

ریگ من الرتمنا

ماہنامہ

PDEBOOKSFREE.PK

محترم قاری!

ڈیجیٹل کتاب اصلی کتاب کا عمل بدل نہیں ہو سکتا۔ پی ڈی ایف کتاب صرف سمندر پار پاکستانیوں کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہے۔ اگر آپ پاکستان میں رہتے ہیں اور اس کتاب کو خریدنا چاہتے ہیں۔ تو یہاں پر کلک کریں۔

کیش آن ڈیلوری صرف پاکستانی صارفین کے لئے۔

**C.O.D SERVICE
IN PAKISTAN**



کچھ ریگ زار تمنا کے بارے میں

شعلہ میں گزشتہ ساڑھے تین سال سے رواں یہ ناول اس ماہ اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ میرے اب تک لکھے جانے والے ناولوں میں یہ طویل ترین ناول ہے۔ میں نے شروع سے ہی اسے مخصوص طرز سے ہٹ کر لکھا تھا۔ میرے دیگر ناولز سنگل ٹریک یا دو ٹریک پر چلے لیکن میں نے اسے ملٹی ٹریک ناول کے طور پر آغاز کیا، اسی لیے قارئین کے لیے اس کے کرداروں کو سمجھنا ذرا مشکل رہا۔ اس کے لیے شکایات بھی موصول ہوئیں کہ کردار زیادہ ہیں اور ذہن نشین نہیں ہوتے لیکن پیارے قارئین! اپنے طور پر میں نے پوری کوشش کی کہ ہر کردار کی ایک الگ پہچان اور علیحدہ شناخت ہو کیونکہ میرے ہر کردار کی نفسیات دوسرے کردار سے مختلف ہے اور میں نے ہر کردار کو اول و آخر اس کی مخصوص نفسیات کو مد نظر رکھ کر لکھا۔ میں زندگی کے مختلف رنگوں کو ملا کر دیکھنا چاہتی تھی (شاید یہ میری اپنی نفسیات ہے۔ بہت سے رنگ اکٹھے ہو کر یکجہ اچھے لگتے ہیں) جن قارئین کے لیے میرے ناول کے کرداروں کو یاد رکھنا مشکل ثابت ہوا، ان سے بہت بہت معذرت۔ جن قارئین نے شروع ہی سے ہر کردار کو پہچان کر اور سمجھ کر اس کے متعلق اپنی آرا بھیجیں ان کا بے حد شکریہ۔

میں آخر میں صرف اتنا کہنا چاہوں گی کہ بہت سے رنگوں میں سے اپنا رنگ انسان فوراً پہچان لیتا ہے۔ کیا آپ نے کسی کردار میں اپنی جھلک محسوس کی؟ کسی کردار کی نفسیات کے کسی خاص پہلو میں اپنی نفسیات کی کسی پیچیدگی کو پوشیدہ محسوس کیا؟ اگر ہاں۔ تو پھر اتنا جان لیجئے کہ۔
ریجہ کے کردار کی نرمی، مضبوطی اور مشکل سے مشکل راہ سے استقامت اور صبر کے ساتھ گزر جانے کی ادا کو ہر قاری نے سراہا اور پسند کیا۔

عیشہ کی ضد، اتنا اور منفی طرز سوچ ناول کے کسی کردار کو نقصان نہ پہنچائی سوائے اس کی اپنی ذات کے ہائیم کی بے غرضی اور بے لوثی نے ہر نظر کو اپنا اسیر کیا۔
راغ کے راہ بدلنے کے عمل کو ہر کسی نے غلط انداز سے تعبیر کیا خواہ اس کا راہ بدلنا ریجہ جیسی بے مثل لڑکی کے لیے ہی تھا۔

ایمان کی بددعاؤں اور اٹل انداز سے ہر کسی کو شکایت رہی۔ ہر چند کہ اس کی اپنی نظر میں اس کا موقف بہت مضبوط اور جائز تھا۔

شہلا کی خاموشی نے کئی لوگوں کو احساس دلایا کہ جہاں بولنا ضروری ٹھہرے وہاں سوا باتوں کی ایک بات ”خاموشی“ والا فارمولا غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

ناعصم کی قربانی اور دوسروں کے بھید چھپانے کی پر خلوص کوشش اس کے کردار کی بلندی کا سبب بنی۔
منہذہ بیگم اور رادی جان کے کرداروں کے تقابل پر تو مجھے لکھنے یا کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔
سو پیارے قارئین! ناول آپ کو پسند آیا تو میری جانب سے شکریہ۔ آپ کے لیے اگر میرا یہ انداز نا پسندیدہ ٹھہرا تو جانے دیجئے۔ بھول جائے۔ لیکن کردار کے رنگوں سے اپنے رنگ الگ ضرور کریں۔ ان پر سوچیں ضرور۔ ٹھکے ہوئے، پر مشرہ، منفی قسم کے رنگ اپنے اندر سے نکال پھینکیں۔ اچلے، شوخ، خوب صورت رنگوں سے اپنی ذات کو ایسا نکھار دیں جو ہر نظر کو محسوس ہو۔ مجھے آپ سے اتنا ہی کہنا تھا۔
آخر میں میں اپنی ان دوستوں اور شناسا آوازوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے ناول کے آغاز سے آخر تک اس میں دلچسپی لی اور مسلسل اپنی آرا سے نوازا۔

دیوگیتا

تا حد نگاہ پتا ہوا صحرا پھیلا ہوا تھا۔ جا بجا بکھرے ہوئے ریت کے ٹیلے اور کانٹوں سے اٹی جھاڑیاں سورج کی تپش سے اسے اپنا چہرہ جھلٹاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔
 ”داوی!“ اس نے ایک مرتبہ پھر نگاہ دور دور تک دوڑائی۔ ”داوی۔ کہاں ہیں!“
 سورج کی تیز گرم جھلساتی ہوئی آگ اسے اپنے پوٹوں پر محسوس ہوئی اور چند لمحوں کے لیے ہر سواندھیرا چھا گیا۔

”داوی۔۔۔ داوی۔۔۔ کہاں ہیں آپ!“ پیاس کی شدت سے اس کے گلے میں کانٹے آگ رہے تھے۔
 ”ربیعہ!“ اچانک داوی کی آواز ایک سرگوشی کی صورت میں اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ”ربیعہ پیاس لگی ہے۔۔۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔۔۔“
 ”داوی۔۔۔ داوی۔۔۔ کہاں ہیں آپ!“ دھوپ کی شدت نے بالآخر اسے دیکھنے کی صلاحیت سے قطعی طور پر محروم کر دیا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اندھوں کی طرح داوی کو ڈھونڈنے لگی۔

”داوی۔۔۔ میری داوی۔۔۔“
 ”ربیعہ!“ سرگوشی پھر ابھری تھی۔ ”ربیعہ پیاس لگی ہے۔۔۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔۔۔“
 وہ زور زور سے رونے لگی۔ بے بسی کا احساس پوری شدت سے اس کے حواس پر طاری تھا۔ وہ صرف رو سکتی تھی۔

اچانک اس نے اپنی ہچکچوں کی آواز سنی اور پھر خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اس کی آنکھ کھل گئی تھی چند لمحے اس طرح گزرے تھے جیسے وہ قبر میں لیٹی ہوئی ہو۔ ہر سو چھایا ہوا اندھیرا، تنہائی اور وحشت سے ہمتا دل! قبر شاید اسی کیفیت کا نام ہے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ بخود کی آواز آرہی تھی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔
 ”حتیٰ علی الصلح۔۔۔۔۔“

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس آواز نے اسے قبر سے نکال کر دنیا میں پہنچا دیا تھا۔ اسے اپنے چہرے پر پھیلی نمی کا احساس ہوا۔ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو جسم سے چمکی قمیص نے اسے احساس دلایا کہ وہ پسینہ پسینہ ہو رہی

ہے۔ حلق کانٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ زبان اکڑی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے کچھ دیر کے لیے وہ قوت گویائی سے محروم ہو گئی ہو۔

بستر سے اتر کر وہ تیز قدموں سے دروازے کی جانب بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ مؤذن کی آواز واضح ہو گئی۔

”اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔۔۔ اشہد ان لا الہ الا اللہ“

وہ صحن میں چلی آئی۔ گھڑوئی پر دھرے سٹکے سے پانی نکال کر اس نے وہیں کھڑے کھڑے گلاس خالی کر دیا اور ایک گلاس بھر کر وہ وہیں بچھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”گھونٹ گھونٹ پانی پیتے ہوئے وہ مسلسل اپنے خواب کے متعلق سوچ رہی تھی۔
”صبح کاذب کے وقت دیکھے گئے خواب سچے ہوتے ہیں۔۔۔ اور خواب کے بعد آنکھ کھلے اور فجر کی اذان سنو تو سمجھو بالکل سچا خواب ہے۔“ دادی ہی کہا کرتی تھیں۔ ”بندہ پاک صاف ہو، عشاء پڑھ کر دامن کی کروش سویا ہو۔۔۔ بس یہ نشانیاں ہیں سچے خوابوں کی۔“

اس کے کانوں میں دادی کی آواز گونج رہی تھی۔ نظموں کے سائینے ان کا چہرہ پھر رہا تھا۔ ابھی دس دن پہلے کی بات تھی۔ جیتی جاتی، چلتی پھرتی دادی جان کا پیار لے کر وہ کالج گئی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ آخری مرتبہ انہیں دیکھ رہی ہے۔ انہوں نے وہ دست شفیقت آخری مرتبہ اس کے سر پر پھیرا ہے۔ اب وہ کبھی انہیں بات کرنا نہ پائے گی۔ اب وہ کبھی اس پر نور مسکراہٹ کو دوبارہ نہ دیکھے گی۔ اسے خبر ہوئی تو وہ گھر سے قدم نہ نکالتی۔ وہ دھڑلے پر جم کر کھڑی ہو جاتی۔ ملک الموت سے پہلے اس کا سامنا ہونا۔ وہ اپنی دادی کو کبھی اس کے ساتھ نہ جانے دیتی۔ کبھی نہیں۔

بے بسی کا احساس پھر پوری شدتوں سے اس پر حاوی ہوا۔ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چارپائی پر گر پڑا۔ اس نے رونا چاہا مگر وہ رونہ نہ سکی۔ پچھلے دس دن میں وہ اتنا روئی تھی کہ اب آنسو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ چڑیوں کے چچمانے کی آواز نے زور پکڑا اور ملکجا اندھیرا اجالوں میں بدلنے لگا تو وہ یوں چوکی جیسے نیند سے اب

بیدار ہوئی ہو۔

گہری سانس بھر کر وہ وضو کے لیے صحن کے کونے میں بنے ہوئے تل کی طرف بڑھ گئی۔ ٹھنڈے پانی نے جلتی ہوئی آنکھوں کو بے حد و حساب سکون بخشا۔ وضو کے عطا کردہ سکون و اطمینان سے لبریز ہو کر وہ دادی کی چوکی پر آ بیٹھی۔ دادی جان کی جاء نماز اسی طرح بچھی ہوئی تھی۔ صاف ستھری بے شکن، اس کے کونے پر ان کی نیلی کتبچ جیسے کسی کی انگلیوں کی منظر تھی۔ جزدان میں لپٹا قرآن پاک رحل پر رکھا ہوا تھا۔

کمرے کا یہ کونا دادی کی عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ دادی جان رات اور دن کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارا کرتی تھیں۔ دن چڑھے چند گھنٹوں کے مخصوص اوقات میں وہ گھر کا تمام کام نمٹالیا کرتی تھیں۔ وہ بہت محنتی اور ہمت والی خاتون تھیں۔ آخری عمر میں بھی وہ گھر کا سب کام جھٹ پٹ کر لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے کبھی کوئی کام ربیعہ کے لیے نہ چھوڑا تھا۔ وہ دھانی تین بجے گھر میں داخل ہوتی تو صاف ستھرا چمکتا گھر اس کا استقبال کرتا تھا۔ کبھی ایک تنکا بھی اسے یہاں سے وہاں پڑا نہ ملا تھا۔ باورچی خانے میں دھلے دھلائے چمکتے ترن اپنے اپنے خاؤں میں دھرے ہوتے۔ چولہے پر تازہ پکی ہوئی ہانڈی دھری ہوئی اور گرم گرم روٹیاں پکڑے میں لپیٹ رہی ہوتی تھیں۔ دادی کو اس نے ہمیشہ تازہ دم، ہشاش بشاش پایا تھا۔ مصروف گزارے ہوئے وقت کی مٹکن کا شائبہ تک ان کے چہرے پر نہ ہوا تھا۔

ربیعہ کھانا نکالتی، دونوں دادی پوتی وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتیں۔ دادی کے ساتھ وہاں بیٹھ کر کھانا کھانا ربیعہ کو بہت مرغوب تھا۔ اسے اپنا گھر بہت عزیز تھا۔ کمرے کا جو گوشہ اس کے لیے مخصوص تھا، وہ اس کی راجدھانی تھی۔ اپنے آنگن میں پار سنگھار کے درخت کے نیچے جا بیٹھنا بھی اسے دل و جان سے پسند تھا۔ لیکن باورچی خانے کی بات سب سے جدا تھی۔ وہاں وہ اپنی دادی کے ساتھ بیٹھ کر دنیا جہان کے قصے چھیڑا کرتی تھی۔

کانج کی، محلے کی سپیلیوں کی، چھوٹی چھوٹی باتیں وہ کرتی رہتی۔ دادی بڑے شوق وانہماک سے سنا کرتیں۔ کبھی کبھی اے کسی غلطی پر ٹوک دیتیں وہ ان کی نصیحت کو پلو سے باندھ لیا کرتی۔ کبھی اس کی کسی بے عقلی کی بات پر انہیں ہنسی آجاتی تو ربیعہ بڑے شوق سے ان کا چہرہ نگے جاتی۔ وہ بس کبھی کبھار ہی ہنستی تھیں۔ زیادہ ہنسا انہیں پسند نہ تھا۔ بلکہ کبھی کبھار وہ زیادہ ہنسنے پر ربیعہ کو بھی ٹوک دیا کرتی تھیں۔

”زیادہ ہنسا دل مرہ کرتا ہے مٹا!“

ربیعہ ہنسی ضبط کرتی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا، جڑوں میں گد گدی ہونے لگتی۔ لیکن پھر وہ اندر ہی اندر ہنستی تھی۔ اسے اپنی دادی کا کہا بے حد عزیز جو تھا۔

دادی کی قربت اسے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں یا تو باورچی خانے میں ملتی تھی یا پھر رات کو بستر پر۔ وہ ان سے لپٹ کر لیٹ جاتی۔ دادی ایک ہاتھ میں سلج کے دانے گھما میں دو سرا یا زواس کے گرد جمائل رکھتیں۔ بستر پر انہوں بہت کم باتیں کرتی تھیں۔ لیکن ربیعہ ان کے وجود سے اٹھتی بھینی بھینی ممک سے اس قدر مانوس تھی کہ ان سے علیحدہ ہو کر اسے نیند نہ آتی تھی۔ دادی نے کئی مرتبہ اس سے کہا تھا کہ وہ اپنا بستر الگ کیا کرے۔ وہ رات کو عبادت کرتا چاہتی تھیں لیکن ربیعہ کے خیال سے ان کو جاء نماز چھوڑ کر اس کے پاس اتار دیتا تھا۔ پھر کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ ربیعہ سو جاتی تو دادی جیسے سے اٹھ کر جاء نماز پر جا بیٹھتی تھیں، پھر رات گئے تک نوافل پڑھتی رہتیں۔ ایسا کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ربیعہ کے سوتے سوتے انہیں خود بھی نیند آجاتی تھی۔ وہ اسی بات سے گھبرایا کرتی تھیں اور ربیعہ کو الگ سونے کو کہا کرتی تھیں۔ لیکن ربیعہ الگ لیٹ تو جاتی پر اسے نیند نہ آتی تھی۔ وہ ٹکر ٹکر دادی کا ہاتھ تکی رہتی یہاں تک کہ وہ خود ہی جاء نماز چھوڑ کر اس کے پاس آلیٹتیں۔

”تم کہاں ماننے والی ہو، نجانے کب بڑی ہوگی۔“

”کبھی نہیں۔۔۔“ وہ محبت سے کہتی۔ ”بڑے ہونے کا مطلب آپ سے الگ ہونا ہے تو میں ہمیشہ چھوٹی رہوں گی۔“

”پکلی!“ دادی ہولے سے ہنس دیتیں۔

اس وقت نجانے کیوں ربیعہ کو ان کی ہنسی پھکی لگتی تھی۔ جیسے دادی اندر سے دکھی ہوں۔ جیسے ربیعہ کا بہت

تہب ہونا ان کو دکھ دیتا ہو۔ شاید اس سے دور جانے کا خیال انہیں دکھ دیتا تھا۔

ربیعہ نماز پڑھ کر وہیں پر ہی لیٹ گئی۔ اس میں دادی کے وجود کا احساس بسا ہوا تھا۔ کتنے برس ربیعہ نے ان کو پابندیء وقت کے ساتھ اس چوکی پر نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ کتنی بھلی خاتون تھیں وہ نیک بخت، عبادت گزار، سروں کے دکھ سکھ کی ساجھی۔۔۔ قدم قدم پھونک پھونک کر رکھنے والی۔

یہ ایک اسے حلق میں اگنے والے کا نیش یاد آگئے۔

”ربیعہ۔۔۔ ربیعہ۔۔۔ پیاس لگی ہے۔۔۔ ربیعہ پیاس لگی ہے۔“

سرگوشی کہیں آس پیاس سے کانوں میں گونجی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا خواب تھا؟ یہ کیا خواب تھا؟ کم و بیش ایسا ہی خواب اس نے چند روز قبل بھی دیکھا تھا۔ کیا تعبیر تھی اس خواب کی؟ کیا اس کی دادی کی روح بے چین تھی؟ کیا انہیں دوسرے جہان میں کوئی تکلیف تھی؟ کیا مرتے وقت ان کے دل میں کوئی خواہش چاس کی مانند اٹکی رہ گئی تھی۔

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی بے چینی سوا ہو گئی تھی۔

”ایسا خواب کیوں دیکھا میں نے۔۔۔ وہ پتا ہوا صحرا، وہ کہتے ہوئے ریت کے ٹیلے، وہ کانٹوں سے اٹی بھاٹیاں،“ وہ پیاس کی شدت سے گلے میں آگے ہوئے کانٹے۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ دادی کی آواز۔ میری دادی کو کیا دکھ ہے وہاں۔۔۔ کون سی تکلیف ہے کون سا دکھ؟ نہیں۔۔۔ میری دادی نے بھلا کیا گناہ کیا تھا۔ میں ان کے پل پل کی مامی ان کے دن رات کی رفیق میں گواہ ہوں ان کی راست بازی کی۔ ان کی سچائی کی ان کے ماتھے پر چمکتے ہوئے

○ ○ ○

«السلام خاله!»

”ہاں ہاں“ ناشتہ ہے بیٹی۔ بے تکلف شروع ہو جاؤ۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مہر توڑا ہی جاتا ہے۔ جیتی جاگتی جانوں کو تو پیٹ کی آگ بجھانی پڑتی ہے۔ بھلا بتاؤ کوئی بندہ بشر کھائے پئے بغیر رہ سکتا ہے؟ ارے بیٹی!“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تمہاری تو پوری زندگی پڑی ہے، ابھی تو رشتے ناتے شروع ہونے ہیں۔ برتنے ہیں۔ نبھانے ہیں۔ بوڑھی دادی کو تو ایک دن ساتھ چھوڑنا ہی تھا۔ ان سے پوچھو جو بھری جوانی میں بیوہ ہو جاتی ہیں۔ ان سے پوچھو جن کے جوان لال خون میں لال ہو کر واپس آتے ہیں۔ ان سے پوچھو دکھ کیا ہے۔ غم کا پہاڑ کیسے ٹوٹتا ہے۔ کایہ کیسے نچتا ہے۔ ارے تم ایک بوڑھی دادی کو رو رو کر دیکھو یہاں جوان جہان رقیق ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ بس بیٹی! آزمائشیں ہیں اللہ کی طرف سے۔“

وہ شروع دن سے ربیعہ کو اسی انداز کی تسلیاں دے رہی تھیں۔ وہ گرم پرانے اور آم کے اچار کا مزہ دار ناشتہ لاتی رہی۔ خالہ کی آواز ناشتے سے ٹکرا ٹکرا کر لوٹتی رہی۔
یوں بھی نفیسہ خالہ میں غور کرنے کے لیے اگر کچھ تھا تو وہ ان کی محبت کی گرمی اور بے پایاں خلوص کی چاشنی تھی۔ ان کی زبان سے نکلنے والا غمناک "اس قابل نہ ہوتے تھے کہ ان پر غور و خوض کیا جائے ان کی طویل بیانی کی بات اب خود کلامی کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔
"کیوں بیٹی! پیٹ بھر کھایا؟" اسے اٹھتا دیکھ کر انہوں نے قطع کلام کیا۔
"جی خالہ! اچار بہت مزیدار ہے آپ کا۔"
"بیٹی رہو! وہ خوش ہو گئیں۔"

ان کے نزدیک ان کی سب سے بڑی صفت ان کے ہاتھ کا ذائقہ تھا۔ وہ اکثر و بیشتر اپنے اس وصف کا تذکرہ کیا کرتی تھیں۔
"جائے میں آج اس لیے نہیں لائی کہ یہیں بنا دوں گی تمہیں۔ گھر سے یہاں تک لاتے چائے بھی ٹھنڈی رہ جاتی ہے۔ تمہارا تو میرا کب کا ٹوٹ گیا۔ نیا خریدنے کی ابھی حیثیت نہیں۔ بدر کسی کام سے لگے تو میری بھی مانی ہو۔ اب تو بوڑھی بیٹیاں ٹھس گئی ہیں کام کر کر کے۔"
"جائے میں خود بنا لوں گی خالہ! آپ ناحق تکلیف کریں گی۔" وہ ان کے پاس آ بیٹھی۔
"اے بیٹی۔ تکلیف کس بات کی؟" وہ بھلا بتاؤ! وہ جھینپ کر بیٹھیں۔
"کتنے دنوں سے آپ ماں بن کر میرا خیال رکھ رہی ہیں۔ میں چاہوں بھی تو آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ یوں ہی میں شکریہ ادا کرنا بھی نہیں چاہتی۔ ماں کے خلوص کو شکریہ کے لفظوں میں تو ل کر میں آپ کا مان کم کرنا نہیں چاہتی۔ آپ نے اس مشکل وقت میں مجھے بہت سہارا دیا ہے خالہ جان!"
"اے بیٹی۔ بھلا بتاؤ! نفیسہ خالہ جی بھر کر شرمندہ ہونے لگیں۔"

نفیسہ خالہ کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بیٹھی یعنی باتیں سوچتی رہی، پھر اس نے بنا سوچے سمجھے کونے میں جی بھاڑا اٹھائی اور گھر کی صفائی شروع کر دی۔
گھر ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک گندا ہو رہا تھا۔ گہریوں کی آمد آمد تھی۔ آج کل دھول مٹی اڑنا بہت کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی ہفتہ بھرے گھر کی صفائی نہ ہوتی تھی۔
دادی جان کی زندگی میں ایسا ممکن نہ تھا۔ وہ بے حد صفائی پسند خاتون تھیں۔ دھول مٹی سے ان کی طبیعت کھراتی تھی۔
"اور۔۔۔ اب۔۔۔ وہ منوں مٹی تلے جاسوئی ہیں۔ نجانے کیسے!" اس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر سر جھٹک کر دوبارہ صفائی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

دراصل اتنے دنوں سے محض اسی ایک بات کی تکرار نے اس کا ذہن بری طرح سے تھکا دیا تھا۔
ٹوٹ پھوٹ کا عمل پوری شدت سے جاری تھا سوا اب اس کا جی چاہ کر رہا تھا کہ وہ دادی کو یاد نہ کرے۔ وہ کچھ دیر لے لیے بھول جائے کہ اس کی پیاری دادی اس سے بہت دور جا چکی ہیں۔ کبھی نہ لوٹنے کے لیے وہ کچھ دیر کے لیے مصروف رہنا چاہتی تھی۔ وہ گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں لگی رہی۔ جھاڑو لگا کر اس نے صحن کے کونے میں بنی کیاری صاف کی۔ سب پتے جمع کر کے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ پودوں کو پانی دیا۔ باورچی خانے کے سنک میں جمع شدہ چند برتن نجانے کب سے گندے پڑے تھے۔ انہیں دھو کر جگہوں پر پھینچا۔ باورچی خانے کا فرش دھو کر پھر سے خشک کیا پھر وہ کمرے میں چلی آئی۔

اس کی نگاہ بستر پر پڑی۔ اس پر کچھ ملبہ چادر ٹھیکوں سے پڑھی۔ نہ چلتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ یہ چادر بدلتا نہ چاہتی تھی۔ اس چادر میں ابھی اس کی دادی کے جسم کی منک باقی تھی۔ زندگی کی

آخری رات انہوں نے اسی بستر گزاری تھی۔ اس کی شکلوں میں ان کے وجود کی گواہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بستر تک آئی، پھر اس پر بیٹھ کر دھیرے سے اسے چھو کر محسوس کرنے لگی۔ وہاں ہلک تھی، شکنیں تھیں، مگر وہ وجود نہ تھا۔

اس کا تنفس تیز ہوتا گیا۔ ایک بار پھر دادی سے پچھڑنے کا دکھ اس کی رگ رگ میں سکھنے لگا۔ دروازے پر دستک نے اسے واپس حواسوں میں لوٹایا تھا۔ چند لمحے اسے خود پر قابو پانے میں لگے پھر وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

”کون ہے؟“ چنچنی کراتے ہوئے اس نے پوچھا۔
”حاکم خان۔!“ باہر سے آواز آئی تھی۔

ربیعہ نے دروازہ کھول دیا۔
”اسلام علیکم چچا جان!“ اس نے انہیں اندر آنے کا رستہ دیا۔
”وعلیکم السلام۔“ وہ اندر چلے آئے۔ ”یسی ہو ربیعہ!“
”بس۔“ وہ نظریں جھکا کر رہ گئی۔
اندروں سے ایک ہلکا سا آواز آئی تھی۔

”انتا غم نہ کرو۔ نازک سی جان ہو، کچھ اپنی ذات کا بھی خیال کرو۔ ابھی تو عمر بڑی ہے۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا۔ اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”چچا جان! ان کے سوا کون تھا میرا اس دنیا میں۔ میں نے تو کبھی آنکھیں کھول کر اس دنیا کے رستوں کو پہچاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ مجھے اپنی دادی کی آنکھوں سے ہی دنیا نظر آتی تھی۔ وہ آنکھیں بند ہو گئی ہیں چچا جان۔ میں تو اندھیروں سے بدتر ہو گئی۔ مجھے۔ مجھے کچھ بھائی ہی نہیں دیتا۔“

”بس۔ بس۔“ وہ اسے پکارتے رہے تھے۔ ”یوں رو رو کر اپنی صحت کا نقصان نہ کرو۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں۔ ادھر تالا لگا کر ہمارے گھر چلی آؤ۔ یہاں تنہائی میں بڑی رہو گی، سوچ سوچ کر اپنی جان ہلکان کر دو گی۔ رو کر آنکھیں خراب کر لو گی۔ یوں بھی جوان لڑکی ہو۔ ایسے شمار مانا صحیح نہیں ہے۔ پھر سمجھو، تو یہ بھی تمہارا دھیان بنائیں گی۔ سیلیوں سے لڑکیاں یوں بھی جلد بھل جاتی ہیں۔“

”میں ٹھیک ہوں چچا جان!“ وہ شرمندہ سی ہو کر بولی۔ ”بس یوں ہی ذرا جی بھر آیا تھا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں، اصل میں۔ میرا یہاں سے جانے کو جی نہیں کرتا۔ یہاں تو قدم قدم پر میری دادی کی یادیں ٹھہری ہیں۔ مجھے سکون ملتا ہے۔ ورنہ نفیسہ خالہ نے بھی بے حد اصرار کیا تھا کہ میں ان کے ساتھ رہوں۔“

”نہ نہ۔ سوچنا بھی مت۔“ حاکم خان کے ماتھے پر ہل پرکے۔ ”وہاں بدو اور سکندر جیسے بد قماش لڑکے ہیں۔ نفیسہ تو بے وقوف عورت ہے جو اس نے ایسی بات کی، تم ہمارے ہاں چلی آؤ۔ وہاں سمجھو، اور تو یہ تمہارا خیال رکھیں گی۔“

”چچا جان! میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کوئی ڈر خوف محسوس نہیں ہوتا۔ دیوار سے دیوار ملی ہے۔ ادھر نفیسہ خالہ کا صحن ہے، اس طرف سیکھ بوا ہیں۔ اگلا گھر آپ کا ہے، سامنے خانا بابر رہتے ہیں۔ مجھے بھلا کا ہے کا خطرہ ہے۔ آدھی رات کو بھی صحن میں کھڑے ہو کر آواز لگاؤں تو نفیسہ خالہ فوراً ”دیوار پر آجاتی ہیں۔“ بہت ضدی لڑکی ہو تم۔!“ وہ ہنسنے لگے۔

”نہیں چچا جان! اسے میری ضد نہ سمجھیں۔ بس میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ دادی سے اور کچھ نہ لیا۔ وضع داری ضروری ہے۔“ وہ سر جھکا کر آہستہ سے بولی تھی۔

”ارے۔ ارے۔“ بھی! ایسی وضع داری۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”پگلی کیل کی۔ اچھا یہ بتاؤ کچھ منگوانا تو نہیں۔ میں سبزی وغیرہ لینے جا رہا تھا۔“

”آج تو نہیں میں ذرا چیزوں کا جائزہ لے لوں۔ ہاں کل ضرور آپ کو ضروری اشیاء کی لسٹ بنا دوں گی۔“
 ”چلو ٹھیک ہے۔۔۔ اچھا میں چلوں۔۔۔“ انہوں نے ایک طائرانہ نگاہ گھر پر دوڑائی۔ ”سمیعہ گھر کا کام نمٹا کر
 آجائے گی تمہارے پاس۔ میں اسے کہہ دیتا ہوں۔“
 ”شکریہ چچا!“ وہ انہیں چھوڑنے دروازے تک آئی۔



سمیعہ اور ثویبہ آگئیں تو اس کی طبیعت مزید سنبھل گئی۔

وہ اس کی بچپن کی تسکیناں تھیں۔ اپنے دل کی باتیں وہ ہمیشہ ہی سے ایک دوسرے سے شیئر کرنے کی عادی
 تھیں۔ اور حقیقت یہ تھی کہ بات محض سمیعہ، ثویبہ تک ہی محدود نہ تھی۔ پورا محلہ ہی ہمیشہ سے ایک دوسرے
 کے دکھ سکھ کا سنا سنی رہا تھا، یہاں کسی کے بھی غم کو ہر گھر اسی طرح محسوس کرتا تھا جیسے یہ اس کا اپنا غم ہو۔
 سمیعہ، ثویبہ کی ماں کی وفات پر محلے کی سب عورتوں نے مل کر انہیں اپنی محبت کے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔
 اس طرح کہ کچھ عرصے بعد دونوں لڑکیاں ہی نہیں بلکہ چھ سالہ نیب بھی ماں کا غم قریباً ”فراموش کر بیٹھا تھا۔ محلے
 کی ہر عورت ان کی ماں تھی۔ نفسیہ خالہ، سیکینہ بوا، دادی اور رحمت آپا ان کی ایک ماں کے چلے جانے پر ان تینوں
 کو جیسے چار ماںیں میسر آئی تھیں۔

ایک عرصے تک ان کے گھر چوہا نہ جلاتھا۔ صبح کا ناشتہ نفسیہ خالہ کے گھر سے آتا تو دوسرے کا کھانا سیکینہ بوا کے
 ہاں سے اور رات کو رحمت آپا خان اٹھائے چلی آتیں۔ یہاں تک کہ لڑکیاں سنبھل گئیں۔ ہنسنے بولنے لگیں۔
 گھر کے کام کاج پورے طریقے سلیقے سے کرنے لگیں۔

اسی طرح رحمت آپا کے شوہر کا انتقال ہوا تو سب نے مل کر اس طرح ان کے دکھی دل پر چاہت و ہمدردی اور
 اپنے پن کا مہم رکھا کہ بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال کر وہ اپنا اور اپنے دو بچوں کا پیٹ پالنے لگیں۔
 محلے کے مرد و عورتوں تک بازار جانے سے قبل ان کا دروازہ کھٹکھٹانا نہ بھولتے تھے، مبادا وہ کسی چیز کے انتظار میں
 بیٹھی ہوں یا کوئی ضرورت انہیں پریشان کرتی ہو۔

اب کی بار دکھ نے ربیعہ کے دروازے پر دستک دی تھی تو پورا محلہ اس کا غم بانٹنے اس کے آنگن میں جمع تھا۔
 نفسیہ خالہ، صبح شام اصرار و محبت سے اسے کھانا کھلا جاتی تھیں۔ سمیعہ، ثویبہ گھر کا کام نمٹاتے ہی اس کی دل جوئی
 کو اس کے پاس موجود ہوتیں۔ سیکینہ بوا اس کی ایک آواز پر دیوار پر آموں جو ہوتیں۔

حاکم چچا (سمیعہ، ثویبہ کے والد) صبح شام چکر لگاتے، اسے حوصلہ دیتے۔ ہر کوئی اسے اپنے گھر لے جانے پر
 ہند تھا۔ لیکن فی الحال ربیعہ نے ایسا کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔
 فی الحال تو اس کی قوت فیصلہ ہی کام نہ کرتی تھی۔ دن رات اس کے لیے اجالے اور اندھیرے کا نام تھا۔ گھڑی
 لی سوئیاں گردش کرتی رہتیں اسے فرق نہ پڑتا تھا۔

ماں باپ کو تو اس نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ شعور کی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اسے ان رشتوں کا ان کی اہمیت کا
 احساس ضرور ہوا تھا۔ لیکن غیر معمولی کمی اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔
 اتنا بڑا دکھ اس قدر آسانی سے سہہ جانا اس کے لیے اتنا سہل نہ ہوتا اگر دادی نے اسے صبر و شکر کا بے پناہ عادی
 نہ بنایا ہوتا۔ وہ عموماً ”توبہ استغفار اور صبر و شکر کی تلقین کیا کرتی تھیں۔“

”دعا مومن کا ہتھیار ہے“ اور صبر اس کی دولت۔ ”وہ اکثر ربیعہ سے کہا کرتی تھیں۔“ جس کے پاس صبر
 اور شکر کی دولت ہو وہ کبھی تنگ نہیں پڑتا۔ اسے کوئی مصیبت ہر اسماں نہیں کر سکتی۔ ایسا شخص نہایت خوش
 قسمت، بے پروا اور غنی ہوتا ہے۔ بے پروا اور غنی ہونا تو اللہ کی صفات ہیں جو وہ اپنے صابر اور شاکر بندوں کو بخش
 دیتا ہے۔ ہر مصیبت پر صبر کرو، اور ذرا سی نعمت پر شکر کرو۔ تم کبھی پریشان نہیں ہوگی۔“
 بچپن سے یہ باتیں انہوں نے ربیعہ کے دامن میں ڈالی تھیں اور اب وہ اپنا دامن دیکھتی تھی تو اس میں

رنگارنگ موتی اس طرح سے جکتے تھے کہ اسے تہی دامن کی کسی احساس سے واسطہ نہ تھا۔
ذرا سی در کوہ بہکتی روتی بلکتی، کوئی شکوہ زبان کی نوک پر آٹھرتا، پھووسرے ہی بل اس کے پلو سے بندھی کوئی
نصیحت چھن چھن بجنے لگتی۔ ربیعہ دکھ بھول جاتی۔ شکوہ ہیں ٹھہر جاتا اور وہ بلند حوصلگی سے دنیا کو دیکھنے لگتی۔
”ربیعہ! ہمارے ساتھ چلو۔“

رات ہوئی تو سمیعہ نے ایک بار پھر وہی بات کہی جو وہ پچھلے کئی دنوں سے کہتی چلی آ رہی تھی۔
ربیعہ منانت سے مسکرا دی۔

”تم نجانے کس طرح اکیلی رہ لیتی ہو، میں تو ڈر کے مارے مری جاؤں۔“ وہ بولی۔ ”اپنے گھر میں بھی میں
تمہارے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتی رہتی ہوں۔“
”کیوں پریشان ہوتی ہو؟ لیکن مانو مجھے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ مجھے تو ہمہ وقت دادی کی موجودگی کا احساس رہتا
ہے۔ یوں جیسے وہ اب تک میرے پاس ہوں، بس نگاہوں سے او جھل ہو گئی ہوں۔“
”پھر بھی ربیعہ! تم اگر محل سے سوچو تو تمہارا یوں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔“ سمیعہ اپنی بات پر مصر تھی۔ ”ابا
کہہ رہے تھے کہ ربیعہ کی جلد سے جلد شادی ہو جانی چاہیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“
”چچا جان بھی بس۔“ ربیعہ خفت سے ہنس دی۔

”ربیعہ باجی! تو یہ جو بڑی دیر سے کسی سوچ میں گم تھی، بول اٹھی۔ کیا واقعی اس دنیا میں آپ کا کوئی
نہیں ہے؟ کوئی بھی نہیں؟“
ربیعہ کے دل سے یکایک بڑی گہری ہوک اٹھی۔ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اس نے چہرہ موڑ کر چھپایا اور
پھسکی سی ہنسی ہنس دی۔



عید الفطر کی رات تھی، شب بھر ہوا خرچا تیرا
اس نے کہا چوڑی مری، اس نے کہا جھمکا میرا

”واہ!۔۔۔ سبحان اللہ۔۔۔“

ایک شور و غل اٹھا۔ دادو نے میں لڑکے پیش پیش تھے۔ لڑکیوں کی تیوری پر بل بڑ گئے تھے۔
”ہاں جی، بہت شاپنگ کروا تے ہیں پوری رات۔“ عائشہ نے دانت پیسیر۔ ”مغرب کے وقت جو بانیک لے کر
نکلے ہیں تو فجر کی اذانوں پر واپسی ہوئی ہے۔“
”خاموش خاموش۔“ ہاشم نے لڑکیوں کو ڈانٹ پلائی۔ ”تم لڑکیوں کو مشاعرے میں بیٹھنے کی تمیز نہیں۔۔۔
ہمیں لطف اندوز ہونے دو۔ ہاں بھئی رافع! آگے چل۔“

وہ جو ہاتھ ماتھے تک لے جا لے جا کر آداب کر رہا تھا، پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔

”اک نے کہا بھیا ذرا رنگریز سے ہو آئیے۔“

اس نے مصرع پڑھا۔ قطعاً ”لڑکیوں کے انداز میں۔ لڑکیوں کی ہنسی چھوٹ گئی۔“

”مکرم۔ مکرم۔“ خوب آوازیں بلند ہوئیں۔

”اک نے کہا بھیا ذرا رنگریز سے ہو آئیے۔“

”رنگریز کے بغیر برصغیر پاک و ہند کی تاریخ ادھوری ہے تو رنگریز کے بغیر لڑکیوں کی عید بقر عید نامکمل۔ کیا کمال کا
مصرع لگایا ہے بھئی۔“ حمزہ نے جی بھر کر داد دی۔

”اگلی مرتبہ میں نے بھی ان کے کان نہ کہنے تو ناعبہ علی خان نہ کہنا مجھے۔“ ناعبہ نے سلگ کر کہا۔

”خاموش۔“ ہاشم محفل کا نظم اعلیٰ تھا۔ ”ہاں رافع!“

اک نے کہا بھیا ذرا رنگریز سے ہو آئیے

دو جی کسے، پنساں سے لے آئیے سودا ذرا

”آہا! ہا۔۔۔ واہ۔۔۔ مزہ آگیا۔“
 لڑکیوں کی شامت تھی۔ سولو کے حلق پھاڑ پھاڑ کر داپش کر رہے تھے۔
 ”آگے چلے، آگے چلے۔“ ہاشم سر ہلا رہا تھا۔
 درزی کے پاس سے ذرا لے آئے پہلی قیص
 اس پر لگانے کے لیے بازار سے گھوٹا ہرا
 اب کی بار لڑکیاں بھی دبلی دبلی ہنسی ہنس دی تھیں۔
 ”معلومات تو غضب کی ہیں رافع!“ رائمہ آبی مسکرا کر بولی تھیں۔
 ”اجی سب کچھ بھگتائے بیٹھے ہیں۔“ اس نے بے بسی سے سر ہلایا تھا۔
 ”جھوٹا زمانے بھر کا۔۔۔“ عریشہ سکی۔
 ”گلی۔۔۔ گلی۔۔۔“ حمزہ نے عریشہ کی بیڑا ہٹ سن لی تھی۔

سب ہی وہاں موجود تھے سب ہی سے پوچھا کیا
 بازار کیسے جاؤں میں؟ دیکھو ذرا بٹوہ مرا
 ”صدقے جاواں۔۔۔“ علی نے نعوا مارا۔ ”ہمیشہ کی حقیقت یوں سرعام بیان کر دی۔ واہ میرے شیر۔“
 ”بھئی یہ بٹووں کی باتیں یوں سر راہ نہیں کرتے رافع!“ رائمہ آبی ہنس رہی تھیں۔
 ”ورہ بھی مسکرا اٹھی تھی۔“
 ”ہر کسی کو حقیقت کا علم ہونا چاہیے۔“ وہ سر ہلانے لگا۔
 ”ہاں بھی اب کس کو علم دوستی کا مظاہرہ کرنا ہے۔“ ہاشم پوچھنے لگا۔
 ”مجھے تو آپ لوگ برداشت ہی نہیں کرتے۔“ حمزہ نے شکوہ کیا۔ ”میرا تو پورا دیوان غیر مطبوعہ رکھا ہے۔“
 ”میں اجی! آپ اسے چھپا کر رکھیں۔“ ہاشم نے اسے پکارا۔ ”اسی میں آپ کی عافیت ہے۔“
 ”دیوان ہے کہ اعمال نامہ!“ علی نے ٹکڑا لگایا۔
 ایک قہقہہ بلند ہوا۔

”چائے پر کون طبع آزمائی کرنے جا رہی ہے؟“ رافع پوچھنے لگا۔
 ”کوئی نہیں۔“ ناعنہ جلی بیٹھی تھی۔ ”پوری لڑکی تو ہیں آپ۔۔۔ چائے بھی بنا لائیں۔“
 ”ارے تو تمہارا کیا خیال ہے؟ چائے بنانا کوئی ایسا فن ہے جو تم لڑکیوں کے ہی قبضہء قدرت میں ہے؟ یہ تو ہم
 لے تمہیں ایڈوائس دیتے ہیں کہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار کہیں تو کرو۔ ذرا ذرا سی دیر کے بعد یہ جو چائے کی پکار
 آتی ہے اس کے پیچھے چائے کی طلب کم اور یہ خیال زیادہ کار فرما ہوتا ہے کہ بے چاریاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی
 اُتی ہیں۔ ان غریبوں کے کرنے کو کچھ تو ہو۔“

”صدقے جاواں۔۔۔“ علی نے تکیہ کلام دہرایا۔
 ”او فہم! آپ لڑکوں نے تو دنیا فتح کر لی ہے۔“ وردہ بولے بنانہ رہ سکی۔
 ”ایا پوچھ گیا ہوا ہے آپ سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔“ حمزہ مسکرایا۔
 ”ارے ہمارے ماؤں کے دلوں سے پوچھو۔ وہاں پر ہم لڑکوں کی بلا شرکت غیرے حکومت کے جھنڈے پوری
 اُٹھتا ہے۔ اب سے لہرا ہے ہیں۔ لڑکیاں جل رہی ہیں، کڑھ رہی ہیں۔“ علی کو جوش آگیا تھا۔
 ”علی۔۔۔ علی!“ فردوس بیگم کی آواز قریب آئی چلی گئی۔
 ماضی کا محفل ایک خاموش ہو گئے تھے۔
 ”یہ علی کہاں ہے؟“ وہ سخت غصے میں نمودار ہوئی تھیں۔
 ”ام۔۔۔ ام۔۔۔ ام۔۔۔ ام جی۔۔۔“ وہ ہکلا یا۔ ”میں بھول گیا امی جی۔“

”کروا تھی ہوں تمہارے باپ سے تمہارے دماغ کا علاج۔“

”چچا جان نے برین سرجری پاس کر لی؟“ حنزہ مصنوعی حیرت سے بڑبڑایا۔

”ہاں، تم بھی آپریشن کروالو۔“ ناعنہ سنجیدگی سے بولی۔ ”شاید کچھ فرق پڑ جائے۔“

”چلو فوراً! اٹھو یا سمین کو لے آؤ۔ وہ غریب دھوکھنے سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ آخر کو فون کیا کہ امی، علی ابھی تک نہیں آیا۔ مجھے کیا خبر تھی حضرت یہاں بیٹھو وقت کا زیاں کر رہے ہیں۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے مڑ گئیں۔ وہ کان سمجھاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

لڑکیاں بدلہ چکانے کو جی بھر کر وائٹ نکال رہی تھیں۔

”علی! ناعنہ نے آواز دی۔ وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔

”وہ جھنڈا لیتے جانا، پیچھے سے کوئی آواز نہ لے جائے۔“

علی نے اسے خجالت سے مکا دکھایا، سب ہی ہنس دیے تھے۔

”اس سال ٹمائیر بڑے منگے رہے بھی۔“ عذرا بیگم حساب کتاب کی ڈائری میں ضروری اندراج کر رہی تھیں۔ ”نافع کل مارکیٹ سے بڑا خوش خوش لوٹا کہ امی ٹمائیر بارہ روپے کھولایا ہوں۔ اب میں حیرت سے اس کامنہ دیکھوں کہ مذاق کر رہا ہے یا جانتا ہے۔ پتا چلا سبزی والا اسولہ روپے دے رہا تھا۔ وہ غریب مارکیٹ جا کر بارہ کے لایا۔“

”بس دلہن! قیامت سر پر کھڑی ہے۔ ایسا زمانہ ہم نے نہیں دیکھا کہ غریب آدمی تین ہزار مارا ہوا رکھتا ہے اور دس ہزار کا خرچ کرتا ہے۔ ان حکمرانوں کو اللہ سمجھے۔ عوام کو بھیڑ بکری کی طرح ہانک رہے ہیں۔ مرد غریب کما کما کر وقت سے پہلے بڈھے ہو گئے ہیں۔ عورتیں ہیں تو دن بھر حساب کتاب کے پرچے لیے پھرتی ہیں۔ سچی خوشی قیامت سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہوئی۔“

شفیقہ حیات نے ولیہ کھاتے کھاتے سو کو مفصل جواب دیا۔

”آج کیا کچے گا ماں!“ وہ ڈائری بند کر کے مصروف سے انداز میں پوچھنے لگیں۔ ”کل میں نے سبزی تو تقریباً“ ہر قسم کی منگوائی ہے البتہ گوشت کا ناغہ تھا۔ فریزر میں صرف قے کے پیکٹ رہ گئے ہیں۔“

”شملہ مرچ منگوائی تھی؟“ انہوں نے خالی پیالہ سو کو تھمایا۔

”جی ہاں، دو کلو شملہ مرچ بھی منگوائی ہے۔“

”بس پھر وہی ڈالو قیمہ میں۔“

”السلام علیکم۔“ ورنہ چلی آئی۔ ”کیسی ہیں نانی امی!“

”جیتی رہو۔ کالج بند ہو گئے تمہارے گھر پر کیسے ہو آج؟“

”اب تو لمبے عرصے تک میں گھر پر ہوں۔“ وہ ہنس دی۔ ”یونیورسٹی میں داخلے ہوں گے تو فارم جمع کرواؤں گی

ایم اے کا۔ تب تک عیش ہیں۔“

”دیکھا کرو گی دماغ کھپا کر۔“ عذرا خاتون ہنس دیں۔ ”بیٹھو اب گھر پر آرام کرو۔“

”نہیں ماما!“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”بچپن کی بات ہے لیکن مجھے یاد ہے اب تک۔ کبھی لاڈ سے پیا کی گود میں جا

بیٹھتی تھی تو وہ پہلی بات یہی کہتے تھے ورنہ امیری سب سے ذہین بیٹی ہے اسے میں بہت پڑھاؤں گا۔“

”ہاں تو پڑھو بیٹی، کوئی تمہیں نہیں روکتا۔“ شفیقہ حیات نے محبت سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔

”مامی! یہ نافع کہاں ہے؟“ وہ آنکھوں میں آنی نمی کو اندر اتارتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”سو یا بڑا ہے اور اسے کیا کام۔“ شفیقہ حیات بولی تھیں۔ ”یہ نسل تو جیسے سونے کے لیے بنائی ہے اللہ نے

نہیں ختم ہوئی ان کی۔“

”ساری رات انوں کا ساتھ دیں گے تو دن بھر بستر ہی توڑیں گے۔“ عذرا بیگم بھی خفگی سے بولیں۔

”نجانے رات بھر کیا میٹنگیں ہوتی ہیں ان لڑکوں کی۔ باتوں میں تو اب لڑکیوں کو مات کرتے ہیں۔ کتر کتر

زبانیں چلتی ہیں۔“

”تمہیں کچھ کام تھا بیٹی! شفیقہ حیات کو خیال آیا۔

”جی ہاں مجھے دھاگے لانے تھے اس کے ساتھ جا کر۔ چھٹیاں ذرا مصروف انداز میں گزر جائیں تو اچھا ہے۔“

”کیسے کاڑھ رہی ہو ابنی؟“

”ابنی نہیں! امی کے لیے چادر کاڑھ رہی ہوں۔“

”چلتی رہو۔ سب سے نیک بچی ہے اپنی ماں کی۔ کیا کرتی ہیں میا تمہاری۔ دو دو دن ماں کو پوچھتی نہیں، کہنے کو کہ ایک ہے۔“

”بس ناں امی! ہم لوگ دو دن سے گھر کے کونوں کھدروں میں جمع گند پھر اصاف کرنے میں لگے ہیں۔ سالانہ غالی مہم شروع کی ہے ناعمہ نے۔ رائے اپنی بھی آئی ہوئی ہیں تو امی کا سارا وقت بچن میں گزر جاتا ہے۔“

”رائے کی بیٹی کیسی ہے؟“ وہ پوچھنے لگیں۔

”آپ خود دیکھ لیں۔“ خوش باش رائے مسبینہ کو اٹھائے چلی آئی۔ ”اسلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔“ شفیقہ حیات اور عذرا بیگم دونوں اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

”یہ تو بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔“ عذرا بیگم شوق سے مسبینہ کو دیکھنے لگیں۔ ”دیکھو تو ٹھوڑی میں گڑھا بھی

رائے نہیں دی۔

اس لیے تو لیے سے گیلے بالوں کو پونچھتا رافع چلا آیا تھا۔

”اسلام علیکم۔ ناشتہ! وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”تم F.M پر ڈی جے تو نہیں ہو۔“ رائے نے اسے گھورا۔ ”اس قسم کا سلام تو وہیں سے ہوتا ہے، تم نے

مسبینہ کو گود میں لے کر بہار کرنے لگا۔

”میں بتا دیتی ہوں ماما! ورنہ عذرا بیگم کو اٹھتا دیکھ کر بولی۔“ کیا بنانا ہے؟“

”ایک اعذہ فرانی کر دو، دو سلاکس سینک دو، ایک کپ چائے۔“ وہ دوبارہ بیٹھ گئیں۔

”اور رافع! تم ناشتہ کر کے ورنہ کو مار کیٹ تک لے جاؤ۔ اسے کچھ کام ہے۔“

”کوئی نیک بخت دن ایسا بھی ہوتا ہے جب کسی لڑکی کو مار کیٹ سے کام نہ ہو۔“

”بلو مست۔“ ماں نے اسے آنکھیں دکھائیں۔ ”تمہیں کون سے پہاڑ توڑنے ہیں یہاں۔“

”پہاڑ بے شک ترزوالیں۔ یہ ہونٹوں کی مانند بازار میں کھڑا ہونا بہت مشکل کام ہے۔ خاتون تو کسی دکان میں

ہا کہ تی ہیں، ساتھ جانے والا بندہ بے چارا اس پاس گزرتی لڑکیوں سے کئی کترا تا رہتا ہے۔“

”صدقے جاؤں۔“ علی کی آمد عموماً پونہی ہوا کرتی تھی۔ ”یہ شرافت ہمیں نہ ملی ہے ہائے۔“

”اجی آپ تو سرتاپا شرافت ہیں۔“ رافع نے طنز سے اسے دیکھا۔ ”مجسم پار سائی۔“

”آداب عرض کرنا ہوں۔ پتلی بار کسی نے میرا ”Inner“ کھوجا ہے۔“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”تمہاری امی کیا کر رہی تھیں؟“ شفیقہ حیات نے اس سے پوچھا۔

”ایک عدد دست تیار کر رہی تھیں۔ جوں ہی میری نگاہ پڑی، گھبرا کر بھاگا، یہاں آکر رکا۔“

”شرم نہیں ہے ان لڑکوں کو۔“ عذرا بیگم ہنسنے لگیں۔

”ناشتہ تو کروا دیں چچی! کل رات کا کھانا کھایا ہوا ہے۔“

”ہم نے کیا بھر کے وقت اٹھ کر کھالیا تھا؟“ رافع نے اسے گھورا۔ ”ہم بھی رات کا ہی کھائے ہوئے ہیں۔“

”ماشاء اللہ! آپ میں صبر بہت ہے۔“ اس نے بچن سے آتی ورنہ کے ہاتھوں سے ٹرے لے لی۔ ”بھئی کچھ دیر

اور صبر کریں۔“

”میں تو بیٹائی دو پہر تک صبر کر سکتا ہوں۔“ اس نے اس کی حرکت پر جی بھر کر اطمینان کا اظہار کیا۔ ”تم ذرا یہ ہاتھ نمنا کرو رو کواریٹ تک لے جانا اسے کچھ کام ہے۔“
اس سے پہلے کہ علی غلٹ میں لقمہ نگل کے کچھ کہتا وہ منظر سے غائب ہو چکا تھا۔

”ہائے اللہ امی۔ یہ اتنا روٹا کیوں ہے۔“ ماہین نے جھنجھلاہٹے ہوئے کہا۔ ”بچوں میں اللہ میاں نے آن آف کاٹن کیوں نہیں لگایا۔ کم از کم کسی گھڑی تو آف کر کے کسی کو نے میں بیٹھ دیتے۔“
”تو یہ کرو۔“ فردوس بیگم نے اسے گھر کا۔ ”اللہ نے اولاد دی ہے اس کا شکر ادا کرو۔ بجائے اس کے الٹی سیدھی باتیں کیے جاتی ہو۔“

”میں بھی اتنا روٹی تھی اتنا ہی تنگ کرتی تھی آپ کو؟“
”نہیں۔“ وہ طنز سے بولیں۔ ”تم تو پیدا ہی اتنی بڑی ہوئی تھیں مجھے کیا کرنا پڑا۔“
”افوہ۔“ وہ حسام کو بیڈ پر چڑھ کر جھلائی۔ ”چپ ہی نہیں ہونا۔“
فردوس بیگم اسے خفی سے دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔ ریکٹ ہلاتا حمزہ اندر داخل ہوا تو ماہین کی جان میں جان آئی۔

”حمزہ میرا بھائی۔۔۔ ذرا اس کینے کو دو گھڑی کے لیے کہیں لے جاؤ ورنہ میں اسے مار بیٹھوں گی۔“
”کس کینے کو۔“ اس نے حیرانی سے ادھر ادھر دیکھا۔
”اس ریں ریں، میں میں کو۔ ہر وقت کا باجا۔“
اس نے حسام کے سر پر چپٹ لگائی۔ وہ اور زیادہ رونے لگا۔
”افوہ۔ ہمارے بھانجے کی شان میں آپ اس سے زیادہ گستاخی نہیں کر سکتیں۔“ اس نے ریکٹ بیڈ پر پھینک کر حسام کو اٹھا لیا۔ وہ فوراً خاموش ہو گیا تھا۔
”یہ آپ کی شکل دیکھ کر روتا ہے اپنا۔“
”کیوں؟“ وہ مشتعل ہوئی۔ ”میری شکل کو کیا ہوا؟“
”آپ کی شکل کو کچھ نہیں ہوا۔ اس کا مزاج اپنے باپ پر چلا گیا ہے۔“
”آٹھائے لڑکے! فردوس بیگم اسے گھورنے لگیں۔ ”کتنا بد لحاظ ہو رہا ہے۔“
”گرمیوں میں تو میرا جی چاہتا ہے سائنس دانوں کو مشورہ دے ڈالوں۔ ہینڈی اے سی ایجاد کرنے کا۔ بس ہاتھ میں پکڑ کر ٹھوتے رہو۔“

عریشہ جیسے بلبلاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ سیاہ اور سرخ امتزاج کا لالان کا پرنٹ اس کی دھکتی ہوئی رنگت پر خوب بہا روے رہا تھا۔

”شکر کرو اے سی بیڈروم میں جی بھر کر عیش کر لیتی ہو۔“ فردوس بیگم نے اس کی بھی خبر لے ڈالی۔
”نجانے سسرال میں جا کر کیسا کرہ ملے۔ ہینڈی اے سی ایجاد کروائیں گی سائنس دانوں سے، ملکہ الزبتھ۔“
”افوہ امی! کبھی تو دعا بھی دے دیا کریں۔“ وہ جھلائی۔ ”جب بولیں گی، ہونا تک ساق نشہ لگا ہوں میں پھر اداں گی۔“
”ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔“ ماہین نے ماں کا ساتھ دیا۔ ”تمہارے تو دماغ ہی نہیں ملتے ہر جگہ تھوڑی یہ نخرے چلتے ہیں۔ لڑکیوں کو تو صبر شکر کا عادی ہونا چاہیے۔“

”ارے اپنا! کیوں بے چاری کو ذرا رہی ہیں۔“ حمزہ ہنسنے لگا۔ ”صبر شکر ٹرننگ انسٹی ٹیوٹ میں باضابطہ ایڈمیشن لے گی تو خود ہی سب کچھ سیکھ جائے گی۔ ابھی سے کیوں اتنی سخت ٹرننگ کا اشارٹ لے رہی۔“
”یہ کون سا اسکول ہے؟“ فردوس بیگم کچھ سمجھی نہ تھیں۔
”سائنس کی آس، نند کی بھڑاس، دیور کی باس اور شوہر کا ستیا ناس۔ کچھ اس قسم کی کلاسز ہوتی ہیں وہاں امی

جی۔

ان تینوں کو ہی ہنسی آگئی تھی۔
”توبہ، کتنی بکواس کرتا ہے۔“ فردوس بیگم نے خود پر قابو پا کر اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔ ”مجال ہے جو کبھی لکھتا، پڑھتا نظر آئے۔“

”اے امی جی! آج کل نیبل پریٹھ کر لکھنے، پڑھنے کا زمانہ نہیں ہے۔ آج کل تو دور ہے حرکت کا۔ ہر شے میں حرکت، کھانا پینا، لکھنا، پڑھنا سب حرکت میں رہ کر ہوتا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کچھ عرصے بعد سونا بھی حرکت میں نہ ہو۔ آدمی سو بھی رہا ہے اور مزے سے اپنے کام بھی منھناتا پھر رہا ہے، کیوں ایسا!“
”ایسی فضول حرکت تم ہی کر سکتے ہو۔“ اس نے ناک چڑھائی۔ ”یہ علی کہاں ہوتا ہے آج کل“
”نظر آکر اس کو اپنی شامت بلوانی ہے کیا؟“ وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگا۔

”کیوں، ہم کیا کہتے ہیں اسے۔“ اسے برا لگا۔ ”کبھی بکھاری کی کہتے ہیں کہ ذرا اسرال سے آکر لے جاؤ ہمیں۔ اب کیا بہنوں کا اتنا بھی حق نہیں۔ وہاں پھپھو کے پورشن میں ہر وقت رائے اور روہ کے کام کرتا رہتا ہے۔“
”نائے کا نام آپ کیوں گول کر گئیں۔ اس سے آج کل تعلقات اچھے ہیں کیا؟“ حمزہ نے شوخی سے اسے دیکھا۔

”وہ تو چلتا پرزہ ہے۔ ایسی تیز ہو گئی ہے۔ کتر کتر تو زبان چلتی ہے اس کی۔ بڑے چھوٹے کا کوئی ادب، لحاظ ہے اس کو۔“ فردوس بیگم کا پسندیدہ ٹاپک تھا۔

بیوہ مند اور اس کی بیٹیوں بیٹیوں کو وہ کسی طور یا سنگ مار کس نہ دیتی تھیں۔
”مٹی والی کے بارے میں کیسے خیالات ہیں آپ کے؟“ اس نے کن اٹھیوں سے عریضہ کو دیکھا۔
”ارے ہاں۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئیں۔ ”یہ کون سا کم ہیں کسی سے۔ ان کا ”منہ پھاڑ“ بھی بہت بڑا ہے۔ جب بولیں گی بے ٹکا بولیں گی۔“

”خدا کے لیے امی! وہ تپ کر کھڑی ہو گئی۔“ مجھ سے تو آپ کو اللہ واسطے کا پیر ہے۔ دو گھڑی کو پاس آکر بیٹھ جاؤ تو یہی جلی کٹی سننے کو ملتی ہے اور یہ حضرت۔ یہ تو پکی بی جھالو ہیں۔ ایک سفید برقع کیوں نہیں خرید لیتے تم۔“
”میرا کام اس کے بغیر بھی چل رہا ہے۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوا۔ ”کیا نہیں چل رہا؟“ وہ اتنی ہی معصومیت سے پوچھنے لگا۔

”ہو نہ!“ وہ پیرت کر کرے سے نکل گئی۔
ماحول کچھ بد مزہ سا ہو گیا تھا۔ حمزہ، حسام کو لے کر کھینا ناسا ہو کر کرے سے نکل گیا۔ ماہین حساب کا بکھرا ہوا سامان سمیٹنے لگی۔

”تسلیم میاں آئیں گے لینے یا رکنے کا ارادہ ہے۔“ فردوس بیگم نے موڈ اور موضوع بدل کر فضا خوشگوار کرنے کی کوشش کی۔

”آج رکوں گی، کل ہاشم کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ تسلیم کے آفس میں تو آؤ تنگ چل رہی ہے۔ انہیں سر بھانے کی فرہمت نہیں۔“

”اچھا اچھا ہاشم ہے کہنا۔ چھوڑ آئے گا تمہیں۔“
انہوں نے بیٹی کو تسلی دی۔

وہ بڑی جگت میں ہاتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ ڈور نیل کافی دیر سے بج رہی تھی۔ تمہ لگے ہوئے دوپٹے کو ہولتے ہوئے مرکز دیوار سے تک چلی آئی۔ آئی ہول سے جھانک کر دیکھا پھر جلدی سے چنچنی گرا دی۔

”السلام علیکم۔“ پوسٹ مین سے اس کی اچھی بھلی سلام دعا تھی۔
”وعلیکم السلام۔“ وہ مسکرائی۔ ”خیریت سے ہیں صدیق بھائی!“
”شکر ہے اللہ کا۔ دعائیں ہیں آپ کی۔“

وہ دستخط کر کے لفافہ لیے اندر چلی آئی۔ خوشی اور ترنگ کی لہریں انگ انگ سے پھوٹنے لگی تھیں۔

بستر پر آرام سے بیٹھتے ہوئے اس نے لفافہ کھولا۔ اندر حسب معمول بیس ہزار کا ڈرافٹ تھا اور ساتھ ہی اس کا محبت نامہ۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ سج گئی۔
ہم سفر ہم نفس!
خوش رہو آباد رہو۔

”نون پر بات بھی ہو جاتی ہے اور انٹرنیٹ پر تمہارا ویدار بھی لیکن جو مزہ تمہیں خط لکھنے میں آتا ہے وہ الگ ہی چیز ہے اور بڑے خاصے کی چیز ہے۔“

تم ساتھ کی دہائی کی ہیروئن کی طرح جب خط کی سطروں پر نظریں دوڑاتی ہوگی اور ایک شریکیں مسکراہٹ تمہارے لبوں کو کھیرتی ہوگی تو تم کیسی پیاری لگتی ہوگی۔ ہے نا۔ ذرا آئینہ دیکھو۔۔۔ میں رات کو فون پر پوچھوں گا۔ بچوں کو میرا بہت بہت پیار دینا، میری طرف سے انہیں بہت سے کھلونے خرید کر دینا اور باہر گھمانے لے کر جانا۔ وہ چند لمحے خط کا کونا ہونٹوں میں دیا کر ہنستی رہی پھر اٹھ کر آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ تمہارا عاشر سیاہ پھول دار پرنٹ میں شمالی رنگت دمک رہی تھی۔ آنکھوں میں چند لمحے قبل ملنے والی خوشی کے دیے جل رہے تھے۔ کیلے بالوں سے شفاف قطرے ٹپک رہے تھے۔

پھر رکا یک ہی اداسی نے اسے آگھیرا۔ برہا کی آگ میں جلتے دو سال ہو گئے تھے۔ دو سال پہلے وہ اپنی کمپنی کی طرف سے جاپان گیا تھا۔ مومن جب دو سال کا تھا اور ایمان محض چند ماہ کی اور ان کی شادی کو محض ساڑھے تین سال کا عرصہ ہوا تھا۔

بس اتنا ہی وقت اس کے ساتھ گزار سکی تھی وہ اور اتنی مدت میں اس کی محبت اور چاہت کی وہ ایسی عادی ہوئی تھی کہ نشے کی وہ زنجیر اب تک اس کے لبوں میں چھنکتی تھی۔
تیار ہو کر کبھی آئینہ دیکھتی تو وہاں اس کی نگاہیں چمکتیں۔ فارغ ہو کر بستر پر جا بیٹتی تو آس پاس اس کے لب مسکرانے لگتے۔ کھانا پکا کر میز پر رکھتی تو اس کا نام پکارتے پکارتے رہ جاتی۔ وہ بے دلی سے بیس ہزار کے ڈرافٹ کو دیکھتی رہی۔ ابھی چند روز قبل تو اس نے بینک میں پچاس ہزار ڈالے تھے جو تمام گھر بیلو اخراجات پورے کر کے بچ گئے تھے۔ اس نے پھر مزید رقم بھجوا دی تھی۔

”مجھے تمہاری ضرورت ہے عاشر!“ وہ زرب لب بولی۔ ”میرے بچوں کو تمہاری ضرورت ہے۔ لوٹ آؤ نا۔“

نیل کی آواز پر وہ خیالوں کی دنیا سے نکل آئی گھڑی پر نظر پڑی تو اس نے لبیک کر دو روزہ کھول دیا۔

”السلام علیکم۔“ سچے مومن کو بیگ لٹکائے دیکھ کر وہ اداسی بھول کر مسکرا دی تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ اس نے متانت سے جواب دے کر بیگ ماں کو تھمایا۔

”ایمان کہاں ہے ماما؟“ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ پہلا سوال بسن کے متعلق کرتا تھا۔

”سورہی ہے جانو!“ اس نے جھک کر اس کا گال چوما۔ ”آپ یونیفارم چھینج کر لو تو میں کھانا لگاتی ہوں۔ ماما کو بہت بھوک لگی ہے۔“

”کیا پکایا ہے ماما؟“

”آپ کا فورٹ آلو گوشت۔ شوربے والا۔“

”ساتھ میں چاول بوا کل کیے ہیں؟“

”بالکل کیے ہیں۔“ وہ شوخی سے بولی۔ ”اب آپ کپڑے تبدیل کر لیں بادشاہ سلامت! تو پھر ہم کھانا کھائیں۔“

”ماما! ایمان کو جگائیں نا میں اس کے لیے چاکلیٹ لایا ہوں۔“

”ماما! پیچھے سے آئی ہوئی آواز پر دونوں نے مڑ کر دیکھا تھا۔“

گھنٹوں سے اونچی پنک کھڑکی فراک پہنے وہ کھڑی منہ بسور رہی تھی۔
 ”لیجئے ہو گئی خواہش پوری۔“ اس نے بیٹے کو ہنس کر دیکھا۔ ”اٹھ گئی بہنا تمہاری۔“
 ”ایمان۔۔۔ آؤ تمہیں چاکلیٹ دوں۔“ وہ کھل اٹھا۔
 وہ لپک کر کھائی سے لیٹ گئی تھی۔

”یہاں سے ناپے آئی؟“ وردہ نے بڑے انہماک سے کپڑا ناپا تھا۔
 ”ایسے نہیں وردہ! بارڈر ضائع ہو گا بعد میں۔“ رائمہ اس کا طریقہ کار دیکھ کر پریشان ہوئی۔
 ”کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے کٹاکٹ فینچی چلا دی۔

”وردہ کو چیخ مت کریں آپ! یہ بہت تیز ہو گئی ہے۔ میں تو اس سے کہہ رہی ہوں ایم اے میں ایڈمیشن مت
 لو۔ کلفٹن پر دکان لے لو بہت چلے گی۔“ ناعمہ مزے سے لیٹی انہیں دیکھ رہی تھی۔
 ”تمہارے منہ میں خاک۔“ وردہ نے خوب ہی برا مٹایا۔ ”گریجویشن کر کے میں درزی کی دوکان کھول لوں۔“
 ”پھر کیا اسمبلی میں جائیں گی۔“ وہ زور سے ہنسی۔ ”اور اگر چلی بھی گئیں تو بھی کچھ نہیں ملنے کا۔ کلفٹن پر دکان
 کی بات ہی اور ہے۔“

”بکواس نہیں کرو ناعمہ۔ میں کام کر رہی ہوں نا۔“ وردہ پریشان ہوئی۔
 ”ہائے اللہ۔“ چاکناک رائمہ کے لبوں سے نکلا تھا۔ ”یہ تم کہاں سے آ گئیں؟“
 وردہ اور ناعمہ نے مڑ کر دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دیں۔

چھوٹی سی ایمان دروازے پر کھڑی تھی۔ ریڈ فراک پر دوپونیاں باندھے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔
 ناعمہ نے لپک کر اسے گود میں بھر لیا۔ ناعمہ سے اس کی بچی بھی بہت تھی۔
 ”چھب لینہ (سبرینہ) کال (کہاں) ہے؟“

”اچھا تو آپ چھب لینہ کو دیکھنے آئی ہیں۔ ہم سے آپ کو کچھ مطلب نہیں۔“ ناعمہ خفا ہوئی۔
 ”تمہاری ماما کہاں ہیں اور مومن؟“ رائمہ نے اس سے پوچھا۔
 ”نالی پاس۔“

”چلو چلیں۔ ایقان خالہ آئی ہیں۔“ وہ تینوں فنافٹ کام پلیٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ حقیقہ حیات کے پورشن میں
 سب ہی جمع تھے۔ ایقان ماں سے لگی بیٹھی تھی۔

”عاشر میاں کب لوٹ رہے ہیں؟“ حقیقہ حیات پوچھ رہی تھیں۔

”پتا نہیں اماں!“ وہ بے زار سی ہو گئی۔ ”دو سالوں سے یہی سن رہی ہوں کہ بس آنے والا ہوں“ آنے والا
 ”اں۔ پتا نہیں وہ ٹرین کب پہنچے گی؟“

”ٹرین نہیں خالہ جانی! اُپر واپس۔“ ناعمہ نے پیچھے سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں۔

”السلام علیکم۔“ عینوں نے کورس میں سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ سب نے ہی جواب دیا۔

”بابی کہاں ہیں؟“ ایقان نے بہن کی بابت دریافت کیا۔

”امی سبرینہ کو لے کر ذرا ٹہلنے نکلی ہیں۔ بس ابھی آجائیں گی۔“

”السلام علیکم۔“ بھاری مردانہ آواز پر سب ہی نے نگاہیں اٹھائی تھیں۔

”اُوسے اُوسے آخر میاں۔۔۔ بڑے روز بعد آئے۔“ حقیقہ حیات خوش دلی سے بولیں جبکہ ایقان سن بیٹھی رہ گئی۔
 تمہی اس شخص کی وجہ سے وہ یہاں کتنا کم آتی تھی لیکن نجانے کیا بات تھی جب بھی آتی سامنا لازمی ہوتا تھا۔
 وہ بڑی بڑی آنکھیں اس پر بے خونی سے جمائے ہوئے تھا۔ اس کے جسم پر چوئیاں سی چلنے لگیں۔
 فرار کا کوئی رستہ بھی فی الوقت بھائی نہ دیتا تھا۔

”ایقان بیگم! کہئے خوش تو ہیں آپ؟“ وہ اسی سے پوچھنے لگا۔

”جی میں ٹھیک ہوں، شکر ہے خدا۔“ اس نے لمبے میں جی بھر کر سنجیدگی سموئے ہوئے جواب دیا تھا۔
”شریک حیات تو خوش ہوں گے آپ کے، کب لوٹ رہے ہیں خیر سے؟“ وہ عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
ایقان کوئی جواب نہ دے پائی۔ جڑ بڑ ہو کر رہ گئی۔

”کہاں تھے آخر میاں! اپنی دونوں کے بعد دکھائی دیے ہو؟“ ”شفیقہ حیات نے بیٹی کو مضطرب پا کر سب کا دھیان بٹانے کی شعوری کوشش کی۔

”جی ہمارا کیا ہے بی بی جان! نہ گھر نہ دس۔ کبھی یہاں بڑے ہیں تو کبھی وہاں۔“ وہ طنز سے ہنسا۔ ”یوں بھی ہم دکھائی دیں نہ دکھائی دیں، کون سی نظرس ہیں جنہیں کچھ فرق پڑے، کس کی نگاہیں تلاشتی ہیں۔“
”ایسا کیوں سوچتے ہو بیٹا!“ شفیقہ حیات نے بساط بھر وضع داری بھائی۔ ”اور کسی کو تم اپنا خیال کرو نہ کرو۔ سگی بہن تو یہاں ہے تمہاری۔ وہ تو بھائی کو یاد کرتی ہی ہوگی۔“

”فردوس آبا! وہ پھر طنز سے ہنس دیا“ ہاں! مجبور ہیں بے چاری۔ جب آجاتے ہیں انہیں ستانے تو بادل خواستہ کرو صاف کروا دیتی ہیں۔ اس سے زیادہ اور ایک بہن کر بھی کیا سکتی ہے کھٹو بھائی کے لیے۔“
”تو بیٹا۔ جب عاقل بالغ ہو، سب کچھ سمجھتے بھی ہو تو کسی روز گار سے لگو۔ اپنا کچھ ٹھکانا کرو۔ گھر بسا۔ خدا کے رسول کی امت میں سے ہو تو اس کی سنت بھی پوری کرو۔“

اس نے ایک گہری سانس بھر کر ہنسی کی نظروں سے، ادھر ادھر دیکھتی ایقان کو، سر سے پیر تک جی بھر کر دیکھا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ہم نے تو بہت چاہا لیکن۔۔۔“ وہ ہنسا پھر منہ ہی منہ میں کچھ گنگناتے ہوئے۔ دروازے کی طرف بڑھ گیا، دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ایک بار پھر رکھا تھا۔

”چھالی بی جان! اچلتا ہوں۔ آپ کی خدمت میں سلام عرض کرنے آیا تھا۔ یہ سلام۔۔۔ کئی دن سکھ سے گزر جائے گا پیام بن گیا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔“ وہ منہ ہی منہ میں پھر سے ادھر اور اگیت گنگناتا، پیر گھینٹا آگے بڑھ گیا۔

ایقان نے نجانے کتنی دیر سے گھٹی ہوئی سانس برآمد کی تھی۔

”توبہ ہے۔ ایسے گھورتے ہیں خالہ جانی کو جیسے نظروں سے کھا ہی تو جائیں گے۔“ ناعسم نے دانت پیسے۔

”تم چپ رہو۔“ رائمہ نے اسے گھر کا ”بچیاں ایسے معاملات میں نہیں بولتیں۔“

”میں بچی تو نہیں ہوں اپنا۔“ اس نے برا سامنے بنایا۔ ”انٹریاس کر چکی ہوں۔“

”جی نہیں۔ ابھی آپ کا رزلٹ نہیں آیا۔ کیا پتا پاس ہوتی بھی ہیں یا۔۔۔ رڈی میں سے پرانے نوٹس دوبارہ اکٹھی کرتی پائی جاتی ہیں۔“

ہنستا ہوا رافع اچانک برآمد ہوا تھا۔

”اللہ رافع بھائی۔ آپ کے منہ میں جھاگ۔ وہ بھی اریل کا۔۔۔“ وہ سلگ اٹھی۔ ”سارنی گند بلا صاف ہو جائے ایک بار میں ہی۔“

ایقان بے ساختہ ہنس دی تھی۔

”یہی چٹکے تنسنے کے لیے آتی ہوں میں۔ طبیعت فریش ہو جاتی ہے۔“

”فریش“ ”ن کر تو ہری ہری چیز کا خیال آتا ہے پھوس۔“ علی بھی بروقت نازل ہوا۔ ”گویا آپ طبیعت ہری کروانے آتی ہیں۔“

ایقان پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

”لیجئے۔ مسخرہ پارٹی کے کارکنان ایک ایک کر کے جمع ہو رہے ہیں۔ اب آپ سینے چٹکے۔“ ناعمہ نے طنزاً کہا۔

”زلزلہ پارٹی کی سربراہ کو پہلا جھٹکا لگا ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اب جوں جوں جھٹکے بڑھیں گے زلزلے کی شدت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔“

”اور جب آتش فشاں زور پکڑے گا تو اس پاس کی سب پہاڑیوں کے منہ سرخ ہو جائیں گے۔“ یہ حمزہ تھا جو ماہین اور عریشہ کی معیت میں اندر داخل ہو رہا تھا۔

سب ابقان کی آمد کا سن کر آ رہے تھے۔ وہ کسی کی ہم عمر پیچھو اور کسی کی ہم عمر خالہ تھی۔ سب ہی سے اس کی خوب بنتی تھی۔

”اچھا۔ تو اصل آتش فشاں کون ہے اور اس پاس کی پہاڑیاں کون کون ہیں؟“ وہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

”پاپ رے باپ۔ یہ تو نہ ہی پوچھیں پیچھو جانی۔ بھلا ناعمہ کی موجودگی میں کون یہ سچ بولنے کی جرات کر سکتا ہے؟ سارا لاوا اس پر ہی نہ اندھیل دے گی یہ؟“

”اچھا چلو۔ بس کروا۔“ حقیقہ حیات نے پہلو بدلا۔ ”یہ چار کہیں جمع ہو جائیں تو پانچواں تو کچھ بول ہی نہیں سکتا۔ کچھ ہمیں اپنے دکھ سنکھ کہنے دے۔ کتنے دنوں بعد تو میری بیٹی آئی ہے۔ چلو۔ تم سب بھاگو یہاں سے۔ دھماچو کڑی کہیں کے۔“

”اف دادی جان۔ اس قدر عزت افزائی۔“ علی نے دانت نکالے۔ ”صدقے جاواں!“

”کہیں تو جاؤ۔“ ناعمہ نے زبان چڑائی۔ ”چلو صدقے ہی جاؤ!“

اندر آئی فردوس بیگم کے ماتھے پر ہل بڑگئے تھے۔

”لڑکی! ابھی تو بولنے سے پہلے تول لیا کرو۔“ وہی تباہی ہی کبھی رہتی ہو۔ ”ان کا لہجہ نہایت درشت تھا۔ ساس اور نند سے دعا سلام کے بغیر ہی وہ اس کی خیر خبر لینے میں مصروف ہو گئیں۔“

”ارے امی جی۔ آئیے ترازو تو ہم سب کا ہی خراب ہے۔“ علی نے ہنس کر بات بدلنے کی کوشش کی۔ ”کچھ ہی دیر قبل حمزہ اس کو آتش فشاں کہہ رہا تھا۔ اور میں زلزلہ پارٹی کی سربراہ کا لقب دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”حالانکہ عریشہ کے ساتھ یہ صریح زیادتی ہے۔“

”اور ناعمہ کے ساتھ کہہ زیادتی۔“ رافع نے بھی مداخلت بدلنے کی کوشش کی۔

”ایک ساتھ اتنے جملوں کی پوچھاڑ ہوئی تو فردوس بیگم بھی ٹھنڈی پڑ کر ساس اور نند سے ملنے لگیں۔“

”کتنے دن کو آئی ہو؟ کوگی تو سہی؟“

”جی بھائی جان۔ اس مرتبہ تو رکوں گی۔ مومن کی بھی چھٹیاں ہیں۔“ وہ انہیں بتانے لگی۔

ناعمہ ورنہ اور رانمہ اٹھ کر اپنے پورشن میں چلی آئیں۔

”دیکھا آئی! آپ نے مامی کا رویہ؟“ ناعمہ کے تن بدن میں گویا آگ لگی ہوئی تھی۔ ”ان کے بد تمیز لڑکے خواہ زمانے بھر کو ہنسی میں خوار کرتے رہیں۔ دوسرا کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور خصوصاً مجھ سے تو ان کو اللہ واسطے کاہر ہے۔“

”جانے دونات ناعمہ۔ کوئی بات نہیں۔ ہماری بڑی ہیں وہ۔ اگر کچھ کہہ بھی دیا تو نظر انداز کرو۔“ ورنہ نے رمانیت سے کہا۔

”ہر مرتبہ ہی نظر انداز کر دیتی ہوں تاکہ۔“ وہ یاسیت سے بولی۔ ”اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے!“

”او فوہ ناعمہ۔ فارگاؤ سیک۔ اب تم بے بات رُسوے بہانے مت بیٹھ جانا۔“ رانمہ کو الجھن ہوئی۔

”ایک تو جتنی جھگڑا ہوا اتنی ہی زور رنج بھی ہو۔“

”لیجئے! آپ نے بھی خطاب دے ڈالا!“ وہ جلیلا کر رہ گئی۔ ”ساری دنیا ایک میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہے۔“

”دنیا سے پوچھو اس نے ہاتھ بھی دھوئے ہیں یا نہیں! حمزہ کی گردن نے دروازے سے جھانکا۔ ”اور اگر نہیں دھوئے تو دھو لے۔ اندر آسکتا ہوں جان کی امان پا کر؟“

”کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔“ ”ورہ ناعمہ کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرائی تھی۔ ”اپنی ذمہ داری پر آؤ اگر آتا ہے تو۔“

”اوہ۔۔۔ میرے ہاتھ میں کون سا لٹھ ہے۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”تمہارے ہاتھ میں ہونہ ہو، منہ میں ضرور ہے۔“ وہ خوش دلی سے ہنستے ہوئے اندر چلا آیا۔ ”بڑی خوبی سے دائیں بائیں گھمائی ہو۔ کیوں رائے آئی؟“

”اب تم مجھے بھی گھسیٹ لو۔“ وہ بھی ہنس دیں۔ ”میں نہیں مفت کی گواہیاں دیتی۔“

”چچو چچو۔۔۔“ اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”گو یا آپ پیسے لے کر گواہیاں دیتی ہیں۔ یہ تو اور بھی بری بات ہے۔“

”صدقے جاواں۔۔۔“ ایک اور آمد ہوئی تھی۔ ”موسم کی کچھ خبر دو۔“

اس نے اندر آکر بطور خاص ناعمہ کے چہرے کا معائنہ کیا۔

”ہاں۔۔۔ ابریاراں کے آثار نہیں۔۔۔ کافی خشک سالی پھیلی ہے۔ آسمان سے سرخی بھی غائب ہے اندر اٹھتی آندھی بیٹھ چکی ہے غالباً۔“

”اب تم آندھی کو پھرت آواز دو ورنہ سر منڈواتے ہی اولے پڑنے والی مثال یاد کرتے بھاگ لو گے۔“ حمزہ مزے سے بولا۔ ناعمہ کو ہنسی آگئی۔

”اتنے بد تمیز ہو تم لوگ۔“ پھر وہ مصنوعی غصے سے بولی۔ ”یہ جو سارے جہان میں مجھے بد نام کرتے پھرتے ہونا۔“

”اللہ معافی دے۔“ حمزہ نے کان پکڑے۔

”تو اور کیا۔ آندھی طوفان، زلزلہ، آتش فشاں بد تمیز، جھگڑا۔۔۔ یہ سارے نام کس نے رکھے ہیں میرے“

”علی نے۔“ حمزہ فوراً بولا۔

”حمزہ نے۔“ علی نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”تم سارے ایک ہی پھیلی کے چٹے بٹے ہو۔“ اس نے جھلا کر کہا۔ ”اپنی خوبیاں نظری نہیں آتیں۔“ جتنا بولوں ”کو وہ کیا مثال ہے، پھلتی بولے سوئی سے تیرے بیت میں چھید، بولی حال تم لوگوں کا ہے۔ اپنی زبانیں کیسے فینچی کی طرح چلاتے ہو۔ اور مجھے زبان دراز کا لقب دلایا ہوا ہے اپنے ”بیٹوں“ سے۔“ رائے اور ورنہ مسکراتے ہوئے ان کی بحث سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

”اے یار۔! امی جان کی باتوں کو دل پہ نہ لے لیا کرو۔“ حمزہ بالآخر اصل موضوع پر آگیا۔ ”علی کی طرح بنو۔ ڈھیٹ اور ڈانٹ پروف۔“

”ہاں تو تمہاری تو امی جان ہیں نا۔۔۔ ماں کی بات کے بری لگتی ہے۔“

”چلو نا۔“ رائے نے اسے ٹھورا۔ ”اب جانے بھی دو۔“

”یہ کہاں چپ رہنے والی ہے آپ! یہ تو بیت بازی کے آخر تک شعر بڑھتی ہے“ اس سے بھلا کون جیت سکا ہے۔“

”اتنے خطابات بونی تو نہیں ملے اس کو۔“ حمزہ نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

”پھر ہو جائے بیت بازی۔“ ناعمہ سب کچھ بھول کر خوشی سے اچھل گئی۔ ”ایقان خالہ بھی آئی ہوئی ہیں۔“

ماہین آئی اور رائے آئی بھی۔۔۔ بھی جمع ہیں۔۔۔ کتنا مزہ آئے گا۔“

”چلو گی۔ اس کے اسپرنگ تو کام کرنے لگے۔“ علی اطمینان سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”یہی چیک کرنے آیا تھا میں۔“

”ہو نہ۔۔۔ ڈر پور کر۔“ ناعمہ نے اسے چھیڑا۔ ”نکل گئی ساری ہوا۔“

”اُوئے۔ ڈرتے ہیں میرے دشمن اور تمہارے دوست۔“ وہ مڑا۔

”چھا۔ پھر آرہے ہو شام کو؟“

”شام کو تو پائنٹ منٹ ہے میری۔“ اس نے کالر کھڑے کیے۔ ”کل شام رکھ لو۔“

”سب تیاری کے ہمارے ہیں۔“ وہ کھلکھلائی تھی۔

”ارے تیاری کیسی؟ یہاں کھڑے کھڑے سو شعر پڑھ ڈالوں میں۔“ وہ جوش میں آگیا۔

”چھا بیٹا۔ آرام سے۔ آرام سے۔“ حمزہ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”کل شام ہی ٹھیک

ہے۔ وہ سو شعر ہم وہاں سن لیں گے۔“ وہ علی کو لے جانے لگا۔

”پھر کل شام کاروگرام پکا؟“ ورورہ نے پیچھے سے آواز دے کر پوچھا۔

”کجا!“ دونوں ہنسا کرتے باہر نکل گئے۔

”چلو اب بیٹھی صفحے کے صفحے کالے کرتی رہو۔“ رائمہ نے ہنس کر ہنس کر دیکھا تھا۔ ”ایسے ایسے خوبصورت

اشعار کی ٹانگ توڑو گی کہ پھر اصل شعر تو ذہن سے ہوا ہی ہو جاتا ہے۔ وہی تم لوگوں کے بنائے اٹے سیدھے

مصرعے ہی ذہن میں پھرتے رہتے ہیں۔“

”یہی تو ہماری کامیابی ہے!“ ورورہ کا دھیان وہیں اٹکا ہوا تھا۔ ”مائی کاروبار محسوس کرتے ہی چلے آئے ناعمہ

کو منانے۔ پھر ممانی اگر کبھی کچھ کہہ بھی دیتی ہیں تو کیا برا ماننا!“

”ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ رائمہ نے اس کی تائید کی۔ ”ہاشم، حمزہ، علی۔ یہ تینوں بھائی بالکل ماموں جان پر گئے

ہیں۔ مخلص، ہم درد اور بار مروت۔“

”ناہین آئی اور عرشہ مسمانی جان کی کاپی ہیں۔“ تنک مزاج اور مغرور۔ ”ناعمہ بیڑائی۔ دونوں بہنیں ہنس کر

اسے دیکھنے لگیں۔

”تم نہیں سدھو گی!“ ورورہ نے اس کے سر پر چپت لگائی۔

”یہ دیکھو۔“ سدھہ نے کاپی ناعمہ کے آگے کی۔

ناعمہ نے شعر پڑھا اور بے اختیار ہنس دی۔

”ویری گلد۔ ویری گلد۔“

”چٹھے چٹھڑاؤں کی!“ اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

ثانیہ اور عرشہ بڑی بے تالی سے چھت پر وارد ہوئی تھیں۔

”اُوئے تمیز۔ یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟“ عرشہ نے آنکھیں نکالیں۔

”حد ادب گستاخ!“ ناعمہ نے برا مانا۔ ”عالی جناب پر آمد کا وقت ہے۔ منہ سے کچھ بھی الٹا سیدھا نکل سکتا ہے

عرشہ شرمندہ سی ہو گئی۔ سارا صبح والی بات اسے بھی اب تنک یاد تھی۔

”چلو جلدی۔ وہ دھماچو کڑی پچھلے لان میں جمع ہے۔ خوب زور زور سے باتیں ہو رہی ہیں۔“

”ارے یا۔ ہم کل کی بیت بازی کی تیاری کر رہے ہیں۔“ سدھہ جھلائی۔ ”تم لوگوں کو جاسوسیوں کی پڑی

ہے۔“ ”اُوئے سدھو۔ بڑے مزے مزے کے راز افشا ہو رہے ہیں۔ اور تو اور عباد اور ربہز بھی آئے ہیں۔“

”ہائے اللہ!“ ناعمہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”عباد بھی آیا ہے۔ ہائے میرا دل!“

”ہائے ہائے مری جاؤں میں۔ جو وہ حال دل سے واقف ہو جائے تو۔“ وہ شرمانی۔

سب کی سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔

”پھر جماعت دعا کریں اس سے تمہارے نکاح کی؟“ سدھہ شرارت سے بولی تھی۔

”اری مراد۔“ ثانیہ نے اسے ایک دھپ لگائی۔ ”اس کا پردھوا دے۔ بڑی بہن نہیں دکھائی دیتی

تھے؟ ایک اور قہقہہ لگا۔

”چلو جی سہ ماں تو سب کی سب اس کی شہید نکلیں!“ ایک طنزیہ آواز سیڑھیوں کے قریب بنے چٹھے کے نیچے سے ابھری تھی۔

”چند لمحوں کے لیے وہ سب کی سب ہٹا بکا رہ گئیں۔ پھر آواز اور وردہ دونوں کو پہچان کر ان سب کی جان میں جان آئی تھی۔

”ہائے اللہ! وردہ آپ کی سچی ڈرا کر رکھ دیا!“ سدرہ کے حواس بحال ہوئے۔ ”آپ کب آئیں گی؟“

”میں تو کب سے یہاں بیٹھی تم سب کی کارگزاریاں دیکھ رہی ہوں۔ منہ سب کے کھلے ہوئے ہیں اور آنکھیں ساروں کی بند ہیں۔“ وہ ان کے قریب چلی آئی۔ ”اور جو میری جگہ کوئی لڑکا یہاں آجاتا تو کیا کچھ بکواس نہ سنتا؟“

”وہ نہیں آئے والے سب وہ سب پچھلے لان میں جمع ہیں۔ ابھی تو ہم ان کی موٹر گاڑیوں کا بردہ چاک کرنے جا رہے ہیں۔“ عریشہ اطمینان سے بولی۔ ”میں آپ کے کمرے کی کھڑکی کھول کر اور لائٹ آف کر کے آئی ہوں۔“

”چھپ چھپ کر دو سروں کی باتیں سننے سے اللہ منع کرتا ہے۔“ وردہ نے انہیں عقل دلانی چاہی۔

”محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔“ ناعمہ نے عریشہ کو آنکھ ماری۔

”تم محبت کر رہی ہو یا جنگ؟“ وردہ نے اسے منصوبی غصے سے گھورا۔

”ہائے!“ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”میرا درد نہ جانے کوئی۔“ سب کی کھی کھی شروع ہو گئی۔

”مجھے لگتا ہے منہ زہ آگنی سے بات کرنا ہی پڑے گی۔“ وردہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

”ہلے عباد سے تو بات کر لیں۔“ عریشہ ہنسی۔ ”وہ تو اسے ناعمہ باجی کہتا ہے۔“

”تمہیں بھی تو عریشہ باجی ہی کہتا ہے۔“ وہ چڑ گئی۔

”ہاں تو میں کب اس کے قصیدے پڑھتی ہوں۔ وہ باجی چھوڑ مجھے دادی کہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”ارے وہ تو بکا مولوی ہے۔ وہ تو مجھے بھی باجی کہتا ہے۔ حالانکہ میں تو یقیناً اس سے چند ایک سال چھوٹی ہی

ہوں گی!“ سدرہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اچھا مٹی۔ اچلو نیچے جو کچھ ہاتھ لگتا ہے وہ بھی نکل جائے گا۔“ ثانیہ نے جھٹاکر کہا۔

سب کی سب سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں۔

”اوئے۔ ادھر دے۔ سگریٹ ہے حقہ نہیں جسے تو گھنٹہ بھر گڑا لے۔“ نافع نے ہاتھ مار کر علی کے ہاتھ سے سگریٹ چھینا۔

”خدا کی قسم یار۔“ اس نے سخت برا منایا۔ ”دکش لیے ہیں میں نے۔ آدھی سے زیادہ تو اس رہبر کے بچے نے رگڑ دی۔“

”میرے کسی بچے نے سگریٹ کو ہاتھ لگایا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا۔“ رہبر نے اطمینان سے ٹانگیں لمبی کیں۔

”اچھا! پھر میں تیرے ابا کو ابھی فون گھماتا ہوں تاکہ وہ تجھے نڈا کریں۔“

”ارے اس غریب کو بھی کش لگاؤ۔ کب سے بیٹھا ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے۔“ حمزہ نے عباد کے لیے کہا۔

”ہاں ہاں لے۔ لگا دم۔ بعد میں کے گا ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم۔“ نافع نے سگریٹ اس کی جانب

بڑھایا۔

”جھی جھی کھی کھی۔“

اس کی مثال پر مخصوص قسم کا قہقہہ بلند ہوا۔

”نہ بھی۔“ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”یہ کام ہم سے نہیں ہوتا۔“

”اس کو سگار دو سگار۔ یہ سگار پیتا ہے۔“ رہبر نے طنز کیا۔
 ”سگار پیئے اپنی جیب سے۔“ علی طنزاً بولا۔ ”میں تو اسے بیڑی نہ دوں۔“
 ”کھی کھی کھی۔“

تقریباً پھر مخصوص انداز میں اچھالا لیا۔
 ”نہ بیڑی نہ سگریٹ نہ سگار۔ یہ سب تم جیسوں کے کام ہیں۔ فارغ بندوں کے۔ میں تو اس وقت سخت
 صحت مند اور شدید قسم کی نیند محسوس کر رہا ہوں۔ کس اب تو نیند چاہیے۔“ اس نے جمائی لی۔
 ”ایوں تو شب عروسی مناکر آ رہا ہے؟ سالے! نافع نے اسے ٹھوکا دیا۔
 ”کھی کھی کھی۔“ سب نے اس مذاق کو حد سے زیادہ سراہا۔
 ”اس کو ابھی سے نیند آرہی ہے علی۔ اس فلم کا کیا ہو گا؟“ رہبر نے شوخی سے پوچھا۔
 ”جائے یہ اپنے گھر۔ ہم اپنے مخصوص جوش و جذبے سے منا میں گے رات۔“ اس نے شان سے ٹانگ پر
 اٹا۔ ہمارا کرما۔

”لے آیا پھر کوئی بے ہودہ فلم؟“ نافع نے اس کا کان پکڑا۔ ”بتاؤ ہاشم بھائی کو؟“
 ”نہا کر دیکھو۔ پھر ایک ایک سین کی جھپک مانگو گے مجھ سے۔ سب سے آگے تو تم ہی بیٹھتے ہو کہ یار! میری نظر
 اندر ہے۔ مجھے دور سے صحیح طرح ہیروئن نظر نہیں آتی۔“ اس نے نافع کی نقل اتاری۔
 ”کھی کھی کھی۔“ اسے بھی شاباش ملی۔ نافع شرمندہ ہو کر سگریٹ پیئے لگا۔
 ”فلم ایسی ہے کہ بس۔ صدمے جاواں! اس نے مزید گل افشائیاں کیں۔ ”ہیرو غنڈوں کا دشمن اور ہیروئن
 پڑوں کی۔“

”کھی کھی کھی۔“
 ”یار! مجھے تو یہ انداز نہیں فہمیں زہر لگتی ہیں۔“ عباد بولا۔ ”اس سے تو بہتر آدمی انگلش مووی دیکھ لے کم از کم
 ہالی وڈ کا پلاٹ کوئی اسٹوری تو ہوتی ہے۔“
 ”چل دفع کر جب تک سات اٹھ مرتبہ ہیروئن بی بی عس صحت نہ فرمائیں ڈائریکٹر کے حسن صفائی کی تسلی
 نہیں ہوتی۔ میں تو گجرا گجرا کر دروازے کی طرف ہی دیکھتا رہتا ہوں کہ کہیں ابامیاں بھی وہاں کھڑے ہیروئن کے
 اٹالی غسل سے لطف اندوز نہ ہو رہے ہوں۔“ علی نے جل کر کہا۔

”کھی کھی کھی۔“ بقیہ سب نے تائیدی تقریباً بلند کیا۔
 ”یعنی آفتاب کے سائے میں مہتاب واہوا۔“ رہبر کو تصور سے ہی روحانی خوشی ملی۔
 ”رہبر صاحب ہو گئے ہیں بے تاب! نافع کو اس کی صورت دیکھ کر ہنسی آئی۔
 ”بحر فلم میں ان کو کیسے دیتے ہیں غرقاب۔“ علی اٹھ کر ہاتھ جھانڈنے لگا۔ ”یار حمزہ! میرا منہ سو گھ۔“
 ”کیوں؟ تو چاہتا ہے میں فلم نہ دیکھوں؟“ اس نے تیوری چڑھائی۔
 ”یہ میں نے کب کہا؟“ وہ حیران ہوا۔

”ہمیں بے ہوش کرنے کے چکر میں ہے۔“
 ”یار میں نے منہ سو گھنے کو کہا ہے، موزہ تو نہیں۔“

”کھی کھی کھی۔“
 ”سگریٹ کی بوتلوں نہیں آرہی؟۔“
 ”ارے چل نا۔ حمام میں سبھی۔ میرا مطلب ہے ایک جیسے ہیں۔“

”کھی کھی کھی۔“
 وہ سب لان کے سائیڈ سے گزر کر مرکزی عمارت تک جاتی پتی سی گلی میں کھس گئے تھے۔

”ہوں! تو یہ تھا مجرا۔“ ناعمہ نے پردہ برابر کیا اور کھڑکی بند کر دی۔

”ہانیہ نے جلدی سے لاسٹ جلائی۔“

”کیسے کیسے ہیں سارے کے سارے۔“ عریشہ نے دانت پیسے۔ ”کیسے سوئے لگا رہے تھے۔ اور امی کے سامنے یہ علی اور حمزہ ایسے بن جاتے ہیں گویا ابھی حج کر کے لوٹے ہوں۔“

”میں کسی فلم کا نام لوں تو یہ حمزہ کا بچہ کان پکڑتا ہے۔ نہ بھی نہ۔ یہ فلم میں نہیں لاسکتا۔ بڑی متنازعہ فلم ہے۔“ ہانیہ بھی سلگ رہی تھی۔ ”اور اپنے کرتوت دیکھو۔“

”اور یہ عباد اور رہبر، کیسے گول کے پورے ہیں۔ صورت دیکھو تو بندہ کلہ بڑھ لے۔“

”ارے اس عباد کو تو نہ برا کہو۔ وہ بے چارہ تو نہ سگریٹ پینے پر راضی تھا نہ فلم دیکھنے پر۔“ ناعمہ نے احتجاج کیا۔

”جی ہاں! ہانیہ طنز آہولی۔“ انگلش موویز تو میرا فرشتہ تجویز کر رہا تھا۔“

”ارے تیرا نہیں وہ میرا فرشتہ ہے۔“ ناعمہ مزے سے بولی۔

”کھی کھی کھی۔“ سب نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ان کی نقل میں ویسا ہی قہقہہ مارا۔

”اب پتہ چلا ورہ! صبح یہ علی صاحب آج رات کے بیت بازی کے پروگرام سے کئی کیوں کترارہے تھے۔“ ناعمہ کو یاد آیا۔

”کہہ رہا تھا، بڑا ضروری اپائنٹ منٹ ہے۔ دیکھ لیا ضروری اپائنٹ منٹ؟ کپڑوں کی دشمن ہیروئن کا دیدار کرے گا تین گھنٹے۔“

”تو یہ تو یہ۔“ سدرہ نے کان پکڑے۔

”ویسے لایا کون سی فلم ہے؟“ عریشہ نے سُن گُن بی۔ ”کل تلاشی لیں ان کے کمرے کی؟۔“

”اب نجائے کون سی نکل آئے یا ر! خود سے بھی انسان شرمندہ ہو۔ دفع کرو۔“ ورہ نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا اور بے زاری سے بولی۔

”اس کا تو ان لوگوں کے اس جاسوسی پروگرام میں شریک ہونے کا بھی کوئی ارادہ نہ تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اسی کے کمرے کی کھڑکی پچھلے جانب پھیلے اس وسیع وعریض اور آجائز قسم کے لان میں کھلتی تھی جہاں بیٹھ کر یہ لڑکے اپنی محفل جمایا کرتے تھے۔ ان کے وہ ہم گمان میں بھی نہ ہوتا تھا کہ ان کی اس قسم کی جاسوسی بھی کی جاسکتی ہے۔“

”یوں بھی ورہ اپنی سنجیدہ طبع اور شائستگی کی بنا پر پورے خاندان میں علیحدہ ہی نظر آتی تھی۔ اس سے کسی بھی لڑکے کو یہ توقع ہو ہی نہیں سکتی تھی۔“

”ارے تو ہم کون سا دیکھ رہے ہیں۔ بس یہ دیکھنا ہے کہ فلم کی ہیروئن کون ہے۔“ عریشہ کو گرا تجسس تھا۔

”نہ ویسے ہم دیکھ بھی لیں تو کیا ہے؟ وہ لڑکے ہو کر دیکھ سکتے ہیں تو ہم لڑکی ہو کر بھی اپنی ہم جنس کو بے پردہ نہیں دیکھ سکتے کیا؟“ ہانیہ نے تنک کر تکتہ اٹھایا۔

”جی نہیں! ورہ نے منہ بنا کر کہا۔“

”چلو ہم کھونگھٹ نکال کر دیکھ لیں گے۔ پردے کی اوٹ سے!“ ناعمہ نے حل پیش کیا۔

”گویا دیکھو گی ضرور!“ ورہ بھنائی۔

”بالضرور!“ کورس میں جواب آیا۔

”کھی کھی کھی۔“ وہ پھر شروع ہو گئیں۔

شادی کے بعد کی زندگی کے لیے کتنے خواب دیکھتی ہیں لڑکیاں! اس نے دھیرے سے گلاب کے پیلے پھول کی منخیں پتی کو چھوا۔ ”اور شادی کے بعد، بے فکری اور البہن کے افسانوں سے سچی زندگی خواب و خیال ہو جاتی ہے۔ شادی سے پہلے مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجے ہوتے ہیں اور شادی کے بعد ماضی کی زندگی دور آسمان

اڑتے ہلکے ہلکے سفید روئی کے گالوں جیسے بادلوں کی طرح دوسرے سے دور اور خوبصورت نظر آتی ہے۔
 ”کیا بات ہے خالہ جان!“ رائمہ نے ہنس کر اس کے صبیح چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو دیکھا۔ ”آج بڑا یاد کیا جا رہا ہے شادی سے پہلے کی زندگی کو؟ خیریت تو ہے؟“

”ماموں جو آئے ہوئے ہیں۔“ ماہین شرارت سے بولی۔
 رائمہ کو بہت زور سے ہنسی آئی جبکہ ایقان ملاستی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”دیری فنی ماہین!“ پھر وہ شکایتی انداز میں بولی۔ ”اس سے گھٹیا مذاق اور کوئی نہیں ملا کرنے کے لیے؟“
 ”سوری۔ سوری ڈیر پچھو۔“ اس نے دونوں ہاتھ اپنے دفاع میں اٹھادیے۔ ”اب میں زبان کو لگا مہوتی ہوں۔
 ہنسی ایک خیال سا آگیا تھا ویسے کتنا ترپایا ہے آپ نے میرے سیدھے سادے سے ماموں کو۔ بے چارے اب ملک بھنوں بنے پھرتے ہیں۔“

”سیدھے سادے؟“ ایقان نے آنکھیں نکالیں۔ ”مائی گاڈ! کہاں سے سیدھے ہیں وہ۔ صرف چلتے ناک کی بدھ میں ہیں۔ بھینے کی مانند ڈکراتے ہوئے۔ سامنے آجانے والا اپنا دفاع خود کرے تو کرے ان کی طرف سے کوئی گارنٹی نہیں۔“
 ”رائمہ کو ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو گیا جبکہ ماہین اب شکایتی انداز میں ایقان کو دیکھنے لگی تھی۔
 ”پچھو!“

”فرمائیے!“ وہ بے نیاز بن گئی۔
 ”کسی چاہنے والے کے جذبات کا کچھ خیال کر لینا چاہیے۔ بے شک جواب میں چاہت نہ دیں کہ یہ دل کے معاملات ہیں لیکن اس طرح کے بے مروتانہ القاب! یعنی آپ نے ان کو بھینسا بنا ڈالا؟“ رائمہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔
 ”کسی بھینے سے کم ہیں وہ؟“ ایقان اپنے الفاظ واپس لینے پر تیار ہی نہ تھی۔
 ”کوئی بھینسا کسی سے اس قدر بے لوث محبت کر سکتا ہے؟“
 ”کسی نہ کسی بھینس سے کرنا ہی ہو گا۔“
 اب ماہین بھی ہنس دی۔

”سوچ بیچھے یہاں تو پھر بات آپ پر ہی آتی ہے۔“
 ”جی نہیں!“ اس نے منہ بتایا۔ ”مجھے تو معاف رکھو۔ اپنی، ونے والی مامی کو ذہن میں رکھو۔“
 ”کہاں تیار ہوتے ہیں اب وہ۔“ ماہین کو نئے صدقات لاحق ہونے لگے۔ ”کتنے برس بیت گئے آپ کی شادی ہو۔ لیکن ماموں۔“

”ماہین!“ ایقان آخر کار زنج ہو گئی۔ ”فار گاڈ سیک!“
 ماہین اور رائمہ چونکہ اس کی تقریباً ”ہم عمر تھیں اس لیے ہر طرح کے موضوعات پر آپس میں بحث کر لیا کرتی تھیں ورنہ باقی افراد تو ایقان کے سامنے یہ موضوع نکالنے ہی نہ تھے۔
 ماہین ہی کبھی کبھار اپنے ماموں کی حالت زار پر ترس کھا کر کوئی نہ کوئی ذکر نکال لیا کرتی تھی۔ ایقان یا تو اپنے مخصوص مزاح سے پُرسنجیدگی سے کوئی جواب دے دیا کرتی یا پھر تنگ آکر اسے ڈانٹ بھی دیا کرتی تھی۔ یعنی کبھی وہ اس کی ہم عمر دوست بن جاتی اور کبھی پچھو بیچی کا رشتہ استوار کر دیتی۔ ضرورت کے مطابق رویہ اختیار کرنے میں اسے مہارت حاصل تھی۔ ماہین کے ساتھ کبھی کبھار پچھو بننے کی ضرورت اسے محض ماہین کی بچکانہ طبیعت اور تنگ مزاجی کی وجہ سے پڑتی تھی لیکن رائمہ کے ساتھ اس کی مثالی انڈر اسٹینڈنگ تھی ان دونوں کے درمیان دوستی ہی دوستی تھی۔ خالہ بھانجی کے تسکفات میں وہ نہ پڑتی تھیں۔ صرف اتنا تھا کہ رائمہ اسے ایقان خالہ یا خالہ جانی کہا کرتی اسی طرح ماہین بھی اسے پچھو کہتی تھی۔ درحقیقت ان تینوں کی عمولوں میں چند برسوں کا ہی فرق تھا۔

تینوں آج کئی دنوں کے بعد ایک جگہ اکٹھا ہو جانے کا لطف اٹھا رہی تھیں۔ ماہین اور رائمہ بھی اپنے اپنے سرگرمیوں سے چند دنوں کی رخصت لے کر آئی تھیں اور ایقان بھی گھر کی تنہائی سے آتا کر کچھ روز کے لیے چلی آئی تھی۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ وہ یوں بے فکری سے ملا کرتیں۔

”یاد ہے پھوپھو! آپ کو لانا کے گانے کتنے پسند تھے۔“ ماہین کو زیر لب گنگناتے ہوئے اچانک یاد آیا۔ ”اسکول“ کالج کے زمانے میں آپ ہر وقت لٹا لٹا کر رہتی تھیں۔ گریجویٹ کی لمبی دوپٹوں میں ”پ“ لکھیوں کے جھو کوں سے تجھے دیکھا جو سانور سے۔“ بار بار ریو اینڈ کر کے سنا کرتی تھیں۔ اور۔ اور۔ وہ کون سا تھا آپ کا من پسند گانا؟ وہی جو راگھی پر پکچر اترتا تھا؟“

”دل تو ہے دل دل کا اعتبار کیا کیجئے۔“ رائمہ نے فوراً یاد دلایا۔

تینوں ہنس پڑیں۔

”اب بھی سنتی ہیں لٹا کو؟“ ماہین اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”ارے کہاں! چند ایک کمیشنس یہاں سے لے گئی تھی، عاشر نے وہ مذاق بنایا کہ حد نہیں۔ کہنے لگا، یا راتم تو بہت اولڈ فیشن ہو۔ بلیک اینڈ وائٹ فلمیں پسند کرتی ہو، لٹا اور نور جہاں کو سنتی ہو۔ سچ بھتاؤ، تمہاری عمر وہی ہے جو تم نے نکاح کے وقت نکاح سے پردہ کرنا ہی ہے یا پھر یہ حسین زلفوں کی سیاہی ”کالا کولا“ کی دین ہے!“

اس نے جلد بھنے سے انداز میں تفصیل سے بتایا۔ ماہین اور رائمہ بڑی دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

عاشر کے جانے کے بعد میں نے بڑے شوق سے چند ایک رومانوی گانوں کے کیسٹس لیے کہ جدائی کا لطف دوایا ہو جائے گا۔ آہائے عاشر نہیں تھے تو کیا ہوا۔ ان کی اولاد تو ہے نا۔ مومن صاحب نے سب کیسٹوں کے ریل نکال نکال کر پورے گھر میں پھیلا دیے۔“

تینوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

مرکزی گیٹ پر کسی کی آمد نے اچانک ہی تینوں کی توجہ اس جانب مبذول کر دی۔

دو خواتین اندر داخل ہو رہی تھیں۔ ساتھ میں ایک چارپاچ سالہ بچہ بھی تھا۔

”یہ کون ہیں؟“ ایقان کو الجھن ہوئی۔

فاصلہ قدرے زیادہ تھا اس لیے انہیں پہچاننے میں دشواری ہو رہی تھی لیکن جوں جوں وہ قریب آتی گئیں ان تینوں کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

آنے والیوں سے وہ تینوں ہی بڑی گرمجوشی سے ملیں۔

”شہلا!۔۔۔ کتنی خوشی ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر، بتا نہیں سکتی۔“ ایقان نے اسے بانسوں میں بھر لیا۔ ”اور یہ انیقہ! کتنی کیوٹ ہو رہی ہے! تقریباً“ سال بھر بعد مل رہی ہوں تم لوگوں سے۔ ہائے اللہ! یہ کتنا پیارا ہو گیا ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔ عیر ہے نا!“

وہ بہت پر جوش ہو رہی تھی۔

”بہت عرصے بعد مل رہے ہیں تو جناب! اس میں سراسر آپ کا اپنا قصور ہے۔ آپ تو جناب عاشر حسین صاحب کو ایسی پیاری ہو میں کہ پیچھے رہ جانے والے بھی ”پیارے“ آپ کے ذہن سے محو ہو گئے۔“ شہلا نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا۔

”ارے نہیں! قسم سے ایسی کوئی بات نہیں۔ بس یہ زندگی خانم ہی اتنی تیز طرار ہو گئی ہیں کہ کیس تلی سے بیٹھ کر فراغت سے جی بھلانے کا کوئی موقع ہی نہیں دیتیں۔“

”جیسا کہ اس وقت بھی آپ بہت مصروف نظر آ رہی ہیں۔“ شہلا نے اسے گھور کر طنز کیا۔

”چھانٹا۔۔۔ اب جانے بھی دو۔“ ایقان نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”قسم لے لو بہت یاد کرنی ہوں ساری سیلیوں کو۔ اور سب سے زیادہ جہیں!“

شہلا مسکرا دی۔

”عباد نے رات بتایا تھا کہ ایقان آپ کی ہوئی ہیں۔“ انبیہہ کہنے لگی۔ ”صبح سے آپ کی انتظار میں تھیں کہ شاید آپ کا کوئی پیغام آئے یا آپ خود ہی آجائیں ملنے کے لیے۔ اب اس وقت ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو یہ خود ہی بلی آئیں۔“

”اچھا! عباد آیا تھا رات کو؟ مجھے تو نہیں ملا۔ ورنہ میں ضرور تمہیں پیغام بھجواتی!“ ایقان بولی۔ ”میں تو کب سے تم سے ملنے کو ترپ رہی ہوں۔“

شہلا اپنے مخصوص انداز میں مسکراتی رہی۔

”اور انبیہہ! تم اپنی سناؤ۔ کیا کر رہی ہو آج کل؟“ ایقان نے دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا ساڑھے پانچ سقند والی گوری جی انبیہہ سے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”میں میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہوں ایقان آپ کی یعنی مستقبل کی میچا!“ وہ شوخی سے مسکرائی ان لوگوں کی بات پر ہنستے ہوئے رافع اور ہاشم ٹھک کر رک گئے۔

”مبارک ہو تجھے!“ رافع نے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”تیری آنکھوں کے قہقہے روشن ہونے والے ہیں یا شاید چلے۔“

”ٹٹی! اچپ“ ہاشم نے گھبرا کر اسے ڈانٹا۔

”اجازت ہو تو ہم آجائیں؟“ وہ دونوں وہیں سے پوچھنے لگے۔

”ارے ہاشم! رافع۔۔۔“ ایقان چونکی۔ ”آجاؤ۔ تم لوگوں سے کون پرہہ کرتا ہے۔“

”ان کی نگاہیں۔۔۔“ رافع کی زبان میں پھر ٹھکی ہوئی۔

ہاشم نے اس کا ہاتھ دبا کر تنبیہ کی۔

دونوں آگے بڑھ آئے۔

”آپ لوگ کب آئیں؟“ ہاشم ان لوگوں سے خوش دلی سے پوچھنے لگا۔

”بس۔۔۔ ابھی!“ مختصر سا جواب ملا۔

”مارا پچھو۔ دھماچو کڑی نے پیغام بھیج دیا ہے، رات کو بیت بازی کا مقابلہ ہے۔“ حیاتِ ولا کے اذلی متصادم ہم کا۔“ رافع اسے بتانے لگا۔

”اچھا!“ ایقان خوش ہوئی۔ ”مزہ آئے گا۔“

”اپنے وقت پر پہنچ جائے گا پچھلے لان میں“ آپ سب خواتین۔“ اس نے حاضرین پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔

”ضرور ضرور۔۔۔“ ماہین اور رائنہ بھی جوش سے بولی تھیں۔

”آپ لوگ بھی شامل ہوں۔“ ہاشم نے ایک مرتبہ پھر انہیں مخاطب کیا۔ ”انجوائے کریں گی۔“

”ایسیں گے۔“ مسکرا کر کہا گیا۔

”دونوں اپنے قدموں پر پلٹ گئے۔“

”ضرور آنا شہلا! ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاؤ گی۔ یہ شیطان ایسی ایسی پھبتیاں کہتے ہیں ایک دوسرے پر۔ بڑا ہوتا ہے۔“

”وعدہ نہیں کرتی ایقان! یہ عمر اپنے روٹین ٹائم پر سونے کا عادی ہے اور ضد کرتا ہے کہ میں ہی اسے کہانی سنا کر اداں۔“

اس نے محبت سے بیٹے کی پیشانی پر سے بال سیٹے۔

”اپنی خالہ سے تو اس کی بالکل نہیں بنتی۔“ انبیہہ نے اس کے چپٹ لگائی تھی۔



اس بڑی بہت بڑی عمارت میں اندھیرا تھا۔

ایسا اندھیرا نہ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھٹائی نہ دے۔ بس ایسا سماں تھا کہ ہر شے کے دھندلے دھندلے نقش بھٹائی پڑتے تھے۔

وہ آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ ایک لمبی راہداری تھی جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اس راہداری کے دونوں جانب کمرے تھے۔ وہ آہستہ روی سے چلتے ہوئے ایک کمرے تک پہنچتی۔
 دادی کی آواز آئی۔

”ریبیجہ۔۔۔ یہاں آؤ۔۔۔ ریبیجہ۔۔۔ یہاں آؤ۔“

وہ اس امید پر کمرے میں جھانکتی کہ شاید دادی کی آواز اسی کمرے سے آ رہی ہے۔ لیکن ہر بار اسے کمرہ خالی ملتا۔

وہ پھر آگے بڑھ جاتی۔

پھر وہ کتنی دیر اندھیرے میں چلتی رہتی تاوقتیکہ اگلا دروازہ آجاتا۔

دادی کی آواز پھر قریب آجاتی۔ تھراتی ہوئی کانپتی ہوئی ’لرزتی ہوئی آواز۔۔۔ وہ بے چینی سے آگے بڑھتی۔ کمرے میں جھانکتی مگر کمرہ خالی ہوتا۔

یونہی چلتے چلتے وہ تھک کر چور ہو گئی۔ اس کے تلووں تلے چھپا ہٹ آگئی۔ اس کے کانڈھے ٹوٹنے لگے۔ تب اس نے دیکھا۔

راہداری کے اختتام پر ایک کمرہ تھا۔ وہ ایک تاریک کمرہ تھا۔ اس میں بالکل روشنی نہ تھی۔ دادی کی آواز شاید اسی کمرے سے آ رہی تھی! شاید!

وہ اس آخری امید پر آگے بڑھی۔ وہ ہر صورت اپنی دادی سے ملنا چاہتی تھی۔ وہ کب سے ان سے نہیں ملی تھی۔ اس نے کب سے دادی کو نہ دیکھا تھا۔ وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔

”ریبیجہ۔۔۔ آؤ۔۔۔ ریبیجہ۔۔۔ آؤ!“

آواز اسے بلاتی گئی وہ کھنچتی چلی گئی۔

وہ کمرے کے دروازے پر جا رہی۔

اندھیرا گہب اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھٹائی نہ دیتا تھا۔ وہ اندر داخل ہو گئی۔ اچانک وہ ٹھٹک کر رہی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ اس کی نگاہیں آہستہ آہستہ کمرے کے اندھیرے سے مانوس ہو رہی ہیں۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کمرے میں موجود چیزوں کو دیکھ سکتی ہے۔ لیکن کمرہ تو خالی تھا۔ کمرے میں تو کچھ بھی نہ تھا۔

پھر دادی کہاں تھیں؟ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

”دادی۔۔۔ دادی کہاں ہیں آپ؟۔“

اچانک ہر منظر واضح ہو گیا۔ کمرہ آپ ہی آپ تیز روشنی سے بھر گیا۔

تب ریبیجہ نے دیکھا۔

خالی کمرے کے ایک کونے میں ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ وہ اسے پہچان نہ سکتی تھی۔

ریبیجہ کو اس تنہا خالی کمرے کی اس واحد مکین سے خوف محسوس ہوا۔

آخر وہ کون تھی۔

اس عورت نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ ریبیجہ کے لبوں سے چیخ نکل گئی۔ اس کا چہرہ جھلسا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں۔۔۔ سرخ آنکھیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں بے بسی تھی۔ التجا تھی۔

”ریبیجہ! میرے پاس آؤ۔۔۔ ریبیجہ!“ وہ بولی۔

ہاں! وہ دادی کی آواز تھی۔

ربیعہ نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ اس کی دادی تھیں۔
”ربیعہ!“

وہ پلٹ کر بھاگی۔ بے تحاشا بھاگی۔

”ربیعہ! پیاس لگی ہے ربیعہ! بہت پیاس لگی ہے۔“

”دادی کی آواز اس کا تعاف کر رہی تھی۔“

اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایک جھٹکے سے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

وہ بے تحاشا ناپ رہی تھی۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔ آنسو خود بخود اس کی آنکھوں سے نکل رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھگور رہا تھا۔

”جی علی الافلاح۔ جی علی الافلاح۔“

دور سے مؤذن کی آواز آرہی تھی۔ ربیعہ تادیر گو گو کی کیفیت میں گھری بیٹھی رہی۔

رات آٹھ بجے جب گھر کی سربراہ خواتین لی۔ وی کے آگے براجمان تھیں۔ ان کے گروہ پچھلے لان میں جمع ہو گئے۔

”انار کلی سپائیں باغ میں ہمارا تخت شاہی سیٹ کروادیا ہے؟“ علی ناعمد سے پوچھنے لگا۔ اس نے ناک چڑھا کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”ذرا آئینہ دیکھیے جہاں پناہ۔ آپ شاید لاہور کی فوڈ اسٹریٹ پر بیان بیچتے ہیں۔ وہ بی ہیں نا؟“

”اوپ ہوں!“ وہ جھلا گیا۔ ”کوئی ادبی کنیر لگتی ہے۔ انار کلی تو ایسی بات تمہیں کر سکتی۔“

لڑکیاں اس کی گت بننے پر زور سے ہنس دی تھیں۔ وہ جھپکے سے ان کے پیچ سے نکل گیا۔

کچھ ہی دیر میں تقریباً ”بھی وہاں جمع ہو گئے تھے۔ اجازت ویران جگہ محفل کا منظر پیش کرنے لگی۔“

سب نے اپنی اپنی جگہیں سنھال لیں۔

ایقان کو انہوں نے کرسی پر بٹھا کر حج کے فرائض سونپ دیے تھے۔

”ہاں بھئی۔“ وہ بے حد خوش نظر آئی۔ ”میر غالب، مشیر فیض۔۔۔ بھی دکھائی دے رہے ہیں۔“

”یہ شاید دہلی کی آخری شمع“ پڑھ کر آرہی ہیں۔۔۔ حمزہ منمنایا۔

”جب کرا“ ہاتھ نے اسے چپت سے نوازا۔

”ہم آجائیں؟“ کسی نے اجازت مانگی تھی۔

سب ہی نے گردنیں ہٹائیں۔ عباد اور رہبر بھی پہنچ چکے تھے۔

لڑکیوں والی دری پر ایک کونے سے دوسرے کونے تک لپچل چھ گئی۔ سرگوشیاں اور دہلی دہلی ہنسی کی آوازیں بلند ہوئیں۔

”ارے بھئی عباد! کہاں ہوتے ہو۔۔۔ تمہیں دیکھے تو مدتیں ہو گئیں۔“ ایقان نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔

”ماشاء اللہ! بڑے ڈیشننگ ہو گئے ہو۔“

”ماشاء اللہ! ماشاء اللہ۔“ غالباً ”ناعمد کی سرگوشی تھی۔“

اسے ٹانہ سے ایک ٹوک ملا۔ بیک وقت ہنسی اور کراہ کی دہلی دہلی آوازیں آئیں۔

”اور رہبر تم سناؤ۔ تم کیسے ہو؟“

”یہ بس ٹھیک ہی ہیں۔ ان کے نمبر کٹ جاتے ہیں نا!“ سدرہ منمنائی۔ پھر دہلی دہلی ہنسی دی۔

”وہ دونوں بھی سرگوشیوں کے تسلسل سے کنفیوژن کا شکار ہو کر ایقان سے ہوں ہاں، میں ہی بات چیت کر رہے تھے۔“ شہلا اور انفقہ نہیں آئیں؟“ رائمہ نے عباد سے پوچھا۔ ”خالہ جانی نے کتنا اصرار کیا تھا۔“

”شہلا باجی تو عمر کو پڑھا رہی تھیں۔ انہی کی کوئی دوست آئی ہوئی ہے۔“
 ”ہائے ہائے“ رابع نے ہاشم کے کان میں کہا۔
 ”کیا ہے؟“ وہ جھلایا۔ ”کیا پھونکیں مار رہا ہے میرے کان میں۔“
 ”دوسرے کان پر ہاتھ رکھیں ہاشم بھائی۔“ ہوا لگے کی۔ ”کہیں سے مشورہ آیا۔ ایسی ہی بے سسکی اور بے سر باتوں میں انہوں نے کتنا ہی وقت نکال دیا۔ آخر کو ناعمہ نے پہلا شعر ہاشم پر داغا۔ یوں بھی اسے فردوس بیگم سے کل صبح کا شکوہ تھا۔“

”ہاشم بھائی! وہ گلا صاف کر کے کھنکھاری۔“ ذرا توجہ کیجئے۔ ممانی جان آپ کے متعلق کیا کہتی ہیں۔“
 ہاشم سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کھپائی متوقع تھی۔
 میں کس کے روپ میں اپنی ہو تلاش کروں۔
 بسھی کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ فردوس بیگم ایک طویل عرصے سے ہاشم کے لیے لڑکیاں دیکھ دیکھ کر مستر کر رہی تھیں۔ ناعمہ کی چوٹ صاف تھی۔

میں کس کے روپ میں اپنی ہو تلاش کروں
 کسی لڑکی کو گھر لانے کو نہ یہ دل مانے
 ”واہ واہ۔۔۔ بھئی واہ۔“ یقین نے واہ دی۔

وہ خود بھی بڑی بھاونج کی اس روش سے پریشان تھی۔
 ”چلو بھئی لڑکو! جواب دو۔“
 ”ایک شعر ماہین آپنی کے لیے۔“ علی نے گلا صاف کیا تھا۔
 ”خبردار علی! اس نے آنکھیں نکالیں۔“
 ”نہ بھئی نہ۔ یہ نہیں چلے گا۔“ یقین نے فوراً ہی جج کے فرائض نبھائے۔ ”اس محفل میں کسی پر بھی چوٹ ہو سکتی ہے۔ یہ محفل کا اصول ہے۔ کسی کو برا ماننے کی اجازت نہیں۔ چلو بھئی علی! سناؤ شعر۔“
 ”عرض کر رہا ہوں۔“

یہ اور بات ہے موٹی ہوئی ہے آج مگر
 وہ کل تلک بہت اسارٹ تھی ”ہوا“ نہ کہو
 عباد اور رہا راتا ہے کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے ماہین خفت سے مسکراتی رہی۔
 یہ اور بات ہے موٹی ہوئی ہے آج مگر
 وہ کل تلک بہت اسارٹ تھی ”ہوا“ نہ کہو
 اب اس کو آندھی و طوفان سے ہی نسبت ہے
 کہو تنہیم سے اب اس کو تم صبا نہ کہو
 علی نے پوری رباعی کہہ ڈالی۔ لڑکے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ لڑکیوں کے لبوں پر بھی دبی دبی مسکراہٹیں تھیں۔ (ماہین کے میاں کا نام تنہیم تھا۔)
 ”تم بھی مسکرا رہی ہو۔“ ماہین نے ان سب کو مشترکہ ڈانٹ پلائی۔ ”کچھ شرم کرو! ذاتیات کو نشانہ بنارہے ہیں یہ خبیث۔۔۔ جواب زوردار قسم کا۔“
 اس کی اپنی شاعری بہت کمزور تھی۔
 ناعمہ کو چچ کا جوش چڑھ گیا۔

”ہاں بھئی۔۔۔ واؤ۔۔۔ واؤ۔۔۔“ یقین کہہ رہی تھی۔
 ناعمہ نے با آواز بلند شعر لڑکوں کو گھورتے ہوئے پڑھا۔

بے پروا
بیکم سے

“U”

لیکھ کر مسترد

حمزہ سرکھانے لگا۔ جذبات میں آکر پہلا مصرع تو گھڑ لیا تھا۔ اب کچھ بھائی نہ دیتا تھا۔

”اوسے لڑکیوں نے شور اٹھایا۔“

”ایک سو“

بالا خروہاں شعر تیار ہو گیا۔

”واہو! سچا اللہ۔۔۔ بھئی کمال کریا۔“

ثانیہ منسکراتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

ثانیہ منسکراتی ہوتی کھڑی ہوتی۔

اس کا مطلب یہ ہے دعویٰ ہمارا سچا ہے

”واہیہ واہیہ“ اب کہ لڑکیوں نے شور مچایا۔

”ایک شعر ہم سے بھی سنو بھی۔“ اچانک ایک بھاری آواز گونجی۔

”ایک شعر، ہم سے بھی سنو بھی۔“ اچانک ایک بھاری آواز گونجی۔

عائد نکلا تو ہم نے وحشت میں

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں

جس کو دیکھا، اسی کو جوم لیا

رس کے معنی جسے نہیں معلوم

ہم نے اس رس بھری کو چوم لیا

پھول سے ناپتے ہیں ہونٹوں پر

جیسا کہ سچ مجھ کو کسی کو چوم نیا

وہ جیسے لٹے کی کیفیت میں تھا۔

ایقان کا وہ حال تھا کہ کاتو تو بوند بھر لہو نہ نکلے۔ اس کے گال سرخ انگارہ ہو گئے۔ کانوں کی لوس گرم ہو گئیں۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔ سب ہی لوگ دم بخود بیٹھے رہ گئے تھے۔ آخر

و متے چھامتے چلے جا رہے تھے۔

کے پاس کھڑی وہ ہمارے دیکھ رہی تھی۔

ابھی ابھی ہاشم اسے گھر چھوڑ گیا تھا۔ اندر جاتے ہی اس نے اپنا بیگ اٹھایا تھا۔ بچوں کو لے کر اور اماں کو بتا کر وہ کسی سے بھی ملے بغیر اپنے فلیٹ پر آگئی تھی۔

اس منحوس شخص کی موجودگی میں وہ وہاں مزید رکنا نہ چاہتی تھی۔ آٹھ برس پہلے کی بات اس کے حافظے میں اسی طرح محفوظ تھی جیسے کل کی بات ہو۔ البز، بے فکری سے دو چوٹیاں سینے پر ڈالے وہ بسن کے پورشن سے واپس اپنے پورشن کی طرف آ رہی تھی۔

رستے میں وہی پچھلا لان بڑا تھا۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ اپنے ہی گھر میں ہونے کے محفوظ و مامون احساس میں گھری وہ بڑی بے فکری سے خراں خراں چل رہی تھی۔ جب کسی نے اچانک اسے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔ اس نے ہراساں ہو کر چیخا چاہا تو چیخنے کا ذریعہ مسدود کر دیا گیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ بے بسی میں گھری رہی پھر پورا زور لگا کر اس نے خود کو آزاد کیا اور تباہی دیکھ بھالے اندر دوڑ لگا دی تھی۔

وہ واقعہ اب تک اس کے خون میں نفرت اور کراہیت کے الاؤ بھڑکا دیا کرتا تھا۔ جب کبھی اسے یہ بات یاد آجاتی تو غصے سے اس کا رواں رواں چہرہ اٹھتا۔

”آئی ہیٹ یو۔ آئی ہیٹ یو۔ قابل نفرت ہو تم۔ زمین کا بوجھ۔“ فون کی تیل نے اسے گہری سوچ سے چونکایا۔ سانسوں کا ردھم بگڑا ہوا تھا۔ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اس نے فون اٹھایا۔

”ہیلو!“ دوسری جانب اس نے قدرے تیز آواز میں کہا۔
”کیا موٹی ہو گئی ہو؟“ دوسری جانب سے پوچھا گیا۔ ”گلتا ہے رسی کو دکر آ رہی ہو۔ خیر تو ہے جان من!“
”وہ۔۔۔ عاشق!“ وہ آواز پہچان کر قریبی کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔



عاشق کی آواز سن کر نجانے کیوں اس کا جی بھر آیا تھا۔ چند لمحوں میں موٹے موٹے آنسو اس کے چہرے پر پھیلنے لگے۔ دوسری جانب سے وہ اسے پکار رہا تھا۔

”یقان۔۔۔ یقان۔۔۔ کہاں گم ہو گئی ہو یا ر!“
”عاشق!“ اس کے گلے میں پھندے سے پڑنے لگے۔
”فوف۔۔۔ بولو تو سہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”تم آتے کیوں نہیں؟“ وہ بھی جھٹا کر بولی۔ ”کب تک تمہاری آواز اور تمہارے بھیجے ہوئے نوٹوں سے خود کو تسلیاں دیتی رہوں۔ میرے اندر آگ سی بھڑکنے لگی ہے اب۔“
”اوہ۔۔۔“ وہ ہنس دیا۔ ”کتنا اچھا لگتا ہے یہ سب کچھ سننا۔“
”میں جل رہی ہوں، تمہیں مزہ آ رہا ہے۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”ارے جانم! ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سخت سردی میں آتش دان کے قریب بیٹھا ہوں اور تمہارا یہ غصہ اوہو۔۔۔ غصہ ڈھاتا ہے۔ گویا ساتھ میں بلیک کافی بھی ہے۔“ تنخ پر لطف ڈالتے۔ ”وہ خاموش ہو گئی۔
جانتی تھی جتنا اپنے غصے کا اظہار کرتی اسے اتنا ہی مزہ آتا۔

”بولو خاموش کیوں ہو گئیں؟“
”نہیں بولتی بس۔“

”اچھا، میرے بچے کیا کر رہے ہیں؟“
”سورہے ہیں۔“

”اور بیوی؟“ وہ پھر خاموش ہوئی۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی شرارت کے موڈ میں تھا۔ وہ اس کے غصے کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا۔

”بہت خوش ہو گیا بات ہے؟“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”ارے واہ بیوی ہو تو ایسی۔ دل کے۔ سندرم میں بلا خوف و خطر ڈبکی لگا دیتی ہے اندر کی بات دھونڈلاتی ہے۔ میں اتنی بہت خوش ہوں۔“

”کیوں، کسی چابی لڑکی نے رشتہ بھیجا ہے؟“ وہ طنز پر بولی۔

”ہا ہا ہا۔۔۔“ وہ ہنس دیا۔ ”جی ہم، ”غزالی مئے“ کے رسیا ہیں، جام پر جام چڑھانے کے قائل۔ چھوٹے چھوٹے ”تھہ نٹوں“ سے ہمارا کام نہیں بنتا۔“ ایقان اس کی بات سمجھ کر بے ساختہ ہنس دی تھی۔

”بس آگئی مسکان لیوں پر۔“ وہ اسے چھپڑنے لگا۔ ”یارا یہ تم خواتین بھی کیا چیز ہوتی ہو۔ ذرا سی تعریف کیلے کا ہمارا ثابت ہوتی ہے۔ لمحہ بھر میں پھسل کر چاروں شانے چت۔“

”جی نہیں ایسی بھی بات نہیں۔ روٹھنے پر آجائیں تو جان لے کر بھی نہ مانیں۔“ وہ بے نیازی سے گویا ہوئی۔

”ارے باپ رکے۔ تم تو چابیانی عورتوں سے زیادہ ظالم ہو بھی۔ یہ تو یونہی مشہور ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ تعجب سے بولی۔ ”کیوں مشہور ہیں کیا ظلم کرتی ہیں؟“

”خود رشتہ ہی نہیں بھیجتیں۔“ ”مہمانی کیوں“ کا انتظار کرتی ہیں۔“ وہ مزے سے بولا۔

”ہائیں یہ“ ”مہمانی کیوں“ کیا بلا ہے؟“

”ارہ جلد میرے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”اچھا۔ تو جلد ارہ جلد ہی سہی۔ آپ پہل کیجئے نا۔ کیا خبر کہیں سے مثبت جواب آئے۔“ وہ جل ہی گئی۔

”نہیں یار! تمہیں تو پتا ہے، مابدولت تو میرے قائل ہیں۔ پتا ہے نا؟۔“ اسے پھر ہنسی آگئی تھی۔

”عاشق۔ قسم سے بہت فضول باتیں کرتے ہو تم۔“ ”انتابل تم ان فضول باتوں کے لیے ہی بھرتے ہو۔“

”اچھا۔ چلو پھر کام کی بات کرتے ہیں، آج کیا تاریخ ہے؟“

”آج۔“ اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ”بارہ۔“

”ہوں۔“ بارہ۔ اور چار دن بعد کیا تاریخ ہوگی؟“

”سولہ۔“ وہ الجھ گئی۔

”سولہ نہیں جان من سترہ، تمہارا داغ تو میری جدائی میں بہت کمزور ہو گیا ہے۔ میں سترہ کو پہنچ کر ٹھیک کرتا ہوں۔“ وہ شوخی سے بولا تھا۔ ایقان کا اوپر کا سانس اوپر نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ کچھ دیر کے لیے اس سے کچھ بولا

”انہ جاہ کا۔“

”عاشق۔ عاشق۔ سچ کہہ رہے ہو، تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو۔“

”تمہاری قسم۔“

”میں۔ میں۔ اف۔ عاشق۔ میں کتنی خوشی محسوس کر رہی ہوں، کیسے کہوں۔“

”تم نہ بھی کہو تو کیا ہے۔“ وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ ”تمہاری ساسیں کہہ رہی ہیں، تمہاری آنکھیں کہیں گی اور میں ان آنکھوں سے چھلکتی ساری خوشی اپنے اندر اتار لوں گا۔ میرے فون کا انتظار کرنا، میں تمہیں فلائٹ کفرم

لر کے ٹائم ٹاؤں گا، ٹھیک۔“

”ہوں۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”پھر ملتے ہیں، چار دن بعد۔“ وہ پھر شوخ ہوا تھا۔ ”خدا حافظ۔“

”خدا حافظ۔“ اس کے لب آہستہ سے ہلے تھے۔

دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

ایقان ریسیور ہاتھ میں لیے کھڑی رہی۔ وہ جیسے کسی خواب کے عالم میں تھی، خوش کن، سرور سے بھرا خواب۔

حرکت کر کے اپنے خواب کو ختم کرنے کا خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھی وہ یونہی بہت بن کر اس ظلم میں بے حس و حرکت کھڑی مسکراتی رہی۔ یہاں تک کہ ایمان کے رونے کی آواز آنے لگی۔ ایقان نے چونک کر ریسیور رکھا اور

چھلانگیں مارتی ہوئی بھاگی۔ ایمان کو بانوؤں میں بھر کر اس نے چٹا جٹ اس کے کئی بو سے لے ڈالے۔
”میری گڑیا کے پایا آئیں گے، میری شہزادی کے پایا آئیں گے، میری لاڈلی اپنے پایا کو دیکھے گی، ان سے باتیں کرے گی، ان سے لاڈ کرے گی۔۔۔ میری گڑیا کے پایا۔۔۔“



الماری بند کر کے وہ کسی سوچ میں گھری تاویر کھڑی رہی۔ دادی کے بوے میں کل دو سو روپے باقی تھے۔ اسے کچھ علم نہ تھا کہ اس رقم کے علاوہ بھی دادی اپنے پیسے کہیں اور چھوڑ کر گئی تھیں یا نہیں۔ دادی کی چیزیں اب تک اپنی اپنی جگہ پر اسی حالت میں پڑی تھیں جیسا کہ وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھیں۔
ربیعہ نے اب تک ان کی کسی شے کو نہ چھوا تھا۔ ان کا لکڑی کا چھوٹا صندوق جو کمرے کے ایک کونے میں پڑا تھا، دادی کا ضروری سامان اس میں رکھا ہوا تھا۔ صندوق میں پڑے تالے کی چابی دادی اپنے ازار بند میں باندھ کر رکھا کرتی تھیں۔ وہ چابی ربیعہ نے ان کی تنقین کے موقع پر نجائے کہاں رکھی تھی۔ اسے اب یاد نہ آتا تھا۔
کچھ سامان تھا۔ ان کے چند ایک جوڑے، ان کی کچھ دینی کتابیں، ان کا چشمہ، کنگھا، دنداسہ وغیرہ۔ الماری میں ان کا بڑھ بھی تھا جس میں دادی روزمرہ استعمال کی رقم رکھا کرتی تھیں۔ اب اس بوے میں محض دو سو روپے باقی تھے۔
ربیعہ دادی کی وفات کے بعد سے اسی بوے سے رقم نکال کر گھر کا خرچ چلا رہی تھی لیکن آج بجلی کا بل آیا تھا۔ بوے میں پڑے پیسوں سے بل بھرنا ممکن نہ تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے اپنا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے صحن میں چلی آئی۔ باہر گلی میں آکر اس نے دروازے میں کھنڈا ڈال دیا اور آہستہ روی سے چلتی سمیٹتہ ٹوپیہ کے گھر تک چلی آئی۔ دستک کے جواب میں ٹوپیہ دروازے تک آئی تھی۔

”ارے ربیعہ باجی آپ! آئیں نا اندر۔“

”حاکم چچا ہیں گھر پر؟“ ربیعہ نے سوال کیا۔

”ہاں ہاں! ابا گھر پر ہی ہیں۔ آئیں نا اندر۔“

ربیعہ اس کی معیت میں حاکم چچا کے کمرے تک چلی آئی۔

”السلام علیکم چچا۔“ اس نے دھیرے سے انہیں مخاطب کیا۔

”ارے!“ وہ ہل اٹھے۔ ”ربیعہ آئی ہے، آؤ بھئی آؤ۔ بہت مبارک گھڑی ہے بھئی ہماری ربیعہ نے کتنے دن بعد گھر سے قدم نکالا ہے۔ ہمارے آنگن کی قسمت جاگ اٹھی۔ ٹوپیہ! ربیعہ کے لیے دودھ میں شربت ڈال کر لاؤ۔“

”رہنے دیں چچا بس۔۔۔ میں جاؤں گی۔ ذرا کام سے آئی تھی۔“ وہ شرمندہ ہو گئی۔

”کام بھی ہوتے رہیں گے، کاموں کے لیے عمر پڑی ہے۔ تم اب تک یہیں کھڑی ہو؟“ انہوں نے ٹوپیہ کو گھورا۔ وہ غنائف باورچی خانے کی سمت چل دی۔

”بیٹھو ربیعہ! ادھر بیٹھو۔“ انہوں نے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جھجکتے ہوئے ان کے پاس آ بیٹھی۔

”چچا جان۔۔۔ وہ کچھ کام تھا۔“

”ارے بھئی، اب کہہ ہی دو۔ یہ ہم سے کیا تکلف برت رہی ہو۔ اس کا مطلب ہے تم ہمیں اپنا ہی نہیں سمجھتیں۔“

”یہ بات نہیں ہے چچا جان!“ وہ گہرا کر لوز۔ ”آپ کو اپنا نہ سمجھوں تو دنیا میں اور کون ہے میرا۔“

”چھاتو پھر کہو کیا بات ہے؟“

”آپ کو بتائی ہے، پچھلی گلی کے برے پر خود دوکانیں ہیں، وہ ہماری ملکیت ہیں۔ ہر ماہ دادی یا تو خود جا کر ان کا کرایہ لے آتی تھیں یا پھر وہ لوگ خود ہی دے جاتے تھے۔“

”ہاں ہاں یہ کون سی راز کی بات ہے۔ سارا اٹھ جانتا ہے۔“
 ”میں چاہ رہی تھی چچا جان! کہ آپ وہاں جا کر دکانوں کا کرایہ لادیا کریں۔ ڈیڑھ ماہ سے کرایہ نہیں آیا ہے اور کل بجلی کا بل بھی آگیا ہے۔ میرے پاس اسے جمع کروانے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔“
 وہ چند لمحوں کے لیے اس کی صورت دیکھتے رہے پھر مسکرا دیے۔

”تو ابھی آپ تم بل جمع کرانے کی فکر بھی کیا کرو گی۔ واہ بھئی۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”خیر بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ میں کرایہ بھی لادوں گا اور بل بھی جمع کروادوں گا۔ میں تمہارا بھگڑا ہوا بچہ گھر سے جدا نہیں سمجھتا۔ یوں سمجھو ایک ہی گھر ہے۔“

”شکریہ چچا جان!“
 ”تو یہ ٹھنڈے دودھ میں شربت گھول کر لے آئی تھی۔ ربیعہ اس سے سمیٹ کے متعلق استفسار کرنے لگی۔
 ”باجی! حنا کے گھر گئی ہیں۔ ان کے ہاں درس ہوتا ہے ہر جمعرات کو۔“
 ربیعہ نے چونک کر توبہ کو دیکھا پھر سر جھکا کر گلاس خالی کرنے لگی۔ حنا کے گھر جانے کا مطلب وہ بخوبی جانتی تھی۔

○ ○ ○
 چالی اسے الماری کے سب سے اوپر کی خانے میں بچے اخبار کے ٹکڑے کے نیچے سے مل گئی تھی۔ اسے یاد نہ آتا تھا کہ اس نے کس وقت وہ چالی وہاں رکھی تھی۔ اس وقت تو وہ اپنے ہوش و حواس میں ہی نہ تھی۔ بھلا یہ بے وقعت بات اسے کیسے یاد رہتی۔ صندوق کھولتے ہوئے اس کے جذبات و احساسات عجیب سے ہورہے تھے۔
 ادنی جان کی زندگی میں اس نے بھی اس صندوق میں جھانک کر بھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی کسی قسم کا تجسس اس کے اندر جاگاتا تھا۔

دادی کی تربیت نے عجب بھول پن اور معصومیت اس کے اندر سمودی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والی بدھمی سادی سی لڑکی تھی۔ بے وجہ کے تجسس اور نظر اسے نہ گھیرتے تھے۔
 پھر دادی نے بھی اس کے سامنے اس صندوق کو کھولا بھی نہ تھا۔ وہ اگر کبھی اسے کسی مقصد کے تحت کھولتی بھی نہیں تو ربیعہ کی غیر موجودگی میں۔

صندوق کا بھاری ڈھکن اٹھا کر اس نے دیوار سے نکادیا اور اندر جھانکنے لگی۔ پہلی نگاہ میں اسے سب چیزیں اپنی اور بے مقصد نظر آئیں۔

ایک کونے میں سفید قلم کے کپڑے کی بوٹلی تھی۔ دوسرے کونے میں کچھ کاغذات تھے۔ تانبے اور پیتل کے ہموئے چھوٹے برتن اور استعمال کی دیگر اشیاء تھیں۔ ایک پرانی البم تھی۔

ربیعہ نے سب سے پہلے البم نکالی۔ یہ واحد شے تھی جس نے اس کی توجہ فوری طور پر اپنی جانب مبذول کر دلائی تھی۔

البم کھول کر وہ تصویریں دیکھنے لگی۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں، سب کی سب بے حد پرانی۔ کسی کسی تصویر میں اسے محض دادی کی پہچان ہو سکتی تھی۔ باقی لوگ کون تھے وہ نہ جانتی تھی۔

بڑی حیرانی سے وہ تصویریں دیکھتی رہی۔ ایک تصویر پر اس کے ہاتھ رک گئے اور نگاہیں ٹھہر گئیں۔ وہ نو عمر لڑکی ربیعہ سے مشابہہ تھی۔ سر پر بھاری کام کا دوپٹہ اوڑھے ہوئیوں پر شرمیلیں مسکراہٹ لیے وہ نظریں جھکائے

”تھی۔ گلے میں کندن کے کام کا بھاری گلو بند تھا۔“
 نظریں چونکے نیچے تھیں اس لیے تصویر کا تاثر مبہم تھا بہت واضح نہ تھا۔

اس چہرے میں کشش تھی بے پناہ کشش۔ ربیعہ اپنی نگاہیں نہ ہٹا سکی۔ دیر تک وہ تصویر کو دیکھتی رہی پھر اپنی انگلی سے اس نے تصویر کو چھوا۔ اس کے رخسار اس کی پلکیں اس کی پیشانی اس کے ہونٹ وہ انگلیوں سے اس

تصویر کا ہر ہر نقش محسوس کرتی رہی۔

اچانک اسے کچھ احساس ہوا۔ اس نے اپنا چہرہ چھو کر دیکھا۔ اس کا وہم درست تھا، اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا، وہ رو رہی تھی، وہ بے خبری میں رو رہی تھی۔ وہ اس تصویر کو دیکھ کر کیوں رو رہی تھی اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ الم بند کر کے اس نے واپس صندوق میں رکھ دی پھر اس نے کانڈات نکالے۔ ان میں مختلف چیزیں تھیں، بینک کے کچھ کانڈات تھے، کچھ پرانے خطوط تھے، ایک فائل تھی، نجانے کس چیز کی۔ ربیعہ کو کانڈات سے دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔ وہ تو بڑی فراغت کے ساتھ توجہ کے ساتھ دیکھے جانے والی چیزیں تھیں۔ اس نے کانڈات بھی واپس رکھ دیے۔

وہ پیتل کے برتن اٹھا اٹھا کر دیکھتی رہی۔ سرمہ دانی، دودھ پینے کا پیالہ، ہاون دستہ، ٹونا، چراغ، چند ایک گلاس اور پلیٹیں۔ نجانے داوی نے یہ برتن کیوں رکھے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھی خالی الذہنی کے عالم میں صندوق کے اندر دیکھتی رہی پھر اس نے مٹل کی پوٹلی اٹھا کر باہر نکالی۔ اس کے اندر کسی بھاری سی چیز کا احساس ہوا تھا۔

ربیعہ نے پوٹلی کھولی، اندر ایک چھوٹا سا ڈبہ اور ایک سرخ جوڑا رکھا تھا۔ اسے قدرے حیرانی ہوئی۔ وہ سرخ جوڑا، کام سے مزین تھا جواب تک کالا نہ پڑا تھا۔ اس کی چمک ضرور مدھم پڑ گئی تھی پھر ربیعہ نے وہ ڈبہ کھولا، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس ڈبے میں طلائی زیورات تھیں۔

ربیعہ نے کندن کے کام کا بھاری گلوبند اور جھمکے استقباب سے دیکھے۔ کنگنوں کو ہاتھ میں لے کر ان کے بھاری پن اور مالیت کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتی رہی پھر بڑے اشتیاق سے اس نے وہ کنگن پہن لیے، گلوبند گلے میں ڈال کر کسا، جھمکے کانوں میں پہنے۔ اس کے بعد اس نے سرخ دپٹہ کھولا اور سر پر ڈال کر آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اچانک اسے حیرت کا جھکا لگا تھا۔ ابھی ابھی اس نے یہی روپ دیکھا تھا، بالکل یہی۔ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

کچھ دیر قبل وہ جس تصویر کو دیکھ کر بے اختیاری کے عالم میں رو رہی تھی وہ بالکل ایسی ہی تو تھی جیسی ربیعہ آئینے میں نظر آ رہی تھی، بالکل ایسی ہی۔

ربیعہ تاویز اپنا عکس دیکھتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ سب چیزیں اس کی اپنی تھیں، بالکل اپنی۔ وہ چیزیں ربیعہ کے کسی بہت "آئینے" کی تھیں۔ آنسو ایک مرتبہ پھر بڑی روانی سے اس کے چہرے پر پھسلنے لگے۔ وہ ان چیزوں کو چھو چھو کر محسوس کرتی رہی اور روتی رہی۔

"ماں! کیا ایک اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

"ماں! پھر اس نے چیخ ماری تھی۔

"ماں! ماں! ماں! وہ دھاڑیں مار مار کر رو دی۔

زندگی میں پہلی بار، پہلی بار اسے "ماں" کے وجود کا احساس ہوا تھا۔ اسے اپنی ماں یاد آئی تھی۔ داوی کی شفقت کا دہیز بادل غائب ہوا تھا تو اس کی محبت کا چمکتا مہتاب طلوع ہو گیا تھا۔

آج اسے داوی کی نہیں اپنی ماں کی یاد آئی تھی۔ آج پہلی مرتبہ وہ اپنی داوی کے لیے نہیں اپنی ماں کے لیے رو رہی تھی۔

ماں۔ جسے اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔

ماں۔ جسے اس نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

ماں۔ جس کی اسے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی تھی۔

جس ذات فقہ کو چکھانہ ہو، جس خوشبو کو محسوس ہی نہ کیا ہو، جس شے کو کبھی دیکھا ہی نہ ہو، بھلا اس کی طلب کب ہوتی ہے۔

پراسے اپنی ماں کی طلب ہو رہی تھی۔ اس کا دل ماں کے بازوؤں میں چھلنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ وہاں کی گود میں سر رکھ کر پرسکون کی نیند سونا چاہتی تھی۔

ماں۔ جو اسے جنم دیتے ہی ہمیشہ کی نیند سو گئی تھی۔

”میں کل تمہارے گھر آئی تھی۔“ رات کو اس نے سمیچہ کو بتایا۔ ”تو یہ بتا رہی تھی، تم حنا کے گھر گئی ہو۔“

سمیچہ کے لب مسکرانے لگے۔

”پھر تم کیا سمجھیں۔“

”میں۔۔۔ میں سمجھ گئی تھی کہ تم ”اس“ کے ساتھ کہیں گئی ہو گی۔ کہاں گئی تھیں؟“

”یونہی، ذرا سا چکر لگا کر آ گئے تھے۔ اس نے مجھے چنے کی چاٹ کھلائی اور بول پلائی۔ بُندے بھی خرید کر دیے۔ تم آؤ گی تو دکھاؤں گی تمہیں۔“

”تمہیں ڈر نہیں لگتا سمیچہ!“ ربیعہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ سمیچہ نے اسے اس طرح دیکھا جیسے وہ اسحق اعظم ہو۔

”ڈر؟“ پھر وہ ہنس دی تھی۔ ”ڈر کا ہے؟ کس سے ڈروں۔ مجھے تو صرف اس کی جدائی کے خیال سے ڈر لگتا ہے۔“

”تمہیں حاکم چا چا سے ڈر نہیں لگتا۔ اگر ان کو بتا چل جائے یا اگر نفیسہ خالہ کو پتہ چل جائے؟“

”تو کیا ہو گا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ سب کو بتا چل جائے۔ سب مل کر ہمارا انکاح پر دھوا دیں گے۔“ وہ بے فکری سے ٹانگیں ہلاتے ہوئے بولی۔

ربیعہ بے ہوش ہونے کے قریب ہو گئی۔ منہ کھولے ہو نقول کی مانند وہ اس کی بے فکری اور بے نیازی کو دیکھتی رہی۔

”تمہیں۔۔۔ تمہیں اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا سمیچہ! تمہارے ابا کو پتہ چل جائے کہ تم ہمدرد سے ملتی ہو، اس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔ تمہارے ابا کیا سوچیں گے سمیچہ! ساری زندگی وہ جب بھی تمہارا چہرہ دیکھیں گے انہیں یہی بات یاد آئے گی۔“

”افو۔“ سمیچہ اس کی تنقید سے برا سا مان کر بولی۔ ”کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی بھی اور ابا کون سا حج عمرے پہنچے ہیں۔ ساری عمر میری اماں جلتی کڑھتی رہی، اسے روگ لگا دیے، مر گئی بے چاری۔ میں نے تو سچے دل سے محبت ہی کی ہے، کوئی گناہ تو نہیں کیا۔ جس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہوں، اسی کے ساتھ شادی کروں گی اسی لے کر میری ڈولی جائے گی اسی کی بیج سجاؤں گی۔“

ربیعہ کے گال تپ گئے، نگاہیں جھک گئیں۔

”چائے بناؤں تمہارے لیے؟“ اس نے آہستگی سے پوچھا۔

”ایک تو ربیعہ۔۔۔ تم بھی نا۔“ سمیچہ نے اس کی حالت دیکھ کر اس کی کم عقلی پر تاسف سے سر ہلایا۔

”ہتا ہے تمہیں ابا کیا کہہ رہے تھے؟“

”ایا؟“

”وہ تمہاری شادی کروانا چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے، اکیلی لڑکی یوں بھلا کب تک خالی گھر میں رہ سکتی ہے اسے، مرد کے سہارے کی ضرورت ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، ان کی نظر میں کوئی رشتہ ہے، تب ہی وہ اتنے وثوق سے کہہ رہے تھے کہ ایک ماہ کے اندر اندر تمہاری شادی ہو جائے گی۔“

ربیعہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”اینکین کیوں؟“ وہ ہراساں ہو کر بولی تھی۔

”میں ایسے ہی خوش ہوں سمیعہ! مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ مجھے اکیلے ڈر نہیں لگتا۔“
 ”جججج“ سمیعہ نے سر ہلایا۔ ”ربیعہ بی بی! یہ تو دنیا کا دستور ہے۔ کوئی ایسی خوفناک بات بھی نہیں کی کہ تم خوف کے مارے جان دے دو اور پھر اگر تمہیں اکیلے گھر میں ڈر نہیں لگتا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ساری عمر تم یونہی گزار دو۔ شادی کر کے مزے سے رہو، بچے پیدا کرو۔“ ربیعہ خاموش بیٹھی اس کی گفتگو سنتی رہی۔
 ”دیکھو نا، ابھی تمہاری ذمہ داری سارے محلے پر عائد ہے اخلاقی ہی سہی۔ تمہاری شادی کسی بھلے ماں سے ہو جائے تو سب لوگ اطمینان کا سانس لیں گے۔ سب ہی کو یہ بوجھ ہلکا محسوس ہوگا۔“ اس نے بغور ربیعہ کے تاثرات کا مشاہدہ کیا۔
 ”آخر تم اکیلی رہ کر کیا کرو گی، تمہارے پاس کرنے کو ہے کیا؟“ وہ آگے بڑھ کر بولی تھی۔
 ربیعہ افسردہ سی ہو گئی۔

”میں تو بڑھنا چاہتی ہوں سمیعہ! ابھی تو عمر بڑی ہے شادی کرنے اور بچے پیدا کرنے کے لیے۔ میرے ذہن میں یہ سب کچھ نہیں ہے، میں نے کبھی اس طرح سے نہیں سوچا اس لیے میرا دماغ ان باتوں کو قبول نہیں کرتا۔ مجھے اپنا ذہن بنانے میں کچھ وقت لگے گا۔ تب تک میں سکون سے اپنی پریشانی مکمل کرنا چاہتی ہوں۔“
 اونہ۔۔۔ اس نے سر جھکا۔ ”تمہارے سر میں خشکی نہیں ہوئی مولی مولی کتابیں پڑھ کر، تمہاری دادی نے تو تمہیں کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بنا دیا ہے۔ سنہ تمہیں بھی کوئی ڈھنگ کا کپڑا پہننے دیکھا، نہ کبھی کوئی بناؤ سنگھار کا شوق ہی دیکھا۔ ہمیشہ یہی سادی سی چٹیا باندھے، کوئی ہلکے سے رنگ کا سوٹ پہنے رہتی ہو۔ اسکول پڑھ لیا، کالج پڑھ لیا۔ اب اور کیا رہ گیا ہے پڑھنے کے لیے؟“

ربیعہ مسکرا دی۔ سمیعہ ہمیشہ اسی طرح اسے لتاڑا کرتی تھی۔ وہ دونوں بچپن کی سنگی ساتھی تھیں، اس لیے اس نے کبھی سمیعہ کی باتوں کا برانہ مانا تھا پھر وہ اس کی ذہنی سطح سے بھی آگاہ تھی۔ اسے بڑھائی لکھائی سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ ایسے مواقع پر وہ چولے جو کسے کی مثال دیا کرتی تھی۔ جتنا کچھ بھی وہ پڑھ سکتی تھی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی سے پڑھ سکتی تھی، ذہن اسے خود محض خط لکھ لینے کا شوق تھا۔ اس سے آگے اس کی سوچ کے پرجلتے تھے۔
 ربیعہ اس کی ذہنی دلچسپی اور میلان سے واقف تھی، سمیعہ کی ایسی باتوں کو مسکرا کر نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔

”بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ میں شادی کے متعلق تمہاری رائے معلوم کروں۔“ اب کے اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ”بلکہ وہ چاہ رہے تھے کہ تم بس ہاں کرو۔ اب تم بتاؤ کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔“ ربیعہ پریشان ہو گئی۔

”سمیعہ! تم انہیں منع کرو، میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ چند ماہ بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہوں گے تو میں وہاں داخلہ لے لوں گی۔“

”پھر تم ہمارے ساتھ رہنا شروع کرو، اپنا گھر بند کر دیا کر لے کر چڑھا دو۔ یوں اکیلی تو تم نہیں رہ سکتیں۔“ ربیعہ بے چارگی کے عالم میں سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”دیکھیں نا خالہ جانی! آپ ہمارے ہمیشہ یہی کرتی ہیں۔“ وہ اسے منہ بسور کر دیکھنے لگا۔
 انہی نے محبت سے اس کا گلابی نرم چہرہ دیکھا اور شرارت سے اس کے بال بگاڑ دیے۔
 ”میں نہیں بات کرتا آپ سے۔“ وہ دھڑک چکا تھا۔ ”اب میں جیتنے ہی والا تھا، آپ نے سب گوثیں بکھرا دیں۔“

”جانو! میرا ہاتھ غلطی سے لگ گیا نا۔ میں نے جان بوجھ کر تو نہیں گوثیں بکھیری ہیں۔“ اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ”اور آپ کو ہمیشہ یہ غلط قسمی کیوں رہتی ہے کہ آپ جیتنے والے تھے، کیا پتا آخر میں میں ہی جیت جاتی۔“

منیڈہ بیگم نے مسکراتے ہوئے خالہ بھانجے کی باتیں سنیں۔

”کیوں تنگ کرتی ہو انیقہ میرے بچے کو۔“ انہوں نے عمر کو بانہوں میں بھر لیا۔

”یکس نانا تو ایسہ میرے ساتھ بے ایمانی کرتی ہیں۔“ اس نے جھٹ شکایت لگائی۔

”اسی ایک تک اپنا مغز کھپاؤں“ اس کو تو صرف چھ کا پھینکا آتا ہے۔ باقی اس کی گویں بھی میں چلاؤں اور اپنی

اور آخر میں جیتیں بھی لانا“ یہ حضرت اور ایک مرتبہ جیت کر تو موصوف کا جی ہی نہیں بھرتا۔ آٹھ دس

ہاں ایسی کھیلی جائیں۔“ اس نے آٹا کر پیر پھیلائے۔ منیڈہ بیگم ہنس دیں۔

”تم میرے ساتھ کھیا کرو۔ میرا بچہ جتنی مرتبہ کے گا میں اتنی ہی مرتبہ کھیلوں گی۔“

”نہیں نانا! آپ کے ساتھ صرف سونے میں مزہ آتا ہے، کھیلنے میں تو عباداموں اور انیقہ خالہ جانی کے ساتھ

آتا ہے۔“ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ منیڈہ بیگم مسکرا دیں۔ انیقہ ہنسنے لگی۔

”وہ کیوں بھی؟“ اس نے ہنسنے ہنسنے پوچھا۔

”نانو کو ہر اک کوئی اچھا لگتا ہے، ماما کو ہر اک بھی اچھا نہیں لگتا۔ صرف آپ کو اور ماموں کو ہر اک مزہ آتا ہے۔“

انیقہ نے ہنسی رک گئی۔ وہ ہونٹ بچھنچ کر مصنوعی غصے سے اسے دیکھنے لگی۔ منیڈہ بیگم نے اسے سینے سے لگا لیا تھا۔

”نانو! ماما آپ کی؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”ہاں بیٹا! آنے والی ہیں تمہاری ماما! پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔“

”ماما کو اپنا ہاسپٹل اچھا لگتا ہے، ماما کو ہر اک بھی اچھا نہیں لگتا۔ انہیں اپنے مریض اچھے لگتے ہیں ہم اچھے نہیں لگتے۔“

”ایسی بات نہیں ہے جانو! آپ کی ماما ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر کا تو کام ہی بیماروں کی خدمت کرنا ہے۔ تم یہ بھی تو

دیکھو! جب تمہاری ماما کی بیمار کو تھیک کرتی ہوں گی تو وہ کتنی دعائیں دیتا ہوگا! اس کے گھر والے کتنا خوش ہوتے

ہوں گے۔“

انیقہ نے اسے خود سے قریب کر کے سمجھایا۔

”خالہ جانی! آپ بھی ڈاکٹر بن جائیں گی پھر آپ بھی ہاسپٹل میں رہا کریں گی۔“ اس نے منہ بسورا۔ ”عباد

ماں تو ویسے بھی کبھی کبھی آتے ہیں۔ جب ان کے کالج کی چھٹیاں ہوتی ہیں، ورنہ تو وہ لاہور میں ہی رہتے ہیں۔“

”اے ابا! کیلا ہی رہا کروں گا؟“

”کیوں بیٹا! میں جو ہوتی ہوں آپ کے ساتھ۔“ منیڈہ بیگم بولیں۔

”آپ کے ساتھ میں بور ہوتا ہوں نانا!“ انیقہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔ اندر آتی ہوئی شملانے دلچسپی

لے کرے کا ماحول دیکھا۔

”ان سے لطفے ستارہ ہے ہوائی خالہ کو۔“ اس نے بیگ کارز ٹیبل پر رکھا اور ماں کے قریب بیٹھ گئی۔

”آپ کا بقرط اپنی علمیت کا بھرپور مظاہرہ کر رہا ہے۔“ انیقہ ہنس رہی تھی۔ ”اور صاف گوئی اپنے عروج پر

ہے۔ نانو کی بھرپور محبت کے جواب میں بے پناہ صاف گوئی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔“

”شملانے عمر کا بازو پکڑ کر خود سے قریب کر لیا اور اس کی پیشانی چومی۔

”ایسا ہے میرا بیٹا!“

”لھیک ہوں۔ اگر بیمار ہو جاؤں تو اچھا ہو۔“ وہ بگڑا بگڑا سا بولا۔

”خدا نہ کرے۔“ شملادیل کروٹی۔ ”ایسی خراب بات کیوں کی تم نے؟“

”پھر آپ گھر پر تو رہیں گی تا میرے پاس۔ ڈاکٹر تو بیمار کے پاس ہی ہوتا ہے۔“ شملانے اسے بازوؤں میں بھر

لیا۔ ”ایک بات بتاؤں بیٹا! آپ کو میں!“

”تائیں۔“

”ایک ڈاکٹر کے گھر والوں کو بہت ایثار کرنا پڑتا ہے دوسرے لوگوں کی خاطر۔ اپنے حصے کا وقت بھی دوسرے

لوگوں کو دیتا پڑتا ہے جب یہ گاڑی چلتی ہے، ورنہ ایک بے چارہ ڈاکٹر کہاں کہاں کس کس کو پورا پڑے۔“ وہ ٹکر ٹکرماں کی صورت دیکھتا رہا۔

”آپ کے جیسے کا نام اگر میں کسی اور کو دیتی ہوں تو اس کا دکھ مجھے بھی ہوتا ہے لیکن دوسرے لوگوں کے لیے یہ وقت کتنا قیمتی ثابت ہوتا ہے، آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے اور پھر میں آپ کو اکیلا تو نہیں چھوڑتی تا۔ آپ کی نانو ہوتی ہیں، خالہ جالی ہوتی ہیں۔ بھی کھار عباداموں بھی آجاتے ہیں۔“

”میرے بھاتا نہیں ہوتے تا۔ سب بچوں کے گھر میں بھاتا ہوتے ہیں، ہمارے گھر میں تو بھاتا بھی نہیں ہیں۔ ماما بھی جلی جاتی ہیں۔“ شمشلا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے آہستگی سے عمر کو خود سے علیحدہ کیا تھا۔

”میں چیتج کر کے آتی ہوں پھر سب مل کر کھانا کھائیں گے۔“

منیہزہ بیگم گہری سانس بھرتا کرتی ہوئی تھیں۔ انہی نے عمر کے سر پر چیتج لگا کر اس کی ناک بہا دی تھی۔

خالی پڑا ہے پیٹ، غذا کیوں نہیں دیتے
جو دال پکائی ہے، کھلا کیوں نہیں دیتے
اس آنت سے اس آنت تک ہیں دوڑ لگاتے
چوہوں کو مارنے کی دوا کیوں نہیں دیتے

وہ اسٹیل کی پلیٹ ڈانگ ٹنگ ٹیل پر اوندھی کسے، بجا بجا کر گایا تھا۔

فردوس بیگم جھلا کر کچن سے برآمد ہوئیں۔ ”علی! سرد ہر جاؤ تم۔“

”کدھر جاؤں خالی پیٹ۔“ وہ مسخرے پن سے بولا۔

”کہہ جو رہی ہوں پک رہا ہے کھانا۔“

”تب تک سنی رہے میرا گانا۔“

”یا اللہ۔“ انہوں نے ماتھا پیٹنا چاہا تو ہاتھ میں تھامی کفگیر ہاتھ پر لگی۔ علی کی ہنسی نکل گئی۔

”میں کھینچ کر ماروں گی یہی کفگیر۔“ انہیں طیش آگیا۔

”کہیں اور جاتا ہے یہ فقیر۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور شرٹ کھینچ کر جینز کے اندر کرنے لگا۔ ”جو دے اس کا بھی بھلا“

جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔ فقیر سانس جاتے ہیں۔

”جائے گا اب چچی یا پچھس کی دہلیز پہ چھوٹنے۔“ وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن میں گھس گئی تھیں۔

”بابی! ایک کپ چائے بنا دو۔“

بھاری، گھیسر آواز پر وہ مڑی تھیں۔ اختر میاں کچن کے دروازے کی چوکھٹ تھاے کھڑے تھے۔ ان کے ماتھے پر پل پڑ گئے۔

”بٹھو باہر۔“ قدرے توقف سے وہ بولی تھیں۔ ”میں آتی ہوں لے کر۔“

وہ منہ ہی منہ میں گنگناتے ہوئے کچن کے باہر بڑی چھوٹی ڈانگ ٹنگ ٹیل پر بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد فردوس بیگم چائے کا مک لے کر باہر آئی تھیں۔

”جیتی رہو بابی! شاد رہو، آباد رہو۔“ انہوں نے بڑی ترنگ میں مک تھاا۔

”ختر! تم اپنی حرکتوں سے کب باز آؤ گے؟“ وہ غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

”ہم تو مسلسل بے حس و حرکت خیال کرتے ہیں خود کو بابی! ایک جو دے زندگی پر طاری ہو تو تباہی نہیں۔“

آپ کو نئی حرکت کی بات کر رہی ہیں؟“ ان پر فردوس بیگم کے غصے کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔ بہت اطمینان سے

چائے کے کھونٹ بھرتے رہے۔

”کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتے ہی رہا کرو۔“ وہ جیسے پھٹ پڑیں۔ ”یہ بھی خیال نہیں کہ یہ ہمارے باوا کا محل

نہیں، بہن کا سسرال ہے۔ میں کوئی حاکم وقت نہیں ہوں یہاں جو ہر وقت تمہاری شکایتوں پر کان لپیٹ کر بے نیازی کی چادر اوڑھے رکھوں۔ جانتے ہو، فاروق نے مجھے کس قدر ذلیل کیا ہے۔ ان کی اماں نے سندیہ کھلوایا تھا کہ اختر کو کسی کھوٹے سے باندھو اور نہیں بندھتا تو نکال کر باہر کر دو گھر سے۔ یہاں ہماری بہن، بیٹیاں ہیں۔ ہم ایسے سر پھرنے، بے شرم، کنگلیے، فحشوں کو کب تلک لائیں۔“

”ہم نے کیا کیا ہے باجی! وہ جیسے زچ ہوئے۔ ہمارا قصور تو بتلائے؟“

”۳۳ روز تم بچوں کی محفل میں جا گئے اور اس ”حسن کی دیوی“ کو دیکھ دیکھ کر عجب قسم کے اشعار بڑھتے تم نے ذرا شرم نہ آئی تمہیں۔ اس نے جا کر ماں سے شکایت کی اور ماں نے فاروق حسن کو بلوا بھیجا۔ کیسا تماشا بنایا تم نے سارے گھر میں۔“

”اے حسن کی دیوی، سچ، سچ، کما باجی! دیوی ہی تو لگتی ہے۔ اور۔۔ اور اب تو جیسے شراب پرانی ہو کر دو آتشہ ہو جائے ہائے۔“

”ہائیں۔“ وہ منہ کھول کر کتنی ہی دیر انہیں سکتی رہیں۔ ”یہ ہے میری سرزنش کا جواب! اختر میاں! تم خود تو ڈوبو گے، مجھے بھی لے ڈوبو گے۔ ارے میں کتنی ہوں! اب وہ بیاہتا، دو بچوں کی ماں ہے۔ اب تو اس کا چچا چھوڑ دو۔“

”ہم اس کا چچا کب کرتے ہیں باجی!“ وہ افسردگی سے گویا ہوئے۔ ”وہ ظالم سرباب کی مانند خود ہی نظر آتی ہے، خود ہی بھلاتی ہے، خود ہی دور بھانکتی ہے۔ پاسا تو بے اختیار ہے۔“

فردوس بیگم بھائی کی صورت دیکھتی رہ گئیں۔ ان کا جی کٹ گیا تھا۔ ایک ہی تو بھائی تھا ان کا۔ ان سے کئی برس چھوٹا، انہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا۔ ان کی شادی کے وقت وہ آٹھ دس برس کا تھا۔ ماں باپ سر پر نہیں تھے۔ وہ انہیں اپنے ساتھ ہی سسرال لے آئی تھیں۔

”کیسی مٹیں کی مٹیں میں نے اماں کی۔ بر تم بھی تو کسی قابل ہوتے، ان کا بھی کیا قصور۔ اپنی لاڈلی بیٹی کیسے دے دیتیں، آٹھ جماعت پاس کھنوکھو نہ کسی روز گارے ہی لگے بھلا کیا دیکھ کر وہ بیٹی دیتیں۔“

”ہمارا دل دیکھتیں۔“ ان کے لہجے میں درد تھا۔

”دل میاں کون دیکھتا ہے۔“ وہ بڑبڑائیں۔ ”عذر! بیگم کی پڑھائی پٹیاں آنکھ سے اتریں تو شفیقہ حیات بیگم کو کچھ بھائی دے۔ وہ تو آنکھ بند کر کے ان کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ میں بڑی بوہوں، پہلا حق میرا بنتا ہے لیکن ہر کام میں فوقیت عذر! کو حاصل ہے۔ ہر مشورہ پہلے اس سے کیا جاتا ہے پھر میری باری آتی ہے۔“

کیسی نظر تھی میری رابعہ پر۔ اس خاندان کا سب سے قابل اور سمجھ دار لڑکا ہے۔ چھوٹا سا تھا تو میں اپنی عریشہ کو اس کے ساتھ ساتھ رکھتی تھی لیکن ہوا کیا، کسی نے مجھ سے مشورہ لینا بھی پسند نہ کیا۔ میں بھی تہہ کیے بیٹھی ہوں اپنے پتوں لڑکوں کے لیے اس خاندان کی ایک لڑکی نہ لوں گی۔ ماہین اپنے گھر کی ہو گئی۔ اللہ نے چاہا تو عریشہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ آجائے گا۔ ہاشم علی اور حمزہ کے لیے میں غیر خاندان کی لڑکیاں ملاؤں گی اور ایسی لڑکیاں کہ دنیا دیکھے گی۔ ”لاؤ آج سے لمحہ بیڈروم میں بیٹی عریشہ کے کانوں تک ماں کی آواز صاف پہنچ رہی تھی۔“

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے تکیہ اٹھا کر سینے پر رکھ لیا۔ بچپن سے ماں نے جو خواب آنکھوں کی پتلیوں پر نقش کر دیا تھا، ابھی وہ چھپنے لگا تھا۔ ہر چند کہ وہ خوابوں کے سارے جینے والی لڑکی نہ تھی، واضح اور پرکشش لیکن کتنی تھکے ہوئے۔

”۳۴ سلام علیکم اماں!“ رابعہ بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام کیا۔

”و علیکم السلام، جیتی رہو۔“ شفیقہ حیات بیگم کے لبوں پر مسکراہٹ آئی۔ ”ہوتی کہاں ہو تم، کئی کئی دن ماں کو سلام کرنے کی فرصت بھی نہیں ملتی تمہیں۔“

وہاں کے قریب بیٹھ کر محبت سے ان کے ہر دہانے لگیں۔
 ”اچھی تو ہو؟“ انہوں نے بیٹی کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”جی اماں! اللہ کا احسان ہے۔ بہت آرام سے ہوں۔“

”راغبہ آئی ہے۔“ عذرا بیگم بڑے کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ ”کیسی ہو راجہ!“
 ”شکر ہے اللہ بھابھی! آپ سنائیں، بچے کہاں ہیں۔“

”رافع اور نافع تو پچھواڑے میں پانی کی موٹر تھک کر رہے ہیں۔ سدرہ اور ثانیہ کچن میں ہیں۔ کوئی نئی دُش بنا رہی ہیں۔ ان مونے لی وی والوں کو تو عورتوں کو کھڑکھڑانے کا شوق چرایا ہے۔ مہنگی مہنگی چیزیں بنا کر کوئی عجیب سا کھانا تیار کر کے دکھا دیتے ہیں۔ لڑکیاں اسی وقت بھائیوں کے پیچھے کہ ابھی چیزیں لا کر دو تو ابھی ہم بنائیں۔ بتاؤ ذرا، صبح رافع پانچ سو کی چیزیں لایا ہے اور بنے گا کیا۔ موٹی سوٹ دُش۔ کھانے کے بعد سب ایک ایک دو دو چمچ کھالیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلاً۔ میں پانچ سو کی بڑی میں دس دن نکال لیتی ہوں۔“

”ارے تم لوگ اپنے بچوں سے عاجز بھی بہت ہو۔“ شفیقہ حیات بولی تھیں۔ ”یہ بھی آج کل کا فیشن ہوا کہ جو بات بچوں کے منہ سے نکلے، اسے پورا کرنا ماں باپ کا فرض ٹھہرے۔ گویا یہ زیادہ سے زیادہ محبت کی نشانی ہوئی۔ ہم تو اپنے بچوں کو ایک شیر کی نگاہ دیکھتے تھے اور پھر انہیں بات بر اصرار کی طاقت نہ ہوتی تھی۔ آج کل کے بچے بچیاں تو اوڈھم ٹوٹو فافان مچا ڈالتے ہیں پانچ سو کی لڑکیاں کل لے گئیں تم سے بوتلیں پینے کے بہانے پانچ سو کا خرچا آج کروا دیا۔ باوا ان کا مشر لگا ہے کہیں۔“

”ابوہ آپ کی شیر کی نگاہ کیا ہوئی؟“ عذرا بیگم ہنستے ہوئے بولیں۔

”ہمارے بچوں کے لیے تو آپ بھی بکری کا سا کلیجہ رکھتی ہیں۔ میں نہ دوں پیسے تو آپ سے ہی سفارش کروا لے ہیں سارے اس وقت ان کی اصرار کی طاقت کمزوری میں بدلا کریں نا۔“

”ارے ہو! وہ کیا کہتے ہیں اصل سے سو دیا را۔ بالکل سولہ آنے صحیح کہا جس نے بھی کہا۔ اپنے بچوں کو تو ڈانٹ مار بھی لیتے تھے، ان سب کو دیکھ کر بے رحمی سے پیار اُٹھتا ہے اور چالاک بھی کیسے ہیں سب کے سب۔ نئے سے نیا بہانہ تراش کر لاتے ہیں۔ میں تو اپنے رکھے ہوئے بھی اٹھا کر دے دیتی ہوں۔“

راجہ بھی ہنسنے لگیں۔ ”پھر بھابھی کو کیا کہتی ہیں۔“

”اے ہاں، دھیان آیا۔ عاشر میاں آرہے ہیں۔“ شفیقہ حیات چونک کر بولی تھیں۔

”اچھا۔“ راجہ بیگم کو بھی مسرت ہوئی۔ ”کب؟“

”کل ایقان کافون آیا تھا۔ خوشی کے مارے پاؤں ہورہی تھی۔ صحیح طور سے کچھ بتلایا بھی نہیں۔ رافع کا پوچھ رہی تھی۔ اسے ایرورٹ بھیجے گی عاشر میاں کو لینے۔ شام بھی جائے گا۔“

”اچھا!“ راجہ بیگم کا چہرہ بھی چمکنے لگا تھا۔ ”اللہ اس کی خوشیاں سلامت رکھے۔ بہت محسوس کرتی ہے عاشر کی غیر موجودگی کو۔ نکتے دونوں کے لیے آرہا ہے؟“

”بتا تو رہی ہوں اس دیوالی کو کچھ نہ سوچتا تھا میں اتنا کہا ماں! پر سول عاشر آرہے ہیں رافع کہاں ہے اس سے کہنا مجھ سے فوراً بات کرے بس اتنی ہی بات کی۔“

اسی اثناء میں ثانیہ اور سدرہ دو ڈونٹے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھیں۔

”اللہ۔ پھپھو بھی ہیں۔ السلام علیکم پھپھو! دیکھیں تو کیسی کھر فل دُش تیار ہوئی ہے!“ ان کے چہرے چمک رہے تھے۔

”و علیکم السلام۔ ابھی تمہاری بیٹی دُش گفتگو کا موضوع تھی۔ کیا بتایا ہے؟“

”بتایا بھی ہے یا لگا ڈا ہے۔“ ہنستا ہوا رافع اندر آیا تھا

”کھا کر دیکھیں بھائی! انگلیاں چبا جائیں گے۔“ ثانیہ فخریہ بولی۔

”بشرطیکہ انگلیاں تمہاری ہوں!“ وہ فولڈ کی ہوئی آستینیں سیدھی کرنے لگا۔
”میری توجہ چاہیے جب ڈش پسند نہ آئے اطالوی ڈش ہے اس کا تو نام ہی اتنا مزے دار تھا۔ بھلا کیا نام تھا
سدرہ؟“

”کچھ عجیب و غریب ساسی تھا۔ خیر چھوڑو پیڑمت گنو۔“
وہ پالوں میں کسٹرو نما چیر ڈالنے لگی۔

”پارن اہل اس میں مینگو اس میں کریم اس میں بھلا مزے دار کیوں نہ ہو؟“ رافع نے چیخ بھر کر منہ میں
ڈالا۔ ”یہ سب چیزیں ویسے ہی کس کر کے کھاؤ تو مزہ دیں گی۔ تمہارا کیا کمال اس میں؟“

”جی ہاں۔ دو گھنٹے ہم نے پکرن میں بھاڑ بھونکا ہے!“ وہ جھلٹی۔
”وہ تو تمہارے بال دیکھ کر ہی لگتا ہے!“ حمزہ برآمد ہوا۔

”رافع بھائی! آپ یہاں دعوت شیرازا ڈارہے ہیں وہاں نافع سمجھ رہا ہے آپ چار منہ والا پیچ کس لینے گئے
ہیں۔“

”ارے یار! میں بھول گیا۔ ذرا دوڑ کر دے آؤ۔“

”آپ اپنا پیالہ مجھے پکڑا دیں ناں۔ میرا تھن میں آپ حصہ لے لیں۔ یوں بھی نافع کے بس کی بات نہیں
مشین کو صحیح کرنا۔ وہ صرف آپ کو اسسٹ کرتا ہے۔“

”ارے چھوڑو میرا پیالہ۔ یہ مجھے پانچ سو کی قربانی دے کر ملا ہے۔ اسے چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا۔“
”ورودہ آپ کا اسسٹنٹ؟“

”اسے بھی بلا لود دعوت اطالیہ اڑانے کو۔“

”اللہ۔ آپ سارے مل گئے تو ہماری ڈش کا دیوالیہ نکل جائے گا!“ ثانیہ گھبرائی۔
”نکل جائے گا نہیں نکل چکا!“ نافع اور علی بھی چلے آئے۔

ثانیہ اور سدرہ ٹھنڈی سانس بھر رہ گئیں۔

”جاؤ ثانیہ! ورودہ اور ناعمدہ کو بھی بلا لاؤ۔ ہاشم کو بھی دیکھو گھر پر ہو تو اسے بھی بلا لو۔ سب مل کر کھاؤ۔“ عذرا
بیکم نے بیٹی سے کہا۔

”جی امی!“ اس نے سر ہلایا اور بے بسی سے اٹھ کر چل دی۔

اس نے اپنی سب کتابیں اور نوٹس وغیرہ نکالے ہوئے تھے اور اب بیٹھ کر انہیں تسلی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ان
سب کی درجہ بندی کر کے ترتیب سے رکھنا چاہتی تھی۔ کئی دنوں سے وہ یہ کام کرنے کا سوچ رہی تھی لیکن ہر مرتبہ
سستی آؤے آجایا کرتی۔ آج اس نے یہ کام کرنے کا تہیہ کر ہی لیا تھا۔

یوں بھی اب وہ سوچتی تھی کہ فارغ اوقات میں زیادہ سے زیادہ پڑھائی کرے لی۔ اے کا امتحان اس نے یونی
میں ہی تیاری کے ساتھ دے دیا تھا لیکن ایم۔ اے وہ پوزیشن کے ساتھ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے مکمل توجہ
کے ساتھ پڑھائی کی ضرورت تھی جو وہ دادی کی اچانک وفات کے بعد سے اب تک نہ کر سکی تھی۔ اس کا ذہن
متاثر ہوا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہوئی تھیں، سوا ب وہ اطمینان اور تسلی سے بیٹھ کر اسی کمی کو پورا
رہنے کا عزم کیے ہوئے تھی۔

دروازہ بجا تو اسے کوفت ہوئی۔ کتنے موڈ کے ساتھ وہ کتابیں لے کر بیٹھی تھی۔ ہر مرتبہ اس کے ساتھ یہی ہوتا
تھا۔ محلے والے اس کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے کے چکر میں اس کے آرام اور سکون میں بھی خلل ہو جایا کرتے
تھے۔ اس نے اٹھ کر دروازے کی چٹختی گرائی۔ باہر نفیسہ خالہ کھڑی تھیں۔

”آئیں خالہ!“ اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

”ٹھیک ہو بیٹی؟“ وہ پیر گھسیٹتی چلی آئیں۔

”جی۔ شکر ہے خدا کا!“

”بڑھ رہی تھیں؟“ انہوں نے حالات کا بغور معائنہ کیا۔

”جی۔“ وہ منمنائی۔

جانتی تھی کہ اب خالہ گھنٹہ بھر سے پہلے ملنے والی نہ تھیں۔ وہ تو جاتے جاتے دروازے پر ہی آدھا گھنٹہ نمنا دیا کرتی تھیں۔ کئی مرتبہ ”خدا حافظ“ کہتیں اور پھر انہیں کوئی نیا خیال چھیڑ جاتا۔

”اچھا اچھا۔۔۔ بڑھو۔۔۔ میں تو یونہی نگاہ مارنے چلی آئی تھی!“ وہ چارپائی پر بیٹھ گئیں اور کیلی بچی ہو پار بار دھیان تمہاری طرف جاتا ہے۔ میں تو اپنے سکون سے لگی۔ بھلا بتاؤ! چین کی نیند سو سکتی ہوں۔ دھیان تو تم میں انکار مٹا ہے۔“ رابعہ مسکرا دی۔

”کیوں فکر کرتی ہیں خالہ جان میں نے کتنی مرتبہ سمجھایا ہے آپ کو۔ میں بالکل اطمینان سے رہتی ہوں۔ نہ کوئی خوف نہ ڈر نہ ٹھکانہ اندیشہ۔ آپ سب لوگ میرے آس پاس بستے ہیں۔ دیوار سے دیوار ملتی ہے۔ پھر بھی میں بروقت دروازے کھڑکیاں بند کر کے رکھتی ہوں۔ کبھی آپ کو دروازہ کھلا ملا؟“

”وہ تو سب ٹھیک ہے بیٹی! لیکن مجھ سی بڑھیوں کو تو دوسو سے ستاتے ہی ہیں۔ تم ماشاء اللہ جوان ہو بہادر ہو، تم دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتی ہو جو معصوم اور شک سے صاف ہوتی ہے۔ ہم بوڑھے لوگوں کو تو وقت یوں بھی شکی مزاج بنا جاتا ہے۔“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

”اور پھر تمہیں بھلا زمانے کی کیا پہچان! یہاں تو شیطان بھی فرشتے کا ہروپ بدل کر آتا ہے۔ شیطان بن کر آئے تو لوگ لالچول بڑھ کر کھٹگانہ دیں!“

ربیعہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ آج نفیسہ خالہ کی باتوں میں فلسفے کا کچھ زیادہ ہی رنگ ملا ہوا تھا اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب ان کے پاس کرنے کو کوئی اہم بات ہوتی۔ ورنہ زیادہ تر تو وہ محلے میں گردش کرتی خبروں پر تبصرے سے گفتگو کا آغاز کیا کرتی تھیں۔

”کیا بات ہے خالہ؟“

”اے لعل بات کیا ہوتی ہے۔ کچھ نہیں بھلا بتاؤ!“ وہ پھکی سی ہنسی ہنس دیں۔ ”پریشان ہو گئیں؟“

”نہیں پریشانی کی کیا بات خالہ جان! آپ جیسے بھلے لوگ میسر ہیں۔“

”بھلے مانسوں میں بھی برے لوگ چھپے بیٹھے ہوتے ہیں بیٹی!“ وہ تذبذب سے بولیں۔ ”یہ بتلاؤ! تمہارا دربار کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں جس کے پاس تم یہ تنہائی کے چند دن گزار لو اور دنیا کی بری نظروں سے بھی بچی رہو۔ کوئی تیا، لاما، چچا، پھوپھا، کوئی تو ہو گا؟“

”پتا نہیں خالہ!“ وہ اداس ہو گئی۔ ”دادی جان تو کبھی اس موضوع پر بات ہی نہ کرتی تھیں، مجھے تو اب ہوش آیا ہے کہ دنیا میں انسان کے اتنے رشتے ناتے ہوتے ہیں۔ میرے ذہن نے تو حالات و واقعات سے خود بخود یہ اخذ کیا ہوا تھا کہ دادی جان کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے نہ کبھی میں نے پوچھا نہ انہوں نے بتایا۔“

”دادی کے سامان سے تمہیں ایسا کچھ نہ ملا جو تم اندازہ کر سکیں اس بات کا؟ کوئی خط، کسی کی کوئی چٹھی۔“

ربیعہ کے ذہن میں وہ تصاویر اور کاغذات گھوم گئے جو دادی کے صندوق میں پڑے تھے۔

”ہاں خالہ جان! کچھ خط وغیرہ پڑے تو ہیں لیکن میں نے ابھی پڑھے نہیں۔“

”بھلا بتاؤ۔“ انہوں نے اس کی کم عقلی پر ماتھا پٹپٹا۔ ”اے ہے بیٹی! ایسی معصومیت بھی انسان کو نفع نہ دے“

نقصان ہی دے۔ بڑھ کر دیکھو تو کیا لکھا ہے ان میں۔“

”اچھا میں آج دیکھتی ہوں خالہ!“ وہ پریشان سی ہو گئی۔

”لیکن بات کیا ہے، آپ بتاتی کیوں نہیں؟“

”دیکھو بیٹی! بات یہ ہے کہ تمہاری سیکنہ ہوا کے جو بہنوں کی ہیں عرفان شوکت صاحب ان کی نظر اب تمہارے کان پر ہے۔ سیکنہ کے مکان اور تمہارے مکان کو ملایا جائے تو اچھا بھلا رقبہ بنتا ہے۔ وہ یہاں بڑے پیمانے پر زیوں کا کام کرنا چاہتے ہیں تاکہ محلے کی غریب عورتوں کو کم اجرت دے کر زیادہ نفع کمایا جائے۔ اب سیکنہ تو اپنا مکان بیچنے پر تیار ہے وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی اپنا مکان اونے پونے انہیں بیچ دو تاکہ وہ دونوں مکان ملا کر بڑی جگہ پر تعمیر کر سکیں۔ ام کے ام، کھلیوں کے دام۔ سیکنہ آج میرے پاس آئی تھی۔ اس پر تو بہنوں کا جاو چل گیا ہے۔ وہ ہاتھی ہے کہ تم بھی مکان بیچنے پر رضامند ہو جاؤ۔“

ربیعہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔
”لیکن۔۔۔ لیکن خالہ جان! میں کیوں اپنا گھر بیچوں؟ اور پھر میں جاؤں گی کہاں۔ یہ گھر تو میری پناہ گاہ ہے۔ میری ادوی کی نشانی۔“

”جب ہی تو کہتی ہوں تمہیں کسی عزیز رشتہ دار کے گھر جا کر رہو۔ یہاں تالا ڈال دو۔ ورنہ یہ لوگ تمہیں تنگ لریں گے وہ کم بخت پیسے والا آدمی ہے۔ ہے بھی پورا بد معاش۔ کہیں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔“
ربیعہ سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح کے حالات کا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نام و نشان نہ تھا۔
”اور سیکنہ ہوا۔“ ام یقین نہ آتا تھا۔ ”وہ بھی؟“

”ارے بیٹی! اچھے اچھوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔ سیکنہ کو اس نے اٹلے سیدھے خواب دکھائے ہیں کہ فارخانے کی انچارج ہنادے گا۔ بعد میں کہیں گھر بنوانے میں بھی مدد دے گا۔ بس وہ آگئی اس کی باتوں میں اور پھر اس کا تو بہنوں کی ہو سکتا ہے اس کے ساتھ کوئی رعایت مروت برتے۔ لیکن تم سے اس کا کیا واسطہ۔ تمہیں تو موائٹھنے کی کوشش کرے گا۔“ ربیعہ مزید پریشان ہو گئی۔
”میں سوچتی ہوں خالہ جان! وہ اتنا ہی کہہ سکی۔“

ہر رنگ اسے پسند تھا۔ بے حد پسند تھا۔ بقول اس کے اس نے جب ایقان کو پہلی مرتبہ دیکھا تو وہ ہرے رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔
یوں بھی وہ زندگی کی روزمرہ کی باتوں میں بھی اپنی پسند کا اظہار کر دیتا تھا۔ کوئی چیز خریدتا اپنی پسند کے رنگ کو ضرور ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔
ایقان کی وارڈروب ہرے رنگ کے ملبوسات سے بھری پڑی تھی۔ اس کی جیولری میں زیادہ تر ہرے موتی یا نگ ہوتے۔ ہری چوڑیوں سے ڈبے کے ڈبے آٹے پڑے تھے۔ بچوں کے کپڑوں میں بھی اسی رنگ کا تناسب سب سے زیادہ تھا۔

ایقان کو گلابی رنگ پسند تھا۔ ان کی شادی ہوئی تو عاشر نے بیڈ روم میں گلابی پینٹ کروایا۔ فرنیچر بھی گلابی اور سفید رنگ میں تھا۔ پردے گہرے گلابی تھے۔ قالین سفید تھا اس پر مکڑ پھول گلابی تھے۔ ان کا بیڈ روم بے حد خوبصورت لگتا تھا۔

لیکن آج اس بیڈ روم کی ہیئت تبدیل ہو چکی تھی۔
دیواروں پر بہت ہلکا پستی رنگ ہو چکا تھا۔ فرنیچر تبدیل ہو گیا تھا۔ فریش گرین کھر کا کارپٹ دیوار تا دیوار اپنی بار دھلا رہا تھا۔ جیسے پیروں تلے سرسبز گھاس ہو۔ پردے مونگیا رنگ کے تھے جن پر سنہری پتے دھیرے سے اپنی ہلک بھلکھی دکھاتے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر خوبصورت سنہری میٹ بجھے تھے۔ فینسی لائٹس کی مدد ہم حسین روشنی میں سنہری و سبز رنگ ماحول کو بہت پرفسوں اور رومان انگیز بنا رہے تھے۔
اس نے بہ نظر غائر ہر شے کا جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر کمرے سے نکل آئی۔
ایمان اور مومن لاؤنج میں کچھ کارپٹ پر بیٹھے ”مسلائی“ کے پیکٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ان تک پہنچ آئی۔

”میرے پیارے پیارے بچے کیا کر رہے ہیں؟“ اس کے دونوں گویا سون میں بھر گیا۔
 ”عمما۔ سلائی کھاؤں!“ مومن نے اس کے منہ میں ڈالی۔ وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

دونوں سے وہ اسی ”مصروفیت“ کا شکار بھی۔ پورا گھر بدل ڈالا تھا۔ ہر جگہ میں اس کی پسند کا خیال رکھا تھا۔ اپنے لیے بھی وہ ہنگامی بنیادوں پر ایک سبز سوٹ خرید کر لائی تھی۔ ساتھ میں سفید اور ہرے موتیوں والی خوبصورت چٹا بھی لی تھی۔ پارلر سے فیشن بھی کروایا تھا۔ یعنی کہ ہر طرح کی تیاری مکمل تھی۔ بس اب اس کی آمد کا پل پل گنا رہ گیا تھا۔

”عمما۔“ مومن نے اسے دھیان سے چونکا یا۔
 ”ہوں۔“ اس نے گری سوچ سے باہر آکر بیٹھنے کی صورت دیکھی۔
 ”بھابھ! آئیں گے؟“ وہ بھرپور طریقے سے مسکرا دی۔
 ”نکل!“



”ہاشم تیز چلاؤ نا گاڑی۔“ وہ چھلائی تھی ”یہ لگتا ہے گدھا گاڑی میں بیٹھی ہوں۔“

”یہ رافع جو آگے بیٹھا ہے۔“ وہ مسکرایا ”گدھا گاڑی ہی ہے۔“

”ویسے گاڑی آپ کتنی بچ رہے ہیں۔ اطلاعاً عرض ہے!“ وہ طنز سے بولا۔

”یہ ذرا مختلف قسم کی گاڑی ہے۔ اس میں گدھا برابر میں بیٹھا ہوتا ہے۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔

رافع نے سیاہ گلاسز کے عقب سے اسے دیکھا۔

”تم غالباً“ میرے ہینڈ سم نظر آنے سے جل رہے ہو۔“

”ہینڈ سم پیدا انہی طور پر ہوتے ہیں جیسا کہ میں جینز پہن کر کالا چشمہ چڑھالینے سے کوئی ہینڈ سم نہیں آ جاتا!“ ہاشم نے اسے چڑایا۔

”خیر اب یوں تو بہت کہو۔“ پیچھے بیٹھی ایتھان چپ نہ رہ سکی۔ ”رافع تو خاندان کا سب سے وجیہ لڑکا ہے۔“

”یہ تو آپ نیا دن کر گئیں پھپھو!“ ہاشم خفا ہوا۔ ”یعنی آپ نے مجھ سے حسین نوجوان کو نمبر دو کر دیا!“ رافع اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

”ہاں۔ تم بھی گدھا لگنگ ہو۔“ وہ بولی۔

”ہاں۔ مزید زیادتی، جیسے دل رکھ رہی ہوں۔“ وہ مزید خفا ہوا۔

”جائیں۔ میں نہیں تیز گاڑی چلاتا۔ گھنٹہ بھر انتظار کرواؤں گا آپ کے صاحب کو۔“

”اللہ ہاشم! سچ بولنے کی تو سزا نہیں ہوتی۔ سزا تو جھوٹ بولنے کی ہونی چاہیے۔“

”کس دور میں جی رہی ہیں۔ سیر پھپھو؟“ وہ ہنسا۔ ”اب تک پرانی اقدار میں زندہ ہیں۔ یہاں تو سچ بولنے والے کے لیے گولی ہے۔ سرور کی نہیں، بندوبست کی۔“

”بھئی۔“ مجھ سے خطرناک باتیں مت کرو۔ میرا موڈ آج بہت اچھا ہے۔“

”وہ تو آپ کی تیاری سے ظاہر ہے۔“ اس نے بیک ویو مرر سے اسے دیکھا۔ ”بس اتھ، ٹیکے کی کسر ہے۔“ ایتھان ہنسی آگئی۔

”رافع! ذرا ایک چپٹ لگاؤ اس بد تمیز کے۔“ رافع نے جھٹ ایک مکہ اس کے بازو پر رسید کیا۔

”مرے بد تمیز شخص!“ وہ بلبلا یا۔ ”ذیر پھپھو نے چپٹ کہا تھا۔ تمہیں چپٹ اور کے میں فرق نہیں پتا۔“

”نہیں!“ اطمینان سے جواب دیا۔

”یہ مکہ اور یہ چپٹ!“ اس نے گیر چھوڑ کر اسے دونوں اشیاء سے نوازا۔ رافع نے بلبلا کر اسے دیکھا۔ ایتھان کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”توبہ توبہ! ایک سے بڑھ کر ایک ماڈل ہے ”حیاتِ دلا“ میں۔“

”آپ تو بہت خوش ہیں ”حیاتِ حلا“ سے جا کر! رافع ہنس۔
 ”ہاں۔ خوش تو ہوں۔“ اس کے لبوں پر پھر دلفریب مسکراہٹ رقصاں ہو گئی۔
 وہ باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگی۔ ایر پورٹ کی عمارت دور سے نظر آ رہی تھی۔

کافذات سامنے پھیلا کر اس نے ان کا بغور جائزہ لیا۔ ان میں کئی خطوط تھے۔ اس نے ایک خط منتخب کیا اور
 کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھا تھا۔
 پیاری امی جان!
 السلام علیکم۔
 ربیعہ نے حیرانی سے کافذینے سے لگا لیا۔

”امی جان! کیا مطلب؟“
 ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ خط میری پھپھو کا ہے؟“
 نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اس پر یہ انکشاف ہونے جا رہا تھا کہ
 اس کے خونی رشتے موجود ہیں۔

کافذ کو ایک مرتبہ پھر سیدھا کر کے اس نے سطور پر نگاہ دوڑائی، لکھا تھا۔
 ”آپ کا خط ملا اور ایک مرتبہ پھر حالات کا اندازہ ہوا۔ جو واقعات آپ نے تحریر کیے ہیں وہ حالات کی سنگینی کا
 پتہ دیتے ہیں۔ احمد جہاں زیب سے کہیے کہ دنیا میں ایک حسن ہی سب سے بڑی حقیقت نہیں۔ حسن چاروں کا
 اہم ہے۔ کاش میں آپ کے پاس ہوتی تو معاملات کو سمجھانے کی کوشش کرتی، یہاں تو یہ حال ہے کہ سانس لینے
 سے پہلے منور میاں سے اجازت لینا پڑتی ہے۔ بہر حال، آپ کی جانب سے احمد جہاں زیب کو کوئی چھوٹ یا نرمی کا
 رویہ نہ ملے، اتنا کہہ دیتی ہوں، اس کی آنکھوں پر جو پٹی بندھی ہے چند روز میں اتر جائے گی۔ آپ خاطر جمع
 رکھیے۔“

تصور اور تمدن، ثانی اماں کو سلام لکھواتے ہیں۔ ترانہ اور تمنا کو بھی آپ کی جانب سے بہت پیار دیا تھا۔ ابھی
 بھی کھیلتی پھر رہی ہیں۔ باقی سب خیریت ہے۔
 آپ کی بیٹی
 بلقیس بانو۔

ربیعہ حیرت سے خط کو دیکھتی رہی۔ تادیر تکتی رہی۔ احمد جہاں زیب اس کے لیے بے حد پرکشش نام تھا۔
 اس خط میں اس کی سمجھ میں آسکنے والی کوئی بات نہ تھی۔ پھر بھی وہ خط پڑھنا اسے بے حد اچھا لگا تھا اس میں احمد
 جہاں زیب کا ذکر تھا۔ اس خط میں احمد جہاں زیب کے وجود کا احساس بند تھا۔ خط پڑھنے سے وہ احساس چند لمحوں
 کے لیے جی اٹھا تھا۔ چند لمحوں کے لیے جیسے احمد جہاں زیب جی اٹھا تھا۔

ربیعہ احمد جہاں زیب! آج تک وہ محض اپنے نام کے آگے یہ نام لکھتی آئی تھی اور بس وہ اننا ہی جانتی تھی کہ
 نام کے آگے باپ کا نام لکھا جاتا ہے۔ اسے محض اتنا ہی علم تھا کہ اس کے باپ کا نام احمد جہاں زیب تھا۔
 ”داوی! میرے امی ابو کہاں ہیں؟“ ایک منہ پیچی سوال کرتی۔
 ”بہت دور۔ بہت دور۔“ داوی خواب بن کر جواب دیتی۔

”اللہ میاں کے پاس؟“
 جواب میں ایک سرو آہ۔
 ”سو جاؤ بیٹی۔ رات ہو چلی ہے۔“ وہ اسے تھپکتیں۔
 یہ آہ نکلیں موند لیتی۔

”دادی۔ امیری امی کیسی تھیں؟“ ایک قدرے سمجھ دار بڑی سوال کرتی۔

دادی چند لمحوں کے لیے بالکل خاموش ہو جاتیں۔

”بتا میں تانا۔ اچھی تھیں؟ پیاری تھیں؟ بتا میں نا؟“

”ربیعہ!“ دادی کی آواز میں تنبیہ ہوتی۔

ربیعہ یکدم چپ ہو جاتی۔ پھر وہ یہ سوال کرنا ہی بھول گئی۔

”دادی۔ میرے ابو آپ کے اکلوتے بیٹے تھے؟“ کسی ترنگ میں آکر وہ پوچھ بیٹھتی۔

کام کرنی دادی جان کے ہاتھ رک جاتے۔

”ان کے علاوہ آپ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی؟“

دادی جان کی جانب سے کوئی جواب نہ آتا۔

یہ ایک اسے احساس ہوتا کہ دادی جان رو رہی ہیں۔ ان کے چہرے پر خاموش آنسو بہہ رہے ہیں۔

وہ جلدی سے اٹھ کر ان سے لپٹ جاتی۔

”سوری دادی۔۔۔ اب نہیں پوچھوں گی۔“

ایک بھر بھی جو کبھی نہ ٹوٹی۔ ایک قفل تھا، کبھی نہ کھلا۔ ایک راز تھا، سوا ب سو رہا تھا۔ دادی کے ساتھ ان کی

قبریں۔

ربیعہ خط کو سینے سے لگا کر آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ فی الحال وہ احمد جہاں زیب کے چند لمحوں کے لیے جی اٹھنے

کے احساس کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔

”یہ لہجے عاشق بھائی اچٹارے دار، سوں سوں کرتے، ذائقوں سے اپنی زبان کو روشناس کرائیں۔ وہ ذائقے جو آپ

بھول چکے ہیں۔ مجھے تو آپ کی مسکراہٹ تک پھسکی پھسکی لگ رہی ہے۔“ حمزہ کہہ رہا تھا۔

عاشق نے ہنستے ہوئے سالن کا ڈونگا تھا، اور سامنے بیٹھی ایقان کو شرر لگا ہوں سے دیکھا۔

”ذائقے۔۔۔ بھولا تو نہیں۔ ترس ضرور گیا ہوں۔“ اس کے لہجے میں بھی شرارت تھی۔

ایقان جربز سی ہوئی۔ کن اکھیوں سے اس نے حاضرینِ محفل کے مشاہدات نوٹ کیے۔ پھر نظریں بچا کر اسے

گھورا۔

اس کی شریر مسکراہٹ، شریر تر ہوئی۔

ایقان ہاتھ میں تھا، ہوا نوالہ منہ تک لے جانا بھول گئی۔ گہری سیاہ آنکھیں، زندگی کے احساس سے جگمگاتی

ہوئی، سیاہ موچھوں تلے مسکراتے گلانی ہونٹ، خاموشی میں بھی بہت کچھ کہتے ہوئے، لوگوں کی پروانہ کرتے گرم

جوش احساسات، شدتوں سے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے جذبے۔

وہ سب کچھ بھول بھال کر اسے دیکھے گئی۔

”اوں ہوں۔“ وہ کھٹکھٹا رہا۔

ایقان چونک اٹھی۔ چوری بن کر کھانا کھانے لگی۔

وسیع ہال کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک دسترخوان بچھا ہوا تھا۔

عاشق کو انیسویں سو سے لے کر وہ لوگ سیدھے ”حیات والا“ چلے آئے تھے جہاں شفیقہ حیات بیگم نے ان کے

اعزاز میں دعوت کی تھی۔

اس وقت پورا خاندان دسترخوان پر جمع تھا۔

فاروق حسن، فردوس بیگم، ان کے تینوں بیٹے، ہاشم، حمزہ اور علی، مابین اور اس کا شوہر نسیم بھی مدعو تھے۔ اس کا

بیٹا حسام، عریشہ کی گود میں بیٹھا کھلکھلا رہا تھا۔

سلوٹ حسن اور ان کی اہلیہ عذرا بیگم نے دعوت کا اصل اہتمام کیا تھا۔ رافع، نافع، ثانیہ اور سدرہ بھی موجود

تھیں۔

رابعہ بیگم بھی اپنی تینوں بیٹیوں کے ہمراہ صبح سے وہیں تھیں۔ بلکہ دعوت کا سارا انتظام انہوں نے ہی سنبھالا تھا۔ رابعہ کل سے آئی ہوئی تھی۔ اس کے شوہر افتخار بھی آفس سے سیدھے وہیں آگئے تھے۔ وردہ اور ناعمہ، ثانیہ، سدرہ کے ہمراہ کھڑی منتظرین کا رول پلے کر رہی تھیں۔

گویا ”حیات والا“ سے تعلق رکھنے والے سب ہی افراد وہاں موجود تھے۔ دسترخوان پر رنگارنگ ڈشیں لڑکیوں کے بے پناہ شوق کی مرہون منت تھیں۔ سب ہی نے مل جل کر سارا کام انجام دیا تھا۔ ”بھئی۔۔۔ ہر چیز اعلیٰ درجے کی بنی ہوئی ہے۔“ عاشق نے کھانے کو سراہا۔ ”لیکن اس چکن بریانی کا جواب نہیں میرا تو اس سے جی نہیں بھرتا۔ یہ کسی خاص ہندے کی پکائی ہوئی لگتی ہے۔“ اس نے ”منتظرین“ کی جانب دیکھا۔

”پھر آپ نمبر لے لیں۔“ ثانیہ نے وردہ کو گھورا۔ وہ مسکرانے لگی۔

”بھئی۔ سب نے مل جل کر ہی سارا کام کیا ہے۔ مجھ اکیلی کا کیا کمال اس میں۔“

”زیادہ انکسار نہ جتائیں۔“ حمزہ نے اسے دیکھا۔ ”یہ بریانی اپنی زبان آپ کہہ رہی ہے کہ اسے کس نے پکایا ہے۔“

”وردہ۔۔۔ سونا کس آف ہو۔“ عاشق نے اسے دیکھا۔

وہ شرمندہ شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

”چکن بروسٹ عریضہ نے بنایا ہے۔“ فردوس بیگم بولی تھیں۔ ”کھا کر دیکھو عاشق! عریضہ بھی بہت ماہر ہے نت نئے کھانے بناتے ہیں۔“

ماہین تقہمہ مار کر ہنس دی تھی۔

”جب تک میری شادی نہیں ہوئی تھی، عریضہ کو یہ بھی علم نہیں تھا کہ چنے کی دال کون سی ہوتی ہے اور ماش کی کون سی۔ ماش کی دال پکاتے تو ناک بھوں پڑھا کر کھتی، چنے کی دال کا صرف حلوہ اچھا لگتا ہے، آپ سالن کیوں بناتی ہیں اس کا؟“

سب ہی ہنس دیے تھے۔ عریضہ جھینپ گئی۔ ماہین کی نظریں ماں سے ٹکرائیں تو اسے احساس ہوا کہ وہ اسے کڑے تیوروں سے گھور رہی ہیں۔ اسے اپنا قصور تو سمجھ میں نہ آ سکا البتہ کسی غلطی کے سرزد ہو جانے کے احساس سے وہ خفیف سی ہو گئی۔

”آخر تماموں کی نظر نہیں آئے،“ تنہیم کو خیال آیا۔ ”کہاں ہوتے ہیں خالہ جان؟“

فردوس بیگم خاصی پریشان سی ہو گئیں۔ سب ہی لوگ خاموش ہو گئے تھے۔

”ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ اس عریضہ کو کس نے پوچھا۔“ انہیں ایک ہی جواب سوچھا۔

شفیقہ حیات نے ہو کو کڑے تیوروں سے دیکھا ضرور، پھر اماں کی موجودگی کا خیال کر کے خاموش ہو گئیں۔

”صدفے جاواں۔۔۔“ علی نے آم کی قاشوں سے بھری ڈشیں آتی دیکھیں تو تعجب بند کیا۔ ”۴ صل چیز تو اب آئی

ہے۔ آہا!۔۔۔ دسترخوان کی رونق معدے کی ٹھنڈک۔ کنگ آف فروٹس آئی۔۔۔“

اس کا ”آم“ مکمل ہونے سے پہلے ہی ناعمہ اور ثانیہ اسے منہ چڑائی آگے بڑھ گئیں۔ ڈش کو تھامنے کے لیے بڑھا اس کا ہاتھ بھی ہوا میں ابر اتاری رہ گیا۔

”ناٹ فیشو۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”یہ لوڈیئر۔“ نافع نے ڈش پکڑ کر اس کی جانب بڑھا دی۔

”ہاں۔“ اسے اطمینان ہوا۔ ”یہ لڑکیاں تو میری خوراک دیکھ دیکھ کر جلتی ہیں۔ خود ان سے تو چوٹی جتنا بھی

نہیں کھایا جاتا۔“

”چیونٹی جتنا۔“ عاشر نے آنکھیں پھیلانیں۔ ”چیونٹی جتنا کون کھا سکتا ہے میرے بھائی؟“
 ”آم ہوں تو میں چیونٹی جتنا بھی کھا سکتا ہوں۔“ وہ مزے سے قاشیں اڑانے لگا۔ ”غضب کی شے بنائی ہے میرے مولائے صدمے جاواں۔“

”باغ کا گوشہ ہوا اور ایک بڑا سا ”سندھڑی“ ہوا اور بندے کو کیا چاہیے۔“ اس نے مزید گل افشانی کی۔
 ”جی ہاں۔“ ناعمہ جل کر بولی۔ ”سندھڑی“ ختم بھی ہو جائے تو یہ کھکھلی پر تادیر ماؤ تھ آرگن بجاتے ہیں۔“
 حاضرین محفل ہنس دیے سب ہی جانتے تھے وہ آم کا دیوانہ ہے۔
 کھانے کے بعد چائے، کافی کا دور چلا جس کسی نے گرمی سے گھبرا کر چائے، کافی سے معذرت کی۔ اسے کولڈ ڈرنک تھما دی گئی۔

”ہاں بھئی، کچھ اشعار ہمیں بھی سناؤ۔“ عاشر نے تنگ گروپ سے فرمائش کی۔ ”یقین ایسے ایسے من گھڑت شعر سنائیے تم لوگوں کے کہ میں شدت سے تمہاری محفل میں شرکت کا خواہاں تھا۔“
 ”راجع اُدھ کیا غزل بنائی تھی۔“

عید الفطر کی رات تھی شب بھر ہوا خرچا زرا
 ”عاشر بھائی! پوری رات پلک جھپکتے گزر جائے گی آپ کی اگر یہ موضوع چھیڑا آپ نے۔“ ہاشم نے کہا۔
 ”رات۔“ وہ زیر لب بڑبڑایا پھر چونک کر اس نے رسوا چوہا دیکھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔
 ”رات تو کسی کے نام ہے بھئی۔“ وہ ہست دھیرے سے بولا۔
 ”سوائے“ اس کے کوئی نہ سن سکا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

سوئی ہوئی ایمان کو اس نے مومن کے برابر لٹایا اور جھک کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔
 ”کتنی پیاری ہو گئی ہے۔ چھوٹی سی تھی جب گیا تھا میں۔ اس کے منے منے ہاتھ پاؤں یاد آتے تھے تو میرا دل اسے پیار کرنے کے لیے چل اٹھتا تھا۔ اب تو گول مٹول سی ہو گئی ہے اور گندی پنجنی میرے پاس آتی بھی نہیں۔
 بھئی! اسے بتاؤ میں اس کا پایا ہوں۔“

اس نے چہرہ گھما کر پاس بیٹھی ایمان کو دیکھا۔ وہ دلچسپ نگاہوں سے اسے بچوں کے پاس بیٹھا دیکھ رہی تھی۔
 ایک ہاتھ گال کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ عاشر نے اس کی شرعی آنکھوں میں ہلکورے لیتی محبت کی مٹھاس کو دیکھا۔ لمحہ بھر کے اندر اس کا مود تبدیل ہو گیا۔

”اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہارا کون ہوں۔“ وہ اس کے قریب ہوا۔
 وہ ہنستے ہوئے قدرے دور ہوئی۔

”میرے ہر جانی ہو۔“
 ”اچھا چلو پھر۔ تمہیں اپنی وفا کا یقین دلاتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں بھی معاملات برداشت سے نکلنے جاتے ہیں۔“

”اچھی سنائی کس لیے۔“ وہ اس کے جارحانہ عزائم کی بھنک پا کر چپکے سے دروازہ کے سمت ہوئی۔
 ”کیونکہ آج تمہاری تصویر نہیں تم رو رہو۔“ وہ مزے سے مڑا۔
 اپنے پیچھے خالی کمرہ دیکھ کر اسے ہسی لگئی۔

”کیوتر۔“ وہ بڑبڑایا۔

بچوں کے کمرے سے نکل کر اس نے دیکھا۔ وہ لاؤنج میں بھی نہیں تھی اس نے بیرونی دروازہ لاک کیا۔ کچن کی لائٹ آف کی۔ لاؤنج کی ٹیوب لائٹس آف کر کے زیر پاؤں کے بلب روشن کیے پھر اپنے بیڈروم کی جانب بڑھا۔
 کمرے کا دروازہ کھلتے ہی نازہ گلابوں کی مہک کا بھرپور جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔

”واؤ۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہی رہ گیا۔ استقبال کا یہ انداز اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

پورا کمرہ سرخ گلابوں سے سجا ہوا تھا۔ کمرے کا سابقہ نقشہ قطعاً ”تبدیل شدہ تھا۔“ طرا سیکم سے لے کر فرنیچر کے ڈیزائن اور سیٹنگ تک ہر شے بدل گئی تھی۔

لائٹ گرین اور ڈبل گولڈن کا حسین امتزاج ہر شے میں نمایاں تھا۔ اس پر سرخ گلابوں کی معنی خیز سجاوٹ کسی کا بھی دل دھڑکا سکتی تھی۔

وہ کچھ دیر دروازے کے پاس کھڑا معطر فضاؤں سے لطف اندوز ہوتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ڈرائنگ ٹیبل تک آ کر وہاں پوشاک کا رڈ سجے ہوئے تھے اس نے ایک کارڈ اٹھایا، لکھا تھا۔

وہ کہیں بھی گیا، لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے ابھی مرے ہرجائی کی

عاشق کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اچانک ہی دوبارہ نہایت نرمی سے اس کے گلے سے آ لپٹے تھے اس کی پشت پر گداز وجود کا احساس ملنے لگا تھا۔ عاشق نے اس کی کلائی تھامی اور نرمی سے پھینچ کر اسے اپنے مقابل کر لیا۔

شرقی آنکھوں میں محبت کی جوت جگا، لبوں پر حسین مسکان لیے وہ اسے شب اول کی مانند نوخیز اور حسین نظر آئی۔ روز پنکٹائی میں اس کا مرمیس وجود غضب ناک حد تک حسین اور خطرناک لگ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر کوئی شریر خیال اس کے لبوں پر مسکان بن کر نکلا۔

”ایک کمی رہ گئی۔“ وہ سر ہلا کر تاسف سے بولا۔ ”بات کچھ ادھوری ہے۔“
”اے۔“ اتنان جیسے ذاب۔۔۔ چوٹی تھی۔ ”کمی۔؟ کیا؟“ اس کا جوا اتر گیا۔ ”جبانے اسے کس چیز کی کمی محسوس ہوئی تھی۔“

”بوجھ تو جانیں۔“ وہ بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔
ایقان اپنی جگہ پر استسارہ سوچ میں گم ہو گئی۔

مہلتے گلابوں سے سجا ہوا کمرہ، ہنستے جذبول سے سرشار حسین بیوی، خاموشی کی زبان بولتی تھائی، ”جبانے اسے کس کمی کا خیال آیا تھا۔ اپنی جانب سے تو اس نے کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔“

”سبیل بوجھ پہلے۔“ اس نے پھر اسے چھیڑا۔
”مجھے نہیں پتا۔“ اس نے ہولے سے پیرچ کر اپنی خفگی کا اظہار کیا۔ کتنے ارمانوں سے خود کو سرتپا سنوار کر اس کے قریب آئی تھی۔ وہ محبت کا رتی برابر اظہار کیے بنا مسند نشین ہو گیا تھا۔

ایقان نے خفا خفا نظروں سے اسے دیکھا۔
”ارے بھائی۔۔۔ ادھر تو آؤ۔“

”میں نہیں بھائی والی۔“ وہ اوڑچی۔ ”کوئی سُرکارشتہ نہیں ہے پکارنے کو۔“
”اوہو،“ بھی یہ وہ والا ”بھائی“ نہیں ہے، ”برادرانہ جذبات والا۔“ یہ دوسرا ”بھائی“ ہے۔ چلو ”من بھائی“ ادھر تو

”اؤ اب خوش۔“
اسے ہنسی آگئی۔ ہستے ہوئے وہ اس تک چلی آئی۔

”فرمائیے، ہرجائی۔“ وہ اس کے قریب بیٹھی۔
”ڈر نہیں لگتا ایسے پکارے ہوئے۔“ عاشق نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”اوہوں۔“ اس نے مزے سے نفی میں سر ہلایا۔ ”پابہ زنجیر کیا اور“ اسے ”چھوڑ دیا۔ ہم تو اس تصور کے تحت مزے سے رہتے ہیں۔“

”وہ۔۔۔ اس قدر بے فکری۔“ اس نے سراہا۔

”جو اپنا ہو، وہ کہیں نہیں جاتا اور جو چلا جائے، وہ اپنا نہیں ہوتا۔ فکر سے کیا حاصل۔“ ایقان نے اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکا۔
 ”اور پھر تمہاری آنکھیں تو سیاہ ہیں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کہتے ہیں ہر جانیوں کی آنکھیں براؤن ہوتی ہیں۔“
 ”تمہاری آنکھیں تو براؤن ہیں۔“ وہ بھی مسکرایا۔

”پھر غلط کہتے ہوں گے۔“
 ”یعنی سیاہ بھی ہو سکتی ہیں۔“ اس نے مصنوعی فکر مندی سے کہا پھر دونوں ہی ہنسنے لگے۔
 ”کمال ہے بار! اس رہ سرج کے لیے تمہیں ایک یہی رات ملی ہے۔ اتنا خوبصورت کمرہ سجایا ہے اور باتیں کر رہی ہو ہر جانیوں کی۔“
 ”جنتاب! ایقان نے اسے گھورا۔ ”اس جرم کے وارنٹ آپ کے نام نکلنے چاہئیں۔“
 ”میں نے تو ایک کمی کا ذکر کیا تھا۔ تم دوسرے چکروں میں پڑ گئیں۔“
 ”بھئی! کیا کی ہے آخر۔“ وہ چڑ گئی۔ ”تم مرد بھی نا، کبھی مطمئن نہیں ہوتے، کبھی تعریف نہیں کرتے، ہمیشہ عورت کی خامیاں ہی ڈھونڈتے ہو۔ اچھا بتاؤ ذرا کیا کی ہے؟“
 عاشر نے اس کا بازو تھام کر اسے قریب کیا۔
 ”شب زفاف کا سا اہتمام کیا ہے۔ دلہن کی طرح نوخیز لگ رہی ہو اور عروسی لباس کی جگہ یہ نائی۔ بات بن نہیں رہی۔“

”عروسی لباس؟“ ایقان حیران ہوئی۔
 ”ہاں، کہاں ہے تمہارا شادی کا ڈریس۔ وہ پہن کر آؤنا۔“
 ”وہ عاشر! یکا یک ہی اس کی پلکیں جھک گئیں۔ گال سرخ پڑ گئے۔“ نہیں بھئی!“
 ”پلیز ایقان۔“
 ”وہ سہمنا نہیں کہاں رکھا ہے عاشر!“ فرمائش نے اسے کنفیوژ کر دیا تھا۔
 ”یاد کر لو۔“ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔
 ”وہ وہ اسٹور میں پڑا ہے عاشر! اوپر سلیپ۔ اتنا بھاری سوٹ کیس ہے۔“
 ”مابودلت آپ کی مزدوری کریں گے میڈم!“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔
 ایقان نے بے بس ہو کر اس کی جانب دیکھا۔
 ”کچھ ہی دیر میں سرخ زرتار لباس اس کے ہاتھوں میں تھا۔“
 ”جاؤ، جلدی سے پہن کر آؤ۔“
 ایقان مسکراتے ہوئے ڈوب رنگ روم کی جانب بڑھ گئی۔
 وہ دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر بہتر پریم ہوراز ہو گیا۔
 ایک پیر ہلاتے ہوئے وہ کسی گہری سوچ میں تھا جب ایقان نے پر وہ کھسکا کر سر ہار نکالا۔
 ”عاشر! وہ جیسے کسی مشکل میں تھی۔“
 ”آں۔“ وہ چونکا۔ ”آؤنا سامنے وہاں چھپ کر کھڑی ہو۔“
 ”میں نہیں آ سکتی۔“
 ”کیوں؟“ وہ سخت حیران ہوا۔
 ”تم ہنسو گے۔“
 ”کیوں ہنسون گا میں، ویڈنگ ڈریس ہے یا کلاؤن ڈریس۔“

”میں نہیں آتی۔“
 ”میں خود آتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدموں سے وہاں تک پہنچ گیا۔
 ایک ہی جھٹکے میں اس نے پردہ ہٹایا تھا۔
 ایقان سرخ لباس میں شرمندہ شرمندہ کھڑی تھی۔
 وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔
 فنگ والی شرت اس نے بڑی کوششوں سے پہنچ نان کرپن تولی تھی لیکن اب عجب ہی عالم تھا۔
 ”یار! ایسا لگ رہا ہے کہ چھوٹے سے پھیلے میں ڈھائی من کی بوری بند کر دی ہے۔“ اس نے تبصرہ بھی کر ڈالا۔
 ایقان بھی ہنسنے لگی۔
 کمرہ ان کی بے ساختہ ہنسی کی پھواروں سے بھیگتا چلا جا رہا تھا۔

دوڑتے دوڑتے اس نے خود کو اکیلا پایا تو رک کر پیچھے دیکھنے لگا۔ وہ وہیں ٹھہر گیا تھا، جہاں اکثر ٹھہر جایا کرتا تھا۔
 رافع مڑ کر واپس اس تک آیا۔
 دونوں ہاتھ سینے پر لیٹے وہ سفید بنگلے کی عمارت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ دوڑنے کی وجہ سے سانسوں کی آمد و رفت
 اشراب تھی لیکن وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔
 ”سب سسٹرو! رافع نے اسے مخاطب کیا۔ ہاشم اسے دیکھنے لگا مگر بولا کچھ نہیں۔“
 ”چلیں۔“
 ”ہوں چلو۔“

دونوں پھر دوڑنے لگے یہ ان دونوں کا معمول تھا، صبح سویرے جاگنگ کے لیے ساتھ نکلتے تھے پھر ایک گھنٹہ
 قریبی پارک میں ہلکی پھلکی ایکسرسائز کر کے سات بجے تک گھر لوٹ آتے تھے۔
 ہاشم حال ہی میں اپنی پڑھائی سے فارغ ہوا تھا۔ وہ ایک اچھی کمپنی سے منسلک ہو گیا تھا، لہذا گھر لوٹ کر وہ نہاد ہو
 کر اپنے آفس چلا جاتا تھا۔
 رافع کی فی الحال چھٹیایں تھیں۔ وہ اپنی اسٹڈی کرتا یا نیند پوری کر لیتا تھا۔ گھر کے دوسرے لوگوں کے برعکس وہ
 ”دونوں صبح سویرے ضرور اٹھتے تھے“ خواہ کتنی ہی دیر سے سوئے ہوں۔ پارک کا ایک چکر مکمل کر کے وہ اپنی مخصوص
 جگہ چلے آئے۔ رافع ایکسرسائز کرنے لگا جبکہ وہ خالی بیچ پر بیٹھ گیا۔
 ”کیا بات ہے استاد؟ خیر تو ہے؟“ رافع نے اسے چھیڑا۔ ”کھوئے کھوئے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔“ ہاشم
 نے کوئی جواب نہ دیا۔

”ڈاکٹر صاحب پھر آگئے خواب میں۔“ وہ ہنسا تھا۔ ہاشم نے خفگی سے اسے دیکھا۔
 ”یہ تمہارے خوابوں کے ٹکٹ ملتے کہاں سے ہیں یا ر! ایک دو ہم بھی خرید لیں۔ بلیک میں ہی سی۔“
 ”کم آن رافع!“ وہ میزا ہوا۔ رافع سیدھا کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا پھر جا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔
 ”کیا بات ہے؟“
 ”امی سے بات کی تھی۔“
 ”پھر؟“

”پھر کیا۔ پھر! اپنی تائی امی کو کیا تم نہیں جانتے۔“ وہ سخت جزا ہوا تھا۔
 ”بڑی میرے بار! ایزی۔“ رافع نے اس کے کاندھے پر بازو رکھا۔ ”ایک مرد کی زندگی کا یہ سب سے مشکل
 مرحلہ ہوتا ہے، مشکل ترین۔ ایک اجنبی کی طرف داری کرنے سے جب اس کے خونی رشتے بدظن ہونے لگ
 جائیں۔ میں جانتا ہوں، وجود و حصول میں بنا ہوا لگنے لگتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وجود کی تقسیم منصفانہ

نہیں ہوتی کیونکہ دل اس حصے میں ہوتا ہے جو حصہ کسی اجنبی لڑکی کا فیور کر رہا ہوتا ہے۔ ”اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔
 ”اور مزے کی بات یہ بھی تو ہے کہ وہ لڑکی اجنبی ہو کر بھی اجنبی نہیں ہوتی۔“ ہاشم نے اسے دیکھا۔ ”یار رافع!
 وہ مجھے اپنی اپنی سی کیوں لگتی ہے۔ اس نے تو کبھی نظر بھر کر میری جانب دیکھا تک نہیں۔ مجھے تو یاد۔ اس کی
 آنکھوں کا رنگ تک نہیں معلوم۔ پھر مجھے اس سے۔۔۔ یار رافع! یہ محبت کیا چیز ہے۔“
 رافع اس کے اس درجہ الجھنے پر مسکرایا۔

”محبت۔۔۔ وہ بھی ایک مخصوص قسم کی محبت۔ میرا تعارف اس محبت سے تمہارے تعلق سے ہی ہے ہاشم۔“
 ”یار! تو نے کبھی محبت کی اس قسم کو اپنے آپ میں ابھرتے ہوئے محسوس نہیں کیا؟“ ہاشم نے اسے عجیب سی
 نگاہوں سے دیکھا۔
 ”نہیں۔“

”میرا وجود تو اندھیرے میں ہے۔“ ہاشم ہنسا۔
 ”وہ کیسے۔“ رافع نے دل دچپی سے اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”محبت تو ایک سورج ہے رافع! وجود کی دھڑلی پر چمکے تو روشنی ہوتی ہے، ورنہ انسان اپنا آپ بھی کھوج نہیں پاتا،
 محبت ایک سمندر ہے۔ اس میں ڈوب کر ہی اپنی ذات کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ موتی ملتے ہیں مگر ہاتھ آتے
 ہیں۔ آپ کو اندازہ ہوتا ہے، آپ کہاں اٹھلے ہیں کہاں گہرے ہیں۔ یار رافع! تو محبت کیوں نہیں کرتا؟“
 رافع بے ساختہ ہنس دیا تھا۔

”میں کروں ہوئی ہوئی تو خود ہو جائے گی۔“
 ”یار! کتنا محروم شخص ہے تو۔ مجھے احساس ہے نہ فکر۔“ ہاشم کو تشویش ہوئی۔
 ”صحیح صبح کیا لطیفے سنا رہا ہے۔“ رافع پھر ہنس دیا تھا۔ ”دنیا کے نوے فیصد انسان پھر تو محروم ہی ہیں۔“
 ”تو ہے اٹھانوے۔“ ہاشم نے تصحیح کی تھی۔ ”میرا اندازہ ہے کہ دنیا میں محض دو فیصد انسان سچی محبت کے حسن
 سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ باقی اٹھانوے فیصد تو خود کو بھی دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں اور ”سے“ بھی۔“
 ”سے؟ کسے؟“

”جس سے محبت کا دم بھر رہے ہوتے ہیں اور کہے؟“
 ”بس ایک تو ہی ہے سچاتے وڈا عاشق۔“ رافع نے طنز سے اسے دیکھا۔ ”بائی داوے“ اتنے پریقین کیوں ہیں
 آپ۔ کیا خبر آپ بھی اٹھانوے فیصد افراد میں شمار ہوتے ہوں۔“
 ”اؤں ہوں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں کہ میں ”خود“ سے محبت نہیں کرتا۔“ س سے کرتا
 ہوں۔ جن اٹھانوے فیصد افراد کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ دراصل اپنی ذات کی محبت میں جتلا ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی
 طلب کی تسکین چاہیے ہوتی ہے۔ وہ اسے محبت سمجھتے ہیں۔ تو جانتا ہے، میرے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے، مجھے
 محبوب کے قرب کی ہوس نہیں ہے۔“

”پھر کیوں تائی امی کو پریشان کر رہا ہے۔“ رافع تمسخر سے ہنسا۔
 ”اؤ نہیں یار! ہاشم نے حشکی سے اسے دیکھا۔ ”تو جانتا ہے نامیری ضد کا پس منظر نہیں جانتا؟“
 ”جانتا ہوں۔“ رافع نے نرمی سے کہہ کر اس کے کاندھے پر بازو رکھا۔ ”تم پریشان مت ہو، ابھی بہت ٹائم
 ہے۔ کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔“

ہاشم سوچ میں گم رہا۔
 ”چلیں۔“ رافع نے اس کا پریشان چہرہ دیکھا۔
 ”ہوں۔“ وہ چونکا۔ ”ہاں چلو۔“
 دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

پہلے کی ہوا سے چہرے پر آتے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے اس نے یونہی نظر اٹھائی تھی۔ وہ دونوں ہتھیلیوں
لے پالے میں چہرہ رکھے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
کھٹلا مسکرا دی۔

”کیا دیکھ رہا ہے میرا بیٹا!“

”آپ بہت پیاری ہیں ممالا تک این ا۔ بجل۔“

”اوہ۔ یعنی آپ نے ا۔ بجلز دیکھے ہیں۔ کیسے ہوتے ہیں؟“ اس نے بہت اشتیاق کا مظاہرہ کیا۔

”آپ جیسے۔“ اس نے سادگی سے بتا دیا۔

”مثلاً۔“ کوئی مشترکہ خولی۔“ اس نے مزید دلچسپی لی۔ رسالہ بند کر کے اس نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”آپ اتنی گوری ہیں ممالا!“

شہلانے ہنسی بمشکل چھپائی۔

”میرے بیٹے کو گوارنگ پسند ہے۔ ہوں۔ دھیان رکھنا بڑے گا۔“

”اور۔ اور۔ انوسینٹ بھی ہیں۔“ عمر نے مزید غور کیا۔ ”ا۔ بجلز انوسینٹ ہوتے ہیں ناممالا!“

”یقیناً ہوتے ہوں گے۔“ اس نے تائید میں سر ہلایا۔

”اور آپ کے بال کتنے اچھے ہیں۔“ اس نے قریب آکر ماں کے بال چھوئے۔ ”ا۔ بجلز کے پروں جیسے۔“

”اوہ مائی گاڈ۔“ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی انیقہ بلبللا کر مڑی تھی۔ ”آپ! یہ آپ کا بیٹا ہے یا مستقبل کا شاعر۔“

اب ہنسے میرا دھیان اس کی باتوں میں لگا ہوا ہے۔ ماں کے حسن کی اس قدر مدح سرائی کر رہا ہے، محبوبہ کی تعریف
میں تو زمین آسمان کے قلابے ملا دے گا۔ کیوں جناب! خالہ جانی کے لیے بھی ایک آدھ قصیدہ ہے آپ کے غیر

مطبوعہ دیوان میں یا نہیں۔“

شہلا بے ساختہ ہنس دی تھی جبکہ وہ منہ بنا کر اسے دیکھنے لگا۔

”ممالا جیسی تو ہیں آپ بھی اگلے سے کیا باتوں۔“

انیقہ کو بھی ہنسی آگئی۔

”یعنی ممالا کی تعریفوں سے ہی جی ٹھنڈا کر لوں اپنا۔ آپ اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔“

”نہیں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”آپ تو خیر ممالا سے بھی زیادہ پیاری ہیں، لیکن مجھے اپنی ممانزادہ اچھی

لگتی ہیں۔“

”اوہ۔“ انیقہ نے ہونٹ سکڑے۔ ”کیا غضب کی صاف گوئی ہے۔ بڑے ناکام قسم کے سیاستدان ہوں گے

آپ۔“ ”وہ کون ہوتے ہیں؟“ وہ سنجیدہ ہوا۔ ”بتاؤ اب۔“ شہلانے پھر سے رسالہ اٹھا لیا۔

انیقہ سر کھانے لگی۔ ”ایک قسم کا پروفیشن ہے۔ جیسے ڈاکٹر ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، قوی اسمبلی کے ممبر

تے ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ سوچ میں گم ہوا۔ ”میرے پاپا کیا تھے؟“

رسالے کے عقب میں شہلا کی پلکیں کانپیں پھر اس نے پورا چہرہ چھپا لیا۔

”تمہیں کوئی آواز آرہی ہے عمر! انیقہ نے اچانک پوچھا۔ ”والٹر کامیوز ک ہے نا۔“

”ہاں۔“ وہ یکدم خوش ہو گیا۔

”چلو پھر بھاگو۔ میرے لیے کارنیو لے لو۔“

”اچھا خالہ جانی! اس نے دوڑ لگا دی۔

انیقہ نے گہری سانس بھر کر سر ہلایا۔

پیاری امی جان!

السلام علیکم

آپ کا خط ملا پانی گویا سر سے اونچا ہونے کو ہے۔ احمد جہاں زیب کو اب وقت ہی سمجھائے گا۔

منور میاں کو سب قصے کا علم ہو چکا ہے وہ سخت طیش میں ہیں۔ یہ دن تو دیکھنا ہی تھا۔ میرے ساتھ کچھ براہو اتو میری بددعا سے بھی شکم چین سے نہ جینے دے گی۔ مجھے احمد جہاں زیب سے یہ امید نہ تھی۔ انسان کو حقیقت پسندی سے کچھ نہ کچھ تو واسطہ ہونا چاہیے۔ اس سے مینا کا قصور پوچھ کر مجھے بتلا دیں۔ آخر مجھے بھی آگے والوں کو مطمئن کرنا ہے۔

سخت پریشانی کے عالم میں ہوں، میرے لیے دعا کیجئے۔

آپ کی بیٹی
بلیس بانو

ربیعہ نے بے دلی سے خط دوبارہ تمہ کیا۔ یہ چوتھا خط تھا جو اس نے پرمھا تھا، لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ احمد جہاں زیب سے بلیس بانو کی کیا ناراضی تھی؟ احمد جہاں زیب نے آخر کیا کیا تھا؟ بلیس بانو ان سے کیوں سخت خفا تھیں؟ اس کا دماغ الجھ الجھ جاتا۔

اتنا بے ضرور اندازہ تھا کہ یہ خطوط اس کی پیدائش سے قبل لکھے گئے تھے یا شاید اس کے ماں باپ کی شادی سے بھی قبل ورنہ کسی خط میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔

ایک خط ایسا بھی تھا جس میں بلیس بانو نے اپنا پتہ بھی تحریر کیا تھا۔ وہ پتہ لاہور شہر کا تھا۔ ربیعہ نے لاہور بھی نہ دیکھا تھا۔ اسے لاہور دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے کئی مرتبہ دادی جان سے لاہور دیکھنے کی فرمائش کی تھی۔ وہ اس کی فرمائش کے جواب میں کچھ نہ کہیں۔ انہوں نے کبھی اپنی بیٹی کا ذکر تک نہ کیا تھا۔ حالانکہ وہ ربیعہ کی فرمائش کے جواب میں اتنا تو بتا ہی سکتی تھیں کہ بلیس بانو نامی ان کی ایک بیٹی ہے جو لاہور شہر میں رہتی ہے۔ ایک معمر تھا جو ربیعہ سے حل نہ ہوتا تھا۔ دادی جان کی وفات سے سوالات سے بھری ایک پٹاری کھل گئی تھی۔ اس کے چاروں جانب مختلف سوالات چکرارہے تھے۔ سب سے بڑا، سب سے تشنہ سوال یہ تھا کہ دادی جان نے بھی اسے اس کے دیگر رشتوں کے متعلق کیوں نہ بتایا تھا؟



”یہ لیجئے۔“ عذرا بیگم نے سلجوق حسن کو چائے کی پیالی تھمائی دی۔

”شکریہ۔“ انہوں نے اخبار ایک جانب رکھ دیا۔ ”لو کے کیا کر رہے ہیں؟ گھر میں کتنے ہی نہیں۔“

”رائف تو اپنے یونیورسٹی کے کام سے ہی گیا ہے۔ تمہارے آنے سے چند منٹ پہلے ہی نکلا تھا۔ نافع شاید حمزہ اور علی کے ساتھ ہے۔ دونوں لینے تو آئے تھے اسے اب کیا خبر کہاں گئے ہیں۔“

عذرا بیگم کے بجائے شفیقہ حیات نے جواب دیا تھا۔

”جھے، نیک، لڑکے دیے ہیں پروردگار نے۔ شکر ادا کیا کرو، بے وجہ دوسوسوں میں نہیں پڑا کرتے۔“ انہوں نے مزید کہا۔

وہ چائے کا برادسا پیالہ تھامے گھونٹ گھونٹ پی رہی تھیں۔

”اے نہیں اماں! دوسو کیسے۔ میں تو یونہی پوچھ رہا تھا۔ کئی روز ہو گئے کسی سے تفصیلی بات ہی نہیں ہوئی۔“ وہ حفاقتی سے بولے۔

”اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ میں کسی قسم کی فکریں نہیں پالتا۔ جانتا ہوں، میری اولاد پر نگاہ رکھنے کے لیے میری ماں ہمہ وقت چوکس و ہشیار رہتی ہے۔ جہاں کوئی کمزوری نظر آئی، وہی مجھے مطلع کر دے گی۔ بیٹے میری سرحدیں ہیں اور ماں میری محافظ۔ میں اطمینان سے ہوں۔“

”جیتے رہو۔“ انہوں نے بیٹے پر شفقت بھری نگاہ کی۔ ”بوڑھے ماں باپ کو اور کیا چاہیے اولاد سے۔ ذرا سی آگاہت ذرا سی محبت، ذرا سا اظہار۔ مشکل گھڑیاں آسان ہو جاتی ہیں۔“ انہوں نے گہری سانس بھری۔

”کیسی مشکل اماں!“

”کوئی مشکل نہیں بیٹے! اللہ کا احسان ہے۔ بس یہ بڑھاپا بذات خود ایک مشکل ہے۔ ساری عمر انسان اپنی آگاہت کا سامنا کر کے ان سے چومکھی لڑ سکتا ہے لیکن جب بڑھاپا آجائے تو اسے آسان بنانے کے لیے دوسروں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑھاپا ایسی مشکل ہے بیٹا! جسے انسان خود آسان نہیں کر سکتا؛ جب تک اسے نہ چاہیں۔“

”آپ کو کوئی شکایت ہے اماں!“ عذرا بیگم نے ساس کی صورت دیکھی۔

”جیتے رہو۔ بیٹیوں جیسی بنی رہی ہو ساری عمر شکایت کیسی۔ میں تو پونہی ایک بات کر رہی تھی۔ اللہ کا احسان، اس نے دو بیٹے دیے، دوسو ہیں۔ میں ایک نے دھتکارا تو دوسری نے گلے لگا لیا۔ کبھی سوچتی ہوں، ایک بیٹا ہوتا اور ایک ہی ہوتا تو میں کہاں جاتی۔“

”ایسا نہ کہیں اماں! یہ تو نصیبوں کے کھیل ہیں۔ کبھی ایک بیٹے کی ماں بھی مسکھی رہتی ہے تو کبھی گیارہ بیٹیوں کی ماں بھی آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے۔“ سلجوق حسن نے خالی پالی پوی کو تھائی۔

”درست کہتے ہو بیٹا! خدا کا شکر ہے اس نے مقدر میں شکھ ہی شکھ لکھا۔“ شفیقہ حیات اطمینان سے بولیں۔

”ہاشم کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں بھابھی جان! اماں اس لیے فکر مند ہیں۔“ عذرا بیگم نے شہر کو ماں کی بے لونی کی اصل وجہ سے آگاہ کیا۔

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات؟“ وہ حیران ہوئے۔

”میں تو یہ کہتی تھی بچے کہ اپنے گھر میں روشنی ہی روشنی ہو تو آدمی پر اپنا چراغ مانگنے کیوں نکلے۔ ماشاء اللہ ہاشم ماں کو دیکھو تو نظرد سے بچاؤ کی دعا یاد آئی ہے۔ میں تو فوراً ”پڑھ کر دم کرنی ہوں۔ ایسا اچھا“ دین پچہ اپنی بچیوں میں سے کسی کا مقدر کیوں نہ بنے۔“

”چھوڑیں اماں۔“ سلجوق حسن نے سر ہلایا۔ ”ان کا بیٹا ان کی عمر بھر کی کمائی۔ ہم کیوں اپنی نیتیں کھوٹی کریں۔ یہ ان کی خوشی ہو۔ خدا ہمارے بچیوں کا مقدر بھی چمکائے گا ماشاء اللہ۔“

”بس بیٹا! بوڑھی جان ہوں، کوئی اور کام تو ہے نہیں۔ بیٹھی سی سوچتی رہتی ہوں۔“ شفیقہ حیات ہنستے ہوئے بولیں۔

”آپ کے سوچنے سے کیا ہوگا اماں! جو ہونا ہوگا، رقم ہو چکا۔“ سلجوق حسن بھی ہنس دیے۔ ”فکر لا حاصل سے اماں حاصل۔“

”درست کہتے ہو۔“ انہوں نے تائید کی۔ ”شاید میرا ایمان ہی کمزور ہے۔“

دو اذہن بجا تھا اس نے کسل مندی۔ گھڑی کی جانب دیکھا۔

ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو بیٹی تھی۔ نظرات نے اسے ذہنی طور پر کچھ بیمار کر دیا تھا۔ عموماً اس پر غمازت کی سی بات طاری رہا کرتی تھی۔

”کون ہے؟“ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”کھولو بیٹی! میں ہوں تمہاری بوا“ سیکینہ۔“

پان زہہ کچے میں شدہ کھلا ہوا تھا۔ ربیعہ نے چٹنی گرا دی۔

باہر سیکینہ بوا کے ہمراہ کوئی اور بھی تھا۔ سیکینہ بوا کے پیچھے کھڑے اس آدمی کو دیکھ کر وہ نبانے کیوں خوف زدہ سی

ہو گئی۔

کلف لگے ہوئے سفید لباس میں ملبوس وہ شخص کچھ نقلی معلوم ہوتا تھا۔ یاہ خضاب سے اس نے سر کے بالوں اور مونچھوں کو گہرا سیاہ رنگا ہوا تھا۔ گلے میں سرخ رومال تھا۔ بالوں کو اس نے تیل کی مدد سے نہایت سلیلا سے جمایا ہوا تھا۔

اس کی آنکھوں کی چمک نے، سید کو خوفزدہ کر دیا۔ سیکنہ بوا منہ میں پان لیے کہہ رہی تھیں۔

”یہ عرفان میاں ہیں، میرے بہنوئی ہیں مگر ہائیں جیسے ہیں۔ تم سے ذرا ایک کام کے سلسلے میں ملنے آئے ہیں۔ تمہیں ذرا سی فرصت ہو گی بیٹی!“

انہوں نے ربیعہ کو دروازے کے پتھوں بیچ المستاد پا کر پوچھا۔

”جی۔“ وہ چونکی۔ ”جی ہاں آئیں۔“

بادل نخواستہ اس نے ان دونوں کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ صحن کے بیچ میں بڑی چارپائی پر وہ دونوں بیٹھ گئے! ربیعہ اپنے لیے پتھن سے اسٹول لے آئی۔

”کیسے سیکنہ بوا!“ وہ اسٹول پر ٹک گئی۔

”دیکھو بیٹی! بات سراسر تمہارے بھلے کی ہے، اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ ذرا ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا۔“ انہوں نے پیک ادھر ادھر دیکھ کر نگل ہی لی۔

”ہاں۔“ پھر وہ کھٹکنا کھاریں۔ ”بات کچھ یوں ہے کہ میں نے اپنا گھر انیس بیچ دیا ہے۔ لاکھ روپیہ انہوں نے نقد دیا ہے، بقیہ پچاس ہزار قسطوں میں دے دیں گے۔“

ربیعہ پلکیں جھپکاتے بنا انہیں دیکھتی رہی۔

”ہاں تو۔ بات کچھ یوں ہے کہ یہ میرے گھر گرا کر چوڑی کا کارخانہ بنانا چاہتے ہیں۔“ سیکنہ بوا کچھ نموس تھیں۔ ”تو۔ بات کچھ یوں ہے کہ جگہ کم پڑ رہی ہے۔“

انہوں نے ڈرون ٹھاکرا ان صاحب کی جانب دیکھا تھا۔

”دیکھو بیٹی!“ وہ مدد کا اشارہ کر اچانک شروع ہوئے۔ ”اس جگہ کی مارکیٹ ویلو کچھ خاص نہیں، اس لیے میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ لاکھ دے سکتا ہوں۔ لاکھ نقد پچاس ہزار قسطوں میں۔ سیکنہ بہن کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ تمہارے ساتھ بھی۔ بلکہ مزید نرمی کی جاسکتی ہے۔ میں تمہیں ایک ساٹھ کروڑوں گا۔“

”مجھے ایک ساٹھ کروڑوں گے؟“ ربیعہ سمجھ کر بھی انجان بنی تھی۔ ”میں سمجھی نہیں انکل!“

عرفان شوکت نے ایک نگاہ اس کے بھولے چہرے پر ڈالی۔

”میرا مطلب ہے میں تمہیں ایک لاکھ ساٹھ ہزار دوں گا۔ سیکنہ بہن کو دی گئی رقم سے دس ہزار زیادہ۔“

”مگر آپ مجھے رقم کیوں دینا چاہتے ہیں؟“

”یہ تمہارا گھر خرید رہے ہیں نا بیٹی۔ اتنے اچھے دام لگ رہے ہیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ فوراً ہائی بھر لو! لڑکی ذات ہو، تمہیں تو سسرال جانا ہے بیاہ کر۔ اچھا ہے تمہارے لیے جینز کی رقم کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”ہاں۔“ وہ زرا سا جھک کر بڑی رازداری سے گویا ہوئیں۔

”ایک رشتہ بھی لائی ہوں تمہارے لیے۔ ہیرے جیسا لڑکا ہے۔ اپنا کاروبار ہے۔ سونگی تو خوشی کے مارا پھولی نہ ساوکی۔ لیکن وہ تو بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ مکان کا کام تو ایک طرف ہو جائے۔“

ربیعہ خاموش ہو گئی۔ اس کے دماغ میں ٹائم بم کی ٹیک ٹیک بج رہی تھی۔ خطرے کا الارم سنائی دے رہا تھا۔ عرفان شوکت کی سرور چالاک نظریں چاروں اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے اس نے بتا رہا تھا۔

خرید لیا تھا۔

”بولو بیٹی! کب رقم دیں تمہیں؟“

”بات دراصل یہ ہے ہوا۔“ وہ ٹہر کر بولی۔ ”یہ گھر میری پھوپھو کا ہے۔ ان کے نام سے ہی اس کے کاغذات بنے ہوئے ہیں۔ اور پھوپھو لاہور میں رہتی ہیں۔“

سکینہ بوا اور عرفان شوکت کو جیسے ایک دھچکا لگا تھا۔ ان کے چہرے اتر گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

”پھوپھو؟“ پھر سکینہ بوا بولیں۔ ”کون پھوپھو؟ ہم نے تو کبھی نہیں سنا کہ تمہاری کوئی پھوپھو بھی ہیں۔ نہ کبھی اتنے سالوں میں تمہاری دادی نے ہی کوئی ذکر کیا۔ اگر ان کی کوئی بیٹی ہوتی تو کیا ان کے مرنے پر بھی نہ آتی؟ تمہارا بارانہ بنتی؟“

ربیعہ پھر خاموش ہوئی۔

”اب میں آپ کو کیا بتاؤں بوا۔“ وہ سوچ سوچ کر بولی رہی تھی۔ ”دراصل یہ سب کچھ بہت پرانی چپقلش کا نتیجہ ہے۔ پھوپھو سے دادی جان کی لڑائی تھی، بہت زیادہ لڑائی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے روادار نہ تھے اسی لیے پھوپھو کبھی یہاں نہیں آئیں مجھے بھی یہ سب باتیں ان کے خطوط سے پتا چلیں۔ لیکن اب میں نے پھوپھو کو مل لکھا تو ان کا جواب آیا وہ اور منور پھوپھو بہت جلد یہاں پہنچ رہے ہیں۔ شاید ہفتہ بھر میں۔ میں آپ کو ان سے ملادوں گی اور مجھے یقین ہے وہ آپ کی پیشکش پر ضرور غور کریں گے۔ کیا کہا تھا آپ نے؟ ایک ساٹھ ارے ہاں آیا۔ پھوپھو نے لکھا ہے کہ پھوپھو جان بھی جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتے ہیں۔ پھر تو سمجھ لیں بات بن ہی گئی۔“

عرفان شوکت کھڑا ہو گیا۔

”اچھا بی بی! ہم پھر آئیں گے اور۔۔۔ ہاں۔۔۔“

اس نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے سکینہ بوا کی جانب دیکھا۔

”میں نے پھوپھو کو دو ساٹھ کہنا بلکہ تین۔ تین لاکھ۔“

”تین لاکھ؟“ ربیعہ نے آنکھیں پھیلانیں۔ ”اتنے زیادہ پیسے اس چھوٹے گھر کے؟“

”ارے ایک سو بیس گز کا پلاٹ ہے۔“ سکینہ بوا بے ساختگی میں بول گئیں پھر جیسے انہوں نے دانتوں میں

دبان دیالی۔

”اچھا۔۔۔ چلیں پھر؟“ عرفان شوکت نے سکینہ بوا سے پوچھا تھا۔

”ہاں! وہ بے دلی سے کھڑی ہو گئیں۔“



”آئے ہائے بیٹی! بھلا بتاؤ۔“ نفیسہ خالہ کی حیرت اور صدمے سے آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔

”اس سکینہ کو خناس نے دیوانہ کر دیا؟ لا حول ولا قوۃ الا باللہ! ارے یہ نہ سوچا، بے باپ کی بیٹی بے چہت کی

ہی ہو گئی تو کہاں جائے گی؟ بھلا بتاؤ تمہارے ذہن میں اگر ایسی چالاکی کی بات نہ آتی تو وہ مواتو تمہیں ٹھک ہی

لہتا۔ بار سال گنچنے کے گھر کی قیمت چار لاکھ لگی تھی لیکن وہ نہ مانی اس کا تو مکان بھی خراب حالت میں تھا۔ تمہارا تو

انداز رکھے ایسی اچھی حالت میں ہے کہ پانچ میں چلا جائے، لیکن میرے منہ میں خاک کیوں جائے بھلا بتاؤ۔“

ربیعہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کا ذہن عجب بھول بھیلوں میں الجھا ہوا تھا۔

”میں تو کہتی ہوں بیٹی۔۔۔ جھوٹ کوچ کر دو۔“ نفیسہ خالہ کچھ سوچ کر بولیں۔

”اگر تمہارا دور پرے کا کوئی رشتہ دار ہے تو خط لکھ کر اسے بلواؤ، ان کمینوں کو کچھ توکان ہوں گے کہ بچی تنہا

نہیں۔ یہ تو سمجھ رہی ہیں جیسے لوٹ کا مال ہے۔ بھلا بتاؤ۔“

ربیعہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

”پھوپھو کا پتہ ملا تو ہے ایک خط میں۔۔۔ میرا خیال بھی یہی ہے کہ میں اس پتے پر خط بھیج کر دیکھوں کیا جواب

آتا ہے۔“

”تب تلک ان مویں کو یونہی الجھائے رکھو۔ تاس پیٹوں کو۔“ پھر انہوں نے بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”ایک بات کہوں بیٹی! برا تو نہیں مانو گی؟“

ربیعہ نے مسکرا کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”نہیں خالہ۔۔۔ برا نہ منے والی بات اول تو ہوگی نہیں اگر ہوئی بھی تو میں ہرگز رانہیں مانوں گی۔“
 ”تم کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ خالہ کے دل میں کوئی لالچ ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات والا حساب ہے۔ میرا بیٹا کسی طور تمہارے لائق تو نہیں پھر بھی تمہاری حفاظت کے خیال سے کہتی ہوں۔ اگر تمہاری مٹکنی بدر سے ہو جائے تو۔۔۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی تھیں۔ پھر انہوں نے ربیعہ کا تیزی سے سفید پڑا چہرہ دیکھا۔

”نہ نہ بیٹی! کوئی زور زبردستی کا سودا نہیں۔ تمہاری اپنی خوشی ہے۔“
 ”چھاپھو ٹوٹی رہنے دو میں بھی دیوانی ہوں بھلا بتاؤ۔“ وہ اس کی حالت سے شرمندہ تھیں۔

”نہ جانے کہاں رکھ دیے سب درازیں الٹ پلٹ کر دیکھ چکی ہوں۔ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ایک میری یہ تختہ کمرے میں بھی کم بختی کی ماری ہوئی۔ چیزیں رکھ کر بالکل بھول جاتی ہوں۔“
 عریضہ نے بے فکری سے لی۔ وی دیکھتے ہوئے ایک نگاہ بڑبڑ کرنی ماں پر ڈالی پھر دوبارہ لی۔ وی کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ان کو دیکھ لو۔ اللہ کا نور۔ ارے میں کہتی ہوں تمہارے داغ اگر یہی رہے تو سرال جا کر کیا غضب ڈھاؤ گی ان غریبوں پر منہ بھر مجھے کو سیں گے کہ ماں نے یہی تربیت کی ہے۔“
 اس کی بے پروائی دیکھ کر انہیں جلال ہی آ گیا۔
 ”یہ بلیجے اب مجھ غریب کی شامت آئی۔“ وہ چڑ گئی۔ ”چیزیں آپ رکھ رکھ بھولیں مسرال میں طعنہ مجھے ملے کوئی تک بختی ہے امی!“

”ارے ماں سے دو لفظ تسلی کے تو کہہ سکتی ہو۔ پوچھ تو سکتی ہو کہ کیا کھو گیا۔ کس لیے گھنٹہ بھر سے پریشان ہو رہی ہوں۔ ساتھ ڈھنڈوانا تو علیحدہ بات، کم سے کم زبان تو ہلا سکتی ہو۔ پھر کے بت کی سی بے پروائی سے بیٹھی ہو۔ ارے آگ لگے ان لی۔ وی والوں کو۔ لڑکیوں کو بالکل ہی نکلا کر چھوڑا ہے۔ بس فیشن کی باتیں کروالو۔ یہ ”ان“ ہے یہ ”آوٹ“ ہے میں کہتی ہوں مسرال میں جا کر خبر ہوگی ”ان“ ہو یا ”آوٹ“ ہو۔“
 وہ سخت جل بھن چکی تھیں۔ فیشن سے متعلق چلتا ہوا پروگرام دیکھتی عریضہ کو انہوں نے بالکل ہی بے زار کر دیا۔

”موت سٹی وی آف کر کے اس نے خفگی سے ماں کو دیکھا۔
 یہ ”مسرال نامہ“ نہ جانے کب تک چلے گا آپ کا۔“ پوائنٹس ختم ہی نہیں ہوتے۔ روز ایک نیا نکتہ سننے کو ملتا ہے۔“

”ماں کاجی جلاؤ گی تو یہی کچھ سننے کو ملے گا ہاں۔“ وہ اس کے برابر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں دا بنے لگیں۔
 ”کیا کھو گیا ہے؟“ اسے پوچھنا ہی پڑا۔

”ارے تمہارے باپ کے کچھ کاغذات تھے ایک خاکی لفافے میں چند روز قبل مجھے تھمائے تھے۔ میں بھول کے نچانے کہاں رکھ بیٹھی۔ اب مل کر نہیں دیتے۔“

”کچن میں جو بیکسٹس والا کیبنٹ ہے۔ اوپر چھوٹا کیبنٹ اس میں بھی ایک براؤن لفافہ پڑا ہے وہی تو نہیں؟“

فردوس بیگم نے لٹکے بھر سوچا پھر ان کا چہرہ کھل اٹھا۔
 ”ارے ہاں! وہیں تو رکھ دیے تھے اس دن۔“
 ”آپ کا بھی جواب نہیں امی!“ عریضہ مسکرا دی۔

”کوئی بھلی سی جگہ تو دیکھ لیا کرس چیز رکھنے سے پہلے کل ہاشم بھائی کے دوست آئے تھے تو میں نے بسکٹ لینے کے لیے کھولا تھا کیبٹ اب اگر میں نہ دیکھتی تو دن بھر کی خواری تھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیزار ہو جاتے سب ایک۔“

”ہاں لیہ تو ہے۔“ نہیں اعتراف کرنا پڑا۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کر رافع اندر چلا آیا۔

”السلامو علیکم۔۔۔ تائی امی ہاشم گھر پر ہے؟“ وہ کچھ جلدی میں تھا۔

”نہیں ہاشم تو نہیں ہے تم کہاں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو آؤ دو گھڑی بیٹھو تو۔“

”اس کے ساتھ حیدر جو کہ تک جانا تھا ایک دوست سے ملنے، میری بایک نافع لے گیا ہے۔“

”چھاتیوں کو ہاشم کی نہیں، موٹر سائیکل کی ضرورت ہے۔“ رافع قدرے جربز ہوا۔

”عشرہ! جاؤ، علی کی دراز سے اس کی موٹر کی چابی نکال لاؤ وہ تو سو رہا ہے اٹھے گا دو تین گھنٹے بعد۔“

رافع نے قدرے سکون کا سانس لیا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔

عشرہ اٹھ کر علی کے کمرے کی سمت برہہ گئی۔ فردوس بیگم بولتی رہیں۔

”تم لڑکے تو بس۔۔۔ ایک تم ہو، ایک تمہارا ہوائی گھوڑا ہوا اور کسی شے کی ضرورت نہیں تمہیں جسے دیکھ لو

اس کا یہی حال ہے۔ ہمارے والے تو ایسے تھے ہیں، الگ الگ موٹریں لے کر دی ہیں باپ نے اور معمولی سا کام

کہہ کر دیکھ لو، ٹکڑوں سے لگتی ہے، سر پر جھپکتی ہے۔“

رافع خاموشی سے بیٹھ کر سننے پر مجبور تھا۔ عشرہ چابی لے کر باہر نکلی تو اس کی صورت دیکھ مسکرا دی۔

”یہ لیں رافع بھائی آپ کا حیدر جو کہ والا دوست انتظار کر رہا ہو گا۔ جلدی سے چلے جائیں۔“

”تھینک یو!“ وہ ممنونیت سے گویا ہوا۔

سیاہ جینز اور رسٹ کلر شرٹ میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ گھنے بالوں کی سیاہی، چمک بن کر بکھر رہی

تھی۔ صاف ستھرا، دھلا، دھلایا، وہ جیسے لائڈری سے نکل کر آیا تھا۔

فردوس بیگم کی نگاہوں نے دروازے تک اس کا تعاقب کیا۔

”ہائے۔ ہائے!“ انہوں نے سر د آہ بھری۔

عشرہ نے چونک کر ماں کی صورت دیکھی۔ اس سر د آہ کا مطلب وہ بخوبی جانتی تھی۔

آج اس نے خط لکھنے کا مکمل تہہ کر لیا تھا۔

داوی جان کے صندوق میں اچھے بھلے خطوط تھے۔ وہ محض چند ایک ہی پڑھ پائی تھی۔ وہ سب خط پھپھو کے

نہیں تھے۔ کئی ایک کے متعلق تو وہ سمجھ ہی نہ سکی تھی کہ خط کس نے بھیجا تھا اور اس کے متن کا کیا مقصد تھا۔

کاغذ قلم لے کر وہ تادیر سوچتی رہی۔ اسے کیا لکھنا تھا اور کیسے لکھنا تھا اس نے کب کسی کو خط لکھا تھا۔ زندگی

میں پہلی بار تو وہ خط لکھنے بیٹھی تھی۔

پھر بہت سوچ سوچ کر اس نے لکھنا شروع کیا۔ اپنا تعارف کرایا۔ داوی کے انتقال کی بابت لکھا اپنے اکیلے پن

اور تنہائی کا ذکر کیا۔ محلے والوں کی بدینتی کا احوال لکھا۔

”آخر میں اس نے اس اندیشے کا ذکر کیا کہ نہ جانے یہ خط بلقیس بانو تک پہنچتا بھی ہے یا نہیں، حالانکہ اس ذکر

کی چنداں ضرورت نہ تھی کیونکہ خط نہ ملنے کی صورت میں وہ یہ جملہ پڑھ ہی نہیں سکتی تھیں اور خط مل جاتا تو اس

نیلے کی ضرورت نہ تھی۔

خط مکمل کر کے اس نے لفافے میں رکھا اور بند کر کے کچھ سوچنے لگی۔

جس خط میں اسے پھپھو کا پتہ ملا تھا وہ تو اس نے بے پروائی سے دوبارہ لکڑی کے صندوق میں ڈال دیا تھا۔ اسے

پھر سب کچھ از سر نو کھنگالنا پڑا تھا۔ اس میں تو بہت کاغذات تھے۔

لیکن بہر حال یہ کام تو کرنا ہی تھا۔

اس نے پھر الماری سے چابی نکال کر صندوق کو کھولا اور سب کانڈزات باہر نکال لیے۔ پرانے بلوں، تاروں، بینک کی رسیدوں اور خطوط کا وہ ایک بے ہنگم مجموعہ تھا اس میں سے کچھ ڈھونڈنا خاصا مشکل کام تھا۔ وہ تہہ شدہ کانڈز کھول کھول کر دیکھنے لگی۔ ایک پرانے تار نے نجانے کیوں اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی۔ ربیعہ نے تحریر بھی لکھا تھا۔

”اطلاعی دی جاتی ہے کہ آپ کی بیٹی بلقیس باوجود دن علالت کے بعد انتقال کر گئی ہیں۔ جلدی پہنچیں۔“

آپ کا داماد

منور امین

ربیعہ کی نگاہوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ امید کی روشن شمع کسی نے پھونک مار کر گل کر دی تھی۔ چکراتے سر اور بے قابو ہوتے دل کے ساتھ وہ بڑی مشکل سے بستر تک پہنچی تھی۔

○ ○ ○

سنہری شام اپنے خوبصورت پردوں کو آہستہ آہستہ بند کرتی جا رہی تھی۔ موسم میں خنکی اور ٹھنڈ کا احساس بڑھنے لگا۔

”چلیں اب؟“ ایقان نے برابر میں بیٹھے ہوئے عاشق کو دیکھا۔

”اول ہوں!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

دونوں بچے ان سے قدرے فاصلے پر بیٹھے اب تک گھروندے بنا رہے تھے۔

”اس قدر حسین شام سے میں اتنی آسانی سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ اس کے ایک ایک لمحے سے لطف و مسرت کشید کر کے اپنے اندر بھر لیتا چاہتا ہوں۔“

اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔ ایقان کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ وہ دور اٹھتی ہوئی لہروں پر نگاہ جمائے نجانے کیا سوچ رہا تھا۔

”عاشق!“ اس نے نرمی سے پکارا۔

”ہوں!“ اس نے نگاہوں کا رخ موڑا سے دیکھا۔

”کیا بات ہے۔ اچانک اداس کیوں ہو گئے؟“

”کبھی کبھی ہر بات جھوٹ کیوں لگتی ہے ایقان! وقت، خوشی، مسرت، اپنا آپ۔ میں کہیں بیٹھے بیٹھے اچانک خلاؤں میں معلق ہو جاتا ہوں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جیسے مجھے کسی شے کی طلب ہو اور اس شے کا نام سمجھ میں نہ آئے، جیسے میں کچھ جانتا چاہتا ہوں، کچھ ایسا جس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا۔ میں خوش ہوتے ہوئے اچانک اداس کیوں ہو جاتا ہوں؟ میں ایک ہتے بستے منظر سے اچانک غائب ہو جاتا ہوں، کیوں ایقان؟ یہ کیسی کنفیوژن ہے؟“

ایقان اداسی سے مسکرا دی۔

”اپنی کیفیات کو تم سمجھ نہیں پاتے عاشق! ابھی تم میرے ساتھ ہو، اپنے بچوں کے ساتھ ہو، بھرپور طریقے سے یہ وقت انجوائے کر رہے ہو لیکن تمہارا لا شعور تم سے کہہ رہا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد تمہیں اس بھرپور خوبصورت منظر سے غائب ہو کر کہیں اور ظاہر ہونا ہے۔ تمہارا شعور تمہیں خوشی دے رہا ہے اور لا شعور اداسی بس یہی ساری کنفیوژن ہے!“

”میں جانے کے خیال سے اداس ہوں؟“ وہ بچوں کی طرح پوچھنے لگا۔

ایقان کچھ بول نہ سکی۔ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”تم بھی! اس مو ایقان؟“ اس کے لہجے میں محبت کی گرمی جاگنے لگی۔

”ابھی تو نہیں ہوں۔“ وہ جان بوجھ کر ہنس دی تھی۔ ”میں آنے والی جدائی کا سوچ کر قربت کے لمحوں کی خوشی یاد نہیں کرتی۔ اور آنے والے ملن کی گھڑیوں کا سوچ کر وقتی جدائی کا دکھ بھول جاتی ہوں۔ آپ کی طرح قنوطی میں ہوں جناب!“

”اچھا!“ وہ بھی مسکرایا۔ ”اور وہ میرے فون سے موٹے موٹے آنسو کس کے نکلتے تھے؟ اس کے لبوں پر ایک سٹراہٹ لانے کے لیے میں اپنی توانائیاں صرف کرتا تھا؟ میڈم راجنیت پند!“

ایقان شرارت سے ہنسنے لگی۔ وہ محض لباس کا دھیان بیٹانا چاہتی تھی اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

”ارے وہ تو یونہی تمہیں یہ یقین دلانے کے لیے کہ تمہاری پیاری بیوی کس قدر با وفا ہے۔ ان رات تمہاری ہدائی میں آئیں بھر بھر کر ملک میں گرمی کی شدت کم کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔“ عاشق کو ہنسی آگئی۔

”یعنی محبوبن بھی ہے۔ ٹوان یون!“ اس نے سر ہلایا۔

پھر چند لمحوں میں وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”شاید تمہیں احساس نہیں ہے ایقان! اپنے ملک میں اپنے بچوں کے ساتھ اپنی چھت کے نیچے رہتی ہوئی عورت ان جذبات و احساسات کا اندازہ نہیں لگا سکتی جو ایک برائے دیس میں پرانے لوگوں کے درمیان رہ کر ”اپن“ کی یاد میں دن گننے والے مرد کے ہوتے ہیں۔ بہت مشکل ہے یا۔ بہت مشکل، سخت قسم کی مزدوری لے کر گھر لوٹنے والے مرد کو بیوی کی کتنی ضرورت ہوتی ہے محض ”وقتی جدائی“ کے رومانس میں ڈوبی ہوئی عورت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔“

وہ بکھرا بکھرا سا لگ رہا تھا۔ ایقان پیار سے اس کا ہاتھ سہلانے لگی۔

”تو پھر لوٹ آؤ۔ ہمیشہ کے لیے۔ یوں بھی تمہارا کانٹریکٹ تو دو سال کا تھا عاشر۔“

عاشق اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایقان کو اس کی نظریں سمجھ میں نہ آئیں۔

”کیا بات ہے عاشر؟“

”میرا ایک نئی کمپنی کے ساتھ چار سال کا کانٹریکٹ ہو گیا ہے ایقان!“ اس نے بتایا۔

ایقان کو یوں لگا جیسے عاشق نے اسے خبر نہ سنائی ہو۔ زور سے دھکا دیا۔ وہ بیٹھی ہوئی تھی پھر بھی اس نے خود کو لڑکھاتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے آنکھیں زور سے بند کیں پھر کھولیں۔ پھر بند کر لیں۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی تھی۔

”ایقان۔“ عاشق نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”پلیز عاشر۔ کچھ مت کہو!“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ جسم ٹھنڈا ہونے لگا تھا۔

”ایقان۔ میری بات سنو!“

”کچھ نہیں سننا مجھے۔ کچھ بھی نہیں۔“ اس نے شدت سے آنکھیں میچ کر نفی میں سر ہلایا۔ ”تم نے تم نے مجھے بتائے بغیر۔ مجھ سے پوچھے بغیر۔ نیا کانٹریکٹ سائن کر لیا؟ کچھ نہیں سوچا میرے بارے میں؟ کچھ بھی نہیں! کتنی آس سے، کتنی امیدوں سے روزِ نیا دن دیکھتی ہوں۔ سوچتی ہوں، جدائی کا ایک دن گزر گیا۔ پھر ایک نئے دن کو گزارنے کے طریقے سوچتی ہوں۔ لیکن تم یہ سب کہاں سمجھ سکتے ہو۔ تمہارے نزدیک تو یہ سب کچھ محض ”رومانس“ ہے۔ حقیقت تو وہ ہے جس کا سامنا تم کرتے ہو پر ایسا دیس پرانے لوگ، تھکن سے چور مرد کی ضرورتیں۔ باقی سب کچھ ”رومانس“ ہے۔“

”ایقان۔ ایقان۔ پلیز۔“ عاشق نے اسے نرمی سے تھاما۔

وہ خاموش ہو کر ہانپنے لگی۔ عاشق نے پاس پڑی بوتل سے گلاس بھر کر اسے تھمایا۔ وہ ایک سی سانس میں سارا ہالی ہو گئی۔

”میں نے اپنی خوشی سے یہ کانٹریکٹ سائن نہیں کیا ہے ایقان! بہت سوچا میں نے۔ بہت غور کیا۔ اپنے بچوں کے لیے میں نے یہ قربانی دی ہے۔ ابھی یہ چھوٹے ہیں، ان کی ضروریات محدود ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ ہم اپنے ”آج“ کی قربانی دے کر اپنا ”کل“ محفوظ اور خوشحال بنالیں۔ کل کو ہمارے بچے بڑے ہو کر اگر اعلا اور اول میں تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں تقاریر نہ آگھیریں۔ ہم نے اپنی تیاری مکمل رکھی ہو۔ اگر چند ایک سال اک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو یہ نقصان کا سودا نہیں ہے ایقان! میں اسی لیے تم سے اپنی کیفیات کا ذکر کر رہا تھا کہ تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ صرف تم میری کمی کو محسوس کرتی ہو۔ یہ دوری مجھ پر اثر انداز نہیں ہوگی؟ میں تمہاری تمہارے جذبات کی بہت قدر کرتا ہوں۔“

”چار سال۔“ اس کی آواز رندہ گئی۔

”میں آتا رہوں گا۔“

”کتنی بار آؤ گے؟ چار سالوں میں زیادہ سے زیادہ دو بار۔ بس نا!“ اس نے سر جھٹکا۔

”بس یہی چار سال ایقان! آئی برا مس۔ ہمارے بچوں کے اچھے مستقبل کی خاطر۔“

ایقان خاموش ہو گئی پھر اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

”بچے! بچے کہاں گئے؟“

عاشق چونک کر کھڑا ہوا تھا۔ ایقان اس کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی۔

ایمان اور مومن کھیلے ہوئے قدرے فاصلے پر چلے گئے تھے وہ دونوں تقریباً ”دوڑتے ہوئے ان تک پہنچے

ایقان ایمان کو اٹھالیا اور عاشق جھک کر بیٹے کا چہرہ جو منے لگا۔

”آئے ہائے! بھلا بتاؤ!“ فکر مند سی نفیسہ خالہ نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”بے چاری بچی کو بیمار کر ڈالا فکروں نے۔ میں تو جی ہی جی میں داد دیا کرتی تھی اس کی ہمت کو۔ ایسی دھان پان نازک مزاج بچی اور حالات کی اتنی سختی یوں مروا گئی۔ سے جمیل گئی۔ مگر مصیبت بھی کبھی تنہا آتی ہے! بھلا بتاؤ! ایک تو دادی کی بے وقت موت سے بچی پریشان اور ادھ موئی اس پر لالچ، کینے لوگوں کی بری نظریں بھی جان کو چٹ گئیں۔ بچی بیمار نہ ہو تو اور کہا ہو۔ اتنا تیز بخار بھلا بتاؤ!“

ربیعہ نے ادھ کھلی آنکھوں سے ان کا پریشان چہرہ دیکھا۔

”میں ٹھیک ہوں خالہ! آپ بلا وجہ پریشان ہو رہی ہیں۔“ اس کی آواز حد درجہ دھیمی تھی۔

نفیسہ خالہ نے شاید اس کا جملہ ٹھیک سے سنا بھی نہیں۔

”بدر کو بھیجا تھا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔ وہ خبیث بھی کہاں کان دھرتا ہے۔ جنے کہاں کو نکل گیا۔ مجھ ان پڑھ کو تو دوائیوں کی اتنی سوجھ بھی نہیں۔ کوئی اٹنی سلفی دوا اٹھا کر دے۔ بی تو بچی تو پہلے ہی اتنی کمزور ہے۔“

دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ حاکم چچا اندر چلے آئے۔

”کیسی طبیعت ہے اب اس کی؟“ ماتھے پر ٹنگن لیے وہ نفیسہ خالہ سے مخاطب ہوئے۔

”کسی سی ہے!“ وہ ہزاری سے بولیں۔ ”ظہیرا ایک نہ دینے دو۔“

اگلا جملہ انہوں نے کمال مہارت سے یوں ادا کیا تھا کہ ان کے اپنے کانوں سے آگے نہ جانے پائے۔

”ڈاکٹر کو بلا یا؟“

”۴۔ ۵ تو میاں! تم لے آؤ ڈاکٹر کو۔ میں اس بچی کو دو سہاٹہ دوں کہ ڈاکٹر لوں گے پیچھے دوڑتی پھروں۔“

”۴۔ ۵ کسی بیٹے کو کہا ہوتا۔ میں تو دکان سے ابھی لوٹا ہوں تو سمیعہ نے مجھے خبر دی۔ خیر میں ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔“

پھر انہوں نے جھک کر ربیعہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

”اوہو۔۔۔ جل رہی ہے!“ انہوں نے تشویش سے کہا ”میں ابھی ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔“

اسی لمحے در ایک شخص کو لے کر اندر داخل ہوا۔

”السلام علیکم چچا جان!“ اس نے حاکم چچا کو دیکھ کر مودبانہ انداز اپنایا۔

”ہوں!“ انہوں نے ناگواری سے محض اتنا ہی کہا۔ ”یہ کون ہے؟“

”ڈاکٹر ہے۔ اپنے محلے کا ڈاکٹر تو چھٹی پر ہے۔ میں تو بڑے اسپتال سے لایا ہوں ڈاکٹر صاحب کسم۔“

”برتا تیرا رہا ہے!“ اب حاکم چچا زیر لب بڑبڑائے۔

ڈاکٹر رعبہ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس سے چند ایک سوالات کر کے وہ نسخہ لکھنے لگا۔

”کیا بات ہے ڈاکٹر؟“ حاکم چچا پوچھنے لگے۔ ”یہ بخار کیسا ہے؟“

”کچھ خاص وجہ نہیں۔ بظاہر اندرونی کمزوری اور ذہنی پریشانی کا نتیجہ معلوم ہو رہا ہے۔ یہ دوایاں استعمال کروائیں۔ انشاء اللہ چند ایک روز میں آرام آجائے گا۔ خوراک کا دھیان رکھیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ کھانے پینے پر بالکل توجہ نہیں دیتیں۔“

”بھلا بتاؤ۔۔۔ بچی بے چاری کیا توجہ دے۔ توجہ دینے والی تو اللہ بخشے قبر میں جا لیٹی۔“ نفیسہ خالہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

”ہم اس کا پورا خیال رکھیں گے۔“ حاکم چچا نے ڈاکٹر سے نسخہ لے لیا۔

ڈاکٹر میس بھی انہوں نے ہی ادا کی تھی۔

آسمان سرمئی بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ڈھلکی ہوئی شام کا سماں بے حد خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔ وہ میسر پر پڑی آرام دہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔

آس پاس کے جنگلوں کی دیواروں اور میسر کے جنگلوں سے لپٹی سرسبز میلیں نگاہوں کو تراوت بخش رہی تھیں۔

اکا دکا میسر یا چھت پر بے فکری سے شملتی ہوئی خوش باش لڑکیاں بھی دکھائی پڑتی تھیں۔ موسم کی مناسبت سے رنگین لباس زیب تن کیے، ہاتھ میں چائے یا کافی کے مکے، تھامے، البرے فکری، بے پروا لڑکیاں رنگین تتلیوں کی مانند لگ رہی تھیں۔ اندر کمرے میں انہی اپنی پسند کا ریکارڈنگ رہی تھی۔ نیو نور کی آواز اسے اپنے اندر اڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

کبھی ہم خوبصورت تھے۔

کتابوں میں، بسی خوشبو کی مانند سانس ساکن تھی

ہست سے ان کے لفظوں سے تصویریں بناتے تھے

پرنندوں کے پروں پر نظم لکھ کر

دور کی جھیلوں میں نئے والے لوگوں کو سناتے تھے۔

جو ہم سے دور تھے لیکن ہمارے پاس رہتے تھے۔“

شہلانے سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ریکارڈ اسے بھی بے حد پسند تھا۔ لیکن ہمیشہ اسے رلا دیتا تھا۔ نہ جلنے انہی کو یہ ریکارڈ کیوں پسند تھا۔

ہمیں ماتھے پر بوسہ دو کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دس جانا ہے

ہمیں رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں

گئے دن کی مسافت، رنگ میں ڈوبی ہوا کے ساتھ کھڑکی سے بلاتی ہے۔

ہمیں ماتھے پر بوسہ دو

آنسو خاموشی سے اس کی آنکھ کے گوشوں سے بہہ رہے تھے۔
کسی نے نرمی سے اس کے چہرہ صاف کیا تو وہ چونک اٹھی۔
”ہی۔ آپ!“

”شہلا! میری بچی! اپنا دل یوں مت جلایا کرو۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے!“ منیہہ بیگم کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔

وہ اداسی سے مسکرا دی۔

”آپ کو کبھی نہ ہوں امی! میرا دل نہیں جلتا۔ میں بہت زیادہ پریکٹیکل ہوں۔ یہ تو بس یونہی، کبھی کبھی۔۔۔“
”باسان عقل دل کو تشا چھوڑ دیا کرتا ہے۔۔۔ نہ آئی!“ انیقہ بھی وہاں چلی آئی تھی۔ شہلا نے اسے گھورا۔
”تمہیں بھی کوئی اچھا دل کو ہسلانے والا ریکارڈ نہیں ملتا۔“

”جو ریکارڈوں سے دل کو ہسلاتے ہیں وہ خود کو دھوکا دیتے ہیں۔ آپ کیا خود کو دھوکا دے رہی ہیں؟“

”کیو مت!“ منیہہ بیگم نے اسے جھاڑ پلا دی۔ ”سوچ سمجھ کر نہیں بولتیں۔“

”میں تو خوب سوچ سمجھ کر بولتی ہوں امی!“ اس نے ماں کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ ”بعض امراض کا علاج نشتر ہی ہوا کرتے ہیں۔ آخر کو میں بھی میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوں۔ یہ اگر ڈاکٹر ہیں تو کیا ہوا! وہ کیا کہا ہے شاعر صاحب نے، ”بیادئی دل جبر نہیں فیض کسی کا۔“

”یہ لڑکی نہیں مانے گی۔“ منیہہ بیگم عاجز ہوئیں۔ ”میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ ان کے جانے کے بعد انیقہ نے سنجیدگی سے بہن کا چہرہ دیکھا۔

”آئی! آپ ہمیشہ بہت مضبوط نظر آتی ہیں اور کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ یہ مضبوطی محض ظاہری ہے اندر سے آپ آج بھی اتنی ہی کمزور ہیں۔۔۔“

شہلا پھکی سی ہنسی ہنس دی۔
”انسان اور پھر میں فرق کرنا سیکھو گی!“ پھر وہ بولی۔ ”زمان و مکان کے احساس سے عاری انسان بس پتھری ہوتا ہے۔ انسان کے جذبات چاند کی طرح ہوتے ہیں، سمندر کی طرح ہوتے ہیں۔۔۔“
”ایک بات صحیح بتائیں آئی!“

”وہی پرانا گھسا پٹا سوال مجھ سے مت پوچھنا!“ وہ بیزاری سے بولی۔

”بار بار اس لیے پوچھتی ہوں کہ اس سلسلے میں مجھے سخت قسم کی کنفیوژن لاحق ہے۔“ وہ چڑ گئی۔ ”اگر آپ کو وہ حضرت یاد نہیں آتے تو آپ تنہائی میں روکیوں پڑتی ہیں اور اگر یاد آتے ہیں تو۔۔۔“

”انیقہ! شہلا نے خفگی سے اسے دیکھا۔ ”بس بہت ہو گیا۔ ختم کرو یہ فضول ٹاپک۔ میں نے کہا تھا مجھے کوئی یاد نہیں آتا۔ بس کبھی کبھی گزرے ہوئے وقت کا رینگاں جانا لا دیتا ہے۔ کہ کاش میں نے اپنا اتنا وقت ضائع نہ کیا ہوتا۔۔۔ تم کچھ اور نہ سمجھا کرو۔ پلیز!“ انیقہ خاموش ہو گئی۔

”مما! سفید شرٹ اور نیکر میں ملبوس عمر ریکٹ شہلا تاجلا آیا۔

”مما کی جان!“ شہلا نے اسے بانہوں میں بھر کر چوما۔

”مما! میں آج راجہ سے جیت گیا ہوں۔ میں نے اسے ہرا دیا ہے۔ دو پوائنٹس سے۔ پتا ہے ممّا! وہ اتنی بے ایمانی بھی کرتا ہے۔ پھر بھی ہار گیا۔“

وہ بے حد خوش نظر آ رہا تھا۔ انیقہ نے اس کا کان کھینچا۔

”آپ کے خیال میں بے ایمانی کرنے والے جیت جاتے ہیں؟“ ”چہ خوب۔“

”وہ ہمیشہ بے ایمانی سے جیتتا ہے خالہ جانی!“

”تو وہ جیت ہوتی ہی نہیں!“ شہلا نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا۔ ”جیت تو ہمیشہ سچائی سے مشروط ہوتی ہے

میرے چاند!

”آپ ضرور اس کو بقرابطہ کر چھوڑیں گی۔ آپ ہاسپٹل چلی جاتی ہیں اور یہ جناب یہی موٹی موٹی باتیں ہمیں فیڈ کرتے ہیں۔“

انہی دنوں میں دی اور شہلا کو بھی ہنسی آگئی۔

تینوں سر جھکائے زور و شور سے اظہار خیال کر رہی تھیں۔

عذر رائیگم نے پونہی دروازے سے جھانکا۔

”یہ تم تینوں ایسی کون سی میٹنگ کر رہی ہو۔ یا ہر ورہ بیٹھی ہے۔“

”ورہ آپ کو بھی اندر بھیج دیں۔“ مصروف سے انداز میں جواب دیا گیا۔

”تم ساری کی ساری مایوں بیٹھ گئی ہو کیا؟“ نہیں غصہ آیا۔

”ارے امی جی! جس نے مایوں بیٹھنا ہے اس کی مشکل کا حل ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”کس کو مشکل آن پڑی ہے۔“ مسکراتے ہوئے ورہ اندر چلی آئی تھی۔ ”یہ اتنے رسالوں کا ڈھیر کس لیے جمع

لیا ہوا ہے۔ ضرور کوئی اہم مسئلہ درپیش ہے۔“

”یہ سدرہ کی بجلی۔ روزنت نئے مسئلے لے آتی ہے۔ پھر ہمیں ان کا حل ڈھونڈنے کے لیے بٹھا دیتی ہے۔“

ثانیہ نے دانت چکچکائے۔

”ہوا کیا؟“ وہ قریب بیٹھ گئی۔

”جنابہ کی دوست کی بڑی بہن مایوں بیٹھ رہی ہیں اور ایک ہزار ایک مسئلے لکھ بیٹھے ہیں کہ ذرا جلدی سے ان کا

حل بتاؤ۔ ہفتہ بھر بعد شادی ہے موصوفہ کی۔ لیجیے بیٹھے بیٹھے ہم بیوٹیشن کے مقام پر فائز ہوئے۔ اب یہ

رسالوں کا ڈھیر لیے بیٹھے ہیں ان کی مدد کے لیے۔“ ورہ کو ہنسی آئی۔

”مسئلہ کیا ہے؟“

”مسئلہ؟“ عرشہ بھنائی۔ ”مسائل۔۔۔ بلکہ مسائل کا انبار کہیے۔ ناخن بڑھتے نہیں، پیٹ بہت بڑھ گیا ہے۔

رنگ کالا ہے، دانت پیلے ہیں، بال سفید ہیں۔۔۔ لیجیے! کوئی چیز اپنے اور بجٹل کلر میں دستیاب نہیں ہے۔ اب

ہانا کیا کیا لکھ کر بھیجیں؟“

”میں تو کہتا ہوں دو نفل شکرانہ لکھ بھیجیے۔ شادی پھر بھی ہو رہی ہے۔“ علی مزے سے بولا۔

”ہائیں ثانیہ نے اسے گھورا۔ ”یہ تم بڑے وقت کی مانند بغیر بتائے کیسے نازل ہوئے؟ معلوم نہیں یہاں

ہاتھن کے کچھ خاص مسائل ڈسکس کیے جا رہے ہیں۔ تمہاری انٹری قطعاً نا منظور ہے۔“

”ارے میں کون سا تم سے ”سحرالبیان“ سننے آیا تھا۔“ وہ چڑ گیا۔ ”میں تو عریشہ بی بی کو امی جان کا خاص پیغام

دینے آیا تھا جس میں انہوں نے اسے گدھے کے سینک قرار دیا ہے۔“

”اور تمہیں یقیناً گدھا قرار دیا ہو گا۔“ ثانیہ مزے سے بولی۔

”جی نہیں۔“ وہ مزید چڑا۔ ”میری امی نہ ہوتیں تو ان کے جملہ ارشادات تمہارے گوش گزار کرتا تاکہ تمہیں

علم ہو تاکہ وہ کس کس کو کیا کچھ قرار دیتی ہیں۔“

ثانیہ اور سدرہ کے چروں کے تمام زاویے بگڑے جبکہ ورہ ہنسنے لگی۔

”کیوں لگ گئی چپ!“ وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ ”اور یہ جو خواتین کے مسائل کا ذکر ہو رہا تھا انہیں تو میں

نہاں میں حل کر سکتا ہوں۔ تم لوگ بے وجہ اپنی توانائیاں صرف کر رہے ہو۔“

”کیوں؟ آپ حکیم ہیں۔“

”نہیں یہ خطرہ جاں ہیں۔“

وہ سب کی سب زور سے ہنس دیں۔

”تم سب کیا سمجھ رہی ہو؟ یہاں میرا کوئی یا روم دو گار نہیں تو تم لوگ مجھ پر ہنس لو گی؟“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”یہ ایسا ہی ہے جیسے بکریوں کے ریوڑ میں شیر۔“

”اچھا۔۔۔ تو پہلے تو بڑھے ہوئے پیٹ کا علاج بتاؤ۔“ عریشہ نے مسئلہ نمبر ایک دیکھا۔

”اسے پتا ہوتا خود نہ کرتا علاج۔“ سدرہ ہنسی۔

”بڑھے ہوئے پیٹ کا علاج ہے الٹا چلنا۔ گردن موڑ کر الٹا چلا کریں۔“

لڑکیوں کو ہنسی آگئی۔

”اس کو کھانا دیاں۔۔۔“ عریشہ بھنائی۔ ”یہ ایسی ہی ہانکے گا۔“

”ہاں سفید ہیں تو دو گ لگاؤ۔ ہر قسم کی وگ بازار میں دستیاب ہے۔ رنگ کالا ہے تو فاؤنڈیشن کا استعمال کرو۔ لو جی! چٹکی بجاتے ہر مسئلے کا حل موجود۔“

”اس کی“ ہونے والی“ کوتاہی تیارے سارے کر۔“ ثانیہ نے عریشہ کو ہدایت کی۔ ”رات کو جب وہ اپنی وگ اتار کر ایک طرف رکھنے گی اور منہ دھو کر واش روم سے نکلے گی تب اسے اپنی حکمت کے فوائد کا پوری طرح اندازہ ہو گا۔“

”ارے صدقے جاواں!“ اس نے پورے دانتوں کی نمائش کی۔ ”کیا ذکر چھیڑا ہے۔ دل خوش کر دیا۔ میری ہونے والی“ جب ہو جائے گی تب تم لوگ جل جل کر راکھ ہونا اور اس راکھ سے ٹپیلے مابجھنا۔ ارے وہ تو ایسی ہو گی۔ ایسی ہو گی۔ کیسی ہو گی؟“ پھر وہ دروہ سے پوچھنے لگا۔

”وگ پلس فاؤنڈیشن۔۔۔“ جواب کہیں اور سے آیا۔

”ہو نہ۔۔۔ جل جل کر تم لوگ اور کالی ہو جانا۔“

”اچھا بھئی۔۔۔ تم جاؤ یہاں سے۔“

لڑکیوں نے اسے بہت مشکوں سے باہر نکالا تھا۔ پھر وہ سر جوڑ کر دوبارہ مسائل کا حل لکھنے بیٹھ گئیں۔

”رات کو سوتے وقت ناخنوں پر لسن کے جوئے ملیں۔۔۔“ عریشہ لکھنے لگی پھر اس نے پین ایک طرف رکھ دیا۔

”سارے کام اس بے چاری کو رات کو ہی کرنے ہیں۔ ناخنوں پر وہ لسن مل لے گی چہرے اور گردن پر لیموں ملی بالائی سے مساج کر لے گی، بالوں میں تیل، اکسیر کی ماسھ کر لے گی۔ تو رزلٹ کیا نکلے گا؟“

”وہاں دوسرے کمرے میں سوئے گا۔“ ثانیہ نے سوچ کر بندرانا جواب دیا۔

”ہا۔۔۔ ہائے! پھر یہ سب کچھ کرنے کا فائدہ؟“

وہ بے چارگی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

اس کی طبیعت کافی بہتر ہو چلی تھی۔ نفیسہ خالہ اور سمعیہ نے اس کی ہر طرح سے دل جوئی کی تھی اور اس کا بہت خیال رکھا تھا۔

اس وقت بھی وہ دونوں اس کے پاس موجود تھیں۔ نفیسہ خالہ اس کے لیے کھجوری بناری تھیں جبکہ سمعیہ اپنے اور اس کے لیے چائے بنا لاتی تھیں۔

دونوں چائے کے گم تھامے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں جب دروازہ بجا۔

”اماں! آجاؤں؟“ بدر کی آواز آئی۔ پھر وہ جواب کا انتظار کے بغیر ہی اندر چلا آیا۔

سمعیہ کے چہرے پر ایک محسوس کی جانے والی تازگی اور شرمیلیں مسکراہٹ چمکنے لگی۔

نفیسہ خالہ سوالیہ نظروں سے بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”وہاں! وہاں کو اپنا آپ تولتا ہوا محسوس کر کے کچھ جھل سا ہوا۔“ اماں۔۔۔ گھر پر کچھ پکایا نہیں کیا؟ مجھے بھوک لگی ہے۔“

”تو بچے! میں نے یہاں تو تندور لگایا نہیں۔ گھر آ کر ہی پکاؤں گی روٹی۔ ابھی شام کے چھ بجے ہیں اور تجھے

”ک بھی لگ گئی۔ سچ کہتے ہیں، فراغت میں بندے کو روٹیوں کے خیال ہی آتے ہیں۔“ وہ جڑ بڑ ہوا۔
 ”تقریر نہ جھاڑا ماں! یہ بتا کچھ کھانے کو ہے؟“ وہ لڑکیوں کے سامنے درگت بننے پر چڑ گیا۔
 سمعیہ منہ دباے ہنس رہی تھی۔ ربیعہ کے لیوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔
 ”یہاں کچھ کھانے کو نہیں۔ تو چل گھر!“ وہ بھی آخر اس کی ماں تھیں۔
 ”اچھا!“ اس نے سر کھجا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ایک سرسری نگاہ ان دونوں پر بھی ڈالی۔
 ”پھر ایسا کرو چائے پیلاؤ۔“ وہ کونے میں رکھے موڑھے پر جا بیٹھا۔
 سمعیہ پھر ہنسی سے بے حال ہونے لگی، جبکہ ربیعہ سنجیدگی سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔
 لہجہ خالہ مجبوراً چائے بنانے لگیں۔ وہ زیر لب بڑبڑاتی بھی جا رہی تھیں۔ جوان لڑکیوں کے مقابل آبیٹھنے پر
 ”بیٹے سے سخت خفا تھیں۔“

”دیوان میں شرم نہ پائی۔“ بچھن دیکھو نو جوان کے۔ جیب خالی۔ مانگے گھر والی بھلا بتاؤ!“
 بدر کو ماں کی بڑبڑاہٹ سے مطلق دلچسپی تھی نہ پروا۔ وہ کچھ گنگناتے ہوئے لیشلی نظروں سے بار بار ان کی طرف
 دیکھتا تھا۔

ربیعہ کو سمعیہ سے اس کے تعلق خاص کا علم تھا پھر بھی اسے بدر کے وہاں آبیٹھنے سے کوفت محسوس ہونے
 لگی۔ وہ چائے کا خالی گ رکھنے کے بہانے وہاں سے اٹھ کر نفیسہ خالہ کے پاس کچن میں چلی آئی۔
 ”ارے بیٹی! تم کیوں انھیں۔ چکر نہ آجائے۔ جسم میں ابھی نقاہت ہے۔ کچھ خیال کرو۔“
 ”کچھ نہیں ہوتا خالہ!“ وہ مسکرا دی۔ ”بیٹھے بیٹھے بھی آگیا گئی ہوں۔“
 ”ان کی پاس بڑی پیڑھی پر بیٹھ کر چولہے میں بھرنے آگ کے شعلوں کو دیکھنے لگی۔
 ”معاف کرنا بیٹی! یہ چائے پانی کا خرچا بھی تمہارے سر بڑ رہا ہے۔“ وہ چائے بنانے پر شرمندہ تھیں۔
 ”خالہ!“ ربیعہ نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ اتنے دن سے بے لوث خدمت کر رہی ہیں
 مہری۔ مجھ پر آپ کا اتنا بھی حق نہیں۔“
 ”میں نے کیا کیا بیٹی۔ بھلا بتاؤ۔“

وہ شرمندہ سی ہنسی ہنس کر چائے کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ ربیعہ خیالات کے دھارے کے ساتھ ساتھ بننے
 لگی۔ باہر صحن میں بدر سمعیہ کے قریب جا بیٹھا تھا۔

”ارے بھی۔ رافع۔ رافع۔ ارے عذرا۔ کہاں ہو۔“ فردوس بیگم ہانپتی کانپتی ”ادھر ادھر ڈھولتے ہوئے
 اندر داخل ہوئیں۔ مارے گھبراہٹ کے انہیں تخت پر بیٹھی، تسبیح کرتی ہوئی سانس بھی نظر نہ آئی تھیں۔
 شفیقہ حیات نے جلدی جلدی ہتھیلیاں چرے پر پھیریں۔
 ”ارے فردوس! کہا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟“

اتنی دیر میں عذرا بیگم بھی عجلت اندر سے برآمد ہو گئیں۔ رافع بھی اتفاق سے اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ
 تالی کی گھبرائی ہوئی آواز سن کر اپنے کمرے سے نکل کر بیڑھیوں پر اکھڑا ہوا۔
 ”کیا ہوا تالی امی؟“

”ارے رافع۔ میرے بچے جلدی آؤ۔ ہاشم کو اسپتال لے کر جانا ہے۔“

”ہاں میں!“ وہ دھڑ دھڑ پیڑھیاں اترتا چلا آیا۔

”کیا ہوا، کیسے ہوا، کب ہوا۔“

ہر طرف سے سوالات برسنے لگے تھے۔ فردوس بیگم آنسو پونچھنے لگیں۔

”موتور سائیکل سے گر گیا، ماتھا پھٹ گیا ہے۔ بھل بھل خون بہہ رہا ہے۔ جلدی چلو۔“

وہ سب کے سب نہایت تیز رفتاری سے باہر کی جانب بڑھے تھے۔ رافع سب سے آگے تھا۔ تقریباً ”دوڑتے

ہوئے اس نے دونوں پورشنوں کا درمیانی فاصلہ طے کیا۔ ہاتھ مار کر اس نے مرکزی لاؤنج کا دروازہ کھولا اور تیز زور سے اندر داخل ہوا۔

ہاتھ پر برف کی ٹکڑی کرتے ہاشم کو دیکھ کر اس نے بے اختیار سکون کا سانس لیا تھا۔ تنے ہوئے اعصاب یکدم ڈھیلے ہوئے تھے۔ صورتحال اتنی خطرناک نہیں تھی جتنا کہ اس کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔
”کیا ہوا یا ر! ڈر دیا چچی نے تو۔۔۔“

”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ اپنی روڈ کے کارنر پر تھا۔ ایک بچی سامنے آگئی یا ایک سلف ہو گئی۔“ رافع قریب جا کر اس کا زخم دیکھنے لگا۔ اتنی دیر میں باقی افراد بھی چلے آئے۔
ہاشم بھی سوالات کے بہاؤ کی زد میں آگیا۔

رافع نے اس کے ماتھے پر دو تھپتھپ سے ابھر آنے والی خون کی بوندوں کو دیکھا۔ اس کی کہنی پر بھی اچھا بھلا زخم آیا تھا۔ پینٹ کا پانچھ اس نے موڑا ہوا تھا۔ ٹانگ پر بڑی خراشیں بھی نظر آرہی تھیں۔ وہ کچھ سوچ کر چپکے سے اٹھ اور کسی کی نگاہ میں آنے بغیر دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

”دادی جان! میں ٹھیک ہوں، مجھے کچھ نہیں ہوا۔۔۔“ ہاشم شفیقہ حیات کے تفکرات کے اظہار کے جواب میں انہیں مطمئن کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔

”ارے بچے! ماتھا بھٹ گیا ہے اور تم کہہ رہے ہو کچھ نہیں ہوا۔ میں کہتی ہوں اسپتال جاؤ۔ کوئی ٹیکہ لگواؤ۔ ماتھے کی مرہم پی کر آؤ۔ ان چوٹوں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔“ ہاشم ہنسنے لگا۔

”بیاری دادی! ایوں فکر کرتی ہیں۔۔۔“
”ٹھیک تو کہتی ہیں۔“ فردوس بیگم بھی خفگی سے بولیں۔ ”ذرا کہنی دیکھو اپنی۔ کیسی سوچن ہو رہی ہے۔ رافع! تم اسے لے کر جاؤ۔“

وہ مڑیں پھر حیران رہ گئیں۔
”ہائیں! یہ کہاں روفو چکر ہو گیا۔۔۔“ انہیں سخت تاؤ آیا۔ ”دیکھ بھی رہا ہے بچے کی حالت پھر بھی بنا پوچھے کچھ کھسک لیا۔ دیکھو آج کل کے لڑکوں کا احساس ذمہ داری۔“

”صبر کرو ہوا! اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔ کسی کام سے ہی گیا ہو گا۔“ شفیقہ حیات نے انہیں تسلی دے کر ٹھنڈا کیا۔ عذرا بیگم نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے جذبات قابو میں کیے۔

اسی لمحے لاؤنج کا دروازہ کھول کر رافع اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا۔ سبھی اس کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس کے پیچھے شہلا محسن علی بھی۔ اس نے دہانٹ اور آل پہنا ہوا تھا۔ گلے میں ایسٹھسکوپ تھا۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ایبھی ڈیوٹی سے لوٹی۔

”السلام علیکم۔۔۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں سب کو سلام کیا۔
یہ گھر اور اس گھر کے مکین اس کے لیے کبھی بھی اجنبی نہ رہے تھے۔ بچپن سے وہ یہاں آتی جاتی رہی تھی۔ ایقان سے اس کی دوانت کالے کی دوستی رہی تھی۔

سب ہی نے اس کے سلام کا پر جوش و پر غلوص جواب دیا تھا۔ سوائے فردوس بیگم کے۔ جن کے ہاتھ پر بے شمار سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ آنکھوں میں محسوس کیے جانے والا تشنہ قرار آیا تھا۔ مارے غصے کے ان کا سانس بھی پھولنے لگا۔

”کیا ہو گیا آپ کو؟“ شہلا ہاشم سے پوچھنے لگی۔
مصرفوب انداز میں وہ اپنا فرسٹ ایڈ باکس بھی کھولنے لگی۔

ہاشم خواب کے سے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شہلا کی جانب محض اس وقت دیکھا تھا جب وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تھی۔ اس کے بعد اس کی نگاہیں قالین پر بنے ڈیزائن سے الجھ رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ شہلا

اگر سرری سی بات کا اس نے کوئی جواب ہی نہ دیا تھا۔
 ”اگر مہانی چاہیے۔“ شہلا نے اس کے ماتھے پر لگے زخم کا جائزہ لیا۔ ”معمولی سا زخم ہے۔ میں صفائی کر کے
 ایندھن کر دیتی ہوں۔“
 ”انفیکشن سے حفاظت کا نیکہ بھی لگا دو بیٹی!“ شفیقہ حیات بولیں۔ ”ایسی چوٹوں کو معمولی نہیں سمجھنا
 چاہیے۔“
 شہلا مسکرا دی۔

”ارے اماں! آپ تو آدمی ڈاکٹر نکلیں۔ میں نیکہ بھی لگاؤں گی، آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“
 عذرا بیگم ایک پالے میں گرم پانی لے کر آئیں۔ شہلا ہاشم کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔
 رافع نے ہاشم کا بغور جائزہ لیا پھر مسکراہٹ کی بے ساختہ پھونٹنے والی دھار کو روک نہ سکا۔ وہ کسی نئی ٹوپی دوسن
 لی مانند گویا سانس بھی روکے بیٹھا تھا۔ جیسے ذرا سی حرکت اس کے خواب کو توڑ دیتی۔ اس کے برابر بیٹھی شہلا
 ماہ ہو جاتی۔

اس کے جذبات و احساسات سے قطعاً ”غافل وہ پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ اس کی بینڈیج کر رہی تھی ساتھ
 لی بینڈیج کے بعد وہ اس کے کہنی پر آئے زخم صاف کرنے لگی پھر کایک اس نے سر اٹھایا۔
 ”آپ اتنے نیش کیوں ہو رہے ہیں۔ ڈونٹوری یہ تو بالکل معمولی سے زخم ہیں۔ اتنا سیریس نہ لیں، پلیر۔“
 پہلی مرتبہ ہاشم کے انداز میں قدرے ڈھیلا پن نمایاں ہوا۔ اس نے مسکرائے گی کو شش بھی کر ڈی۔
 ”میں نیش تو نہیں ہوں۔“

”گہ رہے ہیں۔“ وہ اس کے بالکل قریب بیٹھی اس کے زخموں پر دو انگاری تھی۔
 ”یہ جو ہیں وہ نہ لگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“ رافع برکتہ بولا تھا۔
 ہاشم کو ہنسی آگئی۔ شہلا نے بھی مسکرا کر بالکل نہ سمجھنے والے انداز میں اسے ذہن کیا۔
 فردوس بیگم بھنا کر انھیں اور وہاں سے واک آؤٹ کر گئیں۔ شفیقہ حیات اور عذرا بیگم ہر بات سے ناواقف
 آرام سے بیٹھی اس کی کارروائی ملاحظہ کر رہی تھیں۔ کسی نے بھی فردوس بیگم کے موڈ کو محسوس نہ کیا تھا، اسوائے
 ہاشم اور رافع کے۔

”اچھا جی!“ وہ اپنا کام ختم کر کے کھڑی ہوئی۔ ”اب مجھے اجازت ہے؟“
 ”ارے بیٹی! کوئی چائے پانی تو پیتی جاؤ۔“ شفیقہ حیات کو خیال آیا تھا۔ ”ہم نے تو تمہیں بالکل ہی ڈاکٹر سمجھ
 لیا۔“

”نہیں اماں! چائے پر تو امی اور انیقہ میرا رسنہ دیکھتی ہوں گی، میں ابھی ہاسپٹل سے لوٹی ہی تھی۔ رافع مجھے
 روکے پر ہی مل گئے۔ میں نے تو امی کو بتایا تک نہیں۔“
 ”پھر بھی بیٹی! یوں اچھا نہیں لگتا۔“ شفیقہ حیات کو شرمندگی محسوس ہوئی۔ ”تمہیں ہماری وجہ سے زحمت ہوئی
 اور ہم نے تمہیں پانی تک نہیں پلایا۔“
 ”زحمت کیسی اماں!“ وہ حیرانی سے بولی۔ ”آپ سب تو میرے اپنوں جیسے ہیں۔ بھول گئیں میں اور ایقان سارا
 مارا دن آپ کو تنگ کرتے تھے۔“

”جیتی رہو۔ تم بھی میرے لیے ایقان جیسی ہو۔ آتی جاتی رہا کو بیٹی! ہم بوڑھے لوگ تو اسی آس میں صبح سے
 اٹھ کر تے ہیں کہ کوئی اگر اپنی خیریت دے جائے اور ہمیں پوچھ جائے۔“ وہ مسکرا دی۔
 ”اچھا میں چلتی ہوں۔“ اس نے فرسٹ ایڈ باکس اٹھانا چاہا۔
 رافع نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے باکس تھام لیا۔
 ”میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔“

”تھنک یو رافع! اچھا جی! اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔ کیسی پیاری بچی ہے اور بے چاری کا نصیب۔“ شفیقہ حیات نے اس کے نکلنے کے بعد کہا۔
ہاشم نکلنے کی باندھے اس دروازے کو دیکھ رہا تھا جہاں سے وہ نکل کر گئی تھی۔



صبح میں بکھرے ہوئے ہار سنگھار کے بچے اور مڑھائے ہوئے پھول اکٹھے کر کے اس نے ڈسٹ بن ڈالے اور پائپ لگا کر کیماری میں لگے ہوئے پودوں کو پانی دینے لگی۔
کئی دن کی بیماری کے بعد آج وہ خود کو بہت فریش اور توانا محسوس کر رہی تھی۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے نمٹائے ہوئے اسے عجب لطف محسوس ہو رہا تھا۔

موسم بھی بے حد خوشگوار ہو چلا تھا۔ گرمی کے سارے آثار خشک، تازہ ہواؤں نے تقریباً ”ختم ہی کر ڈالا“ تھے۔ اس کا موڈ اچھا تھا۔ ہولے ہولے گنگنائے ہوئے وقت کی ہر سختی کو وقتی طور پر فراموش کیے وہ اپنے کام میں منہمک تھی جب دھیرے سے دروازہ بجایا۔

ربیعہ چونک اٹھی۔ شام کا وقت تھا۔ عموماً اس وقت سمیعہ اپنے گھر کا تمام کام نمٹا کر آ جایا کرتی تھی۔ اس نے بے دھڑک دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ دھک سے رہ گئی۔

باہر عرفان شوکت کھڑا تھا۔ وہ اپنے مخصوص جیلے میں تھا۔ سفید کلف لگا سوٹ اور گلے میں سرخ رومال۔ بال نہایت سلیقے سے جمائے ہوئے تھے اور آنکھوں میں وہی چمک تھی جو کسی خوشخوار بھیڑیے کی آنکھوں میں معصوم بھیڑ کو دیکھ کر آتی ہوگی۔

ربیعہ کے دل نے غیر معمولی انداز میں دھڑکنا شروع کر دیا۔

”گڈ مرننگ! اچھا! آج اس وقت دوگی ہمیں؟“ وہ بے حد اپنائیت سے بولا۔

ربیعہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔ قدرت نے اسے سمجھنے سے روکا تھا اور وہ تیرنا نہ جانتی تھی۔ ہمت اور حوصلہ اس کا واحد سہارا تھا۔ جینے کی تمنا اس کا واحد ہتھیار۔

وہ چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے دروازہ چھوڑ دیا۔

”شریف لائیے۔“ اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

عرفان شوکت کو شاید اس قدر آسانی کی امید نہ تھی۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

ربیعہ نے جان بوجھ کر اس کے پیچھے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔

”بیٹھیے۔“ اس نے صحن کے پتلیوں پر کھجی ہوئی چائپانی کی طرف اشارہ کیا اور خود کوٹنے میں پڑا موڑھا۔

آئی جی فرمائیے۔“ اس نے اپنے انداز میں بے حد بے گانگی سمجھ کر پوچھا۔

”دیکھو بیٹی! تم میرے لیے بیٹیوں جیسی ہو، اسی لیے میں بنا کسی تکلف کے پھر چلا آیا ہوں۔“ اس نے تم باندھی تھی۔ ”حالانکہ میرے علم میں ہے کہ تمہاری پھوپھو ابھی تک پہنچ نہیں پائی ہیں۔“

ربیعہ نے اپنے اندر ایک عجیب سی اذیت محسوس کی۔ تار کے الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا کر اپنے ہاتھوں پر مرکوز کر دیں۔

”مجھے اس سلسلے میں قدرے بھگت کا سامنا ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ سودا تمہارے ساتھ ہی کر لوں۔ بعد میں تمہاری پھوپھو اور بھپھو سے بات چیت ہوتی رہے گی۔ تم تو بس اس کاغذ پر ایک سائن کر دو۔“

اس نے اچانک ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالا تھا۔

”تم کتنے سال کی ہو؟“ اچانک اسے دھیان آیا۔ ”تمہارا شناختی کارڈ تو بن گیا ہے نا؟“

ربیعہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”اوہو۔“ عرفان شوکت کو شاید اس جواب کی امید نہ تھی۔ ”بہر حال وہ تو بن جائے گا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

۱۱ اس کاغذ پر دستخط کرو بیٹی!

”اس پر کیا لکھا ہے؟“ ربیعہ نے کاغذ تھامنے کی زحمت نہ کی۔

”اس پر شخص اتنا لکھا ہے کہ تم ہم سے اس گھر کا سودا کرنے پر تیار ہو۔ میں کہہ رہا ہوں نا، باقی کے معاملات اگلے روز کے عزیزوں کے آنے پر ہی طے ہوں گے۔“

”مگر آپ سے کس نے کہا کہ میں اس گھر کا سودا کرنا چاہتی ہوں۔“ اب کی بار اس نے قدرے تندہی سے کہا۔

”اس گھر سے میری پیاری دادی کی یادیں وابستہ ہیں۔ اس کے چپے چپے پر ان کے قدموں کے نشان ہیں۔ اس کے ہاتھ ہمارے پرانے نقش ابھرتے ہیں۔ مجھ سے باتیں کرتے ہیں۔۔۔ اویس۔۔۔ آپ مجھے میری دادی کی یادوں کے عوض

ایک موملی رقم کی پیشکش کر رہے ہیں۔ اس امید پر کہ میں یہ پیشکش قبول بھی کر لوں گی؟“

”ارے۔۔۔ بھئی۔۔۔ اس قدر غصہ!“ عرفان شوکت بناوٹی طور پر محفوظ ہو کر کچھ دیر تک ہنسا۔ ”تنی سی گڑیا اور

ایک موملی رقم۔۔۔“

ربیعہ بڑے تیوروں کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اس پر عرفان شوکت کی ہنسی کا کچھ اثر نہ ہوا تھا پھر یک لخت ہی وہ

نا اٹھ اٹھی۔

”ایکھو بیٹی! تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ اس کاغذ پر خاموشی سے دستخط کرو۔ مجھے ہر قسم کی زبان بولنا آتی ہے

اور تم سے میں سب سے نرم زبان میں بات کر رہا ہوں۔ مجھے اس علاقے میں اسی لوکیشن کی ضرورت ہے، اشد

ضرورت اور میں اپنی ضرورتوں پر مجبوری کر لینے والا آدمی نہیں ہوں۔ گھر تو میں ہر حال میں لے ہی لوں گا، بات

تمہاری بھلائی کی ہے اور میں فی الحال تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ کیا سمجھیں؟“ ربیعہ منٹوں میں خوفزدہ ہو گئی لیکن

اس نے یہ خوف اپنے چہرے پر لانے سے حتی الامکان گریز کیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر عرفان شوکت کے ہاتھ سے

ٹانگ لے لیا۔

”اصل میں انکل۔۔۔“ وہ پھر سوچنے لگی تھی۔ ”بات کچھ یوں ہے کہ۔۔۔ میں تو دستخط کر بھی دوں۔۔۔ لیکن

۱۲ وہ بہت برا مانیں گی۔ ان کا گھر ہے ان کی مرضی کا سودا ہونا چاہیے۔“

عرفان شوکت کے چہرے پر در آنے والے سخت تاثرات قدرے زائل ہوئے۔

”میں نے کہا نا، ان سے بات کرنا اور ان کو مطمئن کرنا میرا کام ہے۔ ویسے۔۔۔ کون سی ٹرین میں سوار ہیں تمہاری

۱۳ ۱۲؟“ اس بار وہ دن تو ہو گئے یہ رام کہانی سنتے۔

ربیعہ گڑبڑا گئی تھی۔

”کل۔۔۔ کل آرہی ہیں پچھو۔۔۔“

”کل؟“ وہ پریشان ہوا۔ ”یعنی کہ کل؟“

”جی۔۔۔ کل۔“ ربیعہ قدرے مطمئن ہوئی۔ ”میں یہ کاغذ کل آپ کو سائن کروں گی۔ ٹھیک ہے نا انکل!“

عرفان شوکت سوچتی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے کل یہ کاغذ چاہیے دستخط کے ساتھ۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ وہ مؤویانہ بولی۔

”چلتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔

ربیعہ کو دروازہ بند کر لینے کا خیال بھی نہ رہا۔ کاغذ دونوں ہاتھوں میں پیچھے وہ پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھی

تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بہت بڑے جنجال میں پھنس چکی تھی۔

”شاید۔۔۔ شاید مجھے یہ گھر بیچنا ہی ہو گا۔“ اس نے سوچا۔

ہاتوں اور قہقروں کی ملی جلی آوازوں کے بیچ اس نے ایک نگاہ ایقان بردہ ڈالی۔

وہ باتوں میں بہت زیادہ حصہ نہیں لے رہی تھی۔ بات بے بات ہنسی کی پھوار میں بھینگنا اسے پسند تھا۔ آواز بات بے بات ہنسی بھی نہ تھی۔ چائے کا کپ لیے وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی سوچ میں گم ہو جایا کرتی۔ عادت گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”دوبہنتی پون پانگل۔ نہ جارے نہ جا۔ رو کو کوئی۔“ تنہ نے اچانک سُرلی آواز میں دردناک تان لگائی۔ سر خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

اس کا ”کوئی“ ضرورت سے زیادہ لمبا ہونے لگا تو عیشہ نے اسے ایک دھپ لگائی۔
”کیا مسئلہ ہے؟ اس ”دورے“ کا کیا نام ہے؟“ مانع نے اسے گھورا۔

”یہ تو پھپھو سے پوچھو۔ مجھے لگا، یہ ابھی گانا شروع کریں گی مگر انہیں گانا یاد نہیں آ رہا۔ میں نے تو انہیں گانا کرایا ہے۔“

عاشرہ نے لگا۔ ایقان کے لبوں پر بھی شرمندہ شرمندہ سی مسکان جاگئی۔ وہ حمزہ کو گھورنے لگی۔
”میں تجھے۔۔۔ چھوڑ کے۔۔۔ کہاں جاؤں گا۔“ اب علی کی باری تھی۔ ”میرے بھولے صدمے، تیرے سر کی حمزہ کے جلدی ہی میں، لوٹ آؤں گا۔۔۔ بائے بائے۔۔۔ بائے بائے۔۔۔“ اس نے ہاتھ بھی ہلایا۔
ایقان ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔

”تو بس۔۔۔ منہ پر ہنس دو توں حد کر دیتے ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔
”تھینک یو ایرو! تھینک یو سوچ۔“ عاشرہ نے انہیں ممنونیت سے دیکھا۔ ”اس ہندی خدا کو ہنسیا تو سہی مجھے تو اس کا یہ بوجھ دیکھ دیکھ کر اپنے جانے کے خیال سے خوف آ رہا تھا۔“
”ارے پچھا جان! آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں۔“ علی اس مذاق میں، جیسے صحیح رشتے سے پکارا کرتا تھا، دوا عموما ”وہ عاشرہ مائی یا عاشرہ انکل سے کام چلا لیا کرتا تھا۔“
”ہم انہیں ہنسنا ہنسا کر ہنسی کا گول گپا بنادیں گے۔“
”وہ تو خیر تم بیٹا ہی تھے۔“ عاشرہ نے شرارت سے ایقان کو دیکھا۔ ”تنی اسما رت سی بیوی چھوڑ کر گیا تھا میں بائیس اچ کی سرکھی اس کی۔۔۔“

ایقان نے بے ساختہ انداز میں اسے گھورا۔ مبادا وہ اس کا راز افاش کر دے۔
”حال کی خبر دیجئے۔“ علی نے اپنا کان اس کے قریب کیا۔ ایقان نے اس کا دوسرا کان کھینچ کر اسے اپنی جانب کیا۔

”حال کے بچے۔۔۔ تمہیں کا ہے؟ تجھ سے ڈائریکٹ پوچھ لو۔“
”ارے آپ آدھے پونے اچ کی ڈنڈی ضرور ماریں گی۔“
”رائٹ۔ رائٹ۔“ عاشرہ بھی ہنسنے لگا تھا۔ ”ویسے ایقان کا ارادہ ہے کہ تمہاری برأت میں یہ اپنا ویڈنگ ڈریس پہنے گی۔ کیوں ایقان؟“

”آپ کم ہیں ان مسخوں سے۔“ وہ جل کر وہاں سے اٹھ ہی گئی۔
”میں ذرا باہمی سے مل کر آتی ہوں۔“ وہ عاشرہ کو بتا کر جانے لگی۔
اس وقت وہ لوگ سبوق حسن اور عذرا بیگم کے پورشن میں تھے۔ شفیقہ حیات اپنے چھوٹے بیٹے سبوق حسن کے ہمراہ رہتی تھیں۔ بڑی بہو سے ان کی کچھ خاص نہ بنتی تھی۔

وہ اپنے دھیان میں درمیانی لان عبور کر رہی تھی۔ سامنے سے آتے اختر میاں کو دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رکی۔ اگرچہ اب وہ ایک خود اعتماد عورت تھی پھر بھی برسوں پرانا ایک واقعہ اس کے ”مذہب“ کو چھوڑ گیا۔ وہ نگاہیں چرا کر گزر رہی تھی۔

”مسلام عرض کرتے ہیں آپ کی خدمت میں۔“ ”جیتے رہیے۔“ وہ طنز بولی۔

”ایسی بد دعا تو نہ دیں اچان بیکر!“

وہ اراکی ذرا رک کر آگے بڑھنے کو تھی کہ یکدم پلیٹ کرا نہیں دیکھنے لگی۔

”اپنی ہڈ حرامی کا کریڈٹ کیوں خواخواہ کسی بے قصور کے سر ڈالتے ہیں اختر میاں! کسی دھندے سے لگے۔
تکلیبی ہی رہے ہیں تب تک تو جینے کا عملی ثبوت پیش کیجئے وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔“

خود نمائی تو نہیں شیوہ ارباب وفا
جن کو جلنا ہو، وہ آرام سے جل جاتے ہیں

ٹھٹھ کرتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

”ہائے“ اختر میاں وہیں گھاس پر دھب سے بیٹھ گئے۔ ”تجھے کیا خبر ظالم! ہم چراغوں کی طرح شام سے جل
تے ہیں۔ ہم چراغوں کی طرح شام سے جل جاتے ہیں۔ ہم چراغوں کی طرح۔ ہم چراغوں کی طرح۔“

وہ دیوانوں کی مانند سر ہلاتے جا رہے تھے۔



اہل ڈیوٹی نمشا کر وہ بے حد تھکی ہوئی لوٹی تھی۔

گاڑی لاک کر کے وہ اندر کی جانب بڑھنے لگی، جب اس کی نگاہ لان میں بیٹھی انیقہ اور اس کی دوست پر پڑی۔
وہ اس سے سلام دعا کرنے کی غرض سے لان میں چلی آئی۔
”کیسی ہوا رم؟“

”ایک دم فرسٹ کلاس۔ آپ سنائے بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔“

”ہاں تو تھکی ہوئی ہوں۔“ ڈیوٹی نمشا کر آ رہی ہوں۔ ”وہ سستانے کی غرض سے وہیں لان چیئر پر ٹک گئی۔
”چائے بناؤں آپ؟“ انیقہ نے پوچھا۔

”ہاں دیوار! عمر کہاں ہے؟“ اسے دفعہ ”خیال آیا۔“

”اے کمرے میں ہے۔ میں اسے ہوم ورک کروا رہی تھی جب ارم آئی۔ ہوم ورک تو کمپلیٹ ہو چکا تھا
فارلون لگا کر چھوڑ آئی ہوں اسے۔ دیکھ رہا ہو گا۔“

اس نے چائے بنانے کے ساتھ ساتھ اسے تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔

”اس کی اردو رائنٹنگ کمزور ہے انیقہ! ذرا اس طرف دھیان دیا کرو۔“ لفظوں کی بناوٹ ٹھیک نہیں ہے اس
نے چائے کا کپ تھام کر ٹھونٹ بھرا۔

”ہائیں بنانے میں نمبروں ہے آپ کا بیٹا۔ لکھائی میں جانے کیسے کمزور پڑ گیا۔“ شہلا مسکرا دی تھی۔

”اپنی ماں کے سامنے مجھے تو پاسنگ مارکس بھی نہیں دیتا۔“ انیقہ ارم کو بتانے لگی۔ ”حالانکہ آپ کے ساتھ
نا اہل نہیں گزارنا چھتا میرے ساتھ گزارتا ہے۔“

”چنے بھاکے بارے میں تو پوچھتا ہو گا؟“ ارم پوچھ بیٹھی۔

انیقہ ہلکی سی پڑ گئی۔ شہلا ٹھونٹ بھرتے بھرتے رک گئی۔

”ہاں پوچھتا ہے بہت پوچھتا ہے۔“ پھر وہ بولی۔ ”اور میں اسے بتاؤں گی بھی ضرور سب کچھ بتاؤں گی۔ بس ذرا
دار ہو جائے معاملات کو جتنی فانی کرنا سیکھ لے۔ ایسی باتیں بچوں سے چھپائی تو نہیں جاسکتیں نا۔ آخر

میں نے بھی تو۔“ اس نے آخری ٹھونٹ بھرا۔

”ہائے“ کاغذی کپ میز پر رکھ کر کھڑی ہو گئی۔

”میں ذرا فریش ہو لوں آکسکیوز می۔“

وہ ٹانیاں سنبھال کر اندر کی جانب بڑھ گئی۔

”نئی پیاری ہیں تمہاری آپ! ارم اس کو پشت پر لہراتی سیاہ چوٹی پر نگاہ جمائے ہوئے بولی۔ ”اللہ میاں نے

بھی بعض لوگوں کے دل نہ جانے کس مٹی سے بنائے ہیں۔ اس قدر بھرپور حسن بھی بے اثر ہو سکتا ہے انیقہ؟“
انیقہ محض مسکرا کر خاموش ہو رہی۔

خالی الذہنی کے عالم میں چلتی ہوئی وہ اندر آئی۔ گھر کے مرکزی حصے میں داخل ہو کر دائیں ہاتھ پر سب سے اُس کا ہی کمرہ پڑتا تھا۔ وہ اندر چلی آئی۔ بے دلی سے بیگ ایک کونے میں پھینک کر اس نے اوور آل اتار اور کمرے کی پشت پر ڈال دیا چہرہ کرسی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گئی۔
چند لمحے اسی طرح گزار دینے کے بعد اس نے اوھر اوھر دیکھا۔

ٹی وی آن تھا۔ ”سٹام اینڈ جیری“ چل رہے تھے، لیکن عمر کمرے میں نہ تھا۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی آف کیا۔ آگے بڑھ کر واش روم میں جھانکا وہ وہاں بھی نہ تھا۔ کچھ سوچ کر وہ کمرے سے نکلی۔ لاؤنج میں آکر وہ ٹھک کر گئی۔

عمر سامنے صوفے پر اس طرح بیٹھا تھا کہ شہلا کی جانب اس کی پشت تھی۔ اس نے کان سے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔

”شاید عباس کا فون ہے۔“ اسے خیال آیا۔ ”لیکن عباس لاہور سے اتنی لمبی کال تو نہیں کرتا، یہ مزے۔ ریسیور کان سے لگائے بیٹھا ہے۔“ وہ آگے بڑھ آئی۔

”مما! وہ تو سب سے اچھی ہیں، اتنی پیاری ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”آپ نے دیکھی ہیں؟ کب؟ آپ نے کہ دیکھی ہیں؟ جی نہیں، آپ میری ممّا کو نہیں جانتے۔“
شہلا کو ابھن ہونے لگی۔ وہ آخر کس سے محو گفتگو ہے۔
وہ اس کے عین پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

”جی ہاں، ہاسپٹل تو جاتی ہیں۔ ہاں جی، تو کیا ہوا؟ میری خالہ جانی میرا خیال رکھتی ہیں۔ وہ تو ممّا سے زیادہ کرتی ہیں، ڈانٹتی بھی نہیں۔ پتا ہے، میری ممّا ڈاکٹر ہیں نا۔ وہ کہتی ہیں، ڈاکٹر کے گھروالوں کو سیکرٹ فائر کرنا پڑتا۔
درندہ دوسرے مریض ٹھیک کیسے ہوں گے؟“

شہلا نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
”ممّا،“ عمر کے لبوں پر اس نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔

”پھر بھی یار! یہ سیکرٹ فائر کا فلسفہ اپنی سمجھ سے باہر ہے۔“ دوسری جانب سے کوئی کہہ رہا تھا۔ ”دنیا ٹھیک ہے،
جائے اور ڈاکٹر کے گھر والے بیمار ہونے جائیں، کوئی تنگ ہے؟“

شہلا پتھر کی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے پھٹ گئیں۔
”بہا تو ڈاکٹر ہو سکتے ہیں لیکن ممّا! نوپریشن، اوکے؟ ممّا کا کام گھر پر رہنا ہے، آپ کو لک آفر کرنا ہے، ڈیوٹیا
اسٹینڈ؟“

شہلا نے کچھ کہے بنا ریسیور کیڈل پر پٹخ دیا۔ اس کا دل پوری قوت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی کنپٹیاں جلیج
تھیں۔

”ممّا۔ فون بند کیوں کر دیا؟ انکل بہت اچھی باتیں کر رہے تھے۔“
اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ سینے کا سا معصوم چہرہ اوپر کو اٹھائے وہ اپنی سیاہ خوبصورت آنکھوں سے اس
تک رہا تھا۔

”عمر! میری جان!“ اس نے اسے سینے سے لگا کر چٹا چٹ چو منا شروع کر دیا۔ آنسو روانی سے اس کا چہرہ
رہے تھے۔

آج کل وہ رات میں سمیعہ اور ثویبہ کے پاس چلی جایا کرتی تھی۔ پہلے پہل بیماری میں اس نے ایسا کیا تھا
یوں ہوا کہ اس کا وہاں دل لگنے لگا۔

اپنے گھر میں وہ تنہائی سے لڑ لڑ کر نیم جاں ہو جایا کرتی تو نیند کی دیوی کو اس پر ترس آتا تھا، لیکن سمعیہ ٹھوسہ کے ماتھے اسے وقت کے گزرنے کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔

وہ لوگ بارہ بارہ بجے تک نہیں مذاق کرتیں۔ بستر میں دیک کر بھی باتیں کرتی رہتیں، یہاں تک کہ کسی ایک لالہ کی جانب سے مکمل خاموشی چھا جانے سے دوسروں کو اندازہ ہوتا کہ وہ سو چکی ہے۔

چند روز میں اسے اس معمول کی اتنی عادت پڑ گئی کہ اب وہ روز ہی وہاں چلی جایا کرتی تھی پھر آج شام عرفان کی آمد سے اس کے احساسات کسی سازگے تاروں کی مانند تھکے ہوئے تھے۔ وہ حاکم پچا سے اس معاملے کو اسسکس کرنا چاہتی تھی۔

بچن میں رکھے چند ایک گندے برتن دھو کر اس نے جگہوں پر رکھے پھر بچن کا دروازہ بند کر کے صحن میں چلی آئی۔

”بچے کو کھول کر وہ صحیح طرح سے اوڑھ رہی تھی، جب دروازہ بجا۔“

”اس وقت کون آگیا؟“ اسے الجھن ہوئی۔

”کون ہے؟“ آگے بڑھ کر اس نے پوچھا تھا۔

”بدر!“ مختصر جواب آیا۔

ربیعہ نے دروازہ کھول دیا۔ بدر کھڑا چوروں کی مانند ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

”فہم ذرا اسی بات کرنا تھی۔ میں اندر آ جاؤں؟“

ربیعہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اکثر اسے بدر کے محبت نامے سمعیہ تک پہنچانے پڑتے تھے۔ یہ کام اسے فٹ ناپسند تھا پھر بھی وہ بحالت مجبوری ”ازحد کر اہیت سے یہ کام کیا کرتی۔ اصل میں اسے بدر ہی ناپسند تھا لیکن اہل پھین کی دوست کو یہ کہہ کر ہمیشہ کے لیے خفا کر دینے کی ہمت اس میں نہ تھی۔

”ہاں“ کو کیا بات ہے۔“ ربیعہ نے اسے اندر آ جانے کا رستہ تو دے دیا لیکن وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد وہاں سے چلا جائے۔

”فہم بات کرنا تھی۔“ اس نے دانت نکالے۔

”ہاں تو کرو۔ کیا کہنا ہے سمعیہ؟ میں وہیں جا رہی ہوں۔“

”نہیں۔۔۔ سمعیہ سے میں بھلا کیا بات کروں گا۔ مجھے تو تم سے بات کرنی ہے۔“ اس کے دانت اندر نہ جاتے۔

”مجھ سے؟“ ربیعہ کو حیرانی ہوئی۔ ”اچھا کہو۔“

”فہم تم ناراض تو نہیں ہوگی؟“

”جی!“ ربیعہ کو سخت الجھن ہوئی۔ ”دیکھو بدر! مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔“

”فہم ربیعہ! ماں چاہتی ہیں میری تم سے شادی ہو جائے۔“ وہ یہ کہہ کر شرما گیا۔

”اوہ!“ ربیعہ پر منوں اوس پڑ گئی۔

لفسہ خالہ نے اس سے اس خواہش کا اظہار کیا تھا اور ربیعہ نے انہیں صاف انکار بھی کر دیا تھا۔

”دیکھو بدر! تم پریشان مت ہو۔“ اس نے اسے سمجھانا چاہا۔ ”خالہ نے بات کی تھی مجھ سے اور میں نے انہیں منع بھی کر دیا تھا۔ تم اس بات کی فکر مت۔۔۔“

”لیکن تم نے کیوں منع کیا؟“ اس کی بات اس کے لبوں میں ہی رہ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں کیا نہیں برا لگتا ہوں ربیعہ؟ تم تو۔۔۔ مجھے بہت پیاری لگتی ہو بہت زیادہ۔۔۔ وہ سمعیہ جڑیل تو

ایسا سنی میرے گلے پڑ رہی ہے۔ لیکن مانو مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ تم اماں کو کہاں کہہ دو، میں تو تم سے شادی

لنا چاہتا ہوں۔“

ربیعہ آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ یہ وہی بدر تھا جس کے طویل ترین محبت نامے سمعیہ نے زبردستی سنایا کرتی تھی، جن میں اپنی محبت کی سچائی کا ثبوت پیش کرنے کے لیے وہ ہر طرح کی قسم اٹھانے کو تیار کرتا تھا۔ ”مبولو ربیعہ! میں تمہیں کیسا لگتا ہوں؟“
”رفضان ہو جاؤ یہاں۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

○ ○ ○ ”سیاں بنا گھر سونا۔ سیاں بنا گھر سونا۔“

مغنیہ کی آواز سی ڈی پلیئر سے نکل کر پورے گھر میں پھیل رہی تھی۔ وہ بیڈ پر آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ گھر واقعی بے حد سونا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ وہاں محض ایک نفس کی کمی ہوئی تھی۔ کل شام کی فلاسٹ سے واپس گیا تھا اور ایقان کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ آیا ہی نہ تھا۔ جیسے اس نے کچھ دیر کو آنکھ لگ جانے پر کوئی خواب دیکھا تھا۔ آنکھ کھلنے پر سب کچھ پہلے کی طرح تھا۔ سونا گھر سونا دل، خالی گھر خالی آنکھیں۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ نیچے سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھا۔ لوگوں سے بھری ہوئی وگنیں، بسیں کٹریاں۔ رات کی آمد کا اعلان ہوتے ہی لوگ اپنے اپنے گھروں کو بھاگ رہے تھے۔ سب ہی کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ سب کے گھروں میں ان کی بیوی بچے منتظر تھے۔ وہ وہیں کھڑی بے مقصد ہی سوچے گئی۔

کام کاج سے فارغ ہو کر نہائی دھوئی، صاف ستھری عورتیں ہر تھوڑی دیر بعد چونک کر گھڑی کی سمت دیکھتی ہوں گی۔ میاں لگے بندھے ٹائم پر گھر لوٹا ہو تو منٹ منٹ کا بھی حساب ہوتا ہے اور کچھ نہیں تو چھوٹا بچہ ہی پوچھ لیتا ہے۔

”پہا ابھی تک نہیں آئے؟“

مخصوص وقت ہوتے ہی بجائے والی بیل یا انتظار کے تناؤ کو ختم کرتی ہارن کی آواز کتنی بھلی لگتی ہوگی۔
”آنسو یوں نہ بہاؤ۔ یہ موتی نہ لٹاؤ۔“ سی ڈی پلیئر پر مغنیہ کی آواز ابھری تو وہ چونک اٹھی تھی۔
”رکتا نہیں ہے وقت کا دھارا۔ پل پل بدلتے جیون پیارا۔“

اس نے پلیئر آف کر دیا۔

وقت کا دھارا تو واقعی نہیں رکتا لیکن کبھی کبھی بہتا ہوا پانی بھی ساکت لگتا ہے۔ بہاؤ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ گھڑی کی سوئیاں چلتی رہتی ہیں مگر وقت جیسے ایک جگہ رکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ انتظار کی جان لیوا کیفیت کو وہی جان سکتا ہے جو اس کیفیت سے گزرتا ہے۔

”میں نے چار سال کا کانسٹرکٹ کر لیا ہے۔“

”چار سال!“ اس کی کنپٹیاں درد کرنے لگیں۔

”میں تمہاری طرح قنوطی نہیں ہوں۔“ اس نے کرا تھا۔

لیکن اس وقت وہ شدید ترین قنوطیت کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کے اندر شدید ترین حس ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا، وجود میں کوئی کھڑی ہو جس کے پٹا اوکر کے وہ اپنے اندر کے جس کو کم کر سکے۔

”سال بھر میں چار موسم ہوتے ہیں۔ سال گزرتے گزرتے انسان چار موسموں سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔ میرے جیون میں بس ایک انتظار کا موسم ہے، ملن کی گھڑیاں تو جیسے پل بھر کے لیے آتی ہیں۔ اس کے بعد پھر وہی انتظار کا موسم۔“

”حیات ولا!“ کے سب ہی مکینوں نے کل اس سے بے حد اصرار کیا تھا کہ وہ عاشق کو سی آف کرنے کے بعد ان کے ساتھ ”حیات ولا“ چلے لیکن اس نے انکار کر دیا تھا اور اپنے گھر چلی آئی تھی۔

اواسی اتنی زیادہ تھی کہ خود کو کسی طور بہلانے کو بھی جی نہیں مانتا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بھی روٹھی ہوئی تھی۔
”مما۔“ مومن نے اسے پکارا تھا۔
”جی بیٹا!“ وہ چونک اٹھی۔

”آپ کے سر میں درد ہے؟“ وہ اسے ترجم بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایقان کے بول پر اداس سی مسکراہٹ تیر لگے۔ ”نہیں بیٹا!“ اس نے پار سے اس کا گال سلایا۔

”پھر آپ ایسے کیوں بیٹھی ہیں؟“

”کیسے؟“ اسے حیرانی ہوئی۔

”مٹی بری سی شکل بننا کر۔“ اس نے ماں کی ٹھوڑی چھوئی۔

ایقان کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ وہ کچھ دیر نہ تھکتی رہی۔

”ہتا ہے ماما! جب اسکول میں میری مس کے سر میں درد ہوتا ہے تا تو وہ ایسی ہی شکل بنا لیتی ہیں۔ سب بچے ڈر کر پپ ہو جاتے ہیں۔“

ایقان سے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”توبہ ہے تم بچے بھی نا۔“ اس نے مومن کو خود سے قریب کر لیا۔ ”بائی داوے، کبھی آپ نے اپنی مس سے سر درد کی وجہ نہیں پوچھی؟“

”نہیں ماما!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”ہاں۔ پوچھنا بھی مست۔ ہم سب دیکھی عورتوں کے ”سر درد“ ایک سے ہوتے ہیں۔ بس ناموں کا فرق ہوتا ہے۔“

”چانک ہی اس کی کیفیت تبدیل ہو گئی۔

”کس کے ناموں کا؟“

”سرتاج“ وہ میرا مطلب ہے ”سر درد“ کے ناموں کا۔ ”وہ شرارت سے مسکرا دی۔

”آپ مشکل مشکل باتیں کر رہی ہیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”ہاں بچے۔ آخر سپوت کس کے ہو۔“ اس نے مومن کا سر ہلایا۔ ”یہ باتیں ہماری سمجھ میں کیوں آنے لگیں۔ بری سی شکل نظر آ سکتی ہے۔ جلتا ہوا دل دکھائی نہیں دیتا۔ ہاں۔“

”آپ کا دل جل رہا ہے ماما!“ وہ فکر مند ہو گیا۔

اس نے بھولی سی صورت بنا کر اثبات میں رہنا دیا۔

”بچے گا کیسے؟“

”بھٹنا بھی برا ہے بچے! اسے جلنے ہی دو۔“ اس نے آہ بھری۔

”میں آپ کے لیے پانی لاتا ہوں۔“ وہ پین کی جانب دوڑ گیا۔

ایقان مسکرا دی تھی۔ کچھ دیر قبل اس نے وجود کا جس ختم کرنے کے لیے ایک کھڑکی کی ضرورت محسوس کی تھی۔ اپنے بیٹے کی بھولی بھالی باتوں سے اسے احساس ہوا تھا جیسے کوئی کھڑکی چپکے سے کھل گئی تھی۔ تازہ ہوا کے بہو عکسوں سے سیاحت کی سیلن زدہ لباس ختم ہو گئی تھی۔ اس نے کھڑکی کی پشت سے سر نہکا دیا۔

”کیا بات ہے، تم کچھ پریشان لگتی ہو، خیر تو ہے؟“ چائے کا گھونٹ بھرتی سمیچہ نے غور سے اس کی صورت

دیکھی۔

وہ کھنٹوں پر ٹھوڑی دھرے خاموش بیٹھی تھی۔ سمیچہ کی بات کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسے کیا جواب دیتی؟ اپنی پریشانی کی وجہ۔ اسے بتا کر وہ اپنی واحد دوست کو کھونا نہ چاہتی تھی۔ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی۔ بدر کے قافلے میں وہ کبھی رعبہ کو سچانہ جانتی۔ ساری بات سن کر وہ اپنے دل میں رعبہ کو قصور وار ٹھہراتی، خواہ زبان سے وہ اس کا اظہار نہ کرتی۔

وہ ساری رات جانتی رہی تھی۔ سوچ سوچ کر اس کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ بدر کی بات نے اسے سخت صدمے سے دوچار کیا تھا۔ حالانکہ یہی بات لیفیسہ خالہ نے بھی کی تھی لیکن ان کی بات دوسری تھی۔ انہیں بدر

اور سمیہ کے مابین قائم بے نام رشتے کا علم نہ تھا پھر انہوں نے گھس ربیعہ کی ہمدردی میں اور اسے سارا دینے کے لیے یہ بات کی تھی لیکن بد۔

اس کی سوچوں کے تاروکھ سے ٹوٹنے لگتے تھے۔ اس نے سمیہ کے نام لکھے گئے اس کے سب محبت نامے پڑھے ہوئے تھے۔ وہ نہ پڑھتی تو سمیہ زبانی اس کے لکھے ہوئے ڈانپلاگ سناتی رہتی۔ پڑھ پڑھ کر اسے وہ سب ازبر جو ہو جاتے تھے۔ وہ ان دونوں کی ہر خفیہ ملاقات سے واقف تھی۔ سمیہ کے ٹرنک میں چھپے ہوئے تمام تحائف کا احوال اسے پتہ تھا کہ وہ کب اور کس موقع پر دیے گئے تھے اور وہ بدر اس سے کہتا تھا کہ اسے تو ہمیشہ سے ربیعہ پسند تھی۔ سمیہ میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ دعوا کرتا تھا کہ سمیہ خود اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے جبکہ وہ اسی سے بیزار ہے۔ ربیعہ کو مردوات سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ذات کے اندر دھوکہ بازی، چھوٹ، فریب، کھوٹ کے سب ہی حساب کتاب غیر محسوس طریقے سے فیڈ ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ اسے دنیا دکھائی دے رہی تھی۔

”اے۔ کہاں کھو گئی ہے؟“ سمیہ نے اس کا کاندھا ہلایا۔ ”میں تجھ سے پوچھ رہی ہوں۔“

”کیا پوچھ رہی ہو؟“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”کیا بتاؤں آخر؟“

”نہیں ہو کیا ہے؟“

”کچھ ہوا تو بتاؤں، خواہ وہی۔“

”ایسی تو نہیں ہو تم، آخر تو ہے؟“ پھر وہ شوخی سے بولی۔ ”کیس کسی سے عشق و شوق تو نہیں کر بیٹھی؟ ایسی حالت

تو پیار میں ہی ہوتی ہے بندے کی۔ نہ اپنی خبر نہ دنیا کا ہوش۔“

ربیعہ نے طنز سے اسے دیکھا۔

”سناؤں کے اندھے کو ہری ہری سوچنے لگی؟ ویسے میں عشق کرنا بھی چاہوں تو اس کے لیے ایک عدد شخصیت

کار ہوگی اور آج کل تو محض ایک ہی شخصیت کے متعلق سوچا جاسکتا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“ سمیہ نے از حد اشتیاق سے پوچھا۔

”عرفان شوکت۔“ وہ تلخی سے بولی تھی۔

سمیہ نے برا سامنے بنایا۔

”لو، میں نجائے کیا سمجھ بیٹھی۔ اچھا بات تو سنو۔“ وہ اس کے قریب ہوئی تھی۔ ”ایک کام کرو میرا۔“

ربیعہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

”وہ بد۔۔۔ کو ایک پیغام دینا تھا۔۔۔ وہ مجھ سے ملنے کے متعلق پوچھ رہا تھا تو اس سے کہنا۔“

”سمیہ!“ ربیعہ نے اچانک ہی اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ”میں بدر سے کوئی بات نہیں کروں گی۔“

”کیوں؟“ اسے حیرت سے جھکا لگا۔ وہ فکر فکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

ربیعہ کو نگاہیں چراٹاؤں۔ سمیہ اس کی بچپن کی سٹکی تھی۔ اس کو دکھ دینے کا خیال ہی تکلیف دہ تھا۔

”کیا ہو گیا ہے ربیعہ تمہیں؟ تم اس طرح سے کیوں کر رہی ہو ناراض ہو مجھ سے؟“

ربیعہ کی پلکیں نم ہوئیں تو وہ آہستہ سے ہنس دی۔

”داغ خراب ہو گیا ہے میرا پریشانیوں کی وجہ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی ختم ہوتی جا رہی ہیں۔“

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ پریشانیوں نے اسے سوچنا سکھا دیا تھا۔ زندگی کے جن پہلوؤں پر غور کرنے کی اسے

کبھی ضرورت ہی نہ پڑی تھی اس پر اسے سوچنا بھی تھا اور فیصلے بھی کرنا تھے۔

”یہ زندگی بھی نا سمیہ! عجیب ظالم چیز ہے۔“ ربیعہ سوچوں میں گم تھی۔ ”جنہیں تیرا نہیں آتا، انہیں اٹھا کر

سمندر میں پھینک دیتی ہے۔ اب ڈوب جا میں یا لہروں کو ٹھکست دے کر ماہر تیراک بن کر ابھریں، یہ ان کی ہمت

بھی ہو سکتی ہے اور قسمت بھی۔“

سمعیہ اس کے چہرے کو نکلے جا رہی تھی، جہاں مرا نے کے سے تاثرات تھے۔

رات نے جیکے سے اپنے پر پھیلا لیے۔ آسمان پر ستاروں کا جال بچھ گیا۔ ربیعہ صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹی
اولیٰ تھی۔ اس کا من سخت اداسی کے عالم میں تھا۔ اس کا دل یہاں بالکل نہیں لگ رہا تھا لیکن عرفان شوکت کی
مراد پر خاموش دھمکیوں سے اس پر بہر حال اتنا اثر ضرور ہوا تھا کہ اب وہ اکیلے گھر میں تنہا رہنے کا خطرہ مول لیتا نہ
پااتی تھی۔ سوا ب وہ کچھ دنوں کے لیے یہاں چلی آئی تھی۔ یہاں ہر چند کہ افراد زیادہ تھے لیکن اسے سخت بوریت
وہ ہوتی تھی۔ اسے اپنا آپ بھی بے مقصد دکھائی دے رہا تھا۔

ہاں میں بنی کھڑی ہے اندر کام کرتی تو یہ دکھائی دے رہی تھی۔ ساتھ واث کے بلب کی ملگنی روشنی میں اس کا
پہرہ اور بیمار نظر آتا تھا یا شاید اس کی اپنی ذہنی کیفیت ہی پر مشرود ہو رہی تھی۔

سمعیہ اس کی جانب سے اپنی بات کا کوئی خاص رد عمل نہ پا کر خود ہی کسی بہانے سے نفیسہ خالہ کے گھر گئی
اولیٰ تھی۔ ان دونوں کا چھوٹا بھائی منیب کمرے میں بیٹھا زور زور سے اپنا سبق یاد کر رہا تھا۔

ربیعہ چارپائی پر تاروں کو شمار کرنے میں مصروف تھی۔ دروازہ بجا تو ٹوٹیہ پچن سے نکل آئی۔
"سلام بابا!" اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

"والسلام۔ والسلام۔" انہوں نے گرمجوشی سے اس کا سر تھکا۔ "بہت خوشی ہوتی ہے تمہیں یہاں دیکھ کر"
خوشی ہوتی ہے۔ تمہارا دل بھی خوب لگتا ہوگا، آخر کو تمہاری بچپن کی سکھیاں ہیں یہاں۔ کیوں بھی؟"

"جی!" وہ نظریں جھکا کر روادی میں بولی۔

"کسی بھی بات کی شکایت ہو، مجھ سے کہو۔ کوئی تکلیف ہو، میں بیٹھا ہوں۔ ہم سب ہیں نا تمہارا خیال رکھنے
لے۔"

"فکایت کیسی بچھا جان! آپ لوگوں کا تو بہت احسان ہے مجھ پر۔"

"ہا ہا ہا۔" وہ ہنس دیے۔ "احسان۔ بچی احسان کیا، اپنوں میں بھی کوئی احسان و حسان کا چکر ہوتا ہے؟ اپنوں
میں تو بس اپنا پن ہوتا ہے۔"

"آپ کھانا کھالیں بچھا جان! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

حاکم چچا لے بھر کو چوٹے۔

"بات۔ کیسی بات؟ اچھا اچھا۔ ٹھیک ہے، میں روٹی کھالوں پھر کرتے ہیں بات۔"

وہ استغنیٰ چڑھاتے ہوئے صحن کے کونے میں بنے دوش روم کی طرف بڑھ گئے تھے۔
ربیعہ اندر کمرے میں چلی آئی۔

اس نے پچھلی چند راتوں میں بہت سوچا تھا، بہت غور و خوض کیا تھا۔ تب ہی ایک واضح اور منطقی فیصلے تک پہنچ
لی تھی پھر اس کے سوا کچھ چارہ بھی تو نہ تھا۔

کچھ ہی دیر میں حاکم چچا کاندھے پر بڑے رومال سے مونچھیں صاف کرتے اندر چلے آئے۔ "چھا ہوتا اگر تم
کھانا کھانے سے پہلے ہی بات کر لیتیں۔" وہ اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ "مجھ سے تو پریشانی میں ٹھیک سے کھانا بھی
لھایا گیا۔"

"الہ۔" ربیعہ شرمندہ ہو گئی۔ "مجھے خبر ہوتی تو آپ سے پہلے یہ بات ہی نہ کہتی۔"

"چلو تم بات تو بتاؤ کھانا بتانا تو ساری عمر ساتھ لگا ہے۔" وہ بہت بے چین نظر آ رہے تھے۔

ربیعہ نے انہیں سیکنے بوا اور عرفان شوکت کے متعلق سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔ حاکم چچا بغور سنتے رہے۔
اسی کبھار اپنی مونچھوں کو تاؤ بھی دے لیتے تھے۔

"پولیس میں میرے کچھ جاننے والے ہیں۔" ساری بات سن کر وہ بولے۔ "میرا خیال ہے، میں ان سے بات
راتا ہوں۔"

”بولیں۔؟“ ربیعہ نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”نہیں بچا جان، وہ شخص بہت بار سوخ نظر آتا ہے۔ میرا خیال ہے اس سے الجھنا درست نہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو پہلے تو سیدھی انگلی سے ہی گھٹکے کی کوشش کرتے ہیں لیکن انہیں انگلی ٹیڑھی کرنے میں دیر نہیں لگتی۔“

”تو پھر تم گھر پر تالا ہی پڑا رہو۔ تم ہمیں رہو، تالا توڑ کرنا جائز قبضہ کرے گا تو پھر دیکھ لیں گے۔“

”میرا اپنا خیال بھی یہی تھا۔“ ربیعہ بولی۔ ”لیکن پہلی بات تو یہ کہ ایسا آخر کب تک ممکن ہے؟ جلد یا بدیر! جانا تو ہو گا پھر یہ کہ جلد ہی اسے علم ہو جائے گا کہ میں یہاں ہوں اور وہ یہاں آنے میں بھی تامل نہ کرے گا۔“

”پھر تمہارے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟“

”میرا خیال ہے کہ میں۔۔۔“ ربیعہ خاموش ہوئی۔

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ بولو۔“

”چچا میاں۔۔۔“ اسے شرم آئے آرہی تھی۔ ”میری شادی کر دیں۔“

”اوہ۔۔۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دیے۔ ”بس اتنی سی بات؟ کوئی مشکل ہی نہیں۔ یوں سمجھو چٹ مفتی پٹ ہے لیکن یہ مکان کا قصبہ تو وہیں رہے گا۔“

”مکان بھی میں بچ دوں گی۔“ اس کے لمحے میں ٹھکست خوردگی تھی لیکن پھر سر اٹھا کر ایک عزم سے بولی۔

”لیکن عرفان شوکت کہ ہرگز نہیں۔ کم از کم وہ مجھ سے اس ایگریمنٹ پر سائن نہیں کروا سکتا۔ میں آپ۔۔۔ یہی بات کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن یہ میرے بس کا کام نہیں۔ آپ۔۔۔ اس مکان کے لیے کیا اچھا گاؤں ڈھونڈیں اور میرے لیے کوئی نیک شریف لڑکا۔“

”لڑکا۔۔۔ ہا ہا۔۔۔“ وہ بے کلی سے ہنسنے لگی۔ ”ہاں ہاں ضرور، کیوں نہیں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ میری اپنی نظر میں چند ایک مناسب رشتے ہیں۔“

وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”تم یہاں آرام سے بے فکر ہو کر رہو، کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ میں اس عرفان شوکت کو بھی دیکھ لوں گا سارے کے باپ کی جاگیر ہے کیا جو اکڑ رہا ہے۔ بھی ہمارا مکان ہے، ہم جس کو مرضی پیچیں۔“

وہ دروازے کی جانب بڑھے پھر رک گئے۔

”اور وہ۔۔۔ تمہاری کوئی شرط وغیرہ ہو۔ میرا مطلب ہے کیسا رشتہ چاہتی ہو، کوئی خاص خوبی؟“ ربیعہ سر جھکا کر

”بس آپ اپنا اطمینان کر لیں چچا میاں! میری کیا شرط ہو سکتی ہے۔ بس نیکی اور شرافت ہو۔ دو وقت کی رٹا دے سکے۔ یوں بھی مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے۔ آپ جیسا سمجھیں اور ثوریہ کے لیے سوچتے ہیں یقیناً ویسا تو میرے لیے بھی سوچیں گے۔“

”بالکل۔ بالکل۔۔۔ بلکہ میں ان سے بڑھ کر عزیز رکھتا ہوں تمہیں۔ تمہیں جلد ہی اندازہ ہو جائے گا۔“ وہ کندھے پر پڑا دیوال جھانٹتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ربیعہ گہرا سانس بھر کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”بہت دن ہوئے یہ فردوس بیگم نے چکر نہیں لگایا۔“ شفیقہ حیات نے ٹانگیں سمیٹ کر ہو کو بیٹھنے کے لیے جگہ دی۔

”بس اماں! مرضی کی مالک ہیں۔“ وہ روٹی پکا کر آئی تھیں۔ ماتھے پر پسینے سے چپکے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے پیچھے کرتے ہوئے بولیں۔ ”مرضی ہوگی تو دن بھر میں دو دو چکر لگائیں گی، ورنہ ہفتہ بھر صورت نہیں دکھائیں۔“

”چلو ہم ہی چلتے ہیں اس دن کے بعد ہاشم کی بھی خبر نہ لی، ہم نے غریب کتنی جو میں کھا کر آیا تھا اس دن۔“

”ہاں ضرور۔ میں ذرا سالن سے فارغ ہو لوں، ابھی آکوڑا لے ہیں، گلے میں کچھ دیر لگے گی۔“

”لڑکیاں کیا کر رہی ہیں؟“ انہوں نے ہو کا جائزہ لیا۔

”ماہیہ نے چھت پر مشین لگائی ہوئی ہے۔ سدرہ شاید ناعہ کی طرف گئی ہے۔ رزلٹ آنے والا ہے نا ان کا“

ان پاپہ کرتی پھر رہی ہیں۔“

”ہوں!“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ چھوٹی والی یوں بھی کم دھیان دیتی ہے گھر کے دھندوں میں۔ دیدہ نہیں

انا اس کا گھریلو کاموں میں۔ ادھر ادھر پھر کر ہی دن پورا کر لیتی ہے۔“

”بس اماں! کیا کریں۔ جدھر دیکھو لڑکیوں کا یہی حال ہے۔ بھابھی، ایک چھوٹی والی کو دیکھ لیں۔ اپنی عریشہ وہ بھی

ماں لگتی ہے ماں کے ساتھ یا توئی وی دیکھتی ہے یا پھر یہاں بیٹھی کپڑوں اور میڈ اپ کی باتیں کرتی رہتی ہے۔“

”اب لڑکیوں پر کیا الزام دھرتا بیٹی! ان کی تو جیسی تربیت کرو گی، ویسا پاؤ گی۔ مجھے ہی دیکھ لو۔ رابعہ میری بڑی بیٹی

میں اس پر میں نے شروع سے کڑی نگاہ رکھی کام کاج میں لگائے رکھا، ادھر ادھر کی باتوں میں الجھنے نہ دیا۔ ایقان

اب سے چھوٹی تھی پھر شادی کے طویل عرصے کے بعد ہوئی۔ تین اولادیں تب تک جوان ہو کر اپنے گھروں کی

مہلی تھیں۔ اس کام میں نے ایسا لاڈ کیا جیسے پہلو تھی کا لڑکا ہو۔ اب دونوں میں فرق دیکھ لو۔ ایقان بھی ماشاء اللہ

میں ہوئی، سلیقہ مندی کی ہے مگر اس میں رابعہ والی سنجیدگی اور بروہاری نہیں ہے۔ ابھی بھی بچوں جیسی بات کر جاتی

ہے۔ ضد پر اڑ جائے تو بادشاہ کو خاطر میں نہ لائے۔ رابعہ کا رشتہ میں نے اپنے بھانجے سے کر دیا۔ دونوں کی عمروں

میں اصحابا فرق تھا۔ رنگ کا بھی اللہ بخشہ وہ بچہ بڑا پاک تھا۔ رابعہ ہماری گوری بیٹی، دودھ جیسی لیکن بہن نے جھولی

ہالائی تو میں انکار نہ کر سکی۔ مجال ہے جو اس بچی نے آف تک کی ہو۔ خوشی خوشی دلن بن کر اس کے سسک چل

لی اور یہ ایقان۔ اختر میاں کا پیغام کیا لائیں فردوس بیگم! اس بچی نے قیامت مچا ڈالی۔ ارے میں کون سا کر ہی

ان میں مگر اس نے تو حشر اٹھا دیا۔ اپنی پسند بٹلائی اور وہیں شادی کی۔ تم سے کیا چھپا ہے، سب تمہارے سامنے کی

ہاں میں مگر میں تو یونہی تربیت کا ذکر کر رہی تھی کہ سبکی بہنوں میں بھی اتنا فرق ہو جاتا ہے، اگر تربیت میں کچھ

لگائی رہ جائے تو۔“

”وہی بات اب تک دل سے لگائے بیٹھی ہیں فردوس بھابھی۔“ عذرا بیگم نے گہری سانس بھری۔

”حالات یہ یہ تو نصیب کی باتیں ہیں۔ اللہ کی طے کر وہ ہیں۔ اب آپ بھی گواہ ہیں اماں! میری بھلا بھابھی سے کیا

الاش تھی یا عریشہ میری بیٹیوں جیسی بچی ہے، اس کے لیے میرے دل میں کیا تقصیر ہو سکتا تھا؟ رافع سے آپ

لے لو رو چھتا تھا اس کے لیے۔ جب لڑکے نے ہی ہاں نہ بھری تو بھلا ماں باپ زبردستی تو نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دو باتیں

انہوں نے جی کا ناسور بنائی ہیں۔ تب سے ہی آنا جانا کم ہے ان کا۔“

”چلو خوش رہیں۔ ہمیں یاد آئے گی تو ہم خود جا کر پوچھ لیں گے۔ ہمیں تو اپنے بچے عزیز ہیں نا۔ اس دن ہاشم کی

نی تو مانو من من بھر کے ہو گئے پیر۔ جی یوں ہوا جیسے پانی! وہاں تک گرنی پڑتی جیسے بچنی ہوں، مجھے ہی خبر ہے۔

کو خیریت ہے چنگا بھلا دیکھا تو دل مطمئن ہوا۔“

”وہ بھی بھابھی جان ہی کچھ زیادہ جذباتی ہو گئی تھیں۔“ عذرا بیگم نے منہ بتایا۔ ”انہوں نے تو نقشہ ہی ایسا کھینچا

لہا۔ دل دہلا دیا۔“

”فلیقہ حیات مسکرا دیں۔“

”ماں ہے۔ جس نے کوکھ سے جنا ہو، اس کو درد بھی زیادہ ہوتا ہے بیٹی! بیٹے کے سر سے بہتا خون دیکھ کر ہر ماں

ایسی دیوانی ہو کر بھاگے گی۔“

”خیر یہ تو جی کہا آپ نے۔“ انہوں نے ساس کی تائید کی۔

”چلو پھر تم ذرا سائن کی خبر لو، میں ظہر پڑھ لوں پھر چلتے ہیں ان کی طرف۔“

مذرا بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

میڈیوں پر آہٹ سن کر اخبار پڑھتی منیڈہ بیگم نے سر اٹھایا تھا۔

وہ نما ہو کر فریش ہو گئی تھی۔ اب نیچے آ رہی تھی۔
 ”اے سلام علیکم امی!“ وہ ان کے سامنے آ بیٹھی۔

”اے سلام علیکم السلام۔“ انہوں نے چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ ”تیند کچھ پوری ہوئی؟“

”کچھ نہیں بہت کچھ۔“ وہ ہنس دی۔ ”بچھلے بارہ گھنٹوں سے تو سو رہی ہوں۔ آپ نے جگایا بھی نہیں۔“

”کیوں جگاتی بھی! ہفتہ بھر سے جاگ بھی تو رہی ہو۔ بارہ گھنٹے سو لیں تو کیا ہوا۔ چلو اچھا ہوا“ فریش تو ہو گئیں۔“

انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ملے گلابی سلک کاشن کے کپڑوں میں اس کا گلابی چہرہ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ گیلے سیاہ بالوں کے حصار میں وہ اور بھی اجلی اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ سیاہ کمان دار بھونوں اور ٹھوڑی ہاتھ بھرا ہوا سیاہ تل اسے مزید دلکش عطا کرتے تھے۔ انہوں نے نظروں ہی نظروں میں اس کی نظر اتاری۔

وہ اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی تھی پھر اس نے گھڑی کی جانب دیکھا۔

”ڈیڑھ بج گیا ہے یہ عہرا بھی تک نہیں آیا؟“

”کبھی کبھار دس پندرہ منٹ لیٹ ہو جاتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی تھیں۔

”کیوں لیٹ ہوتا ہے؟“ وہ حد درجہ فکر مند ہو گئی۔ ”آپ نے دین والے سے نہیں پوچھا؟“

”تنی پریشان کیوں ہو گئی ہو میں خود ہر طرح سے خیال رکھتی ہوں۔ سونو کی والے سے بھی میں نے پوچھا ہے۔ کہہ رہا تھا، ٹریفک کا روٹ کچھ بدلے، اس لیے دس منٹ زیادہ لگ جاتے ہیں۔“ ان کی وضاحت سن کر بھی اس کے چہرے سے فکر مندی کے آثار نہ گئے تھے۔

اسی لمحے باہر دین کا ہارن بجا۔

”یہ لو ابھی گیا۔ تم یونہی ذرا سی بات دل پر لے لیتی ہو۔“ منیذہ بیگم ہنس دیں۔

وہ اچھلتا کودنا چلا آ رہا تھا۔

”مما... ممما...“ وہ آکر اس سے لپٹ گیا۔ ”آج آپ گھر پر ہیں، کتنا اچھا دن ہے۔ منڈے بہت اچھا دن ہوا ہے۔“

شہلا مسکرا دی۔ پیر کو عمو! اس کا ریسٹ ہی ہوتا تھا۔

”بیٹا! گھر آکر پہلے نانو کو اور ممما کو سلام کرتے ہیں پھر ادھر ادھر کی ہانکتے ہیں۔“

”اے سلام علیکم نانو، ممما! اس نے فوراً“ تعمیل کی۔

دونوں نے ہی جواب دے کر اس کا ہاتھ چوما تھا۔

”اللہ سلامت رکھے اپنی ماں کی آنکھوں کا نور ہو۔“ منیذہ بیگم بولی تھیں۔ ان کی بلیکس نم ہو گئی تھیں، جنہیں انہوں نے مہارت سے چھپا لیا۔

”آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں ممما! پنک کلر کے کپڑے کتنے اچھے ہیں۔“ وہ اس کا بغور جائزہ لینے لگا۔ شہلا ہنس

دی۔

”تمہاری خالہ تمہیں مستقبل کا شاعر ٹھیک ہی کہتی ہے۔“ اس نے عمر کے سر پر چیت لگائی۔

فون کی بیل بج اٹھی تھی۔ شہلا نے چونک کر فون کی جانب دیکھا۔ ذہن میں آندے ٹول کے بچھو ہو شیار ہو گئے تھے۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ منیذہ بیگم اٹھ گئیں۔

وہ تذبذب کے عالم میں انہیں فون کی جانب جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جیسے ہی انہوں نے ریسیور پر ہاتھ رکھا

وہ چیپ نہ سکی۔

”امی! بات سنیں۔“

”ہاں، انہو۔“ وہ فون اٹھانے سے قبل اسے دیکھنے لگیں۔

پھر اس کی جانب سے کچھ جواب نہ پا کر انہوں نے بجتا ہوا فون اٹھایا۔

”ہیلو۔۔۔ ہال۔۔۔ کہو۔۔۔“
وہ غائب دماغی ہے انہیں بات کرنا دیکھتی رہی۔ ذہن یکدم خالی ہو گیا تھا۔ منہ پر بیگم ریسور رکھ کر واپس آئیں تو وہ کم صم سی بیٹھی تھی۔
”انیقہ کا تھا۔ کہہ رہی تھی دوست کے گھر جا رہی ہے، مل کر اسٹائمٹ تیار کرنا ہے۔ رات تک واپس رہی۔“

انہوں نے رک کر اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔
”شسلام۔۔۔“ انہوں نے کہا۔
”ہی۔۔۔“ وہ چونک اٹھی۔ ”کیا امی۔۔۔ انیقہ کیا کہہ رہی تھی؟“
”تم کہاں کھوئی ہوئی ہو بات کیا ہے؟“
”کچھ نہیں۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

باب سٹک فیصلہ نہ کر پائی تھی کہ انہیں ”اس“ کے فون کے متعلق بتائے یا نہ بتائے۔ دراصل اسے غور سے ابراہیم سے پوچھا تھا کہ ”اس“ نے اتفاقاً ہی فون کر لیا تھا یا یہ اس کی کوئی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔
”وہ کہہ رہی تھی ‘ارم کے گھر جا رہی ہے۔ دیر سے لوٹے گی۔“
”جی۔۔۔ اچھا۔“ اس نے چونک کر اپنے آس پاس دیکھا۔ ”یہ عمر کہاں گیا؟“
”تمہارے سامنے ہی تو اپنے کمرے میں گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں ڈیوٹیاں بھگتا بھگتا کر تمہارا دماغ کمزور تو نہیں ہو گیا؟“

اس نے ہنس کر سر جھکا لیا۔
”میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ باتوں میں دھیان ہی نہ رہا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

چائے چھان کر ناعمہ کیٹلی کوئی کوزی سے ڈھک رہی تھی جب ان تینوں کی آمد ہوئی۔ وہ ان کی آمد سے بے خبر آگے بڑھ کر کینٹنٹ کھولنے لگی۔

علی، حمزہ اور نافع نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کاؤنٹر پر بڑے سخی ہوئی رکھی تھی۔ پکوڑے، تلی ہوئے پاپڑ، بسکٹ اور مٹھائی کی پلیٹیں لبالب بھری ہوئی تھیں۔

ناعمہ سب کچھ تیار کر کے اب کینٹنٹ سے چائے کے مک نکال رہی تھی۔ مک ٹرے میں رکھ کر وہ مصروف سے انداز میں پلیٹی تو اسے اچانک کسی کی احساس ہوا۔

سر جھٹک کر اس نے بغور ادھر ادھر دیکھا اور پھر وہ بری طرح سے چونک اٹھی۔ کاؤنٹر پر سے لوازمات کی ٹرے غائب تھیں۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سارے کچن کا جائزہ لیا جیسے اسے اپنی بصارت پر کوئی شک ہو پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے کچن سے نکل آئی۔

ایقان آئی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ شفیقہ حیات اور عذرا بیگم بھی ان لوگوں کے پورشن میں چلی آئی تھیں۔ ہامیہ اور سدرہ بھی آگئی تھیں۔ وہ ان ہی سب لوگوں کے لیے شام کی چائے اور اسٹیکس وغیرہ تیار کرنے کے لیے کچن میں ایک گھنٹے سے مصروف تھی۔

”ورہ آئی! اس نے سامنے سے آئی ورہ کو مخاطب کیا۔“ کچن سے ٹرے اٹھا کر آپ لے گئی ہیں؟“
”نہیں۔“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”میں تو یہی دیکھنے آ رہی تھی کہ تم کہاں تک پہنچی ہو۔ ٹائی ای کی کہہ رہی ہیں عصر قضا ہو جائے گی۔“

”ہائے اللہ۔“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”پھر سب چیزیں کہاں گئیں؟“
”وہیں ہوں گی ان کے کیا پیراگ آئیں گے۔“ ورہ اس کی پریشان صورت کو دیکھ کر ہنس پڑی۔

”نہیں وردہ آپ! وہاں نہیں ہیں۔“

وہ اس کے پیچھے پیچھے پن میں آئی۔

”یہ دیکھو یہ تو بڑی ہے۔“ وردہ نے ٹرے کی جانب اشارہ کیا جواب دوبارہ کاؤنٹر پر دھری تھی۔

”ہائے اللہ یہ کیا معاملہ ہے؟“ ناعمہ کو حیرت ہوئی۔

پھر وہ چلائی تھی۔ ”لیکن یہ چیزیں تو آدھی ہو چکی ہیں۔ یہ اتنے سے پکوڑے؟ میں نے تو ڈھیر سارے بنائے تھے

اور یہ مٹھائی کی پلیٹ سے گلاب جامن کہاں گئے؟ یہ تو صرف لٹو اور بالوشاشی رہ گئی ہیں۔“

”لٹو اور بالوشاشی ہم پسند نہیں کرتے لڑکی! تمہایت بھاری آواز پن میں گونجی تھی۔

دونوں نے حیران نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وردہ کچھ کچھ سمجھ کر پن سے باہر کھلنے والی کھڑکی کی جانب

ہمیں۔ ”تو یہ تم ہو شیطانو! اس نے باہر جھانک کر کہا۔

وہ تینوں نیچے گھاس پر راجمان مون اڑانے میں مصروف تھے۔

”ناعمہ سے کہیں چائے پیس دے دے۔“ علی نے اس سے یوں کہا جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

وردہ تو ہنسنے لگی تھی لیکن اس کا آدھا خون جل گیا۔

”میں پوری کیتلی تمہارے سروں پر انڈیل دیتی ہوں۔“ اس نے دانت پیسے

”نور ابکم۔“ حمزہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ ”ہم سر اٹھا کر منہ کھول لیں گے۔“

”انگل۔“ یہ نافع تھا۔ ”آپ ان کی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہیں محترمہ!“

”ابھی تم نے میری صلاحیتیں کہاں دیکھی ہیں۔“ وہ تملائی تھی۔

”کیوں نہیں سب کچھ اچھا کھل گیا ہے۔ یہ پکوڑے بنائے ہیں؟ نمک کم، مرچ زیادہ۔ ہر ادھنیا بہت ڈال دیا

ہے۔“ ”اور یہ پاپڑ؟ آدھے جلے آدھے کچے۔“

”مٹھائی اچھی ہے۔“

”ہاں، حلوائی باصلاحیت تھا۔“

”آپ چائے پتا نہیں کیسی ہوگی۔“

”چلو زہرا مار کر لو پنکی کا دل رہ جائے گا۔“

”میں بچ بچ زہر ملا دوں گی۔“ ناعمہ غصے سے سرخ ہو گئی۔

”یعنی دو کی ضرورت طے ہوا۔“ انہیں اطمینان ہو گیا۔

پھر انہوں نے بھر پور تہنہ لگایا تھا۔

”چلو ناعمہ!“ وردہ ہنسنے ہوئے بولی تھی۔ ”مندر لے چلو چائے بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اس کا بس نہ چلنا تھا ان کا

خون پی جائے۔

دونوں چائے اور دیگر لوازمات لے کر اندر داخل ہوئیں تو رابعہ بیگم نے اسے گھورا۔

”دیر نہ گھنٹہ ہو گیا ہے ناعمہ! بہت نکمی لڑکی ہو۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”ماں انتظار کر کے بالآخر نماز کے لیے اٹھ

گئی ہیں۔“ ”می جی۔ دوس۔“

”چلو اب جلدی سے سب کو چائے دو۔“ انہوں نے اسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ”اور یہ کیا چیزیں بنائی ہیں۔

ادھوری سدھوری، حد کروئی تم نے کتے پن کی۔“ انہیں اس پر سخت تاؤ آ رہا تھا۔

”می جی۔ دوس۔“ اس کا دل پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ بات کرنے سے پہلے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ہائیں اب اس میں سوے بہانے کی کیا بات ہے؟“

”ایقان بولی۔ ”بابی! آپ نے بلا وجہ اسے رُلا دیا ہے۔ اتنا کچھ کر کے لائی ہے بے چاری۔“
”اصل راستے میں ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا۔“ وردہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ قافلہ تو لٹا پٹا آپ تک پہنچا
”اں نے رُے کی جانب اشارہ کیا۔

”اے! وہ ہنس پڑی۔ ”تو کیا ہوا؟ وہ بھی اپنے ہی ہیں، دھماچو کڑی کہیں کے۔ کون کون تھا؟“
”عل! تمزہ اور نافع۔“ ناعصہ نے ناک رگڑی۔ ”دیکھ لوں گی میں بھی۔ بدلہ نہ لیا تو ناعصہ علی خان نام نہیں

”نافصہ نہیں کرتے۔“ حقیقہ حیات نماز پڑھ کر چلی آئی تھیں۔ ”ٹڈکیوں کو غصہ پینا آنا چاہیے۔“
”یہاں۔“ ایقان نے شوخی سے ماں کو دیکھا۔ ”پھر ساری عمر یہی کام تو کرنا پڑتا ہے۔ ہاں ای جان؟“
”اے ہاں جانتی ہوں، جتنا غصہ پیتی ہو تم۔“ انہوں نے بیٹی کو گھورا تھا۔ ”موا ناک پر دھرارتا ہے، عینک کی

”اے اللہ امی! میں کہاں غصہ کرتی ہوں۔“ اس نے احتجاج کیا۔ ”اس ندر صابر و شاکر بیٹی سے بھی شکایت
”اے! لہو۔“

”اں ہوں تمہاری، ایک ایک پل کا حساب کتاب ماؤں کے حافظے میں درج ہوتا ہے۔“ ایقان شرمندہ سی
”صابر! اگر تو میری یہ والی بیٹی ہے۔“ انہوں نے پاس بیٹھی رابعہ بیگم کو گلے لگا لیا۔ ”خدا کے حضور بھی صابر

”اے! اے! ہاں باپ کے سامنے بھی کبھی ”ف“ نہیں کی۔ ہر قسم کے حالات دیکھے میری بچی نے لیکن کسی
”اں لے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی۔“
”تو ہی کہاں لے۔“ غدا رابعہ نے بھی تائید کی۔ ”رابعہ سے سیکھنا چاہیے، حوصلہ کیا ہوتا ہے اور تقدیر پر

”اے! اے! اے! رہتے ہیں۔“
”رابعہ بیگم کی پلکیں جھپک جلی تھیں۔
”میں بھی نماز پڑھ لوں، وقت نکل رہا ہے۔“ وہ آہستگی سے اٹھ کر ان کے درمیان سے نکل گئی تھیں۔

”اے! اور ناعصہ ماں کو جاتے ہوئے دیکھنے لگیں۔ دونوں کے چہروں پر سوچوں کے سائے تھے۔
”اے! لہو۔“ انہوں نے بھائی کے سامنے کھانا گویا پٹخا۔ ”کھاؤ پھر سو جاؤ۔“
”اے! لہو! نے جھکا ہوا سراٹھا کر ہن کو دیکھا۔

”اے! تے کڑوے نوالے ہمارے حلق سے کیسے اتریں گے بابی! وہ مسکرائے۔ ”کچھ تو مٹھاس سے بولا کرو۔“
”اے! لہو! خود سے کڑوا یا مٹھا نہیں ہو جاتا، آخر میاں! یہ تو سامنے والے کی مرضی ہے، وہ کڑوا سنا چاہتا ہے یا مٹھا۔

”اے! لہو! میں کتنی ہوں کپنیاں سفید ہو گئیں تمہاری، چندیا پر سے آدھے بال اڑ گئے، یوں دکھائی پڑتے ہو جیسے
”اے! لہو! برس کے ہو پھر بھی تمہاری سوتی ہوئی عقل نہیں جاگی اور اب تو جاگنے کے آثار بھی نہیں۔“
”اے! لہو! میں ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئیں اور اپنا پاؤ دوانے لگیں۔

”اے! لہو! ہم کیا کریں بابی! کچھ نہیں کرتے پھر بھی سب ہم سے خفائی رہتے ہیں۔“
”اے! لہو! ہمایا تو کرو تا پچھ، بہن ہوں تمہاری۔“ جی اٹھتا ہے تمہیں یوں لاوارثوں کی طرح یہاں پڑا دیکھ کر۔ بھائی

”اے! لہو! ہمایا تو بہنوں کا میکہ ہوا کرتے ہیں۔ ان کی عزت، ان کا مان ہوتے ہیں۔ یہاں ہم لوگوں سے شرمندہ ہوتے
”اے! لہو! ہیں۔“
”اے! لہو! لڑکیاں کا نوالہ منہ کی طرف لے جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔

”اے! لہو! شرمندہ ہوتی ہو بابی! انہوں نے نوالہ واپس رکھ دیا۔ ”دو ٹھڈے مار کر باہر کرو ہمیں۔“ وہ بے حد
”اے! لہو! لیکن ہم گئے تھے۔“ یہی سلوک روا ہے ہمیں۔“

”اے بھیا!“ انہوں نے ہاتھ پیٹ ڈالا۔ ”تمہارے بھلے کوہی کہتی ہوں۔ یہ دن بھر کی چار روٹیاں پکا کر نہیں نکل جاتی میری گمتری چاہتا ہے کہ یہ روٹیاں بوی پکائے جس کا پکانے کا حق ہے ماشاء اللہ جو ان جہان ہو“ سی عمر نکل گئی ہے تمہاری؟ ابھی بھی چاہو تو اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ ذرا سی ہمت پکڑو گھر سے نکلو، روز گار سے لگو، چار پیسے لاکر ہاتھ پر دھرو۔ لگے کہ مرد ذات ہو، کہیں رشتہ ڈالتے ہمارا بھی حوصلہ ہو۔ اب کہیں لڑکی مانگنے جائیں تو کیا کہیں؟ کون سے گھر جتائیں تمہارے؟ سارا دن کسی کو نہ میں پڑے اینڈا کرتے ہر بھوک ستائے تو منظر عام پر چلے آتے ہیں، کچھ نصیحت کرو تو روٹھ جاتے ہیں، بادشاہ زادے نہ ہوئے۔“ وہ کھستے ہوئے بول رہی تھیں۔ آخر میاں کچھ دیر کو غمگین نظر آکر پھر کھانے کی جانب متوجہ ہو چکے تھے۔

”اس گھر میں میری سناکون ہے؟ فقار خانے کا طوطی ہوں۔“ اب انہوں نے اپنی ٹانگ بانی شروع کی۔

”جو اپنی بات دوسروں کو سنانا چاہے اسے چاہیے کہ بات میں وزن پیدا کرے۔ نری ہوا ہی نہ ہو۔“ بھابھا لب ولہجے میں کہا گیا۔

وہ دونوں چونک اٹھے تھے۔

فاروق حسن نجانبے کس وقت چلے آئے تھے۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ وہیں بیٹھ گئے۔ فردوس بیگم ان کی بات پر جل بھن کر اب منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگی تھیں۔

”کہاں ہوتے ہیں اختر میاں؟“ فاروق حسن ان سے پوچھنے لگے۔ ”کوئی پر اپر روٹین نہیں ہے آپ کا نظر آنے کا۔“ کبھی صبح سویرے نظر آجائیں تو رات گئے تک خبر نہیں ملتی آپ کی۔ کبھی آدھی رات کو کبھی باغ میں ٹہلنے نظر آجاتے ہیں، کبھی دو دو دن کے لیے غائب ہوتے ہیں، کبھی سارا سارا دن بیٹھنے دی سے شغل کرتا ہیں۔ یہ کیسی زندگی گزار رہے ہیں آپ؟“

”اے بہت کان بیٹھے ہیں میں نے ان پر اثر نہیں ہوتا۔ موتی طبیعت ہے کہ گینڈے کی کھال۔“

اختر میاں نے روٹیاں جھٹ پٹ معدے میں اتار لی تھیں۔ پانی سے بھرا گلاس بھی غٹا غٹ چڑھا گئے اور اکر کھڑے ہو گئے۔

”کل سے میرے ساتھ آفس چلا کریں، صبح آٹھ بجے پورچ میں کھڑے ہوں آپ۔“ انہوں نے ان کا ارا بھانپ کر تنبیہ کی۔

”بہم، بہم۔ بھائی میاں! ہم کیا کریں گے آفس جا کر؟“ وہ گھبرا گئے۔

”سب آپ کے جس شعرو ادب سے لطف اندوز ہوں گے وہاں۔“ انہوں نے طنز یہ کہا۔ ”پڑھے لکھے۔“

”شک زیادہ نہ ہوں، شعرو شاعری خوب کر لیتے ہیں آپ۔“

ایقان کی شکایت پر انہوں نے ابھی پچھلے ہی دنوں خوب خبر لی تھی ان کی۔

”بھائی میاں! ہمارا حافظہ اب وہ نہیں رہا۔“ اختر میاں مظلومیت سے بولے۔ ”ہمیں کہاں شعرا درہتے ہیں اب۔ یوں بھی ہماری وجہ سے وہاں دفتر میں آپ کی بھداڑے گی۔“

”اڑنے دیجئے۔“ وہ مسکرا دیے تھے۔ ”ہمیں زیادہ اڑان بھرنے والوں کے پر کاٹنے خوب آتے ہیں۔ ام ہر حال کل صبح ہمیں پورچ میں ملیں، ٹھیک آٹھ بجے۔“

”لیکن بھائی میاں! ہم وہاں کریں گے کیا؟“ وہ از حد پریشان ہو چکے تھے۔

”کہانا، شعر سنائیں گے سب کو۔ اس شعرو شاعری کو آپ کی نوکری بتا دیا جائے تب ہی دل بھرے گا آپ اب تب ہی کسی بڑھنگ کے کام کو آپ کی توجہ نصیب ہوگی۔“

اختر میاں نے از حد مظلومیت سے بسن کی جانب دیکھا کہ شاید وہاں سے کسی قسم کی ملک دستاویز ہو سکے۔ بھی بھری بیٹھی تھیں انہوں نے قطعاً ”لفٹ نہ کرائی۔ بالآخر وہ ٹھکے ہارے جواری کی مانند جھکے ہوئے کندھیل کے ساتھ وہاں سے نکل لیے۔“

”ارے کیا کراؤ گے اس نکتے سے؟“ بھائی کے جانے کے بعد انہوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”ہے کوئی اس کے کرنے کا کام؟“

”کام کی بھی کبھی کمی ہوئی ہے بیگم! ہاتھ چلانے والا ہونا چاہیے۔“ وہ جوتے اتارنے لگے تھے۔

”پھر بھی اسے تو قلم پکڑنا نہیں آتا۔“ وہ فکر مند تھیں۔

”قلم پکڑنا ابھی نہیں ہے۔“

”اے ہے کچھ تو کہو۔“

”بیون پچھٹی پر گیا ہوا ہے میرا“ اس کی جگہ بٹھاتا ہے۔ چائے کے کپ تو تھما سکتا ہے مناسب کو۔ پانی تو پلا سکتا ہے؟“

”ہائے اللہ۔“ انہوں نے کایجہ تھام لیا۔ ”بچہ اسی بناؤ گے اسے؟ ارے یہی اوقات رہ گئی ہماری؟ جھاڑو دے گا؟ ہاتھ لگائے گا؟ ارے میری میٹا۔۔۔“ وہ زار و قطار رونے لگیں۔ ”ارے کیسے تڑپے گی اب مرحوم کی روح۔ فاروق سن! تم نے ساری عمر جی دکھایا میرا۔“

”ابا مرحوم کی روح اس حال میں خوش ہے؟“ وہ طنزاً ”بولے۔“ ان کے اشعار انہیں ایصالِ ثواب پہنچاتے رہتے ہیں غالباً۔“؟ ان کے جھاڑو پونچھا لگانے سے ادب کی دنیا کو کوئی دھچکا نہیں لگے گا“ بے فکر رہیں۔ جس ان چار پیسے تنخواہ کے نام پر بیس کے سب سے زیادہ خوش بھی آپ ہی ہوں گی۔“

”کتنی طے کی ہے؟“ وہ نہ نکلنے والے آنسو پونچھنے لگیں۔

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پر سج گئی تھی۔

”کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ شملانے بستر پر لیٹی مریضہ سے پوچھا تھا۔

وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”اب تو اچھی ہوں ڈاکٹر صاحب!“

”بہت پیاری بیٹی دی ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو۔“ وہ بھی مسکراتی تھی۔

”بس جی اس کی مرضی۔“ وہ کچھ ادا اس ہوئی۔

”بیٹیاں اتنی ارزاں نہیں۔ آج کل کی مائیں تو اپنی ہی جنس کی ناقدری کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔“ شملہ کو اس کا رویہ دیکھ کر تکلیف ہوئی۔ اس قدر چھیکی مسکراہٹ۔ ”چھیلی مرتبہ بیٹا تھا تو میاں سے وہاں تک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے پچھلے سال کی بات ہے۔ میں نئی نئی لپاسٹ ہوئی تھی۔“ مریضہ شرمندہ ہو گئی تھی۔

”آنے والے لوگ ہی خوش نہیں ہونے دیتے ڈاکٹر صاحب! یوں آتے ہیں جیسے پُرسہ دینے آئے ہوں۔“

”ہندو ازم سے بچنا نہیں چھوٹے گا ہمارا۔“ اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”کسی کو یاد نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی قسملی اللہ علیہ وسلم کو چار بیٹیوں سے ہی نوازا تھا۔ یہ تو زیادہ خوشی منانے کی بات ہے۔ ہم اپنا آخری وقت یاد کر کے کانپنے لگتے ہیں کہ انہوں نے تو بیاہ کر چلے جاتا ہے بیٹا ہوتا تو سہارا تو بنتا۔ ارے بھی! کل بس نے دیکھی ہے؟“

”بس ڈاکٹر صاحب! بیٹی کے نصیب سے ڈر لگتا ہے۔“

”اتنی فضول بات نہ جانے کس نے کہہ دی تو گ۔ اسے دہرائے جاتے ہیں۔ اتنا کمزور عقیدہ اتنا متزلزل ایمان؟ ان کے بیٹے ہوتے ہیں انہیں ڈر نہیں لگتا۔ نصیب تو سب کے ساتھ ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب! آپ کا فون ہے۔“ ڈیوٹی نرس نے اسے اطلاع دی تھی۔

”پچھا۔ میں آئی ہوں۔“

اس کار اوئڈ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ ڈاکٹر زروم کی جانب چل دی۔

دو پہرہ بچے کا ٹائم تھا۔ عمار کثرا سے اسکول سے واپس آ کر فون کیا کرتا تھا۔ اس نے اسی ترنگ میں فون اٹھایا۔
”ہیلو۔“ بہت لمبے میں وہ بولی تھی۔

دوسری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی چھائی رہی۔
”ہیلو، شملہ بول رہی ہوں۔“

”جانتا ہوں۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔ ”تم بھی جان لو کہ میں کون ہوں۔“
شملہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ فوری رد عمل کے نیچے میں اس نے کھٹ سے ریسیور رکھ دیا۔ ایک سناٹے کے عالم میں وہ کھڑی اپنے دل کو ہانتا ہوا سن رہی تھی۔ جب ہی ٹیل دوبارہ بجنے لگی۔ اس نے فون اٹھایا۔
”ڈاکٹر شملہ! مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔ الزو شیزاؤں کی طرح ری ایکٹ مت کرو۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”بات کرو جس طرح نارمل بات کرتے ہیں۔“
”کہو۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تم نے عمر کے فون ریسیور کرنے پر پابندی لگادی ہے؟“
”ہاں۔“

”کیوں؟ تم کیسے لگا سکتی ہو؟ آفٹر آل میں اس کا باپ ہوں۔ مجھے اس سے بات کرنے کا حق ہے۔“
”تم نے اسے بتایا کہ تم اس کے باپ ہو؟“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

”نہیں۔“ پھر وہ بولا۔ ”میں پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے یہ سن کر کوئی جھٹکانہ لگے۔ میں اسے خود سے مانوس کر رہا تھا اور تم نے۔“

”کس طرح مانوس کر رہے تھے اسے؟ اس کی ماں کے خلاف بھڑکا کر؟ یہ مانوس کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟“
”غلط بات مت کرو جیسا کہ تمہاری عادت ہے۔“ وہ چبا چبا کر بولا۔ ”میں اسے تمہارے خلاف کیوں بھڑکاؤں گا۔“

”میری عادتوں کی بات مت کرو مسٹر ابراہیم جیلانی! ان سے تمہارا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“
”تھینک گاڈ!“ وہ طنزاً بولا۔

”میرے ڈاکٹر ہونے سے بھی تمہارا واسطہ نہیں۔“ وہ بھی طنزاً بولی تھی۔

”لیکن اپنے بیٹے سے میرا واسطہ ہے شملہ علی! اس کی لک آفٹر میرا مسئلہ ہے۔ اس کی صحیح طریقے سے کیئر ہو رہی ہے یا نہیں وہ سینس ایبل ہاتھوں میں ہے یا نہیں ان سب باتوں سے میرا واسطہ ہے اور رہے گا۔“
”میں اس کی ماں ہوں مسٹر! غالباً“ آپ یہ بھول رہے ہیں۔ اس کی کیئر اس کی لک آفٹر ان سب باتوں کی پروا جسے سب سے زیادہ ہونی چاہیے اور ہے وہ ہستی میں ہوں۔“
وہ فحش دیا۔

”جب ہی آپ اس وقت اس کے پاس ہیں اسے کھانا کھلا رہی ہیں ٹوریوں سنار ہی ہیں۔“

”اس کی ضروریات سے میں آپ سے زیادہ واقف ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”بہر حال کام کی بات کرو فون کرنے کی وجہ کیا ہے؟“

”میں عمر سے کانٹیکٹ میں رہنا چاہتا ہوں۔ تم یا تمہارے گھر سے کوئی بھی معترض ہو نہ روڑے اٹکائے۔“
”میں سوچوں گی۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”میں تمہیں سوچنے کا ٹائم نہیں دے رہا ہوں، صرف اطلاع دے رہا ہوں۔“ وہ مذاق اڑانے والے لہجے میں بولا۔ ”تم عاقل، باشعور، سمجھ دار اینڈی ڈاکٹر ہو۔ ایک باپ کے جائز قانونی حقوق تو سمجھتی ہوگی۔ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔“ اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔

شمالا کا دل اچھل کر اس کے تالو سے آچکا۔ اس کی آواز بند ہو گئی، سانس رکنے لگی۔
 ”گھر جا کر اپنی والدہ صاحبہ کو بھی اچھی طرح سمجھا دینا، میں جب بھی فون کروں، عمر سے میری بات کرائی جائے۔“
 ”ٹھیک، ٹھیک ہے۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔
 ”میں فی الوقت اس سے اپنے رشتے کی وضاحت نہیں کروں گا۔ میں بھی اس کے ننھے ذہن کو پریشان کرنا نہیں چاہتا لیکن آہستہ آہستہ اسے سب سمجھ میں آجائے گا۔“
 شمالا نے مرے مرے انداز میں ریسور رکھ دیا تھا۔

وہ مغرب کا وقت تھا یا فجر کا؟ اسے صحیح طور پر وقت کی پہچان نہ ہو رہی تھی۔ دھند لکا پورے ماحول کو اپنی پلیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ یوں جیسے ابھی پو پھٹے کی اور سورج کی جانب سے پھینکی گئی پہلی کرن رات کو شیشے کی مانند کرجی لڑکھی کر ڈالے گی یا یوں جیسے سورج اپنی قبا کا پلو پورے طور پر سمیٹ کر آسمان کا دروازہ بند کر لے گا اور ہر سو گھٹسور اندھیرا چھا جائے گا۔ نجانے وہ کون سا وقت تھا؟
 اسے اتنا احساس تھا کہ وہ اداسی کا وقت تھا، دوحشت کا وقت تھا، وہ جس کے زور پکڑ لینے کا وقت تھا۔ اس ملگجے سے آجائے میں صحیح طور پر ہر شے واضح نہ ہوتی تھی۔ ربیعہ گھر میں تنہا تھی، بالکل تنہا۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ وہاں روئی کے گالے اڑتے پھر رہے تھے۔ بھرے بھرے سرمئی بادل ادھر سے ادھر بڑی تیزی سے رات کر رہے تھے۔ وہ کچھ دیر یوں ہی سر اٹھائے بڑی محویت سے آسمان کو تکتی رہی۔ آسمان پر تیزی سے ہوتی ہوئی حرکت توجہ طلب تھی۔ بادلوں میں کھلبلی مچ رہی تھی۔ ربیعہ سر اٹھائے آسمان کو دیکھتی رہی۔
 تب اس کے گال پر پانی کا پہلا قطرہ آن کر، ٹھنڈا ٹھار قطرہ۔ ربیعہ کے پورے وجود میں ٹھنڈک کی لہر دوڑ گئی۔ اسے پہلی بار جس کے کھلنے کا احساس ہوا۔ جسم سے سرسراہٹ ہوا کا ایک جھونکا ہولے سے ٹکراتا ہوا گزر گیا۔ ربیعہ کو خوشی اور طمانیت سی محسوس ہوئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں میں پھر تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ سرمئی بادل اب سیاہ ہو رہے تھے۔ سب کے سب بڑی تیزی سے سیاہ ہوتے جا رہے تھے جیسے کسی نے مٹی بھر سیاہی ملا اب کے پانی میں پھینک دی ہو۔

ربیعہ کو احساس ہوا کہ بادلوں میں سیاہی پھیلنے کی وجہ سے ماحول میں جو ملجاسا اجالا تھا، وہ غائب ہو رہا تھا۔ ہر سو اندھیرا چھا رہا تھا۔
 پھر کیا کیا ہوا؟ چل بڑیں۔ تندو تیز ہوائیں۔ ربیعہ کا پورا گھر ہوائوں سے بھر گیا۔ سب کھڑکیاں، دروازے، اوں کی زد میں آکر کھٹک کھٹک کھٹنے اور بند ہونے لگے۔ محسن میں لگا ہوا سنگھار کا درخت مست شرابی کی مانند ہمنے لگا تھا۔ اس کے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر ربیعہ کے وجود سے ٹکراتے اور پورے گھر میں بکھر جاتے۔
 شائیں شائیں کرتی ہوائیں، سرسراتے ہوئے پتے اور بجتے ہوئے دروازے اور وہ گھر میں تنہا تھی۔
 ”ربیعہ۔ ربیعہ۔“ دادی اسے پکار رہی تھیں۔

”دادی کہاں ہیں؟“ اس نے پریشانی سے سوچا۔ ”دادی! تو گھر میں نہیں تھیں۔ دادی کی آواز کہاں سے آرہی ہے۔“ آواز بہت دور سے آرہی تھی۔ ربیعہ اپنے محسن میں کھڑی تھی۔
 ”ربیعہ۔ ربیعہ۔ یہاں سے جاؤ۔“ آواز پھر آئی۔

ربیعہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ آمدھی کی شدت میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ ہار سنگھار کا درخت یوں رہ رہا تھا جیسے ابھی زمیں بوس ہو جائے گا۔
 ربیعہ کا محسن خشک پتوں سے بھر چلا تھا۔
 ”کہاں جاؤں؟“ اسے خیال آیا تھا۔ ”میں کہاں جاؤں؟“
 ”ربیعہ۔ ربیعہ۔“

پھر وہ مڑی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ ہار سنگھار کا درخت جیسے رسیاں تڑوا رہا تھا۔ ربیعہ نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ چٹنی چڑھائی۔ اسے لگا جیسے کچھ دیر کے لیے وہ کسی محفوظ جگہ پر آگئی تھی۔
بند دروازے سے پشت لگائے وہ آنکھیں بند کیے کھڑی ہوئی تھی۔ آندھی تھم گئی تھی، آوازوں کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ ہوا کی شاخیں شاخیں اور پتوں کی سرسراہٹ بند ہو گئی تھی۔ دروازوں کھڑکیوں کو قرار آگیا۔ صرف ربیعہ کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔
”ربیعہ!“ اسے پھر آواز آئی۔

”اب کی باریہ آواز قدرے قریب سے آئی تھی۔ ربیعہ نے آنکھیں کھولیں، سامنے دیوار والی کھڑکی میں دادی کھڑی تھیں۔ وہ باہر گلی میں تھیں۔ ربیعہ کو صرف ان کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔
”دادی!“ وہ نجانے کیوں ڈر گئی۔

”ربیعہ۔ ربیعہ جاؤ یہاں سے۔“ دادی نے اسے اشارہ کیا۔
”کہاں جاؤں؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔
”جاؤ، بس جاؤ۔ میں نے کہا تھا جاؤ۔“ ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
”جاؤ۔“ اب کی بار شدت سے کہا گیا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پور جسم زلزلوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ پسینے میں شرابور جسم جھکوں سے ابل رہا تھا۔ آنکھ کھل جانے کے بعد وہ کچھ دیر سیدھی جیت لیٹی چھت کو گھورتی رہی۔ اسے علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ خود کو اسی کمرے میں محسوس کر رہی تھی جس کی کھڑکی میں اس نے دادی کو کھڑا دیکھا تھا۔ اسے شدت سے خوف محسوس ہوا۔ کپکپی کی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور خالی خالی نظروں سے ہر چیز کو دیکھنے لگی۔ اسے پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر میں بھی نہیں تھی۔ وہ حاکم چچا کے گھر میں تھی۔

اسے یاد آیا، وہ تو پچھلے کئی دنوں سے یہاں آکر سویا کرتی تھی۔ برابر والی چارپائی پر سمعیہ لٹٹی مدھم سے خراٹے لے رہی تھی۔ اس سے ذرا آگے ٹوپیہ تھی۔
ربیعہ کو اپنے حلق میں کانٹے آگے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا جسم پسینے سے بری طرح سے بھیگا ہوا تھا۔ چارپائی سے پیر لٹکا کے وہ کچھ دیر بیٹھی اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، آواز دے کر سمعیہ کو جگا لے۔ اس وقت ایک سامع کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔
”سمعیہ!“ اس نے ہولے سے آواز دی۔

سمعیہ گھوڑے بچ کر سوئی ہوئی تھی۔ اس کے خراٹوں کے لیے میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ ربیعہ کھڑی ہو گئی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ دروازے کی جانب بڑھی اور بنا آواز کے دروازہ کھول کر صحن میں چلی آئی۔ برابر والے کمرے میں حاکم چچا اور منیب، کرتے تھے۔ اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو رہی تھی کہ اسے خالی صحن سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ غالباً ”رات کا آخری پہر تھا“ ربیعہ کو وقت کا اندازہ نہ ہو سکا۔ بڑی ہمت سے وہ گھڑنجی تک آئی اور منکے سے پانی نکال کر پینے لگی۔ پانی کی کراں نے گلاس جگہ پر رکھا اور مڑی۔
اس کے لبوں سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ اس کے عین پیچھے حاکم چچا کھڑے تھے۔
”ربیعہ!“ وہ ملاحت سے بولے۔ ”جاگ رہی ہو؟“
”میں۔ میں۔ ڈر گئی تھی۔“ اس کا سانس کنٹرول میں نہ تھا۔
”کس سے؟“

”میں۔ وہ۔ سوتے ہیں۔ میں نے عجیب سا خواب دیکھا چچا جان! وہ۔ میں نے دادی۔“
”چچا مت کہہ کر ربیعہ!“ انہوں نے اس کی بات میں محض ایک لفظ پر غور کیا تھا۔ ”چچا نہیں لگتا۔“ ربیعہ کا

۱۔ اہمیت غائب ہو گیا۔ اس کی چھٹی حس پوری طرح بیدار ہوئی۔ رات کے اندھیرے میں اس کے سامنے
لہلہے حاکم چٹکی آنکھیں بڑی وضاحت سے اپنا مدعا بیان کر رہی تھیں۔ چکدار، حریص نظروں میں جو پیغام تھا
لے احساسات کے تاروں نے اسے پوری طرح اور فوری طور پر سمجھا تھا۔

وہ خاموش کھڑی ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔
”ایہ! تمہیں سہارا چاہیے نا، میں بھول گا تمہارا سہارا۔ یقین جانو، عمروں کا تھوڑا بہت فرق کبھی محسوس نہ
کارتھیں۔ ارے اندر سے میں بالکل جوان ہوں، تم سمجھ رہی ہونا؟“

ایہ پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔
”سمجھ، تھوڑے کو تو میں ایک ماہ میں بیاہ دوں گا“ اس گھر پر راج کرنا تم! جتنا خیال میں تمہارا رکھوں گا، کوئی دوسرا
نہ رکھ سکتا۔“

وہوں نے مرکز کمروں کی جانب دیکھا۔ ربیعہ ان کی اگلی متوقع حرکت کا بھید پائی۔
”سمجھ جاگ رہی ہے بچا جان!“ وہ پرسکون مدھم آوازیں بولی تھی۔ ”میں پانی پینے آئی تھی۔“
”اے ہاں۔۔۔ اچھا!۔۔۔ اچھا!۔۔۔ میں بھی پانی پینے آیا تھا۔۔۔“ وہ آگے بڑھے۔
ربیعہ آرام سے ان کے قریب سے گزر کر اندر جانے لگی۔
”ایہ! کسی سے کتنا مت۔۔۔ انہوں نے خوشامد سے کہا۔
”میں بچا جان! آپ بے فکر رہیں۔“ اس نے تلخی سے کہا تھا۔



وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھا اطمینان سے اپنے کھیل میں مگن تھا۔ بلاکس کے ڈھیر میں سے وہ اپنے
دور گولوں کے بلاکس جمع کرتے کسی کھلونے کا ماڈل بنانے میں مصروف تھا۔
ملا آرام کر رہی رہی اُسے دیکھ کر جاری تھی۔ دوازیوں سے متعلق کوئی معلوماتی قسم کا میگزین اس کی گود میں
لٹا ہوا تھا۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ میگزین اس کی گود میں یونہی دھرا تھا۔ وہ اس میں سے ایک لفظ بھی نہ
لی تھی۔ اس کا ذہن پچھلی زندگی کے اوراق تھکانے میں مصروف تھا۔ منیجر بیگم نے چائے کا کپ اس کے
اُپر رکھی میز پر دھیرے سے رکھا تب وہ چونکی۔

”حاجن! تکلیف کی امی آپ نے“ وہ زبردستی مسکرائی ”بھی کچھ دیر پہلے ہی انیقہ نے چائے بنائی تھی۔“
”تمہیں کب اس کی بنائی ہوئی چائے پسند آتی ہے۔ میں کیا جانتی نہیں!“ وہ محبت سے بولیں۔
”مارون کام میں لگی رہتی ہیں۔“ شملہ نے ماں کے ہاتھ تھام لیے ”کھتی نہیں ہیں؟“
منیجر بیگم مسکرانے لگیں۔

”اُمی جان ہو سکتا ہے کبھی تھک بھی جاتی ہو، ماں نہیں تھکتی۔“ وہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولیں۔
”اپ بات پوچھوں امی آپ سے۔“ شملہ ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔
”ہاں پوچھو، اجازت لینے کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔“ وہ مسکرائیں۔
”ملا پنڈن لکھوں کے لیے خاموش ہو گئی تو منیجر بیگم اس کے چہرے پر اضطراب دیکھ کر فکر مند سی ہوئیں۔
”اپ بات ہے شملہ؟ کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”چہ ماں کا ہوتا ہے یا باپ کا؟“ اس نے ابھی ابھی نظریں ان کے چہرے پر نکا دیں۔ منیجر بیگم کے چہرے پر
اُپ مالا لیا۔ وہ اس کی بات کا کچھ جواب نہ دے پائیں۔

”چہ۔۔۔ باپ کا ہوتا ہے۔“ کیوں امی؟ جو ماں تو ماہ تک ہر طرح کی تکلیف اکیلی جان پر ہنتے کھیلتے سہہ جاتی ہے
ان ٹوٹ کن امید پر کہ اس کی گود میں ایک پھول کھل کر اس کے وجود کو گلستان بنادے گا۔۔۔ جو ماں زچگی کی
اُپ نہ ناک نیسوں کو ایک کلکاری سننے کی خواہش میں آگ کا دریا سمجھ کر پار کر لیتی ہے جو اپنی راتوں کی میٹھی نیند

سے بخوشی دستبردار ہو جاتی ہے محض اس خوف سے کہ ساتھ رکھا جھوٹا اگر رک گیا تو اس کا سخت جگر اپنی معہ نیند سے چونک کر ڈر کر رونے لگے گا۔ وہ ماں بار جاتی ہے امی؟ وہ ماں بار جاتی ہے۔ اس شخص سے جو چند لمحوں کی نشاط آفریں جادوگری سے باپ بننے کی پر غور مسرت حاصل کر لیتا ہے۔ ماں بار جاتی ہے۔ شخص جیت جاتا ہے۔ منیڈہ بیگم کے آنسو خاموشی سے ان کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔ شہلا کی دکھ میں بھیگی ہوئی آواز ان کا دل چیر رہی تھی۔

”بولیں نا امی۔۔۔! شہلانے ان کے ہاتھوں کو جھنجھوڑا ”یہ کیسے فیصلے ہیں۔ کوئی حساس درد مند دل یہ فیصلہ کر سکتا ہے؟“

”بیٹی۔۔۔ دنیا کے سارے فیصلے بس ایک بار ہی نہیں ہو جاتے۔“ منیڈہ بیگم نے اس کا سراپے سینے سے لگا ”یہ سب فیصلے ایک بار پھر ہوں گے۔ وہاں جہاں کسی کے ساتھ رتی برابر ظلم نہ ہو گا۔ جہاں پر کوئی اپنی رتی برا نیکی بھی دیکھ لے گا اور رتی برابر ظلم بھی۔“

شہلا خاموش ہو گئی۔

”میں نے ابو کا دل دکھایا تھا نا امی؟“ وہ پوچھنے لگی۔
 ”نہیں بیٹی۔۔۔ ایسے نہیں سوچتے!“ وہ محبت سے اس کا سر تھکنے لگیں۔ ”آپ کے ابو کی روح آپ کو اطم دیکھ کر افسردہ ہوگی۔ بس یہ سوچ کر خوش رہا کرو۔ انہیں ایصالِ ثواب کرتی رہا کرو۔ ویسے ایک بات پوچھ۔۔۔“ شہلانے اثبات میں سر ہلایا۔

”میری بیٹی کو کون سی بات پریشان کر رہی ہے؟ میں کچھ دنوں سے تمہیں پریشان دیکھ رہی ہوں لیکن پوچھا نہیں۔۔۔ کیونکہ بسا اوقات انسان محض اپنے آپ سے گفتگو کرنے کا متنی ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی دوسرے کی ہمدردی بھی ناگوار گزرتی ہے۔ میں نے سوچا تھا جب خود سے سب کچھ کہہ سن لوگی تب پوچھوں گی بلکہ تم خود ہی بتاؤ۔۔۔ لیکن آج تمہیں اس قدر افسردہ دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ پا رہی ہوں۔ پھر تم نے مجھ سے جس طرح سوال کیا اس سے میں خوفزدہ ہو گئی ہوں۔۔۔ آخر بات کیا ہے بیٹی؟“

شہلا سر جھکا کر کسی مجرم کی طرح بیٹھ گئی۔
 ”کچھ دنوں سے۔۔۔ ابراہار کا فون آرہا ہے۔۔۔“ وہ دھیمی آواز میں بولی۔

”یا اللہ!“ منیڈہ بیگم دھک سے رہ گئیں ”تو وہ ابراہار ہی ہے!“

شہلانے جلدی سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ جانتی ہیں؟“

”ہاں شک سا گزرا تھا مجھے عمر کو دو تین مرتبہ فون سنتے پایا۔ پوچھتی تو کہتا: ”انکل ہیں۔ میرے فریڈ ہیں۔۔۔“ یہی سوچتی رہ جاتی کہ کون سے انکل ہیں جو اسے ہر دو سرے دن فون کر لیتے ہیں۔ تم سے یوں نہ کہا کہ تم پریشان جاؤ گی۔ بس پھر بیل بجتی تو میں ہی فون اٹھاتی۔ دوسری جانب سے لائن ڈس کنکٹ ہو جاتی۔ مگر یہ تو کوئی دام پندرہ دن پہلے کی بات ہے۔۔۔“

”اس نے ہاسپٹل فون کیا تھا اور دو ٹوک الفاظ میں کہا ہے کہ وہ عمر سے کانٹیکٹ میں رہے گا۔“ شہلانے گما تھکے الفاظ میں بتایا۔

”پھر تم نے کیا کہا؟“ وہ پریشان نظروں سے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

”میں۔۔۔“ وہ ہولے سے ہنس دی ”میں کیا کہتی؟ میں تو ماں ہوں۔۔۔ وہ اس کا باپ ہے۔“

منیڈہ بیگم نجانے کہاں کھو گئی تھیں۔

”آج وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔۔۔ کل کو ملنے کی خواہش کرے گا۔“ شہلا ان کی کیفیات سے بے خبر رہی تھی ”پرسوں اسے گھمانے پھرانے کی بات کرے گا۔ اور۔۔۔ اور پھر شاید قانونی طور پر اسے ساتھ۔“

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سسکا اٹھی۔

”شہلا! میری جان!“ منہ زہ بیگم گھبرا گئیں۔

ممر نے ماں کو روٹا ہوا دیکھا تو بلا کس روندنا ہوا چلا آیا۔

”مما! آپ رو رہی ہیں۔ ناؤ! آپ نے میری ماما کو ڈانٹا ہے؟“ وہ منہ زہ بیگم سے پوچھنے لگا۔

”نہیں بیٹا! میں بھلا اپنی بیٹی کو کیوں ڈانٹوں گی اور ماما رو نہیں رہی ہیں۔ ان کی آنکھ میں کچھ چلا گیا ہے۔“

انہوں نے اسے ہلانا چاہا۔ عمر نے ماں کے ہاتھ پکڑ کر پیچھے

”دیکھا۔ ماما رو رہی ہیں۔ ناؤ! آپ کو کچھ پتا نہیں چلتا۔ آپ ایسے ہی کہتی رہتی ہیں۔ بے جا رہی ماما!“ وہ اس

کا ہوا اپنے ہنسنے ہنسنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگا۔ شہلا نے اسے سینے سے لگا لیا۔

”میری دور رس نگاہیں کہتی ہیں کہ اگر آپ کے بال کالے ہو جائیں اور آپ کا چہرہ پلاسٹک سرجری سے رنکل

کی لڑوا جائے تو اچھا ناں چھو آپ کے سامنے پانی بھر سگی۔“

منہ زہ بیگم حیات کی گود میں سر رکھ لیٹا ہوا تھا۔ علی اور نافع بھی ارد گرد موجود تھے۔ وہ سب چھیل کر پھانگیں بنا

رہے تھے۔

”جانتی ہوں تمہاری دور رس نگاہوں کو۔“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔ ”زلزلہ آنے دو

پھر پوچھوں گی۔“

”تائیں دادی!“ علی نے بھی اشتیاق کا مظاہرہ کیا ”کیا آپ بہت خوب صورت تھیں؟ اصلی والی خوب

صورت ہوں گی آپ۔“

”ہائیں! یہ اصلی نقلی خوب صورتی کیا ہے؟“ انہوں نے اسے پھانک تھما کر گھورا۔

”آج کل کی جو بیوی ہے نادادی! وہ سب فراڈ ہے۔ ادھار کی خوب صورتی ہے۔ رات کو گھر میں تقریباً ہوا

ماں صبح سے چہرے پر مختلف کریمیں مل مل کر ادھ موٹی ہو جاتی ہیں۔ تب کہیں جا کر ہلکی سی چمک نظر آتی ہے

”ہائیں۔“

بالن میں کام کرتی ثانیہ اور سدرہ کے کان کھڑے ہوئے۔

”ہماری عریضہ کو دیکھ لیں۔“ سہیلی کے گھر رات آٹھ بجے جانا ہے تو صبح آٹھ بجے سے اس کی تیاری کا آغاز ہو

جاتا ہے۔ بالوں میں انڈا منہ پہ اٹھن، بازوؤں پر ہلیج کریم۔ گھنٹہ بھر تو ناخن فائل کرنے میں لگاتی ہے۔“ علی

نے سدرہ کو کہنی ماری۔ دونوں منہ دبا کر ہنسنے لگیں۔

”یہ نقلی بیوی ہی ہے نا! آپ تو بس نماد دھو کر لمبے بالوں کی سادہ سی چوٹی بناتی ہوں گی۔“ نافع نے بھی سب

کھاتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور دادا! ابو۔۔۔ ہائے ہائے۔۔۔ کہتے ہوں گے صدقہ جاواں!“ علی نے آنکھیں بند کر کے گویا برسوں پر اناسین

ان میں لانے کی کوشش کی۔

ملیقہ حیات کا چہرہ لودے اٹھا تھا۔ لبوں پر بیگی بیگی مسکراہٹ چلی آئی تھی۔

”ہاں تو اور کیا۔“ وہ بولیں۔ ”یہ لائے سیدھے فیشنوں کا رواج تو اب نکلا ہے۔ مانو کنواری اور بیاہتا کا فرق

آ گیا۔ اسے منہ سے پوچھنا پڑتا ہے کہ اے بی! اللہ رکھے خیر سے شادی شدہ ہو؟ جواب آتا ہے ”نہیں آنٹی جی

اہی تو ممکن ہوئی ہے۔“ لڑکے خوب محفوظ ہوئے۔

”ایکس نادادی! بھلا کنواری لڑکیاں ناک میں لوگک پنہاں اچھی لگتی ہیں؟“ حمزہ جوش میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”نا۔۔۔ برا جانتے تھے لوگ۔“ انہوں نے ہاتھ ہلایا۔

”اور۔۔۔ اتنا میک اپ کرنے کی اجازت ملتی تھی آپ کے زمانے میں؟“ نافع نے ٹکڑا لگایا۔

”تمہارے تو دادا اتنا خفا ہوتے تھے۔ گالوں پر سرخی نہیں لگانے دیتے تھے۔ کہتے تھے بری عورتیں لگاتی ہیں۔ میں تو بس پان کھالیتی تھی۔ اسی سے ہونٹ سرخ ہو جاتے تھے۔ کرن لگا دوپٹہ اوڑھ لیتے تھے سادے سوٹ پر۔ اللہ خیر صلا۔“

”پھر بھی دادی۔۔۔! پھر بھی آپ اتنی پیاری لگتی ہوں گی کہ کیا یہ آج کل کی فیشن زدہ لڑکیاں لگ سکیں گی۔ دادا! علی ذرا انصو کرو۔ پیاری دادی ہر اسوٹ پہن کر کرن والا دوپٹہ مارتے تھے۔ پان کھا کر جب مسکراتی ہوں گی۔ کیا دل فریب منظر ہوتا ہو گا۔۔۔ نیچل بیوٹی۔“

”نیچل بیوٹی۔۔۔ نیچل بیوٹی۔ اب تو تصویر ہی محال ہے۔ ہر چیز جعلی ہے۔“

”والد! بیوٹی کا زمانہ ہے یا ر!“ نافع نے بھی مایوسی سے سر ہلایا۔ ”ڈورنگ ٹیبل پر دس کریمیں تو محض وقتی طواری گورا نظر آنے کے لیے رکھی ہوئی ملتی ہیں۔ لپ اسٹک کے ڈھیر میں سے میچنگ لپ اسٹک ڈھونڈنے میں آدھا گھنٹہ لگتا ہے ان کو۔۔۔ پھر ہاتھ پیروں کی باری آتی ہے تو یہ گزر گزر بھر کے ناخنوں پر دو دو، تین تین کوٹ لگتے ہیں ناخن پالش کے تپ کیس جا کر مطمئن ہوتی ہیں۔“

”ارے میں تو بہت منع کرتی ہوں ان بیچیوں کو۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ بھیڑ چال بہت بڑھ گئی ہے دنیا میں۔ اب کادستور ہی یہی ہے پھر ہم جیسے سوچتے ہیں کہ ہماری لڑکیاں بے چاریاں قدامت پسند کہلا کر رنجیکٹ نہ کر دیا جائیں۔ سو تھوڑا بہت ہم بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔“

شفیقہ حیات بیگم نے لڑکیوں کا بھی فور کیا۔

اتنی دیر میں مخالف ٹیم بچے تیز کر کے میدان میں اتر چکی تھی۔ تانیہ اور سدرہ کچن کے پچھلے دروازے سے نکل کر وردہ، ناعملہ اور عریشہ گولے آئی تھیں۔ دو منٹ کے رستے میں انہوں نے خوب خوب مرچ مسالے لگا کر ان کی باتیں سنائی تھیں۔

”السلام و علیکم۔“ انہوں نے با آواز بلند کورس میں سلام کیا۔

شفیقہ حیات بیگم نے جواب دیا۔ لڑکے منمننا کر رہ گئے۔ ان کی گفتگو کا مزہ کر کر اہوتا نظر آنے لگا تھا۔

”ارے ایساں تو محفل جی ہے بھی۔“ ناعملہ نے انہیں دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا ”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“

شفیقہ حیات ہنسنے لگیں۔

”بس یونسی۔ ادھر ادھر کی بات کر رہے ہیں۔“

”بہم دادی جان کی تعریف کر رہے تھے۔ اس عمر میں بھی کتنی خوب صورت نظر آتی ہیں۔“ علی جھٹ بولا۔

”نیچل بیوٹی۔۔۔ نیچل بیوٹی۔“ تانیہ نے عریشہ کو کہنی مارتے ہوئے بتایا۔ ”یہی کہہ رہے تھے۔“

”ارے دادی جان۔۔۔! آج کل کے تو لڑکے بھی میک اپ کرتے ہیں۔ لڑکیاں بے چاریاں تو یونسی بدنام ہیں۔ کیوں علی؟“ علی اور حمزہ بغلیں جھاٹنے لگے۔

”جھوٹ نہ بولو عریشہ۔۔۔! سدرہ نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا ”بھلا لڑکے کیوں میک اپ کرنے لگے؟“

”یاد دے علی!“ عریشہ بولتی گئی ”وہ اس دن تمہارے کالج میں فنکیشن تھا تو تم مجھ سے فیس اسٹریکٹ مانگ رہے تھے اور حمزہ! تم نے تو اس دن رنگ گورا کرنے کے لیے کریم بھی لگائی تھی، کتنے گورے لگ رہے تھے نا تم؟“

وہ دونوں بڑبڑہو کر رہ گئے۔

”ہائیں!“ شفیقہ حیات انہیں گھورنے لگیں ”چھلنی بولے سوئی سے تیرے پیٹ میں چھید؟ چلو وہ تو لڑکیاں بالیاں ہیں۔ ان کا تو فطری شوق ٹھہرا بننا سنو نا تمہارے دماغوں میں یہ کیا فتور پلنے لگا؟“

”ارے دادی جان! کہاں اس بی جھالو کی باتوں میں آرہی ہیں۔“ حمزہ نے اسے آنکھیں دکھائیں ”یہ تو امی کی کاربن کا پی ہے۔ بات کا بنگلہ بنانا کوئی اس سے سیکھے۔“

”اور نافع بھائی! آپ اپنی کہیں!“ ثانیہ مزے سے بولی۔ ”آپ کے دوست کی منگنی تھی جس دن۔۔۔ آپ نے اس سے کیا کروایا تھا؟“

”چپ۔۔۔ خاموش۔۔۔ خبردار۔“ وہ گھبرا گیا۔

”ہٹاؤ۔۔۔ بتاؤ۔“ لڑکیوں نے شور مچا دیا۔

”فیصل کروا رہے تھے مجھ سے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی تو سب نے قہقہہ لگایا۔ نافع پر منوں پانی پڑ گیا تھا۔ شفیقہ ہاتھ منس رہی تھیں۔

”دیکھو ان دیوانوں کو۔۔۔ بیٹھے لڑکیوں پر باتیں بنا رہے ہیں۔ مجھے بھی ساتھ لگالیا۔“

”آپ سے ادھار چاہیے ہو گا تاہی امی ان کو۔“ ناعمنہ نے منہ بنا کر کہا۔ لڑکوں نے خاموشی سے کھسک لینے میں اس کا حالت جانی تھی۔

”مما! یہ مجھے ہوم ورک نہیں کرنے دیتی۔“ مومن بڑا بڑا سا بچن کے دروازے تک آیا تھا۔ سالن کی پتیلی میں بے دلی سے چیخ بھلائی ہوئی ایقان چوکنی تھی۔

”کیوں بیٹا! کیا مسئلہ ہے؟“

”بس! یہ گندی بچی بن رہی ہے۔۔۔ میری چیزیں چھیڑ رہی ہے۔“ وہ سخت خفا تھا۔ ایقان بچن سے نکل کر باہر آئے۔ لال فرائڈ میں لمبوس، چھوٹی سی ایمان، جیومیٹری باکس لیے بیٹھی تھی۔

”یہ میلا ہے۔“ اس نے ایقان کو دیکھتے ہی کہا۔

”آپ کا نہیں ہے بھائی کا ہے۔“ ایقان نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ ”واپس دو بھائی کو۔“

”نہیں! اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”ایمان! تنگ نہیں کرتے بیٹا۔“ وہ غصے سے بولی۔

”میں نہیں دوں گی۔“ وہ اٹھ کر کھانے لگی۔ ایقان نے جھنجھلا کر اس سے جیومیٹری باکس چھینا اور اسے ایک نہایت لگائی۔

”خبردار جو بھائی کو تنگ کیا۔ گندی بچی!“ ایمان روتی ہوئی کمرے میں بھاگ گئی۔ وہ میز اور میزاری واپس بچن میں آئی۔ اس کے اندر عجیب سی کیفیت بیدار ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی، کچھ کنفیوز ہو رہی تھی۔

پولے کے قریب آتے ہی اسے سالن کی منگ سخت ناگوار محسوس ہوئی۔ اس نے فوری طور پر ناک پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے ابکائی آگئی تھی۔ چند سیکنڈ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن دوسری مرتبہ ابکائی کے آتے ساتھ وہ چیز سے سنک تک آئی تھی۔ مسلسل ابکائیوں کے باعث وہ تڑھال سی ہو گئی تھی۔

”ممن اس کی غیر معمولی آوازوں سے گھبرا کر بچن میں چلا آیا تھا اور اب اس کا دامن تھامے سوال پر سوال کر رہا تھا۔“

”مما۔۔۔ کیا ہوا ہے۔۔۔ ممما ایسے کیوں کر رہی ہیں۔۔۔ ممما آپ نے کیا کھالیا ہے؟“ وہ اسے جواب دینے کے قابل تھی۔

”فہمی۔۔۔ اندر کمرے سے ایمان کے رونے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ اس کے رونے سے ایقان کا دل مزید خراب ہو رہا تھا۔ وہ اندر جا کر اسے پیار کرنا چاہتی۔ لیکن ابکائیوں کا سلسلہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔

”کچھ دیر بعد وہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی۔ منہ صاف کر کے اس نے چہرہ دھویا اور فریج سے پانی نکال کر کھٹ مٹھونٹ پینے لگی۔ مومن اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”مما۔۔۔ آپ تھک ہیں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ایقان ہولے سے مسکرا دی۔

”ہاں جانو! میں تھیک ہوں۔“ اس نے دھیرے سے اس کا گال چھوا۔ پھر وہ اٹھ کر تیزی سے اندر کی جانب بڑھی۔ بھی ایمان فرش پر بیٹھی سسک رہی تھی۔ ماں کی ڈانٹ کو اس نے بہت محسوس کیا تھا۔

ایقان نے اسے بازوؤں میں بھر کر جوہا۔ اس کا چہرہ صاف کیا۔

”آپ گندی مہمیں؟“ اس نے ناک چڑھائی ”ڈانٹتی ہیں۔“
 ”سوری!“ وہ معصوم بن گئی۔
 ”مہما۔۔۔ مہما! آپ کو کیا ہوا تھا؟“ مومن کی تسلی نہ ہوئی تھی۔ ایقان کچھ سوچ کر مسکرا دی۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔۔۔“ رابعہ بیگم خوش ہو کر بولیں ”ماں جان کو بتایا؟“
 ”تب ہی تو آپ سے کہہ رہی ہوں۔“ وہ دم دم سروں میں بولی ”آپ بتا دیں نا۔“
 ”تو شرم اب بھی شرم آو گی؟“ وہ جی بھر کر نہیں ”چھانیر۔۔۔ میں اماں سے کہے دیتی ہوں۔ لیکن تم یہاں کیوں نہیں آ جاتیں؟“

وہ ایقان سے فون پر محو گفتگو تھیں۔ وردہ اور ناعملہ ان کی باتیں سن کر نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو اشارے کر رہی تھیں۔

”باجی۔۔۔ ایک تو مومن کی اسکولنگ کا مسئلہ ہے۔۔۔ وہاں سے اس کا اسکول دور پڑتا ہے۔ پھر بھالی جان کے وہ منظور نظر مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ انہوں نے تو مجھ سے میرا مہکمہ چھینا ہوا ہے۔ جب آؤ ان کے دیدار سے فیض یاب ضرور ہونا پڑتا ہے۔“ وہ جل کر بولی۔ رابعہ بیگم کو ہنسی آ گئی۔

”اتنی اتنی سی باتوں کو دل پر نہیں لیا کرتے ایقان! زندگی میں تو نجانے کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تم تو بہت نازک مزاج ہو۔۔۔ اماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔“
 ”لیجئے! آپ بھی اماں کی ہم خیال ہو گئیں۔“ اس نے دہائی دی۔ ”میں یونہی خود کو بہت متحمل مزاج خیال کرتی ہوں۔“

”وہم ہے تمہارا۔۔۔“ وہ مسکرائیں ”چھانیر! یہ تو یونہی مذاق ہوا۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں، تم چلی آؤ تو اچھا ہو۔ اس حال میں تمہاریوں تن تمہارا مٹا ٹھیک نہیں ہے۔ دوسرا ہٹ ضروری ہے۔“
 ”کچھ نہیں ہوتا باجی! بہت سی عورتیں رہتی ہیں۔“ وہ لا پرواہی سے بولی ”میں آؤں گی کسی روز!“
 ”چھا!؟“ نہیں نامل تھا۔ ”اللہ نگہبان ہو۔“ دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔

وہ ہمیشہ ہی اپنے گھر کی سڑک کا موڑ یونہی بے پرواہی سے کاٹا کرتا تھا۔ موٹر بائیک کو فل اسپڈ سے دوڑاتے ہوئے اس نے جو سبھی موٹر کاٹا، سامنے سے آتے سفید آٹو کے ڈرائیور نے بے حد غلٹ میں بریک لگائے تھے۔
 ہاشم کو بھی بائیک روکتے روکتے۔ سینکڑی دیر ہوئی۔ بائیک گاڑی سے لگ گئی تھی۔ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر سوار ڈاکٹر شہلانے ہٹنا کر شیشہ نیچے کر کے سر نکالا۔

”بہت جلدی ہے آپ کو؟“ وہ غصے سے بولی۔ پھر ہاشم کو پہچان کر اس کے تاثرات بدل گئے۔ ہاشم بائیک سے اتر کر اس کے قریب چلا آیا۔

”معذرت خواہ ہوں۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔ سن گلاسز میں چھپی ہوئی آنکھوں کا تاثر پوشیدہ تھا، لیکن اس کے لبوں کے کنارے دم دم سا گڑھا نمودار ہوا۔

”سوری۔۔۔ میں نے آپ کو دیر سے پہچانا۔“ وہ بولی ”لیکن غلطی بہر حال آپ کی ہے۔“
 ”تسلیم! میں پھر معذرت خواہ ہوں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”آپ بائیک بہت تیز چلاتے ہیں۔ غلط بات ہے۔ اس دن بھی آپ سب ہو گئے تھے! میں بار بار مفت علاج نہیں کرتی۔“ اب کی بار وہ کھل کر مسکرا دی۔

ہاشم کچھ بول نہ سکا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔ اس کے جی میں خواہش ابھری تھی کہ سن گلاسز کے پیچھے چھپی ہوئی اس کی آنکھیں دیکھ سکے۔

”ہیلٹ پٹنا کریں۔“ اس نے مشورہ دیتے ہوئے شیشہ چڑھایا تھا۔ گویا اشارہ تھا کہ وہ اپنی بائیک سامنے سے ہٹائے ہاشم ست قدموں سے بائیک کی جانب بڑھ گیا۔

”بھئی۔ یہ وہ سٹہ مجھے قطعاً پسند نہیں ہے۔ صاف کسے دیتی ہوں۔“ ڈال صاف کرتے ہوئے فردوس بیگم نے ہاشم کی اوٹ سے بیٹی کو دیکھا۔ ”اب اگر ان باتوں سے تمہاری ساس کا مقصد کچھ اور ہے تو انہیں ہماری طرف سے ہری جھنڈی دکھا دو۔ ہاں۔“

ماہن نے خفا خفا نظروں سے ماں کو دیکھا۔

”بیجے! انہوں نے بھلائی کی اور آپ نے اس میں برائی دیکھی۔۔۔ زمینوں سے پھل آئے تھے، سب رشتہ داروں کو بانٹے ہیں۔ ایک ٹوکری آپ کو بھیج دی تو کیا اس میں انہوں نے زرین کو بٹھا کر بھیجا ہے؟ نہیں بیجے تو آپ کہتی ہیں اس کے سسرال والے تو بیٹے ہیں بیٹے!“

”ارے تمہاری ساس کی چلتی بازیاں خوب سمجھتی ہوں میں۔۔۔ جب تلک ان کے دماغ میں یہ فتنہ نہ گھسا تھا، لے کو نہ پوچھتی تھیں۔۔۔ کسی دعوت میں ملاقات ہوئی تو دعا سلام تک میں خود جا کر کرتی تھی۔ وہ بڑی بی اپنی جگہ نہ بھڑکتی تھیں۔ اب ماشاء اللہ ہاشم میاں کی بڑھائی پوری ہوئی اور اللہ نے عزت والی نوکری دی تو ان کی تو آنکھیں ہندھیا گئیں۔ کبھی پھل بھیجتی ہیں تو کبھی مٹھائی، جب آئیں گی بیٹی کو سجا بنا کر ضرور ساتھ لائیں گی۔ ہاں!“

ماہن نے اکتا کر ماں کو دیکھا۔

”تو ای! اگر ان کے دماغ میں ایسی کوئی بات ہے بھی تو اس پر سوچا تو جاسکتا ہے، زرین اب اتنی گئی گزری بھی نہیں ہے۔ اچھے بھلے رشتے آتے ہیں اس کے۔۔۔ وہ تو۔۔۔ میرا خیال ہے۔ ہاشم بھائی کو دیکھ کر خود ہی انٹرسٹڈ ہو گئی ہے۔“

”اے بھو!“ فردوس بیگم اچھل ہی پڑیں ”خبردار جو اس بارے میں سوچا بھی تو۔ ماشاء اللہ، اللہ نظر بند سے ہائے شہزادوں جیسا میرا بیٹا۔ اس کے لیے وہ چھوٹی آنکھوں والی ہی رہ گئی ہے؟“

ماہن کو سخت ناؤ آیا۔

”خدارا ای! انتا غور بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اچھی مگنڈکننگ لڑکی ہے آپ کو لے دے کر اس کی آنکھیں اس نظر آئیں؟ کتنا فیکر کا پیلیکشن ہے اس کا۔۔۔ بڑھی لکھی ہے اور کیا چاہیے۔“

”بس بی! تم رہنے ہی دو۔“ انہوں نے یزاری سے تھاں پٹا۔ ”میں خود ہونڈیوں کی اپنے بیٹے کے لیے لڑکی دو۔ ہار میلفی باتیں کر کے انہوں نے تمہیں پھسلا لیا۔ تم کل کی پچی ان باتوں کو کیا سمجھو۔“

ماہن ہونٹ چباتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

حقیقت یہ تھی کہ خود تسنیم نے اس سے اس سلسلے میں بات کی تھی اور وہ شوہر کی نظروں میں اپنا قد بلند رکھنا چاہتی تھی۔

”ہاشم بھائی سے تو پوچھ کر دیکھ لیں۔“ اس نے ایک ری سی کو شش بھی کر ڈالی۔

فردوس بیگم کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ چہرہ غیض و غضب کا شاہکار بن گیا۔

”ان سے کیا پوچھوں؟ شہزادہ تسلیم سے! انارکلی پسند کی ہے انہوں نے۔۔۔ بلکہ انارکلی کیوں، مہر النساء کہو۔۔۔ اور جہاں لقب دیں گے اسے۔۔۔ ہمارے سروں پر لا کر بٹھائیں گے ایک بچے کی ماں کو۔“ ماہن حیران پریشان ان کی بے سرو پا گفتگو سننے لگی۔

”بھری دنیا میں انہیں وی ہٹا لگی نظر آئی۔۔۔ میں سمجھتی تھی فور نکل گیا ہو گا دماغ سے، مگر نا بھی وہاں تو وہی احاک کے تین پات۔“

”کیا کہہ رہی ہیں امی!“ وہ کچھ الجھتے ہوئے بولی۔ ”آپ نے بھائی سے بات کی تھی؟“

”کی تھی! جب ہی تو سلگ رہی ہوں۔“ وہ اپنا بازو دبائے لگیں۔
”پھر کیا کہا انہوں نے؟“

”بتا تو رہی ہوں۔۔۔ اسی منحوس کے چکر میں ہے۔“
”ہائے اللہ!“ ماہین نے سینے پہ ہاتھ رکھا ”وہ بھولے نہیں اب تک؟“ فردوس بیگم منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں
”پھر بھی۔ پھر بھی آپ زرین کے رشتے کی مخالفت کر رہی ہیں۔“ ماہین ماں پر غصہ نکالنے لگی۔ ”حالانکہ اس
مطلقہ ایک بچے کی ماں سے تو زرین ہزار درجے بہتر ہے۔ کنواری تو ہے۔“
”اے تو دنیا میں وہی ایک کنواری رہ گئی؟“ فردوس بیگم جل کر بولیں ”باقی سب بیاہتا ہوئیں؟ لڑکی! تیرا داغ
ہے کیا ہے؟“

ماہین خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا منہ بن گیا تھا۔ اسی لمحے عریشہ گنگنائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ بے فکری اور
الہ پرستی اس کے انگ انگ سے پھلک رہا تھا۔ جو گیارنگ کے پرنفلڈ سوٹ میں اس کا سر پایا ہمار دکھلا رہا تھا۔
”آگئیں بی پھرندہ!“ فردوس بیگم نے اسے گھورا ”مجال ہے یہ لڑکی گھر میں ملے؟“ عریشہ نے ماں اور بہن کے
تیور ملاحظہ کیے تو اس کی بے فکری میں قدرے کمی آئی۔ گنگناہٹ بھی رفو چکر ہوئی۔
”آئی۔۔۔ آپ کب آئیں؟“ وہ خفیف سی ہو گئی۔
”تمہیں دعا سلام کی فرصت مل گئی؟“ وہ بھی بگڑی بیٹھی تھی۔ عریشہ نے شرمندہ سی ہو کر حسام کو اٹھا لیا اور پیار
کرنے لگی۔

”میں ہوتی تو محترم کا داغ درست کر دیتی۔ کمال ہے اتنا بھی کانفیڈنس نہیں ہے آپ میں کہ اس کو کھری کھری
ساتھیں، شرم غیرت یا دولتاں۔“ انہیقدہ پھری ہوئی تھی۔ شہلا مسکرا دی۔
”یہ طغزن کہاں سے لاؤں؟ ایک ڈری سیمی ماں میں بھلا اتنا رعب ہو سکتا ہے؟“
”کمال ہے! ہم کیوں ڈریں؟ ہم نے کہیں ڈاکہ ڈالا ہے؟ کسی کی چوری کی ہے؟ اسے کوئی ڈر خوف نہیں۔۔۔
اپنے کیے پر شرمندگی نہیں، چچھتاوا نہیں۔ اتنے سالوں بعد یاد آیا کہ کوئی بیٹا بھی پیدا کیا تھا، واہ صاحب بہت خوب،
شہلا خاموشی سے سنتی رہی اور بے بسی سے مسکراتی رہی۔
”آئے تو سہی محترم کا فون! بس کس بل نکال دوں گی؟“
”پلیز انہیقدہ“ شہلا نے التجا کی ”کچھ مت کہنا۔ اس کی بات عمر سے کرو اور نا۔ دیکھو، وہ شرافت کی جون میں
ہے، کیا خبر، کب اس کا داغ الٹ جائے، عمر کی محبت میں نہ سہی ہماری ضد میں وہ اسے اپنی کسٹڈی میں لینے کا
دعویٰ دائر کر دے۔ میں تو مر جاؤں گی انہیقدہ! عمر کے بغیر۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ انہیقدہ کا سب جوش و خروش ہوا ہو گیا۔ وہ ماتھے پر بل لیے اسے دیکھنے لگی۔
”جانتی ہیں آپ! عورت کا سب سے بڑا دشمن کون ہے؟ یہ آنسو۔“ وہ خفگی سے بولی۔
”بتا نہیں!“ اس نے تھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں ”میں نے تو انہیں سب سے اچھا دوست پایا ہے۔“
”اوہ نہ!“ وہ طنز سے ہنس دی ”دل کا نقصان، جاں کا زیاں، بیٹائی کا عدو۔ کیا دوستی کرتے ہیں یہ آپ سے؟“
شہلا نے گہرے گہرے سانس لیے۔
”دل کا غبار آنکھوں کے رستے نہ نکلے تو شاید اتنا جس اس قدر بوجھ نہ سہرا پائے یہ غریب۔۔۔ دکھ کی شدت سے
پھٹ جائے۔ آنکھیں دھل کر صاف ہو جاتی ہیں تو سوچ، ہلکی پھلکی ہو جاتی ہے۔“
”ماموں آگئے۔۔۔ ماموں آگئے۔“ عمر شور مچا، اندر داخل ہوا تو وہ دونوں ہی چونک اٹھیں۔ اس کے پیچھے
ہنستا مسکراتا عباد تھا۔

”اسلامو علیکم۔۔۔“ اس نے زوردار سلام کیا۔

”و علیکم السلام۔۔۔“ دونوں لمحوں میں خوش ہو گئیں۔

”پر اچانک کیسے وارد ہو گئے؟ نہ فون نہ کوئی پروگرام۔۔۔؟“
 ”بس جناب! ہم نے سوچا چاند تو ہیں ہی۔۔۔ ذرا دن میں نکل کر دیکھیں۔۔۔ اس نے عمر کو گود میں اٹھالیا۔
 ”بہت خوب!“ شہلا ہنس دی ”خدا انظرید سے بچائے۔“
 ”اس بندر کو دیکھنے کا بہت جی چاہ رہا تھا۔۔۔ اس نے عمر کو چوما“ آپ سب سے ملنے کے لیے بھی دل بے چین ہو
 اٹھا۔۔۔ خصوصاً امی کی بہت یاد آرہی تھی۔۔۔ وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔
 ”پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟“ شہلا نے محبت سے بھائی کا چہرہ دیکھا۔
 ”اب دوست! ہمیشہ کی طرح۔۔۔ پھر وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔
 ”آہی!۔۔۔ آپ رورہی ہیں؟“

”ارے۔۔۔ نہیں یا گل!“ وہ ہنس دی ”میں کیوں رونے لگی۔“
 ”لگتا ہے۔۔۔ آپ کی آنکھیں۔“ منیہہ بیگم چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی تھیں۔ ان کا چہرہ عباد کی
 اہلی نوشی کی بوستان کہہ رہا تھا۔
 ”یہ لوسہ گرم گرم سموسے کھاؤ۔۔۔ میں نے دو دن پہلے ہی بنا کر فریز کئے تھے۔۔۔ سوچتی تھی جانے عباد کب آئے
 گا۔۔۔ بہت شوق سے کھاتے ہونا؟“ انہوں نے پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔
 ”یعنی صرف عباد کے لیے بنے ہیں؟“ انیقہ نے ناک بھوں چڑھائی ”ہم خالی چائے پر پڑ خائے جائیں گے؟“
 ”بہی تم سے کمی کی ہے میں نے؟“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر چپٹ لگائی تھی۔ انیقہ نے لاڈ سے ان
 کے گلے میں بائیس ڈال دیں۔
 ”میں جانتی ہوں۔۔۔ تینوں میں آپ سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہیں۔۔۔ ہیں نا امی؟“ منیہہ بیگم مسکرا دی
 ”ہیں۔۔۔ ان کی پلکوں میں نمی تھی۔“



لہسہ خالہ دم بخود بیٹھی تھیں۔ ربیعہ ان کے پاس ان کی طرح پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان
 ٹاؤٹی کا ایک طویل وقفہ آیا تھا۔
 ”بھلا بتاؤ!“ آخر کار خالہ نے ایک آہ بھری۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
 ”میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے نا خالہ جان؟“ وہ متذبذب تھی۔
 لہسہ خالہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہیں پھر انہوں نے اسے گلے سے لگالیا۔
 ”خدا نے مجھے ایسی ہمت والی بیٹی دے دی ہوئی۔۔۔ ایسے نکھٹو مردار لڑکوں سے تو بیٹیاں بھلی۔۔۔ تم مجھے منع کرتی
 ”بیٹی! اس لیے خاموش ہوں ورنہ ایسی کی تیسری کروڑوں کھڑے کھڑے۔۔۔ اس مردار کے سر سے عشق کا بھوت
 ہی اتار دوں اور اس بڑھے کے دماغ کی جو لیں بھی درست کر دوں۔۔۔ بھلا بتاؤ! اپنی بیٹی جیسی بچی کو شادی کا پیغام
 رہا ہے کمینہ۔۔۔ پورے محلے میں ذیل نہ کروں تو نفیسہ نہ کہے کوئی۔۔۔ تمہاری قسم سے خاموش ہو چکی
 ”۔۔۔“

”بس خالہ۔۔۔ ابیری اور پتھر والا حساب ہے۔“ ربیعہ نے ٹھنڈی سانس لی۔
 ”نہ بیٹی۔۔۔ ابیری اور پتھر کا تو پتھر بھی کوئی جوڑ بیٹا ہو۔۔۔ یہ تو قرب قیامت کی مثال ہوئی۔ بھلا بتاؤ۔“ ان کا بس نہ
 ہانا تھا وہ کچھ نہ کچھ ضروری کر ڈالیں۔

”ایک بات مانیں گی خالہ؟“ ربیعہ ہولے سے بولی۔
 ”اس کو بیٹی۔۔۔ اللہ قسم میں نے تمہیں دل سے بیٹی سمجھا ہے، محض زبانی کلامی نہیں۔“ خالہ جذباتی ہو رہی
 ”ہیں۔“ ”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔“ ربیعہ کو کہنے میں تامل تھا۔
 ”کو بیٹی! بنا کر دو۔“ خالہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”آپ بدر کے لیے سمیعہ کا رشتہ مانگ لیں۔“
خالہ خاموش ہو گئی تھیں۔

ربیعہ نے سراٹھا کر بڑی آس سے ان کا چہرہ دیکھا۔
”کیا بات ہے خالہ! آپ خاموش کیوں ہو گئیں؟ آپ کو بری لگی میری بات؟“
”نہ بیٹی۔ بات بری نہیں تو بری کیوں لگے گی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ لڑکی کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، کہیں نہ کہیں باپ پر گنی ہوگی اور باپ تو ایسا ہے کہ پھر راکر آنکھ نکال دو اس کم بخت کی۔ اب دیکھو نا۔ اولاد میں ماں باپ کا اثر تو آتا ہے نا۔“

”میں نے تو سنا ہے سمیعہ کی ماں بہت اچھی عورت تھی۔“ ربیعہ کہیں کھوسی گئی ”داؤی بتاتی تھیں۔“
”آں۔ ہاں ہاں۔ وہ تو جتنی عورت تھی۔“

ربیعہ نے اپنے خیال سے نکل کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔
”خالہ سمیعہ میری بہت اچھی سہیلی ہے۔ بچپن سے۔۔۔ ساتھ رہا ہے ہمارا۔ میں اسے جانتی ہوں۔ وہ بہت پر خلوص اور ہمدرد لڑکی ہے۔ پھر۔۔۔ پھر آپ کے بیٹے نے اسے بہت سے خواب دکھائے ہیں۔ وہ ان خوابوں کے سارے سارے جی رہی ہے۔ بدر اس سے مخلص نہ سہی وہ بدر سے مخلص ہے۔ میرا مشورہ تو یہی ہے خالہ کہ اس خلوص کی نافروری نہیں ہونا چاہیے۔“
”تم بہت اچھی ہو ربیعہ! نفیسہ خالہ نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”پھر مانیں گی میری بات؟“ وہ آس سے بولی۔
”میں تو مان لیتی ہوں بیٹی! وہ بڑھا بھی تو راضی ہو۔“
”آپ رشتہ لے جائیے گا خالہ۔ بانی جوان دونوں کے نصیب میں اللہ نے لکھا ہو۔ ہوتا تو وہی ہے۔“
”وہی منائے گی اپنے باپ کو۔ ہم کیوں اس کی منتیں کرتے پھرں۔“ خالہ پھر جل گئی تھیں۔ جب سے ربیعہ نے انہیں سارا قصہ سنایا تھا وہ حاکم چچا سے بار بار نفرت اور کراہیت کا اظہار کرتی تھیں۔
”خالہ! مکان کو تالا ڈال کر اس کی چالی آپ کے حوالے کر جاؤں گی۔“ ربیعہ کو دھیان آیا تھا ”دکانوں کا کرایہ

بھی آپ رکھ لیا کرنا۔ میں نے ان لوگوں کو کبھی بتا دیا ہے۔“
”تمہاری امانت ہے بیٹی! سب کچھ۔۔۔ جب آؤ گی، اپنی امانت پوری پوری پاؤ گی۔“ خالہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔
”میرا بس چلتا تو تمہیں کسی طور نہ جانے دیتی۔۔۔ نجائے تمہاری داؤی کو اللہ نے اتنی مہلت کیوں نہ دی۔“ ربیعہ نے گہری سانس بھر کر سب آنسو اپنے اندر اتار لیے۔

”آپ میرا کام یاد سے کر دینا خالہ۔ کل تک ہر حال میں۔“
”لو بیٹی۔ یہ بھی کہنے والی بات ہے۔ بھلا بتاؤ!“
ربیعہ گہری سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

”سنا ہے ماہین اپنی نند کا رشتہ لائی ہے ہاشم میاں کے لیے۔“ شفیقہ حیات نے تسبیح روک کر پر خیال انداز میں ہوسے پوچھا۔ وہ راج کی شرٹ پر استری کر رہی تھیں۔ یکدم مڑی تھیں۔
”اچھا! استری کا لپک نکال کر وہ ساس کے قریب چلی آئیں۔“ آپ کو کیسے پتا؟“
”عزیزہ نے کچھ اڑٹی اڑٹی سن لی تھی۔ وہ ثانیہ کو بتا دیتی تھی۔ میں بھی وہیں قریب ہی بیٹھی تھی۔“
”آپ نے نہیں پوچھا عزیزہ سے؟“ نہیں تجتس ہوا۔

”نہ بیٹی۔ میں اچھا نہیں جانتی یوں گھروں کی رپورٹ لیتا۔ وہ تو بس یونہی بات کان میں پڑ گئی۔ ابھی بیٹھے بیٹھے خیال آگیا تھا۔“ بھابی جان کا کیا خیال ہے؟“ عذرا نیگم جو کنا تھیں۔

”کیا خبر؟ تمہیں بتایا تو ہے میں نے کچھ نہیں پوچھا۔“

”خیر!“ عذرا بیگم نے گہرا سانس بھر کر کہا ”جہاں جس کا نصیب اللہ نے لکھا ہو۔ ہمارا تو اس بات پر ایمان کامل“

”پھر جا کر رافع کی شرٹ استری کرنے لگی تھیں۔“

”ارے ہو!“ شفیقہ حیات نے پھر تسبیح روکی تھی ”ذرا بات سنو۔ ایک صلاح کروں تم سے؟“ عذرا بیگم پھر استری کا پلگ نکال کر جلی آمیں اور ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

”فردوس کینہ پرور تو بہت ہے“ اللہ معاف کرے لیکن سب ہی جانتے ہیں۔“ انہوں نے بات کا آغاز کیا تھا۔

”رافع والی بات بھولی نہیں ہے۔۔۔“

”جانتی ہوں اس میں کیا راز کی بات۔“

”پھر بھی۔۔۔ اگر ہم کوشش کریں تو معاملات شاید پھر سنبھل سکیں۔۔۔ دیکھو بیٹی! نیک عورتیں ہمیشہ گھر جوڑنے والی سوچتی ہیں، کیا سمجھ سکتی ہیں کہ کیا سسرال ہر رشتہ بنا ہوتا ہے۔۔۔“

عذرا بیگم اچھ سی گئیں۔ انہوں نے سانس کا چرہ دیکھا۔

”بات کیا ہے اماں! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”میں کہتی ہوں رافع کے لیے نہ سہی نافع کے لیے مانگ لو عریشہ کو۔“ عذرا بیگم خاموش ہو گئیں۔ شفیقہ حیات ان کو دیکھ گئیں۔

”کیا کہتی ہو؟“

”اماں! وہ اب نہیں مانیں گی۔ بے وجہ ہماری زبان بھی خراب ہوگی اور جتنا بھرم ہے اتنا بھی جائے گا۔ باقی“

”اچانک سے بولیں۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں سانس کا مشورہ قطعاً پسند نہ آیا تھا۔“

”ارے بیٹا۔۔۔ اچھ بڑھی کی کیا مرضی، آج سانس ہے، کل کو نکل جائے گی۔۔۔ میں تو اس لیے کہتی ہوں کہ ماہ ان آپس میں جڑے رہیں تو اچھا ہی ہے۔ وہ اپنا لڑکا باہر بیٹھے کو پھرتی ہیں، تم اپنے بیٹے کا کہیں نہ کہیں تو کرو گی“

”اماں! اچھا ہو بھائی بھائی آپس میں ایک دوسرے کا بوجھ بانٹ لیں۔“

عذرا بیگم کے سانس کی بات صحیح معنوں میں سمجھ میں آئی تو ان کے چہرے کے زاویے بدلے۔

”لیکن اماں! نافع کے لیے عریشہ کو مانگ لیں تو کیا ضرور ہے کہ وہ بھی ہاشم کے لیے ہماری لڑکی مانگیں؟“

”سوچیں گی تو ضرور!“ انہیں یقین تھا۔

”اور جو نہ سوچا؟“

”تو کیا ہوا ان کی سوچ ان کے ساتھ ہمیں کوئی لالچ تو نہیں۔ تب ہی سینی بجاتا ہوا رافع سیڑھیاں اترتا چلا آیا۔“

”ای جی! میری شرٹ اس نے متلاشی نگاہیں دوڑائیں۔“

”وہ بڑی ہے ذرا سی رہتی ہے کرنے کو۔“

”اٹیں یعنی میٹنگ انہیں ہے۔ شرٹ ادھوری پھوڑی آپ نے۔۔۔“ وہ ہنسنے لگا ”بائی داوے ہاٹ ٹاپک کیا ہے؟“

”وہ لوں مسکرانے لگی تھیں۔“

”اماں کا خیال ہے نافع کے لیے عریشہ کا رشتہ مانگا جائے؟“ انہوں نے بڑے بیٹے سے بھی تذکرہ کرنا مناسب سمجھا۔

”اوہ خالصتاً زنانہ موضوع۔“ وہ بے نیازی سے شرٹ پر استری پھیرنے لگا۔

”پھر بھی کچھ رائے تو دو۔۔۔“ شفیقہ حیات نے بھی کہا۔

”میں کیا رائے دوں دادی!“ وہ ہنس دیا تھا ”رائے تو صاحب الرائے سے مانگیے!“ اس کا اشارہ نافع کی طرف

”عریشہ اچھی لڑکی ہے نا۔“

”اے دادی! لڑکیاں سب ہی اچھی ہوتی ہیں۔“ وہ سرت چن کر بے بند کرتے لگا۔
 ”پھر تم نے انکار کیوں کیا تھا؟“ انہوں نے اسے چھیڑا۔
 ”بیجے۔ میرا ذکر کیوں نکال بیٹھیں۔ رات گئی بات گئی امی! میں ذرا طفیل کے گھر جا رہا ہوں۔ کچھ دیر ہو جائے
 اچھا اللہ حافظ!“ وہ سٹی کی دھن از سر نو تازہ کرتا ہر نکل گیا۔
 ”ان لڑکوں کے لیے تو ان کی دوستیاں اہم ہیں۔ گھریلو معاملات اہم نہیں۔“ حقیقہ حیات خفا ہوئیں۔
 ”ہاشم سے اس کی ایسی پکی دوستی ہے، یہ چاہے تو اس سے بات کر سکتا ہے۔“
 ”نہ اماں! کبھی نہیں مانے گا۔ پھر اچھا بھی نہیں لگتا۔“ عذرا بیگم نے فوراً ان کا خیال مسترد کر دیا۔
 ”پھر کہو تو میں فردوس بیگم کے کان میں بات ڈالوں۔“ انہوں نے بات کا تصفیہ کرنا چاہا۔
 ”کردیکھیے۔“ وہ دھیرے سے بولی تھیں۔



شہلانے اس کا بی پی چیک کر کے اپریٹس بند کیا۔
 ”بہت لو بلڈ پریشر ہے۔ کیا بات ہے؟ کھانا پینا بڑ ہے کیا؟“
 ”کچھ حلق سے اترے تو کھاؤں نا۔“ وہ بیزاری سے بولی ”جو کھاتی ہوں، اسی وقت حلق سے واپس آ جاتا ہے۔“
 ”بری بات ہے ایقان۔! تم خود کو شش نہیں کرو گی تو آسمان سے فرشتے نہیں اتریں گے من و سلوی کے قتال
 لے کر۔“

”میں بھی تو یہی سمجھاتی ہوں۔“ رابعہ خاتون بولیں ”یہ کسی کی کب سنتی ہے۔ پچھلے سنتے سے برابر فون کر کے
 بلارہی ہوں۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتی رہی۔ کل میں علی کو لے کر ملنے چلی گئی۔ دیکھا تو تقریباً ۱۰
 ہوش پڑی تھی۔ بچوں کی الگ حالت خراب تھی۔ ماں ٹھیک نہ ہو تو بچوں کو کون پوچھے گا۔ اسے اتنا بھی احساس
 نہیں۔“

”ڈانٹ لیجئے آپ بھی!“ وہ ہولے سے مسکرا دی ”میری سائیڈ کون لے گا؟“
 شہلانے اسے لٹٹی وٹامن کی گولیاں لکھ دی تھیں۔
 ”میں اب چلتی ہوں۔ مجھے ہاسپٹل بھی جانا ہے۔ تم اپنا خیال رکھو ایقان! تمہارے بچوں کو تمہاری ضرورت
 ہے۔ جلدی سے ٹھیک ہو کر انہیں توجہ دو۔“ اس نے ننھی ایمان کا گال چھوتے ہوئے کہا۔
 ”عمر کیا ہے؟“ ایقان نے پوچھا۔

”ہوں! اچھا ہے۔“ وہ مسکرا دی ”آج کل عباد کے آگے پیچھے پھرتا ہے۔“
 ”ماموں کا تو دیوانہ ہے۔۔۔“ رابعہ بیگم نے تبصرہ کیا۔
 ”ماموں بھی تو ایسے ہیں۔“ پیچھے بیٹھی ناعملہ گنگنائی تھی۔ ”وہ کوہنسی آگئی۔“
 ”کس بات پر ہنسا جا رہا ہے؟“ شہلا اپنا پاس لیے ان تک چلی آئی تھی۔
 ”کچھ نہیں شہلا بابی!“ وہ گڑبڑا کر رہ گئیں۔

”چلو نہیں بتانا تو نہ سہی۔“ وہ مسکرائی ”چھا بھی خدا حافظ۔“
 ”آتی رہنا شہلا!“ ایقان ہولے سے بولی رابعہ بیگم شہلا کا لکھا ہوا نسخہ دیکھ رہی تھیں۔
 ”میں بھی رافع سے منگوا لیتی ہوں دوایاں۔۔۔“ وہ بولیں ”کیا حال کر لیا ہے اس لڑکی نے اپنا۔“
 ایقان نے آنکھیں بند کر کے سر تیکے سے نکالا تھا۔ آنکھوں میں کسی کی مسکراتی صورت پھرنے لگی تھی۔
 ”آئی مس یو۔ آئی مس یو عاشر!“ اس کی بند پلکوں میں بیانی بھرنے لگا۔



”نہیں۔ میں تو بہت بریو ہوا ہوں۔۔۔ ڈرنا تو نہیں ہوں کسی سے۔“ وہ فون کے تار سے کھیل رہا تھا۔ اس

لم قریب بیٹھ کر نوٹس بناتی انیقہ کے احساسات کے سب تار تجھنجنھا رہے تھے وہ سارے صفحے پر نجانے کیا لکھ رہی تھی۔

”خالہ جانی کتنی ہیں، صرف اللہ میاں سے ڈرتے ہیں۔۔۔ بھوت اور چڑیلیں تو ہوتے ہی نہیں ہیں۔۔۔ سب مٹ ہے۔۔۔“

منیزہ بیگم بظاہر رسالہ دیکھنے میں مشغول تھیں لیکن ان کا دھیان اس کے لفظ لفظ میں الجھ الجھ کر ٹکنا تھا۔
”میرے پاپا؟ وہ تو ہیں ہی نہیں۔۔۔ پتا نہیں کہاں ہیں۔۔۔ ماما سے پوچھو تو وہ کہتی ہیں، بعد میں بتاؤں گی۔“ انیقہ نے صبراً کر قلم بچھا اور حنفی سے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی سے سر جھکا کر رہ گئیں۔

”سب بچوں کے پپا آتے ہیں پیر میں منینگ میں، میری تو صرف ماما ہوتی ہیں۔ میرا دوست ہے ناکئی اس کے پپا میں آتے کیونکہ وہ اللہ میاں کے پاس گئے ہوئے ہیں۔۔۔ شاید میرے پپا بھی اللہ میاں کے پاس گئے ہوں۔۔۔“
”ممہ! بس بیٹا۔۔۔ اب انکل کو خدا حافظ کہہ دو۔“ انیقہ نے آہستگی سے کہا۔ اس نے ریسور کان سے ہٹا کر

”میں بات کر رہا ہوں نا انکل سے۔۔۔“

”آپ کھیلنے نہیں جارہے راجہ کے ساتھ؟“

”نہیں! اس نے بے نیازی سے جواب دے کر پھر ریسور کان سے لگا لیا۔

”ہاں، میری خالہ جانی ہیں۔۔۔ یہ ایسے ہی مجھ سے لڑائیاں کرتی رہتی ہیں۔۔۔ ماما جیسی؟ نہیں ماما تو لڑائیاں نہیں

”نہیں۔۔۔ آپ سے کس نے کہا؟“

انیقہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس نے عمر سے ریسور جھپٹ کر واپس کر ڈیل پر رکھ دیا۔

”اڈس آل! اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔“ ”کانی ہے اتنا۔“

مرحمتی اور قدرے خوف آگھوں میں لیے اسے دیکھتا رہا۔

”آپ ناراض کیوں ہو رہی ہیں خالہ جانی؟“

”اماں خراب ہے میرا اس لیے۔“

”اللہ! منیزہ بیگم نے اسے سرزنش کی۔“ ”بچے سے کیوں الجھ رہی ہو؟“

”میں تو باپ کا داغ بھی ٹھیک کر دوں ماما۔۔۔ لیکن شہلا آپ کی وجہ سے چپ ہوں۔“

”وہ ہاشور سمجھ دار ہے۔ تم ابھی بچی ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔“ وہ رسانیت سے بولیں۔

”اتنے اچھے انکل ہیں۔۔۔ اتنی اچھی باتیں کرتے ہیں۔۔۔ آپ باتیں بھی نہیں کرتیں اور فون بھی نہیں کرنے

”اے۔۔۔ انکل اچھی خالہ نہیں ہیں آپ! وہ منہ بسور رہا تھا۔

”اماں جی۔“ انیقہ کا غصہ اس کا منہ دیکھ کر فرو ہو گیا ”آپ تو بہت پیارے بھانجے ہونا میرے۔۔۔ آپ اچھی

”اے! باتیں کرنا اپنی خالہ سے“ گندی خالہ سے۔“

وہ اس کے پاس بیٹھ کر اس کا منہ چومنے لگی۔

”اے! مرتبہ جب عباداموں آئیں گے نا۔۔۔ میں ان کے ساتھ ہی چلا جاؤں گا۔۔۔ پھر آپ مجھے یاد کیا کریں

”آپ بھی مجھے یاد کریں گے جب میں چلی جاؤں گی۔“ وہ مزے سے بولی۔

”آپ؟“ وہ الجھ کر بولا ”آپ کہاں جائیں گی؟“

”سسرال! وہ شرمناک بولی۔

”د تیز! منیزہ بیگم کو ہنسی آگئی تھی ”بچے کے ساتھ ایسی باتیں کرتی ہے۔“

”لاہور؟“ سمیعہ کی چیخ نکل گئی تھی ”کیوں۔۔۔ کس کے پاس۔۔۔ وہاں کون ہے تمہارا؟“

”میری پھوپھو کا گھر ہے وہاں“ وہ آہستگی سے بولی۔

”لیکن تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ شک نہ تھی ”ایسے اچانک۔۔۔ چوروں کی طرح۔“

ربیعہ نے سر جھکا لیا۔

”اے بی! جب چور ڈاکو سینہ تان کر چلنے لگیں، دھڑلے سے پھریں تو شریف لوگ یونہی خاموشی سے ”چوروں“

کی طرح اپنے کام کرتے ہیں۔“

نفیسہ خالہ بھنا کر بولی تھیں۔ سمیعہ کچھ نہ سمجھنے والی کیفیت میں گھری گھڑی تھی۔

”چلو بیٹی۔۔۔! وقت کم ہے۔۔۔ انہوں نے اس کا ٹرنک سنبھالا۔

ربیعہ اپنا بیگ اٹھا کر گھڑی ہو گئی۔

”ربیعہ۔۔۔ تم نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔“ سمیعہ کو بے حد گلہ تھا۔ ”اب جاتے جاتے کہہ رہی ہو۔۔۔ کس دل

سے رخصت کروں تمہیں؟“ ربیعہ اس کے گلے لگ کر رو دی۔

”مجھے معاف کر دینا سمیعہ۔۔۔! میری کچھ مجبوریات تھیں۔ یہ بات میں خود سے بھی چھپا رہی تھی۔“

سمیعہ بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ دونوں بہنوں کی طرح تھیں۔

”اب کب ملاقات ہوگی؟“

”اللہ کو علم!“ وہ مختصراً ”بولی“ دعا کو مجھے میرے اپنے مل جائیں۔“

اسی لمحے سکندر اندر داخل ہوا۔

”اماں رکشہ آگیا ہے۔“

ربیعہ سمیعہ کو خدا حافظ کہہ کر گھر سے نکل آئی۔ نفیسہ خالہ نے دروازے کو تالا ڈال کر چابی اپنے نیپے ٹم

اڑس لی تھی۔ ربیعہ نے رکشہ میں بیٹھ کر دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنا گھر دیکھا۔

”ربیعہ۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔۔۔ ربیعہ! یہاں سے جاؤ!“

اسے رکشے کے شور میں دادی کی آواز آرہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پر روانی سے بہہ رہے تھے۔

ریل کے پیروں کی چٹکھا اڑاس کے دل میں سوراخ کر رہی تھی۔ وہ اندر سے بے حد خوف زدہ اور سسہا

تھی۔

”خالہ! آپ نے اس سے پر تار بھیج دیا تھا نا۔“ اس نے آخری مرتبہ پوچھا۔

”آں ہاں بیٹی۔۔۔! بے فکر رہو۔ تار پہنچ گیا ہو گا۔ تم اطمینان سے سفر کرنا۔ میں نے ٹکٹ بھی منگے والے ڈھ

کالیا ہے۔ اس میں اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ تم بے فکر ہو کر اللہ پر بھروسہ کر کے جاؤ۔“

وہ ان سے لیٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آپ مجھے بہت یاد آئیں گی خالہ۔“

”تو کیا میں نہ یاد کروں گی تمہیں۔۔۔“ وہ گلو گیر لہجے میں بولیں۔ ”بھلا بتاؤ!“

”میرے گھر کا خیال رکھنا خالہ! وہاں دادی کی روح رہتی ہے۔“

”جتنا بس میں ہو سکے گا بیٹی! خدا ان بے حس انسانوں کو رسوا کرے گا۔۔۔ بچی کو اپنے گھر سے بے گھر ہونے،

مجبور کر دیا ظالموں نے۔ ایسی اندھیر نگری جسے دیکھو وہی دانت گاڑے بیٹھا ہے۔ بھلا بتاؤ۔“ وہ دکھ سے چور چور

تھیں۔ ”میں خط لکھوں گی آپ کو۔“

”کوئی پریشانی ہو تو لوٹ آنا بیٹی۔۔۔ آخر میں تو ہوں نا یہاں۔۔۔“

”دعا کرنا خالہ! کوئی پریشانی نہ ہو۔“

گاڑی کسی چھوٹے اسٹیشن پر رکی تھی۔ عباد کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کر برقعہ سے نیچے آگیا۔ تھرموس سے پانی اہل کر پینے لگا۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

الغبتا! اس کی نگاہ اس لڑکی پر پڑی۔ دھان پان سی وہ لڑکی سر تا پایا سیاہ چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔ صرف اس کا ہمدار بھرا چہرہ چادر سے باہر تھا۔

اس کے چہرے پر فرشتوں کی سی معصومیت تھی۔ حجاب آلود سیاہ آنکھیں ایک بار اس کی آنکھوں سے لڑائیں پھر جھک گئیں۔

مہادی نگاہوں نے اس کے کسی ممکنہ ہم سفر کی تلاش کی پھر وہ ناکام ہو گئیں۔ بقیہ دو ہم سفر تو کراچی سے ہی اس کے ساتھ تھے۔

وہ لڑکی شاید اسی چھوٹے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہوئی تھی۔ وہ تنہا تھی۔ اس کے انداز میں نامحسوس سی لیںوٹن تھی۔

اپنا سفری بیگ گود میں رکھ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

"آپ اکیلی ہیں؟" وہ نجائے کیوں اسے مخاطب کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"جی! اس نے خوف زدہ آنکھوں سے اسے دیکھا تھا "جی۔۔۔ جی ہاں!" عباد نرمی سے مسکرایا۔

"کوئی بات نہیں۔ کہاں جا رہی ہیں آپ؟"

"لاہور۔" اس نے تھوک نگلا۔

"میں بھی لاہور جا رہا ہوں۔" وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ "چلیں سفر خوشگوار ہوگا! میرا نام عباد ہے۔ آپ کا؟"

"ربیعہ!" وہ دھیرے سے بولی۔

اس کے وجود میں بے پناہ کشش تھی۔ عباد اسے دیکھ گیا۔

آہستگی سے دستک دے کر ہاشم اندر داخل ہوا۔

لیپوٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے رافع نے ذرا کی ذرا کی نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا پھر اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اس کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ پر حرکت کر رہی تھیں۔

ہاشم اس کے مقابل گداز صوفے میں دھنسن کر بیٹھ گیا۔ رافع نے چند لمحوں بعد پھر ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ ماہر دماغی سے پی۔ سی کے مانیٹر پر نگاہ جمائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف پتا چلتا تھا کہ اس کامیاب کسی اور فضا میں محو پرواز ہے۔

رافع کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ وہ اپنے کام کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"ایسا کر رہا ہے یا ر!" بڑی دیر بعد ہاشم اپنے خیالوں سے نکلا۔

"پروجیکٹ کھلچٹ کر رہا ہوں۔" وہ مصروف انداز میں گویا ہوا۔ "سر علوی نے جان کھا رکھی ہے۔" ہاشم کی سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔ ناقدانہ نگاہوں سے وہ رافع کو دیکھنے لگا۔

سیاہ ٹاؤزر اور سفید نی شرٹ میں وہ خالصتاً اپنے گھریلو حلیے میں تھا۔ عموماً وہ اطمینان سے اسٹڈی کرنے کے لیے اسی ڈریس کا انتخاب کرتا تھا۔ ماتھے پر پڑی شملن اس بات کا ثبوت تھی کہ اس کا پورا دھیان اپنے کام کی جانب تھا۔ مہارت سے چلتی انگلیاں اس کی سوچ کے بھرپور ارتکاز کی گواہی دے رہی تھیں۔ اس نے ہاشم کی آمد کو قطعاً لفٹ نہ کرائی تھی۔ ہاشم نے بالآخر آکٹا کر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"یار رافع!"

"ہوں۔" کچھ دیر بعد مختصر ترین جواب آیا۔

"جائے پلا!" رافع کی انگلیاں ایک نخت تھم گئیں۔ وہ ریوالوگ جیپر کو گھما کر اسے دیکھنے لگا۔

"میں پلاؤں؟" وہ حلقی سے اسے گھورنے لگا۔

”یہ بات نہیں ہے۔“ ہاشم نے احتجاج کیا۔ ”ایک بہت پریشان خیال شخص ایک بے حد پرسکون بندے سے یہ فرمائش کر رہا ہے۔ یہ پریشانی تیسرے کرنے کی استدعا ہے یا ر!“

”پرسکون بندہ؟ اس پروجیکٹ کو کمپلیٹ کرنے کے خیال نے میری رات کی نیند اور دن کا سکون برباد کر رکھا ہے اور تو کہتا ہے پرسکون بلکہ بے حد پرسکون بندہ۔“

”ارے ہم نے بھی کیے ہیں بڑے بڑے پروجیکٹ۔“ ہاشم نے مکھی اڑائی ”دو دن میں دو مار تے تھے پر اس روگ کا کوئی علاج جتا میرے دوست!“

”کسی ڈاکٹر سے رجوع کرو۔“ رافع معنی خیز انداز میں بولا۔

”ڈاکٹر سے رجوع کرنے پر تو اماں ناراض ہے۔“ ہاسم بے چارگی سے بولا۔

”اب یا تو روگ کا علاج پوچھ لویا اماں کو منانے کا۔ ایک وقت میں میں ایک علاج تجویز کر سکتا ہوں۔“
 رافع نے کرسی ہاشم کی جانب سے مکمل طور پر سوئی اور انگلیاں چمکانے لگا۔ گویا ہاشم کی آمد کو شرف مہمانی عطا کر دیا گیا تھا اور اب وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔

”سنا یہاں بیگم تنسیم بھائی کے ہمراہ آنے والی ہیں؟“ ہاشم نے اصل مسئلہ سے اسے آگاہ کیا۔

”سوار آئیں ان کا گھر ہے۔ تجھے کاہے کے موڑاٹھ رہے ہیں؟“ رافع نے ہنسیں اچکا کر اسے دیکھا۔

”مریوز دراصل تسنیم بھائی کی چھوٹی بہن کا نام ہے میرے لیے۔“ ہاشم نے طنزاً ”کہا۔

”آئی سی“ اس نے سرہلایا۔ ”بیری اور کنکرو الامعاملہ ہے۔“

”کنکر؟ اینٹ بول میرے بھائی۔ میری تو کمر ٹوٹ جائے گی۔“ اس نے دہائی دی۔

رافع کھل کر ہنس دیا۔ سیلنگ فین پر نگاہ جمائے وہ کچھ دیر مسکراتا رہا۔ ہاشم بری سی صورت بنائے بیٹھا تھا۔

”پتیری نہیں“ تیری خود ساختہ عشق کی کمر ضرور ٹوٹے گی۔ ”وہ اسے ڈراتے ہوئے بولا۔

ہاشم اسے گھورتا ہوا اور رافع کے لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ بھی ہوئی تھی۔ ہاشم کے گھورنے کا جواب اس نے محض کانڈھے اچکا کر دیا۔ ہاشم نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”کبھی کبھی مجھے تم پر بہت رشک آتا ہے رافع!“ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ بولا۔

اب وہ مکمل طور پر سنجیدہ ہو چکا تھا۔

”اچھا۔“ رافع نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ ”کبھی کبھی؟ یہ مہربانی کیوں ہوتی ہے؟“

”محبت نامی ”سیخ البحر“ نے مجھے ہی ”سند باد“ سمجھا۔ کیوں آخر؟ یہ بلا میرے کاندھوں پر اس بے تکلفی سے

سوار ہوئی یا رافع! بھی بھی مجھے ”اس“ پر بہت سخت صدم کا تاؤ آتا ہے۔“

”سپر؟ سیخ البحر پر؟“ رافع نے مذاق اڑایا۔
”نہیں۔“

”میں یار۔“

مفتی محمد رفیع الدین

”او قومیں الٹی دم۔۔۔ وہ چڑ لیا۔
بڑا کٹ شہا ۴۱“

وَالْأَنْزِلُ سَهْلًا؟

ہاں۔ وہ بے ساختہ بولا۔
 افع نے ایک بار قہقہہ لگایا۔

”اے گامبرے ہاتھ سے۔“

پے لایرے ہا سے۔

رافع نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی قابو میں کی۔
 ”مجھ پر کبھی بھی رشک آتا ہے۔ اس پر کبھی کبھی سخت قسم کا تاؤ آتا ہے۔ وضاحت کسی بات کی نہیں ہے۔
 ”میرا مسئلہ؟“ وہ خاموش ہو گیا۔ ”یہی تو میرا مسئلہ ہے یا راکہ کبھی مجھے تم پر رشک اور ڈاکٹر شہلا پر سخت
 لہہ آتا ہے۔ دس از دا پوائنٹ۔“

اس کے لب و لہجے میں بے پناہ سنجیدگی تھی۔ رافع بھی سنبھل گیا۔
 ”وضاحت کرو۔“ پہلی بار اس نے ہاشم کو سنجیدگی سے دیکھا۔

”سوچتا ہوں رافع! کاش میں بھی تمہاری طرح ہوتا۔ زندگی کو میں نے اسی نظر سے دیکھا ہوتا جس نگاہ سے اسے
 دیکھتے ہو۔ چند مخصوص قسم کے مقاصد پر دھنا ہے، اچھی نوکری کرنی ہے، مال باپ کی پسند سے شادی کر کے بچے
 لانے ہیں، ان کو بڑا کر کے ان کی شادیاں کرنی ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ذہن میں دھند نہیں بھرتی، آنکھوں میں
 آپ نہیں بستے، سوچوں میں تلاطم برپا نہیں ہوتا، جذبوں میں بھنور نہیں پڑتے سب کچھ صاف، سیدھا غضب
 بندے ہو یا رافع! مجھے تم پر کبھی بھی بہت رشک آتا ہے۔“

”یہ کبھی کبھی کی تکرار کتنی ہے کہ بہت کچھ بین السطور بھی ہے۔“ رافع نے اسے دلچسپی سے دیکھا۔
 ”ہاں۔ کبھی کبھی مجھے تمہارا وجود بے مقصد بھی تو لگتا ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔

رافع ہنس دیا۔ ”وضاحت کرو۔“

”یابستہ! کوئی فرق ہو، ہیل میں اور بندے میں آنکھوں پر بیٹی بندھی ہے اور گول گول گھوم رہے ہو۔ آدمی وہ جو
 یاں تروا کر بھاگے۔ جی! لیکن بس کبھی کبھی، محبت مت کرنا رافع! مت کرنا۔ محبت انسان اپنی پسند سے کرتا
 ہے۔ مقدار اللہ تعالیٰ اپنی پسند سے لکھتا ہے۔ جو بھی Clash ہو جائے تو بڑا نقصان ہوتا ہے بندے کا۔“
 رافع گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اپنے دوست کا بکھرا بکھرا روٹھا روٹھا انداز اسے از حد اچھا لگ رہا تھا۔
 ”اور تم مجھے اتنے اچھے لگ رہے ہو میاں راجھے! کہ میرا بھی جی چاہ رہا ہے کسی کو چاہ دیکھنے کا۔“ اس نے جی ہی
 کی میں سوچا۔

”اچھا! پھر وہ کھنکھار کر بولا۔ ”اور ڈاکٹر صاحبہ پر کس بات کا غصہ آتا ہے؟“
 ہاشم چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ رافع نے اس کی آنکھوں میں دھنک سی اترتی دیکھی۔ غالباً ”یہ محبوب
 کے تصور کا کمال تھا۔“

”بولو نا۔ اس پر غصہ کیوں آتا ہے؟“ وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

”بھی اس نے دیکھا ہی نہیں میری طرف اتنے اتنے بے مول جذبے ہیں میرے۔“ وہ سر جھکا کر شکست
 خوردگی سے بولا۔

”محبت کی تو نہیں ہے ہاشم! لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ محبت کبھی بھی قیمت کی محتاج نہیں ہوتی۔ انمول شے کا
 مال کوئی کیسے دے سکتا ہے؟ چاہو، مگر چاہے جانے کی تمنا مت کرو، یہی اصل بنیاد ہے محبت کی۔ جو وام مانگے وہ
 لہا مشق؟“

ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ہاں مگر کوئی تمنا پس و اماں وفا
 مجھ سے پوشیدہ میرے پیش نظر ہوتی ہے

”محبت کرنا الگ بات ہے شادی کر کے گھر بسانا الگ معاملہ ہے۔ ان دونوں کو جوڑتے کیوں ہو؟“

”اوا!“ ہاشم نے چمک کر اسے دیکھا۔ ”میاں ابھی لگی نہیں ہے تمہیں دعا کرو نہ لگے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا
 ال ہو جائے گا۔ محبت کر کے تو انسان خدا کو پانے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ وہ محبت کیا جو وصل نہ مانگے۔“
 ”پھر وہ محبت نہیں ہے۔“ رافع اطمینان سے بولا۔

”بھروسہ کیا ہے؟“

”قرب کی خواہش“

”کسی سے قرب کی خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے؟ کس جذبے کے تحت؟“

”مہمورت کے قرب کی خواہش مرد کے خیر میں گندھی ہے اس لیے۔“

”گویا کسی بھی عورت سے کام چل سکتا ہے؟“

”ہاں۔ شادی کر کے دیکھ لو بھول جاؤ گے سب کچھ۔“

ہاشم چند لمحے اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔

”تم سنجیدہ ہو؟ یہ خیالات واقعی تمہارے ہیں؟“

”آف کورس ہنڈرڈ پرسینٹ۔“

”محبت خواہ کسی سے ہو۔ شادی کسی اور سے کر کے آدمی ہر بات بھول سکتا ہے؟“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ رافع نے کانڈھے اچکائے۔ ”بھلا ان دو باتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟“

ہاشم اسے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں خفگی تھی۔

”ابند کرے رافع! تمہیں بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“

رافع زور سے ہنس دیا۔

”ان تلوں میں تیل نہیں۔“ وہ بولا۔ ”ویسے دعا دینے کا شکریہ!“

”چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”ویسے اطلاعا“ عرض ہے کہ میں نے تمہیں دعا نہیں بد دعا دی ہے۔“

”آئی سی۔“ اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ”میں نے بہر حال تمہیں نیک نیتی سے مشورہ دیا ہے۔“

تم میں ہمت ہے تو دنیا سے بغاوت کرلو

رنن ماں باپ جہاں کہتے ہیں شادی کرلو

”تھینکس!“ وہ منہ بناتے ہوئے باہر نکل گیا۔



نجانے کتنی دیر بعد اسے بھوک نے ستایا تھا۔ اس نے ایک نگاہ سامنے والی سیٹ پر بیٹھے نوجوان پر ڈالی۔ آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ نجانے تھک گیا تھا یا سو گیا تھا۔

بڑے میاں برتھ پر سونے کے لیے جا چکے تھے۔ ان کی بیگم تسبیح کرتے ہوئے اونگھ رہی تھیں۔

ربیعہ نے اپنا لٹچ باکس کھولا۔ نفسہ خالہ نے بڑے اہتمام سے اس کا کھانا تیار کیا تھا۔ تلی ہوئی مچھلی، مشای

کباب، آملٹ اور پرائٹے ساتھ میں ان کا وہی مزیدار چار تھا جو ربیعہ کو ہمیشہ سے پسند تھا۔ ہر ہر شے میں ان کا

محبت مہک رہی تھی۔

ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ لٹچ باکس کھول کر وہ نجانے کس بیٹے ہوئے لمحے میں جا پہنچی تھی۔

”آہم!“ عباد کھنکھار ا۔

وہ چونک اٹھی۔ جلدی جلدی اس نے اپنے سیاہ پلو سے اپنی آنکھوں کو رگڑا اور یوں اپنا کھانا نکالنے لگی جیسے

کوئی بات ہی نہ ہو۔ وہ اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

”بہت بے مہمورت ہیں آپ!“ وہ بے تکلفی سے بولا۔

”جی؟“ اس نے حیران نگاہیں اوپر اٹھائیں۔

”اتنا سارا کھانا باندھ لائی ہیں اور اتنا بھی لحاظ نہیں کہ کسی ہم سفر کو جھوٹے منہ ہی پوچھ لیں۔“

”وہ!“ اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ وہ بری طرح جھینپ گئی۔

”وہ اصل میں نیچھے۔“ اس سے بات نہ بنائی گئی۔

”بھوک بہت لگی ہے۔“ اس نے مسکرا کر اس کا ادھر اور اہلہ مل کر دیا۔

راہیہ ہنس دی۔

”کچھ نا کچھ۔“ اس نے خالی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اچھا نہیں، بہت کچھ لوں گا۔“ اس نے بے تکلفی سے پلیٹ تھام لی۔ ”لیکن ذرا ٹھہریے۔ غالباً“ میری امی جی لہجہ میں کچھ زور اور اہلہ کیا ہے۔“

اس نے اٹھ کر اپنا نقن نکالا۔ اندر مزید ارچائیہ زرا کس اور فرائیڈ چکن تھے۔

”اؤ۔“ عباد بے اختیار بولا۔ ”جیتی رہے ماں میری۔ دیکھا آپ نے ربیعہ! ماؤں کو اپنے بچوں کی پسند ناپسند کا لانا یاں ہوتا ہے؟ غالباً“ آپ کی امی نے بھی ساری چیزیں آپ کی پسند کے مطابق بنائی ہیں۔ ہے نا؟“

راہیہ نے نظراٹھا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھا۔

”میری امی کا انتقال ہو چکا ہے“ وہ ر سائیت سے بولی۔

مہادی جلتی آنکھوں کی جوت یکا یکدھم پڑ گئی۔

”اکی ایم سوری۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں۔“

میرجیہ نے اپنی پلیٹ میں کھانا نکالا پھر دونوں خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

”کھانا بہت مزیدار ہے۔ کس نے پکایا ہے؟“ عباد کو کھانا بے حد پسند آیا۔

”میری خالہ نے“ وہ آہستگی سے بولی۔

”آپ یہ چلول لیں نا۔ اس میں ماں کے ہاتھوں کی خوشبو ہے۔“

راہیہ نے نقن تھام لیا۔

چاول واقعی بے حد لذیذ کپے ہوئے تھے۔ ربیعہ نے اس طرح کے کپے ہوئے چاول پہلی مرتبہ کھائے تھے۔ وہ

اول سے کھاتی تھی۔

”آپ کس کس جا رہی ہیں لاہور؟“ عباد شوشے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”اپنی پھپھو کے گھر۔“ وہ چیزیں سمیٹنے لگی۔

”کہاں ہے آپ کی پھپھو کا گھر؟“

ربیعہ خاموش ہو گئی۔ اس نے ذہن میں لکھا ہوا پتادہرانے کی کوشش کی اور قدرے کامیاب ہوئی۔

”ہاں! پورہ۔“

”ایمما! میرا ایک دوست وہیں رہتا ہے۔“ عباد کو خوشی ہوئی۔

”آپ!“ ربیعہ نے نگاہیں اٹھا کر اس کا رخ غلوں چہرہ دیکھا۔ ”آپ کس کس جا رہے ہیں؟“

”میں بڑھتا ہوں وہاں۔ بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹرز کر رہا ہوں۔ ہاسٹل میں رہتا ہوں۔“

”ایمما!“

”آپ پڑھتی ہیں؟“

”میں نے گریجویٹیشن کیا ہے۔ اب ماسٹرز کا ارادہ ہے۔“

”غالباً یونیورسٹی سے؟“

”شاید۔“ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے مختصراً کہا۔

○ ○ ○

مڈرا نیگم نے ماٹے کا جوس نکال کر مشین کا پگ نکالا اور جوس گلاس میں انڈیلنے لگیں۔

”مہادی جان! ذرا سائمنک اور کالی مرچ ملا دیں۔“ اسٹول پر بیٹا ریزا رسی بیٹھی ایقانے کہا۔

”ہاں ہاں۔ ملائے دیتی ہوں۔“ انہوں نے اسے تسلی دی۔ ”ویسے تمک بہت تھارہی ہو تم۔“ وہ کسلمندی سے بیٹھی رہی۔ عذرا بیگم نے جوس میں اس کے حسب خواہش اشیاء ملا کر گلاس اسے تھما دیا۔ ”مومن آیا نہیں اب تک؟“

”ہیں۔۔۔ شہلا کے بیٹے سے خوب گاڑھی چھتی ہے اس کی۔ پہلے ماؤں میں دوستانہ تھا اب اولاد بھی نقشِ قد پر چل رہی ہے۔“ انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

ایقان کے لبوں پر بھی مسکراہٹ چلی آئی۔ ”یاد ہے بھابی جان! یا تو میں شہلا کے گھر میں ہوتی تھی یا شہلا میاں آمو جوہر ہوتی۔ علیحدہ علیحدہ وقت گزارنا تو تصور تک نہ تھا ہمارے پاس۔“

”ہاں تو کیا بھول گئی ہوں؟ امتحان تم لوگوں کے ہوتے تھے شامت میری آجاتی تھی۔ کبھی کمرے میں کھا مٹکوا جارہا ہے، کبھی چائے کبھی ٹھنڈا، ہاشم اور رافع بھی مل جاتے تھے تم لوگوں کے ساتھ۔“

ایقان ہنس دی۔

”ہاں۔۔۔ ہاشم! وہ پھر قدرے سنجیدہ ہو گئی۔

نگاہوں کے سامنے سے کئی منظر یکے بعد دیگرے گزر گئے تھے۔

”یہ ہاشم کے لیے بھابی جان نے کوئی لڑکی پسند نہیں کی اب تک؟“

”اللہ جانے کہاں بیانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ سنا ہے ماہین اپنی نند کو بھاج بنانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔“ وہ جھوٹے برتن سنک میں جمع کرنے لگیں۔

”چھا! ایقان کچھ سوچنے لگی۔“ ہاشم کیا کہتا ہے؟“

”اس کو کیا کہنا ہے غریب نے۔ جہاں ماں کے گی ہو لے گا“ وہ سادگی سے بولیں۔

”تا بھی غریب نہیں ہے وہ۔“ وہ طنزاً بولی۔

”رے بڑی زور آور ماں ہے اس کی۔ وہیں کرے گی جہاں اس کے جی میں آئے گا۔“ شفیقہ حیات نے ان کا گفتگو سن لی تھی۔ سو وہ بھی وہیں چلی آئیں۔

”میں تو عذرا سے کتنی ہوں! ان کی چھوٹی کو اپنے چھوٹے کے لیے مانگ لو۔ شاید ان کے جی میں بھی نیکی آجائے تو وہ بھی کچھ پیش قدمی کر لیں۔ مجھے تو ہاشم اتنا بھلا لگتا ہے، جی کہنا ہے گھر کا بچہ باہر کیوں جائے۔ آخر گھر کی بچہ لاء بھی تو ہیں۔“

”عزیزہ کو نافع کے لیے؟“ ایقان بولی۔ ”ناٹ آبیڈ آئیڈیا۔“

عذرا بیگم برتن دھو کر ان کی جگہوں پر رکھنے لگیں۔

”بھئی میں تو نافع سے پوچھ کر ہی کوئی قدم اٹھا سکتی ہوں۔ جو ان بچہ ہے۔ آخر اس کی بھی کوئی پسند ناپسند ہوگی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ جو بھی کرو اولاد کی رضامندی سے کرو۔ لیکن عریضہ میں کوئی خرابی تو نہیں جو وہ اللہ

کرے۔ خوبصورت ہے، کم سن ہے، بڑھی لکھی، شائستہ بچی ہے۔ آج کل کے لڑکے تو یہی کچھ دیکھتے ہیں۔ ہم

فردوس بیگم کے گلے شکوے بھی دور ہو جائیں گے۔“

ایقان گھونٹ گھونٹ جوس پی رہی تھی۔

اسی لمحے سدرہ دوڑی آئی۔

”پچھو جان! آپ کے میاں جی کا فون ہے۔“

ایقان کا سستی سے بھرپور رویہ یک لخت تبدیل ہو گیا۔ وہ جوس کا گلاس وہیں رکھ کر فافٹ دوڑ گئی۔

”آئے ہائے بچی! اور اسے بھل کر شفیقہ حیات نے اسے ٹوکا۔“ ”یوں بھاگ رہی ہے جیسے۔“ بقیہ جملہ انہما

نے لبوں میں ہی دبایا۔ ”ہیلو۔۔۔“ اس نے فون کا ریسپور اٹھایا۔ ”السلام وعلیکم“

حالت ایسی تھی کہ ذرا سائیز چلنے سے سانس بے قابو ہو رہا تھا۔
 ”وعلیک السلام۔۔۔ خیریت تو ہے۔۔۔ آخر میاں کو تو نہیں دیکھ لیا؟“ وہ شرارتاً بولا۔
 ”اوفوف۔۔۔“ وہ جھنجھلا ہی تو گئی۔ ”کوئی ڈھنگ کی بات نہ سوچھی آپ کو؟ اتنے دن بعد فون کیا ہے، وہ بھی ایسی
 ہی باتوں کے لیے۔“
 ”سوری مادام! سوری۔“ وہ سعادت مندی سے بولا۔ ”بندہ معذرت خواہ ہے آپ کا تصور گڑبڑانے پر۔ خیر! تو
 بناؤ بچے کیسے ہیں؟“
 ”اچھے ہیں۔“ وہ نروٹھے پن سے بولی۔
 ”بچوں کی اماں؟“
 ”بہت اچھی ہے“ اس نے مسکراہٹ دیائی۔
 ”جی۔ یہ تو ہمارے دل کی بات کہہ دی آپ نے۔“ وہ بھی ہنس دیا۔ ”یہ تو ہم روز خواب میں دیکھتے ہیں۔“
 ”کیا خبر؟“ وہ بے نیازی سے فون کے تار سے کھیلنے لگی۔ ”خوابوں کو کون چیک کر سکتا ہے کہ وہ جو جی میں
 آئے۔“
 ”پھر تو وہ تمہاری کوئی ہم شکل ہے جو خوابوں میں آتی ہے۔ تم ہوتیں تو کیا تمہیں خبر نہ ہوتی۔“
 ”آپ کا کام تو ہم شکل سے بھی بن رہا ہے۔ آپ کو کسی کی کیا پروا۔“ وہ چڑ گئی۔
 ”نہیں اب ایسا بھی نہیں۔ کام بن نہیں رہا بس چل رہا ہے۔“ وہ شرارتاً بولا۔
 ”چلاتے رہیے۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔ ”ویسے روز خوابوں میں اگر مجھے دیکھتے تو کم از کم میرے حال کی خبر تو
 دتی۔“
 ”اوہو۔۔۔ بھی کیا ہوا حال کو؟ خیر تو ہے؟“ وہ تشویش سے بولا۔ ”آواز سے بھی مر جھائی مر جھائی لگ رہی ہو۔ بخار
 نہ کیا؟“
 ”اوں ہوں۔“
 ”پھر کیا ہوا ہے؟“ وہ فکر مند ہوا۔
 اسے ہنسی آگئی۔
 ”ابھی تو خیر کچھ نہیں ہوا۔“ وہ معنی خیزی سے بولی۔ اس کے ادھورے جملے میں بہت کچھ تھا۔
 وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اچھل پڑا۔
 ”ریکی ایقان! آریو شیور؟“ اس کی آواز میں خوشی تھی۔
 ”ہیں۔“
 ”گڈ نیوز جانو۔۔۔! میرا جی چاہ رہا ہے اڑ کر پہنچ جاؤں تم تک۔“
 ایقان خاموش ہو گئی۔ اس کا دل یکایک ہی افسردگی سے بھر گیا۔
 ”میرا تو نجانے کب سے یہی جی چاہ رہا ہے عاشق! لیکن محض جی کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“ اس نے سوچا
 تھا۔
 ”ہیلو۔ ہیلو۔“ دوسری جانب سے وہ پکارنے لگا۔ ”اور سب لوگ کیسے ہیں؟“
 ”سب ٹھیک ہیں، خیریت سے ہیں۔“ وہ بولی۔
 ”بچے یاد کرتے ہیں مجھے؟“
 ایقان چپ رہی۔ بچے اس کے بنارہنے کے عادی تھے پھر بھی وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر بولی۔
 ”ہاں۔ بہت یاد کرتے ہیں۔“
 ”اور تم؟“ وہ محض ہنس دی۔

اسی لمحے لائن ڈیس کنکٹ ہو گئی تھی۔ ایقان نے گہری سانس بھر کر ریسیور رکھ دیا۔ اس کی طبیعت پر پھر وہی سستی غالب آ رہی تھی۔



آنکھوں پر سے سن گلا سزا تار کراس نے مثلاً شی نگاہوں سے اسے کھوجا۔ پھر وہ اسے دکھائی دے گیا۔ گراؤنڈ میں کھیلے ہوئے بہت سے بچوں میں وہ اسے دور سے ہی نظر آ گیا تھا۔ وہ سب بچوں جیسا تھا۔ اسی کا ہم عمر انہی کی طرح اسکول ڈریس میں ملبوس۔ لیکن شہلا کو وہ سب میں منفرد لگا۔

”عمر۔“ اس نے آواز دی۔

عمر نے مڑ کر دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑی بال پھینک کر دوڑا چلا آیا۔

”مما۔“ وہ اس سے لپٹ گیا۔

”مائی ڈارلنگ!“ اس نے جھک کر اس کا گل چوما۔ ”ہاؤ آ رہو؟“

”فائن ممما۔“ اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ ”آپ مجھے لینے آئی ہیں؟“

”ہیں۔ آف کورس۔“

”میں اپنا بیگ اور بیچ پاس لاتا ہوں۔“ وہ اندر کی جانب دوڑ گیا۔

چند لمحوں بعد وہ گاڑی میں بیٹھے گھر کی جانب رواں دواں تھے۔

”آج جین والا نہیں آیا ممما؟“ اس نے سوال کیا۔

”میں نے اسے منع کر دیا تھا۔“ اس نے مسکرا کر بیٹے کو دیکھا۔ ”آج میرا موڈ تھا اپنے بیٹے کو پک کرنے کا۔“

”آج آپ کا ہاف ڈے تھا ممما؟“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔

”میرے سب فرینڈز آپ کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سب آپ کو لائک کرتے ہیں۔“

”اچھا!“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ ”کوئی خاص وجہ؟“

”سب کہتے ہیں تمہاری ممما بہت پیاری ہیں۔ بیوٹی فل ہیں۔“

”وہ اترا لی۔“ خیر یہ تو ہے۔“

”لیکن۔“ وہ کچھ الجھا۔ ”ایک برا بلم ہے ممما!“

”وہ کیا؟“ اس نے سڑک پر سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا۔

”ان سب کے پاس بیبا بھی ہیں۔ میرے پاس صرف ممما ہیں۔“

شہلا نے گہری سانس بھر کر اپنا ادھیان ٹریفک کی جانب مرکوز کیا اس نے عمر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔ وہ

کن اکھیوں سے ماں کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”مما!“ اس نے کچھ دیر بعد پکارا۔

”ہوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”میرے کوئی بیبا بھی تھے؟“

حذر۔ اتحقانہ سوال پر اسے بے طرح ہنسی آئی۔

”نہیں تو۔ آپ تو کمیت میں آگے ہوئے تھے۔ میں تو ڈلائی۔“ ہنسی پر بمشکل قابو پا کر اس نے کہا۔

عمر نے برا سامنے بنا کر اسے دیکھا۔

”وہاٹ اے اسٹوڈ انسر ممما!“ وہ خفگی سے بولا۔

”بی بیو پور سلٹ ممما!“ شہلا نے سنجیدہ ہو کر اسے تنبیہ کی۔

”نسوری۔“ لیکن آپ مجھے کچھ بتاتی کیوں نہیں ہیں؟“ وہ زنج ہوا۔

”کیا بتاؤں۔“ وہ چڑ گئی۔ ”آپ دنیا کے واحد بچے نہیں ہو، جس کے پاس صرف ممما ہیں۔ دنیا میں ہزاروں بچے

ایسے بھی ہیں جن کے پاس ممایا بھادونوں نہیں ہیں۔ وہ بھی توجی رہے ہیں یا؟ آپ کے پاس تو نانو ہیں، خالہ جالی، ان، ماموں ہیں، ان بچوں کے پاس ان کا اپنا ایک رشتہ بھی نہیں ہے۔ وہ یتیم خانوں میں رہتے ہیں جہاں انہیں صرف دو وقت کی روٹی ملتی ہے اور بہت سا کام کرنا پڑتا ہے۔ نو اسکولنگ، نو گیمز، نو بھی نہیں۔ کیا وہ بچے نہیں ہیں؟ انہیں بھی تو اللہ میاں نے پیدا کیا ہے نا؟ اسی اللہ نے جس نے آپ کو اتنے رشتے دیے ہیں، اتنا پیار دیا ہے، اتنی سہولتیں دی ہیں، اتنا عیش و آرام دیا ہے۔ لیکن عمر! ایک بات بتاؤں آپ کو۔ اللہ تعالیٰ سے شکایت کرنے کا حق ان بچوں کو بھی نہیں ہے۔ تو پھر آپ کن خیالوں میں رہتے ہو؟

اللہ تعالیٰ نے جس کو جس جگہ پیدا کیا ہے وہاں اسے صبر و شکر کے ساتھ رہنا ہے۔ آپ کے اسکول میں بھی بات سے بچے ایسے ہوں گے جن کے پاس صرف ماما ہوں گی یا صرف بھابھوں گے یا ماما بھادونوں نہیں ہوں گے۔ لہذا یاد رکھیں بچے نہیں جیتے؟ خوش نہیں ہوتے؟ کسی محرومی کو روگ بنالینا درست نہیں ہے بیٹا! آپ سمجھ رہے ہیں، میں ایسا کہہ رہی ہوں؟

وہاں ہر دیکھنے لگا۔ شہلا نے بھی گہری سانس بھر کر اسپید بڑھادی۔
”ماما! وہ کچھ دیر بعد بولا۔“

”ہوں۔“

”جن بچوں کے پاس ممایا بھانا ہوں، وہ تو اللہ تعالیٰ کے پاس چلے جاتے ہیں نا۔“
شہلا خاموش رہی۔ وہ سوال کے غیر معمولی پن کو محسوس نہ کی تھی۔
”بولیں نا ماما!“

”ہاں۔۔۔ پھر؟“ اس نے مجبوراً کہا۔

”جن کے ماما بھادیا میں ہوں وہ تو بچوں سے الگ نہیں رہتے نا؟“
شہلا نے نچلا لب و انتوں سے دیا لیا۔

”پھر میرے بھابھ الگ کیوں رہتے ہیں؟“

شہلا کا چہرہ دھک اٹھا تھا۔ اس نے سن گلاس اتار کر ڈیش بورڈ پر پھینکے۔ عمر سہم کر رہ گیا۔ شہلا نے غصے سے دیکھا۔

”تمہارے بھابھ اس لیے الگ رہتے ہیں عمر! کہ انہوں نے تمہاری ماما کو طلاق دے دی ہے، ڈائی ورس۔ ڈیو ایڈر اسٹینڈ؟ اب وہ کبھی تمہاری ماما کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ تمہارے بھابھ ضرور ہیں مگر میرے لیے ایک اجنبی ہیں۔ اگر تم اتنے ہی بڑے ہو گئے ہو تو سن لو کان کھول کر۔ اور آئندہ مجھ سے یہ فضول سوالات نہ کرنا، کبھی نہیں۔“

اس نے ماں کا شرارے برساتا یہ روپ پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ خوف زدہ ہو کر اس نے محض اثبات میں سر ہلادیا۔
گلازی رزک پر فرائے بھر رہی تھی۔



”ہائے اللہ۔“ عریشہ نے ناعملہ کو ٹھوکا دے کر متوجہ کیا۔
ناعملہ نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ پیر میں سینڈل پہن کر دیکھ رہی تھی۔ عریشہ کے ٹھوکے کو اس نے بے حد ناپسند کیا۔

”کیا ہے تمہیں؟ میری پسلیاں چھید رہی ہو مسلسل۔“
یلز مین مسکرانے لگا۔ عریشہ شرمندہ ہو کر خاموش ہو گئی۔ دکان کے گلاس ڈور کے باہر کھڑے وہ تینوں صاف نظر آرہے تھے۔ پیٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بڑی بے فکری اور فراغت سے کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔
ناعملہ اور ثانیہ کی پوری توجہ دکان میں سچی سینڈلوں کی جانب تھی۔ یوں بھی مارکیٹ میں پہنچ جانے کے بعد ان

کے نقشہ حواس کام کرنا چھوڑ دیتے تھے صرف بھاؤ تاؤ والی حس پھرتی رہ جاتی تھی۔
 ”کیسی ہے؟“ ناعمہ سفید سینڈل کے متعلق ان دونوں کی رائے جاننا چاہتی تھی۔ ”لے لوں؟“
 ”اپنا پیر دیکھو۔“ ثانیہ نے سرگوشی کی۔ ”نی کالا سیاہ کالا لگ رہا ہے سفید چپل میں۔ یوں لگے گا جیسے تم نے کسی
 اور کے پیر لگائے ہوئے ہیں۔“
 ناعمہ نے بھنا کر اسے دیکھا۔

”اور کالے پیر دیکھ کر دیکھنے والے کا دھیان تمہاری طرف ہی جائے گا کہ ہونہ ہو یہ ثانیہ کے پیر ہیں۔“ وہ ترکی
 بڑکی بولی۔

”بے لاگ تبصرہ تھا۔ اب بھی تم سینڈل خریدنا چاہتی ہو تو ضرور خریدو۔“ اس نے کاندھے اچکائے۔
 ”تم پتھر عریشہ!“ اس نے دکان سے باہر دیکھتی عریشہ کو دیکھا۔
 ”آلہ سی۔ ہٹا۔“ وہ چونکی۔ ”صحیح ہے۔“

”کیا صحیح ہے؟“ وہ چڑائی۔ تم دونوں کے ساتھ آکر بہت بڑی حماقت کی ہے میں نے۔ اچھا بھلا ورہ آپ کی
 ساتھ لے گئی تھی۔ کوئی ڈھنگ کا مشورہ ہی نہیں دیتیں۔“

”مفت تم نے کی ہے نا ابھی اس کا بنگلہ خان دیکھ لوگی۔“ عریشہ نے دانت پیٹتے ہوئے کہا۔
 ناعمہ کو غیر معمولی پن کا احساس ہوا تو اس نے بھی دکان سے باہر دیکھا۔
 ”ہائے اللہ!“ اس کا رد عمل بھی ہو، سو ہی تھا۔
 ”سمجھ میں آئی۔“

ناعمہ نے سینڈل اتار کر پرے کر دی۔

”دے دوں آئی؟“ سیلزمین نے پوچھا۔

”آئی؟“ اس نے چیخ ماری۔

عریشہ اور ثانیہ کی ہنسی نکل گئی۔

”نہیں چاہیے“ وہ جھٹاکر کھڑی ہوئی۔ ”چلو لڑکیو۔“

”لے لیں باجی!“ سیلزمین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”سیل میں مل رہی ہے۔“

”مفت تو نہیں مل رہی نا“ وہ تنگ کر بولی۔

”چلو اب لے لو۔“ عریشہ نے کہا۔ ”یہ کم بخت تو دفعان ہوں جب تک۔“ اس نے اس کے کان میں سرگوشی
 کی۔ ناعمہ کا غصہ بھی فرو ہو گیا۔

”آل۔ ہاں ٹھیک ہے۔ دے دو۔ ہم اور سینڈل پسند کر لیں۔“ اس نے سیلزمین سے کہا۔

”ضرور کریں باجی!“ اس نے سعادت مندی سے ”باجی“ پر زور دیا۔

وہ تینوں شوگیس کے پاس شملنے لگیں۔

”یہ کیا مصیبت گلے بڑگئی۔ بیٹھے بٹھائے“ ناعمہ نے سرگوشی کی۔

”تمہارا اچھوتا آنیڈیا تھا۔“ ثانیہ نے جل کر کہا۔

”یہ کھڑے کیوں ہیں؟“ وہ پریشان تھی۔

”تم کہو تو بیٹھ بھی جائیں گے۔“ عریشہ نے اسے گھورا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ ثانیہ منمنائی۔

”کابے کا ڈر؟“ ناعمہ کے خون نے جوش مارا۔ ”میں ابھی ایک چمڑے کا جوتا خرید لیتی ہوں۔“ وہ دونوں ہنس

پڑیں۔

آج وہ تینوں بڑے شاندار موڈ کے ساتھ شاپنگ کا پروگرام بنا کر گھر سے نکلی تھیں۔ رستے میں ان تینوں میں

”میرنی، ناعمہ کا ارادہ بس میں سوار ہونے کا تھا کہ وہ ٹیکسی کا کرایہ بچانا چاہتی تھی جبکہ ثانیہ اور عریشہ بھند
ہیں کہ ٹیکسی میں جایا جائے۔“

”اری کم بختو۔ اتنے کرائے میں دو بینڈلں آجائیں گی۔“ اس نے انہیں سمجھایا۔
”اس کے اسٹاپ تک وہی سینڈلں گھسنی بھی پڑیں گی۔“ تھکن ہوگی وہ الگ ”عریشہ اڑ گئی تھی۔ ایسے میں سڑک
لہ انارے کھڑی ہنڈا سوک کو دیکھ کر نجانے ناعمہ کو اچانک کیا ہوا تھا۔

”میں بھائی۔۔۔ گلف تک چھوڑ دیں گے؟“ اس نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔
”وہ کچھ دیر بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔
”آف کورس! تشریف رکھیے۔“

عریشہ اور ثانیہ ہکا بکا تھیں اور وہ دروازہ کھول کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔ ”مجبوراً“ وہ دونوں بھی گاڑی میں
س گئیں۔

”یہ کیا جہالت ہے؟“ ثانیہ بڑبڑائی۔

”خاموش رہو۔۔۔ لفٹ ہی لی ہے نا۔“

”یہ تو دیکھ لیا تو جوتے پڑیں گے۔“ عریشہ کو تین عدد جوان بھائیوں کا خوف تھا۔

”اولی نہیں جھانکتا چلتی گاڑی میں۔“ وہ مطمئن تھی۔ ”دوپٹے آگے کرلو۔“

”راجو یہ لفٹ گا کہیں اور لے گیا تو؟“ عریشہ بھنائی۔

”اھمہ نے اسے کئی بار۔“

”ٹی۔۔۔ بری بات ہے۔ بے چارہ اکیلا ہے، ہم تین ہیں۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”اہ را“ وہ دونوں چپکی ہو رہیں۔

”ہائیل اس نوجوان نے گاڑی ایک جگہ روکی تھی۔ وہاں انتظار کرتے دو لڑکے فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئے۔ ان
ہاں لی سانس گلے میں انک گئی تھی۔“

”لوں جیران ہو کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور مسلسل مسکرا رہا تھا۔“

”ان کی تعریف؟“ آگے سے سرگوشی آئی۔

”لرنا مت۔۔۔ پٹ جاؤ گے۔ وہ تین ہیں، ہم اکیلے ہیں۔“ مطمئن انداز میں جواب دیا گیا۔ لڑکیاں تملکا کر رہ

ہیں۔

”بھیری قسمت کو کس نے جگادیا ہے؟“ پھر ایک سوال ہوا۔

”ارے ہمارے ایسے نصیب کہاں۔“ ٹھنڈی آہ بھری گئی۔ ”یہ تو بھیا کی سوک کا کمال ہے۔“

”سینے!“ ناعمہ پھر کر بولی۔ ”بس روک دیں یہیں۔ ہمیں یہیں اترنا ہے۔“

”مسل تو کچھ اور طے ہوئی تھی؟“

”راج ہوئی۔ ثانیہ اور عریشہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔“

”میں نے کہا نا ہمیں یہیں اترنا ہے۔ گاڑی روکیں۔“

”یہ آئوٹنک گاڑی ہے محترمہ! سیٹلائٹ سے کنٹرول ہوتی ہے۔ میں منزل کی نشاندہی کرچکا ہوں۔ معاملہ

نارواں تک جا پونجا ہے۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔“

”اگل سیٹ سے ایک دیادیا قہقہہ بلند ہوا۔ لڑکیاں حواس باختہ ہو گئیں۔“

”دیکھیے، ہم دروازہ کھول کر کود جائیں گے۔“ عریشہ نے ہمت کر کے کہا۔ ”آپ ہمیں غلط سمجھ رہے ہیں۔“

لہنا گئی آواز کے ساتھ دروازے لاک ہوئے۔

”آپ بندے کو غلط سمجھ رہی ہیں جناب! آرام سے تشریف رکھیے۔ انشاء اللہ بحفاظت منزل پر پہنچیں گی۔“

”طرار ہوا تھا۔“

دروازے لاک ہوتے دیکھ کر ان کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر گری جارا تھیں۔ گاڑی کن رستوں پر دوڑ رہی تھی انہیں خبر نہ تھی۔
جب گاڑی واقعی گلف مارکیٹ کے سامنے جا رہی اور آٹومٹک لاک سے دروازے کھلے تو تینوں کو ہوش آیا
بڑی تیزی سے وہ دروازے کھول کر نیچے اتریں۔
اپنے اپنے پرس سنبھال کر وہ بنا کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئیں تب ہی پیچھے سے پکارا گیا۔
”اچی سینے!“

فوری رد عمل کے نتیجے میں تینوں نے ہی مڑ کر دیکھا۔
”لفٹ لینے کا شکریہ۔“ وہ تینوں وانت نکال رہے تھے۔
اوسان حال ہو چکے تھے اس لیے انہیں ہسی آگئی۔ بنا جواب دیے وہ آگے بڑھ گئیں۔ لیکن اب شاپنگ کے
دوران انہیں اپنا پیچھا کرتے دیکھ کر وہ نئے سرے سے پریشان ہو گئیں۔
”اب اگر ان مردودوں نے کوئی بد تمیزی کی تو بھری مارکیٹ میں بے عزتی کر دوں گی۔“ ناعمہ بڑبڑائی۔ ”ناعمہ
علی خان نام ہے میرا۔“



اسے بیٹھے بیٹھے کب نیند آگئی تھی اسے خبر نہ تھی۔
اس کی آنکھ انجن کی چٹھاڑ سے کھلی تھی۔ گاڑی کسی اسٹیشن پر رک کر اب دوبارہ آگے بڑھی۔ ربیعہ کو حواس
بحال کرنے میں کچھ دیر لگی۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس کے رہے سے اوسان بھی خطا ہونے لگے۔ اس کے علاوہ کمپارٹمنٹ میں دو نمایاں
خطرناک قسم کے آدمی موجود تھے اور ان تینوں کے علاوہ کمپارٹمنٹ میں کوئی نہ تھا۔ بڑی بڑی مونچھوں اور کاندھوں
تک لمبے بال لیے وہ دونوں آدمی اپنی سرخ آنکھوں سے اسے ہی گھور رہے تھے۔ ربیعہ کا دل اس کے حلق میں آن
نکا۔ ماتھے پر لہجہ بھر میں ہیند چپکنے لگا۔

اسے وہ پر خلوص نوجوان یاد آیا، جس کی موجودگی اس کے لیے نجانے کیوں باعث تسکین تھی۔ دو بوڑھے
میاں بیوی بھی اس کے ہم سفر تھے، جواب کمپارٹمنٹ میں نہ تھے۔
وہ جانے لگتی دیر سوئی تھی۔ رستے میں کون کون سے اسٹیشن آکر گزر گئے تھے، اسے خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ کلا
سے ہم سفر کا ساتھ کہاں چھوٹا تھا اسے علم نہ تھا۔

اور اب جو دو اشخاص سامنے موجود تھے، ان کی نظریں اسے چھیدے ڈال رہی تھیں۔ اس نے اپنی سیاہ چادر کا
پلوڈر سا آگے کھینچ کر چہرہ چھپانے کی کوشش کی تھی۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ربیعہ سخت پریشان ہو گئی لیکن وہ پوری کوشش
کر رہی تھی کہ اس کی پریشانی اس کے کسی انداز سے عیاں نہ ہو۔ اسے یاد آیا۔ اس کے ہینڈ بیگ میں ایک رسالہ
تھا جو اس نے سفر کے دوران وقت گزاری کے خیال سے سمیعہ سے لے کر بیگ میں رکھ لیا۔

کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کو اس نے چادر کے اندر رگڑ کر ان کی کپکپاہٹ کم کرنے کی کوشش کی، پھر ہاتھ چادر سے
نکال کر بیگ کی زپ کھولنے لگی۔

اس کی نگاہ اٹھی تو اسے احساس ہوا، وہ اس کے ہاتھوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ربیعہ نے اپنے ہاتھ دیکھے۔
سیاہ چادر کے اندر سے سفید کنول جیسے ہاتھ یوں نکلے ہوئے تھے۔ جیسے کھنی رات میں بادلوں میں سے چاند نکل
آئے۔ اس نے فٹافٹ رسالہ نکالا اور ہاتھ دوبارہ چادر میں لپیٹ لیے۔ اس کا جی چاہا ہاتھ اپنا چہرہ بھی چادر میں
چھپالے لیکن اب ایسا کرنا حماقت کے زمرے میں آتا۔

رسالہ کھول کر اس نے کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ اسے الفاظ دکھائی نہ دیے۔ اس کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔
”میں اس قدر خوفزدہ کیوں ہو رہی ہوں؟“ اس نے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

”یہ صرف مجھے دیکھ ہی سکتے ہیں نا۔ نگاہوں سے کوئی کسی کو نقصان تو نہیں پہنچا سکتا۔“
 شاید اس کپار رمنٹ کی تنہائی اور باہر پھیلی سیاہی سے مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی بات نہیں میں کسی جنگل میں
 نہیں ہوں نا۔“

اس نے اپنے آپ کو ڈھیروں تسلیاں دے ڈالیں۔
 ”کہاں جاؤ گی؟“ ”ایک ان میں سے ایک آدمی اپنی بھاری آواز اور کرخت لب و لہجے میں اس سے مخاطب
 ہوا۔“

ربیعہ نے بد مرگی سے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ اسے انداز مخاطب حد درجہ برا محسوس ہوا تھا۔ ”جی؟ مجھ سے کچھ
 کہا آپ نے؟“
 اسے خود پر حیرت ہوئی۔ خوف کے اس عالم میں بھی وہ اتنے اعتماد سے گفتگو کر سکتی تھی اسے اس سے پیشتر
 انداز نہ تھا۔

”پوچھا ہے کہاں جاؤ گی؟“ اس شخص پر ربیعہ کے رویے کا مطلق اثر نہ ہوا۔
 ربیعہ نے اسے کوئی سخت جواب دینا چاہا پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدل لیا۔
 ”اااااا“ وہ مختصر ”بولی۔“

”لوں نے اس کا جواب سن کر نجانے کیوں ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔“
 ”ایلی ہو؟“ گلا سوال سن کر وہ لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا گئی۔
 رسالہ اس کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر پڑا۔ ربیعہ نے یوں ظاہر کیا جیسے اس نے وہ سوال سنا ہی نہ ہو۔ وہ جبکہ
 رسالہ اٹھانے لگی۔

”ایلی ہو؟“ سوال پھر دہرایا گیا۔

ربیعہ کا جسم اس سوال پر سن ہونے لگا۔

”جی نہیں میں ہوں ان کے ساتھ“ برتھ سے عباد نے سر نکالا۔

ان دونوں نے حیرانی سے اور دیکھا اور ان کے چہرے اتر گئے۔ وہ برتھ سے نیچے اتر آیا۔

”بقیہ اٹرو پو آپ ڈائریکٹ مجھ سے کر لیں۔“ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ قدرے ترش لہجے میں بولا۔

ربیعہ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو بھر آئے۔ اسے دنیا صاف نظر آنے لگی تھی۔

ان دونوں آدمیوں کو سانپ سو گتھ گیا تھا۔ ان کے چلے انہیں اجڑا اور دیہاتی ظاہر کرتے تھے۔ عباد کے امیرانہ
 انداز نے انہیں مرعوب کر ڈالا۔

”کچھ نہیں سامیں! ہم تو یونہی بی بی کو اکیلا جان کر مدد کے خیال سے کچھ باتیں پوچھ رہے تھے۔“ ایک نے
 عذرت خواہانہ انداز اپنایا۔

عباد انہیں گھورتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھا۔

”تھینک یو۔“ اس نے منمننا کر کہا۔

اس سے زیادہ کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ تھا بھی نہیں۔

”ویل کم۔“ رسالہ سیدھا کر لیں اس نے سرگوشی کی۔

ربیعہ نے ہڑبڑا کر رسالہ سیدھا کیا تھا۔

”مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔“ اس نے دہائی دی۔

”کچھ ہو گا تو نظر آئے گا۔“ ستمزے سے بولا۔ ”اپنا رول نمبر انہی کو نظر آتا ہے جن کا رول نمبر چھپتا ہے۔“

”خدا کے لیے حمزہ! بری باتیں مت کرو۔“ ”ورہ روہا سی ہو گئی۔“ ”میں نے دن رات ایک کر دیے تھے
 میں لیل تو نہیں ہو سکتی۔“

”صدقے جاواں ان ہی خوش گمانیوں میں کوئی چیز تو کھلاؤ۔“ علی نے دانت نکالے۔ ”جب اتنا ہی یقین ہے تو پہلے منہ میٹھا ہو جائے۔“

”تم دیکھو نا علی! پلیز“ وردہ نے اخبار اسے تھمانے کی کوشش کی۔

”وردہ آپ! میری قریب کی نظر کمزور ہے۔ میں بے وجہ ہی کہہ دوں گا کہ آپ پاس ہیں۔ بعد میں آپ کا دل ٹوٹے گا۔“

”فٹے منہ!“ ناعمہ نے بھنا کر اخبار چھینا۔ ”تم دونوں تو وہی بد شگونے! اچھی بات منہ پہ آہی نہیں سکتی۔“

”حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے۔“ اس نے تدریس سے سر ہلایا۔

”کہ گھبراہٹ نہیں کرتے کبھی چند ایک پسلیوں سے۔“ حمزہ نے ٹکڑا لگایا۔

ناعمہ اخبار پر جھکی ہوئی تھی۔

”لاؤ ناعمہ! میں دیکھتا ہوں۔“ رافع کے نرم لہجے پر اس نے سر اٹھایا۔

”رافع بھائی! وہ خوش ہو گئی۔“ آپ دیکھیں نا۔ یہ وردہ آپ کی تو حواس مختل ہو جاتے ہیں رزلٹ کا سن کر

اوپر سے یہ دونوں بد تمیز انہیں اور تنگ کر رہے ہیں۔“

”لیجئے! پورے شہر میں خوار ہو کر تو اخبار لانے ہیں۔ اس کا یہ صلہ ہے۔“ علی نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ ”فٹے

منہ بد تمیز بد شگونے“ علی! اٹ از بولی نوڈ۔“ حمزہ نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔

”میری ڈائری بڑی آپ نوڈ ہے چھوٹے بھائی! بوڈ نوڈ وری۔“ اس نے سر ہلایا۔

”مبارک ہو!“ رافع نے رول نمبر ڈھونڈ کر اس کے گرد آئہ کھینچا۔ ”فرسٹ ڈویژن ویل ڈن وردہ!“

”ہرے ہرے۔“ ناعمہ کے ساتھ وہ دونوں بھی تالیاں پیٹنے لگے۔

”دیکھا وردہ آپ! بری بری باتوں کے بعد اچھی چیز اور بھی قیمتی لگتی ہے۔ محسوس کیا آپ نے؟“ وردہ نے حمزہ

کے سر پر چیت لگائی۔ وہ بے حد خوش تھی۔

”جتنے والوں کا منہ کالا۔“ ناعمہ نے منہ چڑایا۔

”ارے جلتے ہیں ہمارے دشمن۔ لاؤ مٹھائی کھلاؤ۔“ علی نے آستین چڑھائیں۔ وردہ دوڑی دوڑی گئی اور

کمرے سے کیک کا ڈبہ اٹھا کر لے آئی۔

”میں نے منگو کر رکھا تھا۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”اور جو سہلی آجاتی تو؟ اس کی کریم سے آنسو پونچھتیں آپ؟“

”بس نا! بار بار سہلی کا ذکر۔“ آپ کی بارودہ چڑ گئی۔ سب ہی ہنس دیے۔

رابعہ بیگم بھی بچن سے نکل آئی تھیں۔ انہوں نے بیٹی کا سر جو م کر مبارک باد دی۔ ناعمہ رائے کو فون کرنے

بھاگ کھڑی ہوئی۔

کچھ ہی دیر میں پورے ”حیات ولا“ میں اطلاع پھیل چکی تھی۔ وردہ کو مبارک باد دینے کے لیے سبھی چلے

آئے تھے۔ حقیقہ حیات نے اسے بہت خوبصورت جوڑا دیا تھا۔ عذرا بیگم اور فردوس بیگم نے پانچ پانچ سو روپے

دیے۔ یاشم نے نازک سی رسدواچ دی۔

”رافع بھائی! عجیب ڈھیلی کریں۔“ علی نے سرگوشی کی تھی۔

”ارے۔ کئی ہوئی چیز کیسے ڈھیلی ہو۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”کل صدر میں کٹ گئی تھی۔“

”کتنی تو وہ ہے جو اڑ رہی ہو۔ ہلکے پن سے اڑ رہی تھی کیا؟“

سب کو ہنسی آگئی تھی۔

”چلو بھئی وردہ۔ تمہارا گفت ادھار رہا۔“ رافع کو اعلان کرنا پڑا۔

”ادھار؟ یہ تو کسی قسم کی قینچی کا نام ہے یا ر؟“ حمزہ نے کان کھجایا۔

”بد معاشو! نمٹوں گا تم سے۔“ رافع مسکرایا۔

لاروق حسن نے چائے کا کپ سامنے رکھتی عریضہ کو ایک نگاہ دیکھا۔
 ارک پریل کپڑوں میں اس کی گلابی رنگت چمک رہی تھی۔ غلابی آنکھوں میں اب تک نیند کا خمار تھا۔ باپ کو
 ”یہ کروہ اب اپنے لیے کپ میں چائے ڈال رہی تھی۔“
 ”یہ نرسٹی کب سے جاؤ گی؟“ انہوں نے کچھ دیر سوچتے ہوئے پوچھا۔
 ”بس بابا! اگلے ماہ سے کلاسز اشارت ہیں۔ پھر مصروفیت ہی مصروفیت“
 ”ہوں!“ انہوں نے ہنکارا بھرا۔ ”یہ اپنی ناعامہ بھی تو تمہارے ساتھ ہے؟“
 ”ہی ہاں!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مانیہ اور ناعامہ میرے ساتھ ہیں ان کے اور میرے سبجیکٹس
 ایک جیسے ہیں۔“

انہیں بتانے کے بعد وہ اپنا کپ لے کر اندر چلی گئی تھی۔ اور تب ہی یکن سے فردوس بیگم برآمد ہوئیں۔
 ”اری اش اللہ!“ یہ ان کا مخصوص تھکن کا اظہار تھا۔
 وہ ان کے قریب آئیں۔

”ارے بھی کسی اچھے ڈاکٹر کا پتا کرو یہ جوڑ تو بالکل ہی بے کار ہوئے جاتے ہیں کم بخت۔“ وہ اپنا کان دھاہا بنے

لاروق حسن نے چشمے کی اوٹ سے انہیں دیکھا۔

”اُم سے کوئی چیک اپ کروالے تمہارا۔ شام کو فارغ ہی ہوتا ہے۔“
 ”انہیں عشق و عاشقی سے فرصت ملے تو ماں کو پوچھیں۔“ وہ منہ ہی منہ میں بد بدائیں۔

لاروق حسن نے ان کی بڑبڑاہٹ پر توجہ نہ دی۔

”آپ کے ہونہار برادر کہاں غائب ہو گئے ہیں؟ آفس جانے کا سن کر ان کی سٹی گم ہو گئی کیا؟“ انہوں نے
 ماں کے متعلق استفسار کیا۔

”ارے اسے چھوڑ دو اس کے حال پر وہ نہیں سدھرنے کا۔ جنے کہاں غائب ہے اس دن سے اب کسی وقت
 کہاں کا ساحلیہ لیے کھڑا ہو گا میرے سر پر۔“ انہوں نے جل کر کہا۔

”انہیں اس حال تک پہنچانے کا ریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے فردوس بیگم!“ انہوں نے اخبار تہہ کیا۔ ”ایک
 ماہ تھا اب آپ ان کے خلاف ایک لفظ کہنے والے کی گردن پکڑ لیتی تھیں۔ آج ان کے ذکر پر آپ کی اپنی گردن
 کھال ہے وقت کسی کو معاف نہیں کرتا۔“

”ماں! اُم میرے قصور معاف کر دو۔“ انہوں نے تنک کر ہاتھ جوڑے۔ ”تمہارے قریب آ بیٹھنا تو ایسا ہے
 چہ نہ قریب میں جالیٹے اور منکر نکیر سہانے کھڑے ہوں۔ بس ہر وقت (وقت) ہمارا اعمال نامہ ہی تمہارے ہاتھ
 میں ہوتا ہے۔“

لاروق حسن کے لبوں پر وہی مسکراہٹ آگئی۔

”آپ کو کبھی احساس نہیں ہوتا کہ اپنے بھائی کے اس رگا میں آپ کس قدر حصہ دار ہیں؟ ایک اچھے بھلے فرد
 ہر طرف داریوں اور لاڈیاری سے آپ نے ناکارہ بنا دیا۔ اب نہ وہ معاشرے کو قبول کرنے پر تیار ہے اور نہ
 معاشرے سے آپ کا دل نہیں دھکتا؟“

”میرا ہی قصور نظر آتا ہے تمہیں وہ وقت بھول گئے جب میرا غریب بھائی چکوں پہ کھوں روتا تھا۔ سدھرنے
 ل میں کھا تھا۔ ہاتھ جوڑتا پھرتا تھا ایک ایک کے سامنے۔ تب تمہارا جی دکھا تھا یا تمہاری ماں اور بن کو
 اس کا اظہار؟“

فاروق حسن نے ان کے بڑے تیور در تک ملاحظہ کیے۔
 ”یہ تو ریلوں کے معاملات ہیں فردوس بیگم! اس میں کیسی زور زبردستی۔ بھیک میں کوئی کسی کو اپنا آپ تو دے دیتا۔ میری بہن کی جگہ آپ ذرا اپنی بیٹی کو رکھ کر سوچیں۔ ایسا کوئی ناکارہ فرد آپ سے اس کا ہاتھ مانگے چنکوں بہن کوں روئے تو کیا آپ اس پر زس کھا کر اپنی بیٹی کا ہاتھ تھما سکیں گی اس کے ہاتھ میں؟“
 ”آپ کروا لٹی سید بی باتیں۔“ وہ کوئی راہ فرار نہ پا کر نایدہ آنسو پونچھنے لگیں۔ ”ہمیشہ میرا جی دکھاتے ہو۔“
 ”ہاشم کے لیے کوئی لڑکی نہیں دیکھی آپ نے اب تک؟“ انہوں نے موضوع تبدیل کیا۔
 ”ماہین کہہ رہی ہے اپنی منہ کے لیے۔ تنسیم میاں نے خود کھلوایا ہے۔“ وہ کچھ راضی ہوئیں۔
 ”کیا ضرورت ہے اپنی دور جانے کی؟“ ان کی پیشانی پر بل پڑا۔ ”اس سے اچھی لڑکیاں تو اپنے گھر میں ہیں۔“
 ”باجی کی ناعملہ ہے۔ سلجوق کی ثانیہ ہے۔“
 ”رہنے دو تم! وہ تنگ کر بولیں۔“ مجھے نہیں کرنی خاندان میں۔ کسے دیتی ہوں۔“
 ”کیا برائی ہے اس میں؟ سکھی رہو گی۔ اپنی بچیاں خدمت بھی کریں گی۔“
 ”ہاشم نہیں مانتا۔“ انہوں نے پلٹا کھایا۔
 ”کیا کہتا ہے؟“ ان کی پیشانی کی تشکنوں میں اضافہ ہوا۔
 ”ابھی تفصیلی بات تو نہیں ہوئی۔ میں نے ماہین کو کھلا بھیجا ہے۔ وہ کسی وقت آکر تسلی سے بات کرے گی۔“
 ”سے۔“ وہ جربزی ہو گئی تھیں۔
 ”ہوں۔“ وہ سوچ میں تھے۔ ”مجھے بتانا پھر کیا کہتا ہے۔ پتا تو چلے صاحبزادے کے دماغ میں کون سا ختاس ہے۔“
 فردوس بیگم ان کا چہرہ دیکھ کر رہ گئیں۔
 دونوں ہتھیلیوں کے بیچ تھوڑی جمائے وہ بیچ پر بیٹھا تھا۔ سامنے اس کے ہم عمر لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے وہ بھی ان کے ساتھ کرکٹ کھیلنے ہی پارک میں آیا تھا لیکن اب اس کا دل کھیل میں نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بیٹھا بیٹھا تھا۔ سب سے الگ تھلگ وہ کچھ سوچنے میں مصروف تھا۔
 ”کیوں دوست؟ کیا سوچا جا رہا ہے اکیلے اکیلے؟“ کوئی اس کے قریب آ بیٹھا۔
 ”عم نے اپنے خیالوں سے چونک کر اسے دیکھا۔“
 ”ہاشم انکل! آپ کب آئے؟“
 ”بس ابھی۔ جب آپ مراقبہ کر رہے تھے۔“ وہ مسکرایا۔
 ”نہیں تو۔“ وہ حیران ہوا۔ ”میں نے تو کچھ نہیں کیا۔“
 ہاشم ہنس دیا۔
 ”اکیلے کیوں بیٹھے ہو شاعر صاحب؟“ اس نے پیار سے اس کا سر ملایا۔
 ”آپ تو نہ کہیں ایسے مجھے خالہ جانی جڑائی ہیں شاعر کہہ کر۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔
 ”زبکی؟“ اس سے حیرت ہوئی۔ ”یعنی پکی پکی پوسٹ ملی ہوئی ہے۔ تو یار کن سوچوں میں گم رہتے ہو تم؟“
 ”میں۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا تھا۔ ”مومن واپس چلا گیا اپنے گھر؟“ ہاشم کو لگا جیسے اس نے بات بتائی تھی۔
 ”ہاں۔ مومن اپنے گھر چلا گیا۔“
 ”وی آر گڈ فرینڈز۔“
 ”آئی نو۔“ ہاشم نے اسے پیار سے دیکھا۔
 ”جب وہ آتا ہے یہاں تو ہم خوب کھیلتے ہیں۔ بہت باتیں کرتے ہیں۔“
 ”اچھا! کیا باتیں کرتے ہو؟“
 ”اپنے اپنے بہا کی۔“ وہ رواں ہو گیا تھا۔ ”اس کے بہا بھی اس سے دور ہیں میرے۔“

"یہ کہہ سہیں۔" اس نے سر جھکا لیا۔

”تم نے اپنے بھیا کو دیکھا ہے عمر؟“ ہاشم کو بچے کی ذہنی الجھن کا اندازہ ہو رہا تھا۔
 ”ہیں۔“

”ایسا جانتے ہو؟“

”ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”میرے پاس ماما ہیں نا۔ مجھے بس اپنی ماما اچھی لگتی ہیں۔ اگر یہاں نہ بھی ہوں تو اہل نہیں رہتا۔“

انہوں نے بے اختیار ہی اسے لپٹا لیا۔

”لڑکیوں نہیں پڑتا میری جان... بہت فرق پڑتا ہے۔“

”ایس اکل! اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں اور تمہا بھی۔ میں تو اب اپنے بھیا کو یاد نہیں کرتا۔ بالکل بھی نہیں۔“
 اُم سے دیکھتا رہ گیا۔

”مری عمر۔۔۔“ کوئی آوازیں دے رہا تھا۔

۱۱۱۔ نہیں مڑ کر دیکھنے لگے۔ شہلا ان تک چلی آئی۔ بیٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عمرو زکریا سے لپٹ گیا۔

ایسا اتنی دیر لگادی آپ نے، میں تو پریشان ہو گئی تھی۔“ وہ فکر مندی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے رہے۔

”میں ہاشم انکل سے باتیں کر رہا تھا۔“

۱۰ ما نے اب اسے دیکھا تھا۔ اس نے مسکرا کر اسے سلام کیا۔

”ہیں آپ؟ ایتقان کیسی ہے؟“

”مگر یہ خدا کا ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”پھپھو تو اپنے گھر جا چکی ہیں۔“

”اور کھر پر سب خیریت ہے؟ اماں ٹھیک ہیں؟“

۱۔ آپ آمیں نا، آیا کریں۔ ”وہ استا ہی کہہ سکا۔“

”اِنَّما اللہُ وقت نے اجازت دی تو ضرور۔“

اور ہاتھ بھام کر مڑتی تھی۔ اور ہاسم وہیں لٹا رہا کہ اس نے چال اب تک ویسی ہی تھی۔

اور ہدو قار۔ عمر ماں لے ساتھ اچھلتا کودتا بائیں لڑا جا رہا تھا۔

البتہ اجازت دی۔۔۔ وہ بجز مریا۔ وقت کا ہی کو سبیل ہے سارا سہولابی۔

میں ابھر رہا تھا۔



عبدالغنی بناب! منزل آپنجی ہے۔ دس منٹ بعد ہم لاہور اسٹیشن پر کھڑے ہوں گے۔ ”عباد نے کہا تو ربیعہ کا دل
لوں انداز میں دھڑک اٹھا۔

”اے سامان چمک کر لیں۔ میں آپ کے لیے بھی ایک عدد قلم ہائر کر لیتا ہوں۔“ وہ مذاقاً بولا تو سب نے اشارت

۱۱۱ اور جنس سمیٹنے لگی۔

’اوں لینے آئے گا تمہیں؟‘ یکا یک اس نے بوجھا۔

”وہ انکی۔“ مجھے شاید۔۔۔ پھپھاجی۔۔۔ یا۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید۔۔۔“

۱۱۔ اے غور سے اس کا چہرہ دیکھا پھر خاموش ہو رہا۔

لڈن پر اتر کر بیچے کا ذہن بالکل خالی ہو گیا تھا، قطعاً "خالی۔ عباد نے اس کا سامان قلمی سے اٹھوایا اور اب وہ

لوگ وینٹنگ ہال میں پہنچ گئے۔

ربیعہ بار بار اسے دیکھتی اور اس کی آنکھوں میں پانی جمع ہونے لگتا۔ وہ اس کے لیے خدا کی بھیجی گئی مدد کا تھا۔ وہ اس کے لیے تحفظ کا احساس تھا۔
”تم نے اپنی آمد کی اطلاع کر دی تھی؟“ عباد نے پوچھا۔
”ہاں، تار بھیجا تھا۔“

”تار؟“ اسے اچنبھا ہوا۔ ”فون وغیرہ۔۔۔ میرا مطلب ہے، کوئی کلینر صورت حال؟ کس کو اتنا کب آتا ہے؟ تم پہچانتی تو ہونا انہیں؟“
اس نے نفی میں سر ہلایا۔
”اور وہ تمہیں؟“

سر دوبارہ نفی میں ہلاتا تھا۔
”مائی گاڈ! وہ ہکا بکا رہ گیا۔“ پچاس برس پرانی دوشیزہ! تم ٹپکی کہاں سے ہو؟ لاؤ پتا دو مجھے۔“
ربیعہ نے جھٹ مٹھی میں دبی پرچی اسے پتھادی۔ عباد کاغذ سیدھا کر کے پتا پڑھنے لگا پھر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”تمہیں یقین ہے یہ پتا درست ہے؟“

ربیعہ کا سر پھر نفی میں ہلاتا تھا۔

عباد نے سر ہٹام لیا۔

دو گھنٹے کی طویل جدوجہد کے بعد وہ اصل مکان ڈھونڈ پائے تھے۔ دونوں تھکن سے چور تھے۔ ربیعہ نے ہال اسے اپنی مختصر ترین داستان سنا دی تھی اور عباد اس کی ہمت اور حوصلے سے بے حد متاثر ہوا تھا۔
ربیعہ کے پاس موجود یہ ایک نہایت خستہ حال پرانے مکان کا تھا۔ جہاں سے علم ہوا تھا کہ پچھلے مکین واما بیچ کر محلہ تبدیل کر چکے ہیں۔ عباد کی مستقل مزاجی اور بھرپور کوشش سے آخر کار وہ نیا مکان ڈھونڈ نکالے! کامیاب ہو گئے تھے اور اب وہ دونوں ایک درمیانے درجے کے مکان کے گہرے سبز رنگ کے گیٹ کے سامنے کھڑے تھے جس کے دروازے پر ”منور امین“ کی تختی نصب تھی۔

”یہی گھر ہے۔“ ربیعہ نے تصدیق کی۔ ”منور امین میرے پچھا کا نام ہے۔“

”پھر بھی۔۔۔ تم اپنا اطمینان کر لو، میں کھڑا ہوں۔“ وہ بولا۔

ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں موجزن بے پایاں خلوص دیکھا۔

”میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھلا پاؤں گی بھائی!“ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”بس بھائی، کہا ہے نا پھر احسان کیسا؟“ عباد کی آنکھیں چمکیں۔

پھر اس نے جیب سے کارڈ نکالا۔

”یہ کارڈ رکھ لو، اس پر میرا موبائل نمبر ہے اور کراچی میں میرے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی۔ کبھی بھی کسی کم ضرورت پڑے تو جھجکنا مت۔“

ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا اور مڑ کر تیل پر انگلی رکھ دی۔

اس کی شفقت کا نام ختم ہو چکا تھا۔

واش روم میں اپنا حلیہ درست کرنے میں اس نے پندرہ بیس منٹ لگائے تھے پھر اپنی کپ سر پہناتے ہوئے باہر چلا آیا۔

بہت سے لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کی سوچ کسی خاص نقطے پر مرکوز نہ تھی۔ وہ بس ہل چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

دارنگ اریا میں آکر وہ جیب سے چابی نکالتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب بڑھتا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ اس چھوٹی گاڑی پر جا پڑی۔

اس کے لبوں سے گہری سانس برآمد ہوئی اس نے اپنی چابی دوبارہ جیب میں ڈال لی اور قدم اٹھاتا اس سفید گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر وہ موجود تھی۔ سفید جالی کے لباس میں ملبوس وہ سیٹ سے سر نکالے چہرے کو اس سے سفید ہیٹ سے ڈھانپنے بیٹھی تھی۔

”شاید نہایت طویل انتظار کا اظہار تھا۔“

ماشرنے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

”ہیلو۔۔۔ ویل کم سوئٹ ہارٹ۔“ ہیٹ میں سے سریلی آواز برآمد ہوئی تھی۔

”ہاٹ آسٹوڈنٹی اڈوس لڑا؟“ اس نے اس کے چہرے پر سے ہیٹ اتار دیا۔ اس نے اپنی خوبصورت مخمور اس سے اسے مسکرا کر دیکھا۔

”اسٹوڈنٹی؟“ وہ ہنسی۔ ”ہاٹ از لومائی ڈارنگ۔“

ماشرنے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

لباس تبدیل کر کے وہ باہر نکلا تو وہ صوفے پر نیم دراز لی وی دیکھ رہی تھی۔ عاشر اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے سامنے والے صوفے پر جا بیٹھا۔

”لانے لی وی کا الیوم دھیمہ کر دیا اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔“

”تم کیوں میرے لیے اتنی زحمت کرتی ہو لڑا؟“ عاشر نے مدھم لہجے میں کہا۔

”تمہارے آفس سے میری فیکٹری تک کا روٹ کتنا لمبا ہے پھر ہماری ٹائمنگز میں اچھا بھلا فرق ہے۔ اور میرے پاس کار ہے میں خود یہاں تک آسکتا ہوں۔ پھر تم یہ زحمت کیوں کرتی ہو؟ کیا تمہارا وقت اتنا ہی فضول

”ہو وقت تمہارے بغیر گزرے۔ وہ مجھے فضول ہی لگتا ہے عاشر!“ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی ”تم پاکستان گئے تو میں اگل ہو گئی تھی۔ لگتا تھا میرے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ آفس سے مجھے دو مرتبہ وارننگ دی گئی کہ میں اپنا کام صحیح طریقے سے نہیں کرتی۔ مجھے شدید ڈپریشن ہو گیا تھا۔ پھر تم لوٹ آئے سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اہل ملک!“

”مسٹر اے۔ اس کے سفید دانت چمک اٹھے۔“

”تم لعلی کر رہی ہو لڑا! بچھتاوگی!“ وہ اپنی آستین کے بٹن بند کرتے ہوئے بولا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صوفے کے بازو پر آ بیٹھی اور اس کے گلے میں بائیں حائل کرتے ہوئے اپنا چہرہ اس کے ہالوں پر رکھ لیا۔

”بچھتاوہ ہے عاشر! جو غلط کو صحیح سمجھ کر کرتا ہے۔ مجھے پتا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ اس کا زیادہ سے زیادہ اور خطرناک نتیجہ کیا نکلے گا۔ مجھے اندازہ ہے پھر بھلا بچھتاوے کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔ میں اتنا اے سے پہلے ہی خود نشی کر لوں گی۔“

ماشرنے ایک گہری سانس لی۔

”اچھا چلو کافی بناؤ میں بہت تھک گیا ہوں۔“ اس نے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا۔

وہ اس کے مزید قریب آنے لگی۔

”لڑتہ!“ عاشر کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

”عجب مرد ہو تم۔“ وہ علیحدہ ہو کر پھیکے سے لہجے میں ہنسی ”تمہیں اپنی بیوی سے علیحدہ رہتے ہوئے بھی فرق نہیں پڑتا؟ شاید تم اپنی بیوی سے بہت زیادہ ڈرتے ہو۔ ذہنی طور پر خوف زدہ ہو سہاں؟“

”ہاں۔۔۔ میں اپنی بیوی سے خوف زدہ ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولا ”اب جاؤ کافی تیار کر کے لاؤ۔“
وہ برا سامنے بنا کر اٹھ گئی اور ذرا سے فاصلے پر بنے کاؤنٹر کے پیچھے جا کھڑی ہوئی جہاں چولے نصب تھے اور
کینبش نے وہاں چھوٹے سے کچن کی صورت اختیار کر لی تھی۔
عاشراؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ اسے نیند آرہی تھی۔ لڑاکے کافی بنا کر لانے تک وہ سو
تھا۔

ایک ایک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔
”یار! کیا ماقہ ہے یہ؟“ وہ نے بسی سے بولا۔
”چپ چاپ لیٹے رہو۔“ وہ ہنسی آمیز لہجے میں بولی۔
”یار۔“ عاشر نے اسے پرے دھکیلا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”یوں کو نکال پڑھو الوداع سے۔ کم سے کم یہ احساس
جرم نہ ہو۔“

”کیسا احساس جرم؟“ وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ عاشر مسکرا دیا۔
”تم نہیں سمجھو گی۔ تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔ اس قسم کے احساس جرم سے تم لوگوں کا واسطہ کم ہی ہو
ہے۔“ اس نے کافی کام اٹھا کر لیوں سے لگایا تھا۔ الزتہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر اس نے ناک
سکڑی۔

”بعض اوقات تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پتہ ہے ایسے میں میرا کیا جی چاہتا ہے؟“
”کیا؟“ اس نے گھونٹ بھرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”میرا جی چاہتا ہے میں پاکستان جاؤں۔ وہاں جا کر تم لوگوں کا لائف اسٹائل دیکھوں، تمہاری ذہنیت، بیشیلا
قوم کیا ہے اس کا اندازہ کروں۔ تب کہیں جا کر میں تمہیں مکمل طور پر سمجھ پاؤں گی۔“
عاشر کچھ سوچ کر شرارت سے مسکرا دیا۔

”وہاں جانے کا سوچا بھی مت کرو لڑاؤ میرا!“
”کیوں؟“ اس نے سر کو استغماہ انداز میں جنبش دی۔

”وہاں گئیں تو بچ کر نہ آسکو گی۔ کوئی نہ کوئی پر زہو ہیں رہ جائے گا۔“
”سوری؟“ وہ حیران ہوئی۔

عاشر نے اپنی سوچ پر خود ہی ہلکا سا تقبہ لگایا۔
”وہاں میری بیوی رہتی ہے۔ جو اس قدر خطرناک ہے کہ میں ذہنی طور پر اس سے خوفزدہ رہتا ہوں۔ پھر
کہ وہ کیا کچھ نہ سمجھائے گی تم پر؟ تمہاری یہ حسین زلفیں تو ضرور وہیں رہ جائیں گی۔“

”نہم آن۔“ اس نے اسے حلقی سے گھورا۔
”جی ہمارے ہاں یہی رواج ہے۔“ اسے سوچ کر مزہ آ رہا تھا۔ ”میاں کی سیلیوں کے بال خاص طور پر نکال
بنائے جاتے ہیں۔“

لڑانے غیر ارادی طور پر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔
”ان ہی زنجیروں میں مشید کرنی ہوتا تم لوگ اپنے شکار کو؟“

”یو سلی مین!“ لڑانے اس کا مذاق سمجھتے ہوئے اسے گھورا ”اب تو میں ضرور جاؤں گی پاکستان اور تمہاری بیوی
سے تو خاص طور پر ملوں گی۔ دیکھوں تو تمہارے جیسے ڈشنگ پر سٹائی رکھنے والے مرد نے کس طرح کی عورت
کا انتخاب کیا ہے۔“

عاشر کی آنکھیں مسکرائے لگیں۔
ان آنکھوں میں ایک چاند چرے کا تصور ابھر رہا تھا۔

۱۱۱۔ اے کے ساتھ دیوار پر نصب سنگ مرمر کی تختی پر کنداں الفاظ نے اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔
 ۱۱۲۔ ایوں منزل پر پہنچ کر اس نجی روم کے لیے چل اٹھا۔ گمرے گمرے سالن، بھر کر اس نے خود پر قابو پانے کی
 ۱۱۳۔ لڑتے ہوئے کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھی، آنکھیں بند کیں اور بٹن دبا دیا۔ کال بیل شاید بیرونی دیوار سے
 ۱۱۴۔ من میں ہی نصب تھی۔ ”ماں“ کی کرخت آواز نے خود ربیعہ کو ہی سہا دیا۔ جامن کے پیڑ پر بیٹھے کچھ
 ۱۱۵۔ سی اڑے تھے۔

۱۱۶۔ والی اے انتظار کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا تو ربیعہ نے متذبذب ہو کر ذرا سا مڑ کر دیکھا۔ ٹیکسی میں
 ۱۱۷۔ اے ہی دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ کو قدرے اطمینان ہوا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر بٹن دبا دیا۔
 ۱۱۸۔ ”کون ہے؟“ یکایک کال بیل سے زیادہ کرخت آواز گیت کے قریب ابھری۔
 ۱۱۹۔ ربیعہ نے جواب دینے کی کوشش کی مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔

۱۲۰۔ ن نے بے جا جارحانہ انداز میں دروازہ کھول کر باہر جھانکا تھا۔ پھر ربیعہ کیوں محسوس ہوا جیسے وہ عورت کسی
 ۱۲۱۔ سے دو جا رہی ہو۔

۱۲۲۔ پائیس پینتالیس کے سن والی وہ عورت سانولی رنگت اور کے نقوش کی حامل تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی مگر
 ۱۲۳۔ ہڈاثر لیے ہوئے تھیں۔ موٹے موٹے لبوں کے گوشوں پر سخت مزاحیہ سے گہری سلوٹیں بڑ گئی تھیں۔ بال سیاہ
 ۱۲۴۔ ڈھالے یا ایسا امتزاج تھے کہ ان کو نظر بھر کر دیکھ لینے سے جھرجھری سی آتی تھی۔ وہ مکمل طور پر ایک تنگ مزاج اور
 ۱۲۵۔ گہیر خاتون نظر آتی تھیں۔

۱۲۶۔ ربیعہ کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ وہ پلکیں جھپکے بغیر اسے یوں تک رہی تھیں گویا پتھر کی ہوں۔
 ۱۲۷۔ ربیعہ نے مڑ کر دیکھا۔ عباؤنوز حالت انتظار میں تھا۔

۱۲۸۔ ”مہمیرا نام ربیعہ ہے۔ ربیعہ جہانزیب!“ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔
 ۱۲۹۔ ”ہاں ہوں!“ اس بات سے یکایک تنفر بھری سرسراہٹ ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی۔ ربیعہ چونک اٹھی۔ اس کے
 ۱۳۰۔ حیران کن بات تھی۔

۱۳۱۔ ”آپ؟۔۔۔ آپ کون ہیں؟“ ربیعہ نے اس کی پتھر آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔
 ۱۳۲۔ ”اندر آ جاؤ۔ کون ہے تمہارے ساتھ؟“ اس کی نگاہیں اب ربیعہ کے عقب میں دیکھ رہی تھیں۔
 ۱۳۳۔ ”لک۔ کوئی نہیں۔“ وہ ہکا کر رہ گئی۔

۱۳۴۔ اس عورت نے ایک طرف ہو کر اسے رستہ دیا۔ ربیعہ اپنا بیگ اٹھا کر گھر میں داخل ہو گئی۔ ایک پراسرار قسم
 ۱۳۵۔ لے ناٹے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ وسیع و عریض صحن جامن کے پتوں سے اٹا ہوا تھا۔ لال رنگ کا فرش ربیعہ
 ۱۳۶۔ ت عجیب معلوم ہوا۔ وہ اس عورت کی پیروی کرتی اس کے پیچھے چلتی گئی جو برآمدے کا دروازہ کھول کر اندر
 ۱۳۷۔ داخل ہو گئی تھی۔

۱۳۸۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ ربیعہ کی آنکھوں کو سکون میسر آیا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا سامنے لائن
 ۱۳۹۔ ٹیبلن کمرے بنے ہوئے تھے۔ پرآمدے کے ایک کونے میں باورچی خانہ تھا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور چولے
 ۱۴۰۔ لگی پٹیلی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کے نیچے کافی تیز آگ تھی۔ وہ عورت شاید کچھ پکاتے پکاتے دروازے
 ۱۴۱۔ لگی تھی۔ باورچی خانے کے مخالف سمت میں چھوٹا اسٹور تھا۔ جس میں رکھے ہوئے ٹرنک دکھائی دے رہے

۱۴۲۔ ”مینا!۔۔۔ کون ہے۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔ ارے میں کب سے پوچھ رہا ہوں، کون ہے؟۔۔۔ کھوں کھوں
 ۱۴۳۔ کھوں۔۔۔“

۱۴۴۔ ربیعہ چونک اٹھی تھی۔ کونے والے کمرے سے بے تحاشا کھانٹے ہوئے کوئی شخص پوچھ رہا تھا۔
 ۱۴۵۔ ”مینا!“ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔

۱۴۶۔ اس کی پھوپھی کے اکثر خطوط میں اس نام کی عورت کا تذکرہ تھا۔ مینا نے مڑ کر اسے دیکھا۔

”او تمہیں بھائی بلارہے ہیں۔“ ان کے انداز میں تھجک تھی۔
ربیعہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ہر قدم پر ایک نیا امتحان منظر تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ان۔
پچھے چلی۔

کمرے کے دروازے پر بدلو کے ایک جھونکے نے اس کا سر چکرا دیا۔ ایک لمبے کے لیے اس کے قدم
لڑکھڑائے پھر اس نے خود کو سنبھالا اور بے ساختہ ناک کی جانب بڑھتے ہوئے ہاتھ کو سختی سے روک لیا۔
وہ ایک گندہ غلیظ کمرہ تھا۔ نہایت پرانی وضع کے پلنگ پر پٹھیں ہوئی میلی کپیلی چادر پر ایک لاغر سا شخص پڑا
جس کے وجود سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔ پلنگ کے پاس پڑی بالائی سے بدلو کے پھلے اٹھ رہے تھے۔
ربیعہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی دوپٹے کا پلو ناک پر رکھ لیا۔

”کون ہے یہ؟“ اس شخص نے قدرے غصے سے پوچھا۔ ربیعہ کے عمل نے شاید اسے طیش دلایا تھا۔
”بھانوی۔“ وہ غالون ہمیں۔“ غور کرو۔“

اس شخص نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

”میں۔۔۔ میں ربیعہ ہوں۔ ربیعہ جہاں نہ بہد۔“

”کھول۔ کھول۔ کھول۔“ منور امین بریک ایک سی کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

مینا نے آگے بڑھ کر وہ بالائی اٹھالی جو غلاظت کے ڈھیر سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اسے کمرے سے باہر لے گئیں۔
ربیعہ کو بے حد سکون کا احساس ہوا۔ بدلو کے تھپڑوں میں بہت لمبی واقع ہوئی تھی۔

”تم۔۔۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

ابھی وہ خود کو سنبھال ہی رہی تھی کہ منور امین نے ترش لمبے میں پوچھا۔ ربیعہ یکدم ہی گڑبڑا گئی۔

”جی۔۔۔ وہ میں۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”شاید بڑھیا گزر گئی۔“ اچانک سی وہ بنے۔

ربیعہ ایک سانے میں رہ گئی۔ ان کا جملہ اسے چیرتے ہوئے گزرا تھا۔ اس پر وہ طنزیہ ہنسی اسے اچانک ہی
احساس ہوا کہ اس نے وہاں اگر غلطی کی ہے۔

وہ اب تک ہنس رہے تھے۔ ربیعہ کے اندر غم و غصے کا طوفان اٹھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس نے
اپنا سامان کہاں رکھا تھا۔ وہ شاید برآمدے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔

وہ مڑ کر دروازے تک پہنچی تو یکایک ان کی ہنسی رک گئی۔

”مینا۔۔۔ مینا۔۔۔ جی کے لیے کھانا بناؤ۔ بے چاری تھک گئی ہوگی۔“

وہ پیچھے سے بولے تھے۔

فون کی بیل بہت دیر سے بج رہی تھی۔ جھنجھلائی ہوئی عریشہ ہاتھ روم سے برآمد ہوئی۔ اس کے چیلے سے ظاہر
ہوا تھا کہ اس نے بے حد غلٹ میں کپڑے پٹنے تھے۔ کیلے بال اس کی قمیص میں پھنسے ہوئے تھے اور کپڑے بدن
سے سکے ہوئے تھے۔

”ہیلو! اس نے ریسیور اٹھایا۔“

”جی یو علیکم ہیلو! دو سری طرف سے چککتے ہوئے کہا گیا۔“

عریشہ لمحہ بھر کو متعجب ہوئی۔

”جی۔۔۔ کون؟“ وہ غٹاٹا ہوئی۔

”انتظار کی سولی۔۔۔ لٹکتا جاں بلب۔۔۔“ سرد آہ بھرتے ہوئے گداز لمبے میں کہا گیا۔

”مجھے تو محلے کے تھمے پر لٹکے فیوز بلب معلوم ہوتے ہیں۔“ وہ بھی کہاں چپ رہنے والی تھی۔

”ہا!۔۔۔ ویل سیڈ فیل سینڈ۔۔۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ محترمہ جس مزاح بھی رکھتی ہیں! اور اسے سراہا گیا۔“

”ہی میں خدا کے فضل و کرم سے تین عدد جوان بھائی بھی رکھتی ہوں۔ ٹکڑے قسم کے“ وہ اطمینان سے کہتی ہوتی ہیں۔

”کئی بات نہیں۔“ بیٹھے لہجے میں فرمایا گیا۔ ”بھائیوں پر چنداں اعتراض نہیں۔ بس اتنا خیال رہے کہ وہ عیشہ ہوگا۔ جیسے روسیہ کہتے ہیں۔“

عیشہ کو بے ساختہ ہنسی آئی۔

”اس بد تمیزی کا مقصد کیا ہے آخر؟ آپ ہیں کون؟“ وہ ہنسی پر قابو پا کر مصنوعی خفگی سے بولی۔

”ارحمن برصدا بتا گیا۔“ بھڑپور آواز لگائی گئی۔

”کدھا؟“ عیشہ کھکھلا کر ہنسی تھی۔ ”جی ہاں جی ہاں۔ میں نے پہچان لیا آواز سے۔“

”لہذا کی آواز قصر شیریں میں محض شیریں ہی پہچان پاتی ہے۔“ وہاں کسی قسم کی شرمندگی کا شائبہ تک نہ تھا۔

”ہم تو ہفتہ بھر سے کالیں ضائع کر رہے ہیں۔ آپ کے ٹیلیفون کے دربان کی آواز بہت بے سُر ہے شیریں! ہم آپ سنبھال سکتے۔“

”اے مسٹر! آپ ذرا اپنی زبان سنبھالیں۔ دو باتیں کیا کر لیں آپ تو منہ کو آنے لگے۔“

”ہی ہمارے ایسے نصیب کہاں۔“

اس کے کانوں میں وہ لہجہ اور وہ جملہ گونج رہا تھا۔ اسے گلف مار کیٹ تک کا سفر یاد آ گیا۔

”یہ تو بھیا کی سوک کا کمال ہے!“

”ہائے اللہ!“ اس کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ سر پٹ بھاگی۔

اپنے پورشن سے نکل کر وہ اپنی پھوپھو کے پورشن کی طرف آئی تھی۔

”ارے ارے بچی۔ کہاں دوڑی جاتی ہے۔ سانس تو لے۔“ حقیقہ حیات دروازے پر ہی مل گئیں۔

”السلام علیکم وادی جان!“ وہ وادی کو دیکھ کر ٹھہری۔

”ایلیکم السلام۔ جیتی رہو۔ کون سی بلا دیکھی؟“ وہ شاید واپس جا رہی تھیں ”یوں ہانپتی کانپتی پھرتی ہو۔“

”میں تو ناعمہ سے ملنے آئی تھی۔“ وہ شرمندہ ہوئی۔

”ہاں تو بچی! خدا نے پیر دیے ہیں پر نہیں دیے اچلو مگر اڑت!“ وہ نکل گئیں۔

اور اڑے پر ہی کلاس لے لی تھی ”اس لیے وہ خود کو قابو میں رکھ کر اندر داخل ہوئی۔ لاؤنج میں بیٹھی پھوپھو کو

”ام کرتی وہ بچن کی جانب بڑھ گئی جہاں دروازے پر کڑھی میں ڈالتی جا رہی تھی۔

”اے کڑھی۔“ عیشہ چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول گئی۔

”تم کب آئیں عیشہ؟“ دروازے نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا ”ناعمہ کڑھی لے کر تمہاری طرف آنے والی

”اور اس کی خوشبو سے میں خود کھنچی چلی آئی۔“ عیشہ۔ خالی پلیٹ اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ ”ذرا

”ہاں میں!“

دروازے کی بنائی ہوئی کڑھی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ عیشہ وہیں بیٹھ کر کڑھی کھانے میں مشغول ہو گئی۔

ناعمہ ہن میں داخل ہوئی تو چونک اٹھی۔

”ہاں میں تو تم سے ملنے آ رہی تھی۔“

”ہاں تو آؤ میں تو کڑھی کھا کر جا رہی ہوں۔“ وہ انگلی سے خالی پلیٹ چائے میں مشغول تھی۔

”تم کڑھی کھانے آئی تھیں؟“ ناعمہ نے اسے گھورا۔

”ہاں۔ آں نہیں نہیں۔“ اسے اصل بات یاد آئی تو وہ سٹپٹا گئی۔ ”وہ تو میں تمہیں۔“

”ہاں خاموش ہو گئی۔ دروازے کی موجودگی میں اس نے اپنا راز فاش کرنا مناسب نہ سمجھا اور آنکھوں ہی آنکھوں

میں اسے اشارے کرنے لگی۔

”یہ کیسے دیدے منکار ہی ہو؟“ ناعمہ الجھ کر بولی۔ ”منہ سے نہیں پھوٹ سکتیں کیا بات ہے؟“ عریشہ نے ہر اسے فٹے منہ کا اشارہ کیا تھا جو درود نے بھی دیکھ لیا اور مسکرانے لگی۔

”کیا بات ہے عریشہ؟ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟“

”نہیں۔ تو درود آپلی میں میں تو۔“

ناعمہ زور زور سے ہنسنے لگی۔ درود ڈونگے میں کڑھی نکال کر عذرا بیگم کو دینے کے خیال سے چل دی۔

عریشہ نے لپک کر ایک دھمو کا ناعمہ کی کمرچہ رسید کیا۔

”کیمنی۔ اب نہیں بتاؤں گی مجھے۔ مرنی رہنا سپنس میں۔ میں جارہی ہوں۔“

ناعمہ نے کمر کی پیس برداشت کرتے ہوئے اس کا بازو تھاما۔

”اچھا نا تھو کو بھی غصہ۔ لیکن اپنے ہی منہ پر۔“

عریشہ کو ہنسی آگئی۔ دونوں بچن سے نکل کر کمرے میں چلی آئی تھیں۔

”اب بولو کیا بات ہے؟“ ناعمہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

”تیرے اس ڈراما سیر کا فون آیا تھا۔“

”میرا ڈراما سیر؟“ ناعمہ وہ واقعہ قطعاً ”خزاموش کر چکی تھی“ الجھ کر بولی۔

”وی۔ سوک والا۔“ وہ جل کر بولی۔

”ہائے۔“ ناعمہ نے دل تھام لیا۔ ”اس نے کیوں فون کیا؟ اور اس کے پاس نمبر کہاں سے آیا؟“

”گھر تک پیچھا جو کیا تھا منحوسوں نے۔ نمبر پتہ کرنا کیا مشکل ہے اور رہی بات کہ فون کیوں کیا تھا تو اس کا جواب تو وہی دے سکتا ہے مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔“

”تو نے پوچھا ہوتا نا۔“ ناعمہ نے شوخی سے اسے چھیڑا۔

”اگلی مرتبہ تیرا نمبر دوں گی۔ پوچھ لینا۔“

”نمبر ضرور دینا لیکن جو تے گا۔“ ناعمہ نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں تو چھکے چھڑاؤں گی موصوف کے

ناعمہ علی خان نام ہے میرا۔“

”کہتا تھا ہفتہ بھر سے فون کر رہا ہے۔“ عریشہ نے فکر مندی سے کہا۔ ”نجانے اس کی ڈمب کاتر کس نے

کی ہوں گی۔“

”سی ایل آئی پر نمبر تو آیا ہو گا نا؟“ ناعمہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔ لیکن موبائل نمبر ہے۔“

”گالیاں دیں؟“ اسے انوکھا خیال سوچھا۔

”شی۔ اس نے بھی جواب میں کچھ کہہ دیا تو؟ کیا عزت رہ جائے گی۔“

”زبان کھینچ کر ہاتھ پر رکھ دوں گی کیمنی کی۔“

”اسی فون سے ہاتھ نکال کر وہ بھی تمہاری کلائی مروڑ دے گا۔“ عریشہ طنزاً بولی ”باتیں بناتی ہو۔“

ناعمہ سوچ میں پڑ گئی۔

”غیر کیا کر لے گا؟ دو چار کالیں ہی کرے گا نا۔ پھر علی اور حمزہ کی گالیاں سن کر خود ہی ٹھنڈا پڑ جائے گا۔“

”وہ لڑکے ہیں لڑکے، وہ بھی آج کے دور کے۔ اس کے گھر تک پہنچ جائیں گے اور سر پہاڑوں گے اس کا۔“

”تو پھاڑیں نا۔ اچھا ہے مزہ آئے۔“

”اور جو وہ اس سفر کی داستان سناؤ الے پھر؟“ وہ جل کر بولی تھی۔

”تب کی تب دیکھیں گے۔“ اس نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے گویا قصہ ختم کیا۔ ”چلو کڑھی چاول کھائیں۔“

وہ بڑی سے سادے صفحے پر قلم چلانے میں مصروف تھا جب کمرے میں کسی کی آمد سے سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے اراکی ذرا نگاہیں اٹھائیں۔
 لہا اس بیگم اور ماہین کو ایک ساتھ اپنے کمرے میں پا کر اس کا ماتھا ٹھکا۔ اس نے قلم کو پھر اسی تیز رفتاری سے اٹھاد شروع کر دیا۔

”اُمم۔“ فردوس بیگم نے گلا صاف کیا تھا۔ ہاشم کو مجبوراً ”نظریں اٹھانی پڑیں۔“
 ”اُمیں امی۔ بیٹھیں۔ بیٹھو ماہین!“ اس نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔
 ”اں ہاں بیٹھتے ہیں۔ بیٹھنے ہی آئے ہیں۔“ فردوس بیگم اپنا تخیم وجود سنبھالتے ہوئے صوفے کی جانب چلی۔ ”تم تو ایسے اپنے کمرے کے ہونے مانو نیا نو یا دو لہا ہو۔ ہم تو باہر سے تمہارا دروازہ ہی دیکھتے ہیں اب کھلے اپ کھلے!“

”اں امی۔ آفس کی طرف سے کام کا کچھ دیاؤ ہے آج کل۔“ وہ انگلیاں چٹخانی لگا۔
 ”اُپھا!“ وہ نہیں۔ ”ہم بھی اسی دیاؤ کی بنا پر آئے ہیں اب تم ہی کچھ مدد کرو ہماری۔“ وہ دونوں اس کے مقابل اُپس۔ ہاشم نے خطرے کی بوسو ٹکھ لی تھی۔ سو وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔
 ”لہا دیاؤ؟“

”اُس کس کی سناؤں بچے۔ تمہارے باوا کا دیاؤ ہے وہ کہتے ہیں تم جان کر بیٹا نہیں پیا تھیں۔ جی بھر کر عیش کرنا اُتی۔ اس کی کمائی پر۔ پھر تمہاری دادی کا دیاؤ وہ ثانیہ کا رشتہ کھلوانی ہیں بہانوں بہانوں سے۔ ادھر اس غریب لہاں مشکل میں پھنسی ہے۔“
 انہوں نے ماہین کی جانب اشارہ کیا۔

”اں کی ساس اپنی صاحبزادی کا بوجھ ہلکا کرنے کو کوشاں ہیں۔ انہوں نے تقسیم میاں سے کھلوا یا ہے اس سال صاف انکار کا یا را نہیں ہوتا۔ اب ذرا بتاؤ تم۔ کس کو کیا جواب دیں؟“
 ہاشم نے نظریں اٹھا کر ماں اور بہن کے متذبذب چہرے کو دیکھے۔

”اب کو ایک ہی جواب دیجئے کہ ہاشم اپنی مرضی سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اگر اس نے شادی کی تو اس کے لہا ہا میں محض ایک لڑکی ہے۔“

لہا اس بیگم نے قدرے طیش میں آکر بیٹی کو دیکھا اور کچھ کہنے کو لب و لکھنے لگے۔
 ”بھائی!“ ان کے کچھ کہنے سے پیشتر ماہین بول اٹھی۔ ”کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ انسانیت لہا ملے کسی برتر سر کھانا زیادہ مناسب ہے یا پھر اپنے خونی رشتوں اور اپنے ماں جاییوں کو زندگی بھر کی الجھنوں اور لہا سے بچا لینا محسن ہے۔“
 اُم نے ہنسنے لگا کہتے ہوئے بہن کو دیکھا۔

”ایک بات اچھی طرح سمجھ لو ماہین! میں نے محبت ضرور کی ہے اور میں کسی حد تک اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو رہی ہوں لیکن میں اپنے جذلوں کے ہاتھوں کوئی کھلونا نہیں ہوں۔ میں ایک واضح اور منطقی سوچ کے حاملہ ہوں۔ اپنی زندگی کے فیصلے کرنا چاہتا ہوں اور کروں گا۔ دوسری بات یہ کہ میں جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ اس لیے پلیز ایسی کوئی کوشش مت کرنا۔“

انہوں نے بے بسی سے ماں کی سمت دیکھا۔
 ”اُمہو میاں! صاف صاف کہہ دیتی ہوں، میں ایک مطلقہ اور بچے کی ماں کو اپنی بہو نہیں بناؤں گی۔ یہ میرا پہلا اور آخری فیصلہ ہے ہاں!“

”لکھک ہے۔“ وہ آسانی سے مان گیا۔
 ان دونوں کے چہروں پر قدرے بشارت آئی۔

”پھر مجھ سے شادی کرنے کے لیے اصرار مت کیجیے۔“ اس کے اگلے جملے نے دونوں کے منہ لٹکا دیے۔
اور حمزہ ماشاء اللہ نوجوان ہیں۔ چند ایک سالوں میں شادی کرنے اور گھر بسانے کے قابل ہوں گے۔ شوق
جہاں چاہیں ان کے رشتے بیچنے اور اپنے سب ارمان پورے کریں۔“
”اور تم“ بے ساختہ ان کے لبوں سے نکلا۔

”میری خواہش کو اپنی ضد بنا کر مجھ پر زندگی کی خوشیاں حرام کر دیں۔“ وہ اپنے کاغذات کی جانب متوجہ ہو
ہوئے بے رخی سے بولا۔ ”مجھے اپنی سزا قبول ہے۔“

فردوس بیگم اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ دوپٹے کا پلو انہوں نے آنکھوں پر رکھ لیا۔
”ارے کیا کھول کر پلا دیا اس چیزیل نے میرے بچے کو۔۔۔ کالا جادو کروایا ہے۔ ارے بونہی تو نہیں رات رات
بھرا بیغچہ میں پھرا کرتی تھی! اری ایقان! خدا تیرا بھلا کرے۔ میرے بھائی کی زندگی تباہ کی اور اس پچھل پھری
گھر کا رستہ دکھا کر میرا بچہ بولا کر ڈالا۔ ارے میں کہتی ہوں فاروق حسن! آؤ دیکھو اپنے لاڈلے کی کل افشائیاں!
اس کو پھولوں کا سہرا بنایا، لڑاؤ اس منوخی کو۔“

”ای۔ ای۔ ای۔“ ماہین نے انہیں جھنجھوڑا۔ ”خدا کا واسطہ چپ کریں۔“ انہوں نے ہڑبڑا کر دوپٹہ آنکھوں
ہٹایا۔ ہاسم کب کا کمرے سے جا چکا تھا۔
”ستی تاس ہو تیرا جادو گرئی۔“ وہ بڑبڑانے لگیں۔

سفید آٹو کو بورچ میں پارک کر کے اس نے برابر کی سیٹ پر رکھا اپنا سیاہ لیڈر بیگ اٹھایا اور گاڑی سے نکل کر
اسے لاگ کرنے لگی۔

آج وہ ہاسپٹل سے مارکیٹ چلی گئی تھی۔ عمر کتنے ہی دن سے ضد کر رہا تھا کہ اسے نئے طرنگ مارکرز کا سیٹ
چاہیے۔ سو آج وہ اس کے لیے مارکرز کا نیا سیٹ لیتے ہوئے آئی تھی۔ اس نے لاؤنج کا دروازہ کھول کر اسے پکارا۔
”عمر! عمر! دیر آریو مائی چائلڈ!“

اسے لپکارتے ہوئے وہ لاؤنج میں پڑے سیاہ صوفے پر جا بیٹھی۔ اس کے جسم میں دکھن کا احساس تھا۔ شدہ
سے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

منہ زہ بیگم بچن سے نکل کر آئیں تو وہ صوفے کی پشت سے سر نکائے آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی۔
”شہلا! انہوں نے آہستگی سے پکارا۔

وہ چونک کر سیدھی ہو گئی۔ اس کی نگاہ ان کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالی پر گئی۔
”جیسے میری ماں!“ وہ خوش ہو گئی۔ ”شدت سے جی چاہ رہا تھا آپ کے ہاتھ کی پیالی چائے پینے کا۔“ اس نے کم
تھام لیا۔

”یہ عمر کہاں ہے؟ آواز دینے پر بھی نہیں آیا۔ راجہ کی طرف گیا ہے کیا؟“

”ہوں!“ انہوں نے آہستگی سے ہنکارا بھرا۔

”انہیہ کہاں ہے؟“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

”پنے کمرے میں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

یکدم اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ اس نے ماں کا چہرہ غور سے دیکھا۔
”ای!“

انہوں نے نگاہیں چرائیں۔

”ای!“ شہلا نے کپ میز پر رکھ دیا۔ ”ادھر دیکھیں میری طرف۔“

”شہلا! بیٹا وہ۔ ذرا عورت سے میری بات سنو۔“ وہ بے بسی سے بالآخر گویا ہوئیں۔

”اسی۔۔۔ عمر کہاں ہے؟“ اس نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔
 ”بناؤ۔۔۔ آج وہی اس کے اسکول سے پرنسپل کا فون آیا تھا۔“
 ”ملا کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ منہ ذہ بیگم کے ہاتھوں پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیل پڑ گئی تھی۔“
 ”ممر۔۔۔ اس کے لب کانپے تھے“ کہاں ہے وہ؟“
 ”اس کا باپ اسے لے جانا چاہتا تھا۔ اس کی پرنسپل نے یہی کفرم کرنے کے لیے یہاں فون کیا تھا کہ آیا۔۔۔“
 ”وہ۔۔۔ اسے لے گیا؟ لے گیا نا۔۔۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔“
 ”شہلا! امیری بات سن لو۔۔۔ ابرار نے مجھ سے خود بات کی ہے وہ اسے چھوڑ جائے گا۔“
 ”وہ لے گیا اسے۔“ وہ پانکلوں کی طرح چیختی۔ ”وہ میرا بچہ لے گیا۔۔۔“ وہ کٹے ہوئے تنے کی مانند ان کی بانہوں

میں گری۔
 ”شہلا۔۔۔ شہلا۔۔۔ انہی۔۔۔ وہ بے طرح گھبرا کر چیخنے لگیں۔
 البتہ اپنے کمرے سے نکل کر بھاگی آئی۔
 ”آپ نے بتا دیا نا ای! میں نے منع کیا تھا آپ کو۔۔۔“
 اس نے شہلا کو صوفے پر لٹایا اور اس کے گال تھپتھپانے لگی۔
 ”ایا کہتی؟“ ان کے آنسو جھرجھرنے لگے۔
 ای لمحے باہر ایک ناموس ہارن بجا۔ ساتھ ہی کال بیل بھی بجی۔ انہی نے خوش امیدی سے ماں کو دیکھا۔
 ”میرا خیال ہے عمر آگیا ہے۔“ وہ اٹھ کر گیٹ کی جانب بھاگی۔
 اس کا اندازہ درست تھا۔ عمر گیٹ پر موجود تھا۔ دور جاتی ایک گاڑی کی سرخ بتیاں چمک رہی تھیں۔
 ”خالی جانی!“ وہ چکا۔ ”وہ میرے بھاتھے۔“
 البتہ اسے بانہوں میں بھر کر اندر چلی آئی۔
 ”دیکھو عمر۔ آپ کی ماما کو کیا ہو گیا ہے۔ اپنی ماما کو آواز دے۔ جگاؤ انہیں۔“ اس نے عمر کو شہلا کے قریب بٹھا

”ماما۔۔۔“ عمر نے ننھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھما۔ ”ماما! آنکھیں کھولیں نا۔ دیکھیں میں آگیا۔“ شہلا نے
 انہیں کھول دیں۔ چند لمحے وہ بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اسے خود سے چٹا کر زور زور سے رونے لگی۔
 ”ممر! امیری جان!“ وہ پناہ اس کا چہرہ اور اس کے ہاتھ چومنے لگی۔
 البتہ آنسو پونچھتی کچن کی جانب چل دی۔ صوفے پر بیٹھی منہ ذہ بیگم بالکل ساکت تھیں۔ ان کے خالی ہاتھ ان
 لگد میں دھرے تھے اور خالی آنکھیں کسی غیر مرنی نقطے پر مرکوز تھیں۔ آنسو ان کے دل پر گر رہے تھے۔

○ ○ ○
 اس کے ذہن کے پردے پر تصویریں بن اور بگڑ رہی تھیں۔
 وہ بند آنکھوں کے پیچھے آباد ایک چٹان سے گزر رہی تھی۔
 نقلی ہی لائنیں ادا بے شمار تصاویر تھیں۔ متحرک تصاویر مملو اور غیر مملو۔
 اس کا چھوٹا سا صحن تھا جس میں ہمارے سکھار کا درخت تھا۔ اس کے پھول ربیعہ کے اوپر گر رہے تھے۔ ربیعہ ہنس
 رہی تھی۔ صحن میں چمکی چار پانی پر دادی اور نفیسہ خالہ بیٹھی تھیں۔ وہ بھی ربیعہ کی خوشی میں خوش نظر آ رہی تھی۔

سمیعہ نے دیوار پر چڑھ کر اسے اشارے کرنے شروع کر دیے۔ ربیعہ اس کے اشارے سمجھ نہیں پا رہی
 تھی۔ ایک دیوار سے پر عرفان شوکت نمودار ہوا تھا۔ اس کے ساتھ حاکم چچا تھے۔ ان دونوں کے چہرے سخت اور
 لال تھے۔ ربیعہ کو ان کے ارادے ٹھیک معلوم نہ ہوتے تھے۔ وہ ڈر کر بھاگی تھی۔ رین کے پیہے بہت

بڑے بڑے تھے۔ ربیعہ کو ان آہنی پنجوں سے خوف محسوس ہوا۔ دفعتاً ریل گاڑی چمکھڑی، ربیعہ کی آنکھ یک لخت کھل گئی۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ ماتھے پر پسینے کا احساس تھا۔ اسے کچھ سرگوشیاں سنائی دیں۔ کوئی کمرہ میں دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ ربیعہ کو سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں تھی؟ وہ بے حس و حرکت بیٹی ٹامانوس چھوٹے کو کھوری رہی جس پر گندہ سا پٹھا لٹکا ہوا تھا۔ سرگوشیوں کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ چند نفوس اس کے سرہانہ مدھم آوازوں میں محو گفتگو تھے انہیں ربیعہ کے جاگنے کا علم نہ ہو سکا تھا۔

ربیعہ کو یاد آیا کہ وہ اپنے پچھپھا منور امین کے گھر میں تھی۔ وہ سفر سے بے حد تھک گئی تھی اس لیے کھانا کھانے ہی سو گئی تھی۔ ان دونوں نے اس سے سفر کے متعلق کوئی بات نہ کی تھی۔

نجانے وہ کتنی دیر تک سوتی رہی۔ اپنی جسمانی کیفیت سے اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے سوئے ہوئے بہت وقت ہو گیا تھا۔ وہ خود کو بالکل تروتازہ محسوس کر رہی تھی۔ ذہن مکمل طور پر چوکس تھا اور مزید سونے کی کوئی خواہش محسوس نہ ہو رہی تھی۔

ربیعہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سرگوشیاں یک لخت معدوم ہو گئیں۔ ربیعہ نے دیکھا اس کے سرہانے بچھے پانگ پر تین خواتین موجود تھیں۔ ان میں سے ایک مینا تھیں۔ ایک مینا سے بے حد مشابہ صورت کی بیس بائیس سالہ لڑکی تھی جو ان کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ دوسری لڑکی بھی اس کی ہم عمر تھی لیکن اس سے قدرے مختلف تھی۔ وہ تینوں اسے بیدار دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ پھر دوسری لڑکی مسکراتے ہوئے اٹھ کر ربیعہ تک آئی اور اس سے لپٹ گئی۔

”میں ترانہ ہوں۔ تمہاری پچھو زاد۔“ اس نے کہا تھا۔
اس کے گلے لگ کر ربیعہ کو دادی کے بعد پہلی مرتبہ کسی خونی رشتے کا احساس ہوا تھا۔
دوسری لڑکی بھی اٹھ کر اس تک آئی تھی مگر اس نے محض ربیعہ سے ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔
”یہ صولت ہے۔ مینا پچھو کی بیٹی۔“ ترانہ نے بتایا۔ ”مینا پچھو سے تم مل ہی چکی ہو۔“
ربیعہ نے مسکرا کر صولت کو دیکھا لیکن اس کی آنکھوں سے ٹپکتی سرد مہری نے اس کی مسکراہٹ مختصر کر دی۔
صولت اسے عجیب سے انداز میں دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کی آنکھوں میں جھانکنے کے بجائے وہ اس کے چہرے کے نقوش کا بغور جائزہ لے رہی تھی جیسے وہ ایک جیتی جاگتی ہستی کو نہیں بلکہ کینوس پر پینٹ کیے گئے کسی چہرے کو دیکھ رہی ہو۔

ربیعہ کنفیوزی ہو گئی۔
”ہی کہہ رہی ہیں انہوں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کیونکہ انہوں نے تمہاری ماں کو ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ تم بالکل اپنی ماں جیسی ہو۔“
”نہیں۔“ تب ہی کرخت لہجے میں مینا بولیں۔ ”اس کی ماں اتنی خوب صورت نہیں تھی۔ وہ سانولی تھی۔ اس نے رنگ اپنے باپ سے لیا ہے۔ ہاں نقوش سب ماں پر گئے ہیں۔“
”تو نقوش کچھ تو کتنے پیارے ہیں پچھو!“ ترانہ نے پیار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ ”اس کا مطلب یہ ہے کہ میری ممانی بہت خوب صورت تھیں۔“
”ہونہ!“ مینا ہمیں۔ ان کی ہنسی میں نفرت اور تضحیک تھی۔ ”حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا بی بی! اگن بھی ہونے چاہئیں۔“

ربیعہ ایک مرتبہ پھر چونک اٹھی۔ نجانے کیوں یہاں آکر اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کئی انکشافات اس کے منظر ہوں۔ وہ بے چین ہو گئی۔

”مجھے پیاس لگی ہے۔“ اس نے ترانہ سے کہا۔
”چلو پین میں چلیں۔ میں چائے بھی بناتی ہوں۔“ ترانہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔

اس نے ہاتھ میں خلوص اور محبت کی حدت تھی۔ ربیعہ کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔

”ہاں لوگ جلدی سو جاتے ہیں؟“ ربیعہ نے سوئے ہوئے ماحول کو دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں۔ ہم لوگ بھی نوبے تک سمجھو سو ہی جاتے ہیں۔ کبھی کبھار ہی ساڑھے نو دس کی نوبت آتی ہے۔“

”لوگوں پھت پر نسل رہی تھیں۔ فضا میں جس تھا اور گرمی کا واضح احساس ہو رہا تھا۔ دور دور تک سناٹا چھایا تھا۔“

”تو نہ بھائی اور تصور بھائی دیر سے لوٹتے ہیں۔ پھر پھپھو ہی اٹھ کر دروازہ کھولتی ہیں۔“ ترانہ نے مزید کہا تھا۔

”ایسے اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔ اچھا ہے تم بھی مل لینا۔“

ربیعہ خاموش رہی۔ اسے اپنی پھپھو کے لکھے ہوئے خطوط یاد آرہے تھے۔

”مادہ نہیں ہونا؟“ اسے یکایک یاد آیا۔

”ہاں نہیں تھیں۔“ ترانہ اداسی سے بولی۔ ”مجھ سے بڑی بہن تھیں۔ ان کا لڑکپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔“

”ان کے بعد امی بھی چل بسیں۔ ہم لوگ۔۔۔ چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ مینا پھوپھو کو طلاق ہو گئی تھی۔ ان کی

امی ابی اولاد ہے صولت۔ یہ ہمارے ساتھ ہی رہا کرتی تھیں۔ امی کے بعد انہوں نے ہی گھر سنبھالا۔ لیکن بس

امی ابی ہو گیا۔ جیسے ایک ماں اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے وہ بات تو نہ تھی نہ ہے۔ خیر وقت گزر گیا۔ اب

اس کا ایذا کر کرتا۔“

”لوگوں جلتے جلتے منڈیر تک آگئیں۔ دور منھی منھی روشنیاں دیوں کی مانند جلتی نظر آرہی تھیں۔ ربیعہ کو وہ

اہل فت سو گوار محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

”تم اپنی کوئی نانی امی کا چانک انتقال کیسے ہو گیا؟“

”پارٹ انیک۔“ ربیعہ اداسی سے بولی۔ ”میں اپنا آخری پرچہ دے کر لوٹی تو گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم

لوگوں کو کچھ کہنے سننے کا موقع تک نہ مل سکا۔ مجھے نہیں بتاوا دی جانے لگے مجھے کبھی بھی تم لوگوں کے متعلق کیوں

نہیں بتایا بلکہ انہوں نے تو کبھی مجھے میرے ابو امی کے متعلق بھی کچھ نہیں بتایا۔ میں تو ہوا میں اڑتے پتے کی مانند

ہوں گی تمام اور لاوارث۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ ترانہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”پھر مجھے ایک صندوق سے پھپھو کے خطوط ملے۔ تمہاری امی کے خطوط تب مجھے علم ہوا کہ میں اتنی بھی

ادارث نہیں۔ میرے بھی خونی رشتے موجود ہیں۔ ماں باپ نہ سہی۔ باپ کی بہن کے اہل خانہ تو ہیں ایک

احادہ بندھی۔ دل کو سکون ملا۔ پتہ نہیں پتہ نہیں۔ دادی نے ایسا کیوں کیا۔“

”نانی امی اور ابو کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔“ ترانہ نے آہستگی سے انکشاف کیا۔

ربیعہ چونک اٹھی۔

”دلوں نے تا عمر ایک دوسرے کا چہرہ نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ نانی امی نے اپنی قسم پوری کر لی۔“

”لیکن ایسا کیوں ہوا؟“ ربیعہ گم سم سی ہوئی۔

اس کے ذہن میں اپنی شفیق دادی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

”بڑھیا مر گئی۔“ ایک مکروہ ہنسی اس کے کانوں میں گونجی تھی۔

”نانی امی نے کبھی تمہیں کچھ نہیں بتایا؟“ ترانہ نے اندھیرے میں اس کا چہرہ کھوجنے کی کوشش کی۔

”نہیں، کبھی بھی نہیں۔“

”مینا پھوپھو۔۔۔ تمہارے ابو کی منگیتر تھیں۔“ ترانہ نے انکشاف کیا۔ ”امی ابو کی شادی کے ساتھ ہی ان کی

صلح ہو گئی تھی۔“

ربیعہ گم ضم میٹھے جاری تھی۔
 ”لیکن یہ ممکن اس وقت ختم ہو گئی جب ماموں نے اپنی پسند سے شادی کر لی، تمہاری امی سے۔ سواہ اور نانا کے مابین بہت بڑی رجس پیدا ہو گئی۔“
 اندھیرے میں پیدا ہونے والی آواز نے دونوں کا دھیان بیٹایا۔ سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی بیساکھی کے سہارے سیڑھیاں چڑھ رہا ہو۔
 ”تمن بھائی آگئے۔“ ترانہ یکایک بولی۔

چند لمحوں میں اندھیری سیڑھیوں پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹک تھی۔
 ”ترانہ! ایک بھاری آواز گونجی۔
 ”جی بھائی، آجائیں۔“ ترانہ بولی۔

اسٹک کے سہارے چلا ہوا سایہ ان تک پہنچا۔ دیوار پر لگے چالیس واٹ کے بلب کی ملگجی بیمار روشنی نے اس کا سر ادا واضح کرنے کی کوشش کی۔
 وہ ایک پراسرار قسم کا شخص تھا۔ ربیعہ کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا۔ کھنی، بھنوں کے نیچے چمکتی پراسرار

نگاہیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔
 ”اسلام علیکم۔“ ربیعہ نے آہستگی سے سلام کیا۔
 ”و علیکم السلام۔“ وہ ہنوز اسے گھورتا رہا۔

”بھائی! یہ ربیعہ ہیں۔ جہاں نسیب ماموں کی۔“
 ”معلوم ہے۔“ اس نے بہن کی بات کاٹی ”مجھے روٹی دو۔“

وہ واپس مڑ گیا۔ اسٹک کی آواز لمحہ بہ لمحہ مدھم ہوتی گئی۔ ترانہ شرمندہ سی ہو گئی۔
 ”معاف کرنا ربیعہ! یہاں سب لوگ بس ایسے ہی ہیں۔ اکھڑ اور بد مزاج سے۔ لیکن تمہیں کوئی کچھ نہیں

کے گا۔ تم فکر مند مت ہونا۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ سمجھو، میں تمہاری بڑی بہن ہوں یہاں کا ماحول تو ایسا ہے کہ مجھے خود شدت سے ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔“ وہ اداسی سے بولی۔
 ”تمن بھائی کو کھانا دے دو۔“ وہ آہستگی سے بولی ”میں نہیں بھوک لگی ہوگی۔“

”ہاں۔“ ترانہ ہنس دی۔ ”میں نہیں بھوک بہت لگتی ہے۔“

”ترانہ اور صولت دونوں نوکری کرتی ہیں۔ ترانہ ٹریولنگ ایجنسی میں کام کرتی ہے، صولت اسکول میں پڑھاتی ہے۔ ویسے تو صولت، ترانہ سے کافی چھوٹی ہے۔ لیکن بے چاری کم عمری میں ہی روزگار سے لگ گئی ہے تمن اور تصور کپڑے کی دکان چلاتے ہیں۔ پہلے بھائی یہ کام کرتے تھے لیکن فاج کے انیک کے بعد وہ تو بس ایک پلنگ کے ہی ہو رہے اب انہیں چھوٹے بچوں کی طرح چالنا پوسنا پڑ رہا ہے۔ لڑکوں پر وقت سے پہلے ذمہ داری آ پڑی اس لیے کچھ چیزیں ہو گئے ہیں۔ تصور تو خیر بہتر ہے اپنی پڑھائی بھی کرتا ہے۔ اسی لیے کافی دیر سے لوٹا ہے۔ لیکن تمن! چلو خیر! روزگار پر لگاؤ کا ہے، مزاج کا تیز ہے تو کیا ہوا۔“

انہوں نے رک کر ربیعہ کا چہرہ دیکھا۔ وہ کچھ دھیان کچھ بے دھیانی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔
 ”اس گھر میں کوئی کسی کو کچھ دینے کا روادار نہیں ہے۔ لڑکے جو کماتے ہیں جیب میں رکھتے ہیں۔ زیادہ سے

زیادہ گھر میں سوداؤ الودیتے ہیں، مہینے کا بجلی، گیس کا بل دے دیتے ہیں۔ ترانہ کی تنخواہ تو آدمی سے زیادہ باپ کے علاج پر اٹھ جاتی ہے۔ پھر آنا جانا ملنا بڑتا، عید تہوار۔ یہ سب بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ اور صولت بے چاری کی تو تنخواہ ہی کتنی ہے۔ کرایوں میں پوری ہو جاتی ہے۔“

ربیعہ کو اب ان کی بات پر مکمل دھیان دینا پڑا۔ ان کا مطلب کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔ اس نے جائے گا کپ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں مٹھل کیا۔

”ترانہ نے لی اے کیا ہے۔ ایک جاننے والے کے توسط سے اسے یہ نوکری مل گئی۔ صولت بے چاری تو اس سے آگے بڑھ ہی نہ سکی۔ ایسے حالات میں آدمی یا تو پڑھ لے یا کھالے۔ پھر بھی تھوڑا بہت جو بھی ہے اپنا لٹا دیتا ہے۔ تم نے بھی تو پی اے کیا ہے نا؟“

اسوں نے ہاتھ میں زبان کی سی تیزی سے چلتی چھری کو چند لمحوں کے لیے روکا۔ وہ بالک کاٹ رہی تھیں۔

”جی!“ ربیحہ کے لبوں سے آہ کی صورت نکلا۔

”ہاں تو تمہیں بھی مل جائے گی نوکری۔ میں ترانہ سے کہوں گی۔ تمہارے لیے بات کرے!“ وہ اس کا جھکا ہوا سر اٹھاتے ہوئے بولیں۔

”تمہاری ہوا دی نے کیا بتایا ہے تمہیں، تمہاری ماں کے متعلق؟“ دفعنا ”میں نے سوال کیا۔ ربیحہ چونک اٹھی۔

”کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں بتایا۔“ وہ قدرے خوفزدہ سی ہو کر گئی۔

وہ چند لمحوں کے لیے اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ ان کی نظروں میں ابھرتا طنز اور تحقیر کا جذبہ ربیحہ کو اندر تک سُراپتا تھا۔

”اچھا کیا!“ کچھ تھا بھی نہیں اس لائق کہ بتایا جاتا۔“ ان کا لہجہ بے حد سخت تھا۔

رہجہ نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے جینے کے لیے ڈھیر سارا حوصلہ درکار تھا لیکن پھر بھی وہ حتی الامکان چھنک کر خواہش مند تھی۔



وہ دیر بے دیر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ نگاہیں غلامی میں جھٹک رہی تھیں اور وہ کہیں دور ہلی ہوئی تھی۔

”مما!“ عمر نے پکارا۔ وہ چونک اٹھی۔

”تم سوئے نہیں اب تک؟“ وہ حیران ہوئی۔

وہ اسے بچانے کب سے سویا ہوا سمجھ رہی تھی۔

”نہیں ممما! مجھے نیند نہیں آرہی۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

شہلا سمجھ گئی تھی کہ اس کے ذہن میں کیا ہے مگر وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”نیند نہیں آرہی تو اپنی خالہ جانی کے کمرے میں چلے جاؤ“ وہ آف موڈ کے ساتھ بولی۔ ”مجھے نیند آرہی ہے اور

میں سونا چاہتی ہوں۔“

”آپ مجھ سے ناراض ہیں ممما؟“

”نہیں عمر۔ بس میں بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔

”اچھا! نہ کریں بات۔ بس سنتی جائیں۔ مجھے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوا۔

شہلا نے آنکھیں کھول کر اسے خفگی سے گھورا۔

”میرے بھیجے میں اتنا دم نہیں ہے۔“

”مما! غصے سے کیوں بول رہی ہیں۔“ وہ سہم گیا۔ ”میں نے تو نہیں کہا تھا کہ آپ بیباک اس کو بھیجیں۔ مجھے

کہتا بھی نہیں تھا کہ وہ میرے بیباک ہیں۔“

شہلا نے بے بسی سے سانس بھری۔ بچے سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ خاموش ہو رہی۔

”وہی وہ اچھے ہیں ممما۔“ وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔ ”آپ کبھی ملی ہیں ان سے؟“

شہلا کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ اس نے نچلا لب و انتوں تلے دبا کر ہنسی روکی۔

”آپ اگر مجھے ملیں ان سے تو۔۔۔“

”عمرو! شہلانے اسے گھورا۔“ جتنا نہیں تم کب بڑے ہو گے اور مجھے ان فضول سوالوں سے نجات ملے گی۔“
 ”میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی ماما۔ آپ یونہی ڈانٹتی رہتی ہیں۔ پہا تو میری باتوں سے بہت خوش ہو رہا تھا۔ وہ کہتے رہے تھے۔ برہیلنٹ بوائے، برہیلنٹ بوائے اور آپ کو میری باتیں فضول لگتی ہیں۔“
 ”پہا کے سگے“ اس کی جان جل کر کباب ہو گئی۔ ”ایک دن باپ نے چو پکلے اٹھالیے تو لگا ہے قصیدہ غزل
 کرنے۔ پوچھا نہیں اس سے اتنے سال کہاں گم تھا؟“

عمر سہم کر خاموش ہو گیا۔ شہلا کا دل لمحہ بھر میں موم کی طرح پکھل گیا۔ اس نے اس کا سر سینے سے لگا لیا۔
 ”سوری بیٹا! آئی ایم سوری۔“
 ”ماما!“ وہ گلو گیر لہجے میں بولا۔ ”آپ مجھ سے ایسے نہ بات کیا کریں۔ میں نے پہا کو بھی بتایا تھا کہ میری ما
 بہت سوفا اسپون کن ہیں۔ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔“
 ”پھر انہوں نے کیا کہا؟“ اس نے خود سے بھی چھپ کر آہستگی سے پوچھا۔
 ”انہوں نے؟“ وہ سوچنے لگا۔ ”کچھ نہیں ماما۔ کچھ نہیں بولے۔“
 شہلا نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”جھوٹ بول رہے ہو؟“

”نہیں ماما! جھوٹ بول رہے تھے۔“ وہ جلدی سے بولا۔
 ”کیا؟“

”کہہ رہے تھے۔ تمہاری ممالیف سکسٹین اور جموئیٹ کے جیسی ہیں۔“
 ”کیا؟“ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔
 ”میں نے نہیں کہا ماما! کہہ رہے تھے۔“ وہ جلدی سے کبل میں گھس گیا۔
 شہلا غصے سے کانپنے لگی۔



وہ اپنی شادی کی تصاویر کا البم کھولے بیٹھی تھی۔ اس کا جی نہ جانے کیوں گھبرا رہا تھا۔ کچھ اور سمجھ میں نہ آیا تو
 یہی مشغلہ نکال کر بیٹھ گئی۔

اس کے ویلیم کے سوٹ کا رنگ گرین تھا اور شادی کا جوڑا گلابی رنگ کا کچھ یادیں دھنک کی طرح اس کی
 آنکھوں میں بکھر گئی تھیں تو ایک سنہری مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھر گئی۔

”یاروینڈنگ ڈریس گرین ہونا چاہیے۔“
 ”کیا؟ تمپاگل ہوئے ہو؟ شادی کے دن ہر اجوڑا پسینوں؟ میں طوطا ہوں کیا؟“
 ”طوطا تو روز پھنتا۔ ہے تم بس شادی کے دن پہنتا۔“ وہ مزے سے بولا۔
 ”میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ میں لال جوڑا پہنتوں گی۔“
 ”خبردار! میں کمرے سے نکال دوں گا۔“

”میں کمرے میں آؤں گی ہی نہیں، میں تمہارے گھر ہی نہیں آؤں گی۔ بلکہ تم سے شادی ہی نہیں کروں
 گی۔“ ”جو مرضی کو۔ میں گرین ڈریس بھجواؤں گا۔“ ”میں اٹھا کر پھینک دوں گی۔“

”ضرور پھینکنا مگر شرط یہ ہے کہ جوڑے میں تم بھی موجود ہو۔ میں کیچ کر لوں گا۔“
 ایقان کو ہنسی آگئی۔ اس کی نگاہ ویلیم کی تصویروں پر جمی ہوئی تھی جس میں اس نے عاشق کا بہت چاہتوں سے
 قرب کیا گرین ڈریس پہنا ہوا تھا۔ اسے یاد تھا ویلیم پر اس کے حسن کی دھوم مچ گئی تھی۔ سبز جوڑے میں اس
 کے حُسن کی مانیایاں۔ پنے عروج پہ تھیں۔
 صوفے کی پشت سے سر نکال کر اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کا شہد نکلتا، محبت بھرا لہجہ اس کے کانوں میں

گولجے لگا۔

”دیکھو یہ رنگ تمہارے لیے تو بنا ہے۔ تمہاری شہد جیسی رنگت کے لیے، شریقی آنکھوں کے لیے، احمریں لہلہ کے لیے۔“

دفعاً وہ چونک اٹھی۔ کال بیل بج رہی تھی۔ اس نے اہم سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی سمت چلی۔ باہر کئی فردوس بیگم اور ماہین کو دیکھ کر وہ بے حد حیران مگر خوش ہوئی تھی۔
”صد شکر آپ لوگوں کو میرا خیال بھی آیا۔“

”اے بی بی! خیال تو سو بار آتا ہے اور سو بار آئیں بھی مگر یہ بڑھاپا بھی عجیب شے ہے۔“ فردوس بیگم ہانپتی کانپتی منہ پر بیٹھتے ہوئے بولیں ”نہ دماغ ہی اپنا، نہ جسم، ہر شے اپنی مرضی کرنے لگتی ہے۔ بندے بشر کے بس میں کچھ ایس رہتا۔ اچھا تمہاری پلاؤ۔“

ایقان جلدی سے فرنیچ سے بوتل نکال کر لے آئی۔
”اصل میں امی کا مسئلہ یہ ہے کہ لفٹ میں سوار نہیں ہوتیں۔ انہیں ڈر لگتا ہے، کہتی ہیں، تیسری منزل تک مہماں چڑھ لیں گی لیکن لفٹ میں نہیں چڑھیں گی۔“ ماہین نے ہنستے ہوئے بتایا۔
”ارے بھائی جان کچھ نہیں ہوتا۔ آپ نے یونہی وہم پالے ہوئے ہیں۔ منٹ میں بندہ تین منزلیں چڑھ جاتا۔“ ایقان بھی ہنسنے لگی۔

”نہ ہوئی! تم ہی منٹ میں چڑھو، منٹ میں اترو۔ جو کبھی لائٹ بند ہو جائے تو میرا تو دم ہی نکل جائے گا۔ یہ اے بھلی والے گھنٹے بھر میں سو بار تو کھیل لیتے ہیں آنکھ مچولی۔ انہوں نے پانی پی کر خالی گلاس اسے تھمایا۔
”تو جزیرہ چل جاتے ہیں بھائی جان۔“ ایقان نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”لیکن آپ کہاں مانیں گی! اچھا یہ ماہین یا خاظو تواسع کروں آپ لوگوں کی۔ کھانا بھی تیار ہے۔“
”کھانا ہم کھا کر آئے ہیں پھپھو!“ ماہین جلدی سے بولی۔ ”اور تکلفات رہنے دیں۔ امی بہت ضروری کام سے آئی ہیں آپ کہاں۔“

اس نے حسام کو گود سے اتار کر مومن اور ایمان کے حوالے کر دیا جو بے حد اشتیاق سے اس کے پاس کھڑے ہوئے۔ حسام کو دیکھ رہے تھے۔
”اچھا میں چائے بنا دیتی ہوں۔“

”بن جاتی ہے چائے بھی“ فردوس بیگم نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا ”تم ذرا دو گھڑی بیٹھو ادھر، بڑا دلالت نکال کر ہمت باندھ کر آئے ہیں ورنہ تمہارے گھر کی تو سیڑھیوں کے خیال سے ہی میرا جی ہولتا ہے۔“
”ایسی بھی کیا بات ہو گئی۔“ ایقان فکر مند ہوئی۔

”بس بی بی کیا کہیں۔ ہمارے تو نصیب ہی برے ہیں۔ جی کو کوئی نہ کوئی روگ لگا ہی رہتا ہے۔ تم ذرا ایک بات اچھا سوچو، جسم ہے تمہیں جھوٹ نہ بولنا۔“

ایقان حیران نگاہوں سے بھانج کی سمت دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔
”یہ جو تمہاری ہم جولی ہے، ڈاکٹرنی، اس کا ہاشم میاں کے ساتھ کیا چکر ہے؟“ وہ بغور ایقان کی سمت دیکھ رہی تھی۔

ایقان پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
”البتہ کیا کہہ رہی ہیں بھائی جان! خدا کا خوف کریں۔ آپ۔ آپ شہلا کی بات کر رہی ہیں نا۔ اس غریب، تو خبر بھی نہیں ہے ایسی کسی بات کی۔“

”رہنے بھی دو۔“ وہ برامان گئیں۔ ”تم کب اپنی سیلی کی بات کہو گی، ہم سے۔ بھلا ایسے تو نہیں کوئی کسی کا دیوانہ ہوتا ہے کہ اپنی زندگی خراب کرنے پر تل جائے۔“

”بات کیا ہوئی؟“ ایقان نے بے بسی سے مایں کی سمت دیکھا کہ شاید ابھی بات کا کوئی سرا ہاتھ لگے۔
 ”بھائی! ڈاکٹر شملہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ مایں دھیرے سے بولی۔ ”اور وہ کہتے ہیں کہ اس فیصلے میں کا رو بدل ممکن نہیں ہے یا تو شادی کریں گے ہی نہیں یا صرف اور صرف ڈاکٹر شملہ!“
 ”ماں! گاؤ!“ ایقان نے سر ہٹا کر کہا۔ ”ہاں اب تک۔“

”چلو اس کی شادی سے پہلے کہتا تو کوئی بات بھی تھی۔ اس کا تم سے دوستانہ تھا، گھر آتی جاتی تھی، ہمیں بھی بل لگتی تھی۔ پر اس لڑکے کے تو تیر ہی جدا تھے۔ تمہاری تو دانت کاٹنے کی دوستی تھی، تم سے کیا پوشیدہ ہے۔ انہوں نے اشاروں اشاروں میں اسے چھپیلی باتیں یاد دلائی۔“ ”ہم ایک بچے کی ماں کو اپنے سب سے بڑے بیٹے کی دلہن بنا لائیں تو کیسی بھداڑے گی پورے خاندان میں کہ لو! تان ٹوٹی تو کماں ٹوٹی۔ اسی بیٹے پر اترا تو ہوا تھیں۔ لے آئیں مطلقہ گھنوں کی پوری!“
 انہوں نے چشم تصور سے خود کو ملنے والے طعنے ملاحظہ کیے۔

ایقان کیا کرتی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ ہر چند کہ اس کے اپنے دل کو اس خیال سے راحت سی ملی تھی۔ اس کا عزیز ازجان دوست کا گھر پھر سے بس جاتا۔ کتنوں کا بھلا ہوتا۔ ایک معصوم بچے کو باپ کے نام کا سائبان مل جاتا۔ لیکن ظالم زمانے کی رسمیں! اس کی عزت مآب بھابی کی بھد نہ اڑ جاتی پورے خاندان میں اس نقصان کا ازالہ کیا کس طرح ہو پاتا۔

”کس سوچ میں پڑ گئیں تم۔“ فردوس بیگم پریشان ہوئیں۔ ”مسئلے کا کچھ حل بتاؤ۔“
 ایقان چونکی۔ جو کچھ سوچا تھا وہ نوک زباں پر لانے کی تاب نہ تھی۔
 ”میں کیا کہوں بھابی جان!“ وہ کھنکھارتے ہوئے بولی۔ ”جو آپ مناسب سمجھیں!“
 ”اے ہمارا کیا مناسب کیا نامناسب۔ ہم تو اس لیے آئے ہیں کہ ہماری خاطر ذرا سا جھوٹ بول دو۔“
 ”جی؟ میں سمجھی نہیں۔“ وہ ابھی۔
 ”ہاں میاں کو کسی بہانے سے بلا کر بات کرو۔ اس سے کہو کہ شملہ نے انکار کر دیا ہے۔ شادی سے۔“
 ”میں۔۔۔ میں کہوں؟“ وہ گھبرا گئی۔

”ہاں۔ اور ادھر شملہ کو سمجھا دو کہ ایسا کوئی خیال ہے بھی جی میں تو اسے نکال پھینکتے۔ اس کو کہہ دو ہاشم کے گھر والے کبھی بھی اسے اور اس کے بچے کو قبول نہیں کریں گے چاہے زمین و آسمان ایک ہو جائے ہاں۔“
 ”لیکن بھابی جان۔ میرا یقین کریں، شملہ کو ہاشم کے جذبول کا بالکل علم نہیں ہے۔ وہ قطعاً بے خبر ہے۔ ایک بے قصور شخص کو ایسی کڑی بات کیوں کہی جائے بھلا۔“

”اچھا! پھر ہاشم کو سمجھا دو۔ کسی بھی طور کوئی بھی جھوٹ بول کر۔ وہ سر پھراڑا کا ہمارے بس کا تو نہیں۔“ ایقان بری طرح پھنس گئی تھی۔ جانتی تھی، بھادرج کے دل میں پہلے ہی اس کی جانب سے کٹنا چھہا ہوا تھا۔ وہ اس کی جانب سے بدظن رہتی تھیں۔ اب کوئی اونچ نیچ والی بات اس کے لبوں سے نکلتی تو وہ بالکل ہی اٹھ جاتیں۔
 ”پچھو! یہ کام آپ کو کرنا ہی کرنا ہے۔“ مایں نے اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر کہا۔ ”بھابی آپ کی بات مان بھی جاتے ہیں۔“

”ہم بڑی آس لے کر آئے ہیں۔“ فردوس بیگم نے بے حد ٹٹھے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”مہم ہمیں مایوس مت کرنا۔“

ایقان کواشات میں سر ہلاتے ہی بنی ہر چند کہ اس کا اپنا دل اس کام کے لیے ہرگز آمادہ نہ تھا۔
 ”فردوس بیگم اور مایں پھر زیادہ دیر نہ ٹھہریں۔“ مایں کے شوہر نسیم کو اس کو لے جانے کے لیے آتا تھا اور وہ ان کی ”حیاتِ ولا“ آمد سے پہلے واپس جانا چاہتی تھیں۔
 ”پچھو! اگر آپ ہاشم بھائی کو زرین کے لیے راضی کر سکیں تو۔۔۔“ اس نے ماں کی نظر بچاتے ہوئے اس کا ہاتھ

”اے دبا کر کہا۔“ سرال میں میری قدر بڑھ جائے گی!“

انہوں نے ایک مرتبہ پھر بے دلی سے سر ہلا دیا۔

ان دنوں کے چلے جانے کے بعد وہ چائے کے برتن سمیٹ کر کچن میں چلی آئی۔ وہاں کئی کام اس کے منتظر تھے۔

”مفتخر العیال کا شکار ہو رہی تھی۔“
 ”مفتخر العیال کی طرح چوکی۔ یہ وقت تو کسی کی آمد کا نہ تھا۔ وہ اب بھتی ہوئی دروازے کی سمت بڑھی تھی۔
 اور پھر ہر کھڑے ہاشم اور رافع کو دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔ بظاہر اس نے بے حد خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔
 ”واہ بھئی! آج تو بھاگ جاگے ہمارے۔“

”اویسی ہیں پھوپھو جانی! پچھپاری کیسی ہے؟“
 ”لرست کلاس!“

”اویسی آتے ہی بچوں کے ساتھ لگ گئے تھے۔ ایقان ان کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی آئی۔ ان کی آمد کا
 صدمہ وہ کچھ سمجھ ہی گئی تھی۔

”راہ میں چلا آیا۔“

”ہمارے پھوپھو میاں کے کیا حال ہیں فون ہون کرتے ہیں یا قاعدگی سے؟“
 ”بے قاعدگی سے!“ ایقان نے تصحیح کی۔

”کوئی آیا تھا کیا؟“ اس نے لوازمات سے بھری ہلہلوں پر نگاہ کی۔ ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو کر سوچنے

”اے۔“ پھر وہ بولی۔ ”بڑوس کی فیملی تھی۔“

”میں اچھا ہے فلیٹ سسٹم بڑا کامیاب ہے اسی لیے۔“ وہ بھٹی ہوئی مونگ پھلی کھانے لگا۔

”پھوپھو کا خیال آگیا کسی کام سے آئے ہو؟“ اس نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا ”یہ تو آنے والے نہیں

”اے۔“

”راہ میں دیا۔“

”لکھ۔“ جمیں ڈیڑ پھوپھو! بے حد ضروری کام سے آئے ہیں۔“ اب وہ سموسوں پر ہاتھ صاف کرنے لگا تھا۔

”ایقان ذرا بیٹھ کر بات کرتے ہیں آرام سے۔“

”اے۔“ کسی لڑکی کا چکر ہے کیا؟“ وہ ہنسی۔

”راہ کا منہ تک جاتا ہوا ہاتھ رک گیا۔“

”اے۔“ ٹانگ! یو آر گرےٹ۔“ وہ خیر سے بولا۔

”ایقان مسکرا دی۔“

”اپنے کپ لے کر وہ تینوں ٹیرس پر بڑی کرسیوں پر بیٹھے۔ تاروں سے بھرا ہوا آسمان اور نیچے روشنیوں
 کا ہر بہت خوب صورت معلوم ہو رہا تھا۔ ایقان نے دیکھا وہ دونوں نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو
 لے رہے تھے۔ اس نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی اور سنجیدہ سی صورت بنا کر بیٹھی رہی۔

”اے۔“ ہالا آخر رافع کھنکھارا۔ ”ڈیڑ پھوپھو! ایک گنبد سمسلمہ درپیش ہے جس کے لیے آپ کے پر خلوص
 لہر تعاون کی اشد ضرورت ہے۔“

”ہم!۔“ وہ اتنا ہی بولی۔

”اے۔“ انہوں نے پھر نگاہوں کا تبادلہ کیا۔

”اے۔“ کے متعلق تو آپ نے سنا ہوگا؟“ رافع پھر بولا۔

”اے۔“ ایقان بھی ہنس دی۔ ”بد تمیز!“ ہاشم نے اسے گھورا۔ ”ٹھیک طرح بات کرو نا۔“

”بھئی میں تمہید باندھ رہا ہوں۔“ اس نے وضاحت کی۔

”کون شکار ہو گیا کیونکہ تیر کا؟“ ایقان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بہت پرانی بات ہے پھپھو جانی۔“ رافع نے سرد آہ بھری۔ ”لیکن زخم ہے کہ بھرتا نہیں، بزبان شاعر۔“

محبت بھی ہے کیا روگ فراز
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا

”تم اپنی بات کر رہے ہو یا ہاشم کی؟“ ایقان نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

”باپ رے باپ!“ رافع نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ ”پنا تو یہ ڈپارٹمنٹ ہی نہیں ہے نا۔ عشق کا دیوتا تو منہ

بیٹھا ہے۔ یہ آپ کا عزیز از جان بھتیجا۔“

ایقان نے ہاشم کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ ”اور وہ ونس کون ہے؟“

”میں! راجھے! اب پھوٹا پنا کچھ۔“ رافع نے اسے گھر کا۔ ”پنی بارات میں نہیں بیٹھے ہو۔“ ہاشم نے سرا

اس کی آنکھوں میں بے بسی تھی۔

”یار پھپھو! میں محبت میں ہنڈرڈ پرسنٹ رازداری کا قائل ہوں لیکن اس جذبے کے ہاتھوں ایک مرتبہ

سخت قسم کا نقصان اٹھا چکا ہوں۔ اب تک دل تاوان بھرتا ہے اس لیے اس مرتبہ بہت مجبور ہو کر اس کا ناہ

رہا ہوں۔“

”لو۔“ ایقان نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا ”کیا نام ہے؟“

”شہلا!“ وہ بے ساختگی سے یوں بولا تھا جیسے لیوں نے جنبش سے کنول کھلایا ہو۔ اس کی نظروں سے دم

پھوٹی تھی۔ چہرے پر سے جیسے کوئی ستارہ گزرا تھا۔ ایقان مبسوط رہ گئی۔

”بہت چاہتے ہو نا؟“ اس نے بے ساختگی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”بہت پھپھو!“ وہ بے بس ہو گیا۔

”تو دیر کیسی؟“

”میں تھیک ہوں نا پھپھو؟“ اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

”ہنڈرڈ پرسنٹ!“ وہ نقیض سے بولی۔

”آپ میرے ساتھ ہیں؟“

”ہنڈرڈ پرسنٹ۔“ اس نے ہاشم کے ہاتھ دبائے۔ رافع ہو نقیض کی مانند ان دونوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔

ایک طویل مباحثے کا سوچ کر آیا تھا گریساں تو لمحہ بھر میں سب معاملات طے ہو گئے تھے۔ ”پھر میں کیا کروں ہم

گھر والوں کو کیسے مناؤں؟“

”تم روٹھایا ر مناؤ باقی تو یوں مانیں گے۔“ اس نے چٹکی بجائی۔

”یار پھپھو! آپ تو بڑی کاریگر نکلیں۔“ رافع کے لہجے میں ستائش تھی۔

”چل بدھو!“ ایقان نے اسے چپت سے نوازا۔ تو کیا جانے ان باتوں کو تیرا تو یہ ڈپارٹمنٹ ہی نہیں۔“



رات بے حد خوب صورت تھی۔ نور سے سچی ہوئی محبت بھری ہواؤں سے لبریز ہاشم تادیر درتچے میں کھڑا

ایک بازو کھڑکی کی چوٹ سے نکالے دوسرا ہاتھ پیٹ کی جیب میں ڈالے وہ نچانے کیا کچھ سوچے چلا جا رہا

ٹھنڈی ہوا بار بار اس کی پیشانی پر بکھرے بالوں سے اٹھکھیلیاں کرنے چلی آتی تھی۔

یہاں تک کہ دیوار پر لگے کلاک نے بارہ بجنے کا اعلان کیا۔ ہاشم نے ابھی ابھی سی نظروں سے کلاک کی

دیکھا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا تا فون تک چلا آیا۔ ”تو آج یہ دریا پار کر ہی لو!“ اس نے خود سے کہا اور رہا

اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

”سری جانب بیل جا رہی تھی۔ ہاشم کو اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔
 ”ہلو۔“ چند لمحوں میں نیند سی بھری آواز ریسور سے ابھری تھی۔ ”ڈاکٹر شملہ! ہینئر۔“
 ”ہلو۔“ اس نے دوبارہ کہا تھا۔ ہاشم دھیرے سے مسکرا دیا۔
 ”ہیلو.....“ پھوہ آہستگی سے بولا۔ ”میں ہاشم بات کر رہا ہوں۔“
 ”سری جانب چند لمحوں خاموشی چھائی رہی پھر اس کی ابھی ابھی آواز آئی۔
 ”اوں ہاشم؟ سوری میں نے پہچانا نہیں۔“
 ہاشم نے مہری سانس بھری۔

اجنبی جیسے اجنبی سے ملے

”الاطویل سفر تھا اور کس قدر کڑا! جس کی صورت اس کی آنکھ کی پتلی پر نقش تھی وہ اسے نام سن کر بھی نہ پہچان
 ال۔ اس کا جی چاہا وہ فون بند کر دے۔
 صحت کے خوبصورت اور انمول جذبے کا اظہار وہاں ہونا چاہیے جہاں کوئی اپنی سماعتیں یہی سننے کو وقف کیے
 ۱۱۔۱۔ ایسے میں اظہار اور بھی انمول اور قیمتی ہو جاتا ہے۔
 اس کا فلسفہ محبت تھا جس پر وہ گزرے ہوئے نکل تک قائم تھا لیکن آج اسے اپنا نظریہ بدلنا پڑ رہا تھا بحالت
 ۱۱۔۱۔ پی مجبوری حالات کی سختی کی عطا کر رہی تھی۔ آج وہ اپنا قیمتی انمول سیپ میں بحفاظت رکھے ہوئے موتی
 اظہار ان سماعتوں کی نذر کرنے جا رہا تھا جنہوں نے اس کے نام کو اجنبی جانا تھا۔
 ۱۔ آپ ہاشم فاروق حسن تو نہیں؟“ یکایک نیند سے جاگی ہوئی شملہ کی کسی سوئی ہوئی حس نے کام کیا

”ہاں۔“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ ”ورنہ میرا دل تو بڑی شدتوں سے آپ کی بے مہری کا گلہ کرنے
 صواب تھا۔ اس طرح کہ زباں میں قوت گویائی تک نہ رہی تھی شملہ دھیرے سے ہنس دی۔
 ”ہی ہاشم۔“ سوری دراصل میں کچھ دیر پہلے نیند کی گولی لے کر سوئی تھی۔ میرے حواس پوری طرح
 ۱۔ میں لر رہے تھے۔ لیکن دیکھیں دیر سے ہی سہی میں نے پہچان لیا ہے۔ خیر تو ہے ناگھر میں؟“
 ۱۔ ”نکولا زرتشتی ہیں؟“ ہاشم نے اس کے سوال کے جواب میں سوال داغا۔ وہ بھی نہایت حیرانی کے

”اے ہاشم۔“ وہ مختصر ”ہولی۔“ ایقان تو ٹھیک ہے نا؟“

”ب ٹھیک ہیں آپ بے فکر رہیں۔“ وہ ہنس دیا۔ ”میں نے اس وقت آپ کو بطور ڈاکٹر ہی نہیں دی
 ۱۔ ”وہ بھی ہنس دی۔“ ”کیا کروں۔۔۔ بارہ بجے کے بعد تو جو بھی فون آئے وہ میں بطور ڈاکٹر ہی ریسور کرتی
 ۱۔ ان میں اور کوئی بات ہی نہیں آتی۔ کیسے! کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“
 ”میں ہند کھوں کے لیے خاموش ہو رہا کتنے جملے ترتیب دیے تھے درتچے میں کھڑے ہو کر چاند کو تکتے ہوئے“
 ۱۔ اس نے برسات کی صورت خیالوں کا سب غبار دھو ڈالا تھا۔ وہ خالی الذہنی سے ریسور تھامے کھڑا تھا۔
 ”میں کنفیوژن کا شکار ہو رہی ہوں۔ آخر آپ کچھ کتنے کیوں نہیں؟“ وہ بالآخر الجھ سی گئی۔
 ”ملا! میں۔۔۔ میں آپ کو پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ بلکہ کر رہا ہوں۔ آپ میری زندگی میں شامل ہونا پسند
 ۱۔ ”

۱۔ بات کہہ کر وہ اپنے دل کی دھڑکنیں گنتے میں یوں مصروف ہو گیا جیسے نہ اس نے کسی کو فون کیا اور نہ ہی کچھ
 ۱۔ ”سری جانب اندھیرے میں کھڑی شملہ کے حواس اچانک پوری طرح جاگے تھے۔ اس کے تھکے تھکے گولی کی
 ۱۔ نیند کے بوجھ سے لہے ہوئے ذہن کو اس کی کسی ہوئی بات نے جھوڑ کر ہکا بکا کر چھوڑا تھا۔

بہت دیر تک دونوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ اگلی بات کس کو کہنا ہے اور کیا کہنا ہے۔

”میں۔۔۔ بہت حیران ہوئی ہوں یہ سن کر۔“ آخر کار وہ بولی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ سب کچھ تم کہا اور اور کیوں کہا؟“

”میرے دل میں آپ کے لیے جذبہ پسندیدگی ہے۔ اس لیے اس کی خود اعتمادی بحال ہو گئی۔“
”میرے لیے؟“ وہ گرم صم تھی۔ ”لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ کیوں۔۔۔ کیسے؟ ہماری تو بہت عرصے سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔“

”نہ آپ کہہ سکتی ہیں۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔ ”کیونکہ میں آپ کے لیے ایک شناسا راہ گیر سے زیادہ نہیں رکھتا اور راہ چلتے شناسا چہرے ہزاروں ملتے ہیں۔ اس لیے آپ کہہ سکتی ہیں کہ ہماری بہت عرصے ملاقات نہیں ہوئی۔“

”آتے جاتے چند لمحوں کے لیے نظر ٹکرا جانے کو ملاقات تو نہیں کہہ سکتے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔
”کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو جذبوں پر منحصر ہے کہ کس نگاہ کو کتنی شدت عطا کریں۔ میرا تو سارا دن ان چند لمحوں زیر اثر گزرتا ہے۔“

ہاشم کو خود اپنی ہی آواز اجنبی لگ رہی تھی۔ اسے اپنا آپ اجنبی لگ رہا تھا۔ شاید اس نے اپنا آپ کسی ادا حوالے کیا تھا اس لیے۔

شہلا دم بخود تھی۔ اظہار نہایت واضح اور دل کو پٹی لے پر دھڑکا دینے والا تھا۔ دھیرے دھیرے دم سر میں اس کی دھڑکن پورے بدن میں گونج رہی تھی۔

”دوسری بات یہ کہ پسندیدگی اور محبت کا یہ جذبہ آج کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ ایک تناور درخت کی ملامت لاتعداد جڑیں میرے دل کی گہرائیوں تک میں پیوست کیے ہوئے ہے۔ خون دل نے برسوں اس کو سینچا ہے۔
نے سالوں نگہداشت کی ہے۔ دھڑکنوں نے مدتوں حفاظت کی ہے۔ اس طرح کہ سوائے تمہارے تصور کے میں اور کچھ اگر ہے تو وہ تمہیں پالنے کی خواہش ہے۔“

وہ خواب و خیال میں بھی نہ سوچ سکتا تھا کہ وہ شہلا سے کبھی یہ سب کچھ کہہ پائے گا۔ جذبوں کا لاوا زار پاکیوں بہہ نکلے گا۔

شہلا میں مزید تاب نہ تھی۔ اس نے فون بند کر دیا۔ اس کا جسم پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ حلق بالکل خشک سا نہیں بے قابو۔ وہ اندھیرے کمرے میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی رہی۔

”مدتوں۔۔۔ برسوں۔۔۔ سالوں؟“ اس کی آنکھیں حیرانی سے کھلی ہوئی تھیں۔

”مجھے بھی احساس تک نہ ہوا؟ یہ کب کی بات ہے؟ ایسا کب ہوا؟ کیونکر ہوا؟“

”اؤ۔۔۔ آؤ! میں تمہیں اماں سے ملواؤں!“ ایقان اس کا ہاتھ تھامے اسے تقریباً ”کھینچتے ہوئے لیے آ رہی“
وہ ہائی ہیل سینڈل کی وجہ سے بہت تیز نہیں چل پارہی تھی لیکن لا ابالی ایقان کو اس بات کی پروا نہ تھی۔
گر جاؤں گی ایقان۔“ وہ رو بائیں ہوئی۔

دروازہ کھول کر باہر آتا ہاشم ان دونوں کو نہایت تیزی سے اپنی جانب آتا دیکھ کر پھرتی سے برے ہوا۔ ایقان کے پاس سے ہوا کے جھونکے کی مانند گزر گئی جبکہ اپنی پٹل ہیل پر ڈوٹی ہوئی شہلا کا سر اس کی شرٹ سے ہوتا ہوا تار مگر رہا۔ وہ بھی آگے بڑھ گئی تھی لیکن اگلے ہی لمحے ایک دلدوز چیخ کے ساتھ رک گئی۔ ایقان کے ہاتھ اس کا ہاتھ نکل گیا۔

”ہائے میرے بال۔۔۔ اف اللہ!“
ہاشم کی سفید شرٹ کے بٹن نے ان کھلی گھنیری سیاہ زلفوں کے ساتھ یکایک ہی شرارت کر ڈالی تھی۔
لٹ اس کے بٹن میں الجھی ہوئی تھی۔

”اے ہاشم کے بچے۔۔۔ چھوٹو اس کے بال۔“ ایقان غصے میں بھری چیل کی مانند پلٹی۔

”مہم میں نے نہیں۔ اس بٹن نے۔“ اس کے لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرے۔

بادالوں سے سجا ایک دلکش چہرہ اس کے اتنے قریب تھا کہ اس کی سانس جہاں تھی وہیں رک گئی۔ شہلا اس سے بے خبر اس کے بٹن سے اپنی لٹ آزاد کروانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ اس کے نرم ہاتھوں کی ہلکی سی سیڑھی پر محسوس ہو رہی تھی۔

”تم اسی توجہ کو گنوں گی طرح بھرائے رکھتی ہو یہ زلفیں۔“ ایقان کو سچویشن دیکھ کر مزید تاؤ آیا۔ ”باندھ نہیں سکتی۔ میری اماں ہوں تو اتنی کس کر چٹیاں بنا دیں کہ پورا ہفتہ نہ کھلے۔“

انہوں نے کہا اس کھڑی وہ تقریر میں مصروف تھی۔

”ام کا بٹن ٹوٹ گیا لیکن اس کے بالوں سے نہ نکلا۔ زلفوں کو رہائی، بہر حال مل گئی۔ ایقان پھر اسے اسی طرح لپیٹتے ہوئے آگے لے گئی۔

”تم پھر کے بت کی مانند وہیں کھڑا رہ گیا۔“ لحوں کی فسیں خیزی اپنا کام کر چکی تھی۔ وہ ایقان کی بچپن کی ہم جولی۔۔۔ لوں، ہم جماعت بھی تھیں۔ وہ اکثر آیا کرتی تھی لیکن آج اس کی زلفوں کی مہک اور ہاتھوں کی نرمی نے اسے ایک نئے بے حد عجیب سے احساس سے دوچار کیا تھا۔ اس نے بھی اس طرح محسوس نہ کیا تھا۔ اس نے کسی چہرے کو اتنے قریب سے نہ دیکھا تھا۔ دل نے کبھی پہلے اس طرح کی فرمائش نہ کی تھی۔ وہ باد صبا کی نرمی۔ ایک منہ بند کلی کو کھول گئی تھی۔ اس کے اندر خوشبو بکھری رہی تھی۔

اس نے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ اس کا بٹن غائب تھا۔ اس کے لبوں پر خوشی مسکراہٹ بن کر چمکی۔ بٹن ٹوٹ جانے سے اسے بے حد خوشی ہوئی۔ اس حقیقت کا ادراک اس پر جلد ہی ہو گیا تھا کہ وہ اپنی سیاہ لٹوں میں اس کا بٹن نہیں دیکھ سکتی تھی۔ کسی کم گشت ستارے کی مانند وہ اب تک اپنی سیاہیوں میں گہمیں پوشیدہ تھا۔

”اب تم شہدہ چیزیں جہاں کھوئی جاتی ہیں وہیں پر مل بھی جاتی ہیں۔“

اس نے اس رات پہلی مرتبہ اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ ایک بے حد معمولی سا واقعہ اپنی ہی باز گشت بن کر اس کی یاد میں بچا لیا تھا۔

”ایک دوست کا بالکل نئے فیشن کے مطابق سلا ہوا لباس ماں کو دکھانے کی عجلت میں گھری ایقان اس کی حالت کو دیکھ کر کہانی نہ ہی اس کے بٹن میں ابھی زلفوں کے ٹوٹنے کا افسوس کرتی شہلا ان لطیف احساسات کو چھو سکی۔ رات کی طرح اس کے کوچہ دل میں پہلی بار برسرے تھے۔

”ہاں کب سے وہ اکیلا ہی ان تمنائوں سے ننھے ننھے نازک نازک پودوں کی طرح دل کے گلستان میں لہراتے کرتا رہا تھا۔“

وہ ایقان کے پاس کبا بن اسٹڈی کے لیے آتی تو وہ بھی چپکے سے اپنی کتابیں لے کر وہاں جا بیٹھتا۔

”اے ہاشم! اے ہاشم! تم آگے۔“ ایقان کھل اٹھتی۔ ”پڑھ پڑھ کر سر دکھنے لگا ہے۔ ذرا منوں حلوئی کے قیمہ بھرے۔“ وہ اذیتا۔ پھر میں چائے بناتی ہوں۔“

”تم احتیاط اور احترام کی چادر میں لپٹی جذبوں، بھری نگاہ لمحہ بھر کے لیے اس پر ڈالتا۔ وہ تیزی سے اپنی نوٹ بک

میں ہاتھ ڈالتی رہتی۔ اسے پڑھنے کا، آگے بڑھنے کا شوق تھا۔ میڈیکل کالج میں ایڈمیشن حاصل کرنا اس کا دیرینہ ارادہ تھا جس کے حصول کے لیے وہ رات رات بھر پڑھا کرتی تھی۔ ایقان کی طرح اسے تھوڑی تھوڑی دیر میں ہر طرح کی دکان کا خیال نہ سٹاتا تھا، نہ ہی سڑک سے گزرتے کسی ریڑھی والے کی آواز اس کے ارتکاز میں مداخلت کرتی تھی جبکہ ایقان کی نگاہ کتاب پر اور کان چار دیواری کے اندر باہر ہوتے واقعات پر غور کرتے

”اے شہلا! گول گپے والا آگیا۔“ وہ خوشی سے کھل اٹھتی۔

”تم خود گول گپا بن جاؤ گی ایقان کی بچی۔“ وہ اسے ڈانٹتی۔ ”سٹرپ مت کرو خوا مخواہ!“

”میں تو چلی۔“ وہ کتابیں پھلا گئی یا ہر نکل جاتی۔

شہلا بے بسی سے اس کی پشت پر جھولتی چوٹیاں دیکھتی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کتاب پر جھک جاتی ہاشم چپکے سے اس کے گال کو چھوتی لٹ کو دیکھتا رہتا۔

محبت کی اس اچھوتی اور مقدس مئے کو دل کے آگینے میں اس نے حفاظت سے یوں رکھا کہ قطرہ بھی چھلکے پاس نہ نہ نگاہوں سے خمار چھلکے نہ کوئی جملہ لڑکھڑائے۔ نشہ بس لبوں پر کر رگوں میں دوڑتا رہے۔ دھڑکنیں! ایک ہی نام لاتی رہیں۔

”شہلا... شہلا... شہلا...“



رافع اس کا یار غار تھا۔ دونوں میں کوئی بات چھپی نہ تھی۔ لیکن ہاشم نے اپنے جذبول کی ہوا اسے بھی نہ لگا دی تھی۔ یوں بھی وہ دونوں اور طرح کے لڑکے تھے۔ ان کے درمیان فزکس اور کیمسٹری کے مختلف ٹاپکس پر بحث رہتے یا قدیم شعراء کی غزلیں۔ لڑکیوں کی باتوں سے انہیں سروکار نہ تھا۔ عشق عاشقی کے قصے وہ گفتگو میں لاتے تھے۔

رافع بے حد مختلف تھا۔ اسے آنچلوں کے دھمک رنگ متوجہ کرتے تھے۔ نہ ہی ہنسی کی جھکنا پر وہ کبھی پلٹ دیکھتا تھا۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ نرا کورا اور قدرے بے حس تھا۔ ایسے میں اپنے جی کی بات اس سے کہنا کے لیے بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا اور نہ شاید اپنے آپ سے گھبرا کر وہ کبھی اس سے کچھ کہہ سکتا تھا۔

لیکن بہر حال خوشبو کہیں نہ کہیں اپنا سراغ چھوڑی جاتی ہے۔ رافع نے ایک دن اس کی چوری پکڑ لی تھی۔ ایقان اور شہلا کا زلزلہ آیا تھا۔ دونوں نے بہت اچھے نمبروں سے امتحان پاس کیا تھا اور اب وہ دونوں مل کر سب سہیلیوں کو دعوت دے رہی تھیں۔ بہت دن تک دونوں کے مابین یہ جھگڑا چلتا رہا کہ دعوت ایقان کے گھر ہوگی یا شہلا کے گھر۔ پھر حسب معمول ایقان جیت گئی تھی۔ شہلا بحث میں اس سے ہمیشہ ہار جاتی تھی۔ دعوت کا دن آگیا۔ ان دونوں نے کچھ چیریں گھر پر تیار کیں اور کچھ بازار سے منگوا لیں۔ رنگ برنگے آئینے میں لہرائے لگے۔ فخری قمقمے ہر طرف بکھر رہے تھے۔

ہاشم اپنے کمرے میں بیٹھا ایک پرانا ریڈیو ٹھیک کر رہا تھا جب چھم چھم کرتی ایقان اس کے سر پر آکھڑی ہوئی۔ ”ہاشم! ذرا ہماری مدد کرو!“

ہاشم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے ہنسی آگئی۔ وہ یوں سچی سنوری کھڑی تھی گویا کسی شادی میں جاری دھانی رنگ کا جوڑا سنہری گولے سے سجا ہوا تھا۔ دیو پٹے میں جا بجا جھنگھروں کے گولڈن بالیاں پہنے بہت سامک اپ کیے وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ہاشم کے ہنسنے پر اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے اہم کان پکڑ لیا۔

”کیوں جھپٹے؟ میں کارٹون ہوں؟“

”ہیں نہیں، صرف لگ رہی ہیں۔“ اسے مزید ہنسی آئی۔ ”وہ خطرناک تیور لیے مڑی تھی۔“

”ارے پھپھو! میری کیوٹ سی پھپھو! ایسا غضب نہ کریں۔“ وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ ”جو چاہیں سناویں۔ کہیں تو منوں حلوائی کی دکان سے کوئی موٹو فیورٹ آٹم لادوں۔“ ایقان ہنس دی۔

”بد تمیز کہیں کے، آج منوں حلوائی کے سارے موٹو فیورٹ آٹم نیچے ٹیبل پر موجود ہیں۔ مسئلہ یہ کہ ہمیں ایک عدد فوٹو گرافر درکار ہے جو ہم سہیلیوں کے اچھے اچھے فوٹو بنا دے۔“

”وہ تو... پلیر پھپھو! اپنے بس کا کام نہیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ لیکن وہ ایقان ہی کیا جو کسی کی معذرت کو خاطر میں لاتی۔ اسے کھینچتے ہوئے حسینوں کے جھر مٹ میں لے

ہاں لایوں کو ہنسنے، ہنسنے اور صرف ہنسنے کا کام تھا۔

ہلانے آج پھر اپنی گھٹاؤں کو کسی کے دل پر برسنے کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ میرون، بلیک اور وہاٹ ۱۸۷ کے ایمر اینڈ سوٹ میں وہ بے تحاشا لوہے رہی تھی۔ میرون آئی شیڈ سے بھی سیاہ آنکھیں چند ایک بار اچھٹ بے ناز سے اس کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں اور ایک شناساسی چمک کے سوا ان میں کچھ نہ تھا۔ وہ ٹوٹل تھی۔ بے حد خوش۔ میڈیکل میں اس کا داخلہ یقینی ہو چلا تھا۔ ہاشم نے تصویریں مکمل کر کے کیمرہ سے لے حوالے کیا اور دل کے فریم میں اس کی مسکراتی تصویر سجا کر چلا آیا۔ چند دن بعد رافع اس کے پاس پہنچا۔

”اچھٹو کی دوست میں انٹرنلڈ ہو؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔
 ”میں کی شے کم ہو گئی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر جلدی سے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔
 ”تو میں کس نے بتایا؟“ اس نے حواس باختگی سے پوچھا۔
 رافع لب بھیج کر مسکرا دیا۔

”تمہارے بھوت نے۔۔۔ رات کو میرے پاس آیا تھا۔ شہلا شہلا کرتا ہوا۔“
 ”اے چپ کر۔“ ہاشم نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”کوئی سن لے گا۔“
 ”اور جو کوئی یہ سب دیکھ لے؟“ اس نے ایک لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ”وہ کیا کہے گا؟“
 ”اے یہ؟“

”تمہاری خاموش محبت کا منہ بولتا بلکہ حلق پھاڑ کر چیخا ثبوت۔“
 ہاشم نے لفافہ جھپٹا اور میز پر الٹ دیا۔ پوری میز پر شہلا کی تصویریں بکھر گئی تھیں۔ وہ سب کی سب شہلا کی تصویریں تھیں۔

”ہا پھو نے مجھے بعد اصرار بھیجا تھا رول دھلوانے کے لیے، وہ دعوت کی تصویر دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں اور تمہاری لگ رہا ہے جیسے دعوت میں سوائے شہلا کے اور کوئی شریک نہیں ہوا۔ اب تم کو تو میں یہ تصاویر دکھاؤں۔۔۔ دلوں؟“

ہاشم سر تھامے بیٹھا تھا۔ اپنی اس بے اختیار حرکت سے وہ خود لا علم تھا۔ اس روز وہ شہلا کو سچا سنورا دیکھ کر بے قرار ہوا تھا لیکن اتنا بے خود ہو گیا تھا کہ اسے خبر نہ تھی۔ اس نے دھڑا دھڑا اس کی تصویر بنا ڈالی تھیں۔ اپنی آنکھوں میں گہری توجہ لگائی البتہ شیزاؤں کو اس حادثے کی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔ البتہ چند ایک گروپ فوٹو ضرور تھے جو انہوں نے خاص طور پر ساتھ کھڑے ہو کر بنوائے تھے۔

”ہاں لیتے ہو؟“ رافع نے اسے گھورا۔
 ”اب لے لے کو کیا بچا ہے؟“ وہ شرمساری سے بولا۔
 ”چو جو توں سے کیسے بچو گے؟“
 ”میں سوچا دوست ایسے وقت میں ہی کام آتے ہیں۔“
 ”ہاں سنی اس وقت کہاں تھی جب پیٹ میں داڑھی پال رہے تھے؟“ رافع نے سر جھٹکا۔
 ”وقت ہے تو ہے ورنہ تم یہ تصاویر مجھے نہیں پھینکو کو دیتے۔“ ہاشم ہنسا۔
 رافع نے اسے غصے سے گھورا۔

”تم مرنے کا نام کو نہیں ہے۔“
 ”تم ہی تو ہے۔“ ہاشم منمنایا۔
 ”اب یہ تصویریں رکھو گے یا پھاڑ ڈالو؟“ اس نے آکٹا کر پوچھا۔
 اس بار ہاشم نے اسے غصے سے گھورا تھا۔
 اچانک بولا خراطلع دی گئی کہ رول خراب تھا۔ چند ایک گروپ فوٹو ٹھیک آئے ہیں باقی سب تصاویر ضائع

ہو گئی ہیں۔

ایقان کو مبینوں اس حادثے کا غم رہا تھا۔

شہلا کا داخلہ میڈیکل میں ہو گیا تھا۔ ایقان کو سائنس کے خشک سبجیکٹس میں دل چسپی نہ تھی۔ اس آرٹس کے مضامین منتخب کر لیے۔ یوں ان دونوں کی راہیں قدرے جدا ہو گئیں۔ اس کے باوجود وہ جب بھی ملتی مرتے ہی والہانہ پن سے ملا کرتیں۔ ایک دوسرے سے اپنی باتیں شیئر کرتے ہوئے۔ آدھی آدھی رات تک سردی گرمی سے بے نیاز لان میں چل قدمی کرتیں، سرگوشیوں میں باتیں کیے جاتیں۔ ان دنوں ان دونوں کا انداز بے حد رازدارانہ ہو گئے تھے۔ ان کی باتیں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ شہلا کے گھر سے بار بار فون آتا تب وہ گھر جانے پر رضامند ہوتی تھی یا ایقان اگر اس کے گھر گئی ہوتی تو اسے واپس لانا دشوار ہو جاتا تھا۔ ہاشم سے اکثر بیشتر اس کا سامنا ہوتا تھا۔ اس کا حسن ان دنوں دو آتشہ ہو گیا تھا۔ وہ اسے اتنی اچھی، اڑ خوبصورت لگتی تھی کہ وہ گھبرا کر سر جھکا لیا کرتا۔

”تم کب تک یونہی بے وقوفوں جیسی محبت کرتے رہو گے؟“ رافع اسے سوچ میں گم دیکھ کر پڑ جاتا۔

”کیا مطلب؟ میں نے کیا بے وقوفی کروئی؟“

”تم اس سے کہتے کیوں نہیں؟“

”کیا کیا کہوں؟“ وہ حیران ہوتا۔

”وہی یار جو فلم میں ہیرو، ہیروئن سے پہلی یا دوسری ملاقات میں ہی کہہ ڈالتا ہے۔“ رافع بیزاری سے کہتا۔

”اُئی لویو۔“

”شٹ اپ۔“ وہ بہم ہوتا۔ ”اپنے آپ کو اس کی نظروں میں ذلیل کرووں؟“

”پھر اس عشق پوشیدہ کا انجام کیا ہو؟“ رافع کے سوال پر ہاشم سوچ میں پڑ جاتا۔

پھر ایک دن اچانک بے حد ڈرامائی انداز میں اس عشق پوشیدہ کا انجام سامنے آیا تھا۔ شہلا نے اپنے کلاس فلور سے لومینج کر لی تھی۔

میڈیکل کے تیسرے سال میں ہی اس نے کورٹ میں جا کر شادی کر لی تھی۔ ”حیات ولا“ میں جس نے خبر سنا اس نے دانتوں تلے انگلی دبالی تھی۔

ہاشم کی معصوم بے ضرر چاہت کے لیے یہ خبر ایک شدید شاک جیسی تھی۔ اس کے وجود میں زلزلہ آیا تھا۔ اور

سب کچھ جیسے ملیا میٹ ہو گیا۔ شدید ڈپریشن کے باعث اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر دیا پڑا۔ یوں ”حیات ولا“ کے

بہوں میں چپکے چپکے یہ خبر پھیلی تھی کہ ہاشم ایقان کی سہیلی کو بے حد حساب چاہتا تھا۔

ایقان چپکی پھرا کرتی۔ اپنے گھروالوں کی نگاہوں سے بچتی پھرتی تھی۔ پھر عاشر کا رشتہ آیا اور وہ دنوں میں بیاہ کر لیا

دیس سدھار گئی۔

کچھ دنوں میں سب کچھ معمول پر آ گیا تھا۔ وقت کی دھیرے دھیرے گرتی پھواریا کو دھندلا کرتی گئی۔ لوگ

بھول بھال گئے۔ شہلا کی لومینج، ایقان کا قصہ، ہاشم کا ڈپریشن، قصہ پارینہ بن گئے۔ ہاشم ایک بے حد سنجیدہ طبع

نوجوان کے روپ میں اپنی زندگی کو از سر نو ترتیب دینے میں مصروف ہو گیا۔ تب سال بھر بعد خبر ملی تھی کہ شہلا

طلاق لے کر اپنے والدین کے پاس لوٹ آئی ہے۔ وہ ماں بننے والی تھی اور اس نے پڑھائی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے

جوڑ لیا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ ٹیس پر کھڑی خود سے اور پاگل ہواؤں سے الجھ رہی تھی۔ فضا میں بے

حد خنکی تھی۔ اسے سردی لگنے لگی لیکن اس نے توجہ نہ دی۔ یونہی دونوں بازو اپنے گرد لپیٹے وہ گئے دنوں کے اوراق

پلٹنے کی کوشش کرتی رہی۔

ایک خاموش طبع سنجیدہ سالزکا۔ جسے اس نے کبھی اس بات سے زیادہ اہمیت نہ دی تھی کہ وہ اسی گھر میں رہتا تھا۔ اس میں اس کی عزیز ترین سہیلی رہتی ہے۔
اس ایک موہوم سا واقعہ اس کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ اس نے سفید رنگ کا بے حد اٹانٹلش سوٹ سلوا یا اس کے متناسب جسم پر وہ لباس سج گیا تھا۔ کمر تک لائے سیاہ بال کھولے وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی جب یہ دیکھ لی آئی۔
ہلانے اسے شہر کے مشہور ٹیلر کا نام بتایا۔

"ایکھا میں بھی کہتی ہوں یہ تو سارا اسلامی کا کمال ہے۔" افسانہ میری اماں بھی نا، مکھ کی درزن کی جان نہیں آئی۔ مجھ سے کہتی ہیں، تم خود سلائی سیکھو اور اپنے کپڑے سیا کرو۔ پچھلی صدی کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ آؤنا! میں اماں کو تمہارے کپڑے دکھاؤں گی۔ ان سے پوچھوں بھلا ان کی درزن سی سکتی ہے ایسا ڈریس۔"
"جان ایقان میں۔۔۔" اس کی بات لبوں میں ہی رہ گئی۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے اپنی دھن میں بولتی اسے "حیات والا" تک لے آئی تھی۔ شہلا کو بال لپیٹ کر جوڑا تک نہ لایا تھا۔ تب وہاں کھڑے ہاشم کی شریٹ کے بٹن میں اس کے بال پھنس گئے تھے۔
"اے! اسے کس قدر شرمندگی ہوئی تھی۔ بال کھینچنے کے دوران اس کی ٹیٹھیں کا بٹن بھی ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن اس نے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ وہ بے حد سیدھا سا دلجو انسان تھا۔ خود میں مگن رہنے والا، نیچی نظروں کے حاملہ کرنے والا۔ بعد میں جب بھی اس کا سامنا ہوتا، شہلا کو وہ واقعہ یاد آ جاتا۔ اس کے لبوں پر مدھم سی آہ لگتی لیکن وہ وہی سنجیدہ رہتا تھا۔

اور اب اتنے سال بعد وہ کہہ رہا تھا کہ اسے شہلا سے محبت تھی! بھلا کیسی محبت تھی یہ؟ لوگ اس طرح بھی لڑھکھک لیتے ہیں کہ بوند بھر پانی نہ برے؟ محبت تو وہ ہے جو ٹوٹ کر برے۔ جل تھل کر ڈالے۔ تن من بھیگ سائیں لینے کی سکت نہ رہے۔

وہ محبت جو ابرار جیلانی نے اس سے کی۔
وہ محبت جو شہلا نے ابرار جیلانی سے کی۔
"میں پہلے دن پہلی نگاہ میں اس کا اسیر ہونے والا ابرار جیلانی بھی ایسا نہ تھا کہ نظر انداز کیا جاتا۔ کچھ ہی دنوں میں انہوں نے پورے کالج کی گفتگو کا محور بن گئے تھے۔ پروفیسرز تک ان کی طوفانی محبت سے واقف تھے۔
انہوں نے ہر جگہ ہر بل ساتھ ہوتے تھے۔

ابرار کا تعلق اندرون ملک سے تھا۔ اس کے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ گاؤں میں ان کی شاندار جوہلی تھی۔ ان کا پورا خاندان آباد تھا۔ ابرار برہان کی غرض سے شہر میں رہتا تھا۔ لیکن اس کے والد اسے شہر بھیج کر اس کے فرائض تھے۔ بہت جلد ان کے عشق کی خوشبو شہر بھر میں پھیل گئی تھی۔

"شادی نہیں ہو سکتی۔ ہم خاندان والوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟" ابرار کی ماں نے سخت احتجاج کیا تھا۔
"ملا جی! اپنے رستے اس سے علیحدہ کر لو یہ ایک بوڑھے باپ کی عاجزانہ استدعا ہے۔" محسن علی صاحب نے طعنے لگے میں اس سے کہا تھا۔

ان دنوں نے بنا سوچے سمجھے کورٹ میرج کر لی تھی۔ محبت کا زہر نس میں پھیل چکا تھا۔ اسے رگوں سے اچھینک دینے کا بارادونوں میں نہ تھا۔

ابرار اسے اپنے فلیٹ پر لے آیا تھا۔ وہ دونوں ساتھ کالج جایا کرتے، ساتھ لوٹتے، دونوں جانب کے خاندان کے حالات سکتے کے حالات میں تھے اور وہ "سکتے" کی اس حالت کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔
"ملا! کپڑوں زمین پر نہ نکلتے تھے۔ وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔

اس دھچکے والا اسے ہر لمحہ سراہنے والا اب دن رات اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ اس کی جھولتی لٹ کو ہٹا کر

اس کے کان میں سرگوشیاں کرتا، وہ اپنی گردن پر اس کے سانسوں کی مہک محسوس کرتی تھی۔ ساری دنیا اہیلی پر سمٹ آئی تھی۔

تب ایک دن ابرار کے والد انہیں لینے آگئے۔ انہیں اپنی ضد منگی پڑی تھی اب وہ سستا سودا کرنا چاہتے، وہ شہلا کو اپنی بہو کے روپ میں قبول کرنے پر آمادہ تھے۔

ابرار بے حد خوش تھا۔ اپنے باپ کے بغیر وہ کچھ بھی نہ تھا اور باپ کے ساتھ بہت کچھ۔

وہ جیلانی ہاؤس چلی آئی۔ دہن کی طرح حج سنور کر۔ سرخ جوڑا پسین کر، ڈھیر سارا زیور پسین کر۔ ”جیلانی ہاؤس میں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

”یہ تمہاری ساس ہیں۔“ اسے ایک معمر عورت سے اسے ملواتے ہوئے بتایا گیا۔

شہلا نے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ سلام کیا۔ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر نونوں سے بھرا تھال اس پر وار کر ملازمہ کو پکڑا دیا۔

”اس سے ملو۔“ ایک اور عورت اس کے مقابل تھی۔

”یہ خاتون بی بی ہے۔ ابرار کی پہلی بیوی۔“

شہلا کے سر پر آسمان ٹوٹ کر گرا۔ اسے سماعتوں پر دھوکہ ہوا۔

اس نے جھٹی جھٹی آنکھوں سے اس عورت کو دیکھا جس کے چہرے پر ویرانی تھی۔

”کون؟“ اس نے ساس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کون ہیں یہ؟“

”تمہاری سوت۔ ابرار کی خاندانی بیوی۔“ انہوں نے پھر اطمینان سے بتایا تھا۔ ”اسے اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھو، تمہارے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں ہوگی۔“

شہلا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ اسے پھر کچھ دکھائی نہ دیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا رکھا ہوئیں، کس نے کیا منہ دکھائی دی، اسے علم نہ تھا۔ اسے صرف آنے والی رات کا انتظار تھا۔

○ ○ ○

ابرار جیلانی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ اس نے بری طرح سے جھٹک دیے تھے۔ وہ چند لمحوں کے لیے حیران ہوا مسکرا دیا۔

”یار! پہلے بندے کو کلینر نس کا موقع تو دو۔“

”تنا بڑا دھوکا، اتنی چیٹنگ!“ اس کی آنکھیں ڈبڈپا گئیں، لعجہ بھرا گیا۔

”کوئی دھوکا نہیں ہوا۔ کوئی چیٹنگ نہیں ہوئی۔ تم میری بات سن لو۔“ وہ مصالحانہ انداز میں بولا۔

”مجھے کچھ نہیں سنتا۔ تم جاؤ یہاں سے!“ وہ چیختی تھی۔

”ہنسنا!“ ”تنبیدہ ہوا۔“ ”یہاں یہ برتاؤ نہیں چلے گا۔ تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نہ جائے۔“

شہلا نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”میں خود اس کمرے سے چلی جاتی ہوں۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”تم جسے چاہو بلاؤ!“

”اوفوہ!“ اس نے سر تھام لیا۔ ”شہلا! ابراہیٰ ٹوانڈرا اسٹینڈ! میری اس سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ وہ

میں مجھ سے پورے سات سال بڑی ہے۔ میرا نکاح چودہ برس کی عمر میں کر دیا گیا تھا جب میں اسکول میں پڑھتا

اور مجھے شادی ہیوا، رسوں و درواجوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ مجھے بس اتنا پتا تھا کہ میری بہن کی شادی اس کے بڑے بھائی

سے ہو رہی ہے اس لیے اسے ہمارے گھر آنا ہے۔ تم خود سوچو، چودہ برس کے لایا بی لڑکے کو بھلا ان باتوں سے

سروکار؟ مجھ سے مولوی نے کہا کلوایا میں نے کہہ دیا۔ نکاح نامہ میرے آگے کر دیا گیا۔ میں نے اپنا نام لکھ دیا

کیا تم اس کو دھوکا، فریب اور چیٹنگ کہو گی؟“

”لیکن تم یہ سب کچھ مجھے بتا بھی سکتے تھے۔“ وہ آنسوؤں کا گولہ نگلتے ہوئے بولی۔

”بتا تو رہا ہوں۔“

اما۔ نے شکایت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ تو وہ ہنس دیا۔
 ”مجھے ڈر تھا شہلا! میں تمہیں کھونہ دوں۔ اس معمولی سی بات سے میرا اتنا بڑا نقصان ہو، مجھے یہ بات ہضم
 نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ اس بات کو کسی اور موقع تک پس پشت ڈال دیا جائے۔
 یہ حال آج وہ موقع آ گیا۔“

ابن ابراہار! تمہیں بتانا چاہیے تھا۔ اس کا دکھ کم نہ ہو رہا تھا۔
 اس میری جان! مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے تمہارا دل دکھایا۔ لیکن پلیز شہلا! ماں باپ کے جاہلانہ فیصلوں
 پر مجھے نہ دو۔ تم اس سے نفی ہونا کیا وہ ایسی ہے کہ تم اس سے کوئی خطرہ محسوس کرو؟“
 اما۔ ناخوشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی۔

تم نے اس کے ساتھ ازدواجی تعلقات۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔
 اس! انارے دو بچے ہیں۔ وہ آہستہ سے بولا۔

اما۔ نے رخ موڑ لیا تھا۔
 ”الٹ بگھاؤ۔ میں سونا چاہتی ہوں۔“

”شہلا۔۔۔ اس نے اسے چھوا۔
 ”ابراہار! اس کے اندر آنسو گر رہے تھے۔
 وہ آہستگی سے پیچھے ہٹ گیا۔

مجموعاً تو ہر حال اسے کرنا ہی تھا اور یہ بات ابراہار جیلانی بھی بخوبی جانتا تھا۔ وہ اسے لانے سے پہلے اس کے پر
 پکا تھا۔

ابراہار کی یقین دہانی ایک طرف لیکن ”جیلانی ہاؤس“ میں مختار جیلانی کا حکم چلتا تھا۔ شہلا اور خاتون بی بی کے
 ابراہار کی راتیں اور دن تقسیم کر دیے گئے تھے وہ ایک رات اور ایک دن شہلا کے ساتھ گزارتا اور اگلی رات
 ان کا اپنی پہلی اور خاندانی بیوی کے ہمراہ۔ شہلا میں لب کشائی کی تاب نہ تھی۔ وہ محض آنسو بہانے پر قادر
 تھی۔

”ایمو جانو! چند دنوں کی بات ہے۔“ وہ اسے بھلاتا۔ ”ہمیں شہر لوٹنا ہے۔ اپنی پردھائی مکمل کرنا ہے وہاں
 سے بچ صرف اور صرف ہماری محبت ہوگی سب دن سب راتیں ہماری ہوں گی۔“
 شہلا روٹھے دل کو اس کی دلیلوں سے منانے کی کوشش کرتی۔ وہ مانتا مانتا مگر شہلا کو ماننا پڑتا یا لا آخر چھٹیوں کے
 پانچویں دن بے مزہ دن تمام ہوئے۔ کالج کھلنے کی تاریخ قریب آگئی شہلا کے چہرے پر بہت دن کے بعد رونق لوٹ
 آئی تھی۔

وہ اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھی جب حاجیانی بیگم یعنی اس کی ساس کمرے میں آئیں۔
 ”یہ کیا کرتی ہو؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”جی۔“ وہ سیدھی ہوئی۔ ”اماں! کالج کھل گئے ہیں نا۔ اب شہر جانا ہے۔ میں اسی کی تیاری کر رہی ہوں۔“
 ”ہوں! انہوں نے ایک لمبی ”ہوں“ کی اور کمرے سے چلی گئیں۔ پکینگ مکمل ہوگئی تو ابراہار اندر آیا تھا۔
 ”شہلا۔۔۔ اس کا انداز تھکا تھکا سا تھا۔

”جی!“
 ”اپنا سامان کھول دو۔ شہر صرف میں جا رہا ہوں۔“
 شہلا دم خود رہ گئی۔

”ابراہار! اتنی کڑی سزا مت دو مجھے۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ مراؤں گی یہاں۔“
 ”شہلا! تمہیں پردھائی چھوٹنی ہوگی۔“ وہ بیزار نظر آ رہا تھا۔ ”اور۔۔۔ اور۔۔۔ اتنی محنت سے کیا حاصل کرو گی؟ بابا

سائیں کبھی بھی تمہیں نوکری نہیں کرنے دیں گے۔ ”جیلانی ہاؤس کی بیویوں کی باتوں کا یہ کام نہیں کہ وہ عورتوں کے بچے پیدا کر داتی پھرں۔ پھر ٹھیک ہی تو ہے۔ تم اپنا بچہ سنبھالو گی یا پر دھو گی؟ یہاں تمہیں ہر طرح کا آرام ہے، ہر کام کے لیے دس دس نوکر ہیں۔ تم رانی بن کر عیش کرو، کن چکروں میں خوار ہو رہی ہو۔ میں ٹیک اینڈ پرائز آؤں گا۔“ شہلا کچھ بھی نہ سن رہی تھی۔ وہ ساکت بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی۔ سہنا دیکھنے کی پاداش میں اس کی بینائی سلب کر لینے کی سزا سنائی گئی تھی۔

ابرار چند لمحے اس کو دیکھتا رہا پھر تذبذب کی حالت میں باہر چلا گیا۔



تھے بہت بے درد لمبے ختم درد عشق کے
تھیں بہت بے مریصیں، مہریاں راتوں کے بعد
اس کے بعد بھی یاد کرنے کے لیے اس کے پاس بے شمار باتیں تھیں۔ تلخ زہریلی یادیں جنہیں وہ ہرگز یاد کرنا نہ چاہتی تھی۔ بڑی مشغلوں سے ”جیلانی ہاؤس“ سے چھٹکارا پا کر وہ اپنے گھر دوبارہ لوٹی تھی۔ بہت کچھ مراحل سے گزر کر ابرار جیلانی نے اسے آزادی کا روانہ دیا تھا۔

ماں باپ سامظلوم رشتہ دنیا میں اور کوئی نہیں ہوتا۔ اولاد ٹھوکر مار کر جاتی ہے اور جب پلٹتی ہے تو انہیں وہ بلینر ہی سرکتا ہوا پاتی ہے۔ ان میں خود کو سہارا دے کر کھڑے ہونے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔ وہ لوٹی تو دل کے مریض باپ نے اسے سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ ماں نے ہر ممکن طریقے سے اس کی دیکھوئی کی۔ کسی نے اسے ایک لفظ ملامت کا نہ کہا تھا۔

محسن علی صاحب نے اپنے تعلقات بروئے کار لاتے ہوئے اس کا تبادلہ دوسرے کالج میں کروا دیا۔ شہلا نے بقیہ تعلیم ہاسٹل میں رہ کر مکمل کی۔ عمر تو پید ا ہوتے ہی ثانی کی گود میں آگیا تھا۔ وہ ماں کی زندگی تھا تو ثانی کی آنکھوں کا نور تھا۔ خانہ اور اماں کو کاچیتا بھانجا تھا۔

اور اب برسوں بعد اسے اس بیٹے کی یاد ستائی تھی جسے اس نے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ اب وہ رہ کر اسے کیوں پکار رہا تھا، شہلا سمجھنے سے قاصر تھی۔

اور ایسے میں دل کے تالاب میں ایک اور پتھر آگرا تھا۔ دائرے در دائرے اس کے اندر چکرار ہے تھے نیند کی گولیاں بھی اس کے پریشان ذہن کو سکون بخشنے سے قاصر تھیں۔



”ربیعہ! گہری دھند میں آہ سے مشابہہ آواز ابھری تھی۔

وہ آواز بے حد دکھی تھی۔ برف کی مانند سرد اور شعلے کی مانند دھواں دیتی ہوئی آواز۔

ربیعہ کا جسم کانپ کر رہ گیا۔ اس آواز نے اس کے دل کو تیز دھار چھری کی طرح اندر تک چیر ڈالا تھا۔

”ربیعہ! پانی دور بیجسس۔“ آواز میں حسرت تھی بے چارگی تھی۔

ربیعہ نے پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ دور کہیں سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ کہیں پر کوئی جھرنابہہ رہا تھا۔ یا شاید برسات ہو رہی تھی۔ ربیعہ اس دھند میں آگے بڑھی۔ بڑھتی چلی گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے وہ آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

”آہ! ایک سرد آنے اس کا دل ہلا کر رکھ دیا۔

جلتی، تپتی آہ۔ جیسے آبلہ پا اپنی آخری امید بھی کھو بیٹھے۔

”ربیعہ! جلدی کرو۔ جلدی کرو۔ پانی لاؤ۔“

ربیعہ دیوانوں کی طرح دوڑنے لگی۔

پانی کی آواز آرہی تھی۔ جھرنات جھرنابہہ رہا تھا، ٹائپ بوئیں گر رہی تھیں۔ پانی کہیں بے حد قریب تھا۔ لیکن اس کے چاروں طرف گہری دھند بے بسی بن کر پھیل چکی تھی۔ اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے بے بسی کی

اتنا پر پہنچ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیوانوں کی طرح اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ ساتھ والے کمرے سے آتی ہوئی کھانسی کی آواز نے اسے احساس دلایا کہ وہ کہاں ہے۔

خالی خالی آنکھوں سے وہ کچھ دیر بیٹھی کمرے کی چیزوں کو گھورتی رہی۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ شدت سے پانی کی طلب ہو رہی تھی۔ اسے اپنا خواب یاد آیا۔

”شاید۔ شاید۔ میں پاگل ہو رہی ہوں۔“ اس نے کوفت سے سوچا۔ ”مجھے ایسے خواب کیوں آتے ہیں۔ ان خوابوں کا پس منظر کیا ہے۔ کوئی الجھن؟ میرے اندر دکھ ضرور ہیں لیکن الجھن کوئی نہیں۔ ان خوابوں کا رشتہ ایسا میرے دکھ سے ہے؟ میرے دکھ سے؟ یا کیا کسی اور کے دکھ سے؟ کس کا دکھ دادی؟ دادی کا دکھ لیکن کیا؟“

اسے دادی یاد آگئیں۔ گوری جی، میدے سے گندھی ہوئی اس کی پیاری دادی جان۔ جن کی کوئی نماز قضا ہونے سے نہ دیکھی۔ جو اکثر بیشتر تلاوت کرتیں یا ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گرائی رہتیں ہاتھ میں اگر بیچ نہ ہوتی تب بھی ان کے لب ہلا کرتے۔ وہ کیا رہتی تھیں؟

ربیعہ اکثر غیر شعوری طور پر ان کی بدبواہی پر کان لگا دیا کرتی۔

”استغفر اللہ۔ استغفر اللہ۔ معاف کر دے میرے رب۔ معاف کر دے۔ گنہ گار ہوں، خطا کار ہوں، سیاہ دار ہوں، مجھے معاف کر دے رب العالمین۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ ربی۔“

وہ اپنی کلمات کا پورے جانتیں۔ ربیعہ کو اس لمحے ان کا چہرہ بہت بھلا معلوم ہوتا۔ سفید نورانی چہرے پر اور بھی ایسا طاری ہوتی تھی۔ گالوں پر لمبوں کی سرخ گرہیں بھرنے لگتی۔ ہاتھ پر ننھے ننھے قطرے چمکتے۔

ربیعہ بے حد محویت سے ان کا استغراق دیکھتی۔ پھر اس کا دل نماز پڑھنے کو چاہتا۔ اس کا دل بھی اتنے ہی اناک سے اپنے رب کو پکارنے کے لیے ہمکتا۔ وہ وضو کرتی۔ اہتمام سے دوپٹہ باندھتی اور جہ نماز پر بیٹھ جاتی۔ وہ دعا کو ہاتھ اٹھا کر دادی کے سے انداز میں کہتی۔

”معاف کر دے اللہ میاں جی۔ پیارے اللہ میاں جی۔ مجھے معاف کر دے۔ میرے اچھے اللہ میاں۔“ وہ کہے جاتی لیکن اس کے ہاتھ پر قطرے نمودار نہ ہوتے۔ اس کے گالوں پر پیش محسوس نہ ہوتی۔ وہ منہ پر اٹھ پھیر کر جہ نماز سے اٹھ جاتی۔ اس کا جی ذرا سی دیر میں ہی اپنے اللہ سے مطمئن ہو جاتا۔

”دادی! میں سمجھ سے مل آؤں؟“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھتی۔

”آہستگی سے سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیتیں۔ وہ دروازے تک پہنچتی تو پیچھے سے ان کی آواز آ جاتی۔“

”ربیعہ۔“

”جی دادی۔“ اس کے قدم تھم جاتے۔

”جلدی آ جانا۔ میں روٹیاں پکا رہی ہوں۔“

”جی اچھا دادی جان۔“ وہ نماز پڑھ کر بڑی سعادت مندی ہوئی ہوتی۔

روانہ ہول کریمناں آئی تھیں۔ ربیعہ اپنے خیالوں سے چونک اٹھی۔ ایک گہری نگاہ انہوں نے ربیعہ پر ڈالی اور ہنسنے لگی۔ ”نجانے وہ ایسا کیوں کرتی تھیں۔ وہ جب بھی ربیعہ پر نگاہ ڈالتیں، چند لمحے اسے بے حد اہمیت سے نکال کر لیتی تھیں۔ ربیعہ ان کی آنکھوں میں جھانکتی، ان کے اندر جانا چاہتی لیکن وہ پتھر نگاہیں اسے اپنے اندر میں کامیاب نہ ہونے دیتیں۔ ان پتھر ملی نظروں نے اسے کبھی خود سے گزر جانے کا اذن نہ دیا تھا۔“

”میں نے کہا جگا دوں تمہیں۔ دن کے دس بج رہے ہیں۔ تم گھوڑے بیچ کر سوئی پڑی ہو۔ اپنے گھر میں تم اتنی

ربیعہ شرمندہ ہو کر بستری سے اٹھ کھڑی ہوئی اور چادر کو تہ لگانے لگی۔

مینا ہانی بستر سینے لگی تھیں۔

”آپ رہنے دیں، میں کر لوں گی پھپھو۔“
 ”پھپھو! وہ بھڑک اٹھیں۔“ میں کس رشتے سے تمہاری پھپھو بن گئی بھی؟ مجھے پھپھو دیکھو کہہ کر مت پکارتا۔“
 ربیعہ کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ چہرے پر سفیدی چھا گئی۔ وہ بے طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔
 ”سوری۔۔۔ آئی۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔ ”وہ ترانہ آپ کو پھپھو کہتی ہے تو میں نے سوچا۔“
 ”خیر۔۔۔ آئندہ خیال رکھنا۔ جلدی سے منہ دھو لو۔ میں نے تمہارے لیے ناشتہ بنادیا ہے۔“ وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ ربیعہ نے آنکھیں بند کر کے بے بسی سے سر ہلایا۔ یہ عورت اس کے لیے ایک معہ ثابت ہو رہی تھی۔

پل میں تولہ پل میں ماشہ والا مزاج سمجھنا اس کے لیے بے حد مشکل تھا۔
 اسے ترانہ کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا اسے بھی اس گھر میں ایک سہارے کی کمی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔ ربیعہ نے محسوس کیا تھا مینا اور صولت نے مل کر گھر اور اس کے مینوں کو اپنے دباؤ میں اس طرح سے لیا ہوا تھا کہ کوئی بھی ان کے مشترکہ محاذ کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا۔
 ایک فاجی زدہ شخص اپنے کمری میں پڑا کھانا، کھنکھارتا رہتا تھا، کسی کو اس کی اور اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ دونوں لڑکے براسرار شخصیتوں کے مالک تھے۔ کم، کم دکھائی دیتے۔ کسی سے کہی مخاطب ہوتے۔ ایسے میں ترانہ کو ”حقیتاً“ ایک سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہوگی۔ وہ گھر کی واحد ہستی تھی جس نے ربیعہ کی آمد کو بے حد خوشی سے قبول کیا تھا۔

منہ دھو کر وہ پین میں چلی آئی۔ ایک پلیٹ میں پڑا ہوا بنا رکھا تھا۔ دوسری پلیٹ میں رات کا بچا ہوا سالن تھا۔ چولہے پر پڑے سلور کے گندے سے ساس پین میں غالباً ”چائے کا پانی کھول کھول کر آدھا ہو چکا تھا۔ ربیعہ کا پی متلایا۔ اسے کبھی بھی ایسی گندگی کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔
 وادی کی صفائی پسندی تو خیر محلے بھر میں مشہور تھی، لیکن اس کے آس پڑوس کے گھروں میں بھی گھروں کا عموماً اور باورچی خانے کا خصوصاً بے حد دھیان رکھا جاتا تھا۔
 ربیعہ نے کھولتا ہوا پانی سنک میں گرا دیا اور ساس پین کو مانجھنے لگی۔ صاف ستھرا ساس پین اس نے چولہے پر رکھا تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔

وہ پیڑھی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگی۔
 مینا پچھڑ پچھڑ پین میں داخل ہوئی تھیں۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر ایک نظر انہیں دیکھا۔
 ”تم ناشتہ کر لو تو ذرا اپنے پھوپھا کا کمرہ صاف کر لو۔“ وہ بولیں۔
 ربیعہ کے ذہن میں وہ کمرہ اور اس کی اشیاء گھوم گئیں۔ اس کا نوالہ حلق سے اترنا مشکل ہو گیا۔
 ”جی اچھا۔“ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

”ویسے تو میں روزی یہ کام کرتی ہوں۔ لیکن کھانا پکاتے پکاتے وقت زیادہ ہو جاتا ہے۔ اب تم اتنی گئی ہو تو ظاہر ہے گھر کے باقی افراد کی طرح تمہیں بھی کوئی نہ کوئی ذمہ داری سنبھالنا ہوگی۔ تم اپنے پھوپھا کا کام کر دیا کرو۔ باقی کام تو کسی نہ کسی طرح ہو ہی جاتا ہے۔ چائے بن گئی ہے۔ چولہا بند کرو۔“
 ”جی۔“ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ”کر دیجئے۔“

”ان کے کمرے میں جو بالٹی پڑی ہے اسے روز صاف کیا کرو۔ گندگی باہر گلی میں پڑی بالٹی میں گرا دیا کرو۔ بعد از روز کے روز لے جاتا ہے۔ پھر اسے دھو کر صاف کر کے واپس کمرے میں رکھا کرو۔ وہ بے چارے اب اٹھ کر باٹھ روم جانے کے تو ہنس نہیں۔ بیماری ہی ایسی پڑی ان پر۔ ورنہ کس کا جی چاہتا ہے ایسے بستروں میں ہی فارغ ہونے کا یوں تو یہ ثواب کا کام ہے۔“
 انہوں نے رک کر اس کا ہوا نیاں اڑا تا چہرہ دیکھا۔ اس کی پلیٹ میں پڑا پڑا اٹھا بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سالن پر

گلی لڑ رہی تھی۔ وہ نوالہ لینا بھول گئی تھی۔

”ان کے بستر کی چادر ہر دوسرے روز تبدیل کر دیا کرو۔ ان کا ایک جوڑا روز استری کر کے ٹانگ دیا کرو۔ لڑکے اور لڑکیاں آتے ہیں خود ہی تبدیل کروائیں گے۔ یہ ہم عورتوں کا کام تو ہے نہیں۔ باقی یہ ہے کہ ٹب میں پانی بھر کر ان کو دھو کر دلو اور تمہارا کام ہے۔ ان کی دوائیوں کا حساب کتاب میں نہیں بتا دوں گی۔ کس وقت کون سی دوا کتنی دلاؤ اور میں دیتی ہے ذہن نشین کر لیتا۔“

انہوں نے خود ہی چائے چھان کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ربیعہ کا داغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس نے کبھی اپنے کمر کا ٹواٹلٹ تک نہ دھویا تھا۔ ایسے کاموں سے اس کی جان جاتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہیں بھاگ جائے یا پھر دھواں دھار روئے۔ بس وہ کام اسے نہ کرنا پڑیں۔ جن کی فرست اسے سنائی جا رہی تھی۔

”اور ہاں۔ منور بھائی کو پیاس کی بیماری ہے۔ انہیں ہر وقت بس پیاس ہی لگی رہتی ہے۔ کو لرو بار بٹتا ہے ان کے سرے کا۔ خیال رہے، کبھی وہ کو لرو خالی نہ ہونے پائے ورنہ سمجھو تمہاری شامت ہے۔ تم سن بھی رہی ہو نہیں یا نہ رہی ہوں؟“ وہ جھلا میں۔

ربیعہ نے جھکا ہوا سر اثبات میں ہلا دیا۔ سر اٹھانے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ اس کی آنکھیں پانی سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ انہیں اپنے آنسو نہ دکھا سکتی تھی۔ وہ چپ چاپ انہیں حلق سے اٹارنے کی کوشش میں مصروف رہی۔

”میں نے ترانہ سے کہا ہے تمہارے لیے کسی نوکری کا بندوبست کرے۔“ وہ پھر گویا ہوئیں۔

ربیعہ کا دل اچانک مطمئن ہوا۔ گھر سے باہر کی نوکری یقیناً گھر کی اس نوکری سے بہتر ہوتی۔ اسے اپنی عاقبت کی راہ نظر آنے لگی۔

”لیکن میں نے اس سے کہا ہے کہ نوکری شام کی ہونی چاہیے۔“ انہوں نے مزید کہا۔ ”صبح میں تو مجھے تمہاری رات ہے۔ میں اکیلی اس گھر میں جان کھپا کھپا کر ادھ موٹی ہو چکی ہوں۔“

ربیعہ نے سر ڈال دیا۔ وہ کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ اندر جانے کے لیے کڑے حوصلے کی ضرورت تھی۔ اس نے اٹھیں بند کر کے خدا کو یاد کیا اور اندر داخل ہو گئی۔

”کھوں کھوں کھوں۔“ بستر پر ڈالا چارو جو دہری طرح کھانسا رہا تھا۔

ربیعہ کے اندر ہمدردی اور خلوص کی لہر اس اٹھیں سے وہ ان کے قریب چلی آئی۔

”پھوپھو جی۔“ وہ ان کے پاس بیٹھنے لگی لیکن اگلے ہی بل اسے ابکاٹی آگئی تھی۔ ان کے نقصان زدہ بستر پر بیٹھنا انسان کا کام نہ تھا۔ بستر کے نیچے کی ہوئی بالٹی پر کھیاں جھنجھٹا رہی تھیں اور اس کی بدبو سے داغ پھٹا جاتا تھا۔

پے در پے ابکائیوں سے ربیعہ کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر ایک لمحہ سے پیشتر کمرے سے باہر نکل بی اور دروازے سے ٹیک لگا کر باپنے لگی۔

”یا اللہ۔“ اس کے دل سے درد کی صورت نکلا تھا۔ ”مجھے معاف کر دے۔“

اسے گالوں پر پیش کا احساس ہوا۔ ماتھے پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ خدا کو پکارنے پر جواب اگر اتنے قریب سے ملے تو ایلیفیات ہوتی ہیں۔ اسے اندازہ ہو گیا۔

اس نے ایک نگاہ پھر کمرے کے اندر ڈالی۔ بستر پر ڈالا ہوا وہ شخص ایک انسان تھا۔ اس کے اندر بھی حیات کا کام آتی تھیں۔ اسے بھی اچھے برے کی تمیز اگر اب نہ رہی تھی تو کبھی تو رہی ہوگی۔ ربیعہ نے دوپٹے کا ٹونگ پر رکھا اور آنکھیں بند کر کے اندر گھس گئی۔ ذہن کو بالکل خالی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے وہ بالٹی اٹھائی تھی اور تقریباً بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔ بالٹی کو باہر گلی میں رکھی بڑی بالٹی میں اوندھا کردہ تیزی سے ٹواٹلٹ میں چلی گئی۔ وہاں پڑے برش سے اس نے اچھی طرح اس گندی بالٹی کو صاف کیا تھا۔

اسے دھو کر اس نے ٹوائلٹ میں رکھا فائل چھڑکا اور کچھ دیر کے لیے وہیں چھوڑ دیا۔ پھر وہ واپس کمرے میں چلی آئی۔

وہ کمرہ کم اور کباڑ خانہ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ فرش ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے اس پر جھاڑو نہ دی گئی ہو اور مینا بیگم کا دعوا تھا کہ وہ روز اس کمرے کو صاف کیا کرتی تھیں۔

ربیعہ کو وہ سب کچھ صاف ستھرا کرنے میں دو گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ اس نے دوائیوں سے الٹی ہوئی ٹرے صاف کی جس میں پرانی، خالی اور بھری شیشیاں تھیں۔ ایک پیاز ہو جانے والی دوائیں تھیں۔ ضروری اور غیر ضروری نسخے تھے۔ اس نے بے حد محنت سے وہ ٹرے صاف ستھری کر کے منور امین کے سرہانے رکھی۔ دیواروں سے مٹی اور جالے صاف کیے۔ ڈسٹبنگ کر کے دیگر اشیاء کو چمکایا۔ جھاڑو لگا کر کچرا سمیٹا اور رگڑ رگڑ کے پوچھا لگا کر گندافرش چمکانے کی اپنی سی کوشش کی۔ کور میں رکھا ہوا پانی بدبو دے رہا تھا۔ غالباً ”اس کور کو کبھی دھل کر صاف ہونے کا شرف حاصل نہ ہو پایا تھا۔ ربیعہ نے کور کا پانی پھینک کر اسے اچھی طرح دھوا منجھ کر صاف کیا اور تازہ پانی میں برف ڈال کر اسے واپس کمرے میں پہنچایا۔

پھر وہ ٹب میں پانی بھر کر کمرے میں لے گئی تھی۔
”پھوپھا جی! ہاتھ منہ دھولیں۔“

انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔ ایسی ہی پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اسے پچھلے دو ڈھائی گھنٹے سے جان توڑ محنت کرتا دیکھ رہے تھے۔
”میں صابن اور توبہ لاتی ہوں۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے سے گئی تھی۔

رات کو ترانہ اپنے باپ کے لیے پھل لائی تھی۔ اسے غالباً ”آج تنخواہ ملی تھی۔ اس کے چہرے پر تازگی سی تھی

ربیعہ، منور امین کو نسخے کے مطابق گولیاں کھلا رہی تھی۔ ترانہ کمرے میں داخل ہوئی پھر ٹھک کر رک گئی۔ اس کے چہرے پر گویا کسی غلطی کا احساس لکھا تھا۔ پھر اس نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا اور خود کو یقین دلایا کہ اس سے غلطی نہیں ہوئی تھی۔ وہ واقعی اپنے باپ کے کمرے میں ہی داخل ہوئی تھی۔
صاف ستھرے بستر پر اس کا باپ صاف ستھرے کپڑے پہنے لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ روشن معلوم ہو رہا تھا۔ فرش بالکل صاف اور داغ دھما سے پاک تھا۔ کمرے میں شاید اگر بتی جلائی گئی تھی۔ بلکی، بلکی، بھینی، بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بستر تک آئی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی مثبت تھی۔

ربیعہ نے بشارت سے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”یہ۔۔۔ کمرہ تم نے؟“ اس سے بولا نہ گیا۔

ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پر روشنی سی چمکی تھی۔

”کھوں۔۔۔ کھوں۔۔۔ کھوں۔۔۔ خدا اس کا بھلا کرے۔ کھوں۔۔۔ کھوں۔۔۔ کھوں۔۔۔“ منور امین نے پانی کا گلاس خالی کر کے اسے دیا۔

ان کا دایاں حصہ کام نہ کرتا تھا لیکن بائیں ہاتھ سے وہ اپنے تقریباً ”بھی کام کر لیا کرتے تھے۔ ترانہ کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے پھلوں کا لفافہ باپ کے سرہانے رکھی میز پر رکھ دیا۔

”ٹھیک یو ربیعہ!“ وہ ممنونیت سے بولی۔

رات کو وہ دونوں چھت پر چلی آئی تھیں۔ صولت صحن میں ماں کے ساتھ بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ ترانہ نے اسے بھی چھت پر چل قدمی کی پیش کش کی تھی، جسے اس نے ناک چڑھا کر رد کر دیا تھا۔

"میں کھانا کھا کر سوؤں گی۔" وہ رکھائی سے بولی تھی۔

اس کے انداز میں اپنی ماں کا سا کھٹکنا تھا۔

"میں کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں ربیعہ۔ میں ان کی بیٹی ہوں لیکن یقین مانو کتنے دنوں سے میں اس کام کے لیے ہمتیں جمع کر رہی تھی جو تم نے پلک جھپکاتے میں کر دکھایا۔ ابو کا کمرہ اور انہیں یوں صاف ستھرا دیکھ کر میرے دل سے بے اختیار تمہارے لیے دعا نکلی۔ جس گندگی کو صاف کرنے کی ہمت بیٹی اور بہن میں نہ تھی۔"

"میں بھی تو ان کی بیٹی جیسی ہوں ترانہ۔" ربیعہ خلوص سے بولی۔ "میں نہیں یوں مجبور اور لاچار دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے۔"

"تم بہت اچھی ہو ربیعہ۔"

ربیعہ مسکرا کر رہ گئی۔

"پچھو کا سلوک تم سے کیسا ہے؟" دونوں چھت کی دوسری منڈیر تک چلی آئی تھیں۔ ربیعہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو رہی۔ شرکی روشتیاں جگنوؤں کی مانند چمک رہی تھیں۔ جھینگروں کی آواز خاموش ماحول میں اداسی سی پھیل رہی تھی۔

"یہاں بہت جیس رہتا ہے۔" ربیعہ بولی۔

"ہاں۔ کچھ دنوں میں زور کی برسات پڑے گی۔ پھر موسم اچھا ہو جائے گا۔ خیر موسم کا کیا ہے ساری بات من کا موسم کی ہے۔ تمہارے من کا موسم کیسا رہتا ہے ربیعہ؟" ربیعہ سوچ میں پڑ گئی۔

"شاید ایسا ہی۔" وہ رک رک کر بولی۔ "اوس اداس، جس زور۔"

"بھئی تم نے اپنے اندر پھول کھلتے محسوس کیے ہیں؟" ترانہ نے پھر پوچھا۔

اس کے لہجے میں خوابوں کی سی بے یقینی تھی۔ ربیعہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اندھیرے میں بھی وہ اس کے منہ پر رقم کیفیت دیکھ سکتی تھی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ سمیٹا کا چہرہ دیکھ رہی ہو اور سمیٹا اس سے بدرجہا باتیں کر رہا ہو۔

"پھول تمہارے اندر کھلے ہوئے ہیں، ہیں نا؟" ربیعہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"شاید! وہ مسکرائی۔"

"لگتا ہے گلستانِ دل میں کوئی "مالی" اپائنٹ ہو گیا ہے۔" ربیعہ شرارت سے ہنس پڑی تو ترانہ چونک گئی پھر وہ انہوں سے ہنس دیں۔

"بے وقوفوں کی طرح مت ہنسو۔" کوئی ڈپٹ کر بولا۔

"دونوں ہی خائف ہو گئیں۔ تمدن سب سے اوپری میڑھی پر کھڑا تھا۔ وہ کب اور چلا آیا انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ ماہِ رواں اپنی باتوں میں کچھ زیادہ ہی مگن ہو گئی تھیں ورنہ اس کی اسٹک کی آواز اس کی آمد سے قبل ہی اس کی اطلاع دے دیا کرتی تھی۔"

"آواز دوسرے گھروں میں جاتی ہے۔" پھر مزید بولا۔ "مجھے روٹی دو۔ بھوک لگی ہے۔"

اپنی بات کہہ کر وہ مڑ گیا تھا۔

"مجھے یہ لفظ "بھوک" بہت برا لگتا ہے ربیعہ۔" ترانہ دھیرے سے بولی۔

"کیوں؟" اس کا وہ بیان تمدن کی جانب تھا۔ وہ بنا سوچے سمجھے بولی۔

"بس نفرت ہے مجھے اس لفظ سے۔ اسے استعمال کیے بغیر بھی تو کھانا مانگا جاسکتا ہے، ہے نا؟"

ربیعہ نے نا سنجھی سے اسے دیکھا۔ وہ مسکرا دی۔

"چلو۔ نیچے چلیں۔"

”خے کون کم بخت ہے۔“ فردوس بیگم نے تلملا کر ریسیور پنچا۔

اسنے کمرے سے نکلتی عریشہ کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ فون کی گھنٹی کی آواز سن کر باہر آئی سی تھی ہم فردوس بیگم نے ریسیور اٹھالیا۔ دوسری جانب سے ان کی آواز سن کر سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔

”میا مرے اس کی۔ ہم اپنے کو مشکل سے سنبھالتے ہیں انہیں مستی سو جھتی ہے۔ دوڑتے بھاگتے ہانڈا چھوڑ کر اس مردار کو سننے آؤ تو دوسری طرف سے ”ٹوں ٹوں ٹوں ٹوں“ ہونے لگتا ہے۔“

عریشہ کے لمبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی جسے ماں سے چھپانے کے لیے وہ پھر کمرے میں چلی آئی۔ وہ بکتی جھکتی والہم پکن میں جا چکی تھیں۔

عریشہ نے کمرے سے جھانک کر ان کے نہ ہونے کا یقین کیا پھر تیزی سے چلتے ہوئے فون تک آئی۔ سب سہلا کام اس نے بھلی کی آواز کم کرنے کا کیا تھا۔ اگلے ہی لمحے پھر ”گھر گھر“ ہوئی۔ اس نے سی ایل آئی پر فہم دیکھتے ہوئے فون اٹھایا۔

”بہت ہی ڈھیٹ شخصیت ہیں آپ۔“ اس نے ریسیور اٹھا کر دانت پکچکائے۔

”عاشقی کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے جناب! اس وصف کے بنا عاشقی ناممکن۔“ چمک کر کہا گیا۔

”کسی دن گالیاں بڑ گئیں تو عاشقی دھری کی دھری رہ جائے گی۔“

”اجی آپ۔ بسم اللہ بچنے گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہونے کی قسم اٹھائی ہے ہم نے۔“

”یہ کام میری والدہ زیادہ اچھا کرتی ہیں۔ کہتے تو فون انہیں دے دوں؟ اس نے شرارت سے لب دبائے۔

”اللہ ان کے دامن میں خوشیاں بھرے۔ ہم پھر بھی انہیں اور آپ کو یہی دعا دیں گے۔“ عریشہ کو بات سمجھ نہی آئی تھی۔

”قسم خدا کی۔ محنت کا پھل مل گیا۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”یہ مدھر جھنکار پچھلے گھنٹہ بھر کی محنت کا صلہ لگی ہے۔“

”آپ باتیں تو خوب بناتے ہیں۔“ وہ تار کو انگلی پر لپٹنے لگی۔

”کسی دن سنئے نا۔“ محبت سے فرمائش کی گئی۔

عریشہ کا دل اڑ کر چاند پر جا پنچا۔ چاروں اور رنگ برنگ ستارے چمکنے لگے۔

”میں بند کر رہی ہوں فون۔“ اس نے تاز سے دھمکی دی۔

”کل کس وقت کروں؟“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی۔

”بولیں نا۔ پلیز۔“

”وہ سر دوجے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اچھا۔“ وہ خوش ہو گیا۔ ”میرا نام فراز ہے۔ آپ کا؟“

”عریشہ۔“

ماں کو پکن سے نکلتا دیکھ کر اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔

”نافع۔“ عذرا بیگم نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے نافع کو پکارا۔

وہ ٹھہر گیا۔ ”جی امی۔ کہیے۔“ وہ مڑ کر ان تک آیا۔

”کیس جا رہے ہو؟“

”جی ہاں، دوست کی طرف جا رہا ہوں۔ کہیے کوئی سبزی یاد آگئی؟ آلو، مغز، بھنڈی، کیا لاؤں؟“

”چلو، ہنو، میرے منہ پر سبزیوں کے نام لکھے ہیں کیا؟“ وہ ہر امان کر بولیں۔

”جی نہیں، میرے منہ پر لکھے ہیں۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”اسے دیکھتے ہی آپ کو سبزی مارکیٹ یاد آجالی ہے۔“

اپنی اپنی آئی۔

”ابھی بیٹوں سے اپنے کام نہ کہوں گی تو کس سے کہوں گی۔“ انہوں نے دلار سے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔
 ”ابا سے کہہ کر دیکھیں۔“ وہ شرارت سے بولا۔ ”وہ بھی کبھی انکار نہ کریں گے۔“
 ”نہیں کا۔“ انہوں نے اس کے سر پر پیار سے چپٹ لگائی۔ ”اب کچھ عقل سمجھ لو۔ بیاہ کر دیں تو سال بھر
 ان جاؤ گے اور باتیں سنو تو نو عمر لڑکوں کی سی۔“

”ابھی تو لڑکا ہی رہنے دیں امی!“ وہ ہنسا۔
 ”بات سے لیے رو کا تھا تمہیں۔“ وہ بیٹھتے ہوئے اصل موضوع کی طرف آئیں۔ ”مفتی کر ڈالیں تمہاری؟“
 ”نہیں تو نہیں؟“

”نہیں کر رہا تھا۔“
 ”بلجیدہ ہو چلیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا اور ابھی تو کافی وقت بڑا ہے ان خرافات کے لیے۔ لیکن ٹھہریے
 اب سے پہلے مجھے اس خوش قسمت کے نام سے آگاہ کر دیجئے جس کا نام قرعہ فال میں یقیناً وادی جان نے
 لیا ہے؟“

”ابھی اس نے آنکھیں میچیں۔“ جس کا ڈر تھا۔
 ”ابھی ائی ہے بجی میں؟“ نہیں برا لگا۔
 ”جائے، یعنی لگے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔

”میں کم ہو بچپنا تو کہو۔“ انہوں نے طنز سے اسے دیکھا۔
 ”ابھی مل کر آپ کو بہت ستائیں گے امی، انصاف پر نظر ثانی کی اپیل ہے۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھا۔
 ”ابھی بیٹا بات سن لو نسلی سے۔“ انہوں نے اسے پکارا۔ ”دیکھو، میں صاف صاف پوچھ رہی ہوں تم سے پھر
 ابھی وادی بات آگے بڑھا میں گی۔ ابھی اگر دل میں کچھ اور کھجڑی پکی ہے تو بتا دو۔ پھر نہ کہنا، ماں نے زبردستی کی

”ابھی کہوں گا۔“ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔
 ”ابھی اپنی بات کا جواب مل گیا تھا۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ابھی یقین نہیں آ رہا یہ تم ہی ہو۔“ انہوں نے بے اختیار اسے شانوں سے تھام کر دیکھا۔ ایتقان مسکرا دی۔
 ”ابھی مل گئی ہوں آنٹی؟ اب اتنی بھی مولی نہیں ہوئی ہوں۔“ وہ شرارت سے بولی۔
 ”ابھی نہیں ہو۔“ وہی سی پاری ہو۔ یقین اس لیے نہیں آتا کہ مدتوں بعد اس گھر میں قدم رکھا ہے تم نے۔ مانو
 وہی مول گئیں۔“ منجیدہ بیگم پیار سے بولیں۔

”ابھی بھولتا ہے آنٹی! وہ بھی بچپن کی ہم جولیوں کے گھر کا رستہ۔ آپ کو بھی اب تک یاد ہوں گے اپنے
 لے سب رستے۔“ وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔
 ”ابھی بیکم چلتے چلتے رک سی گئیں۔“

”ابھی گھر پر نہیں ہے؟“ ایتقان نے پوچھا۔
 ”ابھی آنے والی ہے۔ تم بیٹھو، تب تلک ہم باتیں کرتے ہیں۔“
 ”ابھی ان کے ساتھ لافچ میں پڑے صوفوں پر بیٹھ گئی۔
 ”ابھی ایتھا، عمر کا بہت اچھا دوست ہے۔“ وہ خوش ہو کر تانے لگیں۔

”ابھی اب۔“ وہ ہنس دی۔ ”یہاں آتے ہی آپ کے گھر بھاگتا ہے کہ عمر سے مل کر آتا ہوں۔“
 ”ابھی ایتھا۔ ماؤں نے بچوں کو درختے میں یہ دوستی دی ہے۔ چائے بناؤں تمہارے لیے یا ٹھنڈا پیو گی؟“

”کھانا کھاؤں گی۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”لیکن شہلا کے آنے کے بعد“
 شہلا آچھتی دیر میں آگئی تھی۔ ایقان کو دیکھ کر وہ خوشی سے چل اٹھی۔
 ”تمہاری یادداشت لو۔ آئی ہے ایقان؟“ وہ اس سے لپٹ کر خوش دلی سے بولی۔
 ”ہاں۔ سب کچھ یاد آگیا ہے۔“ وہ خوشی سے بولی۔ ”تمہیں بھی کچھ یاد ہے یا نہیں۔ تم میری بات کبھی
 تھیں۔“

شہلا لمحہ بھر کے لیے سنجیدہ ہوئی۔ ایقان کی بات میں گہرائی تھی اور اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا
 مسکرا دی۔

”میں پڑے بدل کر آئی ہوں۔“

”ضرور۔“ ایقان مسکرائی۔

شہلا اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ ایقان کی آمد یقیناً کسی اہمیت کی حامل تھی۔ وہ کچھ پریشان ہوئی۔ مگر
 وہ بند کرکٹ بھی لیکر سامنے بیٹھی ایقان کو قائل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ لباس تبدیل کرتے
 مسلسل اسی سوچ پر سوچتی رہی۔

”اب کوسو۔“ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”کیسے خیال آگیا؟“

”سچ کہوں تو مجھے بھیجا گیا ہے۔“ ایقان نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”کس نے؟“ اس نے نگاہیں چرائیں۔

”جیسے جانتیں نہیں۔“ ایقان نے ڈانٹا۔

”ایقان پلیز!“ شہلا نے لجاجت سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”میری زندگی میں کسی مرد سے
 جوڑنے کی رتی برابر جگہ نہیں ہے۔ تم مجھ سے جہاں بھری باتیں کرلو لیکن پلیز ایہ بات مت کرنا۔ میں ہاتھ
 ہوں۔“

ایقان دم بخود رہ گئی۔ اتنے واضح انکار کے متعلق اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

”شہلا۔“ اس کے لبوں پر اس کا نام دم توڑ گیا۔

ایقان دکھ کے احساس میں ڈوبی بہت دیر تک خاموش بیٹھی رہ گئی۔ شہلا اپنے آنسو پینے کی کوشش
 ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ماں یا بہن کے دل میں ان آنسوؤں کو دیکھ کر استفہام پیدا ہو اور پھر
 بڑھے۔ اصرار کو مزید افراد کی کمک حاصل ہو جائے۔ وہ اس بات کو محض اپنے اور ایقان کے مابین ہی ختم
 چاہتی تھی۔

”تم نے... امی سے کچھ کہا تو نہیں... میرا مطلب ہے۔“

”نہیں۔“ ایقان سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ”میں سب سے پہلے تمہاری رائے معلوم کرنا
 تھی۔ ہاشم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے اس کی بات سن کر فون بند کر دیا تھا؟ اسے کوئی جواب دینے کے بغیر۔ وہ اس کا
 کو تمہاری رضامندی پر محمول کر رہا ہے۔ وہ بہت بہت خوش ہے شہلا! تم کیوں ایک بے خلوص ہے؟
 سے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھین رہی ہو جبکہ اس کی خوشی تمہاری مانگ کی افشاں بھی بن سکتی
 تمہارے بیٹے کے سر کا سائبان بن سکتی ہے۔ بے وقوفی مت کرو شہلا! زندگی کی حسین ترین تمنا سے
 ہاتھ تمہاری طرف بڑھا ہوا ہے۔ اس تمنا کو اٹھا کر اپنے دل میں رکھ لو اور اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔ میں ایک
 دوست کی حیثیت سے تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں۔ یہ راہبہ کی سی زندگی کب تک گزارو گی۔ آئینے میں
 کبھی غور سے نہیں دیکھا تم نے؟ عمر کے جس دور سے تم گزر رہی ہو وہاں ہمیشہ ایک ساتھی کے مضبوط سہارا
 ضرورت ہوتی ہے شہلا! میں... میں... اور کیا کہوں تم سے؟“

ایقان بے بسی سے اس کا جھکا ہوا سر دیکھ کر بولی۔ شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی پلکوں پر نمی اور
 اس مسکراہٹ تھی۔

موت کو ایقان! جو کچھ تم کہہ رہی ہو، سچ ہے، لفظ لفظ مستحق کو نکال کر مجھے تمہارا رخصت ہوئے پر رتی
 مایہ نیک نہیں ہے۔ لیکن ایقان چہرہ چاہے جو کسے، آنکھیں خواہ کچھ بولیں، انسان مجبور محض دل کے ہاتھوں
 اور مدت ہوئی، میرے دل نے بولنا چھوڑ دیا ہے۔ کچھ نہیں کہتا، گونگا ہو گیا ہے۔ اس کی خواہشات سوئی
 ہیں کہ میں ان کے جانے کی امید رکھوں۔ ساری خواہشات مرگئی ہیں ایقان! بس ایک تمننا کی جلتی ہوئی لو
 ہرے راکھ ہوتے دل میں کچھ روشنی ہے۔ میرا بیٹا! میری ہر امید کا واحد مرکز، میری زندگی کی واحد وجہ
 نے کاکو تاشوت۔ میں کسی مرد کی زندگی میں شامل ہو کر اسے کچھ نہ دے پاؤں گی ایقان! کچھ بھی نہیں
 ملتی میں۔ میں اس کے لبوں پر بھی ایک مسکراہٹ تک نہ لاسکوں گی، پھر میں کیوں خود کو اور اسے یہ سزا

انہی نے قدرے ناراضی سے اسے دیکھا۔

”بھٹ بولتی ہو تم شہلا! زندگی میں نشیب و فراز سب کے ساتھ ہیں۔ حادثے بہت سوں کا مقدر بنتے ہیں
 لوگ ہنسنا، بولنا، جینا نہیں چھوڑ دیتے۔“ آئندہ ”تو ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے نگاہیں
 نہ اٹکتی ہو تم؟ تمہارا ”آئندہ“ تمہارے بیٹے کا ”آئندہ“ کیا سوچا ہے تم نے آنے والے کل کے بارے
 میں؟ تمہاری بہن بیہ کر اپنے گھر چلی جائے گی، تمہارا بھائی اپنی زندگی کی شروعات کرے گا۔ اس گھر میں اس کی
 آنے کی جس کے لیے تم اور تمہارا بچہ ناقابل قبول ہوں گے۔ وہ اپنے بچپن کا گھر چھوڑ کر تمہارے بچے کو نظر انداز نہ بھی
 کرے تم نہیں کہیں ضرور ایسا محسوس کرو گی۔ اس وقت کیا کرو گی شہلا! جب اس گھر میں تم خود کو مس فٹ

ہوا کا چہرہ کرب سے سیاہ پڑنے لگا۔

”مجھے معاف کر دو شہلا! میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔“ ایقان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”تمہارے خلوص پر مجھے شک نہیں ایقان! لیکن اپنے ”آئندہ“ کو محفوظ کرنے کے لیے، اپنے ”کل“ کے مفاد
 اور غرض میں کسی کے سچے جذبات کا سودا اپنے مردہ احساسات کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ اگر میرے اندر اس خوشی کو
 ادا نہ کرنا پڑتا تو میں ضرور آگے بڑھتی لیکن صرف اس لیے کہ مجھے ایک مضبوط ساتھ میرا آجائے اور عمر کو
 نام کا سا سائبان مل جائے۔ صرف اس لیے، میں کسی کی نیک، پر خلوص تمنناؤں کو اپنی مردہ دلی کا تحفہ پیش

”تم اس کر کے تو دیکھو شہلا! ہاشم ایسا نہیں ہے جیسا تم سوچتی ہو۔ وہ کبھی تم سے کوئی جگہ نہ کرے گا۔ تمہاری
 مری: اب تک مہمانی میں نہ بدل جائے، وہ تب تک اور اس کے بعد بھی ہمیشہ تم سے وفا کرے گا، محبت کرے
 گا۔“ اسے آزمائش یا اپنی بے مہری کو؟ دوست کی محبت میں تم ہیچیتجے کے ساتھ کچھ زیادتی نہیں کر رہی ہو ایقان؟
 ہاں! ملک ستاروں سے بھر کر اپنی آرزوؤں کے روپ جلانے کو وہ مجھ سے کچھ نہ چاہے گا؟ میرے اندر جذبول کے
 سرا اور خاموش ہو چکے ہیں۔ بلکہ سی چنگاری بھی نظر نہیں آتی۔ میں اس کے جذبول کی گرمی کے جواب
 میں کیا دے پاؤں گی؟

ایقان دلعتاً خاموش ہو گئی۔ اس بات کا کوئی جواب اس سے بن نہ پایا۔

”مرد کی محبت نے مجھے بہت دکھ پہنچایا ہے ایقان! اتنا دکھ کہ اب میں کبھی بھی ذہنی طور پر کسی مرد کی محبت کو قبول
 نہیں کر سکتی۔ مجھے مجبور مت کر دے بلکہ! ارہی بات میری اور میرے بیٹے کے مستقبل کی تو خدا کا شکر ہے کہ اس نے
 میری زندگی میں عطا کی ہے جو دو سروں کی خدمت میں گزر رہی ہے۔ مجھے اتنا آسرا بہت ہے کہ میں اپنے بیٹے کو اچھا
 لگاؤ بھی تعلیم اچھا مستقبل دے سکتی ہوں۔ بس اللہ کسی کا محتاج نہ کرے۔“

”لوں کے مابین خاموشی کا طویل وقفہ در آیا۔ ایقان کی نگاہوں میں ہاشم کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی
 ”اس کے لبوں کی وہ مدھم مسکراہٹ، چہرے کی کوسہ کتنا خوش تھا وہ اسے سب کچھ بتاتے تھے۔ اس کے

انگ انگ سے خوشی چھلکی بڑتی تھی۔
 ”میں نے کہہ دیا پھپھو! سب کچھ کہہ دیا۔ جو کچھ میرے اندر چھپا ہوا تھا برسوں سے سب کہہ ڈالا۔ میری ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔“

”اس نے کیا کہا؟“ وہ بے حد پر تجسس تھی۔

”اس نے؟“ وہ لمحہ بھر کے لیے دم ہم پڑا تھا۔ ”خاموشی نیم رضامندی۔“

وہ ہنس کر بولا تھا۔ اس کی ہنسی میں یقین تھا۔

ایقان نے گہری سانس بھری۔ اس کی زندگی کی حسین تمنائے جی پھیلی پر اسے شہلا کا انکار رکھنا تھا۔ کسا مشکل کام تھا جو اسے کرنا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی جوت پھونک مار کر بچانی تھی۔

اس کی وہ دلی دلی خوبصورت مسکراہٹ اس کے لبوں سے مٹتے ہوئے دیکھنی تھی۔

”اتنا حوصلہ کیسے کروں شہلا!“ وہ بول اٹھی۔ ”کیسے مایوس ہو تا دیکھوں اسے؟ اس نے لمحہ لمحہ تمہارے دل کی تمنائے کی ہے۔“

”جانتی ہوں ایقان! لیکن میرے قرب سے اسے خوشی نہیں دکھ ملے گا۔ اسے دکھ سے بچاؤ۔“ شہلا انا سے بولی۔ ایقان نے غور سے اس کی سمت دیکھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی۔

”جھٹ! ایسا کرو۔ کچھ دن سوچ لو غور کرو۔ کیا خبر تمہارا دل کوئی مژدہ سنا دے۔“

شہلا نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور مسکرا دی۔

”بہت خوش امید ہو ایقان تم ہمیشہ کی طرح۔“

”اور تم لمبی ہی ٹھووس۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”تمہیں احساس نہیں ہے شہلا! کہ تم کسی کے ساتھ کتنی زیادتی کر رہی ہو۔ اپنے آپ کو مٹاؤ شہلا! دل کے دیپ جلاؤ، جلائے کی کوکوش تو کرو۔ اپنی سیاہ آنکھیں خوب دیکھا کرو، اپنے تراشے ہوئے لبوں پر دھیان دو ذرا۔ اپنی زلفوں سے پوچھو، اتنا حسن تم سے شکایت نہیں کبھی؟ کہ اسے ایک سراپے والا درکار ہے، چاہنے والا درکار ہے۔“

شہلا کی نگاہیں جھک گئیں۔ اس کے گال سرخ ہو گئے تھے۔ ایقان خوش ہو گئی۔

”دیکھا، اتنی نالاج اس تصور سے؟ پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ جذبوں کے الاؤ سر دے گئے ہیں۔ رخساروں پر گرم حرارت جھوٹ نہیں بول سکتی۔“

”ایقان پلیز۔“ شہلا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

”میں تمہیں وقت دے رہی ہوں شہلا! خوب سوچ لو۔ ہاشم کا بچھا ہوا چہرہ دیکھنے کی تاب نہیں ہے مجھ میں اسے یہی کہوں گی کہ تم نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔“

”نہیں ایقان!“ وہ بے تابی سے بولی۔ ”وہ نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے۔ اپنے اندر اس کے مزید دیے جلا لے۔“

”کیا خبر کسی دیے سے تمہارے اندر کا الاؤ ہی بھڑک اٹھے۔“ ایقان نے اسے گھورا۔ ”میں کچھ نہیں ہا اسے یوں اچانک ہی مایوس اور نامراد مت کرو۔“

پھر اس نے لا چاری سے سر جھکا لیا۔

”حیات ولا“ کے بڑے سیاہ گیٹ پر ہی وہ اس کے مقابل تھا۔ ایقان ٹھٹک گئی۔

”کیا کہا پھپھو! اس نے؟“ وہ بے تابی سے اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

”ٹوکے! دم تو لینے دو، میرا سانس پھول رہا ہے۔“

”میرا دم نکل رہا ہے پھپھو! آپ کو سانس لینے کی پڑی ہے۔“ وہ چڑ گیا۔

”ہائیں۔“ وہ رک کر اسے گھورنے لگی۔ ”یعنی پھپھو مرئی ہے تو مرے، تمہیں زندگی کی نوید مل جائے۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔

اس نے چہرے پر شرمندگی اور بے قراری کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ایقان کھڑی اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔ اس کا ہر ذرہ پھوڑی ہونے لگی۔ اپنا یہ بے وقوف سا جھنجھاکو تقریباً اس کا ہم عمر تھا۔ اسے بے حد عزیز تھا۔ اس نے منع کر دیا پھپھو؟ ”وہ ایسے ہی نظریں جھکائے ہوئے پوچھنے لگا۔

ایقان ہولے سے مسکرا دی۔

”ہیں۔“ وہ رسانیٹ سے بولی۔

”ہم جو نک اٹھا۔ اس کے چہرے پر روشنی سی لپکی۔

”میں؟ مطلب ہاں! اس نے۔۔۔ اس نے۔۔۔“

”ہیں کی۔“ ایقان اطمینان سے کہہ کر پھر چل دی۔

”مہمند لمحے اپنی جگہ پر کھڑا اس کی بات پر غور کرتا رہا پھر بھنا کر اس کے پیچھے چل دیا۔

”اے پھو۔۔۔ اللہ کا واسطہ ہے آپ کو۔ مجھے اس طرح جاگل بتا کر آپ جل ہی دل میں لطف اندوز ہو رہی ہیں؟ پلیز

”دل آپ پھر کبھی پورا کریں۔“

اس نے ایقان کا بازو تھام لیا۔ ایقان رک گئی۔

”آپ کو میرے انتظار کی کیفیت کا احساس نہیں ہے؟ ورنہ آپ کبھی ایسا مذاق نہ کریں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

ایقان اس کی آنکھوں میں دیکھ نہ پائی۔ اس نے نگاہیں چرائی تھیں۔

”اس نے ہاں بھی نہیں کی ہے ہاشم! میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

”نہ ہاں نہ ناں۔ یہ کیسا جواب ہے؟“ وہ دکھ سے بولا۔ ”اور آپ؟ آپ اس جواب سے مطمئن ہو کر واپس

چلیں؟ اسی لیے مقدمہ دے کر بھیجا تھا آپ کو؟“

”اے ہاشم! اس نے سوچنے کے لیے فیصلہ کرنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔ ظاہر ہے جیسا تم سوچتے رہے

”اس کے لیے محسوس کرتے رہے ہو۔ ویسا اس نے نہیں سوچا پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ تمہا تھ بڑھاؤ گے اور

”صحت تمہارے بڑھے ہوئے ہاتھ پر اپنا ہاتھ دھر دے گی۔ وہ ایک ذمہ دار لڑکی ہے۔ ایک بڑھتے ہوئے بچے کی ہاں

”نہ دو کو مطمئن کرے گی۔ اپنے گھر والوں سے مشورہ کرے گی، اپنے بچے کو اعتماد میں لینے کی کوشش کرے گی،

”اپنی ایک واضح تھوس درست فیصلہ کر پائے گی۔ تم تو تھیلی پر سرسول بھانا چاہتے ہو۔“

”سری۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔ ”میں واقعی ایسا سوچ رہا تھا کہ آپ زندگی کا پروانہ لیے چلی آ رہی ہوں گی۔ میں

”میں تو تب سے بیس کھڑا ہوں۔“

ایقان نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ قریباً ”تین گھنٹے وہاں گزار کر آئی تھی۔

”ہاشم! پھر وہ ہمدردی سے بولی۔ ”کسی کو چاہو ضرور لیکن چاہت میں خود کو نظر انداز مت کرو۔ اپنی ہستی کو پہلے

”مہم بہانو دوسرے کی طلب میں خود کو مٹانے کا فلسفہ میری نگاہ میں تو سرا سر غلط ہے۔ ہر حال زیادہ بے تاب

”نے ہی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ پھر چل پڑی۔ ”یہ یاد رکھنا ہاشم! کہ فیصلے میں ہاں ناں کا چانس نفی نفی ہونا

”اور عقلمند لوگ ناں کو سیونٹی فائیو پرسنٹ دیتے ہیں تاکہ نتائج کا اثر مثبت ہی رہے۔ دل و دماغ پر اثر انداز نہ ہو

”اور پھر بھی یاد رکھنا کہ اگر وہاں سے انکار ہوا تو میں تمہاری ایک نہ سنوں گی اور مہینے بھر میں بیاہ کر دوں گی تمہارا“

”ہاشم وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

”اللہ آپ کا ظنہ سلامت رکھے۔ پتہ نہیں ہمارے پھوپھا سے اتنی محبت کیسے کر لی آپ نے؟“ وہ اسے دیکھ کر

”طر اتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

”آج کیسے سہیلی کی یاد جاگی من میں خیر تو ہے؟“ شفیقہ حیات نے اسے آتا دیکھ کر اپنے اوس سیٹھ

”سلام کرتے ہوئے ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ تھوڑا سا چلنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔

”یاد تو خیر ایسی چیز ہے اماں! بنا ٹکٹ کے جب چاہے چلی آتی ہے لیکن اس حال میں اتنا چلنے کی ہمت کہا مجھ میں ہاشم کے اصرار پر گئی تھی۔“

”ہاشم کا اصرار۔؟“ ان کا ماتھا ٹھنک۔ ”وہ کا ہے پر اصرار کرتا ہے؟ تمہارے وہاں جانے سے اس کا کیا تعلق؟“ بھول گئیں آپ؟ شہلا نے جب ابراہر جیلانی سے شادی کر لی تھی تو کیا حال ہو گیا تھا اس کا؟ مرنے والا تھا۔ اب بھابھی جان اس سے شادی کے لیے اصرار کیے جاتی ہیں اور اس کی سوتلی وہیں انکی ہوتی ہے۔ کتا شہلا سے ہی کرے گا۔ مجھے بھی تھا اس کی رائے لینے کے لیے۔“

شفیقہ حیات ٹھوڑی پر انگلی رکھے حیرانی سے اس کی جانب دیکھتی رہ گئیں۔

”اس نے بھیجا اور تم چلی گئیں؟ ارے لڑکی! بال بچوں والی ہو گئی ہے۔ کب عقل سیکھے گی ایقان؟“

ایقان چونک سی گئی۔ قدرے حلق سے اس نے ماں کو دیکھا۔

”جیسے بے عقلی کا کون سا مظاہرہ سرزد ہوا مجھ سے؟ وہ اس سے شادی کا خواہاں ہے تو اس میں میرا کیا ہاتھ اس میں برائی بھی کیا؟“

”جو بھی برائی ہے وہ اس کی ماں تمہارے کھاتے میں ڈال دے گی سیدھے سیدھے۔“ وہ بگڑ گئیں۔ ”قابل بنی پھر رہی ہو۔ ہاشم سے کہا ہوتا اپنی ماں بہن کو بھیجے اس کے گھر۔ وہ جا کر رشتہ ڈالیں وہاں۔“ ”ہاں“ وہ ہم بھی شرکت کر لیں گے ملگنی بیاہ میں۔“

”جی ہاں۔“ وہ طنز سے بولی۔ ”وہ بھیجے گا اور وہ چلی بھی جائیں گی۔ اتنی ہی سیدھی ٹھہریں آپ کی ہوسٹیک۔ لاؤ آسمان ایک کر ڈالیں گی پہلے تو پھر جا کر ڈھیر صلواتیں سنا آئیں گی اس غریب لڑکی کو جس کا رتی برابر قصور نہیں۔ سارے قصبے میں۔“

”اب تم سننا وہ ڈھیر صلواتیں۔“ وہ جل کر بولیں۔ ”اور تمہارے ویلے ہم بھی سن لیں گے۔“

”وہ ماں! ایسا کچھ نہیں ہوا، جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔“ وہ بیزار سی بولی۔ ”کون سا رشتہ جوڑ آئی ہوا میں۔ ذرا سی رائے معلوم کرنے گئی تھی وہ بھی قطعاً مثبت نہ ملی۔ بھابھی کو تو پتہ بھی نہ چلے گا۔“

”چھا۔“ شفیقہ حیات کو قصبے میں کچھ دلچسپی نظر آئی۔ ”منع کر دیا اس نے؟ چلو تو ٹھیک ہے۔ اب اسے اپنا پالنے کی فکر ہونی چاہیے کہ نوعمروں کے سے شوق کرے گی۔ ہاشم کا تو دماغ چل گیا ہے۔ گھر میں ایک سے ایک ہیرا لڑکی ہے لیکن وہی بات ہے دور کے ڈھول سہانے۔ گھر کی مرغی دال برابر۔“

ایقان چند لمحے انہیں دیکھتی رہی۔

”چھا اماں! آج سچ کہیں شہلا کی جگہ میں ہوتی تب بھی آپ ایسا ہی کہتیں؟“

”بکو مت۔“ وہ غصہ ہوئیں۔ ”میرے منہ کو نہ آؤ! اچھی بات کرو کوئی اور بیٹا! ماں ابھی زندہ ہے کچھ کر لے سے پہلے صلاح کر لیا کرو تاکہ بعد میں مشکلیں نہ اٹھانی پڑیں۔“

ماں بیٹی کی بحث کے دوران عذرا ایک دم بھی چلی آئی تھیں۔

”خیر تو ہے؟“ وہ ہنس کر پوچھا۔ ”کس بات پر آج ایقان کو بہت دل برداشتہ پڑ رہی ہے؟“

”ڈانٹ تو مجھے ستر برس کی عمر میں بھی پڑ سکتی ہے بھابھی جان!“ اور بے شک پڑے۔ میں محسوس نہیں کرتی۔

”تو بیٹا! سچ تو یہی ہے کہ ہاشم رشتہ دے کر ماں بہن کو روانہ کرے۔ تمہیں کیوں اتنی دور سے پہنچ لایا ہے؟ اور کرماں بہن راضی نہیں تو پھر یہ سچ کہے ہو گیا؟ پہلے گھر والوں کو تو منائے ماں سے تو جیت کر دکھائے یاد دوسری رتبہ کورٹ میں کروائے گا تمہاری سہیلی سے۔“

وہ حلق سے کہنے لگیں۔ ایقان چند لمحوں کے لیے چپ سی ہو گئی۔

”تم جوش میں آکر مدعی سے زیادہ چست ہو جاتی ہو۔ خود بھی باتیں سنتی ہو، ہمیں بھی سنواتی ہو۔“

ایقان نے بے بس ہو کر صہاج کی آڑ لی۔ ”ہاشم نے اتنی التجائیں کر کے بھیجا مجھے۔ کیا نہ
سارے کئی رشتہ نہیں بننا؟ اگر وہ اتنی شدید خواہش رکھتا ہے شہلا کے لیے تو اس کی ذرا سی اخلاقی مدد
لا کر دینا چاہیے؟ کمال کہاں ان معاملات کو سمجھ سکتی ہیں۔ دل کے معاملات سے تو انہیں یوں بھی بے
خبر رہا۔“

ایقان۔ شفیقہ حیات کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ آئی۔
ایقان۔ ”بیرہا ہے مجھے ان معاملات سے، تب ہی تمہیں بیاہ دیا عاشر میاں کے ساتھ۔ کوئی زور
نہیں۔ مٹی خوش رہے، ہمیں اور کیا چاہیے۔“ ایقان ہنس کر ان کے گلے لگ گئی۔
ایقان۔ ”عذرا بیگم بولیں۔“ زندگی ہاشم کو گزارتا ہے۔ اگر وہ ایسا چاہتا ہے تو بھلا بھی بیگم کو روڑے
لے جائیں۔ کیا حال ہوا تھا اس کا، بھول گئیں کیا وہ؟ میرا بیٹا اگر اتنی شدت سے کسی کو چاہے تو میں سر
ہٹاؤں اسے۔“

ایقان۔ ”ایقان نے منہ بنا کر انہیں دیکھا۔ ”بیل ہے وہ تو۔ نازک احساسات سے اسے کچھ واسطہ
نہیں۔“ اپنا تو یہ ڈپارٹمنٹ ہی نہیں۔“
ایقان۔ ”شفیقہ حیات جل کر بولیں۔“ ”سب غلغل ہے دماغوں کا۔“
ایقان نے بے بسی سے ان کو دیکھا۔



ایقان۔ ”پوچھوں آپ سے؟“ ڈرتے ڈرتے اس نے کہا تھا۔
ایقان۔ ”میں سوائے ترانہ کے اسے ہر کسی کو مخاطب کرتے ہوئے بے حد خوف محسوس ہوتا تھا۔ یہاں کے
ایقان۔ ”عجب پر اسراریت کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ ربیعہ کو یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اور سیارے پر
ایقان۔ ”ہمارے الفاظ اپنا مفہوم بدل چکے ہوں اور رویے اپنی سمت کھو بیٹھے ہوں۔ ہر شخص ایک عجیب انداز کا
ایقان۔ ”وہ کو اپنا آپ جی لگنے لگتا تھا۔“

ایقان۔ ”ابھی وہ منور امین کو دوا کھلا کر ان کے گلاس خالی کرنے کی منتظر تھی۔
ایقان۔ ”میرے پر پوچھو۔“ انہوں نے خالی گلاس اسے تھمایا۔ ”پوچھنا چاہیے تمہیں۔“
ایقان۔ ”انتہائی کیوں پتے ہیں؟“

ایقان۔ ”ابھی انہوں نے قدرے حلقی اور بے حد اچھی سے اسے دیکھا۔ غالباً وہ سمجھ رہے تھے کہ ربیعہ ان
ایقان۔ ”میں زندگی کی کوئی بات جانتا چاہتی ہے، اسی لیے انہوں نے بے حد بڑے پن سے اسے اجازت دی تھی
ایقان۔ ”اسے غصے سے دیکھ رہے تھے۔“

ایقان۔ ”کئی ہے میرے اندر۔ آتش فشاں ہے آتش فشاں، اسے بجھا رہا ہوں۔“ احمق لڑکی۔ یہ سوال پوچھا
ایقان۔ ”مقاہنہ۔ بھلا پانی کیوں پیتا ہوں۔ کھوں کھوں کھوں۔ پانی کوئی کیوں پیتا ہے؟ ڈاکٹر نے بولا ہے مجھے،
ایقان۔ ”اس لیے پیتا ہوں۔ تم کیوں پانی پیتی ہو؟ نہ ہی کرو، کھو، زردی آئے گی۔“ زرا سا کولر
ایقان۔ ”میرا ہمارا تو میرا پانی پینا برا لگتا ہے تمہیں۔ کھوں کھوں کھوں۔ اچھا بابا۔ مت دو مجھے پانی تم۔ پراسا مارو
ایقان۔ ”میں کیا کہتی ہو۔ آخر کس باپ کی بیٹی ہو۔ پیاسا ہی مارو گی۔ کھوں کھوں۔“

ایقان۔ ”سائنس لینا محال ہو گیا۔ وہ گھبرا کر تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔ وہ خود کو کوس رہی تھی۔ جب اسے
ایقان۔ ”میں نے یہاں ہر شخص میں تو لہر مٹا دی، دل میں ماشہ ہے تو بھلا اسے ایسا سوال پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ خواہ
ایقان۔ ”میں دو کی جگہ دس کو لپٹا پانی بی جائیں، اسے کیا لینا دینا لیکن بات محض اتنی تھی کہ ایک جیتے جاگتے انسان کے
ایقان۔ ”بات کرنا بھی ایک ضروری عمل ہے۔ خاموش رہ رہ کر اس کے جڑے درد کرنے لگتے تھے، دل گھبرانے لگتا تھا۔
ایقان۔ ”میں اگر وہ مینا سے کوئی بات کرتی تو کسی نہ کسی بات کا یہی رد عمل سامنے آتا جو ابھی سامنے آیا تھا۔ صولت کو
ایقان۔ ”میں کرتی تو وہ جواب میں پتھر پھینچ مارتی۔ منور امین صرف جسمانی ہی نہیں ذہنی بیمار بھی تھے۔ دن بھر ایک نرس

کی طرح ان کی ڈیوٹی نبھاتی رہی۔ جب کبھی اپنے آپ کو چند ایک نمبر زیادہ دینے کی کوشش کرتی تو وہ اس کے علم کے صفحے پر لمبی لکیر کھینچ کر اسے فیل قرار دے دیتے تھے۔ وہ برآمدے میں رہی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر آنسو چلا کوشش کرنے لگی۔

تب برابر والے کمرے سے اسٹک کے سہارے چلتا ہوا تمدن باہر آیا۔ ربیعہ نے اٹھنے کے متعلق سوچا مگر اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ کوئی راہ قرار نہ تھی۔ اس کے اٹھ جانے پر ایک اور برابر عمل سامنے آنے لگا تھا۔

”باکیوں چیخ رہے ہیں؟“ وہ آہستگی سے پوچھنے لگا۔
 ”جی۔۔۔ وہ پتہ نہیں۔“ اس نے آنسو لگتے ”میں نے۔۔۔ شاید غلط بات پوچھ لی تھی۔“
 ”کیا پوچھا تم نے؟“ وہ کچھ چونکنا ہوا۔ ”پیسوں کے متعلق؟“
 ”ہیے؟“ ربیعہ بے حد حیران ہوئی۔ ”کون سے پیسے؟ میں تو ان سے پوچھ رہی تھی کہ آخر وہ اتنا پانی کیوں ہیں۔“
 ”آج سے وہ اب تک بیس چالیس گلاس پانی پی چکے ہیں۔ بس اس بات پر وہ ناراض ہو گئے۔ اگر مجھے علم ہے کہ ان کو برا لگے گا۔ تو میں۔۔۔ ہرگز نہ پوچھتی۔“
 اسے بے حد رونا آ رہا تھا۔

”پانی کیوں پیتے ہیں۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔ اتنا پانی۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔“ اسے اس بات سے بڑا لطف آیا۔
 ربیعہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔
 ”شکر ہے تمدن بھائی! آپ کو ہنستے دیکھا، ورنہ آپ بھی ناراض ناراض سے رہتے ہیں، نجانے کیوں۔۔۔“
 سب لوگ غصے میں رہتے ہیں، سوائے ترانہ کے۔ تصور بھائی تو کبھی بھی بات کر بھی لیتے ہیں لیکن تب۔۔۔“
 اسے عجیب سے انداز سے دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ جھینپ کر خاموش ہو گئی۔

”درازا سا یاد پڑتا ہے مجھے۔ میں شاید تین برس کی ہوں گیا چار برس کی۔ تمنا آپنی مجھ سے دو برس بڑی تھیں۔ ہم گھر کے صحن میں بھاگتے پھرتے تھے، دھندلے دھندلے سے خاک کے بننے ہیں ذہن میں اور مٹ جاتے ہیں پھپھو بتاتی تھیں کہ آپنی کو اچانک ہی شدید بخار ہوا۔ اتنا تیز بخار کہ لگتا تھا بدن کسی آگ سے جل رہا ہے۔ دن یہی کیفیت طاری رہی۔ امی ان کی چارپائی کی پٹی سے لگی بیٹھی رہیں۔ انہیں آپنی سے بے حد محبت تھی۔ دن تک نہ آپنی کے منہ میں دانہ گیا، نہ ہی امی نے کچھ کھلایا یا۔ تیسرے دن آپنی نے ترب ترب کر جان دے۔“

ترانہ گلو گہرے الجھ میں پڑی۔
 ربیعہ بھی افسردہ ہو گئی۔ وہ دونوں بڑے سے پرانے برگد کی چھاؤں تلے بیچ پر بیٹھی تھیں۔ یہ پارک گھر کا نزدیک ہی تھا۔ آج ترانہ کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ چل دی کرتے ہوئے یہاں تک چلی آئی تھی۔
 ”اور پھپھو؟“ ربیعہ نے سوگوار ی سے پوچھا۔

”امی، آپنی کی موت کے بعد زیادہ عرصے زندہ نہ رہیں۔ انہیں آپنی کا غم کھا گیا، وہ دکھی رہا کرتی تھیں، اکثر کرتیں، اندر ہی اندر ٹھکتی گئیں۔ امی کی وفات سے تمدن بھائی کے دماغ پر برا اثر پڑا۔ انہیں راتوں میں چلنے عادت ہو گئی۔ آدھی رات کو نیند میں اٹھ کر بچھٹ پر چلے جاتے تھے۔ ایک دن سیڑھیوں سے گر گئے، ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ کئی دن بستر پر پڑے رہے لیکن اباجی۔۔۔“ وہ ایک گہری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔

”اباجی بھی ہمارے بس اپنے نام کے ایک ہیں۔ بیٹا بستر پر دس دن ترپتا رہا لیکن اباجی کو اپنی عیاشیوں پر فرصت نہ ملی۔ پھپھو ہی ترس کھا کر ایک دن کسی جراح کو بلا لائیں۔ اس نے الٹی سیدھی پٹی کر کے اپنی فیس لے چلتا بنا۔ بعد میں ہڈی کسی طور سیدھی نہ ہوئی، ہمیشہ کا نقص رہ گیا۔“

ربیعہ کے ذہن میں منور امین کا چہرہ اور ان کے الفاظ گھوم گئے۔
”آخر کس باب کی مٹی ہو؟ یا سانی مارو گی۔“

وہ اپنے باپ کے متعلق کچھ نہ جانتی تھی لیکن وہ الفاظ اس کی روح میں ترازو تھے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر کی

”ترانہ؟“ وہ کسی سوچ میں گم ہو کر بولی تھی۔

”ہوں، کرو؟“ وہ اپنی سوچ سے نکلی۔

”تم میرے متعلق کیا جانتی ہو؟ میرے امی، ابو کے متعلق؟ دادی نے مجھے کبھی کچھ نہیں بتایا۔“ ترانہ کچھ

سوچتی رہی۔ وہ گھاس کا تنکا چبا۔ نے میں مگن تھی۔

”میں۔۔۔ کچھ زانو تو نہیں جانتی ربیعہ! بس مجھے یہ علم ہے کہ مینا پچھو، تمہارے ابو سے منسوب تھیں۔ احمد

ازیب سے۔۔۔ میرے ماموں سے۔۔۔ پھر ماموں نے اچانک تمہاری امی سے شادی کر لی۔ تمہاری امی۔۔۔“ وہ

کچھ تذبذب کا شکار ہو کر خاموش ہو گئی۔

”۔۔۔ بولونا۔۔۔“ ربیعہ نے اسے پکارا۔

یہی اس کا ذہن دوسری جانب متوجہ ہوا تھا۔ اس کے سامنے والی بیچ پر عباد بیٹھا۔ اپنے کسی دوست کے

ساتھ باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اس کی نگاہیں ربیعہ کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں پھر اس نے چند لمحوں بعد نگاہ

انال بھی اور اپنے دوست کی جانب دیکھنے لگا۔

ربیعہ کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔ اس کے پورے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے

اس نے عرصے کے بعد کسی اپنے کو دیکھا ہو۔ خوشی کی سنسنی لہر کے زیر اثر وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ عباد نے اسے

لہراہوتے ہوئے دیکھا تو بے اختیار ہی وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کھوں میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

”آپ۔۔۔ عباد۔۔۔ آپ یہاں۔۔۔“ ربیعہ کا لہجہ بے قابو ہو گیا۔

”میں۔۔۔“ اس نے ایک مختاط نگاہ بیچھے بیچ پر بیٹھی ترانہ پر ڈالی تھی۔ ”میں روز یہاں آتا ہوں ربیعہ!

انسان۔۔۔ میں آپ سے بات کر سکتا ہوں نا؟ کوئی مسئلہ تو نہیں؟“

”مسئلہ؟“ ربیعہ نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ ”وہ نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ ترانہ ہے۔ میری

ہو بھی زاد بہن۔۔۔ وہ بہت اچھی ہے۔۔۔ آپ کچھ محسوس نہ کریں۔“

”مجھے بے چینی سی تھی۔“ تھینک گاڈ کہ آپ کو خیریت سے دیکھ رہا ہوں۔ نجانے کیوں ربیعہ! میں۔۔۔ میں

اصلی طور پر آپ سے اٹیچ منٹ محسوس کرتا ہوں۔ آپ کچھ اور خیال مت کیجئے گا۔ اس ایک ذرا سے سفر نے ان

ہاں سا تعلق جوڑ دیا ہے ہمارے بیچ۔ میں اتنے دنوں پریشان رہا کہ قدرت نے جو ذمہ داری مجھے سونپی تھی، پتہ نہیں

میں نے اسے ٹھیک سے نبھایا بھی یا نہیں۔ کبھی مجھے وہم ستاتے کہ میں نے ایک چھوٹی سی، معصوم سی، فرشتوں

کی لڑکی کو اکیلے ایک اجنبی گھر میں کیوں جانے دیا۔ کبھی میں۔۔۔ جتنا جا کر آپ کی خیریت دریافت کروں لیکن پھر

ہاں! آتا کہ میرا آپ کا تعلق ہی کیا ہے؟ چند گھنٹوں کا ساتھ بھلا کب اتنا استحقاق بخشا ہے کسی نے کچھ غلط سمجھ

یا نہ آپ کو مشکل ہو جائے گی۔ آپ سے میرے متعلق لئے سیدھے سوال کیے جائیں گے۔ خیر شکر ہے خدا کا۔

آخر خیریت دکھائی دیتی ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

ربیعہ بھی کھل کر مسکرا دی۔ اتنی دیر تک وہ اسے بولتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ اس کے لیے اتنا پریشان تھا، وہ اتنے

دلوں سے بے چین تھا۔ اس کے من پر ٹھنڈی پھوار برس رہی تھی۔ عباد کے چہرے سے روشنی اتر کر اس کی

اکاہوں میں جذب ہو رہی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں بھائی۔“ وہ نجانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر بولی۔ ”اور آپ اگر آتے تو مجھے کوئی مسئلہ نہ

ہوتا۔ میں سب سے کتنی یہ میرا بھائی ہے۔“

عباد نے بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔
 ”میں اتنے دنوں سے یہاں صرف تمہارے لیے آتا ہوں ربیعہ! اس امید پر کہ شاید تم کبھی یہاں آؤ، یہاں سے گزرو تو میں تمہاری خیریت معلوم کر لوں۔“
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ مسکرائی۔
 ”گھر والے کیسے ہیں؟“ وہ قدرے تذبذب کا شکار ہوا۔
 ”ٹھیک ہیں۔“ وہ یہی کہہ پائی۔ ”وہ ترانہ ہے نا، وہ بہت اچھی ہے۔ میرا خیال رکھتی ہے۔“
 ”میرا نمبر ہے نا تمہارے پاس؟“
 ”ہاں، وہ کارڈ میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔“
 ”میں۔۔۔ آسکتا ہوں ملنے؟ تمہارے گھر؟“

ربیعہ نے چند لمحے سوچا۔ اس کے ذہن میں پہلا خیال مینا کا آیا۔
 ”میں ترانہ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ ہم کچھ دن بعد پھر آئیں گے یہاں۔“ عباد مسکرا دیا۔
 ”نا معلوم کیوں ربیعہ! مجھے جیسے الہام ہوا ہو کہ قدرت نے ہمیں یونہی نہیں ملایا۔ میں سوتے سوتے تمہارے خیال سے جاگ اٹھا ہوں۔ جیسے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری سوچی ہو خدا نے مجھے۔ بس اسی احساس کے ذریعہ میں نے گھر آنے کے متعلق پوچھا ہے۔“
 ”مجھے کوئی دہم نہیں ہے عباد بھائی۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ”لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ گھر میرا نہیں ہے۔“
 ”ٹس اوکے! اچھی لڑکی۔ اب چلتا ہوں پھر ملیں گے۔“
 ”انشاء اللہ۔“

وہ مڑ کر اپنے دوست تک گیا پھر دونوں اٹھ کر پارک کی عقبی سمت چل دیے۔ ربیعہ انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔
 ”کون تھا یہ؟“ ترانہ کی آواز میں بھرپور حیرت تھی۔ ”یہاں لاہور میں تم کسی کو کیسے جانتی ہو؟“ ترانہ اس کے پیچھے اٹھڑی ہوئی تھی۔
 ”ہم ٹرین میں ملے تھے، ساتھ ہی لاہور اترے تھے اور تمہارا گھر ڈھونڈنے میں انہوں نے میری مدد کی تھی، رتنہ میں تو شاید دو دن بعد پہنچ پاتی تمہارے گھر۔“ ربیعہ ہنس دی۔
 ”اے۔۔۔“ ترانہ معنی خیزی سے بولی۔ ”دور یہ حضرت یہاں مڑ گشت کیوں کر رہے تھے؟“
 ”میرے لیے۔“ ربیعہ بھرپور اطمینان سے بولی۔ ”میں نے ان کو مختصراً اپنے متعلق بتایا تھا۔“
 ”گھر آنے کی بہت سہولت ہوئی جناب کی؟“ ترانہ کی شوخی معنی رکھتی تھی۔
 ربیعہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے اس کا کان پکڑ لیا۔

”مائی ڈیئر ترانہ لی بی! اپنے یہ بڑے بڑے کان صاف کر کے سنو، اس کا نام عباد ہے اور میں اسے بھائی کہتی ہوں۔ بھائی۔۔۔ سناتم نے؟ عباد بھائی۔“
 ”اور وہ تمہیں ”منٹی“ کہتا ہے، ہے نا؟“ اس نے ناک چڑھائی۔ ربیعہ مسکرا دی۔
 ”چلو گھر چلیں۔“

وہ دونوں گھر کی سمت چل دیں۔ ربیعہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے زوروں کی بارش ہوئی ہو اور جس بالکل ختم ہو گیا۔
 فضا صاف اور اجلی ہو۔

”پتا ہے ترانہ! میرے من کا موسم آج بہت بہت اچھا ہو رہا ہے۔“
 ”اپنے بھائی“ سے ملنے سے پہلے یا ملنے کے بعد؟“ وہ بے نیازی سے پوچھنے لگی۔
 ”ملنے کے بعد۔“ ترانہ ٹھٹھک کر رہی۔

"اے لیے ربیعہ! یہ غضب مت ڈھانا۔ پھپھو اور صولت تمہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے پر مجبور کر دیں گی اور تم بھائی! خدا کی پناہ! ایسے ایسے سوال پوچھیں گے کہ تمہاری روح کانپ اٹھے گی۔ مجھے اس کا انتہائی برا تجربہ ہے۔"

"خوفزدہ ہو گئی۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ میں عباد بھائی کو سختی سے منع کر دوں گی۔"

"اب مرتبہ میں بہت بیمار پڑ گئی۔" ترانہ بتانے لگی۔ "باری میری خیریت پوچھنے گھر چلا آیا، بس سمجھو کہ میں اس نے پھپھو تو اتنے دن تک۔"

"ہاری؟" ربیعہ نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "باری کون؟"

"عبد الباری۔" ترانہ جھینپ کر بولی۔ اس کے گال سرخ ہو گئے تھے۔

"گلستان بول کا مانی؟" ربیعہ نے شرارت سے پوچھا۔

اس نے شرمیلے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ اور دونوں قہقہہ لگا کر ہنس دی تھیں۔

ان دنوں پھر اسے لینے چلی آئی تھی۔ بلکے گلابی رنگ کے لباس میں وہ بے حد حسین نظر آتی تھی۔ بے پروائی سے الٹی مارا سیکرتے ہوئے وہ اپنی اڑتی ہوئی زلفیں بھی سمیٹتی جا رہی تھی۔

موسم خاصا خوبصورت ہو رہا تھا۔ عاشر اسے دیکھے گیا۔

"اے مسٹر! اس نے عاشر کو چھیڑا۔" یہ تم مجھے اتنا گھور کیوں رہے ہو؟ لگتا ہے آج میں بہت خوبصورت لگ رہی ہوں۔"

"پہ تو ہے! وہ خلاف توقع فوراً مان گیا۔" یہ لباس تم پر اچھا لگ رہا ہے اور اس موسم میں تم اچھی لگ رہی ہو۔"

"روٹلی! وہ چمک اٹھی۔ اس کے چہرے پر موسم کے سب رنگ اتر آئے۔"

"عورت عورت ہے! عاشر مسکرایا۔ "کیا پاکستان! کیا ولایت! لڑا! یہ تم عورتیں تعریف سے اتنا خوش کیوں ہو جاتی ہو؟"

وہ ہندو لمحے شرارت سے مسکراتی رہی پھر بولی۔

"جیسے تم مرد محبت کا اظہار سن کر مغرور ہو جاتے ہو! بس یہی بات ہے۔ اصل میں عاشر تعریف کرنے کا جذبہ ہمارے مرد کے دل میں رکھا اور تعریف کروانے کا جذبہ عورت کے دل میں۔ تم مرد اپنی ڈیوٹی بھول گئے تو عورتیں

اس میں ہونگیں۔ اب کبھی کبھار جب تم جیسے مغرور مرد کو اپنی ڈیوٹی یاد آجائے تو ہم عورتیں تو خوش ہوں گی نا!"

"اے! تو محترمہ کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے فلابے ملانا ہم مردوں کی ذمہ داری ہے۔ واہ ویل ہا!"

"تمہاں یانہ مانو! اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔"

"اور عورتوں کی ڈیوٹی؟ اس کے متعلق کچھ ارشاد فرمائیے؟"

"ایک نہیں بہت سی ہیں۔ مرد سے محبت کرنا، اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دینا، مرد کے بچے پیدا کرنا۔ انہیں انا عورت کی ذمہ داری ہے نا!"

"تم تو خالص مغربی عورت ہو لڑا! عاشر نے اسے کن انگلیوں سے اسے دیکھا۔ "تمہارا باپ انگریز تھا اور ماں امریکن؟"

"ہاں تو پھر؟" اس نے قدرے حیرت سے عاشر کو دیکھا۔

"قبائلات تو ہمارے ہاں سے درآمد کیے ہوئے لگتے ہیں! اس نے شرارت سے نچلاب دیا۔"

”نے قدرے برا مانتے ہوئے اسے کھوڑا۔

”یہ تم مشرقی لوگ خود کو پتا نہیں کیا سمجھتے ہو! جیسے دنیا کی ہر اچھائی تم ہی سے وابستہ ہے۔ وفا اور محبت کے سارے جذبوں پر تمہاری حکمرانی ہے میں مانتی ہوں کہ ہمارے ہاں شخصی آزادی کی وجہ سے عورتوں میں مردوں کی برابری کا جذبہ پایا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مغرب کی عورت گھر بیٹا نہیں جانتی کستا نہیں جانتی بچے نہیں پالتی کیا نہیں کرتی مغرب کی عورت؟ تمہاری عورتیں تو جنت میں رہتی ہیں اپنے گھروں میں ملکاوں کی طرح حکومت کرتی ہیں۔ کام ملازماؤں کے سپرد ہوتے ہیں اور گھر چلانے کی ذمہ داری مریڈی ہوتی ہے۔ ہم تو گھر میں بھی کام کرتے ہیں اور گھر سے باہر ملک چلانے میں بھی مرد کے شانہ بشانہ ہوتے ہیں۔ بھی تو ترقی یافتہ ممالک کے عوام کھلانے کا تلف اٹھاتے ہیں۔“

”ڈش اٹ۔۔۔ ڈش اٹ!“ عاشر نے تالیاں بجائیں ”بھئی لا جواب کر دیا تم نے تو ایسے! ایک بات پوچھوں لڑا؟ تم اکیلی کیوں ہو؟ میرا مطلب ہے تمہارے والدین بہن بھائی؟“

”نہیں بتاؤ چلی ہوں نہیں۔ ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ ہم تین بہن بھائی تھے دو بہنیں ایک بھائی بھائی بچی ازم سے متاثر ہو کر ساری دنیا میں مارا مارا پھرتا ہے اور میری بہن یو کے میں ہی سیٹل ہو گئی۔ مجھے کہنی لے یہاں بھیج دیا اور یہاں تم سے ملاقات ہو گئی۔ یہی اسٹرائیکنگ موڑ ہے زندگی کا۔ اس سے آگے اب کچھ دیکھنے کی تمنا اگر ہے تو وہ ہے تمہارا ملک تمہاری بیوی۔“

”سنو عاشر! مجھ سے شادی کر لو!“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میں بہت زیادہ سیریس ہوں تمہارے لیے۔“

”لڑا! میری بیوی مجھ سے بے پناہ عشق کرتی ہے۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گیا۔ ”میری زندگی مکمل ہے اس میں کسی رنگ کی کمی نہیں ہے۔ تم اپنے آپ کو سمجھاؤ خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگے یہی ہمارے لیے بہتر ہے۔ بسہ سوں کے لیے بہتر ہے۔ ہم اچھے دوست ہیں“ اور جب تک میں یہاں ہوں رہیں گے۔ بس! اس سے زیادہ میں افورڈ نہیں کر سکتا۔“

وہ کچھ دیر بالکل خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد عاشر کا گھر آگیا۔ لڑا نے پارکنگ ایریا میں گاڑی روکی

”سنو عاشر! اچانک وہ بولی۔ ”تم نے کہا تمہاری بیوی تم سے بے پناہ عشق کرتی ہے۔ میں غصہ کر رہی کہ تم کہو گے میں بھی اس سے بے پناہ عشق کرتا ہوں۔ میری زندگی میں تمہاری محبت کے لیے جگہ نہیں ہے لیکن تم نے ایسا نہیں کہا۔ جانتے ہو کیوں؟ مرد کی محبت بے در کا گنبد نہیں ہوتی۔ اس میں ہمیشہ چور دروازہ ہوتا ہے۔ اگر تم مجھے اس دروازے سے بلاؤ گے میں تب بھی آجاؤں گی! میری بات بے غور کرنا!“

وہ گاڑی ریورس کر کے تیزی سے لے گئی۔ اور عاشر اس کے الفاظ پر غور کرتا رہ گیا تھا۔



کر دینیں بدلتے بدلتے رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اسے کسی طور آرام نہ آتا تھا! انجانے من کو کیا ہے کلی تھی۔

وہ بستر سے اتر کر دروازے تک چلی آئی۔ باہر لاؤنج میں اندھیرا ہو رہا تھا۔ اوپری کمروں کی بتیاں بھی گل ہو چکی تھیں۔ ابھی کچھ دیر قبل علی اور حمزہ کے کمرے کی لائٹ روشن تھی۔ لیکن اب وہ بھی بجھ چکی تھی۔ سب بتیاں گل ہو گئیں تو عریشہ کے من میں ایک چراغ کی روشنی ہوئی۔ اندھیرا پھیلنا تو اس نے جانا کہ دل کو آج گل ہوئی ہے۔ کسی نے دل گل میں اس کا دل ہتھیالیا تھا۔

جھوٹی سی تھی تو فروس بیگم دن رات رافع کے قصیدے پڑھا کرتی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے اس کی خوبیوں کا ذکر کرتیں۔ اس کا لانا بند انہیں بھاتا تھا اس کی خوبصورتی کی وہ مزاج تھیں۔ اس کے ادب و آداب سے وہ بے حد خوش رہتیں۔ عریشہ کا ذہن ماں کا مقصد سمجھ گیا تھا۔ اسے بھی رافع اچھا لگنے لگا۔ محبت و محبت کی اسے سمجھ تھی نہ بچان۔ بس اتنا علم تھا کہ وہ اچھا لگتا تھا۔ یہ پتا تھا کہ ماں ایسا چاہتی ہے پھر فروس بیگم کے تیور اچانک ہی بگڑ گئے۔

الح نے اس کے لیے انکار کر دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ وہ تو اس کے لیے ثانیہ اور سدرن جیسی ہے۔ اس نے ہمیشہ اسے پہلی بہن کی طرح سمجھا ہے۔ عریشہ کے معصوم سے دل کو رنج سا ہوا تھا۔ آگینے کو ٹھیس لگی تھی۔ لیکن وہ بے دالی اور بے نیازی کی عمر تھی چند دنوں میں وہ سب کچھ بھول بھال گئی۔ ماں نے کدورت کو بڑی حفاظت سے دل لے لہاں خانوں میں سینت سینت کر رکھ لیا تھا لیکن سکیموں اور ہم جویوں سے مل کر اونچے اونچے قہقہے لگاتی رہی۔ کو یہ بات یاد بھی نہ آئی تھی۔

لیکن اچانک ہی جیسے کوئی گم گشتہ جذبہ یاد آیا تھا۔ دل کو پھر آج لگی تھی۔ وجود میں گلابی کنول تیرنے لگے تھے۔ اس کی شوش چمکتی آواز نے دل میں نقب لگائی تھی۔

"چند دنوں کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ واپس آ کر یاد کروں گا آپ کو۔" اس نے کہا تھا۔ عریشہ کو اندازہ نہ تھا کہ چند دن گزارنے کے کس قدر مشکل ہو جائیں گے۔ اس کا جی بھلتا ہی نہیں تھا اور آج پورا ہفتہ ہو گیا تھا اسے۔

عریشہ ہار گئی تھی۔ اس نے کبھی اسے فون نہ کیا تھا۔ ہمیشہ بے نیازی کی چادر اوڑھ کر بات کی تھی۔ جیسے چند لفظ (ا) کر احسان کیا ہو۔

آج جی کہتا تھا وہ اس کا احسان مانے اگر اس کی آواز سن پائے تو۔ کتنی اچھی باتیں کرتا تھا وہ 'شگفتہ شگفتہ' گھری گھری گفتگو من کر من ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ عریشہ کا دل شدت سے اس کی باتوں کو یاد کرنے لگا۔

اس نے بالآخر لاؤنچ میں آکر اس کا نمبر ڈائل کیا۔ موبائل آف تھا۔ اس نے مایوس ہو کر فون رکھ دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کیسی بے بسی تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر نمبر ڈائل کیا۔ مگر نتیجہ وہی تھا۔ اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"گھر۔ گھر۔" ہنسی کی گئی تیل بجی تھی۔

وہ یوں اچھلی جیسے سانپ دیکھ لیا ہو۔ سنائے میں نیل کی اتنی مدھم آواز بھی کافی تیز لگتی تھی۔ اس نے فون اٹھایا۔

"ہیلو۔۔۔ وہ مدھم سروں میں بولی۔

"آداب!" دوسری جانب سے سرگوشی آئی۔

عریشہ کا دل سات سروں میں گنگناٹے لگا۔ رواں رواں منک اٹھا۔

"آپ! آپ! آگئے! آگئے! اس کی ساری خوشی چند لفظوں میں سمٹ آئی۔

"آپ کو اچھا لگا؟" نہایت شوق سے پوچھا گیا۔

عریشہ خاموش ہو گئی۔ لبوں پر شرم کی مہر آ گئی تھی۔ اس سنائے میں زندگی سے بھرپور وہ آواز کتنی بھلی معلوم رہی تھی۔ اس کا جی چاہا آنکھیں بند کر لے اور وہ ٹکھڑا ٹکھڑا الجھ یونہی کانوں میں گونجا کرے۔ رات ایسے ہی بیت گئے۔

"عریشہ! آپ سن رہی ہیں نا!" اس کی مسلسل خاموشی سے گھبرا کر وہ بولا۔

"جی۔ سن رہی ہوں۔۔۔ آپ بولتے رہیں۔" اس کے من نے شرارت کی۔

"کیوں جی؟ یہ فون ہے یا ریڈیو؟" وہ بگڑا۔

وہ ہنس پڑی تھی۔ ایسی شفاف ہنسی کہ خود اسے اپنے آپ پر تعجب ہوا۔

"آج آپ بولیں گی اور میں سنوں گا۔" وہ جیسے اطمینان سے پیر پھیلا کر بیٹھا تھا۔ "یوں بھی میں تھا کہ ہوا ہوں۔

ہانتی ہیں آپ ٹرین پورے چھ گھنٹے لیٹ تھی اور میں نے گھر پہنچتے ہی آپ کو فون کیا ہے۔"

"آپ کا موبائل کیوں آف تھا؟" وہ شکایتاً بولی۔

"آف نہیں تھا۔ چارج نہیں کیا تھا میں نے۔" وہ مسکرایا۔ "لیکن اتنا علم ہو گیا کہ آپ نے بھی ایک کال ضائع

رہنے کے متعلق سوچ ہی لیا۔ ورنہ تو بہت کجوس ہیں آپ، پیسوں کی بھی اور لفظوں کی بھی۔"

”ٹیکسی کا بل تو اکثر بچا جاتی ہیں۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”عزیزہ بس دی۔“
 ”اور لفظوں میں تو اتنی ڈنڈی مارتی ہیں کہ بس۔“
 ”باتیں بہت بناتے ہیں آپ۔“
 ”سنی جائے۔“ وہ ہنسا۔
 عزیزہ نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ نکھر نکھر الجھ کانوں میں گونجتا رہا۔



”تم اگر فارغ ہو تو رات کے لیے چاول بنا لو۔“ مینا نے کمرے میں جھانکا تھا۔
 ربیعہ نے ابھی ابھی پیچھا کا کمرہ صاف کیا تھا۔ اس سے پیشتر وہ مشین لگا کر سب کے کپڑے دھو رہی تھی۔ صبح سے اسے کمر سیدھی کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ مغرب کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ فارغ ہو کر کچھ دیر لیٹنے کے ارادے سے کمرے میں آئی ہی تھی جب اسے نیا حکم ملا۔
 ”جی اچھا۔“ وہ اتنا ہی کہہ پائی۔
 وہ حسب معمول کچھ دیر اس کا چہرہ نگاہوں سے ٹٹوتی رہیں کہ کہیں کوئی زاویہ بگڑا ہوا ملے یا ایک آدھ ٹکٹن کا سراغ پاتھ آئے لیکن پھر یاس ہو کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں۔
 ربیعہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ مینا نے آہستہ آہستہ تقریباً ”بھی کام اس کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیے تھے۔ صبح بستر سے اٹھتی تو پھر اسے رات گئے کہیں جا کر کمر سیدھی کرنا نصیب ہوتا۔ پھوپھا کے کام کا دائرہ اب پھیل کر نہایت طویل ہو گیا تھا اب اس دائرے میں گھر کے بھی افراد کے کام آگئے تھے۔
 وہ کچن میں چلی آئی۔ چاولوں والے ڈبے سے چاول نکال کر صاف کرنے لگی۔ چاول نہایت سستے قسم کے تھے۔ ان میں بے حد نلکر پتھر تھے۔

ربیعہ کچن کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی۔ اسی وقت مینا بھی کچن میں چلی آئیں۔
 ”تم اور ترانہ کل کہاں گئے تھے؟“ انہوں نے جھوٹے برتن سنک میں جمع کرتے ہوئے سرسری سا پوچھا۔
 ”جی۔۔۔؟“ ربیعہ چونکی۔ ”کل؟“

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تو اسے کچھ یاد نہ آیا۔ وہ لوگ بھلا کہاں آتی جاتی تھیں۔
 ”اب کوئی بہانا سوچ رہی ہو شاید۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”کل تم دونوں پارک گئی تھیں نا؟“
 ”پارک؟ جی ہاں پارک تو گئے تھے۔ یونی ذرا اسی چمپل قدمی کرنے کے لیے۔“
 ”نہوں۔“ وہ کچھ دیر کورکس۔ پھر بولیں۔ ”کون ملا تھا وہاں؟“

ربیعہ کو سانپ سوکھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ انہیں کیا جواب دے۔ اسے ترانہ کی تنبیہ یاد آگئی تھی۔
 ”باری ملا تھا نا؟“ انہوں نے رازداری سے پوچھا۔

ربیعہ خاموش رہی۔ وہ اپنی بلاؤں سے بے سرواڑے کی روادار نہ تھی۔
 ”ترانہ سے ملے آیا تھا؟ ترانہ نے بلایا تھا اسے یا خود آگیا تھا۔ دیکھو لڑکی مجھ سے تیزی طراری مت کرنا۔ میں دھڑکتی ہوں موقع پر پھر نہیں کانیں چھوڑتی میں سچ کچھ کہوں؟“
 ”وہاں تو کوئی بھی نہیں آیا پھپھو!“ ربیعہ نے اچانک ہی بے حد اطمینان سے کہا اور سر جھکا کر چاول صاف کرنے لگی۔

وہ چیخ کر رہ گئی تھیں۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔ وہاں ایک لڑکے نے تم لوگوں سے باتیں کی ہیں۔ مجھے بتایا ہے کسی نے۔“
 ”جی ہاں۔“ اس نے سر اٹھایا۔ ”ایک لڑکا ہم سے کسی کا پتا پوچھ رہا تھا۔ ترانہ سے نہیں مجھ سے۔ میں نے

اس سے کہا کہ میں یہاں کسی کو نہیں جانتی۔ یہ باری کون ہے؟
 ”باری؟ اور تم نے پھر مجھے پچھو کہا۔“ وہ چڑ گئیں۔ ”میں منع کرتی ہوں اور تم بولے جاتی ہو بولے جاتی ہو تم
 اس قدر ڈھیٹ لڑکی ہو۔“

”لیکن پچھو! اس میں حرج کیا ہے؟ وہ سکون سے پوچھنے لگی۔ ”کتنا اچھا رشتہ ہے۔“
 ”کہو مت۔“ وہ اسے جھڑک کر بچن سے باہر نکل گئیں۔

باہر محن سے ان کے بڑھانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ الگٹی پر سے سوکھے ہوئے کپڑے جھلاتے ہوئے اتار رہی
 ہیں۔ ربیعہ نے اپنی مسکراہٹ دہائی۔



”وڑتے وڑتے وہ پھر رک گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔“

رافع نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے ہوئے وہ سفید عمارت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔
 رافع اس تک چلا آیا۔

”اوسے۔ میاں رانجھے۔“ اس نے ہاشم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
 وہ چونک اٹھا۔

”مہال۔۔۔ جب اپنی بارات لاؤ تب رکنا یہاں۔ ابھی میرا خیال ہے، ہم جاگنگ کرنے نکلے ہیں۔“
 ہاشم نے اسے ایک چپت سے اسے نوازا۔

”تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے صاحبزادے۔“
 دونوں پھر وڑنے لگے۔

”معاملہ کہاں تک پہنچا؟“ رافع نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔ ”تم آج کل بہت خوش نظر آتے ہو؟“
 ہاشم نے اس کی بات کا ثبوت فوری طور پر مہیا کیا۔ وہ مسکرائے لگا۔

”اس نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا ہے۔“ وہ جھک کر پیروں کو چھونے لگا۔

”ٹھیک ہے۔“ رافع نے بھی اس کی تقلید کی۔ ”اب تمہارا بوتا تھا ایسا تو ہے نہیں کہ ایک خوبصورت، باوقار
 لڑکا فوری طور پر ”ہاں“ کہہ دے۔ اسے یقیناً کافی سوچنا ہوگا۔“

”ہا ہا۔۔۔“ اس نے ہاشم کو چڑاتے ہوئے توجہ نہ لگایا۔ ”ہا ہا۔۔۔ شاعر نے کہا ہے۔“

سوچو گے جب میرے بارے میں تمناؤں میں
 گھر جاؤ گے اور بھی میری پرچھائیوں میں

تو رافع! اس نے میرے اعتراف کا اظہار کا لفظ لفظ سنا۔ پھر اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے انکار نہیں
 کیا اور ہم نہیں ہوئی اسے برا نہیں لگا۔ یہ خوشی کیا کم ہے میرے لیے؟

ابھی مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ دونوں بیچ پر جا بیٹھے۔

رافع! تو اظہار کی طمانیت اور خوشی سے ناواقف ہے! کاش تو واقف ہوتا! میرے اندر جو خوشی ابھرتی ہے میں
 بہتر کرنا چاہتا ہوں لیکن کر نہیں سکتا۔“

اس نے آسف سے سر ہلایا۔

”اہں نہیں کر سکتے؟“

”اس لیے کہ تجھے تجربہ نہیں ہے۔ جب تو نے کسی کو چاہا ہی نہیں تو تجھے اظہار کی خواہش اور اس خواہش کی
 پاداش کے کرب کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ یا رافع! تو چاہتا کیوں نہیں کسی کو؟“ رافع دور سفید سے نیلے

آسمان کو دیکھنے لگا پھر بیچ سے سر نکا کر اس نے آنکھیں موند لیں۔

”لو مجھے پڑانا چاہتا ہے پورے خاندان سے۔“ پھر مسکرایا۔

”میں۔۔۔ خیر! کیا تو نہیں چاہتا مگر تو میرا رہے نا۔ تجھ سے اپنے تجربات شیئر کرنا چاہتا ہوں، مگر پھر ایک مثال

”میں میں ابھرتی ہے۔“

”کیا؟“ رافع نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

”بندر کیا پانے اور ک کا مزہ۔“ وہ مزے سے بولا۔

خلاف توقع وہ ہنس دیا۔

”چل ٹھیک ہے میرے یار! ہم بندر ہی سہی! ایسی اور ک کے مزے کیا لینا جو منہ کاٹ کر رکھ دے۔ ہائی

دے تیا ابو سے بات کرنی ہے تمہے؟“

ہاشم نے اسے گھورا۔

”تم ضرور میرے حسین خیالوں کا مزہ کر کر کرو۔“

”پہلے یہ بل صراطِ تیار کرو پھر پسند دیکھا!“ رافع نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ابھی ایک معرکہ سر کرنا

تھیں۔“

”مجھے صرف اس کی پروا تھی یا ر! وہ ماں جائے تو کوئی مشکل، مشکل نہیں اور رہے یہ چھوٹے موٹے معرکے تو

کیا کہا ہے کہ شاعر نے

”معرکہ گرم تو ہو لینے دو خرنیزی کا“

پہلے تلوار کے نیچے ہم ہی جا بیٹھیں گے!

رافع ہاشم کی آنکھوں میں کچھ دیر دیکھا رہا پھر خرنیزی سے مسکرایا۔

”یار! مجھے سچ کون؟“

”ہوں۔“ ہاشم نے اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ”خیریت؟“

”کبھی کبھی مجھے بھی اتنی بہت رشک آتا ہے۔“

”تمہ سے؟“ ہاشم کھلکھلایا۔ ”بڑوںوں نقشہ لگا کر ہنس دیے۔“

موتوب سے انداز میں کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ہولے سے کھٹکھٹا کر گلا صاف کرتے ہوئے اس کا

مت جمع کی۔

”ابو جی۔ آپ نے بلایا تھا؟“

فاروق حسن نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھا اور کتاب بند کر دی۔

”آئیے! امیاں صا جزاؤ! بیٹھے کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”گھر ہی میں ہوتا ہوں ابو جی۔“ وہ ان کے مقابل جا بیٹھا۔

”ماں تو آپ کی آپ کے ذکر پر بڑبڑانے لگتی ہیں۔“ انہوں نے غور سے ہاشم کا چہرہ دیکھا۔ ”بیٹوں کے ہاں

بیٹوں کے متعلق اندازہ ان کی ماؤں کے انداز سے لگاتے ہیں ہاشم! آج کل آپ کی اماں آپ سے خوش نہیں

ہیں۔ کیوں؟ وضاحت کریں گے آپ؟“

ہاشم نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

”میں۔۔۔ میں کیا وضاحت کروں ابو جی؟ امی نے مجھ سے تو کبھی ذکر نہیں کیا اپنی ناراضی کا ہاں! اگر آپ ناراض

کی وجہ بھی بتائیں تو میں ضرور وضاحت کر سکوں گا۔“

”آپ کے سر پر سہا سجانے کی خواہش مند ہیں وہ اور آپ انکاری“ وہ بہت توجہ سے بیٹے کا چہرہ دیکھ رہے تھے

”میں ہرگز انکاری نہیں ہوں ابو جی! میں تو خود شادی کا خواہش مند ہوں۔“

”اچھا ثانیہ سے شادی کرویں تمہاری؟“

”جی۔۔۔“ حملہ اچانک ہوا تھا! وہ گڑبڑا گیا۔ ”نہیں ابو جی! میں ثانیہ سے ہرگز شادی نہیں کر سکتا۔ میرے

”اکیس ہے وہ۔“
”اکیس؟“

”میں ابوجی۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”ابو عریشہ جیسی لگتی ہوگی۔“ اچھا۔“ انہوں نے چشمہ اتارا۔ ”ڈاکٹر شہلا کے علاوہ کوئی ایک نام بتا دو مجھے“

”ابو ہلین۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”میرے جذبات کا مذاق مت اڑائیں۔ میں سنجیدہ ہوں۔ آپ نے سچ کہا میں ڈاکٹر شہلا کے علاوہ کوئی نام نہیں لے سکتا۔“

”تم پہلہ کر چکے ہو؟“ انہوں نے لب بھینچ لیے۔

”ی۔“ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

دھند لکھوں کے لیے خاموش ہو گئے۔ ہاشم کو اپنے چہرے پر ان کی نظریں بخوبی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ حتیٰ کہ ہاتھ پاٹ چہرہ لیے بیٹھا رہا۔

”اب لڑکی کا ماضی ٹھیک نہیں ہے ہاشم! دفعہاً وہ تھکے تھکے لمبے میں بولے

”ماضی؟“ ہاشم نے حیرت سے ان کی بات کاٹی۔ ”کیا ہوا ہے اس کے ماضی کو ابوجی! اس نے شادی کی، چلیں

ابا۔ پسند سے کی، ٹھیک ہے اسے طلاق ہو گئی اور اس کے پاس اس کی پہلی شادی کی نشانی بھی موجود ہے، لیکن اب باتوں سے لیں یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس کا ماضی درست نہیں تھا۔ خدا نخواستہ وہ کوئی کرپٹ لڑکی تھی۔

”لے طلسم کی۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اسے قدرت کی جانب سے غلطی کی سزا مل گئی۔ اب وہ آئینے کے مانند

ہوتا۔“ ہندو کر دوار رکھتی ہے گزرے ہوئے پانچ سال اس بات کا ثبوت ہیں۔ بابا! ایک مطلقہ بچے کی ماں سے

بہتر اگر کوئی بری بات ہوتی تو ہمارے پیغمبر کی زندگی میں اس کا نشان نہ ملتا۔ ہم تو ان کی خاک پا بھی نہیں پھر ہم

کس ایسا ممکن رہیں؟“ ہندو کسی مسلمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اس چیز کو غلط سمجھے برا کہے۔“

”لامرغ حسن کی نظروں میں ابجھن در آئی۔ چشمے کی کمائی منہ میں دبائے وہ اسے دیکھتے رہے۔

”تمہاری ماں کو کون سمجھائے گا؟ وہ اس لڑکی کا نام سننا پسند نہیں کرتی۔“

”میں۔“ اس ”جانب سے کوئی مثبت جواب آجائے بابا!“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”میں سے پھر بات کر لیں گے۔“

”اباں کھلا چکے ہو؟“ انہوں نے اسے گھورا۔

”ہاں بڑا گیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔

”چھو کو بھیجا تھا تو نہی ذرا رائے معلوم کرنے کے لیے۔ کوئی رشتہ تو نہیں بھجوا یا بابا میں نے۔“

”تم رشتہ بھی بھجوا دو تو ہم کیا کر لیں گے بر خوردار۔“ انہوں نے چشمہ پھر لگا لیا۔ ”بہر حال اپنی والدہ صاحبہ کو

اپ کا کام ہے مجھ سے یہ درد سری نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ۔۔۔“

دھند لکھے رک کر بولے۔

”ابا بیٹا اپنی ماں کو سوئپ کر آئے گی۔ ہمارے گھر میں ہماری نسل پروان چڑھے گی۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سے کوئی

لامرغ ہند لکھے چپ رہا پھر انہیں کتاب کی جانب متوجہ پا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ ایک بہت بڑا مرحلہ بے حد

اگر سے طے ہو گیا تھا۔

پہلے پر خوشیوں کا فائوس روشن کیے وہ اپنے کمرے کی جانب برہم رہا تھا۔

”م گرم چادر اپنے گرد لپیٹے، وہ بانو قدسیہ کی ”پروا“ میں کھوئی ہوئی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر بھاپ اڑاتی کافی کا مک

دھا ہوا تھا۔ وہ بے حد پرسکون ماحول کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ یکایک اس ماحول میں ارتعاش پیدا ہوا۔ جھنجھالی ہوئی

”اے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ تباہ ہوا تھا۔

”اما۔ نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کئی ایسا ہوا؟“

”فون ہے۔“ وہ سخت بگڑی ہوئی تھی۔

”کس کا؟ ہاسپٹل سے ہے؟“ اس نے چادر ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

”پاکل خانے سے ہے۔ فینٹل ہاسپٹل سے۔ داغی مریض آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔“ وہ بھری ہوئی لگ رہی تھی۔

”کیا مطلب؟“ وہ گم صم سی ہوئی۔ ”ابراہیم کا فون ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔“

”کیا کہتا ہے؟“ اس کا دل اندیشوں کا شکار ہوا۔

”تھرکولینے آ رہا ہے۔ کہتا ہے تیار کر دیں۔“

شہلا چند لمحوں کے لیے ساکت ہوئی پھر وہ بھر کر اٹھی۔ تن فون کرتی وہ فون تک پہنچی۔
”کیا چاہتے ہو تم؟“ وہ فون اٹھا کر دھاڑی۔ ”کیا چاہتے ہو ابراہیم جیلانی؟ مجھ سے میرا بچہ چھین لینا چاہتے ہو اپنے سات جنموں کے بدلے چکانا چاہتے ہو؟ تڑپا تڑپا کر میری بے بسی کا تماشا دیکھ کر جان لینا چاہتے ہو میرا ٹھیک ہے میں بھی دیکھتی ہوں تم کہاں تک جاسکتے ہو لے جاؤ اسے لے جاؤ۔ تمہارا بیٹا ہے نا وہ میری پہلی ہستی پر تمہاری نوازش کے لمحوں کا ثبوت۔ ٹھیک ہے لے جاؤ اسے۔ میں سک سک کر جان دے دلا لیکن تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گی۔ رورو کر اندھی ہو جاؤں گی، لیکن تمہاری چوکھٹ کو سجدہ نہیں کا گی۔“ وہ دم بخود اس کو سن رہا تھا۔

”شہلا!“ اس کے خاموش ہونے پر وہ آہستگی سے بولا۔ ”آئی ایم سوری، میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں تھا یقین جانو میں ایسا کچھ نہیں چاہتا جیسا تم سوچ رہی ہو۔ بخدا میں تو صرف عمر کی محبت سے مجبور ہو کر چند کھٹے کے ساتھ گزار کر سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تم اس طرح سے سوچو گی مجھے اندازہ نہ تھا۔ بھلا میں تم سے بات کا بدلہ لوں گا؟“

وہ چپ ہو کر گہرے گہرے سانس بھر رہی تھی۔

”کہاں تھے تم؟“ پھر وہ بولی۔ ”تسٹے سالوں سے کہاں تھے؟ وہ پیدا ہوا؟“ اس نے گھٹنوں چلنا سیکھا، کھڑے ہر قدم اٹھانا سیکھا، ماں کہنا سیکھا، اپنے گمشدہ باپ کے بارے میں سوچنا سیکھا، اتنا عرصہ تم کہاں تھے ابراہیم! اب تمہیں اس کی یاد آئی جب اس کا معصوم ذہن ہر طرح کے گیان کر سکتا ہے، ہزار ہا سوال سوچ سکتا ہے۔ اب اس کے سوالوں کا منجھ جواب بن کر آئے ہو؟ یہ محبت پہلے کہاں تھی؟“

اس نے گہری سانس بھر لی تھی۔

”شہلا! پچھلے سال بابا سا میں چل بے اور چند ماہ قبل اماں بھی رخصت ہوئیں۔ بابا نے مجھے قسم دی تھی سے کوئی رابطہ نہ رکھنے کی، وہ تمہاری اولاد کو اپنی جائیداد میں سے کوئی حصہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے چہلے میں مجبور تھا۔ لیکن اب میں مجبور نہیں ہوں۔ میں اس سے مل سکتا ہوں اسے سار کر سکتا ہوں۔ اسے اس کا حق دے سکتا ہوں۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں میں باقی زندگی بھی دل پر پتھر رکھ کر گزارا کروں۔ تم خوش رہو۔“

شہلا کا گلہ اُتر گیا۔

”بہت پروا ہے تمہیں میری خوشی کی؟“

”ہاں ہے۔“ وہ بولا۔ ”تم یقین کرو یا نہ کرو۔ جس بیٹے کو میں نے بھی دیکھا، چھوٹا تھا۔ اس کی محبت لے اتنا عرصہ کیوں پریشان رکھا۔ اس بات کا جواب میں اکثر خود سے پوچھتا ہوں۔ تم بھی خود سے پوچھنا دیکھو کیا ہوا ملتا ہے۔“

شہلا سے کچھ بولا نہ جا سکا۔

”میں نہیں فون رکھتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تیار کر رہی ہوں اسے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”لے جاؤ۔“

اس نے گہری سانس بھری۔

”اب تک کسی ہی ہو۔“

شہلا نے ریسور رکھ دیا۔ دبل میں بے تحاشا درد محسوس ہوتا تھا۔ آنکھوں میں بے حد وحساب جلن تھی۔ وہ ابر کھڑی اپنی سسکیوں کا گلا کھونچتی رہی۔

”السلام علیکم۔“

یاشعار کو آواز پر شفیقہ حیات اور عذرا بیگم دونوں نے سراٹھا کر دیکھا۔

فردوس بیگم اپنا بھاری بھر کم وجود سنبھالنے چلی آ رہی تھیں۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔“ شفیقہ حیات مسکرائیں۔ ”کو، اچھی ہو۔“

”شکر ہے۔“ وہ بیٹھ گئیں۔ ”بس یہ جوڑ بے کار ہوئے جاتے ہیں۔ چلنے پھرنے کے نہ رہے ہم۔ آپ تو ایل

رو نہیں بس پھوٹی ہوئی ہو کر رہ گئی ہیں۔ ہم صورت کو ترستے ہیں ایک ہی گھر میں رہ کر۔“

”ارے بی! اب اس عمر میں کیا روٹھنا، ماننا اپنے دن پورے کر رہے ہیں۔ یہاں دن کٹے کہ وہاں کٹے بس چ

ہلاؤ کا وقت ہے۔ تم اپنی سزاؤں فاروق حسن کیسے ہیں؟ دو دو تین تین دن ماں کو پوچھنے نہیں آتے؟ بیٹے سے ا

میرے پوتے ہیں۔ دن میں دس چکر لگا لیتے ہیں۔“

”آپ ہی کے بیٹے ہیں وہ میری تو ایک نہیں سنتے۔“ وہ ہنسی سے بولیں۔ ”ابھی بھی میں علی کا ہاتھ کرنے

تھی۔ ٹیلیفون کے بل کی آخری تاریخ ہے وہ لگ جائے گی کیا کہتے ہیں جرمانہ سو روپیہ اوپر بھرتا پڑے گا۔ ابھی تو

بھرتے ہیں تو فکر نہیں انہیں اپنی جیب سے بھرے گا تو میا یاد آئے گی۔ اے ہاں۔“

وہ اپنا باؤں دبا بنے لگیں۔

”رائع، نافع بھی نظر نہیں آ رہے؟“ انہوں نے گردن گھمائی۔

”دونوں یونیورسٹی مکے ہیں۔“ عذرا بیگم نے جواب دیا۔ ”علی اور حمزہ کی کلاسیں شروع نہیں ہوئیں؟“

”ایا خبر مجھے؟ یونیورسٹی کالج بھی ان کے باوا کی جاگیر ہوئے۔ جب جی ہوا منہ اٹھا کر چل دیتے ہیں ورنہ

تھے تیل کی طرح پھرتے ہیں۔“

”اچھا چلو آئی گئی ہو تو ایک صلاح دو۔“ شفیقہ حیات اچانک ہی بول پڑیں۔

پھر انہوں نے نظروں ہی نظروں میں عذرا بیگم سے اجازت چاہی۔ وہ مسکرا کر رہ گئیں۔

”کیسے اماں؟“ فردوس بیگم چونکی سی ہو گئیں۔

”ہم نافع کے لیے آنا چاہتے تھے تمہاری طرف۔ آئیں نہ آئیں؟“

”نافع کے لیے؟ یعنی۔“ وہ سمجھ کر بھی نا سمجھ بن گئیں۔

جی ہی میں حساب کتاب کرنے لگیں۔

”ارے بھی۔ عریشہ کا ہاتھ مانگتی ہیں عذرا بیگم تم سے اپنے نافع کے لیے۔“ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

”کو، تم راضی ہو؟“

اندر آتی ہوئی ناعمد کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ کان کھڑے کر کے سننے لگی۔ فردوس بیگم تذبذب کا ش

تھیں۔

”اب اماں! ایسے چلتے پھرتے کیا جواب دوں۔ آپ کے بیٹے کی رائے لینا بھی ضروری ہے۔ پھر ہی کچھ کہہ پا

کی ویسے مجھے تو نافع بھی پسند ہے۔ اپنا گھر کا بچہ ہے۔ نظروں کے سامنے ہی پلا بڑھا ہے۔ لیکن پھر بھی۔“

”ہاں ہاں فردوس! تم تسلی سے سوچو۔“ شفیقہ حیات نے انہیں مطمئن کیا۔ ”ہم تو یونہی ذرا ذکر کر رہے تھے تم سے۔ تم سوچ سمجھ لو۔“
 ناعنعم! پلٹ کر بھاگی۔ ایک اچھی خبر اس کے ہاتھ لگی تھی۔

”فٹا سٹک نیوز۔“ وہ چھلانگ لگا کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
 چائے پیتی ہوئی رابعہ بیگم اور کڑھائی کرتی ہوئی وردہ چونک اٹھیں۔
 ”کڑکی!“ رابعہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”چھلاوہ ہو کیا؟ پلک جھپکی حاضر پلک جھپکی غائب! ابھی تو تم ثانیہ کی طرف گئی تھیں۔“

”گئی تھی امی جان! بالکل گئی تھی۔ وہیں سے تولائی ہوں جینٹی خبر“ اس نے چٹخارہ بھرا۔
 ”ہاں۔ دیکھ آئی ہوگی کوئی نیا سوٹ یا نئی ڈش۔“ وردہ نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ ”تمہارے لیے تو یہ بھی ”خبر“ ہوتی ہے کہ ثانیہ نے بہت اچھا سوٹ سلوایا ہے اور پھر اس ”خبر“ کے ساتھ ایک عدد فرمائش ٹانگ کرا می کو سنا دیتی ہو۔“

”جی نہیں جناب! اس بار میں اصلی تے سچی خبر لائی ہوں۔ میرے ان بے گناہ کانوں نے خود سنا ہے۔ لیکن جانیے! میں نہیں سنا! آپ لوگوں کو۔ یہاں تو کسی کو کوئی دل چسپی ہی نہیں۔“
 ”ہاں نہیں ہے ہمیں پرانے گھروں کی باتوں میں دل چسپی!“ رابعہ بیگم نے اسے گھورتے ہوئے چائے کا گھونٹ بھرا۔

”پر ایسا گھر؟“ اس نے احتجاج کیا۔ ”میں سلجوق ماموں کی طرف گئی تھی۔ وہاں ثانی امی اور فردوس ممانی۔ خیر جانیے میں نہیں بتائی۔ رائے آئی ہو تیں نایاں تو اتنے ذوق و شوق سے پوری بات سنیں، وردہ آپ تو بالکل ہی بور ہیں۔“

اس نے ناک چڑھا کر کہا۔ وردہ کو ہنسی آگئی۔
 ”اچھا چلو۔ بکواب!“ اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ ”میں بے حد دل چسپی سے سن رہی ہوں۔“
 ”پتا ہے کیا۔“ وہ پھر برجوش ہو گئی۔ ”ممانی امی، عریشہ کارشتہ مانگ رہی تھیں نافع بھائی کے لیے۔“
 ”اچھا!“ وردہ چونک اٹھیں۔

”واقعی؟“ رابعہ بیگم نے بھی دل چسپی لی۔ ”پھر بھابی جان نے کیا کہا؟ وہ تو بڑی خفا خفا سی رہتی ہیں عذر بھابی۔“
 ”ممنوں نے کوئی خفگی و فکری نہیں دکھائی۔“ وہ مزے سے بولی۔ ”بلکہ ان کا تو دل چاہ رہا تھا فنافٹ“ ہاں، کہہ دیں۔ بس ضبط کر گئیں۔“

”بد تمیز!“ وردہ ہنس پڑی۔ ”تم نے ان کے اندر جھانک کر دیکھ لیا؟“
 ”میں نے تو کمرے میں بھی نہیں جھانکا۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔ ”باہر ہی کھڑی تھی۔ لیکن ان کی آواز میں جو بے تالی اور خوشی تھی میں اسی سے سمجھ گئی کہ ممانی جان کے دل میں لٹو پھوٹ رہے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ رابعہ بیگم نے اسے گھورا۔ ”یہ تم ساری گفتگو چھپ کر سن رہی تھیں؟ کہاں تھیں تم؟“
 ”اُڑ ہو امی جی! امیرا کوئی ارادہ تو توڑا ہی تھا چھپ کر سننے کا۔ میں تو سچ سچ ثانیہ سے ملنے ہی گئی تھی لیکن جب میں کمرے کے اندر جانے لگی تو مجھے ممانی جان کی آواز آئی۔ وہ تو میری صورت سے چڑتی ہیں۔ اسی لیے میں نے واپس آنے کا ارادہ کیا تب ہی مجھے جملے میرے کان میں بڑ گئے۔“

وہ معصوم بن کر وضاحتیں دینے لگی، لیکن رابعہ بیگم اسے کڑی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ وردہ کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اپنے دوپٹے کی جانب متوجہ ہو گئی جس پر وہ پھول کا ڈھری تھی۔
 ”ناعنعم! تم کب سدھرو گی آخر؟“

”بھی نہیں۔“ دروہ زیر لب بولی۔

”کس قدر غلط حرکت کی ہے تم نے۔ کوئی دیکھ لیتا تو کیا خیال کرتا تمہارے متعلق؟ یہی سوچتا کہ ماں نے ایسی بات کی ہے بھائیوں کے گھر کی رپورٹیں لینے کے لیے۔“

انہوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ برے برے منہ بناتے ہوئے سختی رہی۔

”پوری بات سن کر آئی ہو اور کہتی ہو اتفاقاً“ سن لیا۔ اتفاقاً“ ایک آدھ جملہ سنا جاسکتا ہے۔ جس کا کوئی مفہوم نہ ہے پوری کہانی معلوم نہیں ہو سکتی۔ اور پھر وہی چلی آئیں بات پھیلانے کے لیے مزید غلط حرکت۔“

”لی جھالو کہیں کی۔“ دروہ نے اسے چڑایا۔

”بیٹے! رابعہ بیگم اس کی اتاری ہوئی صورت دیکھ کر نرم پڑ گئیں۔“ جس طرح پیسے چوری ہوتے ہیں اسی طرح یہ بھی چوری ہوتی ہے۔ تم بات چرا کر لائی ہو۔ اتفاقاً“ سنا تھا تو اپنے تک رکھتیں، ہمیں بتانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”وہ بھی چٹخارے لے لے کر۔“ دروہ نے اضافہ کیا۔

”دیکھیں نا!۔“ وہ آخر کار بے طرح چڑ گئی۔ ”یہ آپنی اچھے کیوں چھپھڑ رہی ہیں۔“

”اسی سے عقل سیکھو۔ اتنی سمجھ دار بچی ہے میری۔ اور تم ہو کہ ہر دوسرے منٹ ڈانٹ کھاتی ہو۔“

”اچھا سواری۔“ وہ منمنائی۔

دروہ مسکراتے ہوئے اسے نظروں ہی نظروں میں گویا جھیسڑنے لگی۔

”میں عریضہ کی پاس جاتی ہوں۔“ اچانک ہی اسے نیا خیال سوچھا۔ ”دیکھو تو اسے علم ہے یا نہیں۔“

”بینمو آرام سے۔“ رابعہ بیگم نے پھڑ ڈانٹ پلائی۔ ”بھی کیا بات سمجھائی ہے میں نے۔ اس کان سے سنی اور اسنا غور کے بغیر اس کان سے نکال دی۔ خبردار جواب اس بات کا ذکر کسی سے کیا تو۔“

”لیکن امی! اسے تو بتانا ہی چاہیے۔“

”ہاں تو اس کی ماں بتائیں گی۔ باپ بتائیں گے۔ تم کس خوشی میں دوڑی بھاگی جاتی ہو؟ دیوانی کہیں کی۔ اس پر باں جب بوچھے گی کہ تمہیں کس فرشتے نے آکر اطلاع دی تھی تب کہنا اسے کہ چھپ کر بات سنی تھی۔ اچھا۔“

”فرت افزائی ہوگی تمہاری۔“

”اچھا نا۔“ وہ بخل ہو گئی۔ ”آرام سے سمجھا دیا کریں نا۔ غصہ کیوں ہوتی ہیں۔“

”آرام سے سمجھنے والی ہو تم؟“ انہوں نے مزید گھورا۔

ناعمل نے سر جھکا لیا اور دروہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”دیکھ لوں گی۔“ اس نے منکا دکھایا۔



آن وہ نہانے کے بعد لیسن کمر کا چکن کاسوٹ پہن کر بال سکھانے چھت پر چلی آئی تھی۔ موسم اچھا ہو رہا تھا۔

آسمان پر بادلوں کے کلوے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے۔ ہوا بھی خوب چل رہی تھی۔ اکثر گھروں کی چھتیں آباد آ رہی تھیں۔ آسمان پر رنگ پر رنگ پتنگوں کا جوم تھا۔ ربیعہ سراو پر کیے انہماک سے پتنگوں کی لڑائی دیکھنے لگی۔

اچانک ہی اسے غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ آسمان سے پھسلتی اس کی نظر برابر میں کھڑے تصور پر پڑی۔ وہاں کس وقت بالکل خاموشی سے اس کے بے حد قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ تھہرا کر چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ تصور مٹنے لگا۔

”کیا ہوا؟“ ڈر گئیں؟“ وہ چند قدم مزید آگے آ گیا۔

ربیعہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے فوراً بولی۔

”میں تو بھوت سے نہیں ڈرتی، آپ تو انسان ہیں۔“ وہ قدرے خشک لہجے میں بولی۔

پھر وہ دانستہ رخ موڑ کر جھٹ کے دو سری جانب چلی گئی۔ تصور سے وہ اکثر انہی مذاق کر لیتی تھی۔ تمدن کی نسبت وہ خاصا بے ضرر اور شوخ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن آج اس نے عجیب حرکت کی تھی۔ ایسی حرکت جس پر واضح طور پر کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

ربیعہ کو بدریاد آگیا۔ وہ بھی اکثر جان بوجھ کر بالکل قریب آکر کھڑا ہوتا تھا۔ اتنا قریب کہ ربیعہ کو جھک کر پیچھے ہٹنا پڑ جاتا۔ شاید صنف مخالف کو یوں جھجکتا یا کر مردانگی کو کسی قسم کی تسکین ملتی ہو۔
ربیعہ کا خوشگوار موڈ اچانک ہی خراب ہو گیا تھا۔ شاید تصور کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اس سے قدرے فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

”پتنگیں اچھی لگتی ہیں تمہیں؟“ وہ خوش دلی سے پوچھنے لگا۔
ربیعہ نے چند لمحے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے اپنی غلط حرکت کا احساس ہو جائے۔ وہ خاموش کھڑی رہی۔

”کبھی اڑائی ہے پتنگ؟“

”نہیں۔“ وہ مختصراً بولی۔

”آئی نہیں ہو گا اڑانا!“ وہ مذاق اڑانے والے انداز میں بولا۔ ”یکھو گی تو آجائے گا۔ میں سکھا دوں گا۔“
”مجھے شوق بھی نہیں ہے۔“ وہ ہنوز خشک لہجے میں بولی۔

”اچھا اچھا۔ ہاں لڑکیوں کو کم ہی شوق ہوتا ہے۔“ وہ بے وجہ نہا۔ ”لڑکیوں کو تو اور ہی طرح کے شوق ہوتے ہیں۔ سجنے سنورنے کا شوق مگورا ہونے کا شوق، بال برہانے کا شوق، ترانہ کو بھی بال برہانے کا شوق ہے اور وہ صولت ہاہاہاہ۔ سچی کوتاہی۔ اس کے بال ایسے ہی ذرا ذرا سے رہتے ہیں۔ برہتے ہی نہیں۔ ہاہاہاہ۔“
پھر وہ سنجیدہ ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”تمہارے بال بہت خوبصورت ہیں ربیعہ! اتنے لمبے، اتنے سیاہ، اس قدر ملائم۔“ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ ہاتھ برہا کر اس کے بال چھو لیتا۔

ربیعہ تملاکر رہ گئی۔ اس نے کب کسی مرد کے لیوں سے ایسی بے باک تعریف سنی تھی۔ اس نے غفلت بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔
”تصور بھائی! مجھے اس طرح کی باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“ اس نے حتی الامکان پرسکون رہنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا اچھا۔“ وہ پھر بے وجہ ہی ہنسنے لگا۔ ”لڑکیوں کو تو تعریف بہت پسند ہوتی ہے۔ تمہیں پسند نہیں۔ خیر کیا پسند ہے تمہیں؟“

”کبھی کبھار اکیلا رہتا۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ابھی بھی یہی جی چاہ رہا تھا اس لیے اوپر آئی تھی۔“

تصور کا چہرہ بچہ گیا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

”میں تو یونہی چلا آیا تھا، پتنگیں دیکھنے۔“ مجھے علم نہیں تھا کہ اوپر تم ہو۔“

ربیعہ خاموش کھڑی رہی۔ تصور کچھ دیر کسی گانے کی دھن پر سٹی بجاتا رہا، پھر آہستہ آہستہ چل قدمی کرتا وہ سری جانب چلا گیا۔

ربیعہ کچھ دیر کھڑی بے مقصد سوچتی رہی پھر اسے بدریاد آیا۔ پھر چپکا حاکم یاد آئے۔ اس کا منہ نجانے کس احساس سے کڑوا ہو رہا تھا۔

ربیعہ گہری سانس بھرتے ہوئے میز ٹیبلوں کی طرف بڑھ گئی۔

”سنو۔۔۔ اے ربیعہ!“ کوئی اسے سرگوشیوں میں پکار رہا تھا۔

لے لے کر اس کا چرائیٹ سے رگڑتی ہوئی ربیعہ نے گردن گھما کر دیکھا۔ صحن میں کھلنے والی کھڑکی میں سے ترانہ
 میں بھاٹک رہی تھی۔
 ”اے متوجہ ہوتا دیکھ کر وہ قدرے جھنجھلائی۔ ”جائے وہ وہاں کب سے کھڑی اسے آوازیں دے
 رہی تھی۔“

”وہ نے سنک میں ہاتھ دھوئے اور کھڑکی تک چلی آئی۔“

”اچھا۔ اندریوں نہیں آتیں؟“

”اے! اس نے لبوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”پھپھو کہاں ہیں؟“

”وہ رہی ہیں۔ کیوں؟“ اس کے انداز پر تعجب ہوا۔

”صہات؟ وہ کیا کر رہی ہے؟“

”صہات تو گھر پر نہیں ہے۔ اسکول سے اب تک نہیں لوٹی۔“

”اد کا چہرہ کھل اٹھا۔“

”اچھا میں آتی ہوں۔“ وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گئی۔

”وہ پہلے نہ سمجھتے ہوئے برآمدے میں چلی آئی۔ ترانہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ

پاک پیکٹ تھا جس کو خوبصورتی سے پیک کیا گیا تھا۔“

”کیا ہے؟“ ربیعہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

”اے! خاموش! وہ سرگوشی میں بولی۔ اور سیدھی اپنے باپ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ پیکٹ اس نے

اڑی کے نچلے خانے میں رکھ دیا۔ منور امین اپنے بستر پر آنکھیں موندے بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔

”یہاں وہ ترقوت اسی انداز میں گزرتا تھا۔“

”لوگوں کے سامنے سے باہر نکل آئیں۔“

”تم نے کھانا کھالیا؟“ ترانہ نے شکفتہ انداز میں پوچھا۔

”اے! مجھے تو بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔ تمہارے لیے کھانا نکالوں؟“ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کچن میں

آئی تھیں۔

”نہیں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں بزرگ کھا کر آئی ہوں۔“

”اچھا۔“ ربیعہ سادگی سے بولی۔ ”چائے بناؤں تمہارے لیے؟“

”اے! چائے پیوں گی۔ لیکن ٹھنڈا، کچن کا نقشہ بتا رہا ہے کہ تمہارا سارا دن آج یہیں تمام ہوا ہے۔“ ترانہ کی

اوپر چاروں طرف گھومنے لگیں۔

”وہ کھلی دھلائی بریاں اور بوتلیں۔ صاف ستھرے شیفٹ خوب منجھے ہوئے برتن اور یہ چمکتا ہوا چولہا خوب

دھندلے ہوئے۔“

”مجھ سے گند اچھی برداشت نہیں ہوتا۔“ وہ مسکرا دی۔ ”مجھے کسی نے کہا نہیں تھا یہ سب کچھ کرنے کے

لیے۔ اس وقت گزارنے کے لیے کوئی مصروفیت تو ہونا چاہیے نا۔“

”ٹھیک ہے بھئی، ٹھیک ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اب کم از کم میں تمہیں چائے بنا کر تو پلا سکتی

ہوں نا؟“

”نہیں۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں بتاتی ہوں چائے ذرا یہ چولہا صاف کر لوں۔“

”تم سے نہیں جیت سکتی۔ چلو میں تب تک کپڑے بدل لوں پھر چھت پر چلتے ہیں۔“ وہ کچن سے نکل گئی۔

ربیعہ نے مسکرا کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ آج ترانہ بے حد خوش تھی۔ وجہ عنقریب

اسے معلوم ہونے والی تھی۔ چھت پر اسے لے جا کر ترانہ بھی چھت کی طرح ہو جاتی تھی۔ کھلی کھلی اور روشن

روشن۔ ربیعہ سے وہ اپنے دل کی سب باتیں کہہ ڈالتی تھی۔

ربیعہ نے چوبہا صاف کر کے چائے کا پانی رکھ دیا۔ باورچی خانے کا اُجلا پن اس کا من اجال رہا تھا۔ سب کا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا دیکھ کر اسے روحانی خوشی مل رہی تھی۔ اسے محسوس نہ ہوا کہ یکن کے دروازے پر کھڑا ترانہ مسکراتے ہوئے اسے اپنی محنت پر خوش ہوتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

”بہت خوش ہو؟“ اس نے پوچھا تو ربیعہ چونک اٹھی۔

”ہاں!“ وہ ہنسی۔ ”لیکن تم سے زیادہ نہیں۔“

ترانہ چونکی اسے گہری نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

”تم سے کس نے کہا میں خوش ہوں؟“

ربیعہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اور چائے کا گامک اسے تھما دیا۔

”تم کھوگی، لیکن چھت پر چل کر۔“

ترانہ جھینپ کر ہنس دی۔

”آج میری سالگرہ ہے۔ عبد الباری نے مجھے لچ کرایا اور گفت بھی دیا ہے۔“ اس نے چھت پر چل قدم کرتے ہوئے اسے بتایا۔

”پسند کرتی ہو تم عبد الباری کو؟“ ربیعہ نے اس کی آنکھوں کی جلتی ہوئی جوت دیکھی۔

”بہن!“ ترانہ نے اسے گھورا۔ ”یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے تمہیں؟۔ پسند نہ کرتی تو اس کے ساتھ کھول پھرتی، تختہ لیتی، خواب گاہ میں۔“

”شادی کیوں نہیں کر لیتے تم دونوں۔ اس سے کوئی مینا آئی سے بات کرے۔“

ترانہ کی آنکھوں کی جوت سدھم پر گئی۔ وہ اس سے ہونٹیں۔

”میں نے شادی کر لی تو ابو کا کیا ہوگا ربیعہ! بھائیوں کے متعلق تو تم جان ہی گئی ہو۔ انہیں گھر سے جتنی دلچسپی ہے وہ دھکی پھینکی بات تو نہیں۔ رودھو کر مینے کا راشن لے آتے ہیں اور بس! ابو کی دوائیاں دیگر اخراجات یہ سب کچھ میری تنخواہ سے چلتا ہے۔ پھر ابھی باری کی پوزیشن بھی اپنی اسٹرونگ نہیں ہے، ہم کچھ عرصہ شادی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”مینا آئی جانتی ہیں اس کے متعلق؟“ ربیعہ نے پوچھا۔ ”وہ مجھ سے بھی پوچھ رہی تھیں باری کے متعلق۔“

”ہاں۔ معلوم ہے مجھے یہ صولت ایک نمبر کی جاسوس ہے۔ میں کبھی کبھار اس سے اپنے دل کی کہ سن لیتی تھی مجھے علم نہ تھا کہ یہ میسنی پھینچو کو پوری رپورٹنگ کرتی ہے۔ اس نے انہیں خوب بھڑکایا۔ پھینچو نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے باہر کسی لڑکے سے روابط رکھے تو وہ تصور اور تمدن کو ہٹا کر میری خوب ٹھکانی کر دے گی۔“

ربیعہ نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ بے حد لاپرواہی سے سب کچھ کہہ رہی تھی۔

”لیکن وہ اتنی سخت کیوں ہیں ترانہ؟“

ترانہ زور سے ہنس دی۔

”وہ ظالم سماج ہیں ربیعہ! ظالم سماج، محبت کے گلابی سپنوں سے انہیں سخت نفرت ہے۔ کسی کی آنکھوں میں رنگین سپنے دیکھ کر ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ ان آنکھوں کو نوچ کر اندھا کر دیں۔ لیوں پر ٹھکتی ہنسی سے ان کے کانوں میں زہر بھرنے لگتا ہے۔ آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ ایک ایسا قانون پاس کر دیں جس کے تحت محبت کا نام لینے والوں کی زبانیں کھینچ دی جائیں۔ خواب بننے والی آنکھوں میں سلاخیاں پھوادی جائیں۔ نغمے سننے والے کانوں میں سیسہ بھر دیا جائے۔“

ربیعہ دم بخود رہ گئی۔

”بہت متوالی ہو۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”انہ نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے نیازی تھی۔
 ”کلی سخت حکومت، اتنی سرپھری بغاوت۔ اتنی سی بات نہیں سمجھتیں ربیعہ ڈیرہ اسانس لینے کو روزن میسر نہ
 ہوگا۔ اس میں ڈھادی جاتی ہیں۔“
 ربیعہ کو باغی ترانہ سے خوف سا محسوس ہوا۔ اچانک ہی وہ چونکی۔ سیڑھیوں پر اس نے بالوں کی سیاہی دیکھی، پھر
 اہل کپڑوں کی جھلک نظر آئی۔ کوئی چھپ کر واپس جا رہا تھا۔
 ”اے! کسی نے ہماری باتیں سنی ہیں۔“ وہ اچانک ہی ڈر گئی۔
 ”انہ نے مرکز دیکھا۔“

”کون تھا؟“
 ”ہاں نہیں۔ سرخ کپڑوں کی جھلک تھی۔“
 ”صواب! ترانہ نے لب سکڑے۔“ یہ لڑکی کسی دن نقصان اٹھائے گی میرے ہاتھوں۔“
 ”مجھے ڈر لگ رہا ہے ترانہ!“
 ”دھڑ!“ ترانہ نے اسے گھورا۔
 ”منور ربیعہ! جلدی مت سونا۔ ہم رات کو چھت پر گفٹ کھولیں گے۔ پتا نہیں باری نے میرے لیے کیا خریدا
 گا۔“ وہ اپنے گفٹ کے متعلق سوچنے لگی، جبکہ ربیعہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔

”اہل مباد آرہا ہے۔“ رات کے کھانے پر منہزہ بیگم نے سب کو اطلاع دی تھی۔
 ”ملا اور انہی کے چہرے کھل اٹھے۔ عمر نے خوشی سے نعرہ لگایا۔
 ”مہاداموں۔۔۔ ہرے نانوں میں انہیں اپنے پہا کے بارے میں بتاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔“
 ”ملا اپنی پلیٹ پر جھک گئی، جبکہ انہی کی پیشانی پر بل پر گئے تھے۔ منہزہ بیگم نے پیار سے ساتھ بیٹھے ہوئے
 ”کمال تھکا۔“
 ”کالا!“ اس نے پھر کچھ بولنا چاہا۔
 ”مہرا!“ شہلانے اسے ٹوک دیا۔ ”خاموشی سے کھانا کھاؤ۔“

”ایوں جھڑکتی ہو بچے کو بار بار۔“ منہزہ بیگم نے دھیرے سے اسے ٹوکا۔ ”اس کے معصوم ذہن میں بدگمانیاں
 بکھری ہو رہی ہیں۔ بولنے دو۔ کیا لیتا ہے تمہارا۔ ہر طرح کے حالات کو ذہنی طور پر قبول کرنا سیکھ لو شہلا بیٹی!
 انہیں پھر اتنا پریشان نہیں رہتا۔ بہتی دھارا کے ساتھ بننے دو سب کو۔“
 ”ملا نے نشو سے منہ صاف کیا۔

”دھالے لو۔“ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر بولیں۔ ”تمہیں تو بے حد پسند ہے بادام کا حلوہ۔“
 ”بس ای! ابھی موڈ نہیں ہے۔“ وہ ڈانٹنگ ٹینل سے اٹھ گئی۔ ”انہی کے اپنے لیے چائے بناؤ تو مجھے بھی دینا
 ہے۔“

”بی بی! اس نے بھانجے کے سر پر چپٹ لگاتے ہوئے کہا۔
 ”کالا۔“ وہ ماں کے جانے کے بعد بولا۔ ”مما کو کیا ہوا ہے۔ مجھ سے ناراض ہی رہتی ہیں۔“
 ”نہیں بیٹا!“ وہ پیار سے بولیں۔ ”وہ تو آپ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ سال تو اپنے بچوں سے ناراض نہیں ہوتی۔
 ”اپنے بچوں کو بہت چاہتی ہے۔“
 ”اور کیا؟“

”کالا تو اس کی سوئی!“ انہی نے دانت پیسے۔ ”کالا گئی تو بس انک گئی۔“
 ”وہ کہو انہی کے لیے ہے۔“ انہوں نے خفگی سے دیکھا۔

”بچہ نہیں ہے امی! پورا چھپا رہا ہے۔ میں تو چلی جائے بتانے۔“
وہ بچی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ منیڈہ بیگم نے عمر کو گود میں اٹھالیا۔
”بادام کا حلوہ کھلاؤں آپ کو؟“ وہ دلار سے پوچھنے لگیں۔

”نہیں نانو۔ مہاراج صاحب کھلاتی ہیں۔“ ماما کتنی ہیں اس سے دماغ مضبوط ہوتا ہے۔ خالہ جانی ان سے کتنی ہیں اس کا دماغ تو پہلے ہی بہت تیز ہے اپنا۔ اسے مزید تیز نہ کریں۔“ اس نے خالہ کی نقل اتاری۔
”ماشاء اللہ! کیوں نہ ہو۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ چوما۔

”نانو۔ آپ سب سے اچھی ہیں۔ آپ مجھے بالکل نہیں ڈانٹتیں۔“ نانو، ایک بات بتاؤں آپ کو۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ہاں ہاں بتاؤ!“ وہ اسے اپنے بستر تک لے آئیں۔

”میرے بھیا بھی مجھے بالکل نہیں ڈانٹتے۔“

”اچھا!“ وہ خاموش سی ہو گئیں۔

”جیتا ہے نانو! وہ مجھے زخمی لے کر گئے تھے۔ سندباد بھی لے کر گئے۔ انہوں نے مجھے سب جھولوں پر بٹھایا۔“
مجھے اس کزیم کھلائی۔ کتنے اچھے بھیا ہیں میرے۔“

منیڈہ بیگم نے گہری سانس بھری تھی۔

”اب سو جاؤ عمر! صبح اسکول جانا ہے نا۔“

”ہاں نانو! صبح میں ضرور اسکول جاؤں گا میں اپنے سارے فرینڈز کو بتاؤں گا اپنے بھیا کے بارے میں۔“
”عمر!“ کمرے کے دروازے پر شہلا کھڑی تھی۔ ”چلو میں سلاؤں تمہیں۔ امی کے قابو میں کہاں آ جا والے ہو تم۔ خود بھی جاگو گے ساری رات! انہیں بھی جگاؤ گے۔“
وہ بستر سے چھلانگ لگا کر ماں کی گود میں لٹک گیا۔

”نانو! شب بخیر!“ اس نے ہاتھ ملایا۔

”شب بخیر میری جان!“ وہ محبت سے مسکرائیں۔

شہلا اسے گود میں لیے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اس نے محبت سے اسے بستر پر پھینکا اور خود اس کے گدگدائی کرنے لگی۔

”شیطان کہیں کے شکایت لگاتے ہو ماما کی نالو سے ہاں۔ ماما ڈانٹتی ہیں تمہیں۔“

وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا۔

”ماما! ماما میری بات سنیں۔“

”ہاں سناؤ۔“ اس نے ہاتھ روکے۔

”میں بھی آپ کی شکایت نہیں کرتا۔ مجھے تو آپ بہت اچھی لگتی ہیں۔ ہمارے کتنی؟“

شہلا نے معصومیت سے نفی میں سر ہلایا۔

”کتی۔“ اس نے چھوٹے چھوٹے ہاتھ حتی الامکان دور کیے۔ ”بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت زیادہ بھیا۔“

اس نے کن اکھیوں سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ شہلا مسکرا دی۔

”مگر مجھے تمہارے بھیا بالکل پسند نہیں ہیں۔ تم میرے سامنے ان کا ذکر مت کیا کرو، سمجھ۔“

اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ اپنی معصوم نگاہوں میں حیرانی بھر کر اسے دیکھنے لگا۔

”ماما۔ بھیا تو آپ کو بہت لانا لگتے ہیں۔ وہ مجھ سے آپ کی باتیں کرتے ہیں۔“

شہلا کا دل عجب انداز میں دھڑکا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں نم ہو گئیں۔

”نہ ان سے میری باتیں بت کیا کرو عمو!“ وہ اس سے دور ہو گئی۔
 ”اے کر بیٹھ گیا تھا۔“

”ماما۔ کیوں مانہ کروں؟“ اس کے انداز میں ضد تھی۔ ”ہمیں اچھا لگتا ہے آپ کی باتیں کرنا۔“
 ”اے شہلا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ دانتوں سے لبوں کو چپکنے لگی۔
 ”اے ابا کہتے ہیں آپ کو آئیں کریم بہت پسند ہے۔ میں نے کہا جھوٹ! میری ماما تو کبھی آئیں کریم نہیں
 اور ہا بولے آپ کو ریڈ کلر پسند ہے۔ میں نے کہا غلط! میری ماما کے پاس ایک بھی ڈریس ریڈ کلر کا نہیں
 ہے۔“

”اے ابا رہا تھا۔ شہلا کے کانوں سے آہستہ آہستہ اس کی آواز دور۔ بہت دور ہوتی چلی گئی۔ وہ کہیں اور جا پہنچی
 ہوں کے سامنے سے دھندلے دھندلے منظر گزر رہے تھے۔ روٹی کے گالوں جیسے منظر۔
 ”اے کہتے ہو۔ پلیر ابرار۔“ اس کی ہنسی کی جھنکار سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔

”اے شہلا کی لٹھڑی آئیں کریم اس کے گالوں پر مل رہا تھا۔
 ”اے نہاؤ۔ پوری ختم کرو۔“ مجھے رات کے ڈیڑھ بجے آئیں کریم لینے بھیجا ہے نامہ نے۔ اب کہتی ہو
 ”میں جاتی۔ ختم کرو۔“

”اے ابا۔“ وہ اٹھ کر بھاگنے لگی تھی۔
 ”اے اس کا لالہ انچل پکڑ لیا تھا۔ دوپٹہ اس کے گلے سے نکل کر اس کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ وہ اسے رومال
 میں لپیٹ کر باندھ کر بیٹھ گیا۔
 ”اے لے کر کھاؤ۔“

”اے ہرے ہرے تم۔“ وہ ہتھیلیوں سے گالی دے کر گرتے ہوئے بولی۔
 ”اے لڑکے۔“ اس نے شرارت سے آنکھ پچی تھی۔ ”ایسے ہی کہہ دیا؟“
 ”اے اسے زبان چرائی۔“

”اے شہلا کی زبان تو سفید ہو رہی ہے پاس آ کر دکھاؤ۔“ وہ ڈاکٹری جھاڑتا۔
 ”اے جتنی ڈاکٹر میں بھی ہوں جناب۔“ وہ انگوٹھا دکھاتی۔
 ”اے تمہارے تو ناخن بھی پیلے ہیں۔ چلو نسخہ لکھو۔“

”اے شہلا کر فیس بڑتی۔
 ”اے ماما۔“ عمر نے اس کا کاندھا ہلایا۔ ”کیوں فیس رہی ہیں آپ؟“
 ”اے بے یکدم ہوش میں آئی۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر لاش بچھا دی۔
 ”اے میں چلو سو جاؤ۔“

”اے رادہ کیستی ہیں تمہاری۔ شکایت کر رہی تھیں مجھ سے۔“ انہوں نے گاؤں لے کر صوفے کی پشت پر ڈال
 ”اے من بستر پر لیٹتے لیٹتے رک گئے۔“

”اے کہا ہوتا۔ میں مل لیتا جا کر۔ اب رات کے دس بجے بتا رہی ہیں۔ اماں تو سو گئی ہوں گی۔“
 ”اے سو گئی ہوں گی لیکن تم ذرا جاگو۔“ وہ ہانپتی کا ہانپتی بستر کے دوسری جانب آ کر بیٹھ گئی تھیں۔
 ”اے ضرور۔“

”اے انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے بیگم کی جانب دیکھا۔

”اے رانے نافع کے لیے عرشہ کا خیال ظاہر کیا ہے۔ میں نے کہا عرشہ کے باب کی صلاح کے بغیر میں کچھ کہہ
 سکتی ہوں۔ اب تم کو مجھے تو مناسب ہی معلوم پڑتا ہے۔ سچی اپنے گھر میں ہی رہے گی، نگاہوں کے سامنے مایہ
 میں مایہ دیا۔ تسنیم میاں تو بہت بھلے ہیں مگر ماں بہن غضب کی تیز ہیں۔ مایہ کا اپنا مزاج بھی تیز ہے۔“

دھڑکا سا رہتا ہے۔ جی کو ہر وقت۔ بچی اپنوں میں جائے تو اتنا وہم نہیں ہوتا۔ چلو رافع نہ سہی، نافع سہی۔ ہاں ہے۔ بڑھ رہا ہے ابھی تو کسی قابل ہو ہی جائے گا۔“
 فاروق حسن کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔
 ”بچی بچی کی بات آئی تو آپ کو خاندان اچھا لگا۔ ہاشم کے لیے میں ثانیہ اور ناعمہ کا کتنا تھا تو آپ خفا ہو کر کہ خاندان میں نہیں کرتا۔ اب کہیے! بچی کی ماں بن کر سوچا تو کیسا لگا؟ عذرا اور راجہ بھی تو ایسا ہی سوچا۔“

فردوس بیگم خفیف سی ہو گئیں۔
 ”ارے ہاں! ہم تو ثانیہ پر بھی راضی ہیں اور ناعمہ پر بھی۔ ہماری اپنی بچیاں ہیں۔ غصے میں بھلا برا منہ ہی جاتا ہے۔ مگر تم تو بایں کاندھے پر سوار ہو ہمارے۔ فحاشی اندراج کرتے ہو۔“
 فاروق حسن مسکراتے رہے۔

”تم بیمار راضی کر لو تو جس کو کہو گے بیاہ لاؤں گی، سر کے بل جاؤں گی۔“
 ”جیسی نیت ویسی مراد۔“ وہ برجستہ بولے۔ ”خاندان کی لڑکی نہ لانے کا مصمم عزم کیے بیٹھی تھیں آپ نے آپ کی مراد پوری کی۔ اب آپ باہر سے ہی بھولا لائیں۔ خیر بات تو کچھ اور ہو رہی تھی۔ آپ عرشہ کے پوچھ رہی تھیں تو میرا بھی وہی خیال ہے جو آپ کا ہے۔ پھر ماں نے رشتہ جوڑا ہے، اللہ نے چاہا تو بہت اچھا گا۔ آپ بسم اللہ کہہ کر کہاں کیجئے۔ البتہ عرشہ کی رضامندی معلوم کر لیں۔“
 ”ہماری لڑکیاں بیٹوں کے سامنے نہیں بولتیں؟“ وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔
 ”دور رہو! انہوں نے شوہر کو چھوٹی نند کی بابت یاد کروایا تھا۔“

”نافع خوبصورت، سمجھا ہوا، پڑھا لکھا لڑکا ہے۔ لڑکیاں یہی کچھ چاہتی ہیں۔“ وہ بھی رسانیٹ سے بولے۔
 فردوس بیگم بھی ان کا مطلب بھانپ کر خاموش ہو رہیں۔
 ”ہاشم کا کیا کروں؟“ وہ پھر بے بسی سے گویا ہوئیں۔ ”آپ کچھ سمجھائیں اسے۔“
 ”مجھے اس کی حالت یاد آ جاتی ہے۔“ وہ بھی دھیرے سے بولے۔ ”وہ بے حد حساس لڑکا ہے بیگم! ذرا دل نہ کیجئے گا۔ اگر اس کے اصرار میں واقعی ماضی کی سی شدت ہے تو میرا مشورہ تو یہی ہے کہ اس کی مرضی کے تسلیم ختم کر دیجئے۔“

”لوگ کیا کہیں گے۔“ ان کا گلہ رندہ گیا۔ ”بہو کے ساتھ پوتا بھی ملا ہے۔“

”لائٹ آف کرویں۔“ انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

فردوس بیگم غم زدہ انداز میں تادیر بیٹھی رہیں۔



عمر بالا آخر سو گیا تھا۔ معصوم بچپن کی معصوم نیند تھی۔ شکوک و شبہات اور دوسو سون سے پاک نیند، جہاں کے اندیشے تھے نہ جیتے کل کی پرچھائیاں۔ سکون ہی سکون تھا۔ اطمینان ہی اطمینان تھا۔ وہ سکون و اطمینان ساتھ بے خبر سو رہا تھا۔

شملانے جھک کر اس کی پیشانی چومی اور اس کے بکھرے بال ماتھے پر سے سمیٹتے ہوئے اس کا چہرہ غور سے لگی۔ اس کی سیاہ آنکھیں ماں جیسی تھیں۔ بال بھی ماں کی طرح کالے اور گھنے تھے۔ ناک کی اپنی ہی وضع چھوٹی اور گول سی۔ لیکن لبوں کا کٹاؤ بالکل باپ کا سا تھا۔ ہنستے ہوئے اس کے بایں گال میں گڑھا بناتا تھا۔ اہا شملانے گال میں بھی پڑا تھا اور ابرار کے بھی۔ یہ خصوصیت اس نے ماں اور باپ دونوں سے لی تھی۔ شملانے غور سے اس کا چہرہ دیکھا، پھر گہری سانس بھرتے ہوئے بستر سے اتر آئی۔ اور بک شیاف کے کھڑے ہو کر مختلف کتابوں پر نظریں دوڑانے لگی۔

اس فرار چاہ رہا تھا اور ایک خاص سوچ اس فرار کا تعاقب کر رہی تھی۔ کتابوں پر انگلی پھیرتے ہوئے وہ کھڑکی کے پاس آکر اس نے کھڑکی کا سلائیڈنگ ڈور کھول دیا۔
ایمان میں اندھیرا تھا۔ رات کی رانی اور جنگلی گلاب کی ملی جلی مہک دھیرے سے کمرے میں در آئی۔ شہلا ہلہ کھڑکی بند کر دی۔

کہا تھا اس نے ایمان سے۔ کس قدر جھوٹ بولنا پڑا تھا اسے۔ اور وہ ایمان وہ کس قدر درست تھی۔
اس نے شہلا کا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔
ایمان کے سامنے چلی آئی۔ سامنے اس کا عکس تھا۔ وہ ایمان کی نظروں سے اپنا آپ کھوجنے لگی۔
”یہ آنکھیں غور سے دیکھو۔“ اس نے کہا تھا۔ ”پتے تراشے ہوئے لبوں پر دھیان دو۔ اپنی ان سیاہ آنکھیں بند کر لیں۔“

اس کے کانوں میں بھولی بھری سرگوشی جاگی۔
”سہم کے آنکھیں کھول دی تھیں۔“

”یہاں آئی نالاج اس تصور سے؟“ ایمان کہہ رہی تھی۔ ”کیسے کہہ سکتی ہو شہلا کہ جذبوں کے الاؤ سرد پڑے۔“
”مادوں پر بکھرتی حرارت جھوٹ نہیں بولتی۔“
”اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔“ کیسے سمجھاؤں تمہیں یہ بات تو میں اپنے آپ سے کہتے ہوئے
”مذہبوں کے الاؤ سرد نہیں ہیں مگر چنگاریاں جو چھپی ہوئی ہیں۔ ان تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ اس رُپیچ
اس ایک مسافر ہی منزل تک پہنچا تھا۔ افسوس تو یہ ہے کہ وہ منزل کو منزل نہ سمجھا۔ وقتی پڑاؤ سمجھا۔ لیکن
”میں کے نشان آج تک۔“

سہمی۔

”کسی نے ہنس کر کہا۔“

ایمان کی۔ یہ کس نے جی کا چور دیکھا تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ جالی کے سفید پردے چپکے چپکے

اور اہلین کی تصویریں ہاں لگاؤ اور یہ ٹرین یہاں۔ ایمان بچوں کو لیے بیٹھی تھی۔

”یہ ایمان ساری گلو (Glu) ضائع کر رہی ہے۔“ مومن نے اس کی توجہ منہی ایمان کی جانب

”وہ جلدی سے اٹھی۔“ گندی بچی یہ کیا کیا تم نے کاربٹ کاٹاں مار دیا۔ اب یہ کیسے صاف ہو گا۔
”اب اہلین سے آئیں گے یہ صاف کرنے۔“

ایمان ہٹے ہوئے اٹھ کر بھاگی۔ ایمان اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے اچانک رکی۔ کمر میں درود کی شدید لہر اٹھی تھی
”اس کے پورے وجود میں آگ سی بھری۔ وہ سینے سینے ہو گئی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔“

”مومن جو غور سے ماں بیٹی کے درمیان ریس ملاحظہ کر رہا تھا چونک اٹھا۔ ”مما۔ کیا ہوا؟“
”بہن! شکل صوفے تک پہنچی۔ مومن آکر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ ایمان پردے کے پیچھے جا چھپی

”ماں آپ کی طبیعت خراب ہے؟“ وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

”میں ثابت میں سر ہلا پائی۔“ میس رہ رہ کر اٹھ رہی تھیں۔

”وہ کچن کی جانب دوڑ گیا۔“

”مومن نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر رہا تھا۔“

دفعاً "فون کی بیل بجنے لگی۔ مومن نے جا کر فون کا ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔ ہیلو۔ جی ہیا۔ میں مومن ہوں۔"

ایقان چونک گئی۔

"ممائی طبیعت خراب ہو گئی ہیا۔! میں انہیں پانی پلا رہا ہوں۔" اس نے اپنی مستعدی کے ضروری خیال کیا۔

ایقان اپنی جگہ سے اٹھ کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے فون تک گئی۔

"ہیلو۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"ایقان! کیا ہوا ہے یا ر؟" وہ فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

"پتا نہیں عاشر! بس اچانک ہی کمر میں ٹیسس سی اٹھنے لگی ہیں۔ بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ کراہی۔

"مم۔ تم فون کر کے رافع یا ہاسم کو بلا لو۔ ڈاکٹر کے پاس جاؤ۔"

"جھا! اس نے کہا۔"

اس کی پلکیں غم ہو گئی تھیں۔ لب کانٹے لگے تھے۔ عجب موسم تھے جدائی کے۔ پوری زندگی پر محیط دکھ! تھے اس کو تو محض آواز سے کب تک خود کو تسلیاں دیتی وہ۔ ایقان نے اس لمحے خود کو بے حد تنہا اور ملول کیا تھا۔

"ایقان۔ ایقان۔" وہ آواز سن دے رہا تھا۔

"ہاں! اس نے خود پر قابو ہانے کی کوشش کی۔ "میں سن رہی ہوں عاشر!"

"آئی لو یو جانو! یہ بھی گویا تسلی دینے کا انداز تھا۔"

ایقان کی تسلی اب اس جملے سے نہ ہوتی تھی۔ ورنہ بہت عرصے تک تو وہ یہی سہ لفظی جملہ سن کر شامہ کرتی تھی۔ دل ان ہی لفظوں کی تکرار کیا کرتا تھا۔ وہ خوش خوش پھر ا کرتی تھی۔

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ ایقان نے مرے مرے انداز میں ریسیور رکھ دیا۔ دل کو اب کی تسلی کافی نہ تھی۔ جی بھر کر رو لینے کے لیے ایک کاندھا درکار تھا۔

ٹیس پھر اٹھی تھی۔ وہ "حیات ولا" کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ فون عذرا بیگم نے اٹھایا۔

"ہیلو بھائی جان! وہ بولی۔" ایقان بات کر رہی ہوں۔ جی میری طبیعت کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ کہا

ہو رہا ہے۔ جی رافع کو بھیج دیں۔ بھائی جان کی گاڑی لے آئے۔ جی اچھا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"ہم بے چاری عورتیں! صوفے کی پشت سے سر نکا کر سوچنے لگی۔ "کیسویں صدی کا نعروں کا

آزادی کی باتیں کرتی ہیں۔ سینا رہتے ہیں، لیکچر دے جاتے ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ آزادی نسواں کی

ہوتی ہیں۔ عورت آزاد ہے، عورت، مرد کے سہارے کی محتاج نہیں، عورت اکیلی رہ سکتی ہے، بچے پال

نو کر سکتی ہے، اپنا گھر چلا سکتی ہے۔ سب ہی کچھ کر سکتی ہے بے چاری خوا! سب کچھ کر گزری مگر آدم کے

آج تک اپنا دل آزاد نہ کروا پائی۔ آزاد وجود کے اندر قیدی دل لیے پھرتی ہے۔ وہاں سے محض ایک جملہ

فرض پورا ہو جاتا ہے۔ آئی لو یو جانو! کتنی بڑی بات ہے نا۔ یہ بول دینا! یہاں قیدی دل تادیر تکرار کرتا ہے

دیوانہ ساری ساری رات اسی ایک جملے کا تعاقب کرتا ہے، پیسی سننے، سننے رہنے کی خواہش میں عمر گزار

اور بے چاری عورت! کہتی ہے، میں آزاد ہوں! جن کا دل زنجیر کی چھٹک کا غلام ہو۔ ان کے وجود آزاد

کرتے دیوانی عورتوں۔"



وہ "حیات ولا" چلی آئی تھی۔ ڈاکٹر نے دس پندرہ دن بیڈ ریسٹ کی ہدایت کی تھی۔

"نو عمر لڑکیوں بالیوں کی طرح تو اچھلتی کودتی پھرتی ہو تم! شقیقہ حیات نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔"

پردیس میں ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ تمہیں تو دہری ذمہ داری نبھانی ہے۔ اپنا خیال خود

ایک انداز فرشتے تو اتارے گا نہیں جو پل بل تمہارا ہاتھ پکڑ کر سہارا دے۔ بہنی کی سی تلا چیں بھرتے میں نے بارہا کہا ہے تمہیں۔ میرا جی دھڑک دھڑک جاتا ہے پر تم بے دھڑک چھلانگ لگاتی ہو یہاں سے وہاں تک کی۔

”کان لیٹے بیٹھی رہی۔“
”میرے منہ میں خاک! کچھ الٹا سیدھا ہو جاتا تو میاں سے کیا کہتیں؟“
”اوسنہ! میں نے ٹھیک لیا ہے مناسب کچھ سیدھا سیدھا رکھنے کا۔“ وہ جھلائی۔ ”یہاں ہمارا دل الٹا سیدھا آڑا ہمارا سب ہی کچھ ہو جاتا ہے کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اور اماں! عورت اپنے دل سے مرد کی پابندی ہے۔ مرد ہی بھاتا ہے ہر روپ میں بھائی ہو بیٹا ہو اور تو اور داماد ہو۔ بس وہی صحیح ہے۔ آپ کو بیٹی کی فکر نہیں، اللہ کی سوچ کی تشویش ہے۔ حد ہو گئی۔“

”ارے ارے کیسی نامعقول ہو رہی ہو تم۔“ انہوں نے بیٹی کو گھورا۔ ”وہ ہمیں ہی سوچ کر گیا ہے تمہاری خبر گہری۔ فکر نہ کریں گے کیا؟ اور تمہیں یہ کاہے کا بھوت سوار ہے؟“
”ہاں نہیں! بس غصہ آ رہا ہے ہر کسی پر۔“
”بیٹی! وہ نرم پڑ گئیں۔“ کیوں جان ہلکان کیے رکھتی ہو۔ چار پیسے کمانے پر دیس گیا ہے بچہ۔ آجائے گا۔ ساتھ لے لیتے کو عمر پڑی ہے۔“

”ہاں تمہیں۔ حال سے بے حال ہوئی بیٹی کے احساسات سمجھ گئیں۔“
”یہ بھی درست کہا اماں! پیر میرے قبر میں لٹکے ہوں گے اور میں چھاتی پھووں گی لاشی کے سارے۔“
”ہر رات بیکم کھلکھلا کر فہن دیں۔ وہ اس کے لیے شہک بنا کر لائی تھیں۔“
”اپنے نام کی ایک سی ہے۔“ شفیقہ حیات بھی مسکرا دی تھیں۔

”رائنگ پن میں رکھے ہوئے کبابوں کو احتیاط سے پلٹتے ہوئے انہوں نے ایک نگاہ عباد پر ڈالی۔ کچن میں پڑی ہول کول میز کی کرسی پر بیٹھا وہ مزے سے پلاؤ اور رٹتے کا لطف اٹھا رہا تھا۔“
”شامی کباب بھی پلیٹ میں نکال کر لے آئیں۔ اس کے سامنے پلیٹ رکھ دی۔“
”اؤ۔۔۔ کمال ای جی، کمال!“ وہ گرم گرم شامی کباب کھاتے ہوئے بولا۔ ”جس نے بھی کہا سچ کہا کہ معدہ دل پہلے واقع ہوا ہے۔ جو راہ بھی ادھر کو جاتی ہے۔“ اسی راہ سے گزر کر جاتی ہے۔ مائیں تب ہی تورا ج کرتی ہیں ہاں کے دلوں پر۔ گھلا گھلا کر انہیں غلام بے دامن بنا لیتی ہیں۔“
”لوں نے پیار سے اس کے چپٹ لگائی۔“

”مائیں تو انتظار کرتی ہیں اپنے راج دلاروں کا۔ جو لمے پر پلاؤ تو بہت بعد میں بنتا ہے۔ لاتعداد خیالی پلاؤ جی ہی ل میں بناتی ہیں کہ اس بار کیا پکاتا ہے اور کب کب کھانا ہے۔ اولاد اتنے شوق سے کھائے تو ماں کا بنا کھائے ہی ہوں لون بڑھ جاتا ہے۔“
”ہاں ہے ای جی! اس بار آپ کے فرائیڈ رائس اور چکن نے بڑا لطف دیا رستے میں۔“ اسے اپنا سفر یاد آیا اور اٹھ بی ہم سفر بھی۔

”بھوک بھر کر منہ میں ڈالنا بھول گیا۔ منہ بڑھ بیگم نے غور سے اسے دیکھا۔“
”ایا بھول گئے؟“ انہوں نے ٹوکا۔

”اس نے جلدی سے چیخ منہ میں ڈالا اور مسکرائے لگا۔“
”بھول نہیں گیا، کچھ یاد آ گیا تھا۔“ اس نے تھجج کی۔
”چھ مائیں بھی رستے میں کچھ بھول آئے۔“ وہ مطمئن ہوئیں۔
”ای جی!“ اس نے کچھ دیر میں پکارا۔

”کو بیٹے“ وہ اب اس کے لیے چائے دم کرنے لگی تھیں۔
 ”ایک لڑکی ملی تھی لاہور جاتے ہوئے۔ ٹرین میں ساتھ تھی میرے۔ ربیعہ نام ہے اس کا“
 ”اچھا!“ ان کے ہاتھ رک گئے۔ لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ جاگ اٹھی۔
 ”پی۔!“ وہ سوچ میں گم ہو گیا۔

منیزہ بیگم اس کے کچھ کہنے کے انتظار میں کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر کھنکھاریں۔ وہ چونک اٹھا۔
 کہے بنا وہ دوبارہ اپنی پلیٹ پر جھک گیا۔ وہ بھی چائے بنانے لگیں۔
 کھانے اور چائے سے فارغ ہو کر وہ حسب معمول ان کے کمرے میں چلا آیا اور ان کی گود میں سر رکھ کر لہا گیا۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔

”امی جی! وہ بہت اچھی ہے۔“ وہ چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”بہت حوصلہ مند، خوددار، باوقار“ اس کی ہاما چیت میں بے حد شائستگی ہے، مسکراہٹ میں بچوں کی سی معصومیت، آنکھوں میں وہ روشنی جو صرف کردارِ بلند ہی سے ہی ملتی ہے۔ زندگی نے اس کے ساتھ بہت سختی برتی لیکن وہ عزم اور ہمت کی مثال ہے۔ مجھے اس بہت متاثر کیا ہے۔“
 منیزہ بیگم مسکراتی رہیں۔

”پتا ہے امی! اسے اپنی منزل کا علم نہ تھا پھر بھی وہ اکیلی، کسی سے مدد کی درخواست کیے بغیر ہی چل پڑی تھی مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو خود پر ترس نہیں کھاتے، اپنی مظلومیت کے احساس سے رونے نہیں ہمت سے سراٹھا کر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وقت کا چیلنج قبول کرنے والے لوگ۔“
 منیزہ بیگم کچھ نہ بولیں۔ ان کی آنکھوں میں رچھائیاں سی پھرنے لگی تھیں۔

”چڑیا کے دل پر اس نے ہمت اور حوصلے کا شیر کا سا خول چڑھا رکھا ہے۔ دل تو قدرت عطا کرتی ہے نا! اس پر بس نہیں مگر خول انسان خود چڑھاتا ہے۔ یہ تو تعریف کا مقام ہے۔ کیوں امی جی؟“
 ”ہاں!“ وہ چونک اٹھیں۔ ”ٹھیک کہتے ہو بیٹے۔ مگر وہ ہے کون؟“
 ”ربیعہ!“ وہ سادگی سے بولا۔

”کہاں رہتی ہے۔ کیا کمائی ہے اس کی؟“
 ”ابھی تو میں خود ٹھیک طرح سے نہیں جان پایا۔ بس جو اندازہ قائم کیا ہے اس کے بارے میں وہ آپ

بتا دیا۔“

”آپ کا معلوم کر لو تو تمہارا رشتہ لے جاؤں۔“ وہ مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا۔
 ”رشتہ؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”مائی گاؤ! میری پیاری، بھول بھالی امی جان! ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں آپ سے یہ کس فرشتے نے کہہ دیا کہ میرے ذہن میں ایسی کوئی بات ہے؟“
 ”تقریباً تو ایسے ہی کیے جا رہے ہو۔“ وہ براہِ مان کر بولیں۔

”پی۔ جی۔ امی جی۔“ اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”پتا ہے آپ کو مجھے اس میں سب سے زیادہ کس شے کا متاثر کیا؟“

وہ بنا جواب دیے اسے دیکھتی رہیں۔
 ”اس کی آنکھوں میں روشن بلند کرداری کے جگنوؤں نے۔ اور جانتی ہیں یہ جگنو میں نے اور کہاں دیکھے ہیں آپ کی ان پیاری پیاری آنکھوں میں۔ اس کی جیا بھری آنکھیں دیکھ کر مجھے آپ کی آنکھیں یاد آ گئیں۔ اور رخصت ہونے سے اس نے مجھے پکارا۔ عباد بھائی۔ مجھے بہت بہت اچھا لگا۔“

”اچھا۔“ انہوں نے سانس بھری۔ ”تو تیسری بسن مل گئی تمہیں۔“
 ”دیس اشد۔“

”میں تو سمجھی، ایک ذمہ داری سے جان چھوٹی میری۔ اب تمہارے رشتے کے لیے خوار نہیں ہونا پڑے گا

”آپ خدا نخواستہ کیوں خوار ہونے لگیں۔ یہ میری اچھی اچھی بہنیں کس مرض کی دوا ہیں۔“

”میرے بیگم چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔“

”تمہارا جانتے ہو ارا راب اکثر عمر کو لے جاتا ہے۔“

”وہ اسی کم صدمہ سا ہو گیا۔“

”ار ارا!“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”وہ دو روپائی ہو جاتی ہے بے چاری۔ پر کیا کرے، ڈرتی ہے کہیں وہ کوئی دعوائہ کر بیٹھے۔“

”لڑنا ہے تو کرے۔“ وہ بکڑا۔ ”ہم بھی دیکھ لیں گے۔“

”اینا! مردوں کے اس معاشرے میں ایک دکھی ماں کے دل کی فریاد کس نے سنی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔

”ہے وہ اس کا۔“

”اے اب یاد آیا ہے؟“ وہ بھی مجروح لمحے میں یہی کہہ سکا۔

”ایہو! اب کب تک یہ کھیل چلتا ہے۔“ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم ہو گئے تھے۔



دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

وہ تیری یاد تھی، اب یاد آیا

”ماں! عیشہ! سینکڑوں مرتبہ یہ غزل سنی ہے میں نے۔ میڈم کی آواز میں ایک شاہنکار بن گئی ہے ناصر کی

”ماں! لیکن اب میں یہ غزل سنوں تو میرے دل کی عجیب سی حالت ہونے لگتی ہے۔ میرا دل مضطرب ہو جاتا

”ماں! سانس رکھنے لگتی ہیں میرے سینے میں۔ اور جب یہ شعر آتا ہے کہ۔“

بیٹھ کر سایہ نگل میں ناصر

ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا

”وہی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

”میں کیا جانوں۔ اپنے آنسوؤں سے پوچھو۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔

”ماں! وہ کہتے ہیں دل سے پوچھو۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”اں تو ٹھیک ہے دل سے پوچھو۔“

”کچھ تو رہا ہوں۔“

”عیشہ کے گال تپ گئے۔ کان کی لوسن پڑ گئی۔“

”مہم نو تا میرے دل۔ کوئی جواب؟“

”لڑا۔ پکیزے مت بات کرو۔“ وہ جھینپ کر بولی۔

”ام کب ملیں گے عیشہ؟“ اس نے اس کی تحفیت بھانپ کر ٹھیک بدلا۔ ”اب تو تم گلف مار کیٹ بھی نہیں

”ماں!“

”ماں! ہوں مگر اپنے خرچ پر۔“ وہ کھلکھلائی۔ ”ایک مرتبہ کا تجربہ کافی ہے۔“

”اں یہ تو ہے۔“ اس نے اتفاق کیا۔ ”اس طرح کا تجربہ تو بس ایک ہی ہونا چاہیے لائف میں۔ ایک ہی تجربہ

”ماں! ہماری ہے۔ موبائل کا خرچ دو گئے کو کراس کر چکا ہے۔“

”التمت کرو خرچا۔ کس نے کہا ہے۔“ وہ بے نیازی۔

”عیشہ! میں نے اپنی بہن کو تمہارے متعلق بتایا ہے۔ اس کا نام فریہ ہے۔ میں اسے تمہارے گھر بھیجوں؟“

”ہائے اللہ!“ وہ گھبرا گئی۔ ”لیکن تم نے اسے کیوں میرے متعلق بتایا؟“ اور میرے گھر کیوں بھیج دیا؟
 فراز میرے تین بھائی ہیں اور تینوں مل کر میرا گلا دبا دیں گے اگر کچھ ایسا ویسا ہوا تو۔ اور میری امی بہت سخت
 ہیں۔“

”ہاں تو مجھے علم نہیں ہے کیا۔ ان ہی کو تو میں تمہارے ٹیلیفون کا دربان کہتا ہوں۔ وہ ”ہیلو“ کہتی ہیں تو میں
 کانوں میں خارش ہونے لگتی ہے۔ رات کو سونے سے پہلے اسے ڈراپس ڈالنے پڑتے ہیں۔“
 ”بہت بد تمیز ہو تم۔“ وہ جھلائی۔ ”میری امی کے بارے میں ایسے کہہ رہے ہو؟“
 ”قسم لے لو۔ میں تو اپنی مستقبل کی ساس کے متعلق گواہ افشانی کر رہا ہوں۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”دوبارہ!
 ایسے ڈر رہی ہو جیسے میری معصوم سی بہن ڈھول تاشوں کے ساتھ چلی آ رہی ہوگی۔ ارے وہ تو تمہاری سہیلی ہیں
 آئے گی تمہیں دیکھنے“ اور بس۔ وہ تمہاری امی کو میرے متعلق کچھ کہنے نہیں آ رہی۔“

”لیکن ابھی نہیں پلیز۔“ اس نے منت کی۔

”اوکے بابا! جب تم کہو۔“ وہ مان گیا۔

”اچھا میں فون رکھتی ہوں۔“

”یہ مہربانی کیوں؟ ابھی میرے کارڈ میں چند روپے باقی ہیں۔“ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

عریشہ کھلکھلا کر ہنسی اور فون بند کر دیا۔

کچھ دیر وہ ہیں بیٹھی مخمور نگاہوں سے دیواروں کو تکتی رہی۔ اس کی میٹھی میٹھی باتیں کانوں سے اتر کر اس
 دل میں گونج رہی تھیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ اس نام اور اس آواز کی دیوانی ہو گئی تھی۔ جس دن وہ محبت
 لہجے، شرارت بھرا انداز سنا لی نہ دیتا وہ بے کل بے کل پھرا کرتی تھی۔

اس کی باتیں یاد آئیں تو اس کے من میں ایک خیال ابھرا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے سلیپر زپنے اور
 ٹھیک کرتے ہوئے فردوس بیگم کے کمرے تک چلی آئی۔ وہ آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھیں۔

”امی جی! اس نے دھیرے سے پکارا۔

”ہوں!“ وہ کچھ غنودگی میں تھیں۔

”میں ناعمہ کے پاس جا رہی ہوں۔“

”ہوں!“

وہ جیکے سے باہر نکل آئی۔ بڑا سا صحن عبور کر کے وہ پھوپھی کے پورشن میں چلی آئی تھی۔ رابعہ بیگم برآمدہ
 میں بیٹھی بیوی دیکھ رہی تھیں۔

”السلام علیکم پھوپھیو! ناعمہ کیا کر رہی ہے؟“

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”ناعمہ شاید۔“

ان کے الفاظ لبوں میں ہی رہ گئے تھے۔ ناعمہ کچن سے نکل کر چلی آئی۔

”آگئیں۔۔۔ چھپی رستم!“ اس نے لٹاڑا۔ ”ضرور کوئی خبر سنانے آئی ہوگی۔“

”ناعمہ!“ رابعہ بیگم کے لہجے میں اچھی بھلی تنبیہ تھی۔

عریشہ کے چہرے پر ہوا یاں اڑنے لگیں۔ وہ جلدی سے ناعمہ کو کمرے میں کھینچ لائی۔

”کیا ہو گیا۔ یہ تم پھوپھیو کے سامنے کیا کہ رہی ہو؟“ وہ اپنے دل کے چور سے ڈر گئی تھی۔

”کیا مطلب؟“ ناعمہ نے غصے سے بازو جھڑایا۔ ”میں نے امی کے سامنے ایسا کیا کہہ دیا؟“

”تم نے مجھے چھپا کر تم کیوں کہا؟“

”تم ہو۔“

”کیا چھپایا ہے میں نے تم سے؟“ وہ خوف زدہ سی ہو گئی۔

ناعملہ نے بولنا چاہا پھر اسے ماں کا چہرہ یاد آگیا۔ جنھوں نے سخت سے کہہ کر کنکری ہلاتی کی تھی۔ وہ آنکھیں مٹھا کر رہ گئی۔

”بولو نا۔“ عریشہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
 ”کچھ نہیں۔ یونہی تمہیں چھیڑنے کو جی چاہ رہا تھا۔“ وہ بات بدل گئی۔

عریشہ کی جان میں جان آئی۔ وہ تجائے کیا سمجھ بیٹھی تھی۔
 ”اور یہ تم کیوں رات کے دس بجے افتخار و خیراں دوڑی بھاگی چلی آ رہی ہو؟ کچھ چکر لگتا ہے؟“ ناعملہ نے اس کا ہاتھ لیتے ہوئے کہا۔

”سوئی بجھیں!“ عریشہ نے اس کے بازو میں چٹکی بھری۔ ”کوئی چکر دوڑ کر نہیں۔ وہ میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ ہمارے پاس میڈم نور جہاں کی وہ والی غزل ہے۔ دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا۔“
 ”تمہارا دل دھڑکنے لگا ہے کیا؟“ وہ ہنسی۔

”ہاں بابا! دھڑکنے لگا ہے۔“ وہ اس کے آگے بے بس ہوئی۔ ”بس تم مجھے وہ کیسٹ دے دو۔“
 ”کس کی یاد سے یہ نا ممکن کام ممکن ہوا۔ پہلے یہ بتاؤ۔“

”ناعملہ جاؤ! میں نہیں بولتی تم سے۔“ وہ بیزار ہوئی۔ ”بال کی کھال اتارتی ہو۔“
 ”اچھا اچھا دیتی ہوں۔“ وہ احسان کرتے ہوئے بولی۔ ”دیئے تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ اندر رہی اندر وہ پتھر کی پک رہی ہے نا۔ اس کی خبر ہے مجھے۔“

عریشہ جو بے شکل مطمئن ہوئی تھی پھر ریشان ہو گئی۔
 ”تمہیں قسم ہے ناعملہ! سچ بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“
 ”اوہ نہ!“ اس نے ریک میں لگی کیسٹوں میں سے مطلوبہ کیسٹ کھینچ کر نکالی اور اس کے حوالے کی۔ ”جیسے ہاتھ نہیں۔“ وہ طنز پر بولی۔

عریشہ نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تنگلی سے سر جھٹکا اور جانے کے لیے مڑ گئی۔
 ”مجھوں کی بیٹا تم سے۔“ وہ اس کے جانے کے بعد بیڑ پائی۔ ”ناعملہ علی خان ہے نام میرا۔ دل دھڑکنے کا مہیا دیا۔“



”بس بھائی جان! جو اماں نے کہہ دیا وہی میری خوشی وہی میری اولاد کی خوشی۔“ سلجوق حسن مسکراتے ہوئے اپنے لگے۔

شفیقہ حیات بھی مسرت سے بھرپور انداز میں مسکرائیں۔
 ”جیتے رہو! میرا تو فخر و غرور ہو تم لوگ بوڑھے لوگوں کو اور کیا چاہیے جتنا مان تم لوگ مجھے دیتے ہو میری عمر بھاجا جاتا ہے۔“

”اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے اماں! آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی اس گھر کے سب افراد ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔“ فاروق حسن مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اور اللہ نے چاہا تو آپ کے ہاں لے ہوئے ان رشتوں سے یہ بڑا ہی اتفاق اور محبت بڑھتی ہی رہے گی۔“

”بس بیٹا! میں نے اسی لیے تم لوگوں کو یہاں اکٹھا کیا ہے کہ ایک ہی بار سب کی رائے معلوم کر لی جائے۔“ ہال کمرے میں شفیقہ حیات، فاروق حسن، فردوس بیگم، سلجوق حسن، عذرا بیگم، راجہ بیگم اور ایقان موجود تھے۔ سبھی لے چروں پر مسکرائیں تھیں۔ ماحول بے حد خوش گوار تھا۔
 ”عریشہ سے بھی پوچھا ہے کسی نے؟“ ایقان کو خیال آیا۔

”ہاں پوچھ لیا ہے۔“ فردوس بیگم بے اعتنائی سے بولیں۔ ”ہماری بیٹیاں ہمارے سامنے نہیں بولتیں۔“
 شفیقہ حیات کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔ ایقان ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ فردوس بیگم ہی کیا جو کوئی موقع

ہاتھ سے جانے دیتیں۔

دونوں سب کے سوجانے کا اطمینان کر کے چھت پر چلی آئی تھیں۔ چالیس واٹ کے بلب کے ملکی روشنی میں ترانہ نے بے حد بے تابی سے وہ پیکٹ کھولا تھا۔ وہ بہت جلدی میں تھی لیکن پوری احتیاط کے ساتھ ریپر اتار رہی تھی۔ مبادا وہ کہیں سے پھٹ جائے۔ شاید اسے وہ رنگ پیپر بھی عزیز تھا۔ ربیعہ سوچ کر مسکرا دی۔ پیکٹ کے اندر ایک عام سا کاشن کا ٹھری پیس سوٹ تھا جس کے مدھم مدھم رنگ ربیعہ کو ٹھیک طرح سمجھ میں نہ آ سکے تھے۔

”ہائے کتنا پیارا ہے۔“ ترانہ نے محبت سے سوٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ”دیکھا ربیعہ تم نے! اسے کس طرح میری پسند کا خیال رہتا ہے۔“

”ہوں!“ ربیعہ مسکرا کر اتنا ہی کہہ سکی۔

”جانتا ہے میں کیسے رنگ پہنتی ہوں۔ روز غور سے میری ڈرننگ دیکھتا ہے۔ اتنے سالوں سے دیکھتا آ رہا ہے۔ بھلا اب بھی نہ جانے گا۔“

ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ترانہ کا چہرہ دیکھ کر جاری تھی جس پر بکھرے ہوئے رنگ سوٹ سے زیادہ واضح اور خوبصورت تھے اور چالیس واٹ کے بلب کی ملکی روشنی میں بھی بے حد صاف نظر آتے تھے۔ ترانہ کا پورا دھیان سوٹ کی جانب تھا۔ وہ بار بار اسے کھولتی، اچھی طرح سے دیکھتی۔ کبھی قیص کا پرنٹ دیکھنے لگتی تو بھی دھڑکے۔

”کتنا پیارا سوٹ ہے ناربیہ!“ اس نے ایک مرتبہ پھر بے حد اشتیاق لیے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں بابا! کیسے کہوں، پیارا ہے، اچھا ہے، خوبصورت ہے۔“ ربیعہ ہنسنے لگی تھی۔

ترانہ نے خفت سے اس کی جانب دیکھا۔

”مذاق اڑا رہی ہو؟ اڑالو۔“ پھر اچانک ہی وہ پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

”۲ ربیعہ! ایک بات بتاؤ۔ کسی لڑکے نے تجھی نہیں گفت دیا ہے؟“

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”کسی نے محبت کا اظہار کیا؟“ وہ پر شوق انداز میں پوچھ رہی تھی۔

ربیعہ کی نگاہوں کے سامنے سے یکے بعد دیگرے کتنے ہی مناظر گزر گئے۔ اس نے تنفر سے سر کو جھٹکا۔

”جیسے ترانہ! مجھے بیزاری ہے اس لفظ محبت سے۔ کراہیت آتی ہے جب کوئی مرد نگاہوں میں ہوس ناکی بھر کر عورت کو دیکھتا ہے۔ اور اس سے تعریفی جملے بولنا شروع کرتا ہے۔“

”۳ بارے ہو!“ ترانہ خفا ہو گئی تھی۔ ”کیا بکو اس کیے جارہی ہو؟ میں محبت کی بات کر رہی ہوں ربیعہ! ہوس کی نہیں۔ تم محبت کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں؟“

”پتا نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”ہر کسی کی زندگی میں ایسا کوئی جذبہ ہونا بہت ضروری ہے کیا؟“

”تو اور کیا؟“ وہ حیران ہوئی۔ ”تو تو توانائی ہے ربیعہ! تو توانائی جس کے سارے انسان اپنی عمر تمام کرتا ہے۔ توانائی کے بارے میں جانتی ہو؟ یہ شخصیں بدل لیتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی، مرنے نہیں۔ ایک رشتے سے دوسرے رشتے تک سفر کرتی ہے۔ اپنے رنگ بدل لیتی ہے لیکن ہر انسان کے اندر اس کا منبع ضرور ہوتا ہے۔ اس منبع کے بنا زندگی ناممکن، ناممکن کہ تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی؟“

”کی ہے۔ بہت زیادہ کی ہے۔ اپنی دادی جان سے۔“ وہ آزرہ ہو گئی۔

”بس! ہے نامنوع۔ نکل رہی ہے نا کہیں سے توانائی۔ ایسے ہی ایک دن اس منبع سے کرنیں پھوٹیں گی کسی اور رنگ کی کرنیں۔ لیکن پھوٹیں گی ضرور۔ بے وقوف لڑکی! انسان کے اندر محبت نہ ہو تو انسان زندہ کیسے رہے؟“

ربیعہ مسکرا دی۔

”تمہاری پھپھو کیسے جیتی ہیں؟“ وہ ازراہ تفتن بولی۔ ”تم تو کہتی ہو، انہیں محبت کے نام سے نفرت سے تو پھر اس توانائی سے جی رہی ہیں بھلا؟“

ترانہ اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نگاہوں میں اس کی نا سمجھی کے لیے تاسف تھا۔
”تم کیا سمجھتی ہو ربیعہ! پھپھو کے اندر محبت نہیں ہے؟ انہوں نے کبھی کسی کو چاہا نہیں ہے؟ انہوں نے تمہارے ابو کو چاہا تھا۔ بے حد بے حساب، لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ ربیعہ نے جیسے ایک خواب کے عالم میں پوچھا تھا۔
”لیکن ربیعہ! توانائی کو اگر صحیح طرح استعمال کرنا نہ آتا ہو تو یہ نقصان بھی پہنچاتی ہے۔ پھپھو نے محبت تو کی لیکن وہ ٹھیک طرح سے اس کا مفہوم نہ جان سکیں۔ انہیں جلتی ہوئی شعلہ ملی مگر انہوں نے اپنا دل روشن کرنے کے بجائے اس سے اپنے ماتھے جلا لیے۔“

ربیعہ کو اس کی گفتگو بے مقصد اور طویل معلوم ہونے لگی، لیکن ترانہ کسی اور ہی تصور میں کھو گئی تھی سو اس نے ربیعہ کی اکتاہٹ محسوس نہ کی۔

”ہم ہے ربیعہ! اگر عبدالباری تمہیں دیکھے اور تم سے متاثر ہو جائے تو میں کیا کروں گی؟“

ربیعہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔

”میں خوشی خوشی تمہیں اس کی دلہن بنا دوں گی۔“

”ترانہ!“

”ایک مثال دے رہی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”مجھے تو انائیوں کو ٹھیک طرح سے استعمال کرنا آتا ہے۔ پھپھو نے اپنی جلتی شمع سے اپنا دل جلا لیا۔ اپنا گھر جلا لیا۔ اپنے ہاتھ جلا لیے۔ ماموں نے تمہاری امی کو دکھا۔ سنا ہے وہ عین خاتون تھیں۔ تمہارے جیسی ہوں گی نا، ماموں نے تمہاری امی سے شادی کر لی۔ کورٹ میرج پھر وہ ایسے گھر لے آئے۔ پھپھو نے یہ خبر سنی تو انہوں نے کیڑے مار دو الٹی پی لی۔ بہت مشکلوں سے ان کی جان بچائی گئی۔ ابو نے جلد بازی میں پھپھو کی شادی اپنے ایک عزیز دوست کے بھائی سے کر دی۔ وہ اچھا آدمی تھا۔ اس نے ہمارے کو خوش رکھنے کی کوشش کی لیکن۔۔۔“

اس نے گہری سانس بھری۔

”پھپھو نے اپنی محبت کو اپنی جان کا روگ بنا لیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ پھپھو نے محبت کی کرنوں کا رنگ نفرت کے آئینے سے سیاہ کر دیا۔ بالکل سیاہ۔ ہوتا ہے ربیعہ! پھپھو میں محبت بہت زیادہ ہے۔ بہت زیادہ۔ لیکن سیاہ رنگ کی۔۔۔“

”تم عجیب باتیں کرتی ہو ترانہ۔“ ربیعہ بولی۔ ”مجھے تمہاری باتیں کبھی کبھی سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”آئینے کی سمجھ میں! اس شمع سے کرنیں پھوٹنے کی دیر ہے۔“ اس نے معنی خیزی سے سر ہلایا۔

”مجھے نیند آرہی ہے ترانہ۔“ اس نے جوابی لی۔

”ہم ہے ربیعہ! مجھے آج ساری رات نیند نہیں آئے گی۔“ ترانہ نے محبت سے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

دل بے حد بے چین ہو رہا تھا۔ نجانے کیوں۔ اسے خواہ مخواہ ہی غصہ آتا۔ کسی سے بات کرنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ حد درجہ ست اور ڈل ہو رہی تھی۔

ایسے ہی غبار بھرے دل کے ساتھ اس نے آپریٹر سے کال ملانے کے لیے کہا۔ اس کا دل عاشق کی آواز سننے کی ہلنے لگا تھا۔

”دوسری جانب جاتی ہوئی گھنٹی کی آواز سننے لگی۔ پھر کسی نے ریسیور اٹھایا تھا۔

”ہیلو۔۔۔“ ٹھنکتی ہوئی زنانہ آواز آئی تھی۔

ایقان بے یقین سی ہوئی۔ شاید غلط نمبر مل گیا تھا۔

”ہیلو۔۔۔ کیا میں عاشر سے بات کر سکتی ہوں؟“ اس نے انگریزی میں پوچھا۔
”آپ کون ہیں؟“

”میں امیں ان کی واکف ہوں۔“ وہ اب تک بے یقین تھی۔

ریسیور عاشر نے لے لیا تھا۔ اس نے شاید اس عورت سے سخت لہجے میں کوئی بات کی تھی۔ ایقان کو ٹھیک طرح سے سنائی نہ دیا۔

”ہیلو! اب عاشر لائن پر تھا۔

”عاشر! اس کا جی بھر آیا۔“ میں ایقان ہوں۔“

”ہاں جانو۔۔۔ میں نے پہچان لیا ہے کیسی ہو؟“

”وہ کون ہے تمہارا پیاس؟“ وہ مزید کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی۔

”بچے کیسے ہیں؟ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ اس نے سنی ان سنی کی۔

”میں نے پوچھا وہ کون ہے۔“ وہ جھجھلا گئی۔

”گلیا ہو گیا ہے ایقان تمہیں؟“ وہ جیسے اسے چکارتے ہوئے تھا۔ ”میری لینڈ لینڈی ہیں۔ اکثر آتی ہیں۔ وائس براہلم یار؟“ ایقان خاموش ہو کر گرے گرے سانس بھرنے لگی۔ کیا باتی اسے کہ چند محلوں میں ہی دل ناتواں پر کیا کچھ بیت چکا تھا۔ اس کی قربت میں کسی دوسری عورت کے وجود کے احساس نے اسے تیز چھری کی مانند کاٹا تھا۔ بل بھر میں نظموں کے سامنے سے کتنے ہی منظر گزر گئے تھے۔

اس کا باتیں کرنا، اس کا مسکراتا، اس کا وہ گہری نگاہوں سے دیکھنا کہ وہ سمٹ کر رہ جاتی۔ زیر لب وہ شرر مسکراہٹیں، جن کی بھوار اس کا تن من بھگودیتی۔ وہ سب کچھ ایک دوسری عورت کے قریب تھا۔ ایقان تصور سے ہی جھلس کر رہ گئی تھی۔

”ایقان۔۔۔ جانو۔۔۔ یوں نا کچھ؟“ وہ پریشان ہوا تھا۔

”عاشر! اس کی آواز ٹھیک گئی۔“ میرا دل بہت ادا اس ہو رہا تھا۔ میرا جی رونے کو چاہ رہا۔ ہے مجھے ہر وقت رونا آتا ہے عاشر۔“

وہ سچ سچ رونے لگی تھی۔ عاشر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیوں ادا اس تھی۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ بوکھلا سا گیا۔

”ایقان! انیک اٹ ایزی یار! کہاں ہو تم؟“

”میں اماں جان کی طرف ہوں۔“ اس نے سسکی بھری۔

”تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر نے رسٹ کے لیے کہا تھا اس لیے یہاں آگئی۔“ اس نے بھیگی بھیگی آواز میں بتایا۔

”بچے؟ بچے کیسے ہیں؟ ایمان کیسی ہے؟ اور مومن؟“

”سب ٹھیک ہیں۔ حیرت سے ہیں۔“

”وہ! اس نے گہری سانس بھری۔“ پھر میری جان! رو کیوں رہی ہو؟ کیا ہوا ہے گڈے؟“

ایقان یکدم چپ ہوئی تھی۔ برسوں بعد اس نے اس انداز سے پکارا تھا۔ ایقان کے لبوں پہ بل بھر میں مسکراہٹ کی جوت جل اٹھی۔ وہ بہت محبت سے برس جانے کے موڈ میں اسے یوں پکارا کرتا تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں کی یاد گار تھا یہ لقب۔

”اے گڈے! ادھر آؤ۔“ ایقان غصے میں بھی ہوتی تو ہنس پڑتی۔

اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔

”توبہ ہے یار! وہ ریلیکس ہوا۔“ تم نے تو جان ہی نکال دی تھی۔ بھلا اتنی دور سے اس انداز میں پریشان کرو گی

ہاں ہوا کیا ہوگا۔ پہلی فرصت میں ٹکٹ کٹا کر دوڑا بھاگا چلا آؤں گا۔ نوکری جائے بھاڑ میں۔
 ”ہاں تو تھیک ہے پھر۔۔۔“ وہ شانت ہو گئی۔ ”میں روزیو نہیں پریشان کروں گی تمہیں۔“
 ”بندے کا قصور؟“

”تم بندے ہو؟ ایسے ہوتے ہیں بندے؟ اتنے سالوں سے میرے حوصلوں کو یوں آزماتا ہے ہو جیسے میری فوجی
 لڑائی ہو رہی ہے۔ تم اس بندی کا قصور بتاؤ؟ دن سے کھینچ کر رات کرتی ہوں اور رات کو کھینچ کر دن۔ کب ختم
 ہوگی سزا؟ اپنے ملک میں روزگار نہیں ہے کیا؟ لوگ رستے نہیں ہیں؟ کماتے نہیں ہیں؟ جا کر بیٹھ گئے ہوا اتنی
 دن۔ کرب تنہائی سے نواز کر۔“ وہ پھر پڑی سے اترنے لگی تھی۔
 ”الکل ہے یار۔“ پورا ٹیپر چھوڑ کر آیا ہوں تمہاری خبر گیری کے لیے۔ ماں تمہارے پاس بھائی تمہارے پاس
 ہر سب کچھ تمہارے پاس۔ کرب تنہائی سے روز میں گزرتا ہوں یا تم؟“

”تمہاری خود ساختہ ہے یہ سزا۔ تمہیں شکایت کا اختیار نہیں۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ جو نام گنوار ہے ہو ان میں سے
 اولیٰ ہی تمہارا بدل نہیں ہو سکتا میرے لیے۔ تم تم ہو۔ میرے دن رات تم سے بندھے ہوئے ہیں۔ ایک تمہارا
 اٹھنا مٹنا کر میں ان تمام رشتوں سے منہ موڑ کر خوشی خوشی چل پڑی تھی اور تم کہتے ہو کہ سب لوگ ہیں تو سہی
 ہر سب پاس۔“
 ”آہ! اس نے چٹا ہوا بھرا۔“ لطف آگیا یار! ایسی پیاری پیاری باتیں اور بل بھی اپنا نہ بنے، ساسو جی کا بنے۔
 ”لوہے کی بات ہے نا۔“

”ماشر! میری جان پر نی ہے، تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“
 ”لیوں پریشان ہوتی ہو جانو! تھوڑا سا انتظار، تھوڑا سا صبر پھر سارا وقت ہمارا ہوگا سب خوشیاں ہماری ہوں
 گی۔ پریشان نہ ہوا کرو۔ تمہارے لیے اور بچوں کے لیے ہی کر رہا ہوں مناسب کچھ۔ میرے حصے میں یہ گلے شکوے
 (بعد الوفاقان!)“

اس کی آوازیں تھکن در آئی تھی۔ ایقان خاموش ہو گئی۔
 ”سوری ماشر!“ پھر وہ بولی۔ ”میں نے یونہی تمہیں پریشان کیا۔“
 ”میں سچ سچ پریشان ہو گیا تھا۔ آئندہ اس طرح روئے ہوئے فون مت کرنا ایقان۔۔۔ پلیز!“
 ”اچھا تھیک ہے۔ میں اب فون بند کرتی ہوں۔“
 ”بس ایسے ہی؟“ وہ مسکرایا۔
 ”آئی لو یو۔“ وہ جھینپ کر بولی۔
 ”لو یو تو یار۔“

ایقان نے ریسیور رکھ دیا۔
 دوسری جانب وہ گہری سوچ میں تھا۔ کارڈ لیس کا انٹیمینا دانتوں میں دبائے وہ نجانے کیا سوچ رہا تھا۔ لڑا اس کے
 لہجہ چلی آئی۔
 ”میں سوچ رہی تھی کاش میں اردو سمجھ سکتی۔“ وہ شرارت سے بولی۔
 ماشر نے چونک کر اسے دیکھا اور اس کی بات کے مفہوم پر چند لمحے غور کرنے کے بعد وہ مسکرایا تھا۔



بھری دھند تھی وہی سراب کی کیفیت۔
 راجہ ننگے پاؤں گرم ریت پر دوڑ رہی تھی۔ آگے پانی تھا۔ شفاف پانی۔ ربیعہ دوڑتی جاتی پانی آگے سرکتا جاتا۔
 بالوں کے سر جھکے ہوئے تھے، ٹیلوں میں دائرے در دائرے تھے اور صحرا میں کسی حسرت بھری سانس کی گونج
 ”پانی۔ پانی۔ پانی۔“

ربیعہ دوڑتے دوڑتے تھک گئی تھی۔ اس کے گھٹنوں میں سکت نہ رہی تھی، وہ گرنا چاہتی تھی، تھک کر رام ہو جانا چاہتی تھی۔

”تم نے زندگی میں کسی سے محبت نہیں کی ربیعہ؟“ ترانہ نے ہنس کر پوچھا۔
سوال اس کے چاروں طرف چکرانے لگا تھا۔ لفظ ہنس رہے تھے۔
”محبت نہیں کی؟ نہیں کی؟ کسی سے نہیں کی؟“

”کی ہے۔۔۔ بہت کی ہے۔۔۔“ ربیعہ نے دوڑنا جاری رکھا۔ ”میں پانی لاتی ہوں داوی جان! میں لاتی ہوں ہم ابھی لاتی ہوں۔۔۔“

”پانی۔۔۔ پانی۔۔۔ پانی۔۔۔“ حسرت بھری آہ۔

ربیعہ نے ایک جھٹکا کھایا اور ساکت ہو گئی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ چھت کو گھورتی رہی۔ پٹکھے کی گھر گھر کو بہت دیر تک سمجھنے کی کوشش کرتی ہی پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس کے برابر والی چارپائی پر ترانہ بے خبر سو رہی تھی۔ سرانے مینا کا پلنگ تھا۔ مینا کے پلنگ کے برلی طرف پر صوفے پر صولت تھی۔ ربیعہ کچھ دیر بیٹھی بے بسی سے سب کو پر سکون نیند کے مزے لوٹتا ہوا دیکھتی رہی۔ پدم وہ چونکی۔ اسے آوازیں آرہی تھیں۔ کھٹی کھٹی آوازیں جن سے مفہوم واضح نہ ہوتا تھا۔ وہ آوازیں کس کی تھیں، کون گفتگو کر رہا تھا، اسے اندازہ نہ ہوا۔ پھر اسے پچھا کا خیال آیا۔ کہیں وہ پکار تو نہیں رہے؟ انہیں کسی مدد کی ضرورت تو نہیں۔

یہ خیال آتے ہی وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھی۔ اپنا دوپٹہ سنبھال کر وہ ترانہ کی چارپائی کے قریب سے نکل پھلی گئی۔ تیز مگر محتاط قدموں سے وہ کمرے کے دروازے تک پہنچی، مگر پھر اندر سے آئی ہوئی آواز پہچان کر وہ یکایک اوٹ میں ہو گئی۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔“ ضدی لہجے میں بولتا یہ تمدن تھا۔ ”آپ کو رقم دینا پڑے گی۔“
”الو کے پٹھے۔ گدھے کی اولاد۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔ ناخلف۔۔۔ مراد۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔ تو سمجھا کیوں نہیں؟ تیرے دماغ میں اس بالائی سے زیادہ گند بھرا ہوا ہے۔ کمینہ ہے تو۔“ منور امین غصے کی شدت سے گلے جارہے تھے۔

”ہاں، ہاں کمینہ ہوں۔۔۔ ہوں میں کمینہ۔۔۔ میری زندگی تم نے تباہ کی ہے، تم نے۔“ وہ نفرت سے پھر نکارا۔
”لیکن ایک بات یاد رکھنا، جو بھی ہوں، تمہارا بیٹا ہوں۔ میں رقم نکلا کر رہوں گا۔“
”تو میری قبر کھودنا۔ میری قبر کھودنا اگر۔ اس میں سے نکلے گی رقم۔ سمجھا تو۔“
”کھودوں گا۔ قبر بھی کھودوں گا لیکن چھوٹوں گا نہیں۔“

ربیعہ کے قدم من من بھر کے ہو گئے۔ دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند کانپے جا رہا تھا۔ ہاتھ تھر تھرا رہے تھے اور سانس دھونکتی بنا ہوا تھا۔

وہ بڑی مشکلوں سے اپنی چارپائی تک پہنچی تھی۔ رات کے تین بجے ہونے والی اس گفتگو کے پس منظر سے ناواقف تھی، لیکن فریقین کے تئو اور انداز اسے ہراساں کر گئے تھے۔ وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ تمدن اسے شروع دن سے پراسرار معلوم ہوتا تھا۔ وہ کسی بد روح کی مانند لگتا تھا جو انسانی جسم میں حلول کر گئی ہو۔ اس وقت بھی اپنے باپ سے اس کا طرز تخاطب نہایت جارحانہ تھا۔ ربیعہ بستر پر کھیس اوٹھ کر لیٹ گئی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور رگ و پے میں ٹھنڈ سرایت کر رہی تھی۔ وہ اپنا خواب بھول بھال کر اب اس واقعے پر غور کرنے لگی تھی۔

پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے وہ بار بار پانی مانگ رہے تھے۔

ربیعہ آج انہیں پانی پلا پلا کر رنج ہو گئی تھی۔ اسی حساب سے اسے بار بار وہ گندی بالٹی ٹواٹلٹ میں لے جا کر خالی

تھی۔ وہ ان سے پوچھنا چاہتی تھی کہ آخر انہیں کس کی بددعا ہے؟ یہ پیاس کس گناہ کا خمیازہ ہے لیکن وہاں تک خطرے سے خالی نہ تھا۔ سوچنے سے ماتھے پر بل پڑ سکتے تھے اور ماتھے کے بل انہیں فوراً دکھائی دیتے تھے۔

”تم خاموش خاموش کیوں ہو؟“ وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولے۔
”اے! کئی کچھ نہیں۔“

”اے! کچھ نہیں۔ تمہیں اپنی بوڑھی وادی یاد آ رہی ہے شاید۔ کیوں؟“
وہ نے خاموش رہنے میں ہی غافیت جانی۔

”والی بھگوڑی ماں۔ ہا ہا ہا۔ ہیں؟ کیوں؟“

وہ نے چونک کر ان کی صورت دیکھی جس پر طنز کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ بے یقینی سے کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ یہ انہوں نے کیا کہا ہے۔

”کیا کہا آپ نے؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔ ”میری امی کے متعلق؟“

”اے! ہا ہا ہا۔ امی۔ بہت گودوں میں کھیلی ہوتا تم اس کی۔ امی جان کہو اس کو۔“

وہ کی آنکھیں اچانک، پیانیوں سے لبالب بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ تیزی سے چلتے ہوئے دروازے پر چلی آئی اور سنک میں جھک گئی۔ اس کے اندر درد کی ٹہسی اٹھنے لگیں۔ اس نے تل کھول دیا۔

والی اسکیل کے سنک میں گر کر شور مچانے لگا۔ ربیعہ کے اندر آنسو شور مچا رہے تھے۔ سسکیاں چل رہی تھیں۔ دیر سنک کے پاس کھڑی رہی۔ باہر صحن میں مینا کے چلنے پھرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کسی کام سے

اس میں گئی تھیں اور اب واپس آچکی تھیں۔

وہ نے بےوجہ ہی چولہا جلا لیا۔

”کہا لر رہی ہو؟“ انہوں نے اندر جھانکا۔

”جانتے بنائ رہی ہوں۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے!“ وہ بھرائی ہوئی آوازیں بولی۔

”چھا۔ ایک کپ سے زیادہ نہ بنے، پتی بہت مشکلی ہے۔ بار بار چائے کا شوق کوئی اچھی لت نہیں۔“ وہ چپل چلتے ہوئے باہر چلی گئیں۔

وہ کے اندر سیاہ رنگ کی محبت ہے۔ اسے ترانہ کے الفاظ یاد آئے تھے۔

اب دھمی مسکراہٹ اس کے لبوں پر سج گئی۔ اب وہ ترانہ سے کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی۔ یہ کہ ترانہ کے باپ کا نام کس رنگ کی نفرت ہے؟ ربیعہ کے ذہن میں گہرا سبز رنگ آیا تھا۔



اسے لم زندگی کچھ تو دے مشورہ

میں کہاں جاؤں ہوتا نہیں فیصلہ۔

اک طرف اس کا کھر، اک طرف میکہ

دل کی آواز ساز کی جھنکار کے ساتھ گونج رہی تھی۔ عیشہ کچھ دیر سنتی رہی۔

”ہر وقت غریب کیوں سنتے رہتے ہو، اس کو اس رو۔“ وہ کچھ جھنجھلا کر بولی۔

”کہیں پسند نہیں؟ مجھے تو بہت پسند ہیں۔ مجھے یہ آج کل کے بے سُرے باپ سنگرز ایک آنکھ نہیں بھاتے“

”ایب قسم کی تنک بندی۔ کم از کم اسے شاعری تو ہرگز نہیں کہا جاسکتا۔ شاعروں کی ارواح دوبارہ اجتماعی خود

لے لیں اگر آپ سنگرز کو سن لیں تو۔“

”اے! اس کی بات، ہر بے حد ہنسی آئی تھی۔

اجماع اور اجتماعی خود کشی؟“

”بار! ارواح کے احتجاج کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہو گا ہی۔“
 ”مجھے تو سب سنگرز پسند ہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔ ”جو بھی نئی کیسٹ آئے میں شوق سے خریدتی ہوں۔“
 ”ارے۔۔۔ بے حد بد ذوق ہو۔“
 ”تب ہی تو تم سے باتیں کرنے لگی ہوں۔“ وہ برہنہ بولی۔
 ”صرف باتوں سے کام نہیں چلے گا جناب۔ بد ذوقی کا پورا پورا ثبوت دینا پڑے گا۔“ وہ مزے سے بولا۔
 ”یعنی؟“

”یعنی شادی بھی کرنا پڑے گی مجھ سے۔“
 ”عیشہ بے ساختہ شرعاً لگی۔“ یہ تم ایک ٹریک کیوں بدل لیتے ہو؟ شادی وادی کی باتیں مت کیا کرو۔“
 ”کیوں؟ شادی بھی نہ کروں تم سے؟“
 ”فرازیلینے۔۔۔“

”میں سیریس ہوں عیشہ! لو ان فرسٹ سائٹ کا شکار ہوا ہوں۔ تم مجھے اسی دن بہت اچھی لگی تھیں۔ تمہارا انداز بالکل مختلف ہے۔“
 ”اس دن تو ہم تین تھیں۔“ وہ شرارت سے بولی۔ ”تم نے کیسے جان لیا کہ میں وہی ہوں؟“
 ”تمہاری آواز سے۔“ غلطی کی گنجائش ہی نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا ”اور پھر اتنے دنوں سے ہم ہالیم کر رہے ہیں ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔“
 ”عیشہ پھر ہنس دی تھی۔ اچانک ہی وہ چونکی۔ جیسے کے دروازے سے باہر کھڑی شفیقہ حیات اور عذرا بیگم دکھا رہی تھیں۔“

”اچھا سنو، کل بات کریں گے۔“ اس نے جلدی سے ریسور رکھ دیا۔
 ”پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔
 ”السلام علیکم واری جان۔۔۔ چچی جان۔“ اس نے جھلتے ہوئے سلام کیا تھا۔
 ”وعلیکم السلام۔۔۔ جیتی رہو۔“ دونوں اسے دیکھ کر کھل سی گئیں۔
 ”ہاں کیا کر رہی ہیں تمہاری؟“
 وہ صوفوں تک آ گئیں۔

”امی شاید اوپر ہیں میں بلاتی ہوں۔“ وہ مڑنے لگی۔
 ”اچھا سنو۔۔۔ روکدرا۔“ شفیقہ حیات نے اسے پکارا۔
 ”بہ انگو بھی پن کر دیکھو یہی تاپ ہے نا تمہارا؟“
 ”انگو ٹھی؟“ اس نے دلچسپی سے ان کے ہاتھ میں دبی مٹیلی ڈبیا کو دیکھا۔
 ”ہاں۔ اور ذرا ڈیزائن بھی دیکھ لو۔ ہے تو پرانا مگر بے حد خوبصورت ہے۔“
 ”واؤ۔ کس قدر خوبصورت اور یونیک قسم کا ڈیزائن ہے۔ اینٹھیک لگتا ہے۔ کس کی انگو ٹھی ہے؟“
 ”جان؟“ وہ بہت متاثر ہوئی تھی۔

”میری مٹنی کی ہے۔“ شفیقہ حیات ہنس دیں۔ ”برسوں سے سینت سنبھال کر رکھی ہوئی ہے ایسے ہی کم موقع کے لیے۔ اب میری پوتی پننے گی۔“
 ”کون سی پوتی وادی جان۔“ وہ شوخی سے ہنسی۔ ”میں بھی تو پوتی ہوں آپ کی یہ نظر کرم مجھ پر کیوں نہیں؟“
 ”اے ہاں تو کیا تمہارے فرشتوں کی بات ہے۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”تمہاری مٹنی کا سامان ہی کس کا۔ عذرا تو بتی انگو ٹھی کا کہہ رہی تھیں مگر میں نے کہا۔ اتنی اچھی اور قیمتی چیز گھر میں موجود ہے تو الگ سے کا پیسہ خرچ کرنا۔ وہی کسی اور مصرف میں آئے گا۔“
 ”عیشہ تم مسمی ہو کر سن رہی تھی۔ ان کی باتیں اس کے سر کے اذیر سے گزر رہی تھیں۔“

”ام نے سوچا، تمہاری رائے بھی معلوم کر لی جائے۔ آخر بچپن کے بھی سو شوق ہوتے ہیں، لیکن تمہیں تو ہم لانا پسند آئی۔“ وہ ہمیں۔ ”اب تم اپنے جوڑے اور جوتی کانپ دو ہمیں۔ ثانیہ سدرہ دوڑی آتی تھیں کہ میں اپنی بھابھی کانپ۔ انہیں ڈانٹ کر بٹھایا کہ رونی ہانڈی کرو گھر میں۔ ہمیں سو قسم کی باتیں اور بھی پتا تھیں۔“

انہوں نے متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”اگر تمہاری کس کو نے میں کھسی ہے؟“ تب ہی فردوس بیگم اسٹور سے برآمد ہوئی تھیں۔ عریشہ اپنا بے رحم مٹھتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ وہ مں ہو کر وہ بستر گر گئی۔ اس کے کانوں میں کسی کی شوخ ہنسی گونج رہی تھی۔ بے اختیار پلکوں پر ایک قطرہ لگا تھا۔



بھی میں سوچتا ہوں، اک سہانی صبح ایسی ہو

لہ اب میں نیند سے جاگوں

دل بھر کو

مٹی آنکھوں کے آگے نور کی دیوار بن جائے

لہم رکھوں زمین پر تو کوئی مجھ کو ملتا ہو

مٹی ہستی کے چاروں اور اک گلزار بن جائے

وہ مر مرکار کے جگنو مرے دامن سے لپٹے ہوں

لی کی مسکراہٹ ہی مری رفتار بن جائے

صبح کے نور سے روشن نگاہیں مجھ سے گھبراہٹیں

ظہران سے ملے تو دفعہاً ”شیرا کے جھک جائیں

گلاب سے تو میں لہراتے آئیں میں سمٹ جاؤں

میں اس کے سر میں پیکر کی خوشبو سے لپٹ جاؤں

میں ان کیوں میں دباؤ وہ تادیر صبحے پرا بھری ہوئی تحریر کو دکھاتا رہا۔

سب کچھ اس کے قلم سے سرزد ہوا تھا، اسے یقین نہ آ رہا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ کھڑکی میں جا کر کھڑا

ہوا۔ ہا ہر کاموس نہایت دلفریب تھا۔ آسمان سیاہ گھٹاؤں سے ڈھیک گیا تھا اور ہوا مستی بھری خنکی سے لبریز تھی۔

لی لڑکی سے کاسنی پھولوں والی نیل کمرے میں گھستا چاہتی تھی۔ نیل کی حرکت سے کاسنی بھی پانی کا ایک آدھ

لہا اس کے چہرے یا ہاتھوں سے ٹکرا جاتا۔ وہ سوچتا رہا۔ اس نے وہ سب کچھ کیوں لکھا۔

”دار رافع! تو محبت کیوں نہیں کرتا۔“ اس کے کانوں میں ہاشم کا جملہ گونجا۔

”بند کیا جانے اور ک کا مزہ۔“

تب وہ ہنس دیا تھا۔ لیکن ہاشم نے اس جیلے نے ایک عجیب سی بے کلی کو جنم دیا تھا۔ اس کے اندر اس کے پردہ

ال ستاروں سے بھرا آئینہ لہا لیا تھا۔ اور آج موسم کی دلفریبی نے وہ آئینہ اس کے پورے وجود پر ڈھک دیا۔ وہ

لہا سا ہو گیا۔ سادے کاغذ پر قلم کی سیاہی نقش و نگار بناتی چلی گئی۔ اور اب وہ بار بار اس تحریر کو پڑھتا تھا اور

دہلاتا۔ یہ سب کیا ہے۔

اس نے اس صبحے کو دیکھا، دونوں ہاتھوں میں تھا اور پھاڑا لٹا چلا۔ ان خرافات کا وہ قائل نہ تھا۔ باہر بارش کی

لہا ہم میں تیزی آگئی تھی۔ کاسنی پھولوں والی نیل نے بہت سا پانی پھوار کی صورت میں اندر بھیج دیا۔ رافع نے

لی سے وہ صفحہ فائل میں رکھ دیا اور پھر کھڑکی بند کرنے لگا۔ آسمان پر سیاہیاں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ ہواؤں کا

دھندلکا تھا۔ رافع کھڑکی بند نہ کر سکا۔ پانی اسے بھگور رہا تھا۔ اس کی قمیص کے کھلے ہوئے ٹخن سے بہت سا پانی



اس کے سینے کو بھگو گیا۔ اس کے ماتھے پر بکھرے ہوئے بال بھیگ گئے۔ وہ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پر جما ہو گیا۔ اس نے اچھی طرح بھیگ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

روپو کر اس کی حالت غیر ہو چلی تھی۔ آنکھیں سوج کر تقریباً ”بند ہی ہو گئی تھیں۔ وہ بمشکل بھاری پہلو اٹھاتی تھی۔ فردوس بیگم بھی پریشان ہو گئی تھیں۔ ان سے اور کچھ نہ بن پڑا تو ماہین کو بلوا بھیجا۔ وہ بھی خبر نہ دوڑی بھاگی آئی اور اب ماں پر پر ہم ہو رہی تھی۔

”آپ نے بھی سترھویں صدی کی ماؤں کو مات کر دیا امی جی! ہم از کم اس غریب کے کان میں بات تو ڈال ہوتی۔ اسے خبر تو ہوتی کچھ۔ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ان باتوں کو بہت قیل کرتی ہیں۔“

”اے ہاں، قیل ہی چایا ہوا ہے تب سے۔“ وہ جل کر بولیں۔ ”جا کر کہہ دیں باوا کو جنہوں نے رشتہ پکا کا خوشی خوشی یا پھر دادی کی گردن پکڑیں جو ایسا خیال جی میں لائیں۔ ہم بے قصوروں کو کس بات کی سزا دے ہے۔“

عریشہ پانگ پر دونوں ٹانگیں سیٹھ بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی ٹشو کا ڈبہ رکھا ہوا تھا جس میں سے ٹشو نکال نکال دقتاً ”نوٹاً“ آنکھیں اور ناک صاف کر رہی تھی۔ ماں کی بات سن کر اس نے شکایت بھری نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔ وہ بھی تاسف سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

”بس کہہ دیا ہے میں نے۔“ وہ ضد سے بولی۔ ”مجھے نہیں کرنی ہے متکئی ونگئی۔ بے شک ساری زندگی شادی نہ کرں لیکن نافع سے شادی نہیں کروں گی میں، میں نے بھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا۔ میں اسے اس طور پر قبول نہیں کر سکتی۔“

”اچھا تو بتاؤ ہمیں، کسے دیکھتی ہو ان نظروں سے تم؟ ہم اسی سے نکاح پڑھواؤں تمہارا؟۔“ وہ بے حد دل خفگی سے گویا ہوئیں۔ ”باوا کو بڑا مان ہے بیٹی پر اور ہم بھی دھڑکے سے کہہ چکے کہ ہماری بیٹیاں ماں باپ فیصلوں کے آگے سر نہیں اٹھائیں۔ اب ہم بھی شرمساری سے سر جھکا میں گے جب دوسرے طنز بھری سے ہمیں چھدیں گے تو غضب ہو گیا غضب۔ قرب قیامت۔ بیٹا ہے تو وہ بغاوت کا جھنڈا لہرا رہا ہے۔“

”سے دو ہاتھ آگے۔“ ماہین! میں کہہ دیتی ہوں مجھے زہر لادو تو میں چھکارا پاؤں ان سب جھیلیوں سے۔ اسی انہیں بال بوس کر اس قابل کیا کہ یہ ہمیں زہر کھانے پر مجبور کریں۔ ارے لڑکی! میں کہتی ہوں آخر کیا خیال نافع میں؟ خوبصورت ہے جوان ہے، ذہین، باادب بچہ ہے۔ اور تمہاری نظروں میں نہیں سارا۔ تم خود کو کون پرستان کی پری جانتی ہو۔ اور مجھے بتاؤ کہاں ٹانگا جوڑے بیٹھی ہو؟ صاف صاف کہو۔“

”امی۔“ ماہین نے تینبھی نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

عریشہ دھواں دھار روٹنے لگی تھی۔

”اے ہاں۔ تو کیا سمجھو؟ تم ہی کہو؟“ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ”میں چلتی ہوں، تم پوچھ کر بتاؤ ہمیں کیا ہے۔ اور اسے اپنے سرال کے فٹے بھی سناؤ دو چار ذرا آنکھیں کھلیں بی بی کی۔“

وہ اپنا وجود سنبھالتی بکتی بھکتی باہر نکل گئیں۔

ماہین اپنی جگہ سے اٹھ کر عریشہ کے پاس چلی آئی تو وہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

”پاپا! بس مجھے نہیں کرنا متکئی۔ آپ کہہ دیں بابا سے۔“

”اچھا کہہ دیتی ہوں تم جی برامت کرو۔“ اس نے پیار سے اس کا سر سہلایا۔ ”لیکن پتا بھی تو چلے آخر ہمارا

عریشہ نے چند لمحوں کے لیے سوچا۔ ابھی کسی سے کچھ کہنا قبل از وقت تھا۔ ابھی تو وہ خلا میں کھڑی تھی اپنی خوش گمانیوں کے پروں کے سہارے اور خوش گمانیوں کے پر تو موم سے بنے ہوتے ہیں۔ حقیقت کی ڈرا سیچش ان میں جا بجا سوراخ کر ڈالتی ہے۔ خواہشوں کا موم پکھل پکھل کر دل پر گرتا ہے۔ اور آبلے ڈال دیتا ہے۔“

”بولو عریشہ! ماہین نے اسے کرید۔“

میں اپنا۔ مجھے نافع اس لحاظ سے پسند نہیں ہے۔“ وہ منمنائی۔ ”وہ میرا آئیڈیل نہیں۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہوں گی۔“

”بہت دن سے دیکھ رہی ہوں، تمہارے من کا موسم ابر آلود ہے۔“ ترانہ نے اسے چھیڑا تھا۔ ”بات کیا کر رہی ہے؟“

”دن ہو گئے ہیں یہاں آتے ہوئے۔“ وہ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ”تمہارا وہ منہ بولا بھائی بھی پھر دکھائی نہ

آئے۔“ نے بھی اداسی سے گردن جھکا دی۔ ترانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ کچھ دن سے وہ لوگ تقریباً ”روزانہ ہی وہاں“

”نہیں بولی۔ بہنوں سے بہت جلدی دل بھر جاتا ہے ان لڑکوں کا۔“ ترانہ شرارت سے بولی۔ ”تم کسی خوش فہمی

”میں رہنا۔ ویسے سچ بتاؤ، کیا اس کی وجہ سے اداس ہو؟“

”نہیں ترانہ۔“ زندگی کا کوئی مقصد بھائی نہیں دیتا۔ تم پلیز میرا ایڈیشن کروادو کسی پرائیویٹ ادارے میں،

”ادب پڑھ کر سوچتی رہی پھر بولی۔“

”وہ یہ۔“ ”پچھو نہیں پڑھنے نہ دیں گی۔ وہ تم سے نوکری کروانا چاہتی ہیں۔ کچھ دنوں سے وہ روز مجھے

”ہانے سے قبل یاد دہانی کرواتی ہیں کہ میں تمہارے لیے بھی اچھی سی نوکری ڈھونڈوں۔“ ربیعہ خاموش

”وہ ٹھیک سی سوچتی ہیں۔“ میں تم لوگوں پر ان چاہا بوجھ ہوں۔“

”کہو۔ پچھو بہت مطمئن ہیں تمہارے آجانے سے۔ بھلا ان کا کیا نقصان ہے اس میں۔ دن بھر میں دو

”کامیابی ہو اور بن کے سارا دن کام میں لگی رہتی ہو۔ ابو کی ساری ذمہ داری تم نے سنبھال لی ہے جو ہمارے

”سب سے مشکل ترین کام تھا۔ کوئی بھی اس کام کو اپنے سر لینے پر راضی نہ تھا۔ پچھو مارے باندھے یہ ذمہ داری پوری

”میں۔ اب وہ ہر قسم کی فکروں سے آزاد دن بھر محلے میں پھرتی ہیں۔ ورنہ تو وہ گھر سے نکل نہ پاتی تھیں۔

”اگلے دن جب میں اور صولت گھر رہتے تھے وہ اپنا یہ شوق پورا کرتی تھیں۔ وہ تمہارے آجانے سے خوش

”تھیں۔ تمہاری ذات سے دہرا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ تم نوکری بھی کرو ماکہ وہ مفت کی ملازمہ

”ہو۔ تم بھی حاصل کریں۔ تمہاری پڑھائی سے تو انہیں کچھ حاصل نہ ہو گا۔“

”سوچ میں پڑ گئی۔ ترانہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مینا سے ایسی خود غرض سوچ کے سوا کچھ امید نہ تھی۔

”ترانہ۔“ ”وہ بولی۔“ ”میں ہر ماہ انہیں کچھ رقم بھجواؤں گی۔ لیکن میں باہر نوکری کے لیے نہیں پڑھنے کے

”کاموں کی۔“

”مطلب؟“ ترانہ نے اسے گھورا۔ ”پھر نوٹ کیا کسی جادوئی درخت سے تو ذکر لایا کرو گی یا پھر تمہیں پڑھائی

”کا وظیفہ ملا کرے گا؟“

”میرے پاس کچھ رقم ہے۔“ ”دادی کی وفات کے بعد ان کے بینک اکاؤنٹ سے مجھے اچھی خاصی رقم ملی تھی۔

”اگلے سے قبل میں وہ پیسے نکالوا لاتی تھی۔ تقریباً ”پچاس ہزار روپے ہیں۔“ ترانہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”تم نے۔ تم نے وہ پیسے کہاں رکھے ہیں؟ ربیعہ! انہیں حفاظت سے رکھنا ورنہ تم ان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔“

”کاچھو سفید پڑ گیا۔

”لیکن ترانہ میرے پاس زیور بھی ہے، میری امی کا زیور۔ وہ بھی اچھی خاصی مالیت کا ہو گا۔ میں نے سب چیزیں

”مٹ کيس میں رکھی ہوئی ہیں۔“

”مٹ کيس کولاک رکھتی ہو؟“ ترانہ بے کل ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے۔ دیکھو ربیعہ! میں تمہیں ڈرانا نہیں چاہتی لیکن ہمارا گھر اس معاملے میں کچھ زیادہ صاف ہے۔ پیسے تو یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے انہیں راتوں رات برنگ گئے ہوں اور خفیہ چور کا بھی علم نہیں تم اپنا سب سامان حفاظت سے رکھو۔ میں جلد از جلد تمہارا بینک اکاؤنٹ کھلوادیتی ہوں تمہیں اپنی رقم رکھنی چاہیے۔“

”ہوں۔“ ربیعہ نے کھوئے کھوئے انداز میں سر ہلایا۔

”اوس۔ اوس۔ پچھو کو اپنی رقم دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ قدرے شرمساری سے بولی۔ ”ہمارے لیے کرتی ہو۔ وہی بہت ہے مجھے پچھو سے لڑنا بھی پڑ جائے تو میں تمہارا ایڈمیشن کروادوں گی۔“



”میڈم۔ آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔“

وہ ایک مرلیفر، کی کیس، ہسٹری بغور دیکھ رہی تھی جب چراسی نے آکر بتایا۔ شملانے کیس، ہسٹری اسٹال کو تھمائی اور نگاہوں میں الجھن لیے باہر کی سمت چل پڑی۔

ہاسپٹل کے لمبے کوریڈور میں چلتے ہوئے وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس سے ملنے کی ضرورت کس کو اور وہ بھی ہاسپٹل میں۔

اپنے کمرے کے دروازے پر وہ رک گئی تھی۔ آنے والا دروازے کی جانب پشت کے کھڑا تھا۔ شملادہ پر ہی کھڑی اس کی پشت دیکھتی رہی۔ اس کی پشیل ہیل کی ٹنگ ٹنگ پورے کوریڈور میں گونجی تھی سو یہ حکم کہ وہ اس کی آمد سے بے خبر ہوتا۔

”ایکس کیوزی!“ وہ اندر چلی آئی۔ ”آپ۔“

وہ آہستگی سے مڑا۔ شملہ پتھر کی ہو گئی۔ میون پلین شرٹ اور فان کلر کی جینز میں وہ ابرار جیلائی تھا۔ آنکھیں آہستگی سے پھیلیں پھر ان میں پانی بھرنے لگا۔ اس کے گلے میں نمکین قطرے گرنے لگے۔ وہ ٹنگ اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ کی نمی اور چہرے پر شرمساری تھی۔ شملہ چند قدم آگے ہوا اس کے مقابل جا کھڑی ہوئی۔ ابرار کی نظریں اس کے وجود پر پھیلیں۔

فیوزی پلین ساڑھی اور سفید اوور آل پہنے، گلے میں اسٹیتھو اسکوپ لٹکائے، بالوں کا ساوا سا جوڑا آج سے پانچ برس پہلے کی شملہ سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

”بہت بدل گئی ہو۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کیوں آئے ہو؟“ اس کے لبوں سے سرگوشی کے سے انداز میں نکلا تھا۔

ابرار کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ انگلی سے میز کی سطح پر لکیریں بنانے لگا۔

”جاؤ یہاں سے ابرا۔۔۔ پلیز۔“ شملانے منہ دوسری طرف پھیر کر کہا۔

”شملہ! میں میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں بس ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا تمہیں۔۔۔ عمر تمہاری باتیں مجھ سے، صرف تمہاری ہی باتیں کرتا ہے۔ اس کی باتوں نے میرے من میں خلش کی چنگاری کو الاؤ دیا ہے۔ میں میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے شملہ۔!“

شملہ کی آنکھ سے آنسو کا قطرہ گر کر اس کے اوور آل میں جذب ہو گیا۔

”اب سب کچھ بعید از وقت اور بعید از اختیار ہے ابرار! میرا مذاق مت بناؤ دنیا کے سامنے اب انہا بھی گنجائش نہیں رہی زندگی میں۔ جاؤ یہاں سے اور بھی دوبارہ مت آنا۔ پلیز۔“

ابرار نے ایک نگاہ میں اس کے سیاہ بالوں کو، اس کی ٹیکلی آنکھوں کو اور شدت غم سے سرخ پڑنے والے دیکھا۔

”ٹھیک ہی کہتی ہو تم۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دو اجنبی ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں لیکن

لہا رہے نہ اجڑی۔ چلتا ہوں۔“

اس کے قریب سے ہو کر نکل گیا تھا۔ شہلا کو بڑے زور کا چکر آیا تھا۔ وہ سر تھام کر میز پر جھک گئی۔ ضبط کے منہ لگے تھے۔
”ایہ کمائی ایسے ختم نہیں ہو سکتی۔ آپ کو اسے ایک فیل اسٹاپ دینا ہو گا۔“ انہی پریشانی سے کہنے لگی۔
شہلا دونوں ہاتھ گود میں رکھے بالکل بے بسی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس کے ذہن نے کام کرنے سے انکار کیا تھا۔ اس نے بہن کے سامنے اپنا جی ملکا کرنے کا سوچا تھا۔ اس نے اپنی سب پریشانی اس کے سامنے رکھ دی تھی اور اب خالی دماغ لیے بت بنی بیٹھی تھی۔

”اسی تو اس نے ابتدا کی ہے اور آپ جانتی ہیں وہ دل مارنے کا عادی نہیں ہے۔ جو من میں آئے کر گزرتا ہے۔ اس کے من میں کچھ اور ہی سودا سایا ہوا لگتا ہے۔“
”میں یہاں سے چلے جانا چاہتی ہوں انہی ہوں! وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”میں کسی اور شہر جانا چاہتی ہوں۔ اپنے لے کر میں ہر شہر کی دسترس سے نکل جانا چاہتی ہوں۔ بس یہی ہے میرے بس میں۔ عمر نہ ہوتا شاید میں یہ کی تمنا کرتی۔ لیکن میرا بیٹا میری زندگی ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں چاہتی میں۔“
”اپا۔۔۔“ انہی نے اسے غور سے دیکھا۔ ”اپا! ایک بات کہوں آپ سے؟“ شہلا چپ چاپ بے بس رہی اسے دیکھتی رہی۔

”آپ۔۔۔ ہاشم بھائی سے شادی کر لیں۔“
”شہلا جھلا گئی تھی۔ ”کوئی ڈھنگ کی بات ہے تو کرو۔“
”اپا! آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے وہ ایک مخلص انسان ہے۔ اس کا ہاتھ تھام کر زندگی کی ہر الجھن کو سلجھالیں۔
”میں کی کوئی پرچھائیں کالی لمبی کی طرح آپ کا رستہ نہیں کاٹے گی۔ ایک چچی سیدھی راہ پر چل پڑیں اپا۔ یہی اصل کا حل ہے۔“
”میں انہی۔۔۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میری زندگی میں اب کسی مرد کے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں سب ہٹا کر جانا چاہتی ہوں۔ میں عمر کے ساتھ لاہور چلی جاؤں گی۔ میں کبھی پلٹ کر یہاں نہیں آؤں گی۔ میں عمر بھر ساتھ یہاں سے دور بہت دور چلی جاؤں گی۔ ضرورت پڑی تو یہ ملک بھی پھوڑوں گی۔“
”حل ہے آپ کے مسائل کا؟“ انہی نے خفگی سے اسے دیکھا۔
”ہاں۔۔۔ وہ بڑبڑائی۔ ”یقیناً۔۔۔“

رہہ چونک اٹھی۔ باورچی خانے کی کھڑکی میں قصور کھڑا تھا۔
”ہاں ہاں کب سے وہاں کھڑا تھا۔ اپنے کام میں مگن رہیہ نے بے خیالی میں ہی نگاہیں ادھر اٹھائی تھیں۔
”قصور رہائی۔۔۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔ ”وہاں کیوں کھڑے ہوئے ہیں آپ!“
”مسٹر انے لگا۔ اس کی نظروں میں پیغام تھا۔ رہیہ کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ اس کے ابو تو ن گئے۔ وہ چولے پانے سے ہٹ کر کھڑکی میں چلی آئی۔
”قصور رہائی۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔
”ہاں۔۔۔“ وہ لگاوٹ سے بولا۔
”آپ کو کچھ کام ہے یہاں؟“
”کام؟ نہیں تو۔۔۔“ وہ مسکرایا۔
”رہیہ نے کھڑکی زور سے بند کر دی۔ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ پھر سے چولے کے پاس آئی لیکن اسے یاد نہ آئی۔
”رہیہ۔۔۔“ دروازے سے آواز آئی۔

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اب دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے بولوں سے سطر اہت گویا گوند سے چپکی ہوئی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو اب معدوم ہوئی ہی نہیں تھی۔

ربیعہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔

”آپ کچھ کہتے کیوں نہیں۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”کیا کام ہے آپ کو یہاں۔۔۔“

”مجھے چائے بنا دو۔۔۔“ وہ کچھ جھینپ گیا۔

”اچھا، بنا دیتی ہوں۔“ اس کے امرو ہنوز تھے۔ ”لیکن کیا آپ چائے بننے تک یہیں کھڑے رہا

گے؟“

وہ شرمندہ سا وہاں سے ہٹ گیا۔ ربیعہ نے ہانڈی کے نیچے آج کم کر دی اور چائے کا پانی دو سرے چولے پر دیا۔ اس کا ذہن بٹ گیا تھا ورنہ وہ بے حد لگن سے سالن بنا رہی تھی۔ سوچوں میں گم رہتے ہوئے اس نے چائے بنائی تھی۔

”تصور بھائی!“ کچن سے نکل کر اس نے آواز لگائی تھی۔ ”چائے لے لیں۔“

جواب نہ دارو تھا۔ ربیعہ نے یکے بعد دیگرے تینوں کمریوں میں جھانکا۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ چائے کی پیالی ہاتھ تھامے ہوئے وہ حیران پریشان سی برآمدے میں کھڑی ہوئی تھی۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ یقیناً چھت پر چلا گیا ہو گا۔ نجانے کیوں وہ گھر کے افراد سے چھپتا پھرتا تھا۔ وہ پیالی صحن میں نکلی۔

”تصور بھائی۔۔۔“ اس نے پھر آواز لگائی۔ ”یہ چائے لے جائیں۔“

مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ربیعہ کاجی چاہا، چائے کسی کیاری میں گرا دے اور جا کر اپنا سالن پکانے لگے۔ پھر ملہ کر کے وہ سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

وہ اپنی پتنگوں کے پاس بیٹھا تھا۔ ان میں سوراخ کر کے دھاگا پرو رہا تھا۔

”یہ بیچنے اپنی چائے۔“ ربیعہ نے چائے اس کے قریب رکھ دی۔

”سنو ربی۔۔۔“ اس نے آواز دی تھی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ مڑ کر دیکھنے لگی۔

”آؤ، تمہیں پتنگ اڑانا سکھاؤں۔“

”شکریہ۔۔۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔ ”میں نے آپ کو بتایا تھا نا مجھے شوق نہیں ہے۔“

”ربیعہ۔۔۔ ربیعہ بات تو سنو۔“ وہ پتنگ چھوڑ کر اس کے قریب آگیا۔ ”تم مجھ سے ناراض سی کیوں رہتی ہو؟“

ربیعہ نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔

”نہیں تو، میں تو آپ سے ناراض نہیں رہتی۔“ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

”اچھا تو کچھ دیر بیٹھو یہاں، میرے پاس۔“

”تصور بھائی! تازہ اور صولت آئی ہوں گی۔ مجھے کھانا پکانا ہے۔ چولے پر سالن رکھا ہے، جل جائے گا۔“

رسانیت سے کہتے ہوئے مڑی۔

”سنو۔۔۔ سنو ربی۔۔۔“ وہ پھر آگے بڑھ آیا۔

ربیعہ نے گہری سانس بھر کر اسے دیکھا۔

”تصور بھائی! مسئلہ کیا ہے آپ کے ساتھ؟“

اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ تصور ڈر گیا۔

”نہیں تو۔۔۔“ وہ بولا۔ ”مسئلہ تو کوئی نہیں، میں پوچھ رہا تھا تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ کپڑے، کھانا

پیش وغیرہ۔ لڑکیوں کا جو سامان ہوتا ہے۔ مجھے لست بنا دینا، میں لا دوں گا۔“

ربیعہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”اللہ سامان چاہیے تھا تصور بھائی! میں نے ترانہ سے سب کچھ منگو لیا ہے۔ آپ کے پوچھنے کا شکریہ۔“
”اچھا ٹھیک ہے۔ چائے کے لیے شکریہ ربیعہ!“

”بات نہیں۔“
”مر کی نہیں تھی۔ میڑھیاں اترتے ہوئے اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ خاموشی سے بیٹھا چائے کے اندر رہا تھا۔
”کے ذہن میں رہی پڑ گئی تھی۔“



”طش کے عالم میں وہ ان کے قریب آکر بیٹھی تھیں۔
”دل من سونے کے ارادے سے چشمہ اتاری رہے تھے۔ مگر ان کے تیر بھانپ کر وہ رک گئے۔ بغور انہوں نے بھاری بھر کم بیگم کے بگڑے بگڑے انداز دیکھے اور گہری سانس بھری۔
”اس کے پاس سے آ رہی ہوں۔“ انہوں نے اپنی طرف سے بے حد دلچسپی سے باندھا تھا۔
”ہاں، جس کے پاس چلے جاؤ اس کی اپنی ہی کہانی ہے۔ آدمی کس کس کو پورا پڑے۔ اے ہاں اپنی تو عمر بیت سب کی ملو پتو کرتے کرتے۔“

”میں نے کیا کہہ دیا بھی؟“ وہ سونا چاہتے تھے اور کسی قسم کی بد مزگی کی داستان سننے کے قطعاً ”موڈ میں نہ تھے۔
”اگرانی سے پوچھو جنہیں ہری ہری سوچ رہی ہے۔ نئے سے نئے شوٹے نکل رہے ہیں اس گھر میں تو۔۔۔
”من! اپنی اولاد سے تم ہی نمٹو میں کہہ دیتی ہوں۔“
”سنہ ہو گیا؟“ ان کے کان کھڑے ہوئے۔

”ہاں ہیں، نافع سے مشکلی نہیں کرنی۔ یہاں جوڑے اور انگوٹھی کا ناپ بھی جا چکا۔ تیل او، کس قدر سبکی کی بات۔“
”دل من کچھ دیر سکتے کی سی حالت میں بیٹھے رہ گئے۔

”مطلب؟“ ”پھر وہ سنبھل کر بولے۔“ ”آپ نے عریشہ سے پہلے پوچھا نہیں تھا؟“
”اے ہاں، سب تصور میرے، مجھے کیا خبر تھی کتنے پر نکالے ہوئے ہیں اس نے بالشت بالشت بھر کی اس لود کو عقل کل سمجھتی ہیں۔“

”دل من چند لمحے ساری بات سمجھنے کی کوشش میں خاموش بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنا گاؤں پہننے لگے۔
”اس بیگم نے کن اکھیوں سے انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔ ان کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دیں۔
”انہوں نے عریشہ کے کمرے کے سامنے رک کر دروازہ بجایا۔

”مطلب۔“
”بداہ فوراً“ ”یہی کھل گیا۔ سفید شلوار قمیص اور سفید تیل لگے سیاہ دوپٹے میں ملبوس عریشہ ان کے مقابل تھی۔
”کیا تمہیں متورم نہیں اور ناک سرخ ہو رہی تھی۔“
”وہ سامنے سے ہٹ گئی۔“ ”آمین۔“

”اس کا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ فردوس بیگم بھی دبی دبی سی چلی آئیں اور ایک کونے میں دبک گئیں۔
”وہ کمرے کے بیچوں بیچ جا کھڑے ہوئے۔“ ”بدھ کے روز آپ کی مشکلی کی پھوٹی سی رسم کر رہے ہیں ہم۔
”کے ساتھ۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟“

”کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔“ ”سرخ لب کا نپنے لگے تھے۔ ہاں کے مقابل وہ کیسی شیریں جاتی مگر باپ کے ہاتھ بولنے کی ہمت بھی نہ ہوئی تھی۔“

”بابا۔۔۔“ اس نے تھوک نگلا۔

”ہاں ہاں کہو۔ جو کتنا چاہتی ہو۔“ ان کے انداز میں بے حد ٹھہراؤ تھا۔

”بابا! میں نے نافع کے لیے بھی اس طرح نہیں سوچا۔“ اس نے کانپتی ہوئی آوازیں کہا۔

”اچھی بات ہے بہت اچھی بات ہے۔ شریف لڑکیاں ماں باپ کی عزت کا خیال رکھنے والی بیٹیاں الم ہوتی ہیں۔ گھر میں ساتھ رہتے کر نز کو بھائیوں کی طرح سمجھتی ہیں لیکن بیٹے شادی ایک بالکل علیحدہ قسم کا بند ہے۔ ایسا بندھن جو چند لمحوں میں دو اجنبیوں کو ایسا شنا سنا بنا دیتا ہے کہ ساری زندگی کے لیے اعتماد اور اعتبار کا میسر آ جاتا ہے۔ سوچے بیٹا! جب دو اجنبی ایک دوسرے کے متعلق بالکل نئے انداز سے سوچتے ہیں تو آفرات فراتے میں کوئی تو ایسی اچھوتی بات ہوتی ہوگی۔ انسان کی سوچوں کو ایک بالکل نیا رخ مل جاتا ہوگا۔ ابھی نافع حوالے سے آپ کے بخویالات ہیں وہ قابل قدر ہیں۔ لیکن اس بات کا یقین کریں کہ بعد میں آپ کے ذہن کوئی گرہ باقی نہ رہے گی، آپ ویسا ہی محسوس کریں گی جیسا ایک شریک حیات کے لیے کرنا چاہیے۔ بچوں کہ سی باتیں اپنے والدین پر چھوڑ دینا چاہئیں۔ وہ عمر عقل اور تجربے میں اولاد سے بہت آگے ہوتے ہیں ہمسرا کا سوچتے ہیں۔ ہم آپ کی عمر سے گزر چکے ہیں، سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کے کیا احساسات و جذبات ہوں گے۔ ہماری عمر تو نہیں پہنچیں، آپ نگاہ کی اس گہرائی کو نہیں جان سکتیں۔ آپ کے ماں باپ نے آپ کے لیے اچھا فیصلہ کیا ہے، اس کا اندازہ آپ کو عمر کا کچھ حصہ گزار کر ہوگا اور ضرور ہوگا۔“

انہوں نے ٹھہر کر مٹی کا چہرہ دکھا۔ فردوس بیگم ان کی گفتگو سے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلائے جا رہی تھیں لیکن عریشہ کے تاثرات کی سختی، هنوز برقرار تھی۔ وہ مارے باندھے بیٹھی تھی جیسے اس کا بس چلنا تو اٹھ کر کہہ سے بھاگ جاتی۔

”اور ایک آخری بات۔“ اس ان کے لہجے میں ٹھہراؤ اور سختی در آئی۔

عریشہ نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا۔

”میں اپنی ماں اور اپنے بھائی کو زبان دے چکا ہوں میں جانتا ہوں بیٹا! کہ آپ کی ماں نے آپ سے پوچھا ہے ”ہاں“ کر کے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے۔ آپ کے لیے پورے خاندان میں رجحان کی ایک نئی گرہ ڈال دی جائے۔ آپ کے دل کو اگر ٹھیس پہنچی ہے تو آپ کا آپ کے سامنے کھرا مندرت خواہ ہے۔“

”بابا۔۔۔“ اس کے لب کاٹنے۔

”لیکن اب آپ کو اپنے باپ کا مان رکھنا ہوگا۔“ انہوں نے اس کے جھکے ہوئے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے اپنے سر پر ایک بے حد گراں اور قیمتی شے محسوس کی۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں اور دل ہر خواہش سے خالی اور دست بردار ہو گیا۔

”مائی گاؤ۔“ ہاشم کے لبوں پر مسکراہٹ چٹکی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں تحیر تھا۔ چہرے پر خوشی کی الوہی سی لہجہ تھی۔

”بہت اچھے بھی۔“ اس نے کاغذ لہرایا۔

رافع جھینپ کر ہنس دیا۔

”لیکن یہ ”پوشیدہ ہستی“ ہے کون؟“

”ہاں نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔ ”میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا کسی کو۔“

”پھر یہ سب کچھ کس فرشتے نے لکھوایا تم سے؟ بھی کوئی تو تحریک ملی ہوگی کہیں سے۔“

”تحریک تو مجھے تمہارے عشق سے ملی ہے۔“ وہ قلم کو انگلیوں میں گھمانے لگا۔ ”سچی بات ہے۔“

”گویا ادھار کے جذبات ہیں؟ پھر تو یہ نظم مجھے ڈاکٹر صاحبہ کی خدمت میں اپنے نام سے پیش کر دینا چاہیے۔“

رافع! وہ منت بھرے انداز میں بولا۔

رافع نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔

”یابے چند ایک نظمیں ایسی اور لکھ دو مجھے میں سنجیدہ ہو گیا ہوں۔“

”اے! رافع نے آنکھیں نکالیں۔ ”میرے جذبات کو دھڑکنے سے ادھار کا کہہ کر مذاق اڑاتا ہے اور مجھ سے

میری ہی نظمیں مانگ رہا ہے ادھار یہ ہے یا وہ۔“

”بھئی۔ میرے جذبات ہیں نا اس نظم میں۔“

”الفاظ تو میرے ہیں۔“

”محبوبہ تو میری ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”تم تو یہ نظم کسی کے نام بھی نہیں کر سکتے۔“

”اے! وہ مجھ کے محبوب۔“ وہ چڑ گیا۔ ”میں پھاڑوں گا لیکن یہ چیونٹہ نہیں کروں گا۔ محبوبہ تمہارے

پاس ہے۔ جذبات تمہارے پاس ہیں تو نظمیں بھی لکھ لو۔ الفاظ کسی فرد واحد کی ملکیت تو نہیں ہوتے۔“

”ٹھیک ہے شاعر صاحب! ایک نظم کیا مانگ لی تم تو طوطا بن گئے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم بھی کسی ردی کی

دکان پر ایک آدھ گھنٹہ ضائع کر کے کوئی شہ پارہ ڈھونڈ ہی لیں گے۔ کسی مرحوم شاعری مثنیٰ بھی نہ کرنا پڑیں گی۔“

رافع قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”اور مزہ آجائے جب ڈاکٹر صاحبہ کی کسی ڈائری میں پہلے سے وہ شہ پارہ محفوظ ہوا۔“

ہاشم بھی اس تصور سے لطف اندوز ہو کر ہنس دیا۔

”یار ہاشم۔“ رافع سنجیدہ ہوا۔ ”ہوا کیا؟“

”ابھی تک تو ہری اور لال دونوں بتیاں خاموش ہیں۔“ اس نے آہ بھری۔ ”دیکھو کون سی جلتی ہے۔“

”تم نے پھر بات نہیں کی؟ کیا خبر ادھر بھی انتظار کی کیفیت ہو کہ دوبارہ استفسار ہو تو جواب دیا جائے۔“

ہاشم قدرے سوچ میں پڑ گیا۔

”میں نے تو معاملہ پھپھو ڈیر کے سپرد کیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”استفسار تو اب ان ہی کو نہ سہرتا ہے۔“

”وہ سنیں یا را!“ رافع بولا۔ ”تمہارے کہنے کی بات اور ہے۔ صنف نازک کے نازک احساسات کو تقویت ملتی

ہے صنف قوی کو سوال کرنا دیکھ کر۔ دل میں شگوفے کھلتے ہیں تو لبوں پر“ ہاں“ آتی ہے۔“

ہائیں!“ ہاشم بے طرے چونکا کچھ گھبرایا۔

”یار رافع! تو تھیک ہے نا؟“ اس نے رافع کا چہرہ اور سینہ ٹٹولا۔

ہاں! ہاں۔ کیا ہوا۔“ وہ بھی گھبر گیا۔

”یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے آج تجھ میں کسی مرحوم شاعری روح حلول کر گئی ہے۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ رافع

ہمینپ کر ہنس دیا۔

”ویسے کہتے تو صحیح ہوتے۔ لگتا ہے مجھے پھر بات کرنا ہوگی۔“

”تمہیں تو ویسے بھی ہمانا درکار ہے۔“ رافع نے آنکھ دبا لی۔

پھر دونوں ہنس دیے۔



”حیاتِ دلا!“ میں چاندنی اُترتی ہوئی تھی۔ پوری عمارت رنگین قہقہوں سے ججی ہوئی تھی۔ کمرے اور دالان

قہقہوں سے گونج رہے تھے۔ نہ نہ کرتے بھی بہت سے عزیز رشتہ دار بلوالے گئے تھے۔ گھر کے سب ہی لڑکے

انتظامات میں بھی مصروف تھے اور ایک دوسرے پر پھبتیاں بھی کس رہے تھے۔

”یار عباد۔“ حمزہ بولا۔ ”دیگوں گا انتظام تمہارے سپرد ہے۔ خیال رہے کھانا یہاں سے وہاں بھی ہو جاتا ہے

اور گھر والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔“

”اس کے سیر و انتظام کیا گیا تو یقیناً ایسا ہی ہو گا۔“ علی ہنس دیا۔

”بہر حال!“ شہلا نے آنسو پونچھے اور خود پر قابو پایا۔ ”محبت کے تناور درخت کو ہم نے خود مل کر کاٹ دیا اس کی بکری ہوئی شاخوں سے الجھنے سے کیا حاصل ابرا! اب ان شاخوں پر نہ پھل ہیں نہ پھول۔ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔“

”میں اور تم جس دُور سے بندھے ہوئے ہیں شہلا! وہ دوسری جانب تمہارے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ یہ احساس مجھے جینے نہیں دے رہا ہے۔ میں ماضی میں چل رہا ہوں شہلا۔“

”ابرا! ابرا! تم مجھے کیوں نہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟“

”محبت کے اس تناور درخت کو مل کر سیدھا کرتے ہیں شہلا! اس کی جڑیں بہت اندر تک پوسٹ ہیں۔“

”ابرا!“ وہ اس کا مطلب سمجھ کر سکتے میں رہ گئی۔ ”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”ہم پھل جاتے ہیں شہلا!“

”قار گاڈ سیک!“ اس کے لبوں سے سرگوشی کے سے انداز میں نکلا تھا۔ ”تم نے ایسا سوچا بھی کیوں؟“

”اس لیے کہ دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔“ اب اس کا لہجہ مضبوط ہو چکر چکا تھا۔

”ہوتا ہو گا۔“ وہ بے رخی سے بولی۔ ”میری زندگی میں ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”شہلا!“ وہ لجاجت سے بولا۔ ”صرف۔۔۔ صرف عمر کے بارے میں سوچو، تم سوچو میرے بارے میں، تم سوچو اپنے بارے میں اس بچے کا سوچو جو میرا ہے تمہارا ہے اور ہم دونوں کے درمیان جینا چاہتا ہے ذرا سا کٹٹ اٹھالینے سے اگر روشنی خوشیاں پھر سے مل سکتی ہوں تو کٹٹ اٹھالینا چاہیے۔“

”تم مجھے مرنے کے لیے کہہ دو ابرا!“ اس نے بے بسی سے آنکھیں بند کر لیں۔ ”میں مر جاؤں گی۔“

”میں ہمیشہ تم سے جینے کے لیے اصرار کروں گا شہلا۔۔۔“

اس کے لہجے میں بے تحاشا جھجکا تھا۔ شہلا پتھری ہو گئی۔

”شہلا!“ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”میرا ایک دوست ہے وہ یہ قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ سب کچھ تیار ہے شہلا! بس تمہاری ایک ”ہاں“ چاہیے۔“

شہلا نے فون بند کر دیا۔ اس کے وجود میں ایک طوفان برپا تھا۔

”پھوپھو۔۔۔ پھوپھا جان بلا رہے ہیں۔“ نافع نے کمرے میں جھانک کر شرارت سے کہا۔

آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں کمرے کی ٹانگتی ایقان کا ہاتھ کانپا اور دل عجب انداز میں دھڑکا۔ وہ بے تابی سے

مزئی۔

”نافع!“

”جی ہاں۔۔۔ مگر فون برا!“ اس نے دانت نکالے۔ ”میں وہاں دو لہما بن رہا ہوں پھوپھا مجھے ڈسٹرب کر رہے ہیں۔“

”بد تمیز کہیں گا۔“ اس کو ہنسی اور غصہ ایک ساتھ آئے۔ ”لے کر دل دھڑکا دیا میرا، میں سمجھی۔۔۔“ وہ سر

جھکتی، بڑبڑاتے ہوئے فون کی طرف بڑھ گئی۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے ریسیور اٹھایا۔

”مبارک ہو، جیتھے، جیتھی کی منگنی۔“

”خیر مبارک!“ وہ ناز سے بولی۔

”منہ تو میٹھا کرادو۔۔۔“ دوسرے شرارت ہوئی۔

”بلڈو کھینچ ماروں؟“

”ہائے رے ستم ظریفی!“ اس نے شکوہ کیا۔ ”کس کی صحبت میں رہ رہی ہو جان من! تم اتنی ظالم تو نہ تھیں۔ اپنے پڑوس میں کوئی قصاص تو آکر نہیں بس گیا؟“

”آپ کس کی صحبت میں ہیں؟“ وہ جواباً بولی۔ ”بہت خوش مزاج ہوتے جارہے ہیں۔“
 مافریک دم خاموش ہوا۔

”مہیا یہ بتاؤ کون سے رنگ کے کپڑے پہنے ہیں تم نے؟“ پھر وہ خوش دلی سے گویا ہوا۔
 ”خندل سے پوچھو۔۔۔ بوجھ کر دکھاؤ۔“ وہ ہنسی۔

”مہیا! اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔“ سنہری سنہری سی لگتی ہو۔“
 اچانک کا دل دھڑک کر رہ گیا۔ اس نے سامنے لگے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھا اور اپنے گولڈن کلر کے
 لباس دیکھے۔

”سب بے ایمان ہو عاشر تم۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔
 ”سری جانب اس نے قہقہہ لگایا۔

”کلاسیک لکس نا۔ اچھا یہ بتاؤ میرے بچے کیسے ہیں؟“
 ”مدم فرسٹ کلاس!“ اس کا موڈ بہت خوشگوار ہو گیا۔
 ”سب کو سلام کہنا۔ دولہا، دلہن کو مبارک باد۔“

”اے سر!“
 ”ما خیال رکھا کرو۔“
 ”ہاں!“ وہ ہنسی۔

”لہذا حافظہ لو یو!“ سلسلہ منقطع ہو گیا۔
 انہیں بہت دیر تک ریسیور لیے کھڑی رہی۔

”ہم۔۔۔“ نافع کمرے میں جھانک کر منمنایا۔ ”مجھے یہاں تیار ہے۔“
 ”اے۔۔۔“ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ ”ہاں ہاں آجاؤ نافع! میں نے بات کر لی ہے۔ تمہارے ”پھوپھا“ بہت
 مبارک باد دے رہے تھے۔“

”نیک پو۔ ویسے مجھے مبارک باد دے چکے تھے وہ۔“ وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
 ”مہیا!“ وہ ہنسی۔ ”اور کہا کہہ رہے تھے؟“

”مہیا! وہ رہے تھے تمہاری پھوپھو نے کون سے کلر کاڈریس پہنا ہے۔ میں نے بتایا گولڈن کلر کا۔“
 ”اچھا!“ اچانک کانٹہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”بے ایمان۔“
 وہ ہلکا کر رہ گئی۔

”اے۔۔۔ جھرمجھرم کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ بھینکا جا رہا تھا۔
 ”مہرا ایک دوست ہے۔۔۔ وہ یہ قربانی دینے کے لیے۔۔۔“

”لہذا قربانی میری مانتے ہو۔ اور نام اپنے دوست کا لیتے ہو۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ”یہ نہیں
 ہو گا۔ مجھ پر کیا بیتگی۔ جو خوش رنگ پہنے دکھا رہے ہو، ان تک پہنچنے کے لیے مجھے اپنے تکیوں کو لوہمان کرنا
 پڑا اور اسی آہستہ سے تم میری مانگ بھر کر مجھ پر احسان کرو گے۔ ابراہیم جیلانی! تم مرد لوگ عورت کو محض ایک حقیر
 سمجھتے ہو۔ اود کھلونا محض اس وقت تک کشش رکھتا ہے جب تک دسترس سے دور ہو۔“

اس کے قریب رکھا کارڈریس پھر بچنے لگا تھا۔ شہلا پریشان ہوا تھی۔
 ”کہا جاتا ہے یہ شخص۔۔۔ یہ مجھے سکون نہ جینے دے گا نہ مرنے دے گا۔“
 اس نے فون اٹھ لیا۔

”ہل۔۔۔“
 ”اگر تم مرض کر رہا ہو!“ سلجھے ہوئے شائستہ انداز میں کہا گیا تھا۔

شہلا دفعتاً "ساکت ہوئی۔
 "شہلا... آپ مجھ سے خفا ہو گئی ہیں کیا؟" وہ ہلکے پھلکے انداز میں پوچھنے لگا۔
 "جی... نہیں۔" اس کا ذہن حاضر نہ تھا۔
 "پھر آپ آئیں کیوں نہیں؟ پچھو بھی آپ کی منتظر ہیں۔ اور... میں بھی۔"
 "ہاشم! وہ کچھ توقف سے بولی۔ "میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ورنہ میں ضرور آتی۔ پلیز آپ مائنڈ نہ کیجئے گا اور ایقان سے بھی ضرور معذرت کر لیجئے گا میری طرف سے۔"
 "آپ کو شاید میرا سوال اچھا نہیں لگا ورنہ آپ ضرور آئیں۔" وہ آہستگی سے بولا۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ میرا سامنا نہیں کرنا چاہتیں۔"

شہلا نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔
 سب لوگ بڑے ہال میں جمع تھے۔
 عریشہ کو نافع کے برابر لا کر بٹھا دیا گیا۔ وہ بے حد سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ معمولی سی مسکان کی جھلک تک لہلہا کے کسی گوشے میں پوشیدہ نہ تھی۔
 نافع خوش تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ دوست احباب کے چٹکوں کا جواب دے رہا تھا۔
 شفیقہ حیات دو انگوٹھیاں سنبھالتی دو لہما دِلن کے پاس آ بیٹھیں۔ دونوں جانب سے انگوٹھیاں انہیں ہی پہناتی تھیں۔
 "بسم اللہ کیجئے اماں جان! قاروق! سن لو لے۔"

ہاشم رافع، ایقان اور مابین دو لہما دِلن کے صوفے کی پشت پر کھڑے سب کا رروائی ملاحظہ کر رہے تھے۔ سب کے سب جھکے رہے تھے۔
 ذوقاً ہاشم کی نگاہیں اٹھی تھیں۔ خوشبو کے ایک مانوس جھونکے نے اسے چونکا دیا تھا۔
 آنکھوں میں محبت کی جلتی جوت لیے، وہ اس کے مقابل تھا۔ شہلا کے عقب میں پورا چاند اچانک ہی مسکرانے لگا تھا۔ ہاشم کو روئے زمین کی ہر شے مسکراتی ہوئی لگ رہی تھی۔ اسے وہ پورا منظر ایک طویل ریاضت کا اعجاز معلوم ہو رہا تھا۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔ "آپ پھر بھی آئیں، یہ دل آپ کا احسان ملہ ہے۔" شہلا نے نظریں اٹھائیں پھر فوراً ہی جھکا لیں۔
 میں نے سوچا۔ "آپ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "حیات ولا" کی ہر خوشی غمی میں ہمیشہ شریک رہی ہوں۔ تو پھر اتنی اچھی تقریب محض ذرا سی ناسازی طبع کے باعث کیوں چھوڑ دی جائے۔ بعد میں مجھے ہمیشہ افسوس رہتا۔ ایقان بھی شکایت کرتی۔"
 "گویا آپ محض اتنا ہی سوچ کر آئیں۔" وہ مسکرایا۔ "بہتر؟"

شہلا نے پھر بے چینی سے نگاہ اٹھائی۔ کھدر سلک کے گرے کمرے کرتے اور وہاٹ شلوار میں ہاشم کی وجہ سے بہت نمایاں تھی۔ مناسب تدو قدامت کی شہلا کو اپنا آپ اس کے مقابل نہا منسا لگ رہا تھا۔ شناسائی کے احاطہ سالوں میں وہ سینکڑوں مرتبہ اس سے ملی تھی لیکن آج سے پتھر دل نے کبھی یوں چھپ جانے کی خواہش نہ کی تھی۔ جانے فرار نہ ڈھونڈی تھی۔

ہاشم نے ایک مرتبہ پھر اسے دیکھا۔ اس کی ناک میں چمکتی لونگ سے زیادہ روشن نگاہیں اس سے گر رہاں تھیں۔ ان نگاہوں کے عقب میں چاند جھینپا جھینپا سا مسکراتا تھا اور اپنی روشنی اس کے سیاہ بالوں پر نچھاور کر رہا جاتا تھا۔ چاند کی چمک سے مزین لہجے اس کے چہرے کے گرد جھولتی تھیں۔ بے حد مکمل اور خوبصورت منظر تھا۔ ہاشم کا وہاں سے ہٹنے کو جی نہ کرتا تھا لیکن ان نگاہوں میں فرار کی خواہش اس درجہ شدید تھی کہ اسے اپنے دل پہ

رہائی پڑا۔

”آپ کچھ لیجئے نا۔“ اس نے میزوں کی جانب اشارہ کیا۔

”بھئی بھئی۔“ شہلا کو جیسے قید سے رہائی ملی۔

”مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔ اس کی مسکراہٹ کی چمک نے منظر کو مزید روشن اور خوبصورت بنا دیا تھا۔ ہاشم بھی ہلاکت سے مسکرایا۔

”اچانک ہی کسی نے از حد بے تکلفی سے اس کے کاندھے پر بازو دھرا تھا۔ ہاشم جو شہلا کی جانب متوجہ تھا،

”میں رانجھے!“ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ”یہ جنون عشق کے انداز اور قابو کر کے دیکھو۔ یہاں سب کے پاس دو آنکھیں اور دو کان ہیں۔ میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحبہ کے پرفیوم میں بے خودی کا کلوڈ فام ملا ہوا ہے جو صرف تمہاری قوت شامہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔“ ہاشم مسکرایا۔

”خیر اے پیاس تو اس طرح کا کوئی دھندا ہے نہیں، ہمیں تو روزگار سے لگا رہنے دے بھائی۔“

”جو کئی بند تھی ہے وہ بھی چھٹ جائے گی۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”تائی امی! تمہیں ڈاکٹر صاحبہ سے محو

الغلوں کا کر بے حد غصے میں واک آؤٹ کر چکی ہیں جس کا تمہاری صحت پر کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا کیونکہ تمہیں اس

والہ کا علم ہی نہ ہو سکا۔ دادی جان اور امی جان مسلسل ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی ہیں اور

انہیں پھوپھو اور مارے خوشی کے دوپٹے پر بیاہی کی اور دو بروسٹ کی اڑا چکی ہیں اور ہنوز میزوں کے ارد گرد چکرار ہی

ہے۔ میرا خیال ہے وہ تمہاری رات کا کھانا بھی چشم تصور سے اسی محفل میں اشارت کر چکی ہیں۔“

ہاشم کو بے ساختہ ہی ہنسی آئی تھی۔

”میں بتاتا ہوں پھوپھو کو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”تم پھوپھو کے پاس جاؤ، میں تائی امی کے پاس جاتا ہوں۔“

ہاشم نے اس کی کمر میں ایک دھموکا جڑ دیا۔

”چشم بد دو۔“ کسی کی نظر نہ لگ جائے میری پیاری سی دوست کو۔“ ایقان شرارت بھرے لہجے میں

کھلکھلائی۔

”ایک عرصے بعد اتنا تینا سنورا دیکھا ہے تمہیں بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

شہلا نے کچھ کہنے کے لیے لب و لہجہ پھر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

وہ دونوں کھانے کی میزوں سے کافی فاصلے پر آکھڑی ہوئی تھیں۔ ایقان نے محسوس کیا شہلا اس سے نظریں نہ

مٹا رہی تھی۔ وہ کنفیوژن کا شکار دکھائی دیتی تھی۔ ایقان کچھ سوچ کر شرارت سے مسکرائی۔

”شہلا! ایک بات پوچھوں؟“

”ہوں۔“ وہ کسی خیال سے چونکی۔

”ایک سوال کا جواب دینا اور نار تھا تم پر۔“

شہلا نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ ایقان کو اس کی خوبصورت آنکھوں میں خوف کی جھلک نظر آئی۔

انہیں تذبذب کا شکار ہوئی۔ نجانے جو کچھ وہ محسوس کر رہی تھی وہ درست تھا یا صریحاً غلط۔

شہلا تو یوں بھی اس گھرانے کی ہر تقریب میں شریک ہوتی لیکن یہ بھی غلط نہ تھا کہ وہ عموماً ہر تقریب ہی اپنے

سادہ سے انداز میں ہی جھکتا لیا کرتی تھی۔ آج تو اس کا روپ آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کا مقابلہ کرنے پر آمادہ نظر آتا

تھا۔ کدانی سے سجائے ہوئے خوبصورت سوٹ اس کے متناسب سراپے پر اپنی بہار دکھارہا تھا۔ سفید گلیٹنوں سے

مرصع کنڈن کا گلوبند اور آویزے اس کی آنکھوں سے پھوٹی چمک سے حیرہ تھے۔ خوبصورت کٹاؤ والے لب گہری

میوں لپ اسٹک سے بجے حدود وضاحت سے اپنے صن کا قصیدہ کہلوار ہے تھے۔ کمر تک پہنچے ہوئے سیاہ چمکتے ہوئے بال خوبصورتیاں بکھیر رہے تھے۔

اس پر اس کی وہ قاتل ادائے بے نیازی مزید خرابا کر رہی تھی۔
ایقان نے دوز کھڑے ہاشم کی بے بسی پر ایک نگاہ ڈالی اور الجھ کر رہ گئی۔
”شہلا“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

شہلانے سہم کر اس کی صورت دیکھی۔
”ہاشم کا رشتہ لے کر آؤں، باضابطہ طور پر؟“
”ایقان!“ وہ کمزور سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے کچھ سوچنے کی مہلت تو دو۔“

”تمہیں مہلت ضرور دیتی اگر تمہارا یہ قاتل روپ نہ دیکھتی تو۔۔۔ لیکن یہ سب تیاری چی چی کر کر رہی ہے کہ تمہاری خود ساختہ سزا آج ختم ہوئی۔ اب تمہیں مزید مہلت نہیں دی جاسکتی۔ قیدی کی رہائی کی تاریخ کا اعلان کیجئے جی صاحب!“ شہلا مسکرا دی۔

”مذاقی مت اڑاؤ ایقان، کیا ایک تقریب کے لیے یہ ذرا سی تیاری بھی میرا حق نہیں؟ اس کے بھی سوسو مطلب نکالے جائیں گے؟“
ایقان الجھ بھر کو گڑبڑا گئی۔

”خدا نخواستہ میرا یہ مطلب نہیں تھا شہلا! میں کچھ غلط تو نہیں سوچ رہی۔“
”تم غلط ہی سوچ رہی ہو۔“ وہ پھر مسکرائی۔ ”میں یہاں تمہارے بیٹھے کو انسپائر کرنے نہیں آئی ہوں۔“
ایقان کھکھلا کر ہنس دی۔

”وہ تم بہت پہلے کر چکی ہو مانی ڈیر فرینڈ! وہاں تو نظر، جگر، دل، پیمپٹر سب ہی کچھ انسپائر ہے۔ ہاں البتہ جلتی پر تیل چھڑکنے کا سا اہتمام ضرور کیا ہے تم نے۔ اس کی بھی تو کچھ سزا ہونی چاہیے۔“
”مثلاً کیا؟“ شہلانے تیکھی نگاہ سے اسے دیکھا۔

”مثلاً۔۔۔“ اس نے دیدے منکائے ”مثلاً“ یہ کہ سارا اہتمام کم از کم اس کے نام تو کر دیا جائے۔ اتنا تو اقرار کرو کہ یہ سب ناز و انداز اس کے لیے ہی ہیں۔“
”ایقان!“

”شہلا پلیز۔۔۔ کیا اس غریب سے پیر پکڑاؤ گی؟۔“ ایقان بھی سنجیدہ ہوئی۔
شہلا خاموش ہو گئی تھی۔

”میں کل آرہی ہوں“ انہی سے بات کرنے۔“ ایقان نے دھمکایا۔ ”اور تمہاری جانب سے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“
”چھا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
”ہائیں؟“ ایقان دم بخود ہوئی۔

پھر خوشی اس کے لبوں سے جھرنے کی صورت برآمد ہوئی تھی۔ شہلا بھی جھینپ کر مسکرا دی۔

سیاہ ڈھیلے ڈھالے کرتے اور سیاہ چوڑی داریا چامے میں ملبوس وہ مہرہ لب آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی سوچے چلی جا رہی تھی۔ لائے سیاہ بالوں سے ٹپ ٹپاٹپائی کی بوندیں برس رہی تھیں۔ اس کا کراچی بھیگ چلا تھا اور نیلا کاریٹ بھی۔ اسے مطلق پروانہ تھی۔ وہ بجائے کیا کچھ سوچے چلی جا رہی تھی۔

تقریب ختم ہونے دیر ہو چکی تھی۔ سب ہی افراد سخت تھکاؤ کے عالم میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے تھے۔ تقریباً ہر پورشن کی لائٹس آف ہو گئی تھیں۔ اس نے پہلے تو بے حد بے دردی سے اپنے سنورے ہوئے روپ کو لگا دیا تھا۔ کادار بھاری دوپٹہ اتار کر جھارت سے دور پھینکا۔ چوڑیاں توڑ توڑ کر اتاری تھیں۔ سال ہنسنے نوج نوج گڑبڑ ننگ نیل کے آئینے پر دے ماری تھیں پھر جا کر شاور کے نیچے کھڑی ہو گئی تھی۔ چہرہ بے دردی سے رکڑا

مدی سے سجے ہاتھوں پر تادیر صابن ملا تھا۔ نہا کر نکلی تو آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ پوٹے بے تحاشا
ہائے تھیں۔ وہ خاموشی سے جا کر آرام کریں پر بیٹھ گئی تھی۔ ذہن میں بھونچال سے اٹھ رہے تھے۔ پوری
ایک نہایت حقیر شے دکھائی دے رہی تھی جسے ٹھکرا دینے کو من کرنا تھا۔ اسے سب ہی سے شکایت تھی،
وہ کیوں جھک گئی اس نے کیوں اتنی آسانی سے ہار مان لی اس نے کیوں مزاحمت نہ کی۔ کیوں کیوں

اس ہی تپائی پر رکھے فون میں گھر گھر رہوئی تھی۔ عریضہ کے لبوں سے سسکی نکلی۔ اس نے ریسیور پر ہاتھ رکھا
اور اب اس آواز کو سننا نہ چاہتی تھی۔ وہ اسے بھولنا چاہتی تھی۔

نالی گھر گھر فریاد کناں تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے، دل سے خون رستا رہا، لب سکتے
رہے، وہ مری کا پہلا پہلا نشہ تھا۔ پہلا پہلا نشہ بہت طاقت ور ہوتا ہے۔ نرم نرم رگوں میں دوڑتا، لوٹتا، رہتا جاتا
اس لہار کو جسم سے نکال پھینکنا روح نکال دینے کے مترادف لگتا ہے۔ جذلوں کے الاؤ میں شدت کی تپش
ہموٹے چھوٹے معصوم وعدے اس بھی میں تپ کر ایسی مضبوط صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ انہیں
دل کی رگوں کو کاٹ دینے جیسا لگتا ہے۔

نالی ہی اذیت میں مبتلا تھی۔ جسم سے روح نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔
سایہ س ونامراد ہو کر خاموش ہو چکا تھا۔ عریضہ کا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر روئے۔ وہ اٹھ کر بستر پر جاگری اور
مہ چہا کر رونے لگی۔

بیٹھ کر سایہ نگل میں نا صبر

ہم بہت روئے وہ جب یاد آیا
شعر آتا ہے تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟
لہا جالوں اپنے آنسوؤں سے پوچھو۔
آہ لیتے ہیں دل سے پوچھو۔
دل سے آنسو گر رہے تھے۔



سلام علیکم۔ کھلی کھلی سی ایقان اندر داخل ہوئی تھی۔
علیکم السلام۔ فردوس بیگم خفگی سے بولیں۔
ہاں میں پچھو؟ ماہین نے بھی اس جوش و خروش کا مظاہرہ نہ کیا جو وہ عموماً اس کی آمد پر کیا کرتی تھی۔
مرست نکلاں۔ تم کیسی ہو۔ میں ڈر رہی تھی کہیں تم چلی ہی نہ گئی ہو۔
اقتدارات کو تسلیم میاں کا فون۔ فردوس بیگم نے رشتے کی بنا پر مصالحت کا گھونٹ ناچار بھر گئی تھیں، ورنہ
مدی کسی کی خطا میں نہ بخشتی تھیں۔
تھے تیار رہنا، لینے آؤں گا۔ دیکھو رات تک پہنچیں گے۔

ان اور رہ جاتیں۔ ایقان محبت سے بولی۔
ارے اس کے سر ہاں بڑے ٹھنڈے ہیں۔ فردوس بیگم ہر بات کا جواب بذات خود دینا ضروری خیال کرتی
تھی۔ "اد جاردن کو چھوڑ دیا وہی ان کی مہربانی ہے۔"
بھر تو ہو گیا ہے امی! ماہین بولی۔ "اب مہینہ تو رہنے سے رہی۔ بہن کی منگنی ہی تھی۔ شادی ہوئی تو بات
کی۔ اب ہاتھ بھائی کی کہیں بات ٹھہرے تو دیکھیں۔"
مدی کی تو ٹھہری ہی سمجھو۔ فردوس بیگم نے جلے بھنے انداز میں کہہ کر کن اکھیوں سے ایقان کو دیکھا۔
ان دن تیاریاں نہ دیکھی تھیں مہ پارہ کی۔ مانو محفل لوٹنے آئی تھی۔

ایقان قدرے جزیز ہوئی۔ بھانج کے تیور پہلے ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ اس نے ہولے سے کہنا گلا صاف کیا۔

”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟“ انہوں نے بغور اس کا سراپا دیکھا۔

”جی۔۔۔ اب اچھی ہے۔۔۔“ اس کا ذہن ابھ رہا تھا۔ بات شروع کرنے کا سراپا تھوڑا آ رہا تھا۔

”تمہاری سیمیلی تو لگتا ہے جی جان سے تیار بیٹھی ہے۔ دوسری مرتبہ دلہن بننے کو۔۔۔ کیوں؟“ انہوں نے لہجے میں بات کا اتنا زور کر کے گویا اس کی مشکل بھی آسان کی تھی۔

ایقان تھوڑا گھبرائی پھر قدرے سنبھل کر گویا ہوئی۔

”بھابھی جان! وہ تو بے خبری کی رستے پر بے حد خاموشی سے صبر سے محروم تھی۔ اسے تو بار بار چونکا گیا اور رستہ بدلنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ اب بھی اس کے انداز میں خوشی کم اور مجبوری زیادہ ہے۔ آپ بھی عورت بھابھی بیگم! ایک مجبور اور دکھی عورت کا درد سمجھنے کی کوشش کریں۔ کم از کم لفظوں کے استعمال میں تو کچھ احتیاط برتیں۔ اسے دوسری مرتبہ دلہن کے روپ میں دیکھنے کے لیے آپ کا سا جزا وہ ہی بے قرار ہے اس نے تو کیا خواہش کا کبھی اظہار نہیں کیا۔“

فردوس بیگم بھناٹھیں ٹکرائیں کچھ سنبھل سی گئی۔

”میں غلط کہہ رہی ہوں مایہن؟“ ایقان نے تائیدی انداز میں مایہن کو دیکھا۔

مایہن جزیزی ہوئی۔

”کتنی تو آپ بھی غلط نہیں ہیں پھوپھو! اپنا سکہ ہی کھوٹا ہو تو دوسرے سے کیا شکوہ کرنا۔“

”اے ہے منہ میں خاک۔ سوچ سمجھ کر بولو۔ میرا بچہ کیوں کھوٹا ہونے لگا۔ بے چارہ بھولا ہے، کم عمری میں جنس گیا اس جادو گرئی کی لٹوں میں۔“

”مم۔۔۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا امی! مایہن بے چاری ماں اور پھوپھو کے درمیان شعل کاک کی طرح چھلکتی تھی۔ ”میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ شہلا آپ کی طلب ہمارے بھائی کے دل میں جب اس قدر شدید ہے تو ہم انہیں قصور وار نہیں کہہ سکتے۔ وہ تو کہنے میں حق بجانب ہوں گی کہ سمجھانا ہے تو اپنے بھائی کو سمجھاؤ۔“

”اے ہاں ہم کہے سمجھائیں گے جب ان کا جادو سر جڑھ کر بولے گا تو۔۔۔ وہ بڑبڑائیں۔“

”کون سا جادو بھابھی جان؟“ ایقان کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط سے کام لے کر بولی۔ ”اس کو راضی کرنے کے اگر ہاشم کو کوئی جادو کروانا پڑا ہو تو الگ بات ہے ورنہ وہ تو کسی صورت راضی نہ تھی۔“

”سب ہی چلتے ہوتے ہیں ایسیوں کے۔ اپنی قیمت پر دھواتی ہیں۔“ وہ وہاں سے اٹھ گئیں۔ ”بہر حال ہم تو اب بے بس ٹھہرے انکار کرتے ہیں تو لڑکا ہاتھ سے نکلتا نظر آتا ہے۔ اسے تو کورٹ پکھریوں میں بیاہ کرنا آسان ہے ہم کہاں منہ چھپاتے پھر س گئے۔ بعد میں ناک رگڑتے جانا پڑے گا تو اچھا ہے سیدھے سبھاؤ سے بیاہ لا۔ اسے ہمارے نور چشم کی آنکھیں بھی ٹھنڈی ہو جائیں۔ ہمارا کلیجہ جلے تو کس کو پروا ہے یہاں سے یہاں تو سہا جلائے کو بیٹھے ہیں۔“

ایقان سے خوشی کے مارے بولنا مشکل ہو گیا، وہ تو سب کچھ بارے بیٹھی تھیں۔ بس ایک زبانی جنگ تھی سدا جاری رہنا تھی۔ اس نے مایہن کے کچے کچے چہرے پر ایک مسکراتی نگاہ کی۔

”بھابھی جان تو مان گئی ہیں مایہن۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔ ”کیا کریں بے چاری۔“

”اور بھائی جان؟“ اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”بوجی تو پہلے ہی راضی ہیں۔ ہاشم بھائی انہیں کب کا منا چکے۔“

”اور تمہیں؟“ وہ شرارتاً بولی۔

”آپ کہیں جاتے ہیں۔“
”ہمارا رہنا شام کو ادھر چلتے ہیں۔“

اس کے تصور میں ہاشم کا چمکتا ہوا چہرہ تھا جس کی پر خلوص تمنا کا جھنڈا محبت کے

فل سائز کو کولر پانی سے بھرا ہوا ہونے کے باعث بے حد ذنی ہو رہا تھا۔ اسے بے شک تمام اٹھا کر میز پر رکھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ بار بار یہ بھاری کولر کمرے تک لانا دن بھر کا مشکل ترین کام تھا۔

لے ہوئی۔ پانی پانی کی تکرار سے وہ عاجز ہو چلی تھی۔ ان کے اندر نجانے کون سا توردن رات دیر کا کرتا احساس کی پیش آنے کے جسم و جان کو جلایا کرتی تھی۔ وہ کون سی جھلپتی ہوئی سوچ تھی جو ان کے تعاقب میں تھی، یہیہ سمجھ نہ پاتی۔

اس گلاس بھر کر انہیں دیتی رہتی۔ کور لہجہ بہ لہجہ خالی ہوتا چلا جاتا۔ گندی بالٹی لفظ بہ لفظ بھرتی جاتی۔
 لہجہ کے چکر لگا لگا کر تھک جاتی تھی مگر پانی پانی کی سنکار ختم نہ ہوتی تھی ان آنکھوں کی سرخی کم نہ ہوتی،
 ماند نہ پڑتی۔ سانسوں کی پیش برقرار رہتی۔
 لہجہ گلاس بھر کر ان کے روبرو کیا۔

”انہوں نے ایک سانس میں اسے خالی کیا۔ ”شباباش۔“

”ابھی لڑکی ہو۔“

ایک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ اس کے تھے ہوئے اعصاب میں سے گویا ایک گرہ کھلی۔ اتنی سخت
 کے بعد بھی وہ ان کی جانب سے کسی سخت فقرے کی منتظر رہتی تھی۔ وہ بل میں تولہ بل میں ماشہ تھسپا رہ
 کے حامل۔ ان کی مضطرب طبیعت ربیعہ کو ہر وقت بے چین رکھتی تھی۔ گڑھوں میں تیزی سے
 کی پٹلیاں، لبوں کے پھڑکتے ہوئے گوشے اور ہمہ وقت تھے ہوئے تھننے ان کے اندر ایسے لاوے کا پتلا
 ربیعہ کو کبھی کبھی دھواں اگلنے اس آتش فشاں سے سخت خوف محسوس ہوتا تھا۔ کب وہ کون سا روپ
 کوئی گارنٹی نہ تھی۔

اپ کے لیے چائے بنا لاؤں پچھا جی؟“ ربیعہ کو ایک تعریفی جملہ سرشار کر گیا تھا۔ تری ہوئی مٹی، بارش کی

بہانے تم پینا چاہتی ہو تو بنا لو۔“ وہ بے نیازی سے بولے۔ ”میںنا کستی ہے تم چیزوں کا بے دریغ استعمال

بے لگھنڈی سانس بھری سیادل کسی دوسری طرف جانکلے تھے۔

”وہ نجانے کیوں خوش ہوئے۔“ بہت چالاک ہو تم! اپنی دادی کی طرح۔ سازشیں کرنا تمہیں

ربیعہ ہکا بکا ہوئی۔ اس نے بھلا کون سی سازش کی تھی۔ وہ تو اس قدر مجبور تھی کہ وہاں سے نکل بھاگے بھی کوئی سازش نہ سوچ سکتی تھی۔ نکل بھاگنے کا نہ تو کوئی ذریعہ تھا نہ دوسرا کوئی ٹھکانہ۔ وہ ایسی پرکٹی چلا کے لیے پنجرے کی سلاخیں معنی نہ رکھتی تھیں۔
”اے ربیعہ!“ ترانہ کی آواز پر وہ چوکی۔ وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بشاش تھا۔

”ادھر آنا زرا۔“

ربیعہ سب کچھ بھول بھال کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ ترانہ کے انداز میں کوئی غیر معمولی بات تھی۔
”چلو چمت پر چلیں۔“ ترانہ بولی پھر اسے خیال آیا۔ ”پھپھو کہاں ہیں؟“
”مارکیٹ گئی ہیں تصور بھائی کے ساتھ۔“
”میدان صاف ہے گویا۔ اور صولت؟“

”نہا رہی ہے۔“

”آجاؤ پھیس۔“ وہ جوش بھرے انداز میں بولی۔

ربیعہ بھی تجسس سی اس کے پیچھے پیچھے بیڑھیاں چڑھ گئی۔
”میں تمہارے لیے ایک چیز لاتی ہوں۔“ اس نے خاکی لفافہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ربیعہ کھول کر دیکھا۔ اس میں یونیورسٹی کا پراسپیکٹس اور فارم وغیرہ تھے۔
”ہا۔۔۔ بے حد خوشی کے عالم میں اس کے لبوں سے نکلا۔
”شام کی کلاسز کے لیے جو سبجیکٹس ہیں ان میں سے سوچ سمجھ کر کوئی سلیکٹ کر لو پھر میں تمہارا کروا دوں گی۔“

”اور پھپھو۔“

”اوہ۔۔۔ پہلے داخلہ تو ہو لینے دو باقی بعد میں دیکھی جائے گی۔ پھپھو سے ایک مرتبہ معرکہ تو کرنا پڑے گا اس میں ابھی دیر ہے۔“

ربیعہ خوشی خوشی پراسپیکٹس دیکھنے لگی دفعتاً اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ترانہ دلچسپی سے چہرہ دیکھنے لگی۔

”تھینک یو ترانہ!“ وہ ممنون لہجے میں بولی۔

”تھینکس فار وہاٹ؟ جو کچھ تم ہمارے لیے کرتی ہو ربیعہ! اس کے شکریے کے اظہار کی یہ انتہائی صورت ہے بلکہ اس کے شکریے کا اظہار بھی ناممکن ہے۔ یہ سب کچھ تو تمہارا اپنا حق ہے اور جو کچھ ہمارا تم کرتی ہو وہ تمہارا احسان۔“
ربیعہ خوش دلی سے مسکرا دی۔

”احسان کیسا ترانہ! اپنی جائے پناہ کا خیال تو ہر کوئی رکھتا ہے۔ تم یہ ہر وقت احسان احسان کی راگنی صا کرو۔ اچھا اب چائے پلاؤ آج میں تھک گئی ہوں۔“

”ہوں۔“ ترانہ شوخی سے مسکرائی۔ ”آج تو ہرگز چائے نہ پلاؤں گی۔ آج تو چائے پیوں گی، تمہاری اس خوشی کی قیمت تو وصول کروں تم سے۔“

ربیعہ اچانک سی زور سے چوکی۔ بیڑھیوں پر گیلے بالوں کی جھلک معدوم ہوئی تھی۔
”صولت نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔“ وہ سنجیدہ ہو کر بولی۔

ترانہ نے مزہ کر دیکھا اور کچھ سوتے لگی۔

”وہ ابھی ابھی گئی ہے۔“ ربیعہ فکرمند ہو رہی تھی۔ ”میں نے خود دیکھا ہے۔“

”ہوں۔“ ترانہ بولی۔ ”بے چاری سوچتی ہوگی، میں ہی چائے بناؤں۔ یہ دونوں اور اسی نہیں ہیں۔“
 رہیہ کو زور سے ہنسی آگئی۔

”تمہیں کسی بات سے ڈر نہیں لگتا ترانہ؟“
 ”کہ میری شادی باری سے نہ ہو سکے۔“ ترانہ نے شوخی سے اس کے گال پر چٹکی بھری۔ ”اور تو ایسی کوئی نہیں جس سے میں ڈروں۔“
 رہیہ نے رشک سے اسے دیکھا۔

○ ○ ○
 ہٹا کے انداز حد درجہ خشک تھے۔ رہیہ اپنی جگہ پر چور سی بنی ہوئی تھی۔ صبح سے وہ انہیں کئی بار مخاطب کر کے لپک لپک تھی لیکن وہ اپنی خشک مزاجی پر ہنوز مصر تھیں۔

رہیہ کو ان سے اور ان کی ناراضی سے بے حد خوف محسوس ہوتا تھا۔

”میں آئی! آج کیا کانا ہے؟“ اس نے تیسری مرتبہ پوچھا۔

وہ اسے غور سے دیکھنے لگیں پھر ہنکاریں۔

”دیکھنے میں تو بہت معصوم لگتی ہو لیکن ہو کس قدر گھٹی۔“

”میں نے کیا کیا ہے آئی؟“ وہ بے چارگی سے بولی۔

”کیا کیا ہے؟ روزی پکانے کے متعلق استفسار کرتی ہو۔ حالانکہ کچھڑی پکانا تمہیں خوب آتا ہے۔ اندر ہی اندر

اپنی کی کچھڑی سازشوں کی کچھڑی۔“

”یا اللہ۔۔۔“ اس کا دماغ چکر اگیا۔ ”پھر وہی سازش کا ذکر۔“ اس شاہی قلعے کو نجانے کون سی انقلابی سازش کا

اظہار تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔

”کون سی کچھڑی آئی!“ وہ جھنجھلائی ضرور مگر لمحے میں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔

”کل ترانہ تمہیں کیا دکھلانے کو چھت پر لے گئی تھی اس لفافے میں کیا تھا؟“

”اوہ۔“ رہیہ کو ان کی ناراضی کی وجہ پوری طرح سمجھ میں آگئی۔

صورت کی روبرو رنگ نہایت کامیاب اور جامع تھی۔

”اب کہہ دو کون سا لفافہ؟ کس رنگ کا لفافہ؟ میں تو کسی لفافے کے متعلق نہیں جانتی۔“ انہوں نے جل کر

اس کی نقل اتاری تھی۔ ”مہسنی نہ ہو تو۔۔۔“

”آپ اس براؤن لفافے کی بات کر رہی ہیں نا جو کل ترانہ کے ہاتھ میں تھا۔“ وہ فوراً بولی۔ ”آپ کو صولت

لے جایا ہو گا۔“

”مجھے تمہارے فرشتوں نے بتایا۔ تمہیں اس سے کیا۔“ وہ بھڑکیں۔ ”مجھے اس لفافے کے متعلق سچ سچ بتاؤ۔“

”ہاں لوں چھت پر آخر کیا کرنے جاتی ہو؟“

”میں آپ کو سچ سچ بتاؤں تو آپ ناراض تو نہ ہوں گی۔“ وہ تذبذب سے بولی۔

”میرا کیا دماغ خراب ہے۔ میں سچ بات پر ناراض نہیں ہوتی۔“ ان کی سرد آنکھیں لمحہ بھر کو چپکی تھیں۔

”اس لفافے میں بڑے اچھے اچھے ڈیزائن تھے۔“

”ڈیزائن؟“

”جی ہاں، قمیصوں کے ڈیزائن۔ ترانہ نے اپنا سوٹ سلنے کو دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی، اگر صولت نے دیکھ لیا تو وہ

اسی ویسا ہی ڈیزائن بنوانے کی ضد کرے گی اسی لیے وہ مجھے چھپ کر دکھا رہی تھی۔“

”میں نے کچھ دیر تک نظروں سے اس کا چہرہ ٹٹولا۔ رہیہ نے جلدی سے اپنی نظریں جھکا کر دانتوں سے نچلا لب دبا

لپکا تھا۔ اس کے تاثرات نہ جان پائیں۔

”اچھا۔۔۔ مجھے وہ ڈیزائن کانڈ پر اتار کر دو۔“ پھر وہ بولیں۔ ”میں صولت کو اس سے پہلے وہ ڈیزائن سلوا کر دوں

گی۔ وہ سمجھتی کیا ہے۔ چار پیسے زیادہ کمالتی ہے تو ہم سے بہت اونچی ہو گئی ہے۔ ہم اس کے جیسے کپڑے نہیں سلا سکتے کیا؟“

وہ بڑھاتے ہوئے ایک کاپی اٹھالائیں۔
 ”اور دیکھو لڑکی! زیادہ ہوساری مت دکھانا۔ بالکل ویسا ہی ڈیزائن بناؤ رتی برابر فرق نہ نکلے ورنہ مجھ سے ہا کوئی نہ ہو گا اور ترانہ کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ میں کل ہی صولت کو اپنا سوٹ سلوا دوں گی۔“
 ربیعہ نے بے حد مشاقی سے ایک خوبصورت گلے کا ڈیزائن کاپی کے صفحے پر اتار دیا۔ مینا خوش ہو گئیں۔ ترانہ نے اسے کئی مرتبہ بتایا تھا کہ صولت دو سروں کی ہر شے کی حرص تھی۔ خواہ وہ پیر میں پڑی چل ہی کیوں نہ ہو۔ ترانہ اس کی اس عادت سے حد درجہ ہزار بھی اور خاص طور پر اپنے پیروں کے پرنٹ اور ڈیزائن اس وقت تک چھپائے رکھتی تھی جب تک پہن نہ سیتی۔
 ربیعہ کے ذہن کے کسی گوشے میں پڑی ہوئی بات کھولنے سے کسی کی مانند خوش قسمتی سے چل گئی تھی۔

”ارے کینی ... ناشتہ ہی کروادے۔۔۔ مل گھنٹہ بھر سے بیٹھی بکواس کیے جا رہی ہوں۔ ایک تو کسی بات ا ٹھیک طرح سے جواب نہیں دیتی ہو پھر چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا۔
 ناعمہ ثانیہ کی بے توجہی محسوس کر کے سلگ اٹھی تھی۔ ”منگنی“ پر ڈمکیں کرنے کے لیے وہ عالم اشتعال میں صبح اٹھ کر بنا کچھ کھائے پیے ہی وہاں پہنچ گئی تھی۔ ثانیہ لیکن میں مصروف تھی سو وہ بھی وہیں پڑے اسٹبل پٹھہ کرواں تبصرہ شروع کر چکی تھی لیکن اب اسے خیال آیا تھا کہ اول تو ثانیہ اس کی باتوں میں دلچسپی نہ لے رہی تھی دوئم اس نے اس کی کسی قسم کی خاطر مدارت کرنا بھی ضروری خیال نہ کیا تھا۔
 کاؤنٹر پر گیلادسٹر پھیر لی ثانیہ چونگی۔

”آج صبح تم ناشتہ بھی کر کے نہیں آئیں۔“ وہ عام سے انداز میں بولی۔ ”ٹھہرو میں بناتی ہوں چائے۔“
 ”تم بھی تو اکثر بغیر ناشتے کے آجاتی ہو۔“ ناعمہ اس کی بات سے مزید خفا ہو گئی۔ ”ہم بھی تو تمہیں پوچھتے ہیں کہ نہیں۔“
 ثانیہ کو ہنسی آگئی۔

”ارے بچی! تو کہہ دیا ہوتا میں پہلے ہی کروا دیتی ناشتہ تمہیں۔ اتنی دیر سے خواہش جی میں ہی دبائے بیٹھی ہوں اور اطلاعاً عرض ہے محترمہ! کہ میں جب بھی بنا ناشتہ کیے تمہارے ہاں آتی ہوں تو اس بات کا خیال ہمیشہ ورہ آلی کرتی ہیں۔ تمہیں کبھی یقین نہ ہوئی۔“
 ”میں تو کرنا ہی ہے خیال۔“ اس نے دیدے منکائے۔ ”ویسے تمہاری عدم توجہی مجھے بہت کھل رہی ہے، مہی چاہتا ہے تمہاری گدی پر ایک مکال گاؤں اور گھر چلی جاؤں۔“

وہ پھر ہنستے ہوئے چائے کاپی رکھنے لگی تھی۔
 ”میری گدی پر یہی کرم نوازی کیوں بھیجی؟“
 ”بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے گدی ہی اکڑتی ہے نا اس لیے۔“
 ”میں نے کیا بے نیازی دکھائی ہے؟ مسلسل تو باتیں کر رہی ہوں۔“ وہ اپنا کام نمٹا چکی تھی۔ سو دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اس کے سامنے آ بیٹھی۔
 ”بے رنگ باتیں، وہ بھی غائب دعاغی سے۔ جواب یوں دے رہی ہو جیسے کوئی احسان کر رہی ہو۔“ ناعمہ کافی خفا ہو چکی تھی۔

ثانیہ قدرے سنجیدہ ہوئی۔
 ”ناعمہ! تم نے کچھ محسوس نہیں کیا، عریشہ کے متعلق؟“

”وہ کیا؟“ وہ چونکی۔ اچانک ہی گفتگو میں دلچسپی در آئی تھی۔
 ”مجھے لگتا ہے وہ اس نئے تعلق سے ناخوش ہے۔“ ثانیہ نے چکن کے دروازے کو دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔
 ”ہائیں۔ اچھا۔ وہ کیسے؟“ ناعمہ نے اپنا سر اس کے قریب کیا۔ ”ویسے لگتا تو مجھے بھی یہی ہے۔“ ثانیہ نے
 گھبراہٹ اور اچھے پانی کی شاں شاں سن کر اس میں بتی ڈالنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔
 ”جنس سے پر سوالیہ الفاظ کے بعد یہ تائید کا کیا مقصد؟“ وہ پوچھنے لگی۔
 ”میرا مطلب تھا تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا جو میں نے لگایا۔“ وہ ہنسیاں ہو کر بولی۔
 ”اس لیے کہ میرے پاس بھی ویسی ہی آنکھیں ہیں جیسی تمہارے پاس ہیں۔ تمہاری ذرا گول ہیں، میری لمبی۔“
 ”وہ جل کر گویا ہوئی۔

”گول ہوں یا لمبی، آنکھیں تو ہیں۔ شکر ہے خدا کا۔“ وہ قدرے براہمان کر بولی۔ ”دیکھتے ہیں ہم۔“
 ”عریشہ کا رویہ ٹھیک نہ تھا۔“ ثانیہ نے چائے چھان کر کپ اس کے سامنے رکھا اور ٹو سٹر میں سلاٹس ڈالنے
 لگی۔ ”اندھ فرائی کروں؟“

”میں نے بھی یہی محسوس کیا ہاں کرو۔“ ثانیہ جو لمبے پر فرائنگ پین رکھ کر فریج سے اندھ نکالنے لگی۔
 ”اس کی آنکھیں روئی روئی سی تھیں۔ رسم کے وقت اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ تک نہ جاگی۔“
 ”اندھا جلدی دو، میری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“
 اس نے ٹو سٹر میں سے ٹوٹ نکالے۔ ”ہاں دے رہی ہوں، میں مسلسل اسے کہہ رہی تھی کہ منگنی کے دن تو
 اپنا اتنی اداس نہیں ہوتیں۔“

”ثانیہ نے اندھا مل کر اس کے سامنے رکھا اور اپنا کپ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔
 ”لیکن وجہ میری سمجھ میں نہ آ سکی۔“ ثانیہ بولی۔ ”کیا اسے نافع بھائی پسند نہیں؟“
 ”اس کو پسند ہو سکتے ہیں؟“ ناعمہ نے قہقہہ لگایا۔ ”باؤلے سے۔“ ثانیہ اسے گھورنے لگی۔
 ”اپنا مطلب، کوئی برائی ہے میرے بھائی میں؟“

”نہیں۔“ وہ منہ چلاتے ہوئے بولی۔ ”برائی تو نہیں ہے کوئی بھی، بس وہ لڑکیوں کی دماغوں میں وہ خناس ہوتا ہے
 کہہ سکتے ہیں جسے۔“ فینٹسی۔۔۔ وہ نہیں کری ایٹ ہو پائی۔ اسے اسی کا دکھ ہو گا۔“
 ”ثانیہ کا کپ لبوں تک جاتے جاتے رک گیا۔ وہ تحیر سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”ارے واہ، یہ بات تم نے کہا ہے؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ منہ چلاتی رہی۔ ”میں نے ہی کسی ہے، میں ہی تو ہوں یہاں۔“
 اس کا چلتا ہوا منہ رکا، وہ اسے گھورنے لگی۔

”اپنا مطلب، میں اتنا بھی نہیں سوچ سکتی۔ تم آخر مجھے کتنا بے وقوف گردانتی ہو؟“
 ”بہت زبردست بات کہی تم نے۔“ ثانیہ ہنوز سوچ میں تھی۔ ”یہی ہوا ہے، لڑکیاں منگیتر کے نام پر کوئی ہوا
 اس میں جسے کسی نے پہلے نہ دیکھا ہو جو ایسا ہو کہ بس پھر سب ہی اسی کو دیکھیں۔ واہ واہ ہو۔ لڑکے کی مہینوں
 پہ ڈھواں ہوتی رہے، لڑکی کی قسمت پر سالوں رشک کیا جائے۔ میرا معصوم سا بھائی ابھی اپنی عمر کے حساب سے
 بڑا سا ادا سا ہے۔“

”مسخو ہے مسخو۔“ ناعمہ نے فوراً کلزا لگایا۔
 ”ثانیہ نے پھر اسے بری طرح گھورا۔

”میں کچھ دے ماروں گی تمہارے سر پر۔“ اس کا تخیل جواب دے گیا۔ ”کیوں ہونے لگا میرا بھائی مسخو؟ ہنسی
 والی تو سب ہی لڑکے کرتے ہیں اس عمر میں۔“

”اچھا۔ دیکھو۔“ ناعمہ نے کام پٹنا کر پٹے کے پلو سے منہ پونچھا۔ ”فرض کرو، تمہاری نسبت علی سے طے

کر دی جائے۔

”کیا؟“ وہ بھڑکی۔ ”یہ کیا فضول بات کی تم نے؟“

”اگر ایسا ہو جائے تو کیسا ہے۔ خوش ہوگی تم؟“

”تم کرونا اس جو کرے، میرا نام کیوں لے رہی ہو۔“ وہ بھنائی۔

ناعمل نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

”دوسروں کے بھائی جو کہیں اور تمہارا بہت ڈینٹ اور شائستہ کیوں؟ اسے کوئی مضحکہ نہیں کہہ سکتا

ہی تھیلی کے تو ہیں سارے۔“

”دیکھیں علی؟“ غامیہ کو تصور سے ہی الجھن ہوئی۔ ”نہیں بھی۔“

”تب ہی تو وہ بے چاری رو رہی تھی۔“ ناعمل نے آہ بھری۔

9 ✓ سکاٹیری چارہ گر، ترے بن میرا ہر خواب بے رنگ، بے اثر
میری ہر نگاہ بے سمت ہے، میرا ہر سخن یونہی بے اثر
نیری شام کا ہر ایک رنگ، ہاں چلا گیا ترے سنگ سنگ
یہاں رہ گئے ترے منظر یہ اجاڑ اجاڑ سے بام و در
مرے ہر زخم کا علاج تو، مری ہر خوشی میں شریک تو
تو ہی رہنا تو ہی راستہ تو ہی رہ گزر تو ہی ہم سفر
جو نہیں ہے تو، تو تیری قسم یہاں کوئی دل سے نہیں مرا
مری ہم قدم میرے ساتھ آ، کہ ویران ہے مری رہ گزر

ہاشم پریشانی سے صفحے پر ابھری تحریر دیکھتا رہا پھر اس نے نگاہوں میں تحیر اور الجھن بھر کر اس کی سمت دیکھا

”یار رافع ایسا ہے تو نے لکھی ہے؟“

انگلید میں پکڑے، بال پوائنٹ کی نوک منہ میں لیے رافع نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا پھر وہ ہنس

”یقین نہیں آتا۔“ اس نے کتاب بند کر کے ہاشم سے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”مجھے خود نہیں آتا۔“ وہ پریشانی سے بولا۔ ”یار ہاشم! عشق تو کر رہا ہے اور خوشبو مجھ سے پھوٹنے لگی ہے۔“

کیا اجزا ہے؟

ہاشم خالی الذہنی سے اسے تکتا رہا۔ رافع اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑکی تک گیا اور سلائیڈنگ ڈور کھسکا دیا۔ ۳۲
پھولوں سے لدی ہوئی بیل اس کے سامنے جھولنے لگی۔

”میں تیرے عشق کے جذبے سے متاثر ہو گیا، یہ سچ ہے ہاشم! مجھے تجھ پر رشک آنے لگا۔ تیری آنکھوں

پھوٹی وہ مقناطیسی روشنی مجھے سسرا اتر کرنے لگی۔ ٹھک ہے لیکن۔ لیکن یہ سب کیا ہے؟ میں یہ سب

کیسے لکھنے لگا؟ ایک۔ ایک ان جانی خوشبو ہے ہاشم! جو مجھے کھینچتی ہے۔ میرا ہاتھ تھام کر اس میں فلم دیتی ہے۔

میرے دماغ کی گہری کھنڈ لگتی ہیں۔ مجھ میں جذبے بیدار ہونے لگتے ہیں۔ میں ان جذبات کو نہیں پہچانتا۔

اب سے پیشتر انہیں کبھی محسوس نہیں کیا۔ بس لگتا ہے خوشبو ہی خوشبو ہے۔ میرے اندر۔ میرے باہر۔

ان جذلوں کو میں محض خوشبو کا نام دے سکتا ہوں۔ ان سے میری بس اتنی ہی شناسائی ہے جتنی کسی انجان کی مگر

کرتی ہوئی خوشبو سے ہو سکتی ہے۔ یہ خوشبو مجھے مغلوب کر ڈالتی ہے۔ میں سوچتا ہوں اور لکھتا ہوں۔ لکھتا

جاتا ہوں۔ صفحے پر غزل بن جاتی ہے۔“

اس نے مڑ کر ہاشم کو دیکھا جو سحر زدہ سا ہو کر اسے تکتا رہا تھا۔

”ایسا یہ سب کچھ؟“ اس نے قدرے جھنجھلا کر پوچھا۔ ”میرا بی چاہتا ہے میں ان احساسات کو کھینچ کر خود
 مطالعہ کروں۔ میں اس طرح سے سوچنا نہیں چاہتا۔“
 ”میرے اختیار پر مسکرا دیا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر رافع تک پہنچا اور اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔ کچھ دیر وہ
 اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔
 ”تم نے سنا ہے رافع! محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔“ رافع خاموشی سے اس کی آنکھوں
 میں دیکھتا رہا۔

”رافع! میں تجھے مزاجا“ بیل کہتا تھا جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر کولو کے گرد گھومتا ہے۔ میں کہتا تھا تو نرم جذبوں
 کی ماری رو بوٹ ہے۔ تیری بیوی رویا کرے گی۔ میں تجھے ایسا بندر سمجھتا تھا جو محبت کی اورک کا عالیشان ذائقہ
 محسوس ہی نہیں کر سکتا۔“

رافع ہنس پڑا۔

”جی ہاں تو ہے۔“

”میں رافع! نہیں۔ غلط تھا سب کچھ، میرے یا۔۔۔ تو تو۔۔۔ تو تو بہت حساس دل کا مالک ہے۔ کہاں چھپا رکھا
 ہے ان نرم کی گول جذبوں کو۔ تیرے جذبات تو بہت خاص ہیں، خاص الخاص ہیں۔ میں شہلا کو ٹوٹ کر چاہتا
 ہوں لیکن اس کی تعریف میں ایک مصرع نہیں کہہ سکتا۔ تیرے محبوب کا تصور جب اتنا پورا فل ہے تو محبت کا وجود
 مجھے اندر آگ لگا دے گا۔ تو سرے پاؤں تک روشن ہو جائے گا۔“

”ہاشم!“ رافع نے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا دیے۔ ”مجھے بد دعا مت دے میرے بھائی۔ سنا ہے سچے
 ماٹوں کی دعا میں بہت اثر ہوتا ہے۔ میں کسی کو نہیں چاہتا۔ تو جانتا ہے میرا رستہ روشن اور واضح ہے۔ میں اسی
 رستے پر چلنا چاہتا ہوں۔ میں کسی کو دکھ دینا نہیں چاہتا اور محبت بہت دکھ دیتی ہے۔“
 ”محبت دکھ دیتی ہے سچ ہے۔ لیکن ان دکھوں کا مزہ بہت جداگانہ ہے۔ یہ خوشیوں کے نشے کو مات کرتا ہے یہ
 اچھا ل کر دیکھ لے جو یقین نہ ہو تو۔“

”ہاشم ڈونٹ ٹیل می۔“ وہ استہزائیہ ہنس دیا۔ ”میں بندر بنا رہنا چاہتا ہوں۔ میں عافیت چاہتا ہوں۔“
 ”میرے پیارے!“ ہاشم مزے سے پیر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ ”مرزا غالب بڑے کام کی باتیں بتا گئے ہیں، وہ کہتے

ای۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
 کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

رافع کچھ سوچنے لگا تھا۔ اور ہاشم کے لبوں پر مسکان تھی۔



دروازے کی جانب پشت کیے بیٹھی تھی۔ ایسا اس نے دانستہ کیا تھا کیونکہ وہ ترانہ کے لائے ہوئے پرائیکٹس
 کا مطالعہ کر رہی تھی۔ سو وہ نہیں چاہتی تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے کسی بھی فرد کی نگاہ اس پر پڑے۔
 وہ بے حد دلچسپی اور جتنو سے صفحات پلٹ رہی تھی۔ جب اسے اپنی پشت پر لباس کی سرسراہٹ محسوس
 ہوئی۔ رعبہ نے جھٹ پر پرائیکٹس تکیے کے نیچے سر کا دیا۔ تکیے کے اوپر ایک گھریلو قسم کا میگزین رکھا تھا۔ وہ اس کے
 صفحات پلٹتے ہوئے کمرے میں داخل ہونے والے شخص کے متعلق قیاس کرنے لگی۔ کچھ دیر گزر گئی۔ آنے
 والے نے اپنی آنکھوں کو شدید خفیہ رکھنا چاہا تھا۔ رعبہ کو ابھن ہوئی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو تصور ہنسنے لگا۔
 ”تمہیں بتا چل گیا تھا نا کہ میں آ رہی ہوں۔ لیکن تم بہن رہی تمہیں۔“

رعبہ کو کوفت بھری ابھن نے آگھیرا۔ اس گھر کے سب ہی کمین ایک خاص طرز فکر کے حامل تھے، سوائے
 ترانہ کے۔ ترانہ کو کچھ اس کی تعلیم نے اور کچھ اس کی جادو اثر محبت نے یکسر تبدیل کر دیا تھا۔

”تصور بھائی! میں ذرا مصروف ہوں پلینز۔۔۔“ اس نے ٹھنڈے اور مصالجانہ لہجے میں کہا۔
دوسرے لفظوں میں اس نے منہ ب انداز میں تیار رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ تصور وہیں صوفے پر بیٹھا گیا۔

”میں تمہیں کوئی کام تو نہیں بتا رہا بیٹھا ہوں بس۔“
اس گھر میں کل تین کمرے تھے۔ ایک مکمل طور پر منور امین کے نام تھا۔ گھر کا ہر فرد اس کمرے کے سامنے سونا آہٹ کیے گزرتا تھا کہ کہیں وہ اسے پکار نہ لیں۔
دوسرا کمرہ لڑکوں کے نام تھا۔ تصور اور تمدن دن میں تو اکثر موجود نہ ہوتے تھے، البتہ رات کو دونوں ایک ہی کمرہ شیئر کرتے۔ تیسرا کمرہ ترانہ، صولت اور مینا استعمال کرتی تھیں۔ سوا رب ربیعہ بھی ان کی چوتھی روم میٹ بن گئی تھی۔
ربیعہ کا بی چاہا کہ وہ تصور کو صاف طور پر دوسرے کمرے میں جانے کے لیے کہے لیکن وہ بے حد مصلحت پسند لڑکی تھی۔ ہر معاملے میں وہ وہاں تک جھک سکتی تھی جہاں تک جھک جانا اس کے اختیار میں ہوتا تھا۔
”اچھا۔۔۔ آپ بیٹھیں، میں چلی جاتی ہوں۔“ وہ آرام سے کہتے ہوئے اٹھنے لگی۔
”میں کیا تمہیں کاٹ رہا ہوں۔“ وہ غٹک کر بولا۔

ربیعہ چند ثانیوں کے لیے رکی۔
”میں کچھ دیر سکون سے بڑھنا چاہتی ہوں تصور بھائی! ایسا محض تمنائی میں ہی ممکن ہے، ورنہ مجھے آپ کے یہاں بیٹھنے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

”تم خود کو کچھ سمجھتی ہو۔“ وہ قدرے خفگی سے بولا۔ ”تم سے جتنا پیار سے بات کرو، تم اتنا ہی بھاگتی ہو۔ اگر مجھ میں برائی کیا ہے؟“

ربیعہ ایک سانے کے عالم میں رہ گئی۔ تصور اس سے کیا چاہتا تھا؟ اس کے سامنے بالکل واضح ہو گیا۔ اسے کہہ میں نہ آیا، وہ کس رد عمل کا اظہار کرے۔ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اسے بد ریا د آیا، حاکم یاد آئے۔ نفسانی خواہش کی کچھڑ سے لت پت مرد۔ اسے تصور سے کراہیت محسوس ہوئی تھی۔
اسی لمحے صولت اندر آئی۔ اس کی نگاہوں میں غصہ تھا۔ اس نے تصور کو دیکھ کر بڑی کاٹ دار نظروں سے ربیعہ کو دیکھا۔ غائب دماغی کی کیفیت میں مبتلا۔ ربیعہ اس کی نظروں کے تیور نہ سمجھ پائی۔
”مجھے چائے چاہیے۔“ وہ غصے سے بولی۔ ”میرے سر میں سخت درد ہے اور تم یہاں کھسی بیٹھی ہو۔ بیٹھ بیٹھ کر تمہاری کمر نہیں دھکتی؟“

”تم خود کیوں نہیں چائے بنا تیں؟“ تصور بھی جیسے پھٹ پڑا تھا۔ ”ہڈ حرام کہیں کی۔ دو چار گھنٹے باہر گزار کر تم لو کو بہت قابل سمجھنے لگی ہو۔“

”میں نے آپ سے بات نہیں کی۔“ وہ تڑخ کر بولی۔
”میں منہ توڑ دوں گا تمہارا۔“ وہ غرایا۔

ربیعہ سم کر کمرے سے باہر نکل گئی اور کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔ اس کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ اس طرح کی چویش اس کے لیے بالکل انوکھی اور ناقابل برداشت تھی۔
کچھ ہی دیر میں باہر کا گیٹ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ تصور شاید گھر سے چلا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد صولت کچن میں آئی۔ اس کا چہرہ سن ہو رہا تھا۔

ربیعہ نے اسے مخاطب نہ کیا۔ صولت کھڑی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔
”یہ تم ہر وقت تصور بھائی کے پہلو سے کیوں لگی رہتی ہو؟“ وہ بد تمیزی سے بولی۔
”کیا؟“ ربیعہ اچھل ہی پڑی۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟“

"کیوں؟ کچھ غلط کہا میں نے؟ کبھی تم ان کے ساتھ چھت پر خوش کپیاں کرتی ہو؟ کبھی وہ تمہارے ساتھ کچن میں کھسے ہوئے ہوتے ہیں؟ کبھی کمرے میں اور یہ تو آنکھوں دیکھی بات ہے۔ ہم گھر میں نہ ہوتے ہوں گے تو ہاں۔"

اس کے باقی الفاظ ابھی منہ ہی میں تھے کہ اس کے گال پر ایک زوردار تھپڑ پڑا۔
"اگلاس بند کرو کھنٹی لڑکی۔" وہ ترانہ تھی جو نجانے کب وہاں آئی تھی۔
صوت گال پر ہاتھ رکھے اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگی۔ ربیعہ ہکا بکا کھڑی تھی۔ کبھی وہ صولت کے اظہار پر غور کرتی، کبھی ترانہ کے تیوروں پر، کبھی صولت کے گال پر پڑنے والے تھپڑ پر۔
"تم نے مجھمارا ہے؟" صولت غرائی۔

"کوئی شک ہے تمہیں؟" وہ اطمینان سے بولی۔ "مگر ہے تو تاؤ۔"
"میں۔ میں امی کو بتاتی ہوں ساری بات۔ آنے دو ذرا امی کو۔ اس کھنٹی کے کروت بھی بتاؤں گی میں۔ دیکھنا پسند لیل ہوتی ہے یہ۔"

لاہور سے باہر جانے لگی۔ اچانک ہی ترانہ نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور اسے واپس اندر کھینچ لیا۔
"منو صولت! اگر تم نے اپنی گندی زبان سے ربیعہ کے متعلق کوئی بکواس کی تو میں تمہارا حشر کروں گی اور تم اس معصوم کے کون سے کروت گنواؤ گی؟ کروت تو پھر میں تمہارے گنواؤں کی سب کو۔ یہ مت سمجھنا کہ مجھے کسی احد کی خبر نہیں ہے۔"

صولت پتھر کی ہو گئی۔ ترانہ نے اس کے بال چھوڑ دیے تھے لیکن وہ وہیں کھڑی رہی۔ اس کے چہرے سے لمحہ کافور ہو چکا تھا۔
"اگر پیچھو نے مجھ سے یا ربیعہ سے اس واقعہ کے متعلق کوئی استفسار کیا تو یاد رکھنا۔" ترانہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا۔ "میں انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔"

صولت بے حد تیزی سے چن سے باہر نکل تھی۔ ترانہ نے جیسے کسی بھرے ہوئے غبارے کو سوتلی لگا دی تھی۔
ربیعہ کی پلکوں پر اشک چمکنے لگے۔ ترانہ نے اسے خود سے لگا لیا۔
"یہ پتھر تمہیں مارنا چاہیے تھا ربیعہ۔" وہ ہولے سے بولی۔ "میں حقوق ہمیشہ اپنے پاس سنبھال کر رکھوں۔"
ربیعہ خاموش کھڑی آسوی پتی رہی۔ اسے کسی کے سامنے رونا بہت مشکل لگتا تھا۔
"ماتے دیکھو ربیعہ! ذرا صولت جیسی ہو گئی ہے۔" ترانہ آہستگی سے بولی۔
مسلسل ابلتی ہوئی کالی چائے دیکھ کر ربیعہ کو ہنسی آگئی۔

شہلا ایک دم ہی پریشان ہو گئی تھی۔ ہال کا منظر اس کے لیے بے حد کنفیوز کر دینا والا تھا۔ وہ اپنی ڈیوٹی پوری لے کے ابھی ابھی لوٹی تھی۔ اپنی سفید آٹھو سے اتر کر وہ بے دھیانی کے عالم میں تین سیڑھیاں چڑھ کر۔ ٹھکی ٹھکی ملاؤں میں داخل ہوئی تھی اور پھر دورازے میں ہی ٹھہر گئی تھی۔
اندر بڑے بڑے میروں صوفوں پر محفل بھی ہوئی تھی۔
ہاٹنے ہی ایتقان بیٹھی کھلکھلا رہی تھی۔ اس کے پہلو میں مومن اور عمر بیٹھے ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

ایتقان کے دائیں جانب پڑے ہوئے دو صوفوں پر ماہین اور منہزہ بیگم پر اجمان تھیں۔ وہ دونوں بھی کسی دلچسپ احد پر مسکرا رہی تھیں۔ انیفقہ سینئر ٹیبل کے پاس فلور کشن رکھے بیٹھی تھی اور یکوں میں چائے انڈیل رہی تھی۔ اس خوش رنگ ماحول کو دیکھ کر بے ساختہ ہی اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ وہ ایتقان کو اچھی طرح سمجھتی تھی، وہ جو کتنی

تھی، گر گزرتی تھی۔ سو یقیناً وہ اس کے لیے ہاشم کا باضابطہ پروپوزل لے کر آئی تھی۔ ماہین کا اس کے ہمراہ ہونا اس بات پر صاف تھا۔

شملائے اپنی ہتھیلیوں پر نمی اترتے ہوئے محسوس کی۔ اسے اس ماحول کا حصہ بننے کے خیال سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ کیا عجیب موڑ تھا زندگی کا۔ اس کی شادی بھی ہوئی تھی، اولاد بھی اور پھر طلاق بھی ہوئی۔ لیکن اس وقت وہ نو عمر لڑکیوں کی سی گھبراہٹ اور شرم کا شکار تھی کیونکہ زندگی میں کبھی اس طرح کا موقع آیا ہی نہ تھا۔

”بیٹھے۔۔۔ جن کے انتظار کی گھڑیاں گن رہے ہیں۔ وہ وہاں چوروں کی طرح کھڑی ہیں۔“ ایقان چونکہ متقابل بیٹھی تھی اس لیے شاملہ سب سے پہلے اسی کی نظر پڑی۔ ”اُدھر آؤنا یا ر!“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ شاملہ من بھر کے قدم اٹھاتی وہاں تک پہنچی اور دھیمی آوازیں سلام کیا۔ ”وعلیکم السلام۔“ ایقان نے اسے ساتھ لگا لیا۔ ”ہم کب سے آپ کے منتظر ہیں ڈاکٹر صاحبہ! آپ کو اپنے مریضوں سے فرصت نہیں۔ کچھ مریض محبت کا بھی خیال کیجئے۔“

آخری جملہ اس نے سرگوشی میں اس کے کان میں کہا تھا۔ شاملہ نے خفگی سے اسے گھورا۔ اس نے فوراً زبان دانتوں تلے دبائی۔

”تم نہیں سدھرو گی۔“ شاملہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔

”میرا میاں بھی یہی کہتا ہے۔“ وہ مزے سے بولی۔

شملہ کی نگاہ خاموش بیٹھی ماہین پر پڑی۔ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ ماہین کی جوابی مسکراہٹ میں رسمی انداز تھا۔

”یہی ہی خوش دلی مفقود تھی۔ شاملہ کا دل لڑکھڑایا۔

”اگر اجازت ہو تو میں چیخ کر لوں؟“ وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

”جی نہیں۔“ ایقان نے اسے ہاتھ کھینچ کر اپنے پاس بیٹھالیا۔ ”کوئی اجازت و اجازت نہیں ملے گی یہاں سے کھسکنے کی اور ان کپڑوں میں بھی ٹھیک ہی لگ رہی ہو۔“

پھر اس نے رک کر مومن اور عمر کو دیکھا۔ ایمان کو وہ عذر الیم کے پاس چھوڑ آئی تھی۔

”بیٹا۔۔۔ آپ لوگ باہر کیوں نہیں کھیلنے گان میں بہت مزہ آئے گا۔“

وہ دونوں جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔ کھلکھلاتے ہوئے پاہر کی سمت ہو لیے۔

”شملہ بیٹی!“ منیہہ الیم بے حد و حساب خوش نظر آئی تھیں۔ ”یہ لوگ تمہارے لیے پروپوزل لائی ہیں۔ ماہین کے بڑے بھائی اور ایقان کے بھتیجے ہاشم صاحب کا۔ آپ تو جانتی ہی ہوں گی انہیں۔ برسوں سے آئی جاتی ہیں

”جی امی!“ شاملہ کی ساری خود اعتمادی ہوا ہو رہی تھی۔ وہ بے حد خفت کا شکار تھی۔

”بیٹا۔۔۔ ظاہر ہے ایسے فیصلوں کا اچانک ہو تو نہیں سکتے۔ تمہیں بھی سوچنے کو کچھ وقت درکار ہو گا لیکن انہیں

اور میں۔۔۔ ہم دونوں تو اتنے مطمئن ہیں کہ ہماری جانب سے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہ اٹھے گا۔ باقی تمہاری رائے

مقدم ہوگی۔ عباد سے بھی پوچھ لیں گے، کیا کہتی ہو گی۔“

شملہ کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان میں بے ساختہ بھرنے والا پانی کوئی نہ دیکھ سکا۔

ایقان نے شوخی سے اسے کہنی ماری۔

”ہاں بولو نا۔“

”میں آتی ہوں۔“ وہ اتنا ہی کہہ پائی اور اٹھ کر تیزی سے اندر کی سمت بڑھ گئی۔

”شراباری ہے، پاگل لڑکی۔“ ایقان اطمینان سے پلیٹ صاف کرنے لگی تھی۔

اسے شاملہ کا جواب پہلے ہی مل چکا تھا اس کا اطمینان بے وجہ نہ تھا۔ ماہین پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔ انہیہ کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔

”آئی! انفقہ نے کافی کام سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر محبت سے اس کے سوچے ہوئے پوٹوں کو دیکھا پھر وہ اس کے لبہ بیٹھ گئی۔

”ہول! شملہ نے کتاب پر سے نگاہ نہ اٹھائی تھی۔

”اور دیکھیں میری طرف۔“ وہ شرارتاً مسکرائی۔

شملہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے کتاب بند کر دی اور سوالیہ نظروں سے اس کی سمت دیکھنے لگی۔

”بصرت سیاہ آنکھیں متورم تھیں۔

انفقہ نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

”ہو گولڈن چانس ہے آئی! اسے مس نہ کریں۔ تقدیر نے آپ کو آپ کی سابقہ خطائیں معاف ہو جانے کا صلہ دیا ہے۔ ریاضت کا صلہ مل رہا ہے۔ فوراً سے پیشتر ہاتھ بڑھادیں۔“

شملہ نے نظریں چرائیں۔

”ہر طرح کی الجھنوں سے چھٹکارا مل جائے گا آپ کو۔ مجھے آپ کی راہوں میں دور تک گلاب بچھے دکھائی دے رہے ہیں۔“

”یگی! شملہ نے مسکرا کر سر جھٹکا۔ ”راہ تو بس وہیں تک نظر آتی ہے جہاں پر قدم ہوتے ہیں۔ گز بھر کے کیا ہے گولی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم نے دور دور تک سب دیکھ لیا۔“

”ایا امکان تو اچھا رکھنا چاہیے نا۔“ وہ رسانیٹ سے بولی۔ ”تمنا کے گلزار میں ہمیشہ خوش رنگ پھولوں کا میلہ ہوتا ہے۔ یہی جینے کی اساس ہے۔“

”تمنا کا گلزار۔“ وہ اداس ہو گئی۔ ”تمنا کا گلزار تو صحرا کا ٹھکانہ ہے یگی! اس کی حد سے بڑے دور دور تک لگتا ہوا رنگ زائے۔ تمنا کا گلزار وہم ہے، دھوکہ ہے۔ حقیقت ریگزارِ تمنا کی طرح اچانک نگاہ کے سامنے آتی ہے۔ پھول، پتے، پودے، پانی سب سراب ٹھہرتا ہے اور انسان عمر بھر اسی سراب کے پیچھے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ تمنا ہی مزا سانی ہے سب کو۔“

”افوہ! اس نے شملہ کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ ”تبی خون کا باتیں۔ کہ جن پر ایک بار یقین آجائے تو اس جینے کا ارادہ ہی ترک کر دے۔ گلزارِ تمنا، جینے کا ارادہ ہی تو ہے۔“ شملہ مسکرا دی۔

”ایا ہے تو پھر ریگزارِ تمنا زندگی ہے۔“

”قلوبیت کی انتہا۔“ انفقہ نے اسے بری طرح گھورا اور یکایک ٹون بدل لی۔

”مہمترہ شملہ محسن علی صاحب! قدرت اس ریگزار سے باحفاظت گزرنے کے لیے آپ کو ایک عدد ٹکڑا اونٹ لایا کر رہی ہے۔ میرا اشارہ جناب ہاشم فاروق حسن کی جانب ہے۔ بولے آپ کو منظور ہے؟“

شملہ غم پلوں کے ساتھ اچانک ہی ہنس دی۔ اس کی ہنسی بے ساختہ اور شفاف تھی، ہر وہم اور اندیشہ ایک آنفقہ نے اسے ہنسا دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

”انفقہ! شملہ یکایک سنجیدہ ہو گئی۔ ”عمر۔ بہت سمجھ دار بچہ ہے اور اب تو وہ اپنے باپ سے بھی مل چکا ہے۔ اندیشہ ہے کہ یہ واقعہ اس کے ذہن کو متاثر کر سکتا ہے۔“

”جناب! عمر سے زیادہ سمجھ دار ہاشم فاروق حسن ہیں جو اکثر و بیشتر اسے پارک میں مل کر پہلے ہی بہت متاثر کر لیتے ہیں۔ وہ ذہنی طور پر ان کے قریب ہو چکا ہے اور مجھے اکثر ان کی باتیں بتاتا ہے۔ مجھے یقین ہے عمر اس نئے گولڈن چانس سے قبول کر لے گا بشرطیکہ۔“

”کہتے کہتے رک گئی۔ شملہ نے اس کی جانب دیکھا۔

”ہشٹیک۔“ کہیں سے گڑبڑ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔“

”اس کی گارنٹی کون دے سکتا ہے۔“ شملہ نے سر جھٹک لیا۔

انبیقہ کی آنکھوں میں ایک فیصلہ کن سوچ ابھری تھی۔

گلاس ڈور کے باہر نافع کھڑا نظر آ رہا تھا۔ کچن سے نکلتی عریضہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر اس کے اندر منہ تاپسندیدگی کی ایک لہر اٹھی تھی۔

وہ مڑ کر دوبارہ کچن میں گھس گئی۔ فردوس بیگم نے پلٹ کر اسے دیکھا۔
 ”لڑکی! میں کہتی ہوں علی کو جگا دو۔ اس نے کہا تھا گیارہ بجے جگانے کے لیے۔“
 ”جگا دیتی ہوں۔“ وہ بیزار سی سے بولی اور دروازے کی جانب پشت کھڑی رہی۔
 ”ارے۔“ وہ متعجب ہوئیں۔

اسی لمحے دروازے میں نافع نمودار ہوا تھا۔
 ”السلام وعلیکم تائی امی!“ وہ کچھ جھینپا دیکھائی دیتا تھا۔
 فردوس بیگم کے تاثرات آن واحد میں تبدیل ہوئے تھے۔ وہ ماتھے کی سلوٹیں پھپھا کر مسکرانے لگیں۔
 ”وعلیکم السلام بر خوردا۔۔۔ جیتے رہو۔۔۔ خیر سے ہو؟۔“

”جی۔۔۔“ اس نے بے مروت پر بے خبر نگاہ کی۔ ”سلی اور حمزہ کہاں ہیں تائی امی! ہمیں یونیورسٹی جانا تھا۔“
 ”نب سے تو کہہ رہی ہوں اس لڑکی کو! انہیں جگا دے، جگا دے۔ سستی ہی نہیں ہے۔“ وہ بیزار سی سے بولیں۔
 ایک لخت انہیں کچھ خیال آیا۔ ”اے ہاں، بے چاری مصروف بھی تو ہے صبح سے۔ میرے ساتھ لگی ہوئی۔۔۔
 مسلسل۔ یہ لڑکے ہی بڑے ڈھیٹ ہیں، اٹھ کر نہیں دیتے۔ جاؤ بیٹا! تم خود ہی جگالو انہیں، اوپر اپنے کمروں میں
 ہیں۔“

”جی ہست۔“ وہ فوراً غائب ہوا۔
 فردوس بیگم نے اس کا پتھر پلا چہرہ بغور دیکھا مگر پھر انجان بن کر کینبٹ میں ہاتھ مارنے لگیں۔

اس نے بڑی تلاش بسیار کے بعد نمبر کھو جاتا تھا۔ وہ شہلا سے بھی پوچھ سکتی تھی لیکن وہ یہ کام بہت خفیہ طور پر انجام دینا چاہتی تھی۔

نمبر ملا کر وہ دوسری جانب جاتی ہوئی نکل سننے لگی۔
 ”پہلو۔“ ریسیور ابرار نے اٹھایا تھا۔ اس کے انداز میں بلا کا اشتیاق تھا۔ غالباً اس نے سی ایل آئی پر آنے والا
 کال کا نمبر بغور دیکھا تھا۔

انبیقہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔
 ”السلام علیکم! میں انبیقہ بات کر رہی ہوں۔“
 ”وع۔۔۔ دعلیکم السلام۔“ وہ تحریر میں مبتلا ہوا۔
 غالباً اس کے کمان میں بھی نہ تھا کہ دوسری جانب انبیقہ ہو سکتی ہے۔
 ”کیسی ہو کئی!“ وہ برسوں پہلے اسے اسی انداز سے پکارتا تھا۔

”فائن۔“ وہ ر سا بولی۔ ”میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں آپ سے۔ ٹائم ہے آپ کے پاس؟“
 ”شیور۔“ وہ بے حد خوش لگتا تھا۔

انبیقہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ابرار کی اس قدر خوشی کی وجہ اسے سمجھ میں نہ آ سکی۔ برسوں پہلے ٹوٹنے والے
 رشتے کے بد اثرات سیاہ بادلوں کی طرح ان کے گھر کی خوشیوں تک پہنچتی روشنیوں کا رستہ روکے کھڑے تھے۔
 گمان غالب تھا کہ دوسری جانب بھی اس حادثے کا اثر خوش کن تو ہرگز نہ ہو سکتا تھا پھر اس بے طرح خوش دلی کو
 کیا وجہ تھی وہ چند لمحوں کے لیے سوچتی رہ گئی۔

”ہیلو۔“ وہ اسے خاموش پا کر پکار اٹھا۔ ”کی۔اے۔اے۔ تم کچھ کہہ رہی تھیں۔ کیا بات ہے ایسی جو تمہیں مجھ سے
 گفتگو کرنے کا جبر کرنا ناخود پر۔“

اس کی بارفون پر اس کی بدتمیزی سے واسطہ پڑ چکا تھا سو وہ بہت محتاط ہو رہا تھا۔
 ”کی۔اے۔اے۔ بات ہی کچھ ایسی ہے جو مجھے خود پر جبر کرنا پڑا۔“ اس نے صاف گوئی کا بے مثال مظاہرہ کیا۔ ”ورنہ
 آپ کی آواز سننے کی روادار نہ تھی۔ انسان اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو بھول جاتا ہے۔ معاف کر دیتا ہے،
 اپنے پاؤں کا دکھ دیکھنا اور دکھ پہنچانے والے کو معاف کرنا ناممکن امر لگتا ہے۔ میں اپنی باری بہن کی
 اس میں پچھلے پانچ سالوں سے مسلسل آنسو دیکھ رہی ہوں۔ یہ پانچ سال اس کی عمر کے بہترین سال تھے یہ وہ
 قلاب ہر لڑکی صرف اور صرف مسکراتا جانتی ہے اور ہر موسم مسکراہٹ کے پھول اس کے جائز حق کی طرح
 اس کی گود میں ڈال کر گزرتا ہے۔ ہر موسم بہار کا موسم لگتا ہے۔ آپ نے اس کی زندگی کو خزاں کا گمن لگا دیا۔ وہ
 پھول گئی، مسکراتا بھول گئی۔“

”تم بھی کچھ بھول رہی ہو گی!“ وہ بے ساختہ اس کی بات کاٹ گیا تھا۔ ”بہن باس اگر اس نے کاٹا ہے تو یہ سزا
 لے لی اتنی ہی بھگتی ہے جتنی اس نے۔ اس کے پاس میرا بیٹا تھا، میرے پاس کیا تھا؟ اس کے پاس ”سچ“
 لے گا فوراً تھا، میرے حصے میں ندامت اور پشیمانی کے انگارے آئے تھے۔ انسان حق پر ہو تو سولی بھی سکون سے
 اٹھ جاتا ہے۔ ظلم و زیادتی کا احساس انسان کو نہ جینے دیتا ہے نہ مرنے دیتا ہے۔ میں نے ایک ایک لمحہ اس کرب
 کو سمجھنا شروع کیا۔ کاشکارہ کر گزارا ہے کی! کہ میں نے اس کے ساتھ کیا کیا جو کچھ بد نصیبی سے ہو گزرا وہ میری کوئی
 بھی سازش نہ تھی، اس کے نازک جذباتوں کا خون ہوا تو بخدا یہ قتل عمدہ تھا۔ بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ
 میری بہ نصیبی تھی۔ ابر کرم کی ٹھنڈی نرم پھوار سے رگ جال سیراب نہ ہو پائی تھی اور میری بد قسمتی نے ہاتھ
 مارا۔ یہ بند کر دیا۔“

اس کی آواز بھگ گئی۔ لہجہ بھر گیا۔ اس کرب میں سچائی کا احساس اس قدر واضح تھا کہ انہی قدم بخود رہ گئی اس
 کی دھڑکیں نہ ہو گئیں، ہتھیلیاں ٹھنڈی پڑ گئیں۔ اسے سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے کیا کئے کے لیے فون کیا تھا۔ ذہن
 اس کا دکھ اور سچائی کی گونجانی رہ گئی۔
 ”تم کہہ کر چلا جاتی تھیں کی!“ وہ خود پر قابو پا کر بولا۔

”میں۔ میں۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی ابرا بھائی کہ۔“ وہ ایک لخت بولتے بولتے ٹھہر گئی تھی۔
 ہٹا کی ازدواجی زندگی کے نہایت مختصر سے دور کی گم گشتہ یاد ”ابرا بھائی“ کی صورت اس کے لبوں پر چلی آئی
 اور نہ پچھلے چند ماہ میں اس نے ہمیشہ اسے نہایت متفر سے ”ابرا صاحب“ ہی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔
 ”میں یہ کہہ رہی تھی۔“ اس نے پست آواز میں اپنی گفتگو کا سلسلہ جوڑا۔ ”کہہ جو کچھ بھی ہوا سو ہو گیا۔ اب
 آپ سیاہ نصیبی کہیں، یاد بد قسمتی، حادثہ یا واقعہ۔ وہ دن بیت چکے، یادیں ماند پڑ چکیں۔ عمر کا وہ باب ختم ہوا۔
 آپ کا شاید احساس نہ ہو کہ یہ ساری پشیمانیوں، ندامتوں اور زیادتی کا احساس اس عظیم نقصان کا زائلہ کرنے سے
 امریں جو میری بہن کے حصے میں آیا۔ وہ تو خسارہ ہی میں رہی۔ وہ خود چون سا بھی سے ہی نہیں جینے کی تمنا تک
 محروم ہو گئی۔ اس کی آنکھوں نے خوش رنگ خوابوں سے کنارہ کشی کر لی۔ اس کے لبوں نے مسکراہٹ کو
 ہار کر کہہ دیا۔ اس کے باوجود دنیا کی ملا متیں، طنز، طعنے، تشنہ سب اس کی جھولی میں آگرے۔ آپ کو کس نے کیا کہا
 آپ کے پاس جیون سا بھی بھی تھا، بچے تھے۔ ”مرد“ اور ”حاکم“ ہونے کا طرہ اختیار بھی۔ ندامت، اس
 بارے کی ہم وزن نہیں ہو سکتی جو میری بہن کے حصے میں آیا۔ اس نے خود مطلقہ ہونے کا عذاب بھی سہا اور
 معصوم بیٹے کی باپ سے محرومی کا دل شکستہ نظارہ بھی بل بل دیکھا۔ آپ۔ آپ ہو سکتا ہے اپنی جگہ سچے
 لیکن شہلا آپ نے آپ کی نسبت کہیں زیادہ دکھ بھینسا ہے، اس باب میں آپ کو کوئی شک نہ ہونا چاہیے۔“
 اہار خاموش رہا، انہی کے لفظ لفظ میں بھی سچائی کا فرما بھی، سوا ب خاموش ہونے کی باری اس کی تھی وہ

دونوں ہی کچھ دیر چپ ہو رہے۔

”میں۔۔۔ کو بخش کر تو رہا ہوں انبیقہ! اس دکھ کا مداوا کر سکوں۔“ پھر وہ بولا۔

”آپ۔۔۔ اپنے آپ کو خوش کر رہے ہیں ابراہیمائی!“ وہ چاہتے ہوئے بھی ”صاحب“ نہ کہہ پائی۔ ”میں نے آپ کو ساتھ لے کر اسے محبت دے کر اس کی محبت پا کر آپ میری بہن کی اشک شوقی نہیں کر رہے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”کیجئے گا اگر اس طرح کی کوئی سوچ آپ کے ذہن میں ہے تو یہ غلط فہمی دور کر لیں۔ یہ سب کچھ تو مندرجہ ذیل زخموں کو پھر سے کھرنے والی بات ہے۔ آپ تو اپنے خون کے لیے تڑپ رہے ہیں۔“

”آسنہ نہیں ہے کئی!“ وہ دکھ سے بولا۔ ”میرا یقین کرو۔“

”میں یقین کر لہی لوں تو کیا ہو گا ابراہیمائی؟“ یہی ہوئی باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل؟ بہتر یہ ہے کہ ”آسنہ“ غور کیا جائے۔

”میں بھی تو یہی کہتا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”آپ غلط کر رہے ہیں۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس سے محض ایک معصوم ذہن کے پریشان ہو جانے کا اندیشہ

ہے اور بس۔“

ابراہیم کو اچانک ہی اندازہ ہوا تھا کہ انبیقہ اس گفتگو سے یکسر لاعلم تھی جو کچھ دن قبل اس کے اور شہلا کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ کچھ اور ہی کہنا چاہتی تھی۔

”آسنہ کے لیے تمہارے ذہن میں کیا ہے کئی؟“ اس نے محتاط روی سے پوچھا۔

انبیقہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ جیسے جو کچھ اس کے ذہن میں تھا۔ اس پر جی ہی جی میں غور کر رہا ہو، پھر اس نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا۔

”ابراہیمائی! ہم لوگ اپنا کی شادی کر رہے ہیں۔“

”کیا؟“ وہ ایسے بولا جیسے ٹھیک طور پر سنا نہ ہو پھر رکا ایک ہی نجانے کیا سوچ کر وہ دفععتاً ”خوشی سے بولا۔ ”واقعی؟“

انبیقہ کو اس کی ذہنی کیفیت پر تعجب ہوا۔

”ہم۔۔۔ ہم لوگوں نے اپنا کارِ شہ طے کر دیا ہے۔“ وہ پھر جتنے والے انداز میں بولی۔ ”مبادا ابراہیم اللہ سے ہو۔“ کچھ ہی عرصے میں باقاعدہ رخصتی عمل میں آجائے گی۔

”شہلا مان گئی؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

”جی۔۔۔ جی ہاں، مشکلوں سے سہی، لیکن مان گئی ہیں۔“ انبیقہ اب تک اس کے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے کنفیوژ ہو رہی تھی۔

”چھا!“ وہ ٹھنڈے اور ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ ”یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے۔“

”آپ۔۔۔ آپ کے اعتراض سے ہر چند کہ کوئی فرق تو نہیں پڑتا لیکن میں یونہی ایک غلط فہمی رفع کرنے کا غرض سے پوچھ رہی ہوں۔ آپ کو اپنا کی نئی زندگی شروع کرنے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“ ابراہیم نے اس سے فہم

جیسے اسے انبیقہ سے اس بےوقوفی کی امید نہ ہو۔

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے کئی؟“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”آپ عمر کی کسٹنڈی کا دعوا تو نہیں کر دیں گے؟“ وہ جیسے ڈرتے ڈرتے بولی۔

وہ چند لمحے اس کی کیفیت سے محظوظ ہوا۔

”مگر کروں تو؟“

”پلیز ابراہیمائی!“ وہ لالچت سے بولی۔ ”میں نے دراصل یہی بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ یہی اصل مقصد تھا جس کے لیے۔“

”تم نے خود پر جبر کیا تھا۔“ وہ بات کاٹ کر ہلکے سے ہنسا۔

میں معافی چاہتی ہوں کہ میں نے ایسا کہہ کر آپ کے جذبات مجروح کیے۔ درحقیقت جو کچھ آپ نے اپنی مثال میں کہا، اس نے مجھے بھی بے حد متاثر کیا ہے۔ میرے دل میں آپ کے خلاف غم و غصے کے جو کیف بادل تھے، اب آپ کے اعتراف سے جیسے چھٹ سے گئے ہیں۔ لیکن پلیز ابرار بھائی! میں ہاتھ جوڑ کر درخواست کرتی ہوں کہ اب میری بہن کو زندگی کی حقیقی خوشیوں کا لطف اٹھالینے دیجئے۔ اس کے بن باس پر رحم کھائیں۔ اگر واقعی اپنے کیے پر پشیمان ہیں تو اب اسے ایک اچھی اور مکمل زندگی کی شروعات کی دعوت دیجئے۔ عمر میں ایسا کی جان بند رہا اس کے ہونے سے ہے، اس کی سانسوں سے جیتی ہیں اس کی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔ اگر آپ نے اس کی قسم کی انتقامی کارروائی کا سوچا بھی تو میری بہن اس خیال سے ہی مر جائے گی۔ بولتے بولتے اس کا سانس اٹل لیا۔ الفاظ ساتھ چھوڑنے لگے۔ آنسو زبان بننے پر آمادہ ہوئے۔

”مگر مت کرو غی! وہ اطمینان سے بولا۔ ”میں ایسا کچھ نہیں کروں گا جیسا تم سوچتی ہو۔ شہلا کو نئی زندگی کی دعوت مبارک ہو۔ میرے دل میں اس کے لیے کوئی غصہ نہیں ہے۔“

”اوس۔ اور۔۔۔ عہ۔۔۔“ وہ اٹکنے لگی۔

”میں اتنا بھی کمینہ نہیں کہ میں ایک ماں سے اس کے جینے کی امید چھین لوں۔“

”اوس! اطمینان سے سکون کا سانس لیا۔

اس سانس میں ابرار کی قوت کے احساس کا اعتراف تھا۔ وہ مسکرا دیا۔

”مچھ سکتا ہوں کس کے نصیب جاگے ہیں؟“

”ہمارے دیرینہ ہمسائے ہیں۔ بہت عرصے سے اپنا کے طلب گار ہیں۔ خدا خدا کر کے اب اپنا کوان پر ترس لایا ہے۔ ورنہ اب تک تو وہ ہائی ہی نہ بھرتی تھیں۔“ وہ ہلکی پھلکی ہو کر اب سکون سے بول رہی تھی۔

ابرار کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔



”السلام علیکم ممانی جان۔۔۔“ ناعمہ خوش خوش اندر داخل ہوئی۔

لہدس بیگم کی بیوی پروگرام میں مچھ تھیں۔ چونک اٹھیں۔ ریموٹ سے آواز ہلکی کی۔

”وعلیکم السلام۔۔۔“ انہوں نے حسب عادت گہری نگاہوں سے جائزہ لیا۔ ”کہاں سے۔۔۔ ٹی بھاگی آ رہی ہو۔

بھڑکتے ہیں نا؟“

”مئی کی سب خیریت ہے۔ اللہ کا احسان ہے۔ عریضہ کہاں ہے؟“

”اپنے کمرے میں ہے۔“ انہیں قدرے تامل ہوا۔ ”بلکہ شاید سو ہی گئی ہو۔“

”چھا! ناعمہ کو حیرت ہوئی۔ ”اس قدر جلد تو وہ کبھی نہیں سوتی؟“

”اب بی! اہم جھوٹے ہیں! وہ اطمینان بھرے غصے سے بولیں تو وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

”نہیں۔۔۔ نہیں مائی جی۔۔۔ میرا مطلب یہ تو نہیں تھا۔ میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی۔

”ظن ہو گئے ہیں اس نے ایک چکر تک نہیں لگایا ہمارے گھر۔“ متعلق کو مایوں سمجھ بیٹھی وہ تو۔۔۔ مہ۔۔۔ میں دیکھ

اس کے کمرے میں۔ کیا خبر جاگ رہی ہو۔“

”مرضی ہے تمہاری۔“ بے رخی سے کہہ کر انہوں نے ریموٹ سے آواز پھر اپنی کروی۔ گویا اسے اذن

بھست عطا ہوا۔

ناعمہ ابھی کھڑی سوچ رہی تھی کہ عریضہ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ باہر نکل رہی تھی۔ ناعمہ سے نگاہیں

لگائیں تو وہ جھجک سی گئی۔ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔

ناعمہ ایک قدم آگے بڑھی۔

”کیسی ہو عریضہ؟“

”ٹھیک ہوں!“ وہ بے رخی سے کہہ کر فریق کی سمت بڑھ گئی۔

ناعمہ اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“

”نہیں۔“ اس نے ٹھنڈی بوتل نکال کر فریق بند کیا اور واپس اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

ناعمہ ہڑبڑا کر رہ گئی۔ اس سلوک کا تو اس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ پھر وہ تیز قدموں سے اس کے پیچھے دی۔ عریشہ کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ اسے اپنے پیچھے آتی ناعمہ کے قدموں کا احساس تھا سو اتنا غصہ تھا اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند نہ کیا۔ ناعمہ اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی پھر ٹنک کر رک گئی کمرے کی سب ہی لائٹس آف تھیں۔ کھڑکیاں بند تھیں اور اس پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ کونے میں رکھے ڈیک سے غزل کی مدہم سی آواز ابھر رہی تھی۔

حال	دل	ہم	بھی	ساتے	لیکن
جب	وہ	رخصت	ہوا	تب	یاد
وہ	تیری	یاد	تھی	اب	یاد
دل	دھڑکنے	کا	سبب	یاد	آیا

عریشہ نے آگے بڑھ کر لائٹس آن کیں اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ناعمہ جھجکتے ہوئے اس کے مقابلہ تھی۔ عریشہ نے ریموٹ سے ڈیک آف کر دیا۔ کمرے میں یک لخت خاموشی چھا گئی۔ چھت پر گھومتا ہوا پانکھا سی آواز پیدا کر رہا تھا۔

ناعمہ کو تادیر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے کیا ہو چھے۔ عریشہ اس کے مقابل بیٹھی تھی لیکن اس سے ا ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں کوئی خفہ کماٹی کہہ رہی تھیں۔ ناعمہ کا ذہن اس بولی کو سے قاصر تھا۔

”عریشہ۔“ بالآخر وہ بولی۔

”ہوں!“ اس نے لبوں پر زبان پھیری۔ ”کہو۔“

”تمہاری طبیعت۔“

”ٹھیک نہیں ہے“ اس نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اطمینان سے کہہ دیا۔

ناعمہ کو سوائے اس کی متورم آنکھوں کے طبیعت کی خرابی کا کوئی اور سراغ ہاتھ نہ آیا۔

”کیا ہوا ہے؟“ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ وہ ہنوز سابقہ انداز میں بولی جس میں نہ غصہ تھا نہ شکایت۔

ناعمہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی صورت دیکھی۔

”کیسے آتا ہوا؟“ بظاہر اس نے شائستگی سے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ میں۔۔۔ ٹائیپ۔۔۔ ٹائیپ اور میں۔۔۔ اور سرد رہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ہم لوگ درہ آپنی کے کمرے میں ہیں۔“ وہ ہلکا

تماس بولی۔

”آجھا!“ عریشہ اسی سکون سے بولی۔

”ہم لوگ۔۔۔ سب۔۔۔ باتیں۔۔۔ باتیں کر رہے تھے۔“ ناعمہ کو لگتا تھا وہ کسی انجان ہستی کے مقابل بیٹھی ہے۔

یہ وہ عریشہ تو نہ تھی جسے وہ جانتی تھی۔

”آجھا۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کرو باتیں۔“

”تم۔۔۔ تم چلو تا میرے ساتھ۔“ اس نے بے حد جھجکتے ہوئے کہا۔

عریشہ نے نفی میں سر ہلایا لیکن بے حد واضح انداز میں ناعمہ کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہ چھوڑا

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہا۔“ وہ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ ”میں چلوں؟“

”اے حافظ!“ اس کا چہرہ سیاہ تھا۔

”اے اے ڈر کر کمرے سے نکلی جیسے عریشہ اسے مارنے کے لیے پیچھے دوڑے گی۔ تیز تیز قدموں سے اس نے مار کر کیا تھا کہ فروس بیگم کی آواز نے اسے مزید سہایا۔

”ارے ٹھہرو تو لڑکی! کہاں بھاگے جاتی ہو۔“ وہ بچن سے نکل کر اس کی جانب آ رہی تھیں۔

”بی بی! ممانی جان!“ وہ ٹھہر گئی۔

”مہر کی بات؟“ انہوں نے کھوجتی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”بی بی!۔“ اس نے سر کو اثبات میں ہلایا۔

”کیا میرا مطلب ہے۔ کیا بات ہوئی؟“

”بی بی!“ ناعمہ کو مزید حیرانی کا سامنا ہوا۔

ان سے پیشتر انہوں نے کبھی دونوں سہیلیوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کیا

”اے بی بی! اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ پھر وہ نرمی سے بولیں۔ ”وہ ہم سب سے بھی ایسی ہی اکھڑی

”بی بی! تم محسوس نہ کرنا کچھ۔“

”بی ممانی! ٹھیک ہے اب میں چلوں!“ وہ مڑی تھی۔

”بات سنو ناعمہ!“ انہوں نے پھر اسے پکارا۔

”بی بی!“ وہ بولی۔ اس کی حیران آنکھوں میں استفسار تھا۔

”اے بی بی! عریشہ کی طبیعت کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“ وہ قدرے سخت سے بولی تھیں۔ ”ایک دو دن میں

”اے بی بی! آنکھوں کی حیرانی میں یک لخت کی واقع ہوئی۔ جیسے وہ کچھ سمجھ گئی۔

”بی ممانی جان!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”ترانہ! ایک بات کہوں تم سے تم برا تو نہیں مانو گی؟“ ربیعہ نے اداسی سے پوچھا۔ اس کی بات میں عجب گہرائی

”ترانہ! اسے دیکھنے لگی۔

”میرا کسی ہاشل میں بندوبست کرو۔ میں نوکری کر کے اپنے اخراجات پورے کر لوں گی۔“

”ربیعہ!“ ترانہ نے یک دم اس کے ہاتھ تھام لیے۔

ربیعہ نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں تیزی سے آنسو اڑے تھے۔ ربیعہ حیران بھی ہوئی اور شرمسار بھی۔

”ترانہ! میرا مقصد تمہیں دکھ دینا نہ تھا۔ لیکن میں نے بے حد مجبور ہو کر یہ بات کہی ہے تم سے۔ ہاشل ہر شہر

میں ہوتے ہیں، میں اپنے شہر میں ہی کسی ہاشل میں، کسی دارالامان میں جگہ ڈھونڈ سکتی تھی۔ لیکن رشتوں کی

لمبوت بہت اثر ہوئی ہے۔ یہ انسان کو پوری طاقت سے اپنی جانب کھینچتی ہے۔ خونی رشتے بہت توانائی رکھتے ہیں،

میں بھلا نا آسان نہیں ہوتا۔ میں یہاں کچھنی چلی آئی۔ اپنوں کی تلاش میں اپنائیت کی خاطر۔“

”اور یہاں تمہیں غیریت ملی، دکھ ملا۔“ ترانہ نے سر جھکا کر کہا۔

”تمہاری محبت اور تمہارے خلوص کی روشنی میں ہر سیاہ روپہ دھندلا گیا ہے ترانہ۔“ ربیعہ ہمارے بولی۔ ”تم

میں ایک بہن کی سی چاہت دی ہے، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ترانہ!“ وہ اداس ہو کر بولی۔

”مجھے میرا انداز بہت عزیز ہے۔ مجھے میری ہستی کا غور، میرے کردار کی بلندی ہر شے سے بڑھ کر پیاری ہیں۔

”اے بی بی! دامن کو آلودہ نہیں دیکھ سکتی۔“

”تمہارا دامن کوئی معمولی سا داغدار بھی نہیں کر سکتا ربیعہ! کم از کم میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی سے

”اے بی بی! کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ترانہ جوش سے بولی۔

”ترانہ تم بڑھتے ہوئے قدم روک سکتی ہو! اٹھتا ہوا ہاتھ کھینچ لیں۔ چلتی ہوئی زبان کو روکنا تمہارا کام نہیں نہ ہوگا۔ صولت کی بات نے مجھے سر سے پاؤں تک لرزا کر رکھ دیا ہے۔ میں نے رانی کا پڑاؤ بننے سنا۔ بنا رانی کا پڑاؤ۔“

”تم صولت کی باتوں پر دھیان دے رہی ہو یا گل لڑکی!“ ترانہ پیار سے بولی۔ ”جس کی کھوپڑی بالکل کھوکھلی ہے، دماغ نامی کسی شے کا معمولی سا سایہ بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ اسے تو سوچنا تک نہیں آتا۔ ربیعہ!“

”جو کچھ اس نے کہا، وہ معمولی سوچ کی کرشمہ سازی نہ تھی۔“ ربیعہ نے سر جھٹکا۔ ”معمولی سوچ کی الٹا اوپچی نہیں ہوتی۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ طے کیا ہے کہ میرا کردار درست نہیں ہے۔ اپنے حساب سے مجھے ہر ہر بات کا جواز بھی پیش کیا تھا۔“

”ربیعہ! تم نے ٹھیک کہا کہ بڑھتے ہوئے قدم اور اٹھتے ہوئے ہاتھ کو روکا جاسکتا ہے لیکن چلتی زبان پر اختیار نہیں ہوتا۔ اسی لیے تاریخ میں بہت عظیم کردار کی حامل خواتین پر بھی بہتان تراشی کے واقعے رقم ہیں اور ہماری اوقات کیا؟ پھر کیوں ہم ایسی گندی زبانوں کی پروا کریں۔ ان کے خوف سے اپنی زندگی کے فیصلے کرنا اپنے دل رات بسر کرنے کا طریقہ کار ہم ایسے ذہنوں کو مد نظر رکھ کر ترتیب دیں۔ کیوں؟ کیا یہی دواش مندی۔ ربیعہ نے گہری سانس بھر کر سر اٹھایا اور بوڑھے برگد کی لنگتی شاخوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے حد لالہ ہو رہی تھیں۔ ترانہ کو اس پر ٹوٹ کر باریا آیا۔ اس نے ربیعہ کا گورا چٹا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

”ربیعہ! تمہارا میں تمہا ہونا؟ تمہارا کوئی نہیں؟“

ربیعہ نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا۔

”ربیعہ! میں تم سے زیادہ تمہا ہوں۔ میرا باپ ہے، بھائی ہیں، بھینسی ہے، صولت کے نام پر بہن بھی ہے۔ ربیعہ! جس شخص کو رشتوں کے بیچ کہہ کر بھی تنہائی کی اذیت سے دوچار ہونا پڑے، اس کی تکلیف رشتوں، محروم شخص کی تکلیف سے سوا ہوتی ہے۔ رشتوں سے محروم شخص کو محض محرومی کا احساس ہوتا ہے نا؟ درمیان میں گہرے تنہا شخص کو ذہنی تنہائی بھگتنا ہوتی ہے۔ ذہنی تنہائی بہت تکلیف دہ احساس ہے ربیعہ! جیسے جیل میں نووارد۔ قید کا احساس، اجنبیت کا احساس، ذہنی فاصلوں کا احساس۔ میں نے ایک طویل عرصہ احساسات سے جنگ لڑی ہے۔ میں خود کشی کر لیتی شاید اگر مجھے عبدالباری نہ ملتا، باری نے مجھے زندہ رکھا۔ میں نے مجھے ذہنی، ہم آہنگی دی، غلوں سے بے نگرانی کے رشتے کی سچائی اور توانائی کا احساس دیا۔ تم میرے لیے بہت کم ربیعہ! بہت کچھ۔ مجھ سے کبھی بھی دور ہونے کی بات مت کرنا۔ تم مجھے عبدالباری کی طرح عزیز ہو۔ میں کھودینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

ربیعہ نے پہلی مرتبہ ترانہ کو اس قدر جذباتی دیکھا تھا۔ وہ دم بخود تھی۔

”میں کہیں نہیں جاؤں گی ترانہ!“ وہ بولی ”جب تک تمہاری شادی باری سے نہیں ہو جاتی۔“

ترانہ زور سے ہنس دی۔

”بے وقوف!“ پھر وہ خوش دلی سے بولی۔ ”تمہارا کیا خیال ہے؟ میں خوشی خوشی باری سے شادی کروں گی! تمہیں اس جنگل میں چھوڑ کر چل دوں گی؟ بدھو پہلے میں تمہاری شادی کروں گی کسی بہت بہت اچھے انسان۔ پھر باری کے ساتھ چل دوں گی۔“

ربیعہ کو ”بہت“ کی ہنکار سے ہنسی آگئی۔

اچانک ہی اس کی ہنسی چھٹی تھی۔ آنکھوں میں جگنوؤں کی بارات اتری تھی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کے کا کھلے تھے۔

سامنے والی بیچ پر عباد بیٹھا تھا۔ آج وہ تنہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ لائٹ گرین دھاری دار شرٹ اور مشو کلر جینز میں وہ بے حد اسارت دکھائی دیتا تھا۔

”گواہ زبردست!“ ترانہ نے سرگوشی کی۔ ”بھیجی سوچ کے رعبہ! منہ بولا بھائی بھی کوئی رشتہ ہے رعبہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اٹھ کر عباد کی سمت بڑھی۔

”اے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر عباد کھڑا ہو گیا۔ رعبہ اس کے مقابل پہنچ گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ مسکرائی تھی۔ ”کیسے ہیں عباد بھائی؟“

”والسلام السلام!“ وہ جواباً ”مسکرایا۔“ ”میں ٹھیک ہوں تم یہ بتاؤ تم ٹھیک تو ہونا۔ خیریت سے ہو؟ کسی قسم کی بھائی تو نہیں ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں!“ نجانے کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔ اس نے جلدی سے نگاہیں جھکا لیں۔

”رعبہ!“ عباد کے دل میں جیسے کسی نے پن چھودی۔ ”رعبہ۔ اُدھر دیکھو۔“

رعبہ نے جلدی سے انگلی کی پورے پلوں کے کنارے صاف کیے اور مسکرانے لگی۔

”آپ کی اس قدر اپنائیت اچھی لگتی ہے عباد بھائی بس! اور کوئی بات نہیں۔“

عباد نے گہری سانس بھری اور جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”تم اتنی کم زور کیوں ہو رہی ہو؟“ پھر وہ دھیرے سے بولا۔ ”کتنا ویٹ لوڑ کیا ہے تم نے کچھ اندازہ ہے؟“

”ہی ہاں۔ شاید!“ وہ سوچ کر بولی۔ ”میرے کپڑے ڈھیلے ہو گئے ہیں۔ مجھے فارغ بیٹھنا پسند نہیں ہے کچھ نہ کھ کر رہتی ہوں۔ شاید اس لیے۔“

عباد نے اس کے پس منظر میں ترانہ پر نگاہ ڈالی۔

”فارغ بیٹھنا تمہیں پسند نہیں ہے اور بات ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں گھر والوں کو تمہارا فارغ بیٹھنا پسند نہ

”رعبہ اس کی بات پر شکستگی سے ہنس پڑی۔

”مجھاسنو میں کچھ سامان لایا ہوں تمہارے لیے۔“ عباد نے بیچ پر رکھے شاپر ز کی جانب اشارہ کیا۔ ”مگر ہمیں کوئی پرائیمنہ فیس کرنا پڑے تو۔“

”میرے لیے۔“ وہ حیران ہوئی۔ ”کیوں عباد بھائی؟ یہ زحمت کیوں؟“

”اے! بھائی بھی کتنی ہو اور یہ زحمت و حمت کا ذکر بھی۔“ وہ مصنوعی خنکی سے بولا۔ ”بہنیں تو بھائیوں کی جان لاپ میں رکھتی ہیں ہر وقت ہم کیسی ہنس ہو؟“

رعبہ ہنس دی۔

”مگر بھی عباد بھائی! اچھا نہیں لگتا میں احساس کمتری کا شکار ہو جاؤں گی۔“

”اے! اگر مجھے واقعتاً ”بھائی نہ سمجھو تو۔“ وہ بولا۔ ”ورنہ دنیا کی کوئی ایسی نہیں جو بھائی کالا یا ہوا تحفہ

رعبہ کے پاس بولنے کے لیے کچھ نہ رہا۔

”اوکے!“ وہ بولی۔ ”تھینک یو بھائی!“

”مواؤ یلکم!“ وہ کھل کر مسکرا دیا۔

”ترانہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ گھر کے قریب پہنچ کر وہ منمنائی۔

”کس بات سے؟“ وہ بے نیازی سے بولی۔

”پس یہ بھاری بھر کم شاپر ز کیا کہیں گے سب سے؟“

”تم فکر مت کرو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ عمرو عیار کے جیسی ایک زنبیل میرے پاس بھی ہے جس میں

”دیکھو! کاشاک رہتا ہے۔ میں ابھی اپنی زنبیل میں سے ترکیب نمبر چار سو بیس نکالتی ہوں۔“

”وہ چلتے چلتے گلی کے ایک مکان کے سامنے رک گئی تھی۔ پھر اس نے دروازے پر دستک دی۔

”کون؟“ اندر سے آواز آئی۔

”اماں! میں ہوں ترانہ!“
دروازہ کھل گیا تھا۔ اندر سترچ پتھر برس کے سن کی ایک عمر رسیدہ بوڑھی عورت کھڑی تھی۔
”اماں! یہ سامان رکھ رہی ہوں اپنا۔“ ترانہ نے اندر گھس کر وہ شاپر ز ایک طرف کورکھ دیے۔ ”رات کا وقت لے جاؤں گی۔“

”اچھا۔“ اس عورت نے سر ہلایا تھا۔ ”یہ کون ہے؟“

اس نے ربیعہ کی بابت استفسار کیا۔

”یہ میری ماموں زاد بہن ہے۔ ربیعہ۔ اچھا اماں! دروازہ بند کرلو۔“ ترانہ جلدی میں تھی۔

ربیعہ اس کی اس ترکیب پر حیران تھی۔

”یہ سب کیا تھا؟“ اس نے ربیعہ سے پوچھا۔ ”یہ اماں کون ہے؟“

”ایک غریب عورت ہے۔“ ترانہ بولی۔ ”بے چاری تنہا رہتی ہے۔ بیٹا افغانستان کی جنگ میں ہو گیا۔ بیٹی بیاہ کر سسرال چلی گئی۔ یہ یہاں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔ میں اکثر اس کے لیے کچھ نہ لاتی رہنی ہوں سب محکمے والے اس کا خیال رکھتے ہیں۔“

”اوہ!“ ربیعہ کو تجانے کیوں وادی جان یاد آئیں۔ وہ اداس ہو گئی تھی۔

”مجھے جو چیز پھپھو اور صولت سے پوشیدہ رکھنا ہو وہ میں یہاں اماں کے پاس رکھوا دیتی ہوں پھر مناسب وقت لے جاتی ہوں۔“

”مثلاً؟“ ربیعہ نے ہنس کر اسے دیکھا۔

”مثلاً“ باری کے تحائف۔“ ترانہ بھی ہنس دی۔ ”وہی ایک دلکش راز ہے میری زندگی کا۔“

”اب یہ شاپر ز کس وقت لاؤ گی؟“ ربیعہ پوچھنے لگی۔

ترانہ نے اسے شونجی سے دیکھا تھا۔ ربیعہ جھینپ گئی۔

”آج ہی لاؤں گی محترمہ!“ پھر وہ ہنس کر بولی۔ ”مجھے خود بے حد اشتیاق ہو رہا ہے۔ پھپھو اور صولت سونے کا انتظار کرتا ہو گا۔“

ربیعہ نے سر ہلادیا۔

گھر پہنچ کر ترانہ نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گئی تھی۔ ربیعہ کچن میں چلی آئی۔ مینا بیگم نے لہ لگا ہوں سے اسے گھورا۔

”یہ تم لوگ روزانہ باہر کیا کرنے جاتی ہو؟“ وہ کچھ بد مزگی سے بولیں۔ ”لو کیوں کو زنبیر بتا ہے؟“

ربیعہ تو جانے پر رضامند بھی نہ تھی۔ ترانہ اسے زبردستی ساتھ لے گئی تھی۔

”وہہ! آئی۔ روٹیاں ڈال لوں؟“ اسے کچھ اور نہ سوجھا۔

”ہاں!“ وہ برسیں۔ ”اور کم مت پکانا۔ روز تمہاری پکائی ہوئی روٹی کم بڑتی ہے۔ بے چاری صولت کو اکثر اس لیے آتا کہ نہ کھیر روٹی پکانا پڑ جاتی ہے۔ تمہیں تو احساس نہیں کسی کا بچو نوکری کرتے ہیں ان کے دل سے پوچھو۔ وہ بڑبڑاتے لگی تھی۔“

ربیعہ خاموشی سے آٹا نکال کر گوندھنے لگی۔ مینا بیگم کو آج کچھ زیادہ ہی غصہ تھا۔

”صولت بھی تو ہے۔ مجال ہے جو بے وجہ گھر سے نکلنے کا نام لے۔“ ٹائم سے جاتی ہے، ٹائم پر آتی ہے۔“

تمہیں بھی اپنے جیسا کر دے گی۔ لڑکیوں کو یہ آوارہ گردی زیب نہیں دیتی سارک نہ ہوا مصیبت ہو گئی۔“

وہ بڑبڑاتے جاری تھیں۔ غسل خانے کی چٹخنی گرنے کی آواز آئی تو ان کی زبان میں لگام پڑی۔ وہ سالن گھر کرنے لگیں۔

”اپنے پھپھا کو کھانا کھلا کر روٹی دے دینا ٹائم پر۔“ وہ بولیں۔

”ہی۔“ ربیعہ نے محض اتنا ہی کہا۔
 ہمارے ملاقات نے اس کو ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔ اسے ان کی باتیں بھی بری نہ لگ رہی تھیں۔ بلکہ وہ ان کی باتیں
 دیکھ کر حیران سے سن بھی نہ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں عبادت تھا۔ اس کی پر خلوص نگاہیں تھیں جن میں اپنا سیت
 کی اہمیت تھی۔ اس کے پیٹھے کچھ میں بار بار اس سے رشتہ جتنا اور اس رشتے کے حوالے سے اپنا حق جتنا ربیعہ
 کہتا تھا۔

”تم مسکرا کیوں رہی ہو؟“ مینا بیگم نے اسے چونکا دیا۔
 وہ لطیف سی ہو گئی۔ وہ کھوجتی نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔
 ”کہا بات ہوئی؟“
 ”ایک لطفہ یاد آ گیا تھا پھپھو!“ ربیعہ کو بالآخر ان سے جان چھڑانے کو کہا۔
 ”پہ میں آئی سے پھپھو کیسے ہو جاتی ہوں؟“ وہ بھڑکیں۔ ”تم بہت میسنی لڑکی ہو۔“
 ”ہی پھپھو۔“ شاید اس نے مسکینی سے اعتراف کیا۔
 ”تھک کر باورچی خانے سے نکل گئیں۔“

○ ○ ○
 نور امین کو وہ انہیں دے رہی تھی جب تمدن کمرے میں داخل ہوا۔ ربیعہ نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے
 دیکھا اور نور امین کو پانی کا گلاس تھمانے لگی۔
 ”فہارک میں کس لڑکے سے باتیں کر رہی تھیں؟“ اس نے اچانک دھماکا کیا۔
 ”وہ اچھل کر رہ گئی۔ تمدن کا حملہ اس قدر اچانک تھا کہ اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔
 ”ہول!“ وہ اسٹک کے سہارے چند قدم آگے بڑھ آیا۔ ”کون تھا وہ؟“
 ”بی۔سہ!“ وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھی۔
 ”تم نے یہاں کس سے پیار لے لیا ہے؟“ وہ دیرشت لہجے میں بولا۔
 ”تمہیں بھائی۔“ ترانہ اس کی آواز سن کر وہاں آگئی تھی۔ ”مجھ سے پوچھیں۔ کیا پوچھنا ہے۔“
 ”تمہیں ہو جاؤ یہاں سے۔“ وہ اس کی جانب گھوم کر بولا۔ ”بہت دادا کی گزرتی ہو۔ میں ربیعہ سے پوچھ رہا ہوں
 ”کیک ہے۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں جواب دے دیتی ہوں۔ وہ میرا بھائی ہے۔ منہ بولا بھائی۔ ہم لوگ ٹرین میں
 ”

”ٹرین میں۔ ہنہ!“ تمدن نے حقارت سے ہنکارا بھرا۔ ”چند گھنٹوں کے سفر میں بھائی بہن پیدا ہو گئے۔ جب تم
 انسانی سے رشتے جوڑ سکتی ہو تو یہاں تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”تمہیں بھائی۔“ ترانہ چیخی۔ ”خدا کا خوف کس کچھ۔“
 ”من نے مڑ کر اسے زوردار اسٹک ماری۔ وہ بلبلا اٹھی۔ ربیعہ کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ نور امین زور زور سے
 ”

”ارے بے غیرت۔ بہن پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ کتے۔ کھوں کھوں۔ ارے تو کیوں ہمارے سینوں پر ناگ بن کر
 ”کھوں کھوں۔“
 ”لو وار جو آئندہ پارک کا رخ کیا تم دونوں نے۔“ وہ لال آنکھوں سے انہیں گھورتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔
 ”ارے اس لڑکی کو نکالو، میں کہتا ہوں۔“ نور امین کھسک گئے۔ ”ارے یہ اپنی ماں سے دو ہاتھ آگے
 ”کھوں کھوں کھوں۔ میں کہتا ہوں یہ کوئی فساد ڈلو کر رہے گی۔“
 ”منہ چھپا کر کمرے سے نکل گئی تھی۔“

لان میں کھڑی کیا رہوں گا جائزہ لیتی انہیچہ چونک اٹھی۔ چند لمحے وہ تھیر کے عالم میں کھڑی گیٹ سے اندر داخل ہونے والے افراد کی آمد کے مقصد کے بارے میں خیال آرائی کرتی رہی پھر جیسے ہی اس کی نظر درود کے ہاتھ اٹھائے مشائی کے بے سے ڈبے پر پڑی وہ اچھل ہی پڑی۔

آنکھوں میں بے تحاشا چمک دینے قہقہوں کو روٹھنے کیے وہ دوڑی۔

”السلام علیکم۔۔۔“ اس نے پورے ٹیکو پارکر کے لاؤنج کی سیڑھیوں پر قدم دھرتی شفیقہ حیات اور ان کی ہمارا فردوس بیگم اور عذرا بیگم کو پھولتی ہوئی سانسوں سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔ جیتی رہو بچی۔“ شفیقہ حیات نے اس کی پیشانی چومی۔

فردوس بیگم کے ماتھے کی سلوٹیں صاف گئی جاسکتی تھیں۔ عذرا بیگم خوش دلی سے مسکرا رہی تھیں۔ ان کی پچھلی لائن میں ایقان کی سربراہی میں ورورہ اور رابعہ بیگم تھیں۔

انہیچہ سب سے ملتی سب کا احوال پوچھتی انہیں لاؤنج میں لے آئی۔ بھاری بھر کم خواتین صوفوں میں کرسیاں ٹھیک کرنے لگیں۔

”چانک دھاوا برا تو نہیں لگا؟“ ایقان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ارے آپ! وہ ہنس دی۔“ کمال کرتی ہیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے یہ بھی اور اپنے گھر تو کسی وقت بھی آیا تھا ہے اور برائے نام کا کیا سوال؟ میں تو بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں آپ لوگوں کو کدھ کر۔“

”وہ تو کوئی بی بی۔“ فردوس بیگم منہ ہی منہ میں بد بدائی تھیں۔ ”سر کا بوجھ اتر رہا ہے۔“

”آپ کی بواؤ بیٹی! شفیقہ حیات بولیں۔“ اور یہ شہلا کیا کر رہی ہیں؟“

”آپ کی نہار بی بی ہیں۔ شہلا آپ کی ڈیوٹی سے آکر سو گئی تھیں۔ میں جگاتی ہوں انہیں۔“ وہ خوشی سے نہال جاری تھی۔ مڑ کر کمروں کی جانب تیزی سے بڑھ گئی۔

”ہاشم میاں نے بھی کمال ہی کیا ہے۔“ شفیقہ حیات اس کی پتلی کمر کو دیکھتے ہوئے حسرت سے سانس بولیں۔ ”میں کا خیال تھا تو۔۔۔“

ایقان پر نگاہ ڈال کر وہ باقی کے الفاظ ادا نہ کر پائیں۔ وہ براس منہ بنائے انہیں دیکھ رہی تھی۔

اندرونی کمرے کا دروازہ کھول کر شہلا باہر آئی۔ سب ہی کی نگاہیں مجتمع انداز میں اٹھی تھیں۔ سہا روپ لیے شہلا نے کسی نگاہ کو مایوس نہ کیا تھا۔

وہ شاید نہا کر سوئی تھی۔ سیاہ بال نہایت محسوس ہوتی چمک لیے اس کے کاندھوں پر پریشان تھے۔ نیند کے سے لبرز نگاہیں معصوم اور پرکشش لگتی تھیں۔ قدرتی گلابی لب نرم انداز میں ہلکی سی جھینسی جھینسی لیے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ تھوڑی کا سیاہ بل جگمگا رہا تھا۔ نکھر نکھر روپ اپنی ہمار پر تھا۔

کسی کو کچھ غلط سوچنے کا موقع دستیاب نہ ہوا۔

”یہاں آؤ بیٹی! ہمارے پاس۔“ شفیقہ حیات نے اپنے اور فردوس بیگم کے درمیان جگہ بنائی۔ وہ دھیرے چلتی ہوئی وہاں آکر بیٹھ گئی۔

انہوں نے بے اختیار ہی اس کی پیشانی چومی اور اپنی چند لمحوں پیشتر والی سوچ پر شرمندہ ہوئیں۔ اس کی ہمارا بر شرم و حیا کا نور تھا۔ اس کے وجود سے اب تک البرود میزائوں کی مسک اٹھتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ سر سے تک ہمار ہی ہمار تھی۔ کہیں کچھ کمی نہ تھی۔ کوئی داغ نہ تھا کوئی جھول نہ تھا۔

”معاف کرنا بیٹی!“ وہ بولیں۔ ”ہندو معاشرے کے درمیان ایک طویل عرصے رہے ہیں نا۔ ہماری سہارا اب تک ان کے غلط نظریات کے اثرات ہیں۔ حالانکہ مذہب اسلام تو خود سونے جیسا ہے۔ یہ تو اپنے ہر رہنے والوں کو سنہرا کر دیتا ہے۔ ہندوؤں کو ہمارے ساتھ رہ کر احساس ہو گیا کہ ان میں کیا کچھ غلط ہے۔ وہاں کے حقوق کی بات کرنے لگے ہیں۔ انہیں مردوں کے ساتھ جلاؤ لٹنے سے باز آگئے ان کی دوسری شادی کے

لوہ میں لچک پانے لگے۔ اور ہم مسلمان، ہم انہیں اپنی اچھی باتیں دے کر ان کی غلط سوچیں اپنے دامن میں لہر کی طرح لیے پھرنے لگے۔

ہمارا مذہب تو کشادہ دلی کا مذہب ہے۔ وسیع انظری کی بات کرتا ہے۔ وہم، نحوست، سب کچھ شدت سے رد کرتا ہے۔ یواؤں کو، مطلقہ عورتوں کو دوسری شادی کی پُر زور تلقین کرتا ہے۔ پورے معاشرے کو پابند کرتا ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ کہیں کوئی عورت تمہاری کی تجرؤ کی زندگی بسر نہ کرے۔ مرد کی حفاظت اور ذمہ داری میں رہے۔ ہم لوگ یہ سب کچھ تو سکتے ہیں۔ عمل کرنے کا وقت آئے تو لڑتے پھرتے ہیں۔“

ناسف سے بولتے ہوئے ان کی نگاہ منہ ذہ بیگم پر پڑی تھی، ابو نجائے کب سے سامنے کھڑی ان کی گفتگو سن رہی تھیں۔ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے، مہرمان سی منہ ذہ بیگم انہیں بہت بھائیں۔

”ارے... ہمیں خبری نہ ہوئی۔“ وہ جلدی سے اٹھیں۔

”السلام علیکم...“ منہ ذہ بیگم نے مسکرا کر حاضرین کو سلام کیا اور حقیقہ حیات سے معاف کرنے لگیں۔

لردوس بیگم بھی ساس کی تقریر کے زیر اثر دایا مسکرائی تھیں۔ وہ بھی اٹھ کر منہ ذہ بیگم کے گلے لگیں۔ ملنے ملانے کے مراحل طے ہوئے ہی تھے کہ انیقہ نازک گلاسوں میں ٹھنڈا مشروب لیے چلی آئی۔ اور سب کو سرو کرنے لگی۔

”ہم بتا کر نہیں آئے۔ معافی چاہتے ہیں۔“ حقیقہ حیات نے مفرح شربت کا گھونٹ بھر کر کہا۔ ”دراصل سب لوگ اکٹھے ہو کر رشتے کے متعلق بات کر رہے تھے تو لڑکوں نے شور مچا دیا کہ جب سب ہی کچھ ملے ہو چکا ہے تو دیر لیس۔ آج ہی انگوٹھی ڈال کر آئیں اور برات کا دن طے کر لیں۔ پھر یہ ہماری صاحبزادی۔“

انہوں نے ایقان کی جانب اشارہ کیا۔ وہ مسکرائے لگی۔

”ان کے مغز میں کچھ سما جائے تو نکلنا مشکل۔ بچوں کی طرح دیوانی ہو کر ضد کرتی ہے۔ بھگم بھاگ ہاشم میاں کے ساتھ جا کر انگوٹھی اور مٹھائی لے آئیں۔ آدھے گھنٹے میں سبھی کچھ ہو گیا۔ ہم نے بھی سوچا کیا روم و رواج کی اس قدر پابندی کرنا۔ عمر بیت گئی یہی سب کرتے کرتے حاصل نہ وصول۔ ہم بھی اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلو آج ہم بھی بچوں کی ماں کر دیکیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ وہ دیں۔ پر انہ۔“

”سربراہ! درود نچلا بربا کر بولی۔“

”آل ہاں دی۔“

سب ہی ہنس دیے شہلا سمیت، وہ از حد مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ پچھلے دنوں کا وہ سارا اضطراب، سب بے چینی ختم ہو گئی تھی۔ وہ خود کو ہلکا چھلکا اور مسرور محسوس کر رہی تھی۔ ایک نتیجے پر پہنچنا، بھنور سے کنارے پر پہنچنا لگتا تھا۔

”اجازت ہے بس۔“ انہوں نے پرس میں سے عملیں ڈبیہ نکال کر منہ ذہ بیگم کو دکھا۔

ان کی آنکھیں ڈنڈباری تھیں۔ انہوں نے بمشکل خود پر قابو پا کر اثبات میں سر ہلایا۔

حقیقہ حیات نے کسم اللہ بڑھ کر انگوٹھی شہلا کی انگلی میں ڈال دی۔ شہلا کا سر جھکا ہوا تھا۔ پلکیں بھاری بھاری لگنے لگی تھیں۔ لیو پر شرمیلی مسکان کا راج تھا گالوں پر گلال پھیل رہا تھا۔

”ہائے اللہ!“ ایقان نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ ”کیمرہ تو بھول ہی آئی میز پر۔ اب ہاشم لڑے گا مجھ سے۔“

”ہاں جی! حوالہ خفا تو ہو تم۔ تم سے یہی امید۔“ حقیقہ حیات، شہلا کی تھیلی پر لفافہ دھرتے ہوئے پولیس۔

”یہ تمہارے جوڑے کے پیسے ہیں۔ برانہ ماننا۔ ہم نے ابھی دوستان سنا کی تاکہ کیسے آئے ہیں لشم پشتم۔“

”یہ لیجئے ایقان آپ! آپ کے مسئلے کا حل۔“ انیقہ نے کیمرہ لا کر اسے تھمایا۔ ”ہمارے دو لہما بھائی کے ساتھ کچھ زیادتی ہوگی۔“

سب ہی ہنس دیے۔

ایقان جلدی جلدی تصویریں کھینچنے لگی۔

اچانک ہی سب کی توجہ عمر نے اپنی جانب کھینچی۔ وہ غالباً ”ماں کے ساتھ سویا ہوا تھا اور اب اسے ساتھ نہ پا کر پریشان ہو کر باہر چلا آیا تھا۔ اتنے لوگ دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گیا اور جلدی سے شہلا سے لپٹ گیا۔“

شہلا اپنی کیفیات سے پلک جھپکتے میں باہر آئی۔ عمر کے گرد بازوؤں کا مضبوط حصار بنا کر اس نے اس کی پیشانی پر بے ساختہ پیار کیا۔

حاضرین خاموش سے ہو گئے۔ فردوس بیگم گویا بغلیں جھانکنے لگیں۔ ان کے چہرے پر لکھی خفت صاف پڑی جا رہی تھی۔ منہ زدہ بیگم نے آگے بڑھ کر عمر کو شہلا سے علیحدہ کرنا چاہا۔

”آؤ بچے۔ نانو پاس آؤ۔ میں آپ کو اوونٹین بنا کر دوں۔“

”نہیں۔“ وہ محلا۔

”رہنے دس امی! سو کر اٹھا ہے نا۔“ شہلا نے محبت سے اس کے بال سنوارے۔

”اب ماما کو تھوڑا فری ٹائم دو۔“ عذرا بیگم نے ہنس کر ماحول خوشگوار کرنا چاہا۔ ”اب آپ اپنی نانو کو تنگ کیا کرو۔ تمہاری ماما کو تو ہم لے جائیں گے اپنے ساتھ۔“

عمر نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ شہلا سے لپٹا ٹکر نہیں دیکھے گیا۔ اس کی نگاہوں میں خوف در آیا تھا۔ شہلا کے چہرے پر سے سایہ گزر اٹھا۔ فردوس بیگم ہاتھی انداز میں بیٹھی تھیں۔

”بہشاء اللہ۔ چشمہ بد دور۔“ نظر نہ لگے دو لمے میاں کے بتیں دانتوں سے جی مسکرا ہٹ کو۔

ہاشم مسکراتے مسکراتے چونک اٹھا۔ ہنستا ہوا رافع مقابل تھا۔ ہاشم بھی نہ پ گیا۔

”ارے تم کب آئے؟“

”جب آپ چاند میں محبوب کا مکھڑا دیکھ کر فل ٹائم مسکرا رہے تھے۔“ وہ بمشکل خود پر قابو پا کر بولا۔ ”پانی را

وے یہ نسبت طے ہوتے ہی شرمیلی لڑکیوں کی طرح آپ نے چھت کار خ کیوں کر لیا؟ خیالی پلاؤ کی دیگ کیا چھت

پر ہی پکتی ہے؟“

”چل تا بندر۔“ ہاشم نے خفت مٹانے کو اسے مکار سید کیا۔ ”تو کیا سمجھے ہم سے دیوانوں کی دماغی کیفیت کو۔

میاں! احساسات کو سمجھنے کے لیے تجربات سے گزرنا پڑتا ہے اور اگر تجربے سے نہیں گزرے تو احساسات کا

اندازہ نہیں کر سکتے۔ لہذا یہ دانت اندر کر لو۔“

”تجربے سے کیسے نہیں گزرے؟“ رافع معنی خیزی سے بولا۔ ”تجربے سے تو الحمد للہ ٹھیک ٹھاک گزرے

ہیں۔“

”ہاں تو“ ٹھیک ٹھاک گزر گئے نا۔ مسئلہ یہی ہے۔ ”ٹھک“ سے لگی نہیں تھیں۔ ورنہ تم بھی یونہی دانت

نکوتے چاند کو دیکھ کر۔“ ہاشم اپنی شرمندگی پر قابو پا چکا تھا اور اب اس کا بے ڈھٹائی تھا۔

رافع کی مسکراہٹ ہلکی ہوئی اور مفہوم بدلنے لگی۔ اب وہ کچھ سوچتا ہوا نظر آتا تھا۔

”یار رافع۔“ ہاشم نے ہلکورے لیتی ہوا کے سامنے سینہ سپر ہو کر کہا۔ ”یار! ایک نظم لکھ میرے لیے۔“ رافع

چونک اٹھا۔

”کیا مطلب؟“

”یار! عجیب سی کیفیت ہے میری۔ اتنی بڑی خوشی سے گزر رہا ہوں اور۔۔۔ اور مجھے خود سے ڈھیر ساری باتیں

کہنے کا جی چاہ رہا ہے۔ ہوا کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر چاند کی چاندنی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بھی مجھے

ادھورے پن کا احساس ستا رہا ہے۔ جیسے کیس کوئی کمی ہے۔ جیسے خوشی پوری طرح سے کھل نہیں رہی۔ جیسے میں

خود سے ٹھیک طرح سے باتیں نہیں کر پا رہا۔ یار! ایسے عالم میں ایک چیز سارا دیتی ہے۔ جانتا ہے کیا؟“

رافع اس کے چہرے پر بکھری دلکشی حیران آنکھوں سے سمیٹ رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ نہ پایا۔
 ”شاعری! دل کی تہوں سے نکلے، نغمے میں ڈھلے الفاظ۔ کیفیت کی تکمیل کرتے ہیں۔ یا رافع! قدرت نے
 مجھے ہم سے دیوانوں کے احساسات کی تکمیل کرنے کا ڈھنگ دیا ہے۔ ہمارے جذبات کی تکمیل کا ہنر ہے تیرے
 اس یا رافع! کچھ کہہ۔ کچھ بول۔ کچھ سنا مجھے۔ ایسی بات جوں سے نکلے اور دل میں اتر جائے۔ مجھے سن کر یوں
 لگے، جیسے تو نے میرے جذبات کو زبان دے دی ہو۔ جو بات میں خود سے نہ کہہ پایا، وہ بات کہہ دے میرے
 ”ست!“

”کیا کہوں؟“ رافع ہنس دیا۔ ”کیا کہنا چاہتا ہے تو خود سے؟“
 ”اپنی خوشی کا مکمل احساس دلانا چاہتا ہوں خود کو۔ اس کے تصور کو حقیقت کی سطح پر لا کر اپنی خوشی شیر کرنا چاہتا
 ہوں۔ فرض کر رافع! اتنے سالوں تو کسی کو دیوانہ دار چاہتا ہو اور اچانک تجھے اس کی ہمراہی کا اعزاز حاصل ہونے
 لگا۔ تو کیا کہتا؟“

رافع سوچ میں پڑ گیا۔ ٹھنڈی متوالی ہو اس کے کانوں میں سرگوشی کرتے ہوئے گزری۔ بادل کے مہین غلاف
 کو ہٹا کر چاند نے جھانکا اور مسکرایا۔ جنگلی گلابوں کی بھنگی ہوئی خوشبو کسی جھونکے کا ہاتھ تھام کر اس کے بے حد
 قہب سے گزری۔ اس کی براؤن آنکھیں دور دیکھنے لگی تھیں۔ اس کا خیال چاندنی کے ساتھ ساتھ بھٹکنے لگا۔
 ”اس کی ہمراہی بلاشبہ تمہاری بے لوث چاہت کا اعجاز ہے ہاشم۔“ پھر وہ بولا۔ ”جب اس سے ملو تو بتانا کہہ۔“

تری آنکھ کی یہ روشنی، میرے خونِ دل کی لکیر ہے
 تری زلف کی یہ چاندنی مرے خوابوں کی تعبیر ہے
 یہ کشش تھی میرے خیال کی جو یوں تھم گئے ہیں تیرے قدم
 یہ تیری ادائے دلبری، میری چاہتوں کی اسیر ہے
 میری بے بسی میں سوال ہیں، ترا نقش نقشِ جوابدہ
 مری مہ رو کوئی بات کرا تو نہ بت ہے نہ تصویر ہے

”دھم! وہ رافع!“ ہاشم نے بھیجنے لیا۔ ”گھر!“

رافع حیران پریشان کھڑا تھا۔

”میں بالکل ہو جاؤں گا۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”یہ سب کیا ہے؟“

خوشی میں مگن ہاشم نے کچھ نہ سنا تھا۔



”مری مہ رو کوئی بات کر۔ تو نہ بت ہے نہ تصویر ہے۔“ ہاشم مسکرایا۔ وی بی سی پر ایقان کی اتاری ہوئی تصاویر
 اٹاراج کر کے دیکھ رہا تھا۔ کمپیوٹر اسکرین پر شملہ کا شرمیلیں مسکراہٹ سے سجا ہوا چہرہ جگمگا رہا تھا۔ اس کا سر
 قدرے جھکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے درپچوں پر پلکوں کی
 ان نگاہوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ محض ایک شرمیلیں مسکراہٹ اس کے ہر سوال کا جواب نہ تھی۔

”کیسے گزریں گے یہ چند روز تمہارے بغیر۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”میں ان آنکھوں میں دیکھنا چاہتا ہوں شملہ! جہاں
 میرے کئی قیمتی برس قید ہیں۔ مجھے ان لمحوں کا سراغ چاہیے۔“

اس کے موبائل کی ہپ بجنے لگی تھی۔ وہ چونک اٹھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ اپنے بیڈ کی جانب آیا۔ اسکرین پر
 روشن نمبر کے ساتھ شملہ کا نام درج تھا۔ ہاشم کے دل کی کلی مچل گئی۔

”ہاشم میاں۔ قبولیت کا وقت ہے مانگ لو اور کچھ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے موبائل کان سے لگایا۔
 ”السلام علیکم“

”وعلیکم السلام۔“ اس کی مدھم آواز آئی۔ ”تعارف کی ضرورت تو شاید نہیں ہے۔“

”جی نہیں۔ میرے موبائل نے آپ کا تعارف کروا دیا ہے۔“ وہ شرارت سے بولا۔ ”کیسے امزاج بخیر ہیں؟“

”جی۔۔۔ شکریہ!“

”خوش ہیں آپ؟“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی۔

”مطمئن ہوں!“ پھر وہ بولی۔

”جلے!“ اس نے سانس بھری۔ ”متنا بھی بہت ہے۔“

”مجھے ایک ضروری بات کرنا تھی ہاشم صاحب۔! بے وقت آپ کو زحمت اسی لیے دی ہے۔“ وہ محتاط انداز اختیار کرنے لگی تھی۔

”ہائی گاڈ!“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”شملہا پلیز! اجنبیت کی اس دیوار میں اب تو کوئی در پچوا کر لیجئے جہاں سے شناسائی جھانکے دوستی مسکرائے۔ معنویت باتیں کرے۔ آپ تو بے مہری کی حد کرتی ہیں۔“ اس کے لیے میں بے پناہ شکایت تھی۔ شملہا دھیرے سے ہنس دی۔

”چھا۔۔۔ معافی چاہتی ہوں۔“

”ایک اور اجنبی جملہ۔“ وہ فوراً بولا۔

وہ تذبذب کا شکار ہو کر خاموش ہی ہو گئی۔ ہاشم نے چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کیا پھر تھک کر بولا۔

”جلے کہیے کیا کہنا چاہتی تھیں آپ۔ آپ کو شناسائی کی زبان نہیں آتی تو اجنبیت کی بولی میں ہی بات کریں۔ لیکن بات تو کریں۔“

”ہاشم صاحب۔“

”صاحب ہٹا دیں۔“ آج وہ بے حد حق کے ساتھ بات کر رہا تھا۔

”چھا ہاشم۔“ وہ کھٹکھٹا رہی۔ گویا کسی کی کا احساس ہوا تھا۔ ”میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ۔۔۔ عمر کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟“

”وہ سب کچھ جو عمر کے متعلق آپ سوچتی ہیں!“ وہ ہنسا۔ ”عمر کے معاملے میں کبھی بھی خود کو مجھ سے علیحدہ کر کے نہ سوچے گا۔“

شملہا نے جیسے پر سکون سانس بھری تھی۔

”میں اسے اپنے ساتھ رکھوں گی ہر جگہ۔ خواہ وہ میری ماں کا گھر ہو یا آپ کا۔“

اچانک ہی ہاشم خاموش ہوا تھا۔ فاروق حسن کے چند الفاظ دماغ کے کسی خفیہ گوشے سے نکل کر حافظے کی سلح پر ابھر آئے تھے۔

”اس گھر میں ہماری نسل پروان چڑھے گی۔“ وہ سخت لہجہ، وہ ٹھوس اور حتمی بات۔

وہ کیسے بھول گیا تھا اتنی اہم بات! یہاں تو خیالات کا سخت ٹکراؤ ہوئے جا رہا تھا۔

”آپ خاموش کیوں ہیں؟“ وہ جیسے ڈر کر بولی۔ ”دیکھیے آپ کے ذہن میں اگر کوئی اور خیال ہے تو ابھی کلیئر کر دیں۔ اتنا طے ہے کہ میں عمر کے بغیر نہیں رہ سکتی۔“

ہاشم کے دماغ میں خطرے کا الارم بجنے لگا۔

”شملہا۔۔۔ میرا یقین کیجئے!“ فوراً اسے پتہ چڑھ بولا۔ ”میں زندگی کے ہر موڑ اور ہر معاملے میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اور یہ تو آپ کی زندگی کا ایک بے حد اہم معاملہ ہے۔“

”آپ کو چاہیے کہ آپ شادی سے پہلے ہی اپنے گھر میں یہ پوائنٹ کلیئر کر دیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”بعد میں کسی حکم کی بد مزئی نہ ہو۔“

”بہتر جناب!“ وہ بیاشت سے مسکرایا۔ ”مزید کوئی حکم؟“

”یہ حکم نہیں گزارش ہے۔ عاجزانہ التماس ہے۔“

”اس نے بے بسی سے آنکھیں میچ لیں۔“ وہی غیرت سے جبرے الفاظ۔ آخر آپ کب اپنی لگیں
 ۱۱ بے حد احتیاط سے فارم فل کر رہی تھی۔ اپنے پچھلے ڈاکو مینٹس وہ اپنے ساتھ ہی لائی تھی۔ ان میں سے
 ہمدردی بٹاؤ بہت انہماک کے ساتھ فارم پر منتقل کر رہی تھی۔
 کھٹ۔ ٹ کی آواز نے تمدن کی آمد کا بتا دیا تھا۔ ربیعہ نے ڈر کر جلدی جلدی سارے کانغذات تکیے کے نیچے
 لپٹے اور اوپر رسالہ رکھ کر پڑھنے لگی۔ وہ کمرے میں چلا آیا۔ چند لمحے دروازے کے قریب ہی کھڑے ہو کر وہ
 اس کی مصروفیت کا اندازہ کرتا رہا۔ ربیعہ رسالے میں پوری طرح محو دکھائی دیتی تھی۔
 ”اچھا کہاں ہیں؟“ بالآخر وہ بولا۔

”جی! اس نے سر اٹھایا۔“ پچھو سبزی خریدنے گئی ہیں۔“

”اہں! اس نے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اس کی نظر تکیے کے نیچے سے جھانکتے کانغذ پر پڑی۔

”ایک کب چائے بناؤ۔“ وہ بولا۔

ربیعہ نے آنکھیں میچیں۔ وہ دل ہی دل میں یہی دعا مانگ رہی تھی کہ کہیں وہ اسے کسی کام سے اٹھا نہ دے۔
 ”جی! اچھا! وہ چند لمحے رک کر بولی۔“ ابھی بنا دیتی ہوں تمدن بھائی! تمدن وہیں کھڑا رہا۔ ربیعہ کسمسا کر رہ

”اٹھ بھی جاؤ۔“

ربیعہ نے بے بسی سے اس کی جانب دیکھا، پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر چل پھرنے لگی۔ وہ چاہتی تھی اس سے پہلے
 ان کمرے سے نکل جائے۔ اسے وہ کانغذات وہاں سے اٹھا لینے کا موقع مل جائے لیکن ایسا ناممکن لگنے لگا۔ وہ ہنوز
 وہیں کھڑا اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ ربیعہ کو وہاں سے ہٹتے ہی بی۔

اس کی جانب دوزیدہ نگاہوں سے دیکھتی وہ کمرے سے نکل کر کچن میں چلی آئی۔ بے کلی اور اضطراب کے عالم
 اس نے جلدی جلدی ساس پن کھنگال کر چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ باہر صحن میں گیٹ کھلنے کی آواز آئی
 گ۔ شاید مینا سبزی وغیرہ لے کر آگئی تھیں۔ ربیعہ کو مزید کوفت نے آگھیرا۔ وہ باہر سے آکر چند لمحوں کے لیے
 ہمدرد کر سیدھی کرنے کی غرض سے بیٹھتی تھیں۔ ان کے تکیے کے نیچے اس نے گویا پٹاخے رکھے ہوئے تھے۔ اس
 لعل میں ان پٹاخوں کے چلنے کی آوازیں ابھی سے گونج رہی تھیں۔

بھانپن میں چلی آئیں۔ ان کے ہاتھ میں نوکری تھی۔ ربیعہ نے جلدی سے ان کے ہاتھ سے نوکری لے لی۔

”سب سبزی دھو کر رکھنا ہے۔ قیمہ بھی لائی ہوں۔ دھو کر فریز میں رکھو۔“

”جی! وہ مرل انداز میں بولی۔“ چائے دوں آپ کو؟“

”نہیں مجھے یہ ہر وقت کی چائے پسند نہیں۔“ وہ خفگی سے بولیں۔

”مم۔ میں تمدن بھائی کے لیے بنا رہی ہوں۔“ اس نے جلدی سے وضاحت کی۔ مینا بیگم نے گھور کر اسے

دیکھا۔
 ”ایموں لائی ہوں۔“ پھر وہ بولیں۔ ”مجھے سکنجبین بنا کر دو۔“

”جی! اچھا! وہ فرماں برداری سے بولی۔

تمدن کے لیے چائے اور مینا بیگم کے لیے سکنجبین کا گلاس لیے وہ کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ اس کی گویا

مدح قبض ہونے لگی۔

تمدن اس کا فارم ہاتھ میں لیے غور سے دیکھ رہا تھا۔ سب کانغذات اس کے سامنے پڑے تھے۔

”تمدن بھائی! ربیعہ جلدی سے بولی۔“ یہ میرے ہیں۔“

تمدن نے خشمگین نگاہیں اٹھائیں۔

”کس نے لا کر دیا ہے یہ؟“

”ترانہ نے۔“ اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

”کیوں منگوایا ہے تم نے؟“ وہ غرایا۔

”مم۔۔۔ میں بڑھنا چاہتی ہوں۔“

تمدن چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہا، پھر اس نے فارم چھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ربیعہ کے لبوں سے سکی تنک نہ نکل سکی۔ وہ دم بخود اس کی حرکت دیکھتی رہی۔

تمدن نے فارم کے ٹکڑے وہیں فرش پر پھینک دیے اور حقارت سے اسے دیکھنے لگا۔

”بڑھنا چاہتی ہو۔ کیا تم ہمارے لوگ چند کتابیں اور بڑھ کر۔ ترانہ اور صولت کی طرح کمانے نکل کھڑی ہوگی؟ ہم تمہیں پڑھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ تمہارے لیے ہم لوگوں نے کچھ اور سوچا ہے۔“

ربیعہ کے خاموش آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ کسی بت کی مانند ساکت کھڑی رہی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ قرعہ فال میں اب کون سی سزا اس کے نام کی پرچی کے ساتھ نکلے گی۔ لیکن اس کی قوت گویائی غم غصے اور بھرپور احتجاج کو دبانے میں مصروف تھی۔ سو وہ اس کا ساتھ نہ دے سکی۔

”سبزی دھو کر رکھو اور کرپیلے پکاؤ آج۔۔۔“ مینا ٹیکہ بے حد مسرور نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے بڑھ کر ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے لی تھی۔ ربیعہ بے جان قدموں کو ہٹھکتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اسے ڈھونڈتی، آوازیں دیتی چھت پر چلی آئی۔ پھر وہ بیڑھیوں کے پاس ہی کھڑی رہ گئی۔

ربیعہ چھت کے آخری کونے پر چھوٹی دیوار سے ٹیک لگائے، ناہموار فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کے انداز غیر معمولی تھے۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ ترانہ کی آمد پر وہ یوں کونے میں کھسی بیٹھی رہتی یا اس کی پکار کا کوئی جواب نہ دیتی۔ اب وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر ترانہ کو دیکھا تک نہ تھا۔

ترانہ کو پریشانی لاحق ہوئی۔ وہ اس تک پہنچی۔ ربیعہ کی گود میں اس کی ڈائری کھلی پڑی تھی۔ انگلیوں میں قلم ڈھیلے انداز میں جھول رہا تھا۔ ربیعہ کی نگاہیں ڈائری کے صفحے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ربیعہ!“ ترانہ اس کے قریب بیٹھ کر محبت سے بولی۔

”ہوں!“ جواب آنے میں چند لمحے لگے تھے۔

”کیا بات ہے؟ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو۔؟“

ربیعہ نے ایک گہری سانس بھری۔

”نیچے بہت مٹھن ہے ترانہ میرا دل گھبرا رہا تھا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ مجھے لگتا تھا، میں مرجاؤں گی۔ اتنی مٹھن تھی اتنی۔ اتنی۔“

ترانہ گھبرا گئی۔ اس نے ربیعہ کا ہاتھ تھام لیا۔

”ربیعہ! کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا تم نے؟“

اس نے نفی میں سر ہلا کر حلق میں گرتے آنسو لگے۔

”پھر میں نے پہلے کبھی تمہیں اس قدر پریشان نہیں دیکھا۔“

”پریشان تھی۔ اب نہیں ہوں۔“ وہ بولی۔

”یہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں؟“ ترانہ کی الجھن اس کے ادھورے جوابوں سے بڑھ رہی تھی۔

”میں خود کو سمجھا رہی تھی۔“

ربیعہ نے پہلی مرتبہ چہرہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے۔ ترانہ نے بے ساختہ ہی اس کی گود میں رکھی ڈائری کی جانب دیکھا۔

نے ڈائری اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں دے دی۔ ترانہ اس کے چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر ڈائری میں لکھی

اپنے گاندھوں پر لیے اپنے گناہوں کی صلیب
دلت کی شاہراہ پر ہم کیوں گامزن کیا جانے
کیوں نگاہیں بے مہر کے ہیں، کیوں بے مہر خند
کما ہوئے اس شہر کے شیریں خن کیا جانے
دل کہ سہتا تھا غلط انداز بھی پر اب
کیوں محض نظروں سے ہوتی ہے تھکن کیا جانے
کما کہیں عزت نشینی کیوں ہمیں راس آگئی
کس سے تنہائی میں ہیں محو سخن کیا جانے

لے لے اسے ابھی ابھی نظروں سے دیکھا۔

سب کیا ہے ربیعہ؟ کس نے لکھا ہے یہ؟

نے اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

نے؟ کیوں؟

تھمارا سس کے لیے۔ شاید۔ وہ بے یقینی سے بولی۔

اد کا سر جھک گیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر اس نے سراٹھایا۔ اسے شاید کوئی برا ہاتھ آیا تھا۔ ”تم نے

ہم کو کیا؟“

نے خالی خالی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”ترانہ۔۔۔ تم نے بھائی نے میرا فارم بھاڑ دیا۔“ اس کے گلے میں آنسوؤں کی نمی سی گھلنے لگی۔ ”وہ کہتے ہیں‘

’صالح کی ضرورت نہیں وہ کہتے ہیں سب گھروالوں نے میرے لیے کچھ اور سوچا ہے۔“

”اے ترانہ بولی۔“ کیا سوچا ہے؟“

”اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے نہیں پتا۔“

اد کی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے سراٹھایا۔

”تم لیکر کتنی تھیں ربیعہ! تمہاری جیسی لڑکی اس گھر میں رہے گی تو ضرور مرجائے گی۔ میں۔ میں تمہارا

ہم کو یادوں کی اور تمہیں ہاسٹل میں کمرہ بھی دلوادوں گی۔ تمہا لکل فکر مت کرو۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

ہاکی آواز پر وہ دونوں بری طرح سے چونکی تھیں۔ وہ نجانے کب آکر ان کے سروں پر کھڑی ہو گئی تھیں۔ ترانہ

سراٹھائے انہیں دیکھنے لگیں۔ ان کے لبوں پر دل جلانے والی مسکراہٹ تھی۔

”کما کہنا چاہتی ہیں پچھو آپ؟“ ترانہ نے دلیری سے پوچھا۔

”ربیعہ کونہ کہیں جانے کی ضرورت ہے نہ پڑھائی کی۔“ پھر کیا سوچا ”بیوں“ نے؟“ ترانہ نے تلخی سے پوچھا۔

”تم نے ربیعہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ وہ اطمینان سے بولی تھیں۔ ”اور میرے خیال میں اس میں کوئی حرج

نہیں ہے۔ بن مال باب کی بچی کاٹھکانا بھی پکا ہو جائے گا۔“

اد نے ہر اسماں ہو کر ربیعہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”شوں“ کر کے کوئی پھلجھری چھوٹی تھی۔ ربیعہ کے

ہاتھوں کے ہونے لگے۔

اس کی آنکھوں نے دیکھنا چھوڑ دیا۔ کانوں نے سننا موقوف کیا۔ ذہن نے سوچنا بند کیا۔ ہر طرف از میرا

ہر طرف روئے زمین پر تنہا کھڑی تھی۔ بالکل تنہا۔

ترانہ کو اپنے حواس بحال کرنے میں کچھ وقت لگا۔ وہ گم سم بیٹھی ربیعہ کو ایک نظر دیکھتے ہوئے مینا کے ماما جاگھڑی ہوئی۔

”یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں پھپھو؟“ وہ قدرے ترش لہجے میں بولی۔ ”شادی کسی فرد واحد یا اس کے گھروالوں خوشی اور مرضی کا نام تو نہیں ہے۔ شادی تو بندھن ہے، دو افراد کو آپس میں جوڑتا ہے۔ کسی ایک شخص کی مرضی کے تحت بندھن نہیں بندھ جاتے۔ ربیعہ کی مرضی جانے بغیر آپ نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا۔

مینا بیگم نے ربیعہ کی جانب دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں بے پناہ حقیر تھی۔

”اس کی کیا مرضی ہوگی؟ اکیلی لاوارث لڑکی، جس کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے، ہم ہی ہیں اب اس کے سر پر۔ اور مشرقی لڑکیاں اپنے سر پرستوں کے سامنے زبان نہیں کھولتیں۔ اسے تو سہارا ہی چاہیے، سر چھپانے کو۔ چاہیے کھانے کو، وقت کی روٹی چاہیے۔ مل رہا ہے نایاں اسے یہ سب کچھ۔ پھر رشتہ جوڑنے میں اصرار کیسا؟ یوں تو یہ کوئی بائبل ہے نہ دارالامان، تمدن سے اس کا نکاح ہو جائے تو لوگوں کے منہ بھی بند ہو جائیں۔ اسے عزت مل جائے گی۔ بندے کا نام مل جائے گا۔ ابھی ہے کیا؟“

”پھپھو!“ ترانہ از حد تاسف سے بولی تھی۔ ”یہ ایک مکمل ذات ہے، اگر اس کے سر پر باپ کا سایہ ہم ماں کی نرم گود سے میسر نہیں تو اس سے اس کی ذات ادھوری نہیں ہو جاتی۔ یہ ایک وجود ہے، محسوس خفا اس کو جو کچھ مل رہا ہے یہ اس کی پائی پائی کا حساب چکا رہی ہے۔ جسمانی، روحانی، ذہنی، تھکن۔ ہر طرح سے ادا کر رہی ہے یہ اس عظیم احسان کی جو ہم اس کو یہاں رکھ کر کر رہے ہیں۔ اور کن لوگوں کی زبانوں کی فکر ہے؟ کوئی یہ مخلد والے؟ چند ایک دور دراز کے رشتے دار جو محض کسی کے مرنے پر بے شکل پر سہ دینے پہنچتے ہیں۔ اگر ان ہی لوگوں کی بات کر رہی ہیں تو آپ کی یادداشت بہت کمزور ہے پھپھو! ان ہی لوگوں نے صولت کے بھی۔“

”ترانہ!“ مینا بیگم کی آواز غم و غصے سے پھٹ گئی۔ ”زبان کو لگام دو۔ تم جانتی ہو تم کس سے مخاطب ہو!“

”یسا ہی افسوس ابھی ربیعہ کو ہوا پھپھو! مجھے ہوا اب آپ کو ہوا تو آپ نے جانا کہ زبان کا غلط استعمال اذیت پہنچا سکتا ہے۔“ ترانہ نے تاسف سے گہری سانس بھری تھی۔

”یہ بائبل یا دارالامان نہیں۔ ٹھیک ہے۔ یہ لڑکی اگر یہاں آنے کے بجائے کسی دارالامان کا رخ کرتی تو شاید اس کی ذہنی اذیت یہاں کے مقابلے میں کچھ کم ہی ہوتی۔“

”مجھ سے کیا بحث کر رہی ہو تم؟“ وہ دانت کچکچا کر بولیں۔ ”اپنے بھائی سے کیوں نہیں پوچھتیں جا کہ بے تاب ہو رہا ہے۔ پھر اپنے باپ سے پوچھو جس نے اس لڑکی کو ہونٹانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ یہ یہاں مجھے تو سونے کے انڈے نہیں دیتی۔“

”ضرور پوچھوں گی۔“ ترانہ پھر کر بولی۔ ”ربیعہ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو گا۔ خواہ میرا اپنا بھائی ہے۔ یا باپ۔ یہ ایک جیتی جاگتی سانس لیتی باشعور لڑکی ہے اور یہ گھریبے بے در کا گنبد ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ مینا بیگم قدرے سہولت سے بولیں۔ ”پہلے تم ربیعہ کی مرضی تو پوچھ لو نا، کیا خبر! رشتے برا اعتراض نہ ہو۔ تمدن میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔ چھڑے چھانٹوں کے مزاج تو پوچھ بھڑکیلے ہونے والے شادی کے بعد سب ہی ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ بیوی کی ماننے لگتے ہیں۔“ وہ نرم پڑنے لگیں۔

”پھر یہ بھی تو دیکھو کہ ہم سب ربیعہ سے کتنا پیار کرنے لگے ہیں۔ یہ تو ہم سب کی ضرورت بن گئی۔ تمہارے ابو تو اس کے بغیر نہ کھانا کھاتے ہیں نہ دوائی پیتے ہیں۔ تم سے اور صولت سے اس کی بہنوں ہیں۔ تمدن تو خیر اس کے گمن گاتا ہی ہے تصور بھی بہت لگاؤ رکھتا ہے اس سے۔ پھر اتنی اچھی لڑکی کو ہم، گھر بھجیں اور پرانی، ان جانی لڑکی بیاہ کر اپنے گھر لائیں تو یہ تو مکلی بے وقوفی ہی ہوگی نا! انجانے آنے والی کسی والوں سے اس کا برتاؤ کیسا ہو۔ ربیعہ تو ہم میں بالکل مکمل مل گئی ہے۔ خون اپنا ہو تو محبت کی خوشبو تو محسوس

”امامی تو ہم نے ربیعہ کی بھی کرنا ہے اور تمدن کی بھی۔ پھر کیوں نہ رشتے داری کو مزید مضبوط کر دیا جائے۔“

اس کے لمحے میں اصرار تھا۔ ترانہ اب کسی سوچ میں گم تھی۔ مینا بیگم نے سر جھکائے بیٹھی ربیعہ کو ایک نظر ڈالا۔ ترانہ کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔

”دیکھو نا ترانہ!“ وہ بے حد بیٹھے لمحے میں بولیں۔ ”تمہارے ابو کی دیکھ بھال کتنا مشکل مرحلہ ہے۔ اللہ کی مدد سے۔ لیکن عمر تو رب تعالیٰ لکھتا ہے نا۔۔۔ نجانے ابھی انہوں نے کتنے سال اسی طرح پلنگ پر گزارے ہیں۔ میں کہتی ہوں یہ ربیعہ کا ہی حوصلہ ہے جو یہ ان کی ایسی بہترین دیکھ بھال کرتی ہے۔ ایک بیٹی ہی کی ایسی خدمت کر سکتی ہے۔ آج کل کی بیویوں کا تو کام نہیں ہے یہ۔“

”اے ایک گہری سانس بھری تھی۔“

”ہم اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کر بیٹھیں پھینچو! جو کچھ بھی ہو، اس کی خوشی کے ملائق ہونا چاہیے۔ یہ اپنی مرضی سے بنا کوئی نیا رشتہ جوڑے بھی رہنا چاہے تو یہ اس کا حق ہے۔ اور اگر اس کی سوچ میں تبدیلی نہ آئے تو اس کی مرضی ہوگی۔“

”نہ چھ لونا!“ وہ مسکرائیں۔ ”لڑکیاں اپنے دل کی باتیں اپنی سیلیوں سے ہی کرتی ہیں۔ اور اتنے عرصے میں ایک دو سرے سے اپنے دل کی باتیں کہتی آ رہی ہو۔ جانتی ہو ایک دو سرے کو میں کہتی ہوں ایک دو موضوع پر کھل کر آپس میں گفتگو کر لو۔ تم اپنے بھائی اور باپ کی طرف سے اپنی سہیلی کو قائل کرنے کی کوشش کرو۔ بھلا کون سی ایسی ناممکن بات ہے؟ ہم کوئی جبراً تو نکاح نہیں پر دھوا دیں گے۔“

”لک ہے۔“ ترانہ بولی ”کرتے ہیں بات پھر میں آپ کو اس کا جواب بتا دوں گی۔“

”ہوں۔“ انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا۔

”ہاں جانتے وہ ربیعہ کے سر پر دست شفقت پھیر کر گئی تھیں۔“

”اے! اپنی میں تو ڈر رہی گئی۔ اس کا چہرہ بالکل پتھر کا ہو رہا تھا اور آنکھوں میں کوئی احساس کوئی جذبہ نظر نہ آتا تھا۔“

”ملاقات لگ رہی تھی۔“

”دھڑلہ لوں ہاتھ گود میں رکھے گہری سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ ناعمہ نے ذرا ٹھہر کر اپنی بات کا اثر دیکھنا چاہا۔ مطمئن ہو کر رہی اشارت ہوئی۔“

”اور ممانی جان! انہیں تو نجانے کون سا خیال ستا رہا تھا، پہلے تو انہوں نے کوشش کی کہ میں عریشہ سے ملے بغیر جلاں پھر واپسی پر مجھے روک کر بولیں کہ کسی سے کچھ کہنا نہیں۔ ان کا مطلب تھا عریشہ کے رویے کے

”وہ ملے ممتی نظروں سے اسے دیکھا۔“

”مگر تم مزے لے لے کر مجھے سب کچھ بتا رہی ہو۔ حالانکہ تمہیں یہ بات خود تک محدود رکھنا چاہیے تھی۔“

”وہ جھنجھلائی۔“ ”آپ کو ہی بتا رہی ہوں نا۔ کوئی ڈھول لے کر محلے میں تو نہیں نکل گئی۔ اور یوں بھی آپ کو تو ہوتا ہے میرے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے کوئی بات چھپانے کی کوشش کروں تو۔ اس لیے کم از کم کسی

”سے تو ڈسکس کرنا ہی کرنا ہوتا ہے عموماً“ وہ بندہ آپ ہی ہوئی ہیں۔“

”میں بتا رہی ہو یا مجھ سے پہلے بھی کہیں پہنچا آئی ہو۔“ ”ورہ نے اسے کھور۔“

”مہر توبہ۔“ اس نے کان پکڑے۔ ”ممانی جان مجھے گردن سے پکڑ لیں گی۔“

”ممانی عذرا ممانی کے گھر یہ بات نہ پہنچے۔“ ”ورہ نے اسے تنبیہ کی۔“ ”تانیہ یا سدرہ سے اس موضوع پر بات نہ کرو۔“ ”تانیہ سے۔“ اس نے ڈر کر لبوں پر زبان پھیری۔

”کر چکی ہو؟“ وردہ نے اسے بری طرح سے گھورا۔

”آپنی۔۔۔ وہ تو ممکن کے دوسرے دن کی بات ہے۔“ وہ منمنائی۔ ”ہم تو ممکن پر ڈسکش کر رہے تھے۔ مگر کچھ بھی نہیں کہا تھا، شاہنہ بولی تھی کہ عریشہ کا ممکن کے دن رویہ نارمل نہیں تھا۔“
 ”ہاں خیر۔۔۔“ وہ بڑبڑائی۔ ”یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ سب ہی نے محسوس کر لیا تھا، لیکن زیادہ ا نے اسے اہمیت نہ دی۔ سب ہی جانتے ہیں کہ عریشہ سر پھری سی لڑکی ہے، ڈرا سی بات پر خفا ہو جایا کرتی ہے اتنے دن بعد بھی وہ نارمل نہیں ہوئی، تب یہ فکر کی بات ہے۔ آخر وہ چاہتی کیا ہے؟ اگر اسے نافع پند اسے ہامی ہی نہیں بھرنا چاہیے تھی۔“

”بے چارہ نافع!“ ناعمہ نے ناسف سے سر ہلایا۔ ”پھنس گیا بری طرح ہے۔“
 ”بس، فضول ہی بولنا تم مجھے تو تمہارا ہی خوف رہتا ہے ہر وقت کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ بک دیتی ہو اور اس کو باتیں سننا پڑتی ہیں۔“ وردہ نے اسے فوراً ڈانٹا۔

”راشمہ آپ کی شادی پتا نہیں کیوں پہلے کر دی امی نے۔“ اس نے منہ بنایا۔ ”آپ کی کردیتیں تو ہملا پیشیوں سے جان چھوٹی۔ بس سمجھ کر میں اپنے دل کی باتیں کرتی ہوں، آپ فوراً ڈانٹنا شروع کر دیتی۔“
 ”راشمہ آپ اتنی دلچسپی سے میری باتیں سنتی ہیں۔ خوب ہاں میں ہاں ملائی ہیں۔ اور اگر میں کوئی نئی تازی نہ لائے تو ان کا تون ہی بے کار جاتا ہے۔“
 وردہ کو بے ساختہ ہی ہنسی آگئی۔

”میں تمہارا ایشی بدھوپن اسکوڑ ہوں، اس لیے۔“ اس نے خفا بیٹھی ناعمہ کے سر پر ایک چپٹا لٹا دیا۔ ”تجھتی تو کچھ ہو نہیں سوجنا تمہیں ویسے ہی نہیں آتا۔ بی جالو بی پھرتی ہو اور اپنی اس ڈیوٹی پر بہت طر رہتی ہو۔“

”اچھا۔۔۔ تو محترمہ عقل کل صاحبہ! ذرا سی روشنی پھینکیے اپنی عقل کے مینار سے اور بتائیے کہ میں نے کلام بدھوپن کا مظاہرہ کیا ہے عریشہ نافع سے ممکن کر کے خوش نہیں ہے تو اس میں میرا کیا تصور ہے؟ مجھے کیا زیاں ہندی اس قدر شدت سے مل رہا ہے؟“
 وردہ خاموش ہو کر اسے گھورنے لگی۔

”جانتی ہوں اس گھر کے بزرگوں کو گھر کے رشتے گھر ہی میں جوڑنے کا کتنا کیریز ہے۔ لڑکوں کے خاندان کا جانے کا تصور ہی ان کے لیے کتنا روج فرسا ہے۔ ہاشم بھائی بے چارے ابھی تک سخت تنقید کی زبوں میں ہیں حساب سے لڑکیوں کی مائیں بھی یہی کچھ سوچتی ہیں۔ نافع کے لیے عریشہ اور تمہارا دونوں نام زیر غور ہے۔ بزرگوں نے فیصلہ عریشہ کے لیے سنایا۔ کیونکہ۔۔۔“ وہ کہتے کہتے جھجکی۔ ”وجہ تم جانتی ہو۔ اب اگر تم منہ سے یہ بروہی گیندہ کسی نے سن لیا کہ عریشہ اس رشتے سے ناخوش ہے تو جانتی ہو اس کا منطقی نتیجہ کیا نکلے گا یہ کہیں گے کہ تم جلن میں یہ سب کہہ رہی ہو۔ کیونکہ تمہیں چھوڑ کر عریشہ کو منتخب کیا گیا ہے۔“

”ہائے اللہ۔“ وہ خفگی سے اسے دیکھنے لگی۔ ”مجھے کیا خبر تھی میں تو آپ شکرانے کے نقل پڑھوں گی۔“
 وردہ کو ہنسی آگئی۔ ”کیوں یہ نافع اتنا برا تو نہیں ہے بے چارہ۔ تم لڑکیاں اتنا بدک کیوں رہی ہو۔ صورت خوب سیرت، سلجھا ہوا الزکا ہے۔“

”بھئی مجھے خاندان میں شادی کرنے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔“ اس نے ناک سکڑی۔ ”بچپن سے دیکھتے آ رہے ہیں انہیں بڑھاپے تک برداشت کیے جاؤ، کوئی سزا ہے یہ ہماری؟“

”یہ آئینہ فلزم ہی تو مار رہا ہے اس دور کی لڑکیوں کو۔“ وردہ کو غصہ آیا۔ ”مڑیا نے اور غضب ڈھال لڑکیاں خود کو جانے کون سی مخلوق تصور کرنے لگی ہیں۔ ناک کے نیچے کوئی ساتا ہی نہیں لی وی اسکرین تو کوئی ہیرو زندگی میں آگئے اور ہاتھ پکڑ کر واپس فلمی دنیا میں لے جانے جہاں ڈسٹ ساکنز ہوں اور عشقیہ وا

”اے اہل ہونا تم لوگ؟“

”مہمان پہلا کر بیٹھ گئی۔“

”اب سب آپ کی طرح تو نہیں ہوتیں اللہ میاں کی بکری۔“ وردہ کو غصے کے باوجود ہنسی آئی۔

”مثال کو کیا ہوا؟“

”اب آپ کو گائے تو کہنے سے رہی۔ بائیس انچ کی کمر ہے۔ آپ کے لیے یہی مثال مناسب ہے۔“

”اور جو کچھ میں نے عرض کیا اتنی دیر میں وہ پلے پڑا آپ کے؟“ اس نے تینہنسی انداز میں پوچھا۔ اس نے

”مہمان سے سر ہلادیا۔“

”مہمان ہوتی ہوں اب کتنے دن سوگ مناؤ گی اپنی مری ہوئی ماں کا؟“ فردوس بیگم کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔

”کرتی اس کے سر پر آکھڑی ہوئیں۔“ ”ایسی فتنہ لڑکیاں۔“ توبہ توبہ۔ لوگ یونہی تو نہیں زندہ گاڑ دیتے

”کہوتی ہوگی انہیں کہ جوان ہو کر منہ کو آئیں گی یہ بالشت بالشت بھر کی چھو کریاں۔ سروں میں خاک ڈالیں

”ہاں کے تورو دیکھ کر اندر سے سہم گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ایک ہفتہ سے وہ نہ دھنک سے

”نہ کسی نہ کسی سے بات کرتی تھی۔ منہ دھونا، بال بنانا، کپڑے بدلنا سب ہی چھوڑ رکھا تھا۔ گلابی رنگت

”میں تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے تھے۔“

”اس بیگم چند لمحے پیچ و تاب کھاتی رہیں پھر اس کی صورت دیکھ کر نظریں چراتے ہوئے بند پڑنے لگیں۔“

”سہارا حوصلہ تو رہا ہی نہیں لڑکیوں میں۔“ ناشکری سی ناشکری۔۔۔ ارے ایسا کون سا پہاڑ توڑ دیا، ہم نے

”سر۔۔۔“ منگنی ہی کر دی ایک دیکھے بھالے بچے سے۔۔۔ وہ بھی تمہاری محبت میں۔۔۔ کہ بیٹی کو لاؤں سے

”اہیں اور دینے کا حوصلہ نہیں پڑنا۔ ہماری بچی ہماری نظروں کے سامنے رہے گی۔ ہماری آنکھیں اور کلیجہ

”ہمیں گا لیکن بچی نے تو مانو اندھیر مچا ڈالا۔ انوائی کھوئی لیے بڑی ہے سو بڑی ہے۔ اب ہمیں بتاؤ ہم کیا

”ہاں کر گزیں؟ پیر پڑیں تمہارے؟ اپنے سر پر جوتے ماریں؟ کیا کر سچو تم خوش ہو، بتاؤ؟“

”خیال رہا آپ نے میری خوشی کا۔۔۔“ شکر یہ۔۔۔ ”وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔“ ”اب مزید میں کیا چاہوں

”آنکھیں، انا کلیجہ ٹھنڈا کرنے کا سوچا تھا، میرے سر کیا احسان ہے؟ میری آنکھیں تو تب سے سلگ رہی

”سلگیں گی۔ میرے تصور کی دنیا میں آگ لگ گئی ہے۔ اب مجھے کسی سے کیا؟ آپ خوش ہو گئیں۔“

”سہارا کہ ہو اب میرا خیال نہ کریں۔“

”نہ کریں خیال؟ تمہارا خیال نہ کریں اپنی عزت کا تو کریں گے۔ بات پھیلے گی تو ہماری رسوائی ہوگی۔“

”اے اہل ہونا گے۔ تم تو ہیروئن بنی کو نے میں پڑی رہو گی۔ لوگوں کو تو جواب ہم دیں گے، کیا کہیں گے، کس آسیب

”ہے ہماری لڑکی پر؟“ رے بیٹا! چھوڑو یہ ڈرامے۔ ماں باپ کی عزت کا کچھ لحاظ کرو۔ ارے نہیں کرتی تھی تو

”میں باپ کو۔ اب ہو گئی تو بھگت لو۔“ وہ بیڑ باقی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھیں۔ عریضہ بیٹھی ہونٹ چباتی

”اچھدی کیسے بھول جاتی۔ دل کی دنیا بننے سے پہلے ہی اچاڑ دی گئی تھی۔ ابھی تو آنکھوں نے خوش رنگ سینے

”نما رہی کیا تھا۔ ابھی تو دھڑکنوں نے نئی نال پر دھڑکنا شروع کیا تھا۔ ابھی تو آنکھوں سے روشنی پھوٹنے لگی تھی

”گرز تھا۔ سپنا مکمل ہونے سے پہلے ہی اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا تھا اور اب حواس بحال نہ ہونے کی

”حالی کی جاری تھی اس میں کچھ وقت تو لگنا تھا۔ تتلی کے رنگ اس کی انگلیوں پر رہ گئے تھے۔ ان رنگوں کو مٹنے

”کچھ عرصہ درکار تھا۔“

”اب بھی کبھی کبھی کتنے بے مروت ہو جاتے ہیں۔ جس اولاد کی خوشی کا لمحہ خیال کر کے اسے پروان

”ہے جسے شروع سے احساس دلاتے ہیں کہ تمہاری خوشی ہی ہمارا سب کچھ ہے۔ اسی اولاد کی رگ جاں

سے سب سے خوش کن احساس کو نوچ کر علیحدہ کر ڈالتے ہیں۔ زندگی بھر چھوٹی چھوٹی خوشیاں ڈھیر کرتے رہے اور جہاں زندگی کی سب سے بڑی خوشی کا معاملہ آتا ہے وہاں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ زبان کے مسئلے کھڑے ہیں، عزتوں کی بات ہوتی ہے۔ خاندان سے تعلق یاد آتا ہے اور جو بات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے بھول جاتے ہیں۔

زبان۔ ہر شے سے بڑھ کر اور دل؟

عزت۔ ہر شے سے زیادہ اہم اور جذبے؟

خاندان۔ وجود کی بنیاد اور روح؟

دل، جذبات، روح پیاسے رہ جائیں۔ زبان، عزت، خاندان، خون جگر سے اپنے ہونے کا خراج مانگیں۔ دل کی ناقابل برداشت اذیت سے آنکھوں میں آنسو بھر آئیں تو یہ ایکٹنگ قرار پائے۔ ڈراموں میں میں، قصوں میں، کہانیوں میں، افسانوں میں کیا کچھ بھی سچ نہیں ہوتا؟ آنسو کب جھوٹ بولتے ہیں؟ زبان بول سکتی ہے لیکن آنسو یہ سچ کہتے ہیں۔

عریشہ جتنا سوچتی، اتنا ابھرتی تھی۔ اسے بھولنا چاہتی تھی لیکن وہ آواز خوابوں میں بھی اسے ستاتی م سوچتے سوچتے تھک جاتی۔ گرا بجھ کر اسرا ہاتھ نہ آتا۔ اسے کیسے فراموش کرے، نئی زندگی کی ابتدا کیسے کرے خود کو کیا کہہ کر سمجھائے؟ اس وقت جذباتیت، شوریدہ سری اور غم وغصے کا شدید غلبہ تھا۔ وہ کچھ فیملہ کہا قابل نہ تھی۔



”شریت بناؤں؟“ منیہزہ بیگم نے انہی کو محبت سے دیکھا۔

وہ کالج سے آئی تھی اور بے حد تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ شوز اتار کر لاؤنج میں ہی صوفے کے گدازپن اٹھا رہی تھی۔ پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔

”آپ رہنے دیں امی!“ اس نے سراہایا۔ ”میں خود کچن میں آتی ہوں، بھوک لگی ہے۔“

”آج کچن نہیں کیا؟“ وہ فکر مند ہوئیں۔ ”پانچ بج رہے ہیں۔“

”آج بہت مصروفیت رہی۔“ وہ اٹھ کر بال ٹیمینے لگی۔ ”سچ کا ٹائم کہاں ملا۔ چائے تک نہیں پی۔“

”ماں صدقے۔“ وہ افسوس سے بولیں۔ ”پہلے کیوں نہ بتایا۔ حیراب جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر آؤ، میں گرم کر رہی ہوں۔“

”پاپا؟“ اس نے شہلا کی بابت استفسار کیا۔

”وہ تو ڈھائی بجے آگئی تھی۔ دونوں ناں بیٹا سو رہے ہیں۔“ وہ بتاتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئیں۔

سالن کا ڈونگا مسکرو دیو ادوں میں رکھ کر وہ تازہ روٹیاں پکانے لگیں۔ انہی نے پیچھے سے آکر ان کی گلا لاڈ سے بازو حائل کر دیے۔

”سارا دن لگی رہتی ہیں، ہم سب مل کر کتنا ستاتے ہیں آپ کو۔“ وہ ان کے شانے پر سر ٹکا کر بولی۔

”ماں کا کام ہی یہی ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”کبھی بیمار پڑ جاؤں تو خدمت بھی تو تم لوگوں کو کرنا ہے۔ ماں کی اپنی اولاد کے لیے ہی وقف ہوتی ہے اور اولاد کی اپنی ذمہ داریاں ہیں۔“

”پھر بھی امی۔۔۔ مجھے کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ہم لوگ بہت تنگ کرتے ہیں آپ کو۔“

”پاکل لڑکی۔۔۔“ وہ ہنس دیں۔ ”چلو، میز پر سالن رکھو، اور کھانا شروع کرو۔ سباتوں میں ہی تم نے سب کچھ کر دینا ہے۔“

”بڑے لاڈلوں سے ہیں، بھی“ شہلا کی آواز پر وہ دونوں میز پر تھیں۔

وہ لبوں پہ مسکراہٹ لیے کچن کے دروازے میں کھڑی تھیں۔ آج کل وہ ہر وقت مسکراتی نظر آتی تھی۔

”جی ہاں!“ انہی مزے سے بولی۔ ”امی اب پوری طرح سے میرے تصرف میں آنے والی ہیں۔ عبادت بھالی

اور آپ سسرال میں۔ میں اور امی خوب جی بھر کر باتیں کیا کریں گے۔
 ”اتنی تو میں اب اپنی بہو سے کروں گی، تمہیں تو میں پڑھائی مکمل ہوتے ہی بیاہ دوں گی۔“ انہوں نے ہاتھ
 اٹھ کر رکھ کر ہنسنے ہوئے کہا۔

”سی! انہی نے احتجاج کیا۔“ نائٹ فائر! مجھے کچھ تو لطف اٹھانے دیں، آپ کے پورے پورے پیار کا۔“
 شہلا بھی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے ہوئے میز پر آ بیٹھی تھی۔
 ”بھئی تم کیسے لطف اٹھا سکتی ہو۔“ وہ بولیں۔ ”میرا نواسا جو ہے۔ خدا سے سلامت رکھے، وہ کہاں تمہیں لاؤ
 لے دیتا ہے مجھ سے۔“

شہلا ان کا مطلب سمجھ گئی تھی، یکدم سنجیدہ ہو گئی۔

”شہلا! منہ زہ بیگم نے اب اسے مخاطب کیا۔“ بیٹا! وہ لوگ کل شام آرہے ہیں نکاح کی تاریخ رکھنے۔ کل
 صبح اگلے دن ہے نا اسی لیے میں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا۔ یوں بھی نیک کام میں تاخیر مناسب نہیں۔ میں
 اپنا دل تو کیا بل گن رہی ہوں۔ کب وہ مبارک گھڑی آئے اور میں تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھوں۔“
 ”سی! وہ چھ دیویر بعد بولی تھی۔“ میں عمر کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

منہ زہ بیگم نے کچھ دیر سوچا پھر مسکرا دیں۔

”شروع شروع میں تو مناسب معلوم نہیں ہوتا بیٹی! ہاشم میاں ماشاء اللہ علیہ وسلم طبعیت آدمی ہیں پھر
 ان کے بھی جذبات و احساسات کا خیال تمہیں کرنا ہو گا نا۔ ہاں چند ماہ بعد جب زندگی کی گاڑی ایک طے شدہ
 پٹے پر چل نکلے تو آہستہ آہستہ اس گھر میں عمر کی جگہ پیدا کر لیں۔ تب تک میں عمر کا ویسے ہی خیال رکھوں گی
 پھر ماتم خیال کرتی ہو۔ میں اس کی ماں جیسی ہوں۔ مجھے اس کی نانی نہ سمجھو۔ ہمیشہ سے وہ تم سے زیادہ وقت میرے
 ساتھ گزارتا ہے۔“

شہلا کی پلکوں پر نمی چمکنے لگی تھی۔

”میں اس کے بغیر کیسے جی پاؤں گی؟ ساری رات مجھے اس کا خیال ستائے گا۔ وہ رات کو تو میرے بغیر کسی
 صورت میں رہتا۔“

”اہل جائے گا بچہ ہے۔ تم کون سا میلوں دور جا رہی ہو، دن میں دوبار آ سکتی ہو اسے دیکھنے۔“

”میں زیادہ دن اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گی۔“ وہ آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بس ہفتہ
 میں لے جاؤں گی اسے۔“

”سی! ہو۔“ منہ زہ بیگم مسکرائیں۔ ”میرا بھی اعتبار نہیں ہے؟۔“

”آپ کا اعتبار نہ ہوتا تو کبھی ہانی نہ بھرتی۔“ وہ سر جھکائے ہوئے بولی۔

”اچھا یہ بتاؤ اگلے چاند کی تاریخ تمہارا دیں؟“ وہ اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔

”بھئی آپ کی مرضی۔“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ ”اس راہ پر چلنا ہی ہے تو سوچنا کیا؟“

انہی نے فوراً اس کے تاثرات کا جائزہ لینے لگی تھی۔

”تو پھر طے ہے بہن! اگلے چاند کی، اس تاریخ؟“ شفیقہ حیات نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ منہ زہ بیگم کے روم روم سے مسرت کی لہریں نکل رہی تھیں۔

”جلے پھر منہ میٹھا کرتے ہیں۔“ انہی نے ڈانٹنگ ٹینل کی جانب اشارہ کیا، جہاں اس نے بے حد پر تکلف قسم

کا اہتمام کیا ہوا تھا۔

سی گرین ٹکر کے کڑھائی والے لباس میں شہلا صوفی پر بیٹھی تھی۔ سر پر انچل لیے، نگاہیں جھکائے وہ

”الغنا“ مشرقی لڑکیوں کے انداز میں بیٹھی کارروائی ملاحظہ کر رہی تھی۔ وہ وہاں آنے سے بھی گریزاں تھی اور اپنے

کمرے میں ہی بیٹھنے پر مصر تھی، لیکن ایقان اور انہی کے پکڑ لائی تھیں۔

ایقان چند لمحوں میں ہی اپنی پلیٹ بھر کر اس کے قریب آئی جی اوری اور اب بے حد شوق سے ایک روٹ کھا رہی تھی۔ شہلا کے لمبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ گہرے سبز رنگ کے لباس میں بے حد بھرے بھرے گداز جسم کی مالک روشن و شاداب چہرہ کیے وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ شہلا چند لمحے اس پر سے نظر نہ ہٹا سکی۔

”تم بھی کھاؤ نا۔“ ایقان اس کی توجہ محسوس کر کے بولی۔ ”ہم سے کیسی جھجک۔ ہم تو سب تمہارے ہاں

پہچانے دیکھے بھالے ہیں۔ یہ لوگلاب جامن میرے ہاتھ سے کھاؤ۔“ اس نے اپنی پلیٹ میں رکھا گلاب جامن اٹھا کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ بیشتر حاضرین محفل مسکرائے۔

تھے شہلا نے خفت سے اسے دیکھتے ہوئے نشو سے منہ صاف کیا۔

”تم ایقان کی بچی۔۔۔“ وہ بولی تھی۔ ”سدا ہوگی نہیں۔“

”یہ جملہ میرے لیے مخصوص ہو چکا ہے۔“ ایقان ہنسی۔

اس کی ہنسی میں شرارت تھی۔ شہلا اسے پھر سے بغور دیکھنے پر مجبور ہوئی۔ وہ واقعی بہت پیاری لگ رہی تھی۔

وہ غالباً ہر شے سے مکمل انصاف کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔

”پھر کچھ دوسرے تمہارے منہ میں؟“ ایقان نے شرارتاً پوچھا۔

شہلا جھینپ گئی۔

ایقان اپنی پلیٹ مزید بھرنے کے ارادے سے اٹھی تو فروس بیگم وہاں آئیٹھیں پھر انہوں نے غور سے شہلا

جانب دیکھا۔

”کچھ کھاؤ تم بھی۔ جان ہناؤ! بیویاں کر کر کے کیسی دلی ہو رہی ہو۔“

شہلا ہنس کر خاموش ہو گئی۔

”اب اچھی بھلی نوکری تو تم چھوڑ دو گی نہیں۔ نہ ہی ہم کوئی زور زبردستی کریں گے، تمہاری اپنی مرضی ہے۔ کما

چاہتی ہو تو شوق سے کماؤ لیکن چھٹیاں لے لینا، ماہ دو ماہ کی۔ آخر ہمارے بھی تو کچھ ارمان ہیں۔ پہلا پہلا لڑکام

ہمارا۔۔۔ کچھ تو شوق پورے کریں۔“

انہوں نے حسرت سے سانس بھری تھی۔ شہلا خفیف سی ہو گئی۔

”وہ۔۔۔“ وہ بے وجہ ہی کھنکھاری۔ ”عزیزہ نہیں آئی؟“

”اے ہاں۔۔۔ آج کل کی لڑکیاں اپنی مرضی کی مالک۔۔۔ ہم نے تو بہتیرا کہا، بہن نے سمجھایا۔۔۔ وہ منہ پیٹنے ہالا

رہیں۔ بے چاری کی طبیعت خراب ہے کافی دن سے۔“

”خیر تو ہے۔“ شہلا بولی۔ ”کیا ہوا ہے؟ آپ لے آئیں تو میں چیک اپ کر لیتی۔“

”ارے نہیں۔“ وہ مزید گھبرا ئیں۔ ”ایسی کوئی خاص بات نہیں، سردرد کی شکایت کرتی ہے۔ میں نے کہا نظر

چیک کرو الو۔“

انہوں نے جلدی سے بات سنبھالی پھر موضوع تبدیل کرنے کی غرض سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”عمر کہاں ہے؟“

”جی وہا ہر لان میں ہے۔ ایقان کے بچوں کے ساتھ۔“

”اچھا اچھا۔ مومن میاں کا دوست ہے نا۔“

”جی ہاں۔“ شہلا مختصراً بولی۔

”ماں سے ملنے آؤ تو اس سے بھی مل جایا کرنا، شروع شروع میں تو تنگ کرے گا ناںی کو، پھر ہل جائے گا۔“ شہلا

نے چونک کر سراٹھایا۔ قدرے فاصلے پر کھڑی انیقہ کے چہرے نے نئی رنگ بد لے۔

”اب ایسے بچوں کا تو مسئلہ اٹھتا ہی ہے بعد میں۔ یہ تو پہلے سوچنے کی باتیں ہیں۔“

اس سے پہلے کہ شہلا کچھ بول پائی وہ وہاں سے اٹھ گئی تھیں۔ شہلا کی ابھی ہوئی نگاہیں انیقہ کی محتاط نظروں

سے ٹکرائیں۔

گلاس دور بے فکری سے کھول کر اندر آتا نافع بری طرح سے چونکا تھا۔
 وہ سامنے بڑے صوفے پر بیٹھی تھی۔ گیلے بال اس کے تانہ غسل کا پتہ دے رہے تھے۔ لائٹ مسٹرڈ اور لائٹ
 لیمبویشن کا سوٹ پہنے وہ قدرے افسردگی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ بیمار سی لگ
 رہی تھی۔ بے خبری کا یہ عالم تھا کہ اسے نافع کی آمد کا علم ہی نہ ہو سکا تھا۔
 پلیٹ میں پڑا آلیٹ بے دلی سے کھا رہی تھی۔

نافع شوخی سے کھنکھا رہا۔
 عیشہ نے اس نظر اسٹھائیں اور ایک دم گڑبڑا گئی۔
 ”آپ۔۔۔“ اس ایک لفظ میں بیزاری، نفرت، ناپسندیدگی، سب ہی کچھ تھا۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔
 ”اے عیشہ علی۔۔۔ مجھے اس نے مس کال دی تھی۔“

”علی اوپر ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔
 لہروں سر جھکا کر بیٹھ گئی تھی جیسے اس کے وہاں سے جانے کی غصہ ہو۔
 نافع چند قدم آگے بڑھا شاید اسے کچھ خیال آیا تھا۔
 ”تم سلا آئی کے گھر نہیں گئیں اتنے اہم موقع پر؟“
 ”ہیں۔“ وہ مختصراً بولی۔

نافع نے اس کی صورت دیکھی۔
 ”کسی سے لڑائی ہو گئی ہے کیا؟“ وہ مسکرایا۔
 اس کی بچکانہ طبیعت سے پھوٹے ہوئے سب ہی واقف تھے۔ عیشہ نے خاموش نظریں اٹھا کر چند لمحے اس
 کا چہرہ دوبارہ نظریں جھکا لیں۔ اس کی نظروں میں نجانے کیسی غیریت تھی کہ نافع سے پھر کچھ نہ بولا جاسکا۔
 وہ چپ چاپ آگے بیٹھ گیا۔

اچانک ہی دل و دماغ شدید قسم کی بغاوت پر اتر آئے تھے۔ اس نے پلیٹ میں رکھا آلیٹ بیزاری سے پرے
 کر دیا۔ نمک والی ہاتھ مار کر گرا دی۔ میز پر رکھا اخبار اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اور پھر جیسے بے بس ہو کہ میز پر سر
 رکھ کر رونے لگی۔

وہ اس قدر خاموش تھی کہ ترانہ کو اسے مخاطب کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے محض ربیعہ کی
 لاطر پھنکی کی تھی اور صبح سے اس سے بات کرنے کے بہانے تلاش رہی تھی۔
 اور ربیعہ رلوٹ کے سے انداز میں روزمرہ کے کام کر رہی تھی۔ کوئی اس سے کچھ پوچھتا تو وہ اسے میکا کی انداز
 میں جواب دے دیتی اور پھر اپنے کام میں لگ جاتی۔

ترانہ اس کی کیفیت کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اسے ربیعہ سے ڈر لگ رہا تھا۔ یہ ربیعہ بے حد اجنبی معلوم ہو رہی
 تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے گانگی نہ تھی لیکن شناسائی کا جذبہ بھی نہ تھا۔ سمجھی سمجھی نگاہوں سے وہ اس کی سمت
 کرتی تو ترانہ نظریں چرا لیتی تھی۔ ترانہ اس سے کچھ کہنے کے لیے پر توتلی تو وہ کتر اجاتی۔
 لہ ترانہ کو ایک ترکیب سوجھ ہی گئی۔ صولت، تصور اور تمدن گھر پر نہ تھے۔ مینا ٹیکم حسب معمول محلے کے ڈور
 لال ہوئی تھیں۔ ترانہ نے چپکے سے ربیعہ کو دیکھا اور چادر لے کر گھر سے نکل گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ رلوٹ آئی
 لی۔ اس کے ہاتھوں میں شاپرڈ تھے۔

”ربیعہ!“ وہ شوخی سے بولی۔ ”دیکھو تو میں کیا لائی ہوں؟“
 ربیعہ بھی سبزی بنا رہی تھی۔ اس نے سراٹھا کر بے تاثر نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”تمہارے گفتگو۔۔۔“ ترانہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ”جلدی سے کھول کر دیکھ لو پھر انہیں اپنے سوٹ کیس
 لے کر لو اس سے پہلے کہ کوئی آجائے۔“

”یہ تم رکھ لو ترانہ۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔ ”میں بھلا ان کا کیا کروں گی؟“
 ”میں؟“ ترانہ کو حیرت ہوئی۔ ”لیکن یہ تمہارے لیے ہیں ربیعہ! یہ میں نہیں لے سکتی اور پھر ذرا کھول
 دیکھو کیا کیا ہے؟“

اس نے بات کرتے ہوئے شاہرہ بستر پر الٹ دیے۔ بہت سی چیزیں نکل کر وہاں ڈھیر ہو گئی تھیں۔ کچھ
 تھیں چاکلیٹ کے ڈبے تھے، ایک خوبصورت ڈائری، قیمتی پتھر سیٹ اور کچھ اسٹینڈر ٹوائز تھے۔ ترانہ ایک ایک
 اٹھا کر شوق سے دیکھتی رہی پھر اس نے کچھ کمنے کے لیے اشتیاق سے سراٹھایا تھا۔ کہ ربیعہ کو دیکھ کر وہ چونک کر
 ربیعہ کہیں اور دیکھ رہی تھی۔ وہ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اپنے لب و لہجہ
 بچکتے ہوئے وہ غالباً ”آنسو پیچھے چھیلنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔“
 ”ربیعہ!“ ترانہ نے بے ساختہ ہی اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”اتنی اداس کیوں ہو؟“
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے سر جھٹکا۔

ترانہ چپ ہو گئی۔ سب ہی کچھ تو اس کے علم میں تھا۔
 ”گفتگو اچھے ہیں نا؟“ وہ پھر بولی۔
 ”ہاں۔“ ربیعہ جیسے بے خیالی میں بولی تھی۔
 ”میں سنہال کر رہ لو۔“ ترانہ نرمی سے بولی۔
 ”میں نہیں تم رکھ لو ترانہ۔ میں بھلا ان کا کیا کروں گی۔“ وہ یاسیت سے بولی تھی۔
 ”میں۔ میں بھی ان کا کیا کروں گی ربیعہ؟“ ترانہ نے سب چیزیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب تو تمہارے
 خرید گیا ہے۔ ایک بات پوچھوں، بن بن کر؟“
 ربیعہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
 ”تم۔“ ترانہ جھجکی۔ ”تم تمدن بھائی سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ ہے نا؟“

ربیعہ سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو گھورنے لگی۔
 ”تم۔ عباد کو چاہتی ہو؟“ ترانہ نے آہستگی سے پوچھا۔
 ربیعہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی نگاہوں میں خیر تھا۔
 ”ترانہ! میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ اس نے بالآخر لب کھولے اور گلے میں گھلتی نمی کو محسوس کیا۔ ”میں
 بس اتنا جانتی ہوں کہ میں مردوں سے الگ رہوں۔ کیوں؟ کیسے؟ ان سوالوں کے جواب نہیں ہیں میرے
 پاس۔ بس میں شادی نہیں کر سکتی۔ میں یہاں اس گھر میں ساری عمر بتانے کو تیار ہوں ترانہ! میں۔ میں
 جان کی خدمت کروں گی۔ جب تک ان کی یا میری زندگی ہے میں تمدن بھائی اور تصور بھائی کی شادیوں کے
 گاؤں کی ان کی دہلیوں کے چاؤ اٹھاؤں گی۔ پھو کے لیے صولت بن جاؤں گی لیکن پلیز ترانہ! مجھ سے شادی
 کے لیے اصرار نہ کرو۔ مجھے اس سے بچاؤ ورنہ ورنہ شاید میں مر جاؤں گی۔“

وہ سسک اٹھی۔ ترانہ اس کی پشت سے سہلانے لگی۔
 ”پلیز! میں تو نجانے کیا سمجھ بیٹھی۔ مجھے لگتا ہے ربیعہ! تمہاری زندگی میں کچھ ایسے حادثات گزرے
 جنہوں نے تمہیں مردوں سے متنفر کر دیا ہے، ورنہ تمہاری عمر ایسی نہیں کہ تم اس قدر گہرائی سے ان معاملات
 تجربہ کر سکو۔“

”کچھ بھی سمجھ لو۔“ ربیعہ گلو کی لہجے میں بولی۔ ”تم تمدن بھائی کو سمجھاؤ ترانہ! انہیں بہت اچھی لڑکی مل
 ہے۔“

”تم بھی تو بہت اچھی ہو ربیعہ!“ ترانہ نے محبت سے کہا۔
 ربیعہ چونک کر ترانہ کی جانب دیکھنے لگی۔ گویا اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

”دیکھو ربیعہ! اگر بات یہ ہوتی کہ تم تمدن بھائی کو ناپسند کرتیں تب میں کسی کو بھی تم سے زبردستی نہ کرنے دیتی یا اگر تم کہیں اور شادی کرنے کی خواہش مند ہوتیں جیسا کہ عباد سے — تب بھی ایک ٹھوس وجہ بنتی ہے۔ محض اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ تم شادی نہیں کرو گی۔ یہ بات ماننے والی نہیں ہے۔ آج نہیں تو کل تمہیں یہ دم اٹھانا ہی ہو گا تو پھر آج ہی کیوں نہیں اورو۔ اور اگر تمہارے ذہن میں واقعی کوئی ایجنج کوئی آئیڈیل نہیں ہے وہ جبکہ کر خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اب کی بار سر اٹھا کر اسے نہ دیکھا۔ وہ جان چکی تھی کہ ترانہ کا مطلب کیا ہے۔

”ربیعہ!“ ترانہ اس کے ہاتھ تھام کر خوشامد سے بولی۔ ”ربیعہ! تم اس گھر کو سنبھال سکتی ہو، سنوار سکتی ہو۔ تمہاری ”ہاں“ اس گھر کا مقدر بدل ڈالے گی، مجھے یقین ہے۔“

ربیعہ کے اندر آنسو گرنے لگے۔ طوفانی ہوائیں زور پکڑنے لگیں۔ اس کا دل شدت سے نفی میں سر ہلانے لگا لیکن وہ ساکت بیٹھی رہی۔

”پھپھو نے حقیقتاً“ میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے نظر آنے لگا کہ اس گھر کی خوشیاں صرف تمہارے وجود سے وابستہ ہیں۔ یہاں چاہتوں کے گل و گلزار محض تم کھلا سکتی ہو۔ اتنی محبت، اتنی طاقت میں نے تم میں پائی ہے۔ ربیعہ! تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو۔ اس گھر کے معمولی افراد کو اپنا کر غیر معمولی کر سکتی ہو۔ میں جانتی ہوں ربیعہ! میں زیادہ طلب کر رہی ہوں لیکن محض تمہارے اندر موجزن بھلائی کے سمندر کے سہارے میری اتنی ہمت ہوائی ہے۔“

ربیعہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے ترانہ دونوں ہاتھوں سے اور نہایت شدت سے اس کا گلا گھونٹ رہی ہو۔ اس سے سانس لینا محال ہونے لگا تھا۔

”بولو نا ربیعہ!“ ترانہ جیسے خود بھی کسی سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔

ربیعہ خاموشی سے اپنے بچتے آنسو صاف کرتے لگی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اور اس کا انداز ہار مان لینے والا تھا۔ ترانہ نے گویا سکون کا سانس لیا تھا۔

موبائل کی بپ بہت دیر سے بج رہی تھی۔ عاشر بہت تھک کر سویا تھا، اس لیے اسے شعور کی کیفیت میں آنے میں کچھ وقت لگا۔

”ہیلو؟“ بدقت تمام اس نے فون اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“ خزا کی شوخ آواز گونجی۔ ”کیسے ہو ڈار لنگ؟“

”فائن۔“ وہ مکمل طور پر حواسوں میں آنے کی کوشش کرنے لگا۔

”لگتے تو نہیں ہو۔“ خیر کیا کر رہے ہو؟“

”اس وقت تو تم سے باتیں کر رہا ہوں۔“ وہ بیٹھ کر جمائی لینے لگا۔ ”چند لمحوں قبل سو رہا تھا۔“

”اوہ۔۔۔ میں نے تمہاری نیند خراب کی۔ سوری۔“ وہ شوخ لہجے میں بولی۔

اس کا لہجہ اس کے الفاظ کی نفی کر رہا تھا۔

”کہئے میم! کیا غم مت کر سکتا ہوں آپ کی؟“

”غم مت میں آپ کی کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔ ”آپ لینا پسند کریں گے؟“

”کیا؟“ اس نے ایک اور جمائی لی۔

”میری خدمات۔۔۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً“ یہ کہ چھٹی کا دن ساتھ گزارتے ہیں، میں تمہارے لیے کوئی اچھی سی ڈش بناؤں گی۔ ہم لُنج ساتھ کریں گے اور آؤٹنگ پر چلیں گے۔“

”ہوں۔ اس پورے پروگرام میں آپ کی خدمت محض لے جھانے تک محدود ہے مادام؟“

”جو آپ چاہیں پروگرام میں شامل کیا جاسکتا ہے۔“ وہ بے باکی سے بولی تھی۔

عاشق کو رکوں میں آکر گرم ہوتا محسوس ہوا۔

”کافی اوپن مائنڈ ہیں آپ۔“ وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔

”صرف تمہارے لیے۔“ اس نے جتایا۔

”مائی گاڈ۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”تم کچھ کر کے رہو گی۔“

”شیرور۔“ وہ ہنسی۔

”یا پھر میں کچھ کر بیٹھوں گا۔“ وہ ہلکی آمیز لہجے میں بولا۔

”مائی پلیز۔“ وہ گنگنائی۔

”یا سہ۔ تم چاہتی کیا ہو؟“ وہ زنج ہوا۔

”آجائیں؟“

”اوکے۔“ اس نے ہار ماننے والے انداز میں کیا۔

”مسوٹا کس آف یو ڈار لنگ۔“ وہ خوش ہو گئی تھی۔

عاشق نے موبائل آف کر دیا۔ دونوں بازوؤں کا تکیہ بنا کر وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔ آج کا پورا دن وہ سو کر گزارے ارا رہ رہا تھا اور اس نے گیارہ بجے ہی اٹھا دیا تھا۔ ساری نیند آتی بخارات کی مانند اڑ گئی تھی۔ وہ گہری سوچ میں تھا پھر سر جھٹک کر وہ نمائنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

ہاشم آفس جانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ ٹائی صحیح انداز میں سیٹ کرنے کے بعد اب پلٹین وہاٹ شرٹ کے کلف لٹکس لگا رہا تھا۔ ایک نظر اس نے آئینہ ڈال کر بالوں میں جلدی جلدی انگلیاں چلائی۔

”کافی ہینڈ سم ہو یا ر!“ اس نے اپنے عکس سے کہا اور مسکرایا۔

فون کی بیل بج رہی تھی۔ وہ برش کرتا ہوا وہاں تک آیا۔

”ہیلو ہاشم از بیرٹر۔“

”ہیلو۔“ ہاشم انکل۔ میں عمریات کر رہا ہوں۔“ معصوم آواز کی چکار گوئی تھی۔

ہاشم کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”ہیلو شیر جوان! کیسے ہو؟“

”فائن انکل۔ آپ آفس جارہے ہیں؟۔“

”جی ہاں! آپ نے چلنا ہے؟“ وہ مسکرایا۔

”نہیں انکل! میں تو اسکول جاؤں گا، ابھی وین والا نہیں آیا۔“

”اچھا۔ میں ڈراپ کروں؟“

”تو انکل تھینک یو۔ میں یہ کہہ رہا تھا آج شام میں پارک میں آؤں گا۔“

”میرے ساتھ مہم بھی ہوں گی۔“ وہ بولا۔

ہاشم کو اچانک ہی احساس ہوا کہ پیغام کے پیچھے کوئی شخصیت کار فرما تھی۔

”وہ۔۔۔ پھر۔۔۔ میں بھی آؤں؟“

”جی ہاں شام چھ بجے۔“

”اوکے۔“ وہ بولا اور سلسلہ فوراً منقطع ہو گیا۔ ہاشم ریسیور ہاتھ میں لیے کچھ دیر غور کرتا رہا پھر مسکرا کر ریسیور کریٹل پر ڈال دیا۔ ”ہمارا تو بھلا ہی ہوتا ہے۔“

شام اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ گلابی لباس پہن کر اتری تھی۔ ہاشم نے پارک کی پختہ روش پر چلتے ہوئے ہم کی دلگوشی کو محسوس کیا۔ روش کے دونوں جانب تھے مختلف رنگوں کے پھولوں والے ان گنت بوڑوں کی قطار تھی جن سے کمی کا خوشنما احساس قریب جاں کو معطر کرتا تھا۔ گہری سبز گھاس پر معصوم پرندے دن بھر کی تھکن اتار رہے تھے۔ درختوں کے ٹھنڈے گھٹنے سائے بانئیں والے اپنی مہمان آغوش میں بلاتے محسوس ہو رہے تھے۔ بہت خوبصورت شام تھی یا شاید اسے محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں بے فکری سے پھرتے ہوئے بادل اپنا رنگ تبدیل کرنے کی کوشش میں مصروف تھے پھر اس کی نگاہ سامنے سے آتی شہلا پر پڑی۔ اس کے ساتھ اچھلتا کودتا عمر چلا آ رہا تھا۔

”السلام علیکم انکل!“ وہ اس کے قریب آکر بمشکل رکا۔ سفیدنی شرٹ اور گلابی نیکر میں وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ہاشم نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے جھک کر اسے پار کیا پھر سیدھا ہو کر شہلا پر ایک نظر ڈالی۔ لائٹ پیل سوٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“ ہاشم کی آنکھوں نے شام کے سب سے رنگ چرائیے۔ شہلا کو ان نظروں سے نظریں چراتے ہی بنی۔ ”جی میں ٹھیک ہوں، شکر ہے اللہ کا۔“

”آئیے ادھر بیٹھتے ہیں۔“ ہاشم نے سٹی بیچ کی جانب اشارہ کیا۔ مرقدرے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے بچوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وہ دونوں بیچ پر آ بیٹھے۔ شہلا کے چہرے پر سنجیدگی کی ہلچل تھی۔

”وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا۔“ ہاشم نے گہری سانس بھر کر سوچا۔ ”مجھے کچھ کہنا تھا۔“ شہلا دور کھینچتے عمر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں ہمہ تن گوش ہوں۔“ اس نے بازو سینے پر باندھ لیے۔ ”آپ کی والدہ شاید یہ سمجھتی ہیں کہ میں عمر کو امی کے پاس چھوڑ دینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“ اس نے سر ہمکائے ہوئے بات کا آغاز کیا۔ ”حالانکہ میں نے بطور خاص آپ سے گزارش کی تھی کہ آپ اس سلسلے میں سب کی لطف فہمیاں دور کر دیجئے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے کسی سے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا۔“ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی، ہاشم اس کی بات ختم ہو جانے کا منتظر تھا۔

”ہاشم صاحب! اتنا طے ہے کہ میں سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں، سوائے عمر کے۔ میں نے اب تک زندگی میں صرف ایک خوشی پائی ہے اور میں آخری سانس تک اسے خود سے جدا نہیں ہونے دوں گی۔ میں عمر کے بغیر آپ کے گھر نہیں آؤں گی۔“

ہاشم نے اس کے بے مہر چہرے پر نگاہ کی۔ ”آپ... صرف اپنے جذبات کی پروا کرتی ہیں شہلا!“ وہ تاسف سے بولا۔ ”کم از کم دوسرے شخص کو تھوڑا سمجھاؤ جن تو دے دیا کریں۔ جذبہ ہمدردی کے تحت ہی سہی۔“

شہلا نے سر اٹھا کر اسے حیرت سے دیکھا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ؟ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ کم از کم مجھ سے پوچھ تو لیں کہ میں کیا چاہتا ہوں، کیا سوچتا ہوں، میری تنہا کے دائرے میں کیا کچھ آتا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ عمر کے لیے میں وہی سوچتا ہوں جیسا آپ اس کے لیے سوچتی ہیں۔ کیا یہ الفاظ آپ کی تسلی کے لیے کافی نہیں ہیں۔“

”نہیں۔“ وہ بے مروتی سے بولی۔

ہاشم اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔

”شہلا پلیر! مجھے اتنا تو سمجھیں جتنا میں نظر آتا ہوں۔ اندر اترنے کی بات تو علیحدہ ہے۔ اس کا تو میں آپ سے تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ شاید خفا ہو گیا تھا۔

شہلا نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے اپنے رویے کے غلط ہونے کا احساس ہوا۔
”سوری۔۔۔ سوری ہاشم صاحب!“ پھر وہ بولی۔ ”میں شاید کچھ نا انصافی کر گئی آپ کے ساتھ۔“
”کوئی نئی بات ہے؟“

شہلا لب کاٹ کر رہ گئی۔ ہاشم نے چند لمحے اس کی شرمندگی ملاحظہ کی پھر مسکرا دیا۔
”آپ کیا سمجھتی ہیں شہلا! میں آپ کے ایسے وجود کو حاصل کرنا چاہتا ہوں جس میں ”دل“ نہ ہو؟ ہمارے دل کے جسم کی کیا اڑیکشن ہو سکتی ہے؟ میرے لیے ”وجود“ اور ”جسم“ اہمیت نہیں رکھتے۔ میں دل اور روح کے رشتے کا قائل ہوں اور میں اتنا جانتا ہوں کہ ایک ماں کے لیے اس کی اولاد اس کا ”دل“ بھی ہوتی ہے اور ”روح“ بھی۔ آپ عمر کے ساتھ آئیں گی تو آپ میں زندگی ہوگی۔ روح ہوگی۔ دل ہوگا۔۔۔ عمر کے بغیر تو میں نہ آپ کو پاسوں گا۔۔۔ خود کو۔۔۔“

اس کے الفاظ ٹوٹ سے گئے تھے۔

”ویری سوری ہاشم!“ شہلا کا سر شرمندگی سے جھکا ہوا تھا۔ ”میں نے آپ کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔“

”اتنا ضرور ہے شہلا! کہ ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے۔ میں نے گھر میں اس موضوع پر کسی سے اس لیے بات نہ کی کہ میں اتنے اہم موثر یا اختلاف پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں ایک مرتبہ ہم سب کو اپنی خوشیوں میں شریک کر کے اپنے بندھن کا گواہ بنائیں پھر زندگی ہماری ہوگی۔ فیصلے بھی ہمارے ہوں گے۔ جذباتیت کے مظاہرے اس وقت ہو سکتے ہیں تب ان کا اظہار فضول اور بے مصرف ہوگا۔ لہذا ہمارے ارد گرد کے لوگ ان اپنا وقت ضائع نہ کریں گے کیا خیال ہے؟“
شہلا مسکرا دی۔ ہاشم کی نگاہ نے جو رنگ جاتی ہوئی شام کے آئینل سے چرائے تھے وہ شہلا کی مسکراہٹ کو دان کر دیے۔

”نہیں پاپا! میں تو روز آپ کو یاد کرتا ہوں۔ میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟ میں تو روزانہ اپنے فرینڈز کو آپ کی باتیں بتاتا ہوں۔ آپ نے اتنے دن سے مجھے فون نہیں کیا، مجھے گھمانے کے لیے بھی نہیں لے گئے۔“
”ضرور لے کر جائیں گے یا! آپ تو اپنے جان جگر ہو۔ بس آپ کے پاپا تھوڑے مصروف ہو گئے تھے۔ فراغت ملتے ہی آپ کے شہر دوڑے چلے آئے ہیں۔“

”پاپا! میں سندباد جاؤں گا اور میوزیم بھی اور سمندر دیکھنے بھی جائیں گے۔ آپ مجھے بہت سارے نواز لے کر دیجئے گا اور۔۔۔ اور۔۔۔ چاکلیٹس۔۔۔“ عمر نے ساری فرمائشیں دہرائیں۔

”آئی پراس مالٹی سن! جو آپ کہو گے پاپا لے کر دیں گے۔“

”تھینک یو پاپا! میرا آپ کو کس (Kiss) کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”سونا کس آف یو ڈارلنگ۔ سمجھو پاپا کو آپ کی کس (Kiss) مل گئی ہے۔“

”پھر ہم کب چلیں گے پاپا؟“

”سندے کو۔ ٹھیک ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو گیا تھا۔

”آپ کی ماما کہاں ہیں؟“ اس نے سرسری انداز میں پوچھا تھا۔

”ہاسپٹل!“ وہ مختصراً بولا۔

”اچھا۔“ وہ محتاط انداز میں بولا۔ ”ماما سے میری باتیں کرتے ہو؟“

”نہیں۔“

”کیا کرو تا یار! کام کے بندے نہیں ہوتے۔“
”ممنوع کرتی ہیں نا۔“ وہ مستنایا۔

”کیا کہتی ہیں؟“

”نہ کہتی ہیں، مجھ سے پایا کی باتیں مت کیا کرو۔ وہ تمہارے پایا ہیں مگر میرے کچھ نہیں ہیں۔“ وہ کچھ دیر کے
”عاموش ہو گیا۔“
”چھا!“ لگتا ہے تھیں وکالت سکھانا پڑے گی۔ خیر ہم بھی تمہارے باپ ہیں یار! کیا یاد کرو گے تم اوبس
”ساری ما۔“

”پایا میں لپ ٹاپ (کمپیوٹر) لوں گا۔“ موضوع تبدیل ہونے سے وہ بیزار ہوا تھا۔ ”میرے سب فرزندز کے
اس سے اور چھروں والی گن بھی۔ ما مجھے نہیں دلائیں۔ وہ کہتی ہیں، تم کسی کو زخمی کر دو گے۔“
”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں دلاؤں گا۔ ویسے تو بہت سافٹ ہارڈ ہیں تمہاری ماما! مگر ہمارے کیس میں تو۔“ اس
لے ہلکا اُدھورا چھوڑ دیا۔

”خالہ جانی آگئیں۔“ عمر نے سیڑھیاں اترتی انیفکہ کو دکھ کر کہا تھا۔
”او کے جانو۔ خدا حافظ۔“ اس نے فی الفور رابطہ منقطع کر دیا تھا۔

○ ○ ○
رہیہ کچن میں کھڑی برتن دھو رہی تھی۔ صولت بھی خلاف معمول آج کچن میں نظر آ رہی تھی۔ وہ آلو چھیل
رہی تھی۔ غالباً ”اسے سالن بنانے کا آرڈر ملا تھا۔ تمدن اور مینا بیگم آج بڑے خفیہ انداز میں خوش خوش کہیں
مدانہ ہوئے تھے اور تاحال نہ لوٹے تھے۔ تصور چھت پر چٹکنیں اڑا رہا تھا اور ترانہ اپنی ڈیوٹی بھٹکا کر آئی تھی اور
بہرہ آرام کرنے کی غرض سے لیٹی ہوئی تھی۔

ہلکے کی کھڑکی سے لالہ فرش والے صحن کا منظر نظر آ رہا تھا۔ فرش خشک پتوں سے اٹا ہوا تھا۔
”برتن دھو کر میں صحن میں جھاڑو لگا دیتی ہوں۔“ ربیعہ نے دل میں سوچا۔

”جانک ہی اسے اپنا صحن یاد آیا تھا۔ جہاں ہار سنگھار کے ننھے ننھے پیلے پھول بکھرا کرتے تھے، جنہیں وہ روز
میں کسی جن کی خوشبو اسے دیوانگی کی حد تک پسند تھی۔ بچپن میں بھی وہ ان پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر پھرا
کر لے تھی۔

رہیہ کو دادی جان یاد آئیں۔ ان کا چمکتا چہرہ، شفیق مسکراہٹ، مہربان لمس، شناسا خوشبو۔

رہیہ کسی اور منظر میں جا پہنچی تھی۔ جب گیٹ کھلنے کی آواز سے وہ حال میں لوٹ آئی۔ تمدن اپنی موٹر سائیکل
الور لارہا تھا۔ مینا بیگم ہاتھوں میں کئی شاپرز تھا، اس کے ہمراہ تھیں۔
”امی آگئیں۔“ صولت مسرت سے چلائی۔

رہیہ کو اندازہ ہوا کہ وہ ان دونوں کے ایک ساتھ کہیں جانے کے مقصد سے واقف تھی اور بات کچھ ایسی تھی
کہ وہ بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ وہ جلدی آلو پرے کھسکا کر کچن سے نکل گئی۔ ربیعہ گوگو کی کیفیت میں کچھ دیر
وہیں کھڑی رہی۔ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا پھر مینا بیگم نے کچن میں جھانکا۔ ان کے چہرے پر ایسی
مسکراہٹ تھی جو رہیہ نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

”ربیعہ! ذرا یہاں تو آؤ۔“ وہ کمال مہربانی سے گویا ہوئیں۔
رہیہ کے ہاتھوں پر صابن کا جھاگ تھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی پھر میکا کی انداز میں وہ انہیں دھونے لگی۔
”او دھو کر وہ کچن سے نکل کر کمرے میں آئی۔
تمدن، مینا بیگم، صولت اور ترانہ۔ چاروں ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ رہیہ کی

نگاہ ان کے چہروں سے پھسل کر ان کے درمیان رکھی چیزوں پر گئی۔
 ”دیکھو ربیعہ! یہ جوڑا کیسا ہے؟“ مینا بیگم نے گہرا سرخ، مقیش کے کام سے سجا ہوا سوٹ لہرایا۔
 ”اے!“ صولت جلدی سے بولی۔ ”یہ میرا ہوگا۔ ربیعہ کو دو سرا والا دے دیں۔ مجھے لال رنگ پسند ہے۔“ ترانہ نے خفگی سے صولت کو گھورا تھا۔

”ہاں ہاں، کیوں نہیں۔“ مینا بیگم جلدی سے بولیں۔ ”تمہیں یہ پسند ہے تو تم یہ لے لو۔ ربیعہ تو بے چاری ہے صابرو شا کر پچی ہے۔ ایسی باتوں کو محسوس نہیں کرتی۔“
 انہوں نے جلدی جلدی شاپر سے دو سرا سوٹ برآمد کیا۔ وہ گہرے جامنی رنگ کا تھا۔ اس پر بھی مقیش کا ہی نام تھا۔ صولت نے دو سرا سوٹ دیکھتے ہی جلدی سے جھپٹ لیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں یہ لے لیتی ہوں۔ یہ زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔ مم۔ میرا مطلب ہے لال والا تو آپ ربیعہ کا لیے لائی تھیں اسی کو دے دیں۔“ ترانہ نے بد مزگی سے اسے دیکھا۔
 ”سکون سے دیکھئے دو چیزیں کہیں بھاگی تو نہیں جاری ہیں۔ بعد میں جو جو چیزیں پسند آتی جائیں وہ تم رکھ جانا۔ ربیعہ کے لیے بے شک کچھ نہ بچے۔“ ترانہ جل کر بولی تھی۔
 صولت کے چہرے کے زاویے کئی بار بگڑے مگر وہ اس قدر خوش تھی کہ اس نے ترانہ کی خفگی کو زیادہ اہمیت دی۔

”یہ سینڈلیں ہیں۔“ مینا بیگم نے سلور کلر کی دو سینڈلیں ایک شاپر سے برآمد کیں۔ ”ان پہ لڑائی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ دونوں ایک جیسی ہیں۔“
 صولت نے سینڈل غلٹ کے عالم میں ان کے ہاتھ سے چھین لی اور پہننے لگی۔ مینا بیگم اس کے انداز پر دل کھل کر نہیں جبکہ ترانہ کے چہرے پر شدید بیزاری کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔ تمدن صونے پر بیٹھا خواتین کی کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش دکھائی دیتا تھا۔ اس نے خواتین کے معاملات میں دخل اندازی کی کمال کوشش نہ کی۔

ربیعہ کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ وہ سب کچھ کیا تھا، کس لیے تھا، کیونکر تھا؟ وہ سمجھ کر بھی سمجھ نہ پا رہی تھی۔
 ”آہا۔ میک اپ۔“ بیوٹی بس دیکھ کر صولت چلائی۔ ”مزہ آگیا۔ میں تو روز تیار ہوں گی۔“ اچانک ہی کمرے میں تصور داخل ہوا پھر اندر ہونے والی کارروائی دیکھ کر وہ کچھ الجھ سا گیا تھا۔ غالباً ”ربیعہ کی طرح وہ بھی لاعلم تھا۔
 ”یہ کیا ہے؟“ وہ آگے بڑھ آیا اور اشیاء کے متعلق استفسار کرنے لگا۔ ”یہ کس کے کپڑے ہیں؟“ انکارے مارتے۔

”جو جھوٹو جانیں۔“ مینا بیگم نہیں۔
 صولت شرانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ تصور نے الجھے الجھے انداز میں سب کے چہروں پر نگاہ کی۔
 ”کیا بات ہے آخر؟ کچھ بتا تو چلے۔“ وہ قدرے محتاط انداز میں بولا۔
 ”تمہیں دو لہجہ بانی کی تیاریاں ہیں۔“ مینا بیگم مسکرائیں۔
 تصور کے ماتھے پر یک سخت کئی بل نمودار ہوئے وہ سب کو گھورنے لگا۔
 ”کیا مطلب؟ یہ کون سی سازشیں ہو رہی ہیں؟۔“

”سازشیں؟“ ترانہ اچھنبے سے بولی۔ ”اس میں سازش کی کیا بات ہے۔ کیا آپ بھول گئے کہ دو سال قبل صولت سے آپ کی منگنی ہوئی تھی۔“
 ”اس منگنی کا یہاں کیا ذکر؟“ وہ مسلسل بگڑا ہوا تھا۔
 ”ذکر یہ کہ منگنی کے بعد شادی بھی ہوئی ہے۔“ تمدن نے بالآخر قطع کلامی کی۔ اس کے لہجے میں کڑھکی تھی۔
 ”اور اب تمہاری شادی ہو رہی ہے، صولت کے ساتھ۔“

”ساتھ ہی تمدن اور ربیعہ کی بھی شادی ہے۔“ مینا بیگم نے آرام سے جتایا۔
 وہیہ کے سامنے رکھی ہر شے دھندلانے لگی۔ اس کے کانوں میں شائیں شائیں ہونے لگی۔ دل کو جیسے کسی
 نے اپنی بے رحم گرفت میں سختی سے بھینچ کر نرنے اور پھرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔
 ”اگلے ہفتے نکاح ہے۔“ مینا بیگم اطمینان سے چیزیں سمیٹنے لگیں۔

”کمال ہے۔“ تصور اچانک ہی بھڑک اٹھا تھا۔ ”مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں اور لگے اپنی اپنی کہنے۔ مجھے
 شادی وادی کرنی اور اس صولت سے تو ہرگز نہیں۔ ربیعہ سے تو میں شادی کروں گا۔ بھلا یہ۔۔۔ یہ آدمی اس
 کا مال ہے؟“

اس نے فقارت سے تمدن کی جانب اشارہ کیا۔ تمدن پر گویا کسی نے تیل ڈال کر تیلی دکھادی۔ وہ لپک کر اپنی جگہ
 اٹھا اور اس نے تصور کو زور سے دھکا دیا۔

”ابھنے۔ تیری یہ محال۔۔۔ تو اس پر نگاہ رکھتا ہے۔۔۔ اور تو خود کس قابل ہے۔“
 تصور نے مرکز اس کا گریبان پکڑ لیا۔ دونوں بھائی آپس میں کھٹم کھٹا ہو گئے۔ عورتیں چیخنے لگی تھیں۔ ربیعہ تو
 اپنی نہ پائی تھی۔ بچی بچی نظروں سے وہ دونوں بھائیوں کو آپس میں لڑتا دیکھتی رہی۔ ترانہ اور مینا بیگم آگے بڑھ
 گئیں علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگیں جبکہ صولت زور زور سے رونے لگی تھی۔

”اہل۔۔۔ بد ذات۔“ وہ ربیعہ کو دیکھ کر چلائی۔ ”بس بڑی ٹھنڈ کبجے میں؟ لگادی آگ میری زندگی میں؟ مجھے پتا
 تھا۔ اچھی طرح پتہ تھا تو کوئی غضب ڈھا کر رہے گی۔ ایسے ہی لکھن تھے تیرے۔“ ترانہ لپک کر آئی۔ اس نے
 کمال کے کمال پر زور سے پھنپھار مارا۔

”اور تمہارے اپنے لکھن؟“ وہ چیخی۔ ”پے گریبان میں جھانکو۔ تم نے کیا کیا حرکتیں نہیں کیں یہاں سب
 کی نظروں کے سامنے؟ اس پر الزام لگائی ہو۔ اپنا آلودہ دامن دیکھو اسی لیے تصور بھائی نے تم سے شادی سے انکار
 کیا ہے۔ تم جیسی لڑکیوں کو کون پوچھتا ہے۔“ دفعنا ”مینا بیگم نے مرکز ترانہ کے بال دوڑے۔

”لم بنت! میری فرشتہ صفت بیٹی پر الزام دھرتی ہے۔ خود بخائے کیا کچھ گل کھلا کر آئی ہے باہر۔ پرائے لڑکوں
 کے تحائف وصولی پھرتی ہے۔ ایسے کون کسی کو چھ دیتا ہے۔ بدلے میں کو کیا دیتی ہے اے؟“
 قرون تصور سے علیحدہ ہو کر ترانہ کے بال مینا بیگم کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

گرمے میں کان بڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی چنچنے چلانے کی آوازیوں سے پورا کمرہ گونج رہا تھا۔
 وہیہ کی نظروں کے سامنے سے سب کچھ اوجھل ہونے لگا۔ بالآخر وہ تورا کر نیچے گری۔ اس کا سر چارپائی کے
 اسے لگرایا تھا۔ اچانک ہی خون کا فوارہ سا پھوٹا تھا۔

ایک کراہ کے ساتھ اس نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولی تھیں۔ اگلے ہی پل اس کے لبوں سے چند بے
 معنی آوازیں نکل کر رہ گئیں۔ اس کے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ اٹھتی ہوئی نہیں بھری ہوئی موجوں کی
 اس کے احساسات سے پوری شدت سے آکر ٹکرا رہی تھیں۔

وہیہ کی ادھ کھلی آنکھوں کے سامنے منظر واضح ہونے میں میں چند لمحے لگے پھر اسے ترانہ نظر آئی۔ ترانہ کے
 ہاتھ پر تاسف اور فکر مندی واضح تھی۔ ربیعہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے بولنا چاہا تو کراہ کر رہ گئی۔
 ”ترانہ۔۔۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔

”ہاں ربیعہ!“ اس نے اپنے ہاتھ کو ترانہ کے گرم، پر خلوص ہاتھوں میں پایا۔ ”میں ہوں تمہارے پاس۔ اب
 کسی طبیعت سے تمہاری تم تھیک تو ہونا۔ زرد زیادہ تو نہیں ہو رہا؟“

وہیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر ترانہ کا چہرہ دیکھتی رہی جس پر اب ایک مہرمان پر خلوص
 مہر اٹھ رہی۔
 ”تم گرمی تھیں ربیعہ۔ تمہارا سر پھٹ گیا تھا۔ پھر خون بننے کی وجہ سے تم نقاہت سے بے ہوش ہو گئیں۔

ابھی ڈاکٹر آیا تھا۔ اس نے تمہاری بینڈج کی اور انجکشن بھی لگایا ہے۔ وہ بتا رہا تھا کہ تمہارا بلڈ پریشر بہت کم ہو گیا ہے جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔“
 ترانہ اسے دھیمے دھیمے انداز میں بتا رہی تھی۔ ربیعہ آنکھیں موندے سنتی رہی۔
 ”کیا بات ہے ربیعہ۔ تمہارا بلڈ پریشر آخر اتنا لو کیسے ہو گیا؟ کیا تم نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے؟ یا۔۔۔“
 بہت زیادہ سیشن لی ہے؟ کیا بات ہے مجھے تو بتاؤ۔“
 ربیعہ کی بند پٹلوں سے ایک قطرہ نکل کر اس کی کنپٹی سے ہوتا ہوا اس کے بالوں میں کہیں گم ہو گیا۔ اس کا ہونٹ دھیرے دھیرے کانپنے لگے۔ وہ شاید خود بہت ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ترانہ اس کا ہاتھ ہاتھ ہولے پھٹکتے۔ ہونے پر سوچ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

”مجھے پتا تھا۔۔۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا امی! جس دن میں نے اس چڑیل کا یہ سفید چہرہ دیکھا تھا، اسی دن میرے دل میں ایک سوئی سی کھب گئی تھی۔ آخر وہی ہونا جس کا مجھے ڈر تھا۔۔۔ ہونا وہی؟“ صولت فریڈا لیا تھی۔
 ”پہلے اب بند کر اپنی بکواس۔ کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑا تیرے سر پر۔“ مینا بیگم کی تند آواز آئی۔
 دودھ کا پیالہ ربیعہ کی انگلیوں میں کانپ کر رہ گیا۔ اس نے سامنے بیٹھی ہوئی ترانہ پر ایک ننھی ننھی سی ڈالی۔ ترانہ نے اس کی نظریں محسوس کیں کیونکہ اس نے نگاہ اٹھا کر ربیعہ کو نہیں دیکھا۔ وہ مسلسل کسی سوچاؤ میں ہوتی لگتی تھی۔

”اور کیسے ٹوٹا ہے آسمان؟ وہ ڈائن میرا کلیجہ فوج کر لے گئی اور آپ کہتی ہیں کہ۔۔۔“ آگے شدت غم کی وجہ سے صولت کی آواز بیٹھ گئی۔ اس سے بولانہ گیا۔
 ”نہ مرنے نہ مرنے ہو جائے گانگب کچھ ٹھیک۔۔۔“ مینا بیگم قدرے آگاہ سے بولیں۔ ”آدھا کام تو بھلا ہے، باقی آدھا بھی نیٹ جائے گا۔“

”کیسے۔۔۔ کیسے ہو گا سب کچھ؟ وہ تو کہتا ہے صرف اسی جنم جلی سے شادی کرے گا۔“
 ”یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے صولت! اہم بیٹھے ہیں تم لوگوں کے سروں پر۔ اتنا فکر مند ہونے کی ضرورت کیا ہے۔“ مینا بیگم اب کی بار قدرے سہولت سے بولیں۔
 ”شادی کر کے بھی وہ تو اسی کا دم بھرے گا۔۔۔ مجھے کب پوچھے گا۔۔۔ مجھ سے تو دل بھر گیا اس کا۔۔۔ اب ہواؤں میں اڑنا چاہتا ہے۔ یہ دن رات سامنے رہے گی تو۔۔۔“

”مر جا کیٹی!“ مینا بیگم اب یکایک درشت ہو گئیں۔ ”پھر کھالے زہرے۔ یہاں ہم پہلے ہی پریشان بیٹھے تھے تاہم سوچ رہے ہیں۔ کہہ جو دیا سب ٹھیک ہو جائے گا پھر بھی وہی لن تلی ہے۔“
 صولت غالباً ماں کے جارحانہ تیور دیکھ کر سہم گئی پھر اس کی سسکیاں بھی اچانک ہی ختم گئیں۔ ترانہ ہوا چبانے لگی تھی۔ ربیعہ کو نجانے کیوں ترانہ سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔ اس نے جلدی سے ہلدی ملا دودھ کا پیالہ اُسے لگایا۔

”سوٹ کا کلر ہاشم سے پوچھ لیتا چاہیے۔“ پُرجوش ہوتی ایقان فردوس بیگم سے کہہ بیٹھی پھر فوراً ہی لفظ اُٹا گئی۔ انہوں نے از حد بد مزگی سے تھوک نگلا تھا۔

”جی چھو۔۔۔ ضرورت آئی یا پیش کیا ہے آپ نے؟“ رافع اندر چلا آیا تھا۔ ”دو لمبا میاں کا سو اسیر خاں جائے گا اس استفسار پر۔ گالوں پر گلال پھر جائے گا۔ آنکھوں میں ایسی قدیلیں روشن ہوں گی کہ شادی لائٹنگ وغیرہ کی قطعاً کوئی ضرورت نہ پڑے گی اور چشم تصور سے وہ شہلا بھابھی کو وہ رنگ پستا دیکھیں گے تو واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ ان کا اپنا چہرہ دیکھنے۔ دیکھنے۔ والا۔۔۔ میرا مطلب ہے آم!“
 تب ہی اس کی نظر بھی اپنا جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی فردوس بیگم کے خون آشام تاثرات اور انہیں تیبھی نظروں پر پڑ گئی تھی۔

”اب آئیں پھوپھو آپ!“ وہ یکایک ہی موضوع بدل کر خوش گواری سے یوں بولا جیسے چند لمحوں قبل وہ کچھ گمراہی نہ رہا تھا۔

”ہیں۔“ ایقان سے مسکراہٹ ضبط کرنا دشوار ہو گیا۔ ”ہیں۔ بس۔ ابھی۔۔۔ بھابھی بیگم کا فون آیا تھا کہ کی بری کی تیاری کرنا ہے۔ چند ایک روز کے لیے آگئی ہوں۔ میں راتنامہ اور درود مل کر شاپنگ کر لیں گے۔“ اور ہم، ہم کیا کریں؟ ”فاطمہ جوش سے کہتے ہوئے آٹکی تھی۔

”مذہب کو ملک بجاؤ۔۔۔ گلے گاؤ۔۔۔ اب دن ہی کتنے ہیں شادی میں۔۔۔ گنتی کے پچیس دن ہیں۔۔۔ کتنے سال بعد گھر میں خوشی کا ایسا موقع آیا ہے۔ جم کر منائیں گے۔“

واقعہ بعد خوش نظر آتا تھا۔ چوری چوری اس نے اپنی بات کا رد عمل فردوس بیگم کے چہرے پر ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بہ مشابہ آہ کے بھری اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اے رافع میاں! کتنے توجہ ہی ہو۔“ وہ جاتے جاتے بولی تھیں۔ ”اچھا ایقان! پھر یوں کرو بازار جانے سے پہلے گھر میں سے بھی صلاح کر رہی لیانا۔“

کچھ تھکے قدموں سے چلتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی تھیں۔ رافع اور ایقان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ دیا۔ اب کہ فاطمہ چہرے سے ہی پرجوش لگنے لگی تھی۔

الم کمرے میں داخل ہوا تو وہ انگلیوں پر کچھ گنتے میں مصروف تھی۔ ہاشم دروازے پر ہی رک گیا اور مسکراتی آنکھوں سے ارتکاز کا لطف اٹھانے لگا۔ اس کی گنتی میں بار بار گڑبڑ ہو رہی تھی۔ یکایک جھنجھلا کر اس نے نگاہ اٹھائی تو ملاحظہ کئے مسکراتے ہوئے ہاشم کو دیکھ کر اس نے بری طرح سے اسے گھورا۔

”ہاں کیوں کھڑے ہو تم؟ اندر آؤ۔“ ہاشم کے چہرے پر ہنوز دلچسپ و شریک مسکراہٹ تھی۔

”یہ ہونٹوں کا پالہ کس خوشی میں گمراہ ہو رہا ہے؟“ ایقان نے اسے چھیڑا ہاشم کو ہنسی آگئی۔

”افع بالکل ٹھیک ٹھیک رپورٹنگ کر رہا تھا تمہاری۔ اب مجھے اس کی رپورٹ درست ہونے میں کوئی شک نہیں۔“ ایقان نے اس کا کان پکڑ لیا۔ ”شادی میں ہمیں گھر پر قہقہے لگوانے کی ضرورت بالکل نہ ہوگی، تمہیں کھڑا کر دیا جائے گا۔ دو تمہاری آنکھیں اور تینس تمہارے دانت، پورے چوتیس بلب روشن ہوں۔“

”میرا کان چھوڑیں اور اپنی گنتی پوری کر لیں۔“ وہ ہنسا۔ ”ایک آدھ دن کہیں مرنے نہ ہو جائے۔ بائے واوے“

”تمہارے منہ میں کئی شکر۔“ ایقان نے اس کا کان چھوڑ کر گہری سانس بھری۔ ”ابھی تک تو وہاں سے ایسی بات نہیں آئی۔“

”کہہ کون سے دانے پڑھ رہی تھیں آپ؟ میرا مطلب ہے کیا گن رہی تھیں۔ عاشق۔ عاشق کا وظیفہ تو نہیں لکھا ہے؟“

”ایسے چار سو بیس لوگوں پر یہ ہلکے پھلکے وظیفے کام نہیں کرتے۔“ وہ جھنجھلائی۔

”سو بیس؟ یعنی بابے وغیرہ؟“

”ہیں تمہارے پھوپھا موصوف۔“ وہ جلی بیٹھی تھی۔

”جی۔۔۔ بہت افسوس کی بات ہے ڈیر پھوپھو! آپ کی محبت سے مجھے اس ”جلی کٹی“ کی امید نہ تھی۔“

”سمت نام ہی ”جلنے“ اور ”کتنے“ کا ہے ڈیر بیٹھے! تمہیں تو خوب خوب تجربہ ہے۔“

”ہاں فرمایا لیکن ہم نے کبھی ڈاکٹر صاحبہ یعنی آپ کی دوست موصوفہ کو اس طرح نمبر سے یاد نہیں کیا۔“ ایقان

”تمہیں زیب بھی نہیں دیتا کہ تم میری پیاری سی دوست کو اس نمبر سے یاد کرو۔ یہ تو تمہارے بھوپھاجی کے مروت لوگوں کے لیے مخصوص ہے۔ آج پورا آکھواں دن ہے پلٹ کر خبر نہیں لی کہ بیوی! جیتی ہوا مرنی ہوا میری بلا سے۔ یعنی میری جوتی سے۔ میں بھی کون سی پروا کر رہی ہوں۔ خوشی خوشی تمہاری بری کی تیار کر رہا ہوں۔ مصروف ہوں۔“

”سچ کہا۔“ اس نے شرارت سے سر ملایا۔ ”انگلیوں پر نجانے کون سا اسم پڑھ رہی تھیں ابھی آپ۔ آپ کو کیا پروا۔“

”چتا نہیں کیا بات ہے عاشق! وہ اچانک ہی سنجیدہ ہو گئی۔ ”میرا۔۔۔ میرا دل اچانک ہی گھبرانے لگتا ہے۔ عاشق مجھ سے یوں غفلت برتنے لگیں تو میرا کسی چیز میں نہ دل لگتا ہے نہ دھیان اٹکتا ہے۔ نجانے کب پورے یہ سزا کی مدت۔“

ہاشم نے چند لمحے بغور اس کا چہرہ دیکھا، کچھ سوچا پھر کاکیسہ لہجہ بدل کر بولا۔
”یار پھپھو! سنا ہے آپ ڈاکٹر صاحبہ کا ویڈیونگ ڈریس لینے جا رہی ہیں۔“ ایقان جو کسی خیال میں کھو گیا چونک اٹھی۔

”آل۔۔۔ ہاں۔۔۔ بھابھی بیگم نے اسی لمبے تو بلوایا ہے مجھے۔“
”تو پھر ایسا لباس لے آئیں جس میں دھنک کے سب ہی رنگ ہوں۔“
”ہائیں۔“ ایقان نے برا سامنہ بنایا۔ ”یہ تمہیں ٹیکنی کلر ولسن کا خیال کب سے ستانے لگا۔ تم تو بہت سہا بندے لگتے تھے ہمیں۔“

”بائے پھپھو۔۔۔ اب میں آپ سے کیا چھپاؤں۔ جو رنگ بھی سوچتا ہوں اس میں ڈاکٹر صاحبہ کا تصور ا جھللاتا ہے کہ باقی سب ہی رنگ اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں پھر اچانک ہی ڈاکٹر صاحبہ کسی اور رنگ میں لپکتی ہیں تو بس پھر ہر سو وہی رنگ چھا جاتا ہے۔ ایسے میں کسی ایک رنگ کا انتخاب تو بہت مشکل ہے نا؟ اسی ٹیکنی کلر ولسن کی ترکیب اچھی ہے۔ ذرا ذرا سا کپڑا، ہر رنگ کا لے لیں، پورا لباس تیار ہو جائے گا۔ کیا خیال ہے؟ ایقان کے لب مسکرانے لگے۔

”اب اگر تم مذاق بھی کر رہے ہو تو میں ضرور تمہارے ساتھ یہی کرنے والی ہوں۔“
”مذاق۔؟ میں حد درجہ سنجیدہ ہوں پھپھو!“

”بس تو سمجھ لو کہ تمہاری دلہن کے عروسی لباس میں ایک سو ایک رنگ ہوں گے۔“
”ہاں۔۔۔ تصور میں ایک دنیا آباد کر دی آپ نے تو۔ کیا خوبصورت جملہ بولا ہے۔“

ایقان ہنس ہنس کر دھڑکی ہو گئی پھر اس نے ہاشم کو ایک دھپ لگائی۔
”اور بے چاری ڈاکٹر صاحبہ کا کیا تصور ہے جو اس کو ایسی عالی شان سزا دی جائے اتنی سوز، اتنی ڈینس۔“

میری اکلوتی اونٹ۔ اور۔۔۔ ایقان کی ہنسی کسی طور نہ ٹھہر رہی تھی۔
”شباباش ہاشم میاں۔“ ہاشم نے چشم تصور سے خود کو چھپکی دی۔

○ ○ ○
”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟۔“

ربیعہ نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تمدن سامنے کھڑا تھا۔ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔
ربیعہ نے محسوس کیا کہ نرم لہجے اور نرم بات کے پس پردہ ایک نامحسوس سی تپش تھی جیسے وہ کوئی خاص محسوس کر کے یہ سب کچھ کہہ رہا ہو۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر تمدن کو دیکھا۔ وہی نامحسوس سی تپش اس کی نگاہوں میں بھی تھی۔
”بات تو کچھ بھی نہیں ہے تمدن بھائی! وہ رسانیٹ سے بولی۔“ ترانہ بتا رہی تھی کہ میرا بلڈ پریشر بہت کم

”اس کی وجہ سے۔“
”میں دیکھو ربیعہ! کوئی اور چکرور چلا رکھا ہو تو اب بھول جاؤ اسے۔“ وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا تھا۔ ربیعہ

”اس کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔“
”اس یارک والے لڑکے نے اگر کوئی سہانے خواب دکھائے ہیں تو یہ مت سمجھ لینا کہ وہ خواب کبھی حقیقت میں آئے۔ تمہاری حقیقت یہی گھر ہے۔ اس حقیقت کو دل سے قبول کر لو گی تو تمہارا بلڈ پریشر پھر لو نہیں

اس کے لیوں پر ایک بہت دل جلانے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ ایسی مسکراہٹ ربیعہ اکثر منور امین کے دیکھا کرتی تھی۔ ”جب وہ اس سے اس کی ماں کے متعلق کوئی بات کیا کرتے تھے۔ ربیعہ کھلی آنکھوں سے منور امین میں اور منور امین سے پھر تمدن میں تبدیل ہوتا دیکھتی رہی پھر وہ اپنی اسٹک کا سہارا لے کر کمرے

”وہ کے کانوں میں اس کے الفاظ کی بازگشت ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے اس کا وجود کسی بہت پرانی عمارت

”میرا خیال ہے۔ سنہری۔ راسک کا کرتا۔ شیروانی کالر کے ساتھ۔ اس پر ڈل گولڈن امیر انڈری۔“
”تمہارے کپڑے لگاتار پر سے نظر اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔“

”تمہارے جاؤں۔“ اس نے دانت نکالے۔ ”دستار بندی، میرا مطلب ہے سہرا بندی کی رسم آپ کی سرانجام

”آپ کا سہرا لکھا جا رہا ہے۔“ نافع اسے مزید ملبوسات دیں۔
”میرا کلاں میں آپ کا نام ہرگز نہیں لکھا جائے گا۔“ علی نے ٹکڑا جوڑا۔
”میرا لنگنی ششکھی کا چکر بھی فی الحال نہیں ہے۔“ نافع مزید بولا۔
”میرا گولڈن کرنا؟“ علی ہنسے۔

”گولڈن امیر انڈری؟“
”تم میرے بھائی۔“ اور تم میرے ہونے والے دولہا بھائی نہ ہوتے
”تم دونوں اپنا اپنا سر پکڑے۔ بدینہ وغیرہ ڈھونڈ رہے ہوتے۔ پچھلے دو گھنٹے سے میں اپنے آئیڈیا پیش کر رہا
”اور تم دونوں مل کر میرے آئیڈیا کی دھجیاں بکھیر رہے ہو۔ تم دونوں کیا چاہتے ہو؟ کیا میں اپنے بھائی کی
”میرا دھوئی وغیرہ لپیٹ کر آئیڈیا کر لوں؟ کسی چیز پر ہاں ہی نہیں بھرتے رہنے دو پھر ایک جیسے کپڑے بنوانے کا
”میں اپنی ڈیسک علیحدہ ہی کر لوں گا۔“

”اپنے دو گھنٹے میں پیش کیے جانے والے سارے آئیڈیا پر نظر ثانی کرو۔“ نافع نے مدبرانہ انداز میں کہا۔
”میرے فضول خیالات پیش کر کے تم نے ہم دونوں کا وقت ضائع کیا ہے۔ غور کرو، کیوں علی!“
”تمہارے جاؤں۔“ میرے دل کی بات کہہ دی دولہا بھائی آپ نے۔ اس کے بتائے ہوئے تمام ملبوسات میں
”لاسٹ والا آئیڈیا قابل عمل ہو سکتا ہے۔“

”راسک کا کرتا؟“ تمہارے جلدی سے بولا۔
”میں بار بار یہ دھوئی والا۔۔۔ وہ بھی صرف تمہارے لیے۔“
”اچانک اسے اس پاس کوئی ایسی چیز ڈھونڈنے لگا جسے وہ علی کے سر پر مار سکے۔ علی اس کا ارادہ بھانپ کر اچھل کر بیٹھ

”اب میری بات سنو۔“ نافع اس کا جارحانہ انداز بھانپ کر جلدی سے بولا۔ ”اب میں ایک آئیڈیا پیش

کر رہا ہوں یہ کرتے یہ کڑھائیاں وغیرہ بعد میں کام نہیں آئیں۔ کچھ ایسا بناؤ جو بعد میں بھی کام آئے۔“
”مثلاً“ ”بعد“ کی وضاحت بھی کرو۔“ حمزہ نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

”میرا مطلب ہے سوٹ۔ ٹوپیں۔“ اس نے وضاحت کی۔
”اور بعد میں وہی سوٹ تمہاری رسم ہندی میں بھی چل جائے گا۔ ہے نا؟“ حمزہ جل کر بولا۔
”بھئی۔ تم دونوں کی مرضی ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”میں تو اس دن سفید کرتا شلوار پہنوں گا مزے سے بولا تھا۔

”دیکھ لیں گے تیرے کرتے کو نہ تچے رنگین نہ کر دیا تو سالانہ کننا۔“ حمزہ نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔
”پھر اس دو سو روپے کی کیٹلاگ کا کیا ہو گا؟“ اچانک علی نے دہائی دی۔ ”یہ کیوں خریدی گئی؟“ یہ رہا اس کی جیب سے ادا کی گئی تھی اس لیے درد اسی کے دل میں اٹھا تھا۔
”مجھ سے یہ فضول خرچی کیوں کروائی گئی؟ اس سے تو اچھا تھا میں اپنی موٹر بائیک میں اتنے روپوں کا پیلیلا ڈال لیتا وہ غریب بھی کیا سوچتی ہوگی کیا قسمت پائی ہے اس نے۔“
”کوئی بات نہیں۔“ نافع نے اس کا شانہ تھکا۔ ”وہ بڑی منکسر المزاج قسم کی موٹر بائیک ہے اور پھر ایسی لکھا متقی، ہر وقت حالت صوم میں ہوتی ہے وہ غریب کیا سوچتی؟“
”بیوی ڈھونڈنے نکلے تو اپنی بائیک کی تمام خصوصیات ذہن میں رکھنا۔“ حمزہ نے بھی اگلے پچھلے ادھار اٹھانے کی ٹھانی۔ ”مسلک جو شکر گزار۔ تھوڑے کو ہی بہت سمجھنے والی۔“ علی دیدے گھما گھما کر باری باری دونوں کو رہا تھا۔

”ایک لباس میں زندگی بھادی غریب نے“ نافع مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔ ”آج تک سیٹ کو رہا ہونے کی نوبت نہ آئی۔“
”لیکن یا سہ۔ بیوی کچھ صفائی پسند ہو، کبھی کبھی نہاد ہو بھی لیتی ہو۔ اس بائیک کے کھڑے پر تو ہر وقت نشان ہی ملتے ہیں۔“

”بند کرو اپنی بکواس۔“ بالآخر علی کا صبر جواب دے گیا۔ ”اس کیٹلاگ کا سو روپے تم بھڑو اور سو تم۔“ اس نے باری باری دونوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم دونوں کے پرنسز اور اصرار پر ہی میں نے یہ خریدی تھی۔ کیا کہہ رہا نافع تم؟ گھر کی پہلی پہلی تقریب ہے بہت اعلا ڈیزائن کے لباس تیار کروائیں گے اور اب؟؟“

”اب یا سہ۔ یہ ”راجیش“ اور ”مکیش“ کی ڈیزائننگ اپنی سمجھ سے تو بہا رہے۔ اچھے بھلے کرتے کا اسٹاف تک آگیا ہے۔ بھلی سی شیروانی ہے اور آستین غائب دو لہا میاں کھڑے مسکرا رہے ہیں گہری اور نہایت پینے اب بھی کوئی پہننے والے کپڑے ہیں؟“

”میرا مطالبہ اپنی جگہ ہے۔“ علی پر اس کے معذرتی انداز کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ”سو روپے بھڑو۔“
”اوہو! یاد آیا۔ مجھے تو امی نے ایک ضروری کام بتایا ہوا ہے۔“ نافع اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
”اور میری حالت نیند سے خراب ہونے لگی ہے۔“ حمزہ نے جمائی لی اور کیٹلاگ پرے کر کے لیٹ گیا۔
ہی پل وہ خراٹے لے رہا تھا۔

علی کے چہرے پر نہایت جارحانہ تاثرات تھے وہ بدلہ لینے کے سب ہی طریقوں پر غور کر رہا تھا۔

ہنستا مسکراتا وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اوپر آتی عریشہ کسی طور واپس نہ مڑ سکی۔ نافع عین اس کے اسی سیڑھی پر آ کر کاجس پردہ کھڑی تھی۔
اس کی مشکراتی نظروں نے سیاہ لباس میں ملبوس عریشہ کو لمحہ بھر کے لیے اپنی گرفت میں لیا تھا۔

”کیسی ہو عریشہ۔۔۔“ اس کے لمبے میں صرف دو ستانہ رنگ تھے۔

”ایک ہوں۔“ اس کا انداز حد درجہ سرد تھا۔

نافع اب کی بار کچھ ٹھنکا۔ وہ رینگ پر کمر نکالے دونوں ہاتھوں سے رینگ تھامے اسے دیکھنے لگا۔

”منہ عریشہ!“ وہ نجائے کیوں اسے پکار بیٹھا۔ عریشہ تھم گئی لیکن اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔

”تم۔۔۔ ناراض ہو مجھ سے؟ کوئی۔۔۔ کوئی۔۔۔ غلطی ہوئی ہے مجھ سے؟“ عریشہ نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے

پیر اجنبیت اور آنکھوں میں ایسا کراؤ تھا کہ نافع اب اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

”کچھ بھی کہے بغیر پلٹ کر اوپر چڑھتی چلی گئی تھی۔ نافع کمری سوچ میں گم تھا۔

”سما! یہ سب کس کے کپڑے ہیں؟“ وہ آنکھوں میں حیرانی کے سب ہی رنگ بھرے رنگ برنگے کپڑوں کے

پکاس اکھڑا ہوا تھا۔ اینفہ مسکرا دی۔

”مب کپڑے آپ کی ماما کے ہیں۔“ اس نے عمر کو بانہوں میں بھرا۔

”ممنے پیارے کپڑے۔۔۔ چمکیلے۔۔۔ وہ خوش ہو گیا۔ ”میں نے کبھی ماما کو اتنے اچھے اچھے کپڑے پہنے نہیں

دیکھے۔ میری ماما کیا لسن نہیں گی؟“

”شہلا کے چہرے پر سنجیدگی تھی لیکن منیہہ بیگم اور اینفہ مسکرا دیں۔

”اے ماما! آپ کی ماما لسن نہیں گی بہت خوبصورت لگیں گی۔“ اینفہ نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا تھا۔

”اور دولہا؟“ گلا سوال برق رفتاری سے آیا تھا۔

”دولہا۔۔۔“ اینفہ کی بات اس کے لبوں میں ہی تھی کہ عمر نے اچکل۔

”دولہا تو میرے بھائی ہوں گے۔ ماما دولہا تو بھائی دولہا۔۔۔ ہے ناما! اس نے تالیاں بجائیں۔ شہلا کے چہرے

بھرمیں ہزار رنگ بدلے تھے۔ وہ اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ منیہہ بیگم نے تاسف سے اسے جاتا ہوا

دیکھا۔ اینفہ نے زچ ہو کر عمر کو دیکھا تھا۔

”تمہاری یہ دواج کی زبان قابو میں نہیں رہتی تمہارے؟“ وہ چڑ کر بولی۔

”میں نے کیا کہا ہے ناؤ؟“ وہ حیران ہوا۔ ”خالہ جانی تو مجھ سے لڑتی ہی رہتی ہیں۔ ان کو تو میں بالکل بھی اچھا

لگتا۔“

اس کی معصوم آنکھوں میں پانی اترتا دیکھ کر اینفہ سب کچھ بھول بھال گئی۔ اس نے چٹاٹ اس کے گالوں کے

پیر سے لے لیے۔

”آپ تو خالہ جانی کی جان ہو۔ خالہ جانی کو سب سے اچھے آپ لگتے ہو۔“

”کلی نہیں لگتا۔“ وہ منہ پھلا کر بیٹھا تھا۔ ”ابھی آپ نے مجھے ڈانٹا ہے۔“

”نہیں چاند! میں نے آپ کو نہیں ڈانٹا۔“

”سما! یہی سب سے اٹھ کر چلی گئیں۔ انہیں بھی میری باتیں بری لگیں“ اسی لیے اب میں کسی سے بات

نہیں کروں گا۔“ وہ مزید روٹھ کر بیٹھ گیا۔

”آپ کی ماما نے کتنی بار آپ سے کہا ہے عمر کہ ان کے سامنے اپنے پاپا کا ذکر مت کیا کرو۔“ اینفہ نے اسے

چمکے انداز میں سمجھانا چاہا۔ ”پھر بھی آپ۔۔۔!“

”کیوں نہ میں بھائی کا ذکر کروں؟“ وہ اکڑا۔ ”وہ ماما کے کچھ بھی نہیں ہیں مگر میرے تو بھائی ہیں، مجھے اچھے لگتے

میں ضرور ان کا نام لوں گا۔ بھائی۔ بھائی۔ اور بھی لوں گا۔ بھائی۔ بھائی۔ آپ کو بھی میرے

پیر لگتے ہیں ناؤ؟“

اسے لڑائی کے دوران اچانک ہی منیہہ بیگم کا خیال آگیا۔ اس نے از حد معصومیت سے سب کچھ بھول بھال

دیکھا تھا۔

منہزہ بیگم اور انہی بے اختیار ہی اس کے بھول پن پر مسکرا دی تھیں۔

”نہیں بیٹا! وہ کسی کو برے نہیں لگتے۔“ منہزہ بیگم نے اسے گود میں بٹھالیا۔ ”وہ آپ کے ابو ہیں۔ وہ آپ کو اچھے لگتے ہیں تو ہم سب کو اچھے لگتے ہیں۔“

”پھر آپ لوگ انہیں دولہا کیوں نہیں بناتے۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ میری ماما کے دولہا بس میرے ہیں گے۔“

منہزہ بیگم ہونق سی ہو کر انہی کو دیکھنے لگیں۔ نواسے کا یہ انداز ان کے لیے نیا اور بے حد حیران کن تھا۔

”نہاں کی گھبراہٹ ہوئی صورت دیکھی تو جھٹ کھڑی ہوئی اور عمر کو گود میں اٹھالیا۔

”چلو لان میں چل کر کھیلیں۔ وہاں میں آپ کو ساری بات بتاؤں گی۔“ وہ اسے چومتے ہوئے وہاں لے

دی۔ منہزہ بیگم اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے جوڑوں کو ترتیب سے رکھنے لگیں۔ وہ اور انہی ابھی ابھی شادی کے لیے خریداری کر کے لوٹی تھیں اور شملہ کو کپڑے دکھا رہی تھیں۔ عمر کے غیر متوقع سوالات نے اسے رنگ ہی بدل ڈالا تھا۔

”ہاں بھئی! اب بتاؤ۔“ اس نے عمر کو سیڑھیوں پر بٹھایا اور خود اس کے برابر بیٹھ گئی۔ ”یہ کیا چکر ہے؟“

”کون سا چکر؟“ اس نے اچھ کر خالہ کی صورت دیکھی۔ ”آپ تو مجھے اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے لائی تھیں۔“

”پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے بھیا تمہیں دن میں کتنی مرتبہ فون کرتے ہیں۔“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں

”کیوں بتاؤں؟“ وہ بگڑا۔ ”بھیا نے منع کیا ہے۔“

”وہ۔“ انہی کو گڑبڑ کا احساس ستانے لگا۔ ”لیکن ہم تو اب آپ کو منع نہیں کرتے بات کرنے سے بھلا

”وہ کہتے ہیں کہ خالہ جانی اور نانو کو بالکل نہیں بتانا کہ ہم باپ بیٹا کیا باتیں کرتے ہیں۔“ وہ مزے سے

”ہلانے لگا۔“ ”اسی لیے آپ کو تو بالکل نہیں بتاؤں گا۔“

”اچھا۔“ انہی نے بے اختیار ہی اس کی صورت دیکھی۔ ”اور ماما کو بتانے سے منع نہیں کرتے؟“

”نہیں۔“ اس نے پر زور انداز میں سر ہلایا۔ ”وہ تو کہتے ہیں اپنی ماما سے میری باتیں کیا کرو؟“ انہیں ماما

”ہیں نا۔۔۔ ماما ان کی دلہن جو ہیں۔“

انہی کو دم گھٹنے کا احساس ہوا۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور سیڑھیاں اتر کر لان میں چلی گئی۔ عمر جھگڑا ہوا اس

”پچھے چلا آیا تھا۔ پھر وہ پیچھے سے آکر اس سے لپٹ گیا۔

”آپ ناراض نہ ہوں خالہ جانی! میں بھیا سے پریشانی لے لوں پھر آپ کو بھی سب بتایا کروں گا۔“

”یہ۔۔۔ دولہا اور دلہن۔۔۔ کی باتیں تمہارے بھیا کرتے ہیں عمر؟“ اس کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد

”ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ آپ کو کیوں بتاؤں؟“

انہی بری طرح سے اچھی۔ اس نے لپٹ کر اسے برہمی سے دیکھا پھر فوراً ہی اپنا انداز بدل لیا۔ اس

اس سارے معاملے میں رتی بھر قصور نہ تھا۔ وہ جھک کر اسے چومنے لگی۔

”سچ رائے آبی! اور وہ آبی نے تو مجھے سخت بور کر دیا ہے۔ کیا تھا اگر یہ آپ سے بڑی ہو تیں یا پھر ان کی شادی

ہو جاتی تو۔۔۔ حالاتِ حاضرہ پر گفتگو تو انہیں بالکل پسند نہیں۔ کرنٹ الیکٹریسیٹی کی بات کرو تو یہ کرنٹ مارنے

ہو جاتی ہیں۔ کہیں سے اڑتی اڑتی کوئی سن گرن لے آو تو یہ اس ”اڑتی“ کے سارے پرکٹ کر بندے کے ہاں

ہاں میں کہ لو اب جی بھر کر شرمندہ ہوں۔ قسم خدا کی گفتگو کا مزہ عارت کر دیتی ہیں۔ اچھا ہوا جو آپ آئیں۔
 رات بھر ہو گئی تھی ان کے ساتھ رہ رہ کر۔“

اصلاً باز بھی کاٹ رہی تھی اور فل والیوم میں کنسز بھی نشر کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پ
 گر رہے تھے لیکن اسے مطلق پروا نہ تھی۔ کبھی کبھار وہ چھری والے ہاتھ کی پشت دونوں گالوں پر پھیر لیتی۔
 راتہ اپنی اہمیت پر نازاں اور فرحاں نظر آتی تھی۔ وہ بہت دل چسپی سے ناعمہ کی فضول گویاں سن رہی

”ماہر تم نے بتایا نہیں۔۔۔ وہ منگنی والے دن کے بعد عریشہ سے جو ملاقات ہوئی تھی تمہاری؟ ایک تو ہر بات
 دہری بھوڑ کریم کوئی دوسری بات شروع کر دیتی ہو۔۔۔ تمہاری یہ عادت مجھے سخت ناپسند ہے۔“
 ”تو رہی تھی آپ کو کہ وہ آپ سے سخت ڈانٹ پڑی تھی پھر وہ آپ کی بات چل نکلی۔ ہاں تو پتا ہے
 راتہ آپ عریشہ کو نافع سخت ناپسند ہے۔“ ناعمہ نے پھر منہ پر ہاتھ پھیرا۔

”لیکن کیوں؟ کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے؟“ راتہ کا جس اپنے عروج پر تھا۔
 ”میں خیر۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ایسی بات ہوتی تو کیا مجھے علم نہ ہوتا؟ میں تو اس کی رگ رگ سے
 ہوں۔ بس کچھ ایڈیٹل ازم کا چکر ہے۔ عریشہ اپنے آپ کو ”کچھ“ سمجھتی ہے نا۔۔۔ تو اس کے معیار پر نافع
 دراز نہیں اترا۔“

”ہوں۔“ راتہ نے من بھر کا سر سمجھ داری سے ہلایا۔ ”مجھے بھی شک تو ہوا تھا اس کا بجھا بجھا سا چہرہ دیکھ کر۔
 ”ماہر اب تم یہ بات کسی سے کہنا نہیں بے وجہ باتیں نہیں گی۔“
 ”جی جی، مجھے کیا پڑی ہے جو میں ادھر ادھر نہتی پھروں۔ میں کوئی بی جھالو ہوں۔ میں نے تو ممانی والی بات بھی
 سے نہیں کہی کبھی۔“

اس نے آنسو منہ میں جانے سے کمال پھرتی سے روکے اور چھری ایک طرف رکھ کر آچل پورے منہ پر مسلا۔
 ”اے بالکل بھی نہیں کسی تم نے کسی سے اور مجھے تو بالکل پتا نہیں ہے کہ کیا بات ہوئی۔“ دروازے پر دروازہ
 کھلی اسے گھور رہی تھی۔

اصلاً آدمی جان خشک ہو گئی۔ اس نے تھوک نکل کر راتہ سے ملک چاہی۔
 ”رے لوس۔ بڑی بہن ہوں اس کی اور تمہاری بھی۔ کوئی بڑوس تو نہیں ہوں جس سے تم لوگ پردہ داری
 ”راتہ جی بھر کر خفا ہوئی۔ ”مجھ سے اپنے دل کی باتیں نہیں کہنے کی تو پھر کس سے کرے گی۔“
 ”یہ بات نہیں ہے اپنا!“ دروازہ اندر چلی آئی۔ ”یہ بات میں اس کو پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ عریشہ والے
 والے میں اس کا یوں اچھٹا مناسب نہیں ہے۔ خدا نخواستہ کل کلاں کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ساری برائی اس کے
 میں آئے گی۔ یہ سمجھتی ہی نہیں ہے۔“

”تم تو دروازے سے ذرا اسی باتوں کو بہت گہرائی میں جا کر سوچتی ہو بھلا اونچ نیچ کیا ہوتی ہے؟“ راتہ بے پروائی
 ہوئی۔ ”اور ہم کون سا ڈھول تاشے پیٹ رہے ہیں۔ آپس میں ہلکی ہلکی گفتگو کر رہے ہیں نا۔!“
 دروازے سے افسوس سے سر ہلایا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔
 ”تم نے سب سے نہ کو کسٹرو کھلا دیا؟“ راتہ نے بات بدلی۔

”جی ہاں اے امی کے پاس سلا دیا ہے میں نے۔“
 ”چھایہ لیں۔“ ناعمہ نے پیاز کی ٹوکری اس کی جانب بڑھائی۔ ”بریاں کی پیاز بھی میں نے کاٹ دی ہے۔
 گوشت بھی دھو کر فریق میں رکھ دیا ہے۔ بریاں بنانا آپ کا خاص الخاص ڈیپارٹمنٹ ہے۔“
 ”ہاں کوکہ میں یہاں سے چلی جاؤں تاکہ تم گفتگو کا ٹوٹا سراجوڑ سکو۔“ وہ مسکرائی۔ ”چلو ٹھیک ہے میں جاری
 ”پھر وہ ٹوکری تھام کر کمرے سے نکل گئی۔

”ہاں۔ اب بتاؤ!“ رائے نے پیر پھیلائے۔ ”یہ ممائی جان کا قصہ کیا ہے؟“
”ہوایوں کہ ایک دن عریضہ سے ملنے گئی۔“ ناعہ مزے سے شروع ہوئی تھی۔



صولت نے رو رو کر آنکھیں سجالیں تھیں۔ مینا بیگم سخت برہم تھیں، لیکن یہ انداز نہ ہویا تھا کہ دراصل ان کی برہمی کی وجہ کیا ہے؟ شاید وہ خود بھی اس حقیقت سے ناواقف تھیں۔ ربیعہ سے برہم ہونے اور اس پر غصہ اتارنے سے وہ فی الحال احتراز برت رہی تھیں کیونکہ ربیعہ کی اپنی حالت بہ زبان خود بہت کچھ کہہ رہی تھی۔
صولت کے انداز انہیں غصہ دلا رہے تھے لیکن وہ ان کی اکلوتی اولاد اور دنیا بھر میں ان کی محبت و چاہت کا واحد مرکز تھی۔ سو اس پر اتنا غصہ بھی وہ اپنے اندر دبانے پر مجبور تھیں۔ ترانہ کوئی دن سے مہرے بلب بھی سنی فی الحال تو ہر طرح کی پریشانی کا عنوان تصور تھا جو تین دن سے گھر نہ لوٹا تھا۔

صولت سے شادی سے علی الاعلان انکار کر کے وہ گھر سے چلا گیا تھا۔ اور اب تین دن سے اس کا کچھ انا پتہ نہ تھا۔ صولت نے محبوب کی جدائی کو از حد دل پر لیا تھا۔ اور وہ نہ صرف روپیٹ رہی تھی بلکہ کھانے پینے سے بھی گریزاں تھی۔

اسے رہ رہ کر ربیعہ پر غصہ اتارنے کا جوش چڑھتا تھا اور وہ جو منہ میں آتا، سو کہنے لگتی تھی۔ شروع شروع میں مینا بیگم نے اسے کنٹرول کرنے کی کوشش کی پھر وہ بھی ہار مان کر چپ ہو گئی تھیں۔
ربیعہ کو اس وقت آرام اور ذہنی سکون کی ضرورت تھی۔ لیکن باہر سے آتی صولت کی آواز بار بار اس کے اعصاب پر جنجھوڑا لیتی۔ صولت اسے کبھی، کبھی قرار دیتی اس کی اس گھر میں آمد کو سازش گردانی پھر تھک ہار کر چپ ہو جاتی۔ کچھ دیر کے بعد اسے پھر نئے سرے سے جوش چڑھ جاتا۔

”میں کتنی ہوں امی۔ نکال باہر کریں اس چڑیل کو یہاں سے۔ اس کے یہاں ہونے سے میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے۔ آئے چل رہے ہیں آئے۔ بار بار مجھے خیال آتا ہے کہ جانے کس وقت میں اس نے کیا مٹر پڑھ کر پھونکا تصور ہے۔ وہ تو اسانہ تھا۔ ہائے میری قسمت۔“

”کیا بات ہے۔ کیا کو اس ہے یہ؟“ گھر میں یکایک تمدن کی ترش آواز گونجی تھی۔
”جس وقت گھر میں داخل ہو تمہارے بچی بین سننے کو ملے ہیں۔ کیا تکلیف ہے تمہیں؟ مرنے لگاؤ۔ پڑا ہو گا اپنے کسی یار کے گھر منہ چھپائے۔ چار دن اور گزریں گے۔ بے غیرتی سے چلا آئے گا۔“
صولت پھر خاموش ہو گئی تھی۔ اسے خاموش ہونے کے لیے ایسے ہی کسی ہیوی ڈوز کی ضرورت پڑتی تھی۔
”پتا تو کیا ہوتا تمدن!“ مینا بیگم قدرے سہولت سے بولیں۔ ”غصے میں گھر سے گیا ہے۔ جوان خون ہے کچھ ایسا ویسا نہ کر بیٹھے۔“

”ہا ہا ہا۔ ہا ہا ہا۔“ تمدن کو یہ بات کافی پُر مزاح لگی۔ ”جوان خون! پھپھو جوان خون ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ خون میں غیرت بھی ہونا چاہیے۔ جو اس بے چارے کے پاس بالکل نہیں ہے۔ سالابد معاش، ہونے والی بھابھی پر نظر رکھے بیٹھا ہے۔“

صولت پھر بھوں بھوں کر کے رو بنے لگی تھی۔ مینا بیگم اور تمدن نے اس مرتبہ اسے بالکل لفٹ نہ کروائی۔ چند لمحوں بعد وہ دونوں کمرے میں چلے آئے تھے۔ ربیعہ نے اٹھنے کی کوشش کی تو مینا بیگم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

”آرام کرو۔“ تمدن بھی نرمی سے بولا۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

پھر وہ مینا بیگم کی سمت مڑا۔

”پھپھو! فی الحال اس سے گھر وں کا کوئی کام نہ کروانے لگنا۔ ابھی اس کی حالت ایسی نہیں ہے۔ شکل سے ہی تڑھال لگتی ہے۔“

”اب خیر میں اتنی ظالم بھی نہیں ہوں۔“ مینا بیگم کو برا محسوس ہوا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے قدرے ظالم ہونے کا اعتراف بھی کیا۔

”تصور کے چھپ جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ تمدن اسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ جس پر ربیعہ لیٹی ہوئی تھی۔ ربیعہ نے چونک کر خود کو سمیٹا۔ وہ بالکل پرے ہو گئی۔ تمدن نے ایک سرسری نگاہ اس کی حرکت پر ڈالی تھی۔

”میں نے اپنے سب دوستوں کو مدعو کر لیا ہے۔ اور اپنا پروگرام بدلنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس جمعے کو میں مولوی نے آؤں گا۔ گھر میں ہی نکاح پڑھوا لیں گے۔ چند دوستوں اور رشتے داروں کو بلا کر ہلکا پھلکا رائج منٹ کر لیں گے۔“

ربیعہ کے اندر ریت تلے بگولے اٹھنے لگے۔ وہ کسی صحرائی طوفان میں جا پھنسی۔ تمدن اس کی کیفیت سے بے خبر بول رہا تھا۔

”ہمارا کام تو بونہی سادگی سے چل جائے گا۔“

”لیکن تمدن!“ مینا بیگم تیز ذہن کا شکار تھیں۔ ”تصور کے نہ ہونے پر بہت باتیں بنیں گی۔ یوں بھی جن لوگوں کو میں نے دعوت دی تھی، انہیں دونوں شادیوں کے متعلق بتایا تھا۔ اب اگر صرف تمہاری رسم نکاح منعقد کر دی جائے تو لوگ لازماً ”اندیشوں کا شکار ہوں گے اور تصور کا اس موقع پر نہ ہونا ان اندیشوں کو اور بھی ہوا دے گا۔“

”پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔“ وہ خود غرضی سے بولا۔ ”وہ ساری عمر نہ لوٹے تو کیا میں اور ربیعہ ساری عمر اس کا انتظار ہی کرتے رہیں گے؟“

”ایسے نہ کہو تمدن۔ اتنے خود غرض نہ بنو۔“ مینا بیگم خود پر مزید جبر نہ کر سکیں۔ یوں بھی تصور ان کا ہونے والا دام تھا۔ سو تمدن کی نسبت وہ اس سے زیادہ انسیت رکھتی تھیں۔

”اس میں خود غرضی کی کیا بات؟ حقیقت پسندی ہے یہ۔ اور یوں بھی اگر آپ غور کریں تو ہمارا نکاح ہونے سے اس معاملے پر اچھا اثر پڑے گا۔ تصور کی امیدوں پر پانی پھرے گا تو وہ خود ہی چلا آئے گا۔ یہ سوچ کر کہ اب تو کچھ ہو نہیں سکتا۔“

تمدن کی بات پر مینا بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔

”یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ آہستہ سے بولیں۔

”موصیفہ یہی بات ہے پھپھو۔! ربیعہ سے ماپوس ہو کر وہ ضرور صولت سے شادی پر آمادہ ہو جائے گا۔ آپ دیکھ لیتا۔ وہ دوسرے دن ہی صولت، صولت کرنا چلا آئے گا اور پھر ہم تو سب کچھ بہت سادگی سے کریں گے۔ سارا دھوم دھڑکا، رسمیں و رسمیں صولت اور تصور کی شادی پر ہو جائے گا! کیوں ربیعہ؟“

اس نے پکی پارا سے ایک جیتی جاگتی ہستی کا درجہ دینے کی کوشش کی۔ لیکن ربیعہ اب خود یہ مقام قبول کرنے پر تیار نہ تھی۔ وہ پھر کابٹ بنی لیٹی رہی۔

”ٹھیک ہے!“ مینا بیگم نے تمدن کے پروگرام پر تصدیق کی مہر ثبت کی۔ ”میرا خیال ہے تم ٹھیک ہی ہو۔ تو پھر اس جمعے کو طے ہے یہ نکاح۔“

”بالکل۔“ وہ ہل کر مسکرایا۔

مینا بیگم آنکھیں بند کر کے لیٹی ہوئی ربیعہ کو دیکھنے لگی تھیں۔



”دکھنا اچھا ہوتا اگر عیشہ بھی ساتھ ہوتی تو۔“ ناعنہ یہڑھیاں چڑھتے ہوئے افسوس سے کہہ رہی تھی۔ ورنہ نے اسے جی بھر کر گھورا لیکن وہ اپنے ارد گرد کا جائزہ لینے میں مشغول تھی۔

”اتنا تو کم تھا اسے۔“ ثانیہ ہنسی۔ ”اب کیا گود میں اٹھا کر لے آتے۔ اس کی عادت ہی ایسی ہے نک چڑھی

کہیں کی۔ جب سے یہ رشتہ طے ہوا ہے۔ میرا قول ہی ڈرتا رہتا ہے۔ دو تو بھائی ہیں ہمارے۔ کون سے دس گیارہ ہیں جو ایک تک چڑھی بھاون جہر صبر کر کے بیٹھ جائیں۔۔۔

”جائے دو ثانیہ۔۔۔ سب تھیک ہو جائے گا۔“ وردہ نے ثانیہ کو ٹھنڈا کرنا چاہا اور ناعمہ کو جی بھر کر آنکھیں دکھائیں۔

ناعمہ کا اس کی آنکھیں دیکھنے کا قطعاً ”کوئی موڈ نہ تھا۔ وہ اپنے فورٹ شاپنگ امپوریم میں آکر ایسے خوش تھی جیسے چاند گاڑی سے ابھی ابھی چاند پر اتری ہو۔ مختلف دکانوں کی سجاوٹ دیکھ دیکھ کر اس کا اپنا چہرہ بھی دکانوں کی طرح جگمگانے لگا تھا۔

”ہائے ایسا۔۔۔ مرگئی میں تو۔۔۔“ اچانک ہی ناعمہ کی دردناک صدا ابھری تھی۔

وردہ اور ثانیہ گھبرا کر مڑیں۔

”کیا ہوا ناعمہ۔۔۔“ وردہ نے جلدی سے اسے سر سے پاؤں تک چیک کیا۔

”وہ دیکھیں وہ میروں لنگا۔۔۔ کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔“

وردہ کی جان میں جان آئی۔ اب کی بار اس نے نظروں سے کام لینے کے بجائے ہاتھ سے کام لیا اور نظریں بچا کر ایک دھپ اس کی پشت پر رسید کر دی۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ! وہ آواز دبا کر غرائی تھی۔

”بد تمیزی۔۔۔“ وہ سسم گئی۔ ”لنگا ہے ایسا!“

”بالکل انسان بن جاؤ اب۔۔۔ ورنہ اگلی مرتبہ میں تمہارے ساتھ نہیں آؤں گی۔“

وردہ کی دھمکی میں ہست جان تھی۔ ناعمہ شرافت کا مجسمہ نظر آنے لگی۔

وہ تینوں آج ہاشم کی شادی کی تقریبات میں پہننے کے لیے کپڑوں کی خریداری کرنے نکلی تھیں۔ انہوں نے عریضہ سے بھی ساتھ چلنے کے لیے بے حد اصرار کیا تھا لیکن وہ صاف انکار کر گئی تھی۔

”ماہین آپنی ہی کر لیں گی میری شاپنگ بھی۔۔۔“ وہ بے زاری سے بولی تھی۔ ”مجھے نہیں جانا کہیں۔“ ناعمہ اور ثانیہ خاموشی سے چلی آئی تھیں۔

وردہ نے ناعمہ کے اصرار پر میروں لنگا خریدنے کی کوشش کی لیکن اس کی قیمت ان کی قوت خرید سے دو گنی تھی سو وہ اسے لے کر دوسری شاپ پر چلی آئی۔

ناعمہ کی حسرت بھری نظریں بار بار ادھر کا ہی طواف کر رہی تھیں۔



”جی ای۔۔۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اڑ کر پہنچ جاؤں۔۔۔ مجبوری ہے۔ ابھی کلاسز آف ہونے میں چند دن باقی ہیں۔ کس طرح سے یہ دن گزریں گے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ میرا یہاں بالکل دل نہیں لگ رہا ہے۔“ عباد بہت بیزار تھا۔

”کوئی بات نہیں بچے! چند دن اور سہی۔ دل لگا کر کلاسیں لو اپنی۔“

انیقہ نے بے صبری سے منہ پر ہیکم سے ریسیور لے لیا تھا۔

”عباد بھائی۔۔۔ مجھے بالکل مزہ نہیں آ رہا ہے آپ کے بغیر۔ بس آپ جلدی سے آجائیں۔“

”شہلا آپنی خوش ہیں انو؟“ وہ جانے کیا سوچ کر بولا۔

”ہاں خوش ہیں ایسا۔۔۔ آپ کو تو پتا ہے نا۔۔۔ کتنا چھٹا چھٹا کر رکھتی ہیں اپنے دل کی بات۔۔۔ کہیں سے بھی ایک آوٹ نہیں ہونے دیتیں۔ پھر بھی۔ اتنا اندازہ تو ہے مجھے۔۔۔ بہت مطمئن نظر آتی ہیں وہ اس فیصلے پر، مطلب خوش ہیں۔“

”ہوں۔۔۔ اور عمر۔۔۔؟ اسے کس نے بریف کیا؟“ وہ خوش دلی سے بولا۔

انفیکہ لحد بھر کے لیے خاموش ہوئی پھر کھنکھار کر بولی۔
 ”عمر تو بچہ ہے عباد بھائی۔۔۔ ابھی اسے ان باتوں کا زیادہ پتا نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ گزرتے ہوئے حالات سے ہی اخذ کرے گا سب کچھ۔“
 ”نہیں انوسدہ اتنا بھی بچہ نہیں ہے۔ ایسے ہی تو نہیں وہ خود کو ”سپر مین“ کہتا ہے، اسے ذہنی طور پر اس حقیقت کے لیے تیار کرو۔ کہیں بعد میں کوئی پرائیمنہ نہ کری ایٹ کرے۔ شہلا آپلی ڈسٹرب ہو سکتی ہیں۔“
 ”اوکے۔۔۔ میں تو شش کرتی ہوں، آپ بس جلدی سے آجائیں۔ یہاں میں آگلی کچھ بھی نہیں کرپا رہی ہوں۔ آپ آجائیں گے تو مل کر خوب ہلا گلا کریں گے۔“
 ”میں جلد سے جلد پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ، لاہور سے کیا کیا خرید کر لاؤں؟ میں نے تمہارے اور شہلا آپلی کے لیے کچھ ڈسٹریبلز لیے ہیں۔ امی کے لیے گرم شالیں لی ہیں۔ اور کچھ چاہیے تو بتاؤ۔“ انفیکہ مسکرا دی۔

”اب آپ کی یہاں موجودگی کے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہیے۔ میں اور امی جی بھر کر شاپنگ کر چکے۔ ضرورت سے زیادہ ہی خرچا کر لیا ہے ہم نے ایکسانٹمنٹ میں۔“
 ”خرچے کی پروا مت کرو انوسدہ۔ اتنے عرصے بعد تو خوشیوں نے ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ خدا ان خوشیوں کو قائم و دائم رکھے۔“ وہ قدرے جذباتی ہو گیا۔
 ”آمین۔۔۔!“ انفیکہ آہستہ سے بولی تھی۔
 ”سب کا خیال رکھنا انوسدہ۔ میں جلد آ رہا ہوں۔“ اس نے رابطہ منقطع کیا تھا۔

○ ○ ○
 وردہ بری طرح سے جھنجھلا گئی تھی۔
 ”مجھے نہیں لگتا نہیں کچھ لیتا ہے۔ تمہاری سوئی اسی لینگے پرائمک چکی ہے۔ سب نشیات اپنی اپنی جگہ رک گئی ہیں۔ اب تم سکون سے بیٹھو اور مجھے اپنی شاپنگ کر لینے دو۔“
 ”تو آپ کریں ناشاپنگ۔۔۔ میں نے آپ کو منع کیا ہے۔“ ناعمہ کچھ خفا سی ہو گئی۔
 ”میں نے سوچا تھا، پہلے تم سے نمٹ لوں۔۔۔ پھر دیکھوں کیا بچتا ہے میرے لیے۔“
 ”آنتا سیکرٹ فائزنہ کیا کریں وردہ آپلی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔“ وہ طنز سے بولی۔ وردہ اور ثانیہ کو اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر ہنسی آگئی۔ اسے مزید تاؤ آگیا۔

”میں اپنے فیورٹ ساکنز کی سی ڈیزلے رہی ہوں۔ اس شاپ پر ہوں۔“ ناعمہ نے اشارے سے بتایا۔
 ”چلو ٹھیک ہے۔“ وردہ نے اس کے پھولے ہوئے منہ کے پیش نظر سہولت سے اس کی بات مان لی۔ وردہ عموماً ”وہ مارکیٹ میں بھی کسی لڑکی کو تنہا کسی شاپ پر نہیں جانے دیتی تھی۔ وردہ اور ثانیہ کپڑا دیکھنے لگیں۔ ناعمہ سی ڈیزلے دکان کی جانب بڑھ گئی تھی۔

سیلزمین سے کافی ساری سی ڈیزلے نکلا کر وہ بہت دھیان سے ان کے گانوں کے بول پڑھ رہی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

ناعمہ نے نگاہیں اٹھائیں۔ وہ اس کے قریب اس طرح سے کھڑا تھا جیسے وہ اسی کے ساتھ ہو اس کے چہرے پر اپنی پُریش نگاہیں جمائے۔ ہونٹ پیچھے وہ اسے عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ان کی برسوں کی شناسائی ہو۔ جیسے ان کا بہت قریبی رشتہ ہو۔

جیسے وہ کسی بات پر اس سے بے حد خفا ہو۔

جیسے اس کو ٹھیس لگی ہو۔ جیسے وہ آزر رہ ہو۔

ناعمہ سے نگاہیں نہ جھکا لی گئیں۔ وہ اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا۔۔۔؟“ اس کا لہجہ بھی آج آج تھا۔

وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”جی۔۔۔ ائی۔۔۔!“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

”کوئی کھیل تھا تمہارے لیے؟ وقت گزاری تھی؟“ وہ ایک قدم آگے بڑھا۔

ناعمہ نے پسینہ پسینہ ہوتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھی ان کی جانب متوجہ نہ تھا۔ چند لڑکے اپنی پسند کی ڈیزلے رہے تھے۔ سلیزمن انہیں ڈیل کر رہا تھا۔

”آپ۔۔۔! کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ اس نے حسب معمول ہتھیلی کی پشت سے پیشانی صاف کی۔

”جاننا چاہتا ہوں۔۔۔ تمہارے اس طرز عمل کی وجہ۔۔۔“ وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

ناعمہ سخت پریشان ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”میں نے کیا کیا ہے؟ کیا بگاڑا ہے آپ کا؟“

”پنہ دل سے پوچھو۔۔۔“ وہ طنز سے مسکرایا۔

ناعمہ کو اس کی شکل دیکھی دیکھی سی لگی۔ وہ ذہن پر زور ڈالنے لگی کہ اس دیوانے کو اس نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

وہ بھی بے حد غور سے اس کا نقش نقش دیکھ رہا تھا۔

”اسی بھول پن پر مرنا تھا میں۔۔۔“ پھر وہ بولا۔ ”کیا خبر تھی کہ بھول پن کے پردے میں کتنا فریب پوشیدہ ہے۔“

ناعمہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا وہ کیا کرے۔ مدد کے لیے کسے پکارے۔

”فرانس۔!“ کسی لڑکے نے آواز دی تھی۔

”کم آن یا۔۔۔!“

فراز نے ایک بے بس نگاہ اس کے پسینہ پسینہ ہوتے وجود پر ڈالی اور بادل خواستہ اپنی جگہ چھوڑی۔ شاپ سے نکلنے سے پہلے بھی اس نے بُت بنی ناعمہ پر نظر ڈالی تھی۔

”مما!“ عمر بے حد غصے میں معلوم ہوتا تھا۔

شہلا چونک اٹھی۔ وہ پندرہ دن کی چھٹی کے لیے تحریری طور پر درخواست تیار کر رہی تھی۔ پین ایک طرف رکھ کر وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”جی جناب یکیسے!“ وہ مسکرائی۔ ”خالہ جانی سے لڑائی ہو گئی ہے شاید۔“

”آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں؟“ اس نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے۔

شہلا مدھم سا مسکرائی پھر اس نے عمر کو اٹھا کر اپنے زانو پر بٹھالیا۔

”میں آپ کی مما ہوں جانو۔۔۔ مما اپنے جانو کو چھوڑ کر کہیں جاسکتی ہیں بھلا۔؟“

”نہیں۔۔۔ آپ جا رہی ہیں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔ آپ ہاشم انگل کے گھر جا رہی ہیں ان کی دلہن بن کر۔“

مجھے نانوں نے بتایا ہے۔ میں یہاں نانوں کے پاس رہوں گا اور آپ ادھر ہاشم انگل کے پاس رہیں گی۔ ہے نا۔۔۔!“

وہ منہ بسورنے لگا تھا شہلا کو اس پر ٹوٹ کر پیا ر آیا۔ اس نے اسے خود سے لپٹالیا۔ اس کا ہاتھ چوما پھر اس کے بال سنوارنے لگی۔

”عمر۔۔۔ میں آپ کو یہاں نانوں کے پاس صرف ایک ہفتے کے لیے چھوڑوں گی۔ میری جان! آئی پراس! میں ہمیشہ آپ کو اپنے پاس رکھوں گی۔“

”کہاں؟ کہاں رکھیں گی؟ ہاشم انگل کے گھر؟ میں وہاں نہیں رہوں گا۔“

شہلا کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل اپنی مٹھی میں مسل دیا ہو۔

”کیوں؟“ اس نے کمزور سی آوازیں پوچھا۔ ”کیوں نہیں رہو گے وہاں؟“

”وہ میرا گھر نہیں ہے۔ وہ مومن کا گھر ہے۔ میں اس کے گھر میں کیوں رہوں؟“

”بیٹا! وہ جبر ہوئی۔“ وہ تو مومن کی نانو کا گھر ہے۔“

”تو اسی کا گھر ہوا نا؟ یہ میری نانو کا گھر ہے تو میرا گھر ہے نا۔“

شہلا کی سمجھ میں نہ آیا وہ اسے کیسے سمجھائے۔

شہلانے جواب نہ دیا۔ صرف استغماہی نگاہیں اس کے چہرے پر نکادیں۔

”بچوں کا گھر وہ ہونا ہے جو ان کے پاپا کا گھر ہونا ہے۔“

شہلا کو یوں لگا جیسے چھت اس کے سر پر آگری ہو۔ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”جو میرے پیپا ہیں نا۔ ان کا نام ابراہیم جیلانی ہے۔ انہوں نے میرے لیے بہت اچھا گھر بنوایا ہے۔ اسلام آباد

میں۔ اگر آپ میرے پیپا کی دلسن بن جائیں تو ہم تینوں وہاں رہیں گے۔ میں آپ اور پیپا! التمامہ آئے گا نا۔“

شہلا کا سانس اس کے گلے میں پھنس گیا۔ اس سے آواز نکالنا مشکل ہو گیا۔ اپنی ہتھیلیوں کو اس نے نم ہوتا

محسوس کیا۔

”ممما! اس نے شہلا کو بلایا۔“ بتائیں نا! آپ چلیں گی نا اسلام آباد! شہلا کا حوصلہ جواب دے گیا۔ بنا سوچے

سمجھے اس نے ایک طمانچہ اس کے گال پر دے مارا تھا۔

”بند کرو بکواس۔ کس نے سکھایا ہے تمہیں یہ سب کچھ۔“ وہ پھنکاری۔

عمر گال پر ہاتھ رکھے سخت خوف زدہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

○ ○ ○
کاغذ پر اس کا قلم نہایت برق رفتاری سے رواں تھا۔ چند اسانحٹ تھے۔ جنہیں چند ایک روز میں پورا کرنا

بے حد ضروری تھا۔ اس کا پورا پورا دھیان اپنے کام کی جانب تھا۔

اس کے موبائل کی بپ بپ آواز سے سخت کوفت ہوئی۔

اس نے آنے والی کال کا نمبر دیکھا۔ اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ کالر کون ہے۔ اس نے منہ بنا کر کال ریسیو کرنے کا

ارادہ ترک کر دیا اور اپنے نوٹس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”کیا ہوا؟“ عبد الباری نے اس کا فکر منہ چروہ دیکھا۔

”پتا نہیں۔ وہ کال کیوں ریسیو نہیں کر رہا ہے، موبائل تو اس کے پاس ہی ہو گا نا۔“ ترانہ نے فکر مندی سے

کہا۔ ریشان مت ہو، ہو سکتا ہے وہ واش روم وغیرہ میں ہو۔“ عبد الباری نے اسے تسلی دی۔

”میں نہیں جانتی، وہ کس انسٹیٹیوٹ میں پڑھتا ہے۔ ورنہ ہم اس سے ملنے چلے جاتے۔ میرے پاس صرف اس

کا موبائل نمبر ہی ہے۔ مجھے ایک مرتبہ ریبیجہ نے لکھوایا تھا۔“

”ڈونٹ سوری ترانہ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ رٹائی آگئیں۔“

ترانہ نے اشات میں سر ہلایا اور ایک مرتبہ پھر نمبر ملانے لگی۔

اس نے موبائل Silent کر دیا تھا۔ لیکن اب اس کی روشن اسکرین اطلاع دے رہی تھی کہ کال کرنے والا

بات کرنے پر مصر ہے۔ گہری سانس بھر کر اس نے پین رکھ کر فائل بند کی اور موبائل آن کیا۔

”ہیلو۔ عباد صاحب۔ میں میں ترانہ بات کر رہی ہوں۔“

”ترانہ۔؟“ اسے حیرت ہوئی۔ ”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”میں ریبیجہ کی کزن ہوں۔ اکثر آپ نے مجھے اس کے ساتھ دیکھا ہے۔“

”اوہ گاڈ! ہاؤ کین آئی فار گیٹ! سو سو سوری ترانہ۔ میں اس وقت کسی اور دھیان میں تھا۔ جی کہہیے، کیسے

مزان ہیں۔ ریبیجہ کیسی ہیں۔ ایوری تنگ از آل رات نا؟“

”جی نہیں! ترانہ دھیسے سے بولی۔ ”یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ عباد! مجھے آپ سے بہت ضروری بات

کہنا ہے۔“

”کہیں۔۔۔ وہ بری طرح سے چونکا تھا۔

”عباد۔۔۔ آپ۔۔۔ ربیعہ سے شادی کر لیں۔ فوری طور پر۔۔۔ آج ہی آپ کو منظور ہے؟“

”وہاں۔۔۔؟“ وہ بھونچکا رہ گیا۔



اس نے ایک مضطرب نگاہ گرد پیش پر اور دوسری اپنی رست و اوج پر ڈالی تھی۔

باری مسکرایا۔ پھر اس نے میز پر رکھے ہوئے ترانہ کے ہاتھ پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھا۔ ترانہ چونکا اٹھی۔

”ریلیکس۔۔۔ باری نے اسے تسلی دی۔ ”تم بہت ٹینس نظر آ رہی ہو۔“

”ٹینس ہوں تو۔۔۔ نظر بھی آؤں گی۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔ ”واحد اطمینان یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہو۔۔۔ اتنا وقت میں اسی لیے کٹ پائی ہوں۔۔۔ بتانا نہیں وہ آئے گا بھی یا نہیں۔“ عبد الباری نے بھی اپنی رست و اوج دیکھی ہے۔

”وہ آئے گا ترانہ۔۔۔ میں یقین سے کہتا ہوں۔ یوں بھی ہم اس کے دیے ہوئے وقت سے بہت پہلے ہی یہاں پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے پانچ بجے آئے کو کہا تھا اور ابھی صرف سو پانچ ہوئے ہیں۔“

”بتا ہے باری۔۔۔ جو کچھ میں کرنے جا رہی ہوں اس کے لیے بہت بہت درکار ہے۔ مجھے یہ ہمت نجانے کس چیز نے دی ہے۔ شاید۔ شاید میرے احساس جرم نے۔ یا پھر اس محبت نے جو میں ربیعہ کے لیے اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔ جب سے میں نے اسے تمدن بھائی سے شادی کرنے پر فورس کیا ہے میں ایک عجیب سی خلش ایک ناقابل بیان احساس جرم میں مبتلا ہوں۔ یہ جاننے بوجھتے کہ کسی بھی طرح تمدن بھائی اس کے لائق نہیں ہیں۔ میں پھپھو کی باتوں میں آکر اسے ایک آگ کے دریا میں دھکیلنے لگی تھی۔ وہ گھر ہی آگ کا دریا ہے باری! میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ پھر بھی، پھر بھی میں ربیعہ کو وہاں عمر قید کی سزا سنانے والوں میں شامل ہو گئی۔ ربیعہ تو موم کی گڑیا ہے۔ وہ کیسے جی بٹے گی وہاں؟ کھل کھل کر مرجائے گی وہ۔۔۔“

باری گال کے نیچے ہاتھ رکھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ترانہ بات مکمل کرتے کرتے جھینپ گئی۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہو باری؟“

”سوچ رہا ہوں! وہ واقعی سوچ میں گم تھا۔

”کیا؟“ ترانہ نے اچھبے سے اسے دیکھا۔

”ایسا ہی ایک آگ کا دریا میرے گھر میں بھی بہتا ہے ترانہ۔۔۔ یہ کیسی حقیقت ہے؟ ہم انسان اپنے اپنے رویوں سے آگ کے دریا کیوں بناتے ہیں؟ ہم پر سکون، ٹھنڈی میٹھی جھیلیں کیوں نہیں بہاتے ترانہ؟ کیا بھی تم نے جب یہ سب کچھ کہا تو میں۔۔۔ میں بھی ایک احساس جرم میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ کہیں میں بھی تمہارے ساتھ زیادتی تو نہیں کر رہا۔“

ترانہ مسکرا دی۔

”نہیں باری! دونوں سچویشنز میں بہت فرق ہے۔ ربیعہ اس سیٹ اپ کا دائمی حصہ بننے پر آمادہ نہیں ہے۔ اس نے کبھی ایسے ماحول کو نہیں برتا۔ وہ بالکل الگ نیچر کی لڑکی ہے۔ جب کہ میں تو ہمیشہ سے ہی آگ کے دریا کی باسی ہوں۔ مجھ پر جگہیں بدلنے سے زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ پھر میں خود اس بات پر ذہنی طور پر رضامند ہوں۔ اور یہ کہ میں ترانہ ہوں موم کی گڑیا نہیں۔“

باری اس کی بات سن کر مسکرایا۔ تب ہی ان کی نگاہ گلاس ڈور کھول کر اندر آتے عباد پر پڑی تھی۔ وہ اندر آکر اب متلاشی نگاہوں سے مختلف میزوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ترانہ کو باری کے ساتھ بیٹھا دیکھ لیا۔ تو ان کی طرف بڑھا۔

ترانہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ باری، عباد کے استقبال کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ کر چند قدم آگے بڑھ گیا۔ ترانہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سلام دعا کے مرحلے طے کر کے وہ تینوں اپنی اپنی نشستوں پر آ بیٹھے تھے۔ ترانہ نے

جاچتی ہوئی نظروں سے عباد کو دیکھا۔ گرے شرٹ اور گرے جینز میں وہ ہمیشہ کی طرح فریش اور خوب رو لگ رہا تھا۔ شرٹ کی آستینیں کینوں تک موڑے وہ قدرے بے پروا انداز میں تھا۔ شرٹ کا اوپری بٹن کھلا تھا اور اس کے گلے میں پڑا ہوا سیاہ تعویذ دکھائی دیتا تھا۔

ترانہ نے چشم تصور سے اسے ربیعہ کے ہمراہ دیکھا اور خوشی سے مسکرایا۔ ربیعہ جیسی خوبصورت، نرم و نازک، حساس لڑکی کے لیے ایسا ہی شاندار سا بندہ ہونا چاہیے تھا۔

”جی مس ترانہ۔“ آس کریم کے پیالے سے چچہ بھر کر منہ میں ڈالتے ہوئے بالآخر عباد نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ ”تو اب ہم بات کر سکتے ہیں۔“

ترانہ نے ایک نگاہ باری پر ڈالی اور ہولے سے کھنکارتے ہوئے بات شروع کی۔

”عباد... میں نے آپ سے فون پر ایک درخواست کی تھی۔“

”اور ایسی باتیں فون پر تو ہرگز نہیں ہوتیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”سی لیے میں نے آپ لوگوں کو یہاں آنے کی زحمت دی ہے۔ اچھا ہوتا کہ آپ ربیعہ کو بھی ساتھ لے آتیں۔“

”وہی الوقت ایسی پوزیشن میں نہیں ہے۔“ ترانہ افسردگی سے بولی۔ ”اور پھر اسے تو بالکل علم نہیں ہے کہ میں نے آپ سے ایسی کسی بات کے لیے رابطہ کیا ہے۔“

اس نے عباد پر نگاہ ڈالی، وہ سوچتی نگاہوں سے اس کی گفتگو میں تسلسل آنے کا منتظر تھا۔

”دراصل عباد بات یہ ہے کہ میری پھپھو اور میرے بڑے بھائی تمدن نے ربیعہ سے زبردستی کی رضامندی لے کر اس کی شادی تمدن بھائی سے طے کر دی ہے۔ اس... اس جمعہ کو ان کا نکاح ہے۔ شروع میں تو میں بھی سوچتی تھی کہ اگر ایسا ہو جائے تو شاید ہمارے بد قسمت خاندان کو ایک بہت اچھی، سلیبی ہوئی پارسل لڑکی بیبی مدو کی مانند حاصل ہو جائے گی۔ شاید... شاید اس کے ہمارے خاندان کا حصہ بن جانے سے خوش قسمتی کا کوئی دریچہ ہمارے لیے بھی کھل جائے۔ لیکن گزشتہ چند روز میں مجھے احساس ہوا کہ میں بالکل غلط سمجھتی اور سوچتی تھی۔ ہمارا خاندان واقعی اس قابل نہیں ہے کہ وہاں ربیعہ جیسی معصوم، فرشتہ صفت لڑکی اپنی تمام زندگی کسی ناکردہ گناہ کی ناقابل معافی سزا کے طور پر گزار دے۔ وہ گھر تو کالے پانی کی سزا ہے۔ میں بچپن سے وہیں پی بڑھی ہوں۔ لیکن ان درو دیوار میں میرا دم گھٹتا ہے تو ربیعہ... ربیعہ تو بہت نازوں سے پلی ہوئی، نرم و نازک تیل جیسی لڑکی ہے۔ وہ تو چند دنوں میں مرجھا جائے گی۔“

عباد ساٹ چہرے لیے اپنی نگاہیں بولتی ہوئی ترانہ پر جمائے ہوئے تھا۔

”دوسرا کوئی آپشن میرے یا ربیعہ کے پاس نہیں تھا۔“ ترانہ نے نظریں جھکا کر جیسے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا۔ ”اور ربیعہ بے چاری کے ذہن میں تو ایسا بھی کوئی آپشن نہیں ہے۔ وہ تو آپ کو ایک بھائی کی طرح مخلص اور مددگار سمجھتی ہے۔ لیکن عباد! یہ پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ ربیعہ کو اس صورت حال سے نکلنے کے لیے ایک ٹھوس رشتے کی، ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ اس دنیا کی نظر میں منہ بولے رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر میں کسی طرح ربیعہ کو اس گھر سے نکال بھی لائی ہوں تو اسے ایک سائبان چاہیے۔ ایک مضبوط رشتہ چاہیے۔ اس لیے میں نے آپ سے یہ بات کی تھی۔“

ترانہ نے نظروں میں آس بھر کر اسے دیکھا۔

”میں جانتی ہوں عباد! اس نے لبوں پر خاموشی کی مر لگائی ہوئی ہے لیکن اس کا دل دہائیاں بے رہا ہے۔ اس کی آنکھیں خشک ہیں مگر اس کے احساسات اشک بار ہیں۔ وہ اس حالت میں زیادہ عرصہ نہ جی سکے گی۔ اس کے اندر جینے کی آس اگر نہیں موجود بھی ہوئی تو میرا خالم بھائی اسے کسی شمع کی لوکی مانند ایک پیچھوک میں بجھا دے گا۔ پلیر عباد! آپ... آپ اس کا ہاتھ تھام لیں۔ اگر آپ کے دل میں اس کے لیے ذرا سی بھی ہمدردی ہے تو۔۔۔“

آپ! اس سے شادی کر لیں۔“

عباد نے ہلہولدا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے جیسے صورتحال پر غور کیا تھا۔

”لیکن ترانہ! آپ کے گھر والے؟ انہیں کون ڈیل کرے گا؟“

”کوئی نہیں!“ وہ ساٹ انداز میں بولی۔

”کیا مطلب؟“ عباد کو الجھن ہوئی۔ ”ربیعہ آپ کے گھر میں ہے۔ اس کا جھوٹا نکاح ہے۔ ایسی صورت میں

میرا اس سے شادی پر ہامی بھرناس درجہ حماقت کے زمرے میں آتا ہے۔ کیا آپ کو احساس ہے؟“

”عباد!“ ترانہ کو اس کی بات سمجھ گئی۔ ”میں آپ سے کوئی بات وغیرہ لانے کے لیے نہیں کہہ رہی ہوں۔

میں تو آپ سے ربیعہ کو بھگا کر لے جانے کے لیے کہہ رہی ہوں۔“

”وہاٹ!“ عباد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

عبدالباری نے بڑی مشکوکوں سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی تھی۔

○ ○ ○

اس کا پسندیدہ میروں لیگا اس کی نظروں کے سامنے بڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کا دھیان کہیں اور مرکوز تھا۔ گہری

سوچ میں گم ٹھہری وہ اپنی چٹنگی کا ناخن دانتوں سے کاٹ رہی تھی۔ نجانے کون تھا وہ اجنبی جو دل کو بے چینی کا عارضہ

دے گیا تھا۔

ناعمہ کو بار بار جیسے کچھ یاد آتا تھا پھر ذہن پر بننے والے یاد کے نقش کسی دو سری سوچ کی نشیں بہہ جاتے تھے۔

کون تھا وہ؟ پہلے کہاں دیکھا تھا اسے؟ وہ اسے کیا سمجھ رہا تھا؟ وہ اس سے خفا کیوں تھا؟ پھر اس کا نام۔۔۔ سنا سنا۔۔۔

جانا پچانا سا۔۔۔

”قرآن!“ اس کے کانوں میں بار بار آواز گونجتی۔

اس کا مزکر ناعمہ کو بے بسی سے دیکھنا اور بادل خواستہ وہاں سے ہٹنا۔۔۔ ناعمہ کے دل و دماغ پر وہ منظر نقش ہو گیا

تما۔۔۔ پھر اس کی وہ دیوانوں کی سی باتیں۔۔۔ نہ سمجھ میں آنے والی، نہ روکی جانے والی۔ کچھ مطلب تھا ان بے سرو پا

باتوں میں۔۔۔ کوئی دُور بھی جو ہاتھ میں آجانی تو سب ہی معے حل ہو جاتے۔ لیکن وہ دُور۔۔۔ اس کا برا۔۔۔ کہاں تھا؟

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا؟ کیوں؟“

”کوئی کھیل تھا تمہارے لیے؟ وقت گزاری تھی؟“

”جی بھولپن پر مر مٹا تھا میں کیا خبر تھی کہ اس بھولپن کے پردے میں کتنا فریب پوشیدہ ہے کیا خبر تھی؟

کیا خبر تھی۔۔۔“

ناعمہ کے ارد گرد اس کے الفاظ میں چھپی بے بسی چکرانے لگتی۔ اس کی سوچ کی پرواز نہ ڈھال ہو کر گر پڑی۔

اس نے سر بستری پشت سے نکا کر آنکھیں موند لیں۔

”کیا بات ہے ناعمہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ ورہ کی آواز پر اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی

کوشش کی۔ ”میں ٹھیک ہوں اپنا۔۔۔ مجھے بھلا کیا ہوتا ہے؟ آپ نے بحث کو نظر انداز کر کے مجھے میری پسند کا لباس

دلوایا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔“

”ہائیں۔۔۔!“ ورہ دنگ رہ گئی۔ ”یہ تم ہی ہو ناعمہ؟ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہو۔؟ یہ تمہیں کیا

ہو گیا ہے؟ امی کو بلاؤ؟“

ناعمہ بری طرح جھجھکی ہو گئی۔

”کیا ہے ورہ آپ! میں نے ایسا کیا کہہ دیا کہ آپ کو کسی اور کا گمان ہونے لگا۔ آج سے پہلے کیا میں نے کبھی کسی

بات پر آپ کا شکریہ ادا نہیں کیا؟“

ورہ کے لب مسکرانے لگے۔ اس نے ناعمہ کے سامنے پڑے لباس پر ایک نگاہ ڈالی۔

”ویسے ڈریس تو واقعی اچھا پسند کیا ہے تم نے۔ پسن کرو دیکھا ہے؟“

”نہیں۔۔۔ ابھی تک تو نہیں!“ وہ سکلندی سے بولی۔

وردہ نے ایک مرتبہ پھر آنکھیں پوری طرح سے کھول کر اسے دیکھا۔

”ناعصہ تم مجھے واقعی بہت بدلی ہوئی لگ رہی ہو۔ یعنی کل سے تم نے اسے پہن کر ہی نہیں دیکھا۔ کہاں تو تمہارا بس نہیں چل رہا تھا کہ تم اسے وہاں اچھوڑ دینا میں ہی پہن کر کھڑی ہو جاتیں۔“

ناعصہ کو بہن کی باریک بینی کا احساس ہوا۔ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے مسکرا دی۔

”میں ابھی آپ کو پہن کر دکھاتی ہوں۔“ وہ چٹکی بجا کر بولی۔

وردہ بے ساختگی سے مسکرا دی۔

”کیا بات ہے عریشہ! سچ بتاؤ مجھے!“ مایہن سب کام سمیٹ کر اب بے حد فراغت سے اس کے سامنے یوں آکر بیٹھی تھی کہ فرار کے سبب ہی راستے مسدود تھے۔ عریشہ نے کتاب پر سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر نظریں چرا کر لب کاٹنے لگی۔ مایہن بغور اس کے تاثرات ملاحظہ کر رہی تھی۔

”آپ کیا جانا چاہتی ہیں!“ وہ دھیرے سے بولی۔

”تمہارے اس بالکل بدلے ہوئے رویے کی وجہ! اور آج میں جان کر رہوں گی۔ دیکھو عریشہ! اڑیا گڈے سے کھینے کی عمر گزر گئی ہے تمہاری۔ زندگی کو کچھ سنجیدگی سے لو۔ اگر تمہارے ساتھ کہیں کچھ غلط ہوا ہے، کوئی زیادتی ہو گئی ہے، ہم سے تو بتاؤ ہمیں۔ تمہارے لب آزاد ہیں۔ کیوں اپنی گویائی کو قید کیا ہوا ہے تم نے۔“

”کیا بات ہے اپنا!“ وہ پھٹکی سی ہنسی ہنس دی۔ ”آج تو بہت فلسفیانہ گفتگو کر رہی ہیں آپ اتنے دنوں بعد آج آپ کو یہ خیال آیا کہ میرے لب آزاد ہیں۔ اور لبوں کے آزاد ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ گویائی کی طاقت ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ بات تو سماعتوں کی ہے اپنا۔ سننے والوں نے سماعتوں کے در بند کر رکھے ہیں تو گویائی کی بے اثر دستک ان پر اثر انداز نہیں ہوا کرتی۔ یہاں سب کی سماعتیں پتھر کی ہیں۔“

مایہن نے ہمدردی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”عریشہ! بہت دُشرب لگتی ہو تم مجھے۔ تم یہ بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟ تمہیں نافع پسند نہیں ہے یا پھر تمہیں کوئی اور پسند ہے؟“

عریشہ کا دل بیکارگی کسی اور تال پر دھڑکا تھا۔ ”کوئی اور“ نے عجب طرح سے احساسات کو چھوا تھا۔ اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔

”بولو۔ جواب دو۔ میں تمہارا جواب سننے بغیر یہاں سے اٹھنے والی نہیں ہوں۔“

”اپنا۔ کیوں برا لکھ کرید رہی ہیں۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”سب چنگاریاں بجھ چکی ہیں۔“

”جھوٹ۔ غلط۔ پورا الاؤ روشن ہے یہاں تو۔ اس کی تپش باہر والوں تک نہ پہنچے۔ اس بات کا خوف ہے نہیں۔ عریشہ! یہ خاندان کا معاملہ ہے۔ اور وہ خاندان جو برسوں سے ایک ہے۔ تمہاری کسی بچکانہ حرکت سے اس کی بنیادوں کو نقصان پہنچا تو ساری عمر بچتاؤ گی تم بھی۔ اور ہم بھی۔ ابھی وقت ہے فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے جو کہنا ہے وضاحت سے کہہ دو۔“

سب لوگ تمہارے اس برتاؤ کی وجہ جانتا چاہتے ہیں۔ جب سے نافع سے تمہاری مقفی ہوئی ہے تم نے کسی سے بھی کلام کرنا چھوڑا ہوا ہے۔ تم کہیں آنا جانا ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اور اب سب بھائی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی ہے اور تم نے اس معاملے میں بھی رتی برابر دل چسپی نہیں لی بھی۔ خاندان کی سب ہی لڑکیاں بہت شوق سے اپنی تیاریاں کر رہی ہیں اور تم دو لہما کی بہن ہوتے ہوئے بھی لالچعلقی سے کونے میں پڑی ہوئی ہو۔ آخر کیوں؟“

عریشہ نے سر جھکاتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا۔ کیا بتانی وہ کسی کو؟ اس سارے قصے میں بتانے والی آخر کیا بات تھی؟ بس صرف اتنی سی بات تھی کہ اس کا دل اسے کبھی گھڑی، کسی پل چین نہ لینے دیتا تھا۔ اسے آنکھیں یاد آتی تھیں۔ اسے باتیں یاد آتی تھیں۔ اور وہ یوں پہلو بدلتی تھی جیسے کسی الاؤ پر بیٹھی ہو۔

ماہین اسے دیکھتی رہی۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔
 ”نافع سے کوئی شکایت ہے؟“ اس نے پھر زچ ہو کر پوچھا تھا۔
 ”نہیں!“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”اس میں ہے کیا اچھا یا برا لگنے کو۔“
 ”اوہ!“ ماہین اچانک ہی جیسے کسی نتیجے پر پہنچی تھی۔ ”عریشہ! حد ہو گئی پچھنے کی۔“
 وہ تاسف سے بولی تو عریشہ نے آنسو بھری نظرس اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”بس۔۔۔ نہیں پسند مجھے۔“ وہ ضد سے بولی۔

”پھر تو دس منٹنی؟“ ماہین نے ٹھوس لہجے میں پوچھا۔ ”کچھ ایسا ناممکن تو نہیں۔ گھر ہی کی بات ہے۔ بعد میں تم اس کے ساتھ کچی روپیہ اپنائے رکھو گی تو کچھ نہ ہو پائے گا۔“
 عریشہ لب چبانے لگی۔

”بولو۔۔۔ جواب دو۔۔۔ کتنی ہو تو میں ہوں سے بات کروں۔۔۔ ایقان پھپھو کو بیچ میں ڈال کر میں داوی جان تک بات پہنچا دیتی ہوں۔“

عریشہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے الفاظ ہونٹوں پر ہی دم توڑ گئے۔ چشم تصور سے اس نے ایک مضبوط ہاتھ کو اپنے سر پر آتے اور ٹھہرتے دیکھا تھا۔ اس ہاتھ کے دباؤ میں جو مان تھا جو بھروسہ اور جو اعتبار تھا۔ عریشہ کا رواں رواں اسے محسوس کر سکتا تھا۔

”بولو عریشہ۔۔۔ جواب دو۔۔۔!“ ماہین جھنجھلا گئی۔ ”ہاشم بھائی کی شادی کے بعد میں سب سے بات کرتی ہوں۔ توڑ ڈالتے ہیں یہ منٹنی۔۔۔ جب تم ہی خوش نہیں ہو۔“

”نہیں ایسا۔!“ وہ کانپنے لہوں سے بولی۔ ”اب کچھ نہیں ہو گا! میں۔۔۔ میں خوش ہوں۔“

ماہین نے گہری سانس بھری اور کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھا۔
 ”پھر اپنا روپیہ درست کرو۔ انسان بن کر رہو۔ اب کسی کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ اور ہاں کل ہم تمہارے کپڑے لینے جا رہے ہیں۔ سب تیا ریاں مکمل ہیں۔ ایک تمہارے ہی کپڑوں کا کام رہتا ہے۔“
 عریشہ چپ رہی اس کی پلکوں پر نمی تھی۔

○ ○ ○
 نہاد سو کر وہ بستر بہت آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ لیکن ذہن جسمانی آرام کا اثر قبول کرنے پر قطعاً آمادہ نہیں تھا۔ رہ بے حد منتظر! بخیالی کا شکار ہو رہی تھی۔ بالوں سے ٹپکتے پانی سے خشک ہوئے بستر پر اس نے کروٹ بدلی اور گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ کیا راز تھا اس سارے قصے کے پیچھے۔ انیقہ کا ذہن جیسے کسی خفیہ راز تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ عمر سے گفتگو نے اس کے ذہن کو بے حد الجھا دیا تھا۔
 ”وہ کہتے ہیں کہ خالہ جانی کو بالکل نہیں بتانا کہ ہم باپ بیٹا کیا باتیں کرتے ہیں۔“ اس کے کانوں میں عمر کے کہے ہوئے الفاظ گونجے۔

”اور ماما کو بتانے سے منع نہیں کرتے؟“

”نہیں! وہ تو کہتے ہیں اپنی ماما سے میری باتیں کیا کرو۔ انہیں ماما بہت پسند ہیں نا!“
 انیقہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ صورت حال سے بہت کچھ اخذ کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور پھر نتیجہ واضح طور پر سمجھتے ہوئے خوفزدہ ہو رہی تھی۔

اسے ابرار جیلانی سے اپنی گفتگو یاد آئی اور گفتگو کے دوران محسوس ہوتی ابرار کی بے بنیاد خوشی بھی۔
 ”کون ہے وہ خوش قسمت؟“ اس کا وہ مسکراتا ہوا سوال۔

انیقہ بری طرح سے الجھ کر رہ گئی۔
 ”تو کیا ایسا؟ ایسا۔۔۔ بھی شامل ہیں اس کھیل میں؟“ انیقہ کو یقین نہ آتا تھا اور کوئی تھا جو اسے اس بات کا یقین

دلانے پر مسلسل اصرار کر رہا تھا۔ وہ بستر سے اتر آئی اور تھکے تھکے انداز میں کمرے میں ٹہلنے لگی۔
 ”اگر ایسا بھی اس ٹھیل میں شریک ہیں تو وہ بہت غلط کر رہی ہیں۔ ایک بار آزمائے ہوئے شخص کو دوبارہ آزمانا سوائے غلطی کے اور کچھ بھی نہیں۔ اور اس مرتبہ اس غلطی کا نتیجہ بہت برا ہو سکتا ہے۔“ انھیں کاہل بیٹھنے لگا۔
 اسے یہ صورت حال دسکس کرنے کے لیے ایک سامع کی، ایک ہمدرد کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کا واحد سامع شہلا بھی۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر ٹہلتے ہوئے خود ہی سے باتیں کرتی رہی۔
 ”ہاشم بھائی جیسا مخلص اور محبت کرنے والا جیون سا بھی فی زمانہ دستیاب ہونا، عظیم ترین خوش قسمتی کے سوا کچھ نہیں۔ اور پھر جس طرح کے حالات سے ایسا گزری ہیں۔ اس طرح کے حالات کے بعد تو یہ ایک معجزہ ہی ہے۔ خدا کا بے پناہ کرم ہے شہلا آپ کے حال پر ان کی غلطیوں کی معافی مل جانے کا اشارہ ہے۔ واضح اشارہ۔ شہلا آپ کی یہ اشارہ سمجھ کر ہاشم بھائی کا ساتھ ایک نعمت سمجھ کر اپنا رہی ہیں یا پھر۔ یا پھر۔ ان کے قدم ایک یار پھر اپنے رستے سے ہٹ کر رہے ہیں۔“
 انھیں کی بے چینی خدا سے سوا ہو گئی تو وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

جالی کے سفید پردوں کو وہ خالی الذہنی کے عالم میں گھور رہی تھی۔ بند پردوں ٹانگوں کو سمیٹ کر بیٹھی ہوئی وہ نجائے کیا کچھ سوچے جا رہی تھی۔ کچھ دن بعد اس کی سونی اجڑی مانگ پھر سے بچنے والی تھی۔ ہتھیلیوں سے روٹھی ہوئی مہندی کے رنگ پھر سے دوستی کرنا چاہتے تھے۔ سرخ زرتار اچھل پھر سے لہرانے کو تھا۔ لیکن روٹھا ہوا دل۔ مان کر نہ دیتا تھا۔ نجائے کیا چاہتا تھا یہ دل، شہلا اپنے آپ سے ڈر رہی تھی۔ اسے خود سے باتیں کرنے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر ایسا کرنے سے قاصر تھی۔
 عمر کی باتوں نے اس کے دل کو آج ہی لگا دی تھی۔ نجائے وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا۔ شہلا جانتے بوجھے بھی بے نیاز، سننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی کوشش کچھ ایسی کامیاب نہ ہو پاتی تھی۔
 ”بچوں کا گھر وہ ہوتا ہے جو ان کے بابا کا گھر ہوتا ہے۔“
 ”انہوں نے میرے لیے بہت اچھا گھر بنوایا ہے اسلام آباد میں۔ اگر آپ میرے بھائی دلہن بن جائیں تو ہم تنہا رہیں گے۔ میں۔ آپ اور بھائی۔ کتنا مزہ آئے گا نا!“
 شہلا نے بے ساختہ ہی دونوں ہاتھوں سے اپنا گلہ پکڑا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے اس کا گلہ دیا رہا ہو۔

”محبت کے اس تناور درخت کو مل کر سیدھا کرتے ہیں شہلا!“ اس کے کانوں میں ابراہر جیلانی کی آواز گونجی تھی۔

”میرا ایک دوست یہ قربانی دینے کو تیار ہے۔ ہاں کہہ دو شہلا! ہاں کہہ دو۔“
 شہلا کے لبوں سے بے اختیار ہی سسکی نکلی تھی۔ وہ تکیہ میں منہ چھپا کر اوندھی لیٹ گئی۔ قسمت نجائے کیوں ہر موڑ پر آزمائے کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس نے مطمئن اور پرسکون رہنے کے لیے ایک راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اب لگتا تھا کہ اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ اس نے راہ نہیں دوڑا نہ منتخب کر لیا تھا۔ سامنے تو دور سے کھلے ہوئے تھے پوری وضاحت کے ساتھ۔

دوڑتے دوڑتے وہ حسب معمول رک گیا تھا۔ رافع کافی آگے نکل گیا پھر وہ بھی رکا اور پلٹ کر واپس آنے لگا۔ ہاشم دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اس سفید ماربل سے بنے بنگلے کو دیکھ رہا تھا۔ پام کے خوبصورت پردوں سے سجا ہوا ٹیرس فی الوقت سنسان تھا۔ کاسی پھولوں سے لدی ہوئی تیل جس کھڑکی تک جا رہی تھی وہ کھڑکی بھی بند تھی۔ اس کے شیشوں کے پیچھے پڑے دبیز پردے نظر آتے تھے رافع اس کے قریب آکر رکا اور اس کی حد درجہ محویت دیکھ کر مسکرا دیا۔

”میاں رانجھے! کیا سوچنے لگتے ہو یہاں تک پہنچ کر تم؟“
ہاشم نے رانجھ کو دیکھا۔ اس کے لب مسکرانے لگے۔

”اب تو خیر سے شاعر ہیں جناب!“ وہ بولا تھا۔ ”اب تو میرے جذبات و احساسات تمہیں بغیر میرے کچھ کے بھی سمجھ لینے چاہئیں۔ شاعر تو انسانی احساسات کے سب ہی زیر و بم پہچانتا ہے، کیوں!“
رانجھ نے اس کے کھلتے چہرے، مسکراتے لبوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور دل ہی دل میں ان تمام چیزوں کے رانجھ ہونے کی دعا مانگی۔ دونوں اب ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔
”یار رانجھ!“ ہاشم نے اس کے کاندھے پر اپنا بازو رکھ لیا۔ ”وہ جو لڑکی ہے تیرے خیال میں، حقیقت میں وہ کہاں ہے؟“

”کیا مطلب؟“ رانجھ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”جو خیال میں ہے وہ خیال میں ہے۔ حقیقت سے خیال کا واسطہ ہی کیا؟“
”نہیں یار! اب ایسا بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے تو نے“ اسے ”ہی اپنے خیالوں کا پیکر بنایا ہے۔ لاشعوری طور پر“ اتنی بڑی حقیقت تیرے سامنے ہے اور پھر بھی تو اس سے انکاری ہے۔ میرا دل نہیں مانتا۔“
”نہ مانے دل!“ رانجھ مسکرایا۔ ”سے منانا میری ذمہ داری تو ہے نہیں۔ اور میاں رانجھے! تمہیں یہ گمان کب سے ہوا کہ میں اسے کچھ چھپاتا ہوں۔“ اس کا وجود میرے خیالوں کی اس ماورائی دنیا میں نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔“
ہاشم کو انجھن نے آگھیرا۔ دونوں اب پارک میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک بیچ پر بیٹھ کر رانجھ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے صبح کی خوبصورتی کو اپنے اندر سمونے لگا۔
”رانجھ!“ کچھ دیر کے بعد ہاشم بولا۔ ”کیا یہ خطرناک نہیں ہے؟“

”کیا؟“
”جیسی! اتنا بڑا ٹکراؤ۔“
”کیس کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ یوڈو نشوری۔“ رانجھ اٹھ کر بیچوں کے بل اچھلنے لگا۔
”ٹکراؤ ہے رانجھ! تم ابھی اس کی سنگینی سے آگاہ نہیں ہو۔ لیکن میں سمجھ سکتا ہوں انسان کے خیالوں اور اس کی حقیقت میں اتنا بڑا تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ ٹکراؤ ہو کر رہتا ہے۔ رانجھ! ایک مشورہ دوں۔؟“
رانجھ نے اچھلتے اچھلتے ہی ایک نظر اس پر ڈالی۔
”شاعری کرنا چھوڑ دو۔ پھاڑ دو اپنی نظمیں۔ غزلیں۔ سبھی کچھ! بھول جاؤ کہ تم نے لفظوں سے خیال میں ایک پری پیکر تراشا تھا۔ بھول جاؤ۔“
رانجھ ٹک کر حیران و پریشانی سے اسے گھورنے لگا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا وہ کچھ دیر کے لیے کچھ بول نہ پایا۔

پھر وہ آگے ہاشم کے برابر بیٹھ گیا۔
”یار ہاشم!“ کچھ دیر کے بعد وہ خود پر قابو پا کر بولا تھا۔ ”میں تیری گردن دبا دوں گا کسی دن۔“
ہاشم بے ساختہ ہی مسکرا دیا۔

”بندہ“ ”چوں“ ”نہیں کرے گا۔ ہم یاروں کے یار ہیں۔“
”میں سکون سے جی رہا تھا، اطمینان ہی اطمینان تھا میری لائف میں۔ اتنا سیدھا پن تھا اس شاہراہ میں کہ آکھیں بند کر کے بلا خوف و خطر دوڑ لگا سکتے تھے تو نے مجھے ابھارا۔ بار بار ابھارا۔ اتنا کہ میں مجبور ہو گیا خود سے باتیں کرنے پر۔ میں نے اپنے اندر ایک خیالی دنیا بسالی۔ میں نے ایک خیالی محبوبہ اس دنیا کی کمین بنائی۔ اسے سب سے چھپا کر صرف اور صرف خود تک محدود رکھا۔ اور اب جب کہ میں اس دنیا کی سیر کرنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ تو فرماتا ہے۔ بلکہ نیواس کرنا ہے کہ میں آگ لگا دوں اس دنیا میں؟ جل کر رکھ دوں جو جانے دوں، بھول جاؤں کہ میں

نے کبھی کچھ سوچا تھا؟ یا رباشم! میں انسان ہوں۔ یا روٹ ہوں؟ اپنے احساسات کو سنگ دلی سے پھاڑ کر پھینک دینے کا ظالمانہ مشورہ کیوں دیا تو نے؟ وضاحت کر؟

باشم نے گہری سانس بھری اس کی سانس میں رافع کے ہر لفظ کی تائید تھی۔
”رافع! میں تجھے مشینی خیالات کے حوالے سے چھیڑتا تھا تو مجھے چنداں خبر نہ تھی کہ۔۔۔ یہ خیالات تو اس چاند کی طرح ہیں جو بے خبری کے سیاہ بادلوں کے پیچھے سفر کر رہا ہے۔ میں نے اسے انجانے میں ہی بادلوں کو پرے کر دیا رافع! اور اس چاند کی روشنی سے خوفزدہ ہو گیا ہوں یا تو اس روشنی کو ”اس“ کے نام کر دوں۔ یا پھر۔۔۔ بجا دو اسے۔۔۔ گل کر دوں! اُم سے بہت محبت کرتا ہوں رافع۔ اسی لیے ایسا کنہ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم بری طرح سے پھنس جاؤ گے۔ کسی بھی وقت۔۔۔ کسی بھی وقت رافع!“

”میں فی الوقت۔۔۔ ”اس“ کے نام کچھ بھی نہیں کر سکتا باشم! مجھ میں یہ خیال ڈیولپ ہی نہیں ہوا تا۔۔۔ مجبور ہوں۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی اور خیال تو خیال ہے۔ اس سے کیا ڈرنا؟ حقیقت کی سب ہی ڈوریاں ہمارے ہاتھ میں ہیں۔“

”مجھے تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ جذبے اور خیال حقیقت کو کس طرح بے بس کر ڈالتے ہیں۔“
”اے۔۔۔ دیکھی جائے گی!“ وہ شیر جوان کی مانند اٹھ کھڑا ہوا۔ ”چل دیکھتے ہیں کون اس پیپل کے درخت کو پہلے ہاتھ لگاتا ہے۔“

”توجیت جائے گا یا۔۔۔“ باشم نے جمائی لی۔ ”میری دراصل نیند پوری نہیں ہوئی رات کو۔ میں کچھ ست ہو رہا ہوں۔“

”ابھی سے یہ حال ہے۔“ رافع نے شوخی سے دانت نکالے۔
”آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟“ باشم نے بھی خوش دلی سے کلزا لگایا۔
دونوں کے زبردست قہقہے نے پاس بیٹھی چڑیوں کو اڑا دیا تھا۔

”ربیعہ!“ ترانہ نے سرگوشی کی تھی۔

اور وہ تو جانے کتنی راتوں سے جاگی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی پھلتی ہی اس کا دل جیسے کسی آہنی شکنجے کی گرفت میں آکر پھپھڑانے لگتا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے پھت پر گھورتے سچے کو دیکھا کرتی، بے سوچ، خیالی ذہن کے ساتھ وہ دیواروں کے اکھڑے ہوئے پینٹ سے بنے ہوئے نقش و نگار بھول بھلیوں میں پھرا کرتی۔ کمرے میں سوتے ہوئے نفوس کی سانسوں کے زبردست سستی اور اپنی کھوئی ہوئی نیند کے بارے میں سوچتی کہ کبھی وہ اس کی کتنی اچھی سہیلی تھی۔

ایسے میں ترانہ کی مدھم سرگوشی سے فوراً ہی چونکنا لازم تھا۔ ربیعہ نے آنکھیں کھول کر اپنے اوپر جھکے ہوئے سائے کو دیکھا۔ اگر ترانہ نے اسے پکارا نہ ہوتا تو وہ یقیناً ڈر جاتی۔

”ربیعہ!“ ترانہ پھر بولی تھی۔ ”میں اوپر چھت پر ہوں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھ کر آجاؤ۔ کسی کو پتا نہ چلے۔“
ترانہ بات مکمل کر کے آہستہ سے پیچھے ہٹی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی باہر کے اندھیرے میں مدھم مدھم ہو گئی۔
ربیعہ کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ چارپائی اس کی غیر متوقع حرکت پہ جھنجھلا کر اڑی تھی۔ ربیعہ کا دل سہما پھڑپھڑا آہستہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

کچھ دیر کھڑی وہ مینا بیگم اور صولت کی سانسوں سے ان کی گہری نیند کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے قدم باہر کی جانب بڑھا دیئے تھے۔

چھت پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا میں قدرے خنکی کا احساس، ربیعہ کو نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے ٹھنڈ محسوس ہونے لگی۔ اس نے دونوں بازو اپنے گرد لپیٹنے کی کوشش کی۔ ترانہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے ہمدردی سے ربیعہ کے شانے پر بازو پھیلا دیا اور اسے لے کر کونے میں رکھی کرسی کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے ربیعہ کو کرسی پر

بٹھایا اور خود اس کے قریب فرش پر بیٹھ کر اس کے زانو پر اپنے بازو رکھ لیے۔

”کیا بات ہے ترانہ!“ ربیعہ نقاہت سے بولی تھی۔ ”رات کے اس پہرے کوئی خاص بات ہے؟“

”ہاں۔۔۔“ ترانہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”بہت خاص، یہاں اس لیے لائی ہوں تمہیں کہ یہ بات ابھی ہمارے فرشتوں کو بھی پتا نہ چلے تو اچھا ہے۔“

ترانہ بہت مدھم آواز میں گفتگو کر رہی تھی۔ ربیعہ نے ڈر کر اندھیرے میں اسے غور سے دیکھا۔

”جلدی کہو ترانہ! مجھے۔۔۔ مجھے۔۔۔ ڈر لگ رہا ہے۔“

”بس ربیعہ! اب تمہارے سارے ڈر اور خوف ختم ہونے والے ہیں۔ ایک نئی، خوبصورت، مسکراتی ہوئی زندگی تمہارے تعاقب میں دبپاؤں چلی آرہی ہے۔“

”ترانہ!“ ربیعہ کے لب کانپے ”مجھ سے ایسے مذاق مت کر۔۔۔ پلیز۔۔۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکے اور ترانہ کے ہاتھوں پر گرسوہ تڑپ اٹھی تھی۔

”ربیعہ۔۔۔! ربیعہ! مجھے معاف کر دو، میں اپنے خاندان کے لیے بہت خود غرض ہو گئی تھی۔ میں کسی سفاک بیماری کی طرح تمہارا خون بہا کر اس گھر کے لیے عافیت مانگ رہی تھی۔ ربیعہ! بہت بڑی زیادتی کرنے جا رہی تھی میں تمہارے ساتھ۔“

”ایسا نہ کہو ترانہ!“ ربیعہ آہستگی سے بولی۔ ”میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا، کوئی شکایت نہیں کی۔ پھر تم کیوں ایسا سوچ رہی ہو؟“

”میں جانتی ہوں ربیعہ! تم کتنی صابر، شاکر، معصوم اور نیک فطرت لڑکی ہو۔ اسی لیے تو میری نیت میں بھی فتور در آیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پہ گھر اور اس گھر کے مکین اس لائق ہی نہیں ہیں کہ تمہاری جیسی بے غرض اور بے لوث لڑکی اپنی خوشیوں کی قربانی دے۔“

ربیعہ خاموش رہی۔

”مجھے معاف کر دینا ربیعہ! لیکن تم سے پوچھ بغیر ہی میں تمہارے مستقبل کے بارے میں ایک فیصلہ کر بیٹھی۔“

”ہاں۔۔۔! ترانہ قدرے شرمندگی سے بولی۔

”میں تو یہ فیصلہ کب کا قبول کر چکی ہوں ترانہ!“ ربیعہ نے گہری سانس بھری۔ ”تم اب اس بات کا ذکر کیوں کر رہی ہو؟“

ترانہ نے سر اٹھا کر محبت سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”نہیں ربیعہ! میں کسی اور فیصلے کی بات کر رہی ہوں۔“

”اور فیصلہ وہ کیا ہے؟“

”ربیعہ! کل۔۔۔ کل رات کو اسی وقت ہم لوگ خاموشی سے اس گھر سے نکلیں گے۔“ ترانہ مدھم آواز میں بولنے لگی۔ ”ہم لوگ۔۔۔ ہوٹل جائیں گے۔ وہاں عبادہارا منتظر ہو گا۔“

ربیعہ حیرت سے بت بنی اس کی بات سن رہی تھی۔

”ربیعہ! ہوٹل میں باری اور باری کے ایک دوست کے سامنے عبادہ سے تمہارا نکاح پڑھوایا جائے گا۔ پھر ایک گھنٹے بعد تم دونوں ٹرین میں بیٹھ کر کراچی چلے جاؤ گے۔ ہمیشہ کے لیے۔“

”ترانہ۔۔۔! ربیعہ بمشکل بولی پائی تھی۔ ”تم۔۔۔ تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟“

”نہیں ربیعہ! میں اب مکمل ہوش و حواس میں آچکی ہوں۔ ہاں شاید پچھلے دنوں میں پاگل ہو گئی تھی۔“ ترانہ سکون سے بولی۔

”جانتی ہو۔۔۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا کرنے جا رہی ہو؟ تم اس گھر کا ایک فرد ہو ترانہ! تمہارا ہر قدم اس کی بہتری اور بھلائی کے لیے اٹھنا چاہیے۔ اور تم۔۔۔ یہاں آگ لگا دینے والا کام کرنا چاہتی ہو؟“ ربیعہ جذباتی ہو گئی۔

ترانہ نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”ہاں ربیعہ! تم ٹھیک کہتی ہو۔ کچھ دن پہلے تک میں یہی سوچ رہی تھی کہ میرا ہر قدم، ہر عمل صرف اپنے گھر کی بہتری اور بھلائی کے لیے ہی ہونا چاہیے۔ لیکن اب میں جان چکی ہوں کہ صرف اپنے گھر کے متعلق سوچنے والے خود غرض ہوتے ہیں۔ اپنے گھر کی خوشی کے لیے کسی معصوم کی زندگی بھونک دینا سخت ترین خود غرضی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں خود غرض بن کر جینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”اور میں ایسا کچھ بھی کرنے پر تیار نہیں ہوں ترانہ!“ ربیعہ آہستگی سے بولی۔ ”مجھے تمہارا یہ فیصلہ منظور نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”ربیعہ! ربیعہ!“ ترانہ نے اسے ’جھجھوڑا‘۔ ”تم پاگل مت بنو! اس گھر میں کوئی تمہارا ایسا خیر خواہ نہیں ہے جو تمہارے اس ایثار اور خلوص کے بدلے تمہیں کبھی چاہت اور محبت کا ایک لفظ بھی خیرات میں دے دے۔ مجھ سے پوچھو۔ مجھ سے۔ میں نے اس گھر کی بنیادوں کو اپنا خون جگر دیا ہے۔ اور اگر آج میری طرف سے رتی برابر بھی کوتاہی ہو جائے تو یہ لوگ میرا خون پینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ میں اپنے خونی رشتوں کو بخوبی جانتی ہوں۔“

”جو بھی ہے ترانہ! اب یہی میرا مقدر ہے۔“ ربیعہ آنسو پی کر بولی۔ ”ان باتوں پر سوچنے اور بولنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب تو فیصلے پر عمل درآمد ہونا پڑتا ہے۔ سو ہو جائے۔ اور پھر میں تمدن بھائی سے شادی کر سکتی ہوں، لیکن عباد بھائی سے۔ کبھی نہیں۔ تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔ اور وہ۔۔۔ وہ کیسے مان گئے؟“ ربیعہ کی آواز بھرا گئی۔

”انہوں نے اپنی رضامندی تمہاری رضامندی اور خوشی سے مشروط کی ہے ربیعہ!“ ترانہ نے جیسے کسی گناہ کا اعتراف کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”اور میں قطعاً رضامند نہیں ہوں۔“

”ربیعہ! یہ وقوف مت بنو۔ تم کھائی میں گرنے جا رہی ہو۔“ ترانہ جیسے گڑگڑائی تھی۔

”یہ رستہ تم نے ہی تو چنا تھا ترانہ!“ وہ یاسیت سے بولی۔ ”اب یہ کنویں کو جائے یا کھائی کو۔ میری قسمت!“

ترانہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ اس کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔



وہ یوں روٹھے روٹھے انداز میں چلتی ہوئی فون تک آئی تھی۔ جیسے دوسری جانب وہ دیکھ ہی رہا ہو گا۔ چند لمحے اس نے ریسور کو غصے سے گھورا۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی، پھر ریسور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہوں!“ وہ بولی تھی۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب صورت حال سمجھ نہ پایا۔

”ہوں!“ اس نے اصرار کیا۔

”بھئی یہ“ ہوں“ کیا ہے؟ نہ دعانہ سلام۔ منہ میں کچھ رکھا ہے کیا؟“

”ہاں! غصہ رکھا ہے۔ منہ میں نہیں۔ داغ میں۔“ وہ منہ پھلا کر گویا ہوئی۔

”ہا ہا ہا۔“ عاشر نے خوب لطف اٹھایا تھا۔ ”بے وجہ غصہ تو خردماغی کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ ہماری

پاری سی بیگم صاحبہ خردماغ ہو گئی ہیں شاید۔“

”ایقان نے ایک ہاتھ سے ریسور سنبھالا ہوا تھا دوسرا ہاتھ اس نے لڑنے والے انداز میں کمر پر رکھا تھا۔

”اس وقت اگر تم میرے سامنے ہوتے نا!“ اس نے دانت میسے۔

”اچھا! پھر کیا کرتیں؟“ اس نے بہت ساروں انس لہجے میں سمو کر پوچھا۔

"ہاں بھئی۔۔۔ ایسے خوبصورت جملے ادھورے نہیں چھوڑا کرتے۔" وہ مسلسل اسے چھیڑنے کے موڈ میں تھا۔ ایقان کو اپنی بے بسی پر رونما ہی آگیا۔ اس کے آنسو اس کا چہرہ بھگونے لگے۔
"ہیلو۔۔۔ دیکھو تمہاری خاموشی بھی خوبصورت ہے بیگم۔! لیکن میرا بل اگر تمہاری کھٹکتی آواز سے بنے تو زیادہ اچھی بات ہے۔"

ایقان نے زور سے "سوں" کیا تھا۔ بصورتِ دیگر اسے علم ہی نہ ہوا تاکہ وہ رورہی تھی۔
"ہائیں۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ ادھو۔۔۔ دیکھو ایقان! یہ بہت بری بات ہے۔ تم مجھے اتنی دور ہونے کی سزا تو مت دو۔۔۔"
"سزا تو تم مجھے دے رہے ہو عاشق! شاید اس محبت کی جو میں تم سے کرتی ہوں۔ آخر تم مردوں کو بیوی کو یوں ستانے میں کیا لطف آتا ہے۔" وہ سسک کر بولی۔

"ہاں یار! مزہ تو خیر آتا ہے۔ لیکن آنسوؤں کا سارا لطف تو قرب میں ہے انہیں اپنے ہاتھ سے نہ صاف کر دو تو تشنگی نہیں جاتی۔ اس لیے تم ان آنسوؤں کو میرے آنے تک سنبھال کر رکھو۔ فون پر تو بس تم ہنستی ہوئی اچھی لگتی ہو۔"

"اتنے دنوں سے فون کیوں نہیں کیا تم نے؟" وہ پھٹ بڑی۔
"میں یہاں نہیں تھا یا نہ! کہنی کے کام سے تائبان گیا ہوا تھا۔"
"وہاں فون لائنز نہیں ہیں؟ کوئی گاؤں ہے؟" وہ پھری "یا میرا نمبر بھول گئے تھے تم؟" عاشق کو ہنسی آگئی۔
"ایسا کچھ نہیں تھا جانو۔ میں بڑی بہت زیادہ تھا۔ اب معاف بھی کر دو۔ ساری کال تو تم نے لڑنے میں ہی ضائع کر دی ہے۔"

"عاشق! تمہیں میرے جذبات کا بالکل خیال نہیں ہے۔" اس نے خود پر قابو پایا۔ "جس طرح کی صورتِ حال سے میں گزر رہی ہوں۔ اس میں یوں اکیلا اور پریشان رہنا کتنا مشکل اور کتنا خطرناک ہے۔ تمہیں اس بات کا بھی احساس نہیں ہے۔ ایک کمانے کے چکر میں پڑ کر تم ہر طرح کی فکروں سے بے نیاز ہو گئے ہو۔ مرد کا کام صرف اور صرف کمانا ہی تو نہیں ہے عاشق!۔"

عاشق کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ ایقان کا لفظ لفظ سچا تھا۔ وہ اپنی سچائی کہاں سے پیش کرتا۔
"تم ٹھیک کہہ رہی ہو ایقان! پھر وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ "میں واقعی اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو گیا ہوں۔ شاید تم پر بے پناہ یقین کا مظہر ہے یہ کہ میری ایقان نے سب کچھ بہت احسن طریقے سے سنبھالا ہوا ہے۔"
"ہاں۔۔۔ بس ایک اپنا دل ہی نہیں بٹھلتا۔" اس نے خفگی سے سر کو جھٹکا دیا۔

"آجھیہ بتاؤ۔۔۔ حالات کی کیا پوزیشن ہے؟ ہاشم میاں کے ارمان کب پورے ہو رہے ہیں؟"
"گلے ہفتے ارات جائے گی۔ بس اسی کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔"
"میرے بچوں کے کپڑے بہت اچھے ہونے چاہئیں۔ اور بیوی کے بھی۔"

ایقان نے گہری سانس بھرنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"اپنا خیال رکھنا۔ اور بچوں کا بھی۔ سب کو سلام کہنا۔ خدا حافظ۔"

لائن ڈس کنکٹ ہو گئی تھی۔ ایقان نے بے دلی سے ریسپورڈ رکھا۔ الفاظ جیسے اپنے معنی اور اپنا اثر کھوتے جا رہے تھے۔

نافع اور علی ڈھول کا ایک ایک سائیڈ بری طرح سے پیٹ رہے تھے اور حمزہ کھڑا الٹی ڈال رہا تھا۔ لڑکیوں کی ٹولی رستے میں ہی رک گئی تھی اور اب حیات اور عصفے سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔
"یہ۔۔۔ یہ پھاڑ دیں گے اس ڈھول کو۔" ثانیہ قدرے خفگی سے بولی۔ "بجلیوں کی طرح سے پیٹ رہے ہیں۔"

”اوسے۔ اوسے۔ اوسے۔“ حمزہ نے اس کی بات کو بغیر تکیہ قیاس کی کسی سنان لگائی۔ علی اور نافع نے بھی کاتھوا شال اپنا لیا۔ اب حمزہ قبائلیوں کا مخصوص رقص پیش کرنے لگا۔
 ”بھئی کی بد تمیزی ہے یہ۔“ ورنہ بھنا کر آگے بڑھی۔ ”ہم نے یہاں یہ سارا رینج منٹ تمہارا یہ جنگلی رقص دیکھنے کے لیے نہیں کیا ہے۔ واپس دو ہمارا ڈھول۔ ہمارا بہت اچھا موڈ ہے اس وقت۔ اسے خراب مت کرو پیز۔“

”ان سب کو درختوں سے باندھ دو۔ اور لاؤ روشن کیا جائے!“ علی نے جیب سے رومال نکال کر ماتھے پر پی کے انداز میں باندھ لیا۔

”یہ ایسے نہیں ماننے والے۔“ ماہین نے حسام کو گود سے اتار اور آگے بڑھی۔
 علی اور حمزہ بڑی ہنس کو خطرناک تیوروں سے اپنی جانب آتا دیکھ کر بدک کر بھاگے۔ نافع بیٹھا مسکراتا رہا۔ اب وہ اپنا رشتہ بخولی بچپنا تھا۔ ماہین کے لب بھی مسکرا دیے۔
 ”تم کیا سمجھتے ہو۔ بہت لحاظ کروں گی میں تمہارا؟“
 ”کرنا تو چاہیے!“ وہ شرارت سے ہنسا۔

ماحول کی خوش گواریت محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک شریر سی نظر لڑکیوں کے درمیان کھڑی عریشہ پر ڈالی تھی۔ عریشہ کے گال سن ہو گئے۔ اس کے اندر ناگواری کی بہت منہ زور لہرائھی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹنے لگی۔
 ”ایسے جناب!“ اب ماہین قدرے رسائیت سے بولی۔ ”نہیں تو ہم آپ کے جوتے چھپا دیں گے۔“ ایک قہقہہ لگا۔ نافع چچہ بہت جھل ہوا تھا۔ کان کھجا تا وہ لڑکیوں کے درمیان سے نکل بھاگا۔
 ”چلو تان سین کی شاگردوں تان لگاؤ!“ ماہین نے ڈھول سنبھالا۔ وہ ہمیشہ سے ہی اس ساز کو بجانے میں مہارت رکھتی تھی۔

اس نے ایک ہاتھ ڈھول پر مارا اور اگلے ہی پل دکھ سے چلائی۔
 ”کیا ہوا ہے؟“

لڑکیاں چونک اٹھیں۔ ڈھول کا پردہ چاک ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے سر پیٹ لیے۔



بہت دیر تک وہ فون کے پاس ہی کھڑی رہی تھی پھر اسے دھیان آیا۔ لڑکیوں کا ارادہ تو پچھلے لان میں جمع ہو کر کانے بجانے کا تھا۔ وہ بھی ائمہ کے ساتھ وہیں جا رہی تھی جب عذرا بیگم نے اسے عاشق کے فون کا بتایا۔
 فون کے پاس سے ہٹ کر وہ رافع کے کمرے سے نکل آئی۔ بے دلی اور بے دھیانی کے عالم میں اس نے پہلی بڑھی پر نجانے کس طرف سے قدم رکھا تھا کہ پیر اس کا بوجھ نہ سہا پایا۔ ایقان ایک دردناک چیخ کے ساتھ لڑھکتے ہوئے آخری سیڑھی پر آگری تھی۔

”اٹھو بیٹی۔ یہ ذرا سی بخنی پی لو۔“ شفیعہ نیات نے بہت محبت سے اسے پکارا۔

ایقان نے بولی اور بے زاری سے بخنی کا پالہ دیکھا پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں اماں! بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا ہے۔ صبح بھی بھا بھی جان نے زبردستی ایک پیالا پلا دیا تھا۔ اب تو ذرا ابھی من نہیں ہے۔“

”نہ بیٹی!“ انہوں نے اسے چکارا۔ ”ایسی باتوں میں من نہیں دیکھتے، جسم و جان کا بھلا دیکھتے ہیں۔ جتنا کھاؤ گی اتنی ہی جلدی اٹھ کر کھڑی ہو جاؤ گی اپنے پیروں پر۔ شاباش۔“

ایقان چند لمحے چھت کو گھورتی رہی۔ دیر بھر کی بے زاری اور کوفت اسے اپنے اندر بھری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی سے کلام کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ آنکھیں موند کر لیٹے رنما ہی غم غم کا علاج محسوس ہوتا تھا۔

شفیعہ حیات اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ ان کے انداز میں محبت بھرا اصرار تھا۔ ایقان کو محبت سے منہ موڑنا دنیا

کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔ وہ چار اٹھ کر بیٹھ گئی اور ان کے ہاتھ سے پیالہ لے کر گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔
 ”ایسے پھولے موٹے حادثات تو عورت کے مقدر کے ساتھ لکھ دیے گئے ہیں بیٹی! ان کو اس طرح دل پر لے لیا اچھا نہیں ہے۔“

انہوں نے موقع غنیمت جان کر اسے سمجھانا چاہا، ورنہ وہ تو پچھلے چار دن سے کسی سے دو لفظ بولنے پر آمادہ نہ تھی۔ کسی بے جان لاش کی طرح دن رات آنکھیں بند کیے لیٹی رہتی۔
 ایقان نے پیالہ لبوں سے ہٹا کر اس کو ایک نظر دیکھا۔ اس کی نظروں میں افسردگی اور عجیب سا گلہ تھا۔ شاید ان کی بات اس کے دل پر لگی تھی۔ حقیقت حیات اس کی نگاہوں کی زبان سمجھ گئی۔
 ”اٹھ اولادیں ہوتی تھیں میری چار بیٹیاں اور چار بیٹیاں۔ ان میں سے صرف چار نے زندگی پائی۔ اللہ تم چاروں کو سلامت رکھے۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہو تم لوگ لیکن جو چار نہ رہے، ان کا دکھ آج تک سینے میں سلگتا محسوس ہوتا ہے۔“ انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اس زمانے میں نہ تو پیدائشی ٹیکوں کا طریقہ بچاؤ تھا، نہ ہی دوسرے جدید علاج نکلے تھے بیماریوں کے چار بچوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دم توڑتے دیکھا ہے میں نے۔ اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجا ہے۔ بتاؤ بیٹی! ہم بھی تو جیتے ہیں بھتے ہیں کلام کرتے ہیں تم لوگوں کی خوشیوں اور تندرستی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ تم اس حادثے کوئی کا روگ بنائے بیٹھی ہو۔ بچے تمہارے ارد گرد پھر پھرا کر مایوس ہو کر کمرے سے نکل جاتے ہیں۔ کچھ ان کا خیال کرو! انہیں پیار دو، تسلی دو۔ عجیب ہونق سے پھرتے ہیں دونوں۔“
 ایقان کو ماں کی باتوں سے یک گونہ تسلی ملی۔ اس کے دل کو قرار سا آیا۔
 ”کہاں ہے ایمان؟ کس کے ساتھ ہے؟ اور مومن کیا کر رہا ہے؟“ اس نے بے چین سے ہو کر پوچھا تھا۔
 حقیقت حیات مسکرا دیں۔

”ایمان کو دورہ اپنے ساتھ لے گئی ہے اور مومن کو شہلا ساتھ لے گئی تھی، صبح جب سے وہیں ہے۔ اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی کھانا کھا کر عمر کے ساتھ ہی سو گیا ہے۔“
 ایقان کے لبوں پر بھیجی سی مسکراہٹ دور آئی۔ اس نے بخنی کا پیالہ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔
 ”کیا سوچتی ہو گی شہلا بھی اور بے چارہ ہاشم! اس قدر خوش تھا اپنی برات کے تصور سے۔ میں نے اس کے اربابوں کو مزید انتظار کی سزا سنائی۔“

”اے لو۔ اچھی کمی۔“ انہوں نے برا مان کر اسے دیکھا۔ ”بیٹی! لکھ کر کس کا زور؟ جس وقت ملنا لکھ دیا گیا ہے، اسی وقت ملیں گے۔ نہ گھڑی بھر آگے نہ گھڑی بھر پیچھے۔ تم سے بھلا کسی کو کیا شکایت ہوگی۔ تم تو خود اس وقت سب کی توجہ اور ہمدردی کے لائق ہو۔ لا حول و لا قوۃ۔ یہ کیا کچھ خرافات سوچتی رہتی ہو تم۔ ہفتہ بھر بعد برات چلی جائے گی۔ ہمارے ہاں صد شکر کہ شہد گھریوں کا فضول چکر نہیں ہوتا۔“
 وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اسی لمحے عذرا بیگم جوس کا گلاس لے کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ ایقان کے لبوں پر نہ چاہتے، نہ بھی اداس سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔
 ”بیجے، اگلی شفت تیار ہے۔“ وہ بولی۔
 حقیقت حیات بھی مسکرا دی تھیں۔

”بے چاری ایقان! منہ زہ بیگم تاسف سے شہلا کے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھتے ہوئے بولی تھیں۔“ کس تدر خوشی خوشی شادی کی تیاریوں میں حصہ لے رہی تھی اور ناگہانی حادثہ پیش آگیا۔“
 ”بس امی جی!“ انہی نے گہری سوچ کے اثر سے نکل کر سانس بھری۔ ”میرا دل تو لکھ بھر کے لیے جیسے کسی نے طبعی میں دبوچ لیا تھا۔ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اچانک ہوا کیا ہے۔ جس تاریخ کا اتنے دن سے شدت سے انتظار تھا، وہ تین روز بعد ہے لیکن اب۔۔۔“

”دل برانہ کوسہ“ منیڑہ بیگم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ”انہوں نے زیادہ دن آگے نہیں بڑھائے“ صرف ہفتہ بھر کی مہلت مانگی ہے۔ ایقان صحت یاب ہو جائے، ہنسی خوشی شادی میں شریک ہو تو ہمیں بھی خوشی ہوگی۔“ پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھیں۔

”شہلا کی زندگی میں پھر سے بہار لوٹ آئے اس کے لیے اس کی مخلصانہ کوششوں کا بہت ہاتھ ہے۔ ہمیں اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر خوشی منانے کو تو میرا دل بھی ہائی نہ بھرتا اور شہلا۔۔۔ وہ کہاں مانتی تین دن بعد نہ سہی دس دن بعد تھی۔“

انیقہ نے نظروں کا زاویہ بدلا، کراہنیں دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دی۔

”کتنی تو آپ ٹھیک ہی ہیں۔ ایقان آپ کا بہت ہاتھ ہے یہ رشتہ یوں آسانی سے طے ہو جانے میں اور ان کے بغیر تو شادی میں بالکل بھی مزہ نہ آتا۔“

”شہلا کہاں ہے؟“ منیڑہ بیگم نے متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”صبح سے کمرے سے ہی نہیں نکلی۔“

”بیٹیجی ہوں گی اداس شاعری کی کوئی کتاب کھولے۔ عجیب ہی مخلوق ہیں قسم سے۔ میری شادی اتنی قریب ہو تو میں صرف شادی کے گانوں کی کتاب پڑھوں اور اچھے اچھے گانے سلکٹ کروں، انہیں تو کوئی دل چسپی ہی نہیں ہے۔ میں نے اتنا اچھا ایشن لاکر دیا تو بولیں۔ مجھے اس کی خوشبو سے سخت الرجی ہے۔ ہندی کے ڈیزائن دکھائے تو بولیں۔ کوئی بھی ہلکا سا ڈیزائن ہو، زیادہ بیل بوٹے نہ ہوں۔ ان کا بس چلے تو سفید رنگ کا وڈنگ ڈریس پہن کر بیٹھ جائیں اپنی شادی والے دن۔ کہہ دیں گی کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل تو اس جملے کی رٹ لگائی ہوئی ہے انہوں نے۔“

انیقہ جل کر کہہ رہی تھی۔ منیڑہ بیگم مسکراہٹ لبوں پر سجائے اسے دیکھتی رہیں۔

”ہاں تو دلہنیں پہنتی ہی ہیں سفید لباس بھی۔“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”مجھے تو خود بہت پسند ہے سفید لباس۔“

”ہائیں۔“ انیقہ نے تعجب سے ان کی صورت دیکھی۔ ”کمال ہے امی۔ اچھا! آپ نے کون سے رنگ کا لباس پہنا تھا اپنی شادی میں؟“

منیڑہ بیگم دھیمے سے مسکرائیں۔

”سفید۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

انیقہ حیران ہو کر ان کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

اس نے ساتھ ساتھ لیٹے ہوئے عمار اور مومن کو دیکھا پھر مسکرا دی۔ وہ نما کر واش روم سے نکلی تھی۔ گیلے بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے وہ کھڑکی تک چلی آئی اور پردہ ہٹا کر سلائیڈنگ ڈور کھسکا دیا۔ باہر منظر خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادلوں کے سرمئی کٹڑے چل قدمی کر رہے تھے۔ کہیں چھپے ہوئے سورج کی کرنیں ان کے کناروں کو روپوشی بخیل لگا رہی تھیں۔ وہاں نامعلوم سی خوشبو تھی۔ شہلا کی خوبصورت سیاہ آنکھیں بادلوں سے پرے دیکھنے کی جستجو کر رہی تھیں۔ پاس رکھے موبائل کی بے بسی بچنے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھا کر کان سے لگایا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو۔ شہلا۔۔۔“ دوسری جانب موڈ خوشگوار تھا۔

شہلا کا سانس لمحہ بھر کے لیے اس کے سینے میں مقید ہوا پھر پھڑپھڑا کر نکلا۔ اس سے کچھ بھی نہ بولا جا سکا۔

”شہلا! ابرار بات کر رہا ہوں۔“

”یہ۔۔۔ یہ نمبر۔“ وہ ہکا بکا۔

”عمر نے بتایا تھا۔“ وہ ہلکے ہلکے انداز میں بولا۔

”لیکن۔۔۔ لیکن آپ کو اس طرح سے مجھے فون نہیں کرنا چاہیے۔“ وہ خود پر قابو پاتے ہوئے حلقی سے بولی۔
وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ ”تمہیں برا لگا؟“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔
شہلا اس غیر متوقع سوال پر جھنجھلا سی گئی۔

”بات اچھا یا برا لگنے کی نہیں ہے ابرار!۔ ہمارے بچ کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔
”شہلا! بہت سے لوگوں سے ہمارا کوئی رشتہ کوئی تعلق نہیں ہوتا پھر بھی ہم ان سے ملتے ہیں بات کرتے ہیں۔“

”مبرا ارجو تعلق بن کر ٹوٹ جائیں ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی۔“
”گنجائش نکالی جاسکتی ہے شہلا! وہ قدرے لجاجت سے بولا۔ ”مستی سنگ دل کیوں بن رہی ہو؟“
”ابرا ریلیز۔“

اندر قدم رکھتی انہیچہ ٹھک کر رہی تھی۔ دروازے کی جانب شہلا کی پشت تھی۔ انہیچہ بجلی کی سی سرعت سے ایک طرف ہو گئی۔

”شہلا! کچھ مانگ تو نہیں رہا ہوں تم سے میں صرف چند خوشگوار پل۔ جو یہ سوچے بغیر بھی شیر کیے جاسکتے ہیں کہ کون سا تعلق تھا کون سا ہے کون سا ہو سکتا ہے۔ تم اس قدر گہرائی میں اتر کر کیوں سوچنے لگتی ہو اور پھر ہمارے درمیان ایک تعلق ایسا ہے جو ٹوٹنا ناممکن ہے۔ میں اور تم ایک ڈور میں بندھے ہیں اور اس ڈور کا نام عمر ہے۔ کیا تم اس حقیقت سے انکار کر سکتی ہو؟ کیا یہ سچ نہیں کہ تم جس بچے کو دیکھ کر جیتی ہو میں اس بچے کا باپ ہوں۔“

شہلا کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک اجنبی انداز میں رواں ہوا۔

”مبرا ارجو تم۔۔۔ تم آخر کیا کرنا چاہتے ہو؟ کیا۔۔۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”شہلا! میں تو صرف تمہیں۔۔۔ نئی زندگی کی ابتدا کی مبارکباد دینا چاہتا ہوں۔“ وہ فوراً ہی بولا۔ ”تین دن بعد تم کسی خوش قسمت کے درو پور سجانے جا رہی ہو۔ میں نے سوچا تمہیں خوش کروں۔“
”تین دن بعد نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”ایک مسئلے کی وجہ سے یہ شادی ایک ہفتے کے لیے ملتوی ہو گئی ہے۔“

”چھا۔“ وہ گویا مسکرایا تھا۔ ”مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میری سانس میرے حلق میں پھنسی ہوئی ہو۔ تم نے کچھ ریلیف سادیا ہے یہ خبر سنا کر۔“

”مبرا ارجو ریلیز مجھے اس طرح ڈسٹرب مت کرو۔“ شہلا کو رونا آنے لگا۔

”اوکے۔“ وہ فوراً بولا۔ ”تم ڈسٹرب مت ہو۔ میں تمہیں بالکل بھی پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“
”خدا حافظ۔“ شہلا حتیٰ انداز میں بولی تھی۔

”عمر کا خیال رکھنا شہلا!“

”تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ قدرے تیز لہجے میں بولی۔ ”میں اس کی ماں ہوں۔“

”جانتا ہوں۔“ اس کا لہجہ مٹھاس لیے ہوئے تھا۔

شہلا پھر حلقی تھ۔

”بھر بھی۔۔۔ میں یہی کہوں گا۔۔۔ عمر کا خیال رکھنا۔ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے ٹیک کیئر۔“

رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ شہلا نے گہری سانس میں ڈوب کر موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔

ابرار کے انداز غیر متوقع تھے۔ شہلا کو کسی گڑبگ کا احساس ستانے لگا تھا۔ وہ چند لمحے پہلے جن بادلوں کو پُر شوق انداز میں دیکھ رہی تھی اب ان ہی کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ موسمیک لخت ہی بدل رہا تھا۔

باہر کھڑی انہی ایک عجیب کش کش میں گرفتار، اپنی ہی سوچوں سے جنگ کرتی، اپنے ہی واہموں کی نفی کرتی مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

موسم ابر آلود تھا۔ ریجہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ اچانک ہی ماحول میں اس قدر تبدیلی آجائے گی۔ وہی بادل جو کچھ دیر قبل خوشگوار سرمئی رنگت لیے ہوئے تھے، یکایک کالے سیاہ ہو گئے۔ کوئل، متوالی ہوانے اچانک ہی جولا بدلا اور پھیلنے کی شکل اختیار کرنے لگی۔ پانی کے موٹے موٹے قطرے اس کے اوپر اور پھر چاروں طرف گرنے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے اوپر چھت سی بنانے کی ناکام کوشش کی پھر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔

اسے احساس ہوا کہ اپنی دھن میں چلتے چلتے وہ آبادی سے بہت دور نکل آئی تھی۔ وہ تو جیسے کسی سنسان سی چراگاہ میں کھڑی تھی۔ اس کے آس پاس آگے پیچھے بھوسے کے ڈھیر بنے ہوئے تھے۔ دور کسی جنگل کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس مشکل گھڑی میں کہاں جائے، کس سے مدد مانگے؟ بارش آہستہ آہستہ شدت پکڑنے لگی۔ ہواؤں کے جھکڑ اسے دھکیلنے لگے۔ ماحول کالا سیاہ ہوتا چلا گیا۔ سارے منظر جیسے نگاہوں سے اوجھل ہونے لگے تھے۔

”کہاں جاؤں میں آخر کہاں جاؤں؟“ ریجہ کے دل نے دہائی دی۔
موسلا دھار برستا ہوا پانی اسے ہراساں کرنے لگا۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین غائب ہونے لگی۔ اس کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا۔
”میں کہاں جاؤں؟“

”ریجہ۔۔۔ ریجہ۔۔۔!“ کوئی اسے دور سے پکارنے لگا۔
ریجہ نے آواز کی شناسائی محسوس کی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ آواز کہاں سے آرہی تھی، اسے اندازہ نہ ہو سکا۔

”ریجہ۔۔۔ ریجہ! یہاں آؤ۔۔۔ یہاں۔۔۔ میرے پاس۔۔۔“ دعوت میں اصرار تھا۔
ریجہ مزید پریشان ہو گئی۔ اس کا ذہن آواز سے شناسائی محسوس کر رہا تھا لیکن وہ کس کی آواز تھی اسے پوری طرح سے اندازہ نہ ہو پایا تھا۔

”دادی۔۔۔ دادی۔۔۔!“ ریجہ نے زور سے پکارا۔ ”دادی۔۔۔ یہ آپ ہیں؟“
اس کی اپنی ہی آواز کی گونج ناکام ہو کر پلٹ آئی۔ دعوت دینے والی آواز اب غائب تھی۔
”دادی۔۔۔ دادی آپ کہاں ہیں۔۔۔؟ آپ کہاں ہیں۔۔۔؟“ وہ چلائی۔
چاروں طرف اب گھبراہٹا تھا۔ ریجہ نے محسوس کیا، بارش اب ختم غمی تھی۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں کبھی کبھار کوئی بوند ٹپک کر سناٹا توڑتی تھی۔ اس ٹپ ٹپ کی آواز میں عجیب سی تنہائی کا احساس اور خوف تھا۔ ریجہ کو شدت سے خوف محسوس ہوا۔

”ریجہ!“ کوئی اس کے بالکل قریب سے بولا۔
اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا تھا۔ اس کا حلق دھوپ میں پڑے ہوئے گھڑنے کی مانند خشک ہو رہا تھا۔ بدن میں ارتعاش تھا اور اسے سردی لگ رہی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اسی طرح لیٹی لیٹی رہی پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھی۔ اپنے سن ہوتے ہاتھوں کو آپس میں مل کر اس نے بدن کے ارتعاش اور سردی کے احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی پھر پیروں میں پڑی ہوئی چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔ وہ پانی پینا چاہتی تھی۔ آہستہ سے چارپائی سے اتر کر اس نے چادر کو اچھی طرح سے اپنے ارد گرد پھینا اور

باہر کی جانب قدم بڑھائے کرے سے باہر نکل کر وہ کچن میں جانا چاہتی تھی جب اس نے منور امین کے کمرے سے آئی ہوئی آوازیں سنیں۔

ربیعہ کو چند لمحوں تک ان گھٹی گھٹی آوازوں کا مفہوم سمجھ میں نہ آسکا پھر وہ قدرے تیزی سے ان کے کمرے کی جانب بڑھی۔ اگلے ہی پل وہ دروازے کے ایک طرف ہڑ گئی تھی۔ کمرے کا منظر ناقابل برداشت اور ناقابل یقین تھا۔

تمن نے منور امین کو گردن سے پکڑا ہوا تھا اور وہ انہیں جھٹکے دے رہا تھا۔ ربیعہ نے اپنی چیخ کو اندر ہی گھونٹنے کے لیے لبوں پر سختی سے ہاتھ رکھ لیا۔
”تمہیں وہ رقم مجھے دینی پڑے گی۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔ ورنہ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا“ جان لے لوں گا میں تمہاری۔“

تمن بہت دبی دبی لیکن نہایت درشت آواز میں بول رہا تھا پھر اس نے انہیں چھوڑ دیا۔ وہ کھانسنے اور ہانپنے لگے تھے۔ ربیعہ نے خوف زدہ نظروں سے ذرا کی ذرا اندر جھانکا۔ وہ سسم کر رہ گئی تھی۔ ساٹھ واٹ کے بلب کی زرد سی روشنی میں تمن کی دیوانے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں چڑھی ہوئی اور سرخ تھیں۔ لبوں سے گویا جھاگ سائل رہا تھا۔

”بد بخت۔۔۔ کیسے۔۔۔ نافرمان۔۔۔“ منور امین نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ ”تو کیا سمجھتا ہے میری جان لے کر تو وہ رقم پالے گا؟“ کبھی نہیں مردا۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ لے۔۔۔ لے۔۔۔ تو میری جان۔۔۔ مار دے مجھے۔۔۔ میں دیکھتا ہوں کیا لے گا تجھے۔۔۔ چڑیا کی بیٹ بھی مل جائے تو کتنا۔۔۔ ناخلف۔۔۔ خدا مجھے گا تجھ سے۔۔۔ کیرے کھائیں گے تیرا جسم۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔ کھوں کھوں کھوں۔۔۔“

”ہو نہ! تمن نے سر جھٹکا۔“ تم اپنی فکر کو بڑھے! جیسے میں جانتا نہیں تمہاری پار سالی کو۔۔۔ تمہاری قبر میں کیا کچھ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“
وہ اپنی چھڑی ڈھونڈنے لگا تھا۔

ربیعہ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور واپس جانے کے لیے مڑی۔ اس کی چیخ جس نکتے نکتے رہ گئی تھی۔ اس کے پیچھے ترانہ گھڑی تھی۔

”ترانہ۔۔۔ ترانہ۔۔۔! میں یہاں نہیں رہ سکتی۔“ وہ کانٹے ہوئے بول رہی تھی۔ اسے جیسے بخار چڑھنے کو تھا۔
ترانہ نے متاسف نظروں سے اسے دیکھا پھر اس نے اپنی شال اتار کر اسے پہنا دی۔
وہ دونوں چھت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ چار بجے کا عمل تھا۔ افق پر اب پو پھٹنے کے آثار نمایاں ہو چلے تھے۔ باد نسیم رک رک کر چل رہی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا نا ربیعہ! لیکن تم نہیں مانتیں۔“ ترانہ بولی۔ ”جانتی تھی میں۔۔۔ بہت اچھی طرح سے جانتی تھی کہ تمہارا نازک دل ان حالات کو برداشت کرنے کے لیے نہیں بنا ہے۔ مر جاؤ گی تم یہاں۔۔۔ کتنا سمجھایا میں نے تمہیں۔۔۔ لیکن تم نہیں مانتیں۔“

”پلین۔۔۔ پلین ترانہ!۔“ وہ ہلکی انداز میں بولی۔ ”میں نے اس وقت جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد میں اگر یہاں رہی تو یا تو مر جاؤں گی یا پھر پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے یہاں سے بھیج دو، کہیں دور بھیج دو۔“
ترانہ اپنے لب کاٹنے ہوئے کچھ سوچنے لگی تھی۔

”اس کی بہن کی شادی تھی۔“ پھر وہ بولی۔ ”ہو سکتا ہے وہ کراچی چلا گیا ہو پھر تو کیا کہاؤں گی میں تمہارے لیے۔۔۔ یہ لوگ زبردستی تمہارا نکاح بڑھوادیں۔ اگر۔۔۔“
ربیعہ کی نظروں میں تمن کا وحشت ناک چہرہ گھوم گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی۔ ترانہ نے اسے خود سے لپٹا لیا۔
ربیعہ سننے لگی تھی۔

”ممت روؤ ربیعہ! جب تک میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔ مت روؤ۔۔۔“ ترانہ نے اسے تھپکا۔
ربیعہ نے بچوں کی طرح سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ترانہ! وہ نہیں ہوں گے۔۔۔ میں جانتی ہوں۔۔۔ عباد بھائی مجھے مشکل میں چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“
”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ ترانہ بولی۔ ”وہ تمہارے لیے بے حد فکر مند تھا، کچھ کرنا چاہتا ہے وہ تمہارے لیے۔“
”ترانہ! تم میرے لیے جو بھی بہتر سمجھتی ہو، وہ کرو۔“ ربیعہ نے گویا بارمان کر کہا تھا۔ ”تناطے ہے کہ میں تمدن
بھائی کے ساتھ زندگی گزارنے کا اب سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں۔۔۔ میں کیا جانتی تھی ترانہ۔۔۔ کہ وہ۔۔۔ اس
قدر۔۔۔“

ربیعہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔ آنسوؤں سے اس کا گلہ رندہ گیا تھا۔ ترانہ کسی سوچ میں گم تھی پھر اس نے سر
اٹھایا۔
”تم گروہ نہیں لاہور میں ہے تو تم آج رات اس کے ساتھ چلی جاؤ گی۔ اپنا سامان اس طرح سے سیٹھا کہ کسی کو
رتی برابر بھی شک نہ ہوئے۔ خاص طور پر صولت سے محتاط رہنا۔ وہ ایک نمبر کی جاسوس ہے۔“
ربیعہ نے جلدی سے سر ہلایا تھا۔



”السلام علیکم۔“ دونوں نے ایک ساتھ کہتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔

ایقان نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا اور کسل مندی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ابھی ابھی اس کی آنکھ لگی تھی۔ اس کا
اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا پھر بھی اخلاقی تقاضے نبھانے کی خاطر وہ اٹھ بیٹھی۔
وہ دونوں اس کے سامنے پڑی کرسیوں پر آ بیٹھے تھے۔

”کیسی ہیں پھوپھو اب آپ؟“ رافع اس کے پاس پڑے ہوئے انگور کھانے لگا۔
”ٹھیک ہوں۔“ ایقان نے ایک شرمندہ شرمندہ سی نظر ہاشم پر ڈالی۔

وہ بہت ہمدردی اور اپنائیت سے مسکرا رہا تھا۔ ایقان نے آنکھوں میں بھر آنے والے پانی پر قابو پایا اور پلکیں
جھپکنے لگی۔

”بھئی پھوپھو! یہ بہانے نہیں چلنے والے۔“ ہاشم دغتا بولا۔ ”آپ نے تو گھر میں ویرانی پھیلا دی۔ انوائٹی
کھڑوائی۔ وہ کیا ہوتا ہے یا! وہ لے کر پڑ گئی ہیں۔۔۔ انھیں جی۔۔۔ دو لمبا کی پھوپھو ہیں خیر۔۔۔ کوئی ڈھول تاشے،
کوئی گانے شانے یا۔۔۔“

ایقان چند لمحوں کے لیے سب کچھ بھول بھال کر مسکرائے لگی۔
”ہاں پھوپھو! وہ کون سا گانا تھا جو آپ سلائی مشین کا ڈبہ بجا کر گایا کرتی تھیں اپنی گزیا کی شادی میں؟“ رافع ذہن
پر زور دے لگا۔

”میں لکھ لکھ بھیجوں تاشے میں۔“ ہاشم کو ٹکڑا یاد آ گیا۔

”اللہ ہو بھی۔“ ایقان کو بے حد شرم آئی۔ ”کون کون سی باتیں یاد کر رہے ہو بے وقوف۔“
”ہاں ہاں۔ کیا تھا وہ۔ میں لکھ لکھ بھیجوں بوتل میں، سیاں آؤ گے کون سے بوتل میں۔۔۔“ رافع کو پورا مصرعہ

یاد آ گیا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

”پھوپھو! یہ گانا تو ضرور سنتا ہے آپ سے۔ آخر آپ کی عزیز ازجان سہیلی کی شادی ہے۔“ ہاشم خوش دلی سے
مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

”اے رافع! رافع نے اسے چھیڑا۔۔۔“ ”تو عزیز ازجان بھتیجا بھی کہہ سکتا تھا لیکن وہ کیا کہا ہے شاعر نے۔
بات کوئی ہو تیرا ذکر چھیڑ دیتے ہیں۔“

ہاشم کے چہرے پر لہجہ بھر کے لیے کئی رنگ بکھرے۔ ایقان اب دل چسپی اور شوق سے ان کی باتیں سنتے
ہوئے مسکرا رہی تھی۔

”ہر بات میں پھپھو کی سہیلی کا ذکر نکال لیتا ہے یہ۔“
 ”ارے یار! حکم زیاں بندی کی اس قدر طویل سزا بھگتائی ہے، اسی کا رد عمل ہے یہ۔“ ہاشم نے بات کا اثر کم کرنے کی کوشش کی۔ ”مذرا اتنا اسٹاک جمع ہے وقتاً فوقتاً نکلتا رہتا ہے۔“
 ایقان چند لمحے محبت سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے گہری سانس بھری تھی۔

”تم بھی سوچتے ہو گے ہاشم! اچھی بھلی طے شدہ تقریب میری وجہ سے۔۔۔“
 ”فوفو! یار پھپھو! اس نے فوراً ہی اس کی بات کالی۔“ آپ سمجھتی ہیں، ہم میں سے کوئی بھی ایسا سوچ سکتا ہے؟ آپ ہماری ہیں، ہم میں سے ہیں۔ غیروں کی سی بات کیوں کی آپ نے۔۔۔ ہمارے دکھ سکھ، خوشی، غم، تکلیف، راحت سب مشترک ہے یار! اور پھر خوشی کو تو ہم اپنی مٹھی میں قید کر چکے ہیں۔ اب یہ بھاگنے والی نہیں ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”اور جھٹ پٹ بھلی چنگی ہو کر ڈھول سنھالیں۔۔۔ وہ گانا ہم نے ضرور ہی سنتا ہے۔“ رافع نے مزے سے فرمائش داغی۔

”کوئی نہیں سنتا گانا دانا۔۔۔“ ایقان نے صاف انکار کیا۔ ”میں ہرگز اتنے پرانے گانے نہیں گاؤں گی۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ یہ اتنی پرانی خاتون ہیں۔“
 ہاشم اور رافع نے ایک مرتبہ پھر قہقہہ لگایا۔ اس مرتبہ ایقان بھی ان کے ساتھ شریک ہو گئی تھی۔

”تائی امی! اندر آ سکتا ہوں؟“ وہ پر شوق انداز میں اندر جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔
 زبور بات کی جانچ پڑتال کرتی ہوئی فردوس بیگم یکھت ہی بوکھلا اٹھیں۔
 ”ہائیں۔۔۔ لون۔۔۔ نافع۔۔۔ ارے آؤ بچے۔۔۔ آؤ۔۔۔ یوں غیروں کی طرح باہر کھڑے ہو کر پوچھتے ہو کہ ہمیں ہی شرم آ جاتی ہے۔“

انہوں نے بڑی بڑی جھکیوں کو ڈبے میں واپس ٹھونسنے کی کوشش کی۔ نافع خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اندر چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیک کیا ہوا ڈبہ تھا۔
 ”یہ کیا اٹھالائے؟“ انہوں نے چشمے کی کمانی سنھالتے ہوئے اس کا ہاتھ میں تھاما ہوا ڈبہ بغور دیکھا۔
 نافع نے قدرے جھینپتے ہوئے ڈبہ دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا۔

”آپ کیا کر رہی ہیں تائی امی! اس نے بات بدلنے کی کوشش کی جو کامیاب ہوئی۔
 ”ارے بچے! کیا لوں تم سے۔۔۔ دس ہزار جھنجھٹ چنے ہوئے ہیں جان کو۔ میری لڑکیاں تو کسی کام کی نہیں ہیں۔ اب یہی دیکھو۔۔۔ کچھ پرانا زور بھی بری میں رکھنے کا سوچ رہے تھے اسی کا مینا اور کلینے دیکھ رہی تھی۔ ساہن بجاری تو جوڑے ٹانگ رہی ہے۔ عریشہ کو اپنی انڈی ڈھٹائی سے فرصت نہیں۔ بہتیرا اکھا لڑکی سے کہ میری نظراب کام نہیں کرتی۔ ذرا ان جھکیوں اور گلوبند کے کلینے چیک کر لے۔ مجال ہے جو یہ نے کسی کی بات۔“
 وہ قدرے غصے اور جھنجھلاہٹ کا شکار تھیں۔ سو انہوں نے نافع کے سامنے بھی عریشہ کی پردے داری کی ضرورت محسوس نہ کی۔

”لایئے مجھے دیں۔ میں چیک کرتا ہوں۔“ اس نے مخلصانہ پیش کش کی۔
 ”اچھا۔۔۔ تم کر لو گے۔ ہاں کر تو سکتے ہو؟“ انہوں نے پھر ڈبہ کھولا۔ ”اے۔۔۔ لے۔۔۔ یہ دیکھو۔۔۔ تین رنگوں کے کلینے ہیں ان جھکیوں میں۔ ذرا دیکھو تو پورے ہیں۔“
 نافع جھکیوں کو بغور دیکھنے لگا۔

نہیں تائی امی!۔۔۔ پھر وہ بولا۔ ”نبی خانے خالی پڑے ہیں۔ نئے کلینے لگوانے ہوں گے۔“
 ”اچھا!۔۔۔ انہوں نے سوچا پھر تم ہی یہ سیٹ سارے کے حوالے کر آؤ۔ اس سے کہنا کل پرسوں تک تیار

کردے۔ پاش وغیرہ بھی کر دے۔“ وہ جھکیاں اور گلوبند ڈبے میں رکھنے لگیں۔
”تائی امی! میں ذرا عریضہ سے مل لوں۔“

”ہیں۔۔۔؟“ وہ بری طرح جو نکلیں۔ ”عریضہ!“

”تائی امی! آج اس کی سالگرہ ہے نا۔۔۔ میں صرف خوش کرنا چاہ رہا تھا۔ اور۔۔۔ اور یہ گفت بھی دینا تھا۔“ نافع نے صاف گوئی اختیار کی اور منہ پر نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

فردوس بیگم کافی جزیبہ نویس، لیکن اسے منع کرنے کا حوصلہ نہ کر سکیں۔

”اچھا!“ پھر وہ نیم دلی سے گویا ہوئیں۔ ”دے آؤ اسے۔ اپنے کمرے میں ہوگی۔“

”جلدی آجاؤ۔۔۔ میں یہیں بیٹھی ہوں۔“ پیچھے سے انہوں نے جتا دیا تھا۔

”جی جی۔۔۔ میں بس ابھی آیا۔“ وہ مڑے بغیر بولا تھا۔

اس کے کمرے کا دروازہ بجا کر اس نے کچھ دیر انتظار کیا تھا۔ پھر اس نے ہکا سادہ آؤ والا تودہ واڑہ کھلتا چلا گیا۔ نیم اندھیرے کمرے میں عریضہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے کانوں پر سی ڈی پلیئر کا ہیڈ فون تھا۔ شاید اسی لیے وہ دستک کی آواز نہ سن سکی تھی۔

نافع چند قدم آگے بڑھا تو عریضہ نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے کھڑے ہوئے نافع کو دیکھ کر وہ چند لمحے کچھ نہ سمجھ پائی تھی۔ پھر اچانک ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے قدرے غصے سے ہیڈ فون کانوں پر سے کھینچا تھا۔

”تم۔۔۔ یہاں!“ اس کے انداز جارحانہ تھے۔

نافع بے چارہ سٹپٹا کر رہ گیا۔

”وہ۔۔۔ عریضہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں تمہیں یہ دینے آیا تھا۔“ اس نے جلدی سے وہ گفت باکس اس کے سامنے رکھ دیا۔
”یہ لیا ہے؟“ اس کے ابو ہنوز چڑھے ہوئے تھے۔

”یہ۔۔۔ یہ تمہارے لیے گفت ہے۔“ وہ جیسے شرمندگی سے بولا تھا۔
”گفت۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔ آج تمہاری سالگرہ ہے۔ اس لیے۔۔۔ نافع کے انداز ایسے تھے جیسے اس سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔“

عریضہ نے نظروں کا زواویہ بدل لیا۔ گویا اسے جانے کا اذن دیا ہو۔

”اچھا۔۔۔ پھر۔۔۔ میں چلوں!“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

جواباً خاموشی چھائی رہی۔ نافع بے چارگی سے دروازے کی سمت ہولیا۔ پھر وہ جیسے ہی باہر نکلا، اچھل ہی پڑا تھا۔ فردوس بیگم بالکل دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھیں۔ وہ نافع کو دیکھ کر سٹپٹا کر پرے ہوئیں گویا انہیں اس کے اس قدر جلد بردہ ہونے کی قطعاً توقع نہ تھی۔

”ارے۔۔۔!“ وہ خجالت سے نہیں۔ ”میں بس۔۔۔ تمہیں بلانے ہی آرہی تھی۔“

نافع نے حیران نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پھر جارہے ہو سنار کے پاس۔!“ وہ شرمندگی مٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔

”جی۔۔۔!“ اس نے سر ہلایا۔

”ہیلو۔۔۔ پھو جان۔!“ دروازے میں سے رافع نے سر نکالا تھا۔

بچوں کے کپڑے دیکھتی ہوئی ایقان چونک اٹھی۔

”رافع! آجاؤ نا۔۔۔“

”میں اکیلا نہیں آسکتا پھو۔! میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”کوئی اور۔۔۔!“ ایقان کو الجھن ہوئی۔ ”کیا مطلب ہے؟“

”یعنی میرا ایک دوست۔ آپ کی عیادت کے لیے۔ اُس اندر۔!“
 ”ہائیں۔“ وہ اپنا دوپٹہ ڈھونڈنے لگی، جو ہمیشہ کی طرح اتار کر سائیڈ پر رکھا ہوا تھا۔
 ساتھ ہی اسے حد درجہ الجھن اور کوفت ہوئی۔ بھلا رافع کے کسی دوست کا اس کی عیادت کے لیے آنے کا کیا جواز تھا؟ اور پھر جس طرح کے حادثے کا وہ شکار ہوئی تھی ایسے میں کسی غیر مرمی عیادت ایک ذہنی بوجھ کی مانند تھی۔

”آجائے۔“ رافع آنے والے کو اندر آنے کی اجازت دے۔
 ایقان کو ہنوز دوپٹہ نہ ملا تھا۔ وہ گھبراہٹ میں رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی اور جی ہی جی میں رافع کو صلواتیں سناتے لگی۔ اس نے پکارا وہ کر لیا تھا کہ نووارد کے جانے کے بعد وہ اس کی اچھی طرح سے خبر لے لی۔
 کافی دیر گزرنے کے بعد جب اسے اپنے پیچھے کسی قسم کی آہٹ یا آواز سنائی نہ دی تو وہ رافع کی شرارت سمجھتے ہوئے جھنجھلا کر مڑی تھی۔ پھر اگلے ہی بل وہ جیسے پتھری ہوئی۔
 سامنے مسکراتا ہوا عاشکرہ تھا۔

”عاشکرہ! ایقان کے لب کاغے۔“
 عاشکرہ ایک قدم آگے بڑھا تھا۔ ایقان جتنی قدم دوڑ کر اس کے سینے سے جا لگی۔
 ”عاشکرہ! سارے بند ایک ساتھ ہی ٹوٹے تھے۔ ایقان پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔“
 ”بس جانو! وہ اسے تھکنے لگا۔“
 ایقان کا بس نہ چلتا تھا وہ ساری کی ساری آنسوؤں میں بہہ جاتی۔ جانے کہاں کہاں سے کون کون سے گلے، شکوے، شکایتیں، دکھ، تکلیفیں۔۔۔ آنسوؤں کی زبان میں نکلتے چلے آ رہے تھے۔
 ”بس ایقان! بس کر دیا۔ میں بہہ جاؤں گا۔“

ایقان نے سراٹھایا۔
 ”شرقی آنکھوں کو بخشی کر کے مزید ظلم نہ ڈھاؤ۔“ وہ مسکرایا۔
 ”بہت برے ہو تم!“ اس نے ایک مکا اس کے سینے پر مارا تھا۔ ”تمہیں بس باتیں بتانا ہی آتا ہے۔“
 ”غلط فہمی ہے تمہاری۔“ وہ شوخی سے بولا۔
 ”ہٹو پر۔“ ایقان نے اسے دھکیلا اور اس کے پیچھے رافع کو تلاشتے لگی۔
 ”تم نے اپنے آنے کی اطلاع کیوں نہیں دی؟“
 ”اطلاع ہم سے اچھی ہے کیا؟“ اس نے اطمینان سے بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے ایک پرسکون سانس کھینچی۔
 ”میرا ہارٹ فیل ہو جانا پھر۔“ وہ بکڑی۔
 ”ہارٹ تمہارا پیاس ہوتا تو یقیناً انتہائی کمزور ہوتا۔ وہ تو خیر سے میرے پاس ہے۔“ وہ آنکھوں کو دباتے ہوئے بولا۔ یقیناً وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔

ایقان اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔
 ”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔
 ”حزرا انیس قریب پارک لے گیا ہے۔ بس آتے ہی ہوں گے۔“ وہ محویت سے اسے دیکھ رہی تھی۔
 ”تم کیسی ہو؟“ اس نے دفعتاً اس کا ہاتھ تھاما طبیعت ٹھیک ہے اب؟“ ایقان نے نظریں جھکائیں اور ہونٹ کاٹنے لگی۔

”ببولو۔ ببولو ایقان!“
 ”بس عاشکرہ! کچھ مت پوچھو۔!“ وہ لرزتی آواز میں بولی تھی۔ ”ورنہ مجھے پھر سے رونا آجائے گا۔“
 ”ہم شام کو اپنے گھر چلیں گے۔“ وہ قدرے اداسی سے بولا۔ ”ٹھیک ہے نا؟“

ایقان نے اثبات میں سر ہلایا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک دے کر حقیقہ حیات اور عذرا یتیم اندر چلی آئی تھیں۔ دونوں کے چہروں پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ عاشر اچھ کر ان دونوں سے ملنے لگا۔

ایقان یکدم ہی بہت ہلکی پھلکی اور خوش باش ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی چمک آگئی تھی جو پہلی نظر میں ہی محسوس ہوتی ہے۔

وہ خالی خالی نظروں سے پورے گھر کو دیکھتی پھر رہی تھی۔ ایک مرتبہ پھر دیس نکال لیا رہا تھا۔ ظلم و ستم نے ایک بار پھر ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔

ربیعہ نے در حقیقت اس گھر کو اپنا گھر سمجھنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بچپن سے جوانی تک خونی رشتوں کی منک سے اپنے پیاروں کے لمس سے محروم رہی تھی۔ سو اس نے ان کو بھی اپنا سمجھنے کی غلطی کی تھی جو اس کے اپنے نہ تھے۔ نہایت اس کے حصے میں صرف خلش اور دکھ ہی آئے تھے۔

ترانہ اسے آفس جانے سے پہلے ایک مرتبہ پھر تلقین کر گئی تھی کہ وہ اپنا سامان وغیرہ خاموشی سے اپنے سوٹ کیس میں رکھتی رہے۔ اس طرح کہ مینا یتیم یا صولت کو رتی برابر شک نہ ہونے پائے۔ ترانہ آج بینک سے اس کی رقم اور زیور وغیرہ بھی نکلا کر لانے کا کہہ گئی تھی۔ اس نے ربیعہ کو آج عبادت سے منسلک کرنے کا پورا پروگرام بنا رکھا تھا۔ ربیعہ کی اپنی ذہنی کیفیت یہ تھی کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کا ارادہ تو کر چکی تھی، لیکن اب اس کا ذہن بالکل خالی ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، کیوں جانا ہے، وہ کہیں اور جا کر آخر کیا کرے گی۔

اسی کیفیت میں قطعاً غائب و ماغی سے چلتے ہوئے وہ منور امین کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ بستر پر بڑے اونگھ رہے تھے۔ اس کی آہستہ آہستہ کمرے سے ہو گئے۔

ربیعہ اپنے سر کی چوٹ اور اس کے بعد ہونے والی کمزوری کی بناء پر کچھ دن سے ان کے کمرے کی صفائی وغیرہ نہ کر سکی تھی۔ اس وقت ان کا بستر ان کا لباس اور کمرے کی ہر شے بہ زبان خود ربیعہ کی غیر حاضری کی کمانی سنار ہی تھی۔

ربیعہ ان کے بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ منور امین نے قدرے نفرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”تمہارا دماغ تو ابھی سے بہت خراب ہو گیا ہے لڑکی!“ وہ چھنکارے۔

ربیعہ چونکی اور نہ سمجھتے ہوئے انہیں دیکھنے لگی۔

”جی۔۔۔؟“ وہ بولی۔

”تم نے ابھی سے خود کو مالکن کے روپ میں دیکھنا شروع کر دیا۔ ہنس۔ تم کیا سمجھتی ہو۔ تمدن تمہارے سر پر

کوئی تاج سجانے والا ہے؟“

ربیعہ کی کچھ سمجھ میں نہ آ سکا۔ وہ خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

”اس کمرے پر تم نے چند دن صفائی کر کے جو احسان کیا تھا۔ اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں میں۔

شاید تم سمجھتی تھیں کہ میں تمہیں اس رقم کے متعلق کچھ بتا دوں گا۔ ہے نا!“

ربیعہ کو اب ان کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔

”پچھ جانا۔۔۔ ایہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! وہ اداسی سے بولی۔ ”میں بھلا ایسا کیوں سوچوں گی۔ آپ کی کسی بھی

رقم سے میرا کیا واسطہ۔ میں تو صرف آپ کی محبت اور توجہ چاہتی تھی۔“

”ہا ہا۔۔۔ محبت۔۔۔ توجہ۔۔۔ ہا ہا۔۔۔“ وہ ہمیشہ کی طرح دیوانگی سے ہنسے۔ ”لڑکی! تم تو بہت زیادہ چالاک ہو۔ شاید

تمہاری ماں بھی اتنی چالاک نہ ہو۔ ہا ہا۔۔۔ محبت۔۔۔ تمدن سے شادی بھی تم محبت کے لیے ہی کر رہی ہو؟ ہے نا؟

ہا ہا۔۔۔“

ربیعہ کے لب کاپنے اس کی پلوس پر ایک فطرہ بھلائے لگا۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔
 ”تم انہما درجے کا بے وقوف انسان ہے۔“ پھر وہ نفرت سے منہ بگاڑتے ہوئے بولے۔ ”اس کی ذہنیت اس قدر گری ہوئی ہے۔ اس سے مجھے یہی امید ہونا چاہیے تھی۔ تمہارا انتخاب کر کے اس نے مجھے حیران نہیں کیا۔“

اب کی بار ربیعہ نے سراٹھایا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں اس ظالم شخص کے لیے لمحہ بھر کے لیے شکایت چمکی، پھر اس نے دوبارہ سر جھکا لیا تھا۔

”تم بھی۔“ تم بھی اپنی ماں والی روایت دہراؤ گی۔ دیکھ لیتا۔ بھاگ جاؤ گی ایک دن کسی کے ساتھ۔“
 ربیعہ کے سر پر انہوں نے آسمان لا کر آیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔
 ”میری ماں! اس کے لب کاپنے۔“

”ہاں ہاں تمہاری ماں!“ وہ نفرت سے پھنکارے۔ ”دو کوڑی کی عورت۔ جسے تمہارا باپ کہیں سے اٹھالایا تھا۔“ ربیعہ کو چکر آنے لگے۔ اس نے اپنا سر تھام لیا۔

”مسلمان نہیں تھی وہ۔ اور اسے مسلمان کیے بغیر ہی تمہارے باپ نے اس سے شادی کر لی تھی۔“

اسی گناہ کی پیداوار ہو تم۔؟

ربیعہ کو یوں لگا جیسے ابھی اسے الٹی ہو جائے گی اور اس کی آنتیں منہ کے رستے باہر آجائیں گی۔

”پچھ چھا جان!“ وہ بمشکل بولی تھی۔ ”خدا کے لیے۔ خاموش ہو جائیں۔“

”ارے سنتی کیوں نہیں ہو اب۔ جو بچ ہے وہ سننے کی ہمت پیدا کرو خود میں۔ بھاگ کر آئی تھی کہیں سے اور تمہیں پیدا کر کے پھر بھاگ گئی کسی کے ساتھ۔ آخ تھو۔“

ربیعہ کے لیے اس وقت بلنا بھی محال تھا۔ پھر بھی وہ بہت ہمت کر کے اٹھی اور مرہہ قدموں کو تھیشتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔

دوسرے کمرے میں آکر وہ منہ کے بل چار پائی پر اوندھی گری اور سسکیاں بھرنے لگی۔ آج اس کے کانوں نے اس کی پوری زندگی کی بدترین بات سنی تھی؟ ہمیشہ ہی سے وہ اپنے ماں باپ کے متعلق جاننے کے لیے بہت پر شوق رہا کرتی تھی۔ دادی سے کرید کرید کر باتیں پوچھا کرتی تھی۔ جہاں کہیں ان کے لبوں سے کچھ نکلتا۔ ربیعہ کے کان کھڑے ہو جایا کرتے۔ لیکن آج جیسے کسی نے دو دھاری تلوار سے اس کا کلیجہ چیر ڈالا تھا۔ ربیعہ سخت ترین اذیت کا شکار تھی۔ تڑپ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔

آج اس نے جانا تھا کہ کیوں دادی جان ہمیشہ ہی اسے کچھ بھی بتانے سے گریزاں رہا کرتی تھیں۔ ربیعہ کے ماں باپ کا ذکر ان کے لیے تکلیف دہ کیوں تھا؟ وہ اسے اس روحانی تکلیف سے بچانے کی سعی کرتی تھیں جس سے اسے منور امین نے دوچار کیا تھا۔

آج ربیعہ کو علم ہوا تھا کہ کیوں مینا بیگم اور صولت اسے اتنی حقارت بھری نظروں سے دیکھا کرتی ہیں۔ کیوں ان کے انداز میں ربیعہ کے لیے اس قدر تعزیر ہوتا ہے۔

آج جیسے اسے اپنی ہستی کے بے وقعت ہونے کا احساس ہوا تھا۔ وہ تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ اسی دوران اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس گھر سے کہیں نہیں جائے گی۔

اس کے وجود کے ساتھ جو کمائی جڑی ہوئی تھی اس نے ربیعہ کو اس قابل ہی نہ چھوڑا تھا کہ وہ اس دنیا میں سر اٹھا کر ایک باعزت زندگی گزار پاتی۔ اور جب اپنی ذات مٹا کر بھلا کر، سر جھکا کر زندگی گزارنا تھی تو اس کے لیے یہ گھر دنیا میں سب سے موزوں تھا۔

آنکھیں موندے وہ گویا جنت کے کسی باغ میں لیٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے بالوں میں دھیرے دھیرے چلتی

”کیوں نہ ہر محور کن احساس پوری شدت سے ہو رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی آنکھیں نہ کھولے
 ”ایقان۔۔۔!“ عاشر نے محبت سے اسے پکارا۔

ایقان نے آنکھیں کھول کر عاشر کو دیکھا اور مسکرا دی۔
 ”کیا سوچ رہی ہو۔۔۔ میں تو سمجھا تم سوئیں۔“

”تجائے کون سی۔۔۔ ات میں ہوں عاشر۔۔۔! نہ یہ نیند ہے، نیند بیداری ہے۔ نہ خواب ہے نہ حقیقت، نہ کوئی سوچ
 نہ۔۔۔ اس۔۔۔ بس سکون ہے، اتنا کرا، اتنا گھنا، اتنا خاموش سکون کہ ان چند لمحوں میں پوری زندگی بتا دینے کا
 جی چاہتا ہے۔“

عاشر۔۔۔ اُمری سانس بھری اور کچھ سوچنے لگا تھا۔ ایقان نے مخمور نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ وہ متوجہ نہ
 تھا۔

”کیا سوچنے لگے اب۔۔۔ کیسے وہ موتی نوکری تو نہیں یاد آنے لگی؟“ اس نے جل کر پوچھا تھا۔
 عاشر بے ساختہ ہی ہنس دیا۔

”کرا کر رہی ہو یا۔۔۔ اس قدر خاتون ہیں۔ میری وہ چلی، شرارتی سی ایقان کہاں ہے، جسے میں ”نکو“ کہہ کر چڑایا
 کرتا تھا۔“

”تمہاری جدائی کے غم میں کھل کھل کر ختم ہو گئی بے چاری! ایقان نے آہ بھری۔“ اب تو یہی بھاری بھر کم
 ”خاتون، نا“ پچی ہے۔ اسی سے کام چلاؤ۔“

”کام نہ ختم ہو گا، آخر عمر تک چلا میں گے۔“ وہ مزے سے بولا۔ ”لیکن کام میں دل تو لگے۔“
 ”کیا مطلب؟“ وہ ملزی۔ ”تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“

”میں یہ کہنا چاہتا ہوں جانو۔! کہ ”موتی نوکری“ اور ”موتی چھو کری“ سے اپنے بندے کا دھیان چھڑانا ہو تو
 خاتون کو کافی جتن کرنے پڑتے ہیں۔ تم جانتی ہو تمہارا بندہ کس قدر حسن پرست واقع ہوا ہے۔ کیسے ایسا نہ ہو۔“

وہ نے چڑانے کے موڈ میں لگتا تھا۔ ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی اور کڑے توروں سے اسے گھورنے لگی۔
 ”اب یہی، کچھ لوسے۔“ وہ فوراً بولا۔ ”شادی سے پہلے تم نے کبھی مجھے اتنی بری شکل بنا کر نہیں گھورا۔ اور

اب تمہیں پروا ہی نہیں ہے کہ ایسے گھورتے ہوئے تم جتنی بری لگتی ہو۔“
 ”میں اب تمہیں بری بھی لگنے لگی ہوں۔“ وہ رونی صورت بنا کر بولی تھی۔

”میں تو صرف گھورتے وقت کی بات کر رہا ہوں۔“ وہ چکارنے والے انداز میں بولا۔
 ”تم کچھ بدل گئے ہو عاشر! وہ مشکوک ہوئی۔ ”پہلے تو میں تمہیں کسی صورت بری نہیں لگتی تھی۔“

”ارے جانم! وہ ہنس پڑا۔ ”مذاق بھی نہیں سمجھتیں تم۔! مجھے تمہاری لگتیں تو یوں کھنچا چلا آتا۔ میرے لیے تو
 تم مقناطیس ہو۔ اور میں انھیں لوہے کا ٹکڑا۔“

ایقان چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی، پھر یقین سے مسکرا دی۔

”آداب عرض!“ وہ اپنے مخصوص، مطمئن و شاداب انداز میں بولا تھا۔ ”مزاج بخیر ہیں!“ شہلا دھیمے سے
 مسکرا دی۔ فوراً اتفاق سے اسی نے اٹھایا تھا۔

”جی!“ وہ آہستہ سے بولی ”انڈا کا شکر ہے۔ آپ سنا ئے۔ خیریت سے ہیں!“
 ”بس جناب۔۔۔ گفنے پر لگے ہوئے ہیں۔۔۔ دن ہوں کہ پل ہو۔۔۔ کزرتا مشکل!“ شہلا چند لمحوں کے لیے
 خاموش ہو گئی۔

”ایقان کیسی ہے اب!“ اسے خیال آیا۔
 ”فرسٹ کلاس۔ اپنے میاں جی کے ساتھ ہنسی مسکراتی پھر رہی تھیں، یہاں سے وہاں۔“ وہ بشاش انداز میں

بولا۔

”عاشق صاحب آگئے ہیں!“ شملہ نے حیرت سے پوچھا۔
”جی ہاں۔۔۔ پچھو کے بارے میں سنا تو فوری چھٹی کی درخواست منظور کروا کر دو ماہ کے لیے آئے ہیں۔“ ہاشم نے اسے اطلاع دی۔

”چلیں یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ایقان تو بہت خوش ہوگی۔“
”کیا خبر؟“ اس نے کمری سانس بھری۔ ”آپ زیادہ بہتر تھا سکتی ہیں۔ سیاس جی کی آمد پر کیا تاثرات ہو سکتے ہیں؟“
شملہ کے لبوں پر ایک خوشگوار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”اب آپ بتائیں مت۔!“ وہ دھیمے سے بولی۔ ”ان باتوں کا تو اچھا بھلا تجربہ ہے آپ کو۔“
”آپ کو اگر اندازہ ہے تو میرے لیے تو یہ احساس بھی بہت ہے۔ کم از کم ہر نے متعلق کچھ سوچتی تو ہیں آپ۔“ ہاشم نے شخ ہونے کی جسارت کی۔ ”ورنہ یہ بے چارہ دل تو عجب خدشات کا شکار رہتا ہے۔“
شملہ کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔

”خدشات۔!“ وہ کچھ سوچ کر بولی تھی۔ ”کیسے خدشات۔!“

”جانے دیجئے!“ وہ مسکرایا۔ ”آپ برانہ مان جائیں۔“

”نہیں نہیں۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ کہہ دیجئے جو بھی آپ کے دل میں ہے۔ ہاشم صاحب! میں بعد کی بدگمانیوں سے پہلے کی وضاحتیں زیادہ بہتر سمجھتی ہوں۔“

”ارے۔۔۔“ وہ کھل کر ہنس دیا۔ ”آپ تو اس قدر گھبرا گئیں۔ چلیے یہ بھی اچھا لگا مجھے۔ یعنی ناچیز کی آپ کے نزدیک اتنی اہمیت تو ہے نا۔ ویسے میں تو صرف اس خدشے کا اظہار کر رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری پییم خواہش وصال نے آپ کو اکتاہٹ کا شکار کر ڈالا ہو، میری لبوں پر بارفون کرنا۔۔۔ ناگوار تو نہیں گزرتا آپ کو؟“
”یا اللہ!“ شملہ چکر اُگئی۔ ”کتنی مشکل باتیں کرتے ہیں ہاشم آپ؟“
ہاشم نے ایک قہقہہ لگایا۔

”بعد میں بتائیں گے آپ کو ایسی باتوں کا مطلب۔ ایک شاعر خیر سے یار غار ہے۔“

شملہ کے لیے تو ”بعد میں“ ہی کافی تھا۔ وہ جھینپ گئی۔

”اچھا۔۔۔ تو پھر۔۔۔ خدا حافظ۔؟“ اس نے اجازت چاہی۔

”ہمارا“ آپ کا۔۔۔ سب کا!“ اس نے گویا اس کی بات سمجھ لی۔

سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ شملہ رینیور آہستگی سے کریڈل پر ڈالتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

بے حد کوفت اور بددلی سے وہ سامنے بڑے ہوئے لاکٹ سیٹ کو دیکھ رہی تھی۔ عام سا، نقلی نگینوں کا لاکٹ اور ساتھ چھوٹے چھوٹے سے بندے۔ اس گفٹ باکس میں سے بس یہی کچھ برآمد ہوا تھا۔ عریضہ کا کوفت سے برا حال تھا۔ اسے ناف پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔

”حد درجہ احمق اوس۔ اوس بدذوق شخص کو میرے سر تھوپ دیا ہے سب نے مل کر۔“ وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچنے لگی۔ ”یہ ذوق جس بندے کا ہو گیا دے پائے گا ساری زندگی وہ مجھے۔۔۔ اسے تو ڈھنگ سے دو لفظ بولنا نہیں آتے۔ نہ کوئی شخصیت، نہ کوئی ہنر نہ فن۔۔۔ ہونسن۔ کسی کو تحفہ دینے کا سلیقہ نہیں ہے۔ یہ نقلی نگینوں کا لاکٹ۔ میری جوتی پہنے گی اسے۔“

اس نے جھنجھلا کر وہ لاکٹ اور بندے واپس باکس میں ٹھونے اور اسے ایک طرف ڈال دیا۔

”ربیعہ!“ ترانہ نے پریشانی سے اسے پکارا۔

ربیعہ چھت پر کھڑی دور سے آتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔ مڑ کر ترانہ کو دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں کوئی ایسی بات تھی کہ ترانہ بے حد پریشان ہو گئی۔

”ربیعہ! میں تم سے کیا کہہ کر گئی تھی۔ تم نے تو۔۔۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ اب تک۔۔۔ تمہارا سلمان پونہی رکھا ہے اور تم خود۔۔۔؟“ اس نے ربیعہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”تم نے کپڑے تنگ تبدیل نہیں کیے۔ ربیعہ! میں۔۔۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آہستہ آواز میں بولی۔

دیکھ کر آواز کم کی۔ ”میں عباد سے بات کر کے آرہی ہوں۔۔۔ وہ بیٹیں سے۔۔۔ لاہور میں۔۔۔ ہماری خوش قسمتی سے اس کی بہن کی شادی چند دنوں کے لیے ملتوی ہو گئی تھی۔ عباد آج رات کی گاڑی سے کراچی جا رہا ہے۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ میں ربیعہ کو ساتھ لے کر آؤں گی۔“

”میں کہیں نہیں جا رہی ہوں ترانہ!۔۔۔“ وہ گھر کے دکھ کی کیفیت میں بولی۔ ”میں اب یہیں رہوں گی۔ جب تک خدا نے میری زندگی لکھ دی ہے۔ میں۔۔۔ میں اپنے گناہوں کی سزا سمجھ کر اسے یہیں گزاروں گی۔“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔۔۔؟“ ترانہ نے پریشان ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔ ”ربیعہ! تمہیں بار بار کیا ہو جاتا ہے۔ تمہارے رویے میں یہ تبدیلی کیوں آ جاتی ہے؟“

ربیعہ نے آنسوؤں سے بھری نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

”ترانہ! میں اپنے ماں باپ کے گناہوں کا جینا جانتا ثبوت بن کر کہاں جاسکتی ہوں بھلا؟ کسی نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تم کون ہو؟ کس سے ہو؟ کہاں سے آئی ہو؟ کیا جواب دوں گی ترانہ میں۔۔۔“

ترانہ چند لمحے دکھ سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

”تم ہر سوال کا جواب خود ہو ربیعہ! اُم ایسی لڑکی ہو جو خود کسی کا قابلِ فخر حوالہ بن سکتی ہے۔۔۔“

حوالے کی ضرورت نہیں ہے۔ ربیعہ! خود کو پہچانو۔۔۔ خود کو عزت دو۔۔۔ تم اپنی پہچان آپ ہو۔۔۔“

”ترانہ! مجھے بھلانے کی کوشش مت کرو۔۔۔!“ ربیعہ نے منہ پھیر لیا۔ ”میں اگر یہاں سے گئی تو سب یہی کہیں گے کہ اپنی ماں کی طرح۔۔۔ میں بھی۔۔۔ کسی کے ساتھ۔۔۔!“

اس کا گلارہ بندھ گیا۔ اس سے آگے بولنا نہ جاسکا۔

”ربیعہ!۔۔۔“ ترانہ نے اس کا بازو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لے کر زور سے دبا دیا۔ ”لوگوں کے کہنے کی پروا کر کے اپنی زندگی خراب کرنے کے تصور سے نفرت ہے مجھے۔۔۔ میں تمہیں کبھی ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ میں تمہیں زندگی خراب کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”ترانہ!۔۔۔“ اس نے بولنے کی کوشش کی۔

”بس ربیعہ! ایک نہیں سنو کی تمہاری۔۔۔ کل تک تم مجھے سمجھاتی تھیں، آج میں تمہیں سمجھا رہی ہوں۔۔۔ کل تم اپنی مرضی سے یہاں سے جانا چاہتی تھیں تو میں نے تمہیں بہن کہہ کر روکا تھا۔۔۔ آج تم رکتا چاہ رہی ہو تو میں تمہیں ہر صورت یہاں سے بھیجوں گی۔۔۔ کیونکہ تم مجھے ایک بہن کی طرح عزیز ہو اور میں اپنی بہن کو اپنی زندگی تباہ کرنے سے ضرور روکوں گی۔“

ترانہ کے انداز میں حد درجہ حتمی پن تھا۔ ربیعہ اس کی صورت دیکھتی رہ گئی۔

”میں تمہارا سوٹ کیس اماں کے گھر رکھ کر آرہی ہوں ربیعہ!۔۔۔“ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”تم اس میں سے ابھی بدلنے کے لیے کپڑے نکال لو اور ہاتھ روم میں چلی جاؤ۔۔۔ میں موقع پاتے ہی تمہارا سوٹ کیس وہاں چھوڑ آؤں گی۔ اور ٹھیک اٹھ بجے ہم دونوں گھر سے نکلیں گے۔ سمجھیں تم۔۔۔!“

”ترانہ!۔۔۔“ ربیعہ بے ساختہ اس سے لپٹ گئی۔ ”مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”مجھے سب سمجھ میں آ رہا ہے ربیعہ!۔۔۔“ ترانہ نے محبت سے اس کا سر سلایا۔ ”اور دیکھو۔۔۔ اب ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ عباد سے تمہارا نکاح کیا جاسکے۔ تمہیں کراچی جاکر۔۔۔“

”نہیں ترانہ!۔۔۔“ ربیعہ نے الگ ہو کر اسے دیکھا اور حتمی انداز میں بولی۔

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں مگر کبھی ایسا نہیں سوچ سکتی۔۔۔ میں تمہارے کہنے پر جاتا رہی ہوں لیکن وہاں جا کر میں

کسی ہو شل میں رہوں گی اور عباد بھائی سے کہہ کر کوئی نوکری وغیرہ ڈھونڈ لوں گی۔“

”ربیعہ...! ترانہ نے بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

”ہاں نہیں ترانہ۔“ اس نے سر جھکا لیا۔ ”میں... میں شاید کبھی بھی... کسی سے شادی نہیں کر پاؤں گی۔ میرے دل میں اس رشتے کے لیے برابر متنجائش نہیں ہے۔ اور... اور... شاید تقدیر کی بنا پر یہ خانہ بنا ہی نہیں ہے۔“

ترانہ نے گہری سانس بھرتے ہوئے اس کا شانہ تھپکا تھا۔

ربیعہ خالی الذہنی کے عالم میں بائبل مشینی انداز میں بیٹھی اپنے بال سلجھا رہی تھی۔ ترانہ نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ کیا۔ ربیعہ نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ آٹھ بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔

اسی وقت دروازہ کھول کر تمدن اندر داخل ہوا۔

ربیعہ بے اختیار ہی گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ترانہ نے اسے نظروں ہی نظروں میں پرسکون رہنے کے لیے کہا پھر وہ دونوں تمدن کا چہرہ دیکھنے لگیں جو کمر پر ہاتھ رکھے کسی سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ چونک کر ان کی جانب متوجہ ہوا اور ایک گہری نگاہ ربیعہ پر ڈالتے ہوئے ترانہ سے مخاطب ہوا۔

”ترانہ... اسے تیار کر دو۔“

ربیعہ اور ترانہ ایک مرتبہ پھر چونک اٹھی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”تیار کر دوں؟“ پھر ترانہ اچھے سے بولی۔ ”یہ کہاں جا رہی ہے؟“

تمدن ایسے ہنساجیسے ترانہ نے کوئی بہت پر مزاح بات کی ہو۔

”کہیں جا نہیں رہی ہمیشہ کے لیے اس گھر کی ہونے جا رہی ہے۔ میرا ایک دوست نکاح خواں اور گواہوں کو

لے کر پہنچ رہا ہے۔ اسی وقت میرا اور ربیعہ کا نکاح ہو گا۔“

اس نے پھر ایک گہری نظر ربیعہ پر ڈالی جس کا چہرہ یکدم شعلے کی زد میں آئے ہوئے پھول کی مانند کھلا گیا۔ ربیعہ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر دیوار کا سہارا لے لیا ورنہ شاید وہ گر ہی جاتی۔ ترانہ کے چہرے پر از حد فکر مندی اور آنکھوں میں بے حد گہری سوچ کے سائے ابھرے تھے وہ ایک ٹک تمدن کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”تہ تم دونوں کو سانپ کیوں سونگھ گیا؟“ تمدن قدرے غریبا۔ ”میں نے وہی کچھ کہا ہے جو طے شدہ ہے۔ کوئی نئی بات تو نہیں کہی۔“

دوسرے کمرے سے نکل کر مینا بیگم اور صولت بھی چلی آئیں۔

”کہا بات ہے تمدن؟“ مینا بیگم نے ماحول میں تاؤ سا دیکھ کر باری باری سب کو دیکھا۔

”کچھ نہیں پوچھو! آپ نے شاید ان لوگوں کو بتایا نہیں کہ صبح میں آپ سے کیا کہہ کر گیا تھا۔“ تمدن وہیں پڑی

کر سی پڑ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ہاں میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ میں چاہتی تھی انہیں یہ خوش خبری اچانک ہی دی جائے۔“

”کیا... کون سی خوش خبری... کیا ہو رہا ہے؟“ صولت لڑنے والے انداز میں پوچھنے لگی۔

شاید مینا بیگم نے صبح سے یہ خبر اس لیے پوشیدہ رکھی تھی۔ انہیں اپنی ہی بیٹی کے رد عمل کا خوف تھا۔

”کچھ نہیں صولت! تم خاموش رہو۔“ مینا بیگم نے اسے جھڑکا۔ ”بچیاں ایسے معاملات میں یوں منہ کھولتی

اچھی نہیں لگتیں۔“

”خدا کے لیے امی۔“ وہ بھنائی۔ ”اپنے یہ سو سال پرانے اصول اپنے پاس ہی سنبھال کر رکھیں۔ مجھے

بتائیں یہاں کیا ہو رہا ہے؟ مجھے لگتا ہے تمدن بھائی اکیلے ہی اپنی برات کا انتظام کر رہے ہیں۔ میرے اور تصور کے

معاہلے کی یہاں نہ کسی کو فکر ہے نہ پروا اور کیوں کسی کو پروا ہونے لگی۔ جب اپنا رنگ جم رہا۔ تو وہ سروں کی زندگی کے پھیکے پن کی فکر کیوں ہو کسی کو۔ ہم بے موت مرتے رہیں۔ انہیں ہری ہری سوچھے۔

”صولت! تم دن چنچ اٹھا۔“ بے شرم لڑکی۔ دفع ہو جا یہاں سے۔ غائب کر اپنی شکل۔ چل نکل۔“

وہ جارحانہ تیور لیے اٹھا۔ صولت سہم گئی۔ مینا بیگم کے چہرے پر بے حد ناگواری اور خفت کے تاثرات ابھرے تھے۔ انہیں تمدن کا انداز سخت نامناسب لگا۔

”پھپھو۔“ تمدن اچانک ہی ان کی جانب مڑا۔ ”آپ نے اسے بالکل لگام نہیں ڈالی۔“

”ٹھیک ہے تمدن۔ وہ تو ہے ہی سر پھری۔ لیکن تم اتنے عقل والے ہو۔ تم ہی اپنی زبان کو لگام دو۔ تمہارا اس موقع پر یوں چیخنا چلانا کیا اچھا لگ رہا ہے؟“ وہ جل کر بول اٹھیں۔ تمدن چیخ کر رہ گیا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا پھر سر کو زور سے جھٹک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟“ مینا بیگم نے رعبہ کو بری طرح سے گھورا تھا۔ ”تمہیں شرم بھی نہیں آرہی ہے۔ تمدن کے سامنے تصویر بنی کھڑی ہو۔ جاؤ جا کر کپڑے بدلو۔ میری بیٹی کی قسمت کے آگے تو تم نے کالی لکیر بنی کھینچ دی ہے جیسے۔“

رعبہ کا کمزور جسم زور سے کانپا۔ اس نے تھوک نگلا اور آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ترانہ نے جلدی سے اسے سنبھالا۔

”آپ تیار کر دو۔ مولوی آتا ہی ہو گا۔“ مینا بیگم نے بے حد تلخی سے کہا۔

ترانہ رعبہ کو ساتھ لگائے کمرے میں چلی آئی۔ رعبہ سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت اس بکرے کی سی تھی جس کی نظروں کے سامنے قصاب چھری کو دھار دے رہا ہو۔ ترانہ نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھپکا پھر کمرے میں موجود صولت کو دیکھا جو تکیے میں سر۔ دیے دھواں دھار رو رہی تھی۔

”صولت! ترانہ رسائیت سے بولی۔ ”پلینز۔ تم ذرا باہر چلی جاؤ میں رعبہ کو تیار کر دوں۔“

صولت پر اس کی گزارش کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی رفتار سے ہچکیاں مارتی رہی۔

”صولت۔“ ترانہ پھر بولی۔ ”صولت۔“

”کیا ہے؟“ وہ سر اٹھا کر دھاڑی۔ ”میں اس چڑیل کو کیا کہہ رہی ہوں؟ تم شوق سے اسے جتنا مرضی سجاؤ“

سوارو۔ میری نظر نہیں لگنے والی اسے۔“

ترانہ جبر ہوئی پھر اس نے سکتے کے عالم میں کھڑی رعبہ کو دیکھا

”مجھے رعبہ کے کپڑے تبدیل کروانے ہیں۔“ ترانہ پھر عاجزی سے گویا ہوئی۔ صولت کے سامنے اس طرح بات کرنا اس کا شیوہ نہ تھا لیکن اس وقت گدھے کو باپ بنانے والے محاورے پر عمل کر رہی تھی۔

”شوق سے کرواؤ۔“ صولت ہنست دھری کا بھرپور مظاہرہ کر رہی تھی۔

”صولت۔“ مینا بیگم کی خوشی سے لبریز آواز پر وہ تینوں ہی چونکی تھیں۔ ”تصور آگیا ہے۔“

صولت کی حالت میں ایک ایسی واضح تبدیلی نمودار ہوئی۔ اس کے چہرے پر چھائی تختی اور غم وغصے کی جگہ بڑی تیزی سے خوشی اور مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ کسی بچی کی طرح اچھلتی کودتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ ترانہ اور رعبہ ہکا بکا رہ گئیں۔

”میں سب جانتا ہوں۔“ تصور کی کاٹ دار آواز ان تک پہنچی تھی۔ ”لو کا پٹھا نہیں ہوں جیسا تم لوگوں نے

سمجھا ہے۔“

”تو لو کا پٹھا ہی ہے۔“ تمدن دھاڑا۔ ”کمینہ ہے۔“

”جو بھی سمجھ لو لیکن میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔“

”تیرا تو باپ بھی۔“ تمدن نے شاید تصور کا گریبان پکڑ لیا تھا۔

ربیعہ کی لرزش میں شدت آگئی۔ ترانہ کی سوچ بڑی تیزی سے رنگ بدلنے لگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر سرے سے باہر جھانکا پھر کمرے کا دروازہ بند کر کے چھٹی لگالی۔

”وہ دونوں بری طرح سے لڑ رہے ہیں۔“ اس نے ربیعہ کو اطلاع دی۔

ربیعہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ باہر سے تمدن اور تصویر کی گالم گلوچ اور مینا بیگم اور صولت کی چیخ و پکار کی آوازیں رہی تھیں۔

”ترانہ۔۔۔ ترانہ کچھ کرفس۔“ ربیعہ بے بسی سے بولی۔

”یہی تو وقت ہے سب کچھ کر گزرنے کا۔“ ترانہ حتیٰ انداز میں بولی۔

پھر اس نے آگے بڑھ کر الماری سے دو چادریں نکالیں۔ ایک چادر اس نے ربیعہ کی طرف اچھالی۔

”جلدی کرفس۔ اوڑھو اسے۔“ ترانہ نے جلدی جلدی دوسری چادر میں خود کو پیٹا پھر ربیعہ کو حیران کھڑا دیکھ کر تھاپیٹا۔

”ربیعہ۔۔۔ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ جلدی۔۔۔ ہری۔۔۔“

ربیعہ تکیا تے ہاتھوں سے چادر اوڑھنے لگی۔ ترانہ گلی میں کھلتی کھڑکی کی جانب بڑھی اور اس کے پیٹ کھول کر ہر جھانکنے لگی۔ گلی میں سناٹا تھا جبکہ گھر کے اندرونی حصے سے آئی آوازیں میں بے حد شدت آچکی تھی۔ ترانہ کھڑکی سے باہر اترنے میں ربیعہ کی مدد کرنے لگی۔

پہلوں کی گڑگڑاہٹ اور انجن کی چنگھاڑنے ایک مرتبہ پھر ربیعہ کے دل کو انجان و سوسوں اور خدشات کی بھیجی جھونک دیا تھا۔ وہ بے اختیار ترانہ سے لپٹ گئی۔

”ترانہ۔۔۔ ترانہ۔۔۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ ربیعہ رودی۔ ترانہ نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”تم تو بہت بہادر ہو ربیعہ! یاد ہے ایک مرتبہ تم اکیلی ہی ہم لوگوں کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی تھیں۔“

”نجانے کیوں ترانہ۔۔۔ میں اس وقت۔۔۔ اس وقت سے زیادہ خوف محسوس کر رہی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے باندھی سیاہ سرنگ میں داخل ہونے جا رہی ہوں جس کے دوسری جانب کیا ہے۔ کچھ پتا نہیں۔“

”خوصلہ رکھو ربیعہ! دوسری جانب زندگی ہے یہ میرا یقین ہے۔“

”تمہارے یقین کے سارے ہی اتنا بڑا قدم اٹھایا ہی ہوں میں۔“ وہ مایوسی سے بولی۔ ”ورنہ میرے اندر تو اب آس ہے نہ امید نہ یقین نہ خوصلہ۔ میں۔۔۔ میں خود کو بہت ٹوٹا ہوا محسوس کر رہی ہوں۔ ترانہ۔۔۔ ذرا سی تھیں بے پھر جاؤں گی۔“

”خدا نہ کرے کہ تمہیں کوئی تھیں لگے۔ میری ساری دعائیں صرف تمہارے لیے ہیں۔ تم مجھ سے باری کے بائبل پر رابطہ رکھنا۔“

”تم۔۔۔ تم اب گھر جا کر سب سے کیا کہو گی ترانہ؟“ ربیعہ کو پھر اندیشوں نے آگھیرا۔

”کچھ بھی۔۔۔ تم میری فکر مت کرفس۔“ وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں اضطراب پوشیدہ تھا۔ ربیعہ کے دل پھر کچھ ہونے لگا۔

”یہ۔۔۔ عباد کیوں نہیں آیا اب تک؟“ ترانہ نے پریشانی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”عبدالباری! ابھی کچھ پتا نہیں۔۔۔ رہ گئے ہیں یہ دونوں؟“

منیزہ بیگم انیقہ کے قریب چلی آئیں۔ وہ ریسور تھاے گم صم سی کچھ سوچ رہی تھی۔

”کیا بات ہے انیقہ۔۔۔ کس کا فون تھا؟“

انیقہ نے چونک کر ان کی سمت دیکھا پھر گہری سانس بھرتے ہوئے ریسور کریڈل پر رکھ دیا۔ ”عباد بھائی کا۔۔۔“

”عباد کا۔۔۔ منیزہ بیگم مسکرا دیں۔“ ”کیا کہہ رہا تھا؟“

”کہہ رہے تھے کہ۔۔۔“ انیقہ نے ایک مرتبہ پھر الجھ کر ان کی صورت دیکھی۔ ”ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی

ہمارے گھر آ رہی ہے۔“

منیزہ بیگم بے اختیار ہی ایک قدم پیچھے ہٹی تھیں۔

”لڑکی آ رہی ہے۔ عباد کے ساتھ۔؟ کون ہے وہ لڑکی؟“

”یہ تو انہوں نے نہیں بتایا۔ وہ بہت جلدی میں تھے۔“ انیقہ ہونٹ کاٹنے لگی۔

”یا اللہ خیر۔“ منیزہ بیگم نے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”یہ کیا ماجرا ہے۔ کیوں آ رہی ہے وہ لڑکی۔ تم نے پوچھا تو ہوتا۔“

”میں کیا پوچھتی امی! میں نے بتایا تا، وہ بہت عجلت میں تھے۔ انہوں نے بس اتنا کہا کہ امی کو بتادینا میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ساتھ ایک لڑکی بھی آ رہی ہے۔ اس کے لیے بیدار موم وغیرہ تیار کروادیں۔“

”انیقہ۔ مجھے تو بہت فکر ہو رہی ہے۔“ منیزہ بیگم پریشانی سے اسے دیکھنے لگیں۔

”مجھے تو صرف یہ خیال ستا رہا ہے کہ پرسوں آپ کی مہندی اور اس سے اگلے دن برات ہے۔ پتا نہیں یہ عباد بھائی کو ایسے موقع پر کیا سوچا۔“ وہ پیشانی مسنے لگی۔

منیزہ بیگم اب بے حد تشویش کا شکار تھیں۔

کراچی جانے والی ٹرین کی آمد کا اعلان ہو رہا تھا۔ تب ہی دور سے عباد اور باری تیزی سے آتے ہوئے نظر آئے۔ ترانہ کی جان میں جان آئی۔

”کہاں رہ گئے تھے آپ لوگ۔ میں تو ڈر رہی تھی۔“

”آپ تو نہیں ڈری تھیں؟“ عباد مسکرا کر رعبہ سے پوچھنے لگا۔

رعبہ نے نظریں جھکا لیں اور آنسوؤں کا ریلارو کسے کسے لیے ہونٹ کاٹنے لگی۔

”ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے رعبہ! عباد اس کی کیفیت بھانپ کر نکلیں دیکھنے لگا۔ ”ٹرین دوسرے

پلیٹ فارم پر آ رہی ہے۔ جلدی چلیں۔“

رعبہ ترانہ سے لپٹ کر رو دی۔ ترانہ بھی رہا سا حوصلہ ہار بیٹھی۔ دونوں زار و قطار روئے لگی تھیں۔

عباد اور باری اس رقت آمیز منظر سے متاثر ہو کر ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے۔

چاندنی رات میں سفید جھاگ بتاتی، منہ زور بلند وبالا لہروں کا نظارہ مسحور کن تھا۔ ایقان خاموشی سے سامنے چلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ برابر میں کھڑا عاشر بھی ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔

کافی دیر سے اس نے ایقان کو مخاطب نہ کیا تھا۔ ایقان نے گردن موڑ کر عاشر کو دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرح کسی معمول کی مانند پلکیں جھپکائے بغیر لہروں کو دیکھ رہا تھا۔

”عاشر! وہ نرم آواز میں بولی۔

عاشر چونک اٹھا۔ اس نے ایقان کو دیکھا اور مسکرا دیا پھر وہ پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

”کسو۔“ کافی دیر بعد وہ بولا تھا۔ ”کیا کہہ رہی تھیں؟“

”یہ تم کن سوچوں میں گم رہنے لگے ہو۔“ وہ شکایتا بولی۔ ”جب سے تم آئے ہو میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم

کچھ بدل سے گئے ہو۔“

عاشر ہنس دیا۔ اس نے ایقان کی کمر کے گرد بازو جمائل کر کے اسے خود سے قریب کر لیا تھا پھر ایک کش لگا کر

اس نے دھواں باہر نکالا۔

”اور۔ اور۔ یہ سگریٹ کیوں اس قدر پینے لگے ہو تم۔“ ایقان بھنا گئی۔ ”جب دیکھو۔ پرستہ کرکری طرح

پھول پھول کرتے رہتے ہو۔ کس بات کا پرستہ ہے؟“

عاشر نے بے اختیار ہی قہقہہ لگایا تھا۔ اس نے جلتا ہوا سگریٹ ایک طرف اچھال دیا اور ایقان کو شرارتی

نظروں سے دیکھنے لگا۔

”بس۔ اب خوش میم صاحب؟ لیکن بانی داوے۔ یہ تم مٹی کی ہانڈی کی طرح چپکے چپکے کیوں ہکے جاتی ہو؟ کن انڈیشوں کا شکار ہو مضمزمہ! بار بار مجھے بدلے کا طعنہ دے رہی ہو۔ ارے بابا۔ میں وہی ہوں۔ تمہارا عاشق۔ اول و آخر تمہارا۔“ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے تھے۔

”میں بچوں کو اماں کے پاس چھوڑ کر آئی تھی کہ جی بھر کر اپنے دل کی باتیں کریں گے۔ ہر فکر اور اندیشے سے بے پروا، بے نیاز ہو کر لیکن جناب کو مرا بننے سے فرصت نہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تبت کے پہاڑوں سے اتر کر آئے ہو۔“

عاشق پھر ہنس دیا تھا۔

”بس اب ہنسے جاؤ۔“ ایقان مزید جل گئی۔ ”کہنے سننے کو تو کچھ رہا نہیں نا۔ پہلے آتے تھے تو تمہاری باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں اور اب۔ اب صرف میری باتوں پر ہنستے رہتے ہو جیسے کسی بچی کو ہسلارہے ہو۔“

”ایقان۔ ایقان۔ یاد کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ تم بہت چڑچڑی ہو گئی ہو۔ اچھنے کی عادت تو خیر تمہیں پہلے بھی تھی لیکن پہلے کسی کی بات پر الجھا کرتی تھیں اب تو بے بات ہی الجھنے لگی ہو۔“

اس کے انداز میں قدرے برہمی در آئی تھی۔ ایقان یکفخت خاموش ہو گئی۔ عاشق کو بھی ماسول میں گھلنے والی تلخی کا احساس ہو گیا۔

”چلو۔ دینچ چلیں۔ بونے ڈنر کرتے ہیں۔“ وہ ملافت سے بولا۔

ایقان نے پلوں پر چمکتی نمی کو چھپانے کے لیے منہ موڑ لیا تھا۔



شور مچاتی ٹرین تیزی سے منزل کی جانب محو سفر تھی۔ عباد نے ایک نگاہ ربیعہ کے سستے ہوئے چہرے پر ڈالی پھر مسکرایا۔ وہ حد درجہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

”ربیعہ۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”ٹیک ایزی۔ تم بہت زیادہ گھبرا رہی ہو۔ ریلیکس۔“

”عباد بھائی۔ ہم۔ ہم کہاں جائیں گے؟“ وہ کچھ سوچ کر گویا ہوئی تھی۔

”کہاں جائیں گے؟ میں کچھ سمجھا نہیں؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ارے بھئی، ہم اپنے گھر جائیں گے، وہاں میری امی ہیں۔ میری دو بہنیں ہیں۔ ایک پیارا سا کیوٹ سا بھانجا ہے۔“

ربیعہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

”کیا سوچ رہی وہ ربیعہ؟“ عباد کو اس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ تھا۔

”عباد بھائی۔ میں۔ میں کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”کسی کا بھی نہیں، آپ اپنے گھر جانے سے پہلے مجھے کسی ہاسٹل میں۔“

”آواز رندہ جانے پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔ پھر کچھ دیر اسے خود پر قابو پانے میں لگی تھی۔

”میں یہیں میرے پاس۔“ وہ پھر گویا ہوئی۔ ”چند ماہ تک اپنا خرچ اٹھا سکتی ہوں پھر میں کوئی نوکری کر لوں گی۔“

”ربیعہ۔“ عباد تأسف سے بولا۔ ”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اپنا گھر ہوتے ہوئے میں تمہیں ہاسٹل میں چھوڑوں گا؟ شاید تم اب تک مجھ پر بھروسہ نہیں کر پائیں۔“

”عباد بھائی!“ ربیعہ تڑپ اٹھی۔ ”خدا کے لیے ایسا تو مت کہیں۔ میں نے اس دنیا میں محبت صرف چند ایک لوگوں سے پائی ہے اور آپ ان لوگوں میں شامل ہیں۔“

”پھر۔ تم نے ایسا کیوں کہا؟“

”اس لیے عباد بھائی کہ میں۔۔۔ میں لوگوں کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ میں کون ہوں کہاں سے آئی ہوں، میرے ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار، سب کون ہیں، کہاں ہیں۔ میں کسی بھی سوال کا جواب نہیں دے سکتی نہیں دے سکتی۔“ اس نے سر جھکا کر ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

عباد چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔
”کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا ربیجہ! یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ تمہارا حوالہ صرف اتنا ہو گا کہ تم میرے ایک بہت اچھے دوست کی بہن ہو۔“

”یہ کافی نہیں ہے عباد بھائی۔ انسان کے لیے رشتوں کا حوالہ ضروری ہے۔ خصوصاً لڑکی کے لیے۔“ وہ مایوسی سے بولی۔

”انسانیت کا رشتہ ہر رشتے سے بڑا ہے ربیجہ! محبت، خلوص، رواداری۔ یہ سب انسانیت کے رشتے سے آتی خوشبو کے نام ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ میرے گھر کے افراد میں تمہیں یہ خوشبو ملے گی۔ میری بات کا یقین کرو۔“
”عباد بھائی! میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کسی مشکل کا شکار ہوں۔ میرا آپ کے ساتھ آپ کے گھر جانا بہت سے وسوسوں کو جنم دے سکتا ہے آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں ربیجہ! لیکن پھر بھی میں تمہیں اس بے موت دنیا کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ انسان کے لیے اگر رشتوں کا حوالہ ضروری ہے تو پھر یہ حوالہ تم سے ہر جگہ طلب کیا جائے گا۔ اور اگر تم اپنے پچھلے رشتوں کو اپنا حوالہ بنانا نہیں چاہتیں تو نئے رشتے بناؤ ربیجہ۔ محبت اور خلوص کم یا ب سہی، لیکن نایاب نہیں ہے۔“

”عباد بھائی! کیا کہوں گی آپ کے گھر والوں سے؟ کیا بتا سکوں گی؟ نہیں اپنے بارے میں۔؟“
”میں نے کہا نا تم میرے ایک اچھے دوست کی بہن ہو۔ جو چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر تمہاری ذمہ داری میرے سپرد کر کے باہر چلا گیا ہے۔ اور بس۔! اس سے آگے تم سے کوئی کچھ بھی نہیں پوچھے گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ اپنے گھر والوں کو میں خود سمجھا دوں گا۔ ویسے بھی میری ماں، میری بہنیں، بہت اچھی ہیں۔ تم ان سے مل کر تو دیکھو۔“

”یقیناً ہوں گی۔ ان سے ملے بغیر بھی میں جانتی ہوں۔“ ربیجہ پہلی مرتبہ مسکرائی۔
اس کے دل کو جیسے قرار سا گیا تھا۔ اس نے مطمئن ہو کر اپنا سر سیٹ سے ٹکالیا اور آنکھیں موند لیں۔

ہاشم نے اپنے سامنے سجے ہوئے زیورات پر ایک مایوس سی نگاہ ڈالی تھی۔ سیلز مین نے کاؤنٹر پر مختلف ڈیزائن کے زیورات کا انبار لگا دیا تھا۔ لیکن ہاشم کی بے چین، متلاشی نگاہ کو کوئی بھی چیز مطمئن نہ کیا پائی تھی۔ رافع نے ٹھنڈی سرائس بھرتے ہوئے پیپسی کا گھونٹ بھرا۔

”یہ میں نے کوئلڈ ڈرنک کا نہیں صبر کا گھونٹ بھرا ہے میاں راجھے!“ پھر وہ بولا۔ ”ورنہ دل تو تیرا گلا گھونٹنے کو چاہ رہا ہے۔ دو گھنٹے چالیس منٹ ہو چکے ہیں یہاں قدم رنج فرمائے، اس سیلز مین سے شرمندگی محسوس کر رہا ہوں میں۔ بے چارہ علی بابا سے زیادہ خزانہ اٹھالایا ہے اپنے آہنی سیف سے اور تو ہے کس۔۔۔“
ہاشم نے اسے گھورا۔

”جب اپنی دلہن کے لیے زندگی کا پہلا تحفہ ڈھونڈنے نکلے تو میری اس کیفیت کو یاد کرنا۔۔۔ پھر تجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہوگی کہ تو نے میرے جذبات کو سمجھنے میں غلطی کی تھی۔“

”ابے یار! کوئی بھی چیز اٹھالے اس ڈھیر سے۔ یہ انگوٹھی یا وہ برسلسٹ۔ یہ گلوبند بھی برا نہیں۔“
”یہ اتنا بھاری گلوبند۔ منہ دکھائی میں دے دوں؟“ ہاشم چڑ گیا۔ ”یار شاعر! آج تیرے نازک احساسات کہاں جاسوے ہیں؟“

”میں خود چار دن سے نہیں سویا۔“ اس نے جھائی لی۔ ”شادی تیری ہے، خواری میری۔“
 ”دوستوں کے لیے خواری عین سعادت ہے۔“ ہاشم اس کی حالت سے بے نیاز شوکیں میں تاکا جھانکی کرنے لگا۔ پھر نکایک اس کی نظروں میں چمک سی آگئی۔
 ”یار رازغ! یہ اس لاکٹ پر پہلے نگاہ نہیں پڑی ذرا دیکھنا۔“
 سیزمین نے دل کی شکل کا ننھا سا لاکٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہاشم نے شوق سے لاکٹ اٹھا کر دیکھا۔
 ”بیوٹی فل۔۔۔“ پھر وہ بولا۔ ”بس ٹھیک ہے۔ مجھے یہی چاہیے۔“
 ”سوئے کادل ہیرے کے ہتھوڑا! رازغ نے بصرہ کر کے پھر ایک جھانکی لی۔ ”ویری گڈ۔“
 ”دل تو ہمارا سونے کا بی ہے۔“ ہاشم نے دانت نکالے۔ ”اور ان کی محبت اس میں ہیرے کی مانند دمک رہی ہے۔“ گویا مکمل استعارہ ہاتھ لگ گیا جذبات کے اظہار کا۔
 ”یار ہاشم! رازغ بولا۔ ”کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کاش میں ڈاکٹر شملہ ہوتا۔“
 ہاشم نے زوردار تھقہ لگایا۔ پھر جگہ کا احساس کر کے یکدم جھینپ گیا۔

سگریٹ سلگا کر اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے گھڑی کی جانب دیکھا۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ ایقان شاور لے رہی تھی۔ وہ سونے سے قبل شاور لینے کی عادی تھی۔ سوزنہ اسے نیند نہیں آتی تھی۔
 عاشر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اسے ایقان کی باتیں یاد آنے لگیں۔ نجانے کیا تبدیلی آگئی تھی اس کے رویے میں۔ وہ خود سمجھ نہیں پایا تھا لیکن ایقان کی چھٹی جس نے آخر کون سی بات محسوس کی تھی۔ یہ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے موبائل کی بپ بجی تو وہ بری طرح سے چونکا۔ موبائل پر وہ ٹون بج رہی تھی جو اس نے صرف ایک مخصوص نمبر کے لیے سیٹ کی ہوئی تھی۔
 واش روم میں پانی گر رہا تھا اور دم سروسوں میں ایقان کی گنگناہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ عاشر نے جلدی سے کال ریسیو کی۔
 ”ہیلو۔“

”ہائے ڈارلنگ۔“ دوسری جانب جیسے آہ بھری گئی تھی۔

”میں نے تم سے کہا تھا لڑا کہ۔“

”کہہ فون نہ کروں۔“ وہ اطمینان سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”لیکن کیا کروں! عاشر! میرا دماغ تمہارا تابعدار ہے اور دل باغی۔“

”ٹھیک! یہ سب بے بسی سے بولا۔ ”میرے لیے مشکلات مت کھڑی کرو۔“

”ڈونٹ وری ڈارلنگ۔ میں تو صرف تمہیں چھیڑنا چاہ رہی تھی پاکستان کے ٹائم کے مطابق رات کے بارہ بج رہے ہیں نا۔ میں تو چیک کر رہی تھی کہ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ شرارت سے ہنسی۔

”ٹھٹ اپ لڑا! وہ غرایا۔“

”اوکے ڈارلنگ۔ تم اکیلے ہو۔ میں اب آرام سے سو جاؤں گی۔ بائی داؤ۔ کہاں ہے وہ؟“ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آتا بند ہو گئی تھی۔ عاشر نے سناٹا محسوس کیا۔

”اوکے بکائے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”اور اب فون مت کرنا۔“

اس نے موبائل آف کر دیا۔ واش روم سے نکلتی ایقان نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”کے ڈانٹ رہے ہو؟“

”کیا۔؟“ وہ گڑبگڑا گیا۔

”کس سے کہہ رہے ہو کہ اب فون مت کرنا؟“ وہ گیلے بال تویہ سے رگڑتی اس کے مقابل آئی تھی۔

”مپے ایک دوست سے۔“

”کیا کیا ہے بے چارے نے؟“ ایقان نے حیران نگاہوں سے اسے دیکھا۔
عاشراے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر ایقان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اسے خود سے قریب کر لیا۔

”میرے اس قیمتی وقت میں مداخلت کی اس نے۔ جو میں ہرگز نہیں چاہتا۔“

ایقان نے برا سامنا کر اپنی ناک پر گلا تولیہ رکھ لیا۔

”سنگریٹ کی بو آ رہی ہے۔ تم نے پھر سنگریٹ پی ہے؟“

”تمہاری زلفوں کی خوشبو میں ابھی سب کچھ گم ہو جائے گا۔“ عاشرا نے تولیہ لے کر دور اچھال دیا۔

پہلوں کی گرگڑاہٹ کی آواز مدھم مدھم ہوتے ہوتے بالکل ختم گئی۔ عباد نے چہرے پر سے اخبار اٹھایا۔ اور نیند بھری آنکھوں سے ربیعہ کو دیکھنے لگا جو تھیلیاں مسل رہی تھی۔
”ربیعہ۔ ہماری منزل آگئی ہے۔“ عباد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”جی عباد بھائی!“ وہ دھیرے سے بولی۔

”میں قلی وغیرہ دیکھتا ہوں، تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ کچھ لے لوں؟ یا پھر گھر چل کر کھائیں؟ امی نے مزے مزے کی چیزیں بنائی ہوں گی۔“

”جی ٹھیک ہے۔ گھر ہی چل کر کھائیں گے۔“ ربیعہ نے اس کا دل رکھنے کو کہا، ورنہ فی الوقت اسے بالکل بھی بھوک محسوس نہ ہو رہی تھی۔ اس کے دل و دماغ ایک مرتبہ پھر اضطراب کا شکار تھے۔ کچھ دیر بعد وہ پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ عباد اور ادرود دیکھ رہا تھا۔

”کسے دیکھ رہے ہیں؟“ ربیعہ نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”۳؎ ایک دوست کو، میں نے اسے لاہور سے فون کر دیا تھا۔ وہ ہمیں لینے آئے گا۔ سو۔ وہ ابھی گیا۔“ عباد چند قدم آگے بڑھا۔ ربیعہ کی نظروں نے اس کا تعاقب کیا۔ سامنے سے ایک خوب روئو جوان مسکراتے ہوئے چلا آ رہا تھا۔ عباد اس سے بھل گیا۔ پھر وہ اسے لیے ہوئے ربیعہ کے پاس چلا آیا۔

”یہ ربیعہ ہے۔ میرے ایک دوست کی بہن ہے اور میرے لیے بھی چھوٹی بہن جیسی ہے۔“ وہ اپنے دوست سے اس کا تعارف کروانے لگا۔

”۴؎ اور ربیعہ۔۔۔ یہ فراز ہے۔ میرا بہت اچھا دوست، اتفاق کی بات یہ ہے کہ ہم دونوں کراچی میں رہتے ہیں اور ہماری دوستی لاہور میں ہوئی۔ یہ پچھلے سال ہی لاہور سے یہاں کراچی آیا ہے۔“
فراز مسکراتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ربیعہ نے بھی دھیرے سے مسکرا کر سر ہلایا۔

”چلیں۔۔۔؟“ فراز نے قلی کو سامان اٹھائے کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

”بالکل جناب۔!“ عباد نے قدم بڑھا دیے۔

گاڑی ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے جا رکی تھی۔ ربیعہ نے شیشے سے باہر جھانکا اور سفید ماربل سے بنے بنگلے کو دیکھ کر اس کا دل پھر انجانے خدشات کا شکار ہو کر دھڑکنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ بالکل برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔

عباد اور فراز گاڑی سے اتر کر ڈکی سے سامان نکال رہے تھے۔ پھر عباد نے اس کی جانب کا دروازہ کھولا۔

”کیا بات ہے ربیعہ! انہیں کہیں اور جانا ہے کیا؟“ وہ حتمی سے پوچھ رہا تھا۔

ربیعہ گاڑی سے اتر آئی۔ اپنے گھر تک پہنچ کر عباد کے انداز میں بے حد تازگی اور مسرت در آئی تھی جو اس کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہو رہی تھی۔ اس کا سکون اور اطمینان محسوس کر کے ربیعہ کے اندر ایک ہوک سی اچھی سی سکون اور اطمینان اس کی قسمت میں کہاں پوشیدہ تھا۔ وہ قطعاً لاعلم تھی۔

وہ لوگ آگے بڑھے۔ عباد نے باڑ کے ساتھ بنا ہوا لکڑی کا چھوٹا گیت کھولا اور وہ لوگ اندر داخل ہو گئے۔ پورچ میں دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سائیڈ میں بنے چھوٹے سے لان میں خوشنما پھولوں کی برسات تھی۔ ہری بھری نیلیں دیواروں پر بہت اوپر تک جا پہنچی تھیں۔ اس لمحے ربیعہ کے دل کی گرائیوں سے دعا نکلی تھی کہ باہر سے وہ گھر جس قدر پر سکون اور خوشنما دکھائی دیتا ہے اس کے اندر بھی اسی طرح حقیقی مسرت اور سکون کا بئیرا ہو۔

وہ لوگ سیڑھیوں تک پہنچے تھے تب ہی لکڑی کا مضبوط دروازہ ہوا اور ایک شفیق سی خاتون کا چہرہ دکھائی دیا۔ ربیعہ اپنی جگہ ہی رک گئی۔ خاتون چند قدم آگے بڑھیں۔ ان کی نظریں ربیعہ پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھ کر جاری تھیں۔ سفید لباس میں ان کا سر ابا بے حد پروقار اور شائستہ نظر آتا تھا۔ سفید دوٹے کے ہالے میں ان کا سانولا چہرہ محبت کی نرمی اور شفقت کے احساس سے معمور تھا۔ پھر بھی ان کی نظروں میں تشویش کی لہری تھی۔ جسے ربیعہ نے اتنی دور سے بھی محسوس کر لیا تھا۔

”امی!“ عباد نے ایک ہی جست میں سیڑھیاں پار کی تھیں۔ منیوہ بیگم نے محبت سے اس کی پیشانی چومی تھی۔ ربیعہ بھی آہستگی سے آگے بڑھی۔

”السلام علیکم۔“ وہ دم انداز میں بولی۔

منیوہ بیگم نے عباد سے الگ ہو کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہیں پھر مسکرا دیں۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ بولیں۔

ربیعہ نے دیکھا۔ ان کی آنکھوں کی ساری تشویش محبت اور اپنائیت کی لہروں میں بہہ گئی تھی۔ انہوں نے اسے شانوں سے تھام کر اپنے مقابل کیا، پھر بہت محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔

”جیتی رہو۔ اللہ تمہارے نصیب بلند کرے۔ ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”ربیعہ!“ ربیعہ دھیرے سے بولی۔

اس کے ترپے پھرتے دل پر محبت کا نرم گرم ہاتھ آکر ٹھہر گیا تھا۔ ربیعہ کو از حد سکون محسوس ہوا۔

”ماشاء اللہ! اپنے نام کی طرح ہی اجلی اور خوبصورت ہو۔“ انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”السلام علیکم آئی!“ فراز سامان سے لہذا چند اچلا آ رہا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ جیتے رہو۔ عباد بیٹا۔ کچھ خیال کرو۔ سب کچھ اس غریب کو تھما دیا ہے۔“

”ایویں!“ اس کو غریب نہ کہیں امی جی بہت امیر ہے یہ۔“ عباد اطمینان سے بولا تھا۔

”یہ اور بات ہے کہ تم مجھے اپنا پرسل ملازم سمجھتے ہو۔“ فراز نے اس کا بیگ بٹھا۔ عباد ہنس دیا۔

”چلو سب لوگ اندر آؤ۔“ انھیں اور شہلا ناشتہ تیار کر رہی ہیں۔“ منیوہ بیگم نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

عباد اور فراز سامان اٹھانے لگے۔ منیوہ بیگم ربیعہ کے شانوں کے گرد بازو پھیلائے اسے اپنی معیت میں لے کر اندر داخل ہوئیں۔ کچن سے نکلتی انھیں وہیں ٹھہر گئی تھی۔

”آئی!“ پھر اس نے پکارا۔ شہلا بھی کچن سے نکل آئی۔

”آؤ۔“ منیوہ بیگم نے ربیعہ کو پیار سے دیکھا۔ ”اپنی بہنوں سے ملو۔“

ربیعہ آگے بڑھی شہلا اور انھیں بھی آگے بڑھیں۔ پھر وہ دونوں بے حد گرم حوشی سے ربیعہ سے ملیں۔

”ہم لوگ کل سے سوچ رہے ہیں کہ نجائے عباد بھائی کے ساتھ کون آ رہا ہے۔ تمہیں دیکھ کر ساری تشویش خوشی میں بدل گئی ہے۔ ہے نا؟“ انھیں کے چہرے بے حد نرم سا تاثر تھا۔

اس نے منیوہ بیگم کو دیکھا جو اس کی بات سن کر مسکرا دی تھیں۔

”ہاں“ میں ربیعہ سے مل کر واقعی بہت خوش ہوئی ہوں۔ نجائے کیا بات ہے اس میں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ

ہماری اپنی ہو۔“

”بالکل ٹھیک کہنا ہی آپ نے!“ شہلا مسکرائی۔ ”میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔“
”آپ جارہی ہیں نا۔ اس لیے میں ایک بسن اور لے آیا۔“ عبادان لوگوں کے قریب آتے ہوئے خوش دلی سے بولا۔

”بہت اچھا کیا۔“ شہلا کھل کر مسکرا دی۔ ”اور یہ تو اتنی چھوٹی سی لگتی ہے کہ تمہارے بھانجے نے بھی فوراً دوستی کر لینی تھی اس سے۔“

عباد بے اختیار ہنس دیا۔

”لیکن وہ ہے کہاں؟“

”سورہا ہے۔“ منہ زدہ بیگم بولیں۔ ”بہشتا کر لو تو اسے جگا لیتا۔“

سب لوگ ڈانٹنگ ٹیبل کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ربیعہ کو بے حد سکون کا احساس ہوا تھا اسے اچانک سی بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔

”کل شام ایسا کوماںوں بٹھائیں گے ساتھ ہی ہی رسم ہندی بھی ہے۔ پرسوں نکاح ہے۔“ انیقہ ربیعہ کو ہدوگرام سے آگاہ کر رہی تھی۔ شہلا خاموشی سے پیچھی مسکرا رہی تھی۔

”کل مایوں، کل ہی ہندی پرسوں نکاح۔“ ربیعہ نے حیرانی سے شہلا کو دیکھا تھا۔ ”ولسن کو تو کم از کم ایک ہفتہ پہلے مایوں بٹھاتے ہیں۔“

”ہاں بٹھاتے تو ہیں۔ پر یہ ہماری اپنا۔“ انگریز نہ ہو سیں خیر۔“ انیقہ نے ناک بھوں چڑھائی۔ ”کل بھی دیکھو۔ کون کون سے آرڈر پاس کرتی ہیں۔ ان کی مایوں کا تو صرف نام ہو گا۔ ایٹن تو میں اور تم ہی لگائیں گے۔ انہیں تو اگر جی ہو جاتی ہے ایٹن سے۔“

ربیعہ مسکرا کر شہلا کو دیکھنے لگی۔

”میں کسی چیز کی ضرورت بھی تو نہیں ہے۔“ وہ بولی۔

”بس۔ اب تم انہیں زیادہ مت سراہو۔ ورنہ یہ پرسوں تیار ہونے سے بھی مسکر ہو جائیں۔ کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں ہے۔“ انیقہ ہندی کے لیے پیش کی کٹوریاں اور تھالیاں دیکھ رہی تھی۔ جو وہ خاص طور پر فریڈ کر لائی تھی۔

”کم آن انیقہ! کتابولتی ہو تم۔“ شہلا نے اسے گھورا۔

”بیلنس کرنا ہے نامعاملہ۔ آپ جو گوگٹے کا گز شوق سے کھاتی ہیں۔“

ربیعہ ہنس دی۔ اسے ہنوں کی نوک جھونک اور اس میں چھپی محبت کا احساس لطف دے رہا تھا۔ اسی وقت مہاراد، عمر دوڑتے بھاگتے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ دونوں ہنس رہے تھے۔

”ماما۔“ عمر شہلا کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے زور سے بولا۔

”میرا بیٹا! شہلا نے اسے محبت سے جوا۔

ربیعہ لمحہ بھر کے لیے ششدر رہ گئی۔ اسے یہ تو علم تھا کہ عباد کا ایک بھانجا ہے لیکن اپنی سوچوں میں ابھی اس نے کبھی اس بات پر غور نہ کیا تھا کہ عمر کی ماں کون ہو سکتی ہے۔ اب اس وقت اسے اچانک ہی علم ہوا تھا کہ شہلا اپنے بچے کی ماں بھی ہے۔

”دیکھو آپ کی ایک خالہ جانی اور آگئی ہیں۔ ان سے ملو۔ ربیعہ خالہ ہیں آپ کی۔“ شہلا عمر کو اس سے عارف کر دیا رہی تھی۔

عمر اس کے قریب چلا آیا اور کچھ حیرت اور شوق سے اسے دیکھنے لگا۔ ربیعہ نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ عمر نے اس کا ہاتھ قدرے جھجکتے ہوئے تھا تو ربیعہ نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ پھر اس نے بے اختیار ہی اس کا گال چوم لیا۔

”ہمت پارے ہو تم۔ کیا نام ہے تمہارا؟“
 ”عمیرہ“ وہ مسکرایا۔ ”آپ میری خالہ جانی ہیں؟“ ربیعہ نے اثبات میں سر ہلایا۔
 ”آپ کہاں سے آئی ہیں؟“

ربیعہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی تھی۔ دیگر افراد نے اب تک اس سے کوئی استفسار نہ کیا تھا لیکن اب اس کے سامنے اسے اچانک ہی اندازہ ہوا تھا کہ بچے کے سوالات بہت آگے تک جاسکتے تھے۔
 ”اللہ تعالیٰ کے پاس سے۔“ عباد نے آگے بڑھ کر عمر کو اپنی جانب کھینچ لیا۔
 ”اللہ تعالیٰ کے پاس سے؟“ اس نے حیرانی سے ربیعہ کا جائزہ لیا۔ ”یہ اتنی بڑی ہو کر بھی اللہ تعالیٰ کے پاس سے کی ہوئی تھیں؟“

وہ لوگ بے ساختہ ہی ہنس دیے۔ منہ ذہنیکم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسکرائی تھیں۔
 ”بچہ کر رہا ربیعہ! یہ تمہارا دماغ کھا جائے گا۔“ شہلا نے اسے خبردار کیا۔
 ”جیسے اپنا کا کھا گیا ہے۔ ہماری ایسا بغیر دماغ کی ہیں۔“ عباد ہنستے ہوئے بولا۔
 شہلا نے اسے ایک چپٹ لگا لی اور خود بھی ہنسنے لگی۔ ماحول بہت خوشگوار تھا۔ ربیعہ کے اطمینان میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔

”آپ میری دوست بنیں گی؟“ عمر پھر اس کے پاس چلا آیا۔
 ”کیوں؟“ ربیعہ نے مسکرا کر اس کی پریشانیوں میں جھانکا۔ ”خالہ سے دوست بننا ہے ہو؟“
 ”خالہ جانی تو ڈانٹتی ہیں نا! آپ خالہ بن گئیں تو آپ بھی ڈانٹیں گی۔ اس لیے دوست بننا رہا ہوں۔ پھر آپ مجھے ڈانٹیں گی نہیں۔ اور ہم بہت سارے گیمز کھیلا کریں گے۔“
 ”یہ بات ہے تو پھر دوستی کی۔“
 عمر خوش ہو گیا تھا، انہی دنوں اسے گد گدایا۔
 ”خالہ جانی بہت ڈانٹتی ہیں تمہیں؟ جھوٹے کہیں کے میرے خلاف محاذ تیار کر رہے ہو۔ ہاں۔“
 عمر نے اسے زبان چڑادی۔ اور شہلا کی خفگی سے بچنے کے لیے کمرے سے بھاگ گیا۔ سب کے چہروں مسکراہٹ تھی۔

○ ○ ○
 گھر میں ہی ہاشم میاں کو ایشن اور تیل لگانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لان میں سارا انتظام رافع اور نافع نے سنبھالا ہوا تھا۔ علی اور حمزہ کام کم اور باتوں اور تفریق میں زیادہ مصروف تھے۔
 شام رعبانی کا مہنگا لباس پہن کر اتری تھی۔ لڑکیاں زور و شور سے تیار یوں میں مصروف تھیں۔
 فردوس بیگم سب کاموں کے جائزہ لیتی ہوئی مطمئن سی ہو کر اندر آئی تھیں۔ یکایک وہ بری طرح سے ٹھٹک کر رک گئیں۔ سامنے صوفے پر بے حال اور بے ترتیب سے اختر میاں بڑے ہوئے تھے۔
 ”اے ہے۔“ وہ بے طرح پریشان ہوئیں، پھر لپک جھپک ان کے قریب چلی آئیں۔ ”یہ تم کہاں سے لپکے ہو؟ اس وقت۔ کہاں جا رہے تھے؟“

اختر میاں نے سرخ سرخی لگائیں اور سوکھے لبوں پر زبان پھیری۔
 ”آپ! السلام علیکم۔“

”آپ! السلام علیکم۔“ میں پوچھتی ہوں کہاں سے چلے آ رہے ہو؟ حلیہ دیکھا ہے اپنا۔ جیسے گڑے نکل کر آئے ہو۔ چلو اٹھو۔ پہلے نہا کر آؤ۔ بوسے دلاؤ۔ بٹھا جا رہا ہے۔ میں کہتی ہوں فاروق حسن نے اگر تمہیں اس حلیے میں دیکھ لیا تو بھنگیوں سے انھو کر گلی میں پھینکوا دیں گے، سمجھ۔ اے ہاں۔ جسے دیکھو وہی گلے کا طوق ہے۔ چلو اٹھو اب۔“ وہ حد درجہ جھنجھلا گئی تھیں انہیں دیکھ کر۔
 ”بابی! وہ پھر نفرت سے بولے تھے۔“ چائے تو پلا دو۔“

”ارے سب کھلا پلا دیں گے تمہیں۔ مرنے جاؤ گے ذرا سی دیر میں۔ اب اٹھو بھی۔ جا کر ہمارا غسل خانہ پلید کرو۔ چلو جاؤ۔“
 آخر میاں، بہن کی جھاڑ بھکاریں کر لڑکھڑاتے ہوئے غسل خانے کی سمت کو بڑھ گئے۔ فردوس بیگم ہاتھ پر سو بل ڈالے کھڑی سوچی رہ گئی تھیں۔



ہاشم میاں کوچی بھر کر پیلا کیا گیا تھا، لیکن انہوں نے قطعاً برا نہ مانا۔ بقول رافع کے ان کے دانت تک پہلے ہو گئے تھے۔ پھر بھی وہ مسلسل مسکرائے جا رہے تھے۔

”یابو ذرا منہ بند کر اپنا۔“ رافع کھڑا تصویر کھینچ رہا تھا۔ ”پتا ہی نہیں چل رہا ہے کہ ہونٹ کہاں ختم ہیں اور دانت کہاں سے شروع ہیں۔ ساری تصویروں میں ایک پیلا بھوت ہی آئے گا۔“

”چلو۔ ہم بھوت ہی سہی، سرہی چڑھیں گے ناکسی کے۔“ وہ گال ملتے ہوئے ابٹن اتار رہا تھا۔
 ”پلٹ بھی سکتے ہیں کسی کو۔“ حمزہ بے سوچے سمجھے بولا۔

”یہ بھی برا نہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔

بات سمجھ لینے والوں نے ایک قہقہہ لگا دیا تھا۔ لڑکیاں بے چاریاں جھل سی ہو گئیں۔

”چلو کھکو میاں سے۔“ دروہ نے سرگوشی کی۔ ”اب یہ لوگ نجانے کیا کیا اول فوٹ بولیں گے۔“

”بلتے رہیں۔“ ماہین جھجلائی۔ ”ہم کیوں جا میں۔ ہم نے تو ابھی گائے گائے ہیں۔“

”تمہارا اٹھا ابھی دکھا نہیں۔؟“ زائمر نے اسے گھورا تھا۔

”اے میرے بھائی کی شادی ہے۔ کوئی مذاق ہے۔“

”یہ مذاق نہیں آپنی۔ یہ۔۔۔ حقیقت ہے۔“ لڑکیاں پیچھے سے حمزہ نے جملہ کہا اور جلدی سے ڈھیر سارا ابٹن ماہین کے چہرے پر مل دیا۔ وہ بھوت بنی بیٹھی رہ گئی۔ لڑکیاں قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں تو وہ جھلا کر حمزہ کو مارنے لپکی۔ پھر زور سے چیخ اٹھی۔ اس کے ساتھ دروہ بھی پینچی تھی۔

کسی نے ان دونوں کی چٹیا آپس میں باندھ دی تھیں۔ اور اب سارے کے سارے انہیں دیکھ کر ہنس کر لوٹ بوٹ ہو رہے تھے۔

پھر تو گیا ایک طوفان بد تمیزی اٹھ کھڑا ہوا۔ سب ایک دوسرے پر ابٹن کے گولے بتا بنا کر پھینکنے لگے تھے۔ کپڑوں، میک اپ کا حشر ہو گیا تھا۔ قمیصوں سے پورا لان گونج رہا تھا۔ بزرگ حضرات تو یہ صورت حال شروع ہوتے ہی اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ اور اب کوئی کسی کا پرسان حال نہ تھا۔ لڑکوں کی تو باقاعدہ دھینگا مشتی شروع ہو چکی تھی۔ علی اور نافع نے حمزہ کو گرا لیا تھا اور اب جی بھر کر اس کا حلیہ بگاڑ رہے تھے۔ ناعمہ اور سدرہ نے ثانیہ کی شامت بٹائی ہوئی تھی۔ عاشر نے ایقان کے منہ پر ابٹن کا مارک بتا دیا تھا۔ اور اب اسے دیکھ دیکھ کر ہنس رہا تھا۔
 عریضہ پر ابٹن کا گولہ آکر لگا تو وہ چونچ بچا کر قدرے کونے تک چلی آئی تھی۔ بھنا کر پٹی۔ سامنے نافع شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ سلگ کر بولی۔

”بد تمیزی۔؟ یہ تو ماحول کا تقاضا ہے۔“ وہ ہنس دیا۔

”بشٹ آپس۔“ وہ غرائی اور پلٹ کر وہاں سے چلی گئی۔

نافع یکایک ہکا بکا رہ گیا تھا۔ بہت عرصے سے وہ اس کے گریز کو شرم، جھینپ اور حیا کا نام دیتا چلا آ رہا تھا۔ لیکن اب کچھ دنوں سے وہ اس گریز میں حقارت، نفرت، سخت قسم کی ناپسندیدگی کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ مگر اسے کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ دور کھڑی دورہ نے یہ منظر دیکھا تھا اور نافع کی طرح وہ بھی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

رات اسے بہت اچھی نیند آئی تھی۔ اسی لیے وہ صبح سویرے ہی بیدار ہو گئی تھی۔ ابھی کھڑکی کے پردوں پر صبح

کی سفیدی کے آثار نمودار ہونا شروع ہی ہوئے تھے، باہر لان میں چمکتی چیزوں کی محسوس آوازیں اس کے دل کو خوشی اور تفکر کے احساسات بخشنے لگیں۔

ریحہ بستر سے نکل آئی۔ واش روم میں جا کر اس نے وضو کیا پھر کاریٹ پر جائے نماز بچھا کر خدا کے حضور حاضر ہو گئی تھی۔ نماز میں اسے بہت لطف محسوس ہوا تھا۔ دل و دماغ جیسے ہر طرح کے بوجھ سے آزاد بالکل ہلکے پھلکے سے محسوس ہو رہے تھے۔

دعا مانگ کر اس نے دونوں ہتھیلیاں اپنے چہرے پر ٹکالیں۔ بند پلکوں کی لرزش سے اس کی ہتھیلیوں پر نمی اترنے لگی۔ تب وہ ہاتھ چہرے پر پھیر کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بیڈ روم کا ایک دروازہ لان کی سمت بھی کھلتا تھا۔ ریحہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ پھر موسم کی خوبصورتی نے اسے مسحور کر دیا۔ آسمان سرخ می پادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور باد نسیم میں بے حد نازکی اور خوشبو تھی۔ ہر شے اپنے اصل رنگ سے زیادہ رنگین اور دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ ریحہ نے لکڑی کے چھوٹے سفید گیٹ کے قریب آکر باہر جھانکا۔ تارکول کی سیاہ سڑک دور تک جاتی دکھائی دیتی تھی۔ سڑک کے دوسری جانب بنے پارک کے سرسبز درخت دور سے دھند میں لپٹے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے وہ سفید باریک جالی کا لباس پہنے کھڑے ہوں۔ پارک میں چھماتے ہوئے پرندوں کی خوش نما آوازیں اتنی دور سے بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ریحہ نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ خوبصورت اور خوش کن منظر نہ دیکھا تھا۔ اس نے گیٹ کا اوپر کی کنڈا ہٹایا اور باہر چلی گئی۔ صاف ستھری، سیاہ سڑک پر چلنا بھی ایک خوشگوار عمل تھا۔ دور دور تک سنسان دکھائی دیتی سڑک پر خشک سے موسم میں چلتے چلے جانا بے حد بھلا لگ رہا تھا۔

ریحہ پارک میں داخل ہو گئی۔ پارک میں کہیں کہیں کسی ذی نفس کی جھلک دکھائی پڑتی تھی۔ صبح کی سیر کے لیے نکلے ہوئے بڑے بوڑھے یا جاگنگ کرتے نوجوان دور سے نظر آرہے تھے۔ ریحہ پیٹل کے ساتھ بڑی بیچ پر جا بیٹھی۔ اور اس کی پشت سے سر نکا کر آنکھیں موند لیں۔

جاگنگ کرتا ہوا رافع یکفخت ٹھہرا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پارک تاحد نگاہ خالی پڑا ہوا تھا۔ نرم نرم دھوپ درختوں کی اونچی شاخوں پر اٹھی تھی اور اب نیچے اترنے کے لیے کوشاں تھی۔

رات کی تقریب کی وجہ سے اس کی آنکھ قدرے تاخیر سے کھلی تھی۔ سو ہاشم کو تازہ دم ہونے کے لیے سوتا ہی چھوڑ کر وہ اکیلا چلا آیا تھا اور اب کھڑا حیرت سے اس بے فکر دیوانی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ جو پارک کی سگی بیچ پر بیٹھی ہوئی سو رہی تھی۔

اس کا آسمانی آئینل اس کے کانڈھے پر سرسرا رہا تھا۔ دوسرا پلو ہری گھاس پر پھیلا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے، سر نکالے وہ گمری نیند میں تھی۔ سیاہ گھنیرے بالوں کی بدلی اس کے شانے پر پھیلی ہوئی تھی اور گلابی ہونٹوں پر کسی اچھے خواب کی مسکان کا سایہ تھا۔

رافع نے زندگی میں ایسا دلکش منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر بس اسے دیکھے جا رہا تھا۔ پھر جیسے اسے کچھ دھیان سا آیا۔ اس نے ٹراؤزر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ برآمد کیا اور اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ کبھی میں سوچتا ہوں اک سہانی صبح ایسی ہو

کہ جب میں نیند سے جاگوں
مرے قدموں کے آگے نور کی دیوار بن جائے

رافع نے بجائے کب سے لکھ رکھی نظم اپنے ٹراؤزر کی جیب میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ کیوں کس لیے وہ اسے ہمراہ لے کر پھرتا تھا۔ اس نے پریشان نگاہوں سے پھر اسے دیکھا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے کاغذ پھڑپھڑا کر اس کے ہاتھوں سے نکلا تھا۔ پھر وہ رافع کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی ریحہ کی گود میں جا کر ا۔

ربیعہ زور سے چونکی تھی۔ گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور گود میں بڑے کاغذ کو بے اختیار ہی اپنی مٹھی میں بھینچ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کی نظر سامنے کھڑے رافع پر پڑی تھی۔ ربیعہ نے جلدی سے دوپٹہ سنبھالا اور آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

”منیبہ! وہ بھی چند قدم آگے بڑھ آیا تھا۔
ربیعہ گھبرائی لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔
”آپ۔۔۔ آپ کو یہاں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہوں۔“
”جی۔۔۔ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں یہاں پہلی مرتبہ ہی آئی ہوں۔“
”کہاں تھیں اب تک؟“ وہ آہستگی سے بولا۔
ربیعہ بے اختیار ہی پلٹی۔

”جی۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے اس اجنبی کو دیکھا۔
”میرا مطلب ہے آپ کہاں سے آئی ہیں؟“
ربیعہ نے چند لمحے سوچا پھر نجائے کیوں اس کے لب مسکرا اٹھے۔
”اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔“ اس کے سنجیدہ انداز میں ہلکی سی شرارت تھی۔
پھر وہ مزید نہیں رکی تھی۔ رافع پوری آنکھیں کھولے اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔

وہ جیسے ہی گھر کے گیٹ کے پاس پہنچی حیران پریشان عبادیابہر کی سمت ہی لپک رہا تھا۔ ربیعہ کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔

”ربیعہ! کہاں چلی گئی تھیں تم؟“
”عباد بھائی! میں ذرا پارک تک چلی گئی تھی۔“ ربیعہ بھی اپنی غلطی پر شرمندہ سی ہو گئی۔
”میں پریشان ہو گیا تھا۔ کافی دیر تک تمہارا دروازہ بجایا پھر دوسری جانب سے دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں گھبرا گیا کہ تم نجائے کہاں چلی گئیں۔“
ربیعہ نے اس کا چہرہ دیکھا پھر مسکرا دی۔
”میں کہیں نہیں جاؤں گی عباد بھائی! وہ ہنس دی تھی۔ ”بے کار رہیے۔“

عباد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دواؤ ڈالا۔
”نچلو۔ ناشتہ کرو۔ امی بہت مزے کے پرائے بناتی ہیں۔ اور ہاں رات کو شہلا آپی کی مندی کی تیاری بھی کرنا ہے۔ تم نے اور انہی نے سنبھالنا ہے سب کچھ۔“
”ضرور۔“ وہ کھل کر مسکرائی تھی۔

پھر اپنے کمرے میں آکر اس نے بے اختیار ہی اپنا ہاتھ دیکھا اور مسکرا دی۔ نجائے کیا تھا جسے وہ اتنی دیر سے مٹھی میں دبائے پھر رہی تھی۔

ربیعہ نے کاغذ پھیلا کر دیکھا پھر حیرانی سے مسکرائی۔ اس پر تو پوری نظم تحریر تھی۔ ربیعہ نظم پڑھنے لگی۔
”کمال ہے۔“ پھر وہ بولی تھی۔ ”یہ میرے ہاتھ میں کمال ہے۔“
پھر دفعتاً اس کے ذہن میں پورا منظر تازہ ہو گیا تھا۔ وہ ان حیران نظروں کو یاد کر کے مسکرا دی۔
”ربیعہ! منیبہ بیگم کی آواز سے وہ چونک اٹھی۔ ”ناشتہ کرو۔“
وہ جلدی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

رات روشنیوں سے معمور تھی۔ عباد نے گھر کی چھت پر تقریب کا اہتمام کیا تھا۔ ڈیکوریشن والوں نے چھت کو خوبصورتی سے سجانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تھا۔ ہرے اور پیلے رنگ کے جھلملاتے دیوڑوں سے پورا

ماحول سج گیا تھا۔ جگہ جگہ گلاب کے پیلے اور نارنجی پھولوں کے گلدستے سجائے گئے تھے۔ اسٹیج پر گیندے کے پھولوں کی فراوانی تھی۔ رنگین فیتھوں نے جا بجا مختلف رنگ کی روشنیوں کو ہم آہنگ کیا ہوا تھا۔ انیفقہ اور شہلا کی سیلیوں نے اسٹیج پر قبضہ جمایا ہوا تھا اور مختلف گانوں پر طبع آزمائی کر رہی تھیں۔ انیفقہ اور ربیعہ کھانے کے انتظامات کا جائزہ لے رہی تھیں۔ عباد موسوی اور تصویریں بنانے والوں کو ہدایات دے رہا تھا۔ تب ہی ہاشم کی طرف سے مہندی لے کر پوری پلشن آپہنچی۔ آنے والے بھی ڈھول اور دف بجارہے تھے۔ ادھر والوں نے بھی فل والیم میں ڈیک آن کر دیا۔ موم بتیاں روشن ہو گئیں گلائیں بجھادی گئیں۔ دولہا میاں کی بہنوں اور کزنز کے چہرے موم بتیوں کی سحر انگیز روشنی میں چمک رہے تھے تب ہی عریشہ کی نظریں دو آنکھوں سے چار ہوئیں۔ اس کا دل یک بارگی زور سے دھڑکا۔ لیکن وہاں اجنبیت اور بے نیازی تھی۔ عریشہ کے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ سب کے ساتھ گھسنے لگی۔ فراز ایک جانب کھڑا سینے پر بازو پیٹنے خاموش نظروں سے ہنسی مسکراتی، کھلکھلاتی ناعمہ کو دیکھ رہا تھا۔ ناعمہ مہندی کا تھال اٹھائے اس کے بالکل قریب سے گزری تھی۔ گزرتے گزرتے اس نے نظریں اٹھائیں اور اس کے لب جیسے مسکراتا بھول گئے۔

کسی منچلے نے فل والیم میں ابرار کا ”ساں تیری گل کرنی“ لگا دیا تھا۔ تقریب کا رنگ یکلخت ہی بدل گیا۔ ہاشم کی جانب سے آئے ہوئے لڑکوں نے ٹولی بنا کر گانے پر رقص شروع کر دیا تھا۔ عباد، فراز اور عباد کے دیگر دوست بھی ماحول کا اثر قبول کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور سارے لڑکے مل کر خوب خوب ہنگامہ کرنے لگے۔

”ارے بھئی۔ پہلے رسمیں تو کر لیتے۔“ شفیقہ حیات نے پاٹ دار آواز میں کہنے کی کوشش بھی کی لیکن اتنے شور میں کسی نے ان کی ایک نہ سنی۔ لڑکیاں بھی تالیاں بجا بجا کر اپنی طرف کی پارٹی کو پوری داد دے رہی تھیں۔ ربیعہ شوق اور دل چسپی کے عالم میں بیٹھی یہ سارا ہنگامہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے کب اپنی زندگی میں اس طرح کا بے فکر اور خوش باش ماحول دیکھا تھا۔ وہ پوری طرح سے تقریب کو انجوائے کر رہی تھی۔

”ربیعہ ربیعہ۔“ کوئی اسے پکار رہا تھا۔ ربیعہ چونکی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دور کھڑی انیفقہ نجائے کب سے اسے پکار رہی تھی اور ہاتھ ہلا ہلا کر متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ربیعہ جلدی سے کھڑی ہوئی اور شور مچا کرتے لڑکوں سے بچ بچا کر نکلنے لگی، تب ہی بے خودی میں دھمال ڈالتا رافع اس کے سامنے آ رہا تھا۔ ربیعہ ٹھٹک کر رکی۔ رافع بھی چونک کر اپنے آپ میں لوٹا اور خاصا شرمندہ ہوا۔

”کھیاں دے دو بچی گلابی تیرے ڈورے۔“ چبھتی گھر آ جا بڑے چنگے تیرے سورے۔“ ڈیک پر ابرار چمک رہا تھا۔ ربیعہ اس ٹکراؤ پر خاصی زور ہو گئی تھی۔ وہ نظریں جھکا کر باجی چہرہ موڑے جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ رافع اپنی کیفیت کو کوئی نام نہ دے سکا تھا۔ ناچتے، شور مچاتے لڑکوں کی ٹولی کے پیچ وہ یک ٹک کی سوچ میں گم کھڑا تھا۔ اسے کسی کا دھکا لگا تو وہ جلدی سے دونوں ہاتھ اٹھا کر پھر شروع ہو گیا لیکن اب کی بار رقص میں وہ پہلی ہی سرمستی نہ تھی۔

ربیعہ انیفقہ کے ساتھ ٹپل منزل پر جا آئی، جہاں سکون اور خاموشی تھی۔

”میں کسی کام سے نیچے آئی تو دیکھا عباد بھائی کا موبائل بج رہا ہے۔“ انیفقہ اسے بتانے لگی۔ ”میں نے کال ریسیو کی تو دوسری جانب کوئی عبدالباری صاحب تھے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہتے تھے۔“

”اوسے“ ربیعہ کا دل غیر معمولی انداز میں دھڑکا۔ ”پھر۔۔۔ پھر۔۔۔“ اس نے بے مالی سے پوچھا۔
 ”پھر میں نے انہیں تقریب کے متعلق بتایا تو وہ کہنے لگے۔ بعد میں بات کر لیں گے، اب اگر تم کو تو میں اسی نمبر پر کال ملا دیتی ہوں یا پھر یہ تقریب ختم ہو لے تو بات کر لیتا۔ کیا خیال ہے؟“
 انہیچہ اس کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ ربیعہ کو بھی احساس ہوا کہ یہ موقع اس امر کے لیے مناسب نہ تھا۔ ابھی شہلا کی رسمیں نہ دنا باقی تھیں۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں بعد میں بات کر لوں گی۔“
 انہیچہ مطمئن ہو کر پلٹ گئی۔ ربیعہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ہر چند کہ اس کا دل ترانہ کی خیریت معلوم کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

لڑکوں کا جوڑا کچھ سرور ڈاؤن انہیچہ اور ربیعہ، شہلا کو تھام کر اسٹیج پر لے آئیں۔ شہلا کے چہرے پر پہلے آئینل کا سایہ تھا، اس لیے اس کے تاثرات سب ہی سے پوشیدہ تھے۔ سب ہی کی پرشوق نظریں اس کے سراپے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ایقان سے صبر کرنا دشوار تھا۔ وہ جلد از جلد اپنی عزیز ازجان سہیلی کے تاثرات معلوم کرنے کی خواہش مند تھی۔

رسمیں شروع کی گئیں۔ شفیقہ حیات، فردوس بیگم اور عذرا بیگم سب سے پہلے اسٹیج پر پہنچیں۔ انہوں نے اسے اٹھن، مہندی، تیل سب ہی کچھ لگایا۔ شہلا سر جھکائے بیٹھی تھی۔ بڑے سے دوپٹے میں چھپے اس کے وجود میں ارتعاش تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک انجانا سا شور مچا رہی تھی۔ اسے نجانے کیوں کہیں کچھ غلط ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ بے شمار نظریں اور دودی کیمروں کے لینس اس پر مرکوز تھے۔ وہ ماتھے پر آیا پسینہ تک پونچھنے سے قاصر تھی تب ہی اس کے قریب ایک شونخ اور مانوس آواز چھمائی تھی۔

”ہمیں تو دیدار سے محروم نہ کرو سہیلی۔۔۔ آج تو اپنا یہ پیلا پیلا سا روپ دکھاؤ۔“
 یہ ایقان تھی جو شونخی پر کمر بستہ تھی پھر وہ اس کے کھوکھٹ میں سے جھانکنے لگی۔ شہلا کے لبوں پر مدھم سی مسکان دوڑ گئی۔

”ہوں۔۔۔“ پھر وہ مطمئن ہو کر بولی۔ ”اب کم از کم دو لہا میاں کے سوالوں کے جواب تو دے پاؤں گی۔“
 شہلا کے کانوں میں ایک مرتبہ پھر سائیں سائیں سی ہوئی۔ نجانے کیوں اسے یہ حوالہ بے حد اجنبی لگ رہا تھا۔
 نجانے کیوں۔

ہاشم چائے کی طلب محسوس کر کے کمرے سے نکلا تھا۔ شادی کے کاموں کی غرض سے رکھی جانے والی جزوقتی ملازمہ بچن میں موجود تھی۔ اس کا ارادہ اس سے چائے بنوانے کا تھا۔ وہ بیڑھیوں پر آکر ٹھنک گیا۔ بیزار بیزار سی عرشہ بیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ وہ سادہ سے کپڑوں میں ملبوس تھی اور اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ حالانکہ وہ تیار ہو کر سب کے ساتھ اس کی مہندی لے کر شہلا کے گھر گئی تھی۔

عرشہ نے بھی ہاشم کو دیکھ لیا، وہ چورسی ہو گئی۔

”عرشہ!“ ہاشم نے تشویش سے پکارا۔

”جی جی بھائی!“

”تم واپس آ گئیں؟“

”جی!“ وہ نظریں بھٹکا کر بس اتنا ہی کہہ پائی۔

”کیوں خیریت؟“ وہ حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میری۔۔۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ سر میں۔۔۔ درد تھا۔“ اس کی نظریں ہنوز جھکی ہوئی تھیں۔ ہاشم

چند لمحوں اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”کیا ہی آ گئیں؟ اتنی رات میں۔“ پھر وہ بولا۔ ”چھا خیر۔۔۔ آہی گئی ہو تو ذرا چائے بناؤ، میں بھی سردو

محسوس کر رہا تھا۔“

”جی۔۔۔“ وہ پلٹی۔

”سنو“ ہاشم کو دفعتاً خیال آیا۔ ”کسی کو بتا کر آئی ہو؟“

عزیزہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی پھر ہنسی سے بولی۔

”جی نہیں رہا عانی!“

”وہ گاؤں وہ قدرے پرہیزگار۔“

پھر جیب سے موبائل نکالتے ہوئے وہ یہ طرہیاں چڑھنے لگا۔



سب لوگ کھانا کھا رہے تھے جب حمزہ نے ہاشم کی کال ریسیو کی۔

”عزیزہ؟“ وہ بولا۔ ”وہ آپ کے پاس ہے؟ کمال ہے یہاں کسی سے کچھ کہہ کر ہی نہیں گئی۔ نہیں۔ اتنے ہنگامے میں کسی کو خیال ہی نہیں آیا۔ اچھا میں امی سے کہہ دیتا ہوں۔“

موبائل جیب میں رکھ کر وہ پھر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا تھا جبکہ قریب کھڑے نافع نے گہرا سانس بھرا تھا۔ کتنی دیر سے اس کی متلاشی نظریں اسے ڈھونڈ رہی تھیں اور وہ بتا کسی کو کچھ بتائے واپس چلی گئی تھی۔ اس کا ذہن یہ معرکہ حل کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اپنی ذات میں ایک عجیب سا الجھاؤ محسوس کرنے لگا تھا۔



”اور کچھ لیں گی آپ؟“ کوئی اس کے بالکل قریب سے بولا۔

ناعیمہ چونک کر مڑی اور ڈر گئی۔ فرزا اس کے عین عقب میں کھڑا تھا۔ ناعیمہ نے اپنی بھری ہوئی پلیٹ پر نگاہ کی اور قدرے شرمندہ سی ہوئی۔

”جی۔۔۔ جی۔۔۔ نہیں شکریہ۔“ وہ ہنسی بولی۔ بروسٹ کا پیس اس کے حلق میں جیسے انکس ہو گیا تھا۔

فرزانے ہاتھ میں تھامی ہوئی پیٹری آگے کی۔ ناعیمہ نے جلدی سے پوٹل تھام کر کھونٹ بھرا۔ وہ بتا کسی تاثر کے اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ناعیمہ نے چند کھونٹ جلدی جلدی بھرے اور پوٹل اسے لوٹانی چاہی تب اس کے چہرے پر دھیمی سی مسکان نرمی کی صورت ابھری۔

بڑھا کے پاس مری اس نے ہاتھ چھوڑ دیا
وہ کر رہا تھا مردت بھی دل ٹکلی کی طرح

وہ دم سردی میں بولا۔ ناعیمہ کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو وہ جلدی سے مڑ کر سردہ کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ فرزا اس کی گوری گردن میں دکتی چین کو دیکھتا رہ گیا تھا۔



ربیعہ کے ذمے انیفقہ نے شہلا کو کھانا کھلانے کی ڈیوٹی لگادی تھی۔ وہ پلیٹ میں چاول اور بروسٹ کا پیس رکھ کر اب پیٹھے کی تلاش میں نظریں دوڑا رہی تھی۔

”اے کیو بیو بیو۔“ کسی نے کھنکھارے ہوئے کہا۔

ربیعہ چونکا۔ اٹھی۔ رافع اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ربیعہ نروس ہوئی پھر ہونٹوں پر رسمی سی مسکان سجا کر اسے دیکھنے لگی۔

”جی۔۔۔ آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“

”جی ہاں“ آپ سے ہی کہا ہے۔“ وہ بھی مسکرایا۔

”جی۔۔۔ جی کہیے۔“ وہ مجبوراً پھر مسکرائی۔

ربیعہ اس قدر کم اعتماد نہ تھی لیکن اس اجنبی کی بھونر سی نظروں میں شوق اور جستجو کی جو حیران کن کیفیت تھی،

اس سے ربیعہ بوکھا اسی جاتی تھی۔

”کچھ۔۔۔ جان سکتا ہوں آپ کے متعلق؟“ وہ جیسے کسی کشمکش کا شکار تھا۔

”جی۔۔۔ مثلاً کیا؟“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”کیا جانتا چاہتے ہیں آپ؟“

”ایسا کیوں لگتا ہے جیسے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟“

”اس لیے کہ آپ نے دیکھا ہے۔“

”کہاں؟“ وہ چونکا۔

”صبح۔۔۔ پارک میں۔۔۔“ آپ کی بارود اعتماد سے مسکرائی۔

”اوہ!“ اس نے جیسے ربیعہ کی حماقت پر تاسف سے سر ہلایا۔ ”میں اس سے بھی پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

لیکن۔۔۔ بقول آپ کے۔۔۔ اس سے پہلے تو آپ اللہ میاں کے پچھواڑے رہتی تھیں۔۔۔ شاید۔۔۔ شاید میں نے

وہیں آپ کو دیکھا ہو۔۔۔ سنا ہے، وہ میں ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں۔۔۔“

وہ بڑبڑایا تھا۔ ربیعہ کی آنکھوں پر گھٹی پلکوں کی چلن آگئی۔

”میں۔۔۔ جاسکتی ہوں؟“

”اوہ!“ وہ ایک طرف ہو گیا۔ ”شیور!“

ربیعہ پلٹیں تھامے آگے بڑھ گئی۔

رات کے دو بجے تھے جب کسی نے اس کا دروازہ بجایا۔ عریشہ جاگ رہی تھی اور نامعلوم اذیت کا شکار ان دو

بے نیاز آنکھوں کو سوچے چلی جا رہی تھی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا تھا۔ وہ اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور دروازہ کھول دیا۔ باہر

فردوس بیگم کھڑی تھیں۔ وہ اسے کڑے تیوروں سے گھور رہی تھیں۔ عریشہ کی نظریں جھک گئیں۔

”آپ۔۔۔ اس وقت!“

”جن ماؤں کی بیٹیاں بے لگام گھوڑوں کی طرح دوڑیں لگائیں“ ان کی نیندیں یونہی روندی جاتی ہیں بیٹی“ وہ طنز

سے بولیں۔

عریشہ ایک طرف میں ہو گئی تھی لیکن انہوں نے کمرے میں قدم نہ دھرا۔

”کسی سے اجازت لیے بنا بھری تقریب چھوڑ کر اکیلی دندنا پی چلی آئیں۔۔۔ اچھا تاثر پڑا ہو گا تمہارے بھیا کے

سرالیوں پر۔۔۔“

”میں۔۔۔ میری طبیعت خراب ہو رہی تھی۔۔۔“

”طبیعت تو تمہاری پچھلے کئی ماہ سے خراب ہے بیٹا! اچھا تاثر رک جائے بیٹھی ہو۔ نہ مرقی ہو، نہ ہمیں جینے دیتی

ہو۔۔۔“

عریشہ کے دل پر چوٹ پڑی۔ اس نے آنسوؤں سے لبریز شکایتی نظریں اٹھائی تھیں۔

”گھر میں اتنے مہمان آئے لوگوں سے واسطہ۔۔۔ بھائی کی خوشی کا موقع۔۔۔ ہمیں کسی شے کا لحاظ نہیں۔ تمہارا

ماتم ہے کہ پورا ہو کر نہیں دیتا۔ ہماری عزتوں کا بھی پاس نہیں نہیں۔۔۔“

”میں نے آخر کیا کیا ہے امی!“ وہ مدھم لہجے میں شکایتا بولی۔ ”آخر کیوں سب لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں؟

آپ لوگ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔“ وہ خود بے اختیار سسکا اٹھی۔

”تم اپنے حال پر توجہ کرو بیٹی! تو کسی دوسرے کو یہ تکلیف کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے۔“

ان کے دل کو بھی اس کی بے بسی دیکھ کر کچھ ہونے لگا تھا۔ انہوں نے لہجہ کچھ نرم کر لیا۔

”بھائی کی شادی کا موقع ہے، اپنے آپ کو کچھ عقل کی بات سمجھاؤ۔ ہماری باتیں تو تمہاری سمجھ میں آتی نہیں

ہیں، اب کسی کو تم سے شکایت نہ ہو۔“

اسے تنبیہ کرتی ہوئی وہ مڑ گئی تھیں۔ ان کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑے فاروق حسن دفعتاً "راہداری میں ہو گئے۔ فردوس بیگم اپنی دھن میں نکلتی چلی گئیں۔
عزیزہ دروازے سے سرٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

رات کے چار بجے کا عمل تھا۔ گھر کے تمام افراد تقرب کے اختتام پر تھک کر چور ہوئے سو رہے تھے۔ رافع دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر سر کے نیچے جمائے سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کے ساتھ کچھ نیا کچھ عجیب ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو ایک آسمانی آہٹل ذہن کے پردے پر لہرائے لگتا۔ دو جنگبوس آنکھیں شرارت سے چمکتیں اور شرم سے جھک جاتی تھیں۔ گلابی منبسم لب مسکان چھپانے کی کوشش کرنے لگتے اور شفاف قطروں سے پیشانی کی خراب نم ہونے لگتی تھی۔

بے چینی حد سے بڑھی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اسے ہاشم کی یاد آئی۔ بے سوچے سمجھے اس نے موبائل اٹھایا اور نمبر پیش کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد ہاشم کی نیند میں ڈوبی آواز ابھری۔
"اے اللہ تیرے سونے کا وقت نہیں ہوا؟"

"یار ہاشم۔۔۔ عجیب سی بے چینی ہو رہی ہے مجھے۔"
"ہائیں؟ ٹھہر۔۔۔ مجھے صبح سے ناظم دیکھنے دے۔ ہائیں! اے اللہ کی دم۔۔۔ یہ اس وقت تجھے کون سی الجھن ستانے لگی؟"

"پتا نہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "جی چاہتا ہے کچھ کہوں۔۔۔ کچھ۔۔۔ کچھ اعتراف کروں۔"
"میں بادری نہیں ہوں میرے بھائی۔!" وہ عاجزی سے گویا ہوا۔ "اور دیکھ۔۔۔ مجھے سونے دے، کل مجھے جاگانا ہے۔۔۔ پلیز۔۔۔ کوئی التماسیدھا اعتراف کر کے کہیں تو میری نیند ہی عائب کر دے۔"
"ابھی سے بے مروتی کا یہ عالم!" وہ چیخ کر بولا۔ "ابھی تو رات بڑی ہے درمیان میں۔"
"ہائیں!" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "رات تو گزرنے والی ہے۔ ہاں پورا دن ضرور پڑا ہے۔ ایک عالم انتظار کا باقی ہے۔"

رافع کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر اسے ہنسی آگئی۔ اس کی ہنسی کی آواز سن کر ہاشم نے پھر ایک سر دھڑک بھری۔ رافع نے ہنسنے ہنسنے موبائل آف کر دیا۔

اس نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر صحن میں اترتی شام کو دیکھا پھر نجانے کیوں وہ خوفزدہ ہو گئی۔ ایک عجیب اضطراب تھا جو اپنا آہنی پنجہ دل کے گرد تنگ کر رہا تھا۔ ایک بے کلی تھی جو کسی طور کم ہونے میں نہ آ رہی تھی۔ ایک بے چینی جو بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اس وقت انیقہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا وہ شیشے کے پار دیکھ رہی تھی۔

"اپنا! شمشلا آہستگی سے مڑی۔

انیقہ اندر چلی آئی۔

پارلر سے یاد دہانی کے لیے فون آیا ہے۔ آپ کو ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچنا ہے۔ ساڑھے چار بج رہے ہیں۔"

شمسلا نے بے جان سی نظروں سے گھڑی کی سمت دیکھا۔

"آپ کبسے چائے بنا دوں؟" انیقہ بھی بے چین اور اداس سی نظر آ رہی تھی۔

شمسلا نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ جانے کے لیے مڑی۔

"سنو۔ انو۔" شمشلا مضطرب ہو کر بولی۔

انہ "رک گئی۔

"عمہ! کہاں ہے؟" اسے میرے پاس بھیج دو۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی غالب آنے لگی تھی۔ انیقہ

ٹرکروکھنے کا حوصلہ نہ کر پائی۔ چپ چاپ سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔
چند لمحوں بعد مسکرا ہوا عمر کمرے میں داخل ہوا تھا۔ وہ شہلا کے قریب چلا آیا۔
”مما۔۔۔ آپ نے مجھے۔۔۔“ وہ جملہ مکمل نہ کر پایا۔

اس کی توجہ بیڈ پر پڑے عروسی جوڑے نے اپنی جانب مبذول۔ کر دی تھی۔
”مما۔۔۔“ وہ پر شوق انداز میں کپڑوں کی طرف بڑھا۔ ”آج آپ یہ ڈریس پہنیں گی؟“

شہلا نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ عمر اس کی جانب مڑا۔

”مما۔۔۔ آج آپ دلنہیں گی؟“ شہلا جزبہ ہو کر رہ گئی۔

”ادھر آؤ چند!“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کا چہرہ غور سے دیکھنے لگی۔ وہ بھی ایک
ٹک اسے دیکھ رہا تھا پھر اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔

”مما۔۔۔ آپ دلنہیں بن کر مجھے ہمیں چھوڑ جائیں گی؟“

شہلا کو یوں محسوس ہوا جیسے عمر نے دو دھاری تلوار اس کے دل پر رکھ دی ہو۔ اس نے یکایک اسے خود سے لپٹا
لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ عمر کے سوال نے اسے سرتاپا ایک کاٹ ڈار احساس سے دوچار کیا تھا وہ دھواں دھار

روتی رہی۔

اس وقت انہیچہ جانے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی، ربیعہ اس کے پیچھے تھی۔ وہ دونوں کچھ وقت اس
کے ہمراہ گزارنے کی غرض سے اس کے ساتھ چائے پینے کے ارادے سے آئی تھیں۔ شہلا کو یوں رونا دیکھ کر

انہیچہ نے جانے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور تیزی سے شہلا اور عمر کے قریب آگئی۔ اور پھر شہلا کے آنسوؤں میں
اس کے بھی آنسو بھی شامل ہو گئے۔ ربیعہ کے لیے یہ رقت آمیز منظر ناقابل برداشت تھا وہ بھی سسک اٹھی۔

کچھ ہی دیر میں وہ سب کی سب دھواں دھار رو رہی تھیں۔ یکایک کمرے کے دروازے پر منیوہ بیگم نمودار
ہوئیں اور ہکا بکا کہہ نکلیں پھر وہ اندر آکر شہلا کو پیار سے چپ کروانے لگیں۔

”بس بیٹی۔۔۔ اب یہ آنسو پوچھو اور نئی زندگی کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہو۔ بھول جاؤ ان آنسوؤں کو۔۔۔
خوشیاں تمہاری یاد رکھ رہی ہیں۔“

شہلا آنسو پوچھنے لگی۔

”فراز تمہارے کپڑے اور زیور مانگ رہا ہے وہ تمہیں پارلر لے جانے کے لیے آیا ہے۔“
انہیچہ بھی اٹھ کر چھوٹے سے بیگ میں شہلا کا عروسی جوڑا اور زیورات کے ڈبے رکھنے لگی۔ ربیعہ نے گم صم

سے عمر کو خود سے لپٹا لیا اور چومنے لگی۔
”اپیاسے۔۔۔ آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں۔۔۔“ وہیں سمجھیں عمر کے لیے میں آپ کی جگہ لے رہی ہوں۔ میر

اے آپ سے زیادہ چاہنے کا دعوا تو ہمیں کر سکتی لیکن عمل میں کوئی کسر نہ چھوڑوں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ
ہے۔“ ربیعہ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تھی۔

شہلا قدرے ہلکے ہلکے انداز میں مسکرائی۔

”شکریہ ربیعہ۔۔۔ اُم نے یہ چند الفاظ کہہ کر مجھے بہت تسلی دی ہے۔“

”گویا میری جانب سے آپ کو کوئی شک تھا؟“ انہیچہ نے آنکھیں نکالیں۔

”تم میرے بیٹے کو ذرا مٹی بہت ہو۔“ شہلا دھیرے سے ہنسی۔ ”شکایتیں لگاتا ہے یہ تمہاری۔“

”روز ملوانے لاؤں گی آپ سے۔۔۔ پھر پوچھیے گا اس سے۔“ انہیچہ نے عمر کو گد گدایا۔

شہلا کچھ سوچنے لگی تھی منیوہ بیگم نے دھیرے سے اس کا شانہ دیا، وہ چونکی۔

”چائے پی لو تو چلو۔ پارلر جانے کا نام ہو چلا ہے۔“

ربیعہ ٹرے کی جانب بڑھ گئی۔



قد آدم آئینے میں وہ خود کو ہر زاویے سے چیک کر رہا تھا۔ نگاہوں میں تشویش کی لہرں تھیں۔ عقب میں کھڑے رافع نے بمشکل مسکراہٹ لبوں میں دبائی اور بظاہر اپنی ٹائی درست کرنے لگا۔
”پاراشاعرے!“ پھر وہ بولا۔ ”یہ ٹائی اچھی تو لگ رہی ہے ناس سوٹ کے ساتھ؟“ رافع نے تھوڑا سا بن کر اسے دیکھا پھر بے نیازی سے بولا۔

”ہاں ٹائی تو اچھی لگ رہی ہے۔“

”نبائی تو؟“ یہ ”تو“ کا کیا مطلب؟ خراب کیا لگ رہا ہے؟“

رافع نے بغور اس کا منہ دیکھا پھر یوں خاموش ہوا جیسے اپنے عمل سے اس نے اس بات کا جواب دے دیا ہو۔ ہاشم اس کی بات سمجھ کر بے مزہ سا ہوا اور غور سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگا۔ رافع کی ہنسی جھوٹ تھی۔ ہاشم نے اس کی پیٹھ پر گھونسا رسید کیا۔

”تیرے نصیب میں بھی خدا نے ایسا دن لکھا ہو گا پھر ہم بھی ایسے ہی بنیں گے۔“

رافع کی ہنسی یک لخت رک گئی وہ پھر سے ٹائی کی جانچ کرنے لگا۔ ہاشم نے بغور اس کی یہ حرکت دیکھی۔
”رات تو نے مجھے چار بجے فون کیا۔ کس خوشی میں؟“

”بس یونی۔“ رافع بیٹھ کر جوتے پہننے لگا۔ ”نیند نہیں آ رہی تھی۔“

ہاشم اب خود سے مطمئن ہو چلا تھا۔ لہذا سرسری سا آئینہ دیکھنے لگا۔

”اور وہ اعتراف؟ جو وقت تہجد نازل ہوا۔ وہ کیا تھا؟“

”اعتراف؟“ رافع یوں بنا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ”کون سا اعتراف؟“ ہاشم نے پھر ایک دھوکا سے رسید کیا۔ رافع کراہ اٹھا۔

”اوہ۔ کچھ نہیں یاد۔ ایسے ہی تجھے چھیڑ رہا تھا وقت تجھ۔ تو ج سمجھ بیٹھا۔“

”اور جو میرے منہ سے کچھ نکل جاتا انا سیدھا۔ پھر؟ قبولیت کا وقت تھا۔“

”قبولیت کا؟“ رافع سوچنے لگا۔ ”قبولیت کا وقت تھا؟“

اسی لمحے کمرے میں حمزہ نے جھانکا اور اپنے دانتوں کی نمائش کی۔

”حضرات۔ وقت سہرا بندی ہوا چاہتا ہے۔ ابوی دونوں ہاتھوں میں سہرا تھامے دولہا کے منتظر ہیں۔“

تشریف لے آئے۔

”س۔ سہرا۔؟“ ہاشم کو جھنکا سا لگا۔ ”یعنی کے سہرا؟ میں سہرا باندھوں تو پیس پر؟“

رافع اور حمزہ ہنسنے لگے۔

”وہ بھی نوٹوں کا۔ ہزار ہزار کے نوٹ ہیں آپ کے سرے میں۔“ حمزہ پھر بولا۔

”نوٹوں کا سہرا؟“ ہاشم کو پھر کرنت لگا۔ ”او خدا کے لیے بھائیو۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ میں سترہویں صدی کا

لہری نما دولہا نہیں ہوں۔ اندھوں کی طرح کہاں ٹانگ ٹوئیاں ماروں گا؟“

کمرے میں رافع اور حمزہ کے قہقہے گونجنے تو علی اور رافع بھی چلے آئے۔

”تو بے فکر رہ۔ ہم ”خیر“ تک تیرے ساتھ رہیں گے۔“ رافع شرارتا بولا۔

”خیر تک؟“ اس نے اب روچھا ہے۔ ”کیا مطلب؟“

”میرا مطلب ہے۔ جب تک تو اپنے سہارے آپ جلنے کے قابل نہیں ہوتا تب تک۔“

”میں ہرگز سہرا نہیں باندھوں گا۔“ وہ جگڑا۔ ”اور وہ بھی نوٹوں کا سہرا۔“

”سوچ لے۔ نایابو کو غصہ آگیا تو جوتوں کا سہرا باندھ کر لے جائیں گے۔“ رافع نے دھمکایا۔

”اچھا۔“ وہ سہم گیا۔ ”پھر نوٹوں کا ہی سہی۔ بائے داوے۔ کل کتنے نوٹ ہوں گے اس میں لگ بھگ؟ ہنہی

کا بندوبست ہو جائے تو میں یہ قربانی بھی دے سکتا ہوں۔“

”صدمہ تو جاواں۔“ علی نے دانت نکالے ”بھائی جان۔ محتاط رہیے ہزار کاواں میں صرف ایک نوٹ ہے باقی سب پانچ کے نوٹ ہیں۔“

”پانچ کے نوٹ؟“ وہ چنچا۔ ”وہ تو کب کے متروک ہو چکے ہیں۔“

”جب ہی تو ابوجی نے نوٹوں کا سہرا بنوایا ہے۔ صرف بنوائی کے پیسے دیے ہیں انہوں نے۔“

”یا خدا۔“ ہاشم کو چکر آگیا۔ اسی لمحے ہانپتی کانپتی فردوس بیگم نمودار ہوئیں۔

”ارے بیٹا۔۔۔ سب کے سب ہی دو لہا بن رہے ہو کیا؟“ وہ خفگی سے بولیں۔ ”نیچے ہال میں ایک لڑکا نہیں جو

ہمارے کچھ کام آئے۔ اور ہاشم بیٹے! تیار ہو تو چلے آؤ۔ رات لے جانے میں اب کون سی کسر ہے؟“

”امی جی۔ میں سہرا نہیں باندھوں گا۔“

”سہرا۔۔۔؟“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”کون سا سہرا۔۔۔؟ تمہارے ابا میاں نے تو صرف پھولوں کے ہار منگوائے

ہیں رسم کے لیے۔“

ہاشم نے غصے سے مٹھیاں بھیجنے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا لیکن وہ گدھے کے سر سے سینک کی مانند غائب تھا۔

اس نے انقبہ کا لائٹ بریل غرارہ سوٹ پہنا تھا۔ لباس اس پر اس طرح سے سجا تھا جیسے اسی کے لیے بنا ہو۔ ڈریسنگ روم سے نکلتی انقبہ ٹھنک کر رک گئی۔

اس کے لانے سیاہ بال کمر سے نیچے تنک اپنی چھب دکھلا رہے تھے گوری رنگت ذرا سے میک اپ سے دمک اٹھی تھی۔ سیاہ آنکھوں کو لائٹ نے نمایاں کر دیا تھا۔ نیٹ کا بڑا سا ہم رنگ دوپٹہ اوڑھے وہ کوئی مغل شاہ زادی لگ رہی تھی۔

”بیوی فل!“ بے ساختہ ہی انقبہ کے لبوں سے نکلا۔ ”ریجہ۔۔۔ ریجہ۔۔۔ یہ تم ہی ہونا۔“ ریجہ شرما سی گئی۔

”بس ایک کمی ہے۔“ انقبہ اس کے قریب آتے ہوئے بولی۔

ریجہ اسے دیکھنے لگی۔

”جیولری کی۔۔۔ گردن بھی خالی ہے اور کانوں میں بھی کچھ نہیں۔“

”اسی لیے میں اس کے لیے یہ لائی ہوں۔“ منیزہ بیگم کی آواز پر دونوں پلٹیں۔ وہ ہاتھوں میں جیولری باکس

تھامے کھڑی تھیں۔

”ریجہ۔۔۔ تم یہ پہن لو۔۔۔ یہ میرا سچے موتیوں کا سیٹ ہے۔ تمہارے اس لباس کے ساتھ بہت اچھا لگے گا۔“

”آئی۔۔۔ لیکن۔۔۔“ وہ ہچکچائی۔

”اور اب مجھے ای، کہا کرو۔ میری بیٹیوں جیسی ہو تم۔“ انہوں نے ڈب۔ اسے تھما دیا پھر وہ انقبہ کی جانب متوجہ

ہوئیں۔ ”تم بھی نناٹ تیار ہو جاؤ۔۔۔ ہال پہنچنے میں بھی ٹائم لگے گا۔“

”بس امی جی۔ میں یوں تیار ہوئی۔“ اس نے چٹکی بجائی۔

ریجہ ڈبہ تھامے کھڑی رہ گئی تھی۔ محبتوں کی خوشبو اس کے ارد گرد بکھر رہی تھی۔ اس کا وجود پھول بن کر کھلنے

لگا تھا۔

عاشق اندر داخل ہوتے ہی ٹھنک کر رک گیا تھا۔ سفید موتیوں کے کام والے فیوزی لباس میں ملبوس ایقان کی

آج چھب ہی نرمالی تھی۔ عاشق کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اس کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ ایقان نے ایک بے

بازی سے نظر اس پر ڈالی اور پھر اپنی لپ اسٹک درست کرنے میں مگن ہو گئی تھی۔ کھلے ہوئے براؤن بال اس کی

پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا بے پروا قاتل روپ جلیاں گرانے پر آمادہ تھا۔

عاشق نے اس کے قریب آکر اسے کمر سے تھام لیا اور اپنا چہرہ اس کے شانے پر ٹکا دیا۔ ایقان گڑبڑا گئی۔

”عاشق۔۔۔ عاشق۔۔۔ دروازہ کھلا ہے۔ کیا کر رہے ہو۔۔۔“

”ایسا کچھ نہیں جس کے لیے دروازوں کا دھیان رکھا جائے۔ یونہی قریب سے دیکھ رہا ہوں تمہیں۔“ وہ آئینے میں اس سے نگاہیں چار کرتے ہوئے شوخی سے مسکرایا۔

”اوں ہوں۔“ وہ کسمائی۔ ”ذرا دور سے دیکھو تو اچھا ہے۔ یہ میرا میکہ ہے۔ ابھی میرے ایک اشارے پر میرے بھائی بند آجائیں گے۔ سمجھ۔“

”او فوف۔“ وہ ہنس دیا اور قریب رکھے اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ”بڑا ٹھیکہ ہے بھائی بندوں کا۔ ذرا بلاؤ تو۔ ہم نے بھی کو تو آل نہ بلوایا تو کہنا۔“

ایقان نے بڑے ناز سے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا اور نخوت سے ناک سکڑی۔

”اڑی رہا آجائیں ہم تو کو تو آل بھی کچھ نہ کہائے۔ یاد رہے۔“

”اور ہم اگر ضد پر آجائیں تو بھری محفل میں بھی منہ چوم لیں گے تمہیں بھی یاد رہے۔“

”اوہ۔“ وہ ہاتھ میں پکڑی لپ اسٹک میز پر رکھ کر اسے مصنوعی حیرت سے دیکھنے لگی۔ ”دو بچوں کی ماں کا منہ چومتے شرم نہ آئے گی آپ کو؟“

”اوں ہوں۔ تم کو تو ہم کسی چار بچوں کی۔“

”عاشق۔ عاشق۔“ ایقان نے ہنر برش سے اسے دو تین ضربیں لگائیں۔ ”جاؤ یہاں سے۔ مجھے تیار ہونے دو۔ جاؤ۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا! اس نے اطمینان سے نفی میں سر ہلایا۔

ایقان جبرج ہوئی تب ہی عاشق کا موبائل بجنے لگا ٹون سنتے ہی عاشق اٹھ کھڑا ہوا۔

”او کے تم جلدی تیار ہو میں ذرا فون سن لوں۔“ وہ تیزی سے کمرے سے نکلا تھا۔ ایقان دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی آئینے کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”فار گاڈ سیک۔ کیوں تنگ کر رہی ہو۔“ عاشق راہداری میں آتے ہوئے دلی دلی آواز میں غرایا

”تم مجھے تنگ کر رہے ہو۔ ڈارلنگ اور کتنا امتحان لوگے۔“ وہ انداز سے بولی۔

”لڑا۔ میں تمہیں کتنا سمجھا کر آیا تھا لیکن۔۔۔“ وہ فرج ہوا۔

”لیکن سمجھ پاتی تب نہ۔ کب آؤ گے؟“

”میں بھی تو مہینہ پڑا ہے تم آرام سے رہو۔“

”آرام؟ تمہارے بغیر؟ No way۔“

”کچھ نہیں ہو سکتا!۔“ وہ بے رخی سے بولا۔

”میں پاکستان آ جاؤں؟“ وہ فراخ دلی سے بولی۔

”لڑا!۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”پنے حواسوں میں رہو اور یاد رہے اب فون مت کرنا۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

سامنے سے علی اور نافع آرہے تھے۔ عاشق نے فون آف کر کے جیب میں ڈالا اور مسکراتے لگا۔

”چلیں عاشق بھائی۔ بارات بالکل تیار ہے۔ دو لہا ایک دم ریڈی۔“ نافع بولا۔

”چلو۔ میں ایقان کو لے کر آتا ہوں۔“ وہ جلدی سے کمرے کی جانب مڑ گیا۔

بارات بہت شان سے اتری تھی اور ہاشم بے حد ارمان لیے گاڑی سے باہر آیا تھا۔ رنگ و بو کا عجب سا تھا۔ ہر سوبہاری بہار تھی۔ مسکراتے، جھللاتے چہرے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

ربیعہ نور انقہہ خواتین کو گھر سے پیش کر رہی تھیں۔ تب ہی ایقان سے کوئی مشورہ کرتے رافع کی نظر اس کی جانب اٹھی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے غم صم سا ہوا۔

”لیکن بھائی صاحب کو ہوا کیا اچانک؟“ ایقان کچھ ہٹنا کر پوچھ رہی تھی۔ رافع چونکا اور جلدی سے کھٹکھا را۔

”پتہ نہیں۔۔۔ وہ جہات کا علم نہ ہو سکا لیکن اصرار میں بے حد شدت ہے۔۔۔ داوی جان راضی ہیں۔“
 ”اچھا۔۔۔ اماں بھی مان گئیں؟ اور اصل پارٹی؟ اس سے کسی نے پوچھا؟“
 ”اباجان اور تایا اب اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔
 ”کمال ہے! کہنی تک ہے بھلا۔“ اس نے خفگی سے سر جھکا ”اب میں کیا کر سکتی ہوں؟“
 ”آپ سے انہوں نے عریشہ کو سمجھانے کے لیے کہا ہے۔۔۔ بلکہ بتانے کے لیے۔۔۔“
 ”یا اللہ!“ اس نے سر تھام لیا۔

”قاضی صاحب کو میں لے کر آتا ہوں آپ اسے بھی وہاں لے آئیں۔“
 وہ کہہ کر آگے بڑھا۔ تب ہی اس نے پھر ایک اچھتی سے نظر اس پر ڈالی تھی۔ مسکراتی ہوئی رعبہ بھی کسی سے بات کرتے ہوئے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ رافع کو متوجہ پا کر اس کی نظریں فوراً سمجھ گئیں۔

ڈرننگ روم کے قد آدم آئینے میں شملہ کو اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ موو اور لائٹ گرین کامبی نیشن کے غریب سوٹ میں اسے اپنا آپ اجنبی لگ رہا تھا۔ یہ وہ شملہ تو نہیں تھی جسے وہ اب تک دیکھتی آئی تھی یہ تو کوئی اور ہی تھی۔

اجنبی سا چہرہ!

اجنبی سی سوچیں!

اجنبی سی راہیں!

سب کچھ کسی سے اوارہ مانگا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ گم صم سی بیٹھی تھی جب دروازہ کھلا اور بلخاری ہوئی۔ ایقان، ورہ، ثانیہ، عذرا، بیگم ہستی مسکراتی اندر چل آئی تھیں۔ شملہ کی نظریں جھک گئیں۔
 ”ہائے سہیلی۔۔۔ آج تو پہچانی نہیں جا رہیں۔“ ایقان نے اسے گدگدایا ”وہ میری سادگی اور متانت کا نمونہ بنے رہنے والی دوست کہاں ہے؟“
 شملہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”غیر خیر۔۔۔ مجھے اس کی کچھ ایسی تلاش بھی نہیں۔۔۔ یہ نئی دوست مجھے زیادہ بھائی ہے۔۔۔ خدا کرے کہ ہمیشہ تمہیں ایسا ہی سجا بنا مسکراتا دیکھوں۔۔۔“
 ایقان نے اس کا گال چوم لیا۔ شملہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ سب کی نظریں اس کے اس انمول روپ کو سراہ رہی تھیں۔

تب ہی دروازہ کھلا اور فردوس بیگم عریشہ کو لیے چلی آئیں۔ ان کے چہرے پر پریشانی رقم تھی عریشہ کا چہرہ از حد تباہ ہوا تھا۔ شملہ کے مدھم سر میں کیسے گئے سلام کا بھی وہ جواب نہ دے پائی تھیں۔
 ایقان اور عذرا بیگم نے ایک دوسرے کو بے بس نظروں سے دیکھا۔ ورہ، ثانیہ نظریں چرانے لگیں۔
 ”سی۔۔۔ لمبے رافع اور عاشر قاضی صاحب کو لے کر وہاں چلے آئے تھے۔ پیچھے عباد اور فراز تھے۔ خواتین دو دروہو گئیں۔ فردوس بیگم نے عریشہ کا بازو پکڑ کر اسے شملہ کے قریب بٹھا دیا اور اس کا دوش اس کے سر پر ڈال دیا۔ سب دم بخود تھے۔

قاضی صاحب نے شملہ سے ایجاب، قبول کروایا۔ اس نے سر جھکائے جھکائے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ مبارک سلامت ہوئی۔ پھر وہ عریشہ کی جانب متوجہ ہوئے۔

”عریشہ بی بی۔۔۔ آپ کو بعض پچاس ہزار روپے سکہ رائج الوقت میاں نافع حسن ولد سلجوق حسن کے نکاح میں آنا منظور ہے؟“

عریشہ پتھر کے بت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ ایقان اور ورہ نے پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شملہ متوجہ تھی۔

قاضی صاحب نے اپنا سوال دہرایا۔ تب اس نے کاٹ دار لگاؤں کا ذکر کرنا شروع کیا۔ بھادو کے پہلو میں کھڑے فراز کو دیکھا تھا۔ وہ نظریں جھکائے، سینے پر بازو لپیٹے بے نیازی سے کھڑا تھا اور اپنے جوتوں کی شیب پر غور کر رہا تھا۔ عریشہ کے سینے میں سانس اٹکنے لگی۔

”بیٹی! جواب دو۔“ قاضی صاحب نرمی سے بولے۔

”ہاں!“ وہ چپٹی۔۔۔ ”منظور ہے منظور ہے مجھے منظور ہے۔“

سب چند لمحوں کے لیے دم بخود ہو گئے تھے۔ قاضی صاحب قدرے بوکھلائے۔ حتیٰ کہ بے نیازی سے کھڑا فراز بھی بے طرح چونکا۔

”اُدھر دستخط کر دینی!“ قاضی صاحب نے جیسے اس کے رویے پر غور کرتے ہوئے کاغذات آگے بڑھائے تھے۔ اس نے جھپٹ کر کاغذات لیے اور دھڑا دھڑساؤں کرتی چلی گئی۔ پھر وہ اٹھی اور فائل وہاں رکھ کر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ وہاں موجود افراد ایک دوسرے کے چہرے پر اس کے رویے کی وجہ کھوج رہے تھے۔ فردوس بیگم بھی چپکے سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

عاشق نے بے وجہ کھنکھار کر گلا صاف کیا اور گواہ کے طور پر دستخط کرنے لگا۔

عریشہ کے اصرار پر حمزہ اسے گھر چھوڑ آیا تھا۔ تھوڑی بہت بد مزگی جو چند افراد نے محسوس کی تھی وہ کچھ ہی دیر میں ماحول کی ست رنگی اور تازگی میں گھوٹ گئی تھی۔ سب ہی نے ہاشم میاں کی بے پناہ خوشی اور مسرت کو محسوس کیا تھا اور نئے جوڑے کے لیے دعا مانگیں کی تھیں۔

وقت رخصت شہلا کی متلاشی نظروں کا عندیہ پکارا نیچے چپکے سے اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔

”عمرو کو فراز کے ساتھ مصروف کیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں میں اسے صبح ضرور لے کر آؤں گی۔“

اس کی سرگوشی شہلانے اور شہلا کے عین عقب میں موجود ہاشم نے بھی سنی تھی۔ انہی کی بات پر شہلا برا اختیار ہی رو پڑی تھی۔ پھر منہ پر بیگم، عماد اور پھر ربیعہ سے گلے لگ کر وہ سسکتی ہی رہی۔

ہاشم نے قدرے پیچھے ہو کر برابر کھڑے رافع کے کان میں کچھ کہا۔ رافع خاموشی سے مڑ گیا تھا۔ پھر بھی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر شہلا زندگی کے نئے سفر پر روانہ ہو گئی۔

کرشل کا گلہ ان زور سے ڈرائنگ ٹیبل کے آئینے سے ٹکرایا۔ گلہ ان وہ میز اور پھر فرش پر گر ا اور چکنا چور ہو گیا۔ آئینہ چٹخ کر کئی حصوں میں بٹ گیا تھا۔ پھر شیشے کا ننھا ساج محل دیوار پر لگا اور زمین پر گرنے سے پہلے ہی کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ چینی کی گڑیا، پلاسٹر آف پیرس کا مجسمہ اور ایسے ہی کئی شو پیس کمرے میں ادھر سے ادھر جا کر گرے۔ اور انجام کو پہنچے گئے۔ اس کے بعد بستر کے تکیے، بیڈ شیڈ، میک اپ کا سامان، سی ڈیز، کتابیں غرض کہ کچھ بھی اس کے جنون اور وحشت سے محفوظ نہ رہا یا۔ ایک کے بعد ایک وہ ہر چیز کو توڑتی اور بھینتی چلی گئی۔ ایک عالم جنون تھا جو اس پر طاری تھا۔ اس کی روح کسی نادیدہ قوت سے مصروف جنگ تھی۔ دماغ تو شاید کہیں تھا ہی نہیں، صرف اور صرف وحشت کا راج تھا۔

پھر اس نے چیخ چیخ کر رونا چاہا مگر اس کی آواز گلے سے نکل نہ پائی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ گوشت ہو گئی ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس نے دیکھنا چاہا مگر اسے کچھ بھائی نہ دیا۔ غم وغصے کی بے پناہ شدت نے شاید اسے اندھا بھی کر دیا تھا۔ اس نے خود کو آواز دینا چاہا لیکن اسے اپنی ہی بیکار کا جواب نہ مل سکا۔ وہ شاید خود سے بھی بچھڑ گئی تھی! وہ دنیا میں بالکل اکیلی۔ اندھی، بھری اور گوشتی ہو گئی تھی۔ اس سوچ نے اسے لرزاکر رکھ دیا۔ بیٹی پھٹی آنکھوں سے گرد پیش کو دیکھتے ہوئے وہ خود کو بیکار نے لگی غبار بیٹھنے لگے، وحشت شانت ہونے لگی،

عریشہ تھک کر گہری گہری سانس بھر نے لگی تھی۔ اسی لمحے شنائیوں کی آواز سے گھر کے در و دیوار گونج اٹھے۔

بارت دلمن کو لے کر آچکی تھی۔

شہلا کو باہن اور ایقان نے اس کے کمرے تک پہنچایا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ اور خوب صورتی قابل دید تھی۔ دن بھر راف، نافع، حمزہ، علی اور خود ہاشم میاں بھی کمرے میں موجود رہے تھے اور اب وہ لوگ ان کی محنت کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ بیڈ کے پتھوں بیچ گلاب کی سرخ، نرم پتیوں سے بڑا سادل بنایا گیا تھا۔ جبکہ بیڈ کے چاروں جانب گلابی اور نارنجی پھولوں کی لڑیاں تھیں۔ کمرے میں جا بجا گلدستے سجے ہوئے تھے جن کی منہک سے ماحول میں حسن، محبت اور انتظار کی سب سے کیفیتیں نمایاں تھیں۔

ایقان اور باہن سحرانگیز ماحول کو زیادہ دیر سہ نہ پاسیں۔ وہ شہلا کو خدا حافظ کہہ کر باہر چلی گئیں۔ یوں بھی لڑکے لڑکیوں نے چھت پر رت جگے کاروگرام بنایا ہوا تھا اور ان کا خوب خوب ہلا گلا کرنے کا پروگرام تھا۔ شہلا ایک نامعلوم سی کیفیت کا شکار تھی، بھاری بھاری سے پوٹے اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سب سے کچھ محبت کی طرح خوب صورت تھا۔

تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونکی تھی۔
 ”ماما...“ چنکتی ہوئی آواز سن کر شہلا کا اپنا دل بھی جیسے چمکا تھا۔
 سارا منہ عمر کھڑا تھا۔ شہلا کی آنکھوں میں بے ساختہ چمک نمودار ہوئی تھی۔
 ”عمہ...“ انتہائی حیرت اور مسرت سے اس نے کہا تھا۔
 وہ دوڑ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔

”واؤ ماما! اب کچھ زبردست ہے۔ اب ہم یہاں سویا کر س گے؟“
 ہلکی سی ہنسی کی آواز کے ساتھ محتاط سی کھنکھار تھی۔ شہلا چونکی، سامنے ہاشم مسکرا رہا تھا۔
 ”آؤ اب! اسے اپنی جانب دیکھنا پتا کروہ شوخی سے بولا۔ شہلا قدرے جڑبڑہوئی۔
 ”یہ... عمر؟“ اسے اور کچھ نہ سوچا۔

”رؤ نمائی کا تحفہ سمجھ لیجیے۔ آپ وقت رخصت بے حد اداس تھیں۔ ہمیں اپنے دل کی توہین محسوس ہوئی سو حال دل کرنے سے پہلے آپ کی اداسی دور کرنا مناسب جانا۔ کہیے... تحفہ پسند آیا؟“
 وہ بھی قریب آ بیٹھا تھا۔ عمر نے حیرانی سے باری باری دونوں کو دیکھا۔
 ”کون سا تحفہ انکل؟“ وہ بولا۔

ہاشم ہنس دیا اور اس کے گال پر چمکی بھری۔
 ”ہے ایک پیارا سا تحفہ۔ اور یار! اب یہ انکل و نکل چھوڑو۔ پہا کہا کرو!“
 ”پہا؟“ اس کی شفاف آنکھوں میں حیرت چمکی۔ ”پہا تو میرے ہیں نا؟“
 شہلا کا دل عجیب انداز میں دھڑکا تھا۔ ہاشم ہنس دیا۔
 ”ضرور ہیں جناب۔ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں۔ چلو یوں کرو، بابا کہہ لیا کرو بابا جانی!“

”یہ ٹھیک ہے!“ اس نے اطمینان سے سر ہلایا۔
 ”مگر بوائے!“ ہاشم نے اس کے بال سہلائے۔
 شہلا نے جھکی جھکی نظریں اٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔ وہ عمر کی جانب متوجہ تھا۔ دو لہا کے روپ میں اس کی مردانہ ہمت بے حد نمایاں تھی۔ اعتماد اور اعتبار نے اس کی شخصیت کو چار چاند لگا دیے تھے۔ اس کی نظروں کو محسوس لڑکے ہاشم نے جھٹ اس کی چوری پکڑنے ہوئے اسے دیکھا۔ شہلا نے نظر چرائی وہ کھل کر مسکرایا تھا۔
 دروازے پر دستک دے کر انہی قہار و ربیعہ اندر داخل ہوئی تھیں۔
 ”السلام علیکم...“ وہ دونوں کھلی کھلی نظر آ رہی تھیں۔
 ”و علیکم السلام جیتی رہیے۔“ ہاشم چمکا۔

”یہ آپ بہن کے ساتھ ساتھ ہمارا بھانجا بھی لے آئے ہاشم بھائی! ناٹ فٹو!“ انیقہ مصنوعی خفگی سے بولی۔
 ”جناب!“ وہ سرخم کرتے ہوئے بولا ”ان کو قبول کیا ہے تو ان کے ساتھ وابستہ ہر شے کو قبول کیا ہے ہم نے اور
 جہاں تک آپ کے بھانجے کا تعلق ہے تو یہ جتنا آپ کا ہے اس سے زیادہ ہمارا ہے اب۔۔۔ یاد رہے!“
 ”بالکل، بالکل۔۔۔“ وہ گرم جوشی سے بولی۔ ”لیکن فی الوقت ہم اسے ساتھ لے جا رہے ہیں اس کے بغیر ہمارا
 دل لگنا محال ہے وہاں چلو عمر!“

”اوں ہوں!“ اس نے منہ بتایا ”میں یہاں رہوں گا۔۔۔ آپ لوگ جائیں!“
 ہاشم نے مسکراہٹ چھپانے کو منہ پھیر لیا۔ شہلا کا سر جھک گیا تھا۔
 ”۔۔۔! رعبہ نے پکارا۔“ ”یہاں دیکھو میری طرف۔ میرے ساتھ نہیں چلو گے؟ اچھی دوستی کی ہے تم نے۔“

وہ جھٹ شہلا کے پاس سے اٹھ کر رعبہ کے پاس چلا آیا۔
 ”میمما! میں صبح آؤں گا۔“ اپنی جانب سے اس نے شہلا کو تسلی دی تھی۔ سب ہی کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ
 گئی تھی۔ رعبہ نے اسے گود میں اٹھالیا تھا۔
 ”پاپا۔۔۔! ہم سب آئیں گے صبح۔“ انیقہ بولی تھی۔

شہلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ دونوں باہر کی جانب بڑھ گئیں۔

شہلا نے سکون سے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے گہرا سانس بھرا تھا۔ تب ہی اس نے اپنے چھوٹے
 برس میں ارتعاش محسوس کیا۔ حیران ہوتے ہوئے اس نے پرس میں سے اپنا سیل فون نکالا اور پھر کانپ کر رہ گئی۔
 اسکرین پر ابراہار جیلانی کا نمبر چمک رہا تھا۔ شہلا لمحہ بھر میں پسینہ پسینہ ہو گئی۔
 ”فینلو۔۔۔“ اس نے بجلی کی سرعت سے کال اٹھینڈ کی۔

”شہلا!“ دوسری جانب اس کی گھبیر آواز ابھری تھی۔ ”مبارک ہو۔“
 شہلا سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ بت کی مانند موبائل کان سے لگائے ہوئے تھی۔

”میں نے تمہیں شادی کی مبارک باد نہیں دی ہے جانو!“ وہ جیسے نیند میں بول رہا تھا۔ شہلا کی آنکھیں پھٹ
 سی گئیں۔

”میں نے تمہیں۔۔۔ اپنا ملن قریب سے قریب تر ہونے کی مبارک باد دی ہے۔۔۔ اس کمزور۔۔۔ بے جان رکی
 تعلق کو جلد از جلد ختم کر کے۔۔۔ مجھ تک لوٹ آؤ شہلا! میں تمہارا منتظر ہوں

”Waiting for you Darling“

شہلا نے فون آف کیا اور بے جان ہاتھوں سے ایک طرف ڈال دیا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔
 مسکراتا ہوا ہاشم کمرے میں داخل ہوا تھا۔ کچھ دیر وہ دروازے کے قریب کھڑا رہا پھر دروازہ لاک کر کے آہٹلی
 سے چلتا ہوا اس کے قریب آ بیٹھا۔

”شہلا!“ اس کے کنبے میں دھنک کے سب ہی رنگ تھے۔ شہلا سمٹ گئی۔

”جذبوں کی کہانی۔۔۔ کہاں سے شروع کروں۔۔۔“ اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھاما پھر وہ اس کی گود میں
 رکھ کر لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے شہلا کے بالوں کی لٹ کو چھوا اور مسکرا دیا۔

”سننا ہے گندہ پیڑیں۔۔۔ جہاں پر کھوئی جاتی ہیں۔۔۔ وہیں سے مل بھی جاتی ہیں۔“

وہ دھیرے سے بولا پھر آنکھیں کھولی کہ اس کی لرزتی پلکوں کو دیکھنے لگا۔

”تمہارے بالوں میں میرا بنن تو نہیں ہو گا لیکن میرا دل کیس پر اٹکا ہوا مجھے ضرور مل جائے گا اجازت!۔“

”دھونڈ لوں؟“

شہلا نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔ وہ کیا کہتی؟ ہاشم نے جو کچھ بھی کہا اس نے ایک لفظ نہ سنا تھا۔ اس
 کانوں میں تو ابراہار کا لفظ لفظ گونج رہا تھا۔

”اس کمزور۔۔۔ بے جان رسمی سے تعلق کو ختم کر کے مجھ تک لوٹ آؤ شملا!“
 “Waiting for you Darling”

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے وہ قدرے خم صم سی بیٹھی تھی۔ واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی وہ جیسے چونک کر خود میں واپس آئی۔ لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ سجائے فریش فریش سا ہاشم ہاتھ گاؤن میں ملبوس باہر نکلا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں تیزی سے بالوں میں چلاتے ہوئے وہ اس کے عقب میں آکھڑا ہوا۔

شملا بھی خاموشی سے برش کرنے لگی تھی۔ ہاشم نے آئینے میں نظر آتے اس کے عکس کو بغور دیکھا۔ لائٹ تنک نیٹ کے لمباس میں وہ بے حد سادگی کے عالم میں بھی بجلیاں گرا رہی تھی۔ سیاہ بالوں کی بدلی نے اس کے پرکشش سراپے کو مزید جاذبیت بخش دی تھی۔

کانوں میں ہیرے کے ننھے آؤرے دیکر رہے تھے۔ اسے اپنی جانب متوجہ کرنا شملہ نے خاموش نظریں اٹھا کر اس کی چمکتی آنکھوں میں دیکھا پھر پلکیں گرا لیں۔

”کیا بات ہے شملہ؟“ ہاشم قدرے جھک کر بولا تھا۔ ”گریز کے اس پردے کو درمیان سے ہٹا کیوں نہیں دیتیں تم؟ کھل کر مسکراؤ۔۔۔ کھل کر دیکھو۔۔۔ کھل کر اپنی لگو۔۔۔ یہ کیا کہ بے مری کی یہ چادر تم ساتھ ساتھ لیے چلی آئیں۔“

وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے آیا تھا۔ شملہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ہاشم بھی بے ساختہ ہی سیدھا ہوا تھا۔ ”شملا کو اپنے ردِ عمل کی مناسب وجہ نہ سوچی۔“ دروازے پر کوئی ہے۔“

”اچھا!“ ہاشم متعجب ہوا۔ ”دستک ہوئی ہے؟“

ابھی شملہ کوئی جواب سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر کچھ دستک ہوئی۔

”ریٹلی!“ ہاشم دھیرے سے ہنس دیا۔ ”میں کچھ زیادہ ہی بے خود ہو گیا تھا شاید۔“

ہاشم دروازے کی جانب بڑھا تو شملہ نے خود کو کمپوز کرنے میں چند سیکنڈ ہی لگائے تھے۔

دروازہ کھلنے پر باہر کھڑے کئی افراد ہنستے مسکراتے اندر آئے تھے۔ مایہن کی رہنمائی میں انقیہہ ربیعہ، عمر، عباد کے علاوہ عامرہ، در، ثانیہ اور سدرہ بھی تھیں۔ لمحہ بھر بعد ہی سب ہی چمک رہے تھے ہنس رہے تھے۔ شملہ عمر کیوں ساتھ لگائے بیٹھی تھی جیسے برسوں بعد ملی ہو۔

فردوس بیگم نے کمرے میں جھانکا۔ ان کی سب سے پہلی نگاہ شملہ اور عمر پر ہی پڑی تھی۔ لمحہ بھر کے لیے ان کے چہرے پر نہایت بد مزگی کے تاثرات ابھرے۔ شملہ بھی اتفاقاً ”لن کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ قدرے خفیف سی ہوئی۔

”امی جی۔۔۔ آئیے نا۔۔۔ باہر کیوں کھڑی ہیں۔“ ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کی جانب بڑھا۔

”ہم باہر ہی بھٹکے۔۔۔ مل دھرنے کی جگہ نہیں اندر۔“ وہ بے زار سے لمحے میں گویا ہوئیں۔ ”مے مایہن۔۔۔ یہاں بیٹھی ہنسی مذاق کر رہی ہو باہر ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ دلہن کی ہمیں جو سامان لائی ہیں وہ بھی ویسا ہی پڑا ہے۔ چلو ذرا ناشتہ لکواؤ۔“

ان کے بیزار لمحے اور کرخت آواز نے لمحہ بھر کے لیے گل و گلزار ہوئی محفل کو سراسیمہ سا کر دیا تھا۔ سب ہی خاموش ہو کر رہ گئے۔ مایہن جھل سی ہو کر اٹھی تو درودہ اور ثانیہ بھی جلدی سے اس کا ہاتھ پٹانے کے خیال سے کھڑی ہو گئیں۔

”آؤ یا۔۔۔ ذرا رافع کی خبر لیں۔“ ہاشم نے عباد کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ اس کے بغیر ہر محفل کچھ ادھوری سی لگتی ہے۔“

عباد فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ ناعما اور سردہ بھی ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کمرے میں اب صرف شہلا، انیقہ اور ربیعہ ہی رہ گئی تھیں۔
 ”ہاں۔۔۔ کیا رائے ہے دولہا بھائی کے بارے میں؟“ انیقہ نے مسکراتی نظروں سے شہلا کو دیکھا۔ وہ رسانیٹ سے مسکرا دی تھی۔

”رائے اگر اچھی نہ ہوتی تو ہائی کیوں بھرتی میں۔ ظاہر ہے رائے تو شروع سے ہی اچھی ہے۔“ وہ عمر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

”اور ان کی رائے آپ کے بارے میں؟“ اب ربیعہ کی باری تھی۔ ”منہوں نے کیا بتایا آپ کو؟۔“
 ”کیا جانا چاہتی ہو تم دونوں؟“ شہلا نے دونوں کے کان پکڑ لیے۔ ”اب کیا میں لفظ بہ لفظ ان کی باتیں دہراؤں؟“

وہ دونوں ہنسنے لگیں۔ عمر حیران لگا ہوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔
 ”مما۔۔۔ اب آپ یہاں رہیں گی؟“ بالآخر اس نے جلد ہی وہ سوال پوچھ لیا جو وہ نجانے کب سے لبوں میں دبائے بیٹھا تھا۔

”عمر۔۔۔ ربیعہ نے پیار بھری سرزنش کی۔“ ”میں نے آپ کو کیا سمجھایا تھا؟ آپ بھول گئے ساری باتیں؟“
 ”نہیں تو۔۔۔“ وہ جلدی سے بادوب ہو بیٹھا۔ ”میں تو ایسے ہی مماسے پوچھ رہا تھا۔“
 اس کی صورت دیکھ کر ربیعہ اور انیقہ کو ہنسی آگئی جبکہ شہلا سنجیدہ سی ہو گئی تھی۔ اسی وقت وردہ کمرے میں آئی تھی۔

”آپ لوگ آجائیں۔ ناشتہ لگ گیا ہے۔“ وہ انیقہ اور ربیعہ سے مخاطب ہوئی پھر اس نے شہلا پر نظر ڈالی۔
 ”شہلا بھابھی۔۔۔ آپ کا اور ہاشم بھائی کا ناشتہ میں بیہیں لے آتی ہوں۔“

”نہیں وردہ۔۔۔ شہلا جلدی سے کھڑی ہوئی۔“ ”میں اور ہاشم آپ سب کے ساتھ ہی ناشتا کریں گے۔“
 وردہ مسکرا دی تھی پھر اس کی ہمراہی میں وہ تینوں کمرے سے نکلی تھیں۔

ڈائننگ ٹیبل کے آس پاس مزید کچھ کرسیاں لگا کر سب کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ یوں بھی خاندان کے بڑے اپنے کمروں میں ہی تھے۔

”آپ ادھر بیٹھیں شہلا بھابھی۔۔۔“ رافع جو ہاشم کے برابر والی کرسی پر بیٹھا خوش گہیوں میں مصروف تھا اسے سامنے بیٹھتے دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں رافع۔ آپ بیٹھیں۔“
 ”پلیز نہ۔۔۔ رافع مصر تھا۔“

شہلا جھکی جھکی نظریں لے ہاشم کے برابر آ بیٹھی۔ رافع دوسری کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے پھر چونک اٹھا تھا۔ اس کی نظر ربیعہ پر پڑی تھی۔ وہ چند لمحے بے اختیار اس سے دیکھتا رہ گیا۔ ”ہاشم کھنکھارے۔ رافع چونک اٹھا پھر وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔“

”معیشت کہاں ہے ماہین آئی؟“ ”دفعتا“ انیقہ کو خیال آیا تھا۔ ”ہم تو اسے نکاح کی مبارکباد دینا چاہتے ہیں اور وہ ہے کہ سلیمانی ٹوپی پہن کر بیٹھ گئی ہے غالباً۔“

”دفعہ ہاں دفعہ۔۔۔ دراصل۔۔۔ وہ ذرا دیر سے اٹھتی ہے۔“ ماہین سے بات چنانے نسی تو جزبہ زور کر رہی گئی۔
 وردہ اور ثانیہ کی نگاہیں چارہ ہوئیں پھر دونوں نے ہی ٹھنڈی سانس بھری تھی۔



”عباد بھائی!۔۔۔ ربیعہ نے ہولے سے دستک دے کر کمرے میں جھانکا۔“ ”میں آجاؤں؟“

عباد کا تیزی سے چلتا ہوا قلم رک گیا۔ وہ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے خوش دلی سے مسکرایا۔
”اور بیعت۔“

”آپ مصروف تو نہیں؟“ اس نے اس کے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کے ڈھیر کو دیکھا۔

”کچھ ایسا خاص نہیں۔“ اس نے ربیعہ کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”کوئی پر اہم ہے؟“

”نہیں۔ بالکل نہیں۔“ وہ بشارت سے مسکرائی۔ ”میں تو آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں عباد بھائی!

آپ۔ آپ میری زندگی میں بھائی نہیں فرشتہ بن کر آئے ہیں۔“

ربیعہ کی نظریں جھک گئی تھیں اور چہرے پر احسان مندی کے جذبات ابھر آئے تھے۔

”اوہ گاڈ!“ عباد نے مصنوعی غصے سے اسے دیکھتے ہوئے اور سر ہلایا۔ ”اگر تم صرف یہی بات کرنے آئی ہو تو یقین مانو میں بہت مصروف ہوں۔“

”نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”اس کے علاوہ یہ کہ میں۔۔۔ آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔۔۔ اگر آپ میرا ایڈیشن یونیورسٹی میں کروادیں تو۔۔۔“

”وائے ناٹ!“ آپ کی بارہو کھل کر مسکرایا۔ ”یہ تو بہت اچھی بات سوچی ہے تم نے۔ میں خود بھی نہیں چاہتا کہ تم گھر بیٹھی فضول سوچوں سے الجھتی رہو۔ میں کل ہی ضروری انفارمیشن حاصل کرتا ہوں۔ تمہارا ایڈیشن ہو جائے گا۔ ہاں بیکش وغیرہ کے بارے میں مجھے بتاؤ۔“

”عباد بھائی۔۔۔“ ربیعہ کچھ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”ایک۔۔۔ بات اور۔۔۔“

”ہاں ہاں، بولو۔۔۔ جھجکنے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ربیعہ! میں نے تمہیں بسن کہا ہی نہیں دل سے سمجھا ہی ہے۔ تمہاری ہر ضرورت پوری کرنا میرا فرض ہے۔“

ربیعہ کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے تھے۔ اس نے احسان مندی کے جذبات کے ساتھ اسے دیکھا۔

”عباد بھائی۔۔۔ یہاں اکثر لوگ مجھ سے میرے ماضی کے بارے میں جاننے کے خواہش مند ہیں۔ میں۔۔۔ میں سمجھ نہیں پاتی کہ انہیں کیا جواب دوں۔ آپ۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ نے میرے بارے میں سب سے کیا کہا ہے یا یہ کہ مجھے کیا کہنا چاہیے۔“

”ربیعہ! ایک بات یاد رکھو۔“ عباد پین رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”میں نے بارے میں اتنا زیادہ کاغذات لکھنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ تم جو بھی ہو اپنا حوالہ آپ ہو۔ کوئی دوسرا شخص تمہاری ذات کا حوالہ نہیں بن سکتا۔“ وہ لہجہ بھر کے لیے سانس لینے کو رکھا پھر بولا۔

”دوسرے یہ کہ میں نے تمہارے بارے میں سب کو صرف یہ بتایا ہے کہ تم میرے ایک عزیز از جان دوست کی بسن ہو جو کچھ عرصے کے لیے تمہاری ذمہ داری مجھے سونپ کر گیا ہے اور بس۔ تم سے کوئی کچھ پوچھے تو ہمیں یہی کہنا ہے کہ بھائی کے سوا دنیا میں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ دیکھو ربیعہ! دنیا کو بات سے بات نکالنے کی اور کھوج در کھوج کی عادت ہوتی ہے۔ تم خود کو جتنا پردوں میں چھپاؤ گی، دوسرے اتنا ہی تمہارے بارے میں تجسس رہیں گے۔ لہذا، بہتر یہی ہے کہ تم خود کو دوسروں سے الگ رکھنے کی یا چھپانے کی کوشش ہی نہ کرو۔ دوسروں کی پروا کرنا پھوڑو دوسرے تمہاری پروا کرنا چھوڑ دیں گے۔ رائٹ!“

ربیعہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

”اور اب میرے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔ ”تم نے میرے سر میں درد کر دیا ہے۔“

ربیعہ دھیرے سے ہنس دی اور اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ کچن میں آکر وہ چائے کے برتن نکالنے لگی۔ اس کا من شہلا کی شادی کی وجہ سے بٹ گیا تھا لیکن اب ہنگاموں سے فارغ ہو کر وہ مسلسل اس گھر کے متعلق سوچ رہی تھی، جہاں وہ چند ماہ قیام کر کے اپنا سکھ، چین غارت کر کے چلی آئی تھی۔ اس کے ذہن کے پردے پر فلم سی چلتی رہتی تھی، جہاں منور امین کے طنز بھرے تیرتے، تمدن کی مکار مسکراہٹ تھی، تصوری حرص سے چھٹی آنکھیں

تھیں، صولت کی گستاخیاں اور مینا بیگم کی آ رہا رہتی نظریں۔۔۔ اور ان سب سے پرے سب سے الگ ترانہ کی گرم جوش اور پر خلوص محبت کے مناظر تھے۔ ربیعہ ترانہ کو شدت سے یاد کر رہی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی کہ اس کی چلے جانے کے بعد اس پر کیا گزری وہ سب کچھ جانتا چاہتی تھی۔

اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کیا کہ رات کو وہ ضرور عباد سے کہے گی کہ اسے عبد الباری کا نمبر اپنے موبائل سے ملا دے۔ وہ گھر کا قانون استعمال کرنے سے گریز کر رہی تھی کہ کہیں انفعہ یا منہ زہ بیگم کوئی غلط خیال نہ کریں۔ ارادہ باندھ کر وہ مطمئن ہو چلی تھی۔ پھر چائے کی ٹرے اٹھا کر وہ عباد کے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔

دونوں بازو نیکیے کی صورت سر کے نیچے دھرے وہ بستر پر جٹ لیٹا ہوا تھا۔ سی ڈی پلیئر پر مدھم مدھم سروسوں میں نور جہاں کی مترنم آوازیں ”دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا“ چل رہا تھا۔ ذہن کے پردے پر کچھ مناظر متحرک تھے۔ اسے وہ شیخ و شنگ لڑکی کسی طور نہ بھولتی تھی جو ایک روز بڑے دھڑلے سے اس کی گاڑی کا دروازہ کھول کر یوں بیٹھ گئی تھی جیسے وہ اس کی ذاتی گاڑی ہو اور وہ اس کا ڈرائیور۔ سارا راستہ وہ بیک ویو مرر میں اس بھولے گھڑے کو اپنی شوخ نگاہوں سے تکتا رہا تھا۔ کیا خبر تھی کہ ذرا سی دل لگی، دل کی لگی میں تبدیل ہو جائے گی پھر فون پر اس کا وہ شرمایا شرمایا، متمسک لہجہ۔ بچوں کی سی باتیں، اس لڑکی کو شاید خبر نہ تھی کہ اس کا یوں ذرا سا کھیل کسی کے دل کی دنیا کا سکھ چین تہہ بالا کر ڈالے گا۔

فرازا اپنے جذموں میں سنجیدہ ہو چلا تھا اور وہ۔۔۔ وہ محض ایک کھیل کھیل رہی تھی جس سے دل اکتا جانے پر اب وہ اسے پہچاننے کی بھی روادار نہ تھی۔ کتنی بار وہ ٹکرائی تھی اور ہر بار اس کی نظروں میں بے نیازی، اجنبیت تھی۔ فراز نے کئی بار اسے مخاطب کر کے دیکھا تھا اور ہر بار وہ کئی کترا کر نا آشنا بن کر گزر گئی تھی۔

”تم نے۔۔۔ میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔۔۔“ وہ دکھ سے بڑبڑایا۔ ”میرے جذبے اتنے ارزاں تو نہیں تھے کہ تم انہیں یوں روند کر چلتی بنو۔ مانا کہ تم آج بھی دل کو اتنی ہی عزیز رکھتی ہو، جتنی کہ کل لیکن غرور کی، نا انصافی کی، دھوکہ دہی کی کچھ سزا بھی تو ہونی چاہیے۔ سزا تمہیں ملے گی، ضرور ملے گی۔“

وہ جلتی آنکھوں پر بازو رکھ کر دکھ کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

صبح کے چھ بج رہے تھے۔ ایقان کو پہلے پہل نیند میں کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ کسسا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ عاشر کے موبائل پر مدھم مدھم سروسوں میں بپ بچ رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر گہری نیند سوئے ہوئے عاشر کو دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اسے جگانا چاہا تب ہی عاشر از خود جاگ گیا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایقان نے پھر آنکھیں موند لیں۔

”ہیلو۔۔۔“ عاشر کی مدھم لیکن قدرے خفا خفا سی آواز آئی تھی۔

نجانے کیوں ایقان کی سوئی ہوئی تمام حسیات جاگ اٹھیں۔ عاشر مزید کچھ بات کہے بغیر اٹھا اور ڈرائنگ روم میں گھس گیا۔ وہاں سے اس کے مدھم مدھم ہونے کی آواز آرہی تھی لیکن ایقان کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ چند لمحوں بعد وہ بے حد تیزی سے باہر آیا تھا۔ اس کی نظریں جاگتی ہوئی ایقان کی نظروں سے ٹکرائیں۔ عاشر ٹھٹک گیا۔

”کیا بات ہے عاشر! اس کا قانون تھا؟“ ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”کسی کا نہیں، تم سو جاؤ۔“ وہ سلیپنگ سوٹ کے ٹخن کھولنے لگا۔ ”میں ذرا ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔“

”ایئر پورٹ؟“ وہ نہایت حیرانی سے بولی۔ ”خیریت؟“

”پاں خیریت ہے۔ ایک دوست کی فیملی پہنچ رہی ہے۔ اسے گھر تک ڈراپ کرنا ہے، اسی کا قانون تھا۔“

”تمہیں چائے بنانا؟“ وہ بستر سے اتر آئی۔

”نہیں۔“ وہ شرٹ پہننے لگا۔ ”جما لینڈ کر چکا ہے، دیر ہو جائے گی۔ میں چائے ایئر پورٹ پر ہی پی لوں گا۔“

”ہوں۔“ اس نے مدھم سروسوں میں کہا اور اس کی عجلت بھری حرکت دیکھنے لگی۔

عاشرا پنج منٹ میں تیار ہو گیا تھا۔ اس نے گم صم سی ایقان پر ایک نظر ڈالی اور پھر دھیرے سے اس کا گال تھپتھپایا۔
 ”ڈونٹ وری ڈارلنگ۔ میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ میں لوٹ آؤں گا۔ تم آرام سے سو جاؤ۔“ ایقان نے اثبات میں سر ہلایا۔ عاشرتیزی سے باہر نکل گیا۔

وہ برہم برہم سا کا دروازہ کھٹکھٹاتا تھا۔ لڑانے شرارتی نظروں سے اسے دیکھا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا کالر کھینچا۔
 ”اے مسٹر! میں تمہاری جدائی میں بے تاب ہو کر یہاں تک چلی آئی ہوں اور تم ہو کہ ٹھیک سے بات تک نہیں کر رہے ہو۔ یہی صلہ ہے میری بے تابیوں کا تمہارے پاس؟“
 عاشر نے ایک تیز نگاہ اس پر ڈالی۔

”تمہاری اس حرکت سے میری ازدواجی زندگی متاثر ہو سکتی ہے لڑا! تمہیں احساس نہیں؟“
 ”اوسے ڈونٹ وری۔“ وہ اطمینان سے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ ”میں تمہاری بیوی سے کوئی منظرہ کرنے کے ارادے سے نہیں آئی پھر بھلا تمہاری ازدواجی زندگی کس طرح متاثر ہونے لگی؟ ہر سال لاکھوں سیاح تمہارے ملک میں گھومنے پھرنے کے ارادے سے آتے ہوں گے۔ ایک میں بھی ہوں۔ تم کس بات کی فکر میں پڑ گئے؟“

”وہ لاکھوں سیاح ہر گھنٹے بعد میرے سیل فون پر کال نہیں کرتے۔“ اس نے دانت پیسے۔ ”تم سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ سمجھنا نہیں چاہ رہیں بات یہ ہے۔“
 لڑانے کن اکھیوں سے اسے دیکھا اور دلکش انداز میں مسکرا دی۔

”تمہاری بے بسی مزہ دے رہی ہے۔“ وہ شرارت سے بولی۔ ”جپان میں تو تم قابو میں آکر نہیں دیتے تھے۔ میں نے اچھا کیا جو یہاں چلی آئی۔“

وہ کار سے باہر دیکھنے لگی۔ صبح کی نرم دھوپ بلڈنگز کے اوپری حصے سے نیچے اترنے کی تیاری میں تھی۔ لوگ گاڑیوں، بسوں، ٹیکسیوں میں یا پھر سیدل ہی اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں تھے۔ احول میں صبح کی مخصوص پرجوش سی چل پھل تھی۔ گاڑی ایک فائیو اشار ہوٹل کے احاطے میں جا کر رکی تھی۔
 باوردی دربان نے آگے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔

”تم چلو۔ میں گاڑی پارک کر کے آتا ہوں۔“ عاشر نے اسے ایک نظروں پر دیکھ کر کہا۔
 لڑا مسکرا کر سر ہلا کر اترتی تھی۔

”ہیلو۔ ہیلو۔ باری بھائی؟ میں ریجہ بات کر رہی ہوں کراچی سے۔“ وہ لان میں سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔

”اوہ ریجہ۔ کیسی ہو تم؟“ عبدالباری اس کی آواز سن کر حقیقتاً ”خوش“ ہوا تھا۔
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں بالکل خیریت سے۔ آپ مجھے ترانہ کے بارے میں بتائیں۔ کیسی ہے وہ ٹھیک تو ہے نا۔ گھر میں سب خیریت تو ہے؟“

عبدالباری چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔

”ہیلو۔“ ریجہ بے تابی سے بولی۔ ”باری بھائی۔“
 ”ہاں ریجہ۔“ پھر وہ بولا۔ ”سب ٹھیک ہے، تم بے فکر رہو۔ اپنا خیال رکھنا۔ کسی قسم کی کوئی تکلیف یا شکایت ہو تو سب سے پہلے مجھے فون کرنا۔“

”باری بھائی! مجھے ترانہ کے بارے میں بتائیں۔“ وہ بے تابی سے بولی۔
 باری کے لبے سے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ خیریت نہیں ہے۔ وہ خاموش خاموش سا لگ رہا تھا۔ ریجہ کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

”تمہارا چلے جانے کے بعد گھر والوں نے اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔۔۔۔۔۔ اتنے مضبوط اعصاب کی لڑکی بھی اتنا کچھ برداشت نہ کر پائی۔“

ربیعہ کے ہاتھ پیروں سے گویا جان نکل گئی۔ چند لمحوں کے لیے گویا اس کے دل نے دھڑکننا چھوڑ دیا تھا۔ باری کچھ دیر اس کے کچھ کہنے کا منتظر رہا پھر بولا۔

”تم فکر مند مت ہو ریجہ۔ آزمائش کے یہ چند دن ہی ہیں مگر زرا جائیں گے ان شاء اللہ۔ جو کچھ بھی ہو گا ہمارے حق میں بہتر ہو گا۔“

”باری بھائی۔۔۔ میری کسی طرح ترانہ سے بات ہو سکتی ہے؟“ وہ گلوگیر لہجہ میں بولی۔
 ”مشکل ہے۔۔۔ میرا خوردِ ابط نہیں ہے۔ آس والوں کے ذریعے اس کی خیریت پتا چلتی رہتی ہے۔“
 ”اچھا۔۔۔ ہو سکے تو اسے میرا سلام پہنچا دیجئے گا۔“ وہ آزر دگی سے بولی۔
 ”ٹھیک ہے۔۔۔ خدا حافظ۔“ وہ بولا۔

”خدا حافظ۔“ ربیعہ نے تھکے ہوئے انداز میں موبائل آف کر دیا۔ اس کے ذہن میں پھر سے کئی حقائق رواں ہو گئے تھے۔

شہلا نے آئی تھی۔ گھر میں گویا خوشیاں، روشنی کی صورت اتری ہوئی تھیں۔ انہی کے رعبہ، عمر منہزہ بیگم سب ہی اسے گھر میں لیے بیٹھے تھے۔

”سب لوگ کیسے ہیں وہاں اپنا؟“ انقباض جوش و خروش سے پوچھ رہی تھی۔ ”جب آپ کی اور ایقان باجی کی بہت دوستی تھی، تب تو مجھے وہ گہ بہت اچھا لگتا تھا۔ اتنے سارے لوگ اتنی ڈھیر ساری رونقیں۔ اتنی چہل پھل۔ سب کچھ کتنا اچل کرتا تھا۔ اب وہاں کا ماحول کیسا ہے؟“

”دور کے ڈھول سنانے“ شہلا دھیرے سے ہنس دی۔
 ”کیا مطلب؟“ سب کے ہی کان کھڑے ہو گئے۔

”مطلب یہ کہ اب سب کے سب اپنی اپنی زندگی میں مصروف ہیں۔ ان محفلوں کا ان رونقوں کا تو اب ڈھونڈنے سے کوئی نشان نہیں ملتا۔ زیادہ تر افراد اپنے اپنے پور میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ہاں ورنہ بہت اچھی لوگ ہے، وہ اکثر مجھ سے ملنے چلی آتی ہے۔ مافیہ بھی خیال کرتی ہے۔“

”اور عربشہ؟“ انقید نے جلدی سے پوچھا تھا۔ ”وہ تو مجھے عجیب سرپھری سی لڑکی لگتی ہے۔ اپنے آپ میں گم۔ نہ کسی سے کچھ لینا نہ دینا۔ شادی کے ہر فنکشن میں وہ غائب تھی۔“

”عزیزہ؟“ شہلا لمحہ بھر کے لیے سوچ میں گئی۔ ”ہاں شایید۔۔۔ جتنی بار بھی وہ میرے سامنے آئی ہے۔۔۔ میں نے اسے گم صم ہی پایا ہے۔ پتہ نہیں اس کے ساتھ کوئی نفسیات پر اہم ہے یا کچھ اور۔۔۔ میں اب تک سمجھ نہیں

پانی۔ تب ہی باہر گاڑی کا بارن بجا تھا۔ عمر کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ لمحہ بھر میں اچھلتا کودتا باہر بھاگا۔ شہلانے ناٹم دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

”میرا خیال ہے ہاشم آگئے ہیں۔ میں انہیں لے کر آتی ہوں۔“

انہی کا اور بیجا اٹھ کر عمر کی بھیمری ہوئی، پیڑس جھلوں پر رکھنے لگیں۔ منہ زہ بیکم دوپٹ ٹھیک کرنے لگیں۔ بھاگتے ہوئے عمر کے پیچھے پیچھے شہلا لکڑی کے گیٹ تک جا پہنچی تھی۔ تب ہی وہ ٹھٹک کر رکی اور بے اعتبار نظروں سے سیاہ کر بلا سے ٹیک لگا کر کھڑے ابرا کو دیکھنے لگی جو ایک ناک اسی کو دکھ رہا تھا۔

”پہا... پہا جانی...“ عمر بھاگتا ہوا اس سے جا ملتا۔

ابراہیم نے عمر کو گود میں اٹھا کر حوا اور چند قدم آگے بڑھ آیا۔

”کیسی ہو شہلا؟“ اس نے ایک گہری نگاہ اس کے سب سے سنورے سراپے پر ڈالی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔ وہ درے درے ناگواری سے بولی۔ میں یہاں اسے پکے ہارے پکے ہارے چاہتا ہوں۔“

”میں نے فون پر عمر کو بتایا تھا کہ میں اسے لینے آرہا ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر اس کا گال چوما۔ ”یہ شاید تمہیں بتانا بھول گیا۔ کیوں شہزادے؟“

”میں بھول گیا تھا بہا۔۔۔ ماما آگئیں تو انہیں دیکھ کر میں ہر بات بھول گیا۔“

”بے قصور ہو یا را!“ اس نے معنی خیز لہجہ اپنایا۔ ”کچھ ایسی ہی ہیں تمہاری ماما۔“

شہلا نے اسے غصے سے دیکھا۔ اس نے لمحہ بھر میں لہجہ اور انداز بدل لیا۔

”اچی بو۔۔۔ اب تم یہاں تک آئی گئی ہو۔۔۔ تو۔۔۔ اجازت بھی دے دو۔۔۔ کیا میں عمر کو لے جاسکتا ہوں؟“

شہلا متذبذب ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی، کسی گاڑی کی روشن ہیڈ لائٹس ان تینوں پر پڑی تھیں۔ شہلا اور ابراہان بے ساختہ ہی اس جانب متوجہ ہوئے۔ لائٹس آف ہوئیں اور گاڑی میں سے ہاشم برآمد ہوا۔

شہلا کو ایک بل کے لیے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس منظر میں اس کی پوزیشن کچھ آکوردی تھی۔ اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا۔

ہاشم گاڑی بند کر کے قدم قدم چلتا اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ابراہان کو دیکھا۔ گویا اس کا تعارف چاہتا ہو۔

شہلا کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو وہ پلٹ کر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ شرمندگی کا ایک گہرا احساس اس کے پورے وجود پر غالب تھا۔ وہ سیدھی بچن میں چلی آئی۔ فریج کھول کر پانی کی بوتل نکال کر گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

”کیا ہوا ایسا۔۔۔“ پیچھے سے انہی کی آواز آئی تھی۔ ”یہ ہاشم بھائی کہاں رہ گئے؟“

”ہاں۔۔۔“ اسے کوئی جواب نہ سوجھا تو اس نے گلاس لیوں سے نکال لیا۔

”السلام علیکم۔“ ہاشم کی خوشگوار آواز نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

انہی، ربیعہ اور منیہہ بیگم ہاشم سے ملنے میں مصروف ہو گئیں۔ شہلا اتنے عرصے میں خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

شیفون کا دوشہ دھیرے سے ماتھے پر کھینچ کر وہ جیسے ہی مڑی، لمحہ بھر کے لیے سسم ہی گئی۔ ہاشم اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ شہلا نے بے اختیار ہی اس کی نظروں میں کچھ دھونڈنے کی کوشش کی۔ وہ مسکراتی، جھجکاتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے جناب! میکے آکر تو ہمیں لفت ہی نہیں کر رہیں۔“

”جی۔۔۔ نہیں۔۔۔ وہ میں۔۔۔ دراصل وہ۔۔۔“ شہلا کے ذہن میں سب ہی الفاظ گڈمڈ ہوئے۔ ہاشم دھیرے سے ہنس دیا۔

”عمر کہاں ہے شہلا؟“ منیہہ بیگم کو اس کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔

ربیعہ اور انہی جلدی جلدی ڈانٹنگ ٹیبل پر کھانا لگانے لگی تھیں۔ شہلا ایک مرتبہ پھر الجھن کا شکار ہوئی۔ کیا کے گیانہ کے۔

”عمر کو اس کے والد ابراہان جیلانی لے کر گئے ہیں۔“ ہاشم نے ڈانٹنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی سلا میں سے کھیرے کا پیس اٹھا کر منہ میں ڈالا اور عام سے انداز میں اطلاع دی۔

شہلا نے قدرے متحیر ہو کر اسے دیکھا۔ ربیعہ اور انہی دفععتاً ”اپنی اپنی جگہ تھم سی گئی تھیں۔ منیہہ بیگم بھی کچھ پریشان سی ہو کر ہاشم کو دیکھنے لگیں۔

وہ بے حد ناراض انداز میں اپنی بات کہہ کر اب بانی کا گلاس بھر رہا تھا۔
 ”برابر؟“ پھر منہ پر بیگم بولیں۔ ”اب برابر آیا تھا؟“
 ”جی ہاں وہ اب ہر سے ہی غم کو لگے ہیں۔ چند گھنٹے بعد چھوڑ جائیں گے۔“
 شملہ سر جھکا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا دل بیکدم ہی مطمئن سا ہو گیا تھا۔ ہاشم کا انداز قطعاً ناراض تھا۔
 منہ پر بیگم چند قدم آگے بڑھ آئیں پھر انہوں نے ہاشم کا چہرہ تھام کر سر جھکایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔
 ”جیتے رہو بہت نیک بچہ ہو۔“
 ہاشم مسکرایا۔ اس کی نگاہیں شملہ کی نگاہوں سے ٹکرائی تھیں۔ شملہ ان نظروں کی چمک کی تاب نہ لاپائی۔
 اس نے پھر سر جھکا لیا تھا۔

”بھائی۔۔۔“ اس نے اندر جھانکا۔ ”میں آسکتا ہوں؟“ کمپیوٹر پر مصوف۔ رافع چونک اٹھا۔
 ”نافع آؤ۔“ اس کے انداز میں حد درجہ مصوفیت تھی۔
 نافع چند لمحے دروازے پر ہی کھڑا رہا۔ وہ قدرے تذبذب کا شکار تھا۔ رافع نے ایک مرتبہ پھر نظر اٹھائی۔
 ”میں پھر بات کر لوں گا بھائی! اگر آپ مصوف ہیں تو۔۔۔“
 رافع کو اس کے لہجے کے غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ وہ کمپیوٹر آف کرنے لگا۔
 ”نہیں“ آجاؤ۔ ”وہ کرسی گھماتے ہوئے بولا۔
 نافع اندر چلا آیا۔ وہ کچھ سنجیدہ اور خاموش خاموش تھا۔ اندر آکر وہ رافع کی کرسی کے مقابل پڑے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔
 ”مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔“
 ”بولو۔“ رافع نے غور سے اسے دیکھا۔
 ”بھائی۔۔۔ میرے اور عریشہ کے متعلق۔۔۔ خاندان کے بڑوں نے جو فیصلہ کیا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟“ وہ سر اور نظریں جھکائے ہوئے تھا۔
 ”میں؟“ رافع لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں یا! اصل بات تو تمہاری رضامندی کی تھی جو کہ میرا خیال ہے تم نے دی تھی۔“
 ”جی ہاں۔“ اسی نے مجھ سے بات کی تھی اور میں نے ہامی بھی بھری تھی لیکن۔۔۔“
 ”لیکن؟“ رافع نے ابرو چڑھایا۔
 ”لیکن بھائی۔۔۔ گزرتے وقت کالج لمحہ مجھے یہ احساس دلا رہا ہے کہ کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے۔ اس رشتے کے لیے میری رضامندی ضرور شامل تھی لیکن عریشہ۔۔۔“
 رافع نے اب بخور اسے دیکھا۔ وہ تھکا تھکا اور آزرہ سا دکھائی دیتا تھا۔

”عریشہ شاید خوش نہیں ہے۔ بلکہ یقیناً۔۔۔ وہ یقیناً خوش نہیں ہے۔ میرے ساتھ اس کا رویہ از حد تکلیف دہ ہے۔ مجھ پر اس کی نگاہ بھی بڑ جائے تو وہ یوں منہ پھیر لیتی ہے جیسے اس کے لیے یہ انتہائی اذیت ناک امر ہو پھر یہ کہ میرے علم میں یہ بھی آیا ہے کہ جب سے یہ رشتہ طے ہوا ہے۔ اس کا رویہ اپنے گھر والوں سے بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ خود کو تنہا سے تنہا کرتی چلی جا رہی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں بھائی۔۔۔ یہ صورت حال میرے لیے کتنی تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ میں۔۔۔ میں ڈسٹرب رہتا ہوں یہ سب کچھ سوچ کر۔۔۔“
 ”ہوں۔“ رافع کچھ دیر بعد بولا تھا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں نے بھی غمخوس ہو گیا تھا لیکن پھر اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ یوں بھی عریشہ شروع سے ہی کچھ سر پھری سی لڑکی ہے لیکن تمہارے ساتھ اس کا یہ رویہ کسی اور ہی صورت حال کی نشان دہی کرتا ہے۔“ وہ سوتے لگا۔
 ”آکر وہ اس رشتے کے لیے راضی نہیں تھی تو گھر والوں کو اس کے ساتھ جبر سے کام نہیں لینا چاہیے تھا۔“

لیکن اب۔ اب کم از کم تمہاری جانب سے کوئی ایسی بات نہیں ہونا چاہیے رافع! جس سے خاندانوں میں بدگمانیاں پیدا ہوں یا دائرہ پڑے۔“

”میں سمجھتا ہوں بھائی۔۔۔ لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ اگر وہ ابھی سے میرے لیے اپنے دل میں اتنا شغف جمع کر لے گی تو بعد میں اس رشتے کو نبھانا نبھاتے چلے جانا میرے لیے بھی مشکل ہو جائے گا اور اس کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ صورت حال کو ابھی واضح کر لیا جائے۔“ وہ آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

”تم کیا سمجھتے ہو ہمیں ایسے حالات میں کیا قدم اٹھانا چاہیے؟“ رافع نے اسے ایک نظر دیکھا۔

”یہی مشورہ کرنے آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔ میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا میں اس گھر کے بیٹوں کو کسی پریشانی میں بھی نہیں ڈالنا چاہتا۔ لیکن۔۔۔“

”ہوں۔“ رافع نے گہری سانس بھری اور کسی سوچ میں گم ہو گیا۔

”دیکھو نا بھائی۔“ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ ”میری باتوں۔ تو صورت حال کو ابھی جوں کا توں رہنے دو۔ تم لوگوں کی شادی کا معاملہ اتنے میں ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا یہ وقتی اہال خود بخود ہی ٹھنڈا ہو جائے اور اسے اپنی غلطی کا احساس وقت سے پہلے ہو جائے۔ ایسا ہو جائے تو سب کے لیے اچھا ہو گا۔ تم دونوں کے لیے بھی اور اس خاندان کے لیے بھی۔ اور اگر تب تک ایسا نہیں ہوتا۔ پھر ہم یہ مسئلہ اٹھائیں گے کہ کسی کے ساتھ جبراً زور زبردستی نہ ہو۔ اور یہ معاملات دل کی خوشی کے ساتھ ہوں تو ٹھیک ہے ورنہ انہیں ختم ہی کر دیا جائے تو بہتر ہو گا۔ تب تک تمہیں خود پر قابو رکھنا ہو گا نا بھائی۔ بھول جاؤ کہ تمہارا کسی کے ساتھ کوئی تعلق قائم ہوا ہے۔ سب کچھ بھول کر اپنا فیوچر بناؤ۔ اگر تب تک عریشہ کے اپنے دل میں اس تعلق سے متعلق کوئی واضح خیال پیدا ہو جاتا ہے تو وہ خود اپنے والدین سے بات کرے یہ ہمارا درد سر نہیں ہے کہ آیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے یا نا پسند۔ ہم خود یہ بات چھیڑ کر اپنے بیٹوں کے معتب کیوں ٹھہریں؟ نا بھائی خاندان بننے بہت مشکل سے ہیں اور ٹوٹنے میں لمحہ بھی نہیں لگاتے۔ ہم تمہیں کوئی ایسا کام نہیں کریں گے جس سے خاندانوں کے ٹوٹنے کا الزام ہمارے کندھوں پر آئے ہاں اگر کوئی اور ایسا کرنا چاہے تو اس کی مرضی۔ تم سمجھ رہے ہونا؟“

نا بھائی نے ایک نظر بڑے بھائی کو دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میرا خیال ہے میرا بوجھ کافی حد تک ہلکا ہو گیا ہے۔“ وہ بولا۔

رافع بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھپتھپایا۔

جاگڑ کے تسے کتے ہوئے وہ ٹھہر گیا۔ چند لمحوں کے لیے اس کا دل بھی جیسے ٹھہر گیا۔ نظر پھر اسی دشمن ایمان پر جا ٹھہری تھی۔

رافع کو لمحہ بھر کے لیے خود پر تاؤ آیا۔ کیا تھا جو وہ بھی ہاشم میاں کی طرح گھوڑے بچ کر سویا رہتا۔ اسے کیا تکلیف ہوئی تھی صبح صبح صبح صبح کی شدتوں کو خیر یاد کہہ کر بستر سے نکل آیا تھا۔

”اب لڑتے رہو خود سے اور خود سزل سے۔“ وہ بڑبڑایا۔

ربیعہ کی نظر بھی اس پر پڑ چکی تھی لیکن وہ سرخ موڑ کر قدرے بے نیازی سے کیا ریوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

رافع بھی مڑ کر جاگنگ ٹریک پر دوڑنے لگا۔ دل ٹھہر گیا تھا قدم دوڑ رہے تھے جب ایک جنگ سی اس کے وجود کے اندر پھا ہونے لگی۔

”یہ سپیدی افقی سے اتری ہے۔ یا تری مرمریں پیشانی سے۔“

وہ خود بخود ہی گنٹایا تھا پھر وہ ٹھہر گیا۔

”اودہ خدا! یہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ۔“ اس نے مڑ کر دیکھا۔

بارک دور دور تک خالی تھا۔ اس کی نظریں بے قرار ہوئیں پھر اس نے سر جھٹکا۔ خود کو کوسا اور پھر بھاگنا شروع کر دیا۔

”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ باتری مرمریں پیشانی سے۔“
دل تھا کہ تکرار کیے جا رہا تھا۔ رافع یہ نظم شروع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ نظم کی طرح وہ اپنے انجام سے بھی واقف تھا۔ یکایک وہ ٹھٹک کر رکا۔ ربیعہ اس کے سامنے سے آ رہی تھی۔ رافع کی مانند وہ بھی پلٹ کر چل پڑی تھی۔ نتیجہ یہ کہ ایک گولائی میں جلتے جلتے وہ پھر آئے سامنے تھے۔

فاصلہ اب اس قدر کم تھا کہ گریز ناممکن تھا۔ رافع چند قدم آگے بڑھ آیا۔
”السلام علیکم۔“ وہ بشارت سے مسکرایا۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ بھی جیسے رسا ”مسکرائی تھی۔“ ”آپ۔۔۔ روز آتے ہیں یہاں؟“
”جی ہاں، تقریباً۔۔۔“ رافع کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے لگا۔

”ہلے ایک دوست ہمراہ ہوا کرتا تھا، اب کچھ عرصے سے وہ بے وفا کسی اور کا ہو گیا ہے۔ سویرے بیدار کرنے کے لیے مس کال دوں تو علم ہوتا ہے کہ موبائل آف کیا ہوا ہے۔“
ربیعہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی۔

”چلیں، مہر کر۔۔۔ خدا نے چاہا تو آپ کو کوئی اور دوست مل جائے گا۔“
رافع چلتے چلتے رک گیا۔ ربیعہ کی سادہ انداز میں کئی گئی بات نے اس کے اندر شرارت کی رگ پھر کا دی۔ اس کے رک جانے پر ربیعہ نے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلاکی معصومیت تھی۔ رافع معمول کی مانند پھر چل پڑا۔

”پڑتی ہیں آپ؟“
”میں نے گریویشن کیا ہے۔ اب ماسٹرڈ کرنے کا ارادہ ہے۔“ وہ مختصر ”بولی۔“
”آپ۔۔۔ شہنا! بھابھی کی رشتہ دار ہیں؟ میرا مطلب ہے پہلے کبھی آپ سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“
”میں۔۔۔“ ربیعہ کچھ کتے کتے رک سی گئی۔ ”جی۔۔۔ رشتہ دار ہی سمجھ لیجئے۔ ہاں وہ اس روز آپ کی ایک نظم میرے پاس رہ گئی تھی، آپ کہیں تو میں واپس کروں؟“
رافع مسکرایا اور ایک ٹھہری سی نظر اس پر ڈالی۔ صبح کی خوشگوار روشنی میں وہ ہار سنگھار کے پھولوں کی سی لگتی تھی۔

”نہیں۔۔۔ واپس کرنے کے بجائے آپ رکھ لیں تو مجھے اچھا لگے گا۔“
اس کے جواب میں نجانے کس جذبے کی حدت تھی۔ ربیعہ کی پیشانی چمک اٹھی۔ اس نے رسمی سا مسکرا کر اسے دیکھا اور گھر جانے والے رستے پر چل دی۔
آنکھوں میں گہری سوچ لیے رافع اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”یہ سپیدی افق سے اتری ہے۔ باتری مرمریں پیشانی سے۔“ ذہن نے پھر تکرار شروع کی۔ رافع نے گہری سانس بھری۔ نظم نے خود کو مکمل کروا کر ہی رہنا تھا۔



وہ دواش روم سے نکل کر لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک کر رہی تھی۔ ہاشم بستر پر نیم دراز بے دلی سے ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا۔ شہلا کو آدیکھ کر اس نے ٹی وی آف کر دیا۔ گویا وہ اسی کے انتظار میں تھا۔
شہلا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ ہاشم نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تارغ ہیں آپ؟“

”جی!۔۔۔ وہ آہستہ سے بولی۔“

”کچھ بائیں کر لی جائیں؟“ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ شہلا چونک اٹھی۔
”ضرور۔۔۔“

ہاشم کھسک کر اس کے قریب ہوا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”شہلا۔۔۔ کتنا اعتبار کرتی ہو مجھ پر؟“

”جی؟“ شہلا نے حیران نظریں اٹھائیں۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں ہاشم۔۔۔“

”میں نے پوچھا۔۔۔ کتنا اعتبار کرتی ہو مجھ پر۔۔۔ نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے اس میں؟“

”آپ۔۔۔ میرے شوہر ہیں۔۔۔ میں نے اپنی مرضی سے یہ نعلق قبول کیا ہے۔۔۔ تو۔۔۔ ظاہر ہے کہ۔۔۔ اعتبار

کروں گی آپ پر۔۔۔“

”سی طرح تم بھی میری بیوی ہو شہلا۔۔۔ میری عزت ہو۔۔۔ میری محبت بھی ہو۔۔۔ میں نے تمہیں بہت خواہش

سے اپنایا ہے۔۔۔ میں بھی بھرپور اعتبار کرتا ہوں تم پر۔۔۔ اعتبار بھی، اعتماد بھی۔۔۔ تم سے وفا کے سب ہی رشتے

استوار کر لیے ہیں میں نے۔۔۔“ شہلا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔

”۳ روز تمہیں گھبراہٹ ہو، دیکھ کر میرے دل میں یہ سوال اٹھا تھا شہلا! کہ کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کرتیں؟

نہارے انداز کہہ رہے تھے کہ تم مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئی ہو۔ ایسا کیوں تھا؟ کیا تم مجھے ہو کہ تمہارے حوالے

سے کبھی کوئی غلط خیال میرے دل میں آسکتا ہے؟ ہو لو۔۔۔“

شہلا چند لمحے خاموش رہی۔ اسے ہاشم کی نگاہ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔

”دیکھو شہلا۔۔۔ میں تمہارے باطنی سے بخوبی واقف ہوں۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں اپنایا ہے تو اس کا

مطلب یہی ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے سب ہی حوالوں کے ساتھ قبول کیا ہے۔ تمہارے اور عمر کے ساتھ

اس شخص کا نام وابستہ تھا۔ عمر کے ساتھ اب بھی ہے اور پیشہ رہے گا۔ اس نعلق کے حوالے سے تمہارا اس سے

سامنا بھی ہو سکتا ہے، بات بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ خدا خواستہ تمہارے دل میں کوئی

غلط خیال ہو۔۔۔ میں مگر کبھی یہ بات نہیں سوچ سکتا۔ تم میری جانب سے اپنا دل صاف کر لو۔ اور آئندہ ایسی کسی

بھی تجویز کو بو لڈلی فیس کرو۔ تم میری بیوی ہو شہلا۔۔۔ میرا اعتماد ہو۔۔۔“

شہلا دم بخود اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”۳ ذات کلیئر؟“ وہ اس کی صورت دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔

”ہوں؟“ ”وہ چونکی۔۔۔“ ”پیس۔۔۔ آف کورس۔۔۔“

”جاگنا ہے یا سونے کے ارادے ہیں؟“ اس کے انداز میں شرارت بڑھ رہی تھی۔

”میں۔۔۔ میں سونا چاہتی ہوں ہاشم۔۔۔ بلینز۔۔۔ اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو۔۔۔“

”نیور مائنڈ۔۔۔“ وہ اپنا تکیہ اٹھا کر قدرے دور ہوا۔ ”یوں تو آپ جاگنا چاہتی ہیں لیکن اکیلے میں۔۔۔ چلیں

جناب۔۔۔ جیسے آپ کی مرضی۔۔۔ شب بخیر۔۔۔“

وہ تنکے میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ شہلا نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کر دی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک

نہ تھا۔ ہاشم نے درست کہا تھا۔ وہ جاگنا چاہتی تھی مگر تنہائی کے ساتھ اسے مختلف باتوں پر غور کرنا تھا۔ اس کے

ذہن میں بگولے سے بھر رہے تھے۔

ابراہیم کے انداز اسے بے حد خوف زدہ کر چکے تھے۔ اس کے مقاصد اسے بے چین کر رہے تھے۔ اس کی بے کلی

بڑھتی جا رہی تھی۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ مدھم مدھم سی موسیقی سے ایقان کی نیند ٹوٹی تھی۔ اس نے کروٹ بدل کر

دیکھا۔ عاشر اپنے بستر پر موجود نہ تھا۔ آواز اس کے موبائل کی تھی۔ غالباً ”کوئی کال آرہی تھی۔ عاشر نے موبائل

کی آواز بے حد غم کی ہوئی تھی۔

ایقان اٹھ کر بیٹھ گئی۔ واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی جس کا مطلب وہاں عاشر کی موجودگی تھی۔
بب مسلسل بچ رہی تھی۔ شاید عاشر کو پانی گرنے کی وجہ سے بب سنائی نہیں دی تھی۔ ایقان نے ٹائم دیکھا
صبح کے چار بجے کا مکمل تھا۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ روشن اسکرین پر ”ٹزاکالنگ“ کے الفاظ چمک رہے تھے۔
”ٹزاک؟“ اس کی نیند لمحہ بھر میں اڑن چھو ہو گئی۔

موبائل آن کر کے اس نے کان سے لگایا اور خاموش رہی۔
”عاشر۔ ڈیس۔ ٹاک ٹومی۔ پلیز۔“ ملجہ التجائیہ تھا۔

ایقان نے موبائل آف کر کے جگہ پر رکھا اور کسی چور کی طرح اپنے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ واش روم سے
عاشر نکلا تھا۔ وہ اپنی جگہ آکر لیٹا پھر اس نے بازو بڑھا کر ایقان کو گھیرے میں لے لیا۔
ایقان کی بند گرزنی پلوں سے ایک موٹی نکلا اور اس کے بالوں میں گم ہوا۔
”زاٹ یو؟“ وہ لہجہ اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

یقین کے محل میں پہلی دراڑ پڑی تھی۔ اس کا وجود جیسے تیز ہوا کی زد میں تھا۔ عاشر کا بازو اسے آگ سے بنا
محسوس ہونے لگا۔

بے حد رغبت سے سیب کا مڑتہ کھاتے ہوئے وہ بہت فریش اور قدرے خوش نظر آ رہا تھا۔ ایقان نے کن
اکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ عاشر اس کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا، وہ مرتبے کی شیشی میں چھو ڈال کر سیب کے
ٹکڑے نکالتا اور منہ میں رکھ لیتا۔ ایقان چند لمحے اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس قدر بے فکری خوش باشی زندگی سے
بھرپور انداز۔ جیسے کوئی غم کبھی چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔ وہ اتنا خوش کیوں تھا؟ اس کے ارد گرد سوالیہ نشان پھرنے
لگے۔

”عاشر۔ ازات یو؟“ وہ لہجہ پھر اس کی سماعتوں میں سرسرا نے لگا تھا۔

”عاشر۔ ڈ۔۔۔ پلیز ٹاک ٹومی۔“ وہ التجائیہ انداز اس کا دل چمیدنے لگا۔

”ٹزاک۔ یہ لڑا کون تھی؟ کیا عاشر اسے جانتا ہے؟ کیا وہ اس سے بات کرتا ہے؟ کیا وہ اس سے ملتا ہے؟“ سوالوں
کی ایک یلغار تھی جو اسے رات کے پچھلے پہر سے لے کر اب تک پریشان کر رہی تھی۔ عاشر نے مرتبے کا جار بند
کرتے ہوئے نظریں اٹھائی تھیں پھر وہ تنگ سا گیا۔
ہاتھ میں سلاکس تھا۔ وہ بے حد عجیب سی نظروں سے اسے نکلے جا رہی تھی۔ وہ اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ
اسے ہاتھ میں موجود سلاکس کی بھی خبر نہ تھی۔

عاشر نے مسکرا کر اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا۔ ایقان بری طرح سے چونکی پھر اس نے سلاکس واپس
پلیٹ میں رکھ دیا اور سامنے رکھی ٹھنڈی ہوتی چائے کا گھونٹ بھرنے لگی۔

”کیا بات ہے؟ کوئی ڈانٹنگ پلان چل رہا ہے؟“ اس نے ایقان کی ناشتے میں عدم توجہی محسوس کی۔
”ہوں۔“ وہ پھر چوٹی۔

”کیا کہا؟“

عاشر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پر زور سے چٹکی بھری۔ وہ ”سی“ کر کے رہ گئی۔

”کیا ہے عاشر!“ خلاف توقع وہ بیزاری سے کہتے ہوئے کھڑی ہوئی پھر وہ ناشتے کے برتن سمیٹنے لگی۔

عاشر نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ان پر اپنا چہرہ رکھا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔ بظاہر وہ برتن
سمیٹ رہی تھی لیکن اس کے پورے وجود میں ایک اضطراب سا تھا۔ ایک بے کلی تھی جو محسوس ہوتی تھی۔ ایک
تاؤ تھا جو اس کے انداز سے بھی جھٹکتا تھا اور ہجرے سے بھی۔

”ایقان۔۔۔“ عاشر نے اسے پکارا۔

”کو۔“ وہ کچن کی جانب جاتے جاتے رک گئی۔

”تم۔۔۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“

ایقان نے مڑ کر نجانے کیسی نگاہوں سے اسے دیکھا، وہ گزرا سا گلاب پھروہ کوئی بھی جواب دیے بغیر کچن میں چلی گئی۔ عاشر الجھنے لگا۔ چند لمحے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اس نے کچھ اندازے لگانے کی کوشش کی پھر اٹھ کر کچن میں چلا آیا۔ وہ ساس پین میں پانی ڈال کر چونے پر رکھ رہی تھی۔ عاشر آہستگی سے اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔

ایقان چونکی۔ اس کے ہاتھ ٹھہر گئے۔

”کیا بات ہے ایقان۔“ عاشر نے اپنا چہرہ اس کے بالوں پر رکھ دیا۔ ”بیزار ہو گئی ہو مجھ سے، واپس چلا جاؤں؟“

”ناگھل ہوئے ہو۔“ وہ کھوکھلے سانس میں بولی۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو۔“

”بیساتم سلوک کر رہی ہو۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”بہن نے کہا کیا ہے عاشر؟“

”نہیں۔۔۔ جہن کی مار مار رہی ہو اور پوچھتی ہو۔۔۔ چلو تباؤ۔“ اس نے اس کا سر اپنی جانب موڑا۔ ”کیا بات پریشان

کر رہی ہے تمہیں؟“

اس کے دونوں ہاتھ ایقان کے کندھوں پر تھے۔ ایقان نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ نجانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ عاشر کے انداز میں بناوٹ کی پوند کاری بھی تھی۔

”یہ تو اکون ہے؟“ اس نے پوچھنا چاہا لیکن الفاظ اس کے لبوں تک آنے سے پہلے ہی تحلیل ہو گئے۔ جانے اس سوال کا کیا جواب آتا؟ اگر وہ ٹیگٹ نظریں چرایلتا۔ اگر ایقان کے شانوں پر دھرے اس کے ہاتھ بے اختیار پھسل جاتے۔ اگر وہ پھیکے سے انداز میں ایسی وضاحتیں دینے لگتا جو ایک آن دیکھے جھوٹ کا آئینہ معلوم ہوتیں۔ پھر۔۔۔ پھر کیا ہوتا؟ ایقان اپنی خوش فہمیوں سے اس قدر جلد دستبردار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ ایک گہری سانس بھر کر اس نے پھر سے رخ موڑا اور چوما جانے لگی۔

”رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ طبیعت مضطرب ہو رہی ہے۔ دل چاہ رہا ہے جلد از جلد سب کام

سمیٹ کر سو جاؤں۔“

”ہیں۔“ عاشر نے چند لمحے اس کی بات پر غور کیا۔ ”نیند کیوں نہیں آئی، کوئی پریشانی؟“

”کمال ہے عاشر۔! وہ زبردستی مسکرا دی۔“ ”بھٹے بھٹا کیا پریشانی ہو سکتی ہے اللہ کا شکر ہے۔ کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ نہ زندگی میں۔ نہ تمہاری۔۔۔ محبت میں۔۔۔“ اب کی بار اس نے سوچ میں گم ہونے کا شر کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ قدرے چونکا پھر مسکرایا۔

”چلو پھر ٹھیک ہے۔ تم آرام کرو۔۔۔ میں ذرا کام سے جا رہا ہوں شام تک لوٹوں گا۔“

”کام سے؟“ ایقان نے اسے دیکھا۔ ”مثلاً کیا کام؟“

”چند ایک پرانے دوستوں سے ملوں گا۔ سوچتا ہوں واپس لوٹ کر جو کاروبار کرنا ہے ابھی سے اس کی سری

تیار کر لوں۔ اچھا ہے یہ معلومات جمع ہوتی رہیں گی تو کام آئیں گی۔“

”ہوں۔“ وہ پہلی سے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ تازہ چائے تمہارے لیے ہی بنا رہی تھی۔ اب بی کر جاؤ۔“

”نہیں یا۔۔۔ تم ہی لو۔۔۔ مجھے تو ابھی نجانے کہاں کہاں چائے پینا ہوگی۔“ وہ ایک بار پھر بے فکر اور خوش باش

لگنے لگا تھا۔

”چلتا ہوں۔۔۔ دروازہ بند کر لو۔“ ایقان پُرسوج نگاہیں لیے کچن کے دروازے پر ہی ایستادہ ہو گئی تھی۔

وہ آئینے میں خود کو بغور دیکھتے ہوئے سفید شرٹ کا کالر ٹھیک کر رہا تھا جب اس کے پیچھے شملہ کا عکس نمودار

ہوا۔ ہاشم کے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ جاگئی۔ اس نے غور سے خود کو اور اسے ایک ساتھ دیکھا اور پھر مسکرایا۔

شملہ آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے اس کے قریب آگئی۔

”صبح بخیر ادم۔! وہ ہنسنے لگی۔“

”ہاں۔ ایک بات کہنا چاہی آپ سے۔“
 ”ہوں ہوں، جتنی چاہے کہیے۔ آپ کے لیے تو ہم آفس سے لیٹ بھی ہو سکتے ہیں۔“
 ”اس کی ضرورت نہیں۔“ شہلا مسکرا دی۔ ”میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ میں نے جتنی چٹھیاں لی تھیں وہ ختم ہو چکی ہیں۔ میں اب ہسپتال جایا کروں گی۔“

”ضرور جائیے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔
 شہلا چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی جیسے اسے کسی بات کے کہنے سے جھجک سی تھی پھر وہ دھیرے سے بولی۔
 ”امی سے آپ بات کر لیجئے گا۔ وہ سمجھ رہی ہیں کہ میں اب مستقل طور پر چھوڑ چکی ہوں۔ میں نے ان کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے۔“

ثانی کی ناٹ پابند ہتھ ہوئے ہاشم کے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے تذبذب ابھرا تھا۔
 ”شہلا۔۔۔ تم امی کو مناسب الفاظ میں یہ وضاحت کرو کہ تم چھٹیوں پر نہیں۔۔۔ میرا خیال ہے میرا اس سلسلے میں کچھ کہنا غیر مناسب ہو گا۔ ہاں پھر اگر وہ کوئی نکتہ اعتراض اٹھاتی ہیں تو میں انہیں سمجھا لوں گا۔ یا ایسا کروں گا۔“
 ”ہاں بھی آئی ہوئی ہے۔ اس سے تذکرہ کرو۔۔۔ امی خود سمجھ جائیں گی۔ کیا خیال ہے۔“
 ”ٹھیک ہے۔ ایسا ہی کر لیتے ہیں۔“ وہ آواز ہو گئی۔ ”میں ماہین سے بات کر لوں گی۔ ایک بات اور بھی ہے۔“
 ”وہ کیا؟“ وہ اب بریف کیس میں رکھی فائلیں چیک کر رہا تھا۔
 ”نہیں کچھ دن کے لیے عمر کو اپنے پاس لے آؤں؟“
 ہاشم چونکا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے اس سوال کا جواب نہ دے پایا۔ چند تینہ ہی جملے اس کی یادداشت سے ٹکرائے تھے۔

”اس گھر میں صرف ہماری نسل پروان چڑھے گی۔“
 ”لوگ کیا کہیں گے۔۔۔ بہو کے ساتھ پونا بھی ملا ہے۔“
 شہلا اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی ہاشم چونک کر خود پر قابو پانے لگا۔
 ”آں۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔ ہم چلیں گے ان سب سے ملنے تو۔۔۔ عمر کو بھی لے آئیں گے۔ کچھ دن ہمارے ساتھ رہ لگے گا۔“

”کچھ دن۔“ شہلا کے دل میں پون سی چھبی۔
 اس نے قدرے بے اعتباری سے ہاشم کا چہرہ دیکھا۔ ہاشم اس کی کیفیات سے بے خبر بریف کیس بند کر رہا تھا پھر اس نے مسکرا کر شہلا کو دیکھا اور اس کے قریب آ کر اس کا گال تھپتھپایا۔
 ”میں اب چلوں، شام کو ملنے ہیں۔“
 اس نے بے دلی سے سر ہلادیا۔

”ایم اے کی کلاسز اسٹارٹ ہو چکی ہیں پھر بھی تم فکر مت کرو، میری کچھ جان پہچان ہے، تمہارا ایڈمیشن کروا دوں گا۔ ہاں یہ ہے کہ یونیورسٹی میں اب ایڈمیشن مشکل ہے۔ کالج سے ماسٹرز کرو لو، کیا خیال ہے؟“
 ربیعہ نے چونک کر عباد کو دیکھا اور مسکرا دی۔
 ”میرے لیے پڑھائی اہم ہے عباد بھائی، یونیورسٹی یا کالج نہیں۔ آپ مجھے فارم اور پراسپیکٹس وغیرہ لادیں تاکہ یہ مراحل جلد سے جلد طے ہو جائیں۔“
 ”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ سارے کام کل ہی ہو جائیں گے۔ تمہارے پاس تمہارے ضروری اڈاکویشن تو ہیں نا؟“
 ”جی ہاں۔ میں انتہائی غلت میں بھی اپنی فائل لینا نہیں بھولی تھی۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ پڑھ وین پر چند مناظر پھر گئے تھے اس کا دل اداس ہوا۔

”شہلا آپنی کے سسرال سے بھی کافی لڑکیاں کالج جاتی ہیں۔“ عباد بولا۔ ”تمہیں وہاں سے اچھی خاصی پہچان مل سکتی ہے۔ تمہیں یہ کہہ کر کہ انیتھ کے ساتھ شام کو شہلا آپنی سے ملنے چلی جاؤ۔ ان سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور ضروری انفارمیشن بھی مل جائے گی۔“

”کیسی انفارمیشن درکار ہے جناب کو۔“ انیتھ چائے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں آرہی تھی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”وہ بھی شہلا آپنی کے سسرال سے۔ خیر تو ہے؟“ وہ جھک کر چائے میز پر رکھنے لگی تو عباد نے اس کا کان پکڑ لیا۔

”تمہاری کھوپڑی الٹی فٹ ہے اس لیے تمہارے سوچیں بھی الٹی سمت میں سفر کرتی ہیں۔“

”پھر اس میں میرا کیا قصور ہے، میرا تو کان پھوڑیں۔“ وہ کرائی۔

”جلدی سے ڈاکٹر بن جاؤ تو تمہارا بھی کچھ علاج کریں۔“ انیتھ زور سے ہنس دی۔

”بچتے۔ ڈاکٹر بنوں میں۔ اور علاج کریں آپ۔ یہ تو لطیفہ ہو گیا اور مجھے آپ کہہ رہے ہیں کہ میری سوچیں الٹی سمت میں سفر کرتی ہیں۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ اپنے بارے میں کیا خیال ہے جناب کا۔“

”بہت نیک خیال ہے۔“ وہ اطمینان سے پیر پھیلا کر بولا۔ ”چلو چائے بناؤ۔“

”یہ کام ربیعہ کرے گی۔“ وہ مزے سے کشن گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔

ربیعہ دونوں بہن بھائی کی نوک جھونک مزے سے سن رہی تھی وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میز کے قریب آ بیٹھی اور چائے بنانے لگی۔

”ربیعہ۔ اتنے دن ہو گئے۔“ انیتھ نے کہا۔ ”تم نے کبھی اپنے بارے میں نہیں بتایا، اپنی فیملی کے بارے میں۔ اپنا نیک گراؤنڈ۔ ماں باپ، بہن بھائی۔“

ربیعہ کا دل دھڑکا ہاتھ کانپا، چائے کپ سے چھلک کر ساسر میں گری۔ وہ عباد کو چائے پکڑا رہی تھی۔

”ربیعہ کے ماں باپ حیات نہیں ہیں۔“ عباد چائے کا کپ تھامتے ہوئے سکون اور اطمینان سے بولا۔ ”اس کا ایک ہی بھائی ہے جو میرا بہت اچھا دوست ہے۔ جب کے سلسلے میں اسے ملک سے باہر جانا پڑ گیا۔ چند لالچی رشتہ داروں کے خوف سے وہ ربیعہ کی ذمہ داری میرے سپرد کر کے گیا ہے اور اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں۔ ہم جو ہیں۔“ منیہہ بیگم اندر داخل ہوتے ہوئے مسکرائیں۔ ”ایسا کیوں کہتے ہو کہ اس کا کوئی نہیں ہے، میں اس کی ماں ہوں۔ انیتھ اور شہلا اس کی بہنیں ہیں۔“ انہوں نے ربیعہ کا سر اپنے کاندھے سے لگا لیا۔ ربیعہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ منیہہ بیگم کے وجود سے اٹھتی خوشبو اسے بہت اپنی بہت مسحور کن محسوس ہوئی۔ اس نے بے اختیار ہی اپنے بازو ان کے گرد جامل کر لیے تھے۔



”دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا۔ وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا۔“

دھڑا دھڑا میں غزل کے دلکش بول کمرے کی خاموشی میں گونج رہے تھے۔ ناعہہ کمرے میں داخل ہوئی تو ٹھنک کر رک گئی۔

عریشہ بستر دراز تھی۔ دونوں ہاتھ سینے پر رکھے، آنکھیں بند کئے وہ کسی لاش کی مانند ساکت لگ رہی تھی۔ چند دنوں میں اس کا وجود جیسے برف کی طرح سے گھلا تھا۔ چہرہ جو کبھی، مختلف گلاب کی مانند تھا، بے رونق اور زرد ہو رہا تھا۔ آنکھیں گڑھوں میں دھنسی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ناعہہ کو اس پر بے حد ترس آیا اور اس سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ اس کے قریب آ بیٹھی۔ آہٹ محسوس کر کے عریشہ نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند لمحے ناعہہ کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے ریموٹ سے سی ڈی پلیئر آف

کر لیا۔ ”عریشہ۔ کیسی ہو۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”تم دن ہو گئے، تم تو اب ملنے آتی ہی نہیں ہو۔ خود کو قید کر لیا ہے تم نے اس کمرے میں۔ ایسے تو تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“
 عریشہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اداسی سے مسکرائی۔ ایک قطرہ اس کی آنکھوں سے نکل کر بالوں میں گم ہو گیا۔

”بیمار تو۔۔۔ ہو گئی ہوں ناعمہ۔۔۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔۔۔“
 ”ایسا کیوں کہتی ہو، خدا نہ کرے جو ہمیشہ کے لیے بیمار پڑو تم۔“ ناعمہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے دھچکا سا لگا۔
 اس کا ہاتھ ہڈیوں سے بنا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

”ایک بات پوچھوں تم سے۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولی۔
 ”کون سی نئی بات ہے پوچھنے کو ناعمہ؟“ وہ بے دلی سے بولی۔ ”کیا جان لو گی تم؟“
 ”تمہیں نافع پسند نہیں ہے؟“ وہ بے اختیار ہی پوچھ بیٹھی۔
 عریشہ لختی سے ہنس دی۔ اس کے چہرے پر تنفر پھیل گیا تھا۔

”اب ان باتوں سے کیا فائدہ، مروے کو دفن کر پوچھنا کہ تمہیں قبر پسند آئی یا نہیں۔ عجب لاعا حاصل سوال ہے ناعمہ!“

ناعمہ خوف اور وحشت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔ اسے عریشہ واقعی ایک مروے کی مانند محسوس ہوئی۔
 سرد اور بے جان۔

”عریشہ!“ وہ ایک مرتبہ پھر ہمت کر کے بولی۔ ”تم نے ایک چھوٹی سی بات کو خود پر سوار کر لیا ہے۔ باہر نکلو، ہنسو، بولو تو تمہاری یہ بے سکونی کچھ کم ہو۔ ماحول بدلنے سے خیالات پر بہت اثر پڑتا ہے عریشہ!“
 ”مجھے اب کسی بات سے فرق نہیں پڑتا۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔ ”اب تم جاؤ ناعمہ! میرے پاس بیٹھنے سے تمہیں ضرور فرق پڑے گا۔ کہیں تم میں سے بھی کافور کی بونہ آنے لگے۔“

ناعمہ سن سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ عریشہ نے پھر آنکھیں نہیں کھولیں۔ ناعمہ اٹھ کر مرے مرے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔



”ہوں۔“
 وردہ متفکر ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔
 ”میں سچ کہہ رہی ہوں وردہ آپنی! وہ۔۔۔ وہ مرجائے گی۔۔۔ وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس نے خود کو ایک مردہ تصور کر لیا ہے اور اس کے اندر یہ یقین پختہ ہو جا چکا ہے۔“

ناعمہ اسے لفظ بہ لفظ ساری کہاںی سن کر بیٹھی تھی۔ دونوں بہنیں حقیقتاً پریشان ہو گئی تھیں۔
 ”کیا کیا جائے۔“ وردہ سوچ رہی تھی۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے، فاروق ماموں نے بہت غلٹ دکھائی ہے فیصلہ سننے میں۔ لڑکیاں بھی جیتی جاتی مخلوق ہیں۔ وہ بھی جذبات و احساسات رکھتی ہیں، ان کی بھی پسند ناپسند ہو سکتی ہے۔ اگر اسے نافع پسند نہیں تھا تو بیویوں کو اس بات کو سمجھنا چاہیے تھا۔ انہوں نے تو اسے انا کا مسئلہ بنا لیا۔ مجھے لگتا ہے ناعمہ! عریشہ کے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔ وہ اتنی زیادہ حساس ہے، اس کا کسی کو اندازہ نہ ہو سکا۔“ ناعمہ نے انہات میں سر ہلایا۔

”ایک بات تو بتاؤ۔“ وردہ نے نطو لتی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم، عریشہ اور ثانیہ تو ایک دوسرے کی ہمرازو دمساز تھیں۔ اس نے کبھی کسی اور کے لیے پسندیدگی کا اظہار کیا؟ کیا کبھی تم نے محسوس کیا کہ وہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہے؟“

”نہیں۔“ ناعمہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کبھی بھی نہیں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور ہم سے ذکر کرتی۔“



”ہوں۔“ اس نے سوچ انداز میں کہا پھر تو سارا مسئلہ بس یہی ہے کہ وہ مانع کو سخت سے رد کر رہی ہے۔ اتنی زیادہ شدت سے کہ اس کی اپنی ہستی متنی جا رہی ہے اور اسے یا کسی اور کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہے۔
”ہم اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں اپنا؟“ ناعمہ نے تاسف کے احساس میں گھر کر پوچھا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔

”آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ رافع بھائی سے بات کریں نا۔“ ورور نے اسے بری طرح گھورا۔
”پاگل ہوئی ہو، میں رافع سے کیوں بات کروں۔ بات کرنا ہوئی تو میں ڈائریکٹ نافع سے کروں گی۔ تمہارا مانع بھی نجانے کہاں سے کوئی لا تا ہے۔“
وہ بڑبڑانے لگی تھی۔ ناعمہ کے لب شرارت سے مسکرا اٹھے۔ اس نے پیار سے بہن کی جانب دیکھا تھا۔



یہ سپیدی افق سے اتری ہے
یا تری مرمریں پیشانی سے
یہ کرن آسمان سے ٹوٹی ہے یا پھر
تیری مسکائی ضوفشانی سے
دل کے جذبوں نے بولنا سیکھا
تیری نظروں کی مہربانی سے

وہ سادہ صفحے پر رقم الفاظ کو تنک رہا تھا۔ عجب آرزو میں تھیں جو شہر تنہا میں نمونپانے لگی تھیں۔ رافع نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں سختی سے بند کر لیں۔

”یا رافع!“ اس کے کانوں میں ہاشم کے الفاظ گونجنے تھے۔ ”خدا کرے تجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“
وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بے چینی حد سے سوا ہونے لگی تھی۔ کھڑکی کے کھلنے سے کاسنی تیل جھک جھک کر اندر جھانکنے لگی تھی۔ رافع کا دل چاہا وہ بھاگے۔ بھاگتا جائے۔ اتنا بھاگے کہ تھک کر چور ہو جائے۔ ٹوٹے ہوئے، ٹھکے ہارے وجود میں صرف ایک دھڑکتے دل کی آواز ہو اور ہر آواز معدوم ہو جائے، ہر خیال پس پشت چلا جائے۔ ہر احساس ختم ہو جائے۔ صرف۔۔۔ صرف ایک احساس کے سوا، وہ ہر بات بھلا ڈالنا چاہتا تھا لیکن۔۔۔ لیکن کیا ایسا ممکن تھا۔

”کون ہو تم؟“ اس نے سختی سے آنکھیں میچیں۔ ”کہاں سے آئی ہو، کیوں آئی ہو؟ کیا ملا تمہیں کسی کی پرسکون دنیا کو بے سکون کر کے۔ کیا پایا۔۔۔ بولو۔۔۔ جواب دو۔“ ذہن کے افق پر ایک مرمریں وجود کی مسکراتی شبیہ نمودار ہوئی۔

”ہار سنگھار کے پھولوں سی لڑکی! لوٹ جاؤ، جہاں سے آئی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے گلاب جذبوں کی خوشبو تم تک پہنچے اور تم بھی میری طرح بے سکون ہو جاؤ۔ میں نہیں چاہتا۔۔۔ لوٹ جاؤ۔۔۔ لوٹ جاؤ۔“

”میری چشیاں بھی ختم ہو چکی ہیں۔“ اس نے سلا کی پیلٹ اٹھاتے ہوئے بظاہر عام سے انداز میں کہا۔ ”میں بھی کل یا پرسوں سے جوائن کروں گی۔“

کھانا کھاتے فردوس بیگم کے ہاتھ رک گئے۔ ان کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ شہلا ان کی جانب نہیں دیکھ رہی تھی پھر بھی اس نے ان شکوک کو محسوس کر لیا۔ منہ میں نوالہ ڈالتی باہین کے ہاتھ بھی ست ہو گئے۔

”ابھی سے۔۔۔ ابھی سے بھابھی!“ پھر وہ بولی۔ ”ابھی تو ہم نے اپنے چاؤ بھی پورے نہیں کیے۔“
”اے ہاں۔۔۔ کیسے چاؤ۔“ فردوس بیگم نے ہاتھ میں چٹڑی ہوئی روٹی ہاٹ پائٹ میں رکھ دی۔ ”ہم نے تو پہلے دن ہی ہر چاؤ جو پچھلے سے ہاتھ اٹھا لیا تھا۔ جیسے چاہو کرو۔ ہم بے چارے نہ لینے میں نہ دینے میں۔“
”امی!“ باہین نے ماں کو تنبیہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

سینی ہی نہ تھی۔ حمزہ مال کے انداز پر بے حد شرمندہ ہو کر ہاتھ دھونے کے لیے گھڑ گئی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے گھس گئی۔
 ”ماہین! شہلانے فکر مندی سے اسے دیکھا۔ ”کیا بات ہے۔ کیا امی جان کو میرا نوکری کرنا پسند نہیں ہے؟“
 دیکھو ماہین! میں تمہیں ایک بات بتاؤں۔ مجھے اس بات سے بے حد خوف محسوس ہو رہا ہے کیونکہ۔۔۔

”کیونکہ۔۔۔“
 وہ بولتے بولتے رک گئی۔ جھک آڑے آگئی تھی۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے پہلے تعلق کے بارے میں بات نہ کر پائی۔ ہر چند کہ وہ ماہین کو بتانا چاہتی تھی کہ اس کا پہلا تعلق ختم ہونے کے پیچھے بھی اسی معمولی بات کا ہاتھ تھا۔
 ”آپ دلی پر نہ لیں بھابھی! ماہین دے دے سے انداز میں بولی۔ ”امی کی تو عادت ہے ذرا اسی بات پر سوڈ خراب کرنے کی پھر خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتی ہیں پھر اصل بات تو ہاتھ بھائی کی اجازت کی ہے۔ اگر وہ راضی ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

وہ اپنی بات مکمل کر کے برتن سمیٹنے کے بہانے اٹھ کھڑی ہوئی۔ شہلا سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے اپنا منیکہ اور اس کا بے حد پر سکون ماحول ٹوٹ کر یاد آیا پھر وہ ایک گہری سانس بھر کر کھڑی ہو گئی۔

گاڑی گرلز کالج کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ فریجہ نے جوس کا خالی ڈبہ باہر پھینکا اور بھائی کی جانب دیکھا۔ وہ ہونٹ پیچھے نبھانے کس سوچ میں گم تھا۔ سن گلاسز کے پیچھے چھپی آنکھیں اپنا بید چھانے میں کامیاب تھیں۔ فریجہ نے اس کے تاثرات دیکھے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ وہ کاندھے اچکا کر کالج کا گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ تب ہی گھڑی کی سوئیوں نے ایک نئے کا اعلان کیا۔ چند لمحوں میں بڑا آہنی گیٹ واہوا تھا۔ لڑکیاں جوق در جوق باہر نکلنے لگیں۔ آپس میں باتیں کرتی، ٹیکسٹ بکس کو ہاتھ بھاتی، خدا حافظ کہتی، بے فکر لڑکیاں ہستی کھلکھلاتی گھروں کو جانے کی جگت میں تھیں۔

”وہ۔۔۔“ فراز نے فریجہ کو مخاطب کیا۔ ”وہ سامنے۔ جس کے ہاتھ میں دو کتابیں ہیں اور کاندھے پر بلیک بیک۔“

فریجہ نے جلدی جلدی گاڑی کے قریب سے گزرتی لڑکی کا مشاہدہ کیا اور مسکرائی۔
 ”گنڈ! پسند تو آچھی ہے آپ کی۔“ فراز نے گہری سانس بھر کر گاڑی اشارت کردی۔
 ”باد رکسو کی نا۔“

”بالکل۔“ وہ یقین سے بولی۔
 ”مجھے اس نے اپنا نام غلط بتایا تھا۔ شہلا آپ کی شادی میں علم ہوا کہ اس کا نام ناعملہ ہے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں بالکل غلطی نہیں کروں گی۔ ویسے کیوں نہ اسے گھر تک ڈراپ کروں؟“
 فراز نے ایک نظر بہن پر ڈالی اور زخمی سے انداز میں مسکرا دیا۔
 ”غلطی بار بار نہیں دہراتے۔“ وہ بولا تھا۔

پھر اس نے گاڑی سڑک پر ڈال دی۔ فریجہ نے نا سنجھی سے کاندھے اچکا دیے۔

”ہم اندر آسکتے ہیں؟“ شہلانے جالی کا دروازہ کھول کر اندر بھاٹک کر پوچھا۔
 کروشیہ سے تیل بنائی رابعہ بیگم نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں اور ایک دم رنجوش ہو گئیں۔
 ”زہے نصیب۔۔۔ زہے نصیب۔۔۔“ وہ والہانہ انداز میں اٹھیں۔ ”یہ آج چاند کہاں سے نکل آیا۔ وہ بھی ہمارے گھر میں۔ آؤ آؤ نا۔“

شہلا مسکراتی ہوئی اندر چلی آئی۔ اس کی ہمراہی میں انیفہ اور ربیعہ بھی تھیں۔ وہ آپس میں سلام دعا کرنے

لیکس۔ ان کی آوازیں سن کر اندر سے وردہ اور ناعمہ بھی نکل آئیں۔
 ”شکر ہے۔ آپ کو ہمارا خیال تو آیا۔“ ناعمہ نے شہلا کے گلے لگ کر جھٹک دیا۔ وردہ اسے آنکھیں دکھانے لگی۔ انہیقا اور ربیعہ مسکرا دیں۔
 وردہ انہیں ڈرانگ روم میں لے آئی۔ انہیں بٹھا کر وہ خود ہر نکل گئی تھی۔
 ”واہ بھئی۔ بہت ذوق و شوق سے سنوارا ہے گھر۔“ شہلا نے خوبصورتی سے ججے ہوئے درود پوار کو دلچسپی سے دیکھا۔

”یہ سب وردہ کا کمال ہے۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔ ”گھر کو سجانے بنانے کا جنون ہے اسے۔ کتنے ہی کورسز کر ڈالے ہیں اسی چکر میں۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ بناتی ہی رہتی ہے۔“
 ”اور ناعمہ۔“ شہلا نے بھرے بھرے چہرے والی گلابی لڑکی کو شوق سے دیکھا۔ رابعہ بیگم نے آہ سے مشابہ سانس بھری تھی جو اس کے استفسار کا خوب جواب تھی۔ ناعمہ شرمندگی سے مزید سرخ ہوئی۔ انہیقا اور ربیعہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”ہاں تو چھوٹی بھی تو ہے نا۔“ شہلا بول اٹھی۔ ”چھوٹی پٹیاں لاڈلی زیادہ ہوتی ہیں نا۔“
 ”کوئی نہیں ایسا۔“ انہیقا نے احتجاج کیا۔ ”میں چھوٹی ہوں لیکن امی آپ کو زیادہ چاہتی ہیں۔ مجھے تو ڈانٹتی ہی رہتی ہیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ ناعمہ جھٹ سے بولی۔ ”گھر میں سب سے زیادہ ڈانٹ میں ہی کھاتی ہوں۔ کہاں کالا ڈکیا لاؤ۔ سارے نمبر تو یہ وردہ آپ لے جاتی ہیں۔“ ایک بار پھر سب اس کے احتجاج پر ہنس دیے۔
 ”وردہ میری سب سے پیاری اور نیک بچی ہے۔“ رابعہ بیگم کے لہجے میں کچی محبت بول رہی تھی۔ ”میرا سب سے زیادہ خیال کرنے والی، سلیقہ مند اور سمجھ دار۔ یہ ناعمہ تو ابھی بچپن سے ہی نہیں نکلی۔“
 وردہ چائے کی ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوئی۔ چائے کے ہمراہ پائین اہل یک اور شامی کباب بھی تھے۔ ٹرے سینڈ، نیمل، برکھ کہہ سب کو سرو کرنے لگی۔

”مجھے تو یہ کباب اور ایک بھی وردہ کے ہاتھوں کا کمال لگتے ہیں۔“ شہلا نے کہا۔

”اسی نے بنائے ہیں۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔

”وردہ!“ شہلا نے کباب کا پیس منہ میں رکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ”ربیعہ بھی دراصل تم ہی سے ملنے آئی ہے۔ تم ہاسٹرز کر رہی ہو نا؟“

”جی ہاں سوشیالوجی میں۔“

”ربیعہ بھی ایڈمیشن لے رہی ہے۔ یہ تم سے کچھ مشورہ وغیرہ کرنا چاہتی ہے۔“

”ضرور۔“ وہ مسکرائی۔ ”میرا ہی سبجیکٹ لے لو تو ہم دونوں کو بہت آسانی ہو جائے گی۔ ویسے میں تمہیں سارے سبجیکٹس کے متعلق تھوڑا بہت گائیڈ کر دوں گی۔ تم اپنی مرضی سے سلیکشن کر لینا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ ربیعہ نے سر ہلایا۔

”او میرے ساتھ۔ میں تمہیں بکس وغیرہ دکھاتی ہوں۔“ وردہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ربیعہ بھی اس کے ہمراہ اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

”بہت پیاری بچی ہے۔ ماشاء اللہ۔“ رابعہ بیگم اس کے جانے کے بعد بولیں۔ ”تم لوگوں کی رشتہ دار ہے؟ شادی سے پہلے اس بچی کو کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔“

”رشتہ دار ہی نیچے۔“ شہلا نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی کچھ عرصہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔“

”پڑھائی کی غرض سے آئی ہوگی۔“ وہ پر خیال انداز میں بولی تھیں۔

”جی! انہیں نے مختصر“ کہا۔

”بس تو پھر طے ہو گیا، میں سو شیا لوجی ہی سلیکٹ کر لیتی ہوں۔ اچھا مضمون ہے۔“ ربیعہ کتابیں اور سلیبس وغیرہ دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھی۔ درود خوش ہو گئی۔

”چلو پھر تو بہت اچھا ہوگا، ہم دونوں ساتھ ہی کالج آیا جایا کریں گے۔ نوٹس وغیرہ بنانے میں بھی سہولت رہے گی اور ویسے بھی مجھے تم اچھی بھی لگتی تھیں۔ جی چاہتا تھا تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کو، تمہیں قریب سے دیکھنے کو۔“ درود مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ربیعہ حیران ہی رہ گئی۔

”اچھا۔۔۔ تو تم نے کبھی مخاطب بھی نہیں کیا مجھے۔“

”تمہارا رعب حسن تھا نا۔“ درود ہنس دی۔

ربیعہ بھی قد رے شرمندگی سے مسکرا دی۔

”مجھے اپنی تعریف بالکل بھی پسند نہیں ہے۔“

”نیکو ہو؟“ درود نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ارے نہیں۔“ ربیعہ ہنس پڑی۔ ”اور کوئی ارادہ بھی نہیں۔“

”وہ کیوں؟“ سے حیرت ہوئی۔

”بس۔“ ربیعہ اداس سی ہو گئی۔ ”کوئی وجہ تو نہیں پھر بھی۔۔۔“

”کبھی کوئی اچھا نہیں لگا اس لیے؟“

ربیعہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ درپچہ خیال پر دو چمکتی شناسا، مہمان نگاہیں ابھری تھیں۔ دو مسکراتے لب۔۔۔ خاموش مگر مہرہ وقت کچھ کہتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ وہ خاموش مہمان تبسم دل کو اچھا لگا تھا۔ نجانے کیوں اس وقت درود کے سوال پر ربیعہ کے ذہن میں اس نگاہ کا ہر لمحہ پھر گیا۔ درود بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی جیسے کچھ سمجھ کر مسکرا دی۔

”آپ کی امی کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا۔“ چہرے پر کلیزنگ کریم ملتے ہوئے اس نے عام سے انداز میں کہا۔ وہ مکمل میگزین کی ورق گردانی کرنا ہوا ہاشم قدرے چونک اٹھا۔ اس نے چند لمحے اس کے لہجے اور بات پر غور کیا پھر محتاط سے انداز میں بولا تھا۔

”امی کی پسند ناپسند سے اتنا فرق نہیں پڑتا شہلا! میں یار ہا تمہیں کہہ چکا ہوں، تمہیں میرا اور مجھے تمہارا اعتبار ہونا چاہیے۔ جب میں تمہیں اجازت دے چکا ہوں پھر تمہیں کسی اور کی اجازت درکار تو نہیں ہونا چاہیے اور امی کی بچہ کریم کسی حد تک تو سمجھتی ہی ہوگی۔ مزید وضاحت کی ضرورت تو نہیں ہے۔“

”فرق کیوں نہیں پڑتا ہاشم! وہ کائن بال سے چہرہ صاف کرنے لگی۔“ ”ایک گھر میں رہتے ہوئے ان باتوں سے فرق تو پڑنا ہے۔ خیر میں مینج کر لوں گی۔ آپ میرے ساتھ ہیں تو میں مطمئن ہوں۔“

”میں تو کب سے آپ کے ساتھ ہوں مختصر! اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر میگزین بند کیا۔“ ”آپ دھیان ہی نہیں دے رہیں۔ اب تو مایوس ہو کر سوچنا ہوں، رافع سے کپ شپ لگا آؤں۔“

”ضرور۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں نے آپ کو کبھی روکا تو نہیں۔“

”کاش! اس نے آہ بھری۔

”آپ بچ جبار ہے ہیں؟“ شہلا کو حیرانی ہوئی۔

”روک لو اگر چاہو تو۔“ وہ شرارت سے ہنسا۔

شہلا جھینپ گئی تھی۔ ہاشم مسکراتا ہوا باہر کی سمت بڑھ گیا۔

”یا حضرت“ رافع نے اسے حیرانی سے سرسپاؤں تک دیکھا۔ ”یہ واقعی آپ کی سواری بادشاہی ہے یا پھر میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔“

”اے۔۔۔“ ہاشم نے شرمندہ ہوتے ہوئے اسے ایک دھپ سے نوازا۔ ”تجھ پر بھی یہ اچھا وقت آئے گا“ بے فکر رہ۔“

”اے۔۔۔“ رافع نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”یار ہاشم! اچھی دعائیں دیا کر یا! مجھے لگتا ہے تیری زبان اچھی بھلی کالی ہے۔“

ہاشم نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ رافع آنکھیں موند کر دم سُرول میں کچھ گنگنا لگا۔

”یہ جو ایک اچھی سی لڑکی ہے ربیعہ! ہاشم بولا۔“

رافع نے اس قدر بے اختیار آنکھیں کھولیں کہ ہاشم کا دل حقیقتاً ”ذور سے دھڑکا۔“

”یار رافع! سنبھل کر میرے بھائی۔“ وہ حقیقتاً ”پریشان ہوا۔“

رافع کے لبوں پر جھپٹی جھپٹی سی مسکراہٹ در آئی تھی۔

”یونہی۔۔۔ خوا خواہ۔۔۔ ہواؤں میں تیرا“ وہ سر جھٹک کر بولا۔

”تیر تو ہواؤں میں ہی چھوڑے جاتے ہیں دوست۔ تب ہی نشانے پر لگتے ہیں۔“ ہاشم کے لہجے میں یقین

بھی تھا، بے یقینی بھی۔ ”میں تیرا دوست ہوں رافع۔ تیرا ہدم، ہم نفس۔۔۔ تو مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

رافع سر جھٹکا کر اپنی ہتھیلیاں ملنے لگا، پھر اس نے سراٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔

”میں خود اس سے بھی جھوٹ بولنے کی سعی پیہم میں مصروف ہوں دوست۔ پر کامیابی ہوتی نظر نہیں آتی تو بڑا ظالم دوست ہے ہاشم۔ تو نے مجھے بہت بددعا میں دی ہیں۔“

”اوہ۔۔۔“ ہاشم جیسے بالکل ہی بیٹھ گیا تھا۔ ”آئی۔۔۔ آئی ایم سوری رافع۔ کیا خبر تھی۔ اوہ۔۔۔ آئی ایم ریلی

سوری۔“

”چلو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ ایقان نے اسکول سے آئے ہوئے مومن کو ہدایت دی تھی۔

”حمزہ بھائی آرہے ہیں ہمیں لینے، ہم ثانی امی کے گھر چل رہے ہیں۔“ وہ خود ایمان کو شوز پہنا رہی تھی۔

”ہرے۔۔۔“ مومن نے تعجب لگایا۔ ”ہم وہاں رہیں گے نا ماما؟“

”ہاں۔۔۔ آج رات رہیں گے۔ کل واپس آجائیں گے۔“ وہ اب ایمان کی پونیاں بنانے لگی۔

”اُتی جلدی۔۔۔“ اس نے منہ سورا۔ ”مجھے عمر کے ساتھ کھیلتا ہے بہت سارا۔“

”بیٹا! آپ کی پچھلیاں تو نہیں ہیں پھر بھیا آئے ہوئے ہیں آپ کے۔ وہ کیا کہیں گے۔“

”پہا کتنے دن بعد واپس جائیں گے ماما؟“ ایقان نے تھمر کر اسے دیکھا اور گہری سانس بھری۔

”پتا نہیں۔“ وہ قدرے خفگی سے بولی۔ ”آپ کپڑے چھیج کر لو، جلدی۔“

وہ اچھلتا کودتا اندر چلا گیا۔ ایمان کو تیار کر کے اب وہ خود بال بنارہی تھی۔ جب ڈور تیل بجی۔ باہر حسب توقع

حمزہ ہی تھا۔ اپنے لالہ ابلی انداز میں ایمان کو کاندھے پر چڑھائے کر وہ اندر چلا آیا۔

”چلیں پھو؟“

”ہاں چلو، ہم لوگ تیار ہیں بالکل۔“

”اور پھیما حضور۔ وہ کہاں ہیں؟“

”کچھ خبر نہیں ماتی ان کی۔“ وہ جلدی سے انداز میں بولی۔ ”کبھی بالکل فارغ، کبھی بے حد مصروف۔ سنا ہے

آج کل کسی بزنس وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر گھر سے باہر ہی پائے جاتے

ہیں۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا اور فریج کھول کر کوئی کام کی چیز تلاش کرنے لگا۔ ”میں نے انہیں چند دن پہلے دیکھا

تھا ایک فائر لڑکی کے ساتھ آئس کریم پارلر پر۔ شاید بزنس وغیرہ کے سلسلے میں مصروف تھے۔
ایقان جہاں بھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس نے بے اعتباری سے حمزہ کی جانب دیکھا کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہو لیکن وہ اپنی بات پوری کر کے اب سنجیدگی سے مٹھائی کے ڈبے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔

”تم نے۔۔۔ تم نے۔۔۔ عاشرہ دیکھا تھا۔۔۔ آئس کریم پارلر پر۔۔۔“ وہ بے اعتباری سے بولی۔ ”کب؟ کب کی بات کر رہے ہو؟“
”اول۔۔۔“ اس نے سوچا۔ ”شاید پرسوں کی بات ہے۔ پرسوں رات کی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ یقیناً میں اسی دن رہبر کے ساتھ نکلا تھا۔“

”پرسوں۔۔۔“ ایقان نے کھوئے کھوئے انداز میں سوچا۔

اس روز عاشرہ رات بہت دیر سے لوٹا تھا اور ایقان کے استفسار پر اس نے ایک دوست کے ہاں دعوت کا ذکر کیا تھا۔

”چلیں پھپھو۔۔۔ حمزہ نے قدرے اکتا کر کہا۔ ”مجھے دیر ہو جائے گی۔ میری شام کی کلاسز ہیں۔“
”آہ۔۔۔“ وہ چونکی۔ ”ہاں چلو۔“

خود پر قابو پانا اس وقت دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔ بدقت تمام اس نے بیگ شانے سے لٹکایا۔ اس وقت اس کا اپنا جی کسی کے شانے سے لگ کر آٹو بھانے کو چاہ رہا تھا۔
”ایک فائر لڑکی کے ساتھ۔۔۔ آئس کریم پارلر پر۔۔۔“ حمزہ کے الفاظ اس کا دل کاٹ رہے تھے۔
”ٹرا! کالنگ۔“ عاشرہ کے موبائل کی اسکرین اس کے ہاتھ پر روشن تھی۔

”اوکے۔ میں اب چلوں گا۔“ کافی کا خالی گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لڑانے الماری کے پٹ بند کرتے ہوئے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔

”آج بیس رک جاؤ۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔
”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔“ وہ برش سے بال سنوارنے لگا۔
”کیا خرچ ہے؟“
عاشرہ نے اسے گھورا۔

”ٹرا! میں تمہیں ایک ہزار ایک مرتبہ سمجھا چکا ہوں۔ ایسے مطالبات مت کرو جو میرے لیے ناقابل قبول ہوں۔“

”جو مطالبات تمہارے لیے قابل قبول ہوں ان کی ایک لسٹ بنا دو۔“ وہ شرارت سے ہنسی۔

”میں تمہیں اپنا دائرہ عمل بتا چکا ہوں۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولا۔

”آہ۔۔۔“ اس نے منہ کھول کر کاغذ پر لکھ کر دیا۔ ”اب کب آؤ گے؟“

”پرسوں تمہاری فلائٹ ہے، تمہیں سی آف کرنے آؤں گا۔“ وہ چند لمحے ٹھہرا۔

”تم آؤ۔۔۔ ڈنٹ سے کہ تم کل نہیں آؤ گے۔“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔

”اوکے۔“ کو شش کر دیں گا۔“ وہ نرمی سے اس کا ہاتھ ہٹا کر دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

”عاشرہ۔۔۔“ اس نے پیچھے سے پکارا۔

وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

”کل۔۔۔ شادی کرو گے مجھ سے؟“

عاشرہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔

”یہ کون سا مذاق ہے؟“

”میں بالکل سنجیدہ ہوں۔“ وہ حقیقتاً سنجیدہ تھی۔

عاشق نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا بے تاثر سے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔
لڑچند قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل آرکی۔ مدھم مدھم روشنی میں وہ ہلاکی سحر انگیز لگ رہی تھی۔ بے داغ،
چمکتے چہرے پر سخی سیاہ آنکھیں صراحت سے انہماک عاکہ رہی تھیں۔
”بولو عاشق! اس نے دھیسے سے کہا شادی کرو گے مجھ سے؟“

پھر اس نے اپنا سر اس کے کاندھے پر ٹکا دیا۔ چند لمحوں کے لیے ماحول میں بے حد گہیر خاموشی چھا گئی تھی۔
عاشق اس لمحے میں بھری ہوئی جادو اثر روانیت سے نکلنے میں کچھ دیر لگی تھی۔ پھر اس نے آہستگی سے اس کا سر
اپنے کاندھے سے ہٹایا۔

”نہیں لڑا۔“ وہ بولا تو اس کا لہجہ مضبوط تھا ”میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“
”کیوں؟“ وہ ایک دم بھڑک اٹھی ”کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا رکاوٹ ہے؟ تم مسلمانوں کو تو چار چار بیویاں رکھنے

کی اجازت ہے؟“

عاشق کو لہجہ بھر کے لیے جھجکا سا لگا پھر مسکرا دیا۔

”ہاں بالکل ہے اجازت، لیکن یہ آپشن ہے، مجبوری نہیں۔“

”کیوں نہیں فائدہ اٹھاتے اس آپشن سے؟“ وہ ضدی پن سے بولی۔

”کیونکہ میں اپنی بیوی کو بہت چاہتا ہوں لڑا! میں اسے دکھی نہیں کر سکتا۔ میرے بچے مجھے بہت عزیز ہیں۔ میں
نہیں چاہتا، کل کو ان کے ساتھ کوئی نا انصافی ہو۔ دو شادیاں کر کے میں انصاف کے تقاضے پورے نہ کر پاؤں گا۔“

”عاشق! عاشق! میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ اس کے انداز میں انتہا درجے کی بے بسی
تھی۔

”سوری لڑا! میری کوئی قیمت ہے ہی نہیں۔ جو چیز ناٹ فار سیل ہو، اس کی قیمت نہیں ہوتی۔ یہ بات میں تمہیں
نجانے کب سے سمجھا رہا ہوں لیکن تم سمجھتی نہیں۔ ایک دوست کی حیثیت سے میں تمہیں تمہارے حقے کا
وقت دے چکا ہوں۔ تمہیں مجھ سے یہی درکار تھا۔ تم خود کہتی تھیں۔ اب شکایت کا حق تمہارے پاس نہیں
ہے۔“

”جھوٹے ہو، تم جھوٹے۔ تم مسلمان مرد دو غلے ہوتے ہو۔۔۔ منافق ہوتے ہو دل میں کچھ اور زبان پر کچھ
اور۔۔۔ تم سے اچھے تو وہ ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ کم از کم ان کے تعلق میں منافقت تو نہیں ہوتی۔“

وہ الماری کے پٹ سے ٹیک لگا کر جنونی انداز میں بول رہی تھی۔ عاشق نے بے حد سکون سے اس کی بات سنی
تھی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“ پھر وہ بولا ”تمہارے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔۔۔ تم کسی ایسے مرد سے شادی کرو جس کا
کوئی مذہب نہ ہو۔ مسلمان مرد سے شادی کر کے تمہیں کیا ملے گا سوائے منافقت کے۔“

اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا۔

”عاشق! عاشق! وہ اس کے پیچھے لپکی ”عاشق! میری بات سنو۔“

باہر کا ریڈور سنسن پڑا تھا۔

”کیا بات ہے بچی۔۔۔ جب سے آئی ہو، یونہی کھوٹی کھوٹی خاموش خاموش سی ہو۔۔۔ طبیعت تو ٹھیک ہے

تمہاری؟“ حقیقہ حیات نے بے حد محبت سے اسے مخاطب کیا

ایقان نے مر جھائے ہوئے انداز میں ان کی جانب دیکھا۔ اس کا زبردستی بھی مسکرائے کوئی نہ چاہا تھا۔

”جی اماں! وہ گہری سانس بھر کر بولی ”طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔“
 ”عاشریاں سے کوئی کھٹ پٹ تو نہیں ہوگئی؟“ وہ قدرے فکر مند ہوئیں۔
 ایقان کے لبوں پر مدہ سی مسکان پھیلی۔

”کیا کھٹ پٹ ہوتی ہے اماں۔۔۔! کھٹ پٹ کے لیے بھی وقت درکار ہے اور وقت ان کے پاس ہے ہی نہیں۔“
 ”اوہ! انہوں نے بغور اس کی بات سنی اور اطمینان کی سانس بھری۔ ”تو بٹیا! مرد آدمی ہے سارا وقت تو
 تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ اس کے اپنے سودھندے ہوں گے نمٹانے کو۔۔۔ تم اپنے کاموں میں
 جی لگاؤ۔“

”جی جلاؤ، کیسے۔۔۔“ وہ جل کر رہ گئی۔ ”اور میرے کسی گھٹنے، ٹخنے کی ایسی قسمت نہیں ہے کہ وہ اس کے
 ٹوٹے پر بھی دو گھڑی لو لگ کر بیٹھ جائیں۔ انسان کس سے دل کا دکھ کرے۔ مائیں بھی شادی سے پہلے بیٹوں کی اور
 شادی کے بعد دامادوں کی ہوتی ہیں۔“
 ”بٹیا! بات تو حق کی کہنا چاہیے، چاہے بیٹی ہو یا داماد! وہ اطمینان سے پان لگانے لگی تھیں۔
 ایقان زیر لب بڑبڑانے لگی۔ عذرا بیگم نے اندر داخل ہوتے ہوئے اس کے تاثرات کا جائزہ لیا اور مسکرا دی
 تھیں۔

”کیوں ایقان۔۔۔! عاشری واپسی قریب ہے کیا؟“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولیں۔
 ”نہیں بھابھی۔۔۔ ابھی قریب! پندرہ بیس دن کا قیام مزید ہے۔“
 ”تمہارا چہرہ تو کمرہ رہا ہے جیسے وہ کل ہی جا رہا ہو۔“

”میرا چہرہ ہی ایسا ہے۔۔۔“ وہ خفگی سے بولی۔
 عذرا بیگم ہنس دیں۔ ”شفیقہ حیات بھی مسکرانے لگیں۔
 ”آپ سنائیں کچھ نئی تازی۔“ وہ موضوع بدلنے کی خاطر بولی۔ ”کیا حال احوال ہیں سب کے۔۔۔ شہلا اور
 ہاشم خوش ہیں؟“

”سننا ہے بھالی بیگم کے مزاج اچھے نہیں ہیں۔“ عذرا بیگم دبا دبا سا مسکرائیں ”شہلا نے ڈیوٹی جوائن کر لی ہے
 اور بھالی بیگم کے مزاج پر یہ بات گراں گزری ہے۔“

”کیوں۔۔۔ اس میں اعتراض کا کیا سوال؟“ وہ حیران ہوئی ”بھالی بیگم جانتی ہی تھیں کہ شہلا ڈاکٹر ہے۔ اب
 اس نے اپنی محنت گھر بیٹھ کر برتن مانجھنے کے لیے تو کی نہیں تھی۔ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں جو انہوں نے
 بد مزگی پھیلاتا شروع کر دی۔ بے چارہ شہلا کتنی مشکلوں سے راضی ہوئی تھی۔ کتنے دھڑکے تھے اس کے دل کو۔ کیا
 سوچتی ہو گی وہ غریب؟“

”شہلا سمجھ دار بنی لگتی ہے۔۔۔ وہ معاملہ سنبھال لے گی۔“ شفیقہ حیات بولیں ”پھر اس کو پرانا تجربہ بھی ہے۔۔۔
 سنبھل کر ہی قدم اٹھائے گی۔“

”سب سے بڑھ کر یہ کہ خود ہاشم میاں بہت سمجھ دار ہیں۔۔۔ وہ بد مزگی کی نوبت آنے ہی نہیں دیں گے۔“ عذرا
 بیگم بولیں۔

”ہاں۔۔۔ یہ کسی سوباتوں کی ایک بات! شفیقہ حیات نے خوش ہو کر سو کو دا دی۔
 ایقان خاموش ہو کر اب شہلا کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔

پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کر کے وہ مصروف و مطمئن سے انداز میں چابی بیگ میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھی
 تھی تب ہی عقب سے آتی آواز سن کر اس کے قدم ختم گئے۔
 ”شہلا! شہلا تیزی سے گھومی۔ اس کے گلاسز برابر جیلانی کا عکس پرانے لگا۔

”تم۔“ اس کے لبوں نے بے آواز سرگوشی کی پھر اس نے جھٹکے سے گلا سزا تار کرادھر ادھر دیکھا۔
 ”کیا چاہتے ہو تم ابرار؟ میری بدنامی؟ میری تباہی؟ بریادی؟“ وہ دہلی دہلی آوازیں بولی۔ وہ اداسی سے مسکرایا اور دو قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل آگیا۔
 ”میں تو خوش سکون اور شاد آباد زندگی کے متعلق سوال کرنے آیا ہوں شہلا۔“
 ”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی؟“ اس نے جھٹکے سے رخ پھیرا۔
 ”سمجھ کر بھی انجان بنو تو الگ بات ہے۔“

”پلیک پلیس پر میرا تماشا بنوانا چاہتے ہو؟ تم چاہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ بدنام ہو جاؤں؟ ابرار۔۔۔ خدا کا واسطہ نہ مجھے اب سکون سے جی لینے دو۔۔۔ میرے راستے میں آنا چھوڑو پلے۔“
 ”میں تمہیں تمہارے ہر راستے میں ملوں گا شہلا۔۔۔ جانتی ہو کیوں۔۔۔ اس لیے کہ اب تمہاری ہر راہ مجھ تک آتی ہے۔ میں تمہاری منہن ہوں یہ بات یاد رکھنا۔ تم جہاں پل دو پل کے لیے ٹھہری ہو وہ تمہاری منزل نہیں محض ایک گزر گاہ پر فوجی پڑاؤ۔ ہے۔“
 شہلا نے زچ ہو کر آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ ابرار نے اپنا بازو گاڑی کی چھت سے ٹکا کر غیر محسوس طور پر اس کا رستہ روکا۔ شہلا نے پریشان ہو کر نگاہیں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کو اس نے ابرار کی نگاہوں میں دیکھا تھا پھر گہری سانس بھر کر نظر پھیر لی۔

”تم اچھا نہیں کر رہے ہو ابرار۔۔۔ نہ اپنے ساتھ نہ میرے ساتھ۔“ پھر وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔
 ”منزل پر پہنچ کر تمہارے خیالات بدل جائیں گے۔ یہ میرا دعوا ہے۔ زندگی میں اتنے رنگ بھر جائیں گے شہلا کہ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ جلد سے جلد فیصلہ کر لو۔ میں تمہارا منتظر ہوں۔“
 شہلا بدستور نگاہ پھیرے کھڑی رہی۔

”چلتا ہوں۔۔۔ جو کچھ میں نے کہا“ اس پر منطقی انداز میں سوچنا۔
 وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ چند لمحوں میں اس کی گاڑی شہلا کی گاڑی کے قریب سے نکلی تھی۔ شیشے میں سے ابرار نے پھر کابت بنی شہلا کو غور سے دیکھا تھا۔



وہ تہی تی سی فون تک آئی تھی۔
 ”ہیلو۔“ وہ ابھی پن سے بولی۔
 ”ہیلو ایقان۔۔۔“ دوسری جانب وہ قدرے تھکا تھکا سا تھا ”کمال ہے یا۔۔۔ بتائے بغیر حل گئیں۔۔۔ کم از کم مجھے اپنا پروگرام تو بتا دیتیں۔ گھر لوٹا ہوں تو سنا لے استقبال کر رہے ہیں۔ کیا کروں اس اکیلے پن میں؟“
 ایقان طنز سے ہنسی۔

”افوہ۔۔۔ اتنے سالوں سے وہاں جاپان میں یہی ”کیلا پن“ منہ رہے ہو وہاں تو تمہیں کوئی شکایت نہ ہوئی۔ یا وہاں بہت قربتیں میسر ہیں؟“
 عاشق جونکا۔ اس کے لہجے کا طنز اور بدلاؤ بہت واضح تھا۔
 ”بچے کہاں ہیں؟“ اس نے گویا سنی ان سنی کی۔
 ”یہیں ہیں گھر میں۔“ وہ مختصراً بولی۔
 ”لینے آجاؤں؟“

ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوئی۔ جی چاہتا تھا۔۔۔ کوئی ایسا جملہ کہے کہ اس کے اندر کی ساری تپش اس جیلے میں کھل کر اس کی سماعتوں میں اتر جائے۔ پھر اگلے ہی لمحے ہر طرح کی مصلحتیں اس کی زبان کے آڑے آ گئیں۔
 ”مرضی ہے۔“ وہ مختصراً بولی۔

”کیا بات ہے ایقان۔۔۔“ وہ الجھ گیا ”تمہیں ہوا کیا ہے؟“
”خدا حافظ!“ وہ فون رکھ کر مڑ گئی۔

”انیقہ!“ ربیعہ نے کمرے میں جھانکا ”بڑی ہو؟“

”ہاں ہوں تو۔۔۔“ اس نے جرتل پر سے سر اٹھا کر چہرے پلٹے بال سیٹھے ہوئے کہا ”کوئی ضروری کام ہے؟ میں ذرا یہ ڈایا کر امن بنارہی تھی۔“

”مجھے وردہ سے کچھ کام ہے۔ بس کے متعلق بات کرنا چاہ رہی تھی“ انیقہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔
”ہاں تو چلی جاؤ نا۔۔۔ اب تو تمہارا آنا جانا رہے گا۔“

”میں اکیلی؟“ وہ متذنب ہوئی۔

”یار ربیعہ۔۔۔ ایہ گز بھر کے فاصلے پر تو گھر ہے پھر بھی تم کو تو چلتی ہوں۔“ وہ کتابیں سمیٹنے لگی۔
”نہیں نہیں۔۔۔ انیقہ! تم اپنی اسٹری کرفس۔۔۔ میں چلی جاؤں گی۔ تم ٹھیک ہی کہتی ہو اب تو اکثر آنا جانا ہو گا۔“
ربیعہ نے اسے کتابیں چھوڑنا دیکھ کر جلدی سے کہا۔

”شیور؟“ اس نے پوچھا۔

اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئی۔

ڈوبے سورج کی نارنجی کرنوں نے ماحول کو رنگ دیا تھا۔ اس سنہری سنہری شام میں اپنی دھن میں آگے بڑھتا ہوا رافع ٹھٹکا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے گیٹ کے دوسری جانب کھڑی ربیعہ بھی اسے دیکھ کر اپنی جگہ ٹھہری گئی۔

”آپ؟“ وہ مسکرایا ”یہاں؟“

ربیعہ بھی متانت سے مسکرائی ”کیوں۔۔۔ میں یہاں نہیں آسکتی؟“

”بہ نصیب۔“ وہ قدرے شر ہوا۔ ”ہزار مرتبہ آئیے۔“

”آپ دروازہ کھولیں تب نا۔“ وہ ہنس پڑی۔ رافع کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بھی ہنس دیا۔ پھر اس نے کندھی کھول کر گیٹ دکھایا۔

”تشریف لائیے۔۔۔ یو آر موسٹ ویلکم۔“

ربیعہ قدرے جھینسی گئی۔ اندر آکر اس نے لمحہ بھر کے لیے اپنے سامنے پھیلے بنگلے کے طول و عرض کو دیکھا تھا۔ شہلا کی ہمراہی میں وہ راجہ بیگم کے پورشن میں گئی تھی لیکن اب اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ اس کے قدموں کو کس سمت میں بڑھنا ہے۔

”کیا سوچ رہی ہیں آپ؟“ رافع نے اس کا چہرہ پڑھا۔ ”میرا خیال ہے شہلا بھابی اپنے کمرے میں ہی ہوں گی۔“

”جی ہاں۔۔۔ لیکن اس وقت میں وردہ کے پاس آئی تھی۔۔۔ مجھے اس سے کچھ ضروری کام تھا۔ شہلا آپلی تو خود ہمارے گھر آنے والی ہیں۔ میں واپس جا کر ان سے ملوں گی۔“

”وردہ سے!“ رافع کا چہرہ واضح طور پر بجھا تھا ”وہ۔۔۔ اچھا آئیں میں آپ کو پھپھو کے پورشن تک چھوڑ دیتا ہوں۔“

ربیعہ نے روش پر اس کی ہمراہی میں قدم بڑھائے تھے۔ رافع اس سے دو قدم ہٹ کر قدرے آگے چلنے لگا۔ اپنا اڑتا ہوا آنچل سنبھالتی ربیعہ نے بھی قدموں کی رفتار تیز کی۔

اسی لمحے سامنے والے پورشن کا مرکزی دروازہ کھول کر ہاشم اور شہلا باہر نکلے تھے۔
رافع اور ربیعہ رک گئے۔ ہاشم بھی انہیں دیکھ کر جیسے ٹھنک کر اپنی جگہ پر ٹھہرا تھا۔ اس کی نگاہوں میں حیرت اور استعجاب کے رنگ تھے۔

ربیعہ شہلا کو دیکھ کر تیز قدموں سے اس تک پہنچی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بے حد گرم جوشی سے ان دونوں کو سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ شہلانے محبت سے اسے ساتھ لگایا ”تم مجھ سے ملنے آئی ہو ربیعہ۔ اندر چلیں؟“

”آپ سے ملنے نہیں آئی تھی۔“ ربیعہ شرارت سے ہنس دی ”کیونکہ مجھے علم تھا کہ آپ کو ابھی ہم لوگوں سے ملنے آنا ہے۔ میں وردہ کے پاس آئی تھی۔ بکس خریدنے سے پہلے اس سے مشورہ کرنا چاہ رہی تھی۔“

”چھا۔ یہ بات ہے۔“ شہلانے گلابی لباس میں ملبوس ربیعہ کو غور سے دیکھا ”بہت پیاری لگ رہی ہو ربیعہ۔ یہ رنگ بہت اچھا لگ رہا ہے تم پر۔“

”چھا۔“ وہ جھینپ سی گئی۔

ہاشم ان دونوں کو جو گفتگو پا کر حیکے سے رافع کی سمت کھسک لیا۔

”اے شہلا۔“ اس نے سرگوشی کی ”تو تو بدھتا ہی جا رہا ہے۔ یوں سرعام ہبانگ دال۔“

”کیو اس نہ کر۔“ اس نے دانت پیسے۔ ”میں اسے پھپھو کے پورشن تک پہنچانے جا رہا ہوں۔“

”ہائے“ ہاشم نے آہ بھری ”قسمت کی خوبی دیکھیے کسے کہاں پہنچانے جا رہا ہے“ رافع نے زیر لب اسے برا بھلا کہا۔

”ویسے سچ کہوں رافع۔“ وہ نزدیک تر ہوا ”جوڑی خوب بچ رہی ہے۔ اگر میں تعصب کی عینک اتاروں تو میری اور شہلا کی جوڑی کو بھی مات دے دی تو نے۔“ رافع نے گہری سانس بھری تھی۔

”ہاشم ہاشم!“

”اوکے۔ اوکے۔“ اس نے مصالحتی انداز میں دونوں ہاتھ اٹھائے ”ہم چلتے ہیں۔ تم تھوڑی دور اور اس کے ساتھ چل لو۔“

پھر اس نے پلٹ کر شہلا کو دیکھا۔ شہلا اس کی نگاہوں کا اشارہ پا کر ربیعہ سے اجازت چاہ کر آگے بڑھ آئی۔

”جلدی آ جانا۔“ اس نے ربیعہ کو تاکید کی تھی۔

”بس آئی۔“ آدھے گھنٹے میں آئی ہوں۔“ وہ مسکرائی۔

رافع نے جربز ہو کر اپنی نگاہ پھیری تھی۔

”ہائے ربیعہ تم!“ وردہ اسے دیکھ کر کھل ہی اٹھی ”ابھی میں سنہیں ہی یاد کر رہی تھی۔ پوچھو تو ناعمہ سے۔“

”بالکل سچ!“ ناعمہ بھی مسکرائی ”وردہ آپ کا ہی ذکر کر رہی تھیں۔“

”اؤ اندر چل کر بیٹھیں۔ ناعمہ! تم ہمارے لیے اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“ وردہ اس کا ہاتھ تمام کر اندر کی جانب چل دی تھی۔

ربیعہ ان لوگوں کی محبت اور خلوص سے حقیقتاً ”متاثر ہوئی تھی۔ خصوصاً“ وردہ اسے بہت اچھی لگی تھی۔

”حیات ولا“ کے جتنے افراد سے وہ اب تک متعارف ہوئی تھی ان میں سے دو افراد اسے خصوصیت سے اچھے لگے تھے۔ ان دونوں سے ایک وردہ تھی۔

ناعمہ چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو وہ دونوں گہری سیلیوں کی طرح کسی بات پر ہنس رہی تھیں۔

ناعمہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

”کتنی اچھی لگتی ہیں آپ ہنستے ہوئے۔“ اس نے نرے ان کے سامنے رکھی اور خود بھی بیٹھ گئی۔

”زیادہ سے زیادہ ہنسائیں۔“

ربیعہ دفعۃً ”سمجھ رہی ہو گئی تھی۔“

”میں ہی نہیں تو کبھی کبھار ہی آتی ہے۔“ نجائے کیا سوچ کر وہ بولی تھی پھر قدرے چونک کر ان کی جانب متوجہ

ہوئی۔

”اور تم لوگ تو یوں ہی ہنسی مذاق کرتی رہتی ہوگی۔ بہنوں کی تو آپس میں خوب ہنسی ہے۔“
 ناعمہ نے وردہ کو دیکھ کر منہ بنایا۔ وردہ مسکرا دی تھی۔

”ان کے ساتھ اور ہنسی مذاق؟“ وہ بولی۔ ”نہیں تو میری ہر بات پر نکتہ اعتراض اٹھانے کا موقع مل جاتا ہے۔“
 بہن کم اور ناصح زیادہ ہیں۔ ہاں رانمہ آئی سے میری خوب ہنسی ہے۔“

”بہنوں کی اصل قدر شادی کے بعد ہی آتی ہے۔“ وردہ نے اسے چڑایا۔ ”کیوں ربیعہ؟“

”بالکل ٹھیک۔“ وہ مسکرائی۔ ”وردہ کی شادی کے بعد تم اسے بھی یونہی یاد کرو گی۔“

”جی رہنے دیں۔“ اس نے کپ ربیعہ کو تھمایا۔ ”یہ کون سا رانمہ آئی کی طرح کہیں دور جائیں گی جو میں انہیں یاد کروں گی۔ ناصح بن رہیں گی۔ دن رات نصیحتیں کرنے کے لیے۔“

”کیا مطلب؟“ ربیعہ نے دل چسپی سے وردہ کی شرمیلیں مسکراہٹ اور ناعمہ کے بھنائے ہوئے انداز کو دیکھا۔

”مطلب یہ کہ سلوک ماموں کے بڑے صاحبزادے رافع حسن ان کے منگیتر ہیں۔“

ربیعہ کو نجانے کیوں لمحہ بھر کے لیے چکر سا آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے منظر دھندلا گیا۔ ہاتھ کانپا۔
 چائے راسر میں چھلک گئی۔ لمحہ بھر کی بات تھی پھر منظر صاف ہو گیا۔ اس نے خود پر قابو پایا اور دھیرے سے مسکرائی۔

”اچھا۔“ وہ بولی۔ ”وردہ نے تو بتایا ہی نہیں کہ یہ انگلیٹ ہے۔“

”یہ ایسی ہی ہیں۔۔۔ گھنٹی سی۔۔۔“ ناعمہ مزے سے بولی۔

”شرم کرو کچھ۔“ وردہ نے اسے جھڑکا لیکن اس نے قطعاً ”روانہ کی۔“

”چند سال قبل بزرگوں کی باہمی رضامندی اور رافع بھائی کی پسند سے یہ رشتہ طے پایا ہے۔“ ناعمہ مسلسل بول رہی تھی۔

ربیعہ کو یوں محسوس ہوا گویا اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکے ہیں۔ اس نے چائے کی پیالی ٹرے میں رکھ دی۔

”کوئی نہیں پسند دسند۔“ وردہ جھٹ بولی تھی۔ ”ناعمہ! تم کچھ زیادہ ہی بول رہی ہو۔“

”بھئی میں تو سچ ہی بول رہی ہوں۔ کیا غلط ہے کہ رافع بھائی نے عریشہ کے بجائے آپ سے منسوب ہونا پسند کیا تھا؟ ان کے سامنے دونوں آہشمنز تھے۔“

”انہوں نے محض ترجیح دی تھی کیونکہ ان کے مطابق عریشہ ان سے کافی چھوٹی ہے۔ باقی یہ کہ اس رشتے کے طے پانے میں کسی قسم کی ذاتی پسندیدگی نہیں تھی۔“

”اللہ۔۔۔ تو آپ اس قدر صفائیاں کیوں دے رہی ہیں۔“ ناعمہ شرارت سے آنکھیں مٹکا کر بولی۔ ”پسندیدگی اگر ہو بھی تو میں اور ربیعہ ہرگز معترض نہ ہوں گے۔ کیوں ربیعہ؟“

ربیعہ محض مسکرا کر رہ گئی تھی۔ ذہن کے افق پر چمکتی دو لگا ہیں اپنی جگہ هنوز موجود تھیں اور ان میں موجود وہ جذبہ کہانی وہ چٹائی وہ اخلاص؟

جھوٹ کہاں تھا، کس جگہ تھا؟ ربیعہ سمجھ نہ پائی۔

”یہ آپ کس سوچ میں کھو گئیں؟“ ناعمہ نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ بلایا تو وہ جلدی سے مسکرا دی۔

”سوچتی ہوں اب چلوں۔۔۔ شہلا آئی بھی غنظر ہوں گی۔“ وہ سچ کھڑی ہو گئی تھی۔

○ ○ ○ ”السلام علیکم۔“ عاشق اندر داخل ہوا۔

شفیقہ حیات اور عذرا بیگم نے بے حد خوش دلی اور گرم جوشی سے اس کے سلام کا جواب دیا جبکہ وہ بے نیازی

سے اپنے ناخنوں کا جائزہ لینے لگی تھی۔

عاشق نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی۔ لائٹ براؤن لباس میں اپنی شرمیلی آنکھوں سے بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھتی وہ دل میں اتر رہی تھی لیکن اس کی بے نیازی کی وجہ سمجھنے سے وہ هنوز قاصر تھا۔

”اوہ بھی عاشق میاں۔“ شفیقہ حیات نے قریب رکھے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہاں بیٹھو ہمارے پاس۔ اچھے لوٹے ہو یا ہرے۔ دونوں چہرہ نہیں دکھاتے۔“

”بس اماں!“ وہ قدرے شرمندہ ہوا۔ ”کچھ دوستوں کے ساتھ مصروف تھا۔ بات بھی کچھ ایسی تھی کہ چاہنے کے باوجود جان نہ چھڑا سک۔ معذرت خواہ ہوں۔“

”ارے اب جانے بھی دو۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”میں نے تو یونہی ایک بات کی۔ تم اپنی طبیعت کا سناؤ خوش باش ہو؟“

”جی اماں۔ اللہ کا شکر ہے۔ آپ پتائیں، آپ کیسی ہیں؟“ وہ سعادت مندی سے کہہ رہا تھا۔
ایقان منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے لگی تھی۔ اس کا سعادت مندانہ رویہ دیکھ کر اس کی جان جل کر رہ گئی تھی۔
”اے لی۔ یہ تم کون سے منتر پڑھنے لگیں؟“ شفیقہ حیات نے اسے گھورا۔ ”بچہ کب سے آیا بیٹھا ہے چائے پانی ہی پوچھ لو۔“

ایقان جڑبڑ ہوئی۔ عاشق کے لبوں پر شرارتی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ اسے شرارت سے دیکھنے لگا۔
”میں چائے بناتی ہوں۔“ عذرا بیکمراٹھنے لگی تھیں۔

”آپ بیٹھیں بھیا بھی جان!“ ایقان پھرتی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں لے کر آتی ہوں۔“ پھر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔ یوں بھی وہ بہت دیر تک ان نگاہوں کا سامنا کرنا نہ چاہتی تھی۔

چائے کولوا زماں اور ایک ڈیڑھ گھنٹے کی گپ شپ کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
”چلیں؟“ اس نے منتظر نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”ہوں۔“ وہ نیم ہلی سے بولی۔ ”میں بیگ لے آؤں۔ بچوں کو بھی لاتی ہوں۔ لان میں کھیل رہے ہیں۔“
عاشق سب سے اجازت طلب کر کے باہر نکل گیا تھا۔



گھر آکر وہ کتنی ہی دیر چھوٹے چھوٹے کام پنپاتی رہی تھی۔ عاشق لباس تبدیل کر کے ٹی وی کے سامنے رازا ہو گیا تھا۔ ایقان کا ذہن بری طرح سے الجھا ہوا تھا۔ وہ عاشق سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ اس سے اپنے تمام سوالات کے تسلی بخش جواب چاہتی تھی۔

یہ لڑا کون تھی جو اکثر اسے رات کو فون کرتی تھی؟ وہ لڑکی جسے حمزہ نے پارلر پر عاشق کے ہمراہ دیکھا تھا۔ کیا وہی لڑا تھی؟ عاشق اس سے کیا تعلق تھا؟ وہ اس سے کیوں ملا تھا؟ آیا ان تمام باتوں کے پیچھے کوئی مربوط کہانی تھی یا یہ محض چند اتفاقات کے سرے تھے جو آپس میں کہیں نہیں ملتے تھے۔

وہ مصروفیت میں بھی ان سب سوالوں سے سر پر بیکار تھی۔ اسے عاشق سے بھی خوف محسوس ہو رہا تھا اور اپنے آپ سے بھی۔ اسے یہ سب باتیں پوچھنے سے اور ممکنہ جوابات سے از حد خوف محسوس ہو رہا تھا۔

سب کاموں سے فراغت پا کر بچوں کو ان کے کمرے میں سلا کر جب وہ بیڈ روم میں آئی تو اس پر منوں اوس پڑ گئی۔ وہ لی وی آف کر کے اب گہری نیند سو رہا تھا۔

ایقان پیرتج کر رہ گئی۔ کیا کچھ نہ سوچ ڈالا تھا اس نے پچھلے دو گھنٹوں میں۔ کیسے کیسے الفاظ ترتیب دے تھے اس نے کہ وہ سب کچھ سچ کہنے پر مجبور ہو جائے اور وہ بے فکری سے تکیہ بعل میں دبائے دنیا و مافیہا سے غافل نجانے خوابوں کی کس وادی میں اترا ہوا تھا۔

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ایقان واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ اب وہ بھی غسل کر کے سونا چاہتی تھی۔ داغ سوچ

سوچ کر شل ہو گیا تھا۔ سکون کے چند لمحے چاہتا تھا، وہ بھی اب ناشی طرح ہر بات بھول کر زندگی وادی میں اترنا چاہتی تھی۔

واش روم میں ٹاول اسٹینڈ پر عاشق کی پینٹ شرٹ پڑی تھی۔ ایقان بھنا ہی اٹھی۔ اسے میلے کپڑے اور دھڑھر چھوڑنے پر سخت اعتراض ہوتا تھا۔

حسب عادت کپڑے جھاڑ کر اس نے عاشق کی جیبیں چیک کیں۔ تب ہی ایک معطر نشو پیرا اس کے ہاتھ میں آیا۔ ایقان نے اس پر لگے سرخ لپ اسٹک کے داغ دیکھے۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کو دیوار کا سارا لینا پڑا۔ سر جھٹک کر اس نے پھر اس نشو کو دیکھا پھر اس نے اس کی تمہیں کھولیں۔ اگلے ہی لمحے اس کا تنفس تیز تر ہو گیا تھا۔ سرخ لپ اسٹک سے نشو پر ”آئی لویو“ لکھا گیا تھا اور جابجا ہونٹوں سے مر لگائی گئی تھی۔

ایقان چند لمحے یقین اور بے یقینی میں گھری وہ نشو اور اس پر ثبت وہ مہر میں دیکھتی رہی پھر اس نے اسے مٹھی میں بھینچ لیا۔

یقین اور بے یقینی کے اس پل پر سفر کرتی اس کی سوچ اب یقین کے سرے پر آکر ٹھہر گئی تھی۔ وہ جیسے سارے قصبے سے آگاہ ہو گئی تھی۔ شک اور بے یقینی اپنا کام دکھا کر تحلیل ہو چکے تھے۔ وہ ایک فیصلہ کن موڑ پر تھی۔

بچوں کو اسکول کے لیے بھیج کر ایقان اندر آئی تو بیڈ روم کے دروازے پر آکر ٹھہر گئی۔ وہ نمدادھو کر آئینہ کے سامنے موجود تھا۔ بالوں میں تولیہ رگڑتے ہوئے بے حد فریش موڈ میں وہ کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔

”یاس! چائے دو جلدی ہے۔“ آئینے میں ایقان کا عکس دیکھ کر وہ بولا اور بالوں میں برش پھیرنے لگا۔

ایقان خاموشی سے پٹی تھی۔ کچن میں آکر چائے بناتے ہوئے وہ خود میں چولہے سے زیادہ پیش اور کھولتے ہوئے پانی سے زیادہ کھولاؤ محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا، یہی آگ وہ عاشق کے وجود میں بھی بھڑکا دے۔

بے حد مصروف سے انداز میں وہ ٹیبل پر اخبار بچھا شے سرخیاں دیکھ رہا تھا۔ ایقان نے چائے کا کپ اس کے سامنے رکھا اور کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ باہر آئی تھی۔ کرسی ٹھیکٹ کر وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ چائے پیتے پیتے عاشق نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور بے حد چونکا۔

”ایقان! کیا ہوا تمہیں؟“

وہ جواب دیے بنا اسے دیکھتی رہی۔

”طبیعت خراب ہے؟ اتنی سرخ آنکھیں جیسے روتی رہی ہو رات بھر۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ماتھا چھونا چاہا۔ ایقان نے اپنے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ایقان۔۔۔“ اس نے بے یقینی سے دیکھا۔

ایقان نے عین اس کی نظروں کے سامنے مٹھی کھولی تھی، اس کے ہاتھ پر وہی نشو دھرا تھا۔

”کیا ہے یہ؟“ عاشق نے حیران ہو کر پوچھا۔

”یہی تو میں جانتا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟ اٹھاؤ اسے اور بتاؤ کہ یہ محبت کی نشانی کس کی ہے کس کے لیے ہے اور کیوں ہے؟“

ناشرمقاط سام ہو گیا۔ اس نے دھیرے سے نشو اٹھایا اور اگلے ہی پل سب سمجھ گیا۔ اس میں سے لڑا کے

مختصر دس پر فیوم کی نہایت تیز خوشبو آ رہی تھی۔

ایقان پلک جھپکاتے بغیر اس کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔ عاشق نے نشو کی تمہ کھولی پھر غیر ارادی طور پر ہی اس کے لبوں سے گہری سانس برآمد ہوئی تھی۔

”یہ کہاں سے آیا؟“ اس نے ایقان سے پوچھا۔

”غیر ضروری سوال ہے۔۔۔ ان ضروری سوالوں کا جواب دو عاشق! جو میں نے تم سے پوچھے ہیں؟“ عاشق نے

جزیرہ ہو کر اسے دیکھا تھا۔

”میں کہہ سکتا ہوں ایقان! اگر میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں کہوں گا۔ یہ لڑکی حرکت ہے۔ اسی نے جان بوجھ کر یہ میری جیب میں رکھا ہو گا۔“

ایقان کا تنفس تیز ہو گیا۔ وہ اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی۔

”جانتے ہو عاثر! مرد کے زیب تن کیے لباس میں اگر کوئی لڑکی کچھ رکھنا چاہے تو اسے اس مرد کے کتنا قریب ہونا پڑتا ہے؟“

عاثر لمحہ بھر کے لیے دم بخود سا ہو۔ پھر وہ کچھ بولنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کرنے لگا۔

”دیکھو ایقان! بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ دراصل میں تمہیں بتانا چاہ رہا تھا۔“

”کون ہے یہ لڑا؟“ وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہی تھی۔

”لڑا۔۔۔ لڑا میری دوست۔۔۔ وہاں جاپان میں وہ میرے ساتھ۔“

”جاپان؟“ بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”وہ جاپان سے تمہارے ساتھ آئی ہے۔“

”نہیں۔“ وہ جزیرہ ہوا۔ ”وہ میرے ساتھ نہیں آئی۔۔۔ وہ بعد میں۔۔۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی آئی ہے۔“

”تم تم سے لینے ایرپورٹ گئے تھے؟“

ایقان کو گزشتہ دنوں میں رونما ہونے والے واقعات یاد آنے لگے۔

”اور۔۔۔ اور تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے دوست کی فیملی آئی ہے۔ اور۔۔۔ اس دن کے بعد سے تم پورا پورا

دن۔۔۔ آدھی آدھی رات تک غائب رہے۔ مجھ سے مختلف جھوٹ بول کر اپنی مصروفیت کا جواز پیدا کرتے

رہے۔ اور۔۔۔ اور عاثر سب میں پاگل ہو جاؤں گی۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

”ایقان۔۔۔ پلیز یا۔۔۔ مجھ پر اعتبار کرو۔۔۔ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ محض وقت گزاری کے چند لمحات۔۔۔

دراصل اس نے مجھے اتنا مجبور کر دیا کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی۔۔۔ وہاں جاپان میں اکیلے پن کی وجہ سے ہم کچھ قریب ہو گئے تھے۔“

وہ ہکلائے والے انداز میں، بے تنکے پن سے وضاحت کرنے کی کوشش میں نجائے کیا کچھ کہتا چلا جا رہا تھا۔

ایقان جیسے پھر پنی بیٹھی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے ٹائپ آنسو بہہ رہے تھے۔

”تم نے مجھے بہت بڑا دکھ دیا ہے عاثر! بہت بڑا۔۔۔ بے یقینی، بے اعتباری کا دکھ۔۔۔ بے وفائی کا دکھ۔۔۔ میں

سب کچھ سمجھ سکتی ہوں لیکن اپنی بے توقیری نہیں۔۔۔ تم نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔۔۔ کبھی، خاف نہیں

کروں گی تمہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔“

وہ روتے ہوئے ابھی اور بھاگتے ہوئے بیدروم میں چلی گئی۔ دروازہ اس نے اندر سے لاک کر لیا تھا۔ عاثر

پشیمانی کے ساتھ اپنی جگہ پر بیٹھا رہ گیا تھا۔

ربیعہ کو دور سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ سامنے جو جھلملاہٹ دکھائی دے رہی ہے۔ وہ یقیناً پانی کی ہے۔ وہ بہت بڑا

تالاب تھا۔ اتنا پُرانا کہ اس پر جمیل ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ چاندنی رات میں اس کے شفاف پانی کی چمک چاند کی

کرنوں کا عکس تھی۔ یوں جیسے روپہلی چادر بچھی ہو۔

ربیعہ قدم بڑھائی چلی گئی لیکن یہ کیا وہ جتنا آگے بڑھتی تھی۔ پانی بھی اتنا ہی دور ہٹ جاتا تھا۔ وہ تیز تیز چلنے

لگی۔ پانی بھی تیزی سے دور ہونے لگا۔

کیا وہ سراب تھا؟ کیا وہ کسی رنگ زار میں تھی؟ کیا وہ فریب نظر تھا؟ کیا وہ کوئی تمنا تھی؟

ربیعہ بھاگنے لگی۔ بھاگتے بھاگتے اس کی ٹانگوں میں درد ہونے لگا لیکن پانی اتنا ہی دور۔

”ربیعہ۔۔۔ ایک ٹھنڈی، میٹھی آواز کہیں سے ابھری تھی۔ ”ربیعہ! آگے۔۔۔ میرے پاس آگے۔۔۔“ ربیعہ

ٹھٹھک کر رہ گئی۔

”کس کا آواز ہے یہ؟“ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ شناسا مہربان آواز۔

”ربیعہ! ربیعہ! آؤ۔“ میں یہاں ہوں ربیعہ۔ تمہارے سامنے۔“

ربیعہ نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ دفعتاً چاند کو بادلوں نے اپنی اوٹ میں لے لیا۔ کچھ لمحے قبل جگمگاتا ماحول اچانک اندھیرے میں بدل گیا اور پھر ربیعہ نے بارش برستی محسوس کی۔

اس نے ہاتھ پھیلانے اور آگے بڑھنا شروع کیا۔ آواز اسے مسلسل پکار رہی تھی۔ ربیعہ کا ذہن اس کی پہچان کو گرفت میں لانے سے قاصر تھا لیکن شناسائی مسلسل محسوس ہو رہی تھی۔

”کون ہو تم۔؟ کون ہو تم۔؟ کہاں ہو تم۔؟“ وہ پاپلوں کی طرح آگے بڑھ رہی تھی۔

ایکایک اسے ٹھوکر لگی۔ بڑے زور کی ٹھوکر۔ اور اس سے پیشتر کہ وہ گر پڑتی، اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ بستر لیٹی ہوئی گرے گرے سانس بھر رہی تھی۔ اس کے سانسوں کی آواز اتنی تیز تھی کہ برابر میں لیٹی ہوئی انبیقہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ربیعہ۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ ”کیا ہوا ہے؟“

ربیعہ بھی اٹھ کر بیٹھی۔ ”پانی۔“ وہ بمشکل بولی تھی۔ ”مجھ پیانی چاہیے۔“

”میں لاتی ہوں۔۔۔ تم شاید خواب میں ڈر گئی ہو۔۔۔“ انبیقہ نے اس کا نشانہ پھتہ پھتہ پایا پھر وہ بستر سے اتر کر فرنگ کی جانب بڑھ گئی۔

اپنی سانسوں سے الجھتی ربیعہ اب خود سے الجھ رہی تھی، کیوں دیکھتی تھی وہ ایسے خواب؟ کس کی دعوت؟ یہم اسے بلاتی تھی؟ اسے کہاں جانا تھا؟ اس کے لاشعور میں کیا دم تھا؟

انبیقہ اسے پانی پلا کر پھر سے لیٹ کر سوچکی تھی لیکن ربیعہ اب پچھلی کئی بار کی طرح نہ سو سکی۔ اب وہ سنجیدگی سے ان خوابوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ یہ تسلسل اتفاق نہیں تھا۔ کوئی واقعی اس کا منتظر تھا۔ لیکن کون؟



وہ تیزی سے ریکٹ گھماتے ہوئے اپنے پورشن کی جانب جا رہا تھا جب اس نے لان کے پچھلے حصے میں چھت کو جاتی ہوئی سیڑھیوں پر کسی کو بیٹھ دیکھا۔

نافع ٹھہر گیا۔ دور سے واضح نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گیا کہ اس وقت اس یا سیت بھرے ماحول میں اس طرح تنہائی میں کون بیٹھ سکتا ہے۔ ایک کڑواہٹ سی اس کے حلق میں اتری۔ سر جھٹک کر اس نے پہلے کی طرح ریکٹ گھماتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا لیکن نجانے کیا بات ہوئی۔ وہ آگے بڑھ نہ سکا۔

اس نے پھر اسی جانب دیکھا۔ چند لمحے سوچا پھر اس کے قدم بے اختیاری سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئے تھے۔ وہ عریشہ ہی تھی۔ کاسنی رنگ کے ملکج، شمعن آلود لباس میں ملبوس ٹھٹھوں پر ٹھوڑی ٹکائے وہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ نافع اس کے قریب جا رہا۔ عریشہ نے سر اٹھایا، دونوں کی نگاہیں ٹکرائیں پھر اس نے کسی تاثر کے بغیر واپس سر جھکا لیا۔ نافع نے دیکھا ان نگاہوں کی وہ پچھلی حقارت اور نفرت اب معدوم تھی۔ اب وہاں بچھے ہوئے چراغوں کی سی کیفیت تھی۔ نہ کوئی تاثر نہ سوچ نہ خیال۔

اس نے گہری سانس بھری پھر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ عریشہ کے وجود میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔

”عریشہ۔“ اس نے نرم لہجے میں پکارا۔

”کو؟“ بے تاثر جواب آیا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“

”سب مسئلے ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو ایک انتظار باقی ہے۔“

”کیسا انتظار؟“ وہ الجھا۔

اس بات کا کوئی جواب نہ آیا تھا، نافع کچھ دیر خاموش رہ کر لفظوں کو ترتیب دینے لگا۔

”دیکھو عریشہ! پھر وہ بولا۔ ”کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ نکالا جاسکے۔ میں جانتا ہوں۔ جب سے ہماری مکتبی ہوئی ہے، تم ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گئی ہو اور جب سے نکاح ہوا ہے، تب سے تم جسے بالکل بچھ ہی گئی ہو۔ دیکھو۔ میں ایک کھلے ذہن کا انسان ہوں۔ میں چاہتا ہوں ہر انسان کو اپنی ذاتی رائے پسند ناپسند کے مطابق فیصلے کرنے کا کلی اختیار ہو۔ میرا خیال ہے ہمارے معاملے میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ اسی بات نے تمہیں ہرٹ کیا ہے غالباً۔ شاید میں تمہارے اس معیار پر پورا نہیں اترتا جو تم نے اپنے جنون سادھی کے بارے میں اپنے ذہن میں قائم کیا تھا۔“

وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ عریشہ یوں بیٹھی تھی جیسے وہ یہ سب کچھ کسی اور سے کہہ رہا ہو اور عریشہ کا ان باتوں سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

”عریشہ! اگر ایسی بات ہے اور تمہاری اس کیفیت کی وجہ یہی ہے تو یقین مانو، میں کسی جبر کی ضرورت کا ساتھ نہیں دوں گا۔ تم میں نہ ہو لیکن مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں ایسے جبری فیصلوں کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہوں۔ قانوناً، شرعاً، تم میری بیوی ہو لیکن اگر تمہارا دل اس رشتے کو تسلیم کرنے سے شدت سے انکاری ہے تو میں اتنا ظرف رکھتا ہوں کہ تمہیں پابند رکھنے کے بجائے آزاد کروں لیکن۔ لیکن پلین۔ ایک مرتبہ اپنے منہ سے کہہ دو کہ تم آزادی چاہتی ہو۔ یہ بندھن تمہارے لیے تکلیف دہ ہے۔ تم ایک مرتبہ کہہ دو پھر پھر پھر پھر ہو گا جو تم چاہو گی۔ ایک جیتے جاگتے انسان کو اس تکلیف دہ حالت میں دیکھنا، علم از کم میری برداشت کی حد سے باہر ہے۔“

عریشہ اسی بے نیازی سے بیٹھی رہی۔ نافع زچ ہوا۔

”بولو عریشہ! خدا کے لیے کچھ بولو۔ جواب دو میری بات کا۔“

”مجھے کسی بندھن یا آزادی سے اب فرق نہیں پڑتا نافع!“ بلا آخر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر گویا ہوئی تھی۔ ”میں اب جیسی ہوں، مرتے دم تک شاید ایسی ہی رہوں گی۔ آخری دم۔ بس اسی کا انتظار ہے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں۔ اگر تم اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرنا چاہو۔ کوئی قدم اٹھانا چاہو تو تمہیں اختیار ہے۔ جہاں تک میرا سوال ہے۔ میں ہر خوشی سے دست بردار ہو چکی ہوں۔“

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہاں سے چلی گئی تھی۔ نافع حرائی سے بیٹھا اس کے لفظوں پر غور کرتا رہ گیا۔

شملہ تھکی باری ہاسپٹل سے لوٹی تو شدید پیاس لگ رہی تھی۔ پانی پینے کی غرض سے وہ کچن میں داخل ہوئی تو جلے بھنے تیروں سے فردوس بیگم نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ شملہ اٹھٹھک سی گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے مسکرا کر شیریں لہجے میں سلام کیا۔

”اولم والسلام۔“ انہوں نے جواب دینے کے ساتھ سر کو بھی جھکا دیا تھا۔

”آپ۔ کیا کر رہی ہیں؟“ اس نے ان کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے دوستانہ سے انداز میں پوچھا۔

”رور ہے ہیں اپنی جان کو۔“ وہ زہر خند لہجے میں گویا ہوئیں۔ ”بڑھی بڈیوں کو گھس رہے ہیں۔ سوچا تھا۔ ہو گھر میں آئے گی تو جان کو سکھ نیب ہو گا۔ ہم بھی تھوڑا آرام کر لیں گے۔ لیکن ہم سے بد نصیبوں کی قسمت میں آرام ہو تب نہ۔ صبح ہانڈی شام ہانڈی۔ یہی کرتے، ہم چار دن بیمار ہوں گے اور خیر سے اپنی آرام گاہ کو پہنچیں گے۔ ہو کو دوسرے مریض پینانے سے فرصت نہیں۔“

شملہ حد درجہ خجل ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر چچہ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

”آئی ایم ویری سوری۔ میں کل سے ضرور کھانا پکا کر ڈیوٹی پر جاؤں گی۔ آئرشل یہ بھی میری ڈیوٹی ہے۔ آپ

آرام کریں میں کھانا کاتی ہوں۔“

فردوس بیگم نے ہاتھ میں پکڑا چھ اے دینے میں تامل نہ کیا تھا۔

”آلو دلیس کے گوشت میں۔۔۔ دال بھی رکھنی ہے دوسرے چولہے پر۔ میں سوچ ہی رہی تھی۔۔۔“

”میں۔۔۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔۔۔ آپ جائیں پلیز۔۔۔“ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

”اے ہاں۔۔۔ ہم بھی انسان ہیں۔۔۔ کہاں تک چپ رہتے۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے باہر نکلی تھیں۔

شہلا نے نجانے کب کار کا سانس خارج کیا۔ اس نے کپڑے تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کر کے گوشت بھونا

شروع کر دیا تھا۔

”ویسے کچ کوں رافع! جوڑی خوب بیچ رہی ہے۔“ اس کے کانوں میں ہاشم کا شرارتی لہجہ گونجا۔ اس نے سختی سے آنکھیں میچیں۔

آنکھیں بند کرتے ہی گلابی کپڑوں میں ملبوس وہ بار سنگھار کے پھولوں سی لڑکی پردہ افق پر مسکرانے لگی تھی۔ رافع نے گھبرا کر جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔

”خدا کرے رافع! تجھے بھی کسی سے محبت ہو جائے۔“ ہاشم پھر تصور میں گنگنا تھا۔

”ستیا ناس تیرا۔۔۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”اور کوئی بدعا نہیں دے سکتا تھا؟“

”میں نے تجھے بدعا نہیں دی عادی ہے۔“ ہاشم کی ہنسی اس کے کانوں میں گونجی۔ رافع نے گہری سانس بھری۔

”ٹھیک ہی کہتے تھے تم ہاشم میاں! بدعا عادی بھی تم نے مجھے میری پرسکون، مطمئن زندگی میں اضطراب کی

لہریں تمہاری اس بدعا سے ہی اٹھی ہیں۔ ہم نے تمہارے لیے دعائیں کیں اور دیکھو، تم مطمئن اور شاداب بیٹھے

ہو۔ بولو معق دوستی کس نے ادا کیا؟“

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ رات کی ٹھنڈی ہوا میں کھلی چھت پر ٹھکرا رہا۔

رات پھیلی ہے تیرے سر میں آجکل کی طرح

چاند نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے پاگل کی طرح

نجانے کہاں کس نے نور جہاں کی آواز میں خوبصورت غزل لگائی ہوئی تھی۔ ہوا کے دوش پر تیرتے ہوئے

ریلے لیکن اپنی آج میں مدھم مدھم سکتے بول اس کی سماعتوں سے آکر آئے۔

رافع کا دل یکدم آداس ہو گیا، بے طرح، بے حد آداس۔ ایک عجیب ترپ تھی جو اس کے اندر اٹھی تھی۔ اسے

دیکھنے کی ترپ۔ اسے اپنے کی ترپ۔

پھر اسے کچھ چہرے یاد آئے۔ اپنی ماں کا شگفتہ، مسکراتا چہرہ۔ اپنے باپ کا بارعب مگر پر شفقت چہرہ۔ اپنی بیوہ

پھپھی کا آداس مگر پر یقین چہرہ۔

وہ اتنے چروں سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ وہ صرف خود سے جھوٹ بول سکتا تھا اور اب تک بول رہا تھا

لیکن شاید اب اس میں بھی ناکام ہو چلا تھا۔

”رافع!“ اسے اپنے باپ کے الفاظ اب تک یاد تھے۔ ”تم میرے سب سے بڑے بیٹے ہو۔ میری امیدوں،

آرزوؤں کا مرکز۔ نجانے کیوں کہ باپ کو اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی اتنی شدید تمنا ہوتی ہے۔ خیر۔۔۔ تمنا

پوری ہونے میں تو ابھی وقت ہے لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں بیٹا کہ اس خاندان کے افراد ایک دوسرے کی

مضبوطی ہیں۔ ایک دوسرے کی طاقت، ایک دوسرے کا مان ہیں اور ہم بزرگوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہم ایک

دوسرے کی طاقت میں اضافہ کریں گے، کی نہیں۔ بیٹا! تم جوان ہو، یقیناً تمہیں تمہارے فیصلے کرنے کا اختیار ہونا

چاہیے لیکن اگر تم یہ اختیار اپنے والدین کو سونپ دو تو ہم مرتے دم تک تمہاری فرماں برداری پر مشغور رہیں

گئے۔“

”آپ جیسا کہیں بابا!۔۔۔ اس نے سعادت مندی سے کہا تھا۔

”بھائی صاحب کا عہدہ عرشہ کے لیے ہے اور راجہ کا ورہہ کے لیے۔ اب تم ہتاؤ تمہاری پسند کیا ہے؟“
 ”میری پسند ناپسند کچھ نہیں ہے بابا! میں نے کہا نا آپ کو اختیار ہے۔“
 ”تم کسے ترجیح دیتے ہو؟“
 ”عرشہ تو۔۔۔ وہ بھوکا۔۔۔ ابھی کافی کم عمر ہے اور قدرے نا سمجھ۔“
 ”ہوں! اور ورہ۔۔۔؟“

”ورہ۔۔۔ بتائیں بابا! میں نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔ جو آپ بہتر سمجھیں۔“
 ”ہوں! ٹھیک ہے بیٹا! اب تم جاؤ آگے سوچنا ہمارا کام ہے۔“
 اور وہ مطمئن سا چلا آیا تھا۔ گزرے ہوئے سالوں میں اسے کبھی یہ باتیں یاد نہ آئی تھیں لیکن اب اکثر یاد آتی تھیں۔
 کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا وہ گھڑی کی سوئیوں کا رخ موڑ دے۔ وقت اگلے قدموں چل پڑے۔ اس کا دل اکثر یہ لا حاصل تمنا کرنے لگتا تھا۔

○ ○ ○
 دیوار کے ساتھ لگے ہوئے چھوٹے گملوں میں پانی ڈالتے ہوئے ورہ ہنسی تھی۔
 حمزہ کی ہمراہی میں ایک بے حد خوبصورت چھوٹے قد کی ماؤرن سی لڑکی اندر داخل ہوئی تھی۔
 ”السلام علیکم۔۔۔“ وہ محنتی سے مسکرائی۔
 ورہ آگے بڑھ آئی۔ اس سے ہاتھ ملایا۔
 ”ورہ آپ! یہ ناعمہ کا پوچھ رہی تھیں۔“ حمزہ بولا۔ ”میں انہیں یہاں لے آیا ہوں۔“
 ”آپ۔۔۔ ناعمہ کی فرزند ہیں؟“ ورہ نے دلچسپی سے اس کا روشن چہرہ دیکھا۔
 ”نہیں۔۔۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔ ”میں نے انہیں کالج میں دیکھا ہے۔ ویسے میرا نام فریحہ ہے۔ آپ کی تعریف؟“
 ”میں ورہ ہوں۔ ناعمہ کی بڑی بہن۔“
 ”اوہ۔۔۔ ناعمہ گھر پر ہیں؟“

اسی لمحے کمرے سے کوئی گانا تیز سرور میں گنگنا تی بے فکر ناعمہ باہر نکلی تھی۔
 فریحہ نے بے حد اشتیاق سے بھولے چہرے والی ناعمہ کو دیکھا تھا۔ ورہ جو فریحہ کو بغور دیکھ رہی تھی ان نگاہوں کی معنویت پر قدرے چونک سی گئی تھی۔ ناعمہ بھی ایک اجنبی مگر خوبصورت اور خوش لباس لڑکی کو گھر میں دیکھ کر ہنسی۔

”ناعمہ! یہ فریحہ ہیں۔۔۔ تم سے ملنے آئی ہیں۔“ ورہ نے نرم لہجے میں کہا۔
 ناعمہ نے ایک مرتبہ چکر بڑا کر ان دونوں کو دیکھا۔ ”مجھ سے ملنے؟“ وہ حیرانی سے ناک چڑھا کر بولی۔
 فریحہ کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ ورہ قدرے بھنائی تھی۔
 ”آئیں فریحہ! وہ خود ہی بولی تھی۔“ اندر چل کر آرام سے بیٹھتے ہیں۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“
 فریحہ نے ہنوز مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ورہ آگے بڑھی تو فریحہ بھی اس کی ہمراہی میں قدم بڑھانے لگی۔ ناعمہ پہلے تو ہونٹوں کی مانند کھڑی رہ گئی پھر کچھ خیال آنے پر وہ بھی تیزی سے ڈرائنگ روم کی سمت بڑھی تھی۔

”کیا لیں گی آپ؟“ ورہ نے شائستہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔ ”کولڈ ڈرنک یا پھر چائے؟“
 ”میں چائے شوق سے پیتی ہوں۔“ وہ بات بے بات مسکراتے اچھی لگتی تھی۔
 ”آپ ناعمہ سے باتیں کریں میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ ورہ وہاں سے اٹھ گئی۔
 اس کے جانے کے بعد فریحہ ناعمہ کی جانب متوجہ ہو گئی جو خود بھی اسے دھیان سے دیکھ رہی تھی۔

”تو آپ ہیں ناعمہ!“

”جی ہاں۔۔۔ میں ہی ناعمہ ہوں۔۔۔ آپ مجھے کس حوالے سے جانتی ہیں؟“ وہ قدرے حیرانی میں مبتلا تھی۔

”ہے ایک حوالہ۔“ وہ کھل کر مسکرائی۔ ”پھر بتاؤں گی۔“

”آپ۔۔۔ مجھ سے ملنے ہی آئی ہیں؟“ ناعمہ کو یقین نہ تھا۔

”یہی سمجھ لیں۔۔۔“ وہ مختصراً بولی۔ ”کون کون ہوتا ہے آپ کے گھر میں؟“

”یہ میرے نانا ابو مرحوم کا بنگلہ ہے۔“ ناعمہ اسے بتانے لگی۔ ”یہاں ہم لوگ علیحدہ علیحدہ پورشنز میں آباد

ہیں۔ دو پورشنز میں ہمارے دو ماموں اور ان کی فیملیز ہیں۔ یہاں امی، میں اور ورہہ آبی ہوتے ہیں۔ بڑی بہن کی

شادی ہو چکی ہے۔“

”آپ کے والد؟“

”ہمارے بچپن میں ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔“

”اوہ۔۔۔ ہی سوری۔“ فریجہ بولی۔

”اور آپ؟“ ناعمہ اب تک الجھی ہوئی تھی۔ ”آپ بھی کچھ بتائیں اپنے بارے میں؟“

فریجہ نے اچانک ہی اپنا پرس کھول کر ایک تصویر برآمد کی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے وہ تصویر ناعمہ کی آنکھوں

کے سامنے رکھ دی۔

”میں ان کی بہن ہوں۔۔۔ انہیں جانتی ہیں نا آپ؟“

ناعمہ نے فراز کی تصویر دیکھی۔ کئی مناظر اس نئی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ اس کے چہرے کا رنگ واضح

طور پر بدلا تھا۔

فریجہ نے تصویر واپس پرس میں ڈال لی۔

”فراز بھائی اکثر آپ کا ذکر کرتے ہیں اسی لیے مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا۔ بس اسی شوق کے تحت میں یہاں

چلی آئی۔“

ناعمہ گم صم سی ہو گئی تھی۔ وہ دیوانہ سا لڑکا جو چند ایک مرتبہ اس سے ٹکرایا تھا، وہ بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا تھا؟

اور فریجہ کے ”پونسی“ چلے آنے کے پیچھے کیا عندیہ پوشیدہ تھا؟ اس کا داغ الجھ سا گیا۔

”تم پریشان کیوں ہو گئی ہو ناعمہ؟“ فریجہ نے اس کا چہرہ دیکھا تو اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں بولی۔

”میں یہاں تمہیں پریشان کرنے تو نہیں آئی۔“

ناعمہ نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اسی لمحے ورہہ چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی تو فریجہ

اطمینان سے صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ ورہہ چائے بنانے لگی۔ اسی اثناء میں رابعہ بیگم بھی وہاں چلی آئیں۔

”السلام و علیکم۔“ فریجہ انہیں دیکھ کر تعظیماً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔“ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”پڑھتی ہو ناعمہ کے ساتھ؟“

”جی؟“ وہ لہجہ بھر کور کی۔ ”یونہی سمجھ لیں آئی!“

ناعمہ نجانے کیوں اس ساری صورت حال سے ہراساں سی ہو رہی تھی۔ رابعہ بیگم کے وہاں بیٹھتے ہی وہ اٹھ کر

باہر چلی گئی۔ فریجہ کی آمد کا مقصد کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا لیکن اس کا معنی خیر سا انداز اسے الجھا رہا تھا۔

”میں نے ناعمہ کو شہلا آئی کی شادی میں دیکھا تھا۔“ فریجہ رابعہ بیگم کو بتا رہی تھی۔ ”میرے بڑے بھائی فراز

احمد، عباد بھائی کے بہت اچھے بھگڑی دوست ہیں۔ اسی حوالے سے ہم ان لوگوں کو جانتے ہیں۔“

”اچھا اچھا۔۔۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔

”ناعمہ مجھے اچھی لگی۔ اسی لیے میں آج آپ لوگوں سے ملنے چلی آئی۔“ وہ ایک پیس کھاتے ہوئے کہہ

رہی تھی۔

رابعہ بیگم اور ورہہ نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں خوشی کی کیفیت تھی۔ فریجہ کو

دیکھ کر اس کے فیملی بیک گراؤند کا بخولی اندازہ کیا جاسکتا تھا۔
پھر جب تک وہ وہاں رکی چھوٹے چھوٹے معنی خیز جملوں میں اپنا مدعا بیان کرتی رہی تھی۔
”اے گھر والوں کو بھی لانا بیٹی!“
اس کے اٹھنے پر رابعہ بیگم نے بے حد خوشی اور شوق سے کہا تھا۔
”ضرور آئی! اب تو آنا جانا ہے گا۔“ وہ مسکرائی تھی۔

چند آنسو ایقان کے اندر گرے۔ اس نے مومن کو سینے سے لگا لیا۔
”میں نے بتایا نہ تھا! آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے۔ ایمان سو رہی ہے اب تک؟“
”وہ تو سو رہی ہے ماما۔ لیکن مجھے بہت بھوک لگی ہے۔“
”چلو میں آپ کو برگر بنا دوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
”نہیں۔ مجھے آپ چکن ڈال کر نوڈلز بنادیں۔“ اس کے چہرے پر چمک آگئی۔
”اچھا۔۔۔ بنا دیتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر چکن میں جلی آئی۔ اس کے سر میں درد سے دھماکے سے ہو رہے تھے۔ پچھلے چند روز گھنٹوں سے اس نے پانی کا گھونٹ تک حلق سے نہ اتارا تھا۔ عاشر نے پہلے اس سے بات کرنے کی بہتیری کوشش کی تھی پھر وہ اسے ”ماما۔۔۔ ماما۔۔۔“ مومن نے ایقان کا شانہ ہلایا۔
اس نے سوچی سوچی آنکھوں سے مومن کی جانب دیکھا۔
”ماما! آپ کو کیا ہوا ہے؟ آپ ہم سے بات کیوں نہیں کرتیں؟“ وہ اس کی آنکھوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ایقان نے گہری سانس بھر کر اسے خود سے لپٹا لیا۔

”ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے جانو۔ اس میں درد ہے اس لیے۔“
”آپ یہاں سے ناراض ہیں؟ انہوں نے رات آپ کو اتنی آوازیں دیں۔ آپ نے بیڈروم کا دورازہ کیوں نہیں کھولا؟“

ایقان چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی پھر اس نے اس کے ماتھے سے بال ہٹائے۔ ”آپ نے ہوم ورک کیا؟“
”آپ کروائیں نا۔ آپ کو پتا ہے میں اکیلا ہوم ورک نہیں کر سکتا۔ لیکن پہلے کھانا تو دیں مجھے اتنی بھوک لگی ہوئی ہے۔ آپ نے آج کھانا نہیں پکایا ماما؟“

اس کے حال پر چھوڑ کر نجانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ ایقان نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی شرانیں ٹھنسنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ اس کی سمجھ میں تو کچھ بھی نہ آیا تھا۔ اسے تو بس اتنا ہی علم ہو سکا تھا کہ عاشر کی زندگی میں اس کے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ اور یہ خیال سوہان روح تھا۔ جتنا سوچ رہی تھی گتھیاں اتنی ہی الجھتی چلی جا رہی تھیں۔

مومن کو نوڈلز کا پیالہ دے کر وہ فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لے کر پھر کمرے میں چلی آئی۔ گھونٹ گھونٹ لے کر پانی اپنے اندر اارتے ہوئے اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ عاشر کو معاف کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ عاشر نے اس کے اعتماد کو بے حد ٹھیس پہنچائی تھی۔ اور بات صرف اعتماد کی کب تھی؟ یہاں تو محبت جیسی شے داؤ پر لگی ہوئی تھی جس کے پیچھے وہ آنکھیں بند کیے اتنے سالوں سے چلتی چلی جا رہی تھی۔

ایقان کی نگاہوں میں گزشتہ زندگی کے سارے مناظر ایک ریل کی مانند چل رہے تھے۔ وہ کالج کا خوبصورت زمانہ، شہلا اور اس کی بے مثال دوستی کے دن۔ پھر شہلا کو ابراہار اور اسے عاشر مل گیا تھا۔ دونوں سیلیڈوں نے گویا ایک ساتھ ہی زندگی کے نئے دور کا آغاز کیا تھا۔
ایقان اس حساب سے خوش قسمت نکلی تھی کہ اس کی محبت کو کسی بڑی رکاوٹ کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا۔ عاشر کا

رشتہ آنے پر جب گھر والوں کو اس کی عاشر کے ساتھ انوالومنٹ کا علم ہوا تب اماں اور بھائیوں کی پیشانیوں پر ہل ضرور پڑے تھے لیکن کسی نے بھی ان دونوں کے مابین آنے کی کوشش نہ کی تھی، سوائے فردوس بیگم کے جو اس کی شادی آخر میاں سے کرنے کی خواہش مند تھیں لیکن گھر والوں نے ایقان کی خواہش کو مقدم جانتے ہوئے عاشر کا رشتہ قبول کر لیا تھا۔

عاشر ایک خوب، متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا اور اونچے خوابوں میں جینے والا نوجوان تھا جسے ایقان کی صورت بہت سے خوبصورت خوابوں کی تعبیر مل گئی تھی لیکن اس کے خوابوں کا ایک بڑا حصہ حصول آسائش سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے آگے سے آگے بڑھنے کی جستجو تھی۔ سوا ایقان کے بہت روکنے پر بھی وہ خود کو آگے جانے سے نہ روک سکا۔ شادی کے ابتدائی چند سالوں میں ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ اگر کچھ بننا ہے تو جدائی کے سمندر کو پار کرنا پڑے گا۔ سو وہ کوشش پیہم میں مصروف رہا اور ایک دن اسے سالوں کی جدائی کی نوید سن کر چلیا گیا۔ ایقان محبت کے پانی کی مچھلی تھی۔ اس کی زندگی میں سب کچھ محبت سے ہی عبارت تھا لیکن محبت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر نہایت متضاد صورت میں اتنا اور خود پسندی کا جذبہ بھی اسی شدت کے ساتھ موجود تھا۔ وہ بیک وقت محب اور محبوب دونوں بننا چاہتی تھی۔ وہ محبت میں پوجا کی قائل نہ تھی۔ کچھ دیکھ لو کا اصول اس کے اندر پورے توازن کے ساتھ کام کر رہا تھا اور اتنے سالوں بعد اچانک یہ توازن اس طرح بگڑا ہوا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خود کو مچھلی کی صورت تالاب سے باہر پڑا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ ایک تڑپ تھی جو عضو عضو کو کرب میں مبتلا کر رہی تھی۔ اس نے عاشر کو اتنا چاہا تھا کہ اس کی بے وفائی کا خیال اس کی رگ جاں کو خنجر کی مانند کاٹ رہا تھا اور وہ جتنا تڑپ رہی تھی کچھ کر گزرنے کا خیال اتنا ہی قوی نہ تھا جتنا تھا۔

پلاؤ کو دم دے کر ریجہ سلاو بنانے کے لیے فریق سے سبزیاں نکال رہی تھی۔ جب اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے آواز دے رہا ہے۔

ریجہ نے فریق بند کر کے لمحہ بھر کے لیے غور سے سنا پھر وہ نوکری ایک طرف ڈال کر تیزی سے اندر کی جانب بھاگی تھی۔ کمرے کا منظر اس کے ہاتھ پاؤں پھلادینے کے لیے کافی تھا۔ منیژہ بیگم بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ ان کے پیٹ کے نچلے حصے پر سختی سے جمے ہوئے تھے اور وہ بری طرح سے گراہ رہی تھیں۔ ریجہ دوڑتی ہوئی ان تک پہنچی۔

”آئی۔ آئی۔ کیا ہوا ہے آپ کو؟“ وہ انہیں سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔

”درد بہت ہے ریجہ! وہ رو دینے کو تھیں۔“

شدت ضبط سے ان کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا۔ آنکھیں گہرے حلقوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

”آئی۔ آئی۔! میں۔! میں کیا کروں؟“ ریجہ کے ہاتھ پیر پھول چکے تھے اور عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

”میری بچی۔! میری بچی۔! منیژہ بیگم تڑپنے لگی تھیں۔ ”میری بچی کو بلا دو۔“

”اوہ۔“ ریجہ کی عقل گواٹھکانے پر آئی۔

پھر وہ انہیں چھوڑ کر بھاگتے ہوئے ٹیلی فون تک آئی تھی۔ فون اٹھا کر وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شہلا کا موبائل نمبر ڈائل کرنے لگی۔

شہلا ہسپتال جانے کے لیے تیاری کے آخری مراحل میں تھی جب اس کے موبائل کی بیپ بجی۔ غلت میں کلائی پر نازک سی سلور ریسٹ و اچ باندھتے ہوئے وہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل تک آئی۔

اسٹرین پر روشن نمبر دیکھ کر اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔

”ہیلو۔ السلام علیکم۔“ اسے دوسری جانب سے منیژہ بیگم کی آواز کی توقع تھی۔

”شملہ آپلی! میں ربیعہ۔ آپ۔ آپ جلدی سے یہاں آئیں۔ آنٹی کی طبیعت بہت خراب ہے۔“
 ربیعہ کا انداز ہی نہیں الفاظ بھی ایسے تھے کہ شملہ کا وجود کانپ کر رہ گیا۔
 ”کیا کیا ہوا امی؟“ وہ ہکلائی۔
 ”مجھے نہیں پتا۔ بس آپ جلدی آئیں۔“ وہ رو دینے کو تھی۔
 شملہ پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ لمحہ بھر میں وہ مرکزی گیٹ پر تھی۔ سامنے ہی رافع اپنی بائیک اشارت کر رہا تھا۔ شملہ تیزی سے لپکی۔
 ”رافع! رافع پکڑو! مجھے امی کے گھر لے چلو۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔“
 ”کیا ہوا بھابھی!۔“ وہ بھی گھبرا گیا۔ ”ایسا کیا ہو گیا؟“
 ”پتا نہیں۔ بس تم جلدی چلو۔“ وہ اس کے پیچھے پیٹھتے ہوئے بولی۔
 رافع نے بائیک دوڑادی تھی۔

چند منٹوں میں وہ دونوں آگے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔ منیجرہ بیگم کو سنبھالنے کی کوشش کرتی۔۔۔ ربیعہ نے انہیں سلام کیا۔ وہ پینتہ پینتہ ہو رہی تھی۔
 شملہ نے اپنا فرسٹ ایڈ باکس منگوایا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ اس نے انہیں فوری طور پر اثر کرنے والی پین کلر ٹیبلٹ دی پھر ہڈ پر کچھ لکھنے لگی۔
 ”رافع! پکڑو! انجکشن لا دو۔“ آرمی کو آرام نہ آیا تو میں انہیں انجکشن بھی دے دیتی ہوں۔“
 ”ضرور۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن آنٹی کو ہوا کیا ہے؟“
 ”میں ابھی کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ٹیسٹ وغیرہ کروانے کے بعد ہی کوئی حتمی رائے دی جاسکتی ہے۔ شاید اپنڈکس ہو۔ لیکن اپنڈکس لگتا نہیں ہے۔“

وہ منیجرہ بیگم کے چہرے پر سے ہال ہٹاتے ہوئے بولی۔ رافع فوری طور پر نسخہ لے کر باہر نکل گیا تھا۔

”افہم؟“ شملہ نے سوالیہ نظروں سے ربیعہ کو دیکھا۔ ”لولی نہیں اب تنگ؟“

”نہیں۔“ ربیعہ نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ ”لیکن اب آتی ہی ہوگی۔ عمر کے آنے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔“

عمر کے ذکر پر شملہ کے چہرے کے تناؤ میں قدرے کمی آئی تھی۔ وہ پھر منیجرہ بیگم کو دیکھنے لگی جواب آہستہ آہستہ کر رہی تھیں۔ ان کے درمیں کافی کمی واقع ہوئی تھی۔ شملہ کافی متفکر انداز میں انہیں دیکھ رہی تھی۔

”شملہ آپلی!۔“ آنٹی کو پہلے کبھی ایسا درد اٹھا ہے؟“ ربیعہ ان کا ہاتھ دباتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ وہ کچھ سوچنے لگی۔ ”بھی کبھار ہلکے پھلکے سے درد کی شکایت کرتی تھیں۔ ہاضمے کی دوائیاں بھی

اکثر استعمال کرتی ہیں لیکن اتنا شدید درد۔ کبھی نہیں ہوا۔“

”آنٹی کا مکمل چیک آپ کروانا چاہیے نا؟“

”ہاں ربیعہ! میں کل ہی انہیں ہاسپٹل لے کر جاؤں گی۔“

رافع ہولے سے دروازہ بجا کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں شارٹ تھا جو اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

”بہت شکریہ رافع!۔“ شملہ نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ ”میں تمہیں پیسے دینا بھی بھول گئی۔“

”بھابھی!۔“ وہ شامی ہوا۔ ”کیسی غیروں جیسی باتیں کرتی ہیں۔ آنٹی میرے لیے بھی ماں جیسی ہیں! اب ان کی

طبیعت کیسی ہے؟“

”آرام آ گیا ہے۔ لیکن کل میں ان کا مکمل چیک آپ کرواؤں گی۔“

”یہ بہت ضروری ہے۔“ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میں اب چلوں بھابھی؟“

”چائے پیئے جاؤ۔“ شملہ نے ربیعہ کو دیکھا۔

وہ جلدی سے کھڑی ہوئی تھی۔ رافع نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”نہیں رعبہ! پلینہ۔۔۔ میں چلوں گا۔۔۔ آپ تکلف میں نہ پڑیں۔“
 ”تکلف کیسا۔۔۔ چائے بننے میں بھلا کتنا وقت لگتا ہے؟“
 رافع نے لمحہ بھر کے لیے نگاہ اٹھائی پھر بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔
 ”بیٹھ جائیں ناپلینہ۔۔۔ میں صرف پانچ منٹ میں چائے بنا لیتی ہوں۔“ وہ گفتگو سے مسکرائی۔ رافع کسی معمول کی مانند کرسی پر بیٹھ گیا۔



”ای۔۔۔ ای جی۔ کیا ہو گیا تھا آپ کو۔“ ”انیقہ“ مینزہ بیگم کی گود میں منہ چھپائے منمنارہی تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اس کے بالوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔
 ”کچھ بھی نہیں۔ تم لوگ یونہی پریشان ہو رہی ہو۔ پرسوں میں نے بوائے اکل انڈا کھالیا تھا اور تم جانتی ہو انڈا مجھے موافق نہیں آتا۔ پرسوں سے ہی ہلکا ہلکا سارو تھا۔ کل وہی درد بڑھ گیا۔ بد بھڑی ہو گئی تھی اور کچھ بھی نہیں۔“
 ”دودو ڈاکٹر کی موجودگی میں آپ کی اپنی رائے کا وزن کچھ بھی نہیں ہے امی جان!“ شہلا مصنوعی خفگی سے بولی۔ ”یہ معاملہ آپ ہم پر چھوڑیں، ہم خود تحقیق کریں گے مرض کی۔ آپ کل میرے ساتھ ہاسپٹل چل رہی ہیں بس۔“

”اچھی ڈاکٹر ہو تم دونوں۔“ وہ ہنس دیں۔ ”مریض خود بتا رہا ہے اپنے مرض کے بارے میں اور تمہیں کچھ پتا ہی نہیں چل رہا۔ نیشنل پر دارود دار ہے تشخیص کا۔ ایک زمانہ تھا کہ ڈاکٹر اور حکیم نبض پکڑتے ہی مرض پکڑ لیا کرتے تھے۔“

شہلا اور انیقہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے لگیں۔
 ”یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ ”انیقہ نے تائید کی تھی۔“ ”جیسے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی ترقی کر رہی ہے، انسانوں کی اپنی قابلیت گھٹتی جا رہی ہے۔ آج کا ڈاکٹر جب تک دس نیٹ نہ کروالے، نسخہ تجویز نہیں کرتا۔“
 ”ہاں تو اپنے پاس ہی رکھو اپنی ڈاکٹری کو۔“ وہ اطمینان سے پیرسارتے ہوئے بولی تھیں۔ ”میں اپنا نسخہ خود تجویز کر چکی ہوں۔“

”وہ کیا؟“ وہ دونوں ایک ساتھ بولیں۔

”آئندہ میں انڈا نہیں کھاؤں گی۔“

شہلا اور انیقہ نے برا سامنے بنایا تھا جبکہ رعبہ کی ہنسی نکل گئی تھی۔



دردہ کافی پرجوش سے انداز میں ماں کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ رابعہ بیگم نے کروشیمے کی تیل بناتے بناتے اس پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر مسکرا دیں۔

”ای جی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“ ”دردہ نے مدھم سی آوازیں پوچھا۔“

”کس بارے میں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”افسوس! اسی لڑکی فریج کے متعلق۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر ناعمہ کے موجود نہ ہونے کا یقین کیا۔

”ہوں۔ لڑکی تو اچھی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔

”ای جی۔ اس کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے کہ کسی بہت اونچے اور شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ ہے نا؟“

رابعہ بیگم نے کروشیمے اور دھاگا ایک طرف رکھ دیا اور قدرے سنجیدہ سی ہوئیں۔

”لیکن دردہ۔۔۔ اپنی ناعمہ تو بہت بوگلی سی ہے ابھی۔ مجھے تو رہ کر یہی خیال آ رہا ہے کہ مجھے ناعمہ کا رشتہ

خاندان میں ہی کرنا چاہیے۔ اپنے پھر اپنے ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن اپنے خاندان میں اب ہے کون؟“ وہ قدرے چڑھی گئی۔ ”اور جب سے نافع اور عریشہ کا نکاح ہوا ہے،

تب سے میں خاندان میں رشتہ ہونے سے خوف سا کھانے لگی ہوں۔ نجائے کیا بات ہے جو ان لوگوں کی خوشیوں

کو کھنسا لگ گیا ہے۔ آج کل کے لڑکے لڑکیاں کون سی ماورائی دنیا میں رہنے لگے ہیں جو حقیقتوں کو قبول ہی نہیں کیا کرتے۔ خیر یہ تو ایک بے معنی سی گفتگو ہے۔ میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اگر وہ لوگ ناعمہ کا رشتہ لے آتے ہیں جو کہ ایک لازمی بات ہے تو پھر ہمارا جواب کیا ہو گا؟“

راجہ بیگم کے چہرے پر تفکرات کے سائے پھیلے۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو وردہ! اجانے کیوں مجھے بھی وہم سے ستانے لگے ہیں۔ رافعہ یوں تو ہر لحاظ سے بہت ہی اچھا لڑکا ہے لیکن۔۔۔ لیکن تمہاری طرف سے وہ کچھ زیادہ ہی بے نیاز لگتا ہے۔ جیسے۔۔۔ جیسے اسے اس رشتے کی اہمیت کا احساس ہی نہ ہو۔“

”افوس!“ وردہ نے سر ہی پیٹ لیا۔ ”امی جی! یہ تو سوال گندم، جواب چناوالی مثال ہوئی۔ میں کیا پوچھ رہی ہوں، آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں اپنی نہیں، ناعمہ کی بات کر رہی ہوں۔“

”ناعمہ سے زیادہ اب مجھے تمہاری فکر ہے وردہ!“ انہوں نے گہری سانس بھری۔ ”ناعمہ کا رشتہ طے ہو جانے کے بعد اگر انہوں نے فوری شادی کی فرمائش کی تو میں کیا جواب دوں گی؟“

”تو کیا؟ ہم ناعمہ کی شادی کر دیں گے۔“ وہ مزے سے بولی۔ ”پھر میں اور آپ عیش کریں گے یہاں۔ وہ موٹی میری بنائی ہوئی ساری چیزیں کھا جاتی ہے۔ تنگ کیا ہوا ہے اس نے مجھے۔“

راجہ بیگم ہولے سے مسکرا دیں۔

”بمقام کی بات نہیں ہے وردہ! اصل بات یہی ہے کہ عذرا بھابھی ابھی رافعہ کی شادی کی بات نہیں کریں گی۔“

”مٹا یہ اور سرد رہی ابھی کہیں بات نہیں چلی۔“ نجائے انہوں نے شہس کتنے سال پونہی بٹھا کر رکھنا ہے۔“

”تو آپ کو کاہے کی فکر ہے؟“ اس نے لاڈ سے ان کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ ”میں تو خود یہیں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ ساری عمر۔“

”خدا نہ کرے۔“ وہ کانپ گئیں۔ ”میں بھی بات منہ سے نکالتے ہیں بیٹا! اما میں بیٹیوں کو ان کے گھروں میں بستا دیکھ کر خوش ہوتی ہیں اپنے ساتھ رکھ کر نہیں۔“

”میں چھوڑیں اس بات کو۔ میں تو ناعمہ کی بات کر رہی تھی۔“

”دیکھو۔۔۔ جو اس کا نصیب۔“ انہوں نے سانس بھری۔ ”اگر اس کا نصیب اسی گھر میں جڑنا لکھا ہے تو ایسا ہی ہو گا لیکن سچی بات تو یہ ہے بیٹا کہ رشتہ ہمیشہ اپنے جیسوں میں ہی کرنا چاہیے۔ وہ بہت اونچے لوگ لگتے ہیں۔“

”تو کیا ہوا۔ ہماری ناعمہ کسی سے کم ہے کیا؟ کم از کم اس کا مانع تو بہت ہی اونچا ہے۔“ وہ شرارت سے ہنس دی تھی۔

○ ○ ○

ہاشم، منیزہ بیگم کی مزاج پر سی کے لیے آیا تھا۔ کافی دیر سے وہ ان کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

”یہ لوگ درست کہہ رہی ہیں! آپ کو ضرور اپنا تفصیلی چیک اپ کرانا چاہیے۔“

”تمہیں بھی انہوں نے اپنا ہم نوا بنانا لیا ہے۔“ وہ مسکرائیں۔ ”چلو۔ دیکھتے ہیں۔ ابھی تو مجھے مکمل آرام ہے۔۔۔ کوئی درد درد نہیں ہے۔ آئندہ کبھی اٹھا تو چیک اپ بھی ہو جائے گا۔“

”خدا نہ کرے۔“ شملانے خفگی سے انہیں دیکھا۔ ”آئندہ کیوں اٹھے درد۔ آپ بھی بچوں جیسی باتیں کرنے لگی ہیں۔“

ہاشم نے بے حد پرشوق انداز میں شملہ کو دیکھا تھا۔ اس کا خفا خفا سا انداز اسے بہت دلچسپ لگا۔ اسی لمحے شملہ نے بھی نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور پزل سی ہو گئی۔

”گھر چلیں جناب؟“ وہ بشارت سے پوچھنے لگا۔

شملانے نگاہ اٹھا کر گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ نجائے کیا بات تھی، اس کا ”حیات ولا“ میں دل لگ کر نہ دیتا تھا یہاں آکر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی گمشدہ جنت میں چلی آئی ہو۔

ہاشم نے اپنے سوال کے جواب میں اس کے بدلتے ہوئے تاثرات کو بے حد دھیان سے دیکھا۔ اسے احساس

ہوا تھا کہ شہلا کا وہاں سے جانے کا موڈ نہیں ہے۔

”میں چلوں پھر؟“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔

شہلا چونکی تھی۔ اس نے ہاشم کا سوال یاد کیا پھر خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں بھی چل رہی ہوں آپ اکیلے ہی جانے کا ارادہ رکھتے ہیں کیا؟“

ہاشم ذرا سا مسکرایا ”لگ رہا تھا کہ اکیلے ہی جانا پڑے گا۔ چھٹی جس الارم بج رہی تھی۔“

”کیسے تو آپ کی چھٹی جس کا علاج کروں۔ صبح صبح کام نہیں کر رہی یہ۔“ وہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتے ہوئے یونہی بولی۔

ہاشم ایک مرتبہ پھر اسے غور سے دیکھنے اور مسکراتے پر مجبور ہو گیا۔ شہلا کے انداز میں جیون ساتھی والے رنگ ابھرنے لگے تھے۔ اس کی روز آدل والی اجنبیت میں کمی آتی جا رہی تھی۔

”چچا! جی۔ میں اب چلتی ہوں۔ کل آپ سے ملنے آؤں گی۔ دو انارم پر لے لیجیے گا بلکہ میں نے انیفکہ اور ربیعہ کو بجا دیا وہاں کرائی ہے۔“

”تم بے قد ہو کر جاؤ۔“ وہ بھی مسکرائیں۔ ”ربیعہ تو میرے منٹ منٹ کا حساب رکھتی ہے۔ وقت پر کھانا“

وقت پر دو آئی۔ بیٹوں سے بڑھ کر ہو گئی ہے میرے لیے۔“

اندر داخل ہوئی ربیعہ نے ان کے جملے سنے۔ اس کی روح ہلکی پھلکی ہو کر مسکراتے لگی جیسے ہر ریاضت کا صلہ پالیا ہو۔ شہلا نے بھی اس کا چہرہ بہت محبت سے دیکھا تھا۔

ربیعہ کی ہم راہی میں اندر آتا عمر بھاگ کر شہلا سے لپٹ گیا تھا۔

”ماما! آپ جا رہی ہیں پھر۔“

”عمر! ربیعہ نے اے پکارا۔“

”نہیں۔۔۔“ وہ ضدی پرن سے بولا۔ ”میں آج ماما کے ساتھ جاؤں گا۔ میں بہت دنوں سے ماما کے ساتھ نہیں سویا۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتا۔“

”جھوٹے“ ربیعہ نے اے ایک چپٹ لگائی۔ ”روزانہ میں تمہیں کہانی سناتی ہوں اور تم کہانی ختم ہونے سے پہلے ہی سو جاتے ہو؟“

”تو میں کیا کروں۔ آپ کی کہانی اتنی لمبی ہوتی ہے۔ بورنگ ہونے لگتی ہے تو میں سو جاتا ہوں۔“ اس کی بات پر سب ہنس دیے۔

”ربیعہ! اس کے کپڑے اریو نیفارم وغیرہ رکھ دو۔“ شہلا نے محبت سے اس کا سر ہلایا۔ ”میں اسے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔“

”ہرے۔۔۔“ اس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

ماں بیٹے کی خوشی دیکھ کر پھر کوئی کچھ نہ کہہ سکا تھا۔

اس	کے	گھر	کا	پتہ	نہیں
ہم	کو	اک	رہنا	نہیں	نہیں
ایک	عالم	کو	چھان	بیٹھے	ہم
آپ	سا	دوسرا	نہیں	کھنگالے	ہیں
لفظ	کے	پچ	خم	نہیں	اب
”پیار“	بھی	بے	”ریا“	ڈھونڈے	نہیں
اپنی	گھراؤں	میں	خدا	نہیں	
بت	کدوں	میں			

رافع ”حیات ولا“ کے پچھلے بڑے لان میں منہل رہا تھا۔ داغ پر بجائے کیوں ایک پڑا بوجھ دھرا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس بوجھ کو خود پر سے اتار کر پھینک دینا چاہتا تھا لیکن کسی طور کامیابی نہ ہوتی تھی۔ ایسے عالم میں لفظ سے لفظ جڑ گیا۔ خیال سے خیال بن گیا اور غزل ہوتی گئی۔

وہ گھاس پھوس سے بھرے ہوئے حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن خب نے کیوں اسے اس وقت ایک سگریٹ کی طلب ہونے لگی تھی۔ ذہن میں بھرا ہوا دھواں کسی بہانے نکالنے کا جی چاہنے لگا تھا۔ نجانے وہ آسمانی رنگ اتا کیوں پہنتی ہے؟ شاید اسے علم ہے کہ آسمانی رنگ اس کی صبح رنگت بہت چلتا ہے۔ اس رنگ میں اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک اور سیاہی مزید بڑھ جاتی ہے۔ شگرتی بیوں کی مسکان اور چھلی معلوم ہوتی ہے۔ شاید!

لیکن نہیں۔ وہ تو خود سے اتنی بے نیاز محسوس ہوتی ہے، جتنی باقی دنیا سے۔ اس کا دھیان تو نجانے کہاں رہتا ہے، بادلوں پر۔ چاند کی چاندنی پر۔ ان بنی دنیا میں۔ پریوں کی مگر میں۔ شاید وہ خود بھی وہیں سے آئی ہے۔ وہ پریوں کی نازک لڑکی۔

رافع نے آنکھیں بند کیں۔ وہ روشن پیشانی، وہ سیاہ چمکتی آنکھیں، وہ۔ وہ۔

”افسوس“ وہ اپنی ہتھیلی پر مکار کر رہ گیا۔ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ رافع اچھل ہی پڑا پھر اس نے ہاشم کے مخصوص ”Gucci“ کی خوشبو محسوس کی۔ وہ اس کے برابر حوض کی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا۔

”تو یہ طے ہے کہ تو اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ تیرے رت جگے بتا رہے ہیں۔“ رافع خاموشی سے بیٹھا رہا۔ ہاشم نے اس کے تاثرات دیکھنے کی کوشش کی لیکن رات کافی سیاہ تھی۔ ”تو کیوں جاگ رہا ہے؟“ رافع نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔ ”اگر محبت ہی جگاتی ہے تو۔۔۔ اب تو تجھے سونا چاہیے۔“

ہاشم اس کی بات پر دھیرے سے ہنس پڑا۔ ”کیوں؟ شادی محبت کا اختتام ہے۔“ جیسے لاثانی جملے پر تیرا یقین ہے کیا؟ ”نہیں۔“ رافع بھی مسکرایا۔ ”میرے کہنے کا یہ مطلب تو نہیں۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر محبت میں جدائی رت جگے دیتی ہے تو محبتوں کی قربت تو مدد و شوشی عطا کرتی ہے۔ یہاں دیرانے میں تو ہم سے آلو بھلے لگتے ہیں۔“

ہاشم زور سے ہنسا پھر وقتاً خاموش ہو گیا۔ ”یار رافع۔“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”یہ دن وے محبت کا فارمولا کیسا ہے؟ کیا کہتا ہے تو اس بارے میں؟ دن وے محبت کی قربت کتنی دیر مدد و شوش رکھ سکتی ہے بندے کو؟“ رافع چونک سا گیا۔ ہاشم کے لہجے میں کچھ تھا۔

”اگر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ اس نے محتاط سا ہو کر پوچھا۔ ”اوشنیں یا۔۔۔ شکایت تو جب بھی ہوئی، مجھے اپنے آپ سے ہوگی۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”خدا نہ کرے۔“ رافع بڑبڑایا۔ ”چھا، غزل سنا۔“ ہاشم قدرے بے فکری سے پھیل کر بیٹھا۔ ”کون سی غزل؟“

”جو ابھی وارد ہوئی ہے۔ ایسی رات اور ایسی تنہائی۔ شاعر غزل نہ کہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“ رافع دھیرے سے ہنس پڑا۔ ہاشم یار عار تھا۔ اس سے کچھ بھی چھپانا اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ اسے غزل سنانے لگا۔ ہاشم بغور سن رہا تھا۔

”ہوں۔۔۔ اس کا مطلب ہے۔۔۔“ پوری غزل سن کر وہ بولا ”خواتین کی رہنمائی۔۔۔ تصور کی حسین نگری سے نکل کر اب حقیقتوں کی دنیا کی جانب توجہ سفر ہے۔“
”وہ کیسے؟“

”تیری غزل کا وہ ماورائی، تصوراتی رنگ غائب ہو رہا ہے جس میں صرف محبوب کو سوچنے سے ہی خوشی بلکہ روحانی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ تیری سوچ میں اب لا حاصل کی کتنی اتر رہی ہے۔“ رافع خاموش سا ہو گیا۔ شاید ہاشم ٹھیک کہہ رہا تھا۔
”یار شاعر! خوش رہنا چاہتا ہے تو۔۔۔ اسی تصوراتی دنیا میں لوٹ جا۔۔۔ محبوب کو سوچ اور۔۔۔ اور بس سوچ۔۔۔ جہاں اسے پالنے کی تمنا کی۔۔۔ وہیں سے سوچ کا رنگ زار شروع ہو جائے گا اور تمنا سراپ کی صورت دور۔۔۔ اور دور ہوتی چلی جائے گی۔“
”ہاشم۔۔۔“ وہ دھیرے سے بولا۔
”ہوں؟“

”تیرے پاس سگریٹ ہے؟“
”رکھتا تو ہوں۔“ اس نے جیب پر ہاتھ مارا پھر ٹٹول کر ایک سگریٹ برآمد کی۔
رافع نے اس سے سگریٹ لے کر سلگائی اور بہت سا دھواں چھوڑا۔
”بس اب توجا۔“ پھر وہ بولا تھا۔
”اچھا۔“ ہاشم حیران ہوا پھر گہری سانس بھر کر کھڑا ہو گیا۔ ”ٹھیک ہے۔۔۔ چلتا ہوں۔“
بھڑان پر ایک ترم بھری نظر ڈال کر وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھا تا چل پڑا تھا۔

شہلا کا ڈیوٹی ٹائم شروع ہونے میں اب زیادہ دیر نہ تھی۔ روٹی پکاتے پکاتے اس نے ایک نظر لاؤنج کی دیوار پر نظر آتے والے کلاک پر ڈالی۔ محض آدھا گھنٹہ ہی رہ گیا تھا۔ اس نے پریشانی سے ماتھے پر آتے ہال بازو سے ہٹائے۔ فردوس بیگم کچن کی ہر ذمہ داری اس کے سپرد کر کے خود ہر فرض سے سبک دوش ہو چکی تھیں۔ عریضہ کا گھر میں ہونا نہ ہونا بالکل برابر تھا بلکہ شہلا کو تو اس کی صورت بھی ہفتہ میں دو تین بار بمشکل نظر آتی تھی۔ ایسے میں شہلا کو اپنی ذمہ داریوں میں توازن قائم رکھنے میں کافی دقت پیش آرہی تھی۔
”میرا خیال ہے، مجھے کچن کے لیے ایک عدد ملازمہ رکھ ہی لینا چاہیے۔“ اس نے ہاٹ پاٹ میں روٹی رکھتے ہوئے سوچا۔ ”میں ہاشم سے کہتی ہوں وہ اس سلسلے میں اپنی امی کو خود ہی قائل کریں تو بہتر ہوگا۔“
روٹیاں پیک چکی تھیں۔ شہلا نے سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے اپنے آج کے ڈریس کے متعلق لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

نیلے ہاتھ جھٹکتے ہوئے وہ جیسے ہی مڑی، اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کچن کے دروازے پر ایک بڑے ڈبل ڈول کا سانولا آدی کھڑا تھا۔ اس کی سرخ نظریں شہلا کو اپنے وجود کے آریار گزری محسوس ہوئیں۔ لمحہ بھر کے لیے شہلا کے اعصاب بالکل جواب دے گئے تھے۔

”آپ کے ہاں بیویوں کو سلام کرنے کا رواج نہیں ہے کیا؟“ وہ بولا۔
تب شہلا کے حواس دھیرے دھیرے واپس لوٹے۔ اس نے اس آدمی کو غور سے دیکھا اور پہچان لیا۔
”اویس۔“ اس کے لبوں سے گہری سانس خارج ہوئی۔ ”السلام وعلیکم۔ ک۔۔۔ کیسے ہیں آپ۔۔۔؟“
”وعلیکم السلام۔“ وہ مسکرائے۔ ”ہم تو ویسے ہی ہیں شہلا بیگم! جیسا آپ کی دوست چھوڑ گئیں ہمیں۔“
”اوه گاڈ۔“ شہلا نے دل میں سوچا۔ ”یہ آخر میاں اب تک۔۔۔“
”آپ کو شادی کی مبارکباد۔“

”شکریہ۔“ وہ مختصراً بولی تھی۔

آخر میاں پکن کے دروازے پر جم کر کھڑے ہوئے تھے۔ باہر نکلنے کے راستے مسدود تھے۔ شہلا کو کوفت نے آگھیرا۔ اسے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔ نجانے فردوس بیگم کہاں تھیں جو اپنے بھائی کو سنبھالتیں۔
”دلن بیگم! ہمیں ایک کپ چائے بنادیں، اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو۔۔۔“ آخر میاں نے جیسے اس کی کوفت اور بیزار محسوس کر لی تھی۔ وہ پکن کے دروازے پر سے ہٹتے ہوئے بولے۔
”جی۔۔۔ جی ضرور۔۔۔“ شہلا نے اپنی کوفت کو حتی الامکان دبانے کی کوشش کی۔

آخر میاں پلٹ گئے تھے۔ شہلا نے جلدی جلدی ساس پین چولے پر دھرا تھا۔ تب ہی اس کے کانوں میں دلی دلی آواز آئی تھی۔

”اے بے۔۔۔ تم پھر آن مرے۔۔۔ ہمارا صحت سلامت نہ رہنے دینا تم۔۔۔“ یہ جلابھنا اندازا سوائے فردوس بیگم کے اور کس کا ہو سکتا تھا۔

”با جی۔۔۔ کوئی سلام دعا کا موقع بھی دے دیا کرو۔۔۔“ آخر میاں ہنسے تھے۔ ”ہمیں دیکھتے ہی تم تو یوں کو سنہ دیتی ہو جیسے ہم تمہارا کچھ لے بھاگے ہوں۔“

”ہماری عزت، ہمارا وقار دو کوڑی کا کر جاتے ہو تم بھیا! اور بھلا کیا لوگے اور؟ نئی دلن گھر میں ہے۔ کیا سوچے گی تمہارا یہ ”شریفانہ“ حلیہ دیکھ کر۔“

”ہا ہا ہا۔۔۔“ وہ ہنسے تھے۔ ”اچھا۔۔۔ تو یہ فکر ستائی تمہیں۔۔۔ کوئی بات نہیں با جی۔! زانہ ہی سفید خون کا ہے۔ سرخ لہو تو اب شاید ہماری ہی رگوں میں دوڑتا ہے جو ہم ”پنوں“ سے ملنے چلے آتے ہیں۔ ویسے ”نئی“ دلن کی بات بھی خوب کی تم نے۔ ہم کیا اسے جانتے نہیں۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔“

رُے میں چائے اور بسکٹ لے کر آئی شہلا کے ذہن کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھکی۔ اس نے اپنا چہرہ سرخ ہوتا ہوا محسوس کیا پھر گرم گرم لہو اس کے پورے جسم میں گردش کرنے لگا۔ اس نے رُے آخر میاں کے سامنے تقریباً پٹختی دی تھی۔

فردوس بیگم نے حیرانی اور قدرے غفلت سے اسے دیکھا جیسے اس بدتمیزی کا مطلب جاننا چاہتی ہوں۔ شہلا نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے پھر لمحہ بھر سوچا۔ اس کے بعد وہ لب کاٹنے ہوئے مڑ گئی۔ تھکے تھکے ذہن اور پرمردہ اعصاب کے ساتھ وہ سیڑھیاں چڑھتی اپنے کمرے تک چلی آئی تھی۔ اسے تازہ دم ہو کر اپنی ڈیوٹی پر پہنچنا تھا۔ سوچوں میں الجھ کر خود کو تھکانے سے کچھ حاصل ہی نہ تھا۔



پودوں کو پانی دیتی ربیعہ کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ لکڑی کے چھوٹے سفید پھانک کے دوسری جانب وردہ کھڑی تھی۔ ربیعہ نے پائپ کیاری میں ڈال دیا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے پھانک تک آئی۔
”السلام علیکم۔۔۔“ وہ شکر اُتاتے ہوئے اس کا استقبال کرنے لگی۔
”وعلیکم السلام۔۔۔“ وردہ اندر چلی آئی۔ ”کیسی ہو ربیعہ؟“
”بالکل ٹھیک۔۔۔ آؤ اندر بیٹھتے ہیں۔“

وہ اس کا ہاتھ تھام کر اندر کی جانب پرہز گئی۔ انبیقہ اپنے کمرے میں اسٹڈی میں مصروف تھی جبکہ منیہ بیگم عسکری نماز سے فارغ ہو کر چائے پی رہی تھیں۔ وردہ کی آمد پر وہ دونوں بھی ڈرائنگ روم میں چلی آئی تھیں۔

”اتنے سالوں میں تم کبھی مجھ سے ملنے نہ آئیں اور ربیعہ سے دوستی ہوئی تو اس سے ملنے آئی ہو۔“ انبیقہ نے اپنے مخصوص دھولس والے انداز میں شکایت کی تھی۔
”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وردہ ہنس دی۔ ”میں اپنی غلطی مانتی ہوں لیکن یہ بھی تو دیکھو ربیعہ بھی تو مجھ سے

ملنے آئی ہے جبکہ اتنے سالوں میں تم کبھی مجھ سے ملنے نہ آئیں۔“

”چلو بھئی۔ تم نے تو بدلہ ہی چکا رہا۔“ انہی نے بے بسی سے بولی۔ سب ہی ہنس کر لگے۔
 ”یہ ربیعہ ہے ہی ایسی۔“ منیزہ بیگم نے محبت سے اس کی جانب دیکھا۔ ”یہ سب کو اپنا بنا لیتی ہے۔ سب ہی
 گرویدہ ہو جاتے ہیں اس کے۔“
 ربیعہ جھینپ کر اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگی۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آئی آپ۔“ وردہ نے تائید کی۔ ”ہمارے گھر میں بھی سب اس کے دیوانے ہیں،
 سب ہی اس کا ذکر کرتے ہیں۔“

ربیعہ کا دل نچلنے کیوں دھڑکا تھا۔ ”سب“ کا مطلب نجانے کیا تھا؟ وہ لمحہ بھر کے لیے کہیں کھو گئی۔ دو مہرمان
 نگاہیں اسے تنکے لگی تھیں۔ دو مسکراتے لب اپنا مدعا کہہ رہے تھے۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں
 چمکیں۔

”ہمارے ماموں سلجوق حسن کے بڑے صاحبزادے رافع حسن ان کے منگیتر ہیں۔ ان کی پسند سے ہی رشتہ۔“
 ناعمہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔

”کوئی نہیں پسند و سہ۔“ وردہ کا وہ جھینپا جھینپا سا انداز۔

”ربیعہ! انہی نے اسے دو سہری مرتبہ آواز دی تھی۔“

ربیعہ چونک کر اپنے آپ میں لولی۔ ایک ایک کر کے اس نے سب کے چہرے دیکھے پھر دھیرے سے مسکرائی۔
 ”کہاں کھوئی ہوئی ہو؟“ انہی نے مسکرا کر دیکھا۔

”بس یونہی ایک خیال آ گیا تھا۔“ وہ اپنے خیال کی حدت سے گھبرا کر کھڑی ہوئی۔ ”آپ لوگ گپ شپ کریں،
 میں اچھی سی چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”میں چائے پی کر آئی ہوں ربیعہ!“ وردہ کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ ربیعہ کمرے سے نکل گئی
 تھی۔

”آئی۔! میں دراصل آپ کے پاس آئی تھی۔“ وردہ نے منیزہ بیگم کو مخاطب کیا۔

”ہاں بیٹا! بولو۔“ وہ شفقت سے بولیں۔ ”میں اگر آپ کے کسی کام اسکوں تو مجھے خوش ہوگی۔“

”آئی۔! عباد بھائی کے ایک دوست ہیں فراز احمد۔ ہیں نا؟“

”ہاں ہاں۔ فراز تو ہمارے گھر کے ایک فرد کی مانند ہے۔ ہمارے لیے تو وہ عباد جیسا ہی ہے۔“

”اچھا۔“ وردہ خوش ہو گئی۔ ”میں دراصل یہی جاننا چاہ رہی تھی، ان کا فیملی بیک گراؤنڈ، خاندان کے افراد
 وغیرہ۔ سب کیسے ہیں؟“

”سب ہی بہت اچھے ہیں۔ دو بہنیں اور دو ہی بھائی ہیں۔ سب ماشاء اللہ سلجھے ہوئے، پڑھے لکھے افراد ہیں۔
 بہت کھانا پیتا گھرانا ہے۔“

وردہ کے چہرے پر چمک آئی تھی۔ منیزہ بیگم کے الفاظ اور انداز بہت حوصلہ افزا تھے۔

”پہلے یہ تو بتاؤ کہ بات کیا ہے؟“ انہی نے اسے گھورا۔

”بات یہ ہے کہ فراز کی بہن فریحہ ہمارے گھر آئی تھیں، ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ناعمہ میں انٹرنسٹڈ
 ہیں۔“

”وہی گڈ۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ انہی بھی خوش ہوئی۔ ”ان دونوں کی جوڑی تو خوب بچے گی۔ ویسے
 فراز بھائی تو بچے رستم نکلے۔ آنے دو انہیں، سمجھتی ہوں ان سے۔“

”ارے نہیں انہی! پلینس۔“ وردہ التجائیہ انداز میں بولی۔ ”ابھی تو ان لوگوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ یہ تو
 محض میرا اندازہ ہے۔ ابھی تم ان سے کچھ مت کہنا، ورنہ وہ ہمارے متعلق کیا خیال کریں گے۔“

”تم بے فکر ہو وردہ بیٹی! منیزہ بیگم نے اسے تسلی دی۔ ”ہمارے گھر سے ایسا کوئی ذکر نہیں ہوگا اور جہاں

تک ان لوگوں کا تعلق ہے، وہ بہت اچھی فیملی ہے، ہر لحاظ سے اچھی۔ اگر رشتہ آئے تو قبول کرنے میں تامل نہ کرنا۔“

”بہت شکریہ آئی!“ وردہ ممنونیت سے بولی۔ ”میرا بوجھ ہلکا کر دیا آپ نے۔“
”یہ ناعمہ تمہارا بوجھ کب سے ہو گئی؟“ انہیچہ حیرت سے ہنسی۔

وردہ نے اس کی بات پر غور کیا پھر خود بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔ چائے لے کر اندر داخل ہوتی رہی۔
نے دھیان سے اسے دیکھا تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں والی، علیحہ رنگت کی حامل وردہ واقعی رُکشش تھی اور ہنسی اس کے چہرے پر ملکوتی تاثر لے آتی تھی۔ رہیہ نے دل سے اس کے یونی مسکراتے رہنے کی دعا کی۔ نجانے کیوں یہ لڑکی اسے بہت اپنی اپنی سی لگتی تھی۔

کولر سے پانی لے کر وہ جیسے ہی پلٹی، لمحہ بھر کے لیے ٹھنک کر رک گئی تھی۔ سرخ نگاہیں لیے وہ مقابل تھا۔ ایقان ان نگاہوں میں دیکھنا نہ جانتی تھی۔ وہ پانی لے کر سائڈ سے نکلنے لگی۔ عاشر نے اس کا رستہ روکا۔
”یہ کون سا کھیل کھیل رہی ہو تم میرے ساتھ ایقان!“ نظروں کی طرح اس کا لہجہ بھی پتاپتا سا تھا۔
ایقان نے بھی سکتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”کھیل؟ کھیل کا مطلب جانتے ہو تم عاشر صاحب؟ میں ایک کمزور عورت بھلا کون سا کھیل کھیل سکتی ہوں؟ کھیل تو تمہارے جیسے مرد کھیلتے ہیں۔ ہم عورتوں سے۔۔۔“

”یہ کیا فاطمی ہے!“ وہ جھنجھلا یا۔ ”میرے واپس جانے میں محض تین دن رہ گئے ہیں۔ محض تین دن۔۔۔ اور تم۔۔۔ تم اپنی ہر ذمہ داری، ہر تعلق کو پس پشت ڈال کر، کمرہ بند کیے نجانے کس ماتم میں مصروف ہو۔“
”ذمہ داری۔۔۔ تعلق۔۔۔“ ایقان نے بھرا ہوا گل اس سبک میں دے مارا۔ ”میں یاد رکھوں اپنی ذمہ داریوں کو۔۔۔ میں ہر تعلق بنا ڈال۔۔۔ اور تم!“ اس نے انگلی سے عاشر کی جانب اشارہ کیا۔ ”تم آزاد پنجھی بن کر ڈال ڈال پھرتے رہو۔“
”کیا کیا ہے میں نے ایسا؟“

”وہ تم اپنے آپ سے پوچھو اگر ضمیر نام کی کوئی شے ہے تمہارے اندر۔ اور اگر نہیں ہے تو پھر تمہارے اس سوال کا جواب تمہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔“
وہ پھر اس کے قریب سے گزر کر جانے لگی تھی۔ عاشر نے اس کا بازو اس سختی سے پکڑا کہ اس کی انگلیاں ایقان کے بازو میں جکڑ گئیں۔

اسے چھینتے ہوئے وہ کمرے میں لایا اور بستر پر دے مارا۔ ایقان کے لبوں سے گھٹی گھٹی سی چیخیں برآمد ہوئی تھیں۔

”تم مجھے میرے فیسو رہنے کا یہ صلہ دے رہی ہو؟ کیا کر لیتیں تم اگر میں اس سے شادی کر لیتا تو؟ کیا کر سکتی تھیں تم اگر میں اس کی اداؤں اور حسن کا دیوانہ بن جاتا اور اس دیوانگی میں تم کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا؟ بولو۔۔۔ اب دو؟۔۔۔ جواب دو۔۔۔ کیا بگاڑ سکتی تھیں تم میرا اور کیا بگاڑ لو گی اب؟“
”ایقان بستر پر گری اسے خونی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ایقان بیگم! تم نجانے کون سی فینٹسی میں زندہ ہو۔ آنکھیں کھول کر دیکھو کہ اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اب کچھ ہو رہا ہے۔ مرد اگر خراب ہونا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ کوئی نہیں، بیوی تو ایک بہت کمزور سی شے ہے۔“

ایقان کی آنکھوں میں دکھ سے آنسو آگئے تھے۔ وہ ایک ناک اسے دکھے جا رہی تھی۔
”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ہے جس پر تمہیں بیواؤں کی طرح ماتم کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ سمجھیں تم!“
لہر ہاتھ رکھے بے حد سفاک انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مردوں کی زندگیوں میں ایسے چھوٹے موٹے واقعات آتے رہتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے کی مانند عورتیں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ اور ہوا کے جھونکوں کے پیچھے کوئی نہیں بھاگتا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔“

ایقان نے اپنے چہرے پر سے بال ہٹائے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ قدم قدم چلتی اس کے سامنے جا گھڑی ہوئی۔

”ہوا کے جھونکے کی مانند اگر کوئی میرن زندگی میں بھی آجائے مسٹر عاشق! تب بھی تمہارے خیالات یہی رہیں گے؟ اگر میں بھی تمہارے جانے کے بعد کسی مرد سے وقتی تعلق استوار کر لوں۔“

اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی رہ گئے تھے۔ عاشق نے اس کے چہرے پر اس زور سے تھپڑ مارا تھا کہ وہ پلٹ کر پھر بستر پر جا گری تھی۔

”میری حد میں رہو ایقان بیگم۔! وہ غرایا تھا۔“ تم نے صرف میری محبت دیکھی ہے۔ اسی پر قناعت کرو۔ اس سے آگے جانے کی کوشش کی تو۔۔۔ آئی دل کل یو۔۔۔“

وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ نجانے کیا بات تھی، چہرے پر اٹھتی ٹیسوں کے باوجود اسے روانہ آیا تھا۔ کھلے آنکھوں سے دیوار کو تکتے ہوئے وہ کچھ سے کچھ سوچے چلی جا رہی تھی۔

مندی مندی آنکھوں سے شہلا نے ٹائم دیکھا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ آج اس کا آف ڈے تھا۔ اس نے دوپہر بہت مزے سے سونے میں بتادی تھی۔

اس نے اپنے برابر خالی جگہ پر نگاہ کی۔ عمر کو اس نے اپنے ساتھ ہی سلایا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا نجانے کس وقت وہ اسے سوتا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا تھا۔

شہلا نے اپنے بال سینے اور اٹھ کر لائنس آن کیں۔ پھر وہ واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھو کر پرسکون اعصاب کے ساتھ چائے کی طلب لیے وہ کمرے سے نکلی تھی کہ سیر میٹھیوں پر پہنچ کر وہ ٹھٹھک گئی۔

”یہ چھوکر اتو جان کو آگیا ہے۔ اتنا شیطان! اتنا شریر۔“ فردوس بیگم کا بارہ نہایت ہائی ہو رہا تھا۔

شہلا کی نظریام کے گیلے پر بڑی جواوندھا ہو کر ٹوٹ گیا تھا اور اس کے قریب کھڑا منہ بسور رہا تھا۔

”مجھے کیا پتہ! آپ لوگوں نے رستے میں کیلے رکھے ہوئے پیر۔۔۔“ وہ اپنے انداز میں بولا۔ ”یہ کوئی جگہ تو نہیں پودوں کی۔ انہیں باہر رکھیں نالان میں۔ آپ لوگوں کا لان کتنا بڑا ہے۔“

”اے ہے۔۔۔ اپنی زبان قابو کر لو کے! بے لگام کہیں گا۔“ انہوں نے اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کی۔

شہلا کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا وہ لمحہ بھر میں سیڑھیاں اتر گئی۔

”آئی پلیز۔۔۔“ اس نے عمر کو کھینچ کر خود سے لپٹا لیا۔ ”آپ اسے اس طرح ٹریٹ نہ کریں بچوں۔ سے غلطیاں ہوئی جاتی ہیں۔“

اس کا لہجہ ضبط کے باوجود تلخ ہو چلا تھا۔

”بی بی! ہمارے گھر میں بچوں کو والوک کا تیر نہیں بناتے۔ سمجھیں تم۔۔۔“ انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ ”اتنا ہی! لا کالڈو ہے تو رہے نانی اماں کے گھر۔ ہم نے تو پہلے دن ہی صاف کہہ دیا تھا کہ ہم ہو تو لے جا رہے ہیں۔ پوٹا ہمارا اپنا خون ہی ہو گا۔ یہ پھر بھی ہر دوسرے دن بیس مونگ دلتا ہے۔“ وہ بات مکمل کر کے گیلے کا جائزہ لینے لگی تھیں۔

”میری عزیزہ کتنے شوق سے لالی تھی۔ سب سستیاس کر دیا۔“ وہ بوڑھا رہی تھیں۔ شہلا آنکھوں میں آنسو بھرے لب کاٹ رہی تھی۔ عمر نے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”آئی ایم سوری مم! انہوں نے میری وجہ سے آپ کو ڈانٹا۔ نانو نے تو آپ کو کبھی نہیں ڈانٹا۔ ہے نا۔۔۔!“

”چلو بیٹا! ہم نانو کے گھر چلتے ہیں۔“ اس نے بے حد ضبط سے خود پر قابو پایا تھا۔

”ٹھیک ہے!“ اس نے سر ہلایا۔ ”میں واپس نہیں آؤں گا ماما! مجھے ان کا گھر پسند نہیں ہے۔ آپ واپس آئیں گی؟“
شمالا ب کاٹ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی تھی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو ایقان تم؟“ عذرا بیگم خوف سے پہلی بڑ گئی تھیں۔
”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں بھابھی بیگم!“ اس کے لہجے کی استقامت سے انہیں مزید خوف محسوس ہوا۔ ”اور آپ جانتی ہیں میں کس قدر ضدی ہوں۔“
”لیکن ایقان۔۔۔ ماں۔۔۔ تمہارے بھائی۔“ وہ ہکلا کر رہ گئیں۔ ”تم نے اماں سے ذکر تک نہیں کیا اور اب مجھے بتا رہی ہو۔“

ایقان نے گہری سانس بھری وہ اپنا ضروری سامان اور بچے لے کر دوپہر میں ہی ”حیات ولا“ چلی آئی تھی۔ سارا دن عجب بے کلی میں گزرا تھا۔ دل کو پٹکھے لگے ہوئے تھے۔ اماں کے سو جانے کے بعد وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔ عذرا بیگم سے اس نے سب احوال کہہ ڈالا تھا۔

”اماں کو میں بتا دوں گی۔ بھائی کو آپ بتا دیں۔ دنیا کو خود ہی بتا چل جائے گا۔“
”ایقان۔۔۔“ وہ رونے کے قریب ہو گئیں۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ کیا کر رہی ہو۔ ارے کچھ سوچ سمجھ تو لو۔“
”اتنا طے ہے بھابی بیگم! کہ میں پلٹ کر اس شخص کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ وہ بولی ”آپ جانتی ہیں نا۔ ابا مرحوم نے ”حیات ولا“ کے حصے اپنی زندگی میں ہی کر ڈالے تھے۔ دو بڑے حصے دونوں بھائیوں کے لیے اور دو چھوٹے حصے ہم دو بہنوں کے۔ ہے نا۔ میرے حصے کا پورشن اب تک ویران اور خالی پڑا ہے۔ میں وہیں رہوں گی۔“

”ہمیں تمہارے رہنے کی نہیں۔ تمہارے آباد رہنے کی فکر ہے۔ ایقان۔۔۔“ انہوں نے آنسو پونچھے۔
”میرے لیے تم ثانیہ اور سدرہ کی طرح ہو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ تمہارا ہنستا ہنستا گھر برباد ہو۔“
”آپ کے یا میرے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے بھابھی جان!“ وہ گہرے دکھ میں ڈوب کر بولی۔ ”نقدیر کا وار چل چکا۔“

”خدا نہ کرے۔ کچھ نہیں ہوا۔۔۔ تم تو یونہی باؤلی ہو رہی ہو۔“
”شاید آپ سب لوگ ایک آواز ہو کر یہی کہیں گے۔“ اس نے پلک بڑا تراموتی توڑا۔ ”لیکن میری سوچ، میرا دل اپنی ہی بات کہہ رہے ہیں۔ چاہے کوئی اس بات کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ اگر کسی نے مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی۔ تو میں خود کو آگ لگا لوں گی۔ یاد رکھیے گا۔“
عذرا بیگم ہونق ہو کر اسے دیکھ گئیں۔ ایقان اٹھ کر چل دی تھی۔

بے حد تھکا ہارا عاشر دروازے کی جانب بڑھا تھا۔ کال بیل کے بٹن پر انگلی رکھ کر اس نے کافی دیر تک نہ ہٹائی۔ چند لمحوں تک کوئی جواب نہ آنے پر اس نے پھر کال بیل کا مین ہنٹ کیا تب ہی سامنے والا دروازہ کھول کر اس کے پڑوسی فضل صاحب نکلے تھے۔
عاشر غیر متوقع آواز پر چونک کر مڑا۔ فضل صاحب نیند سے سرخ آنکھیں لیے کھڑے تھے۔

”چالی؟“
”آپ کی مسز وے گئی تھیں۔ آپ کے لیے۔۔۔ آپ تو بڑی دیر سے لوٹے۔“
”اوہ۔۔۔“ وہ شرمندہ ہوا۔ ”آپ کو زحمت ہوئی فضل صاحب۔ معذرت، بہت معذرت۔“ وہ سر ہلا کر مڑ گئے۔

عاشق چالی لیے سوچ میں گم کھڑا رہا۔ صبح کے مناظر اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے تھے اس نے ڈیڑھ بجائی گھڑی کو دیکھا۔

دروازہ کھول کر وہ گھر میں داخل ہوا پھر سیدھا فون کی جانب بڑھا تھا۔
 بیبل ایک قوارے سے بجی تھی۔ عذرا بیگم افتاب و خیزاں فون تک پہنچی تھیں۔
 ”ہیلو۔۔۔“ انہوں نے نیکی ہوئی سی آواز میں کہا۔
 عاشق چند لمحوں کے لیے خاموش رہا تھا پھر ان کے دوبارہ ”ہیلو“ کہنے سے قبل ہی وہ آہستگی سے بولا۔
 ”السلام علیکم بھالی جان۔۔۔ عاشقات کر رہا ہوں۔“
 اب چند لمحے خاموش رہنے کی باری عذرا بیگم کی تھی۔ پھر وہ بھی مزید ہم آوازیں بولیں۔
 ”ہاں عاشق میاں! کیسے ہیں آپ؟“

”میں ٹھیک ہوں بھالی جان۔۔۔ یہ ایقان کہاں ہے؟“ اس کی زبان اٹکنے لگی تھی۔ عجب شرمندگی کا احساس دامن گیر ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی دل کی تہوں سے غصہ بھی اٹھ رہا تھا۔
 ”ایقان۔۔۔“ عذرا بیگم بھی جیسے اس کے جیسی کیفیات کا شکار تھیں۔ ”ایقان تو۔۔۔ شاید سو رہی ہے۔“
 عاشق نے گہری سانس بھری۔ اسے نجانے کیوں ایک وہم سا تھا جیسے وہ اسے وہاں نہیں ملے گی جیسے وہ کہیں اور چلی گئی ہوگی۔ اب اس کی وہاں موجودگی کا غم ہو جانے پر وہ قدرے مطمئن سا رہ گیا۔
 ”نہیں بھالی جان۔۔۔ وہ سو نہیں رہی جاگ رہی ہے۔ میں جانتا ہوں۔“

”عاشق! وہ۔۔۔ ایسا ہے کہ کیا بہتر نہیں ہو گا کہ تم صبح فون کر لو۔“ عذرا بیگم اب کے قدرے شرمندگی سے گویا ہوئیں۔ ”ایقان کی طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔“
 عاشق نے ایک گہری سانس لی۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

”بھالی جان۔۔۔“ آپ اسے بلائیں! وہ قدرے نرم گئے انداز میں بولا ”میں اس سے ابھی بات کروں گا۔“
 ”چھا! وہ ہم پر سن۔“ میں دیکھتی ہوں تم ہولڈر کھنا۔“
 ریسیور ایک طرف رکھ کر وہ پریشانی کے عالم میں اس کمرے کی جانب بڑھی تھیں جہاں شفیقہ حیات اور ایقان لیٹی تھیں۔ انہیں خوف تھا کہ رات گئے شفیقہ حیات کی نیند اگر خراب ہوئی تو شاید ان کی طبیعت بھی بگڑ جائے وہ گولیاں کھا کر سوا کرتی تھیں۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹھک گئیں۔ ایقان دیوار سے ٹیک لگائے، دونوں بازو سینے پر باندھے باہر ہی کھڑی تھی۔ نیم اندھیرے میں بھی وہ اس کے متورم پونوں کو دیکھ چکی تھیں۔
 ”ایقان!“

”مجھے خبر ہے بھالی جان!“ وہ ہولے سے بولی۔ ”میں بیل کی آواز سن رہی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ میں کمرے میں جا رہی ہوں تم بات کر لو۔“

ایقان چپ رہی۔ عذرا بیگم پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ایقان یونہی سینے پر بازو لپیٹے کھڑی ہوئی۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ فون کا ریسیور یونہی ایک طرف رکھا رہے اور دوسری جانب وہ انتظار اور غصے کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ لیکن عقل کہہ رہی تھی کہ آج بالکل اسے بات تو کرنا ہی تھی۔ سو کچھ دیر بعد وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی فون تک آئی۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے بالکل بے تاثر انداز میں کہا۔

”کیا طریقہ ہے یہ۔۔۔“ وہ دوسری جانب اپنا غصہ دبائے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ”گھر چھوڑ کر بغیر کسی اطلاع کے یوں چلے جانے کا کیا مقصد ہے؟“

”مقصد صرف ایک ہے۔“ وہ مضبوط لہجے اور دھیمی آواز میں بولی۔ ”وہ یہ کہ میں تمہارا گھر اور تمہیں دونوں کو چھوڑ آئی ہوں ہمیشہ کے لیے۔“

”ہاٹ؟“ اسے جیسے کرنٹ لگا۔ اس بات کا تو اس کے وہم و گماں میں کیسے سایہ تک نہ تھا۔
”ایقان؟ تم پاگل ہو گئی ہو کیا؟ جانتی ہو کہ نہ کیا رہی ہو؟“

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ ہنوز سابقہ انداز میں بولی۔ ”اتنے سالوں میں تم شاید مجھے نہ جان پائے۔ اور شاید اتنے سالوں میں بھی تمہیں نہ سمجھ سکی۔ شاید اتنے سال علیحدہ رہے اس لیے، لیکن کیا اچھا نہیں ہوا کہ بہت جلد میں نے تمہیں پہچان لیا؟ اور یہ بھی اچھا ہی ہو گا کہ اب تم مجھے بھی جان لو میرے نزدیک محبت میں ہر خطا قابل معافی سے ماسوائے بے وفائی اور ہرجائی پن کے۔ تم نے میرے جذلوں کی توہین کی ہے عاشر۔! میں مر کر بھی یہ بات نہیں بھولوں گی۔“

عاشر کا جی چاہا ریسیور مار کر اپنا سر پھوڑ لے۔

”ایقان۔۔۔ ایقان تم تم کوئی سولہ سترہ سال کی جذباتی لڑکی نہیں ہو۔ ایک میچور عورت ہو۔۔۔ دو بچوں کی ماں ہو تم ہوش سے کام لو۔ یہ کیا اول فوٹو کے جاری ہو۔ مجھے یہ بتاؤ تمہیں ابھی لینے آ جاؤں یا صبح آؤں؟ میرا خیال ہے میں ابھی آجاتا ہوں تمہیں جو کچھ کہنا سننا ہو رات بھر میں کہہ لینا تاکہ صبح تمہارا یہ پاگل پن اترے۔“
”عاشر صاحب! وہ طنزیہ مسکراتی تھی۔“ مجھے آپ کی طرح نہ کسی کے حسن کا نشہ چڑھا ہے نہ ہی غم غلط کرنے کے لیے میں نے شراب کا سہارا لیا ہے۔۔۔ میں نے جو کچھ کہا وہ بھانگی ہوش و حواس کا ہے۔ آپ کو نہ اس وقت زحمت کرنے کی ضرورت ہے نہ صبح۔۔۔ میں یہاں سے واپس جانے کے لیے نہیں آئی۔ تمہاری صورت دیکھنا اب میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔“

”ایقان! وہ سنگ اٹھا۔“ اپنی اوقات میں رہو۔ زبان سنبھال کر بات کرو۔ بدتمیز جی کی کوئی حد ہوتی ہے۔“
”آپ کے نزدیک تمہذیب کیا ہے میں جان چکی ہوں!“

”مروت!“ وہ بلبلا گیا۔ ”اور“ اور میں صبح آؤں گا بات کروں گا تمہارے گھر والوں سے۔ کیا سمجھا ہوا ہے تم نے میں تو اٹھا کر لے جاؤں گا تمہیں۔ قانونی بیوی ہو میری کوئی معشوقہ نہیں ہو جو یہ دھمکیاں دے رہی ہو۔ خناس چڑھ گیا ہے تمہیں۔“

بڑبڑاتے ہوئے اس نے ریسیور کریڈل پر دے مارا تھا۔ ایقان چند لمحوں کے لیے سن سی رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں برسات اتر آئی۔ پیاز کی طرح تہہ در تہہ اترتے روپ کے متعلق اس نے کئی بار سنا اور پڑھا تھا، دیکھ پہلی بار رہی تھی۔



عاشر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے قدرے فاصلے پر چہرے پر خاصے تاؤ کی سی کیفیت لیے فاروق حسن بیٹھے تھے۔ ایک طرف شفیقہ حیات بیٹھی بار بار سفید دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ ان کے ایک طرف سلجوق حسن اور دوسری جانب عذرا بیگم بیٹھے ہوئے تھے۔
گمرے کی کھڑکی کے قریب ایقان کھڑی تھی۔ دونوں بازو سینے پر لپیٹے وہ مسلسل کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ کتنا ہی وقت اسی خاموشی کے عالم میں گزر گیا۔ پھر عاشر نے سر اٹھا کر سب کی جانب دیکھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے سب ہی اس سے نظر چرا رہے ہوں۔ اس نے پھر کابٹ بنی ہوئی ایقان کو دیکھا۔ پھر جیسے زچ ہو کر گویا ہوا تھا۔
”کیا فیصلہ ہے تمہارا؟ تم میرے ساتھ چل رہی ہو یا نہیں؟“

ایقان نے رخ پھیر کر اسے فقط ایک نظر دیکھا۔

”نہیں!“ وہ بے حد ٹھوس انداز میں بولی۔

گمرے میں موجود نفوس میں سے زیادہ تر نے بے اختیار گہری سانس بھری تھی۔ عاشر نے ایقان کی بے پناہ ضدی طبیعت کے مقابلے میں ان سب کی بے بسی محسوس کی۔

”آخر میں نے کیا کیا ہے؟“ وہ چلا ہی اٹھا اور اگر کچھ کیا ہے تو ٹھیک ہے دنیا میں بے شمار مر رہیں جو کبھی نہ کبھی رستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لیے بمک بھی جاتے ہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ ان کی ہویاں اس سرکشی پر اتر آئیں۔ اس طرح تو اس طرح تو کتنے گھر ٹوٹ جائیں۔ آپ، آپ سب لوگ اسے سمجھاتے کیوں نہیں آپ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ اس سے کہیں یہ سامان اور بچے لے اور میرے ساتھ چلے۔ میں اسے لینے آیا ہوں ایک طرح سے معذرت خواہ ہی ہوں اور یہ ہے کہ اور اکڑ رہی ہے آپ لوگ بھی اپنی خاموشی سے اسے شہہ دے رہے ہیں۔“

اس کے لفظ لفظ سے بے بسی اور دبا دبا غصہ جھلک رہا تھا۔ ایقان کو یک گونہ سکون کا احساس ہوا۔ عاشر کے آنے سے قبل ہی اس نے اپنی ماں اور بھائیوں پر واضح کر دیا تھا کہ فی الحال وہ اس کے ساتھ جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی اور یہ کہ اگر کسی نے اسے مجبور کرنے کی کوشش کی تو وہ کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ وہ ماں اور بھائیوں کی لاڈلی تھی۔ سب سے چھوٹی تھی اور ہمیشہ سے اپنی منوائی آئی تھی۔ اس وقت بھی اس کی دھمکی نے جیسے سب کے لب سی دیے تھے۔ یوں بھی ان کا گھر انہ اخلاقی قدروں کی اہمیت کو پہچاننے اور ان پر زور دینے والوں میں سے تھا۔ فاروق حسن اور سلجوق حسن کو ایقان کی ناراضی کی وجہ جان کر حقیقتاً ”دھچکا لگا تھا۔ انہیں عاشر سے اس بے راہ روی کی امید نہ تھی۔ دل ہی دل میں وہ ایقان کو درست جان رہے تھے۔

فاروق حسن نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر وہ جیسے انداز میں بولے۔

”دیکھیں عاشر میاں! آپ کہتے ہیں کہ آپ کا یہاں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ معذرت خواہ ہیں۔ حالانکہ اب تک جو کچھ آپ نے کہا اس ساری گفتگو میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کو معذرت خواہ ثابت کرتا ہو۔ آپ دنیا کے سارے مردوں کے ایک ہی صف میں کھڑا ہونے پر اصرار کر رہے ہیں جس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ اپنے کئے کو حق بجانب سمجھتے ہیں اور آپ کے خیال میں اس روش میں کوئی برائی نہیں ہے۔“

”میں نے ایسا ہرگز نہیں کہا بھائی میاں!“ وہ بھی قدرے نرم پڑا۔ ”میں تو بار بار یہی کہہ رہا ہوں کہ ٹھیک ہے مجھ سے غلطی ہوئی لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس ذرا سی بات کے پیچھے اپنا گھر خراب کیا جائے۔ میں اسے چاہتا ہوں۔ اپنے بچوں کو چاہتا ہوں۔ پھر یہ مجھے کس بات کی سزا دیا جا رہی ہے؟“

فاروق حسن نے اس کی بات مکمل ہونے پر سوالیہ نظروں سے ایقان کی جانب دیکھا تھا وہ اب ہونٹ چباتے ہوئے جیسے خود کو بہت کچھ کہنے کے لیے تیار کر رہی تھی۔

”بولو ایقان! فاروق حسن بولے۔

”بھائی میاں!“ وہ سکتے لہجے میں بولی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اگر معذرت خواہ ہیں بھی تو مجھے ان کی معذرت پر رتی برابر بھی یقین نہیں ہے۔ چور اگر چوری کرتے ہوئے پکڑا جائے اور اسی وقت معافی مانگ لے تو کون ہے جو یہ یقین کرے گا کہ آئندہ یہ چور مزید چوری کا ارتکاب نہیں کرے گا؟ اس نے تو پکڑے جانے پر ایک رسمی کارروائی کے طور پر ہی معذرت کی ہے نا؟ یہی حال ان کا بھی ہے۔ یہ چکر کتنا پرانا ہے کب سے چل رہا ہے، اور بات کہاں تک جا پہنچی ہے۔ میں کچھ کبھی نہیں جانتی۔ مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ میں نے ان کے رویے میں ٹھنچاؤ اور فرق محسوس کیا لیکن یہ مجھے جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ میں نے کئی بار ان سے وقت کی کمی کا رونا دیا یہ ہر بار کچھ نہ کچھ کہہ کر مجھے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے اور جب میں نے ایک واضح ثبوت ملنے پر انہیں یہ باور کرایا کہ میں بہت کچھ سمجھ چکی ہوں تب انہوں نے اعتراف جرم اس انداز میں کیا جیسے سر سے ہلا اتارتے ہیں۔ میرے نزدیک جو بات زندگی اور موت کا معاملہ ہے۔ ان کے لیے محض وقتی کھیل جسے بہت سے لوگ کھیلتے ہیں انہوں نے بھی کھیل لیا تو کیا برائی؟ معذرت اس کو کہتے ہیں؟ شرمندگی اس کا نام ہے؟ کیا گارنٹی ہے اس بات کی کہ کل کو یہ کھیل دوبارہ شروع نہ ہو گا؟ وہ حسین بلا وہاں جاپان میں ان کی دو روزہ جدائی برداشت نہ کر پائی۔ ان کے پیچھے وہ یہاں تک پہنچ گئی۔ یہ اسے لیے لیے پھرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہونٹوں میں عیاشیاں کرتے رہے۔

مجھ سے جھوٹ بولنے کہ آئندہ شروع کرنے والے بزنس کے متعلق معلومات حاصل کر رہے ہیں یا شاید یہی تھا ان کا ”آئندہ“ ہونے والا ”بزنس“ وہاں جاپان میں انہیں کس کا ڈر ہو گا؟ وہ حسینہ ہو گی۔۔۔ اور یہ ہوں گے میں یہاں ان کے بچے پالتی ہوں اپنی جان جلاتی رہوں، مکمل ٹھل کر رہ جاؤں یہ ہر سال دو سال بعد تشریف لائیں اور اپنا ”ہنسابستا گھر“ دیکھ کر خوشی خوشی اپنی دنیا میں واپس لوٹ جائیں۔ بس! ان کی معذرت خواہی کے پیچھے یہی خواہش کارفرما ہے۔“

ایقان کے لفظوں میں سچائی گونج رہی تھی۔ کمرے میں کافی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر عاشر نے گہری سانس بھرتے ہوئے اسے دیکھا۔

”جو کچھ تم نے کہا، سچ ہے۔ میں چاہتے ہوئے بھی اپنا دل کھول کر تمہیں دکھانے نہیں سکتا۔ تم میری کسی بھی بات پر یقین نہیں کرو گی۔ لیکن چلو یہ تو بتاؤ کہ تم اس مشکل کا کیا حل نکالتی ہو؟ اب جو ہوا، سو ہوا لیکن آئندہ کیا کیا جائے؟ میں حلف اٹھاؤں؟ نو کری چھوڑ کر تمہارے پاس گھر میں بیٹھا رہوں؟ کیا کروں میں؟ کیا چاہتی ہو؟“

”میں تم سے علیحدگی چاہتی ہوں۔“ وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ایک بجلی سی سب پر گری تھی۔ حقیقتہً حیات نے پھر رونا شروع کر دیا۔ دونوں بھائی بھی سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھے رہ گئے تھے۔

”اس غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں کبھی تمہیں طلاق دوں گا۔“ عاشر غصے سے تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔

”تمہاری حماقت اور تمہارے پاگل پن کی سزائیں اپنے بچوں کو کبھی نہیں دوں گا۔ سمجھیں تم؟“

”میں طلاق نہیں چاہتی!“ وہ اطمینان سے بولی۔

”میں اپنے بچوں سے“ تم سے زیادہ محبت کرتی ہوں۔ کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ یہ ایک بروکن فیملی کا حصہ کہلاؤں۔ لیکن یہ ہے کہ مجھ پر تمہارا کوئی حق نہیں ہو گا۔ قانونی طور پر تم سے وابستہ ضرور رہوں گی لیکن۔۔۔ لیکن عملی طور پر تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔“

وہ جھجک سی گئی تھی۔ بھائیوں کی موجودگی نے اسے بہت کچھ کہنے سے باز رکھا تھا۔ لیکن اس کے الفاظ کا منہ موم بے حد واضح تھا۔ عاشر ششدر رہی رہ گیا تھا۔

”ایقان!“ وہ قدرے بے بسی سے بولا۔ ”کیا کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”دوسرے یہ کہ میں اب تمہارے گھر میں نہیں رہوں گی میں یہاں رہوں گی“ ”حیات ولا“ میں بنے اپنے پورشن میں، لیکن اپنے بچوں کا ماہانہ خرچ تم مجھے دو گے کیونکہ بہر حال تم ان کے باپ ہو ان کے کفیل۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن تم اپنا گھر چھوڑ کر یہاں رہنا کیوں چاہتی ہو؟ جب میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو تمہیں وہاں رہنے میں کیا قیامت ہے؟“ وہ بالآخر ضبط کھوٹے ہوئے اس کے مقابل اٹھڑا ہوا۔

ایقان چند لمحوں اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی۔ اس کی نظروں کی بے بسی، جھنجھلاہٹ اور کچھ نہ کر پائے والی کیفیت سے وہ عجب مسرت سے ہمکنار ہوئی۔

”تمہارے گھر میں رہوں گی تو تم سے وابستہ رہنے کا احساس مجھے شکست و ریخت میں مبتلا رکھے گا۔ میں مسلسل اسی کیفیت میں گھری رہوں گی کہ میں یہاں رہ کر تمہارے گھر کی دیکھ ریکھ ایک باندی کی طرح کر رہی ہوں اور تم! تم وہاں کسی اور کی زلفوں کے سائے میں زندگی کی خوشیاں کشید کر رہے ہو۔ نہیں! میں اپنے گھر میں رہوں گی اس احساس کے ساتھ کہ میں اور میری زندگی ہر قید و بند سے آزاد ہیں۔ کسی کو میری پروا نہیں اور مجھے کسی کی پروا نہیں۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔ پہلا اور آخری۔ کسی رد و بدل کی توقع کے بغیر تم سے میرا تعلق صرف اور صرف ہمارے دو بچوں کی زندگی کے اہم معاملات تک محدود رہے گا۔ جب بھی پاکستان آؤ ان سے ملنے آجانا اور بس“

عاشر کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے جیسے دھند سی اتری۔ پھر اس نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔

”ٹھیک ہے۔۔۔“ وہ بولا تو اس کے لہجے میں دکھ کی گہری پڑچھائیں کے ہمراہ سرکشی کا تاثر بھی نمایاں تھا ”تم ساری زندگی ایک بیوہ۔۔۔ ایک مطلقہ کی سی محرومی میں مبتلا رہنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی۔ لیکن جیسے ہی تنہائی

کی رات میسر ہو تو یہ سوچنا کہ کس کو کتنا فرق پڑے گا۔“

وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے کے دروازے تک جا پہنچا۔ پھر لمحہ بھر کے لیے رک کر اس نے کمرے میں موجود افراد پر ایک نظر ڈالی۔

”صبح میری فلائٹ ہے۔ اب کب لوٹوں گا نہیں جانتا! میری طرف سے خدا حافظ۔۔۔ الوداع۔۔۔“

وہ کمرے سے نکل گیا۔ سب ہی نے دکھ کی گہری کیفیت میں ڈوب کر قدرے ملا متی نظریوں سے ایقان کی جانب دیکھا۔ جو پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ سب کی نگاہوں کو محسوس کر کے وہ اپنے آپ میں لونی تھی پھر جیسے ان نگاہوں میں موجود سوالوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ بھی تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔

”میری بچی۔۔۔“ شفیقہ حیات زار و قطار روئے لگیں تھیں۔ ”ٹھیک ہی تو کہہ گیا ہے وہ۔۔۔ شوہر والی ہو کر بھی بیوہ یا طلاق یافتہ کی زندگی گزارے گی۔۔۔ ارے کوئی اسے سمجھاؤ سبجوت۔۔۔ فاروق ارے تم لوگ بھی کچھ نہ بولے۔“

”کچھ نہیں ہوتا اماں!“ فاروق حسن نے کسی سوچ سے نکلنے ہوئے انہیں تسلی دی۔ ”ہوں سمجھیں کہ ایک طوفان تھا جو ٹل گیا۔ آج کی اس ملاقات میں ان دونوں نے ہی اس انتہائی قدم کو اٹھانے سے گریز کیا۔ جس سے میں خوف زدہ تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں یہی چاہت انہیں ایک دن پھر قریب لے آئے گی۔ ایقان نا سمجھ ہے لیکن میں بھی چاہتا ضرور ہوں کہ عاشر کو اس کے کیے کی کوئی نہ کوئی سزا ضرور ملنی چاہیے۔ ایقان کا فیصلہ ایک غلطی سے درست بھی ہے۔ آخر مرد کے لیے بھی خدا کی جانب سے مقرر کردہ حدود ہیں جن کا اسے پاس کرنا چاہیے۔ عاشر نے ایقان کو زمانہ قدیم کی کوئی بے بس ناخواندہ عورت سمجھا، غلطی کی ایقان اس کے نرم رویے اور واپس آجانے کے وعدے پر سمجھوتہ نہیں کرنا چاہتی۔ ساری عمر کی جدائی چاہتی ہے یہ بھی غلط۔ لیکن بہر طور جلد یا بدیر ان دونوں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گا۔ تب تک انہیں علیحدہ علیحدہ اپنی سوچوں سے نبو آزما رہنے دیں یہی دونوں کے لیے بہتر ہے۔“

شفیقہ حیات کے آنسو ٹھم گئے تھے۔ سبجوت حسن اور عذرا بیگم نے بھی مطمئن انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا فاروق حسن ماں کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

وہ سر جھکائے بے حد اذہمک سے اپنی کتابوں کا جائزہ لے رہی تھی جب انبیقہ کمرے میں داخل ہوئی۔

”ربیعہ۔۔۔“

ربیعہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ کارڈ لیس اس کی جانب بدھار ہی تھی۔

”تمہاری کسی دوست کا فون ہے۔“

ربیعہ نے قدرے اچھبے سے فون تھاما۔

”ہیلو۔۔۔“

”ربیعہ!“ دوسری جانب سے نہایت جوش و جذبے سے کہا گیا۔

ربیعہ کو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس کی تمام حسات بیدار ہو گئیں۔

”ترانہ۔۔۔ ترانہ۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ہاں ربیعہ! میں ہوں ترانہ، کیسی ہو تم ربیعہ تم؟ ٹھیک تو ہونا تم، تم خوش تو ہونا ربیعہ۔“ ترانہ بھی اس کی آواز سن کر اس سے زیادہ جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی آواز میں بے پناہ جوش تھا۔

ربیعہ کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے۔ کتنے عرصے بعد اس نے ترانہ کی آواز سنی تھی۔ کسی خونی رشتے کی مہک کو محسوس کیا تھا۔ سچی محبت کو بہت قریب محسوس کیا تھا۔

”ترانہ میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک ہوں۔ تم میرے لیے بالکل فکر مند مت ہونا تم، تم کیسی ہو گھر میں سب لوگ کیسے ہیں؟“

”بس ربیعہ۔۔۔ کیا بتاؤں تمہیں۔“ ترانہ دکھ سے بولی۔ ”یہ عرصہ کس طرح گزارا ہے میں نے۔ میرا دل

ہی جانتا ہے اور گھر والوں کا کیا پوچھتی ہو وہ سب ویسے ہی ہیں جیسا تم چھوڑ گئی تھیں۔“
”ترانہ! ربیعہ کو اس کی آواز سے گہرے دکھ کا اندازہ ہوا تو وہ بھی بے تحاشادھی ہوئی۔“

”ترانہ! میرے لیے تم نے بہت پریشانی اٹھائی ہے نا؟ میری وجہ سے صرف میری وجہ سے۔ میں یہاں سکون اور اطمینان سے ہوں اور تم ہم اپنے گھر میں ہی اجنبی بن کر رہ گئیں قیدی بن کر۔“ اس کی آواز زندہ گئی تھی۔
”ارے نہیں۔۔۔ نہیں ربیعہ۔“ ترانہ جلدی سے بولی ”تم جانتی ہونا۔ اتنی کمزور میں بھی نہیں ہوں کہ ہر کسی کی بری بھلی سہ جاؤں اور جتنی محبت مجھے تم سے ہے اس کے مقابلے میں یہ تھوڑی سی تکلیف اور پریشانی کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔ ہر کسی کو اس کے کیے کا پھل ملنا ہے ربیعہ۔ جیسے ابا کو ان کے کیے کا پھل ملا ہے۔“
”پھر تمھارے کیا ہوا انہیں؟“

”پھر تمھیں بتاؤں گی ربیعہ۔۔۔ ابھی اتنا وقت نہیں ہے۔ میں اپنی دوائی کا بہانہ بنا کر گھر سے تھوڑی دیر کے لیے نکلی ہوں۔ تمدن اور تصور ہمہ وقت میری پیڑے داری کرتے ہیں تاکہ مجھ سے انہیں کسی طرح تمھارا سراغ مل سکے۔ میں صرف تمھاری خیریت جاننا چاہتی تھی۔ تم ہم خوش ہونا ربیعہ؟“
”ہاں ترانہ! میں ٹھیک ہوں بالکل۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا ہے میں نے اور عباد بھائی کے گھر والے بہت اچھے لوگ ہیں۔ میرے ساتھ بالکل اپنوں کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔“
”خدا کا شکر ہے۔“ ترانہ سچی خوشی سے معمور ہو کر بولی تھی۔

”اور تم ترانہ؟“ ربیعہ نے جلدی سے پوچھا۔
اسی وقت لائن منقطع ہو گئی۔ ربیعہ نے گہری سانس بھر کر فون کی جانب دیکھا پھر عقیدت و محبت سے اسے چوم لیا۔



شہلا نے ایک نگاہ چاروں جانب ڈالی تھی۔ دو کمرے، چھوٹا سالانج اور اس سے ملحقہ کچن! وہ ایک چھوٹے سے رقبے پر بنی ہوئی انیکسی یا ایک قدرے بڑے گیٹ روم کی مانند تھا۔
”تو تم نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے؟“ اس کی نگاہ ہر جانب سے ہو کر سامنے بیٹھی ہوئی ایقان کے چہرے پر آئی۔
”تمھارے خیال میں یہ ایک غلط فیصلہ ہے؟“ ایقان نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے سوال کیا۔
”پتا نہیں ایقان۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ”ہر مسئلہ ایک دائرے کی مانند ہوتا ہے۔ دائرے کے اندر موجود شخص کو وہ اور طرح سے دکھائی دیتا ہے اور دائرے سے باہر موجود شخص کو اور طرح سے۔ اور دائرے کے باہر جو لوگ موجود ہوتے ہیں وہ دائرے کے اندر موجود شخص کی کیفیت کو پوری طرح سے نہیں سمجھ پاتے۔“
”پھر تمھیں۔۔۔“ ایقان نے اصرار کیا۔ اپنا نقطہ نظر تو ہوتا ہے نا۔ تم کیا کہتی ہو؟“
”ایک عورت ہونے کے ناتے میں اس انا کو سمجھ سکتی ہوں ایقان! جس نے تمہیں ایسا کرنے پر مجبور کیا لیکن ایقان ایک دن اپنی اسی انا کا گلا عورت اپنے ہاتھ سے گھونٹتی ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں۔“

”تم مجھے بھی اچھی طرح سے جانتی ہو شہلا! ایقان ضدی پن سے بولی۔
”ہاں!“ اس نے گہری سانس لی۔ ”تمہیں بھی جانتی ہوں۔ اسی لیے کچھ بھی کہنے سے گریز کر رہی تھی۔ تمھاری انا کی سطح عام انسان کی سطح سے بلند ہے میں سمجھتی ہوں۔“

”شہلا، شہلا تم جانتی ہو گواہ وہ تم میں نے اتنے سالوں سے کتنا بے تحاشا چاہا ہے۔ ہر لمحہ ہر بل اس کا خیال دل و دماغ میں اس طرح پیوست رہا کہ اور کچھ سوچنے یا غور کرنے کی میں نے ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ اس کی جدائی میں اس کی قوت اور اس کی قوت میں اس کی جدائی کے بارے میں سوچتی رہی اور“ اور اس نے اس نے میری محبت، میرے اعتبار و اعتماد کی دھجیاں اس قدر آسانی سے بکھر دیں؟ وہ عورت کتنی ہی حسین ہو لیکن وہ۔۔۔ وہ ایقان تو نہیں تھی۔ وہ اس کی محبت تو نہیں تھی۔ کیسے اس کا دل مانا کہ وہ اس کے قریب جائے۔ کیسے اس کے ضمیر نے گوارا کیا کہ وہ اسے چھوئے اس سے وہ باتیں کہے جو کبھی اس نے مجھ سے کیں۔“

”ہو سکتا ہے ایقان یہ تمہاری غلط فہمی ہو۔“ شہلا نے کمزور سے لہجے میں کہا تھا۔ ”اس عورت نے عاشر بھائی کو مجبور کر دیا ہو۔“

”کن پوائنٹ پر؟“ ایقان نے طنز سے اس کی بات کاٹی۔ ”دینا کی کوئی طاقت مجھے اس بات پر قائل نہیں کر سکتی کہ کسی عورت نے کسی مرد کو مجبور کر دیا۔ یہ صرف اور صرف مرد کے اندر چھپا شیطان ہے جو مخالف کو راضی برضا دیکھ کر کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اس نے مجھ سے بے وفائی کی ہے۔۔۔ یہ بات روشنی کی مانند عیاں ہے مجھ پر اور اور میں اب اس کے قریب نہیں جاسکتی۔ مجھے ہمیشہ اس کے ہاتھوں سے اپنے جذبوں کے خون کی بو آئے گی۔ مجھے مجھے اس کی سانسوں سے کسی دوسری عورت کے وجود کا۔“

وہ بات مکمل نہ کر پائی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر رودی۔ شہلا متاسف نظروں سے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔ پھر اس نے ایقان کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

”مت رو ایقان۔۔۔ مضبوط فیصلے کرنے والوں کو پہلے اپنے آنسوؤں جیسی کمزور شے کو مات دینی پڑتی ہے۔ اگر تم واقعی یہی سمجھتی ہو کہ تمہارا فیصلہ درست ہے اور اعلیٰ ہے تو پھر اپنے آنسوؤں کو یہ باور کروا دو کہ یہ ہمیشہ تمہارا اور تمہارے فیصلے کا منہ چڑاتے رہیں گے۔ تمہیں جتنا تے رہیں گے کہ تمہارا فیصلہ غلط تھا۔“

”کبھی نہیں۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے آنسو پونچھ لیے۔

”اور ایقان! کوشش کرنا، تمہارے معصوم بچوں کے ذہنوں میں قبل از وقت وہ سوال نہ اٹھیں جو انہیں بھی پریشان کر دیں اور تمہیں بھی۔ انہیں یہ احساس مت دلانا کہ ان کے باپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کی پاداش میں انہیں یہ ہجرت کرنی پڑی ہے۔ میں میں معصوم سوالوں کے درد سے آشنا ہوں اسی لیے تمہیں یہ مشورہ دے رہی ہوں۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“ ایقان نے سر جھکا لیا۔

”میں اب چلوں۔“ شہلا کھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اسپتال سے سیدھی تمہارے پاس ہی چلی آئی تھی۔ سب ہی تمہارے مسئلے سے ڈسٹرب ہوئے ہیں ہیں نا۔“

”ظاہر ہے۔۔۔“ وہ افسردگی سے مسکرائی۔ ”میرے اپنے ہیں۔۔۔ میرے دکھ پر لازماً دکھی ہوں گے۔ ہر کوئی تسلی اور دلاسا دینے آیا ہے۔ ہاشم بھی آیا تھا ہاشم تو تم جانتی ہو مجھ سے کچھ زیادہ ہی اٹیچ ہے۔“

”ہوں۔۔۔“ شہلا ہلکا سا مسکرائی۔

ایقان نے اس کا چہرہ دیکھا پھر کچھ دیر دیکھتی رہی۔

”شہلا۔۔۔ ایک بات پوچھوں؟“

”ہاں۔۔۔“ وہ چونکی۔ ”ضرور۔“

”تمہیں ہاشم سے میرا مطلب ہے ڈیو لوہم؟“ اس نے پچھتے ہوئے پوچھا۔ شہلا لمحہ بھر کے لیے حیران ہوئی جیسے اسے ایقان کی جانب سے اس سوال کی امید نہ تھی۔ پھر وہ کھل کر مسکرا دی تھی۔

”ہی از ریکی آئڈ مین!“ وہ ٹھٹھکی سے بولی۔

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ ایقان نے قدرے غٹکی سے اسے دیکھا۔

”تمہارے سوال کا جواب کیا ہے مائی ڈیر فرینڈ۔۔۔ یہ شاید میں خود بھی نہیں جانتی۔“ اس نے ایقان کا سر ہلایا۔

”جس دن مجھے مل گیا۔ اس دن تمہیں بھی ضرور ملے گی۔ ٹھیک ہے؟“

ایقان اس کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔



چھوٹے سے پارک کی پختہ روش پر وہ دونوں ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ راستے میں بڑے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو جوتے کی ٹوک سے اڑاتے ہوئے بے فکری سے چپس کھاتے ہوئے منظر کا دل و دماغ بے حد فریش تھا۔ نافعہ بات پوری شدت سے محسوس کر رہا تھا اور اسے اس بے فکری اور فریش نیس کا پس منظر بھی معلوم تھا۔ کل

ہی اس کی متکلی اس کی پسند سے اس کی پھپھی زادے ہوئی تھی۔ نافع نے بھی اس فنکشن میں شرکت کی تھی اور وہ جانتا تھا کہ منظر صرف خوش نہیں بلکہ بے حد خوش ہے۔
منظر سے اس کی دوستی زیادہ پرانی نہ تھی۔ ابھی چند ماہ قبل ہی دونوں کی ملاقات ہوئی تھی اور پڑھائی کے سلسلے میں وہ ایک دوسرے سے کافی قریب ہو گئے تھے۔
کسی رومانوی گانے کی دھن پر سٹی بجاتے ہوئے وہ بیچ پر جا بیٹھا تھا۔ نافع بھی خاموشی سے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ منظر نے یکجہت سٹی بجانا موقوف کر کے اسے دیکھا۔
”کیا بات ہے؟ آج گھر پر وال پکی ہے کیا؟“
”نہیں تو۔۔۔“ نافع لمحہ بھر کے لیے گڑبڑا سا گیا۔ ”کیا مطلب؟“
”کدو؟“

”کیا ہے یار۔۔۔“ وہ جھلا گیا۔ ”تم سے کس نے کہا کہ میں تمہاری دعوت کر رہا ہوں۔ میرے گھر پر کیا پکا ہے اس سے تمہیں کیا مطلب؟“
”مجھے اس سے مطلب نہیں۔۔۔ میں تو محض تمہاری سنجیدگی، خاموشی اور افسردگی کے جملہ اسباب جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔“
”تمہیں کس فرشتے نے خبری کہ میں افسردہ ہوں؟“ وہ مزید جھلایا۔
”سنجیدہ اور خاموش تو ضرور ہوں۔ اس سے تو انکار نہیں کر سکتے نا؟“ وہ مسکرایا۔
”سنجیدہ اور خاموش ہو گیا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اس کی تردید چاہتا بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ منظر کی شگفتگی اور خوشی سے نافع خاموش ہو گیا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اس کی تردید چاہتا بھی تو نہ کر سکتا تھا۔ منظر کی شگفتگی اور خوشی سے اس کے اندر عجب ملال سے اتر آئے تھے۔ وہ بہت سے سوالوں کے درمیان گھر گیا تھا اور یہی اس کی خاموشی کا سبب بھی تھا۔

”دعوتیں سوچ رہا تھا۔“ اس نے یونی گھر کر بات سنائی چاہی۔ ”کہ تم، تم، آج بہت خوش نظر آتے ہو۔“
”ہاں تو میں ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”وجہ محض کل کی تقریب ہی ہے یا کچھ اور بھی؟“ وہ روکھے پن سے بولا۔
”اے بے بدھو!“ منظر نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ ”یہ وجہ تمہارے نزدیک محض ہے؟ میری متکلی، ہوئی ہے یا میری پسند۔۔۔ کتنی بڑی وجہ ہے خوشی کی۔ جسے تم محض قرار دے رہے ہو۔ ویسے بانی داوے تمہارا بھی تو نکل ہو گیا ہے نا۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ اس نے بے دلی سے ہنکارا بھرا۔
”خوش نہیں ہو شاید؟“ منظر نے اس کا چہرہ پڑھا۔
”نہیں۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں ہے میں نے تو کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔“
”اب بناؤ مت یا تم کوئی فرشتہ ہو؟ انسان ہو ہمارے جیسے اور یہ رشتہ تو ہوتا ہی انوکھا ہے۔ دنیا کے ہر رشتے سے الگ ہر محبت ہے جدا۔“

”چتا نہیں۔۔۔“ نافع کے انداز میں دکھ اتر آیا تھا۔ ”میں نے کبھی اس طرح کی محبت کو محسوس نہیں کیا۔“
”کیوں؟ گدھے ہو کیا؟“

نافع نے خفگی سے اسے دیکھا تو وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔
”کمال آدمی ہو یا رہا محبت کی لطافت اور ندرت سے انکاری ہو۔ خیر شاید ابھی ہم اتنے کلوز نہیں ہوئے کہ تم اپنے اندر کی باتیں آشکار کرنے کے لیے میرا انتخاب کرو لیکن اتنا ضرور ہے کہ تمہارے اندر کچھ ہے ضرور کوئی غبار، کوئی جھس زدہ سوچ۔“ پھر اس نے سوچ میں ڈوبے خاموش بیٹھے ہوئے نافع کے کاندھے پر جھکی دی۔
”جب بھی برسنا چاہو میرا آگن حاضر ہے۔“
نافع نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔

ہاتھوں میں کتابیں تھامے وہ بے حد مصروف سے انداز میں باہر نکلتا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ سامنے سے آتی ہوئی وردہ پر پڑی۔ وردہ نے بھی رافع کو جھٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ پھر وہ رافع کے سامنے آرکی۔

”آپ یونیورسٹی جا رہے ہیں نا؟“

”ہاں۔۔۔“ وہ بولا ”آج پچیس جمع کروانا ہے۔ تم؟“

”میں آج نہیں جاؤں گی۔۔۔“ وہ سست سے انداز میں بولی۔ ”ایقان خالہ کی وجہ سے کچھ بھی اچھا محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ آپ پلیز ایک پیغام پانچواں گے؟“

”ہوں؟“ وہ چونکا۔ ”ہاں ضرور لو۔“

”وہ ربیعہ میرا انتظار کر رہی ہوگی، ہم دونوں ساتھ ہی نکلتے ہیں نا۔۔۔“

”ربیعہ؟“ رافع کے لب دھیرے سے ہلے اور چرے نے نئی رنگ بدلے۔

وردہ نے اس کا چہرہ دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

”آپ کو دیر ہو رہی ہو تو کوئی بات نہیں۔ میں خود چلی جاتی ہوں اسے بتانے۔“

”ارے نہیں۔“ رافع مسکرایا۔ ”میں تمہارا پیغام دے دیتا ہوں ڈونٹ وری۔“

”تھینک یو۔“ وہ ممنونیت سے مسکراتے ہوئے کرپٹ گئی۔

رافع مرکزی گیٹ کی جانب بڑھ گیا تھا۔ سیاہ سڑک پر آہستہ روی سے چلتے ہوئے وہ نجانے کیا کچھ سوچ رہا تھا۔ کیسے رستے تھے یہ جولا کھ کریز کرنے پر بھی ایک ہی سمت کو جانگھٹتے تھے۔ کتنے دن لگتے تھے دل کو سمجھانے میں اور بل بھر میں وقت پھر اسے اس کے سامنے لا کھڑا کرتا تھا۔ اسے دیکھ کر لفظ سے لفظ جڑنے لگتے تھے۔ تخیل کا سیل رواں بہا کر کہاں سے کہاں لے جایا کرتا تھا اور اس کی سوچ ایک کمزور تنکے کی مانند جھٹکتی پھرتی تھی۔ یکدم رافع ٹھک کر رک گیا۔ سفید بنگلے کی دیواروں پر چڑھی ہری بیلوں نے اس کے قدم روک لیے تھے۔ وہ آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔

لکڑی کے چھوٹے پھانک کے قریب ربیعہ کھڑی تھی۔ لیسن کمر کے کپڑوں پر بڑا سا سفید دوپٹہ اور سفید اسکارف لیے وہ موم سے بنی ہوئی گڑیا لگ رہی تھی۔

اس کا دھیان رافع کی جانب نہ تھا۔ وہ سڑک کے پار گھنے درختوں کے عقب میں چھپے پارک کی سمت دیکھ رہی تھی۔ نجانے وہ اس قدر انہماک سے کیا سوچ رہی تھی۔

رافع اس کے قریب پہنچ کر ہولے سے کہنا کھا را۔ ربیعہ بری طرح سے چونک اٹھی۔

”آپ؟“ اس کے لب حیرانی سے یوں ہلے تھے جیسے رافع کا سامنے ہونا۔ اس کے لیے بے حد باعث حیرت تھا۔

رافع تو نجانے کیوں خوش قسمتی سی ہوئی۔ شاید وہ اسی کو سوچ رہی تھی تب ہی اسے سامنے پا کر یوں حیران سی ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

”وعلیکم السلام۔۔۔“ ربیعہ بھی اپنی کیفیات پر قابو پا کر شگفتگی سے مسکرا دی۔

رافع کو یوں لگا تھا جیسے وہ صبح مزید خوب صورت، مزید چمکی ہوئی تھی۔

”یونیورسٹی جانے کی تیاری میں ہیں؟“ اس نے ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

”تیاری تو کب کی ہو چکی، میں وردہ کا انتظار کر رہی ہوں وہ اب تک نہیں آئی۔ پوائنٹ نکل جائے گا۔“

”وردہ کا ہی پیغام ہے آپ کے لیے؟“ وہ آج یونیورسٹی نہیں جائے گی۔“

”وہ۔“ ربیعہ یکدم پریشان سی ہو گئی۔ ”لیکن کیوں؟“

”یہ تو میں نہیں جانتا شاید ناسازی طبع اس کی وجہ ہو۔“
 ”اچھا!“ ربیعہ یایوس سی ہوئی۔ پھر میں بھی نہ جاؤں۔“ اس نے جیسے خود کلامی کی تھی۔
 ”مشورہ مانگ رہی ہیں؟“ رافع شوخی سے مسکرایا۔
 ربیعہ چونکی بھر دھیرے سے ہنسی۔

”نہیں۔ بلند آواز میں سوچ رہی ہوں۔“
 ”ویسے میں یونیورسٹی ہی جا رہا ہوں۔ مجھے تھیسس کے سلسلے میں تھوڑا کام ہے۔“
 ربیعہ اس کا مطلب سمجھ کر چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی تھی۔ پھر وہ لکڑی کا پھانگ کھول کر باہر نکل آئی۔
 ”جب ایڈمیشن لے لی لیا ہے تو کبھی کبھار اکیلے کلاس اینڈ کرنے کی عادت بھی ہونی چاہیے۔“ وہ بولی۔
 ”گلد۔“ رافع نے سر ہلایا۔

دونوں صاف ستھری سڑک پر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ رافع نے ایک مرتبہ پھر صبح کی تازگی اور خوب صورتی کو پوری طرح سے محسوس کیا۔ سورج ابھی ٹھیک طرح سے طلوع نہ ہوا تھا۔ آسمان کا رنگ نظروں کو اپنی جانب کھینچتا تھا۔ پارک کی جانب سے آتی ہوئی ایک سنگ مختلف درختوں کی ملی جلی خوشبو کھینچ لاتی تھی۔
 ”کئی دنوں سے آپ۔۔۔ پارک میں نہیں آئیں۔ کیا صبح کی سر سے جی بھر گیا؟“
 ”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ میں چپل قدمی تو کرتی ہوں لیکن گھر کے لان میں ہی شوق پورا کر لیتی ہوں۔“
 ”اچھا۔۔۔“ رافع ہنسا۔ ”میں بے وجہ ہی منتظر۔“

وہ اچانک ہی خاموش ہوا تھا۔ بے خودی میں گھر کر نچا۔ زبان کہا کہنے چلی تھی۔ لیکن قابو پا رہا تھا۔
 ”دیر ہو گئی تھی۔ لفظوں کا مفہوم پوری طرح سے عیاں ہو گیا تھا۔ رافع جی ہی جی میں بے حد شرمندہ ہوا۔ اس سے پھر کچھ بھی نہ بولا جا سکا۔

دوسری جانب ربیعہ بھی سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کو اپنے چہرے پر لمبی گرمی محسوس ہوئی تھی۔ ان ادھورے لفظوں کا مفہوم کیا تھا؟ وہ سمجھ کر بھی نا سمجھی کی کیفیت میں مبتلا ہو گئی۔ تب ہی مین سڑک پر آتے ہوئے پوائنٹ کو دیکھ کر دونوں کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔
 ”خدا حافظ!“ ربیعہ نے رسمی سا مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”خدا حافظ!“ رافع کے لب زرا سا ہلے۔
 وہ اب تک اپنے کمرے پر شرمندہ تھا۔



وہ راؤنڈ مکمل کر کے لوٹی تھی۔ ڈیوٹی روم فی الوقت خالی پڑا تھا۔ شملانے انٹر کام پر چائے کے لیے کہا اور بیٹھ کر ضروری فائلز دیکھنے لگی۔ تب ہی اس کا موبائل بجنے لگا۔ شملانے چمکتی اسکرین دیکھی۔ کال انیوٹیک تھی۔
 ”ہیلو۔“ اس نے کال ریسیو کی۔

”ہیلو آپنی۔!“ دوسری جانب لہجے سے فکر مندی جھلک رہی تھی۔
 ”ہاں ایفہ بولو۔ کیا بات ہے؟“ وہ یکدم متفکر ہوئی۔
 ”وہ میں عمر کو لینے اسکول گئی تھی۔“
 ”تو پھر؟“ اس کا دل دھڑکنے لگا۔

”وہاں ابراہم جی موجود تھے وہ عمر کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“
 شملہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”ساتھ۔ کیا مطلب ساتھ لے گئے ہیں۔ کیوں لے گئے۔ تم نے تم نے عمر کو جانے کیوں دیا۔“

”اوہ آبی! اتنی زیادہ ٹنشن نہ لیں۔“ وہ نرمی سے بولی۔ ”آپ تو جانتی ہیں عمر مسلسل ان سے کانٹھکٹ میں رہتا ہے عمر نے ان سے فرمائش کی تھی گھمانے پھرانے اور شاپنگ کروانے کی اس نے مجھے خود بتایا کہ وہ پہا کے ساتھ جانا چاہتا ہے میں پھر کیا کہہ سکتی تھی۔“

”اوہ انیقہ۔۔۔ تم نہیں جانتیں یہ شخص مسلسل عمر کی برین واشنگ میں لگا ہوا ہے۔ نجانے کیا کر کے رہے گا یہ۔“ وہ بے حد پریشان ہو چکی تھی۔

”اور عمر۔۔۔ یہ لڑکا تو میرے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔ میں اسے کتنا سمجھاتی ہوں لیکن۔۔۔“ اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی رہ گئے۔ اس کی مائٹی ڈاکٹر زورواڑہ کھول کر ہنسی مسکراتی اندر آ رہی تھیں۔

”واپسی کے متعلق کیا کہا اس نے؟“ اب اس نے قدرے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ابرا بھائی کہہ رہے تھے وہ اسے دو دن بعد چھوڑ جائیں گے۔“ وہ دم سا بولی۔

”دو؟ دو دن؟“

”جی ہاں یوں بھی ویک اینڈ ہے۔ عمر کی چھٹی بھی ہے اسکول سے۔ ویسے آپ پریشان نہ ہوں آبی! عمر تو بے حد خوش تھا۔ اس نے مجھے بالکل لفٹ نہیں کروائی۔“

”ہم نہیں جانتیں انیقہ۔۔۔؟ وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔ ”چلو ٹھیک ہے بعد میں بات کرتے ہیں۔“

”اوکے خدا حافظ!“

سلسلہ منقطع کر کے اس نے موبائل ایک طرف رکھ دیا۔

”ینی پرا بلم؟“ اس کی ساتھی کو لینگ نے جیسے اس کا چہرہ پڑھا تھا۔

”نفس۔ ناٹ ایٹ آل۔“ وہ اپنے چہرے کے تاثرات درست کرتے ہوئے مجبوراً مسکرائی تھی۔



”پہا۔۔۔ یو آر گریت!“ وہ بے حد خوش تھا۔

یٹرنی آپریٹڈ گاڑی میں وہ بڑے سے لان کے کیتے ہی چکر کاٹ چکا تھا۔ ابرار نے اس کی فرمائش کے مطابق اس کو ہر چیز کے کردی تھی۔ کئی ہزار کی شاپنگ کروائی تھی اور اب وہ اپنی چیزیں دیکھ دیکھ کر بے حد خوش ہو رہا تھا۔

”اچھا۔۔۔ اب آجاؤ۔۔۔ بہت دیر ہو گئی ہے تمہیں کھیتے ہوئے۔۔۔ کھانا کھاتے ہیں۔“

”پہا! تھوڑی دیر اور۔۔۔“ اس نے التجائی۔ ”تنا مزہ آ رہا ہے کتنا بڑا لان ہے آپ کا۔ اس میں تو گاڑی چلانے کا مزہ آلیا۔“

”کھانا کھا لو پھر چلا تے رہنا۔“ اس نے سمجھایا۔

عمر گاڑی سے نکل کر اس کے پاس چلا آیا۔ دونوں ماربل کے چکنے فرش پر چلتے ہوئے اندر کی جانب بڑھے۔

”پہا۔۔۔ کتنا بڑا گھر ہے آپ کا۔ اور اتنا اچھا۔“ وہ مرعوب ہو رہا تھا۔ ابرار نے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا اور اس کا گال چوما۔

”یہ گھر میں نے آپ کے لیے خریدا ہے میری جان!“ وہ بولا تھا۔ ”یہ میرا نہیں آپ کا ہے۔“

”لیکن میں تو تانوب کے گھر رہتا ہوں۔“ میرا گھر تو وہ ہے۔“

دونوں بڑا سالانہ عروج عبور کر کے، گلاس ڈور کھول کر ڈائننگ ہال میں چلے آئے۔ ابرار کے ملازم نے ڈائننگ ٹیبل پر کئی طرح کے کھانے چن دیے تھے۔ ابرار نے اسے ایک کرسی پر بٹھادیا۔

”نانو کا گھر کبھی بھی بچوں کا گھر نہیں ہوتا عمر۔!“ وہ اس کی پلیٹ میں روٹ پیس رکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت اتری۔

”بچوں کا گھر۔۔۔ ان کے پہا کا گھر ہوتا ہے۔“

”ادہاں یاد آیا پہلے بھی آپ نے بتایا تھا“ وہ خوش ہوا۔ ”پھر تو میرا گھر یہ ہے نا پہا؟“

”ہاں میری جان! میں نے کہنا ہی تمہارا گھر ہے۔“ وہ اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے لگا۔
 ”لیکن پیپا! یہاں تو صرف آپ رہتے ہیں اکیلے۔ میں تو نانو کے ساتھ سوتا ہوں یا پھر ربیعہ خالہ کے۔ اتھ۔ میں
 یہاں کیسے سوؤں گا؟“

ابرار نے اس کی جانب دیکھا اور دھیرے سے مسکرایا۔
 ”میرے ساتھ سونا۔“

”ہاں پیپا! وہ نیم دلی سے بولا۔“ لیکن مجھے کہانی سے بغیر نیند نہیں آتی نا۔“

”میں نہیں ڈھیر ساری اسٹوری بکس دلوؤں گا۔۔۔ روز بڑھا کر نا۔“

”ایسا کیوں نہ کریں پیپا۔ انا تو ربیعہ خالہ اور خالہ جانی کو بھی یہاں لے آئیں۔“ اسے نئی ترکیب سوچی تھی۔
 ”کتنا مزہ آنے کا سب لوگ مل کر رہیں گے۔“

”مما کا نام نہیں لیا تم نے۔۔۔؟“ ابرار نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ ”تمہاری ممما کو یہاں لے آئیں تو کیسا
 رہے؟“

عمر ایک دم خاموش ہوا تھا۔ وہ روٹ پیس کانٹے سے توڑنے لگا۔ ابرار نے اس کے انداز کو بطور خاص دیکھا۔
 ”بولو عمر۔۔۔؟“ اس نے اصرار کیا۔ ”تم نے جواب نہیں دیا۔“

”پیپا! مجھے تھوڑے سے چاول دیں نا۔۔۔“
 ابرار نے اس کی پلیٹ میں چاول ڈالے اور اپنا چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر وہ چاول کھاتے عمر
 کو غور سے دیکھنے لگا۔

”عمر!“

”جی پیپا!“

”آپ اپنے پیپا کی بات کو انور کر رہے ہو جانو؟“

”نہیں پیپا یہ بات نہیں ہے۔“ وہ آہستہ سے بولا۔

”پھر کیا بات ہے؟ مجھے کچھ بتاؤ۔۔۔“

”وہ۔۔۔ ممما کہتی ہیں اپنے پیپا سے میری باتیں بالکل مت کرنا۔ اگر پیپا کوئی بات کہیں بھی تو تو تم خاموش رہنا۔“
 ”ہوں!“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اصل میں جانو بات یہ ہے کہ آپ کی ممما ہم سے ناراض ہیں اسی

لیسے۔“

”انہوں نے ہاشم انکل سے شادی کر لی؟“ وہ بے ساختہ ہی بولا تھا۔ ابرار اس کا چہرہ دیکھ کر رہ گیا۔
 ”لیکن پیپا! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب وہ ہاشم انکل کی دلہن بن کر ان کے گھر چلی گئی ہیں۔ اگر آپ نے

انہیں یہاں لانا تھا تو آپ ان سے شادی کرتے۔ اب وہ یہاں نہیں آسکتیں۔“

ابرار گم صم سا ہو کر اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

”اور آپ بھی ان کی باتیں نہ کریں پیپا! ممما ناراض ہوتی ہیں۔“ اس نے بے حد مدبرانہ انداز میں گویا اسے
 سمجھایا تھا۔

ابرار دھیرے سے مسکرایا پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے رخسار پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

”ڈونٹ وری عمر! تم دیکھنا ایک دن ہم تمہاری ممما کو منالیں گے۔“

”ریٹلی؟“ اس کی معصوم آنکھیں چمک اٹھیں تھیں۔ ”ممما ممما مان جائیں گی پیپا؟“
 ”شیور!“

”لیکن۔۔۔ وہ ہاشم انکل؟“ اسے یکدم پھر باؤسی نے گھبرا۔

”م نہیں بھی دیکھ لیں گے۔۔۔“ وہ بڑبڑایا تھا۔

راجہ بیگم اور وردہ کے تو ہاتھ پیر ہی پھول گئے تھے۔ نئے ماڈل کی چمکتی گاڑیوں میں سے ان سے زیادہ چمکتی ہوئی خواتین برآمد ہوئی تھیں۔ فریج چونکہ پہلے بھی آچکی تھی لہذا تعارف کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر ہی تھی۔
 ”آئی۔! یہ میری بھالی ہیں ہدیٰ اور یہ میری بڑی بہن ہیں سلیمہ۔۔۔ اور یہ پیاری سی خاتون ہماری چھٹی وردانہ ہیں۔“

راجہ بیگم نے از حد خوش دلی اور خندہ پیشانی سے ان سے سلام دعا کیا اور انہیں ڈرائنگ روم کی جانب لے کر بڑھیں تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ اندر سے نکلیں اور وردہ کی جانب بڑھیں۔
 ”وردہ! ائمہ جلدی سے جا کر اماں کو لے آؤ اور عذر اُبھائی کو بھی بلکہ فردوس آپا کو بھی لے آؤ تو بہتر ہے۔ میرا خیال ہے اس موقع پر ان لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے!“
 ”جی امی۔! وردہ خوش بھی تھی اور اچانک بڑنے والی افتاد پر قدرے پریشان بھی۔
 ”ناعمہ سے کہنا اپنا اول جلول جلد درست کر کے سامنے آئے بلکہ اس کے کپڑے تم ہی نکال کر جاؤ۔ وہ دوس برس پرانا کوئی ملگجاسا لباس پہن لے گی۔“
 ”جی امی!“ وردہ سر ہلاتے ہوئے اور جانے کے لیے مڑی۔
 ”اور سنو۔۔۔“

وردہ نے پلٹ کر دیکھا۔
 ”ایقان کا تو میں بھول ہی گئی۔“ وہ قدرے شرمندگی سے بولیں۔ ”اسے بھی لے آؤ۔ یوں بھی بے چاری نہ جائے کن سوچوں کا شکار رہتی ہے آج کل۔“
 ”جی امی۔!“ وردہ پھر مڑی تھی۔
 ”اور سنو۔۔۔“

”اب کیا ہے۔“ اسے ہنسی آگئی۔ ”کہہ بھی چکیں۔“
 ”ارے کچھ ان کی مدارات کا بھی بندوبست کرنا ہے کہ نہیں۔“ وہ مدھم آواز میں بولی تھیں۔
 ”نافع کو پیسے اور لسٹ دیٹی آؤ اور اس سے کہنا فافٹ لے آئے۔ تم تب تک چائے دم دے لینا۔“
 ”جی امی۔!“ وہ تابعداری سے بولی ”اب میں جاؤں؟“
 ”ہیں؟“ وہ اس کی غیر موجودگی کے تصور سے خائف سا ہوئیں۔ ”جاؤ مگر دس منٹ میں واپس آنا۔۔۔“
 ”جی اچھا۔۔۔“ وہاں کو اتنا پریشان دیکھ کر محبت سے بولی تھی۔
 تھوڑی ہی دیر میں ان کے چھوٹے سے پورشن میں گویا تقریب کا سا سماں ہو گیا تھا۔ شفیقہ حیات اور عذرا بیگم کے ہمراہ خوشی خوشی مٹھی اور سدرہ بھی چلی آئی تھیں اور اب بچن میں وردہ کے ساتھ مصروف کار تھیں۔ ایقان اور فردوس بیگم بھی موجود تھیں۔ فردوس بیگم کی تیوریاں ان کی از حد تشویش کو ظاہر کر رہی تھیں جنہیں دیکھ دیکھ کر لڑکیاں منہ چھپا کر ہنس رہی تھیں۔
 ”اے وردہ! بات سنو۔“ وہ بچن میں چلی آئیں۔

”جی ممائی جان! کہیں کچھ چاہیے آپ کو؟“ وہ تیلی کوئی کوزی سے ڈھانچتے ہوئے بولی۔
 ”اے ہو! کچھ نہیں چاہیے۔ یہ بتاؤ یہ لوگ پہلے بھی آئے ہیں کیا؟“
 ”سب تو نہیں البتہ فریج ایک مرتبہ آئی تھی۔ ثانیہ! پلیریز برتن ٹرائل میں لگا دو۔۔۔“ وردہ نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے ثانیہ کو ہدایت بھی دی۔

”دیکھنے آئے ہیں یا باقاعدہ رشتہ ہی ڈال رہے ہیں۔“
 ”مجھے خبر نہیں ممائی جان!“ وہ مسکرا دی۔ ”میں تو تب سے کچن میں ہوں۔ اندر کیا بات چیت چل رہی ہے مجھے خبر نہیں۔ لیکن آپ تو اندر سے ہی آ رہی ہیں نا!“

”ارے ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آیا ان کے انداز تو ایسے ہیں جیسے گنگی ہوئے جی مدت گزر رہی ہو۔ اب تم لوگ کچھ چھپاؤ تو ہمیں کیا خبر!“
 ”ورہہ“ تنخیرہ گئی۔ وہ اپنی بات کہہ کر پھر پلٹ کر ڈرائنگ روم کی سمت چل پڑی تھیں۔
 ”دیکھا تم نے؟“ ”ورہہ“ ثانیہ کی جانب مڑی۔

”برسوں سے دیکھ رہے ہیں۔“ وہ بے پروائی سے کباب پلیٹ میں رکھتی رہی۔ ”تم اپنا کام کرو۔“ ”ورہہ گہری سانس بھر کر رڑائی کا جائزہ لینے لگی تھی۔
 اس چھوٹے سے گھر کے لیے وہ ایک بے حد خوشی کا دن تھا۔ ان کی پھپھی نے وقتِ رخصت اپنے نفیس سے پرس سے ایک مٹخلیس ڈبیا نکالی تھی اور رابعہ بیگم کی جانب اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا تھا اور رابعہ بیگم سوائے مسکرانے کے کچھ نہ کہہ پائی تھیں۔

تب انہوں نے ڈائمنڈ رنگ ناعمہ کے ہاتھ کی تیسری انگلی میں ڈال کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔
 ”یہ صرف شگن ہے۔“ ”وہ بولی تھیں“ ”باقاعدہ رسم ہم ان شاء اللہ سب کی مرضی کی نارت پر کریں گے۔“
 ”اور رسم کیسے ہوتی ہے؟“ ”فردوس بیگم نے ناگواری سے میز پر پڑے مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکروں کو دیکھا تھا۔ صد شکر کہ ان کی بڑبڑا ہٹ صرف ان کے پہلو میں کھڑی ثانیہ ہی نہ پائی تھی۔
 ان کے جانے کے بعد سب ہی ہنسی خوشی رابعہ بیگم اور ناعمہ کو مبارک باد دینے لگے تھے۔ رابعہ بیگم کا چمکتا چہرہ ان کی سچی خوشی کا مظہر تھا۔ ناعمہ ہنوت پن سے محض سب کے چہرے دیکھ رہی تھی۔ خود پر سے گزرنے والی افاد نے جیسے اس کے حواس مفلوج کیے ہوئے تھے۔

”رائمہ کو فون کر کے بلاؤ ورنہ۔“ ”رابعہ بیگم کو بڑی بیٹی کی یاد ستائی۔“ ”اس غریب کو تو کچھ خبر ہی نہیں ہے۔“
 ”اے میں بھی چلوں!“ ”فردوس بیگم اٹھی تھیں۔“ ”ماہین کو اطلاع کروں جیسے ہمیں ٹولی پھولی بات پتا ہے ویسے اسے بھی پتا دیں ہاں!“
 کئی افراد انہیں جاتا دیکھ کر مسکرا دیے تھے۔

ماہین دوڑی دوڑی چلی آئی تھی اور اب بے حد دلچسپی اور انہماک سے ماں کی گفتگو سن رہی تھی۔
 ”یہ بڑی گاڑیاں اور دونوں میں ڈرائیور موجود یوں جیسے کہیں کے رئیس زادے ہوں۔ اے ماہین! یہ بوگلی ناعمہ تو بڑی ہوشیار نکلی۔“ ”نجانے کہاں سے اس نے ایسا رئیس زادہ قابو کیا۔ ہمیں نہ آئیں ایسی ہوشیا ریاں اور بیٹیاں، ہم سے زیادہ بھولی۔“
 ”کچھ پتا نہیں چلا آپ کو یہ رشتہ آیا کو کر؟“ انہوں نے ناعمہ کو کہیں دیکھ کر پسند کیا یا لڑکے اور لڑکی کی باہمی پسند ہے؟“
 ”ارے ہمیں کوئی کچھ بتائے تو ہمیں پتا بھی چلے۔“ ”وہ مایوسی سے بولیں۔“ ”کن سوئیاں لیتی تو ہمیں آج تک نہ آئیں۔“

”وہاں موجود افراد کی باتوں سے اندازہ نہ ہوا آپ کو؟“ ”ماہین قدرے خفگی سے بولی۔“ ”ایک تو آپ کی سمجھ بھی ایسی ہی ہے نا۔“
 ”اب تمہیں بلایا ہے تمہارے کو“ ”ماجر ا کیا ہے۔“ ”وہ سرگوشی میں گویا ہوئیں۔“ ”ارے ہم نے بھی بس جلد بازی سے ہی کام لیا۔“
 ”کس معاملے میں؟“ ”اس نے نا سمجھی سے ماں کو دیکھا تھا۔

”ابنی عریشہ کے معاملے میں اور کس معاملے میں۔“ ”انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری۔
 ”فرخ سے پانی کی بوتل نکالتی عریشہ کے ہاتھ اپنا نام سن کر سست بڑے تھے۔
 ”وہ تو اب تک ناراض ہے آپ لوگوں کے اس غیر منصفانہ فیصلے پر۔ نہ لڑکی کی رضامندی ڈھنگ سے لی نہ

کسی اور کی رائے کو کوئی اہمیت دی۔ اب دیکھ لیجئے نافع میں رکھائی کیا ہے؟ یہاں ہماری بہن برتن مانجھے گی اور وہاں وہ نکمی ناعمہ راج کرے گی۔" ماہین نے بھی پھپھولے پھوڑے تھے۔
 "بس ماہین۔۔۔ غلطی ہی ہوگئی! انہوں نے کف افیوس ملے۔
 عریشہ فرنج کے پاس ہی کھڑی نجائے کیا سوچنے لگی تھی۔
 "کرنا کیا ہے لڑکا؟" ماہین پھر اپنے تفتیشی انداز میں لولی۔
 "میں کیا جانوں۔۔۔ کسی نے بتایا تو ہوتا۔"
 "لیجئے پوچھ کر نجائے کیا آئی ہیں۔" ماہین کو ماں پر غصہ آیا۔
 "فراز نام ہے لڑکے کا۔ تصویر ورہہ نے مجھے دکھائی تھی اس کی۔ اے ماشاء اللہ ایسا خوبہ جوان کہ نظر بھر کر نہ دیکھے کوئی۔"

"جھما۔۔۔ واقعی؟" ماہین کو حسرت ہوئی۔
 "گھر والے ایسے عمدہ لوگ اور ہمیں ایک سے بڑھ کر ایک۔۔۔ بڑی شادی شدہ ہے لیجئے اور چھوٹی وانی ڈیجہ کی ابھی کہیں بات نہیں ہوئی۔"
 عریشہ نے دیوار کا سہارا لیا تھا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں سی ہونے لگی تھی۔ ان سب ناموں سے وہ بخولی واقف تھی۔
 "مجھے تو لگتا ہے ماہین! یہ ناعمہ کا ہی کام ہے۔ اسی نے کہیں سے یہ لڑکا پیچھے لگایا ہے۔ کیسی گھنی ٹکلی ہے یہ اور صورت دیکھو تو فرشتوں کی سی۔"
 "کیا خبری!۔" ماہین بے دلی سے بولی۔ "بغیر جانے بوجھے کیا کسی پر الزام دھرنا ناعمہ اور ورہہ ایسی لڑکیاں نہیں ہیں۔"
 عریشہ کہنے کی حالت میں اب تک اپنی جگہ کھڑی تھی۔

اسی ڈائری میں دیکھ کر اس نے نمبر لایا تھا پھر وہ سری جانب ہوتی ہوئی ٹیل کی آواز سننے لگی تھی۔ جلد ہی فون اٹھالیا گیا تھا۔
 "ہیلو۔" حسن اتفاق سے وہ ورہہ ہی تھی۔
 "ہیلو ورہہ۔۔۔ ریجہ بول رہی ہوں۔"
 "اوہ۔" ورہہ کی آواز میں خوشی دور آئی۔ "کیسی ہو ریجہ۔۔۔ میں ابھی تمہیں ہی یاد کر رہی تھی۔"
 "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ کل یونیورسٹی نہیں آئیں۔" ریجہ نے پوچھا۔
 "میری طبیعت؟" ورہہ قدرے گڑبڑائی گئی تھی۔ "اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں تھیک ہوں ریجہ! بس یونی کچھ موڈ نہیں تھا اور پھر شام کو اچانک ہی وہ لوگ چلے آئے۔"
 "وہ لوگ؟" ریجہ کچھ نہ سمجھی۔

"ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ فراز کے گھر والے۔۔۔ میں نے تم لوگوں سے ذکر کیا تھا ناپیلے بھی۔ بس وہ اچانک ہی آگئے۔۔۔ بنا کسی پروگرام کے۔۔۔ اور افرا تفری میں ہی ناعمہ کو انگوٹھی بھی پہنا گئے۔ مصروفیت ایسی ہوگئی تھی کہ میں تمہیں فون بھی نہ کرائی۔"
 "ارے۔۔۔" ریجہ خوش ہوگئی۔ "پھر تو مبارک ہو بہت بہت۔ یہ تو بہت اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔ ناعمہ کو میری طرف سے بہت مبارک باد دینا۔ فراز بھائی تو اتنے اچھے ہیں کہ کسی شک شبہ کی گنجائش ہی نہیں بنتی۔ ناعمہ واقعی خوش قسمت ہے۔" ورہہ دھیمے سے ہنس دی۔
 "خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔ ویسے تم مبارک باد دینے خود کیوں نہیں آجاتیں؟ تم سے ملنے کو بہت دل چاہ رہا ہے۔"

”یعنی منگنی کی مٹھائی کھانے بھی میں خود چل کر آؤں؟“ ربیعہ مسکرائی۔
 ”مٹھائی یہاں بھی کھلا میں آؤں گھر بھی دینے آئیں گے۔ تم بے فکر رہو۔“ ”ورہ بھی شگفتگی سے بولی۔
 ”اچھا میں کوشش کرتی ہوں۔ امی سے پوچھ لوں۔“ ربیعہ بولی۔
 ”اوکے۔ میں منتظر ہوں۔“

ربیعہ نے ریسور رکھ دیا پھر وہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ ”حیات دولا“ کی سمت جاتے ہوئے رستے میں جو مانوس سی خوشبو اپنی جانب بلانے لگتی تھی وہ خوشبو ایک طلسم کی مانند تھی اور ربیعہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس طلسم کا شکار ہونا نہ چاہتی تھی۔ ورہ کی دعوت میں بے حد خلوص تھا۔ ورہ خود بہت معصوم اور پر خلوص لڑکی تھی۔ ربیعہ گہری سانس بھرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ اس نے ”حیات دولا“ جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

”ربیعہ آرہی ہے۔“ ورہ نے ناعمہ کو مطلع کیا۔ ”وہ تمہیں بہت مبارک باد دے رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ یہاں آکر مبارک باد دے لے۔“

ناعمہ نے سستی سے بن کی جانب دیکھا اور ایک بڑی سی جمالیلی۔ وہ ابھی ابھی سوکرا ٹھی تھی۔
 ”آپ ان کے لیے چائے تو ضرور بنا میں گی۔ ایک کپ مجھے بھی دے دیجئے گا۔“
 ورہ نے اچانک ہی بے حد خفگی سے اسے دیکھا۔

”تمھوڑی سی شرم کسی سے ادا رہی لے لو ناعمہ! امی ویسے ٹھیک ہی فکر مند ہوتی ہیں تمہاری طرف سے۔ میں بے وجہ انہیں طفل تسلیاں دیتی رہتی ہوں۔ دو گھنٹے سے بستر میں تھسی ہوئی ہو اور بجائے اس کے کہ ربیعہ کے آنے پر تم ہمیں چائے وغیرہ سرو کرو، الٹا فرمائشی پروگرام شروع کر دیا۔ کیا بنے گا تمہارا۔ اب تو عقل کرو، سرال والی ہو گئی ہو۔“

”اف آپ!۔۔۔ پلیز۔۔۔“ وہ بھنا کر اٹھ بیٹھی۔ ”آپ تو امی کی زبان استعمال نہ کریں۔ سچی میں تو پہلے ہی بے حد کوفت کا شکار ہوں۔ کیا مصیبت سر پہ پڑ گئی ہے بیٹھے بٹھائے۔“

”ناعمہ! عقل کرو! امی سیدھی باتیں وقت بے وقت منہ سے نہیں نکالا کرتے۔ خدا نے تمہیں اتنی بڑی نعمت بن مانگے دی ہے۔ لڑکیاں تو ایسے رشتوں کے لیے وظیفہ بڑھا کرتی ہیں۔“ ”ورہ سنجیدگی سے بولی۔
 ناعمہ زور سے ہنس دی۔ ورہ نے پھر اسے گھورا تھا لیکن وہ اس کے گھورنے کی پروا کیے بغیر ہنستی رہی۔
 ”میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے تمہیں؟“ وہ چڑ گئی۔

”اور کیا۔۔۔ لطیفہ ہی ہو گیا یہ تو۔۔۔ یعنی دنیا جہان کے چند و نصائح سننے کا لڑکیوں کو اس قدر شوق ہوتا ہے کہ وہ وظیفہ کرنے لگتی ہیں۔ سچی آپ! جب سے یہ بلا میری انگلی میں آئی ہے میں نصیحتیں سن سن کر مرنے والی ہو گئی ہوں۔ اٹھتے بیٹھتے دس پندرہ اقوال امی کی جانب سے عطا ہوتے ہیں۔ سوتے جاگتے چھ سات آپ بھی ساتھ لگا دیتی ہیں۔ ابھی تو ذرا راتمہ آپ کو آنے دیں سب سے زیادہ خطرہ تو مجھے ان سے ہے۔ وہ تو مجھے حالت نیند میں بھی نہ چھینیں گی۔ جگا کر کہیں گی۔ ناعمہ! تمہارا منہ کھلا ہوا ہے اسے بند کر کے سونے کی عادت ڈالو۔ سرال والے کیا کہیں گے۔ ماں نے سونا بھی نہیں سکھایا۔ آپ! یہ سرال والے ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں؟“
 ورہ نے خود پر بہت ضبط کرنا چاہا لیکن مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آہی گئی تھی۔
 ”بے وقوف۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

اسی لمحے ان دونوں کو ہی کمرے کے دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ دروازے کی جانب دیکھا تھا۔

”ارے۔“ ناعمہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ”عریشہ! تم۔۔۔“ وہ خوش ہو کر بستر سے نکل کر اس کی جانب بڑھی۔

”کفر تو نا خدا کر کے تو آخر تمہیں ہماری یاد آئی گئی۔“

اس کے قریب پہنچ کر ناعمہ قدرے ٹھٹھکی سی محسوس ہوئی تھی۔ عریشہ بے حد بے تاثر سے انداز میں کھڑی تھی۔ ناعمہ کے اتنے گرم جوش اور والہانہ انداز نے بھی اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔ اس کی آنکھوں میں سرد مہر سی واضح تھی۔ ناعمہ لکھت ہی قدرے پیچھے ہٹ گئی۔

”او عریشہ!“ وردہ نے بھی خوش مزاجی سے اسے مخاطب کیا۔ ”اندر آکر بیٹھو نا وہیں کھڑے رہنے کا ارادہ ہے کیا؟“

عریشہ نے ناعمہ سے نظریں ہٹا کر وردہ کی جانب دیکھا پھر وہ ایک ایک قدم بدھاتی اندر چلی آئی اور بستر کے کونے پر بے حد تکلف سے ٹک گئی۔ ناعمہ بھی اس کے قریب آئی تھی۔

”تم دونوں باتیں کرو، میں تب تک چائے بنا لاؤں۔“ وردہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”ہم نے بھی شام کی چائے اب تک نہیں پی ہے۔“

عریشہ نے اسے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا پھر دوبارہ ناعمہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اس کی نظریں بے حد چبھتی ہوئی تھیں جس نے ناعمہ کو نجانے کیوں خوف زدہ سا کر دیا۔

”کیا بات ہے عریشہ؟“ وہ بالآخر بول اٹھی۔ ”تم مجھے اتنے عجیب سے انداز سے کیوں دیکھ رہی ہو؟“

”سنا ہے تمہاری منگنی ہو گئی ہے۔“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

”ہاں۔ تم نے ٹھیک سنا ہے۔“ ناعمہ نے سر ہلایا۔

”بہت خوش نظر آ رہی ہو۔“ اس کے لہجے میں زہر سا گھلا۔ ”کہاں کھلی ہے قسمت؟“

ناعمہ کا منہ حیرت سے کھلا۔ اسے لگا یہ وہ عریشہ ہی نہیں تھی جسے وہ بچپن سے جانتی تھی۔

”ایک بات بتا دوں تمہیں۔“ اس سے پیشتر کہ ناعمہ کچھ بول پاتی، وہ پھر اسی لہجے میں گویا ہوئی۔ ”دو سروں کے حصے پر ڈاکہ ڈالنے والے کبھی خوش نہیں رہتے۔ وقتی طور پر انہیں خوشیاں راس آ بھی جائیں تو بھی ایک دن کسی کی آہ انہیں لے ڈالتی ہے۔“

”عریشہ؟“ ناعمہ کے لب کاپنے۔ ”یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ کس کے حصے پر ڈاکہ ڈالا ہے میں نے کس کے ساتھ زیادتی کی ہے؟“

اس سے قبل کہ عریشہ کچھ بولتی، رابعہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔

”انشاء اللہ۔۔۔ بھی آج تو ہماری عریشہ بیٹی آئی ہے۔ بڑی خوشی ہوئی تمہیں دیکھ کر۔“ عریشہ بادل خواستہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ جیسے زرب لب بولی۔

”و علیکم السلام۔ جیتی رہو۔ کیسی ہو بیٹی؟“ رابعہ بیگم نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ نوز سرو انداز میں بولی۔

”ناعمہ کی منگنی کے بارے میں بتا چلا تمہیں؟“ رابعہ بیگم خوش دلی سے بولیں۔

عریشہ کے لبوں پر تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”مجھے تو چل گیا ہے۔ ناعمہ کو بھی چل جائے گا۔ چلتی ہوں۔“

وہ مڑ کر اچانک ہی کمرے سے باہر نکل گئی۔ رابعہ بیگم نے از حد حیرت سے ناعمہ کی سمت دیکھا۔ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔

”کیا مطلب اس بات کا؟“ وہ ہنسنے لگی۔

”پتا نہیں امی جی۔۔۔“ ناعمہ منمنائی۔

اسی لمحے وردہ چائے کی ٹرے لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

”ہائیں۔۔۔ یہ عیشہ کہاں گئی؟“ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔
ناعمہ کے چہرے پر گہری سوچ کی پرچھائیں تھیں۔

وہ دوسرے کھانے کی تیاری کر کے کچن سے نکلی تھی۔ سامنے بیٹھی منیزہ بیگم کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے ٹھک سی گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔
”امی جی۔۔۔“ ربیعہ ان کے قریب چلی آئی۔ ”کیا بات ہے۔۔۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ جب سے ان کی طبیعت ایک مرتبہ بگڑی تھی تب سے نجانے کیوں اس کے دل کو دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ وہ اب انہیں کچھ بھی نہ کرنے دیتی تھی۔ یونیورسٹی جانا ہوتا تو وہ اگلے دن کے کھانے کی زیادہ تر تیاری رات میں ہی کر لیا کرتی اور اگر آف ہو تا تو نہ صرف ناشتہ بلکہ دوسرا اور رات کا کھانا بھی وہی بناتی تھی۔
منیزہ بیگم اپنی سوچ سے نکل کر اب محبت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھیں۔

”ہاں ربیعہ۔۔۔“ پھر وہ اس کے ہاتھ تھام کر بولی تھیں۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہاری جیسی خدمت گزار بیٹی جس ماں کو مل جائے۔ اسے کچھ ہو سکتا ہے بھلا؟“ ربیعہ کے دل کو نجانے کیا ہوا تھا۔ وہ یکدم ہی ان سے لپٹ گئی۔

”امی جی۔۔۔ آپ کی بیٹیاں واقعی بہت خوش قسمت ہیں۔ اتنی اچھی، اتنی پیاری، شفیق ماں قسمت والوں کو ملتی ہے۔“

”تم بھی میری بیٹی ہو ربیعہ! یقین جانو۔ مجھے شہلا، انیقہ اور تم میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔“ انہوں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

ربیعہ کا دل مزید پھلا۔ اس کی آنکھوں سے چند قطرے نکل کر چپ چاپ منیزہ بیگم کے آنچل میں گم ہو گئے۔ اس نے ان کے کاندھے سے سر نہ اٹھایا۔
”ربیعہ!“ انہوں نے اس کی کیفیت محسوس کر کے اسے پکارا۔

”جی۔۔۔ امی۔۔۔“ وہ چند لمحوں بعد بولی۔
”بیٹا۔۔۔ کبھی تم سے پوچھا نہیں۔ لیکن اب پوچھنے کو دل کرتا ہے۔ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ، اپنے پس منظر کے متعلق، اپنے گھر، گھر والوں کے متعلق۔“

ربیعہ نے ان کے کاندھے سے سر اٹھایا پھر نظریں نیچی کیے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا دل چاہا، وہ انہیں شروع سے آخر تک سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دے۔ یوں بھی اس کی زندگی میں کوئی ایسی بات تھی بھی نہیں جسے وہ کسی سے چھپانا چاہتی۔

لیکن پھر اسے عباد کا خیال آیا۔ اس کے سب کچھ کہہ دینے سے عباد یکدم اپنے گھر والوں کی نظروں میں جھوٹا پڑ جاتا اور پھر جن حالات کے تحت جس طرح وہ عباد کے ساتھ آئی تھی، شاید اس کے گھر والوں کے لیے وہ بھی قابل قبول نہ ہوتا۔

منیزہ بیگم اس کا چہرہ غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہولے سے مسکرا دیں پھر انہوں نے ربیعہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

”عباد کہہ رہا تھا۔ تم اس کے کسی دوست کی بہن ہو اور وہ نوکری کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے۔“
”جی۔۔۔“ وہ جھجھکی ہوئی نظروں سے فقط اتنا ہی کہہ سکی۔

”تمہارے ماں باپ؟“

ربیعہ نے نظر اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں اعتبار اور محبت تھی۔
”وہ حیات نہیں ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی تھی۔

”ماں کے متعلق اب ایسے مت کہنا۔“ وہ شفقت سے مسکرائیں۔ ”میں تمہاری ماں ہی ہوں۔۔۔ ہیں نا۔۔۔“

”امی جی۔۔۔“ ربیحہ ایک بار پھر بے اختیار ان سے لپٹ گئی تھی۔

وہ ڈیوٹی آف کر کے ہسپتال سے نکل ہی رہی تھی جب ہاشم کی کال آئی۔ شہلا نے موبائل اسکرین پر جھکتے نام کو قدرے حیرت سے دیکھا تھا۔ ان اوقات میں تو وہ اچھا بھلا بڑی ہوتا تھا۔

”ہیلو۔۔۔ ہاشم۔۔۔“ اس نے موبائل آن کیا۔

”عزیز من۔۔۔ کہاں ہیں آپ؟“ وہ کافی خوشگوار موڈ میں لگتا تھا۔

”میں بس گھر کے لیے ہی نکل رہی تھی۔ آپ کہاں ہیں؟“

”میں بھی گھر جا رہا ہوں۔ سوچا تمہارا شیڈول پتا کر لوں۔ ڈنر کے متعلق کیا خیال ہے؟ آج کیس باہر چلتے ہیں۔“

شہلا کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ اس کے لب مسکرا دیے تھے۔

”خیریت؟ بہت موڈ میں لگتے ہیں۔“

”آپ سے بات ہو رہی ہے جناب!“ وہ شرارتاً بولا۔ ”موڈ تو خود بخود ہی خوشگوار ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ مابولت کا سوال ٹال گئی ہیں۔“

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کا دل چاہ رہا ہے تو ضرور چلتے ہیں۔“ وہ چلتے ہوئے اپنی گاڑی تک آئی تھی۔

”آہ۔۔۔ گویا بات اب تک محض ہمارے ہی دل تک محدود ہے۔“ اس نے قدرے سرسری سے انداز میں کہا تھا۔

”خیر۔۔۔ پھر کچھ ڈیسا مذکورہ کہاں چلیں؟“

”چائنا ٹاؤن۔۔۔“ وہ فوراً بولی تھی۔

”ویری ٹائس۔“ اس نے فوراً اتفاق کیا۔ ”چلو پھر گھر پہنچو، تھوڑا ریسٹ کر کے فریش ہو کر نکلیں گے۔“

”عمر کو بھی لے لیں گے نا۔ میں اسے بتا دیتی ہوں۔“

ہاشم کی جانب سے لمحہ بھر کا توقف ہوا۔

”اوکے۔“ چند لمحوں بعد وہ بولا تھا۔

”خدا حافظ۔“ شہلا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پھر وہ کچھ سوچنے لگی تھی۔ ہاشم کی جانب سے وہ لمحہ بھر کا توقف اسے ڈسٹرب کر گیا تھا۔ نجانے اسے عمر کو بھی ساتھ لے جانے کی بات کرنا چاہیے تھی یا نہیں پھر وہ سر جھٹک کر گاڑی کالا کھولنے لگی۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے وہ عمر کو اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ کینسل کر چکی تھی۔ نجانے کیوں اس نے محسوس کیا تھا کہ انیم ایسا نہیں چاہتا تھا۔ وہ فی الوقت صرف شہلا کی ہمراہی کا خواہش مند تھا اور شہلا نے شاید اس کی تمنا کو نہیں پہنچائی تھی۔ اسے شرمندگی نے آگھیرا۔ وہ ہمیشہ ہی انجانے میں اسے دکھ دے دیا کرتی تھی۔

”گویا بات اب تک محض ہمارے ہی دل تک محدود ہے۔“

اسے ہاشم کے الفاظ یاد آئے گاڑی سے نکل کر وہ بے حد مضطرب سوچوں کا شکار اندر پہنچی تھی۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ سامنے ہی، پیشہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ شہلا کو قدرے حیرت ہوئی۔ وہ لڑکی اسے اب تک اپنے کمرے میں محدود ہی تھی۔ یوں کسی مرکزی جگہ پر وہ کم ہی ملا کرتی تھی۔

عریشہ نے نگاہ اٹھا کر اسے لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور پھر سے اپنی سوچ میں گم ہو گئی تھی۔

”کیسی بو عریشہ!“ شہلا نے اس کے قریب ٹھہر کر ملائمت سے پوچھا۔

”جی؟“ اس نے بادل خواستہ سراٹھایا۔ ”ٹھیک ہوں۔“ وہ بے زاری سے گویا ہوئی تھی۔

”آئی کہاں ہیں؟“ اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔

”پتا نہیں۔“ اس نے کاندھے اچکائے۔

”بجائے اس لڑکی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟“ شملہ نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔

پھر وہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔ پورچ میں اس نے اپنی گاڑی ہاشم کی گاڑی کے پیچھے پارک کی تھی لہذا اسے علم تھا کہ ہاشم اپنے کمرے میں موجود ہے۔ اس نے دل میں ارادہ کیا کہ وہ ہاشم سے ملے گی کہ آج ذرا وہ دونوں ہی جائیں گے۔ عمر کے ساتھ آؤٹنگ کا پروگرام بعد میں بھی رکھا جاسکتا تھا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی اور پھر جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ ہاشم بستر پر لیٹا ہوا تھا اور عمر اس کے پیٹ پر بیٹھا زور زور سے ہنس رہا تھا گویا ہاشم نے اسے کوئی بہت مزے کا طیفہ سنایا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر دونوں ہی نے مڑ کر دیکھا۔

”مما..... ممما آگئیں! عمر ہاشم پر سے اتر کر دوڑتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

ہاشم بھی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے لبوں پر بے حد خوبصورت مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی ابھی پہنچا تھا۔ شرٹ اتار کر اس نے ایک طرف ڈالی ہوئی تھی اور پیٹ اور بنیان میں بے حد فراغت سے بیٹھا تھا۔ وہ اس قدر پرکشش نظر آ رہا تھا کہ شملہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی ہی رہ گئی۔

”کس بات پر یہ آئینہ محو حیرت ہے؟“ ہاشم گنگنایا۔

شملہ چونکی پھر عمر کو خود سے لپٹاتے ہوئے آگے بڑھ آئی۔

”یہ عمر؟“ وہ بیڈ کے کنارے آئی۔

”میں اسے پک کرتا ہوا آگیا تھا۔“ ہاشم نے پار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”کیوں؟“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

ہاشم نے قدرے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔

”کیوں؟ کیا مطلب کیوں؟ بھی میرا دل چاہ رہا تھا اس سے ملنے کا۔۔۔ باتیں کرنے کا اور پھر صاف جزا دے ہمارے ساتھ ڈنر کے لیے بھی تو چل رہے ہیں نا۔۔۔“

اس کے لمحے میں شائستہ تھی۔ شملہ ایک بار پھر جی ہی جی میں شرمندہ ہوئی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ۔۔۔“

پھر اس کی نگاہ عمر پر پڑی جو بے حد دل چسپی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

”عمر۔۔۔“ شملہ نے اس کے بال رگاڑنے۔ ”مما کے لیے پانی لے کر آؤ۔“

”جی ممما۔۔۔“ وہ فریج کی جانب چلا گیا۔

شملہ نے ہاشم کو دیکھا جو دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے اسی کی جانب متوجہ تھا۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔

”میں سوچ رہی تھی اگر آج ہم دونوں ہی جلتے عمر کے ساتھ پھر کسی دن اچھا سا پروگرام بنالیں گے۔“

”لیکن تم نے ہی کہا تھا کہ ہم عمر کو۔۔۔“ ہاشم کی نظروں میں الجھن در آئی۔ ”اچانک تبدیلی کیسی؟“

”سوری ہاشم۔۔۔ میں شاید آپ کے احساسات سمجھ نہیں پاتی تھی۔“

ہاشم چند لمحے اس کی جانب دیکھتا رہ گیا۔

”کم آن شملہ تم نے تم نچائے کیا سمجھیں۔ عمر جیسا تمہارے لیے ہے ویسا ہی میرے لیے بھی ہے۔ اتنا ہی عزیز اتنا ہی اہم بلکہ جب تم نے مجھے اس کی بابت یاد دلایا تو میں تو بے حد شرمندہ ہو گیا تھا۔ یہ بات تو مجھے خود کہنی چاہیے تھی کہ ہم عمر کو بھی ساتھ لیں گے۔“

شملہ اسے کچھ بولا نہ جاسا تھا۔ ہاشم کے جذلوں نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔

”مما! اما! آج ہم کہاں جائیں گے؟“ عمر بانی کا گلاس بھر کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔ شہلانے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا۔
 ”آج ہم چائنا ٹاؤن جائیں گے اور پھر جہاں عمر بابا کہیں گے وہاں چلیں گے۔“ ہاشم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”ٹھیک ہے۔“ وہ خوش ہو گیا۔
 ”کہاں جاؤ گے؟“

”جہاں پیالے کر گئے تھے۔“ وہ جوش سے بولا۔ ”وہاں بہت سارے جھولے تھے۔ پیالے مجھے سارے جھولوں پر بٹھایا تھا پھر انہوں نے مجھے ڈھیر سارے ٹوائز بھی لے کر دیے تھے۔ آس کریم بھی کھلائی تھی۔ پتا ہے ہاشم انکل میرے پیالے بہت گریٹ ہیں۔“

”عمر! شہلانے قدرے غصے میں اسے پکارا۔ ”کیپ کو اسٹناؤ!“
 عمر سسم کر ایک دم ہی خاموش ہو گیا تھا جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔
 ”بولنے دو یا نہ۔“ ہاشم آہستگی سے بولا۔ ”بچہ ہی تو ہے۔“
 شہلانے محسوس کیا ہاشم کے انداز میں قدرے سنجیدگی آگئی تھی۔
 ”میں ذرا چیخ کر لوں!“ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔

”مما! ہم یہاں کیوں آگئے ہیں؟“ مومن بسور رہا تھا۔ ”مجھے یہاں رہنا زیادہ پسند نہیں ہے۔“
 ایقان نے لحظہ بھر کے لیے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے ماتھے پر پل بڑ گئے۔
 ”چھا! تو کیا اس عمر میں بھی آپ کی پسند ناپسند کی بہت اہمیت ہے۔۔۔ بڑے ہو کر تو جانے کیا حال ہو گا۔“
 ”مما! یہاں بھی کبھی آتا تو مجھے اچھا لگتا ہے لیکن آپ تو یہاں رہنے لگی ہیں۔ اپنے سارے کپڑے بھی لے آئی ہیں۔ وہاں میرے فرینڈز میرا انتظار کر رہے ہوں گے ہم سب شام کو کرکٹ کھیلنے تھے، کتنا مزہ آتا تھا۔“
 ”مومن! میرا دماغ مت کھاؤ۔“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”فرینڈز یہاں بھی بن سکتے ہیں اور عمر بھی تو ہے یہاں اس کے ساتھ کھیلا کرو۔ شام کو پارک چلے جانا۔“
 ”نہیں ممما! مجھے اپنے گھر جانا ہے وہاں میرے اتنے سارے کھلونے ہیں اور وہ گھر بڑا ہے یہ تو بالکل چھوٹا سا ہے یہاں کھیلنے میں مزہ نہیں آتا!“
 ایقان خاموش ہو گئی۔ بچے سے بحث کرنا فضول تھا۔ وہ اٹھ کر کچن کی جانب چلی گئی۔ لیکن وہ پیچھے ہی چلا آیا تھا۔

”آپ سامان رکھ لیں ہم شام کو چلیں گے۔“ ایقان نے مڑ کر خفگی سے اسے دیکھا۔
 ”مومن! تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آتی؟“
 ”آپ کو بھی ممما! میری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔“ اس نے منہ بگاڑا۔ ”مجھے تو ہر وقت پہلایا داتے ہیں وہ میری ہر بات سمجھتے ہیں۔“

غصے کی ایک شدید لہر اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔
 اسی لمحے بجتے والی فون کی بیل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔ وہ غصے میں چلتی ہوئی فون تک آئی۔

”ہیلو۔۔۔“
 ”عاشقہ! تم کہاں ہو۔“
 دوسری جانب سے آئی ہوئی آواز نے اسے سر سے پیر تک سُن کر دیا تھا۔ اس سے چند لمحوں کے لیے کچھ بولنا نہ جا سکا۔ پھر کایک اس کا غصہ پھر عود کر آیا۔
 ”تم؟ تمہیں یہ نمبر کس نے بتایا؟“ وہ پتھنکاری تھی۔

”بھائی بیگم نے۔۔۔“ وہ لولا۔۔۔“ اور زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے محض یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں نے پچاس ہزار کاڈرافٹ بھیج دیا تھا اپنا اکاؤنٹ چیک کر لیتا۔ دوسرے یہ کہ میں اپنے بچوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہوگا!“

ایقان چند لمحے خاموش کھڑی ہوئی پھر اس نے ریسورسائیڈ میں پٹخا تھا۔

”مومن۔۔۔! یہاں آؤ۔“ وہ چلائی۔

مومن دوڑتا ہوا آیا تھا۔

”جی ماما۔۔۔؟“

”فون پر بات کرو۔“ وہ وہاں سے جانے لگی۔

مومن نے ریسورسائیڈ کو اٹھا کر ہیلو کہا تھا پھر اگلے ہی لمحے اس نے بے ساختہ مسرت اور اشتیاق سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

”بھائی! السلام علیکم میں آپ کو بہت یاد کر رہا تھا۔“

ایقان کمرے میں چلی آئی۔ ایمان بے خبر سو رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ضبط محال تھا۔ اس کی آنکھوں سے کئی قطرے نکل کر اس کے گریبان میں جذب ہوئے۔ کس سنگ دلی سے اور بے مہری سے اس نے بات کی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہی لہجہ پھول برساتا تھا۔

مومن بات ختم کر کے کمرے میں آیا تو وہ اچھا خاصا رو چلی تھی۔ پوٹے متورم ہو چلے تھے، وہ اسے دیکھ کر جلدی جلدی چہرہ صاف کرنے لگی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

”ماما! اپنا ایمان کا پوچھ رہے تھے وہ بھی ہم لوگوں کو مس کر رہے ہیں۔“

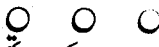
”اچھا! وہ گلو کیر لہجے میں اتنا ہی بول پائی۔“

”اور ماما! اپنا ہمارے لیے پارسل بھی بھیج رہے ہیں۔ انہوں نے ہمارے لیے شاپنگ کی ہے!“

”اچھا بیٹا! تھیک ہے۔“ اس کا دل بھر بھر آنے لگا تھا۔

”ماما! آپ پہا کو مس نہیں کرتیں؟“ وہ اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

ایقان گہری سانس بھر کر خاموش ہو گئی۔



شہلا چہرے پر کلنزنگ ملک لگا کر اب ٹشو سے صاف کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز پر اس نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ یقیناً ”ہاشم ہی تھا۔ شہلا آئینے کے سامنے سے ہٹ کر دروازے تک چلی آئی۔

لاک کھولنے تک اس کے ذہن میں یہ خیال راسخ تھا کہ باہر یقیناً ”ہاشم ہی ہے۔ دروازہ کھولتے ہی وہ یکایک اوٹ میں ہو گئی۔ باہر فاروق حسن ہوں گے اس کے تو، ہم و گمان میں نہ تھا۔

شہلا بیٹا! آپ کا فون ہے۔“ وہ باہر سے بولے۔ ”کارڈ وروالے ایکسٹینشن سے بات کر لیں۔“

”جی۔۔۔ جی انکل۔۔۔!“ وہ ہلکا کر رہی رہ گئی تھی۔

پنک نیٹ کی ٹائٹی میں بنا شال کے ان کے سامنے آجائے روہ حد درجہ خفت کا شکار ہوئی تھی۔ اس نے خود کو سخت سست سائیں۔ دروازے پر کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ اسے خود شال یا گاؤن وغیرہ لینا چاہیے تھا۔

خوسے لڑتی جھڑکتی، برا بھلا کہتی وہ فون تک چلی آئی تھی۔ اس نے یہ بھی خیال نہ کیا تھا کہ اس وقت بھلا کس کا فون ہو سکتا تھا۔

”مہیلو۔۔۔“ اس نے ریسورسائیڈ اٹھایا۔

”مہیلو۔۔۔“ دوسری جانب ابرار تھا۔

شہلا کے اوپر جیسے پہاڑ ٹوٹا۔ ابرار کا فون اور وہ بھی گھر کے نمبر پر! فون فاروق حسن نے ریسورسائیڈ کیا تھا۔ یہ سوچ کر

اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

”تم، تم، تم نے یہاں... اس کے حلق سے آواز نکلتا مشکل ہو گئی۔

”کیا کروں؟“ وہ بے حد مطمئن تھا۔ ”موبائل پر نمبر دیکھ کر تم فون ریسیو نہیں کرتیں۔ مجبوراً“ مجھے اس نمبر پر فون کرنا پڑا۔“

”میں ریسیو کر لوں گی، تم اس نمبر پر کال کرو۔“ اس نے بے تحاشہ دھڑکتے دل سے کہہ کر ریسیو پر اٹھا۔ کچھ دیر وہیں کھڑی وہ اپنے دل کی دھڑکنیں سنتی رہی پھر تیز تیز قدموں سے چلتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ حسب توقع اس کا موبائل بج رہا تھا۔ شہلا نے جھپٹ کر موبائل اٹھایا تھا۔

”کیا بات ہے ابرا! کیوں میرا تماشا بنا رہے ہو تم...؟ اس کے لیے میں عاجزی و راضی تھی۔

”تم میرے جذبات سے کھیل رہی ہو تمہیں اس بات کا خیال ہے؟“ وہ شکایتی انداز میں بولا۔

”کتنے دن سے میں تمہارا سیل فون نمبر زانی کر رہا ہوں لیکن تم ہر مرتبہ مجھے مایوس کرتی ہو“ آخر بات کر لینے میں تمہارا کیا جاتا ہے؟“

”ہمارے درمیان اب ایسا کیا ہے جس پر بات کی جاسکے؟“ وہ چیخی۔

”عمر! عمر ہے ہمارے درمیان!“ شہلا ایک سخت خاموش ہوئی تھی۔

”شہلا! میں عمر کو اپنی کسٹڈی میں لینا چاہتا ہوں۔ قانونی طور پر!“

شہلا کو یوں لگا جیسے اس کے دل کی دھڑکن بند ہو جائے گی۔

”نہیں...“ بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا تھا ”نہیں ابرا! پلیز ایسا مت کہو۔“

”تو پھر تم ایک راستہ منتخب کیوں نہیں کر لیتیں؟ کیا رکھا ہے اس شخص میں؟ اس گھر میں یہاں آکر دیکھو شہلا! میں نے تمہارے لیے کیا کچھ رکھا ہوا ہے اور جو کچھ میرے دل میں ہے وہ تو میں تمہیں دکھا بھی نہیں سکتا۔ یقین کرو شہلا! تم ہاؤس نہ ہو گی۔“

شہلا کو اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا۔

”دیکھو شہلا! اوصاف بات یہ ہے کہ میرے صبر کی حد اب ختم ہو چکی ہے۔“ وہ مزید بولا ”میں اپنے بیٹے سے اب کسی طور علیحدہ نہیں رہوں گا۔ وہ بھی خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا ہے۔ نہ اس کے پاس ماں رہی نہ باپ۔ جب تک تم اس گھر میں نہیں تب تک بات دوسری تھی۔ اب میں سمجھتا ہوں اس کے وہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جبکہ اس کے باپ کے پاس کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیا بہتر سمجھتی ہو؟“

”نہیں؟“ وہ غائب دماغی سے بولی۔

”ہاں تم۔ فیصلے کی تمام ڈوریاں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ یونہی ایک مختلف خانوں میں بیٹھی ہوئی زندگی جیتی رہو یا پھر یہاں آ جاؤ جہاں زندگی مکمل ہے۔ گھر مکمل ہے۔ ہر چیز تمہاری ہے مکمل تصرف کے ساتھ!“

شہلا کو کمرے میں سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا۔ اس نے ذرا سا مڑ کر دیکھا ہاشم نے کس وقت چلا آیا تھا۔ اس تبدیلی کر کے وہ ڈیڑھنگ روم سے باہر آ رہا تھا۔ شاید جس وقت وہ فون سننے کمرے سے باہر گئی تھی تب ہی ہاشم کی واپسی ہوئی تھی۔ موبائل کان سے لگائے وہ غائب دماغی سے ہاشم کو سننے لگی تھی۔

”اور سنو شہلا! ایک بات یاد رکھنا جتنے عرصے تم وہاں ہو اس درمیان تمہیں کسی طور بھی ریگینٹ نہیں ہونا۔ یہ وہ چیز ہے جو تمہیں ایک ناقابل تصور مشکل میں مبتلا کر ڈالے گی۔ تم کسی کنارے نہ لگ سکو گی اسی بھنور میں ہمیشہ کے لیے پھنس جاؤ گی۔ سمجھ رہی ہونا!“

شہلا کے منہ سے ایک لفظ کا نکلتا محال تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے ہاشم کو تنکے جا رہی تھی جو کبھی کبھار اس پر نگاہ ڈال لیتا تھا۔

”جی الامکان اس بات کا خیال رکھنا۔ بی کیئر فل!“

شہلانے موبائل آف کر کے بے جان ہاتھوں سے ایک طرف ڈال دیا۔
”یہ کیسی گفتگو تھی؟“ ہاشم نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا تھا ”نہ ہوں نہ ہاں کون تمہیں لمبی، مڑکی غزلیں سنا رہا تھا؟“

”جی؟“ شہلانے اسے دیکھا ”کیا کہا؟“
ہاشم نے بغور اس کا چہرہ دیکھا پھر نفی میں سر ہلایا۔
”کچھ نہیں!“ وہ بولا تھا۔

”تم اس دن آئیں نہیں۔ میں تمہارا انتظار کرتی رہ گئی۔“ وردہ نے شکوہ کیا تھا۔ ربیعہ نے لان کی روش پر چلتے چلتے رُک کر اس کی جانب دیکھا۔

”اوہ ہاں وردہ!“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی تھی۔ ”مجھے تو تم سے معذرت کا بھی خیال نہ رہا بس اس دن چند ایک کام ایسے نکل آئے تھے۔ میں چاہتے ہوئے بھی نہ آسکی۔“

”خیر جانے دو۔ میں اب تم سے معذرت کی منتی نہیں ہوں یونہی ایک ذکر کر رہی تھی۔“
دونوں پھر آگے بڑھنے لگی تھیں۔ کلاس آف ہونے کے بعد وہ چہل قدمی کر رہی تھیں۔ اگلی کلاس شروع ہونے میں تقریباً ”اوجھا گھٹتی باقی تھا۔ سو وہ گپ شپ کی غرض سے باہر چلی آئی تھیں۔“

”تم نے سرزیدی کے نوٹس تیار کر لیے ہیں؟“ وردہ نے اس سے پوچھا۔
”نہیں۔۔۔ چند ریفرنس بکس کی ضرورت ہے۔ میں آج اپنا کارڈ بھی لانا بھول گئی ہوں۔“ ربیعہ نے بے چارگی سے کہا ”نوٹس ادھورے پڑے ہیں۔“

”سرزیدی اسائنمنٹس کے معاملے میں اچھے بھلے سخت آدمی ہیں۔“ وردہ نے اسے دھمکایا۔ ”ذرا خیال رکھنا۔“

”ہوں۔“ ربیعہ نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔

اس کی نگاہ قدرے فاصلے سے ان ہی کی جانب آتے ہوئے رافعہ پر پڑی تھی۔ لائٹ گرین شرٹ اور بلیک پینٹ میں اس کا سرایا کافی جاذبِ نظر تھا۔ سن گلاسز لگائے کمینوں تک آئینیں فولڈ کیے وہ بے حد پینڈ سم لگ رہا تھا۔
ربیعہ نظریں ہٹا کر کہیں اور دیکھنے لگی تھی۔

”ارے۔“ وردہ کی نظر بھی اس پر پڑی تھی ”یہ تو رافعہ ہیں!“

”السلامو علیکم۔“ وہ ان تک آپہنچا۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ دونوں ہی بولی تھیں۔

ربیعہ نے محسوس کیا، وردہ کے گالوں پر ہلکی سی سرخی آگئی تھی اور لب مسکرانے لگے تھے۔ ربیعہ بھی ہشاشت سے مسکرا دی۔

”کلاس بیک ہو رہی ہے؟“ رافعہ نے انہیں چھیڑا تھا۔

”جی نہیں۔ ہم بہت ریگولر اور پینکچوکل اسٹوڈنٹس ہیں۔“ ربیعہ مسکرائی ”آپ اپنی سنائیے کلاسز ختم ہو جانے کے بعد بھی یہاں نظر آ رہے ہیں۔“

”مجھے ذرا تیریری میں کام تھا۔“ وہ ہنس دیا۔ ”اور یوں بھی یہاں سے جس کا رشتہ ایک بار جڑ جائے، وہ اتنی آسانی سے ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔“

”تیریری!“ ربیعہ کو اچانک ہی خیال آیا تھا ”دو بکس نکلو ادیں اگر زحمت نہ ہو تو۔۔۔ آپ کے تو اچھے خاصے تعلقات بنے ہوئے ہیں!“

”مائی ہیلڈ۔۔۔“ اس نے ذرا سا سر خم کیا۔

ربیعہ نے بیگ سے نوٹ بک نکال کر اسے کتابوں کے نام اکھ دیے۔ رافعہ نے ایک نگاہ ان ناموں پر ڈالی۔

”او کے ربیعہ! میں یہ بکس نکلاؤں گا، مجھے زرا دیر ہو جائے گی۔ میں شام کو بکس آپ کے گھر دے جاؤں گا۔“
 ”بہت مہربانی ہوگی آپ کی۔۔۔“ ربیعہ خوش ہو گئی۔
 ”اب پلیر تکلف سے گریز کریں!“ وہ ہنسا ”میں اب چلتا ہوں۔ مجھے چند ایک ضروری کام ہیں۔ او کے۔۔۔ خدا حافظ!“

وہ ایک سمت کھڑے اپنے منتظر دوستوں کی جانب بڑھ گیا۔ ربیعہ نے مسکراتے ہوئے وردہ کی جانب نگاہ کی اور پھر چونک سی گئی۔ وردہ کے رخساروں پر آجانے والی وہ چمک غائب تھی اور لبوں پر گزشتہ مسکان کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے برعکس وہ خالی خالی نظروں سے دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کو سب کچھ سمجھنے میں لمحہ بھر لگا۔ رافع اس مختصر سے عرصے میں محض ربیعہ سے محو کلام رہا تھا۔ وردہ سے مخاطب ہونے کی اس نے ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ دوسری جانب ربیعہ بھی اس کی اندرونی کیفیت سے بے خبر اپنی ہی کئے گئی تھی۔ شاید ان دونوں نے وردہ کو نظر انداز کیا تھا۔ ربیعہ نے اپنے اندر شرمندگی کی لہر اٹھتی محسوس کی۔ لیکن اس کے پاس ایسا کچھ نہ تھا جس کے لیے وہ وردہ سے معذرت ہی کر سکتی۔

”چلیں؟“ وردہ نے اسے سوچنا دیکھ کر خود ہی کہا تھا ”سرنیہ کی کلاس شروع ہونے والی ہے!“
 ”ہوں؟“ ربیعہ چونکی ”ہاں چلو۔“
 جی ہی جی میں شرمندہ ہوئی وہ اس کے ساتھ چل دی تھی۔

”آہی!“ ناعم نے کمرے میں جھانکا تھا ”چائے پیئیں گی؟“
 نولس بناتی ہوئی وردہ چونک اٹھی۔

”ہاں ضرور۔ میں تو خود ابھی چائے بنانے کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔۔۔“ وہ مصروف سے انداز میں گویا ہوئی۔
 ”پکوڑے بنا لوں ساتھ میں؟ پودینے کی چٹنی کے ساتھ؟“
 وردہ نے اب کی بار خاصی حیرت سے اس کی جانب نگاہ کی۔

”اس میں پوچھنے کی کیا بات؟ نیکی اور پوچھ پوچھ؟“

ناعم کچھ جھینپ کر مسکرائی اور غائب ہو گئی۔ وردہ پین و انتوں میں دبا کر کچھ سوچنے لگی تھی۔ اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ شاید اس کی اور رابعہ بیگم کی نصیحتیں اثر کر رہی تھیں۔ سر جھٹک کر اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہوئی۔ پھر یکدم ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کچھ سوچنے لگی۔

نجانے کیا بات تھی ایسی! کتابوں میں دل نہ لگ رہا تھا۔ نجانے کیسا احساس تھا جو مسلسل تعاقب کر رہا تھا۔۔۔ وہ کس سوچ سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی! اسے خود سمجھ میں نہ آ رہا تھا! ناعم جلد ہی آگئی تھی۔ اس نے ٹرے میں قرینے سے برتن سیٹ کیے ہوئے تھے۔ ایک پلیٹ میں گرم گرم پکوڑے، چینی کی پیالی میں خوش رنگ چٹنی اور ساتھ میں دم کی ہوئی چائے۔

وردہ نے بے حد حیرانی سے ہر چیز ملاحظہ کی۔

”یہ اتنی جلدی؟“ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”آدھے گھنٹے سے بھی کم عرصے میں تم نے یہ سب کچھ کر لیا؟“
 ”کیا کرتا تھا آئی؟“ وہ بے حد اطمینان سے تھی ”پکوڑا مکس سے پانچ منٹ میں پکوڑے بن جاتے ہیں۔ یہ گرین چٹنی بھی نیٹسل والوں کی کرامت ہے۔ ہاں چائے میں کچھ دیر لگی ہے۔ اس میں میرا کمال کیا ہے؟“
 ”اوہ۔“ وردہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے کہا“ میری بہن سکھو ابے میں مجھ سے بھی دو تھ آگے نکل گئی ہے شاید۔ ویسے پیاری بہن! یہ ریڈی میڈ چیزیں گھر کی بنی ہوئی چیزوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتیں۔ خیال رکھنا!“

”میں تو اس انتہائی کر سکتی ہوں۔“ وہ گرما گرم پکڑوں سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔ ”اور اس سے پہلے کہ یہ پلیٹ میں اکیلی ہی صاف کرجاؤں! پناہ خدود وصول کر لیں!“

”ای کو بھی بلا لو نا۔“ وردہ نے اسے گھورا۔

”جناب! امی ثانی امی کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ وہ اور ثانی اماں آج کل ایقان خالہ کے مسئلے پر روزانہ پرزور گفتگو کرتی ہیں۔“

”ہاں!“ وردہ کے چہرے پر ملال ابھرا ”ایقان خالہ!“

”آئی!“ ناعمہ نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کیے ”ایک بات کہنی تھی آپ سے۔ میں کئی دن سے سوچ رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا کیسے کروں؟“

”ہائیں۔“ وردہ کو حیرت ہوئی ”تمہارے منہ پھٹ پن سے مجھے یہ امید تو نہیں ہے کہ کوئی بات کہنے میں تم کئی دن لگاؤ اور وہ بھی مجھ سے؟ مجھ سے تمہارا کیا پردہ ہے؟“ ناعمہ کے چہرے پر کش کش کے رنگ ابھرے تھے۔

”آئی! فریجہ کافون آیا تھا کچھ دن پہلے۔ وہ چاہتی تھی کہ میں فراز سے فون پر بات کروں۔ میں نے اسے پہلے تو منع کر دیا لیکن اس کے اصرار پر میں نے کہا کہ میں آئی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔“

وردہ کے ہاتھ میں پکڑا تھا جسے وہ منہ میں ڈالنا بھول گئی۔ وہ ناعمہ کو دیکھ گئی۔

”اتنی بھی؟“ وردہ کو ہنسی آئی ”سچ کہا تم نے۔ بس تھوڑی سی کم عقل ہو اور مجھے لگتا ہے کہ یہ خامی بھی دور ہوتی جا رہی ہے۔ خیر جہاں تک فراز سے بات کر لینے کی بات ہے، تمہارا خیال ہے کہ ایک حد اور تمیز کے اندر رہ کر بات کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ میں امی سے بھی ڈس کس کر لوں گی، مجھے نہیں لگتا کہ انہیں کوئی اعتراض ہو گا۔ رافع کے حوالے سے انہوں نے کبھی مجھ پر کوئی معمولی سی پابندی بھی نہیں لگائی۔ اسی لیے مجھے کبھی اس رشتہ کے خاص ہونے کا اتنا احساس بھی نہیں ہوا اور پھر ان کی فیملی اچھی بھلی ماؤں ہے۔ جب ہم نے ان سے رشتہ جوڑا ہے تو پھر ہمیں ان باتوں کو بھی بد نظر رکھنا ہو گا۔ اب اگر فریجہ کافون آئے تو تم بے شک فراز سے بات کر لیتا لیکن اخلاقی تقاضوں کو بد نظر رکھتے ہوئے سمجھ رہی ہو تا میری بات کو۔“

”جی آئی۔“ ناعمہ کی آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ اسے وردہ سے یہ ٹاپک ڈسکس کرتے ہوئے جو جھینپ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا عکس اس کے چہرے پر واضح تھا۔

”چلو اب تم مجھے چائے کا کپ دو اور اپنے یہ ریڈی میڈ پکڑو لے کر بھاگو میراں سے۔ مجھے بہت سارا کام کرنا ہے۔“

وہ اپنی کتابوں کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ ناعمہ اس کے لیے چائے بنانے لگی۔ ناعمہ کے جانے کے بعد وردہ ایک مرتبہ پھر سوچوں کا شکار ہونے لگی تھی۔ فراز اس نئے رشتے کے حوالے سے ناعمہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کہیں، کسی گوشے میں اس احساس کو ڈھونڈنے کی ناکام سعی کی۔ پھر ایک سانس بھر کر چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا تھا!

رات کا شاید آخری پر تھا۔ سونے کی کوشش میں ہر طرح سے ناکام ہو کر شہلانے بے چینی سے ایک مرتبہ پھر گھڑی کی جانب دیکھا تھا۔

ساڑھے تین بج رہے تھے۔ شہلانے بے قرار ہو کر کروش بدلی۔

”میں عمر کو اپنی کسٹڈی میں لینا چاہتا ہوں قانونی طور پر۔“ اس کے کانوں میں ابرار کے الفاظ گونجے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ بستر سے اتر کر بے قراری سے کمرے میں شہلے لگی۔

”جب تک تم اس گھر میں تمہیں تب تک بات دوسری تھی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ اس کے دہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ جب کہ اس کے باپ کے پاس کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے!“ شہلانے بے بسی سے لب کاٹے۔

ابرار کی بات کسی صورت بھی غلط نہ تھی۔ عمر اپنے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی اپنی ثانی کے گھر رہ رہا تھا۔ وہاں

سے بھی دور ہو گیا تھا اور باپ سے بھی۔ ایسی صورت میں اگر واقعی ابرار قانون کے ذریعے اسے حاصل کرنا چاہتا تو اسے پہلی کوشش میں ہی کامیابی مل جاتی۔ یوں بھی شہلا بخوبی جانتی تھی کہ قانونی طور پر عمر ابرار کا ہی تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس کے خلق میں کانٹے لگ آئے ہوں۔ عمر سے جدا ہونے کا تصور جان لیوا تھا۔ عمر تو اس کے سینے میں دل کی جگہ دھڑکتا تھا۔ وہ کیسے اسے نظروں سے دور کرنے کے بارے میں سوچ سکتی تھی بھلا؟

”میں نے غلطی کی ہے۔“ وہ ذریعہ بڑبڑاتی ”شادی کر کے میں نے اپنی زندگی کی بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ اگر عمر کو لے گیا تو کیا رہے گا میرے پاس؟“ یہ درست تھا کہ وہ شادی کر کے ہاشم کے ساتھ چلی آئی تھی لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس کا عزیز ازجان بیٹا چند قدم کے فاصلے پر موجود ہے۔ وہ جب چاہے اس سے ملنے کے لیے جا سکتی ہے۔ بلکہ وہ خود روزانہ ہی چلا آتا تھا۔ فردوس بیگم کے نامناسب رویے اور غصیلی نگاہوں کی پروا کیے بغیر۔ پھر شروع سے ہی وہ منترہ بیگم کے بے حد قریب رہا تھا۔ ماں سے زیادہ اسے نانی کے قرب کی عادت تھی۔ ابرار کے ساتھ جا کر وہ مینٹلی طور پر کس قدر ڈسٹرب ہو سکتا تھا، شہلا کو بخوبی اندازہ تھا۔ اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ کر رہ جاتی۔

”فیصلے کی تمام ڈوریاں تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔“ اسے پھر ابرار کی بات یاد آئی ”یونہی ایک مختلف خانوں میں بٹی ہوئی زندگی جیتیں ہو یا پھر یہاں آجاؤ۔ جہاں زندگی مکمل ہے، گھر مکمل ہے ہر چیز تمہاری ہے، مکمل تصرف کے ساتھ!“

شہلانے لب بھینچے تھے۔ ایک تکلیف دہ احساس نے اس کے وجود کا احاطہ کیا تھا۔ وہ اس شخص کا گریبان پکڑ کر اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ جب اس نے ساری دنیا کو چھوڑ کر اس کا انتخاب کیا تھا تب یہ مکمل زندگی، مکمل گھر اور مکمل تصرف کہاں تھا؟ تب کیوں اس نے اسے ایک ایسے گھر میں لے جا چھوڑا تھا جہاں کچھ بھی اس کا نہ تھا بلکہ جہاں ابرار کی دعوے دار ایک عورت پہلے سے موجود تھی۔

وہ عورت اب کہاں تھی؟ وہ بچے کہاں تھے؟ وہ بہت سے سوال پوچھنا چاہتی تھی لیکن اسے ایسا کرنا زیب نہ دیتا تھا۔ ان سوالات سے وہ کوئی بھی مطلب اخذ کر سکتا تھا۔ شہلا دل ہی دل میں شرمندہ ہو جاتی اگر اس کے الفاظ کوئی اور معنی اختیار کر لیتے۔ لیکن اب بھی کوئی راستہ بھجائی نہ دیتا تھا۔ اب بھی ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ بے بسی کے احساس تلے دب کر اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں۔ آنکھوں کو ہتھیلیوں سے پوچھتے ہوئے وہ بستر تک چلی آئی۔

اپنی جگہ پر لیٹتے ہوئے اسے اچانک ہی دھچکا سا لگا، ہاشم کھلی آنکھوں سے اس کی جانب متوجہ تھا۔ شہلانے بے اختیار ہی ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں صاف کرنا چاہی تھیں۔ ہاشم نے ہاتھ بدھا کر اس کے رخسار کو چھوا اور اپنی انگلیوں پر نمی کو محسوس کیا۔

”شہلا!“ وہ گہمیر آواز میں بولا۔

”جی۔۔۔“ وہ اپنی جگہ چوری بن گئی تھی۔

”رات کے اس پہر۔۔۔ یوں اکیلے میں اس طرح رونے کی وجہ جان سکتا ہوں؟“

ہاشم کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے شہلا کے اعصاب کو پتھر کی طرح منجمد کر دیا تھا۔

”شہلا گھبرا کر اٹھ کر بیٹھی تھی۔ اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ بظاہر سویا ہوا محسوس ہوتا ہاشم نہ صرف جاگ رہا ہو گا بلکہ اس کی۔ بے چینی اور بے قراری کا یہی شاید بھی ہو گا۔ شہلا کو یوں لگا جیسے ہاشم کی آنکھوں میں اس کے سوال سے بڑھ کر بے اعتباری تھی۔ ہاشم نہایت آہستگی سے اٹھ بیٹھا۔ تکیے سے ٹیک لگا کر اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لیے تھے اور اب سوالیہ نظروں سے شہلا کی جانب دیکھ رہا تھا۔ خوب صورت نائٹ لیپ کی مدھم دودھیا روشنی میں شہلا ان آنکھوں کو بخوبی پڑھ سکتی تھی۔ اس نے غیر شعوری طور پر اپنے گالوں پر آئے آنسو کو ایک بار پھر صاف کرنا چاہا۔ ہاشم پورے حواسوں کے ساتھ اس کی جانب متوجہ تھا۔

”شہلا!“ اس نے بے حد دھیمی آواز میں پکارا۔ ”میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟“ شہلا سے کوئی جواب نہ دیا۔ وہی نظریں اٹھائی گئیں۔
 ”کیا ان آنسوؤں کی آمد میں میری کسی کوتاہی کا عمل دخل ہے؟“
 ”نہیں نہیں۔“ اب کی بار وہ بے اختیار ہی پولی تھی۔ ”ایسا ہرگز نہ سوچیں ہاشم! آپ سے مجھے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی یہ تو بس یونسی میں کچھ ڈپرہسٹ تھی!“
 ”وہی تو پوچھ رہا ہوں وجہ ڈپریشن؟“ اس نے سر ہانے رکھے ٹائم پیم کی جانب دیکھا۔
 ”آخر ایسی کون سی بات ہے جو رات کے اس پسر تھیں یوں رلا رہی ہے۔۔۔ یہ وقت تو اللہ والوں کا ہوتا ہے یا پھر دل والوں کا۔“

شہلا نے بے اختیار چونک کر اسے دیکھا۔

”میں۔۔۔ سمجھی نہیں؟“

ہاشم کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی۔

”جیسے میں نہیں سمجھا۔۔۔ میرے سوال کا جواب ابھی تک ادا ہوا ہے۔“ شہلا بے طرح جبر ہوئی۔

”ہاشم! میں، میں شاید عمر کو مس کر رہی تھی۔ مجھے یونسی رونے آ گیا ہے وجہ بے اختیار۔ آپ پلیرز پریشان نہ ہوں۔۔۔“
 ”عمر کو مس کر رہی تھیں؟“ اس نے جیسے خود کلامی کی۔ ”عمر کو تو ہم نے رات بارہ بجے گھر ڈراپ کیا ہے۔ کتنی دیر تک ہم نے ساتھ وقت گزارا ہے اور تم عمر کو مس کر رہی تھیں؟“ اس کے لہجے میں نجانے کیا تھا۔ شہلا کا جی چاہا وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر وہاں سے غائب ہو جائے۔

”پلیرز ہاشم!“ وہ لیٹ گئی۔ ”میں سونا چاہتی ہوں بہت دیر ہو گئی ہے۔“

اس نے آنکھوں پر یوں بازو رکھا جیسے اب مزید گفتگو کے لیے کچھ بچانہ ہو۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نیند تو اب بہت دیر کے لیے آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے ہاشم کی سائڈ ٹیبل کی دراز کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنی۔ پھر اس نے ہاشم کو اپنی جگہ سے اٹھ کر جاتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ گیلری کا دروازہ کھول رہا تھا۔

شہلا سمجھ گئی تھی۔ جب کبھی اسے سگریٹ کی طلب ہوتی تھی تو وہ گیلری میں چلا جاتا تھا۔ رات کے اس پسر اسے سگریٹ کی طلب کیوں ہوتی تھی؟ شہلا کا دل معمول سے ہٹ کر دھڑکنے لگا۔ شہلا کی حرکت سے نجانے اس نے اپنے طور پر کیا اخذ کیا تھا۔ شہلا کا جی چاہا کہ وہ جا کر اس سے صاف صاف پوچھ لے کہ وہ کیا سوچ رہا ہے لیکن اس کے اندر اتنی ہمت نہ تھی۔ وہ چپ چاپ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی رہی۔ گیلری میں کھڑا ہاشم سگریٹ کے کش لیتے ہوئے کیس دور دیکھ رہا تھا۔

باہر گاڑی کا ہارن بجتی ہی وہ تینوں پر جوش انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ عمر سب سے پہلے شور مچاتا ہوا باہر کی جانب دوڑ گیا۔

”ماموں آگئے۔۔۔ ماموں آگئے۔“

ربیعہ، انیقہ اور منیرہ بیگم بھی لاؤنچ کا دروازہ کھول کر سیڑھیوں تک آگئی تھیں۔ فراز اور عباد لکڑی کا دروازہ کھول کر اندر آ رہے تھے۔ عمر کو دیکھ کر عباد نے اپنا اپنی کیس نیچے رکھ دیا اور اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

”بھئی۔۔۔ بھانجیا تو ماشاء اللہ شیریں گیا ہے!“ اس نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”اب تو جم کر ریسنگ ہوگی۔“

”ہر ادوں گا۔۔۔“ اس نے مکالمہ لیا۔

”مائی ہلزور جانو۔۔۔ عباد نے ققہہ لگایا۔

پھر عمر کو اتار کر وہ ان تینوں کی جانب بڑھا تھا۔

”اسلامو علیکم۔۔۔ وہاں سے لپٹ گیا۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے محبت سے اس کا ماتھا چوما۔ ”میری آنکھوں کی ٹھنڈک آگئی۔ اللہ میاں نے میری دعائیں سن لیں۔ اب نہیں جانے دوں گی۔ سن لو!“

”قارغ ہو کر آیا ہوں۔“ وہ ہنسا ”بے فکر ہو جائیں آپ کی گود میں سویا کروں گا۔“ انیقہ اور ربیعہ ہنس پڑیں۔

”اور بھئی کیا حال ہیں آپ دونوں کے۔“ وہ ان کی جانب متوجہ ہوا۔ ”پڑھائیاں کیسی جاری ہیں؟ نقلیں

و نقلیں چل رہی ہیں یا رے کاہی سارا ہے؟“

اس کی بات پر انیقہ نے ناک چڑھائی جبکہ ربیعہ دل کھول کر ہنسی تھی۔

”توبہ ہے عباد بھائی! اتنا گنا گزرا سمجھتے ہیں آپ ہمیں۔“

”ساری پڑھائیاں انہوں نے جو اپنے نام لکھوائی ہیں۔“ انیقہ، فراز کے سامنے ایسے بیمار کس پر جخل ہو رہی تھی۔

فراز بھی ان کی گفتگو سے محظوظ ہوتا مسکرا رہا تھا۔ اس نے بھی برہہ کر ان لوگوں سے سلام دعا کی پھر عباد سے مخاطب ہوا۔

”غلام کو اجازت ہے جناب؟ رخصت لے سکتا ہوں؟“

”جی نہیں۔“ عباد نے اسے گھورا۔ ”تمہاری میں نے خبر کہاں لی ہے اب تک؟ تم چائے کے ساتھ کئی طرح کے لوازمات لاؤ گے اور ہماری تواضع کرو گے ہاں البتہ چائے تمہیں ہماری طرف سے مفت دی جائے گی۔ چائے کے بعد میں تمہاری کھل کر خبر لوں گا۔“

”ارے ارے۔“ منیزہ بیگم حد درجہ حیران ہوئی تھیں۔ ”اس غریب نے اچانک کیا قصور کر ڈالا ہے جو اس کے ساتھ یہ مجرموں کا سا سلوک ہے۔“ عباد جواب دینے کے بجائے پھر فراز کو گھورنے لگا تھا۔

”ارے میرے بھائی!“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”کیوں مجھے ظالم ساس جیسی نظروں سے دیکھ رہا ہے میں خود کو مظلوم ہو محسوس کرنے لگتا ہوں۔“

”جی ہاں محترم کو اب اس قسم کے رشتے ہی بھائی دیں گے۔“ عباد نے اسے مزید چڑایا۔

”چپ چاپ ہمارے ہی محلے میں ہمارے ہی رشتے داروں کے گھر متگنی کر کے بیٹھ گیا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں۔“

”خبر کیوں نہیں۔“ منیزہ بیگم نے فوراً ہی فراز کی نہایت کی۔ ”بالکل خبر تھی ہمیں۔ متگنی کی مٹھائی بھی دونوں گھر دار اسے آئی تھی۔“

”لیکن میرا اس کا رشتہ تو ذرا اسپیشل ہے امی جی۔!“ عباد ضدی لہجے میں بولا۔ ”مجھے تو بہت پہلے سے سارے معاملے کی خبر ہونا چاہیے تھی نا۔“

”چلیں اب جانے بھی دیں عباد بھائی۔!“ ربیعہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔ ”دوستی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مانڈ نہیں کرتے پھر بھلا دوستی کا مطلب کیا ہوا؟“

”ڈیش اٹ!“ فراز مسکرایا۔ ”تھینک یو ربیعہ!“

”چھوٹی چھوٹی باتیں؟“ عباد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اچھا۔ خیر عونی سہی!“

”جہاں تک چائے کے ساتھ لوازمات کی بات ہے تو اس کا ہم لوگوں نے پورا بندوبست کیا ہوا ہے۔ لوازمات بھی تیار ہیں اور چائے بھی۔“ انیقہ نے بات مکمل کی۔ ”اب آپ سب لوگ اندر تشریف لے چلیں تاکہ شام کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوا جاسکے!“ انیقہ کی بات پر مسکراتے ہوئے سب ہی کے قدم اندر کی جانب برہہ گئے۔

وہ اپنا کہا پورا کرتے ہوئے حقیقت میں منیزہ بیگم کی گود میں سر رکھ کر لیٹنا ہوا تھا۔ اور وہ محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

”بس اب کہیں نہیں جانے دوں گی۔ یاد رکھنا! بہت پرہائیاں ہو گئیں۔ اب ماں کے ساتھ رہو۔ نجانے زندگی میں اب کتنی سانسوں کی مہلت باقی بچی ہے!“

”ہی۔۔۔“ وہ سیدھا ہوا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ ”ایسی باتیں کریں گی تو میں سچ سچ کہیں دور دراز کے ملک میں کسی مشکل سے کورس کے لیے ایڈمیشن لے لوں گا۔ خدا نخواستہ آپ کو کیوں کچھ ہونے لگا۔ ابھی تو ہم نے بہت سی خوشیاں ساتھ مل کر دیکھنا ہیں۔“

”ان شاء اللہ۔۔۔“ وہ کچھ مطمئن، کچھ آزرہ سی ہو کر بولی تھیں۔

”سب سے پہلے انبیہ اور ربیعہ کے لیے رشتے دیکھتے ہیں تاکہ ان کی پرہائی مکمل ہوتے ہی ان کے فرض سے سبکدوش ہوا جاسکے۔“

”بے فکر ہو۔۔۔“ انہوں نے اس کا کان کھینچا۔ ”وہ کہتی ہیں کہ اب تمہارے لیے اچھی سی لڑکی ڈھونڈنی ہے۔ تم ماشاء اللہ پرہائی سے بھی فارغ ہو چکے ہو۔ اور عباد! سچ پوچھو تو میری اپنی خواہش بھی یہی ہے کہ جلد از جلد تمہارے سر پر سراسجا ہوا دیکھوں۔“

”اوہ ہوائی!“ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”یہ آپ کن چکروں میں پڑ گئیں ابھی تو میری ڈھیر ساری پلاننگز ہیں جن پر مجھے عمل کرنا ہے۔ پرہائی سے فارغ ہوتے ہی سر پر سراسجا باندھنے کا مجھے بالکل شوق نہیں، ابھی تو میدانِ عمل میں قدم رکھنا ابھی ہے اور جانا ابھی۔“

”تمہارے ابو اتنی زمین چھوڑ گئے ہیں تمہارے لیے۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”تمہیں ابھی سے یہ فکریں پالنے کی کیا ضرورت؟ اچھا بھلا گزارا ہو رہا ہے ہمارا۔“

”وہ میری بھولی ماں۔۔۔! اس نے ان کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھما۔ ”یہ دور باپ دادا کی جاگیر پر عیش کرنے والا نہیں ہے یہاں اپنے زور بازو دکھانا پڑتا ہے تب انسان کی کوئی ویلیو بنتی ہے۔“

”ہاں! چاند رکنندہ لو گے۔“

”کوشش تو ضرور کریں گے۔“ وہ ہنسا پھر قدرے سنجیدگی سے بولا ”امی! میری ملاقات پچھلے دنوں امیر حسن سے ہوئی ہے۔“

”امیر حسن؟“ وہ تعجب سے بولیں۔ ”یہ کون ہے؟“

”ہے تو میرا ہم عمر۔ لیکن پرہائی اور تجربے میں مجھ سے کہیں آگے ہے۔ اس کا بزنس لندن میں ہے اب اسے وسعت دینے کے لیے وہ یہاں آیا ہوا ہے۔ وہاں لندن میں اس کے کاروباری پارٹنرز بزنس سنبھال رہے ہیں۔ بہت بڑے پیمانے کا کام ہے جس کے لیے اسے یہاں بھی پارٹنرز کی ضرورت ہے جو پیسہ بھی لگائیں اور کام میں بھی مدد دیں میں نے امیر حسن کے ساتھ بزنس شروع کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ چند ایک روز میں ہم پروجیکٹ سائن کر لیں گے اس کے بعد کچھ عرصے تک دن رات کی مصروفیت ہوگا۔“

”عباد۔۔۔!“ وہ کچھ پریشان ہوئیں۔ ”تم نے سب کچھ دیکھ بھال لیا ہے؟“

”آپ بے فکر رہیں۔۔۔ ہاں لیکن ہر نماز کے بعد کامیابی کے لیے دعا کرتا نہ بھولیں۔۔۔“ وہ مسکرایا۔ ”مجھے آپ کی دعا اور اپنی محنت کی قبولیت کا پورا یقین ہے۔“

”اللہ تمہیں ہر طرح سے کامیاب کرے بیٹے!“ وہ کچھ متفکر تھیں۔

”میں بینک سے کافی بڑی رقم بھی نکلاؤں گا امی!“

”میرے بچے سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔“ ان کی پلکوں پر نمی چکنے لگی۔ ”تم جانتے ہو۔۔۔“

عباد نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”سب کچھ آپ کا ہے امی۔! بینک بیلنس، یہ گھر اور ہم سب۔“

”جیتے رہو۔۔۔“ وہ آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگیں۔

پھر جیسے انہیں کچھ دھیان آیا تھا۔
 ”عباد! ایک بات کہوں تم سے۔۔۔ ڈرتی ہوں، کہیں کچھ غلط نہ کہہ بیٹھوں!“
 ”کمال ہے!“ وہ خفا ہوا۔ ”آپ ماں ہو کر ایسی بات کرتی ہیں، آپ کو ہر طرح کی بات کرنے کا حق حاصل ہے۔
 کہیں کیا بات ہے؟“
 ”تم ربیعہ کی شادی کی بات کر رہے تھے نا!“ وہ کچھ ہچکچائیں۔
 ”جی ہاں کیوں کوئی مسئلہ ہے؟“ وہ متعجب ہوا۔
 ”نہیں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولیں۔ ”مسئلہ کیا ہوتا ہے۔ میں سوچتی ہوں عباد! ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی آج کے
 دور میں نایاب ہے اگر اگر تم راضی ہو تو کیوں نہ ہم ربیعہ کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں؟“
 عباد ایک نکتہ ہی خاموش ہو گیا۔ منیذہ بیگم نے امید بھری نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔ عباد نے سر جھکا لیا
 تھا۔

”میں میں نبجائے کیوں اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی!“
 ”امی!“ عباد نے آہستہ سے ان کے ہاتھ تھامے۔ ”میرے لیے آپ کی خواہش سے بڑھ کر اس دنیا میں کچھ
 بھی نہیں لیکن کچھ رشتے ایسے بن جاتے ہیں کہ ان کا احترام لازم ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے بھائی کہتی ہی نہیں حقیقتاً“
 بھائی سمجھتی بھی ہے پھر میں بھی انیقہ اور ربیعہ میں کوئی فرق نہیں پاتا۔ ایسی صورت میں یہ بہت مشکل ہو جائے گا
 کہ۔۔۔“
 اسی لمحے دروازے کے پاس برتنوں کی کھٹک سنائی دی۔ پھر دروازے پر ہلکی سی دستک کے ساتھ ربیعہ نمودار
 ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔
 ”حیرت ہے۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے اندر چلی آئی۔ ”آپ کو اب تک چائے کی طلب نے نہیں ستایا۔۔۔ میں
 خود ہی بنالائی ہوں!“
 ”مجھے پتا تھا کہ ایک بہن نالائق ہے تو دوسری بہت کی ترنگ اور سلیقہ مند ہے۔“ عباد نے اس کا سر ہلایا۔
 ”اور چائے کی خوشبو تو مجھے بہت دیر سے آرہی تھی اس لیے کہنے کا تکلف ہی نہیں کیا!“
 ربیعہ مسکراتے ہوئے کپوں میں چائے ڈالنے لگی۔ منیذہ بیگم نے گہری سانس بھری تھی۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے میز پر رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھا تھا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔
 کتنی ہی دیر سے وہ عجب کش کش کا شکار تھا۔ مشکل تھی کہ سمجھتی ہی نہ تھی۔ حل تھا کہ نکلتا ہی نہ تھا۔ دل کسی
 طور ایک بات پر راضی نہ ہوتا تھا!
 وہ لاپرواہی سے کتابیں ایشو کروا کر لایا تھا۔ دماغ کہتا تھا کہ یہ کتابیں وہ ورودہ کے حوالے کر دے۔ ورودہ اس کی
 دوست تھی وہ اسے کتابیں پونچھا دیتی لیکن دل! دل کہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر، بھول بھال کر اسے کتابیں
 پہنچانے چل دے۔ آنکھیں ایک مرتبہ اس کے دیدار سے سیراب ہو جائیں پھر جو ہو سو ہو۔
 ”تم واقعی اچھی لڑکی ہو
 یا مجھ کو اچھی لگتی ہو!“

اس نے آنکھیں موند کر سوچا تھا۔ پردہ ذہن پر لمحے کے ہزارویں حصے میں وہی موہنی صورت مسکرانے لگی
 تھی۔ رافع بے بسی سے آنکھیں کھول کر پیشانی پر ہلکے ہلکے مارنے لگا اسے ہاشم یاد آنے لگا تھا۔ کتنا ذائقہ اڑایا
 کرتا تھا وہ اس کے جذباتوں کا، اس کی محبت کا، اس کی بے بسی کا۔ آج وہ خود اسی مقام پر کھڑا تھا اور اس کے اپنے
 جملوں کی بازگشت اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔
 ”یار شاعر!“ اسے ہاشم کا انداز تحاطب یاد آیا۔ اس کے لبوں پر اداسی بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”یار! بندر آیا
 جانے اور رک کا مڑو!“

”چلو ہم بند رہی سہی!“ وہ مزے سے کہا کرتا۔
 ”تو گویا عشق نے انسان بنادیا!“ اس نے سوچا اور دھیرے سے مسکرایا۔
 ”عشق؟“ کسی نے چپکے سے سرگوشی کی تھی۔ ”عشق کرنے لگے ہو؟ واقعی؟“ رافع گھبرا سا گیا۔ اس نے ادھر ادھر دکھا۔ جیسے چوری پکڑ لیے جانے کا ڈر ہو۔
 ”ہاں۔۔۔ شاید!“ پھر اس نے بھی دل میں چپکے سے کہا تھا۔
 ”انجام جانتے ہو؟“
 ”آغازِ انجام کب سوچا جاتا ہے۔۔۔“ دل ضدی ہوا۔
 ”جو عقل رُمٹے ہیں وہ سوچ کر چلتے ہیں۔“
 ”عشق اور عقل؟ ساتھ ساتھ؟“ دل استہزائیہ ہوا۔ ”عشق کی کرشمہ سازیاں دیکھ کر تو عقل کا منہ حیرت سے کھلا رہ جاتا ہے!“
 ”اچھا!“ کوئی اور بھی ہوا۔ ”عشق تو جرأت و بے خودی سے معمور ہوتا ہے۔۔۔ جرأت ہے تو اٹھاؤ کتابیں اور چل بیٹھو اس کے گھر کی راہ پر۔“
 ”لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ وہ بے کل ہوا۔
 ”بابا بابا۔۔۔“ دوسری جانب سے زبردست قہقہہ پڑا۔
 رافع نے بے بسی سے اپنی پیشانی میز پر ٹکادی تھی۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ ربیعہ نے ایک نگاہ اپنے برابر سوئے ہوئے عمر پر ڈالی پھر اس نے فرطِ محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔
 انیسفہ کے امتحان ہو رہے تھے سو اس نے اسٹڈی روم کو ہی اپنا بند روم بھی بنالیا تھا۔ ربیعہ عمر کے ساتھ سو جایا کرتی تھی۔ لیکن آج نجانے کیوں نیند آنکھوں سے روٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
 وہ اٹھ کر کمڑکی تک چلی آئی۔ پردہ ہٹا کر اس نے سلائیڈنگ ڈور کھول دیا اور باہر دیکھنے لگی۔ لان میں رات کی رانی کا مکمل راج تھا۔ ربیعہ نے گہری سانس بھری تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے ساتھ ڈھیر سی خوشبو اس کے اندر اتر گئی۔

”ربیعہ جیتی، میرا لڑکی آج کل کے دور میں نایاب ہے۔ اگر تم راضی ہو تو کیوں نہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ رکھ لیں۔۔۔“
 اس کے کانوں میں منیہہ بیگم کی آواز کی بازگشت لہرائی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے بے کل ہوئی تھی۔ پھر عباد کی باتیں یاد آنے لگیں تو اس نے سکون کا سانس بھرا۔

سچ تو یہ تھا کہ یہ گھر ایسے بھی بے حد پسند تھا۔ یہاں کے مکینوں کے لیے اس کے دل میں بے حد فطری اور جدی محبت پیدا ہو چکی تھی۔ وہ بھی ہمیشہ بیس رہنا چاہتی تھی لیکن جس حوالے سے منیہہ بیگم نے یہ بات سوچی تھی ربیعہ کے لیے اس کا تصور بھی محال تھا۔ عباد نے ٹھیک کہا تھا۔ ربیعہ کے لیے اب اپنے پرانے حقیقی، غیر حقیقی کا تصور ختم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے عباد بھائی تھا، صرف بھائی۔ منیہہ بیگم ماں تھیں اور انیسفہ اور شہلا بہنیں۔ اسی گھر میں رہتے ہوئے ان رشتوں کے بدلنے کا خیال قطعاً ناقابلِ قبول تھا۔ لیکن طمانیت کی بات یہ تھی کہ خود عباد بھی اس کا ہم خیال تھا۔ ربیعہ وہیں کھڑی سوچتی رہی۔ پھر اسے خیال آیا۔

”کیا اس کی بے گلی بے قراری کی وجہ محض یہی تھی؟“
 اس سے پرے اس سے سوا بھی کچھ تھا جس نے اس کی آنکھوں سے نیند کو دور کیا ہوا تھا۔ کیا تھا وہ؟ ربیعہ اٹھلیاں چٹھانے لگی۔ عجب مشکل میں دل آں پھنسا تھا۔ آخر کیا تھا اس؟ ”میں جو اسے یوں بے چین کر گیا تھا؟ وہ

کیوں ناچا جتے ہوئے بھی اس کے متعلق سوچتی تھی؟ وہ کیوں اسے دیکھنے کی مسمیٰ رہتی تھی۔ ان مسکراتی آنکھوں کے سحر کو کیا نام دیا جاسکتا تھا؟

دیوار سے لگ کر کھڑے کھڑے اس نے خود سے لاتعداد سوالات کر ڈالے تھے جن میں سے کسی کا بھی جواب اس کے پاس نہ تھا۔

”کیا تم اس سے محبت کرنے لگی ہو؟“ چانک ہی ایک سوال اس کے اندر سے ابھرا تھا۔
ربیعہ اس سوال سے خوفزدہ ہو گئی۔ اس جواب سے تو وہ نجانے کب سے نظریں چرا رہی تھی۔
”شاید۔۔۔ ہاں۔۔۔“ اس نے سوچنا چاہا۔

تب ہی ایک معصوم، مسکراتی صورت اسے یاد آئی۔ وہ ورہ کا چہرہ تھا۔ پُر خلوص اور سچی ورہ کا۔
”نہیں۔۔۔“ اس نے بے چین ہو کر کہا ”نہیں بالکل نہیں۔ میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ میں اس کے متعلق سوچتا بھی نہیں چاہتی مجھے نہیں پتا وہ کون ہے۔“
اس نے سلائیڈنگ ڈور بند کیا اور ایک جھٹکے سے پردہ برابر کر دیا۔ پھر وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی بستر تک آئی تھی۔
تکبے کے سارے نیم دراز ہو کر اس نے آنکھیں موندیں۔ تب اسے احساس ہوا ”اس کے اندر کوئی چپکے چپکے اس پر ہنس رہا تھا۔ ربیعہ نے بے بسی سے اپنا سر بیڈ کی پشت سے ٹکا دیا۔

”ناعمہ۔۔۔ ناعمہ!“ رابعہ بیگم اسے آواز میں دے رہی تھیں۔ وہ کپڑے استری کر رہی تھی۔ یونہی اٹھ کر باہر چلی آئی۔

”جی امی۔۔۔“ اس نے دروازے کی چو کھٹ سے ہی پوچھا تھا۔
”تمہارا فون ہے۔۔۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولیں۔ ”بات کر لو۔۔۔“
”کس کا ہے؟“ وہ فون کی جانب بڑھنے لگی۔
”فریحہ کا!“

ناعمہ کے قدم یک لخت ہی سست پڑے، چہرے پر پریشانی سی نمایاں ہوئی۔ اس نے آنکھوں سے ماں کی جانب دیکھا۔

وہ جانتی تھی، فون فریحہ کا ہی تھا لیکن فریحہ کے ساتھ کون موجود تھا اسے اس بات کی بھی خبر تھی۔ ہر چند کہ ورہ اسے اجازت دے چکی تھی بلکہ شاید اس نے اب تک رابعہ بیگم سے بھی یہ بات ڈسکس کر لی تھی، لیکن پھر بھی ایک حجاب تھا جسے اٹھانا ناعمہ کے لیے بے حد مشکل امر تھا۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے ریسیور اٹھا کر حتی الامکان آہستہ آواز میں کہا۔
”ہائے!“ دوسری جانب سے فریحہ کی شوخ، تھکتی ہوئی آواز آئی ”کیا ہو رہا ہے جناب؟“
”کچھ بھی نہیں۔۔۔ بس یونہی۔۔۔“
”ڈسٹرپ تو نہیں کیا آپ کو؟“

”نہیں نہیں۔۔۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، آپ سنائیں کیسی ہیں؟“
”بھئی۔۔۔ یہ ہم عمر نندہاج میں آپ جناب نہیں چلنے والا۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”میری اور تمہاری تو خوب لڑائیاں ہوا کریں گی۔ میں بہت لڑا کا طبیعت کی ہوں۔ خیال رکھنا۔“
ناعمہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے تھے۔ شاید فریحہ نے ہی گپ شب لگانے کے لیے فون کیا تھا۔ وہ غلط سمجھ بیٹھی تھی۔

”تم تو میں بھی نہیں ہوں۔“ وہ اپنی جون میں آئی۔ ”مقابلہ تو پھر کانٹے کا ہی ہو گا!“ فریحہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا۔

”اچھا۔۔۔ بھائی سے خوب شکایتیں لگایا کرو گی میری، ہے نا؟“ ناعمہ جھینپ سی گئی۔
”نہیں خیر لگائی بھائی کی عادت تو نہیں ہے مجھے۔ وہ تو ورہ آپی ہی مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔۔۔ انہوں نے ہی کہا ہو گا تم سے۔۔۔“

”تو بھی۔۔۔ چور کی داڑھی میں تنکا۔“ ایک اور قہقہہ لگا ”اچھا خیر ہمارا نام تو پورا ہوا۔ یہ بھائی مجھے خوب خوب گھور رہے ہیں اور اب تو انہوں نے تار کھینچنی شروع کر دی ہے۔ تم اب ان سے صفائیاں پیش کرو میں تو چلی!“
ناعمہ کو اچانک ہی رگوں میں خون خشک ہونے کا احساس ہوا اس کے لگا اس کی آواز بیٹھ گئی ہے۔
”ہیلو۔۔۔!“ دوسری جانب سے قدرے سنجیدہ لیکن خوب صورت مردانہ آواز ابھری تھی۔ ناعمہ خاموش رہی۔ اس نے کمر اٹھایا۔ قدرے فاصلے پر بیٹھی ماں کی جانب دیکھا تھا جو کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ پتہ نہیں وہ اس کی جانب متوجہ تھیں یا نہیں۔

”ہیلو!“ دوسری جانب سے پھر کہا گیا۔
”جی۔۔۔“ وہ کسی مجرم کی طرح مری مری آواز میں بولی تھی۔
”یہ میری آواز سن کر سانپ کیوں سونگھ گیا ہے تمہیں؟ آواز پہچانی نہیں یا پھر آواز پہچان کر یہ حال ہوا ہے؟“
نہایت سنجیدہ اور قدرے سخت انداز میں کہا گیا تھا۔ ناعمہ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔
”جی۔۔۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
”کیسی بات؟ کھل کر بتاؤ۔۔۔ آواز پہچانی ہے یا نہیں پہچانی؟“ فراز قدرے طنز سے بولا۔
”آواز میں بھلا کیسے۔۔۔“ اسے پھر فریب بیٹھی ماں کا خیال آیا۔
”ہوں!“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ”زیادہ لوگوں سے باتیں کرنے سے یہی ہوتا ہے۔ آوازیں آپس میں گٹھ ہو جاتی ہیں ویسے سچ کہوں تو مجھ سے بھی تمہاری آواز نہیں پہچانی جا رہی ہے۔ تمہارے انداز بڑے بدلے بدلے ہیں۔ تم کیا گٹھ میل کر رہی ہو؟“

”جی؟“ اب کی بار وہ حقیقتاً ”پریشان ہوئی۔“ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟“ فراز دھیرے سے ہنسا تھا۔
”ہمت خوب۔۔۔ بانی داوے یہ یہ نیا نمبر کیوں لیا گیا ہے؟ وہ بچھلا نمبر اب کس۔۔۔ کپاس ہے؟“
”بچھلا نمبر؟“ وہ گم سم سی ہوئی۔ ”اب“ آپ۔۔۔“
”ناعمہ۔۔۔!“ رابعہ بیگم اچانک ہی زور سے بولی تھیں۔
”جی امی جی!“ وہ پہلے ہی ہراساں تھی۔ زور سے ریسوور لھ کر پلٹی۔
”کیا جل رہا ہے؟ تم استری کھلی چھوڑ آئی ہو؟“

ناعمہ تیزی سے اندر کی سمت دوڑی تھی۔ رابعہ بیگم بھی اس کے پیچھے آئیں۔ کچن سے نکل کر ورہ بھی آگئی تھی۔ ناعمہ نے واقعی استری بند کیے بغیر اپنی نئی قمیص پر چھوڑی ہوئی تھی۔ قمیص جل کر سیاہ ہو چکی تھی اور اس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔
ورہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر بٹن بند کیا اور استری اٹھا کر جگہ پر رکھی۔ ناعمہ صدمے سے اپنی قمیص کا شتر دیکھ رہی تھی۔

”یہ لڑکی اپنے حواسوں میں کبھی ہوتی ہے؟ نہ جانے دھیان کہاں انکار رہتا ہے۔“
رابعہ بیگم بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئیں۔ ناعمہ ان کا مطلب سمجھ کر خفت سے سرخ ہو گئی تھی۔ ورہ نے اس کی صورت دیکھی۔ اسے بے اختیار ہی اس پر ترس آ گیا۔
”چلو کوئی بات نہیں یہ کپڑا تو بہت سے مارکیٹ میں میں تمہیں کل ہی نئی قمیص کا کپڑا لا دوں گی۔“
”ہوں؟“ اس نے چونک کر بہن کو دیکھا۔ ”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“
ورہ نے غور سے اسے دیکھا تھا۔ ”کس کا فون تھا؟“ اس نے سرسری سا پوچھا۔ ”فریحہ کا؟“

”جی۔۔۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔
وردہ بہت کچھ سمجھ گئی تھی۔ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ناعمہ اسی پوزیشن میں کھڑی اپنی جلی ہوئی قمیص کو گھورتی رہی۔

دل قدموں کو اور قدم اسے یہاں تک لے تو آئے تھے لیکن بیل بجا کر اب وہ خفت کا شکار تھا۔ نجانے کیوں اس کے جی میں پلٹ جانے کا خیال آیا۔ تب ہی لاؤنچ کا دروازہ کھول کر عبادا ہر آیا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے گیٹ کے اوپر سے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ کا تبادلہ کیا تھا۔
”رافع بھائی!“ عباد نے پر جوش انداز میں ہاتھ ملایا۔ ”آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“
”یہ تو تم سناؤ!“ اس نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”کبھی ملتے ہی نہیں۔۔۔ چھٹیوں میں آکر بھی چپ چاپ تے نکل جاتے ہو۔“

”بس آپ کی شکایتیں ختم“ وہ ہنسا۔ ”اب مستقل طور پر یہیں ڈیرہ جمالیا ہے ہم نے۔ اب خوب محفلیں جما کریں گی اور ہم آپ کی غریبیں سنا کریں گے۔“ رافع دھیرے سے ہنسا تھا۔
”آئیں نا اندر۔ اطمینان سے بیٹھ کر بات کرتے ہیں!“

رافع نے نایک نگاہ سفید سنگ مرمر سے مزین دیواروں پر ڈالی تھی پھر اس نے گہری سانس بھری۔
”نہیں یا۔۔۔! بس چلوں گا میں۔ یہ کتابیں ربیعہ کو دینا چھیں، یہ پلیز اسے پہنچا دیتا۔“
”اچھا!“ عباد نے کتابیں لے کر ان کے نام دیکھے۔ ”لاہیری سے لائے ہیں؟“

”ہاں۔۔۔ ربیعہ اور وردہ نے نوٹس وغیرہ بنائے ہیں۔“
”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن چائے پے بغیر تو آپ جاتے ہیں۔ کچھ تو ہمارے جذبہ میزبانی کا خیال کیجیے۔“
”پھر سہی۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

”اچھا۔۔۔ چلیں جیسے آپ کی خوشی۔ آپ ہمارا دل توڑ کر خوش ہوتے ہیں تو یونہی سہی!“ عباد! ٹھانٹکی سے بولا تھا۔

”میں پھر آؤں گا عباد ابھی ذرا ضروری کام سے جا رہا تھا۔“
”اوکے رافع بھائی۔!“ عباد نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”نافع سے کہیے گا مجھ سے ملے۔“
”ٹھیک ہے۔“ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔
اسے ایک نظر دیکھ لینے کا خیال کس قدر فرحت بخش تھا۔ رافع نے اس خیال کو کس مشکل سے مات دی تھی۔ وہی جانتا تھا۔ دل ادا اس ہو گیا تھا سوچ آزرہ ہوئی تھی لیکن وہ بانٹا تھا یہی ٹھیک تھا۔

گاڑی اسکول کے سامنے رکتے ہی وہ گیٹ سے بھاگا بھاگا چلا آیا تھا۔ شملانے جھک کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آ بیٹھا۔

”السلام وعلیکم ممما۔!“
”وعلیکم السلام جانو!“ اس نے جھک کر اس کے گال چومے ”ہاؤ آریو؟“
”فائن۔۔۔“ وہ مسکرایا۔

”ممما کو تنگ کرنے لگے ہونا۔۔۔“ اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔

”نہیں ممما۔!“ وہ جلدی سے بولا۔ ”بس آج میرا موڈ ہو رہا تھا کہ آپ مجھے پک کریں۔ اسی لیے آپ کو فون کیا۔ آپ تنگ ہوئیں؟“

شملانے ایک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”نہیں۔۔۔ آج تو خیر میری ٹانمگنڈ بھی کی ہیں لیکن روز روزیہ نہیں چلے گا۔ سمجھے؟“

”جی... اس نے سمجھ داری سے سر ہلایا۔

پھر وہ باہر گزرتے مناظر دیکھنے لگا تھا۔

”بڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”فرسٹ کلاس‘ منتہلی ٹیسٹ میں میری رپورٹ سب سے اچھی ہے۔“

”زبردست...“ شملہ نے خوش ہو کر اس کے بال سلائے ”اب آئندہ بھی یہی کارکردگی ہونی چاہیے۔“

”جی ماما...“ اس نے اچانک ہی پکارا۔ ”اس روڈ پر اگر ٹرن کریں ناتو آگے جا کر ایک اور روڈ ہے۔“

وہاں میرا گھر ہے۔“

شملہ نے متعجب ہو کر اس رستے کی جانب دیکھا جو شہر کے پوش ایریا کی طرف جاتا تھا۔

”کس کا گھر ہے؟“

”میرا! وہ مزے سے بولا۔

”تمہارا؟ وہ کیسے؟“

”میرے پیانے بنوایا ہے میرے لیے۔“

شملہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔

”پہا تمہیں یہاں لائے تھے؟ اس گھر میں؟“ کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”جی ماما! بہت شاندار گھر ہے۔ پیانے بولے! یہ تو میں نے اپنے بیٹے کے لیے بنوایا ہے۔ میں نے کہا کہ میں

اتنے بڑے گھر میں اکیلا کیسے رہوں گا... تو وہ بولے... ”اچانک وہ زبان دانتوں میں دبا کر خاموش ہو گیا تھا۔

”ہوں...“ وہ قدرے خالی الذہنی سے بولی۔ ”کیا بولے؟“

”وہ بولے... تمہاری ماما کو بھی اس گھر میں لے کر آئیں گے۔“

شملہ خالی خالی نظروں سے سامنے سڑک کو دیکھتی رہی۔ قریب گزرتی گاڑی نے زور سے ہارن دیا تب وہ چونکی

تھی۔ اس نے عمر کی جانب دیکھا جو اب مزے سے ٹانگیں ہلا رہا تھا۔

”ماما! کچھ دیر بعد وہ پھر بولا تھا۔

”ہوسا... بولو...“ وہ مدھم آواز میں بولی۔

”بچوں کا گھر کون سا ہوتا ہے؟ ان کے پیانے کیان کی ماما کیا پھر ان کی نانوکا؟“

شملہ خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی ابھری تھی۔ اس کے معصوم بیٹے کے لیے واقعی یہ ایک بڑا سوالیہ

نشان تھا کیونکہ ہر بچے کی طرح اس کے ماں باپ کا گھر ایک نہیں تھا۔ ان دونوں کے گھر علیحدہ علیحدہ ہو چکے تھے۔

اس پرستم یہ تھا کہ وہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ رہنے کے بجائے ایک تیسرے گھر میں رہتا تھا جو کہ اس کی

نانی کا تھا۔

”پتائیں نانا ماما! اس نے اصرار کیا۔

شملہ نے ایک گہری سانس بھر کر پلکیں جھپکیں اور نمی اپنے اندر اتارنے لگی۔

”بچوں کے تو سارے ہی گھر ہوتے ہیں بیٹے! پہا ماما، ناتو سب ہی پیار کرتے ہیں نانا بچوں سے۔“

”لیکن پہا کہتے ہیں کہ نانوکے گھر ہوتا میرے لیے صحیح نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں پہا کا گھر ہی بچوں کا اصل گھر

ہوتا ہے۔“

شملہ کے اندر ملال اترنے لگے۔ اس سے کچھ بولا نہ جا سکا۔

”ماما! میں اب اپنے پیانے کے ساتھ رہوں گا۔ ان کے گھر میں۔“ وہ اچانک ہی مصمم انداز میں بولا۔

شملہ کی گرفت اسٹیرنگ پر کمزور پڑنے لگی۔

”کس نے کہا تم سے۔“

”پہا نے کہا ہے۔ لیکن مجھے ان کی بات بہت اچھی لگی ہے۔ میں نانوکے سے ملنے جاؤں گا روز، لیکن رہوں گا

اپنے پہا کے ساتھ ٹھیک ہے نامما۔!

شملہ نے مضطرب سی ہونٹوں تلے دیا لیا تھا۔

”اور اگر آپ ہمارے ساتھ رہنا پسند کریں تو آپ بھی آجائیں۔۔۔۔۔ پھر وہ آہستگی سے بڑا۔

”ہاشم انکل، بہت اچھے ہیں ممما! وہ آپ کو ضرور پریشانی دے دیں گے۔“

شملہ کی اب سمجھ میں آیا تھا کہ عمر آج اس سے ضد کیوں کر رہا تھا کہ وہی اسے اسکول سے واپسی پر لینے آئے۔

اس نے بے حد صراحت سے ابراہار کا پیغام اس تک پہنچا دیا تھا۔ یہ ابراہار (زیبا) سے سن کر وہ بھلا جاتی تھی لیکن آج عمر کے ہونٹوں سے یہی سب کچھ سن کر اس کا ذہن جیسے دور نہیں غلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔ اسے لگا کہ اگر اس نے اپنی کیفیت پر قابو نہ پایا تو وہ ضرور گاڑی کیس مار بیٹھے گی۔ سر بھٹک کر اس نے سڑک پر نگاہ جمائی اور گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔

رات کے کھانے پر وہ بے حد خاموش خاموش سی تھی۔ وردہ نے نئی مرتبہ اس کی کیفیت نوٹ کی لیکن رابعتہ کی موجودگی میں اس نے کچھ بھی پوچھنے سے گریز کیا۔ ناعمہ نے بمشکل چند لفظ لیے پھر وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

وردہ جب ٹیبل صاف کر کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ چائے کا کپ لیے بیٹھی کچھ سوچ رہی تھی۔ وردہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

”ناعمہ۔۔۔۔۔!“

”جی۔۔۔۔۔“ وہ چونک گئی۔

”کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ تم نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا۔۔۔۔۔ مجھے تم کچھ پریشان معلوم ہوتی ہو۔“

”نہیں آپ! ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ وہ تو مجھے ویسے ہی بھوک نہیں تھی، شام کو فروٹ چاٹ کھالی تھی نا۔۔۔۔۔“

”اچھا! اس نے غور سے اسے دیکھا۔ ”مجھے تو لگتا ہے فراز کا فون آنے سے تم کچھ ڈسٹرب ہو گئی ہو۔“

”فراز کا؟“ ناعمہ کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ فون۔“

”خیر۔۔۔۔۔ تمہاری طرح بدھو تو ہوں نہیں میں۔۔۔۔۔ دو آنکھیں اور دو کان نہ صرف رکھتی ہوں بلکہ الحمد للہ عقل سے ارادہ کا استعمال بھی کرنا آتا ہے مجھے۔“

ناعمہ نے سر جھکا لیا۔

”لیکن میں اتنی بدھو کیوں ہوں آپنی؟“ وہ بے بسی سے بولی تھی۔ ”مجھے تو کوئی بات بھی سمجھ میں نہیں آتی۔“

”مثلاً کیا؟“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔ یہ فراز کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کی ایک بات بھی میرے پلے نہیں پڑی۔ عجیب اشاروں اشاروں میں باتیں کر رہا تھا۔ مجھے تو ایسے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ یہ آپ لوگوں نے میرا رشتہ کہاں طے کر دیا ہے۔“

وردہ اس کی بات سن کر پریشان سی ہو گئی۔

”کیسی عجیب باتیں؟ کیا تمہارے ہاتھ؟“

”مجھ سے پوچھ رہا تھا، کیا تم نے میری آواز نہیں پہچانی؟ پھر کہنے لگا تم شاید گلٹ فیل کر رہی ہو۔۔۔۔۔ بھلا میرے پاس ان باتوں کا کیا جواب؟ جب میں پہلی مرتبہ اس کی آواز سنوں گی تو پہچانوں گی کیسے اور مجھے گلٹ کیوں ہونے لگا میں نے کون سا جرم کیا ہے؟“

”فون پر نہ سنی۔۔۔۔۔ عام زندگی میں تو تم نے اس کی آواز سنی ہوگی نا؟“

ناعمہ نے چند لمحوں کے لیے سوچا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاتھ بھائی کی شادی میں اس نے دو ایک مرتبہ مجھے مخاطب کیا تھا۔ لیکن تب بھی اس کا رویہ عجیب سا تھا۔۔۔ اور ہاں!“

اسے یکدم ہی یاد آیا۔
”ایک مرتبہ وہ ہمیں شائنگ سینٹر میں بھی ملا تھا۔۔۔ میں سی ڈیز دیکھ رہی تھی اور وہ وہاں آگیا تھا چچا آپ! تب تو میں اسے کوئی پائل ہی سمجھی تھی اس کا رویہ بالکل بھی نارمل نہیں تھا!“
وردہ کے چہرے پر اب اس کی پریشانی کھل کر ظاہر ہو چکی تھی۔ ناعمل نے اس کا چہرہ دیکھا تو خود بھی پریشان ہو گئی۔
”ہائے آپ!۔۔۔ اب کیا ہو گا۔ آپ لوگوں نے ایک پائل سے میری منگنی کر دی ہے۔ میں تو کبھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔“

”جھجک کرو۔۔۔“ وردہ نے اس کی بلند دہائی پر اسے جھڑکا۔ ”امی کو ہرگز یہ فضول باتیں پتہ نہ چلیں ان کا بلڈ پریشر فوراً ہائی ہو جائے گا۔ مجھے تو تمہاری بات کا زیادہ اعتبار نہیں ہے۔ میں بھی اس سے ملی ہوں میں نے بھی اس سے بات چیت کی ہے۔ مجھے تو وہ ہر طرح سے ایک معقول بندہ لگا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ عباد کا دوست ہے۔ ایسی ویسی کوئی بات ہوتی تو وہ لوگ آنکھیں بند کر کے یہ رشتہ کرنے کا مشورہ نہ دیتے۔ میں منیئر آنکلی کی طبیعت سے بخوبی واقف ہوں۔ مجھے ان پر پورا بھروسہ ہے۔“
”اور میری بات پر آپ کو یقین نہیں؟“ وہ آزر دگی سے بولی۔
”نہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔۔۔“ وردہ نے سمجھانا چاہا۔
”مثلاً کیا؟“

”چل جائے گا پتہ تم خود کو پریشان مت کرو۔“
وہ اسے تسلی دے کر وہاں سے اٹھ گئی تھی۔

عذرا بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو شفیقہ حیات کو گہری سوچ میں گم پایا۔ ان کے چہرے پر از حد رنج و غم کے آثار تھے۔ وہ ان کے قریب آ بیٹھیں۔
”کیا بات ہے اماں بیگم!۔۔۔ ایسے کیوں بیٹھی ہیں۔“
انہوں نے ٹھنڈی آہ بھر کر سو کی جانب دیکھا۔
”کتنے دن ہو گئے ہیں۔۔۔ ایقان دو قدم کے فاصلے پر ہو کر بھی شکل نہیں دکھاتی۔ پہلے گھر دور تھا تو ہر دو سرے دن آیا کرتی تھی اور اب۔۔۔“
عذرا بیگم چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئیں۔

”دراصل وہ ہماری نصیحتوں سے چڑنے لگی ہے۔ یا تو آپ کوئی بات چھیڑ کر بیٹھ جاتی ہیں یا میں۔ وہ کچھ عرصے تک اس موضوع پر بالکل بات نہیں کرنا چاہتی۔ ہمیں بھی اس کے جذبات کا خیال کرنا چاہیے۔“
”اے کیا خاک خیال کریں ہم۔ اس نے اپنی اور بچوں کی زندگی کا خیال نہیں کیا۔“ ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

”اماں! سارا قصور اسی کا تو نہیں ہے نا۔“ انہوں نے دلی آواز میں مندی حمایت کرنا چاہی۔
”اے چپ رہو بیٹی۔! انہوں نے بہو کو ہولے سے جھڑکا۔ ”ہم نے بھی اسی دنیا میں زندگی گزاری ہے۔ ہر طرح کے حالات سے گزرے ہیں تجربات بھی حاصل کیے ہیں اور مشاہدے بھی۔ ارے مرد پچہ ہے چلو کیا کسی کھیل تماشے میں چار روز کو وہ ایسی کا کچھ سی نازک نکلیں، بلکی سی چوٹ نہ برداشت کر پائیں چور چور ہو گئیں غم سے۔ ارے عورتیں تو شرابی، کبابی، جواری مردوں کو زندگی بھر بٹس کھیل کر برداشت کرتی ہیں کہ گھر نہ ٹوٹے، بچے بے گھر نہ ہوں۔“ عذرا بیگم خاموش ہو گئیں۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔۔۔“ انہوں نے دل میں سوچا تھا۔ ”علم، جبر، بے ایمانی، فریب عورت، ہنسی خوشی برداشت کرتی رہے تو عورت! ان کے خلاف آواز اٹھائے فریب دیئے والے کا گریبان پکڑے، اپنے جذباتوں کی توجہ کی سزا دینا چاہے تب سارے الزامات کا رخ اس غریب کی طرف اس نے گھرتوڑا اس نے بچوں کو بے گھر کیا۔ خاموش بے زبان گائے جیسی زندگی گزار کر دنیا سے چلے جانے والی عورتوں کو مثال بنایا کر پیش کیا جاتا ہے۔“

”میں کہتی ہوں عذرا! اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔۔۔“ شفیقہ حیات نے ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی۔ وہ چونکا اٹھیں۔

”اس کو سمجھاؤ اب بھی وقت ہے معافی مانگ لے اس سے۔ اچھا پھر سے آباد کرے۔ ارے یہاں بیٹھی اچھی لگ رہی ہے بھلا؟ اپنے گھر کو تالا ڈال کر چلی آئی ہے، تالا ڈال کر چلے آنے سے کیا وہ گھر پر آیا اور یہ اس کا ہو جائے گا؟“

”آپ جانتی ہیں ماں! وہ کس قدر ضدی ہے۔۔۔“ انہوں نے دھیمے سے کہا۔

”اور یہ ضد انسان کو تباہ کر دیتی ہے، تم بھی جانتی ہوگی۔“

”خدا نہ کرے۔۔۔“ وہ ہڑبڑائیں۔

”ارے بددعا نہیں دے رہی اسے! ماں ہوں اس کی لیکن ماں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ میں بے جا باتوں میں اس کا ساتھ دوں۔ اسے اچھے برے کی تمیز نہ سکھاؤں، آئینہ نہ دکھاؤں۔۔۔ میرا توجہ کرتا ہے اچھی طرح سناؤں اسے۔“

”جلدی نہ کریں ماں!۔۔۔“ انہوں نے ہولے سے ان کا ہاتھ دیا۔ ”ابھی زخم تازہ ہے۔“

”ارے میرے جی پر بیٹھا رہتا ہے اس کا خیال۔“ وہ سسکیں۔ ”کچھ اور نہ ہو جائے عذرا!“

”سب ٹھیک ہو جائے گا آپ فکر نہ کریں۔ عاشر اتنا کم عقل نہیں ہے۔“ انہوں نے ساس کو تسلی دی تھی۔

دونوں ہی کچھ دیر کے لیے خاموش ہو کر اپنی اپنی سوچ میں گم ہوئی تھیں۔ تب ہی سدرہ کمرے میں داخل ہوئی اس نے ایک نگاہ ماں اور دادی پر ڈالی پھر ادھر ادھر دیکھا۔

”پھپھو کہاں گئیں؟“

”پھپھو؟“ وہ دونوں ہی چونکا اٹھیں۔

”ہاں! ایقان پھپھو آئی تھیں نا ابھی۔۔۔ میں کچن میں تھی۔۔۔“

”ایقان آئی تھی؟“ شفیقہ حیات حیران سی ہوئیں پھر جیسے بہت کچھ سمجھ گئیں۔

”اس نے یقیناً ہماری گفتگو سنی ہے۔۔۔“ عذرا بیگم متفکر ہوئیں۔ ”بے چاری اٹھ قدموں لوٹ گئی ہے۔“

شفیقہ حیات کچھ سوچنے لگی تھیں۔

ہاشم نے گاڑی گھر کے اندر کھڑی کی تو دیکھا، شہلا کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔ اس نے رسٹ واپس پر نگاہ ڈالی۔ اس کا ڈیوٹی ٹائم آف ہونے کا کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ منبہ بیگم کی طرف چلی گئی تھی۔

اینا بربٹ کیس اٹھائے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوا۔ لاؤنج میں فاروق حسن اور فروس بیگم موجود تھے۔

”السلام وعلیکم۔“ وہ بربٹ کیس میز پر رکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔

”وعلیکم السلام۔“ فاروق حسن نے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھا۔

”شہلا نہیں آئیں اب تک؟“ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”پہلے وہ طے تو کر لیں کہ ان کا گھر ہے کون سا۔۔۔“ فروس بیگم کو گویا اس کے سوال نے تکی ہی دکھادی تھی۔

چمک کر بولیں۔

ہاشم چونک سا گیا۔ اس نے باری باری ماں کا تانا ہوا اور باپ کا سپاٹ پر ہر دیکھا۔
”کیا مطلب۔۔۔ میں کچھ سمجھا نہیں؟“

”مطلب یہ بیٹے جی۔! کہ کچھ ہمارا اور ہماری عمروں کا خیال کرو۔ ہمیں سوچا ہے تھی ہماری خدمت کے لیے۔ وقت پر کھانا وقت پر دوا دارو۔ یہاں تو ہو بیگم کو ڈیوٹی اور پھر میکے سے فرصت نہیں۔ فارغ اوقات میں یہ

پاٹے میں کہتی ہوں یہ دہنایا کب تک چلے گا آخر۔“
ہاشم خاموش سا ہو گیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ شہلا کے لیے کچھ بھی غلط سننے پر اس کا دل آمادہ نہ ہوتا تھا لیکن ماں

آخر کوماں تھی۔ اس کی بات رد کرنا بھی ممکن نہ تھا کہ وہ شہلا کی طرف داری کرنا۔
”ہاشم بیٹے! قافوق حسن نے چشمہ اتار کر میر پر رکھا۔“ تمہاری امی کی بات میں اتنی سچائی تو ضرور ہے کہ ہو کو اب کچھ عرصہ گھر میں ہمارے ساتھ گزارنا چاہیے۔ ہم لوگ اس گھر میں سچی خوشیوں کے جتنی ہیں۔ سب مل کر رہیں ساتھ وقت گزاریں نہیں بولیں زندگی کے سچے رنگوں سے لطف اندوز ہوں۔ بیٹا! ہمیں اب بھٹے بھٹے قہقروں اور مصحوم آوازوں کی ضرورت ہے۔ دادا، دادی کے انظار سننے کے لیے کان ترس رہے ہیں۔ تم لوگوں کو ہماری خوشیوں کا خیال کرنا چاہیے۔“

”جی۔۔۔ جی بابا جان!“
وہ آہستگی سے کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کے قدم سست پڑ چکے تھے۔

آج کئی دن کے بعد وہ پارک میں آئی تھی۔ شام کی تازہ ہوا میں چل قدمی کرتے ہوئے سورج کی الوداعی کرنوں کے رنگوں پر غور کرتے ہوئے وہ کافی آگے تک چلی آئی تھی۔

تب ہی اسے عمر کا دھیان آیا۔ وہ اسے سوتا چھوڑ کر آئی تھی۔ اٹھ کر وہ یقیناً اسے تلاش کرتا۔ شہلا کے اس گھر سے چلے جانے کے بعد یہ ربیعہ سے بہت زیادہ المیہ ہو گیا تھا۔ اکثر وہ اسی کے ہاتھ سے کھانا کھانے کی ضد کرتا تھا۔ منہ زہ بیگم یہ سب کچھ دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ ربیعہ نے ان کی تقریباً ”سب ہی ذمہ داریاں بانٹ لی تھیں۔“

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے وہ پارک سے نکل کر سڑک پر چلی آئی۔ عین اسی لمحے ایک سیاہ کتا نجانے کہاں سے نکل کر دوڑنا ہوا اس کی جانب آیا تھا۔

ربیعہ کے منہ سے بے اختیار یہی چیخ نکلی۔ وہ ہٹا دیکھے بھالے سڑک کی طرف دوڑ پڑی تھی۔ خوف کے عالم میں وہ نہایت قریب آتی گاڑی بھی نہ دیکھ سکی۔ ڈرائیور نے حتی الامکان اسے بچانے کی کوشش کی تھی مگر ربیعہ گاڑی سے بری طرح ٹکرا کر نیچے گر پڑی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص گھبرا کر باہر نکلا تھا۔

قریب آکر اس شخص نے ربیعہ کو سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔
ربیعہ جھجک کر خود کھڑی ہونے لگی لیکن اگلے ہی لمحے اس کے لبوں سے چیخ برآمد ہوئی تھی۔ اسے اپنے پہلو میں بائیں بازو میں درد کا احساس ہوا۔

”میں۔۔۔ میں بے حد معذرت خواہ ہوں میڈم۔!“ وہ شخص بے طرح شرمندہ اور ہراساں ہو رہا تھا۔
تب ہی ایک بانیک ان دونوں کے نہایت قریب آکر رکی۔ بانیک پر بیٹھا ہوا رافع نیزی سے اترا اور ان لوگوں کی جانب بڑھا۔

”ربیعہ! آریو آل رائٹ؟“ وہ ربیعہ سے پوچھنے لگا۔
”میں۔۔۔ میں تھک ہوں۔“ ربیعہ نے رسانیت سے بولنے کی کوشش کی۔ نجانے کیوں رافع کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ سڑک پر اچھا بھلا تماشا کھڑا ہو گیا تھا۔

رافع اب اس کارڈر ایئر کو کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اس کا گریبان پکڑ لیتا۔
 ”اتنی بڑی گاڑی ملی ہے تو اس کو استعمال کرنے کے تقاضوں کو بھی مد نظر رکھیں مسٹر!“ وہ نہایت غصے سے اس شخص سے مخاطب ہوا۔ ”کوئی نشہ وغیرہ کر کے گھر سے نکلے تھے آپ؟“
 ”دیکھیں سر۔۔۔! میں معذرت چاہتا ہوں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں میں قصور وار نہیں ہوں۔“
 وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولا۔

”جی ہاں۔۔۔ بھلا آپ قصور وار کیوں ہونے لگے۔“ رافع طنز سے بولا۔ ”ان معاملات میں اکثر ہی گاڑیوں والے بے قصور ہوتے ہیں۔“

”رافع۔۔۔! رافع پلین۔“ ربیعہ دردی کی شدت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی ”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہ واقعی بے قصور ہیں۔۔۔ دراصل میں ہی بغیر دیکھے بھالے سڑک کر اس کر رہی تھی۔“

”میرا خیال ہے، ہمیں باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں ہاسپٹل لے کر جانا چاہیے۔“ وہ شخص ربیعہ کا زرد پرتا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ رافع نے اب ربیعہ کا جائزہ لیا تھا۔
 ”نہیں نہیں۔۔۔“ ربیعہ مزید زرد پڑی۔ ”میں کہیں نہیں جاؤں گی۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ہوں، میں اب گھر جاؤں گی۔“

اس نے ذہم بڑھانے کی کوشش کی تو ایک مرتبہ پھر چیخ اٹھی۔ اسے احساس ہوا کہ اسے واقعی چوٹیں آئی تھیں۔

”ربیعہ۔۔۔! رافع نرمی سے بولا۔ ”میرا خیال ہے، یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔۔۔ تمہیں چیک اپ کروالینا چاہیے۔ ہمیں قریب ہی میرے دوست کے بھائی کا کلینک ہے۔“
 ”میں گھر جاؤں گی۔۔۔“ وہ اٹل انداز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ رافع مزید نرم پڑا۔ ”میں شملہ بھابی کو فون کر دیتا ہوں۔“
 وہ شخص عجیب کش مکش کا شکار ہیں کھڑا تھا۔ رافع نے اپنی بائیک سائیڈ میں کھڑی کی پھر وہ ربیعہ کے قریب چلا آیا۔

اگر تمہیں سہارے کی ضرورت ہے تو میں۔۔۔ وہ قدرے جھجکا تھا۔
 ربیعہ کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ خود کو چلنے کے قابل نہیں پاری تھی لیکن وہ رافع کا بازو تھامتھی یا رافع اس کا ہاتھ پکڑنا اس خیال نے ہی اسے شرم سے پانی پانی کر دیا تھا۔
 ”اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں آپ کو گھر تک پہنچا دوں مس ربیعہ!“ ”عجیب سی صورت حال کے شکار اس شخص نے مدخلت کی۔

رافع نے ایک نظر اس کے فخل چہرے پر ڈالی پھر اس کی گاڑی کو دیکھا۔
 ”یہ شاید ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ رافع نے ربیعہ کو قائل کرنے والے انداز میں دیکھ کر کہا۔ ”تم گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔۔۔ میرا نہیں خیال کہ تم گھرتیک آرام سے چل پاؤ گی۔“

اتنی بات ربیعہ بھی سمجھ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ گاڑی کا ہی سہارا لے کر پچھلے دروازے کی جانب بڑھ گئی۔
 اجنبی نے اس کے لیے لپک کر دروازہ وا کیا تھا۔ ربیعہ کے بیٹھ جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کر کے رافع کو دیکھا۔

”پلین۔۔۔ آپ بھی بیٹھیں۔۔۔“
 ”نہیں، میں بائیک پر آجاتا ہوں۔ آپ انہیں گھر تک پہنچادیں۔ بے حد نوازش ہو گی!“ وہ اپنی بائیک کی جانب بڑھ گیا۔

ربیعہ کو آتا دیکھ کر منہ بزم اور انہماک بے حد گھبرا گئی تھیں۔ ان کی آوازوں سے پریشان ہو کر عباد بھی اپنے

کمرے سے نکل آیا۔

”کیا ہوا ہے ربیعہ! خیر تو ہے، زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔“
سب کے سب اس سے مختلف سوالات کرنے لگے۔ ربیعہ انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی انہی
نے اسے صوفے پر بٹھایا اور اس کا بازو چپک کرنے لگی۔
ایسے میں عباد کی نگاہ ایک تخت سامنے کھڑے اس شخص پر گئی۔
”ارے امیر حسن۔۔۔ آپ!“ وہ بے ساختہ ہی آگے بڑھا۔
”جی ہاں۔۔۔“ وہ مسکرا رہا تھا ”میں آپ ہی کو دیکھ رہا تھا کہ آپ کب متوجہ ہوتے ہیں!“ عباد گرم جوش انداز
میں اس سے ملنے لگا۔ پھر وہ منیزہ بیگم کی جانب مڑا تھا۔
”می جی۔! میں نے آپ سے ان کے متعلق بات کی تھی۔ شاید آپ کو یاد ہو!“
”امیر حسن!“ منیزہ بیگم سوچنے لگیں۔ ”ہاں، شاید یہ وہی ہیں نا جن کے ساتھ تم اپنا بزنس اشارٹ کرنا چاہتے
ہو۔“

”جی ہاں۔۔۔“ عباد مسکرایا۔

امیر حسن نے بے حد احترام سے منیزہ بیگم کو سلام کیا۔
”جیتے رہو۔۔۔“ وہ طماننت سے بولیں ”میرا تو خیال تھا، کوئی بڑی عمر کا شخص ہو گا۔۔۔ تم تو بالکل میرے عباد جیسے
ہی ہو۔“

وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

”دراصل بزنس میرے پیپا اور بھائی سنبھالتے ہیں۔۔۔ میں یہاں پاکستان میں اس کی پروموشن کے سلسلے میں آیا
ہوں۔۔۔ یہاں عباد صاحب سے ملاقات ہو گئی تو ہم نے سوچا، کیوں نہ مل کر کام کیا جائے۔ آج بھی میں اس سلسلے
میں عباد سے ہی ملنے یہاں آیا تھا۔“
”اور ہمارے گھر کے ایک بندے سے آپ سروک پر ہی مل لیے۔“ انہی نے مزاحاً ”شکایتی انداز میں کہا۔ سب
لوگ ہی ہنس دیے تھے۔

”یہ گواہی تو آپ کے گھر کا بندہ ہی دے گا جناب!“ امیر حسن اب بشارت سے گویا ہوا تھا ”کہ اس حادثے میں
میرا ہاتھ سرمو نہیں ہے، کیوں مس ربیعہ!“

”جی ہاں۔۔۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ربیعہ آہستگی سے بولی تھی ”دراصل میں ایک کتے سے خوف زدہ ہو
کر دوڑی تھی۔ بنا دیکھے ہی سروک کر اس کرنے لگی۔ آپ نے تو پھر بھی حاضر دماغی سے کام لیا ورنہ شاید یہ حادثہ
خطرناک ہو سکتا تھا۔“

”بچانے والی ذات خدا کی۔۔۔“ وہ مسکرایا۔ ”ہم انسان تو خطا کے پتلے ہیں۔“

ربیعہ نے اب کی بار پہلی مرتبہ اسے نظر بھر کر دیکھا۔ خوب صورت بھاری آواز رکھنے والا وہ شخص خود بھی
متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ آف وہائٹ شلوار سوٹ میں اس کا قد و قامت بے حد جاذبِ نگاہ نظر آتا تھا۔ اس کا
لہجہ اور بات کرنے کا انداز بھی بہت خوب صورت تھا۔

”ہم نوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں امی! ذرا چائے وغیرہ بھیج دیں۔“ عباد نے منیزہ بیگم سے کہا پھر وہ امیر
حسن کو لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہو تم!“ انہی نے اس کے بازو وغیرہ اچھی طرح ہلا کر دیکھ لیے تھے ”میں بین کلو دیتی
ہوں۔ گرم گرم دودھ سے کھا کر تھوڑی دیر آرام کرو۔۔۔ کل تک بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔“
”میں اسے گرم دودھ میں ہلدی ملا کر دیتی ہوں۔۔۔“ منیزہ بیگم بولی تھیں ”کسی اندرونی چوٹ کا خطرہ نہ رہے
گا۔“ ”ٹھیک ہے۔۔۔“ انہی نے سر ہلایا ”ہم دونوں اپنے اپنے ہنر اس پر آزمایاتے ہیں!“

ربیعہ مسکرا دی۔ منیہہ بیگم کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ انیہہ اس کے لیے گولیاں لانے کے لیے اپنے کمرے کی سمت چل دی۔ اس نے گہری سانس بھر کر صوفے کی پشت سے سر نکالیا۔ اس کا ذہن رافع کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ اسے چھوڑنے گھر تک تو آیا تھا۔ پھر نجانے کیوں اندر آنے کے بجائے باہر سے ہی لوٹ گیا۔ لوٹنے سے اس کا چہرہ اس کی آنکھیں ربیعہ کے لیے فکر مند تھیں۔ ربیعہ کا دل فکر مندی کی اس دھند میں لپٹا ہوا تھا۔ ان نگاہوں سے پھوٹتا ”پنا خیال رکھنا“ کا پیغام اس کے پردہ ذہن پہ سایہ کیے کھڑا تھا۔ وہ بہت دیر کے لیے کہیں کھوسی گئی تھی۔

اس نے کال بیل کی آواز سنی ضرور تھی لیکن سنی آن سنی کر کے وہ بیٹھی اپنے نوٹس مکمل کرتی رہی۔ تب ہی وردہ ٹنگٹنگی سے مسکراتی ہوئی چلی آئی۔ ناعمہ نے ایک مصروف سی نظر اس پر ڈالی۔

”کون ہے آئی؟“

”یہیے بنی بیٹی ہو جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔“ اس نے اسے گھورا ”گھنی ہوتی جا رہی ہو!“

”جی؟“ ناعمہ نے حیران نظریں اٹھائیں۔ ”میں سمجھی نہیں۔ کس بات کی خبر ہونی ہے مجھے؟“

”فریحہ نے تمہیں اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی؟“ وردہ نے سوال کے ساتھ ساتھ اس کا چہرہ بھی غور سے دیکھا۔

”فریحہ نے؟“ ناعمہ مزید حیران ہوئی۔ ”فریحہ آئی ہے کیا؟“

”جی ہاں۔۔۔ نہ صرف فریحہ بلکہ آپ کے وہ ”بجنوں“ بھی ساتھ ہیں۔“ وردہ مسکرائی ”فناٹ کپڑے تبدیل کر کے آجاؤ۔“

”میں؟ میں آجاؤں؟“ ناعمہ کی جان خشک ہونے لگی۔ ”نہیں اپنا۔۔۔ میں ہرگز ان موصوف کے سامنے نہیں آؤں گی۔۔۔ کہہ دیں آپ جا کر انہیں۔“

”می ڈرائنگ روم میں ہی موجود ہیں اور تمہیں بلا رہی ہیں۔“ وردہ سنجیدگی سے بولی۔ ”اور کوئی تمہیں کھا نہیں جائے گا۔ حالات کو فیس کرنا سیکھو۔ چلو اٹھو، کپڑے بدل لو۔ بال بناؤ سلیٹے سے۔۔۔ قسم سے اگر وہ لوگ تمہیں اس حیلے میں دیکھ لیں نا۔۔۔“

”تو شوق سے مٹنی تو ڈروں۔۔۔“ ناعمہ جل کر بولی تھی۔ ”میں تو دو دن سکون کی نیند سوتی رہوں گی!“

”کجو مت!“ وردہ ناراضی سے بولی ”شکل اچھی نہ ہو تو انسان بات ہی اچھی کر لے۔“

”اپنا! میں سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ میں ہرگز ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گی۔“ وہ پین پھینک کر قدرے ضدی پن سے بولی تھی۔

وردہ نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

”ناعمہ! یہ یاد رہے، اس کے کچھ مختلف تقاضے ہیں، نہ چاہتے ہوئے بھی کہیں کہیں دنیا داری نباہنا پڑتی ہے۔ انسان اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے بھی نباہ سکتا ہے۔ چلو اٹھو، شاباش! میں چائے بنا رہی ہوں۔ اسٹینکس بھی تیار کر دیتی ہوں، لیکن سرو تمہیں ہی کرنا ہے۔ اور اب انکار کر کے میرا وقت ضائع مت کرو۔“

”آئی۔۔۔!“ وہ رو ہانسی ہو گئی ”اس پانگل کو کس نے کہا تھا آئے کو۔“

اس کے انداز میں ہار ماننے کا اشارہ تھا۔ وردہ کو اس کی بات اور اس کی پے بسی پر ہنسی آگئی۔ وہ ہنسی چھپاتے ہوئے کمرے سے نکل گئی تھی۔ ناعمہ کچھ دیر پریشان صورت بنائے بیٹھی سوچتی رہی۔

پھر وہ تھکے تھکے سے انداز میں اٹھ کر الماری کی جانب بڑھ گئی۔

کپڑے تبدیل کر کے لائٹ پنک لپ اسٹک سے چہرہ سجائے جب وہ کچن میں داخل ہوئی تو وردہ کی تیاری بھی مکمل تھی۔ ٹرائل میں کئی قسم کے لوازمات سجے ہوئے تھے اور وردہ کیٹلی کوئی کوزی سے ڈھانپ رہی تھی۔ ناعمہ کو دیکھ کر وہ مسکرا دی۔

”دیش گڈ!“ اس نے مطمئن نظروں سے اس کا سراپا دیکھا۔ ”چلو یہ چائے کے کرجاؤ اور سلیقہ اور تمیز سے سرو کرف۔“

”یہ کام آپ کر لیں نا آپ!“ وہ منت بھرے انداز میں بولی۔ ”میں آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں۔ مجھ سے تھوے اور وردہ کا تناسب ٹھیک نہیں رہتا۔“

”زیادہ ہانے بازی کی ضرورت نہیں ہے۔“ وردہ پر اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ”چلو سنبھالو!“ اس نے ٹرائی کھینچ کر ناعمہ کے آگے کر دی۔ مزید بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ سو وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ٹرائی لپٹا گئے برہ گئی۔ وردہ بھی اس کے پیچھے تھی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر اس نے نگاہ اٹھائے بغیر ہی سلام کیا تھا۔ جواب میں فریجہ کی گرم جوش آواز سے اسے اندازہ ہو گیا کہ کون کہاں بیٹھا ہے، سو وہ اسی جانب برہ گئی۔

”ناعمہ! مٹا پہلے سب کو چائے دو۔“ رابعہ بیگم نے اسے دھیس سے پکارا۔ وہ صوفے پر بیٹھنے لگی تھی، لیکن اسے ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ ناچار وہ ٹرائی رابعہ بیگم کے ساتھ بیٹھے ہوئے فراز کے قریب لے آئی۔

”میں صرف چائے لوں گا۔۔۔ بنا دیجیے پلیر!“ اس نے سرونگ پلیٹ واپس ٹرائی میں رکھ دی۔

”چینی؟“ ناعمہ نے دھیس سے پوچھا۔

”بغیر چینی کی چائے دیں۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی تپش تھی۔

ناعمہ نے گہرا کر نظر اٹھائی۔ تب اس نے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے لہجے سے بھی برہ کر تپش تھی۔ ”ہائے! کیا ہو گیا بھائی آپ کو۔“ فریجہ شوخ انداز میں بولی تھی ”گھر میں تو آپ آدھا کپ چینی سے بھر لیتے ہیں اور یہاں چینی کی بچت کر رہے ہیں۔“

”کبھی کبھار طخی اچھی لگتی ہے۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

ناعمہ نے اسے واقعی بغیر چینی کی چائے تھما دی پھر وہ ٹرائی فریجہ کے قریب لے آئی۔

”بھئی، اب تم آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ فریجہ نے پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا ”میں تو دل بھر کر انصاف کروں گی۔ ویسے سچ بتاؤ، ان میں سے کیا کچھ تم نے بنایا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں!“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی ”سب کچھ وردہ آپنی کا کمال ہے!“ وردہ اسے گھورنے لگی تھی لیکن ناعمہ چونکہ یہ بات جانتی تھی، سو اس نے وردہ کی جانب دیکھنے سے گریز ہی کیا۔

”ویل سیڈ!“ فریجہ مسکرائی۔

نہ جانے کیوں ناعمہ کی نگاہ ایک مرتبہ پھر اس کی جانب اٹھ گئی۔ وہاں ہنوز وہی تپش برقرار تھی۔ ناعمہ کو الجھن ہونے لگی۔

چائے کا کپ خالی کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ فریجہ بھی جلدی جلدی پلیٹ صاف کرنے لگی پھر وہ نوں بھائی بہن کے درمیان نظروں ہی نظروں میں کسی بات کا تبادلہ ہوا تھا۔ فریجہ نشو سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے رابعہ بیگم کی جانب برہی۔

”آئی۔ ایک فرمائش کر سکتی ہوں۔“

”ضرور بیٹا!“ رابعہ بیگم مسکرا دیں۔ ”اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے۔۔۔ بولو۔“

”مجھے امید ہے، آپ خفانہ ہوں گی بلکہ خوش دلی سے مان جائیں گی۔“ وہ لاڈ بھرے انداز میں بولی۔

”کیوں نہیں۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں ”تم کو تو سہی!“

”آئی۔! ہم لوگ کچھ دیر کے لیے ناعمہ کو باہر لے جائیں؟“

اس کی بات سن کر رابعہ بیگم دفعتا ”خاموش سی ہو گئیں۔ وردہ کا چہرہ بھی یکایک سنجیدہ ہوا تھا اور ناعمہ پر تو جیسے

بجلی ہی گری تھی۔ وہ تو ہوا۔ اس کی کھڑی سب کے چہرے دیکھنے لگی تھی۔
 فرازونوں ہاتھ پینٹ کی جیسوں میں ڈالے یوں لا تعلقی سے کھڑا تھا جیسے اس کا اس بات سے کوئی تعلق ہی نہ ہو
 حالانکہ ناعمہ کو پورا اندازہ تھا کہ اس فرمائش میں فریجہ کی صرف زبان ہی استعمال ہوئی ہے۔ اسے یہ خیال
 بے طرح ستا رہا تھا کہ ہمیں رابعہ بیگم سے ان دونوں کے ساتھ جانے کے لیے نہ کہہ دیں۔ ایسی صورت میں یقیناً
 فریجہ درمیان سے ہی کہیں غائب ہو جاتی اور وہ اس کی پیش بھری نظروں کا سامنا کرنے کے لیے تنہا اور بے یار و مددگار
 رہی رہ جاتی! رابعہ بیگم نے ہنوز فریجہ کی بات کا جواب نہ دیا تھا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھیں۔
 ”بولیں نا آئی!“ فریجہ اٹھلائی ”ہم آئیں کریم کھا کر لوٹ آئیں گے۔ زیادہ دور ہرگز نہیں جائیں گے۔ آپ
 بالکل بے فکر رہیں۔“

”دیکھو بیٹا!“ رابعہ بیگم دھیمی آواز میں بولیں ”میں جانتی ہوں کہ یہ نیاز مانہ ہے اس کے کچھ اور ہی تقاضے
 ہیں۔ نئے رنگ ڈھنگ ہیں لیکن ہمارے خاندان اور ہمارے گھر میں اب تک ان ہی پرانی قدروں کا رواج ہے
 ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکا، لڑکی کے آپس میں ملنے یا ساتھ باہر آنے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ تم
 لوگ یہاں آئے، مجھے بے حد خوشی ہوئی، بلکہ میں نے خاص طور پر ناعمہ کو بھی سامنے بلوایا کیونکہ میں اس بات
 میں کوئی حرج نہیں سمجھتی لیکن بیٹا! جہاں تک تمہارے ساتھ باہر جانے کی بات ہے، اس کی اجازت میں نہیں
 دے سکتی کیونکہ ہمارے مشترکہ نظام میں اسے نہ صرف برا سمجھا جائے گا بلکہ میری بیٹی ہمیشہ کے لیے اپنے بھائیوں کی
 نگاہ میں بے باک قرار پائے گی۔ اللہ نے مجھے بیٹا نہیں دیا لیکن میرے بھائیوں کے بیٹے ان لوگوں کو بہنوں کی طرح
 سمجھتے ہیں۔ ان میں سے کسی کا سامنا ہو گیا تو ناعمہ کبھی ان سے نظروں کا ربات نہ کر پائے گی۔ اس لیے میری بات کو
 سمجھنے کی کوشش کرو اور برا مت ماننا لیکن میں معذرت خواہ ہوں!“

فریجہ سے کوئی جواب نہ بن رہا۔ وہ قدرے خفت کا شکار نظر آرہی تھی لیکن فراز چند قدم آگے بڑھ آیا۔
 ”آئی۔۔۔ آپ کو معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے!“ وہ بولا۔ ”معذرت تو ہمیں کرنا چاہیے کہ ہم
 نے آپ سے ایک غلط فرمائش کی۔ آپ کا لفظ لفظ سچائی پر مبنی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوئی ہے آپ کی باتیں سن
 کر۔ آپ پلیز ہم لوگوں کو معاف کر دیں۔ آئندہ ہماری طرف سے ایسی کوئی فرمائش نہ ہوگی۔“
 رابعہ بیگم کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر فراز کی پیشانی چومی۔

”ناشاء اللہ جیتے رہو بیٹا! بیٹی کی ماں ہوں۔ یہ سب کچھ کہتے ہوئے دل میں خوف بھی تھا کہ نبجانے داماو سب کچھ
 سن کر کس رویے کا مظاہرہ کرے۔ لیکن تم نے میرا دل ہلکا کر دیا۔ اللہ تمہیں اور نیکی اور سچائی سے نوازے۔
 خوش رکھے۔“
 ناعمہ نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ اس لمحے فراز اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ وہ رابعہ بیگم کی دعاؤں پر
 دھیمے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس لمحے اس کا وہ انداز ناعمہ کے دل میں اتر چلا گیا۔ ان نگاہوں کی وہ پیش غائب
 تھی، ہونٹوں پر وہ تلخ کھچاؤ نہ تھا۔ اس کے چہرے پر بے پناہ نرمی اور محبت تھی اور خوب صورت مسکراہٹ سے
 اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا۔

”اب اجازت چاہیں گے آئی!“ وہ بولا۔

”آتے رہا کرو بیٹا! تمہارا انگرہ ہے یہ۔۔۔ اس میں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”اور آئیں کریم میں بہت اچھی بنائی ہوں۔“ ورہہ شوخی سے بولی۔ ”پہلے سے بتا کر آئیں گے تو آئیں کریم
 کھانے کے لیے باہر جانے کی اجازت نہیں لینا پڑے گی۔“
 ”کیا خبر تھی!“ وہ ہنس دیا۔

فریجہ اور ناعمہ بھی مسکرا دیں۔ چند لمحوں پیشتر ماحول میں جو کھچاؤ اور آہ تھا اب کہیں اس کا شائبہ تک نہ تھا۔
 فریجہ اور فراز باہر جانے کے لیے بڑھے تو رابعہ بیگم اور ورہہ انہیں رخصت کرنے کے ارادے سے باہر کی جانب
 بڑھ گئیں۔ ناعمہ نے سکون کا سانس لیا تھا!

اس کے ہاسپٹل سے ڈیوٹی انچارج کافون آیا تھا۔ شہلا سوتے سے اٹھی تھی۔ اس نے قدرے غائب دماغی سے فون ریسو کیا۔

”ہاں ڈاکٹر شہلا! آپ کو آنا ہو گا۔“ وہ کہہ رہے تھے ”ایمر جنسی ہے اس وقت!“

”لیکن سو۔! میں تو ابھی دو بجے واپس آئی ہوں۔“ اس نے پریشانی سے گھڑی کی سمت دیکھا جو چار بج رہی تھی۔

”آئی نوڈاکٹر شہلا! لیکن مجبوری ہے! ڈاکٹر رضوانہ اور ڈاکٹر ارم دونوں کے ساتھ کچھ پر اہلم ہو گئی ہے اور ہاسپٹل میں چار کیس موجود ہیں جبکہ ڈیوٹی پر صرف ڈاکٹر ناصر ہی ہیں۔ آپ اس وقت ڈیوٹی دے لیں۔ کل آپ کو ریسٹ دے دیں گے۔“ وہ نرمی سے سمجھا رہے تھے۔

”اوکے۔ سر! وہ بولی ”میں آجاتی ہوں۔“

”تھینک یو ڈاکٹر شہلا!“ انہوں نے ممنونیت سے کہا۔

”تس اوکے!“ اس نے ریسپورر رکھ دیا۔

پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ سامنے کھڑی فردوس بیگم نے بے حد کڑے تیوروں سے اسے دیکھا۔

تیز گلابی شرٹ کے ساتھ سفید شلوار روپے میں کھلی کھلی سی ہوا انہیں ذرا متاثر نہ کر سکی تھی۔ سفید پرس کاندھے پر لٹکائے وہ ان کے قریب آ کر۔

”آئی۔! میں ذرا ہاسپٹل جا رہی ہوں۔“

”جہاں مرضی آؤ جاؤ۔“ وہ سخت سے بولیں ”اجازت کی تو تم نے کبھی ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔۔۔ ری بات اطلاع کی تو اس کی ضرورت ہم محسوس نہیں کرتے۔“

”آئی۔! ایمر جنسی ہے۔ ہاسپٹل سے فون آیا تھا۔“ وہ نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ”ورنہ آپ جانتی ہیں میں ابھی آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی کر کے آئی ہوں۔“

”ارے ہم سب جانتے ہیں۔ تم کیا سمجھا رہی ہو۔“ وہ ہنا کر بولی تھیں ”وہاں سے آٹھ گھنٹے بعد لوٹو تو اپنے میکے چلی جانا۔ یہ تو تمہارا بس اڈہ ہے کھانے پینے کا ٹھکانا!“ شہلا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

”آئی۔! آپ زیادتی کر رہی ہیں۔“

”ہماری مجال!“ انہوں نے سر جھٹکا۔ ”جتنے اونچے گھر سے آئی ہو اس سے اونچا جانتے ہیں تمہیں ہم اور تم خود کو اس سے بھی اونچا جانتی ہو۔“

”آپ سے بات کرنا فضول ہے۔“ شہلا کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

”کیا کہا؟“ وہ چلا آئیں۔ ”آئے دو ہاشم کو۔ پوچھتی ہوں میں یہ کیسی بہو میرے سر پر لا بٹھائی ہے۔ ڈاکٹر نہ ہوئی“ منشر ہوئی کہیں کی۔ ہم کوئی بازرگ بھی نہیں کر سکتے۔ لگتا ہی نہیں کہ ماں باپ نے کبھی کوئی تربیت کی ہے۔“

شہلا کو اپنے پیچھے سے مسلسل ان کی آواز آرہی تھی لیکن وہ سنی ان سنی کر کے چلتی چلی گئی۔ اسے اپنے دماغ میں دھماکے ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کے اپنے گھر کا ماحول اس قدر شائستہ اور سنبھلا ہوا تھا کہ ایسی کسی بد لحاظی کا اس نے سوچا تک نہ تھا۔

گاڑی کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کر کے وہ چند لمحوں کے لیے یونی بیٹی رہی۔ کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے گاڑی اشارت کی تھی!

دور وہ اس سے ملنے آئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں گلابی پھولوں کا بہت خوب صورت بکے تھا۔ ربیعہ کی طبیعت خوشگوار ہو گئی۔

”اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔۔۔؟“

”انکل ٹھیک ہوں۔۔۔“ ربیعہ نے پھول لیتے ہوئے مسکرا کر کہا ”چلو اسی بہانے تم ملے تو آئیں۔“
”مجھے افسوس ہے ربیعہ! وہ بیٹھے ہوئے بولی۔ ”بچھلے کچھ دن اتنے مصروف گزرے کہ میں تمہیں فون تک نہ کر سکی۔ اور پھر رافع نے مجھے تو اس حادثے کے متعلق کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ مجھے تو ثانیہ نے بتایا ” آج صبح

”یہی“ ایسی کوئی بڑی بات ہوئی نہیں جسے خاص طور پر یاد رکھا جاتا یا اس کا ذکر کیا جاتا!“ ربیعہ ہلکے ہلکے شگفتہ سے انداز میں بولی۔

”شکر ہے خدا کا کہ کوئی بڑی بات نہ ہوئی!“ وردہ نے اس کا بغور جائزہ لیا پھر اس کے قریب پڑی اسٹک کو دیکھا۔
”اور یہ اسٹک کیسی؟“

”تخنے کی بڑی میں ذرا سی تکلیف ہے۔۔۔ چلتے وقت سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، بس اسی لیے۔“
”کسی اسپیشلسٹ کو دکھانا تھا ربیعہ!“ وردہ فکر مندی سے بولی۔ ”یہی باتوں کو معمولی نہیں لیا کرتے۔“
”ہاں۔ انہی مجھے لے گئی تھی زبردستی۔ ایک سرے وغیرہ بھی کروا لیا ہے، سب ٹھیک ہے!“
”کل سے یونیورسٹی بھی کھل رہی ہے، کیا ارادے ہیں؟“

”ایک دو دن تو نہیں جا سکتی!“ ربیعہ بے جا چارگی سے بولی ”جیسے ہی اس اسٹک سے جان چھوٹے گی۔ میں تیار ہو جاؤں گی۔ لیکن پلین وردہ امیرے لیے نوٹس وغیرہ بنالینا لیکچرز کے، ورنہ میرا بہت حرج ہو گا!“
”تم بے فکر رہو ربیعہ! یہ بھی بھلا کتنے دن بات ہے۔“ وردہ نے محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ربیعہ چند لمحوں کے لیے اس کی جانب دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وردہ کے چہرے پر جو روشنی تھی وہ اس کی بہترین طبیعت اور بے پایاں خلوص کا مظہر تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت دیے جلتے ہوئے محسوس ہوتے تھے اور لبوں کا تبسم جادوئی کیفیت رکھتا تھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔ اس قدر محبت سے؟“ وردہ نے اس کا ایک ٹک دیکھنا محسوس کر کے کہا۔

ربیعہ چونک اٹھی پھر وہ ایک گہری سانس بھر کر مسکرا دی تھی۔
”کچھ نہیں!“ وہ دھیرے سے بولی ”سوچ رہی تھی بہت خوش قسمت ہو گا وہ شخص جس کے نصیب میں اللہ نے تمہاری بے پایاں محبت و درج کی ہوگی!“
وردہ نے چند لمحوں کے لیے کچھ سوچا پھر مسکرا کر سر جھکا لیا۔ ربیعہ نے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے دبایا۔ اس دن وردہ کافی، یہ اس کے پاس بیٹھی تھی۔ دونوں سہیلیاں آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ پھر وردہ کو وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اب چلوں گی ربیعہ!“

”بہت اچھا لگا تمہارا آنا۔۔۔“ ربیعہ خلوص اور محبت سے مسکرائی ”آتی رہا کرو نا۔“

”چلو باریاں لگا لیتے ہیں اب کے تمہاری باری ہے!“ وردہ شوخی سے ہنسی۔

”منظور ہے۔۔۔“ ربیعہ بھی ہنسی دی۔

”میں منیجرہ آئی سے دعا سلام کر لوں پھر چلوں گی۔“ وردہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ تب ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ منیجرہ بیگم کی ہمراہی میں فریش سارا رافع آ رہا تھا۔ سفید بے داغ شرٹ اور مشروٹو کلر جینز میں وہ بے حد خوبو نظر آتا تھا۔ وردہ اپنی جگہ گرکھی اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ رافع کے ہاتھوں میں سفید گلابوں کا بڑا سا گلہ سہ تھا۔
”ارے!“ رافع اسے دیکھ کر رک گیا ”وردہ۔۔۔ تم!“

نجانے کیوں وردہ نے محسوس کیا کہ اسے دیکھ کر رافع کا روشن چہرہ قدرے بچھ سا گیا تھا۔

”جی۔۔۔ میں ربیعہ کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔“ وہ دھیمے سے بولی ”ثانیہ سے پتہ چلا تھا کہ ربیعہ کا معمولی سا ایک سیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا مل آؤں!“

اس کی نگاہ رافع کے ہاتھوں میں موجود گلدستے پر تھی۔ سفید گلاب بے حد تازہ اور بہت خوب صورت محسوس ہو رہے تھے۔ وردہ کا جی ان پر ہاتھ پھیرنے کو چاہا۔

”ہاں۔۔۔ اچھا کیا۔“ رافع قدرے غائب دماغی سے بولا ”میں بھی۔۔۔ میں نے بھی سوچا۔۔۔ دراصل اس دن میں بھی ادھر سے ہی گزر رہا تھا۔“

”اچھا آئی! میں اب چلوں گی!“ وردہ نے اپنی توجہ گلدستے سے ہٹا کر منیجر بیگم کو دیکھا۔
 ”آئی رہا کرو بیٹی! ربیعہ کا بھی دل لگ جاتا ہے۔ انفقہ کو تو اپنی پڑھائی سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ گھر میں رہ کر بھی اس کا پتا ہی نہیں چلتا میں اور ربیعہ ہی ایک دوسرے کی تمنائی کے ساتھی ہیں۔“

”جی!“ وردہ مسکرائی۔
 نہ جانے کیوں رافع کو اس کی مسکراہٹ بے حد بھیجی سی محسوس ہوئی تھی۔ وردہ اس کے قریب سے نکل کر آگے بڑھ گئی تب وہ چونکا۔

”ربیعہ!“ منیجر بیگم اس کے کمرے کے دروازے پر اسے پکارنے لگیں ”یہ رافع آیا ہے تمہاری طبیعت کا پوچھنے۔“

اندر بیٹھی ہوئی ربیعہ بری طرح سے چونکی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا۔
 ”اندر آجا میں رافع!“ رافع کو سامنے کھڑا دیکھ کر بولی۔

”کیسی ہیں آپ!“ اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

”شکر ہے اللہ کا۔۔۔ بالکل ٹھیک ہوں۔“

رافع نے گلدستہ اس کی جانب پڑھایا۔ ربیعہ نے اسے تھام لیا۔
 ”اُدھ۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”کتنے خوب صورت پھول ہیں۔ ابھی وردہ بھی میرے لیے بہت اچھے پھول لائی تھی۔“

رافع نے اس کی نظروں کے تعاقب میں گلابی پھولوں والے کبے کو دیکھا۔ ربیعہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کے لائے ہوئے پھول وردہ کے پھولوں کے برابر میں رکھ دیے۔

”آپ کو جو شہ غیر تو نہیں آئی تھی زیادہ۔۔۔“ رافع خود کو قدرے غائب دماغ محسوس کر رہا تھا۔

”آئی تو تھی لیکن بچت ہو گئی۔۔۔“ ربیعہ دھیمے سے ہنسی۔ ”ہڈیوں پسلیوں کی۔“

”آپ۔۔۔ روزِ ہمیشہ ایسے ہی کر اس کرتی ہیں؟“

”اگر ایسا ہوتا تو میری کوئی بڑی سلاامت نہ ہوتی۔“ ربیعہ شگفتگی سے ہنسی۔ ”سب میں کریک ہوتے۔۔۔

دراصل میں ایک کتے سے ڈر کر بھاگی تھی۔ جو شاید مجھے کانٹے کے ارادے سے بڑی تیزی سے میری سمت آ رہا تھا۔ مجھے تو اب پارک کے خیال سے ہی خوف آ رہا ہے۔“

”تمہا کیوں جاتی ہیں۔۔۔“ وہ بے خیالی سے بولا ”کسی کو ساتھ لے لیا کریں۔“

اس نے نچانے کس سوچ کے تحت کہا تھا لیکن ربیعہ چند لمحوں کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

”اپنا خیال رکھا کریں۔“ وہ پھر اسی انداز سے بولا۔

پھر یکایک وہ چونک کر کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈال کر اس نے گرمی سانس بھری اور جیسے

حواسوں میں آتے ہوئے خوش دلی سے مسکرایا۔

”میں اب چلوں گا۔۔۔“

”ارے۔۔۔“ ربیعہ بھی چونک اٹھی۔ ”اس طرح کیسے جاسکتے ہیں آپ۔ میرا خیال ہے اسی چائے بنا رہی ہیں۔“

”میرا مقصد آپ کی عیادت کا تھا سو پورا ہوا، چائے پینے پھر کسی دن حاضر ہوں گا!“ وہ شرارتاً بولا۔

”پھر آنے کا بہانا؟“ نجانے کس رویں ربیعہ کہہ بیٹھی۔
 رافع حیران سا ہوا۔ ربیعہ بے حد خفت زدہ ہو گئی تھی۔ جو کچھ لہوں سے بے اختیار اور بے سبب ہی نکل گیا تھا۔
 ذہن میں کہیں اس کا نشان نہ تھا نجانے کیسے وہ کہہ بیٹھی تھی اور اب جی بھر کر شرمندہ ہو رہی تھی۔
 ”خدا حافظ!“ وہ جیسے سے کہہ کر نکل گیا۔
 ”خدا حافظ!“ ربیعہ کے بھی ہونٹ ہلے تھے۔

کمرے کی لائٹ آف کر کے اس نے بے حد مدھم آواز میں ریڈیو لگایا ہوا تھا۔ ریڈیو پر لیٹ آواز کا غزل
 پروگرام چل رہا تھا۔ ہر چند کہ یہ کام اس کی طبیعت اور مزاج سے میل نہ کھاتا تھا پھر بھی نجانے کیوں آج ناعمہ کا
 دل آدھی رات کو موسیقی سے لطف اندوز ہونے پر آمادہ تھا۔ کھلے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ
 مسلسل زندگی کے نئے رخ اور نئے حالات کے متعلق سوچ رہی تھی۔ واقعات میں اتنا الجھاؤ اور اتنی گھٹیاں تھیں
 کہ انہیں سلجھانا اسے اپنے بس کی بات نہ لگتی تھی۔

آج اس نے فراز کا بے حد خوب صورت روپ دیکھا تھا۔ اس کی بہت اچھی باتیں سنی تھیں۔ اب تک وہ اس
 سے جس انداز سے مخاطب ہوتا آیا تھا اور جن نظروں سے اسے گھورا کرتا تھا اس سے ناعمہ کے دل میں اس کی
 طرف سے گرمیں بڑھتی تھیں لیکن آج اس کا آواز نرم، مسکراتا روپ اس کے دل میں کھب گیا تھا۔
 کتنا اچھا لگ رہا تھا وہ۔ رابعہ بیگم سے بات کرتے ہوئے۔ ناعمہ کے دل نے اس کی پچھلی سب خطائیں
 بخش دی تھیں۔ آج پہلی مرتبہ دل نے اسے اس رشتے کی بابت پہچانا تھا جو تقدیر نے ان دونوں کے درمیان قائم کیا
 تھا۔ ناعمہ کا جی چاہا، ”آج وہ اسے فون کرے۔ اس سے بات کرے۔ اس سے پوچھے کہ وہ کیوں اس کے ساتھ اس
 طرح کا رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔“

ناعمہ کو علم تھا کہ اس کی ممکنہ ہونے میں فراز کے فیصلے کا عمل دخل تھا۔ اس کے باوجود وہ اس سے بات کرتا
 تھا تو اس کے لہجے سے پیش پھوٹی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ کبھی اسے فون پر بلواتا ہے، کبھی اپنے ساتھ باہر لے جانے کا متمنی ہوتا ہے، اس کے باوجود وہ
 بات کرتے ہوئے عجیب طنزیہ انداز روا رکھتا تھا۔ اسے عجیب نگاہوں سے گھورتا تھا جیسے کسی مجرم کو دیکھ رہا ہو۔
 بھلا ایسا کیوں تھا؟

وہ بے طرح الجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ شخص کیا چاہتا تھا، کیا سوچتا تھا، کیا جاننا چاہتا تھا۔ اس کے لفظوں کی بازگشت
 اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

”آواز پہچانی نہیں۔ یا پھر آواز پہچان کر یہ حال ہوا ہے؟“

”تم کیا گلت فیل کر رہی ہو؟“

”یہ کیا نمبر کیوں لیا گیا ہے؟ وہ پچھلا نمبر اب کس کے پاس ہے؟“

ناعمہ کو عجیب سے احساس نے آگھیرا۔ وہ لیٹ ہوئی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا

وہ تیری یاد تھی اب یاد آیا

نور جہاں کی آواز ریڈیو سے ابھری تھی۔ بے حد خوب صورت غزل بے حد خوب صورت انداز میں گائی جا رہی
 تھی۔ ناعمہ سب کچھ بھول بھال کر غزل کی طرف متوجہ ہو گئی۔

بیٹھ کر سایہ گل میں ناصر

ہم بہت رونے، وہ جب یاد آیا

آخری شعر پر ناعمہ کی آنکھوں میں نجانے کیوں آنسو بھر آئے۔ شاید یہ نور جہاں کی آواز کی گہرائی کا اثر تھا یا پھر

لفظوں کی سچائی کا۔ اس نے انگلی کی پور سے آنسو صاف کیے۔
 یکایک اسے کچھ یاد آنے لگا۔ کوئی بات بے چین کرنے لگی۔ اس نے سوچا، غور کیا۔ کیا بات تھی؟ اسے اس غزل سے عریضہ کیوں یاد آنے لگی تھی؟
 تب ایک ایک کر کے بہت سی باتیں، بہت سی یادیں کسی الہم کی طرح اس کے ذہن میں کھلنے لگیں۔ اسے بہت سے بے درپے واقعات تفصیل سے یاد آئے۔

عریضہ کا اس سے یہ غزل ملنا۔ اس کا ہر روز کھویا کھویا سا انداز۔ کبھی اداسی، کبھی بے پناہ خوشی۔ اس کا نافع سے منگنی ہو جانے پر شدید احتجاج، ہر شخص ہر شے سے روٹھ جانا۔ ناعمہ کا سانس تیزی سے جلنے لگا تھا۔ اس کا ذہن آج شاید ہر راز سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اپنے ذہن کی ایسی مثالی کارکردگی سے وہ خود ناواقف تھی!
 وردہ تو اسے نہایت کم عقل اور بدھو گردانتی تھی۔ رائمہ اسے معصوم اور سیدھی سادی کہا کرتی تھی۔ ثانیہ اسے کوئی عقل کی بات کہتا دیکھتی تو فرط حیرت سے دانتوں میں انگلی دبالتی تھی اور آج ناعمہ کو ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس نے کسی بڑے راز سے پردہ اٹھا لیا تھا۔ جیسے اس نے وہ سمجھ لیا تھا جواب تک کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ سمجھ کر کس ردِ عمل کا مظاہرہ کرے؟ لیکن کیا جو کچھ اس نے سمجھا تھا وہ واقعی درست تھا؟ سچ تھا؟ یا پھر لوگوں کی اس کے بارے میں رائے بے حد واثق تھی۔ جو ربط اس نے بنایا تھا۔ وہ اس کی کم عقلی کا مظہر تھا؟ اس کی اتنا درجے کی حماقت کا کرشمہ؟
 ناعمہ کو ابھی اس کتنی کو سلجھانا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کئی ارادے باندھنے لگی تھی۔

چہرے پر پانی کے چھپکے مارتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل الفاظ کے چناؤ میں مصروف تھا۔ اس نے جو کچھ سوچا تھا وہ اس کے لیے تو بے حد واضح تھا لیکن فریقِ مائی کا ردِ عمل کیا ہو سکتا تھا اور کیا نہیں۔ وہ اس سلسلے میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھی!
 واش روم سے نکل کر وہ تویہ سے چہرہ تھپکتی ہوئی بید پہ آ بیٹھی۔ ہاشم اپنی جگہ پر نیم دراز تھا۔ ایک بازو اس نے آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔

شہلا کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ آج ہاشم ضرورت سے زیادہ خاموش تھا۔ اس نے شہلا کی چند باتوں کے جواب میں سنجیدگی سے چند الفاظ ہی استعمال کیے تھے اور خود سے کوئی بات اب تک نہ کی تھی۔ شہلا اور ہاشم کمرے میں ہوتے تو ہاشم کی توجہ مسلسل اس پر مرکوز رہا کرتی تھی اور موڈ بے حد خوشگوار ہوتا تھا۔ وہ شکستگی سے اکثر اس کی بے توجہی پر فخرے کسا کرتا تھا۔ آج معاملہ بے حد برعکس تھا۔ شہلا اس کی جانب متوجہ تھی اور وہ آنکھوں پر بازو رکھے نجانے سوراہا کیا کچھ سوچ رہا تھا۔
 شہلا نے ہولے سے کھنکھار کر اسے متوجہ کرنا چاہا لیکن نتیجہ حسبِ توقع برآمد نہ ہوا۔

”ہاشم!“ اس نے پکارا۔
 ”ہوں!“ وہ اسی انداز میں لیٹے لیٹے بولا۔ بازو ہٹا کر اس نے شہلا کی جانب نہ دیکھا تھا۔ شہلا کے دل کو کچھ ہوا۔
 چوٹ سی لگی۔

”آپ سو رہے ہیں؟“

”نہیں!“ واضح جواب آیا تھا۔

”پھر ایسے کیوں لیٹے ہیں؟“

”بس یونہی۔“

شہلا کچھ سوچنے پر مجبور ہوئی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے غور کیا پھر بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔
 ”آپ سے۔۔۔ کسی نے کچھ کہا ہے میرے بارے میں؟“ ہاشم نے بازو ہٹایا اور اسے غور سے دیکھا۔
 ”مثلاً۔۔۔ کس نے؟“

”آپ کی امی نے؟“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔
ہاشم اس کی بات پر چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔
”شہلا...!“

”جی؟“

”تم صرف ”امی“ بھی کہہ سکتی ہو ”آپ کی امی“ کہنا کچھ معنی رکھتا ہے۔ شاید تم انہیں اپنی ماں نہیں سمجھتیں۔“

شہلا خاموش ہو کر انگلی سے بستر کی چادر پر لائنیں کھینچنے لگی۔
”انہوں نے شاید آپ سے میری شکایت کی ہے۔“ پھر وہ بولی تھی ”اور آپ مجھ سے کچھ بھی پوچھے بنا کوئی بھی وضاحت مانگے بغیر یوں خفا ہو کر لیٹے ہوئے ہیں۔ اس ناٹ فیشر ہاشم!“
”تم سے کس نے کہا کہ میں تم سے خفا ہوں۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں بولا۔ ”اور کیا وضاحت مانگوں تم سے؟ میں نے تو تم سے کبھی کسی بھی بات کی وضاحت نہیں مانگی۔ شاید مجھے وضاحتیں طلب کرنے کی عادت نہیں ہے۔“

”خفگی کا اظہار صرف لفظوں سے نہیں ہوتا ہاشم! اگر آپ نہ بھی کہیں تب بھی میں سمجھ سکتی ہوں۔ اور آپ کو وضاحت طلب کرنے کی عادت نہیں ہے تو مجھے بھی صفائیاں پیش کرنے کی عادت کبھی نہیں رہی لیکن میاں پووی کو دل کی باتیں کر لینی چاہئیں ورنہ زندگی بہت مشکل ہو جاتی ہے۔“
ہاشم اس کی بات پر اسے بہت دیر تک دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔
”یہ۔۔۔ تم کہہ رہی ہو شہلا؟“

”آپ کے انداز میں شکایت کیوں ہے؟“ شہلا نے ابرو چڑھایا۔ ہاشم نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔
”کیا آپ کے دل میں بھی میرے لیے شکایت ہے؟“ شہلا نے پوچھا تھا۔
ہاشم خاموش رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ اس کی بات کے جواب میں کیا کہے۔
”ہاں میں ہاشم؟“ وہ جانے بھر مصر مچی۔

ہاشم کو بہت پہلے رافع سے ٹکی گئی اپنی گفتگو یاد آئی۔
”ڈاکٹر صاحبہ سے کوئی شکایت؟“ رافع نے پوچھا تھا۔
”او نہیں یا نہ! شکایت تو جب بھی ہوئی، اپنے آپ سے ہوگی!“ اس نے کہا تھا۔ وہ گہری سانس بھر کر خود میں لوٹا۔ وہ شاید اپنے کمنے سے پھر رہا تھا۔

شہلا اپنی بات کا کوئی جواب نہ پا کر اب سنجیدگی سے کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے سراٹھا کر ہاشم کو دیکھا۔
”ہاشم میں ایسا بات کہنا چاہتی ہوں، آپ سے امید ہے۔ آپ میرا مسئلہ برامانے بغیر حل کروں گے۔“
”ہاں کو کیا بات ہے ایسی۔۔۔؟“ وہ سب کچھ بھول کر اب اس کے مسئلے کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔
”میں علیحدہ گھر لیتا چاہتی ہوں۔“ وہ قدرے رک کر بولی۔
”علیحدہ گھر؟“ ہاشم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ۔۔۔ میں میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہاں سب لوگوں کی منبیلٹی مختلف ہے۔ میری سوچ بے حد مختلف ہے۔ میں یہاں رہوں گی تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ آپ، آپ پلیز میرا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کیجیے۔“ ہاشم ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا کہ شہلا آخر اس سے کہہ کیا رہی ہے۔
”شہلا! کیا کیا چاہتی ہو تم؟“ وہ اٹلتے ہوئے بولا تھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ میں اور آپ علیحدہ الگ گھر میں رہیں اور اور عمر ہمارے ساتھ رہے۔“
”اور؟“ ہاشم نے گہرا سانس لیا ”تو یہ بات ہے!“

”پلیز تاہم! میری اس درخواست کو لاناہٹلی نہ لیجیے گا۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑی پرابلم بنتی جا رہی ہے اسے سولوا (Solve) کرنے کی کوشش کریں پلیز“
وہ ملتیجانہ انداز میں بولی تھی۔ ہاسٹم سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا تھا۔

وہ بے حد خاموش خاموش سی بیٹھی کچھ سوچ رہی تھیں۔ ورورہ نے چپکے سے آکر ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال دیں۔ رابعہ بیگم نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”کیا سوچ رہی ہیں اکیلے اکیلے۔۔۔“
”اُف۔۔۔ بیٹھو میرے پاس۔ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔۔۔“
ورورہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

رابعہ بیگم چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھیں۔ پھر انہوں نے ورورہ کی جانب نگاہ کی۔
”ورورہ بیٹی! ایک بات کہوں۔“

”لیجیے۔۔۔ اب یہ اجازت کیوں دے رہی ہوئی۔ ایسی کیا بات ہے؟“
”سوچتی ہوں۔۔۔ تمہارے دل کو شاق نہ کر رہے۔۔۔“

”اُف فوراً۔۔۔“ اس نے برا سامنے بتایا۔ ”ای پلیز ایسی باتیں نہ کیا کریں۔ کہیں کیا کہہ رہی تھیں؟“
”ورورہ بیٹی! میں سوچتی ہوں جس طرح فراز، فریحہ کو سامنے لا کر کبھی ناعمہ سے بات کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے، کبھی اسے اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہتا ہے تو کیا یہ سلسلہ مزید آگے بڑھے؟ اس سے یہ بہتر نہیں کہ ہم جلد از جلد ناعمہ کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں؟“

”واہ۔۔۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”یہ تو آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی!“
”لیکن بیٹی! تم ناعمہ سے بڑی ہو۔ پہلا حق تمہارا بنتا ہے۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی تھیں۔ ”کیا یہ بات تمہارے لیے ناگوار نہ ہوگی؟“
”ارے جانے دیں امی! یہ پرانے زمانے کی باتیں۔“ وہ برا سامنے بنا کر بولی ”مجھے شادی کی نہ کوئی خواہش ہے نہ

ہی جلدی۔“
”یہی رافع کہتا ہے۔۔۔“ وہ فکر مندی سے بڑبڑائیں ”آخر بات کیا ہے؟“
”آپ، آپ کبھی تو میں ناعمہ سے بات کروں۔۔۔“ وہ جلدی سے بول پڑی۔ ”آخر ہمیں اس کی رائے بھی معلوم کرنا چاہیے۔“

”میرا خیال ہے میں عذر بھالی سے بات کروں۔۔۔“ رابعہ بیگم کا ذہن اب دوسری جانب ہی جا نکلا تھا۔ ”میں میں تم دونوں کے فرض سے ایک ساتھ سبکدوش ہو جاؤں، یہ بہت بہتر رہے گا۔ نجانے کل کس۔۔۔ پتا نہیں کیوں میرا دل خوف زدہ سا رہتا ہے!“

”بے وجہ کے توہمات کا شکار نہ رہا کریں امی!“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”جو تقدیر میں رقم ہوا اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ انسان کو اپنے معاملات خدا کے حوالے ہی رکھنے چاہئیں، خود کو خدشات کے حوالے کرنے سے گھنٹ پریشان ہیں ہی حاصل ہوتی ہیں!“

رابعہ بیگم نے اپنی سوچوں سے نکل کر اسے دیکھا پھر وہ مسکرا دیں۔
”بہت سمجھ دار ہے میری بیٹی!“ وہ محبت سے بولی تھیں۔ ”خوش رہو۔ اللہ تمہیں ہر طرح کی خوشیاں دکھائے

آمین!“
فونز کی گھنٹی دیر سے بج رہی تھی۔ ربیعہ نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا۔ لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔ منیز فونز شاید نہار ہی تھیں۔ وہ اسٹک کے سارے چلتی ہوئی فون تک آئی تھی۔

”ہیلو۔۔۔“ اس نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔۔۔“ دوسری جانب سے خوب صورت بھاری آواز ابھری تھی ”مس ربیعہ بات کر رہی ہیں؟“

”جی ہاں!“ وہ قدرے الجھی۔ ”ربیعہ ہی بات کر رہی ہوں۔ آپ کون صاحب ہیں؟“

”امیر حسن مخاطب ہوں“ آپ کا مجرم!“ وہ ہیرے سے ہنسا تھا۔

ربیعہ نے قدرے غائب دماغی سے چند لمحوں کے لیے غور کیا تھا۔ فوری طور پر اسے وہ نام شناسا تو محسوس ہوا لیکن مکمل طور پر کچھ یاد نہ آسکا۔

”امیر حسن؟“ وہ بڑبڑائی۔

”شاید آپ پہچانی نہیں، حالانکہ میں اپنا تعارف ایک مجرم کی حیثیت سے کروا بھی چکا ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

تب ہی اچانک اسے امیر حسن بھی یاد آگیا اور اپنے ٹخنے کا درد بھی۔

”وہ۔۔۔ کیسے ہیں آپ۔“ وہ نجانے کیوں شرمندہ بنی ہوئی۔

”یہی پوچھنے کے لیے تو میں نے فون کیا ہے۔“ وہ ہنس دیا۔ ”یہ بتائیں کہ آپ کیسی ہیں، آپ کا پیر ٹھیک ہو گیا؟ عبادت گزار تھا کہ آپ کو چلنے میں کچھ پرانلم ہو رہی ہے۔ میں تو یہ سن کر بے حد پشیمان ہوا۔ مس ربیعہ! ایک بار پھر بے حد معذرت چاہتا ہوں۔“

”ارے امیر حسن صاحب! آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ ربیعہ فوراً بولی تھی۔ ”میں بھی جانتی ہوں اور آپ بھی کسے۔ قصور صرف اور صرف میرا تھا۔ میں ہی اندھا دھند بھاگتی ہوئی آپ کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔“

”آپ خواہ مخواہ الزام اپنے سر لے رہی ہیں۔“ وہ شکفتگی سے بولا۔ ”حالانکہ اصل قصور وار تو وہ پارک کا کتا ہے۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے اس کا؟“

ربیعہ کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی۔ وہ اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکی۔

”میں نے کتے کا نام بھی بتایا تھا؟ شاید میرے اوسان کچھ زیادہ ہی خطا ہو گئے تھے۔“ دوسری جانب امیر حسن بھی ہنسنے لگا تھا۔ اس کی ہنسی میں شکفتگی اور دوستانہ پن تھا۔ ربیعہ کو احساس ہوا کہ وہ ایک متوازن اور خوبصورت شخصیت کا مالک ہے۔

”اوسان تو آپ نے میرے خطا کر دیے تھے۔ عین ممکن تھا کہ کوئی پتھر مار کر میرا سر ہی پھوڑ ڈالتا۔ شکر ہے گواہی دینے کے لیے آپ ہوش و حواس میں تھیں۔“

ربیعہ قدرے جھینپ گئی۔

”نیچے مزید شرمندہ نہ کریں۔ اب جانے بھی دیں اس ذکر کو۔“

”چلیں جانے دیتے ہیں۔“ وہ فوراً ہی بولا۔ ”اب اجازت دیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ کسی دن حاضر ہوں گا۔ آنٹی کو میرا سلام کہیے گا۔“

”جی ضرور۔۔۔“ ربیعہ بولی۔

”خدا حافظ۔۔۔“ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ربیعہ ریسیور تھامے کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔

○ ○ ○

”ہاشم بھائی۔۔۔ میں نے آپ سے سیمسٹو کی فیس کے لیے کہا تھا۔“

بریف کیس بند کرنا ہوا ہاشم چونک اٹھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ حمزہ شاید یونیورسٹی جانے کے لیے ہی تیار کھڑا

تھا۔ ہاشم کو یاد آیا کہ اس نے دو دن پہلے ہاشم سے اپنے سیمسٹو کی فیس کا ذکر کیا تھا۔

ہاشم کو قدرے شرمندگی ہوئی۔ اس سے پیشتر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کسی بھائی کو اپنی کسی ضرورت کا ذکر

دوسری مرتبہ کرنا پڑا ہو۔ وہ اپنے گھر والوں کی ضروریات یوری کرنا اپنی پہلی ترجیح سمجھتا تھا لیکن پچھلے کچھ دنوں سے

وہ ذہنی طور پر ڈسٹرب سا تھا۔ اسے بہت سی باتیں بھول جاتی تھیں۔

”سوری حمزہ! مجھے یاد ہی نہیں رہا۔“ وہ پشیمانی سے بولا۔

پھر اس نے اپنی چیک بک نکالی اور چیک کاٹ کر حمزہ کی جانب بڑھا دیا۔

”علی کو بھی تو لیس جمع کروانی ہوگی؟“

”اس نے بابا سے لے لیے تھے۔“ وہ مسکرایا۔ ”مجھے تو آب ہی سوٹ کرتے ہیں ان کاموں کے لیے۔ بہت

سے غیر دلچسپ سوالات کے جواب نہیں دیتا بڑتے۔“ ہاشم بھی مسکرا دیا۔

”میں بھی کسی دن بابا جانی کا روپ دھار سکتا ہوں۔ ہیشا رہنا۔“

”میں اس دن سلیمانی ٹوپی پہن کر آؤں گا۔“ حمزہ بے ساختہ بولا۔

ہاشم نے ہلکا سا تقبضہ لگایا۔ حمزہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکلا تھا۔

ہاشم ہلکے ہلکے اٹھا کر کھڑا ہوا، تب ہی ڈرننگ روم سے شہلا نکلی تھی۔ وہ بھی بالکل تیار تھی۔

”آپ مجھے بھی ڈراپ کر دیجئے گا۔ آج تو ناٹمنگنز تقریباً ایک سی ہیں۔ واپسی بھی ساتھ ہو جائے گی۔“

”ضرور۔“ ہاشم مختصراً بولا۔

”ناشتہ میں تیار کر کے آئی تھی اوپر۔“ شہلا نے ایک نگاہ اس کے سنجیدہ سے چہرے پر ڈالی۔ ”چلیں، میں آپ

کے لیے چائے پھر سے بنا دوں۔“

”نہیں۔“ ہاشم نے گھڑی دیکھی۔ ”میں پھر لیٹ ہو جاؤں گا۔ تم ساتھ چل رہی ہو تو میں چائے آفس میں ہی

پیوں گا۔“

”اگر ایسا ہے تو میں اپنی گاڑی میں چلی جاتی ہوں۔“ شہلا فوراً بولی۔ ”آپ خالی پیٹ نہ جائیں، آرام سے

ناشتہ کر کے نکلیں۔ میری وجہ سے آپ بچ تک بھوکے ہی رہیں گے۔“

”آپ کی وجہ سے تو ہم عمر بھر بھوکے رہ سکتے ہیں مادام!“ ہاشم ہلکا سا مسکرایا۔ ”یہ طیلے اب اتنا تکلف نہ برتا

کر کہ بیوی کے بجائے پڑوسن معلوم ہوں۔“

شہلا نے حیران ہو کر اس کی صورت دیکھی۔ اس کے الفاظ میں شکفتگی لیکن لہجہ ہلکا سا طنز لیے ہوئے تھا۔ شہلا

کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہاشم مذاق کر رہا ہے یا طنز۔

وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ ہاشم کے پیچھے بیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا ذہن اب تک اس کے لفظوں

میں الجھا ہوا تھا۔

”آپ کی وجہ سے تو ہم عمر بھر بھوکے رہ سکتے ہیں مادام۔“

شہلا کو خوشگوار سا احساس بھی ہوا۔ کتنے ہی دن سے وہ کچھ سنجیدہ اور اداس سا تھا۔ اس نے شہلا سے کوئی

محبت بھری بات، کوئی دل بھاتا جملہ نہ کہا تھا۔ آج اس کے لبوں سے ایسی بات سن کر اسے اچھا لگا تھا۔ ہر چند کہ

ذہن میں اس کے لطیف طنز کا احساس بھی پھانس بن کر چھپا تھا۔

گاڑی آگے بڑھی تو شہلا نے کھٹکھٹا کر جیسے کسی بات کے لیے خود کو تیار کیا تھا۔

”ہاشم... میں نے... آپ سے ایک درخواست کی تھی۔“ وہ ذرا جھجکتے ہوئے بولی۔

ہاشم نے کچھ دیر اس کی بات کا جواب نہ دیا تھا۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ شہلا نے گردن گھما کر اسے

دیکھا۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں ہاشم!“

ہاشم نے گہری سانس بھرتے ہوئے موڑ کاٹا تھا۔

”اسی کا جواب دینے کے لیے مناسب لفظوں کا چناؤ کر رہا تھا۔“ وہ بولا۔

”مناسب لفظ؟“ شہلا چونکی۔ ”مناسب لفظ تو کسی معذرت یا انکار کے لیے ڈھونڈے جاتے ہیں۔“

ہاشم پھر کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نرم لہجے میں بولا۔
 ”تم نے جو فرمائش کی تھی شہلا! میں اس کے جواب میں معذرت کے سوا اور کوئی چارہ نہیں پاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ تم میرا پوائنٹ آف ویو نہ سمجھ سکو لیکن میرا خیال یہ ہے کہ میں اپنے گھر کا سب سے مضبوط ستون ہوں۔ فی الحال اس فیملی کی عمارت کا بوجھ زیادہ تم میرے کاندھوں پر ہے۔ ایسی صورت میں۔۔۔“
 ”میرا نہیں خیال ہے کہ میرا پوائنٹ آف ویو آپ نہیں سمجھ سکے۔“ شہلا مدھم لیکن قدرے تیز لہجے میں بولی تھی۔

”آپ اگر معاشی مسائل کے حوالے سے بات کر رہے ہیں ہاشم! تو میں نے آپ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ آپ اپنے گھر والوں کی معاشی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیں، نہ ہی میں نے اپنے اخراجات میں اضافے کی بات کی تھی۔ میں نے اپنے لیے ایک علیحدہ رہائش کی بات کی تھی لیکن میرا مقصد آپ کے مسائل میں اضافہ کرنا نہیں تھا۔ خدا کا فضل و کرم ہے میرے اخراجات کے لیے میری اپنی آمدنی کافی ہے۔ میں صرف اپنے ذہنی سکون اور ارتکاز کی بات کر رہی تھی۔ اس گھر میں میری سوچ نجانے کتنے پہلوؤں میں سفر کرتی ہے۔ میں مسلسل ٹینشن کا شکار ہوں۔ ایک ماں ہوتے ہوئے میں اپنے بیٹے کی آمد پر ایک خفت سے دوچار ہو جاتی ہوں۔ آپ مجھ سے محبت کا دعو کرتے ہیں لیکن اتنی معمولی سی بات نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔ اگر ہم قریب ہی کوئی گھر لے کر وہاں شفٹ ہو جاتے ہیں تو اس میں کون سی پرانی ہے؟“

”سوچنے کی حد تک تو سب ٹھیک ہے شہلا! لیکن ایک بات سے کئی باتیں نکلتی ہیں۔ تم بھی میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس گھر کا بڑا بیٹا ہوں۔ صرف معاشی مسائل کی بات نہیں ہے اور بھی کئی ذمہ داریاں ایسی ہیں جو علیحدہ ہونے کی صورت میں عیس احسن طریقے سے نہ نبھایاؤں گا۔“
 ”مثلاً۔۔۔“ شہلا نے چڑکرا سے دیکھا۔

”مثلاً کچھ نہیں۔“ وہ دھیسے سے بولا۔ ”تم اس وقت ایسے موڈ میں ہو، جب صحیح بات بھی غلط لگتی ہے۔ اس موضوع پر پھر کبھی بات کر س گے۔ تمہارا ہاسپٹل بھی آگیا ہے۔“
 شہلا خاموش ہو کر سر دکھنے لگی۔ ہاشم کے انکار سے اسے دھچکا سا لگا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ہاشم اس مطالبہ پر زیادہ اعتراض نہ کرے گا اور ہنسی خوشی اس کی بات مان لے گا لیکن ہاشم کا فیصلہ کن انداز اسے حیران بھی کر گیا تھا اور بہم بھی۔ ہاشم نے گاڑی ہاسپٹل کی پارکنگ میں روکی تو شہلا اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے قدرے آف موڈ میں اترنے لگی تھی۔

”خدا حافظ۔“ ہاشم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

”خدا حافظ۔“ وہ زیر لب بڑبڑاتی تھی۔

فون نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور دل عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ اس گھبراہٹ کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ وہ اپنے نگہبیر سے بات کرنے جا رہی تھی۔ وہ بہر حال پڑھی لکھی، باشعور، ایک سوئس صدی کی لڑکی تھی۔ البتہ حیا دار اور اپنی حدود میں رہنے کی قائل ضرور تھی۔

مگر اس عجیب سی گھبراہٹ کی اصل وجہ وہ نامعلوم سا احساس اور وہ انداز تھا جو اس نے نجانے کیسے، ایک پہر کے جادوئی لمحے کے طفیل قائم کیا تھا اور اب وہ اپنے اندازے کی تصدیق چاہتی تھی۔ دوسری جانب بیل جا رہی تھی۔ ناعملدہ کاٹتے ہوئے اپنے تیز ہوتی کی دھڑکنیں سننے لگی۔ وہ لینڈلائن پر بھی رابطہ قائم کر سکتی تھی لیکن اس نے جان بوجھ کر موبائل نمبر ملایا تھا کیونکہ اس صورت میں کسی اور کے فون اٹھانے کا امکان تھا۔

”ہیلو۔“ رابطہ قائم ہونے پر دوسری جانب سے وہی شناسا آواز سنائی دی تھی۔

”ہیلو۔ السلام علیکم۔“ وہ مدھم لہجے میں بولی۔ ”میں۔۔۔ ناعملیات کر رہی ہوں۔“

”و علیکم السلام۔“ وہ چند لمحوں کے بعد بولا تھا۔ ”میں ہنڈرڈ پرسنٹ شیور تھا کہ فون ورنہ نے کیا ہوگا۔ زبہ

نصیب! آپ کو یہ تمہارا دوتا آیا۔“

”میں نے۔۔۔ ورہ آلی سے ہی نمبر لیا ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

فراز نے ہلکا سا تقبہ لگایا۔ ناعمہ کو اس کے بے وجہ ہنسنے پر حیرت ہوئی۔

”کیوں ہنسے آپ؟“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”تجلیل عارفانہ کی بھی کوئی حد ہوتی ہے مس ناعمہ۔“ وہ عجیب انداز میں بولا۔ ”میرا موبائل نمبر آپ نے ورہ

سے لیا ہے؟ اس سے پہلے آپ نے کبھی مجھ سے اس نمبر بات نہیں کی؟“

ناعمہ کا دل ایک مرتبہ پھر اسی اجنبی انداز سے دھڑکا تھا۔ اندازوں کی تصدیق ہونے لگی تھی۔ وہ ایک ایسا راز جاننے کی منتی تھی جسے جان کر اسے خوشی نہیں دکھ ہوناقا پھر بھی وہ سب کچھ جانتا چاہتی تھی۔

”میں نے۔۔۔ پہلے آپ سے کب بات کی تھی؟“ اس نے ہولے سے پوچھا۔ ”کتنا عرصہ ہو گیا اس بات کو؟“

”عرصہ کتنا ہوا؟ یہ تو مجھے یاد نہیں۔ مجھے تو صرف چیٹنگ اور دھوکے کا مطلب پوچھنا ہے تم سے۔“ وہ قدرے سلگتے ہوئے انداز میں بولا تھا۔

”چیٹنگ۔۔۔ دھوکا۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے دھوکا کیا آپ کے ساتھ؟“

”تم ہی کہو۔۔۔ وہ سب کچھ کیا تھا؟ یا تمہارا سنگ؟“

ناعمہ بہت دیر کچھ نہ بول سکی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے سے کئی منظر گزر رہے تھے۔ عیشہ کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں اور ایک دوسرے میں پوست لب۔ جو کھلنا تو چاہتے تھے لیکن ماں باپ کے جبری فیصلے کے آگے کھلنے کی ہمت نہ کر سکے۔

”نہیں۔۔۔“ پھر وہ آہستہ سے بولی۔ ”میں نے ٹائم پاسنگ کے لیے ایسا نہیں کیا تھا فران۔ بس کچھ مجبوریاں

آڑے آگئی تھیں۔“

”وہ۔۔۔“ فراز نے ہماری سانس بھری۔ ”تو بالآخر۔۔۔ بالآخر تم نے قبول کر ہی لیا۔ کتنے عرصے تک مجھے بے

وقوف سمجھتی رہیں تم مزید بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی رہیں لیکن آج۔۔۔ آج تم نے تسلیم کر ہی لیا کہ ایک

عرصہ مجھے اذیت میں مبتلا رکھا ہے تم نے۔“

”جی ہاں۔“ وہ مزید مدہم ہو گئی تھی۔ ”میں نے تسلیم کیا۔ آپ جو سزا دینا چاہتے ہیں دے دیجئے۔“

فراز چند لمحے کو خاموش ہوا۔ وہ اسے پے درپے حیرت سے دوچار رہی تھی۔

”سوچنا پڑے گا۔ اتنا تو طے ہے مس ناعمہ۔ کہ یہ ممکن نہیں ہے تمہیں سزا دینے کے لیے ہی کہی تھی لیکن سزا

کیا ہوگی؟ اس بات کا فیصلہ میں اس وقت کروں گا جب تم مجھے ان مجبوریوں کے متعلق بتاؤ گی جن کا تم نے ذکر کیا

اور میں اس وقت کا انتظار کروں گا۔“

”میں۔۔۔ میں اگر نہ بتانا چاہوں۔۔۔“ وہ گھبرا سی گئی۔

”تب تو سزا میں کسی نری کی گنجائش نہیں نکلے گی۔“ وہ بے رحم انداز میں بولا تھا۔

ناعمہ کو اس لمحے اس سخت گیر شخص سے عجب خوف سا محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے ریسپور رکھ دیا۔

ہونٹ دانتوں تلے دبائے وہ نجائے کیا سوچے جاری تھی۔ کیا ہوا تھا؟ کیا ہو رہا تھا اور کیا ہونے جا رہا تھا؟ سب کچھ

ایک باریک پردے کے پیچھے تھا، نظر ابھی رہا تھا اور نظروں سے اوجھل بھی تھا۔ اتنا ضرور تھا کہ معتہ ٹھیک اسی

انداز میں حل ہوا تھا جس طرح اس نے اندازہ لگایا تھا۔

سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہونے لگا تو وہ بے جان سی ہو کر بستر گر گئی تھی۔

○ ○ ○

ٹائی کی ناشد درست کرتے ہوئے اس نے ایک نظر آئینے پر ڈالی پھر خوش دلی سے مسکرایا۔

”آدی تم ڈشنگ ہو رافع حسن!“ اس نے زیر لب کہا اور دھیرے سے ہنس دیا۔ اسے ہاشم یاد آ گیا تھا جو ہمیشہ

آئینہ دیکھ کر خود کو یوں ہی مخاطب کرتا تھا۔

”بے وفا دوست۔۔۔“ وہ بڑبڑایا۔ ”بالکل ہی بیوی کو پیارا ہو گیا ہے، مہینوں شکل نہیں دکھاتا۔۔۔ چلو اچھا ہے، اگر بیوی کو پیارا ہو جائے تو۔۔۔ پڑی مشکلوں سے یہ دن دیکھا ہے اس نے۔۔۔ اور پتہ نہیں پیارا ہوا بھی ہے یا۔۔۔ اب بھی گیلری میں کھڑے ہو کر سکرٹ پیتا ہے۔“

آستین کا بن بند کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکلا تھا۔ چائے کے کپ میں دودھ ڈالتی ہوئی عذرا اینگم نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہنے پر مجبور ہوئیں۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر کپ میں چچہ ہلانے لگا۔ عذرا اینگم بھی دوسری کرسی گھسٹ کر پیٹھ تکیں۔

”رافع۔۔۔ ایک بات کرنا بھی تم سے۔“

”جی ای۔۔۔ کیسے۔۔۔“ اس نے غجٹ میں کئی گھونٹ بھرے۔

”ہمانیہ کے لیے جو لوگ پچھلے دنوں آئے تھے، انہوں نے ”ہاں“ کھلوائی ہے اور مجھے بھی لڑکا پسند آیا ہے۔ کاروبار بھی اچھا ہے ان لوگوں کا۔ پھر کیا خیال ہے تمہارا؟“

”بایا کیا کہتے ہیں؟“ اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔

”وہ تو راضی ہیں۔ کہتے ہیں رافع سے بھی پوچھ لو۔“

”ہوں۔۔۔ ٹھیک ہے۔“ اس نے کپ خالی کیا۔ ”میں دو مرتبہ ملا ہوں اس سے۔ شمس اچھا لڑکا ہے۔ شریف

ہے، وہ بن ہے اور کیا چاہیے؟ آپ بسم اللہ کریں۔“

”لیکن ایک مسئلہ ہے بیٹے، وہ دو ماہ بعد عید کی تاریخ مانگ رہے ہیں۔ اتنی جلدی بازی میں سب کچھ کیسے ہو گا؟“

”کیوں نہیں۔۔۔ ثانیہ کے لیے تو تقریباً ”سب ہی کچھ تیار ہے۔ مسئلہ کس بات کا ہے؟“ وہ ماں کے ہچکچاہٹ بھرے انداز پر حیران ہوا۔

”مسئلہ۔۔۔ مسئلہ تمہارا ہے نا۔ تمہاری نوکری جب تک کسی اچھی جگہ نہ ہو جائے۔۔۔“

”میرا۔۔۔؟ میرا کیا مسئلہ ہے امی؟“ اس نے مزید حیرت سے ماں کی بات کالی۔ ”بات ثانیہ کی ہو رہی ہے مسئلہ میری نوکری کا کیسے ہو گیا؟“

”مجھے کسی کو شش کرو بیٹا! تمہارے والد کا خیال ہے کہ ثانیہ کی شادی اور تمہارا ولیمہ ساتھ کر دیں، اسی طرح

سدرہ کی شادی اور نافع کا ولیمہ ساتھ ہو جائے۔ دو بیٹیاں جائیں گی تو دو ہوس آجائیں گی اور پھر اس طرح کچھ

کفایت بھی ہو جائے گی اب تمہاری نوکری بچی ہو جائے تو میں رابعہ سے بات کروں۔ وہ بھی ورورہ کی وجہ سے فکر مند

ہے۔ ناعصہ کی میٹنگ کے بعد اب وہ حق بجانب بھی ہے اور سب ہی کا خیال ہے کہ اب تمہاری اور ورورہ کی شادی

کر دی جائے۔“

بات کرتے کرتے انہوں نے اس کے چرے کی جانب دیکھا پھر یکدم حیران سی ہوئیں۔ رافع کا چہرہ یوں بچھا تھا

جیسے کسی نے شمع ان کو ہوا دکھادی ہو۔ وہ بالکل گم صم سا ہو گیا۔ عذرا اینگم پریشان ہو گئیں۔

”رافع۔۔۔“ انہوں نے پکارا۔

”جی۔۔۔“ وہ اپنے خیالوں سے چونکا۔ ”جی ای۔۔۔ کیسے۔۔۔“

”کیا کہوں میں تو اپنی بات مکمل کر چکی۔“

”کون سی بات؟“ وہ غائب دماغی سے بولا۔

”شادی کی۔۔۔ اور کون سی۔۔۔ یہ تم اتنا پریشان کیوں ہو گئے ہو؟ کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی الجھن ہے؟“

”جی۔۔۔؟ نہیں۔۔۔ نہیں امی۔۔۔ کوئی الجھن نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تو مجھے کچھ جواب تو دو۔“ وہ اسے جانے کے لیے تیار دیکھ کر قدرے خفا سی ہوئیں۔

”میں ایک سنجیدہ موضوع پر بات کر رہی تھی اور تم یوں ہو گئے جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔ اب بتاؤ کئی جواب دیے جانے کو پر تو لے لگے۔“

”اُمی۔۔۔ میں ایک انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں۔“ اس نے رستہ واضح پر نگاہ کی۔ ”دعا کیجئے گا، اللہ کامیاب کر دے۔“

”اچھا۔“ ان کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”بیٹا! میرا تو رواں رزاں تم ہی لوگوں کے لیے دعا گو رہتا ہے۔ کیسی نوکری ہے؟“

”بہت اچھی جاب ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنی ہے، اچھی تنخواہ دیں گے۔ دیگر مراعات علیحدہ۔“ کتے ہوئے چل پڑا۔ عذرا بیگم اس کے پیچھے آ رہی تھیں۔

”پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں ہے۔ تم اگر خیر سے کامیاب لو تو میں رابعہ سے بات کر لوں گی۔ وہ بھی اپنی تیاری رکھے۔“

”اُمی۔۔۔ وہ اچانک ہی پلٹا۔“ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ زندگی میں ابھی کرنے کو بہت کچھ باقی ہے۔ شادی میرے مسائل میں اضافہ کر دے گی۔ آپ پھپھو سے ابھی کچھ بھی نہ کہیں، صرف ثانیہ کے لیے سوچیں۔“

”ہائیں۔“ عذرا بیگم کا منہ کھلا رہ گیا۔ ”یہ۔۔۔ تم کیا کہہ رہے ہو بیٹا؟“

”باقی باتیں پھر کریں گے اُمی! میں پہلے ہی لیٹ ہو گیا ہوں۔ خدا حافظ۔“ وہ چھپاک سے باہر نکل گیا۔

”خدا۔۔۔ حافظ۔“ وہ بڑبڑاتا تھا۔ ان کے ماتھے پر شکنوں کا جال بچھنے لگا تھا۔

”سیاں بنا گھر سونا سونا۔ سیاں بنا گھر سونا۔۔۔ چاند بنا جیسے سونی رتیاں۔۔۔ سن خوشبو جیسے سونی بگیا۔ سیاں بنا گھر سونا۔۔۔“

کچن میں کھڑی ایمان لمحہ بھر کے لیے سُن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ گانا جو کبھی جنون کی حد تک پسند تھا، آج اس کے بولوں نے اس کا دل چر کر رکھ دیا تھا۔ وہ دوسرے کھانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی چھری ایک طرف پھینک کر وہ باہر نکل آئی۔

سامنے ہی ایمان بیٹھی تھی۔ سی ڈی پلیئر آن کر کے وہ اپنے کارنامے پر بسہہ بخش۔ رانی تھی۔

”مما۔۔۔ ممما۔۔۔ آپ کا فیورٹ سائنگ۔“ اس نے تالیاں بجا کر اس سے بھی داد دے سول کرنا چاہی۔

ایمان نے آگے بڑھ کر پلیئر آف کر دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

”کیوں ممما۔۔۔ یہ سائنگ اچھا نہیں لگا؟“ ایمان اس کے آنسوؤں سے خوفزدہ سی ہو گئی۔ ”میں دوسرا سائنگ لگا دوں؟ بلو دے گھر۔“

”آپنی وی پر کارٹون لگا لو بیٹا! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ گانے کی آواز اچھی نہیں لگ رہی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ ماں کی کیفیت سے پہلے ہی گھبرا گئی تھی۔ سعادت مندی سے اٹھ کر بیڈ روم میں چل گئی۔ ایمان وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ رات بھی کتنے ہی عجیب و غریب خوابوں سے گھبرا کر اس کی آنکھ کئی مرتبہ کھلی تھی۔ اس کے بعد اسے نیند ہی نہ آئی۔ اب دکھتا ہوا سراورہتے ہوئے آنسو لیے وہ سوچ رہی تھی کہ مومن کے اسکول سے آنے سے قبل کھانا کیسے بنائے؟

”یہ گانا میرے دماغ میں سرنگ بنا چکا ہے۔“ ایک جھنجھلائی ہوئی آواز تھی۔ ”آخر کیا جاوے اس میں جو تم یوں بے خود ہو جاتی ہو؟“

”یہ گانا اور اس کے بول میرے دل میں سرنگ بنا چکے ہیں اور جو چیز ایک بار دل کو چھو جائے، وہ ہمیشہ یونہی بے خود کرتی ہے۔“ وہ بے نیازی سے بولی تھی۔ ”آپ کو آخر کیا اعتراض ہے اسے سننے میں؟“

”چھان۔“ وہ قریب ہوا تھا۔ ”تیب ہی تم ہی تھے پونی بے خود کر دینی ہو۔ آخر ایک بار دل کو چھو چکی ہو۔“
 ”ایک بار؟“ وہ ابرو تان کر بولی تھی۔ ”کیا مطلب ایک بار؟“

”ہلے ایک بار۔ پھر بار بار۔ بار بار۔“
 اور اس کی ہنسی کی آوازوں سے کمرہ بھر گیا تھا۔

ایقان چونک کر اپنے آپ میں لولی تھی۔ کسی نے کال نل بجائی تھی۔ اس نے دوسرے بارہ بجاتی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا۔

”ماں ہیں شاید۔ اس وقت وہی ہوتی ہیں۔“ اسے خوشی سی ہوئی۔

شفیقہ حیات اس سے تھا تھیں۔ وہ بس بھی کبھار ہی اس کی خیریت پوچھنے یہاں تک چلی آتی تھیں، ورنہ اکثر ایقان ہی ان سے مل آتی تھی۔ ایک ہی گھر میں آجائے کے باوجود وہاں بیٹی میں ایک ناپیدہ سی دوری ہو گئی تھی۔ ایقان تیزی سے دروازے کی سمت بڑھی۔ دروازہ کھول کر وہ کچھ دیر کے لیے پتھر کی سی ہو گئی۔ باہر اختر میاں کھڑے تھے۔



”ماں۔ اماں۔ میں بہت پریشان ہو کر رہ گئی ہوں۔“ صبح سے دلو انوں کی مانند ادھر سے ادھر پھرتی عذرا بیگم بشکل دوسرے تک ہی ضبط کر پائی تھیں۔ کوئی چارہ نہ پا کر بالآخر وہ ساس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔
 ”ہلے سوچا تھا کہ سلجوق سے کہوں لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اگر وہ انہیں غصہ آگیا تو کیا ہوگا۔ گھر میں کوئی بڑا فساد نہ گھڑا جائے۔ میرا دل تو بہت گھبرا رہا ہے۔“

”خدا خیر کرے۔ سو۔ ایسا کیا ہو گیا؟“ شفیقہ حیات بھی گھبرا سی گئی تھیں۔ ”دیکھو مجھے کوئی الٹی سیدھی خبر نہ سنانا۔ میرا دل تو پہلے ہی بہت کمزور ہو چکا ہے۔“ عذرا بیگم خاموش سی ہو کر ساس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ انہیں الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے بھی دقت ہی محسوس ہو رہی تھی۔

”ماں! میں نے صبح رافع سے شادی کی بات کی تھی۔ ثانیہ اور رافع کی شادی چونکہ ایک ساتھ ہی کر دیئے کا ارادہ تھا اس لیے میں نے سوچا کہ رافع کو بھی ذہنی طور پر تیار کر دیا جائے۔“
 وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئیں۔ تو شفیقہ حیات ہر اسال سی ان کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ عذرا بیگم کی خاموشی انہیں شاق کر رہی۔

”اب کچھ آگے بھی کہو۔“ وہ بے صبری سے بولیں۔

”ماں!۔ رافع۔ رافع ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کہتا ہے کہ اتنی جلدی شادی نہیں کرے گا۔“ وہ سر جھکا کر آہستگی سے بولیں۔

”ہاں۔ پھر؟“ نہیں مزید بے تابی ہوئی۔

”پھر کیا؟“ انہوں نے حیرانی سے سر اٹھایا۔ ”یہی بات تو مجھے صبح سے پریشان کر رہی ہے۔ میں نے پانی کا گھونٹ تک نہیں پیا اور آپ کہہ رہی ہیں پھر؟“

”اے لوتہ۔“ شفیقہ حیات کی ساری بے تابی جیسے ہوا ہو گئی۔ ”تم اس بات کو اتنا بڑا مسئلہ بنائے بیٹھی ہو۔ میں تو دُور سے جیسے بے جان ہی ہو گئی تھی کہ جنے کیا ہو گیا۔ حد کر دی ہو تم نے۔“

”حد تو آپ کر رہی ہیں اماں!“ وہ برا مان گئیں۔ ”یعنی یہ پریشان کن بات نہیں ہے؟ رابعہ کتنی ہی بار دوسرے لفظوں میں کہہ چکی ہیں اور میں انہیں یہی کہہ کر تسلی دیتی آئی ہوں کہ ثانیہ کے ساتھ ہی رافع اور وردہ کی شادی بھی کر دیں گے۔ اب میں رابعہ کو کیا جواب دوں گی؟ پھر یہ کہ وردہ آخر کب تک رافع کے نام پر بیٹھی رہے گی؟ ماشاء اللہ باہم میاں کب سے گھر گرہستی کے ہو گئے۔ رافع اور باہم ہم عمر ہی ہیں تقریباً۔ یہ رافع کیوں نکھا چھین رہا ہے۔ اب نہیں کرے گا تو کب کرے گا؟ جب مونچھیں سفید ہو جائیں گی؟ پھر سلجوق سے کیا کہوں؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔“ وہ بالکل مطمئن تھیں۔ ”بچے نے یقیناً کچھ سوچا ہو گا اپنے مستقبل

کے بارے میں۔ بقول تمہارے، تنہا بچہ نہیں ہے، بہت سمجھ والا ہے میرا یہ پوتا۔ اگر چند ایک سال مزید مہلت مانگ رہا ہے تو اس میں زور زبردستی کا کیا کام ہے؟ اور رابعہ ہماری اپنی بیٹی ہے، کوئی غیر تو نہیں۔ اپنوں کا یہی تو فائدہ ہے۔ سولت سے بات سمجھ لیتے ہیں اور سبکچسپی سے میں خود ہی بات کر لوں گی، اس کی تم فکر مت کرو۔“

عذرا بیگم مزید پریشان نظر آنے لگی تھیں۔ جانتی تھیں کہ رافع، شفیقہ حیات کا سب سے لاڈلا پوتا تھا۔ اس کی برائیاں بھی انہیں خوبیاں نظر آتی تھیں لیکن اس موقع پر رافع کی حمایت کرنا انہیں مناسب نہ لگتا تھا۔

”اماں! سب کو چھوڑ کر آپ رافع سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ آخر شادی کر لینے سے اس کے مستقبل کو کون سے خطرات لاحق ہو جائیں گے؟ ہماری اپنی بیٹی ہے ورنہ اس گھر سے اس گھر میں آجائے گی۔ یہ کرتا رہے آگے جو اس نے کرنا ہے۔ وہ اسے منع تو نہیں کرے گی نا اور مجھے تو فکر اس بات کی ہے کہ اسے انکار فی الحال شادی سے ہے یا۔۔۔ یا پھر ورنہ سے شادی سے ہے۔۔۔ آپ سمجھ کیوں نہیں رہی ہیں؟“

شفیقہ حیات کو بسو کی اصل پریشانی اب سمجھ میں آئی تھی۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگیں۔

”میرا خیال ہے رافع اتنا کم عقل نہیں ہے۔ ماشاء اللہ بہت سمجھ بوجھ والا بچہ ہے۔ اسے علم ہے کہ یہ دو گھروں کا ملاپ ہے۔ اس رشتے سے کئی رشتوں کی محبت اور عزت قائم ہے۔ وہ کبھی کوئی انا کام نہیں کرے گا۔ تم اگر فکر مند ہو تو میں رافع سے کھل کر بات کر لیتی ہوں۔“

”جی ہاں، یہی چاہ رہی ہوں میں۔ اسے سمجھائیں اور اس سے کہیں چپ چاپ شادی کر لے۔ ہمارے بھی کچھ ارمان ہیں۔“

وہ ساس کے پاس سے قدرے ہلکی پھلکی ہو کر اٹھی تھیں۔



پودوں کو پانی دیتی رابعہ بیگم ہنسی تھیں۔

”تم واپس بھی آؤ گی؟“

ست روی سے چلتی ہوئی ورنہ یوں رکی تھی جیسے کسی خیال سے چونکی ہو۔

”جی۔۔۔ جی امی۔۔۔“

”میں نے کہا۔ واپس بھی آؤ گی۔ خیر تو ہے، ثانیہ ملی نہیں؟“

”ثانیہ؟ ہاں۔۔۔ وہ۔۔۔ پتہ نہیں۔ شاید وہ نہ رہی تھی۔ اس کے واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی

میں پھر واپس آؤ گی۔“

وہ ثانیہ کے پاس سے انا کڑھائیوں کا کیٹلاگ لینے گئی تھی اور پھر اٹنے قدموں لوٹ آئی تھی۔

”اچھا۔“ رابعہ بیگم مطمئن ہوئیں۔ ”اماں کیا کر رہی تھیں؟ کہہ رہی تھیں کچھ؟“

”جی؟“ وہ پھر چونکی۔ ”ثانیہ امی؟ پتہ نہیں۔ میں اندر نہیں گئی۔ ثانیہ کے کمرے سے ہی لوٹ آئی۔“

”کمال کیا تم نے بھی۔“ وہ خفا سی ہوئیں۔ ”کم از کم انہیں سلام ہی کر لیتیں، طبیعت پوچھ لیتیں ان کی۔ بھابھی

بیگم سے ملیں؟“

”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں بس واپس آؤ گی۔“

”ناعمدہ والا حساب کتاب تمہارا بھی ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ بڑبڑاتی تھیں۔ ورنہ چپ چاپ اندر کی جانب بڑھ گئی

تھی۔



”اسلام علیکم۔“ انہوں نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا تھا۔ ایقان خاموش کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔

”آپ یہاں کیسے؟“ بالآخر کچھ تو کہنا تھا۔

”ہم تو۔۔۔ وہیں کے وہیں ہیں۔“ وہ عجیب سے انداز میں ہنسنے لگی تھیں۔ ”آپ ہی جا کر واپس آئی ہیں ایقان بیگم۔“

ایقان کا جی چاہا وہ دروازہ زور سے بند کر لے مگر موتا "وہ ایسا نہ کر سکی۔ پلٹ کر اندر چلی آئی۔ آخر میاں سے اس نے اندر آنے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن ان کی چاپ سے اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ پیچھے ہی آرہے تھے۔
"میاں سے علیحدگی ہو گئی؟" وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بے تکے سے انداز میں پوچھ رہے تھے۔ ایقان تڑپ کر مڑی۔

"میں کام سے کام رکھیے۔ آخر میاں۔۔۔ فضول سوال جواب سے پرہیز کریں۔"
"اپنا کام۔" وہ پھر نہ بے۔ "ہم نے تو کبھی آپ کو غیر نہیں سمجھا ایقان بیگم۔ آپ تو ہماری اپنی ہی ہیں۔ اپنا سمجھ کر ہی پوچھ رہے ہیں۔ آپ کو فضول لگتا ہے تو چلیں، نہیں پوچھتے۔"
اندر سے ایمان ایک مردانہ آواز سن کر بھرا ہوا تھا۔ اب وہ گھر کے دروازے پر کھڑی ایک ننگی آخر میاں کو دیکھ رہی تھی۔
"اے۔۔۔ ننھی گڑیا۔۔۔ آویساں ہمارے پاس آؤ۔" انہوں نے اسے چمکارا۔ ایمان دوڑ کر ایقان سے پلٹ گئی تھی۔

"ممما۔۔۔ ممما۔۔۔ یہ کون ہیں؟" وہ حیرت زدہ بھی تھی اور قدرے خوفزدہ بھی۔
"ہم انکل ہیں گڑیا۔۔۔ تو ہمارے پاس۔" وہ مسلسل ہاتھ کے اشارے سے اسے بلارہے تھے۔
"جاؤ بیٹا! ماموں ہیں آپ کے۔" ایقان قدرے طنز سے بولی۔ "ماموں سے ملو۔"
آخر میاں کھسپانے ہو کر عجیب سے انداز میں کھی کھی کرنے لگی۔ ایمان اب تک ان کے قریب نہ گئی تھی۔
"بھابھی بیگم کو سلام کہیں گے۔" ایقان نے انہیں دھرتا پر پیرا کر کہا۔
"چھا۔" انہوں نے نالغ داری سے سر ہلایا۔ "میں بھی جائیں گے تو ضرور کہہ دیں گے اور کوئی کام ہو تو ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔ اب ہم یہیں رہیں گے باجی کے پاس۔ اب ہم یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔"
"آپ کے لیے تو اتنا کام ہی کافی ہے آخر میاں! یہ بھی اگر آپ سہولت سے کر سکیں تو۔" وہ جل کر بولی تھی۔
آخر میاں کے چہرے پر گہرے دکھ کے آثار نمودار ہوئے۔ انہوں نے ایک آہ سی بھری۔
"آپ نے ہی کسی قابل سمجھا ہوتا ایقان بیگم تو ہم تو دنیا فتح کر لیتے یہ بے کار بے مصرف زندگی آپ کی مہرانی

تو ہے۔"
اب آپ جائیں آخر میاں! ایقان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ "مجھے ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ میں اس کی ان عجیب و غریب باتوں کو قابل جواب نہیں سمجھتی ورنہ کہنے کو تو بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔"
"چھا۔" ہم جائیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے پیاسی نظروں سے دیکھا۔ ایقان کو لہجہ بھر کے لیے بے حد خوف سا محسوس ہوا۔ آخر میاں کا ڈیل ڈیل کسی بھی نازک اندام عورت کو خوف میں مبتلا کر سکتا تھا۔
"راض۔" وہ ایک دم ہی بولی تھی۔ "راض آنے والا ہے۔ اسے آپ کی یہاں موجودگی اچھی نہیں لگے گی۔"
"چھا۔" وہ قدرے مایوسی سے بولے۔ "پتہ نہیں ہم اتنے بڑے کیوں ہیں۔ کسی کو ہماری کہیں بھی موجودگی اچھی نہیں لگتی۔ آپ غصہ نہ کریں ایقان بیگم! ہم تو یونہی آپ کو ایک نظر دیکھنے چلے آئے تھے۔ اب ہم چلتے ہیں۔"

"جی ہاں۔۔۔ ضرور۔" اس کی جان میں جان آئی۔
آخر میاں دروازے کی جانب بڑھے۔ ایقان دروازہ بند کرنے کے خیال سے ان کے پیچھے ہی لپکی۔ یکایک وہ رک کر بیٹے تھے۔ ایقان کے لبوں سے جھجکتے نکلتے رہ گئی تھی۔
"مگر آپ برا نہ مائیں تو۔۔۔ ہم کبھی کبھی آجایا کریں۔" وہ پوچھ رہے تھے۔
"کیوں؟" وہ بھٹائی۔
"یونہی۔ آپ کو دیکھنے۔"

”خدا حافظ۔ بھابھی کو سلام کہیں گے۔“ وہ قدرے بے رخی سے بولی۔
 ”اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔“ وہ مایوس سے ہو کر باہر نکلے تھے۔

”امی۔ آپ کے لیے جائے بنا دوں۔؟“ ربیعہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔
 پھر ریکارڈ وہ رکی۔ بیڈ پر بیٹھی منیہ بیگم کے چہرے پر درد کے آثار نمایاں تھے۔ ربیعہ تیزی سے ان کے قریب پہنچی۔

”امی۔ امی۔ کیا ہوا ہے؟“
 ”جانتا نہیں ربیعہ۔۔۔ پیٹ میں ایک گولہ سا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔“ انہوں نے تکلیف سے بڑھال ہوتے ہوئے کہا۔

”پھر وہی درد اٹھا ہے نا آپ کو۔“ ربیعہ نے ان کے رُف ہوتے ہوئے ہاتھ تھامے۔
 ”ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔ لیکن اتنا زیادہ نہیں ہے۔ تم پریشان مت ہو۔“ انہوں نے اس کا دھواں دھواں ہوتا ہوا چہرہ دیکھا۔

”کوئی میڈیسن دوں آپ کو؟“ ربیعہ کو اچانک خیال آیا۔ ”اس دن شہلا آپنی نے جو ٹیبلٹ دی تھی آپ کو۔ وہ ہے میرے پاس۔“
 ”ٹیبلٹ سے نہیں، اس انجکشن سے آرام آیا تھا لیکن تم ابھی ٹیبلٹ ہی دے دو۔ میں کھا لیتی ہوں۔ شاید اسی سے آرام آجائے۔“

ان کا چہرہ مزید پیلا پڑ رہا تھا۔ ربیعہ ڈر سی گئی۔
 ”امی۔ میں شہلا آپنی کو فون کر دیتی ہوں وہاں بھی گھر پر ہی ہوں گی۔“
 ”نہیں ربیعہ۔۔۔“ انہوں نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”اس کی ساس اس کا یہاں روز روز آپنا پسند نہیں کرتی۔ وہ میرا سن کر دوڑی چلی آئے گی۔ خواہ مخواہ کوئی ناچانی نہ ہو۔“
 ”لیکن امی! آپ کی طبیعت۔۔۔“

”انیقہ آئی ہی ہوگی۔“ انہوں نے خود کو نارمل ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی۔ ”تم تب تک وہ گولی دے دو مجھے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ربیعہ ناچار وہاں سے اٹھ کر لاؤنچ میں آئی تھی۔
 منیہ سن بکس سے گولی لا کر اس نے انہیں کھلائی پھر ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ کچھ دیر میں انہیں قدرے آرام آگیا تھا۔

”ربیعہ۔۔۔“ انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔
 ”جی امی!“ وہ ان کا ہاتھ ہولے ہولے دبا رہی تھی۔
 ”بہت اچھی بیٹی ہو تم۔ خدا کا احسان ہے مجھ پر جو اس نے تمہیں یہاں میرے پاس بھیج دیا۔“
 ”میں بھی اللہ کا شکر ادا کرتے نہیں چھٹی امی جی۔ اس نے مجھے ماں بھائی، بہنیں۔۔۔ سب ہی کچھ دے دیا ہے۔“

منیہ بیگم کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئی تھیں۔
 ”تمہارا بھائی۔۔۔ کبھی تمہیں فون بھی نہیں کیا اس نے۔۔۔ کون سے ملک گیا ہے وہ؟“
 انہوں نے اچانک ہی پوچھا تھا۔ ربیعہ کو تھوڑی دیر کے لیے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہے۔
 ”وہ۔۔۔ امی جی۔۔۔“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی تب ہی فون کی بیل بجنے لگی۔ منیہ بیگم چونک اٹھیں۔
 ”دیکھو تو کس کا فون ہے۔۔۔ اور سنو۔۔۔ عبادیا انیقہ کا ہو تو میرے درد کے متعلق کچھ مت کہنا۔ وہ اپنے کام وام

چھوڑ کر چلے آئیں گے میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“
”جی اچھا۔“ ربیعہ ناچار اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے فون اٹھایا۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب ورنہ تھی۔ ”ربیعہ! کیسی ہو تم؟“

”ارے ورنہ تم۔“ وہ خوش ہو گئی۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں، تم سناؤ۔ پھر جکر ہی نہیں لگایا تم نے۔“

”میں نے تم سے کہا تھا۔۔۔ اب تمہاری باری ہے۔“ وہ بولی۔

”اچھا۔۔۔ چلوں ضرور آؤں گی۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ ”یوں بھی میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔“

”ربیعہ! تم نے اس دن یونیورسٹی میں رافغ سے بکس کا کہا تھا نا۔؟“

”ہاں رافغ دے گئے تھے مجھے، میرے پاس ہی ہیں۔ تمہیں چاہئیں؟ ویسے نوٹس میں بتا رہی ہوں۔ تم مجھ سے لے لینا۔“

”ہوں۔“ ورنہ جیسے چوکی تھی۔ ”ہاں ٹھیک ہے۔ میں پھر دوسری بکس ایڈیٹو کروالوں گی۔ اچھا خدا حافظ۔“
اس نے اچانک ہی فون بند کر دیا تھا۔ ربیعہ کو بے حد حیرانی ہوئی۔ اس نے ریسیور کو حیرانی سے دیکھا اور کریڈل پر رکھ دیا۔

”چوہے لے پر کچھ چڑھایا ہوا ہو گا میڈم نے۔ وہی یاد آگیا ہو گا۔“ اس نے مسکرا کر سوچا۔

ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ گیلیری میں کھڑی شہلا کو سردی سی محسوس ہوئی لیکن وہ پھر بھی کھڑی رہی۔ باریک پنک ناخن خنکی کا بڑھتا ہوا احساس دبانے میں ناکام ہو رہی تھی لیکن شہلا کو وہاں کھڑے ہو کر بے حد سکون محسوس ہو رہا تھا۔

رات کے دوسرے پہر کی گرمی خاموشی، ٹھنڈی ہوا اور ہر طرف پھیلا ہوا اندھیرا، تاروں سے اپنے مسائل ڈسکس کرنا سے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ ہر چند کہ صبح اسے جلدی ہاسپٹل پہنچنا تھا پھر بھی وہ سونا نہ چاہتی تھی۔
اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلنے کی تھوڑی سی آواز ہوئی اور ہاشم نے باہر جھانکا۔
”شہلا۔۔۔“ اسے شہلا کا ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔

”جی۔۔۔“ اس نے چند لمحوں بعد مڑے بغیر کہا۔

”تم یہاں اکلی کیا کر رہی ہو۔؟“ وہ بھی باہر ہی چلا آیا۔ ”تیری رات گئے!“

”بس۔۔۔ یو سی۔۔۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ ”نیند نہیں آ رہی تھی تو میں۔۔۔ کچھ دیر کے لیے یہاں

آئی۔۔۔ تازہ ہوا۔۔۔ اچھی لگ رہی ہے۔“

ہاشم اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شہلا کے مخصوص پرفیوم کی مدھم سی منک اس نے سانس کھینچ کر اپنے اندر اتاری پھر اس نے آہستگی سے اسے خود سے قریب کیا تھا۔

”نیند نہیں آئی تو کسی کے ساتھ مل کر بھی جاگ سکتے ہیں۔ تم ہمیشہ اکیلے ہی جاگنے پر اصرار کرتی ہو۔“

اس کی آواز میں محبت، نرمی اور پیار بھر ابلوا تھا۔ شہلا کے لیے یہ بے حد مانوس انداز تھا۔ اس نے ہاشم کو ہمیشہ

انتہائی نرم اور محبت سے بھر اہلایا تھا۔

لیکن بچانے کیوں اس وقت دل تھامی مانگ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے ہاشم کا ہاتھ ہٹایا۔

”ہاشم۔۔۔ میں۔۔۔ میں کچھ دیر تمہارا رونا چاہتی ہوں۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے امید ہے آپ سناؤ نہیں کریں گے۔“

ہاشم کچھ دیر خاموش رہا۔

”اوکے۔“ پھر وہ بولا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ مڑ کر اندر چلا گیا۔ شہلا کا دل عجب خجالت میں مبتلا ہوا۔ شاید اس نے ہاشم کے ساتھ زیادتی کی

تھی۔ وہ وہیں کھڑی چند لمحے پیش روانی صورت حال پر غور کرتی رہی پھر اسے احساس ہوا کہ اس نے واقعی ہاشم کے نرم جذلوں کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا۔ گلٹ کا احساس بڑھا تو وہ مرکزِ انڈر پلی آئی۔
ایکایک ہی درہ رک گئی تھی۔ ہاشم بیڈ کی اس سائیڈ پر بیٹھا ہوا تھا، جہاں شہلا سوئی تھی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی ہوئی تھی۔

شہلا کو اندر آنا دیکھ کر اس نے دراز بند کر دی۔ شہلا آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے قریب جا بیٹھی۔

”ہاشم۔“ وہ آہستگی سے بولی تھی۔

”ہوں۔“ اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

سائیڈ لمپ کی دودھیا روشنی میں ہاشم کی بے ریا، شفاف نگاہوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ شہلا کا دل مزید دکھ گیا۔
اس نے ہاشم کے کاندھے پر سر رکھ دیا۔

”ہاشم۔“ آئی ایم ویری سوری۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں۔۔۔ میں آپ کو دکھ دینا نہیں چاہتی۔۔۔ لیکن ہر مرتبہ۔۔۔
زیادتی کر جاتی ہوں۔“

ہاشم اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”شہلا۔۔۔“ وہ عجیب انداز میں بولا تھا۔

”جی۔۔۔“

”یہ کیا ہے؟“

اس نے اپنی بند مٹھی کھول کر اس کے سامنے پھیلائی۔ شہلا کا دل لمحہ بھر کے لیے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ گولیاں۔۔۔ یہ تم کھاتی ہو؟“

شہلا خاموشی سے شیشی دیکھ رہی تھی۔ سناٹے میں گولیاں وہ اوپری دراز میں ہی رکھتی تھی۔

اس کی جھکی ہوئی نظریں پھر اٹھ نہ پائی تھیں پھر بھی اس نے ہاشم کی نگاہوں سے برستی شکایت اور بے اعتباری کو محسوس کر لیا تھا۔

”شہلا! کانی دیر خاموش رہ کر وہ بالآخر بولا۔ ”تم۔۔۔ تم اگر۔۔۔“

شہلا نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ ہاشم کیس اور دیکھ رہا تھا۔

”فکر مت کرو شہلا! وہ ایک بار پھر بولا۔ ”آئندہ۔۔۔ آئندہ تمہیں یہ گولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”ہاشم! نہ جانے کیوں اس کا دل جیسے رکھتا تھا۔

ہاشم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے روئیں روئیں میں ایک اضطراب کی کیفیت پنہاں تھی۔

”ہاشم۔“ شہلا نے بے تاب ہو کر اسے پکارا۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

”ہاشم۔ میری بات سنیں۔ فار گاؤسک۔“ شہلا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ہاشم رکنا نہیں تھا وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا۔ شہلا مضطرب سی ہو کر دروازے تک گئی پھر وہیں ٹھہر گئی۔ ہاشم اس وقت غم و غصے کی جس کیفیت میں تھا اسے نہ چھیڑنا ہی بہتر تھا۔ وہ اس وقت اس کی بات نہ دھتک سے سن سکتا تھا نہ سمجھ سکتا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر کے بے بس سی ہو کر بیڈ پر

گرنے والے انداز میں بیٹھ گئی۔ اپنا چکراتا ہوا سر اس نے دیوڑیوں اٹھوں سے تمام لیا۔ تقدیر کے رُزور شور مچاتے دریا کی لہروں پر وہ خود کو بے آسرا تنکے کی مانند محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر تک انتظار بے کی بے چینی بے بسی اور

اضطراب کا مقابلہ کرنے کے بعد اس نے خود کو ٹوٹا ہوا محسوس کیا تو سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر نیند کی گولیل کی پیشی نکالی۔ دو گولیاں پانی کے ساتھ نگل کر اس نے دراز واپس بند کر لی چاہی۔ تب ہی اس کی نگاہ سامنے

کارپٹ پر گرمی اس شیشی پر پڑی جو ہاشم وہاں بھیجنا کر گیا تھا۔
 ”فکر مت کرو شہلا! آئندہ ہمیں یہ کولیاں کھانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“
 اس کے الفاظ ایک مرتبہ پھر اس کے کانوں میں گونجے۔ شہلا نے جھک کر شیشی اٹھائی۔ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، پھر اس نے وہ شیشی ڈسٹ بن میں ڈال دی۔

وائٹ ٹریک سوٹ میں ملبوس، تھمتا تاچہ لیے وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ پاس سے گزرتے ہوئے ملازم کو ریکٹ تھما کر اور بج چوس لانے کا کہتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔
 نہادو گھر جس وقت وہ واش روم سے برآمد ہوا، بیڈ پر بے نیازی سے بیٹھی ہوئی فریجہ کو دیکھ کر مسکرا دیا۔
 ”آپ کا اور بج چوس۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل کی جانب اشارہ کیا۔
 ”بڑی تکلیف کی آپ نے۔“ اس نے شرارتاً اس کے کاندھوں پر تویہ ڈال دیا۔
 ”چھوٹی موٹی تکلیف تو آپ دیتے نہیں ہیں نا۔“ اس نے بھائی کو گھورتے ہوئے اٹھ کر تویہ جگہ پر ڈالا۔
 ”ڈسٹ رائٹ۔“ وہ بیڈ کے کمرے سے جوس پینے لگا۔ ”آدمی کو کام بڑا ہی کرنا چاہیے۔“
 ”چھ۔“ تویہ فرمایا۔ ”کہ ایک بے حد بڑا اور اہم کام کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟ امی چاہتی ہیں کہ وہ جلد از جلد آپ کے فریضے سے سبکدوش ہوں تاکہ۔“
 اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور مسکرائی۔

”آں۔“ گہری سوچ میں ڈوبا فراز چونکا۔ ”تاکہ کیا؟“
 ”تاکہ میری باری آئے۔“ اس نے بیسی دکھائی۔
 ”شرم کرو لڑکی!“ فراز نے مسکراہٹ روک کر اسے گھورا۔ ”بڑے بھائی کے سامنے ایسی باتیں۔ اور پھر مسکرا بھی رہی ہو؟“
 ”بھئی، بڑے بھائی جب فنتیں کر کے پسند کی لڑکی دکھائے، اس سے زیادہ فنتیں سمجھتیں کر کے منگنی رچائے۔“
 ”مگتیز کو فون پر بلوانے کے لیے آؤں کریم اور سوپ کی پیش کش کرے، تب کچھ نہیں اور میں نے صرف امی کا پیغام صراحت سے پہنچا دیا تو بے شرمی کا لیل فٹ فٹ کر دیا۔“ وہ بے پروائی سے بالوں میں انگلیاں چلانے لگی۔
 ”ویسے اصل بات آپ گول کر گئے۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شادی کے لیے کون سا مہینہ اور تاریخ رچ رکھی جائے؟“
 اس نے سوچ میں گم ہوتے ہوئے بھائی کا چہرہ عور سے دیکھا۔
 ”ہوں؟“ وہ پھر چونکا۔ ”تم۔۔۔ ننھی فاختہ۔ زیادہ فکر مت کرو۔ اس موضوع پر میں امی سے خود بات کر لوں گا۔“

”کیا بات کریں گے؟“ وہ الجھی۔ ”اتنے سنجیدہ کیوں ہو رہے ہیں؟“
 ”آپ تم جاؤ۔“ وہ ریموٹ سے ٹی وی آن کرتے ہوئے بولا۔
 ”سوچ لیں۔ اب میں فون پر ناعمہ کو نہیں بلوانے والی۔“ وہ تب کر کھڑی ہوئی۔
 ”ڈونٹ وری۔ اب ایسی کوئی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ وہ مطمئن تھا۔
 ”ہائیں، آپ کو ہوا کیا ہے؟“
 ”بخار۔ اور مجھے آرام کی سخت ضرورت ہے اور تنہائی کی بھی۔“ ٹاؤ۔۔۔ پلینز۔ لیوی الون۔ ”اس کے پرسکون“
 ٹھنڈے لہجے میں کچھ پوشیدہ تھا۔ فریجہ کا ماتھا ٹھکا۔
 ”اچھا۔۔۔ پھر امی سے بات کر لیں۔ میں چلی۔“
 ”تھینکس۔“ وہ بدرمایا۔

چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیے وہ کسی سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ وردہ کمرے میں داخل ہوئی پھر چند لمحوں

کے لیے تھم ہی گئی۔

اس طرح بیٹھی ہوئی ناعمہ بہت معصوم اور سادہ سی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر سوچ کا تاثر تھا اور آنکھوں میں قدرے اداسی۔ ورہہ کچھ سوچ کر اس کے قریب آئی تھی۔ ناعمہ کے استغراق میں فرق نہ آیا۔ ورہہ مسکرائی اور کھنکھاری۔ تب وہ چوکی۔

”ارے آپ۔ دھل گئے آپ کے کپڑے؟“ وہ شرمندہ سی ہوئی۔

”صرف میرے نہیں آپ جناب کے کپڑے بھی دھل گئے ہیں۔“ ورہہ نے طنزاً کہا۔

”جب آپ کی شادی ہو جائے گی تب تو مجھے ہی دھونا پڑیں گے کپڑے۔“ اس نے منہ بنایا۔

”جیسے آپ سے پہلے رائنہ آپلی کی ڈیوٹی تھی۔“

”ہائے۔“ ورہہ نے فراغت سے میٹھے ہوئے ہنڈلوشن اٹھایا اور ہاتھوں پر ملنے لگی۔ ”وہ بے محترمہ۔ ناعمہ علی خان۔ آپ کو نوید ہو کہ مجھ سے پہلے امی آپ کو سسرال بھیجے کی فکر میں ہیں۔ سنا ہے پچھلے دنوں آپ کی ساس صاحبہ کا فون آیا تھا وہ اس سلسلے میں امی کا عندیہ لینا چاہ رہی تھیں۔“

ناعمہ جیسے کوئی غم گرا تھا۔ وہ پریشان نظروں سے ورہہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپلی۔“

”آخر اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔“ ورہہ سے رہانہ گیا۔ ”ناعمہ! تم کئی دنوں سے بہت ڈسٹرب ہو۔ کیا بات ہے مجھے بتاؤ۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ کوئی مشورہ ہی دے سکوں۔“

ناعمہ نے جن نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا اس سے ورہہ کو صرف اندازہ ہی نہیں پورا یقین ہو گیا کہ واقعی کوئی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے وہ پریشان تھی۔

”آپلی۔“ چند لمحوں بعد وہ سست لہجے اور مدھم سی آواز میں بولی۔ ”میں یہ بات صرف خود تک محدود رکھنا چاہتی تھی لیکن شاید ایسا ممکن نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی بازگشت بہت آگے تک جائے اور اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔“

”خدا خیر کرے۔“ ورہہ گھبرا گئی۔ ”بولو ناعمہ! ایسی کیا بات ہے آخر؟“ ناعمہ نے نظروں میں مسئلے کی پیچیدگی بھر کر اسے دیکھا۔

”آپلی۔“ فراز نے مجھ سے ایک غلط فہمی کی بنا پر متکلی کی ہے۔“

”کیسی۔ کیسی غلط فہمی؟“ ورہہ کا سانس رک گئے لگا۔

”وہ سمجھتا ہے کہ میں وہ لڑکی ہوں جو فون پر کچھ عرصہ اس سے باتیں کرتی رہی ہے جس نے اس سے شاید کچھ عہد و پیمان بھی پابندھے ہیں اور پھر جب فراز اس معاملے میں سنجیدہ ہوا تو۔۔۔ تو وہ لڑکی پیچھے ہٹ گئی۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن وہ لڑکی ہے کون؟“ ورہہ کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

”عریشہ۔“ ”کیا۔۔۔؟“ ورہہ کا منہ بھی کھل گیا۔ ”عریشہ؟ عریشہ؟ یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو ناعمہ؟“

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں آپلی! فراز کا جھلک رویہ مجھے شروع دن سے پریشان کر رہا ہے۔ اس کی مبہم باتوں سے میں کچھ بھی اخذ نہیں کر پاتی تھی لیکن بالآخر مجھے سب کچھ سمجھ میں آنے لگا۔ سب کچھ اور میں پختہ یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ فراز کے ساتھ فون پر باتیں کرنے والی لڑکی عریشہ ہی ہے۔ فراز سمجھتا ہے کہ عریشہ نے اس کے ساتھ فلرٹ کیا تھا۔ وقتی کھیل۔۔۔ دل لگی۔ اور۔۔۔ چونکہ وہ مجھے ہی وہ لڑکی سمجھتا ہے اس لیے اب وہ مجھے سزا دینا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ متکلی اس نے مجھے سزا دینے کے لیے کی ہے۔“

”اوہ گاڈ! ورہہ کو چکر سا آگیا۔“ یہ۔۔۔ یہ سب کیا ہے ناعمہ؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”یقین تو مجھے بھی نہیں آتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ فراز نے میرا ہی گمان کیوں کیا؟ اسے کیوں یقین ہے کہ وہ

لڑکی میں ہوں؟ کیا عریشہ نے اس سے کوئی غلط بیانی کی تھی؟“

”تم۔۔۔ تم عریشہ سے پوچھو۔“ ورہہ بہت ہی گھبرا گئی تھی۔

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ ناعمہ آزدگی سے بولی۔ ”عریشہ سے کوئی بھی استفسار بولی بہت بڑا ہنگامہ کھڑا کر دے گا۔ آپ نے شاید اس کی ذہنی کیفیت پر غور نہیں کیا۔۔۔ فراز سے علیحدہ ہو جانے کا فیصلہ اس نے غالباً ”نافع سے متعلق کے بعد کیا تھا اور تب سے وہ ایک پتھر کے بت جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ میں اس سے کیا پوچھوں اور کیونکر پوچھوں؟“

”ناعمہ۔ ناعمہ۔ یہ تو بہت پیچیدہ مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔“ وردہ سرگوشی میں بولی۔

وہ جیسے جیسے صورت حال پر غور کرتی جا رہی تھی، ناعمہ کی طرح اس پر بھی غائب دماغی کی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔ ”اگر عریشہ کی بات متعلق سے نکاح تک نہ پہنچی ہوتی آپ! تو ابھی بھی بہت کچھ ہو سکتا تھا لیکن اب۔۔۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو ناعمہ! اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ عریشہ نے یہ بات خود تک محدود رکھ کر بہت نقصان اٹھایا ہے۔ اگر وہ متعلق کے وقت اسٹینڈ لے لیتی تب معاملہ مختلف ہو سکتا تھا۔“

”ماموں اور ممانی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا آپ! ناعمہ نے سر دہا بہری۔

”والدین بھی کبھی بکھار کیسے کیسے غلط فیصلے کر جاتے ہیں۔“ اگلی آہوردہ نے بھری تھی پھر وہ چونک اٹھی۔

”لیکن۔۔۔ لیکن ناعمہ۔۔۔ تمہیں فراز کی غلط فہمی ضرور دور کر دینی چاہیے۔ کہیں وہ سزا کے چکر میں پڑ کر کچھ ایسا ویسا نہ کر بیٹھے۔ اسے بتا دو کہ تمہوہ لڑکی نہیں ہو۔“

ناعمہ کچھ دیر خاموش رہی تھی۔

”میں نے اس پیلو پر بھی سوچا ہے آپ! پھر وہ بولی۔ ”اگر میں اس سے یہ کہتی ہوں تب وہ یہ جانے پر اصرار کرے گا کہ پھر وہ لڑکی کون ہے؟“

”ہاں تو بتا دو اسے۔“ ناعمہ نے وردہ کو غور سے دیکھا اور جیسے سے مسکرا دی۔

”کمال ہے۔۔۔ اتنا عرصہ آپ سب لوگ مجھے بدھو، کم عقل اور نجائے کیا کچھ کہتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اب جی بھلی عقل مند ہوں آپ! عریشہ نافع کی بیوی ہے، اس کی عزت اس کے حوالے سے ہمارے پورے خاندان کی عزت! نافع عباد اور فراز کا دوست ہے۔ میں نے فراز کو یہ بات بتادی تو اس کی نگاہ میں نافع کی بیوی کی کیا حیثیت ہوگی؟ سمجھ سکتی ہیں آپ؟“

”وہ! وردہ کی سمجھ میں یک فخت سب کچھ آگیا تھا۔ ”پھر۔۔۔ پھر ناعمہ؟“

”پھر یہ کہ میں فراز سے اقرار کر چکی ہوں کہ ہاں۔۔۔ میں ہی وہ لڑکی ہوں جس نے کچھ عرصہ اس سے دل لگی کی۔“

”ناعمہ! وردہ دھک سے رہ گئی۔ ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ سزا؟“

”اسی کی منتظر ہوں میں۔“ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔

”وہ۔۔۔ ناعمہ۔۔۔ ناعمہ۔۔۔ وردہ نے فرط جذبات سے مغلوب ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔

”آپ!۔۔۔“ ناعمہ کچھ دیر بعد بولی۔ ”نافع میرا صرف کزن ہے لیکن رافع بھائی کے حوالے سے آپ سے اس کا رشتہ مختلف اور احترام پر مبنی ہے۔ آپ۔۔۔ آپ اسے کسی طرح سمجھائیں کہ وہ عریشہ سے متنفر نہ ہو۔ اسے زندگی کی طرف لوٹنے پر مجبور کرے محبت کے جذبے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔“

”تم تو واقعی بہت عقل مند ہو۔“ وردہ نے اس کی ٹھوڑی چھوئی۔ ”تمہارے سامنے یہ خاکسار زانوئے ادب نہ کرتی ہے۔“

دونوں بنیں کچھ شوخی، کچھ اداسی سے مسکرا دی تھیں۔

”کیا بات ہے؟“ ربیعہ نے پیار سے عمر کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے پوچھا۔ ”آج تم نے نہ نوڈلز کی

فرائش کی، نہ نمکس کی۔ لان میں سائیکل بھی نہیں چلائی۔ یوں منہ لگا کر یوں بیٹھے ہو۔
 عمر نے ربیعہ کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گہرائی اور اداسی تھی۔ ربیعہ چونک اٹھی۔
 ”کیا بات ہے عمر؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“
 ”ٹھیک ہے خالہ جانی۔“ وہ نیم دلی سے بولا۔
 ”اداس ہو؟“

”ہاں، ہوں تو۔“ وہ کچھ سوچ کر بولا۔

”ممایا د آرہی ہیں؟“ ربیعہ نے آہستگی سے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں یکایک ہی آنسو ابھرے، وہ انہیں پینے کی کوشش کرنے لگا۔ ربیعہ کو اس چھوٹے سے معصوم بچے پر بے حد پیار آیا۔ اس نے اسے سینے سے لگا لیا۔
 ”عمر۔“

”خالہ جانی! مجھے ممایا د نہیں آرہیں۔“ وہ اس سے علیحدہ ہوا۔ ”میں اب مما کو بالکل یاد نہیں کرتا۔ مما مجھے چھوڑ کر ہاشم انکل کے گھر چلی گئیں۔ اب وہ مجھ سے روز ملتے بھی نہیں آتیں۔ حالانکہ انہوں نے مجھ سے پراس کہا تھا۔“ ربیعہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

”میں تو اب صرف پیہا کو یاد کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا وہ مجھے لینے آئیں گے۔ ابھی تو وہ اپنے ضروری کاموں سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ میں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔“
 ”آپ کو ہم لوگ اچھے نہیں لگتے عمر؟ میں، آپ کی نانوس۔ انیقہ خالہ۔ عباد ماموں۔ ہم سب کتنا چاہتے ہیں آپ کو۔“

وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں۔“ اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ ”میں بھی آپ سب سے بہت پیار کرتا ہوں اور۔ اور مما سے بھی۔“
 اس کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی تھی۔

”پھر۔ آپ ہم سب کو چھوڑ کر جانے کی بات کیوں کرتے ہو؟“
 ”اس لیے خالہ جانی کہ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔ یہ گھر ناٹوکا ہے۔ میرا گھر وہ ہے جو میرے پیہا کا ہے۔“

ربیعہ نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”انتی سی عمر میں انتی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے بڑے ہو کر تم ضرور سائنس دان بنو گے یا کوئی بڑے فلسفی۔“ وہ لہجہ بدل کر بات بھی بدلنے لگی۔

عمر پر اس کی بات کا کوئی خاطر خواہ اثر نہ ہوا تھا، وہ پھر سے کچھ سوچنے لگا۔

”اچھا۔ ایسا کرتے ہیں۔ سامنے پارک میں چلتے ہیں۔ میں تو بہت دنوں سے نہیں گئی اور میرا خیال ہے تم بھی گھر میں بور ہو رہے ہو؟“ عمر نے ایک نظر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں، میں تو بور نہیں ہو رہا۔ دیے اگر آپ کو اسی کتے سے ڈر لگ رہا ہے تو میں آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔“

ربیعہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو روکا تھا۔ کتنا گویا باہر اسی کے انتظار میں ٹھہرا ہوا تھا۔

”ہاں جی عمر۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”مجھے واقعی اکیلے جاتے ہوئے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ تم پلیز میرے ساتھ چلو۔“

”چلیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں اپنا بیٹ لے آؤں۔ وہاں میرے دوست کرکٹ کھیل رہے ہوں گے۔ میں بھی تھوڑا سا کھیل لوں گا۔“

”تھوڑا سا کیوں اتنا سارا اٹھایا۔“ ربیعہ نے مسکرا کر دونوں ہاتھ پھیلائے تھے۔

پارک میں واقعی عمر کے کئی ہم عمر بچے کھیل رہے تھے انہیں دیکھتے ہی اس کے انداز ہی بدل گئے۔ وہ ایک چھوٹے سے بچے کی ساری خوشی اپنے چہرے اور مسکراہٹ سے چھلکا ناان کی طرف لپک گیا تھا۔ ربیعہ مسکراتے ہوئے ایک بچہ پر جا بیٹھی۔

”ہیلو۔“ دوستانہ انداز میں کہا گیا تھا۔ ربیعہ بے طرح چوٹی۔

”ارے آپ۔“ رافع کو دیکھ کر اس کے اندر کون سا جذبہ ابھرا تھا، وہ سمجھ نہ پائی یا شاید اس نے جان بوجھ کر اس جذبے سے نظر سچائی تھیں۔

”کئی دن کے بعد دیکھا۔ اک شخص۔“ وہ منہ ہی منہ میں گنگنایا۔

ربیعہ سمجھ کر بھی نا سمجھی سے مسکرائی۔ رافع بچ کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔

”آپ تو بہت ڈر پوک نگلیں ربیعہ۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔ ”آنا ہی ترک کر دیا اس حادثے کے بعد۔“

”جی۔“ اس نے سر جھکا دیا۔ ”سمجھ دار لوگ حادثات سے بچ کر چلتے ہیں۔“

رافع چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے جیسے ذو معنی بات کے اصل معنی پر غور کیا تھا۔

”آپ کا خیال خیال ہے ربیعہ! پھر وہ بولا۔ ”جو لوگ حادثات کا شکار ہو جاتے ہیں وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا مطلب ہے جان بوجھ کر غلطی نہ کی جائے تو عقل مندی ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”بے سوچے سمجھے دل غلطی کر بیٹھے پھر؟“

”جی؟“ اس نے حیران ہو کر اس کی جانب دیکھا۔

”آپ۔۔۔ دل کی غلطیوں پر یقین رکھتی ہیں ربیعہ؟“ رافع اسے اتنی گہری اور بھرپور نظر سے دیکھ رہا تھا کہ ربیعہ

چند لمبے تھمی ان آنکھوں میں نہ دیکھ سکی۔ اس کی پلکیں بے اختیار اس کے رخساروں پر آگری تھیں۔

”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ رافع اس چہرے کی دلکشی کے سحر میں گرفتار ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

”کیا۔ کیا جواب دوں؟“ اسے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی تھی۔

”ایک غلطی کی ہے دل نے۔۔۔ جانتا چاہتا ہوں کہ واجبِ تحریر ہوں یا بے اختیار قرار دے کر معاف کر دیا جاؤں

گا۔ کہہ دیجئے۔ جو بھی آپ کہنا چاہیں۔“

ربیعہ دور کھیلے عمر کو دیکھنے لگی تھی۔

”جزایا سزا کا اختیار مجھے نہیں ہے رافع! غور کیجئے، جرم اگر ثابت ہو جائے تو کس کے گناہ گار ٹھہریں گے

آپ۔“ پھر وہ گہرے تہجے میں بولی۔

رافع بہت دیر تک کچھ کہنے کے قابل نہ رہا تھا۔

”دل۔۔۔ اپنی پسند کا ٹھہرا چاہے تو؟“ پھر وہ قدرے آزر دگی سے بولا۔

”کبہرے اور مصنفِ دل کی پسند کے تابع تو نہیں ہوتے نا۔“ وہ مسکرائی۔

رافع کو اس کی مسکراہٹ ڈوبتے سورج کی آخری کرن کی مانند لگی تھی۔

عمر نے رافع کو دہاں بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ وہ بیٹ گھمانا، دوڑنا چلا آیا۔

”آہا۔ رافع! انکل۔ السلام علیکم۔“

”و علیکم السلام۔“ جھجھکے۔ رافع نے اسے چوما۔

”اب آپ خالہ جانی سے شادی مت کر لیجئے گا۔“ اس نے منہ بنایا۔

ربیعہ اس کی بات پر دھک سے رہ گئی تھی جبکہ رافع بے حد حیران رہ گیا۔ کیا مطلب؟“ وہ اسی حیرانی سے بولا۔
 ”مطلب یہ کہ جب بھی میں اور ممبارک میں آتے تھے، ہمیں یہاں ہاشم انکل مل جاتے تھے پھر انہوں نے ماما سے شادی کر لی۔ اب خالہ جانی آتی ہیں تو آپ ملتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ آپ بھی خالہ جانی سے شادی کر کے انہیں اپنے گھر لے جائیں۔“
 ”عمم۔۔۔“ ربیعہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم بہت عجیب باتیں کرنے لگے ہو۔ چلو گھر۔۔۔“
 ”یہ نہ تھی ہماری قسمت۔“ رافع کی گنگناہٹ ہر چند کہ بہت مدہم تھی پھر بھی ربیعہ نے اسے بخوبی سنا تھا۔
 اس نے جلدی سے آگے جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔
 ”بھینچے اچلو میرے ساتھ۔۔۔“ رافع نے عمر کو پکارا۔ ”اپنی ماما سے مل لو۔“
 عمر کی نگاہوں میں چمک ایسے اتری تھی جیسے اندھیرے میں جگنو چمکے پھر یک لخت وہ مرچھا سا گیا تھا۔
 ”نہیں انکل!“ وہ بولا۔ ”مجھے تو کل کے نیٹ کی تیاری بھی کرنی ہے اور۔۔۔“
 ”اور کیا؟“

”اور ممبارک ساس مجھے پسند نہیں ہیں۔“ اس نے بے نیازی سے کہہ کر ربیعہ کی انگلی تھام لی تھی۔ ربیعہ جربز ہوئی۔ رافع زور سے ہنس رہا تھا۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑا ٹائی کی ٹاٹ باندھ رہا تھا۔ شہلا اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ ہاشم نے ایک سرسری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

”ہاشم! میں۔۔۔ میں کچھ کہنا چاہتی ہوں آپ سے۔“ شہلا کی زبان اٹکنے لگی۔
 ہاشم کی نظر نے ایک ساعت کو اسے دیکھا پھر وہ ہیر برش اٹھا کر بالوں میں بھرنے لگا۔
 ”ہاشم! جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ چاہتی ہوں کہ آپ میری بات سن لیں۔“
 شہلا اضطراب کے عالم میں انگلیاں پچکاتے ہوئے بولی۔
 ”دراصل ہاشم! میں صرف عمر کے لیے فکر مند تھی۔ میں ایسا نہیں چاہتی ہاشم! کہ میں دوبارہ ماں نہ بنوں۔ بخدا میں ایسا نہیں چاہتی۔“

ہاشم آئینے کے سامنے سے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھا۔ سامنے رکھے بریف کیس کو کھول کر وہ اپنی فائل اور ضروری کاغذات اس میں رکھنے لگا۔ شہلا اس کے قریب آ بیٹھی۔

”ہاشم! میں عمر کی حیثیت کا تعین چاہتی تھی اور بس۔۔۔ میں۔۔۔ میں سوچتی تھی کہ ایک بار عمر کو ایک گھر۔۔۔ ایک جائز مقام مل جائے تب۔۔۔ تب میں دوبارہ ماں بنوں۔ بصورت دیگر وہ بہت کامپلیکسڈ ہو جاتا۔ آپ۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں نامیری بات۔“

”شہلا!“ وہ بریف کیس بند کرتے ہوئے بے حد نرم لہجے میں بولا۔ ”میں نے آپ سے کسی بات کی وضاحت نہیں مانگی۔ آپ کیوں خود کو ہلاکان کر رہی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں ہاشم! آپ کے دل میں بدگمانی ہے۔“ وہ روپائی سی ہوئی۔
 ”گناہ دل میں ہو تو گناہ نہیں ہوتا۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”عمل میں در آئے تب اس پر بات ہو سکتی ہے۔“
 اس نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ شہلا اس کے پیچھے لپکی۔
 ”میں نے جو کچھ آپ سے کہا، آپ کو اس پر یقین نہیں ہے ہاشم؟“
 ہاشم مٹھ کر گیا تھا۔ اس نے پلٹ کر شہلا کو دیکھا اور دھیمے سے مسکرایا۔
 ”یقین تو آپ نے میرا نہیں کیا شہلا! دکھ تو صرف اس بات کا ہے۔ اپنی دوسرے طے شدہ بات پر مزید کیا بات

کی جائے؟ میرا خیال ہے، میں لیٹ ہو رہا ہوں اور آپ کا بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔ خدا حافظ۔“
وہ باہر نکل گیا تھا۔ شہلا اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔ ہاشم کا انداز مخاطب اسے بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ ”آپ“ سے
”تم“ تک کا فاصلہ اس نے خوش رنگ تناسوں کے سارے طے کیا تھا اور اب وہ واپس پلٹ رہا تھا۔
”میرا خیال ہے، میں لیٹ ہو رہا ہوں اور آپ کا بھی وقت ضائع ہو رہا ہے۔“
شہلا کو چکر سا آیا تھا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ ہاشم اس سے بدگمان ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا نہ تھا لیکن اب
ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ واقعی ایک طے شدہ بات تھی۔

”ممم۔۔۔“ اس نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ ”میں آسکتا ہوں۔“
رہخانہ بیگم بیٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے آنکھوں پر رکھا ہوا یا زو ہٹایا۔
”ہاں۔۔۔“ آفرانہ اندر آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی تھی اسی لیے نیند بھی نہیں آئی۔“ فرزانے تلے قدم
اٹھاتا اندر چلا آیا پھر وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔ رہخانہ بیگم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ ”فرزان! میں نے ناعمہ کی ماں سے
شادی کی بات کی تھی کہ آیا وہ درودہ سے پہلے ناعمہ کی رخصتی کرویں گی یا پھر ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ مجھے خوشی
ہے کہ وہ ایک سمجھ دار خاتون ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ ناعمہ کا ہاتھ ہمیں دے دیں گی۔ جب بھی ہم چاہیں۔
تم سن رہے ہو نا؟“
فرزان جو کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا، ایک لخت چونکا۔
”جی۔۔۔ سن رہا ہوں۔“

”دراصل بیٹا، میری طبیعت تمہارے سامنے ہے۔ کبھی دن کی طرح بالکل تازہ اور روشن ہوتی ہے تو کبھی سیاہ
رات سی تاریک۔ مجھے خود اپنا اعتبار نہیں۔ میں چاہتی ہوں جلد از جلد تمہارے سر پر سر اسجاد کھ لوں۔ کیا بات
ہے فرزان! تم کہاں کھوئے ہوئے ہو۔ میں اتنی اہم بات کر رہی ہوں اور تم دھیان ہی نہیں دے رہے ہو۔“
”نہیں امی! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سب سن رہا ہوں لیکن بات یہ ہے امی کہ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا
ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ یہ مت کہنا کہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتے۔ اس کے علاوہ جو کچھ کہنا چاہتے ہو، کو۔“ وہ سائیڈ ٹیبل
سے اپنا چشمہ اٹھا کر نرم کپڑے سے صاف کرنے لگیں۔
فرزانے ایک نظر اپنی بہت عجیب محبت کرنے والی لیکن قدرے سخت گیر ماں کو دیکھا۔ اپنی اولاد میں سب سے
زیادہ وہ اسے چاہتی تھیں لیکن ان سے بات کرتے ہوئے ایک حد فاضل قائم رکھنا بہت ضروری ہوتا تھا۔ البتہ
فریجہ سب سے چھوٹی ہونے کے ناطے اس چیز سے مستثنیٰ تھی۔ وہ ان کی لاڈلی تھی اور ان سے ہر بات شیر کر لیا
کرتی تھی۔

”امی۔۔۔ آپ کو یاد ہو گا۔۔۔ میری منگنی آپ رخسانہ آنٹی کی بیٹی فرحین سے کرنا چاہتی تھیں؟“

”اب اس بات کا یہاں کیا ذکر۔“ انہوں نے اسے گھورا۔

فرزان قدرے پرل ہوا۔

”وہ۔۔۔ امی۔۔۔ دراصل۔۔۔ میں چاہتا ہوں کہ میں آپ کی خواہش پوری کر دوں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیران ہوئیں۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں؟ کھل کر کو؟“

”امی! میں ناعمہ سے شادی نہیں کر دوں گا۔“ بالآخر وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

رہخانہ بیگم چند لمحوں کے لیے سکتے میں رہ گئیں۔

”فرزان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ ان کی آواز جیسے کسی کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، آپ میری شادی جلد کرنا چاہتی ہیں، کرویں لیکن ناعمہ سے نہیں، فرحین سے۔“

رحمانہ بیگم چند لمحے اسے غم و غصے سے دیکھتی رہیں پھر ان کا ہاتھ اٹھا اور اس کے گال پر ایک زوردار طمانچے کی مورت بڑا۔ پوری زندگی میں انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی کسی اولاد پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ فراز بھی ششدر رہ گیا۔

”ہم؟“ سے یقین نہ آیا۔
”تم؟ تم؟ کسی غریب کی عزت کو مذاق سمجھتے ہو۔ چار دن کا کھیل ہے تمہارے لیے؟ کسی کے گھر کی خوشیاں اپنی دل لگی کے لیے استعمال کرو گے؟ فراز نے فرانسس میرا دل چاہ رہا ہے میں تمہیں شوٹ کروں۔“
”تو کرویں شوٹ ماما!“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”لیکن یہ امر قطعی ہے میں ناعمہ سے شادی نہیں کروں گا۔ وہ لڑکی اس قابل نہیں ہے۔ جو الزام آپ نے مجھ پر لگایا ہے ان ہی الفاظ میں میں اس لڑکی پر عائد کرتا ہوں۔ کسی کی خوشیاں اس کے لیے محض چار دن کا کھیل اور دل لگی جیسی ہیں۔ اسے سزا دینے کے لیے ہی میں نے یہ مفتی کی تھی۔ اب میں یہ مفتی توڑ دوں گا کہ اسے کھیل اور دل لگی کا صحیح مطلب سمجھ میں آئے۔“
رحمانہ بیگم بھی اس کے عقب میں کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے فراز کا کاندھا پکڑ کر اس کا رخ اپنی جانب موڑا

تھا۔ ”سنو فراز!“ وہ بولیں۔ ”اس سارے معاملے کے پیچھے کیا کہانی پوشیدہ ہے۔ میں نہیں جانتی مجھے جاننے میں دلچسپی بھی نہیں ہے۔ تمہارا ناعمہ سے کس طرح تعارف ہوا؟ بات کہاں تک پہنچی مجھے علم نہیں ہے لیکن اب میں یہ جانتی ہوں کہ یہ معاملہ دو افراد کا نہیں دو خاندانوں کا ہے۔ افسوس کہ تم نے ایک کریمہ عمل کے لیے اپنے خاندان کی عزت و آؤ پر لگانا چاہی لیکن بیٹا! تمہاری ماں ابھی مری نہیں زندہ ہے۔ میں تمہیں ایسا کوئی قدم نہیں اٹھانے دوں گی۔ کیسے سمجھ لیا تم نے کہ جس طرح تمہاری ضد کے آگے مجبور ہو کر ہم مفتی کر لیں گے اسی ضد کے آگے کھٹے نکیتے ہوئے اسے توڑ بھی دیں گے۔ میں وہ لڑکی جیسی بھی ہے اس نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا اس کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ ہے۔ ہمارے لیے وہ ہماری ہونے والی ہو ہے۔ سمجھے تم۔“

”آپ جذباتی ہو رہی ہیں ماما!“ وہ چڑ گیا۔
”جذبات کا دھارا صحیح سمت میں بہتا ہو تو جذباتی ہونے میں حرج نہیں۔“
”آپ۔۔۔ آپ ہوا کر بیٹا کھونا چاہتی ہیں۔“ وہ چراغ لپٹا ہونے لگا۔
”اگر ایسا ہے تو ایسا ہی سہی۔ ناعمہ ہر صورت تمہاری دلہن بن کر اس گھر میں آئے گی۔ اس گھر کے لوگ تمہاری طرح عمدہ شگن اور بے زبان نہیں ہیں۔ سمجھے تم۔ مفتی زبان ہے، عمدہ ہے۔“
فراز پیر پختے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

”یقیناً! میری بچی! کیوں خود کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تجھے اپنے بچوں پر بھی ترس نہیں آتا۔“ شفیقہ حیات بے بسی اور لجاجت سے بولیں۔

ایقان کی آنکھیں شدت ضبط سے سرخ ہونے لگیں۔ اس نے ٹیلا بل دانتوں تلے دبایا۔
”کیوں ترس کھاؤں اپنے بچوں پر؟ خدا انخواستہ سڑک پر تو نہیں بیٹھے ہوئے اپنی ماں کے گھر میں ہیں۔ یہ حصہ ابامیاں نے میرے نام کیا تھا۔“

”اری باؤلی عورت! تم عقل! بچوں کو باپ کا سایہ چاہیے۔ اسلام اور قانون اسی لیے ممتا کو فراموش کر کے بچہ باپ کے حوالے کرنے پر اصرار کرتے ہیں۔ اتنا بھی سمجھتی؟ کل کو اگر اس کے دماغ میں کوئی فتور آجائے خدا انخواستہ۔ اپنے بچے چھین لے وہ۔ تو کیا کرنے گی؟ اپنے ابامیاں کا حصہ لے کر بیٹھی رہ جانا۔ بھلا یہ دو کمروں کی چھت بھی اتنا غور کرنے کے لائق ہے۔“

”اماں۔۔۔“ وہ چھلک ہی پڑی۔ ”کیا کہہ رہی ہیں آپ! میں بھلا کیا غور کروں گی جس عورت کا شوہر اس کا مان، اعتماد، اعتبار، سب ہی کچھ ایک راہ چلتی کو سو پدے۔ لیکن آپ اگر مجھ سے یہ چاہتی ہیں کہ میں اس کے پیر پڑوں اسے مناؤں، بلاؤں اور ایک بار پھر بے شرمی سے اس کے ساتھ چل دوں تو یہ ممکنات میں سے نہیں ہے۔ اتنی عزت نفس میرے اندر ہے ابھی۔“

حقیقہ حیات نے تاسف سے اسے دیکھا۔

”جھوٹی انا کو عزت نفس کا نام مت دو ایقان! یہ تو شیطان کا برکاوہ ہے جس میں اگر اپنا گھراپنے ہاتھوں پر یاد کرنے پر تلی ہوئی ہو تم۔ ارے غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے نا۔ اس نے بھی مانا تھا کہ اس سے غلطی ہوئی۔ بھری محفل میں مانا تھا۔ تم پھر بھی انا کے جھنڈے پر لہرائی رہیں۔“

”نجانے کیا کھول کر پایا اس نے آپ کو۔“ وہ چیخ کر رہ گئی۔ ”اس کی خامیاں بھی آپ کو دیدہ زیب محسوس ہوتی ہیں۔ خوبیاں نظر آتی ہیں۔“

”ارے بچی۔۔۔ مجھے تو صرف تیرا گھر نظر آتا ہے۔“ وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ ”اس سے میرا کیا رشتہ کیا نا تا۔ سارے رشتے تیرے حوالے سے ہیں۔ میں تو صرف تجھے چاہتی ہوں۔“

”مجھے چاہتی ہیں اماں تو خدا کا واسطہ، مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گی، مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔“

حقیقہ حیات بے بسی اور تاسف سے اسے دیکھتی رہیں۔

”تیرا غم میری جان لے لے گا ایقان!“ وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”ٹھیک ہے بچی! اماں مرجائے گی تو تجھے علم ہو گا کہ ماں جاپوں کی محبت اور موت کتنے دن کی۔“

ایقان کے رونے میں شدت آگئی۔

”میں کب کسی سے کچھ مانگتی ہوں اماں!“

”ہاں تو اس بچے کے دل میں نیکی ہے اس لیے جس دن اس نے ہاتھ کھینچ لیا، اس دن ہاتھ بھی پھیلا نا پڑ جائے گا۔ اپنی سی بات نہیں سمجھتی؟ ارے جس کی کمائی کھا رہی ہے اس کی چار خطاؤں سے نظر چڑا لے تو کون سی قیامت آجائے گی؟“

”اپنے بچوں کی کفالت اس کی ذمہ داری ہے۔“ وہ رونا بھول کر زور سے بولی۔ ”کوئی احسان نہیں کر رہا ہے مجھ پر۔ پیسہ بھیجتا ہے اپنے بچوں کے لیے۔ نہیں بھیجے گا تو ہم بھوکوں نہیں مریں گے۔ پڑھی لکھی ہوں، نوکری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پیال سکتی ہوں۔“

”وہی مرغ کی ایک ٹانگہ۔“ انہوں نے اسے گھورا۔ ”اس وقت سے ڈر جب وقت سمجھانے پر اتر آئے ابھی تو ماں بد نصیب ہی سمجھا رہی ہے۔“

”چھوڑیں آپ۔۔۔ میرے حال پر چھوڑ دیں مجھے۔“ اس نے گالوں پر اتاری نمی صاف کی۔

”یہ بتائیں چائے بناؤں آپ کے لیے۔ کتنے دن کے بعد آپ کو میرا خیال آیا ہے۔ آپ تو مجھے ماں کم اور ساس زیادہ لگتی ہیں۔“

”میں نہیں جانتی چائے۔“ انہوں نے حلقی سے سر جھٹکا۔ ”ماں کی متاثر تو شک مت کر، شوہر تو جو کیا سو کیا۔“

ایقان نیم دل سے مسکرائی۔ اسی لمحے فون کی بیل بجی۔ ایقان کا دل دھڑکا۔ یہ وقت تو عاشر کے فون کا تھا۔ مومن کے اسکول سے آجانے کے بعد وہ بھی بکھار فون پر اس سے اور ایمان سے بات کرتا تھا۔ مومن نہا رہا تھا، ورنہ وہ بیل سن کر دوڑتا تھا آگ لگا آتا تھا۔ ایقان ٹھس سی بیٹھی رہی۔

”فون کیوں نہیں اٹھاتیں؟“ حقیقہ حیات نے ناگواری سے پوچھا۔

ایقان نے سانس بھری۔ بیل بند ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ ناچار اسے اٹھنا پڑا۔

”ہیلو۔“ اس نے اپنے دل کی دھڑکن اپنی سانسوں میں محسوس کی۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب عاشر ہی تھا۔ ”عاشر بات کر رہا ہوں۔“

”ہوں۔۔۔ مومن نہا رہا ہے۔“ وہ حقیقہ حیات پر ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی کہ فون کس کا ہے۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ وہ سنجیدہ تھا۔
ایقان کی ہتھیلیاں جھکنے لگیں۔ دل کی حالت اسے بتا رہی تھی کہ اس شخص سے کیسے کیسے بات کرتے تھے۔ اس کی
پلکیں نم ہو گئیں۔

”کچھ دیر بعد کر لینا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

نجانے کہاں سے تھی، حقیقہ حیات کے سامنے بات نہ کرنا ہی بہتر تھا۔

”نہوں“ ٹھک ہے۔“ وہ جیسے سمجھ گیا۔

لاسن دس کنکٹ ہوئی تو اقبال نے بے جان ہاتھوں سے ریسیور رکھ دیا۔ وہ مڑ کر واپس آئی تو اسے احساس ہوا کہ شفیقہ حیات پوری طرح چوکی تھیں۔

کہ شفیقہ حیات پوری طرح چوکنی تھیں۔

”کس کا فن تھا؟“ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

”س کا لون تھا، اسوں نے بے مانی سے پوچھا۔
”میں کہہ رہا تھا،“ بیستہ کہ جاؤ، ٹھک کرتے ہوئے اس نے تاثرات چھپانے لگی۔

”مومن کے دوست کا۔۔۔ وہ بستر کی چادر ہٹ کر رہے ہوئے اپنے ہاتھ پر چپکے سے۔۔۔“

”اچھا۔۔۔ وہ مایوس ہو کر کچھ سوچ میں ڈوب گئیں۔“

”جی ہاں“ ایقان چونکی۔ ”ہاں کرتے ہیں، ابھی بھار۔“

”چھا۔“ انہیں جیسے خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ ”لیا تے ہیں یہ“

”کھاتا۔“ وہ بے نیاز؟ سے بولی۔ ”مومن اور ایمان سے ہی بات ہوتی ہے۔“

”کبھی تم سرایت نہیں کرنا؟“

”نہیں“ وہ سرخ رو سے لہجہ

”ہمیں۔“ وہ بے رخی سے بولی۔

حقیقہ حیات مایوس ہوئی ہیں۔

منیزہ بیگم کو روائی دے کر وہ کمرے سے نکلی تھی تب ہی باہر گاڑی کا ہارن بجا اور چند لمحوں بعد ہی ڈور بیل

بھم۔ ربیعہ نے لاؤنج میں لگی دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔ یہ وقت ایسا تھا جب شازادہ ربی کوئی آیا کرتا تھا۔

لاؤ، بچ کا مرکز، دروازہ کھول کر وہ باہر نکلی، تب اس نے دیکھا۔ لکڑی کے گیٹ کے دوسری جانب ابراہیم جیلانی

کہا تھا۔ اس سے کہ سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ مڑ کر اندر چلی آئی۔

۱۳۹۴ھ - نوہمے سے سبزی بیگم کو آواز دی۔

”امی! اس لے دھیرے سے منیذہ نیم“
”میں! غنہ! کر! الم! الم! الم!“

”ہوں۔“ وہ عنودی کے عام میں ہیں۔

”باہر عمر کے پایا آئے ہیں۔“ وہ اہستہ سے بولی۔

”کیا؟“ وہ چونکیں اور بیٹھ گئیں۔ ”کون ابرار؟“

”جی۔“

”کیا کہتا ہے؟“ ان کے چہرے پر از حد پریشانی نمودار ہوئی۔

”پتا نہیں کس مقصد سے آئے ہیں۔ میں نے ابھی انہیں اندر نہیں بلایا۔“

وہ چند لمحے کچھ سوچتی رہیں پھر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”دیکھتے ہوں، مات تو کرتی ہی ہوگی ربیعہ۔“

سچے نے اسرار کے لئے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اور لا کر بٹھادیا۔

”آج کا عرف ہے“ وہ پوچھے بنا رہ نہ سکا۔ ”مہلے کبھی دیکھا نہیں آپ کو۔“

”اپنی تعریف؟“ وہ پوچھے بنا کر
”میں آہستہ سر ہمارے“

”ربیعہ“ وہ اہلسنی سے ہوئی۔
 ”آج آج مجھے
 ز آ کر متعلق رہا تھا۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”اویس! کس سیوا دیا۔ مجھے عمرے آپ نے سنبھل بتایا تھا۔ مگر یہی ہوئی آپ کے لئے۔“

ربیعہ نے لہجے کی شائستگی سے متاثر ہو کر فرارے عورتوں سے اسے دیکھا

ابراہیم ایک حد درجہ متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ دو شادیوں کے باوجود وہ نہایت کم عمر نوجوان نظر آتا تھا۔ براؤن، جدید تراش خراش کے ٹوپس سوٹ میں وہ بہت جاذب نظر اور پند سم لگ رہا تھا۔ اس کے بالوں کا اسٹائل، اس کی رست و اچ اور بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی کسی قیمتی پتھری انگلیسی۔ ہر شے سے امارت اور جدید انداز نمایاں تھا۔

وہ ہولے سے کھنکھار رہا۔ ربیعہ چونک اٹھی۔ اسے احساس ہوا کہ وہ کتنے اٹھماک سے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھی۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ شائستگی سے بولی۔ ”میں آٹنی کو بھیجتی ہوں۔“

وہ تیزی سے باہر کی سمت بڑھ گئی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے سوچا تھا۔ اتنا جاذب نظر بندہ اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اپنے مگن ہو کر اسے دیکھنے کے خیال سے وہ شرمندہ بھی ہوئی اور اسے ہنسی بھی آئی۔ لیکن میں اگر اس نے چائے کے لیے پانی اپنے کورکھا اور برتن نکالنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کتنا اچھا ہوا جو اس وقت عباد اور انیقہ دونوں ہی گھر پر نہیں تھے، وہ دونوں قدرے جذباتی ہو کر سوچتے تھے۔ ان کی موجودگی سے کوئی مسئلہ بھی کھڑا ہو سکتا تھا۔

چائے کی ٹرے لے کر وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ابراہیم اور منیذہ بیگم دونوں ہی خاموش تھے۔ ابراہیم کی خاموشی میں اطمینان تھا جبکہ منیذہ بیگم کے چہرے کا نقش نقش ان کے اضطراب کی داستان سنارہا تھا۔ ربیعہ نے چائے بنا کر دونوں کو دی۔

”تھینکس۔“ ابراہیم شائستگی سے بولا۔

”دیکھو بیٹا! منیذہ بیگم بولی تھیں۔“ میں جانتی ہوں کہ قانوناً تمہاری عمر کے اصل حق دار ہو۔ ہم لوگ تمہیں کسی طور اسے یہاں سے لے جانے سے نہیں روک سکتے لیکن اگر تم ہم پر ترس کھا کر دماغ کے بجائے دل سے سوچو۔ تو عمر کے لیے تمہارا فیصلہ تمہیں نامناسب لگے گا۔ وہ ہم لوگوں سے بہت ایچڈ ہے۔ نہیں رہ پائے گا ہمارے بغیر اور۔ اور ہم سب عمر کے بغیر۔“ ان کی آواز بھر گئی۔

”آٹنی۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”کیا شہلا کی شادی سے پہلے کوئی سوچ سکتا تھا کہ عمر شہلا کے بغیر رہ پائے گا یا شہلا عمر کے بغیر رہے گی؟ نہیں نا۔ یہ تصور ہی بے معنی لگتا ہو گا خصوصاً ”شہلا کو لیکن اب آپ دیکھیں، دونوں نے اس جدائی کو ایک زندہ حقیقت کی مانند قبول کر لیا ہے۔ یہ سب تو کہنے کی باتیں ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ صحیح کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے بیٹے کو میرے ساتھ رہنا چاہیے۔ نانی اور ماموں کے پاس رہنا مناسب نہیں جبکہ ماں باپ حیات ہوں، بچے کو ان باتوں کا احساس نہیں ہو سکتا لیکن آہستہ آہستہ وہ یہ سب اکورڈ فیمل کرے گا۔ لوگوں کے سوالات اس کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیں گے اور ایک دن وہ ہم سب سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہو گا کہ اس کے ماں باپ کے ہوتے ہوئے وہ آخر اپنی نانی کے گھر کیوں رہتا ہے؟ ابھی اسے آپ لوگوں سے پچھڑنے میں تھوڑی تکلف تو ہوگی لیکن آخر کار وہ اس تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول کر ہی لے گا۔“

منیذہ بیگم خاموش ہی رہ گئیں۔ دکھ کی گہری پرچھائیں ان کے چہرے پر تھیں۔ وہ عمر کو اس طرح چاہتی تھیں جیسے وہ ان کا نواسہ نہ ہو۔ سب سے چھوٹا بے حد لاڈلا بیٹا ہو۔

”میں جانتا ہوں آٹنی! اس کی جدائی وقتی طور پر آپ سب ہی کو شاق گزرے گی لیکن اس میں عمر کا مستقبل، اس کی بھلائی پوشیدہ ہے اس لیے اس فیصلے کو خوش دلی سے قبول کر لیں پلیز۔“

”کیا کہہ سکتی ہوں۔“ وہ آزر دگی سے بولیں۔ ”تمہاری باتوں کی نفی بھی نہیں کر سکتی لیکن اپنی محبت سے کیا کہوں؟“

”آٹنی! میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے یقیناً نانی نہیں، ماں بن کر پالا ہے اسے لیکن یقیناً جانیں، میں اسے آپ سے جدا نہیں کر دوں گا۔ وہ اسی طرح آپ سے ملا کرے گا۔ اس کا صرف گھر تبدیل ہوگا، رشتے نہیں۔“

اس کے لمحے میں نجانے کیسا اطمینان تھا۔ ربیعہ کو کسی گہرائی کا احساس ہوا۔
 ”اور جب آپ دادی نہیں گی تو ان بچوں کی قلقاریوں میں ساری اداسیاں کھوجائیں گی۔ آپ کو یہ سب یاد بھی نہ رہے گا۔“ وہ بشارت سے بولا۔

منہزہ بیگم اور ربیعہ خاموش تھیں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
 ”میں کل شام آکر اسے لے جاؤں گا۔ اب اجازت دیجئے۔“
 وہ کمرے سے نکل گیا۔ منہزہ بیگم نے صوفے کی پشت سے سر نکال دیا، ان کی آنکھوں سے آنسو اتارے بہہ رہے تھے۔ ربیعہ نے ان کے پاس بیٹھ کر ان کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

خوشی سے چمکتا ہوا چہرہ لیے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ تسبیح کرتی شفیقہ حیات نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ ان کے قریب آ بیٹھا۔

”پھلین، جلدی سے سارا اثر میری پیشانی میں داخل کر دیجئے پھر آپ کو خوش خبری سنا تا ہوں۔“

شفیقہ حیات نے اس کی پیشانی پر دم کیا پھر پیشانی چوم لی۔

”تمہیں دیکھنا ہی بڑی خوشی ہے بچے! ماں باپ کی نظر تو اپنے بچوں کو صرف دیکھنے سے ہی راضی رہتی ہے۔ کو کیا بات ہے؟“

رافع نے ان کے ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگائے۔

”دادی جان! آپ بہت اچھی ہیں۔ خوشی کی خبر یہ ہے کہ میری نوکری چکی ہو گئی۔ اپائنٹ منٹ لیٹر لے آیا ہوں۔“

”ارے واہ! مبارک ہو بہت بہت۔“ ان کی ساری خوشی ان کی آنکھوں میں اتر آئی۔

”تمہارے باپ کا بھی بوجھ ہلکا ہوا۔ بڑے بیٹے کے روزگار سے لگنے کی تو خوشی ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ دیگ پکواؤں گی۔ کیسی نوکری ہے؟“

”نوکری بہت اچھی ہے اماں۔“ وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”اس کمپنی میں پہلے بھی ایک مرتبہ نرائی کر چکا ہوں تب کامیابی نہ ہوئی تھی۔ یوں سمجھ لیں یہ میرا خواب تھا جو پورا ہو گیا۔“

”ماشاء اللہ۔ تب ہی تو خوشی ایک ایک ادا سے چھلک رہی ہے۔“ وہ ہنس۔ ”ماں کو بتایا؟“

”امی شاید پھپھو کی طرف گئی ہیں۔“ اس نے بند آنکھوں سے ہی بتایا۔

”رابعہ کی طرف؟“

”جی۔ شاید۔“ اسے جیسے دادی کی گود میں نیند آنے لگی تھی۔

”اچھا رافع۔ بات سنو۔ یہ تمہارا ورہ سے شادی کے متعلق کیا ارادہ ہے؟ تمہاری ماں کچھ فکر مند ہو رہی تھی۔“

انہوں نے بنا کسی پیش لفظ کے اچانک ہی اصل بات کا آغاز کیا تھا۔ رافع اس اچانک حملے پر چونک اٹھا۔
 آنکھیں کھول کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”امی! فکر مند کیوں ہیں؟ میں نے ایسا کیا کہا؟“ وہ محتاط ہو کر پوچھنے لگا۔

”ارے بچے۔ ماؤں کے دل تو یوں بھی بہت وہمی ہو جایا کرتے ہیں۔ خصوصاً بیٹوں کے معاملے میں۔ ذرا ذرا سی باتوں سے اندازے لگایا کرتی ہیں۔ تم سے اس کی کیا بات ہوئی۔ یہ تو میں جانتی نہیں۔ تاہم وہ فکر مند ضرور ہے۔ شاید تم نے ایسا کچھ کہا ہو؟“

وہ بات مکمل کر کے بغور اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ رافع سے اپنے تاثرات چھپانا دشوار ہونے لگا۔

”بولو بچے! اگر ایسی کوئی بات ہے بھی تو مجھ سے کہو اپنی بریشائی؟“

”نہیں دادی!“ وہ دمہم سا گویا ہوا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ بس اتنی بات ہے کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ابھی کرنے کو بہت کچھ ہے لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آتا، جلدی کس بات کی ہے؟“

”بڑے لڑکے ہوتے۔ جب باپ بنو گئے تو یاد کرنا ان دنوں کو۔ ماں باپ کو کیسی آرزو ہوتی ہے ان لحوں کو دیکھنے کی۔ بہر حال تمہاری بات رکھ کر تم کو کچھ مہلت دے دیں گے، ہم لیکن ہمیں اتنا اطمینان تو دلا دونا کہ ورہ سے شادی کرنے میں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

رافع نے ایک گہری سانس بھری۔ ایک نظر بوڑھی دادی کی جانب دیکھا پھر لب چباتے ہوئے وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

”اگر میں آپ سے کہوں دادی!“ پھر وہ دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

”نہ جانے کیوں میرا دل اور دماغ کسی بھی بات پر متفق نہیں ہو رہے ہیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس وقت زندگی سے کیا چاہ رہا ہوں اور زندگی مجھ سے کیا چاہ رہی ہے؟ شاید یہ دونوں علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں اور میں اس چیز سے ڈسٹرب بھی ہوں اور خوف زدہ بھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس صورت حال میں میں کسی سے بھی انصاف کر سکوں گا۔ اسی لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ فی الوقت میں شادی جیسی بڑی ذمہ داری نہیں اٹھانا چاہتا۔“

اس نے سر اٹھا کر حقیقتہً حیات کی جانب دیکھا جو نظروں میں بے تحاشا تشویش اور الجھن لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ان کی دھندلی بوڑھی آنکھوں میں بہت گہرائی تھی۔ رافع زیادہ دیر ان سے نگاہیں نہ ملا سکا۔

”رافع!“ انہوں نے کچھ دیر بعد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ ”میرے بچے تو نے اس وقت میرے دل کا سب چھن، سارا قرار مجھ سے چھین لیا ہے۔ دیکھ بیٹے! دادی کو بچ بچا دے کیا تجھے کوئی اور لڑکی پسند آگئی ہے؟“

رافع خاموش بیٹھا رہا۔ جین اور قرار کی بات کر کے جب وہ یہ بات پوچھ رہی تھیں تو وہ کچھ بھی کہنے کے قابل ہی کہاں رہا تھا۔

”رافع!“ ان کی آواز بھگ گئی۔ ”میری بیٹی رابعہ بہت ظرف والی، بڑے صبر والی بچی ہے، زندگی کی کٹھنائیوں کا اس نے بہت پامردی سے مقابلہ کیا ہے۔ خدا نے اسے تین بیٹیوں سے نوازا، اس نے بہت خوش دلی سے اپنی پھول سی بچوں کی پرورش کی۔ اولاد زینہ کی نعمت سے محروم رہی لیکن کبھی کوئی حسرت کوئی شکوہ اس کے لبوں پر نہ آیا۔ شوہر کی بھرپور رفاقت اس سے چھوٹی۔۔۔ ہا۔۔۔ آہ! اس خدا کی ہندی نے بہت جلد خود پر اور حالات پر قابو پانے کی اپنی سی سی سی کی۔ اتفاق پر تو اس کے حوصلے اور صبر کا سایہ تک نہیں بڑا۔ خیر۔۔۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ بیٹا! تم جوان خون ہو۔ ذہن کے بجائے زیادہ تر دل سے سوچتے ہو گے۔ یہی تمہاری عمر کا تقاضا بھی ہے۔ لیکن میرے بچے۔ جو بھی فیصلہ کرو! اپنی صبر والی چھپی کے صبر اور حوصلے کو مت آزمانا اور پھر ورہ بہت بیماری پکی ہے۔ تین لڑکیوں میں وہی اپنی ماں پر لگی ہے۔ اس میں بھی وہی ظرف اور ویسا ہی صبر ہے اور جس عورت میں یہ دو خوبیاں ہوں وہ مرد کی زندگی میں کنگھ ہی کنگھ بھر دیتی ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہوتا۔“

”جی!“ رافع چونکا پھر اس نے ایک گہری سانس بھری۔ ”سن رہا ہوں دادی! سب سن رہا ہوں سب سمجھ رہا ہوں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں؟ ان میں سے کوئی بات ایسی بھی ہے جو میرے علم میں نہ ہو؟ سب جانتا ہوں میں۔ آپ بے فکر رہیے۔ میں ایسا کوئی فیصلہ نہیں کروں گا جس سے کسی کو کوئی دکھ پہنچے۔ بس مجھے وقت درکار ہے دادی! زندگی اور زندگی کے مطالبات کو سمجھنے کے لیے وقت چاہیے۔ خود کو سمجھانے کے لیے وقت چاہیے۔“

”رافع!“ حقیقتہً حیات نے اچانک ہی سرگوشی کی۔ ”وہ کون ہے؟“

”کون؟“ وہ حیران ہوا۔

”وہی لڑکی جسے تو شاید چاہنے لگا ہے۔“

”اوہ!“ وہ ایک لخت ہی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”بہت۔۔۔ خوبصورت ہے کیا؟“

”کم آن دادی جان۔“ وہ ہنس دیا۔ پھر اس نے جھک کر ان کا سر چوم لیا۔ ”کہہ رہا ہوں نا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بدگمانیوں کو دل میں جگہ نہ دیں۔“

”بیٹا۔ اپنی وردہ بھی بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ تم نے تو کبھی اسے غور سے بھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ کب سے تمہاری سنیتر ہے وہ۔ لڑکیوں کو ایسے رشتوں نا توں سے بہت توقعات وابستہ ہو جایا کرتی ہیں۔ بہت نازک جذبے ہوتے ہیں ان کے۔ ان باتوں کا بھی خیال نہیں کیا تم نے۔“

”یا اللہ۔“ رافع بے حد گھبرا گیا۔ ”میں چلوں دادی۔ بہت زوروں کی بھوک لگی ہے۔“

”ہاں بچے۔ کھانا کھاؤ۔ چائے پیو۔ فریش ہو لو۔ لیکن میری باتوں کو ذہن میں دہرا ضرور لینا۔“

رافع خود کو سخت پر آگندہ خیال محسوس کرتا ہوا وہاں سے نکلا۔

”آپ جانتی ہیں بھابھی جان! ای کے مشورے سے زیادہ میں آپ کے مشورے کو صائب جانتی ہوں۔ آپ کی رائے میرے نزدیک بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لیے فراز کی امی کا فون آتے ہی میں نے آپ کو کھلا بھیجا۔ اب آپ کہیے کیا رائے ہے آپ کی؟“

راجہ بیگم نے ایک نظر قدرے خاموش اور سنجیدہ نظر آتی عذرا بیگم کو دیکھا۔

”میرا اور آپ کا منہ بھاج کا کم اور بہنوں والا معاملہ زیادہ ہے۔ اس لیے اپنی رائے میں کوئی تردد نہ کر س آپ۔ جیسی بھی آپ کی آسانی ہو ہم ویسا ہی کر لیں گے۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ آپ ثانیہ اور رافع کے فرض سے فارغ ہو جائیں میں وردہ اور ناعمہ کے فرض سے سبکدوش ہو لوں۔ کیسی آسانی ہو جائے گی ہماری۔“

پکن میں عذرا بیگم کے لیے چائے بناتی ہوئی وردہ کے ہاتھ ست ہو گئے تھے۔ وہ بے دلی سے چائے کی پیالیاں صاف کرنے لگی۔

”کتنی تو تم بالکل درست ہو راجہ۔ تمہاری بات کے صحیح ہونے میں کوئی شک شبہ نہیں ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ رافع ثانیہ سے بڑا ہے اور وردہ ناعمہ سے بڑی ہے۔ پہلا حق بھی ان دونوں کا ہی بنتا ہے۔ لیکن۔“ وہ قدرے متامل تھیں۔

”لیکن کیا بھابھی جان؟ آپ کھل کر کہیے اگر کوئی پریشانی ہے تو ہم مل کر اس کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں۔“

”بات یہ ہے کہ رافع۔۔۔ رافع ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا۔“ وہ نظریں جھکا کر آہستگی سے یوں بولی تھیں جیسے کسی جرم کا اقرار کر رہی ہوں۔

”رافع؟“ راجہ بیگم دھک سے رہ گئیں۔ ”لیکن۔۔۔ اسے کیا اعتراض ہے بھابھی جان؟“ ان کے تو وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اس معاملے میں رافع کی جانب سے بھی کوئی گریز ہو سکتا ہے۔

”نہیں، نہیں راجہ! تم غلط نہ لو اس بات کو۔ دراصل وہ اپنے کیرئیر اپنے مستقبل کے حوالے سے کہتا ہے یہ بات۔ تم تو جانتی ہو آج کل کے لڑکے ایک جست میں ہی آسمان پھولینا چاہتے ہیں۔“

”تو کیا وہ شادی کو پاؤں کی زنجیر سمجھتا ہے؟ وردہ تو خود پڑھی لکھی، روشن خیال لڑکی ہے۔ وہ تو اناس کی مدد کرے گی اس کا کیرئیر بنائے میں۔“

”میں ایک بار پھر رافع سے بات کروں گی۔ تم خاطر جمع رکھو۔“ عذرا بیگم نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر جیسے تسلی دی تھی۔

وردہ پکن سے چائے لے کر نکلی تو وہ دونوں ہی خاموش ہو گئی تھیں۔ وردہ نے بسکٹ ان کے سامنے کیے تو انہوں نے پلیٹ سے ایک بسکٹ اٹھالیا۔ پھر کوئی خیال آنے پر انہوں نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

”ارے بھئی وردہ۔۔۔ ثانیہ کب سے یاد کر رہی ہے تمہیں۔۔۔ اسے بازار سے بھی کچھ کام بھیجے اور اپنی ایک قمیص بھی کر ڈھواتا ہے تم سے۔ پہلے تو تم اکثر چکر لگالیا کرتی تھیں اب تو صورت نہیں دکھاتیں بھی۔“

”جی ممانی! میں آؤں گی کل پرسوں تک۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
”سوچتی ہوں ناعمہ کے لیے بھی ایک دو کڑھائی کے سوٹ تیار کر لوں۔ کیا پتہ اس کی ساس کا کب ارادہ بن جائے؟“

عذرا بیگم نے پیار سے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”اور اگر تمہاری ساس کا ارادہ بھی بن گیا پھر؟“ انہوں نے اس کی ٹھوڑی کو ذرا سا اٹھا کر شرارت سے پوچھا۔
”وہ قدرے جھینپ سی گئی۔ رابعہ بیگم اور عذرا بیگم ہنس دی تھیں۔“



وہ بے حد بے قراری سے ٹہل رہی تھی۔ کل سے وہ اسی بے چینی اور بے کلی کا شکار تھی۔ عاشر کے فون نے اسے بہت ٹینس کر دیا تھا۔ حقیقتہً حیات کی موجودگی کے باعث وہ اس سے بات نہ کر پائی تھی۔ اس نے دوبارہ فون کیا تو عذرا بیگم اس کی خیریت دریافت کرنے آئی ہوئی تھیں۔ ایقان نے فون کا تار ہی نکال دیا تھا تو تب سے اب تک وہ ایک ناقابل بیان کیفیت کا شکار تھی۔ عاشر نے اسے کیوں فون کیا تھا۔ وہ آخر کون سی ضروری بات کرنا چاہتا تھا اس سے؟

شاید تنہا زندگی کے تعاقب میں دوڑتے دوڑتے وہ تھک گیا تھا۔ شاید جھکنا چاہتا تھا۔ اپنی ہار کا اقرار کرنا چاہتا تھا۔ اور ایقان اس کی ہار کا اعتراف سننے کی بے حد شدتوں سے متمنی تھی۔ اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔
”مومن کے اسکول سے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب عاشر عموماً فون کیا کرتا تھا۔“
ایقان نے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس کی اور تب ہی نیل ہوئی تھی۔ وہ اچھل ہی پڑی پھر تیزی سے چلتی ہوئی وہ فون تک پہنچی تھی۔
”ہیلو! اس کا سانس غیر معمولی ہو رہا تھا۔“

”ہیلو۔ عاشر بات کر رہا ہوں۔“ اس کے انداز میں بے حد سنجیدگی تھی۔
”ہاں ہیلو۔ کیا بات ہے؟“ ایقان نے لمبے میں زمانے بھر کی بے رخی سمو کر کہا۔ اس کی ہار کے اعتراف کے موقع پر وہ خود کو بہت بے نیاز اور بے پروا ثابت کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ گھر کی عورت اتنی گری پڑی، مظلوم اور طالب نہیں ہوتی جتنا کہ اس نے سمجھا تھا۔ وہ اسے جتنا چاہتی تھی کہ ہر بار عورت ہی نہیں جھکتی۔ اپنے بچوں کے مستقبل اور خوشیوں کے لیے کبھی کبھار مرد کو بھی جھکنا پڑتا ہے۔“
”میں۔ میں ایک بے حد ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ قدرے رکا تھا۔
”میں سن رہی ہوں۔“

”ایقان۔ میں۔“ ایقان سانس روک کر دم بخود سننے لگی۔

”ایقان! میں لڑا سے شادی کر رہا ہوں۔“ وہ بالا خرہ کہنے لگا۔

”کیا؟“ اس کے لبوں سے چیخ کے مشابہہ آواز نکلی تھی۔

ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ اس نے فوری طور پر دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو شاید وہ گر ہی جاتی۔ دوسری جانب خاموشی تھی۔ شاید وہ اس کے جوابی رد عمل کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن ذہنی جھٹکا ایسا تھا کہ ایقان خود کو مفلوج تصور کر رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ کچھ دیر بعد وہ بولا۔ اس کے لمبے میں طنز تھا۔

”کچھ کموگی نہیں؟ تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی کا یہ ایک منطقی نتیجہ ہے سو خود کو شاباش دو ایقان بیگم۔“

ایقان مہربان لب ساکت نگاہوں سے دیوار کو گھور رہی تھی۔

”زندگی کی دشوار گزار راہوں پر تم اکیلی چل سکتی ہو۔ میں تمہاری ہمت کو سات سلام کرتا ہوں! تاہم میرے لیے یہ سب کچھ بہت مشکل تھا۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے ایک ساتھی کی ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اسی لیے

”آئی ہیٹ بوعاشر۔ مجھے نفرت ہے تم سے۔ تمہارے ساتھ جڑے ہر رشتے سے۔ میں تمہارے ساتھ نام کا بھی رشتہ رکھنا نہیں چاہتی مجھے طلاق چاہیے۔ ابھی۔ اسی وقت۔“ وہ ریسیور کان سے لگائے پاگلوں کی مانند چیخ رہی تھی۔ عاشر کافی دیر خاموش رہا۔ اس کی چیخیں ہمیں تو وہ تحکم سے بولا۔

”تمہاری حماقت، جذباتیت اور جلد بازی نے ہی تمہیں اس موڑ پر لاکھڑا کیا ہے! یقیناً! لیکن بہر حال میں اتنا جذباتی آدمی عقل نہیں ہوں۔ سوچ سمجھ کر ہی فیصلے کرتا ہوں۔ تمہیں طلاق دینے میں مجھے عار نہیں۔ تاہم میں جانتا ہوں کہ یہ ہمارے بچوں کی زندگی پر کیسے اثرات مرتب کرے گا۔ سوا چھی طرح سوچ سمجھ لو“

”مجھے کچھ نہیں سوچنا۔ وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔ ”کچھ بھی نہیں، مجھے طلاق ابھی اسی وقت۔۔۔ میں تمہارے جیسے کینے شخص کے ساتھ ایک بل بھی جڑی رہنا نہیں چاہتی۔“

غم و غصے سے وہ دیوانہ ہو رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ریسپور میں ہاتھ ڈال کر وہ اس کا گریبان پکڑ لیتی۔ اسے دیوانہ وار مارتی۔ اس کا چہرہ لہو لہماں کر دیتی۔

”سوچ لو ابقان۔۔۔! اچھی طرح سوچ لو۔ میں چند دن بعد فون کروں گا۔“ دوسری جانب اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی تھی۔

”ہیلو۔ ہیلو کیسے۔۔۔ ذیل۔۔۔ پاجی۔۔۔ بات کرو مجھ سے بات کرو۔“ وہ کریڈل پر ہاتھ مارنے لگی۔ حالانکہ دس کنکٹ ٹون اسے بتا رہی تھی کہ وہ فون بند کر چکا ہے۔

”میں... میں کبھی نہیں رہوں گی تمہارے ساتھ کبھی نہیں...“ ریسپور پیجینک کردہ دونوں ہاتھوں سے بتے ہوئے آنسو صاف کرنے لگی۔ ”تم طلاق نہیں دو گے تو میں عدالت جاؤں گی۔“

آنسو تھے کہ رکنے کا نام نہ لیتے تھے۔ سسکیاں اٹھیں کہ ہم کرنہ دیتی تھیں۔ وہ بمشکل کمرے میں آئی اور بستر پر گر کر زار و قطار رونے لگی۔

وہ بالکل گم صم بیٹھی ہوئی تھی اس کے ایک جانب منہ پر بیگم بیٹھی تھیں اور دوسری طرف انبیقہ تھی۔ قدرے فاصلے پر کھڑکی کے قریب عباد کھڑا ہوا تھا۔ ربیعہ ایک اپچی کیس میں عمر کا سامان رکھ رہی تھی۔ وہ ان سب کی کیفیات سے بے نیاز ایک بال کا تعاقب کرتا پھر رہا تھا۔ اس نے آج خاص طور پر نیا لباس پہنا تھا اور وہ اپنی حرکات و سکنات سے بہت برجوش اور خوش نظر آ رہا تھا۔ شہلا کی خاموش نظریں بار بار اس کا طواف کرتی تھیں پھر اس کے اندر سے ایک سنسکی سی نکلتی تھی۔

”عمرو! آپ کے کھلونے بھی رکھ دوں؟“ ربیعہ نے قدرے آزر دگی سے پوچھا۔ ”یا انہیں ہمیں چھوڑ جاؤ۔ جب یہاں آنا کرو گے تو کھیل کرنا ان سے۔“

”تھک ہے۔“ اس نے بے نیازی سے سر ہلایا۔ ”ویسے بھی پیانے پر امس کیا ہے کہ وہ مجھے بہت سے ٹواڑے دلاوا کس گئے کافی سارے انہوں نے لے کر بھی رکھے ہیں۔“

”مہم! آج کو تیرا یہاں میرا روم سنٹ کروا رہا ہے۔ اتنا اچھا اتنا اچھا۔ یہاں کہہ رہے تھے۔ انہوں نے گھر

کاسب سے خوبصورت کمرہ میرے لیے سیٹ کروایا ہے۔ ماما! آپ کبھی آئیں گی مجھ سے ملنے؟ میں آپ کو اپنی چیزیں دکھاؤں گا۔ پلیز ماما۔ آپ آئیں گی نا؟ شہلا کی آنکھوں سے چند قطرے نکل کر اس کے بالوں میں گم

ہو گئے۔ اس نے سر اٹھا کر شہلا کا چہرہ دیکھا۔

”مماپلینے۔۔۔ آپ رو میں مت۔۔۔ میں گٹلی فیل کرنے لگتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے آپ میری وجہ سے رو رہی ہیں۔ دیکھیں نا۔۔۔ آپ بھی تو باہم انکل کے ساتھ گئی تھیں۔ میں تو نہیں رویا۔ آپ سے پراس جو کیا تھا میں نے۔ اب میں جا رہا ہوں تو آپ کیوں رو رہی ہیں۔“

اس نے اپنے ہاتھ سے شہلا کا چہرہ صاف کیا۔ شہلا سسک پڑی۔ اس نے عمر کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ منیہہ بیگم نے دلا سادے والے انداز میں اس کے شانے پر بازو پھیلا دیا تھا۔

”بچے کو خوشی خوشی بھجو شہلا! کسی غیر کے نہیں“ اپنے باپ کے ساتھ جا رہا ہے۔ دل مضبوط رکھو بیٹا پھر اس نے وعدہ کیا ہے کہ ہمیں محسوس نہیں ہونے دے گا کہ عمر یہاں سے چلا گیا ہے۔ وہ روز عمر کو بھیجے گا۔ ہم روز اس سے ملیں گے۔ اسے پیار کریں گے۔ اگر دماغ سے سوچو تو یہی ٹھیک ہے۔ عمر کو باپ کے مضبوط سارے کی ضرورت ہے۔ نام کی ضرورت ہے۔“

”نہیں سوچ سکتی دماغ سے۔“ اس کے لبوں نے سرگوشی کی۔ ”نہیں سوچ سکتی۔ محبت کے پاس صرف دل ہوتا ہے اہی! دماغ تو اسے ملا ہی نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔ کیا اچھا ہے کیا برا۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں عمر کے بغیر نہیں جی سکتی۔“

”ممما۔۔۔“ عمر اس کے انداز سے روہا نا ہو گیا۔ ”آپ ایسے لی بیو نہ کریں پلینے۔۔۔ ورنہ میں بھی روؤں گا۔ مجھے آپ کے آنسوؤں سے رونا آ رہا ہے۔ ممما۔۔۔ آئی لو پو۔۔۔“

اس نے شہلا کو پیار کیا۔ شہلا نے اسے دیوانہ وار لپٹا لیا تھا۔ عجب منظر تھا۔ سب ہی کی پلکیں غم تھیں اور دل آزرہ تھے۔

باہر گاڑی کا ہارن بجاتا سب نے چونک کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ عباد تھکے تھکے قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اندر آیا تھا۔

”امی۔۔۔“ وہ منیہہ بیگم سے مخاطب ہوا۔ ”ابرا صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ چائے وغیرہ بھیج دیں“ ویسے وہ جلدی میں ہیں، فوراً جانا چاہ رہے ہیں۔ بہر حال میں انہیں چائے کے لیے اندر لے آیا ہوں۔ آپ بھی آکر مل لیں اور۔۔۔ اور۔۔۔ عمر۔۔۔ کو بھی لے آئیں۔“

عمر کو چند لمحوں پیشتر والی خوشی شہلا کے آنسو دیکھ کر بھول چکی تھی۔ وہ خوفزدہ سا نظر آ رہا تھا۔ شہلا نے اس کی صورت دیکھی تو اس کا دل پھٹنے لگا۔

”عمر۔۔۔“ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”تمہارے پیپا۔۔۔ آگے ہیں۔“

”ممما۔۔۔“ وہ روہا نا سا ہوا۔ ”آپ بھی چلیں نا میرے ساتھ۔۔۔ پیپا کہہ رہے تھے اگر آپ چاہیں تو۔۔۔“

”عمر۔۔۔“ انیقہ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ ”ڈونٹ ٹاک ناں مینس۔۔۔ ممما کو تنگ نہ کرو جانو۔ وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔ چلو ہم تمہارے پیپا سے ملے ہیں۔ کم آن۔“ شہلا نے لاشعوری طور پر اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ انیقہ نے نرمی سے اسے چھڑانے کی کوشش کی۔

”انیقہ۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”آئی۔۔۔ پلینے۔۔۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”مجھنے کی کوشش کریں۔“

”انیقہ۔۔۔ میں مر جاؤں گی۔“ وہ پھر سسکی۔ ”اس سے جا کر کہو، مجھ پر یہ ظلم نہ کرے۔ پلینے۔“

”آئی! اخو کو سنھالیں۔“ انیقہ نے اسے سرزنش کی۔ ”لوگ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھی تو بھیجتے ہیں کئی سالوں کے لیے۔ آپ بھی سمجھیں کہ عمر اپنا مستقبل اپنا کیریئر بنانے جا رہا ہے۔ اس طرح رو کر اسے ڈسٹرب نہ کریں۔ کتنا خوش ہے عمر آپ مسلسل اسے ذہنی طور پر پریشان کر رہی ہیں۔“

”مجھے یہ طفل تسلیاں نہ دو۔“ اس نے آنسو پونچھے۔ ”میں جانتی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ صرف ضد

میں آکر اسے لے جا رہا ہے تاکہ مجھے تڑپائے، ترسائے۔ میرا تماشا دیکھ لیں۔ میں جانی ہوں انفیقا! وہ عمر کو مجھ سے ملنے بھی نہیں بھیجے گا۔“

عمر منہ کھولے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا اس کے معصوم ذہن کے لیے ساری باتیں کسی پسلی کی مانند تھیں جسے بوجھنے کی وہ اپنی سی سچی کر رہا تھا۔

”آئی! خدا کا واسطہ اتنی کمزور مت بنیں۔“ انفیقا بجا جت سے بولی۔

”تم کہہ سکتی ہو انفیقا! تم ابھی ماں نہیں بنیں۔ تم کہہ سکتی ہو۔“ اس کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ اسی لمحے عباد ڈرانگ روم کے اندرونی دروازے کو کھول کر باہر آیا تھا۔ شدت جذبات سے اس کی آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ عمر کا وجود ان سب کے لیے خوشیوں کی اساس تھا۔ جسم میں روح کی مانند تھا۔ ”عمر!“ اس نے آواز دی۔ اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ ”کم آن ڈیئر۔ تمہارے بچا تمہارا ویت کر رہے ہیں۔“

”ماما! ماما! جاؤں؟“ عمر نے سراٹھا کر شہلا کو دیکھا۔

شہلا کی کیفیات سے وہ حد درجہ ہراساں ہو رہا تھا۔ اسے اب تک اندازہ نہیں تھا کہ اس کا ابراہ کے ساتھ جانا شہلا کے لیے کیا معنی رکھتا ہے۔ اب اسے اندازہ ہو رہا تھا اور وہ سخت پریشان تھا۔

”ماما! میں نہ جاؤں؟“ وہ پھر معصومیت سے پوچھنے لگا۔ ”بچا کو منع کروں؟“

”عمر!“ عباد قریب چلا آیا۔ ”کم آن ڈرانگ۔“

عمر شہلا سے مضبوطی سے لپٹ گیا۔ شہلا کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ انفیقا اور عباد پریشانی سے ایک دوسرے کو تنگ رہے تھے۔

ایک نخت شہلا لچلی کی سی تیزی سے اٹھی۔ اس نے عمر کی کلائی تھامی ہوئی تھی۔ وہ اسے کھینچتے ہوئے ڈرانگ روم کی طرف برومی۔ عباد اور انفیقا ہکا بکا رہ گئے پھر عباد اس کے پیچھے لپکا۔

”آئی! اپنا۔ رکیں۔“

لیکن شہلا اتنی دیر میں ڈرانگ روم میں داخل ہو چکی تھی، جہاں ابراہناہات اطمینان سے براجمان تھا۔ اسے دیکھ کر وہ حد درجہ حیرانی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ منیہہ بیگم بھی کھڑی ہو گئیں۔ عباد اور انفیقا بھی تقریباً دوڑتے ہوئے وہاں چلے آئے تھے۔

شہلا تیزی سے اس کے قریب پہنچی پھر اس نے پاگلوں کی طرح اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا۔ کس جنم میں تمہارے ساتھ برائی کی تھی میں نے؟ بولو! جواب دو۔ کتنی بے دردی سے تم نے میری زندگی سے کھیلنا ہے اور اب تک کھیل رہے ہو۔ ابراہ۔ کیا سمجھتے ہو تم مجھ۔ ایک کھلونا۔ ایک معصوم۔ جسے ہر بار مختلف طریقوں سے حل کرنا چاہتے ہو تم۔“

”شہلا۔ شہلا کنٹرول یور سیلف۔“ ابراہ نے نرمی سے اپنے گریبان پر جسے اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا۔

چاہا۔

”میرا بچہ چھینے آئے ہو اور کہتے ہو کنٹرول یور سیلف۔“ وہ بری طرح سے چیخی۔ ”میرے گلے پر چھری رکھ کر چلا رہے ہو اور کہتے ہو میں چیخوں نہ۔ چلاؤں نہ۔ کیا قصور ہے میرا جس کی اتنی کڑی سزا مل رہی ہے مجھ۔ جس بچے کو اتنے سال اپنی سانسوں کی طرح سنبھال کر رکھا میں نے اسے لینے آئے ہو تم۔ کیونکہ تمہیں اچانک یاد آیا کہ تم اس کے باپ ہو اور میں۔ میں کچھ نہیں۔“

”آئی! آپ پلینز۔ فار گاڈ سیک۔“ عباد بھی قریب آگیا۔

منیہہ بیگم انفیقا، ربیعہ سب ہی اس کے پاس چلے آئے سب کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔

”شہلا۔ تم۔ تم سب کچھ ہو اس کے لیے۔ سب کچھ۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”ایڈیو نوویری ویل کہ میں کیا چاہتا ہوں۔“

شملہ اتنا چیخنے کے بعد اب قدرے حواسوں میں آئی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ اب تک برابر کے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ وہ چونکی پھر اس نے مزاحمتی انداز میں اپنے ہاتھ اس سے چھڑا لیے۔
”لے جاؤ اسے۔“ وہ اچانک ہی خود پر قابو پا کر بولی۔ ”لیکن۔۔۔ لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ روز بھیج دو گے، ہم۔۔۔ ملے۔“

”آئی برا مس۔“ وہ دھیمے سے مسکرایا۔

شملہ لٹیچی اور پھر یک لخت وہیں رک گئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ہاشم کھڑا تھا۔ وہ اس تمام صورت حال کو سمیٹ جاتی ہے دیکھ رہا تھا جیسے یہ کسی اور ہی دنیا کا قصہ ہو۔ شملہ کو چند لمحے پیشتر والی صورت حال یاد آئی۔
اُسے وہاں مزید کھڑا نہاد شوار ہو گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ہاشم کے قریب سے ہوتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئی پھر دوڑتے ہوئے بیڈ روم میں جا بھسی۔ بستر پر گر کر وہ بے بسی سے رونے لگی تھی۔

”یہاں سب کچھ بہترین طریقے سے ہو رہا ہے۔ یو ڈونٹ وری۔“ امیر حسن نے چائے کا سپ لے کر کہا تھا
وہ اس وقت فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ یار نثر شپ کی بات چل رہی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا عباد کے متعلق۔ عباد از ریگی اوند ر
فل پر سن۔۔۔ تم اس سے مل کر خوش ہو گے۔ میں بہت اچھی طرح جاننے لگا ہوں اسے۔ گھر بھی جا چکا ہوں۔ اس
کی ٹینٹی بھی بہت اچھی ہے۔“
وہ یہ بات کرتے ہوئے کپ کے کناروں پر انگلی پھیرنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر خوبصورت سی مسکراہٹ سج گئی
تھی اور آنکھوں میں چمک سی آئی تھی۔

”تم آؤ گے تو میں ملواؤں گا سب لوگوں سے۔ بس۔۔۔ آف کورس۔۔۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”مجھے کسی چیز
کے متعلق کوئی کنفیوژن نہیں ہے لیکن شہیار! میں چاہتا ہوں کہ ہر کام تمہارے پورے علم کے مطابق ہو۔
میں کانٹریکٹ اسی وقت سائن کروں گا جب تم یہاں موجود ہو گے۔ تم جانتے ہونا، میں کوئی بھی کام تمہارے بغیر
نہیں کرتا۔“

وہ پھر دوسری جانب سے ہونے والی گفتگو سننے لگا تھا۔ مسکراہٹ بدستور اس کے چہرے کا حصہ بنی ہوئی تھی۔
”میری جان۔۔۔ یہاں آ کر تو دیکھو ہوا پاکستان بھی تمہارے لندن سے کچھ کم نہیں ہے، تم تو یہاں آ کر یہیں کے
ہو گئے ہیں۔ جی جناب! بات ہی کچھ ایسی ہے۔“ وہ پھر زور سے ہنسا تھا۔

”عزیز من۔۔۔ جو کچھ بھی کریں گے آپ کے مشورے سے کریں گے۔ آپ ہی ہمارے مشیر ہیں اور آپ ہی
وزیر۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ جلد سے جلد آنے کی کوشش کرو۔ فلائٹ کنفرم ہو تو مجھے اطلاع کرنا اور بابا جان کیسے ہیں اب؟
کیا کہتے ہیں ڈاکٹر؟“

”چھاب۔۔۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”چلو یار! امید تو ہے نا۔۔۔ اوکے شہیار پھر بات کریں گے
خدا حافظ۔“

اس نے فون بند کیا پھر کچھ سوچتے ہوئے چائے کا کپ اٹھایا۔

ڈرائنگ روم میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں پر کوئی بھی نہیں ہے۔ حالانکہ اس
وقت کئی افراد وہاں موجود تھے۔

ابرار کچھ دیر قبل ہی عمر کو لے کر وہاں سے گیا تھا۔ ہاشم کے چلے آنے سے سب ہی کو اپنی کیفیت پر قابو پانا
آسان ہو گیا تھا۔ سوبانی کے مراحل آسانی سے طے ہو گئے تھے۔

”آپ۔ کیا علم تھے اس بات سے کہ ابرار جیلانی عمر کو لینے کے لیے آ رہا ہے؟“ عباؤ نے گہری سانس بھر کر خاموشی توڑتے ہوئے ہاشم سے پوچھا۔ ہاشم کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ چونک اٹھا۔
 ”ہاں۔ مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں، میں تو ابھی اتفاقاً“ ہی شہلا کو لینے یہاں آ گیا تھا۔ یہاں یہ صورت حال ہوگی میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔“

”کمال ہے، آپ نے آپ سے ذکر نہیں کیا؟“ عباؤ بڑبڑایا۔

”اپنے پر منغل میں وہ ہمیں کم ہی شامل کرتی ہیں۔“ ہاشم دھیسے سے مسکرایا۔ اس کی بات پر منیزہ بیگم اور انقیدم قدرے چونکی تھیں۔ ہاشم کے انداز میں انہیں ہلکی سی شکایت، بے نام سی تلخی موجود تھی۔
 ”بیٹا! ایک گزارش ہے تم سے۔“ منیزہ بیگم بولیں۔
 ”جی آئی! آپ حکم کیجئے۔“ وہ تابعداری سے بولا۔

”کچھ دنوں کے لیے شہلا کو یہاں ہمارے پاس ہی چھوڑ دو۔ اس کا دل بھل جائے گا اور ہماری اداسی بھی خیر ختم کیا ہوگی“ قدرے کم ہی ہو جائے گی۔“
 ”جیسے آپ کی مرضی آئی اور جیسی شہلا کی خوشی۔“ وہ یوں بولا جیسے کسی سوچ میں گم ہو۔ ”میں نے شہلا کو ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ان کی خوشی میرے لیے مقدم ہے۔ جس طرح وہ خوش رہنا چاہیں۔“
 ”جیتے رہو بیٹا! خدا ہمیں خوش رکھے۔“

منیزہ بیگم نے اسے سچے دل سے دعا دی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے کے باہر کھڑی شہلا نے ساری گفتگو سنی تھی۔ ہاشم کے الفاظ پر اس نے بہت غور کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ڈرائنگ روم میں موجود افراد میں سے کسی نے بھی محسوس نہیں کیا تھا کہ اس کے لہجے اور اس کے الفاظ میں ایک ذومعنی سافرق موجود ہے لیکن شہلا نے اس فرق کو بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ بہت کم عرصے میں وہ ہاشم کو بہت اچھی طرح سے سمجھنے لگی تھی۔ اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر ایک سانس بھری۔ عمر کا یوں چلے جانا ہاشم کا بدگمان ہونا۔ اوس۔ اور۔ ابرار کا یوں پُرسین ہونا۔ نجانے تقدیر اس سے کیا چاہ رہی تھی؟ اس نے لاشعوری طور پر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ اسے ابرار کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت یاد آئی۔

”شہلا! تم سب کچھ ہو اس کے لیے۔ اینڈیو نوویری ویل۔ میں کیا چاہتا ہوں۔“ وہ الفاظ ”وہ مسکراہٹ“ وہ ظلم کردہ۔

شہلا کا ذہن کہیں پرے خلاؤں میں بھٹک رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے اس نے گلاسز اتار کر ڈیش بورڈ میں رکھے اور عمر کو دیکھنے لگا۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے، کسی گہری سوچ میں وہ گزرتے مناظر دیکھ رہا تھا۔
 ”عمر۔ مائی سن!“ ابرار نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں بکھرایا۔

”جی ہیا!“

”پہا کی جان۔ مسکراتے نہیں کیا بات ہے؟“
 ”کیسے مسکراؤں پہا۔ میں بہت اداس ہوں۔ مجھے ماما کے آنسو یاد آ رہے ہیں۔“
 ”اوس۔ یہ بات ہے۔“ وہ بھی قدرے سنجیدہ ہوا۔ ”ڈونٹ وری مائی سن! فکر مت کرو۔ تمہارے پہا اتنے ظالم نہیں ہیں کہ ایک بیٹے کو اس کی ماں سے جدا کریں۔“
 ”لیکن ماما اتنا رو کیوں رہی تھیں۔“ وہ اداسی سے پوچھنے لگا۔ ”میں میرا آپ کے ساتھ آنا پسند کیوں نہیں آیا۔ حالانکہ وہ بھی مجھے چھوڑ کر ہاشم انکل کے ساتھ چلی گئی تھیں۔“
 ابرار نے گہری سانس بھری۔

”بسر بیٹا! تمہاری ماما بہت چاری بہت مجبور ہو کر گئی تھیں ان کے ساتھ لیکن اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“
 سب کچھ۔ خوشیاں بہت جلد ہمارے ارد گرد رقصاں ہوں گی۔“

”کیسے پہا۔۔۔“ وہ الجھا۔ ”ایک پرابلم تو یہ بھی ہے کہ اتنے بڑے گھر میں ‘میں’ کیسا کیسے رہوں گا؟“
 ”گیلے کیوں رہو گے۔ پہا جو ہیں تمہارے ساتھ۔“
 ”جب پہا گھر پر نہیں ہوں گے۔ پھر؟“
 ”پھر۔۔۔“ وہ جیسے سے مسکرایا۔ ”مما تو ہوں گی نا۔“
 عمر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا وہ سر جھٹک کر باہر دیکھنے لگا تھا۔

”میرا تو خیال یہ ہے اماں جان کہ میں سیدھے سبھاؤتے معاملہ ان کے ابا جان کے سپرد کروں۔ اپنے سپوت سے خود ہی بات کر لیں گے وہ۔۔۔ اب بتائیں بھلا۔۔۔ میں ایکلی کس کس کو دیکھوں۔ کس کس جھگڑے سے نمٹوں؟ اور ہر ثانیہ کے سسرال والے تاریخ مانگ رہے ہیں۔ وہاں رابعہ کو ناعمہ کی ساس مسلسل فون کر رہی ہے۔ رابعہ مجھ سے پوچھتی ہیں۔ میں کس سے پوچھوں؟“
 عذرا بیگم سخت جھنجھلائی ہوئی تھیں۔ ابھی ابھی شفیقہ حیات نے انہیں رافع سے ہونے والی گفتگو کے متعلق بتایا تھا۔

”غصہ نہ کرو ہوا جوان بیٹوں کے معاملات ایسے ہی بہ حسن و خوبی نباتے ہوتے ہیں۔ ماتھے پر شکن لائے بغیر اور پھر بے جا ایسا کیا کہہ رہا ہے۔ کیوں غصہ کر رہی ہو۔ ابھی نہ سنی، اگلے سال سنی۔ میں خود رابعہ سے بات کر لیتی ہوں۔ ہم نے جب دورہ کو اس سے مانگ لیا تو بس سمجھو لے لیا۔ اسے ورہ کی کیا فکر ستا رہی ہے؟ خوش دلی سے ناعمہ کو رخصت کرنے، وہ پراپوں کا معاملہ ہے اسے نمٹائے، ہم تو سب اس کے اپنے ہیں۔ کے کی تو صرف نکاح کے دو بول پڑھوا کر ورہ کو یہاں لے آئیں گے۔“

”لیکن اماں۔۔۔ سلجوق چاہتے ہیں کہ ایک بیٹی جائے تو ایک ہو آجائے ان کی خواہش ہے یہ اور صحیح کتے ہیں وہ۔ خرچا بھی کم ہو گا اور پھر ثانیہ نے پورا گھر سنبھالا ہوا ہے۔ اس کے جانے کے بعد میں بہت پریشان ہو جاؤں گی۔ ہو کی ضرورت مجھے بھی ہے، ان کا موڈ سخت آف ہو رہا تھا۔ رافع کی گفتگو کے متعلق جان کر۔“

”ایسا ہی ہے تو عریشہ کو لے آؤ۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔

”ہائیں۔“ عذرا بیگم حیران گئیں۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ ایسا کیسے ہوا ہے کہ بڑا بیٹا کیمرہ بنانا چاہتا ہے اور جھوٹا جو ابھی نوکری پر بھی نہیں لگا اس کی شادی کروں؟ پھر رابعہ کیا سوچیں گی؟“

”تمہیں رابعہ کی فکر کیوں ہے ہو؟ رابعہ میری بیٹی ہے، میں اسے تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ وہ کچھ نہیں سوچے گی۔ دراصل یہ مشورہ میں نے اس لیے دیا ہے کہ فردوس بیگم عریشہ کے لیے فکر مند ہیں۔ وہ کچھ بیمار رہتی ہے اور ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ اس کا علاج جلد از جلد شادی ہے۔ نافع نوکری پر نہیں ہے تو کیا ہوا، ہم خدا نخواستہ بھوکوں نہیں مرتے۔“

”عریشہ؟“ عذرا بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔

”پتہ نہیں۔“ پھر وہ بے دلی سے بولیں۔ ”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ کچھ بھی صحیح نہیں لگ رہا ہے۔ جب صحیح ہے نہیں تو کیا خاک لگے گا اور آپ اماں آپ رافع کے بے جا حمایت کر رہی ہیں۔ میں سلجوق سے کہوں گی کہ وہ خود رافع سے بات کر لیں۔ بعض معاملات گھر کے آدمیوں کے بس میں ہی ہوتے ہیں۔ وہی نمٹائیں۔“

”تم بے فکر ہو ہو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری مانو تو نافع سے بات کرو۔ فردوس نے کھلوایا نہ ہوتا تو میں زبان نہ کھولتی۔ ایسا کرنے میں حرج کیا ہے؟ ناعمہ، ثانیہ اور عریشہ کی سہیلیاں ہیں بچپن سے۔ اچھا ہے بیٹوں ساتھ رخصت ہوں خیر۔“

”اور بے چاری ورہ؟“ وہ شکایت سے بولیں۔

”اللہ مالک ہے۔ اگلے برس سنی۔“

”آپ تو امان بالکل نہیں سمجھ رہیں۔ بالکل رافع کی طرح۔“ عذرا بیگم ان سے بالکل مایوس ہو گئیں۔

وہ سخت غم و غصے کی کیفیت کا شکار تھا۔ کسی پچھلے ہوئے شیر کی مانند کمرے میں ٹھل رہا تھا۔ فریجہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے انداز دیکھ کر قدرے سسم سی گئی۔

”کیا بات ہے؟“ ماتھے پر تیوری بال کر اس نے بے رخی سے پوچھا۔

”فراز بھائی۔۔۔ مجھ سے کیوں اس طرح بات کر رہے ہیں۔“ وہ روہاسی ہو کر بولی۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟“

”تم آخر ای کو سمجھاتی کیوں نہیں ہو۔۔۔ وہ تمہاری بات سمجھتی ہیں فریجہ۔“ وہ بسن کا چہرہ دیکھ کر قدرے نرم پڑ گیا۔ ”امی آج تک ہماری ہر بات کو سمجھتی آئی ہیں۔ ہماری بات مانتی آئی ہیں پھر زندگی کے اتنے اہم فیصلے کے متعلق ان کا رویہ اس طرح کا کیوں ہے؟“

”آپ بے شک خفا ہوں بھائی جان لیکن برحق اور جائز بات یہی ہے کہ اس معاملے میں سراسر قصور آپ کا ہے جو کچھ آپ کر رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ آپ خود ہی سوچیں، کہاں کا انصاف ہے یہ؟“

”فریجہ۔۔۔ فریجہ۔۔۔ اہم نہیں جانتیں۔“ وہ اس کے دونوں بازو تھام کر بولا۔ ”وہ لڑکی فراڑ ہے، چیلر ہے۔ یہ درست ہے کہ میں اس کا معصوم اور بھولا بھالا چہرہ دیکھ کر اس کی محبت کا شکار ہو گیا تھا۔ فرسٹ ٹائم میں نے ہی اپروچ کیا تھا اسے لیکن اس نے میری پذیرائی کی۔ میری محبت کو خوش آمدید کہا۔ وہ گھنٹوں مجھ سے فون پر باتیں کرتی تھی۔ بارہا میری محبت کا اقرار کیا اس نے اور۔۔۔ اور جب میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے شادی کا خواہش مند ہوں تو۔۔۔ تو وہ یلکھت پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی۔ میرے فون ریسپونڈ کرنا چھوڑ دیے پھر اپنا نمبر تبدیل کر لیا۔ میں۔۔۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ دیوانہ ہو گیا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر میں وہ نمبر ڈائل کرتا رہتا تھا۔ اس امید پر کہ صرف ایک باس۔۔۔ بس ایک بار وہ اپنی آواز سنا دے۔ مجھے کیا پتا تھا فریجہ کہ وہ لڑکی صرف مشغلے کے طور پر مجھ سے بات کرتی تھی پھر۔۔۔ پھر وہ مجھے شہلا آئی کی شادی میں ملی۔ اس نے جان بوجھ کر مجھے انور کیا۔ یوں ظاہر کیا جیسے وہ مجھے جانتی تک نہیں اور تب میں نے فیصلہ کیا کہ میں اسے اس کے گمے کی سزا ضرور دوں گا۔“

”فراز بھائی! بات چاہے جو بھی ہو لیکن امی کا کہنا بھی سو فیصد بجا ہے کہ اب اس معاملے میں دو خاندان انوالو ہو چکے ہیں جو بھی بات ہوگی وہ بیویں کے درمیان ہوگی۔ معاملہ آپ کے ہاتھ سے نکل چکا ہے یا تو آپ مشکلی سے پہلے ہی یہ ساری بات مجھ سے کر لیتے تو معاملہ اتنا آگے نہ بڑھتا۔ آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ سزا آپ صرف اسے نہیں اس کے پورے خاندان کو دے رہے ہیں اس کی بیوہ ماں کا کیا قصور ہے؟ یا اس کی معصوم بہنوں کا؟“

فراز خاموش ہو گیا تھا۔

”بہر حال۔۔۔ اسے تقدیر کا لکھا۔۔۔ مجھ کو قبول کر لیں۔ اتنا تو طے ہے ناکہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں۔“

”کرنا تھا۔“ وہ پھٹکارا۔

”شادی کے بعد پھر ہو جائے گی۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”نیور۔ میں اس کا حشر کروں گا۔ بتا دینا امی کو۔“

”حشر تو میں تمہارا کروں گی۔“ فرانسہ۔

بیجانہ بیگم کی تیز آواز پر وہ دونوں ہی گھبرا کر مڑے تھے۔ وہ دروازے پر کھڑی شعلہ بار نظموں سے اسے گھور رہی تھیں۔

”فرانسہ۔ میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ اس معاملے میں مجھ سے مت الجھو۔ تم نے اپنی ماں کا لاڈلیا رہی دیکھا ہے۔ غصہ نہیں دیکھا ہے اور نہ دیکھو تو بہتر ہے۔“

”میں بھی آپ کا بیٹا ہوں امی۔“ وہ بے رخی سے بولا۔

”ہوں۔ ٹھیک ہے پھر دیکھتے ہیں کہ ماں جیتے گی یا میاں۔ تم کو گے تو میں، خوشی زہر کھالوں گی پھر تم کسی اور سے شادی کر لینا۔“

”اے۔“ وہ ترپ اٹھا۔ ”خدا کے لیے اپنی ضد کو اتنا آگے نہ بڑھائیں۔ وہ بھی ایک ایسی لڑکی کے لیے آپ خود کو میری جگہ رکھ کر سوچیں تو مار جن ضرور نکل آئے گا۔“

”بیٹا! تم خود کو اپنے مرحوم باپ کی جگہ رکھ کر سوچو۔ تمہیں شاید اندازہ ہو کہ خاندان کی عزت اور بیوی کی زبان کیا ہوتی ہے۔ میں نے اس لڑکی کو اپنی خاندانی انگوٹھی اس لیے نہیں پہنائی کہ اسے اس طرح الزام تراشی کر کے واپس لے لوں۔“ وہ قدرے نرم انداز میں بولی تھیں۔

”فریجہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اب تم اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔ کل ہم تمہاری شادی کی تاریخ رکھنے جا رہے ہیں۔ مجھے تم سے امید ہے کہ تمہاں کو زہر کھانے پر مجبور نہیں کرو گے۔“

وہ بات مکمل کر کے پلٹ گئی تھیں۔ فراز کا بکا بکا کھڑا رہ گیا۔

”فریجہ۔ فریجہ۔“ اس نے ہن کو پکارا۔

فریجہ بھی اس سے نظر چر کر کرے سے نکل گئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے بستر پر نیم دراز سامنے کی دیوار کو گھور رہا تھا۔ دل و دماغ کی کیفیت از حد بہتری کا شکار تھی۔ وہ خود اپنی کیفیات سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا دماغ مسلسل چیخ چیخ کر کچھ کہتا تھا لیکن اس کے دل نے اپنے کان بند کیے ہوئے تھے۔ اس کا دل، دماغ کا کہا بالکل سننا نہ چاہتا تھا۔ سو اس نے کان بند کر لیے تھے۔ لیکن اسے احساس تھا کہ کوئی چیخ رہا ہے۔ کچھ کہہ رہا ہے۔ کچھ بتانا چاہتا ہے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو دبائے لگا۔ سر میں رہ رہ کر دودی لہر اڑتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک منظر واضح ہوا۔ شہلا ابرار کے بالکل قریب کھڑی تھی۔

اس کے دونوں ہاتھ ابرار کے سینے پر تھے۔ ابرار کے ہاتھوں نے ان ہاتھوں کو تھاما ہوا تھا۔

”لے جاؤ اسے۔“ لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ روز بھیجے گا، ہم سے ملنے کے لیے۔“

”اُئی پرامس۔“

شاید اس لمحے ابرار کی آنکھوں میں جو چمک تھی، اس کے چہرے پر جو روشنی تھی، اس کی مسکراہٹ میں جو کیفیت تھی، وہ سوائے ہاشم کے کسی نے محسوس نہ کی تھی۔

لیکن ہاشم اس وقت صرف اور صرف ابرار کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور چہرے سے ہوتے ہوئے اس کی نگاہ ان ہاتھوں پر پڑی تھی ان ہاتھوں پر جو۔

ہاشم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے لگا کہ وہ پاگل ہو جائے گا۔ اسی لمحے اس کے موبائل کی بپ بجی پھر بجتی ہی چلی گئی۔

ہاشم نے تھکے ہارے انداز میں موبائل اٹھایا تھا۔ اسکرین پر رافع کا نمبر دیکھ کر اس نے فون آن کیا۔

”ہاں بھئی۔“ شاعر ایسا ہے۔“ اس نے قدرے بشاشت سے بولنے کی کوشش کی لیکن بری طرح سے ناکام رہا۔ اسے اندازہ ہوا اس کی آواز بھیجی ہوئی تھی۔

”میاں مجنوں، کہاں جوگ لیے بیٹھے ہو؟“ رافع بولا تھا۔ ”اور یہ مطلع ابرار آلود کیوں لگتا ہے صحرا کا۔“

”ہاں۔۔۔“ وہ ہنس اور انگلیوں سے آنکھوں کے گوشے صاف کرنے لگا۔ ”میں۔۔۔ سو رہا تھا۔“

”رور ہے تھے؟“ اس نے جان بوجھ کر غلط سنا۔

ہاشم نے پھر منے کی سعی کی۔

”ہے ناشاعر۔۔۔ قافیہ بندی تو کرے گا۔ بلکہ اسے تک بندی کہتے ہیں۔“

”بندیوں کو چھوڑ خدا کے بندے۔ یہ بتا کہ کہاں ہے۔ مجھے کام ہے۔“

”میں گھر پر ہی ہوں۔“

”اور ڈاکٹر صاحبہ؟“

”کیوں۔۔۔ تجھے وہ انکی لینی ہے؟ ویسے وہ اپنے میکے گئی ہیں۔“

”بیش گڈ۔“ رافع خوش ہوا۔ وہ ”ان“ سے ملنے گئی ہیں تو ہم دونوں مل لیتے ہیں کیا خیال ہے؟“

اب کی بار ہاشم حقیقتاً ہبشاشت سے ہنسنا تھا۔ وہ رافع کا اشارہ سمجھ کر محظوظ ہوا تھا۔

”خیال میری طرح نیک ہے۔ میں ذرا شانور لے لوں پھر آتا ہوں۔“

”میں یارک کی طرف جا رہا ہوں۔ وہیں آجاؤ۔“ رافع بولا۔

”اوکے“ ہاشم نے فون آف کر دیا۔



دونوں بچہ آ بیٹھے تھے۔ رافع نے سراٹھا کر درختوں کے جھنڈ دیکھے اور ان پر منڈلاتے خوش نما پرندے ان کی آوازیں دل کو بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

”ہاشم۔۔۔ یا۔۔۔ ایک مشورہ لینا چاہتا ہوں اسی لیے تکلف دی ہے تجھ۔“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”ضرور لو مشورہ۔ لیکن ایسے معاملات میں مشورے صرف نئے جاتے ہیں دل

صرف اپنی کروا تا ہے۔“

رافع نے چونک کر اسے دیکھا۔

”تم سمجھ گئے ہو۔“

”ظاہر ہے اس شیخ سے بخیر و خوبی گزرا ہوں لیکن رافع یا راہیہ دل بہت بے کار چیز ہے۔ کم بخت کو نکال کر باہر

پھینک دے آدمی۔“

”یہی تیرا مشورہ ہے؟“ رافع نے اسے گھورا۔

”نہیں۔“ وہ آزر دگی سے بولا۔ ”یونہی ایک خیال تھا سو پیش کر دیا۔“

”ہاشم۔۔۔!“ رافع دور دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یارا پیلے صرف ایک احساس تھا پھر۔۔۔ وہ احساس قدرے واضح ہوا“

خیال بنا پھر حقیقت اور اب حقیقت نے شدت اختیار کر لی ہے۔ تم ٹھیک کہتے تھے ہاشم! اس حقیقت سے فرار

ممکن نہیں ہوتا۔ اب بتاؤ کیا کروں؟ اس دل کی بس ایک رٹ ہے۔ اے پانا ہے اے پانا ہے اے پانا ہے۔“

اس نے گری سانس بھر کر اپنا سر بچ کی پشت سے ٹکایا۔

”دوسری جانب گھر میں ثانیہ کی شادی کے ساتھ ہی میری اور وردہ کی شادی کی بھی بات چھڑ گئی ہے۔ امی چاہتی

ہیں کہ دونوں فرانسس ساتھ ادا کر دیے جائیں۔ میرے پاس انکار کے لیے کوئی محسوس وجہ نہیں ہے ہاشم! میں گھر

والوں کا دل توڑنا بھی نہیں چاہتا۔ میں۔۔۔ میں وردہ کا دل توڑنا بھی نہیں چاہتا۔ بتاؤ کیا کروں؟“

”ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”چار کی گنجائش ہے غور کرو۔“

”ہاشم!“ وہ غصے سے بدک گیا۔ ”بی سیر لیس۔“

”اچھا۔۔۔ ویسے میرا دل چاہ رہا ہے رافع! میں خوب ہنسون مذاق کروں۔ ہم دونوں مل کر سگریٹ پیئیں۔“

یہی چلا جاؤں۔“

رافع اسے حیرانی سے دیکھنے لگا۔ اسے ہاشم کی دماغی حالت پر شک گزرا۔

”ہاشم! آریو آل رائٹ۔“

”ہاں نہیں۔“ پھر اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ ”ہوں! اب بات کرتے ہیں۔ اچھا تو یہ معاملہ

ہے۔ دیکھو رافع! ان تمام باتوں سے بڑے بھی ایک بات ہے اور وہ یہ کہ ریجہ کیا چاہتی ہے۔“

رافع کچھ دیر کے لیے خاموش ہو کر سوچنے لگا تھا۔

”میرا خیال ہے ہاشم! وہ بھی پسند کرتی ہے مجھے۔“

”صرف خیال؟“

”ظاہر ہے“ اقرار وغیرہ کی نوبت تو کبھی آئی نہیں۔ خیال ہی پیش کر سکتا ہوں۔“

”اگر ایسا ہے تو وردہ کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ وہ بڑھی لکھی، سمجھ دار لڑکی ہے۔ اسے وقتی طور پر دھچکا ضرور لگے گا لیکن پھر جلد ہی سنبھل جائے گی لیکن پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ربیعہ کیا چاہتی ہے۔ کیا وہ تمہارا ساتھ دینے پر آمادہ ہے۔“

”وہ وردہ کی بہترین سہلی ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ آسانی سے اس بات پر رضامند ہوگی۔“

”ہوں۔۔۔“ ہاشم سوچنے لگا تھا۔ ”پھر اس کا ایک اور حل ہے۔“

”وہ کیا؟“ رافع نے اسے دیکھا۔

”تم ڈائریکٹ وردہ سے بات کرو۔ یہ مسئلہ اس سے ڈسکس کرو۔ دیکھو وہ کیا کہتی ہے۔“ رافع اسے بری طرح سے گھورنے لگا تھا۔

”ہاشم! میرا خیال ہے تجھے سگریٹ پینے کی ضرورت نہیں تھی لگتا ہے کہ تو کچھ اور بی کر آیا ہے۔ یہ آج کیسی باتیں کر رہا ہے تو۔۔۔ یعنی میں وردہ سے پوچھوں کہ وہ کیا کہتی ہے؟ کیا اسے میرا اپنی سہیلی سے اظہار محبت پسند آئے گا یا نہیں؟ اور وہ خوشی ہمیں شادی کی اجازت دے گی یا نہیں؟“ ہاشم کان کھجانے لگا۔

”اچھا۔۔۔ تو پھر پہلے ربیعہ سے اظہار محبت کرو۔ دیکھو۔۔۔ وہ کیا کہتی ہے۔ کمال ہے، کسی نہ کسی سے شروعات کرنا ہی ہو گئی تھی۔ وردہ سے نہیں تو ربیعہ سے اور کیا عمل نکل سکتا ہے بھلا؟“

”تم۔۔۔ تم۔۔۔ شہلا بھابھی سے کیوں نہیں کہتے۔“ رافع مدھم سا بولا تھا۔

”کیا؟“ ہاشم چونک اٹھا۔ ”شہلا سے کیا کہوں؟“

”وہ۔۔۔ وہ میری ٹھیک ٹھیک مدد کر سکتی ہیں۔ ربیعہ کیا چاہتی ہے کیا نہیں۔ شہلا بھابھی اس کے دل کا حال معلوم کر کے بتا سکتی ہیں مجھے۔“

”اھ۔۔۔“ ہاشم نے دل میں سوچا۔ ”اور شہلا کیا چاہتی ہے، مجھے کون بتائے گا۔“

”کیا سوچنے لگے؟“ رافع نے اسے ٹھوکا دیا تھا۔

”ہاشم چونک اٹھا تھا اس نے پُرسوج انداز میں رافع کا چہرہ دیکھا۔

”تم ربیعہ تک اپنا اظہار پہنچانا چاہتے ہو؟ شہلا کی مدد سے؟“

”نہیں۔۔۔“ رافع نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں شہلا بھابھی سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ وہ ربیعہ سے بات کر کے

دیکھیں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ کیا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے یا یہ صرف میری خام خیالی ہے۔ اگر ربیعہ بھی

اپنے دل میں وہی جذبات رکھتی ہے جو کہ میرے دل میں ہیں تب تو بات بن سکتی ہے۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ وردہ کے

معالے پر گھر والوں سے بات کر سکتا ہوں لیکن اگر ربیعہ۔۔۔ ربیعہ۔۔۔ ایسا بالکل نہیں چاہتی۔ اگر وہ اس موضوع

پر بات تک کرنا نہیں چاہتی تب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں خاموشی سے۔۔۔“

”وردہ سے شادی کر لوں گا۔“ ہاشم نے جملہ مکمل کیا۔

”نہیں۔“ رافع آزدی سے بولا۔ ”نہیں ہاشم۔! پتہ نہیں میں ایسا کر سکوں گا یا نہیں۔ یا ر! وردہ اچھی لڑکی

ہے، کہیں اس کے ساتھ نا انصافی نہ ہو، بے ایمانی نہ ہو۔ میں۔۔۔ میں ساری زندگی اس کی آنکھوں میں کسی اور کی

نظر میں تلاش کروں۔ میں۔۔۔ میں شاید خاموشی سے کہیں چلا جاؤں گا۔ مزید پردھانی کے لیے یا پھر نوکری کے

لیے۔“

”پاکل ہوا ہے۔“ ہاشم حیران رہ گیا۔ ”اتنا جذباتی ہو رہا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ کچھ دنوں سے بہت جذباتی ہو رہا ہوں۔ جس ڈور سے بندھنا نہیں چاہتا تھا، اسی میں بری طرح الجھ گیا

ہوں۔ جتنا ہاتھ چیرتا ہوں اتنا ہی پھٹتا چلا جاتا ہوں۔ یا رافع! کچھ کرنا۔
 ہاشم! افسردگی سے مسکرایا تھا اسے نجانے کیا کچھ یاد آگیا تھا۔
 ”یا رافع! کچھ کہوں گا تو تجھے ایسا لگے گا جیسے۔۔۔ جیسے میں تجھے مس گائیڈ کر رہا ہوں، راہ کھولتی
 تیری۔۔۔ لیکن حقیقت یہ ہے رافع کہ دل کا سکون انسان کی قیمت میں لکھا ہوتا ہے یا نہیں۔ یا نہیں ہے۔۔۔
 بس! بانی سب دایہ کے ہسلاوے ہیں۔ یہ محبت۔۔۔ بلکہ افلاطونی قسم کی محبت۔۔۔ کس قدر جلد ایک دھونگ ثابت
 ہوتی ہے۔ انسان فرشتے سے پھر انسان بن جاتا ہے۔ اس کی چاہ میں فرق آجاتا ہے۔ تمنا کا رنگ بدل جاتا ہے
 پھر۔۔۔ پھر اکثر تمنا پھیلی پر اتر آتی ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ یہ قوس وقزح جیسی تمنا تو ایک سراب تھی۔ صحرا کا
 ہسلاوا تھی۔“

رافع سب کچھ یکسر بھلا کر ہاشم کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ ہاشم نجانے کس رویں بہا ہوا تھا۔ رافع کی موجودگی سے
 یہ نیاز بس بولتا چلا جا رہا تھا۔

”اور۔۔۔ اور رافع! پتا ہے صحرا کا بنیادی وصف کیا ہے؟ پیاس۔۔۔ پیاس ہے صحرا کی پہچان، صحرا کی صفت۔۔۔
 تو بس رافع۔۔۔ تمنا کا انجام ہے پیاس۔۔۔ چاہے وہ آسمان بن کر یا قوس وقزح بن کر چمکے، چاہے پھیلی پر اتر
 آئے چاہے انسان اس کے پیچھے بھاگے، چاہے آگے۔۔۔ بس پیاس ہی پیاس مقدر ہے۔۔۔ تو پیارے۔۔۔“
 اس نے رافع کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا۔

”تمنا مت کرو۔۔۔ مت کہ۔۔۔ بچ اس سے۔۔۔ یہ محبت بن کر فریب دیتی ہے۔ خوشی کے نئے معنی سمجھاتی
 ہے بے سکونی کے ڈراوے دیتی ہے لیکن انت اس کا پیاس۔۔۔ جو زندگی خود سے دے رہی ہے خوشی خوشی لے
 لے۔۔۔ مزے میں ہے گا۔“

”ہاشم! رافع نے اسے آہستگی سے پکارا، وہ چونک اٹھا۔
 ”کیا بات ہے میرے یار!“ رافع نے نرمی سے پوچھا۔ ”تو مجھے بہت دسٹرب لگ رہا ہے۔ اپنی پرالیم؟ تو تو ہر بات
 مجھ سے شیعہ کرتا تھا۔“

”آل۔۔۔ ہاں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔“ وہ انگلی اور انگوٹھے سے آنکھیں صاف کرنے لگا۔ ”میں تو یونہی خطابت کے
 موڈ میں آگیا تھا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔“

”چلو ایسا ہی ہو گا۔“ رافع مسکرایا۔
 ”میں چلوں اب۔“ ہاشم اٹھ کھڑا ہوا۔
 رافع بھی اس کی تقلید میں اٹھا تھا۔

”تو پھر طے یہ پایا کہ میں شہلا سے ربحہ کے دل کی بات معلوم کرنے کے لیے کہوں گا۔ اگر وہ بھی یہی چاہتی ہے
 تو گھر میں یہ ایسا اٹھایا جائے گا۔ بصورت دیگر تو خاموشی سے وردہ سے شادی کر لے گا۔“

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔“ رافع نے خفگی سے اسے دیکھا۔
 ”لیکن میں ایسا ہی کہہ رہا ہوں کیونکہ میں یہی چاہتا ہوں۔“ ہاشم نے انگڑائی لیتے ہوئے عام سے انداز میں کہا
 تھا۔ ہر چند کہ یہ ایک خاص بات تھی۔

”ایقان۔۔۔ ایقان۔۔۔ میری بچی۔۔۔ آنکھیں کھول دے۔۔۔ بیٹا! سن رہی ہے ناں کی بات۔۔۔“ شفیقہ حیات
 نے بے حد محبت سے اسے پکارا تھا۔ ایقان نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تھی۔

”اماں۔۔۔ اماں۔۔۔ میرے بچے۔۔۔ میرے بچے کہاں ہیں؟“
 ”میں نافع لے گیا ہے پارک۔۔۔ تیری طبیعت دیکھ کر وہ بیچارے روہانے ہو رہے تھے۔ نافع انہیں گھمانے
 پھرانے لے گیا ہے۔ ابھی آجائیں گے۔“

انہوں نے اسے چکارا بھرا تھے پر ہاتھ رکھ کر بخار کی حدت کا اندازہ لگانا چاہا۔

”مسکریے خدا کا۔۔۔“ ان کے منہ سے نکلا تھا۔ ”آج تیسرے دن بخار اُترا ہے۔“
 عذرا بیگم نے ان کی بات سن کر ایقان کی کلائی تھام کر دیکھی۔
 ”ٹھیک کرتی ہیں آپ۔“ وہ بھی مطمئن ہوئیں۔ ”۲۲ ترگیا ہے بخار۔۔۔ نجائے کیسا بخار تھا۔ نہ کوئی نزلہ زکام نہ
 گلا خراب نہ اور کوئی شکایت پھر بھی ایک سو چار ایک سو پانچ بخار تھا اسے۔ مانو بے ہوش پڑی رہی ہے مین
 دن۔“

”اماں۔ اماں۔! میں۔ میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں کروں گی۔“ وہ بڑبڑائی۔
 ”ہائیں۔ کیا کہہ رہی ہے؟“ انہوں نے کان لگا کر سنا۔
 ”اماں۔ اماں۔! اس کے لیے۔ کیا نہیں کیا میں نے۔۔۔ عمر لگا دی اس کی تمنائیں۔ اپنا سب کچھ دے دیا۔
 کیا رہ گیا میرے پاس۔“

شفیقہ حیات نے پریشان نظروں سے عذرا بیگم کو دیکھا۔ وہ ہولے سے مسکرائی تھیں۔
 ”جن باتوں پر جی ہی جی میں کڑھتی رہتی ہے، وہی بول رہی ہے۔ کبھی نہ کبھی تو دل کا غبار نکلے گا نا۔ نکلے دیں نہ
 روکیں اسے۔“

”ایقان۔“ شفیقہ حیات اس پر جھکیں۔ ”میری بچی۔! نہ کڑھ۔ نہ کڑھ ایسے وقت کی سب طنائیں ابھی
 تیرے ہاتھ میں ہیں۔“
 ”اماں۔ میں۔ میں خالی رہ گئی۔ وہ ویسے کا دیا رہا۔ اماں۔! ایسا کیوں ہوا؟! اس پر وقت بے اثر ہو گیا
 اور۔۔۔ اور ہم سر پائیدل گئے۔“

”ہائے عذرا۔! یہ کیا اول فول بک رہی ہے۔“ شفیقہ حیات بے طرح گھبرائیں۔ ”کہیں بخار اس کے دماغ پر تو
 نہیں چڑھ گیا۔“

”ایقان۔ ایقان۔! عذرا بیگم نے اسے نرمی سے پکارا تھا۔ ”اٹھو۔ پانی پی لو۔ اٹھو شہابش۔“
 ”بھابھی بیگم۔۔۔“ وہ کراہی۔ ”بھابھی بیگم۔! میں۔ میں سمجھتی تھی وہ بہت۔ بہت چاہتا ہے مجھے۔“
 ”آہ۔ ہا۔“ انہوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”پجاری عورت ہے نا۔۔۔ اوپر سے کتنا ہی مضبوط بن لے اندر
 وہی چاہے جانے کی خواہش دل کے جھولے میں پڑی ہے۔“

”ٹھیک کرتی ہو عذرا تم۔ یہ عاشق کو یاد کر رہی ہے۔ میرا خیال ہے عذرا۔! یہ موقع اچھا ہے، تم رافع سے کہہ
 کر عاشق میاں کو فون کرواؤ۔ اسے اس کی حالت کا بتاؤ وہ بھی چاہتا ہے اسے۔ سن کر وہ نہ سکے گا۔ کیا خبر بگڑتی
 ہوئی بات بن جائے الجھا ہوا مسئلہ سلجھ جائے۔“

”اماں۔ اماں۔“ وہ ہنوز بڑبڑا رہی تھی۔ ”اماں! مجھے کاغذ لا دو۔ اماں۔ کاغذ لا دو مجھے۔ اسے کوا اماں!
 پنجرہ کھولے۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔“

”خدا را۔“ وہ دونوں اب حقیقتاً ”پریشان ہوا تھیں۔
 ”میرا خیال ہے اماں! پہلے ہمیں ڈاکٹر کو بلا لینا چاہیے۔ یہ اپنے ہوش و حواس میں آئے گی تو عاشق سے بات
 کرے گی نا۔ ایسی حالت میں بھلا وہ بھی اس سے کیا بات کر سکتا ہے؟“
 ”چلو۔ ایسا کر لو۔ فون کرو ڈاکٹر سلطان کو۔ وہ خود آکر چیک آپ کرے اس کا۔ کسی چھوٹے ڈاکٹر کو نہ بھیج
 دے۔“

وہ متفکری ہو کر ایقان کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔ عذرا بیگم تیزی سے فون کی جانب بڑھی تھیں۔

”شہلا آئی۔! رعبہ نے کمرے میں جھانکا۔ ”کھانا کھائیں۔“
 شہلا صوفے پر بیٹھی نجائے کس سوچ میں گم تھی۔ اس نے جیسے رعبہ کی بات ہی نہ سنی۔ رعبہ چند لمحے اس

کے جواب کی منتظر رہی پھر اندر چلی آئی۔

”شہلا آئی! وہ اس کے قریب آ بیٹھی۔

”آل“ وہ چونکی۔ ”ہاں۔۔۔ ربیعہ۔۔۔ بولو۔“

ربیعہ نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ دونوں میں ہی اس کی رنگت کلا گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ شکن آلود لباس میں وہ کئی دنوں کی بیمار نظر آرہی تھی۔

”شہلا آئی! اتنی ٹینشن نہ لیں۔ پلینز۔“ ربیعہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ ہمت سے کام لیں اور پھر عمر تو خوش ہے۔ اس کا فون آیا تھا۔ چمک رہا تھا۔ ابراہیمائی نے اسے اتنے کھلونے لے کر دیے ہیں کہ وہ ہم سب کو بھولا بیٹھا ہے۔“

”لیکن میں تو اسے نہیں بھول سکتی۔“ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میرے پاس تو دل بہلانے کو اسے چند لحوں کے لیے بھی بھولنے کو ایک بھی کھلونا نہیں ہے ربیعہ! ایک بھی کھلونا نہیں ہے۔“

وہ سک اٹھی۔ ربیعہ نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔

”ایسے نہ کریں شہلا آئی!“ وہ افسردگی سے بولی۔ ”ایسے نہ کریں پلینز۔ ہم سب آپ کو دکھی دیکھ کر مزید اداس ہو رہے ہیں۔ امی۔ عباد بھائی۔ انفقہ۔۔۔ میں۔۔۔ ہم سب اداس ہیں۔ پلینز شہلا آئی! ہم سب کے لیے ن سہی لیکن خود کو بہلانے کی کوشش تو کریں اور عمر کل آئے گا ہم سے ملنے۔ اس نے وعدہ کیا ہے۔“

”تم نے ربیعہ! کبھی تصور کیا تھا کہ اس گھر میں عمر نہ ہو۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”وہ۔۔۔ وہ یہاں پیدا ہوا۔ ہم سب کے بازوؤں میں کھیل کر اتنا بڑا ہوا وہاں سیڑھیوں پر وہ اپنا بال پکڑتا پھرتا تھا۔ باہر لان میں اس کا سائیکل خالی پڑا ہے۔ اس کا ویڈیو۔۔۔ ہم۔ اس کا کمپیوٹر۔۔۔ سب۔۔۔ سب خالی، اداس، بے جان ہیں۔ اس کے بغیر تو میں تو۔۔۔ میں تو اس کی ماں ہوں ربیعہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں سب سے زیادہ خالی۔۔۔ سب سے زیادہ اداس۔۔۔ سب سے زیادہ بے جان ہوں۔“

ربیعہ نے گہری سانس بھری۔

”میں۔۔۔ میں نہیں رہ سکتی اس کے بغیر۔۔۔ وہ جانتا ہے ربیعہ!“

”جی۔۔۔؟“ ربیعہ چونکی تھی۔ ”کیا مطلب شہلا آئی!“

شہلا نے خود کو سنبھالا پھر دھڑکے کوٹنے سے آنسو صاف کرنے لگی۔

”ایسے تو آپ بیمار پڑ جائیں گی آئی!“

”میں۔۔۔ صحت مند کب ہوں ربیعہ! میری روح کو بیماری لگ گئی ہے۔ تم دیکھنا میں مر جاؤں گی۔“

”خدا نہ کرے۔“ ربیعہ بے ساختہ ہی بولی۔

اسی لمحے منیزہ بیگم کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ شہلا نے انہیں دیکھ کر بال سنوارنا چاہا۔

”شہلا۔۔۔“ وہ پریشانی سے بولیں۔

”جی۔۔۔ جی امی۔۔۔!“

”بٹا۔۔۔! کھانا نہیں کھاؤ گی؟“

”میں۔۔۔ میں آتی ہوں۔۔۔ آپ چلیں۔“

منیزہ بیگم نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آواز اس کا چہرہ اس کا انداز سب ہی اس کی حالت کی چغلی کھا رہے تھے۔ انہوں نے بے بسی سے سانس بھری۔

”شہلا۔۔۔ میری بیٹی۔! زندگی میں بہت سی باتوں پر اختیار نہیں ہوتا۔ زندگی سے نجانے کیسے کیسے اور کتنے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔“

”جی امی۔! مجھتی ہوں میں۔۔۔ لیکن۔۔۔ لیکن یہ مامتا۔ اس سے کیا کہوں۔“

”ہر جذبے کو قرار آجاتا ہے شہلا۔“ وہ جیسے سرگوشی میں بولی تھیں۔ ”ہر جذبے کا وقت سامیہ کون ہے بھلا؟“

شہلانے چونک کر انہیں دیکھا، وہ کچھ دیر ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔
”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔“ پھر وہ بولی تھی۔

”کہاں جا رہی ہیں امی۔!“ ورنہ رابعہ بیگم کو باہر کی جانب بڑھتا دیکھ کر ان کے پیچھے دروازے تک آئی تھی۔
”ماں کا پیغام آیا تھا، ایتقان کی طبیعت خراب ہے، اسی کو دیکھنے جا رہی ہوں۔“ وہ مزے۔ ”تم بھی چلو۔“
”چھا۔“ اس نے لمحہ بھر کو سوچا۔ ”اچھا ٹھیک ہے، میں چلتی ہوں۔ ناعمہ سے کہتی ہوں، وہ روٹیاں ڈال لے گی۔“
”آجاؤ پھر۔“ وہ باہر نکل گئی تھیں۔

ورنہ لٹے قدموں کمرے میں آئی، جہاں وہ کتابیں بکھرائے بیٹھی تھی۔
”ناعمہ! میں اور امی ایتقان خالہ کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ تم روٹیاں ڈال لو۔ مڑ قیسم میں لے نکالیا ہے دم پر رکھا ہے۔ چلو ایسا دے بند کر دینا۔“
”جی اچھا۔ آپ جائیں۔“ وہ مصروف سے انداز میں بولی۔
”مے میں ہر ادھیا بھی ڈال دینا۔“
”ٹھیک ہے۔“

ورنہ نے ایک نظر اس کی مصروفیت پر ڈالی پھر باہر نکل گئی۔ ناعمہ دروازہ بند کرنے کے خیال سے چند لمحوں بعد اٹھی تھی۔

دروازہ بند کر کے وہ کمرے کی طرف آ رہی تھی جب فون کی بیل بجی۔ اس کا دل دھڑکا تھا۔ آج کل ہر بیل پر اس کا دل دھڑک اٹھتا تھا۔ خواہ وہ دروازے کی ہو یا فون کی۔ فون تک اگر وہ مزید پریشان ہوئی۔ یہی ایل آئی بتا رہا تھا کہ فون کس کا تھا۔ ناعمہ چند لمحے کھڑی ہاتھ ملتی رہی لیکن بیل بند ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ ناچار اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔
”ہیلو۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”فراہیات کر رہا ہوں۔“ ادھر انداز جا رہا تھا۔
”جی۔ جی کہیے۔“

”میں نے وہ جواب سننے کے لیے فون کیا ہے جو آپ پر ادھا رہا تھا۔“ وہ تیزی سے بولا۔
”آج آپ مجھے بتائیں گی کہ آپ نے میرے ساتھ چیٹنگ کیوں کی تھی۔ کیا آپ کے پیش نظر مجھے جو قوف بنانا مقصود تھا؟ یا پھر آپ کے لیے وہ وقتی تفریح کے لمحات تھے؟ یا پھر آپ ایک ہی وقت میں مختلف نمبرز پر بات کرتی ہیں۔ کبھی اس سے کہی، کبھی اس سے؟ مجھے آج اپنے سوال کا جواب درکار ہے۔ ہر حال میں سچا اور کھرا جواب، کیونکہ آپ کے جواب پر میری زندگی کے بے حد اہم فیصلے کا دارومدار ہے۔“
ناعمہ کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس قدر مشکل صورت حال کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ بات بنانا کار دشوار تھا۔

”میں۔ میں نے کہا تھا نا۔ مجبوری تھی۔“ اس نے تھوک نگلا۔
”وہی مجبوری جاننا چاہتا ہوں۔ بتاؤ مجھے، ایسی کیا مجبوری تھی تمہارے ساتھ کہ تم مجھے تسلی کے دو لفظ تک نہ کہہ سکیں۔ تمہارے گھر سے وہ نمبر ختم کروا گیا۔ تم نے دو سرائمر لے لیا پھر بھی پلٹ کر کبھی مجھے فون نہیں کیا۔ بولو کیوں؟ جواب دو؟“
”میں۔ میں نہیں بتا سکتی۔“ وہ روہانی سی ہو گئی۔

”تمہارے اس جواب سے میں کوئی بھی نتیجہ اخذ کر سکتا ہوں اور ناٹنٹی ناٹن پر سنٹ نتائج تمہیں دھوکہ باز ثابت کرتے ہیں۔ دو نمبر لڑکی۔“ وہ غرایا۔
 ناعمہ نے بے بسی سے سانس بھری۔
 ”نہیں بچہ! نہیں۔۔۔ میں نے۔۔۔ میں نے دھوکا نہیں کیا۔“
 ”محبت کی تھی مجھ سے؟ جیسی میں نے کی؟“
 ”ہاں۔“ وہ شگفتگی سے بولی۔ ”کی تھی لیکن۔۔۔ لیکن جیسی آپ نے کی تھی۔ اس سے کہیں بڑھ کر۔“
 اس کے ذہن میں عریشہ کی متورم آنکھیں تھیں، مہرہ لب احتجاج تھا جو سوائے لبوں کے رو میں رو نہیں سے ظاہر ہوتا تھا۔

”اوہ۔۔۔ وہ طنز سے ہنس دیا۔ ”ریلی؟ وہاٹ آجوک مس ناعمہ!“
 ”یہ مذاق نہیں ہے فراز! حقیقت ہے۔ چاہے آپ مائیں یا نہ مائیں۔“
 فراز چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔
 ”میں۔۔۔ میں یہ ایکیج منٹ تو زنا چاہتا ہوں ناعمہ۔“ پھر وہ بولا تھا۔ ”میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ منگنی اس کھیل کا جواب تھی جو تم نے میرے ساتھ کھیلا۔ ہر چند کہ تمہارا اصرار ہے کہ تم فٹیو تھیں۔ تاہم میں اس بات سے انکار کرتا ہوں۔ تم چشمو ہو۔ دو نمبر لڑکی اور میں۔۔۔ میں تم جیسی لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا۔“
 ناعمہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
 ”جیسی آپ کی مرضی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں ایک نمبر ہونے پر اصرار نہیں کرتی۔ آپ خوش ہو جائیں۔“

فراز نے غصے سے سانس کھینچی تھی۔
 ”تم۔۔۔ تم۔۔۔ آئی ول شوٹ یو۔“
 ناعمہ خاموش کھڑی رہی۔ اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔
 ”تمہیں۔۔۔ تمہیں خود اس شادی سے انکار کرنا ہو گا مس ناعمہ۔“ پھر وہ بولا۔ ”اپنے گھر والوں سے کہو کہ وہ اس شادی کے لیے میرے گھر والوں سے معذرت کر لیں۔“
 ”میں۔۔۔“ وہ گھبرا گئی۔ ”میں بھلا کیسے کہہ سکتی ہوں؟“
 ”جیسے مجھ سے محبت کے اقرار کیے تھے۔“ وہ طنز سے بولا۔ ”ان ہی لبوں سے کہو جن سے تمہیں جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن میرے پاس کیا جواز ہے اس انکار کے لیے؟“
 ”جواز گھڑنے تو تمہیں خوب آتے ہیں۔ ایسی ہی کسی خود ساختہ مجبوری کا رونا رولو۔“
 ”دیکھیں فرانس! پلیز۔“ وہ رونے والی ہو گئی۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتی۔“
 ”تب نا بد رکھنا۔ میں تمہاری زندگی عذاب بنا دوں گا۔ شادی کی رات سے قبر کی رات تک۔۔۔ تم ہر رات روؤ گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔“
 ”فرانس۔ فراز پلیز۔“ ناعمہ کی روح تک کانپ گئی تھی۔
 ”میں بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے اسے استعمال کرو۔ مجھ سے شادی سے انکار کرو، بالکل واضح اور دو ٹوک انکار۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن آپ مجھ سے ایسا کیوں چاہتے ہیں؟“ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور آواز بھی۔
 ”اس لیے کہ میں نے تمہارے لیے یہی سزا تجویز کی ہے اور تم نے کہا تھا کہ تم ہر سزا کے لیے تیار ہو۔ ناؤ۔ پروو یور ورڈز۔“

دوسری جانب سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا۔ ناعمہ کھلی آنکھوں سے دیوار کو تکتے ہوئے اپنے دل کی آوازیں سن رہی تھی۔



”مجھے یہ کسی ذہنی شاک کے زیر اثر لگ رہی ہیں۔“ ڈاکٹر نے رافع کے کاندھے پر بازو رکھ کر اسے کمرے کے دروازے سے کچھ دور کیا۔ ”کوئی مسئلہ ہے ان کے ساتھ؟“

”مسئلہ“ رافع دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”مسئلہ تو ہے ڈاکٹر صاحب! پچھو کے اپنے ہینڈ سے کچھ اختلافات چل رہے ہیں لیکن یہ کوئی بہت نئی یا اچانک ملنے والی خبر نہیں ہے جو شاک ثابت ہو۔ یہ تو پرانا مسئلہ ہے۔“

”پھر بھی... ان کی ذہنی کیفیت یہی کہہ رہی ہے۔ بہر حال انجکشن میں نے لگا دیا ہے، ان کے اعصاب قدرے پرسکون ہو جائیں گے۔ سو کر انھیں گی تو بہتر محسوس کریں گی۔ بخار تو ویسے بھی اتر ہی گیا ہے پھر بھی دو ادویات کئی نیو کریں گے۔“

”جی ڈاکٹر صاحب! تھینک یو۔“

”میں اب چلتا ہوں۔ انہیں خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ شاید انہوں نے بہت ٹینشن لے لی ہے۔“

”تھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔

”رافع... شفیقہ حیات کی آواز پر وہ چونکا۔“

”جی دادی جان...“ وہ اندر کی جانب بڑھتا تھا۔

”کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر! تمہیں باہر کیوں لے گیا؟“ انہیں تشویش تھی۔

”کچھ نہیں دادی جان! اچھو پھول لکل تھیک ہیں۔ صرف ٹینشن ہے اور کچھ نہیں۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

ایقان انجکشن کے زیر اثر اب گہری نیند سوچکی تھی۔ اس کے تنفس کا مدو جز اس کی پرسکون نیند کا غماز تھا۔

”میرا خیال ہے بہت ہو چکا۔“ رافع ایقان کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اب ہمیں اس مسئلے کے سنجیدہ حل کے لیے کچھ کرنا ہی ہو گا۔“

”میں اور تمہاری دادی بھی یہی بات کر رہے تھے۔“ عذرا بیگم نے تائید کی۔ ”ذرا سی ضد کے پیچھے اپنا گھر خراب کر رہی ہے۔ رافع! تم عاشر میاں سے بات کرو۔ دیکھو، وہ کیا کہتے ہیں۔ اگر وہ مسئلہ سلجھانا چاہتے ہیں تو ہم سب مل کر ایقان کو مجبور کرنے کی کوشش کریں گے۔“

”نہیں امی!“ اس نے سر ہلایا۔ ”عاشر بھائی! اگر واقعی مخلص ہیں تو انہیں خود پچھو کو منانا پڑے گا۔“

”تم عاشر سے بات کرو۔“

”جی... رات کو کرتا ہوں۔“

اسی لمحے اس کے سامنے چائے کی ٹرے آگئی تھی۔ رافع نے چونک کر سر اٹھایا۔ دروازے پر کھڑی تھی، وہ حیران ہوا۔ اس کے علم میں نہیں تھا کہ دروازہ بھی وہیں ہوگی۔

”تھینک یو۔“ اس نے نظریں چرا کر آہستگی سے کپ اٹھالیا۔

دروازہ ٹرے لے کر آگے بڑھ گئی۔ رافع کا نظر چراٹا اس نے بے حد واضح طور پر محسوس کر لیا تھا۔ وہ ایک عرصے سے ان نظروں کو پڑھ رہی تھی۔ پہلے ان میں ایک خوش دلی، شناسائی اور اپنائیت کا جو جذبہ ہوتا تھا، عرصے سے اس کی جگہ اجنبیت اور بے دلی نے لے رکھی تھی۔ دروازہ جیسی حساس لڑکی کے لیے یہ تبدیلی اتنی غیر اہم نہ تھی کہ وہ اسے محسوس ہی نہ کرتی۔ سب کو چائے دے کر وہ کچن کی جانب بڑھ رہی تھی جب اچانک رافع نے اسے پکار لیا۔

وہ ٹھگ کر رہی۔ اس آواز میں اپنا نام اس نے بہت عرصے بعد سنا تھا۔
”جی۔“ وہ مڑی۔

”تم۔۔۔ یونیورسٹی نہیں جا رہی آج کل؟“

”پندرہ دن کی چھٹیاں ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

واقع نے پھر کوئی سوال نہ کیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اب اس کے پاس کرنے کے لیے کوئی اور سوال نہ تھا۔

نجانے کس احساس کے تحت اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے ذرا سا اٹھ کر دیکھا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے کمرے کے عین سامنے جو کمرہ تھا، اس کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ابراہار اپنے بیڈ پر سبے آسانی عمر کا بیڈ دیکھ سکتا تھا۔

اس نے دیکھا، عمر اپنے بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔ تکیہ گود میں رکھ کر اس پر کہنیاں ٹکا کر اس نے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھا ہوا تھا۔

ابراہار کے کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی تھی لیکن عمر نے کمرے کی لائٹس آن کی ہوئی تھیں، وہ بستر سے اتر کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھا تھا۔

”عمر، ہائی سن۔۔۔“ وہ اس کے قریب آ بیٹھا۔ ”کیا بات ہے جان! سوئے نہیں اب تک؟“

”ننید نہیں آرہی ہے یہاں!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”کیوں؟ کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا ہو گا۔ بھوک لگی ہے؟“

”نہیں، گل خان نے دودھ دیا تھا اور لٹین ڈال کر۔ میں نے پی لیا تھا۔“

”پھر نیند کیوں نہیں آرہی؟“ ابراہار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”یہاں! میں اکیلا نہیں سوتا نا۔“ وہ مجبوری سے بولا۔

”اوہ۔“ ابراہار کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”میں نے تم سے کہا تھا نا، کچھ دن کمرہ شیئر کرتے ہیں لیکن تمہیں اپنے کمرے میں سوئے کی جگہ تھی۔“

”کیونکہ میں بڑا ہونا چاہتا ہوں۔ بڑے لوگ اپنے کمرے میں اکیلے سوتے ہیں جیسے آپ۔“

ابراہار شرارت سے مسکراتے لگا۔ ”میری جان! تمہارے پیپا بالکل بھی بڑے نہیں ہیں۔ وہ بھی اکیلے سونا بالکل پسند نہیں کرتے۔“

اس نے عمر کو بانہوں میں بھر لیا۔

”اور جب تک تم بڑے ہو گے، تب تک ہم تمہاری دلہن بھی لے آئیں گے۔ کلیئر؟ چلو اب یہاں کے ساتھ چل کر سو جاؤ۔“ اس نے کھڑے ہو کر عمر کو بازوؤں میں اٹھایا اور اسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

”یہاں لیٹ جاؤ، یہاں کے برابر دیکھنا، مثنیٰ اچھی نیند آتی ہے۔ کو تو یہاں تمہیں ریڈ رائیڈنگ ہڈ بھی سنا سکتے ہیں۔ تمہارا بیٹا اتنے بھی ناکارہ نہیں بنتا کہ تم خیال کرتے ہو۔“

ابراہار جانتا تھا کہ اسے گھروالوں کی یاد بے طرح ستا رہی ہے، تب ہی وہ اس کا دھیان بانٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے لانا کہ اس نے اپنا تکیہ بھی اس کے تکیے سے جوڑ کر رکھا اور اس کے قریب لیٹ گیا۔

”ہاں تو بتاؤ میری جان! کون سی کہانی سناؤں، بانی داوے تمہارے پیپا کو صرف دو کہانیاں ہی یاد ہیں۔ ریڈ رائیڈنگ ہڈ اور طوطا مینا۔“

”میرے پاس بہت سی بکس ہیں یہاں! رسیجہ خالہ کہتی ہیں کہ مجھے اب کہانی پڑھ کر سونا چاہیے۔ میں اتنا چھوٹا نہیں ہوں کہ کہانی سنیں۔ بڑھنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔“

”ہوں۔“ اس نے چند لمحے غور کیا۔ ”معاملہ گنیمت ہے۔ ویسے اتنی جلدی بڑے ہو کر کیا کرو گے یا رہا کو بوڑھا

کرنے کی بہت جلدی ہے تمہیں؟ ہم اچھے دنوں کی آس میں بیٹھے ہیں اور تم ہو کہ بار بار جوان ہونے کا ڈر ادا دیتے ہو۔“

”آپ کیسے بوڑھے ہو سکتے ہیں۔ آپ تو اتنے شان دار ہیں“ اتنی اچھی باڈی ہے آپ کی۔“

”اوپر تھینک یوس۔ تھینک یوس۔“ وہ ممنونیت سے بولا۔ ”ایسی ہی باتیں کیا کرو جن میں بہا کی تعریف اور تمہارا بچپنا نظر آئے۔“

عمر پھر خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگا۔

”بہا! آپ نے ممائے شادی کیوں کی تھی؟“

ابرار نے مری سانس بھری۔

”آپ کی مہارت اچھی لگتی تھیں، ہم نے شادی کر لی۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”پھر آپ کی ڈائی ورس کیوں ہوئی؟“

”ہوں۔“ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ ”بس بیٹا! کبھی بکھار بڑے غلط لمحے آجاتے ہیں زندگی میں۔“

انسان اندھا بہرا ہو جاتا ہے۔ وہ ایسا ہی ایک لمحہ تھا جب شیطان غالب۔ انسان مغلوب۔“

وہ ماضی کے دھندلوں میں کھولنے لگا۔

”پھر بہا! آپ نے مجھے بھی ماما کو دے دیا تھا؟“

”آں۔“ وہ چونکا۔ ”نہیں تب تک تم۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ اب اتنے سے بچے کو وہ کیا کچھ سمجھا سکتا تھا۔

”بتائیں بہا! اس وقت آپ نے ممائے مجھے کیوں نہیں لیا؟“

”عمر! ان باتوں سے کیا حاصل میری جان! اس نے اسے چکارا۔“ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ ہم سے

غلط ہو گیا ہے، ہم اس کی تصحیح کر لیں۔ سو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”بہا! وہ سوختے ہوئے بولا۔ ”ماما! یہاں آجائیں گی؟“

”بالکل آئیں گی۔“ وہ بے حد یقین تھا۔

”وہ ہاتھ اٹھ کر انکل کو چھوڑ دیں گی؟“

”ہاں عم۔ وہ تمہارے لیے۔ میرے لیے۔ انہیں چھوڑ دیں گی۔ مجھے یقین ہے۔“

”ہاتھ اٹھ کر انکل کو دکھ ہو گا بہا۔ وہ بہت اچھے ہیں۔“

”دکھ تو ہو گا بیٹا! لیکن ان کا دکھ بانٹنے والا بھی کہیں نہ کہیں موجود ہو گا لیکن عمر! یہاں ایک بات کلینر کروں۔“

اگر تم اپنی ماما کو یہاں لانا چاہتے ہو تو تمہیں اپنے بہا کا ساتھ دینا پڑے گا۔ تمہیں اپنی ماما کو فورس کرنا پڑے گا۔

ابھی لوہا بہت گرم ہو گا، چوٹ ابھی لگانا ہوگی۔“

”چوٹ۔“ وہ حیران ہوا۔ ”چوٹ کس کو لگے گی؟“

”لوہے کو۔“ وہ اپنے خیال سے لوٹ کر مسکرایا۔

”لوہا کہاں ہے؟“

”ٹوئیے میں تمہاری ماما کے۔“

”کیا کہہ رہے ہیں بہا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“ وہ الجھ گیا۔

”کیونکہ تمہیں سخت نیند آ رہی ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ لیپ بجھا دیا۔ ”اب سو جاؤ باقی باتیں کل

کریں گے۔“

”کل۔۔۔ مجھے نانو کے گھر جانا ہے۔ آپ کو یاد ہے نا۔“

”ہاں میری جان! مجھے اچھی طرح یاد ہے اور تمہیں اپنی ماما سے کیا کہنا ہے، یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔ گڈ

نائٹ۔“

”گڈ نائٹ بھیا!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”تم آخر کس دھیان میں رہتی ہو، تھوڑے بہت مسئلے تو سب ہی کے ساتھ ہوتے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ انہیں بالکل ہی اپنے سر پر سوار کر لیا جائے۔“ ورہ سخت خفا ہو رہی تھی۔ ناعمہ خاموش بیٹھی رہی۔ ”روٹیاں پکانا تو ایک طرف، تم سے یہ چولہا تک بند نہ ہو سکا۔ سارا قیمہ لگ گیا ہے۔ دل تو چاہ رہا ہے، امی سے شکایت کر کے سخت سُنست سناؤں کتھیں۔“ ناعمہ نے اسے دیکھا۔

”سنو ادیس۔“ اس نے توقف کیا۔ آہستگی سے بولی۔ ”پتا نہیں ابھی کیا کچھ سننا باقی ہے۔“ ”کیا مطلب؟“ ورہ نے خفگی سے اس کی جانب دیکھا پھر گہری سانس بھری۔ ”ایک تو شکل ایسی بنا کر رکھتی ہو کہ کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا۔ خیر روٹیاں میں پکا سیتی ہوں، تم جا کر امی کا سر دبا دو۔ وہ جب سے ایقان خالہ کو دیکھ کر آئی ہیں ان کے سر میں درد ہے۔“

”اچھا۔ میں وکس بھی لگا دیتی ہوں۔“ ناعمہ رابعہ بیگم کا سن کر جلدی سے اٹھ گئی۔ وکس لے کر وہ ان کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ ”امی! آپ کے سر میں درد ہے؟“ وہ ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”ہاں۔“ انہوں نے آنکھوں پر سے بازو ہٹایا۔ ”دبا دو تھوڑی دیر۔“ ناعمہ ان کے قریب بیٹھ کر ان کے ماتھے پر وکس ملنے لگی۔

”ایقان خالہ کی ٹینشن لے لی آپ نے؟“ ”ایقان کی؟“ وہ ایسے بولیں جیسے کسی خیال میں گم ہوں۔ ”ہاں، ایقان بے چاری پر بھی ترس آتا ہے لیکن ناعمہ! جب معاملہ اپنی اولاد کا ہو تو ماں کو کسی اور کی اتنی فکر نہیں ہوتی، بہن کی بھی نہیں۔“ ”میں سمجھی نہیں امی۔“ وہ الجھ گئی۔

”ناعمہ۔۔۔ میں۔۔۔ میں ورہ کے لیے سخت فکر مند ہوں۔“ ”ورہ کے لیے۔۔۔“ اس کے ہاتھ رک گئے۔

”ہاں ناعمہ! رافع کے تیور ٹھیک نہیں لگتے۔ میں نے بار بار محسوس کیا ہے کہ اسے ورہ میں ذرا بھی دلچسپی نہیں ہے اور۔۔۔ اور آج تو۔۔۔ شاید یہ میرا وہم ہو۔۔۔ خدا کرے کہ یہ میرا وہم ہی ہو۔۔۔ آج تو رافع نے اسے دیکھ کر۔۔۔ ایسے نظریں چرائیں جیسے منہ پھیر لیا ہو۔“

”نہیں امی!“ ناعمہ پریقین انداز میں بولی۔ ”یہ محض آپ کا وہم ہے۔ رافع بھائی بہت اچھے ہیں وہ بالکل بھی ایسے نہیں ہیں۔“

”تم نہیں جانتیں ناعمہ! تم ابھی بہت کم عمر ہو۔ مردوات کے دل میں کتنے چور خانے ہوتے ہیں، تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ہم نے دنیا دیکھی ہے، ہاتھ دیکھ کر دل کی شکنوں کا پتہ چل جاتا ہے اور۔۔۔ اور عذر رافع بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ۔۔۔“

وہ خاموش ہو گئیں۔ ناعمہ بھی فکر مند سی ہوئی۔

”کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی تھیں ممانی۔۔۔“

”وہ۔۔۔ کہہ رہی تھیں کہ۔۔۔ رافع۔۔۔ شادی کے لیے رضامند نہیں ہے۔“

ناعمہ دکھ اور پریشانی سے خاموش ہی رہ گئی۔

”لیکن۔۔۔ لیکن کیوں؟“ پھر اس نے بہ دقت پوچھا۔

”وہ تو یہی کہہ رہی تھیں کہ رافع ابھی اپنا کیریئر بنانا چاہتا ہے لیکن ناعمہ۔۔۔ آج میں نے رافع کا چہرہ دیکھا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھی ہیں۔۔۔ وہ ایک مرد کی آنکھیں تھیں، بالکل ایک مرد کی آنکھیں۔ بے مروت، سرد مزاج۔“

ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ناعمہ نے جلدی سے ان کے آنسو اپنی ہتھیلیوں میں جذب کر لیے۔
 ”ای۔ ای۔ ای۔ آپ روئیں نہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔ وردہ آپنی لاکھوں میں ایک ہیں۔ انہیں رشتوں کی کمی تو نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے ناعمہ! لیکن۔۔۔“
 ”لیکن وہ مین کچھ نہیں۔ اگر رافع بھائی نے ہم سے آنکھیں پھیریں تو۔۔۔ تو۔۔۔“ وہ غصے کی شدت سے کانپنے لگی۔

”مجھے تمہاری طرف سے بہت اطمینان ہے ناعمہ۔“ رابعہ بیگم اچانک ہی بولی تھیں۔ ”فراز بہت اچھا لڑکا ہے۔ ایسا لڑکا کہ ماں ایسے بیٹوں کی تمنا کریں اور بیٹیوں والی مائیں ایسا داماد چاہیں۔“
 ناعمہ کے ہاتھ بالکل ساکت ہو گئے تھے۔

”اتنا امیر مگر بہت لحاظ و رت والا لڑکا ہے۔ شائستہ اطوار، خوش شکل، خوش سیرت۔۔۔ تم بہت خوش نصیب ہو بیٹی۔“

”جی! اس نے بمشکل تھوک نگلا۔“
 ”تم۔۔۔ تم بھی ان لوگوں کو کبھی شکایت کا موقع نہ دینا ناعمہ! اس خاندان نے ہم سے ناتا جوڑ کر ہماری قدر و منزلت میں اضافہ کیا ہے۔ تم بھی ہمیشہ ان کی عزت بنی رہنا، عزت بنائے رکھنا۔“
 ”جی۔۔۔ اس نے سرگوشی کی تھی۔“

”میرا دل تمہاری طرف سے بہت ٹھنڈا اور مطمئن ہے۔ اللہ ہر بیٹی کی ماں کا دل ایسا ہی ٹھنڈا اور مطمئن رکھے۔ آمین۔“

ناعمہ کی آنکھیں جیسے خلا میں بھٹکنے لگی تھیں۔
 دروازے کے باہر کھڑی وردہ دانتوں سے لب کاٹتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔

”کہیں جا رہی ہو؟“ منیہہ بیگم ٹھٹک کر رک گئی تھیں۔
 ڈارک گرے لان کے کپڑوں میں کھلی کھلی سی ربیعہ ان کے دل میں اتر گئی تھی۔
 ”جی۔۔۔ میں آپ سے اجازت لینے ہی آرہی تھی۔“ وہ مسکرائی۔ ”وردہ سے ملنے جا رہی تھی۔ کافی دن ہوئے، نہ اس کا فون آیا نہ ملاقات ہوئی۔ میں نے سوچا۔ مل آؤں۔“

”ہاں ہاں، کیوں نہیں، ضرور جاؤ۔ تم تو ہفتوں باہر نہیں نکلتی ہو۔ میں خود سوچتی ہوں، تمہارا دل گھبراتا ہو گا۔“
 ”نہیں امی۔! وہ ہنسی۔ ”میرا دل اس وقت گھبراتا ہے جب گھر میں آپ نہیں ہوتیں۔ آپ کے ہوتے بہت رونق کا احساس رہتا ہے۔“

”جیتتی رہو۔“ وہ مسکرائیں۔ ”بہت پیاری بیٹی ہو۔“
 ”میں جاؤں امی!۔“

”ہاں لیکن ذرا گھمو، میں آیت الکرسی پڑھ کر تم پر دم کروں۔ بہت پیاری لگ رہی ہو ان کپڑوں میں۔ کسی کی نظر نہ لگ جائے۔“

وہ اس کے قریب آکر آیت الکرسی پڑھنے لگیں۔ اس پر دم کر کے انہوں نے اس کا ہاتھ چومنا۔ ربیعہ کو یوں لگا جیسے ان کی خوشبو نے اسے اپنے حصار میں لے لیا ہو۔

”طلب جاؤ۔“
 ”جی۔۔۔“ وہ چونکی پھر مسکرا کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

سیاہ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ اپنے ہی دھیان میں تھی۔ چونکی اس وقت جب کوئی عین اس کے مقابل آکر کھڑا ہوا تھا۔ ربیعہ اسے دیکھ کر ڈر سی گئی۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے

پنکھری اک گلاب کی سی ہے

انہوں نے بے حد جذب سے شعر پڑھا، ربیعہ حواس باختہ ہو گئی۔

”آپ کی تعریف؟“

”جی۔۔۔ میں۔۔۔ میں ربیعہ ہوں۔“ وہ سخت حیران تھی اس شخصیت کو دیکھ کر۔ ”لیکن آپ۔۔۔ آپ کون ہیں؟“

”خادم کو سب یہاں اختر میاں کے نام سے جانتے ہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”جب کبھی خیالوں کے آسمان سے ٹوٹیں۔ یہیں گرتے ہیں۔“

”جی؟“ وہ مزید پریشان ہوئی۔ ”میں وردہ سے ملنے آئی ہوں۔“ اختر میاں اس طرح کھڑے تھے کہ اس کے نکلنے کا راستہ مسدود تھا۔

”وردہ۔۔۔ کون وردہ؟ اچھا۔۔۔ آپ شاید رابعہ بابی کی بیٹی کا ذکر کر رہی ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”آپ۔۔۔ کہاں قیام پذیر ہیں؟“

”جی۔۔۔ میں یہیں۔۔۔ قریب سی۔۔۔ ربیعہ اس انوکھے انڈروپور سخت حیران پریشان تھی۔

”اکثر آتی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ بس یونہی۔۔۔ کبھی کبھار۔“

”ہم تو آپ کو اکثر دیکھنے کے منتظر ہو رہے ہیں۔“ وہ مسکرائے۔

ربیعہ عاجزی ہو گئی۔ ”نہا۔۔۔ کون شخص تھا وہ؟“ کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ اس نے تو آج تک اس گھر میں ایسی کوئی شخصیت نہ دیکھی تھی۔

”اے اختر۔ کیا کر رہے ہو وہاں۔“ فردوس بیگم اتفاقاً ہی میز پر چلی آئی تھیں۔ ”یہ لڑکی کون ہے۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا یہ تو شہلا کی بہن ہے۔“ وہ بڑبڑائیں۔

اختر میاں بہن کو دیکھ کر گھبرا س گئے تھے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ایک طرف کوچل دیے۔ ربیعہ گم صم، ہراساں سی وردہ کے پورشن کی جانب بڑھ گئی تھی۔

○ ○ ○

”اے ربیعہ تم۔۔۔“ وردہ اسے دیکھ کر وحشیہ سے مسکرائی۔ ”آؤ نا۔۔۔ بیٹھو۔۔۔ کتنے دنوں بعد آئی ہو۔“

”کیسی ہو وردہ۔“ ربیعہ نے اسے گرم جوشی سے ساتھ لگایا۔ ”مجھے تم بہت یاد آ رہی تھیں۔ میں نے سوچا آج ضرور مل کر آؤں۔“

”بہت اچھا کیا۔“ وردہ مسکرائی۔ ”آؤ بیٹھتے ہیں۔“

دونوں وردہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

”تم بیٹھو، میں ناعمہ سے کہتی ہوں چائے بنائے۔“ وردہ اسے بٹھا کر باہر نکل گئی۔

ربیعہ کتابیں دیکھنے لگی تھی۔ وردہ چند لمحوں میں ہی لوٹ آئی تھی۔

”یہ کبکس۔۔۔ مجھے بھی دینا وردہ۔ میں بھی نوٹس بناؤں گی۔“

”ہاں ضرور۔“ وہ قریب بیٹھ گئی۔

”تم۔۔۔ خود ہی ایڈیٹ کرنا لیتی ہو؟“

”ہاں۔“ وہ ہم سامہ کر آئی۔ ”مجھے کس نے کروا کر دی ہیں۔“
 ”تم۔“ رافع سے کہہ دیا کرو۔ انہوں نے مجھے ساری بکس اڑچ کر دی تھی۔ حالانکہ کافی لمبی لسٹ دی تھی میں نے انہیں۔“
 ”ورہ خاموش ہی رہی۔ ربیعہ نے اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”تم کچھ خاموش خاموش ہی ہو وورہ! خیر تو ہے نا؟“
 ”ہاں خیر ہے۔ ربیعہ! ایک بات بتاؤ تم نے کبھی کسی کو پسند کیا ہے؟“ وورہ نے اچانک ہی پوچھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

ربیعہ گڑبڑا کر رہ گئی۔
 ”پسند۔۔۔ نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“
 ”تمہیں کبھی کوئی اچھا نہیں لگا ربیعہ۔؟“
 ربیعہ خود پر قابو پا کر مسکرا دی تھی۔
 ”اب تک تو کوئی نہیں لگا، آئندہ کی خبر نہیں۔ جب بھی یہ ماجرا ہوا، تمہیں ضرور بتاؤں گی۔“
 ”پراس؟“ وورہ نے جلدی سے ہاتھ آگے کیا تھا۔
 ربیعہ نے چونک کر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔
 ”پراس۔“ پھر وہ اس کی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ کر آہستگی سے بولی تھی۔

”عمر۔“ شہلانے اس کے چہرے کے کئی بو سے لے ڈالے اس کے بالوں کو چوما۔ ”میرا بیٹا۔۔۔ میری جان۔۔۔“
 ”آپ مجھے یاد کر رہی تھیں ماما!“
 ”ہاں میری جان۔۔۔ بہت بہت یاد کر رہی تھی میں آپ کو۔“
 ”میں بھی آپ کو یاد کر رہا تھا ماما! آپ کو ایسا لگا ہو گا نا جیسے میں آپ کو مس کر رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے آپ مجھے مس کر رہی ہیں۔“
 ”میں بہت مس کر رہی تھی آپ کو، یہاں سب آپ کو مس کر رہے ہیں۔“
 دونوں ماں بیٹا ساتھ ساتھ لگے دکھ سکھ کہہ رہے تھے۔
 ”آپ۔۔۔ خوش ہو عمر؟“ پھر شہلانے آہستگی سے پوچھا۔
 ”جی ماما! میں وہاں بہت خوش ہوں۔ بہت بہت اچھے ہیں۔ ان کا گھر بھی بہت اچھا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ آزر دگی سے بولی۔
 ”ماما! آپ ہاشم انکل سے کہیں وہ آپ کو چھوڑ دیں۔“
 ”عمر! شہلا کو یک دم ایک شاگ سا لگا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو۔“
 ”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ماما! پلینز۔ ہمارا گھر پھر سے بن جائے گا۔ مجھے ماما بھی مل جائیں گی اور بہا بھی۔“
 آپ۔۔۔ آپ پلینز ہمارے پاس آجائیں۔“
 ”عمر۔۔۔ خدا کے لیے سب بی کو اسٹ۔“
 ”ماما! اگر آپ کہیں تو میں ہاشم انکل سے بات کرتا ہوں وہ ضرور میری بات سمجھ جائیں گے وہ بہت اچھے ہیں۔“

”عمر۔“ وہ بہت اچھے ہیں اس میں کوئی شک نہیں ہے اور بیٹا! اچھے لوگوں کو دکھ نہیں دیا کرتے۔“
 شہلانے پلکیں جھپکا جھپکا کر آنسو روکے۔

”مجھے نہیں پتا۔“ وہ خفگی سے منہ پھلا کر بولا۔ ”آپ کو میرے لیے یہ سب کچھ کرنا ہو گا مگر! مجھے آپ چاہئیں، مجھے اپنی ماں چاہیے۔ پلیز ماما۔“

شہلا دم بخود تھی۔
”عمر نہ تھیں۔۔۔ تمہارے پپانے یہ سب کچھ سکھایا ہے نا۔ اتنی جلدی؟ تم ان کی باتوں میں آکر مجھے مجبور مت کرو بیٹا۔۔۔ میں ساری زندگی خود سے نظر نہیں ملا پاؤں گی۔“
”ٹھیک ہے ماما! پھر آپ مجھے بھی فورس مت کرنا کہ میں یہاں آکر آپ سے ضرور ملوں۔“ اس کی آواز زندہ گئی۔

شہلا نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ اسے لگا اس کا دل حلق کے رستے باہر آنا چاہتا ہے۔ اس مرتبہ کی ضرب بہت کاری تھی۔ شہلا ساکت بیٹھی سوچے گئی۔

دل و دماغ بالکل سن ہو رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے چلتے لان کے آخری کونے تک آگئی تھی۔ اسے واضح یقین تھا کہ اگر اس کے ساتھ اس کے بچے نہ ہوتے تو اس ذہنی کیفیت میں وہ یقیناً صرف اور صرف خود کشی کے متعلق ہی سوچتی۔ کچھ ایسا کرنے کا جی چاہتا تھا کہ ساری دنیا میں ایک زوردار گونج اٹھے۔ ہر کوئی چونک اٹھے اور وہ۔۔۔ وہ تڑپ کر رہ جائے۔ خشک پتوں پر قدموں کی آواز سے وہ چونکی۔ کوئی آ رہا تھا۔ اندھیرے میں آنے والے کے نقش و آئینہ نہ تھے۔ صرف ایک ہیولہ تھا۔ ایقان ڈر سی گئی۔
”کون۔۔۔؟“ اس نے پکارا۔

”ہم ہیں۔ اختر میاں۔“ وہ قریب آگئے۔ ”آپ۔۔۔ ایقان بیگم۔ آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں۔ اتنی رات گئے۔“

”خاک پھانک رہی ہوں“ آپ کو کیا۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”آپ کہیے۔ آوارگی کو اب تک ترار نہیں آیا۔“
اختر میاں افسردہ سا مسکرا بے۔

”ہمارا محور ہم سے گم ہو گیا ہے ایقان بیگم! کیا کریں۔“
”دفعتنا! ایقان نے ان کی جانب دیکھا پھر وہ دیکھتی ہی رہی۔ اندھیرے میں اختر میاں کی ناامید ملکٹی آنکھیں افسردہ لگتی تھیں۔“

”اختر میاں۔۔۔“

”جی۔۔۔“

”آپ۔۔۔ مجھ سے شادی کریں گے؟ اگر میں عاشر۔۔۔ سے طلاق لے لوں تو؟“

اختر میاں سن ہو کر رہ گئے۔

اختر میاں یوں کھڑے تھے گویا مٹی کا بے جان بت ہوں حتیٰ کہ ان کے وجود میں سانس کی جنبش تک محسوس نہ ہوتی تھی۔ ایقان نے اپنی بات کہہ تو ڈالی تھی لیکن اب اسے ایسا لگتا تھا جیسے اس کا لہجہ اوجہ ایک آگ کے گولے میں تبدیل ہو گیا ہو۔ اس کی سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ۔۔۔ چند ہی لمحوں میں وہ پوری کی پوری دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گی۔

”ایقان بیگم۔۔۔! اختر میاں کے بت میں سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوئی تھی ”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ ہم ایک بے توقیر ذرے سے درخشاں ستارہ بن جائیں۔۔۔ ہم نے تو اب سنے میں بھی یہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے اور آپ ہمیں حقیقت میں۔۔۔ نہیں۔۔۔ شاید آپ، آپ ہم سے مذاق کر رہی ہیں آپ آج بھی وہی ایقان ہیں شوخ، زندہ دل، غصیلی، کالچ سے بنی ہوئی اور۔۔۔ کالچ کی طرح توڑ پھوٹنے والی ایقان۔“

ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ ایقان جواب میلی لکڑی کی طرح اندر رہی اندر سلگ رہی تھی، چونکے بنانہ رہ سکی۔

”ختر میاں! آپ کی ہی بد دعا لگی شاید۔“ وہ آہستگی سے بولی جیسے نیند میں محو کلام ہو۔ ”ورنہ اور کسی کا تو دل کبھی نہیں دکھایا میں نے۔“

”ہم نے تو ہمیشہ آپ کے لیے دعا کی ہے۔“ وہ جیسے منمنائے ”اور ہمیشہ کرتے رہیں گے۔ لیکن ابھی کچھ دیر قبل جو آپ نے کہا“ سے سن کر تو ہر غم کا نشہ اتر گیا ہمارے سر پر سے۔ ہم۔ ہم سمجھ نہیں پائے کہ ہم حواسوں میں لوٹے ہیں یا حواسوں سے حقیقتاً بے گانہ ہو گئے ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں کہا؟ یہ مہربانی ہمارے نصیب پر؟“

”ہاں نہیں۔“ وہ تلخی سے ہنس پڑی۔ ”یہ آپ کے نصیب پر مہربانی ہے یا پھر اپنے نصیبوں سے بے مہری کی انتہا۔ جو کچھ بھی سمجھ لیجیے اسے۔ لیکن اتنا یقین کر لیں کہ میں نے نہ آپ سے مذاق کیا ہے نہ خود سے۔ میں نشے میں بھی نہیں ہوں اور نیند میں بھی نہیں ہوں۔ میں نے اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ یہ بات کہی ہے اور۔ اور اب آپ کے جواب کی منتظر ہوں میں۔ بتائیے۔ ایک مطلقہ کی حیثیت سے اپنا میں گئے تھے؟“

”ہم۔ ہم کیا اپنا میں گئے آپ کو ایقان!“ ختر میاں جوش جذبات سے پھٹی ہوئی آواز میں بولے تھے۔ ”ہم تو سر سے پاؤں تک آپ کے بن جا میں گئے۔ پھر کھو کر بھی ماریں گی تو آپ کی چوکھٹ سے نہ انھیں گئے، ہم۔ قسم لے لیں ہم سے۔“

”قسموں وعدوں کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وہ تلخ انداز میں بولی۔ ”آپ نے کہہ دیا، بس کافی ہے۔ اب آپ جائیں اور ہاں پھر منہ اٹھا کر کہیں چل مت پڑیے گا۔ پتا چلے کہ عین موقع پر آپ کے نام کی ڈھونڈ مچی ہو اور آپ حواسوں سے بے گانہ کسی گلی میں پڑے سو رہے ہوں۔“

”طغت ہو ہماری صورت پر اگر ہم ایسا کریں تو۔“ وہ جذباتی ہوئے ”ہم تو آج سے ہی گھر سے نکلنا چھوڑ دیں گے۔“

”جی ہاں۔“ وہ کھول اٹھی تھی۔ ”میں عدت میں بیٹھتی ہوں۔ آپ مایوں بیٹھ جائیں۔“ ختر میاں لرزے گئے تھے۔

”ایقان بیگم! ایک۔ ایک بات پوچھیں آپ سے۔ یہ اچانک آپ کو کیا ہوا؟ ایک ہنستی ہنستی زندگی سے منہ موڑ کر آپ ہم سے دیوانے سے یہ کیا مانگ رہی ہیں؟ ہم تو اپنا دیوانہ پن ہی دے سکتے ہیں آپ کو۔ آپ کی زندگی کو کسی ہمار کی بویہ نہیں ستائیں گے ہم۔“

ایقان نے زخم زخم نظروں سے اندھیرے میں ان کے اجازت نقوش کو دیکھا تھا۔

”میری زندگی کو کسی ہمار کی ضرورت نہیں رہی ختر میاں! یہاں تو بس ہر شے کو جلا کر راکھ بنا دینے کی تمنا ہے۔ میں اپنے جلنے کا تماشا آپ دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہنستا چاہتی ہوں اپنی راکھ پر۔“

”پھپھو۔ پھپھو! دلعنا“ انہیں قریب سے ہی آواز ابھری تھی۔

ایقان اور ختر میاں دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ پھر یکدم ہی رافع سامنے آ گیا تھا۔

”پھپھو! آپ یہاں ہیں؟ اس وقت؟“ وہ سخت حیران تھا اور ختر میاں! یہ آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

ختر میاں کی مٹی گم ہو گئی لیکن ایقان کے جامد انداز میں فرق نہ آتا تھا۔

”نیند نہیں آ رہی تھی رافع!“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”ایک جلن سی برپا تھی وجود میں میں کچھ دیر ٹھلنے کے لیے یہاں آ گئی۔ اور یہ۔۔۔ ختر میاں! ان کی ختر تماریوں سے کون واقف نہیں ہے۔“

”پھپھو۔!“ رافع نے ہمدردی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا ”جلس اندر۔۔۔ اب اچھی طرح جانتی ہیں آپ کو آرام کی اشد ضرورت ہے۔ پھر ڈاکٹر نے خاص طور پر آپ کو نیشن سے دور رہنے کے لیے کہا ہے۔ اس طرح راتوں کو جاگ کر سوائے نیشن کے کیا حاصل ہوتا ہے بھلا؟“ وہ اسے اپنے ساتھ لیے اس کے پورشن کی

طرف جانے لگا۔

”بچوں کو اکیلا ہی چھوڑ آئی ہیں؟ اگر سوتے میں ڈر جائیں تو؟ آپ کو گھر میں نیا کڑوا کس قدر ڈسٹرب ہو سکتے ہیں؟ کچھ اندازہ ہے آپ کو؟“

”رافع!“ وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی تھی۔ ”اگر۔۔۔ اگر میں مراحوں رافع! تو شملہ سے کہنا، میرے بچوں کو وہ پال لے۔ انہیں عاشق کو مت دینا۔۔۔ پلیز!“

”پھپھو!“ وہ نرمی سے بولا تھا۔ ”میں نے کہا تھا آپ صرف آرام کریں۔۔۔ فضول مت سوچیں۔ نیند نہیں آتی تو ٹیلیٹ لے لیا کریں۔“

”ایک دو گولیوں سے فرق نہیں پڑتا رافع!“ وہ بچوں کی طرح بولی۔ ”پھر دل چاہتا ہے کہ روز نیند کی منت ساجت کرنے سے بہتر ہے کہ آدی پوری شیشی کھا کر ایک بار موت کی دعوت ہی کر ڈالے۔“

”خدا کا واسطہ ہے پھپھو!“ وہ اس کے دروازے کے سامنے رُک گیا۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کو میں نے کبھی ایسا تصور نہیں کیا تھا۔ اتنی قنوطیت۔ اس قدر جذباتی پن۔ شادی شدہ زندگی میں بڑے بڑے معرکے کرنے پڑ جاتے ہیں ڈیر پھپھو! آپ تو بہت دلو نگلیں۔“

”تم نہیں سمجھو گے۔“ اس نے گہری سانس بھری تھی۔ ”جائے۔۔۔ سو جاؤ۔۔۔ اتنی رات کو تم کس لیے جاگ رہے ہو؟ ابھی تم تو کسی معرکے سے دوچار ہونے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہو۔“ رافع دھیمے سے مسکرا دیا تھا۔

”ہرمیدان کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں ڈیر پھپھو۔ ایک مصرعہ انگ گیا تھا ذہن میں سو پھانس نکالنے کی کوشش میں تھا اور اب میں آپ کو یوں چھوڑ کر جانے والا نہیں ہوں۔ چلیں میرے سامنے دو آئی کھائیں مگر م دودھ پینیں اور اپنے بچوں کے ساتھ سکون سے لیٹیں۔۔۔ پھر میں جاؤں گا۔“

”دو آئی میں کھاؤں گی۔۔۔ دودھ بھی پی لوں گی۔“ وہ اداسی سے مسکرائی۔ ”بچوں کے ساتھ لیٹ بھی جاؤں گی لیکن سکون؟ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لیے تم جاؤ۔ اپنا وقت مجھے کم نصیب کے لیے خراب مت کرو۔ مجھے تو اب اس کی عادت ہے۔ صبح ہوتے ہوتے نیند بھی اُٹی جائے گی۔ آخر کو انسان ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ میں جاتا ہوں۔ لیکن پلیز پھپھو! کوئی الٹا سیدھا کام نہ کیجیے گا۔ کچھ بھی نہیں بگڑا ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ بھروسہ کیجیے۔“

”جانتی ہوں رافع۔۔۔ بس ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے جیسے سرگوشی کی تھی۔

”اب میں چلوں؟“ وہ مٹھو کو ساتھ لیا۔

”ہاں، تم جاؤ۔ شب بخیر۔“ اس نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

رافع پریشان سا کافی دیر وہیں کھڑا رہا تھا۔

”ہی جی۔۔۔!“ ورنہ کافی گھبرائی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔ ”یہ ان لوگوں کا ہر کام ایسے جلد بازی اور افرا تفری میں ہی کیوں ہوتا ہے بھلا؟ انہیں سکون و اطمینان کے معنی نہیں آتے کیا؟“

”کیا ہوا؟ خدا خیر کرے۔“ رابعہ بیگم گھبرا سی گئیں۔ ”کس کی بات کر رہی ہو؟“

”فراز کے گھر والوں کی۔۔۔ اب ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی ان کے سروں پر ریو الورتا نے کھڑا ہے۔ ابھی فریحہ کا فون آیا تھا۔ کہنے لگی، ہم لوگ آپ کے گھر آ رہے ہیں۔ میں نے کہا، ضرور آؤ، سر آنکھوں پر تپ بولی۔ ہم شادی کی تاریخ رکھنے آ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں تو اس موقع پر بہت خاص قسم کے لٹو بنوائے جاتے ہیں لیکن چونکہ وقت کم ہے اس لیے کس مٹھائی کے ٹوکے بنوائے ہیں۔ آپ لوگ پسند کریں گے نا؟“

”ہاں میں!“ رابعہ بیگم بھی چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ ”تاریخ رکھنے؟ ہیوں اچانک؟“

”جی ہاں!“ وہ تپتی ہوئی تھی۔ ”ہے کوئی ٹینک، تھیلی پر سروں جمانے کی؟ اب شام تک دعوت کا بندوبست کرنا آسان کام ہے بھلا؟ اس نے کہا ہے کہ قریباً ”آٹھ“ وں افراد ہوں گے۔“

”لیکن ہم بھی تو اپنے سب ہی رشتے داروں کو بلائیں گے۔ اس طرح پچاس ساٹھ افراد تو بن جاتے ہیں۔“
 رابعہ بیگم کے چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی۔
 ”خیر، آپ ٹینشن نہ لیں۔“ ورہ نے ان کی صورت دیکھ کر فوراً ”ہی پر سکون انداز اپنا لیا۔“ سب ہو جائے گا۔ اللہ مالک ہے، ہم بازار سے پکاپکایا کھانا منگوا لیتے ہیں۔“
 ”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”میں رافع سے کہتی ہوں، وہی انتظام سنبھالے گا۔“
 ”اُمی۔!“ ورہ آہستگی سے بولی تھی۔ ”ہاشم بھائی بھی تو ہیں اور حمزہ اور علی بھی اتنے چھوٹے نہیں ہیں۔ میں بڑے ماموں کے یہاں جا رہی ہوں۔ انہیں شام کی دعوت بھی دے دیتی ہوں اور کھانے کے متعلق بھی سارا کچھ ڈسکس کر لوں گی۔ آج چھٹی کا دن ہے ابھی سب گھر پر ہی ہوں گے۔ وہ تینوں مل کر سارا انتظام سنبھال لیں گے۔“

”اچھا! جیسے تمہاری مرضی۔“ رابعہ بیگم چپ سی ہو گئیں پھر جیسے انہیں خیال آیا تھا۔

”آج چھٹی ہے۔ بیگم سے پیسے بھی نکلوانے ہوں گے۔“

”کوئی فکر کی بات نہیں ہے، اے نی ایم سے نکال لوں گی میں، آپ بالکل اطمینان رکھیں، سب بالکل خیریت سے ہو جائے گا۔“

وہ پلٹ کر جانے لگی تھی۔

”بات سنو ورہ۔!“ رابعہ بیگم نے اسے پکارا۔

”جی امی۔!“ وہ لائے قدموں پلٹ آئی۔

”وہ لوگ۔۔۔ کب کی تاریخ رکھتے کا کہہ رہے ہیں؟“ وہ قدرے فکر مند سی پوچھنے لگیں۔

”میرا خیال ہے اگلے چاند کی کوئی تاریخ۔“

”ہائیں۔!“ وہ سیٹھا گئیں۔ ”اس قدر افراتفری؟ تم ٹھیک کہہ رہی ہو ان کا کوئی کام بھی جلد بازی سے خالی

نہیں ہے۔ یہ ناعمل ہے کہاں؟“

”سو رہی ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اٹھاؤ اسے۔“ وہ جھٹلا میں۔ ”ہم یہاں دبے ہوئے جا رہے ہیں اور وہ ٹھانڈے سے بستر کی سیر کر رہی ہے بلکہ

تم جاؤ میں خود جگاتی ہوں اسے۔“

”بستر کی سیر؟“ ورہ کو ہنسی آگئی۔ ”تب ہی اکثر یلنگ سے نیچے گر جاتی ہیں محترمہ۔ فراز کو کہنا پڑے گا کہ اس

کے سائیڈ میں تکیہ لگایا کرے۔“

رابعہ بیگم بھی ساری فکر بھول کر ہنس پڑی تھیں۔

شیشے کا بیرونی دروازہ کھول کر وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ فردوس بیگم سامنے ہی صوفے پر براجمان ہرے پنے

نکال رہی تھیں۔

”السلام علیکم ممانی جان۔!“ ورہ ان کے قریب جا بیٹھی۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے ٹوکری پرے کی۔ ”آؤ ابھی عرصے بعد شکل دکھائی ہے تم

نے لگتا ہے کوئی خاص کام ہے آج ہم لوگوں سے۔ کیوں؟“

ورہ دھیرے سے مسکرا دی تھی۔

”ٹھیک سمجھی ہیں آپ۔ بہت ذہین ممانی ہیں آپ میری۔“

”اے ہاں۔۔۔ یہ تو سامنے کی بات ہے۔ یوں تو ہم بہت کوڑھ مغز ہیں ذہین تو تمہاری چھوٹی ممانی ضرور ہوں

گی۔ ساس جو بنیں گی تمہاری۔“

اپنی بات سے محفوظ ہو کر انہوں نے خود ہی تقبہ لگایا۔ وردہ کی دیکھی سڑکیں اس کی بے تکلی ہنسی میں شریک ہوئی تھیں۔

”اچھا کونسا کیسے آتا ہوا؟“ نہیں فوراً ہی اصل بات یاد آگئی۔
 ”آج شام ہمارے ہاں آپ سب کی دعوت ہے۔ اصل میں ابھی ابھی فریکہ کافون آیا تھا۔ وہ لوگ ناعمہ کے لیے تاریخ لینے آرہے ہیں۔ اس موقع پر آپ سب لوگوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔“

”ناعمہ کی تاریخ؟“ ان کا منہ کھل گیا۔ ”شادی کی تاریخ؟“
 ”جی ہاں۔“ وہ ان کے انداز سے قدرے گھبرا سی گئی۔ ”شادی کی ہی تاریخ رکھنا ہے ممانی!“
 ”اور تم اب بتا رہی ہو۔“ وہ خفا و دوس میں۔ ”خیر۔۔۔ شکوہ بے جا ہے۔ پہلے کون سا تم لوگوں نے کسی بات میں شریک کیا ہے جواب کرو گے۔ مہمانوں کی طرح حقت سے بلائے ہو۔ ہم بھی مہمانوں کی طرح جی آئیں گے۔“

انہوں نے دو دو: وہ نوکری اپنے آگے کر لی اور چنے نکالنے لگیں۔
 ”ایسی کوئی بات نہیں ہے ممانی! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ ابھی فریکہ کافون آیا ہے اور میں ابھی آپ کے پاس چلی آئی ہوں۔ بلکہ آپ یوں یقین کریں کہ اگر جٹ نوٹس پر کھانا بھی پکا ہوا منگوانا ہے اور مجھے اس سلسلے میں ہاشم بدائی اور حمزہ سے بھی مشورہ کرنا ہے۔“

”کرو مشورہ۔“ وہ بے نیازی سے بولیں۔ ”ہم نے کب روکا ہے۔“ پھر دفعتاً ”ان کے ہاتھ رکے تھے۔ ان کے اندر میں بیکدم ہی اپنا سیت در آئی۔“

”بات سنو وردہ! یہ عذرا کا کیا خیال ہے رافع اور تمہارے بارے میں؟“

”جی؟ میں کچھ سمجھی نہیں ممانی جان!“ وہ الجھ سی گئی۔
 ”ہاشم کی بھی تاریخ رکھی جانی ہے چند دنوں میں۔ تو کیا تمہاری اور رافع کی بھی۔“
 ”نہیں نہیں۔“ وہ گھبرا سی گئی۔ ”ابھی تو ایسی کوئی بات نہیں نکل۔ پھر ناعمہ کے جانے سے امی کے پاس میرا ہونا ضروری ہے۔ میں خود اتنی جلدی شادی کے حق میں نہیں ہوں۔ امی بہت اکیلی ہو جائیں گی۔“
 ”سنا ہے رافع بھی ٹال مٹول کر رہا ہے۔“ انہوں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”مجھے تو اس کی خبر نہیں ممانی جان!“ اس کے چہرے کی جوت بچھ گئی تھی۔
 ”کیا خیال ہے تمہارا۔“ وہ اچانک ہی پراسرار ہو گئیں۔ ”مگر ہم نافع اور عریشہ کی بات چلائیں تو ٹھیک ہے؟“ ”ضرور۔“ وہ مختصراً بولی۔ ”تم حرایت کرو گے ہمارے مطالبے کی؟“

”کیوں نہیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ وہ مسکرائی تھی۔
 ”جی رہو۔“ وہ یکایک ہی خوش ہوئیں۔ ”چلو ٹھیک ہے۔ ایک ہی گھر کے تین بوجھ اتر جائیں گے۔ عریشہ، ہاشم اور ناعمہ۔ تین ہسبیلیاں تینوں ساتھ ہی دکن نہیں گی۔ کیوں وردہ؟“
 ”بالکل ٹھیک ہے ممانی۔“ وہ مسکرائی۔

”تم تو تینوں سے بڑی ہو وردہ!“ انہوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”تمہارا دل تو خراب نہ ہو گا؟“
 ”کمال کرتی ہیں ممانی جان۔“ یہ تو نصیب نصیب کی بات ہے۔ ”وہ رسائیت سے بولی۔ ”جس کا جیسے لکھا ہو۔ آپ میری فکر نہ کریں میں اتنی چھوٹی باتوں پر دل خراب نہیں کرتی۔“
 ”تم کھانے کی بات کر لو ہاشم اور حمزہ سے!“ انہوں نے اسے گرین گنل دکھایا۔ ”دونوں اب پر ہیں۔“

دیکھ رہے ہیں۔“
 ”جی اچھا۔“ وہ میز صیوں کی جانب بڑھ گئی تھی۔
 اسے آتا دیکھ کر عریشہ آڑ میں ہو گئی تھی۔

اس کا رنگ سفید بڑ گیا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔
 ”لیکن امی! اپنی جلدی۔۔۔ کیوں؟“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”س بیٹا! کیا کریں۔۔۔ جلدی تو لگتا ہے ان لوگوں کی کھٹی میں شامل ہے۔۔۔ ہر کام جلدی، دوڑ بھاگ میں۔۔۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جلد یا بدیر۔۔۔ کام تو بہر حال ہونا ہی ہوتا ہے۔ تم اس روز ثانیہ کے ساتھ مارکیٹ گئی تھیں تو ایک ہرے رنگ کا سوٹ لائی تھیں نا؟ وی، جس پر شاید سفید کام تھا؟“
 ”وہ۔۔۔ بالکل گرین سوٹ موتیوں کے کام والا؟ وہ تو۔۔۔ وردہ آپنی کے لیے لائی تھی۔“ وہ اب تک گم صم صم کیفیت کا شکار تھی۔

”ہاں تو تمہارا ناب تو تقریباً“ ایک سا ہے۔ وہ سوٹ پہن لو۔۔۔ ساتھ میں میرا موتیوں والا سیٹ بھی پہن لو۔ باکا پھلکا میک اپ ضرور کر لینا۔ لڑکیاں تو ایسے موقعوں پر خوب جی جان سے تیار ہوتی ہیں، تمہیں تو کسی تکیہ بندی میں ہے بالکل۔“

وہ ایک دم خفاسی ہوئیں پھر اس کی اتاری ہوئی صورت دیکھ کر نرم پڑ گئیں۔

”خیر تم فکر مت کرو۔ رائے آتی ہی ہوگی۔ خود ہی سمجھا دے گی تمہیں سب کچھ۔ اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے یہ موقع تو خوش ہونے کے ہوتے ہیں بیٹا۔ لڑکیاں تو انجوائے کرتی ہیں ان چھوٹی چھوٹی رسموں کو۔ تمہارا تو رنگ یوں اڑ گیا ہے جیسے کپڑے پر ہلیچ ڈال دو۔“

”امی! اس کی آنکھیں بھر آئیں۔“ پتا نہیں مجھے ڈر بہت لگ رہا ہے!“
 رابعہ بیگم کو بے اختیار ہی اس پر پیار آیا۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
 ”آپ۔۔۔ آپ ان لوگوں کو منع کر دیں۔“

”ناعمدہ!“ وہ حد درجہ حیران ہوئیں۔ ”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ خوشی کے موقعوں پر ایسی بے سرو پا باتیں منہ سے نہیں نکالتے بیٹی!“
 پھر وہ قدرے اداس ہوئی تھیں۔

”تمہارے والد اگر زندہ ہوتے۔ تو کیسی تسلی ہوتی مجھے اس وقت تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ایک کارڈ شوہر ہے جس کا بوجھ تنہا اٹھانا ہے۔ بہت کم حوصلہ ہو رہی ہوں میں اور تم ایسی صورت بنا کر اور ایسی فضول باتیں کر کے مجھے مزید بے حوصلہ کر رہی ہو۔ خدا کے لیے سب اچھا بولو۔ کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نہ نکلتے۔“
 ”لیکن امی جی پہلے وردہ آپنی کا حق تھا!“ وہ کچھ اور سمجھ میں نہ آنے پر احتجاجاً بولی۔

”یہ سب تو اللہ کو پتا ہے بیٹا جی! یہ لکھا ہوا اسی کا ہے اس نے اگر تمہاری خوشی وردہ سے پہلے لکھی ہے تو اس کی کوئی مصلحت ہوگی۔ یہ باتیں ایسی نہیں کہ انہیں زیادہ سوچا جائے پھر وردہ مطمئن ہے تو تمہیں کاہے کی فکر؟ وردہ میری بہت پیاری بیٹی ہے مجھے خیر ہے اس پر۔“
 ”میں پیاری نہیں ہوں؟“ اس نے منہ بسورا۔

”یہ میں نے کب کہا؟“ وہ ہنس پڑیں۔ ”تم پیاری بھی بہت ہو اور تمہارے لاڈ بھی بہت کیے ہیں میں نے رائے سے پوچھو اس کے ساتھ کتنی تنگی کی تھی میں نے۔ اب کبھی سوچتی ہوں تو افسوس بھی ہوتا ہے۔“
 وہ نچالے کیا کچھ سوچنے لگی تھیں۔ پھر کچھ خیال آنے پر چونک اٹھیں۔

”اچھا خیر۔۔۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ وقت ضائع مت کرو، کپڑے ایک مرتبہ پہن کر فٹنگ وغیرہ چیک کرلو“ کہیں عین وقت پر کچھ کام نہ نکل آئے۔ وردہ آئے تو اس کے ساتھ مل کر فٹنگ گھر کو سدھا رلو۔ میں ذرا ماں جی کی طرف جاتی ہوں۔“

”جی۔۔۔“ وہ سر جھکا کر منمنائی۔

رابعہ بیگم کے جانے کے بعد وہ بے کلی سے ٹہلنے لگی تھی۔ شام کی رات سے قبر کی رات تک رونے کا تصور

انتہائی لمزہ خیز اور جان لیوا قسم کا تھا لیکن وہ اپنے بارے میں بھی جانتی تھی۔ اس سلسلے میں اس کی لبوں سے کوئی بات نہ نکلنے والی نہ تھی۔ اپنی ماں کے دکھوں سے وہ بخوبی واقف تھی اور اس میں رتی بھر اضافہ اسے کسی طور گوارا نہ تھا۔ خواہ اس کے لیے اسے حقیقتاً شادی کی رات سے قبر کی رات تک رونا ہی کیوں نہ پڑتا۔

وہ کمرے میں اندھیرا کیے لیٹی ہوئی تھی۔ ساری رات نیند پلکوں کے قریب نہ چٹکی تھی۔ اب سرور سے پھٹا جا رہا تھا اور طبیعت بے حد بھاری ہو رہی تھی۔ یکدم موبائل کی لرزش سے اس کی غنڈوگی ٹوٹی۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اسکرین پر نام دیکھا پھر موبائل آن کیا۔
”ہیلو۔“

”شہلا! ہاشم بات کر رہا ہوں۔“ وہ گہیر آواز میں بولا تھا۔
”جی۔“ وہ سستے سے بولی۔

”دشرب تو نہیں کیا تمہیں؟“ وہ محتاط انداز میں بولا تھا۔

شہلا کچھ دیر کے لیے خاموش رہ گئی۔ ہاشم کے انداز میں پچھلے کچھ دنوں سے در آنے والی اجنبیت اس کے لفظ لفظ سے ٹپکتی تھی۔ نجانے کیوں۔ شہلا کے دل کو نہیں سی لگتی تھی۔
”ایسی باتیں نہ کیا کریں ہاشم! بہت اجنبی سے لگتے ہیں۔“

”اجنبیت تو احساس ہے شہلا! باتوں سے در آئے رویوں سے یا پھر وہ افراد کی قسمت میں ہی رقم ہو۔ خیر۔ میں کہہ رہا تھا کہ تمہیں لینے آ رہا ہوں۔“
”خیریت؟“ وہ پوچھ بیٹھی۔

”کیا بات ہے شہلا! کیا تم یہاں آنا نہیں چاہتیں؟“ ہاشم الجھ سا گیا تھا۔ ”میں نے گھر واپس آنے کے لیے بھی تمہیں اور مجھے ایسے سوال جواب کی ضرورت ہے؟ بہر حال بات یہ ہے کہ عہد کے سسرال والے اس کی شادی کی تاریخ رکھنے آرہے ہیں۔ امی کا خیال ہے کہ ہم لوگ اس موقع پر عریضہ اور نافع کی تاریخ بھی ساتھ ہی رکھ لیں۔ اسی سلسلے میں بچا جان کی طرف جارہے ہیں۔ میرا خیال ہے اس موقع پر تو تمہارا یہاں ہونا ضروری ہے؟“
”جی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”میں خود آجاتی ہوں۔ کون سا زیادہ رستہ ہے۔ آپ خواہ مخواہ تکلیف کریں گے۔“

ہاشم چند لمحوں خاموش رہ کر دھیرے سے ہنس دیا تھا۔

”اور ابھی تم بھرے الفاظ سے ٹپکتی اجنبیت کی شکایت کر رہی تھیں۔ خیر۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ کی ہمراہی عین راحت و مسعدت ہے۔ تم تیار رہو میں آتا ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ شہلا اس کے لطیف طفرے کے متعلق سوچتی رہ گئی۔



بے حد پریشانی کے عالم میں اس نے فون بند کیا تھا۔ ریسپور پر ہاتھ رکھے وہ بہت استغراق کی کیفیت میں نظر آیا۔
عذرا! تم گھر اس کے قریب آگئیں۔

”راہے۔“ انہوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔
وہ تکیا اٹھا۔

”جی امی۔“ اس نے ایک لمبی سانس بھری۔ ”وہ کہتے ہیں کہ کمپنی کے ساتھ کیا گیا ان کا مائٹریکٹ ختم ہو گیا ہے۔ اب وہ کہاں گئے ہیں؟ ہمیں خبر نہیں ہے۔“

”یا خدا۔“ وہ پریشان ہو گئیں۔ ”یہ کیا ماجرا ہے۔ ایقان تو کہتی ہے کہ وہ اکثر و بیشتر بچوں سے بات کرنے کے لیے فون کرتا رہتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ایقان کو نہ سنی بچوں کو تو ضرورتاً۔“
”ہو سکتا ہے پچھو کو اس کا علم ہو۔“ رابع نے خیال ظاہر کیا۔

”لیکن ہم اسے تو نہیں کہہ سکتے تاکہ ہمیں عاشر سے رابطہ کرنا ہے۔ اس کی فطرت سے تم بخوبی واقف ہو۔“
 عذرا بیگم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔
 ”کچھ بھی ہوا ہی جی! میں کل رات کے واقعہ سے سخت خوفزدہ بھی ہوں اور پریشان بھی۔ پھپھو کو قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ وہ کیا کر رہی ہیں وہ کچھ بھی غلط کر سکتی ہیں۔ ایسے میں ہم سب کا فرض بنتا ہے کہ انہیں کسی کھائی میں گرنے سے بچائیں۔ عاشر بھائی سے رابطہ کرنا ناگزیر ہے۔“ وہ بڑے سوچ انداز میں کہہ رہا تھا۔
 ”تم اماں کے سامنے ہرگز ان باتوں کا ذکر مت کرنا۔“ عذرا بیگم نے اسے ٹوکا۔ ”وہ پہلے ہی ایقان کے بارے میں حد درجہ فکر مند رہتی ہیں۔ ایسی باتیں سنیں گی تو تیار پڑ جائیں گی۔“
 ”جاننا ہوں۔“

”اب کیا کرو گے، عاشر کا نمبر کہاں سے لو گے؟“
 ”آپ اپنے طور پر پھپھو سے پوچھنے کی کوشش کریں شاید وہ بتا ہی دیں۔“
 ”لیکن کیوں کیا کہوں اس سے۔؟“ وہ جڑبڑھائیں۔
 ”کوئی بہانا دیں۔ کہہ دیں ان کا کوئی دیرینہ دوست ملا تھا وہ مانگ رہا تھا۔“
 ”تو پھر تم ہی کہو نا۔“ وہ بھنائیں۔ ”عاشر کا دیرینہ دوست مجھے کہاں مل جائے گا؟“ رافع چونکا پھر مسکرا دیا۔
 ”ٹھیک ہے، میں ہی کہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

○ ○ ○
 تقریب کا اہتمام لان میں کیا گیا تھا۔ ہاشم نے انتظام بہت عمدگی سے سنبھالا تھا۔ ہر ہرجیرے میں ”مینجمنٹ“ نامی طور پر نظر آ رہی تھی۔

”رابعہ! سن! سب بہت زیادہ کر لیا آپ نے۔“ رحمانہ بیگم ان کا ہاتھ تھام کر بولی تھیں۔
 ”جی آنٹی!۔“ فریحہ بھی قریب ہی موجود تھی۔ ”ہم نے تو خاص طور پر کوشش کی تھی کہ بالکل گھبرانا نہ ہو۔“
 اس تقریب کو منایا جائے تب ہی ارجنٹ ٹولس دیا تھا آپ لوگوں کو لیکن آپ لوگوں نے تو بہت عمدگی سے سب کچھ مینج کر لیا۔“

”اللہ سلامت رکھے بچوں کو۔“ رابعہ بیگم مسکرائیں۔ ”ان ہی کے دم سے ساری اذیت ہے اور رہی بات تقریب کی تو ان بچیوں کے سوا میرا کون ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں پر اگر اپنے ارہان نہ نکالوں گی تو پھر کب خوشیاں اتریں گی یہاں۔“

”آنٹی! میں ناعمہ کے پاس چلی جاؤں؟“ فریحہ کھڑی ہوئی تھی۔ ”وہ اندرا کیلی بیٹھی ہوگی۔“
 ”ہاں ضرور۔ لیکن ابھی اصل کام تو باقی ہے اور تم اندر جا رہی ہو۔“
 ”تاریخ آپ لوگ سیٹ کر بس، یہ اپنا ڈیپارٹمنٹ نہیں۔“ وہ ہنسی تھی۔ قریب بیٹھی ورنہ کو ہاتھ ہلا۔ ترہوئے وہ اندر کی جانب بڑھ گئی۔

○ ○ ○
 سفید موتوں کے کام سے مزین گرین کلر کے کپڑوں میں ملبوس وہ بہت معصوم اور شگفتہ نظر آ رہی تھی۔ ڈرائنگ میل کے آئینے کے سامنے بیٹھ کر وہ قدرے محویت سے خود کو دیکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے آئینے میں ایک اور عکس کو اپنے عکس کے پیچھے ابھرتا ہوا دیکھا۔ ناعمہ چونک کر مڑی۔
 ”عزیز!۔۔۔ تم۔۔۔“

وہ دروازے کی چوٹ سے نیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی ہوئی تھی۔ ناعمہ کے پکارنے پر وہ چند قدم بڑھا کر اندر چلی آئی۔ سیاہ کپڑوں میں اس کی رنگت زرد اور مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔
 ”مبارک ہو۔“ اس کے لب ہلے۔ ”فرزادہ!۔۔۔“ اس قدر خوشی کی بات ہے۔ ہے نا۔ تمہارا یہ دکتا روپ بتا رہا ہے۔“

ناعمہ خاموشی سے اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی۔ اس کے چہرے پر اس کی آنکھوں میں اس کے انداز میں وحشت کا راج تھا۔ عریضہ اگر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ نجانے کیوں ناعمہ کو اس دیوانی لڑکی سے خوف سا محسوس ہوا تھا۔

”بہت خوش ہو، ہوں؟“

”نہیں۔“ ناعمہ نے سر جھکا کر قدرے اداسی سے کہا تھا۔ ”بالکل خوش نہیں ہوں۔ محض مجبوری ہے۔“
 ”وہ؟“ وہ طنز سے بولی۔ ”مجبوری۔۔۔ مجبورا شادی کر رہی ہو اس سے؟ جانتی ہو ناعمہ! مجبورا شادی کیسے کی جاتی ہے؟ جیسے میں کر رہی ہوں ایسے۔“
 ”جانتی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”تم کیا جانو گی۔“ وہ حقارت سے بولی۔ ”تمہارے دل پر تو ان عذابوں کا سایہ تک نہیں اترتا جو میری ذات کے اندر پر پھیلانے لگے ہیں۔ صرف اتنا جان لو جو تمہارا اپنے جا رہا ہے اس نے کبھی میری محبت کا دم بھرا تھا، میرے فراق میں آپس بھری تھیں، میرے لیے راتیں جاگی تھیں اور۔۔۔ جب میں زنجیروں میں جکڑی گئی، تب وہ تمہارے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ جانتی ہو کیوں؟ صرف اور صرف مجھے جلانے کے لیے، میرا تماشا بنانے کے لیے یہ جتانے کے لیے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا، وہ صرف دل کا ہلاوا اور تفریح تھی اور تم۔۔۔“ اس نے نفرت سے ناعمہ کو دیکھا۔ ”تم بھی خوشی خوشی اس کے تھیل میں شریک ہو گئیں۔ میں نہیں جانتی کہ تمہیں ان ساری باتوں کا علم ہے یا نہیں۔ لیکن اتنا جان لو کہ میرے قاتلوں کی فہرست میں تمہارا نام بھی شامل ہے۔ مجھے تم سے بھی نفرت ہے، مجھے سب سے نفرت ہے۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رودی تھی۔ ناعمہ تاسف سے اسے دیکھتی رہی۔

”مت روؤ عریضہ!“ پھر وہ آہستگی سے بولی۔ ”مت روؤ، کوئی تمہارا یا تمہاری خوشیوں کا قاتل نہیں ہے۔ یہ سب نسبیدوں کے پھیر ہیں۔ دل کسی کا ہوتا ہے، وجود کسی اور کا ہوتا ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔“
 ”مت ہلاؤ مجھے ان جھوٹے لفظوں سے۔“ وہ پھنکاری۔ ”میں بھی تم بہت خوش ہو، نیسے پانے جا رہی ہو اسے آسمان کا چاند سمجھتی ہو لیکن یاد رکھو، چاند صرف چند گھنٹوں کے لیے اپنا ہوتا ہے، چند پل گزرتے ہیں اور وہ دوسری چہمت پر نظر آتا ہے۔ وہ جو کل مجھ سے محبت کرتا تھا۔“
 ”وہ آج بھی تم سے محبت کرتا ہے۔“ ناعمہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”فرق اتنا ہے کہ محبت نے روپ بدل لیا ہے اور اسے اس کی خبر نہیں ہے۔“
 عریضہ اس کی بات پر حیران ہوئی۔
 ”کیا مطلب؟“ پھر وہ بولی تھی۔

”تمہیں یاد ہے عریضہ!“ ناعمہ آہستہ آہستہ بولنے لگی تھی۔ ”جب ہم اپنی اسکول میں پڑھتے تھے تب ہمیں انگریزی کے استاد گھر پر بھانے آتے تھے۔“

”ہاں۔۔۔ یاد ہے۔ لیکن یہاں ان پرانی باتوں کا کیا ذکر؟“

”تب ہم ان شران کے گھروں ملا کر انہیں مختلف طریقوں سے تنگ کیا کرتے تھے۔ ہے نا؟“

”ہاں۔“ وہ قدرے آکٹا ہٹ سے بولی۔ ”پھر؟“

”انہیں، کبھی اندازہ نہ ہوا تھا کہ ہم ایک نہیں دو مختلف لڑکیاں ہیں۔ تب ہمیں پتہ چلا تھا کہ ہماری آوازیں اور ہمارے آنے کے انداز میں بے تحاشا مماثلت ہے۔ تب ہم نے تنوں کو ایک لڑکی بن کر۔۔۔ بے وفائی بنایا تھا۔“
 ”اگر یہ بات تم کیا کرتی تھیں، آدھی میں اور کبھی کوئی ہماری چوری نہ پکڑ پایا تھا۔ ہے نا؟“

عریضہ بول چوکی تھی جیسے اسے کرنٹ لگا ہو، وہ ششدر سی اسے دیکھے گئی۔

”تم۔۔۔ تمہارا۔۔۔ تمہارا۔۔۔ مطلب ہے کس۔۔۔“

”ہاں۔“ ناعمہ نے سر جھکا لیا۔ ”فراز کو بھی کبھی اندازہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نہیں دو مختلف لڑکیوں سے بات کی ہے۔“

عریشہ یکدم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

”اور یوں۔۔۔ یوں تم نے میری محبت، ہتھیالی اور۔۔۔ اور اتنے اطمینان سے مجھے بتا رہی ہو۔“

”نہیں عریشہ! ناعمہ محبت کو بننے کے بجائے گڑتا دیکھ کر گھبرا گئی۔ ”تم میری بات تو سمجھو۔“

”تب ہی تم نے کہا کہ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ تم نے بیچ میں آکر نجانے کس طرح اس کی راہ کھولی کر دی۔ اسے اپنی جانب کھینچ کر لے گئیں۔“

”نہیں عریشہ! تم جانتی ہو تمہارا نکاح نافع سے ہو گیا تھا۔“

”ہاں ہوا تھا نکاح، لیکن میری نظر میں صرف اور صرف میرے دل کے رشتے کی اہمیت تھی۔ وہ مجھے چاہتا ہے اور میں اسے۔۔۔ اسی بات پر میں عمر گزار سکتی تھی لیکن۔۔۔ لیکن تم بے ایمان لڑکی! تم نے ہمیں ایک عجیب انجالی کسک میں مبتلا کر ڈالا ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو، میں اس بات کو آسانی سے بھول جاؤں گی؟ نہیں، ہمیں تمہاری اس بے ایمانی کی پوری سزا ملے گی۔ نہ میں نافع کی بیوی کی اور نہ فراز کو تمہارا بننے دوں گی۔ سنا تم نے۔“

”آہستہ بولو عریشہ! ناعمہ کا کالج کانپ گیا۔ ”کوئی سن نہ لے۔“

”جس کو سننا چاہیے وہ سب ضرور سنے گا۔“ وہ ایک عزم سے بولی۔

پھر وہ بیٹی اور کمرے سے نکل گئی۔ ناعمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اسے درود پوار گھومتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ حلق میں کانٹے لگنے لگے تھے۔ نجانے تقدیر اس کے ساتھ کیا کرنے والی تھی۔

”بھابھی! کسی نے یکدم قریب سے کہا۔“

ناعمہ بری طرح چونک اٹھی۔ اس کے پاس فریجہ کھڑی ہوئی تھی۔

تارکول کی سیاہ سڑک تاحد نگاہ نظر آتی تھی۔ اس سے پرے سیاہ بادلوں کے بڑے بڑے کٹڑے ایک دوسرے سے جڑ کر کھڑے ہوئے تھے۔ گویا کسی کارستہ روکنے کی تیاری کر رہی ہو۔ مغرب سے پرے کا وقت تھا۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو سرمئی آسمان اپنا رنگ بدلنے لگا۔ اس کے کناروں پر جیسے بدلیوں میں آگ سی لگ گئی۔ پل بھر میں آسمان گلابی ہو گیا تھا۔

ربیعہ کو احساس ہوا، درودور تک محض ویرانہ تھا۔ کہیں آبادی کا نام و نشان تک نظر نہ آتا تھا۔ ربیعہ گھبرا سی گئی۔ ایسے سنسان پر میں وہ تنہا وہاں کھڑی تھی۔

”ربیعہ! اسے کسی کی سسکی سنائی دی۔ ”ربیعہ! میں۔۔۔ میں یہاں ہوں۔ یہاں۔۔۔ یہاں۔“

ربیعہ نے پلٹ کر دیکھا۔ دائیں پھر یا میں۔ وہاں کوئی نہ تھا، تب ہی ایک شور کے ساتھ ہوا میں چل پڑی تھیں جیسے سارے بادل ابھی برسنے والے ہوں۔ ربیعہ کا جی چاہا وہاں سے بھاگ جائے۔

”ربیعہ! ربیعہ! کوئی رو رہا تھا۔ ”ربیعہ! یہاں آؤ۔ میں۔۔۔ یہاں ہوں۔ تمہارے قریب۔ آؤ تو۔۔۔ دیکھو تو۔۔۔ ملو تو۔۔۔“

ربیعہ کو خوف محسوس ہوا پھر وہ ایک بھاگی۔ تارکول کی سیاہ سڑک جیسے اس کے پیر تھانے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ بھاگی تھی۔ ربیعہ اپنی پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی۔

”ربیعہ! ربیعہ! آؤ اس کے قریب تر آئی گئی جیسے کوئی اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔

تب ربیعہ نے دیکھا، تارکول کی سیاہ سڑک کے آخری کونے پر کوئی کھڑا تھا۔ ربیعہ ٹھہر گئی۔ وہاں کوئی کھڑا تھا جیسے ربیعہ کے انتظار میں ہو۔

”ربیعہ! اس نے بائیں پھیلائیں۔“ آؤ۔ آؤ۔ میرے پاس۔“

ربیعہ اپنی جگہ رک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔
 ”ربیعہ!“ کوئی اس کے بالکل قریب بولا تھا۔ ربیعہ کو اپنی گردن پر کسی کی سانسوں کی گرمی محسوس ہوئی۔ اس کے لبوں سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی۔
 تب ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ایک جھکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سانس نہایت تیز رفتاری سے چل رہی تھی اور پورا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔

”ربیعہ!“ منہ ذہنی گیم تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر آئی تھیں۔ ”ربیعہ! کیا ہوا؟“
 ”امی جی۔“ وہ ان سے لیٹ کر رو پڑی۔ ”امی۔“
 ”ربیعہ! میری بچی۔ کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہو گئی تھیں۔

چند لمحوں میں ہی عباد اور انیقہ بھی چلے آئے تھے۔ وہ سب اس کے پاس بیٹھ گئے۔ ربیعہ نے سر اٹھا کر ان سب کو دیکھا۔ چند لمحوں بعد اس کے اوسان اس کے قابو میں آئے تھے۔ انیقہ نے اٹھ کر اسے پانی کا گلاس بھر کر دیا تو وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔
 ”ڈراؤنا خواب دیکھا تھا؟“ عباد اس کا چہرہ غور دیکھ رہا تھا۔

”بہت دن بعد۔“ اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”بہت دنوں کے بعد مجھے پھر۔۔۔ پھر سے۔۔۔“
 ”کیا مطلب پھر سے۔۔۔“ انیقہ حیران ہوئی۔ ”کوئی سیریز ہے خوابوں کی؟“
 ربیعہ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ ہمہ سامسکرائی تھی۔

”پتا نہیں انیقہ! سیریز ہی لگتی ہے۔ دادی کے انتقال کے بعد سے ایک عجیب سلسلہ شروع ہوا تھا۔ میں ہر دوسرے دن ایسا ہی کوئی خواب دیکھتی تھی۔ کبھی دادی نظر آتیں، کبھی ایک نادیدہ شخصیت کا واضح احساس ہوتا، کبھی خوف اور صرف خوف محسوس ہوتا۔“
 وہ تینوں حیران سے ہو کر اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ لوگوں کے پاس آنے کے بعد ان خوابوں میں کی آگئی تھی پھر یہ سلسلہ بالکل موقوف ہو گیا تھا لیکن آج پھر اتنے دن کے بعد۔“

”تم کہو تو میں تمہیں باہر نفسیات کے پاس لے چلوں گا؟“ عباد ہمدردی سے بولا۔
 ”ارے نہیں عباد بھائی!“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ”جو کچھ آپ لوگ کرتے ہیں میں اسی کا احسان نہ اُتار پاؤں گی ساری عمر۔“

”احسان؟“ عباد ناراض ہوا۔ ”تم ہماری محبتوں کو احسان شمار کرتی ہو ربیعہ! ہم سب تو بھول چکے ہیں کہ تم کوئی آؤٹ سائڈ رہو۔ امی کے لیے تم تیسری بیٹی ہو اور میرے لیے تیسری بہن۔“

”عباد ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ منہ ذہنی گیم نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ ”اور یہ بات تم بھی جانتی ہو بلکہ ہم سب جانتے ہیں کہ تم بھی ہمارے لیے ایسے ہی سچے جذبات رکھتی ہو۔“

”آئندہ یہ احسان وغیرہ کی بات میں نہ سنوں۔“ عباد بولا۔ ”اور کل شام میں تمہارے لیے کسی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ لوں گا میرے ساتھ چلنا۔“

”نہیں عباد بھائی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ گھبرا کر بولی۔
 ”ہم سب جانتے ہیں کہ تم ٹھیک ہو۔“ وہ مسکرایا۔ ”لیکن خواب ذرا غلط قسم کے دیکھ رہی ہو۔ علاج تمہارے خوابوں کا ہونا ہے تمہارا نہیں۔“

منہ ذہنی گیم اور انیقہ، ہنس دی تھیں۔ ربیعہ بھی مسکرا دی۔
 ”چلو اب سو جاؤ! اب یقیناً تمہیں پرسکون نیند آئے گی۔“ عباد کھڑا ہوا۔ ”بلکہ انیقہ تمہارے ساتھ ہی سو جائے گی یہاں۔ کیوں انیقہ؟“

”ضرور۔“ نفیقہ مسکراتے ہوئے اس کے قریب ہی لیٹ گئی۔ عباد اور منیرہ بیگم باہر نکل گئے تھے۔

رات کے دو بجے کا عمل تھا۔ کروٹیں بدل بدل کر جب وہ تھک گئی تو اس نے کروٹ لے کر سوئے ہوئے ہاشم کی پشت کی جانب دیکھا۔ اس کا جی چاہا، وہ عمر کی آواز سے پھر وہ ڈر گئی۔ اس خواہش کے بے حد خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ کچھ دیر وہ بونٹی لیٹی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سر میں درد سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ بستر سے پیر لٹکا کر اس نے اپنے سلیپر ٹیبلے پھر اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ رابداری میں زیر و پاؤر کے تین چار بلب روشن تھے۔ شہلا سیدھی چلتی چلی گئی پھر بیڑھیاں اتر کر وہ بچن میں چلی آئی تھی۔
لائٹ جلا کر اس نے ساس پن میں پانی ڈالا اور برز جلا کر خود چائے کی پتی نکالنے لگی۔
”کیا بات ہے؟“ تیز آواز پر وہ بری طرح چونکی۔

اس نے مڑ کر دیکھا۔ بچن کے دروازے پر فردوس بیگم کھڑی تھیں۔ ان کے ماتھے پر بڑی تیوریاں دوڑ رہی سے نظر آتی تھیں۔

”کچھ نہیں امی جی! میرے سر میں درد تھا۔ میں چائے بنانے کے لیے آئی تھی۔“ وہ نہی سے بولی۔
”سارا گھر سو رہا ہے اور تم کھڑے پیر کر کے ساروں کی نیند خراب کرنے پر تلی ہو۔“ وہ سختی سے بولیں۔
”اتنے دن ماں کے گھر رکھنے سے سونے جانے کی عادتیں بونٹی بگڑ جاتی ہیں۔“
شہلا کے ہاتھ رک گئے۔ وہ کبھی بھی اتنی سخت گفتگو سننے کی عادی نہ رہی تھی۔
”امی جی! میں نے آپ کو بتایا ہے نا، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”کچھ دن سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے رات ٹھیک طرح سے نیند نہیں آتی۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا تو بہت معذرت۔“

”طبیعت۔۔۔ طبیعت تو ہماری خراب ہو گئی لی بی! جب سے ہم اپنے لڑکے کے مطالبے پر تمہیں لے آئے۔ بتاؤ! ایسی ہوتی ہیں ہوسیں۔ آدھی رات کو چائے بناتی نظر آتی ہیں۔ بقیہ دن کمرے میں غائب۔ کسی بال بچے کا کوئی اتاپتا کچھ خبر نہیں۔ ایک پیدا کیا، اس کی بعد توبہ کر لی۔ ہم ترستے ترستے مرجائیں۔ بیٹا کچھ کتا نہیں لیکن اس غریب کی آنکھیں اپنی غلطی پر شرمسار لگتی ہیں۔“
وہ بڑبڑاتے ہوئے پلٹ گئی تھیں۔ شہلا اپنی جگہ پر سن کھڑی تھی۔ اتنی تلخ کلامی کا تو اس کی شائستہ طبیعت نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس نے اچلتے ہوئے پانی کی شاں شاں تنی پھر برز آف کر دیا۔ طبیعت نہایت نرم رہتی تھی۔ وہ چائے بناتے بغیر پلٹ گئی۔ بیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ عجیب سی ذہنی حالت کا شکار تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر وہ ہاشم کی جانب بڑھی۔

”ہاشم! اس نے بے حد سخت سے انداز میں اس کا شانہ ہلایا۔
ہاشم گھبرا کر اٹھا، وہ بے حد تھک کر بالکل عاقل سویا ہوا تھا۔
”کیا کیا؟ کیا ہوا؟“ وہ حیران سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”میاں بیوی کے درمیان جو سیکرٹس ہوں، انہیں میاں بیوی کے درمیان ہی رہنا چاہیے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ ایسے معاملات پر بھی اپنے گھر والوں سے بات کر سکتے ہیں۔“
ہاشم پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا پھر اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔
”جو کچھ تم کہہ رہی ہو، کیا اس کی تفصیل مجھے خواب میں بتائی جا چکی ہے؟“ وہ بے چارگی سے بولا تھا۔
”آپ نے۔۔۔ آپ نے۔۔۔ اپنے گھر والوں کو کیا بتایا ہے؟“ ابھی آپ کی والدہ نے مجھے کہا کہ میں نے ایک بچہ پیدا کر کے توبہ کر لی اور یوں آپ کو اور سب گھر والوں کو ترسار رہی ہوں۔“
”امی نے؟“ ہاشم کی ہنوس حیرانی سے چڑھ گئیں۔ ”وہ وہ یہ کہنے یہاں آئی تھیں؟ اس وقت؟“

”وہ یہاں نہیں آئی تھیں۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔ ”میں چاہتا ہوں کہ یہ سب کچھ سمجھ گیا۔“

”میں سمجھتی ہوں، میاں بیوی کے درمیان جو سیکرٹس ہوں۔“

”کس سیکرٹس کی بات کر رہی ہو شہلا تم۔“ دفعنا ”وہ ڈپٹ کر لولا۔“ ہمارے درمیان کبھی ایسا کوئی سیکرٹ ڈسکس نہیں ہوا۔ اگر تم نے یہ سیکرٹ کسی ”اور“ سے ڈسکس کیا ہو تو علیحدہ بات ہے۔“

شہلا یوں کھڑی ہوئی جیسے اسے شک لگا ہو۔

”کیا۔ کیا آپ نے۔؟“

”میں اپنے گھر والوں سے کیا کہتا ہوں؟ کیا نہیں۔ یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ ”میاں بیوی“ کے حوالے سے تم ایسی بات کیسے کر سکتی ہو۔ ہمارے درمیان ”میاں بیوی“ والی کون سی بات ہے شہلا؟“

وہ چڑ کر بول رہا تھا۔

”ہاشم! شہلا ایک خیر کے عالم میں اسے دیکھے گئی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔“

”جو کچھ تم نے کیا شہلا! وہ صرف تمہارا سیکرٹ تھا۔ میں اتفاقاً اسے پا بیٹھا۔ یہ علیحدہ بات ہے اس لیے مجھ پر یہ پابندی عاید مت کرو کہ میں اسے خود تک محدود رکھوں۔ کیوں کروں میں ایسا؟“ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

”کیا یہ سچ نہیں ہے جو کچھ امی نے تم سے کہا۔؟“

شہلا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا ”اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبرز تھیں۔ ہاشم کے دل کو کچھ ہوا۔“

”میں نے آپ کو بتایا تھا ہاشم۔ میں۔ میں۔ صرف عمر کے لیے۔“

”واٹ ایور دارین وان۔ مجھے اس سے غرض نہیں۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

”ہاشم! آپ۔ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔“ شہلا نے رخ موزا تھا۔

”ہوں۔ تو تم تیار ہو۔ کیا میں یہ سمجھوں؟“ ہاشم نے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔ ”ہاتھ نگن کو آرسی کیا۔“

شہلا اس کا مطلب سمجھ کر جیسے بدک کر پیچھے ہٹی تھی۔

”میں بھی میں ذہنی طور پر تیار نہیں، پلیز۔“

”نہ ذہنی طور پر۔ نہ دلی طور پر۔ یہی حقیقت ہے۔“ ہاشم کے چہرے پر جیسے بار کے آئینہ نظر آنے لگے

تھے۔ ”ٹھیک ہے شہلا! مجھے کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں مجبوری کا قائل نہیں ہوں۔ مجبور بننا بار

بس محبت میں اٹھانا ٹھیک ہے۔ تم جب کسی منطقی نتیجے پر پہنچو، مجھے صرف آگاہ کرونا اور ہاں میں کسی راز و خفیہ

رکھنے کا پابند نہیں تھا لیکن میں نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔ تم ایسا سوچ بھی کیسے ہو کہ میں یہ سب کسی

سے کہہ سکتا ہوں۔ دل کی شکست کا اظہار اتنا آسان نہیں ہوا کرتا۔“

جھکے تھے انداز میں کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ شہلا کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سر کا درد اب اپنی انتہا کو پہنچ

رہا تھا، وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بستر پر گر سی گئی۔

”تیار ہو رہیہ؟“ عباد نے دستک دیتے ہوئے کمرے میں چھاٹکا۔

”ہیہ۔ جو اپنا دوشہ ٹھیک طرح سے اوڑھ رہی تھی، چونک اٹھی۔“

”جی عباد بھائی! میں تیار ہوں۔ ویسے آپ بے حد تکلیف اٹھا رہے ہیں۔ مجھے ان نفسیات کے ماہروں پر کچھ

زیادہ اعتبار نہیں ہے۔“

”تم خود جو بہت بڑی ماہر نفسیات ہو۔ چلو، فافٹ باہر آجاؤ۔ میں گاڑی میں بیٹھا ہوں۔“ وہ باہر نکل گیا تھا۔

ربیعہ نے ایک نظر آئینہ پر ڈالی پھر اپنا بیگ اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔

فرشتہ در کھول کر وہ بیٹھی تو عباد نے گاڑی اشارت کی۔

”ہمیں رستے میں کچھ دیر کے لیے ٹھہرنا ہوگا۔“ عباد بولا۔ ”ڈاکٹر کا نام آٹھ بجے سے ہے اور ابھی ساڑھے چھ بجے ہیں۔“

”لیکن ہم اتنی جلدی کیوں نکلے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کیونکہ مجھے امیر حسن سے ملنا تھا وہ آفس میں میرا منتظر ہوگا۔ آدھے گھنٹے کی مینٹگ ہے پھر ہم سیدھے ڈاکٹر کی طرف چلیں گے۔ ٹھیک؟“

”چھا۔ ٹھیک ہے۔“ وہ نیم بولی سے بولی۔

امیر حسن کی کمپنی کا آفس شہر کی مشہور و معروف بلڈنگ میں تھا۔ ربیعہ اس کا آفس دیکھ کر متاثر ہوئی۔ امیر حسن یقیناً فنکارانہ مزاج کا بندہ تھا۔ اس نے اپنا آفس بہت دلکش انداز میں سجایا کیا تھا۔ دیواروں کا پینٹ اور فرنیچر کی کلاسیک ہی بہت زبردست اور نمایاں جدید تھی۔ جگہ جگہ انڈور پلانٹس ایسی ترتیب سے رکھے گئے تھے کہ ہر چیز میں ایک خاص تناسب اور حسن نظر آتا تھا۔ ربیعہ ہر چیز کا بہت محو ہو کر جائزہ لے رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“

ربیعہ چونکی۔ امیر حسن پر غلوص مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کر رہا تھا۔

عباد نے مڑ جوش انداز میں اس سے مصافحہ کیا۔ ربیعہ نے بھی مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

”آئیں پلیز۔“ وہ انہیں لے کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

انہیں بٹھا کر اس نے انٹر کام پر کافی کا آرڈر دیا پھر ان لوگوں کی جانب متوجہ ہوا۔

”۴۰ مس ربیعہ۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے اب۔۔۔ چوٹ کا کیا حال ہے؟“ وہ گفتگو سے اس کا ہال بوجھنے لگا۔

”اوہ۔ آپ کو اب تک وہ مراد یاد ہے۔“ ربیعہ دھیمے سے ہنس دی۔ ”میں تو اسے بھول بھی چکی ہوں۔۔۔ چوٹ کا حال کیا۔۔۔ ناؤں۔“

”پارک جانے میں احتیاط کیا کریں۔ کیا خبر کتنے کو اب تک یاد ہو۔“

ربیعہ اور عباد ہنس دیے تھے۔ ربیعہ کو اندازہ ہوا کہ وہ بے حد شگفتہ اور دل چسپ شخصیت کا حامل نوجوان تھا۔ کچھ دیر اوپر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد امیر حسن اور عباد اپنی برنس کی باتوں میں مگن ہو گئے۔ ربیعہ آفس کی اشیاء پر نگاہیں دوڑاتی رہی۔

اچانک ہی اس کی نظریں امیر حسن کی سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر جا پئی تھیں۔ وہ تصویر ایک جوان شخص کی تھی۔ نجائے اس کے چہرے میں ایسی کیا بات تھی ربیعہ اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ ایک ٹک وہ اس تصویر کو دیکھتی رہی۔ اس چہرے اور ان نگاہوں میں ایک مقناطیسی کیفیت تھی۔ ربیعہ اس مقناطیسمیت کا شکار ہو گئی۔ اس کے سامنے رکھی کافی ٹھنڈی ہو گئی۔ امیر حسن اور عباد کی گفتگو اختتام کو پہنچی۔ ربیعہ اسی کیفیت میں بیٹھی وہ تصویر دیکھتی رہی۔

عباد اور امیر حسن اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں نے الوداعی مصافحہ کیا پھر عباد نے چونک کر ربیعہ کو دیکھا۔ امیر حسن کی نگاہ اس کے سامنے رکھے ہوئے کافی کے پھرے کپ پر پڑی۔

”ربیعہ۔! دونوں کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا۔

ربیعہ بری طرح چونکی۔

”کی۔۔۔ کی۔۔۔“

”کہاں کھوئی ہوئی ہو تم؟“ عباد حیران تھا۔

”یہ تصویر۔“ اس نے غائب دماغی سے تصویر کی جانب اشارہ کیا۔
 ”یہ شہیار ہے۔ شہیار احمد۔ میرا کزن۔ میرا دوست۔ میرا بزنس پارٹنر۔“ امیر حسن بولا۔ ”لیکن آپ کو اس تصویر میں کیا بات نظر آئی؟ کیا آپ نے آج سے پہلے اسے دیکھا ہے؟“
 ربیعہ جیسے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

”ربیعہ!“ عباد نے اسے ملاحت سے پکارا۔ ربیعہ چونکی۔

پھر وہ ان دونوں کو دیکھ کر غائب دماغی سے ہٹ کر آئی۔

”چلیں۔“ اس نے عباد سے پوچھا۔

”آپ نے بتایا نہیں ربیعہ!“ امیر حسن نے تجسس سے چمکتی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

”کیا؟ کیا نہیں بتایا؟“ وہ حیران سی ہوئی۔

”یہی کہ شیری کی تصویر میں آخر آپ کو ایسی کون سی غیر معمولی بات محسوس ہوئی؟ آپ۔ آپ اس طرح گرد و پیش سے بے خبر کیسے ہو گئیں؟“

ربیعہ چند لمحے غور کرتی رہی پھر اس نے بے چارگی سے کانڈھے اچکا دیے۔

”میں خود نہیں سمجھ سکی۔ لیکن اس چہرے میں ایک مقناطیسی محسوس کی میں نے۔ ایک عجیب سی کشش۔“

”شیری۔۔۔ کبھی پاکستان نہیں آیا۔“ امیر حسن مدھم سا مسکرا کر بولا۔

”آپ بھی پاکستان سے باہر گئی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔ بھی نہیں!“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”بس پھر اتنا تو طے ہے کہ آپ لوگوں کی بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ باقی اگر دور پرے کی کوئی رشتہ داری نکل آئے تو الگ بات ہے۔“

تینوں ہی ہنس دیے تھے۔

”یہ ربیعہ۔۔۔ ویسے بھی کچھ۔“ عباد نے انگلی کو کپٹنی کے پاس لا کر گولائی میں گھمایا۔ ”اس کی باتوں پر اتنا

دھیان مت دو۔“

امیر حسن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر وہ ان دونوں کو سی آف کرنے باہر تک آیا۔

”آپ جاب وغیرہ میں انٹرنیٹڈ نہیں ہیں؟“ عباد پارکنگ ایریا سے گاڑی لینے گیا تو امیر حسن نے گلاسز کے پیچھے

چھپی نظروں سے اسے دیکھا۔

”جاب؟“ ربیعہ حیران سی ہوئی۔ ”میرا ایم اے ابھی مکمل نہیں ہوا۔“

”اگر اسے ضروری نہ سمجھا جائے تو؟“ وہ مدھم سا مسکرایا۔

”تو۔“ ربیعہ سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا ”تو شاید۔۔۔ میں اپنا کام اچھی طرح سے نہ کر سکوں گی۔“

”خوبصورت معذرت ہے۔“ اس نے خوش دلی سے سر ہلایا۔

”آپ کی گاڑی آگئی۔“

”ربیعہ نے دیکھا۔ عباد اس کے انتظار میں تھا۔

”اللہ حافظ۔“ وہ دھیسے سے مسکرا کر آگے بڑھ گئی۔

امیر حسن کے لب۔ آہستگی سے ہلے تھے۔

لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو فروس بیگم کو سامنے ہی بیٹھا ہوا پایا۔

”السلام علیکم۔“ وہ بریف کیس میز پر رکھ کر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں حد درجہ تھکاوٹ

تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ انہوں نے بے حد گہری نگاہ سے اس کے ہر انداز کو دیکھا۔ ”بہت اچھے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔“

”جی امی۔“ ہاشم نے آنکھوں کو بازو سے ڈھانپ لیا۔ ”آفس میں اتنا کام ہے کہ لپچ کرنے کا نام بھی نہیں مل پاتا۔ چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو جاتی ہے لیکن گھونٹ بھرنا مشکل لگتا ہے۔“

”اے ہے۔ کیا دوز برا عظم لگ گئے۔“ وہ تشویش سے بولیں۔

”ہٹاؤ۔ ناشتہ بھی نہیں کر کے گئے تھے۔ خالی پیٹ کیا خاک کام کرتے ہو گئے۔ اس طرح تو آدمی کی کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اے ہاں۔ یونی تو نہیں کہتے کہ مرد کی کامیابی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ سیانے لوگوں نے بھی سوچ سمجھ کر یہ کہا دیا ہے۔ بیگم کا حال دیکھ لو صبح سے رات ہونے کو آئی ہے۔ انہوں نے شکل نہیں دکھائی۔ کیا پکا ہے کیا نہیں کس نے کھایا کس نے نہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہے۔ اور کسی کا نہیں اپنے شوہر کا تو خیال کریں۔ اسے تو دیکھیں۔ پریمال کسے پروا ہے۔ نہ بی بی کو نہ شوہر کو۔ ایک کولہو ہے جس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان کی گرہستی ہے۔“

ہاشم نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا، سامنے ہی مایہ ناز کا بیٹا اپنا بیٹا اٹھائے بھاگا پھر رہا تھا۔

”مایہ ناز آئی ہے؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”ہاں بلایا ہے ہم نے۔ ناعمہ کے ساتھ عرشہ کی تارنخ تو رکھ دی ہے۔ لیکن عذر اینگم نے نہ تو شگون کی مٹھائی ہی بھجوائی نہ مزید کوئی پیش رفت کی۔ اپنا مایہ ناز سے معاملے کی جانچ کرواتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ ہاشم نے بیٹھ کر بریف کیس نزدیک کیا۔ میری اس سلسلے میں رافع سے بات ہو چکی ہے۔ وہ لوگ تانیہ کے سسرال والوں سے تمام معاملات طے کر کے پھر ہماری طرف آئیں گے۔ تارنخ وہی ہے جو ناعمہ کی رکھی گئی ہے۔“

اس نے بریف کیس کھول کر چیک بک نکالی۔ پھر چیک لکھ کر کاٹا اور ان کی جانب بڑھایا۔

”فی الحال تین لاکھ کا چیک دے رہا ہوں۔ مایہ ناز اور عرشہ مل کر زیور اور کپڑوں وغیرہ کی تیاری کر لیں۔ فرنیچر کا آرڈر میں خودوں گا۔“

اس نے بریف کیس بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔

”جیتے رہو۔“ وہ نہال نظر آنے لگیں۔ ”اب کہاں چل دیے۔ کھانا لاتی ہوں۔ صبح کے بھوکے ہو۔“

”میں ہاتھ لوں گا پہلے سخت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔“

اس کے بڑھتے ہوئے قدم بیکام تھے۔

”شہلانے بھی صبح سے کچھ نہیں کھایا؟ آپ اس سے پوچھ تو لیتیں۔“

”ہم سے پوچھنا اس کا کام ہے۔ اس سے پوچھنا ہمارا کام نہیں۔“ وہ بے نیازی سے چیک دیکھ رہی تھیں۔

”ایسے بے جالاؤ ہم نے بیٹیوں کے نہیں اٹھائے کبھی۔“

”بہت اچھا کیا۔“ اس نے ہڑبڑا کر سرد آہ بھری تھی۔ پھر وہ بیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو اسے جس اور ٹھن کا احساس ہوا تھا۔ نیم اندھیرے ماحول سے شناسا ہونے میں اس کی آنکھوں کو چند لمحے لگے پھر اس نے دیکھا۔ شہلا تکیے میں منہ دیے اوندھی لیٹی تھی۔

”کم از کم اے سی تو آن کر لیتیں۔“ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ریوٹ اٹھا کر اے سی آن کیا۔

”امی بتا رہی ہیں۔ آج کمرے سے نکلیں ہی نہیں۔“ وہ بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ ”کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔؟“

شہلا کی جانب سے کسی رد عمل کا اظہار نہ ہوا۔ ہاشم ڈرنک روم میں گھس گیا۔ چند لمحوں بعد وہ اپنا گاؤن پہنے برآمد ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے آرام کرنا چاہتا تھا، کیا کہ اسے کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ شہلا کی پوزیشن

میں رتی بھر تیر ملی نہ آتی تھی۔ ہاشم بے ساختہ اس کی جانب بڑھا۔
 ”شہلا! ہاشم نے اسے کاندھے سے پکڑ کر سیدھا کیا پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔
 شہلا کا جسم تیز بخار میں پھنک رہا تھا وہ تقریباً ”ہشیم بے ہوش“ تھی۔
 ”شہلا، شہلا! آنکھیں کھولو۔“ ہاشم نے اسے زور سے ہلایا۔
 پھر وہ بجلی کی تیزی سے اٹھا شہلا کو بازوؤں میں اٹھا کر وہ تیز قدموں سے باہر کی جانب بڑھا۔



”ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے یہ کئی دنوں سے حالت فاقہ میں تھیں۔ انہوں نے کب سے کچھ کھایا یا نہیں ہے؟“ اسے احساس ہو رہا تھا جیسے شہلا کی اس حالت کا ذمہ دار وہی ہے۔
 ”آپ کے درمیان کوئی کشیدگی ہے؟“ ڈاکٹر سلطان نے اس کے چہرے سے اس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”جی؟“ وہ برسی طرح چونکا ”کشیدگی؟“

پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے؟ ”ہاں نہیں شاید۔“

ڈاکٹر نے اس کی کیفیت سے از خود ہی کوئی مطلب اخذ کیا پھر اس کا شانہ تھمتھایا۔

”میاں بیوی کے درمیان کبھی بھی سیدھا راستہ نہیں ہوتا بیٹے۔ یہ ایک زگ زیگ ہے۔ یہ رشتہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ بے تحاشا توقعات بے تحاشا سببات۔ لیکن۔۔۔ بہت سی محبت اسی لیے ہر زگ زیگ کے بعد ایک خوبصورت موڑ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

ہاشم گو گو کا شکار اپنی ہی سوچوں میں گم کھڑا تھا۔ اس نے بمشکل ڈاکٹر سلطان کی جانب دیکھا۔

”جی۔۔۔“

”آپ اتنا گلٹی فیل مت کرو۔ خواتین کو ذرا اسی بات پر کھانا پینا چھوڑ دینے کی بیماری بہت پرانی ہے۔“ وہ مسکرا رہے تھے۔

”ڈاکٹر شہلا بالکل ٹھیک ہیں۔ میں نے انجکشن بھی دیا ہے۔ یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔“

”ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! ٹھیک ہو، ٹھیک ہو۔ سوچ۔“ وہ بہت ممنونیت سے بولا۔

وہ اس کا شانہ تھمتھاتا کر کمرے سے نکل گئے تھے۔ ڈاکٹر سلطان اس کے والد کے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے گھرانے کی ان سے پرانی شناسائی تھی۔ اسی لیے ہاشم شہلا کو ان کے کلینک لے آیا تھا۔ اس نے شہلا کے گھر کسی فرد کو بھی اس بات کی خبر نہیں دی تھی۔ اس کے اپنے گھر میں بھی کسی نے اسے شہلا کو لے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا وہ شہلا کے قریب آکھڑا ہوا۔ وہ برسکون انجکشن کے زیر اثر غنودگی میں تھی۔

ہاشم نے اس کے پہلو میں رکھے ہوئے نرم ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

”آپ اتنا گلٹی فیل مت کرو۔“

ڈاکٹر سلطان نے اسے کہا تھا، لیکن حقیقت یہ تھی کہ ہاشم اس وقت سخت پیشانی محسوس کر رہا تھا۔ کتنے دن

ہوئے اس نے شہلا کے حال سے واقف رہنا چھوڑا ہوا تھا۔ عمر کے چلے جانے سے اس کے دل پر قیامتیں بیت گئی

تھیں۔ وہ غم سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ لیکن ہاشم نے اس کے دکھے دل پر اپنی محبت کے اظہار کا مرہم رکھنے کی

ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ اسے وہ منظر صرف ابرار کی فاتحانہ مسکراہٹ کے حوالے سے یاد آ رہا تھا۔ اسے شہلا

کی آنکھیں یاد نہ آتی تھیں۔

پچھلی رات جب شہلا نے اسے جگایا تھا تب وہ کس قدر شکستہ دل لگتی تھی۔ اس نے فردوس بیگم کے خراب

روپے کی شکایت کی تھی تب ہاشم نے اس سے کتنا خشک رویہ رکھا تھا۔ اسے سب یاد تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔

وہ بستر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا، اس نے شہلا کی بند پلکوں کو دیکھا۔ اس کے زرد چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ کتنی کمزور ہو رہی تھی۔ نجانے اس نے کب سے کھانا پینا چھوڑا ہوا تھا۔ وہ اکثر شدید سر درد کی شکایت کرتی تھی۔ اس نے اسے قابلِ توجہ نہ جانا تھا۔

”شہلا... شہلا... آئی ایم سوری۔ آئی ایم ویری سوری۔“ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”محبت کرنے والے یقیناً ایسے نہیں ہوتے۔ تم نے میری دعویٰ کو جھوٹا پایا ہو گا۔ نجانے کس بات پر یقین کر کے تم میرے ساتھ چل پڑی تھیں۔ اور میں نے دکھ کے سوا تمہیں کچھ نہیں دیا۔“ اس نے شہلا کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگالیا۔

”میں... اپنے ہی اندیشوں کا شکار بدگمانی کی دھند میں رستہ ڈھونڈتا رہا۔ تمہارے رستے میں بڑے پتھروں کو چھٹا بھی میرا فرض ہے میں نے نہیں سمجھا۔ میں میں وہ نہیں نکلا شہلا جس کا میں نے تم سے دعویٰ کیا تھا۔ یقین جانو۔ اتنا یقین رکھنا کہ میری محبت میں تمہارے لیے آج بھی وہی شدت ہے۔ وہی حدت ہے۔ وہی خلوص ہے۔ وہی سچائی ہے۔ سارے رستے صرف تمہاری جانب آتے ہیں۔“

اس کی آنکھوں سے نکلے آنسوؤں سے شہلا کا ہاتھ نم ہو گیا تھا۔

”مما... ممما...“ مومن نے زور سے اس کا شانہ ہلایا۔ تب وہ چوٹکی۔

”جی بیٹا... بولو...“ اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے بیٹے کا چہرہ دیکھا۔

”مما... میرا پروگریس کارڈ ہے۔ اس پر سگنچر کرویں۔“ اس نے ایقان کی سمت کارڈ اور پین بڑھایا۔

ایقان نے دونوں چیزیں تھامیں اور کارڈ پھول کر ”پیرنٹس سگنچر“ کے خالی خانے میں دستخط کر دیے۔

”یہ لو...“ اس نے مومن کو کارڈ واپس کرنا چاہا۔

مومن نے کارڈ نہیں تھاما۔ وہ کھلی آنکھوں سے ایقان کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے جرات سے اسے دیکھا۔

”آپ نے مجھے کچھ بھی نہیں کہا۔“ وہ دمِ ہم سا بولا۔

”کیا مطلب؟“ وہ ابھی پھرا گلے لمحے ہی سمجھ گئی۔

اس مرتبہ اس نے کارڈ دوسری ہی نظر سے دیکھا تھا۔ پورے کارڈ پر نظر دوڑاتے ہی اس کا دل جیسے بند ہونے لگا۔

”مومن... مومن... وہاں از دس؟ یہ... یہ پروگریس ہے تمہاری۔ اتنا خراب کام... اتنے برے

ریکارڈس۔“

وہ خاموش کھڑا لب کاٹتا رہا۔ ایقان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”میں اتنی ذہنی ٹینشن میں بھی تمہیں پڑھاتی ہوں۔ تمہارا کام چیک کرتی ہوں۔ تمہیں یاد کرواتی ہوں۔ پھر بھی تم نے اتنے خراب ٹیسٹ دیے کیوں... کیوں مومن؟ باپ نے کیا کم احسان کیے ہیں میری ذات پر جو تم بھی مجھ ناتواں کو جلانے پر مل گئے ہو۔“

”آپ اب اس طرح نہیں پڑھائیں جیسے پڑھایا کرتی تھیں۔ وہاں اپنے گھر میں۔“

”وہ گھر اب اپنا نہیں ہے۔ اپنا گھر یہ ہے۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔ سمجھ تم؟“

”جی نہیں، میرا گھر وہی ہے۔ میرے پیپا والا۔ یہ گھر آپ کے پیپا کا ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گا۔“ وہ ہٹ

دھری سے بولا۔

ایقان نے غور سے اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھا۔

”ٹھیک ہے“ پھر وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ ”اپنی ماما کو چھوڑ کر چلے جاؤ وہاں دیکھو تمہیں وہاں اپنے پیہا ملتے ہیں یا نہیں۔“

”جا بھی سکتا ہوں۔“ وہ بے خوفی سے بولا۔ ”عمر بھی اپنی ماما کو چھوڑ کر اپنے پیہا کے پاس چلا گیا ہے۔ وہ وہاں بہت خوش ہے۔ اس کے پیہا بھی بہت اچھے ہیں۔ میں بھی اپنے پیہا کے پاس خوش رہ سکتا ہوں۔“

ایقان کا غصے سے بُرا حال ہو گیا اس نے بھیچ کر ایک پھینٹ اس کے گال پر جڑا پھر دو سرا پھینٹ اس کے سرے گال پر مارا۔

”تم سب کے پیہا بہت اچھے ہیں، تمہاری مائیں ہی خراب ہیں۔ ان کے نصیب جو خراب ہیں، اپنے لمبوی بوندوں سے تمہارے جسم تراشے۔ تمہیں جنم دیا۔ تمہارے لیے راتوں کو جاگے۔ خون جگر پلا کر تمہیں اتنا کیا ہے ہم نے۔۔۔ اچلے جاؤ اپنے باپ کے پاس جو ان ہو کر بھی تم نے یہی کہنا اور یہی کرنا ہے۔ اس لیے ابھی چلے جاؤ تو بستر وہاں جس گوری ڈائن کو اس نے سر پر بٹھایا ہوا ہے نا وہ تمہیں تمہاری اوقات کا پتا دے گی۔“

وہ خود بھی چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ مومن جو مار کھا کر بری طرح رو رہا تھا اب اس کے رونے سے سہم کر خاموش ہو گیا اور اسے دیکھنے لگا۔

ایمان اندر سو رہی تھی ان کی آوازوں سے ڈر کر جاگی اور بھاگتی ہوئی باہر چلی آئی۔ اب ایقان کی آواز میں اس کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔

دروازے کی چوکت پر کھڑے رافع کے لیے یہ منظر ناقابل یقین اور ناقابل برداشت تھا وہ انتہائی تیزی سے اندر آیا۔

”پھینٹو۔۔۔ پھینٹو کیا ہوا ہے؟“ اس نے بلکتی ہوئی ایقان کو کاندھے سے لگایا، دو سرا بازو بٹھا کر ایمان کو سمیٹا۔

”رافع! رافع! میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ بے ایمان شخص کسی اور کا ہو گیا۔ میری اولاد بھی اسی کی ہے۔ یہ بچے اسی کے ہیں رافع! اسی کو دے آؤ۔ مجھے زہر لاؤ۔ خدا کا واسطہ ہے تمہیں۔ مجھے تھوڑا زہر لاؤ۔“

”پھینٹو۔۔۔ بلینے۔۔۔ سنھالیں خود کو۔ خدا کا واسطہ میں آپ کو دیتا ہوں۔ اتنی کم ہمت نہ بنیں میں تو آپ کو بہت اسٹرانگ سمجھتا تھا پھینٹو۔ بہت برابر اور نڈر۔ آپ اتنی کمزور کیسے ہو گئیں؟“

”کوئی عورت بہادر نہیں ہو سکتی۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”کیسے ہو سکتی ہے بہادر۔ مٹی سے نہیں جذبات سے بنی ہے عورت۔ ذرا سی تیش سے پکھلنے لگتی ہیں۔ چاہے تیش غم کی ہو، غصے کی ہو یا محبت کی اسی جھپے تو اتنی آسانی سے بےوقوف بن جاتی ہے کم بخت۔“

اس نے اس طرح دانت پیس کر کہا کہ رافع کو ایسے موقع پر بھی ہنسی آگئی۔

”مت ہنسو میری بے چارگی پر۔ میں اس وقت بہت تنہا محسوس کر رہی ہوں خود کو۔ یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ مومن جس کی آواز سے میری صبح میری شام ہوتی ہے یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ وہاں اپنے باپ کے پاس، کیونکہ میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ باپ کے پاس بہت کچھ ہے۔“

وہ پھر بلی، مومن اب سخت نا دم نظر آتا تھا۔

”ٹھیک ہی کتاب ہے، اب میرے پاس بچا کیا ہے۔ اسے دینے کے لیے، جنم میں اسے دے چکی ہوں، اپنی خوبصورت نیند سے بھری راتیں۔ اس کی دیکھ بھال میں گزار دیں میں نے۔ اس کے پونزے دھو کر ہاتھ چھل گئے تھے میرے۔ وہ وقت بھی گزر گیا۔ اب یہ بڑا ہو گیا ہے اسے اب میری ضرورت نہیں ہے۔ سب کچھ دے چکی ہوں میں اسے۔ اب اسے وہ چاہیے جو اس کے باپ کے پاس ہے۔ اسی لیے اب یہ وہاں جانا چاہتا ہے۔“

مومن خاموش کھڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو جھرجھر رہے تھے۔ ایمان رافع کے بازو میں منہ دیے سسکیاں بھر رہی تھی۔

رافع نے مومن کو اشارے سے قریب بلایا۔ جیب سے رومال نکال کر اس کا چہرہ صاف کیا۔ ایمان کو پیار کر کے اس کے بال سنوارے پھر ایمان کا ہاتھ مومن کو تھمایا۔

”جاؤ بیٹا، مومن کو لے کر جاؤ، سدرہ بائی کے پاس بہت سارے چاکلیٹ ہیں ان سے کہو وہ آپ دونوں کو مزے دار چاکلیٹ دیں گی۔ چاکلیٹ لے آؤ پھر میں آپ دونوں کو گھمانے لے کر چلتا ہوں۔“

بچوں کا موڈ لمحہ بھر میں بحال ہو گیا تھا، دونوں اپنی پسندیدہ چیز کا نام سن کر فحاش دوڑ گئے۔ رافع نے ایمان کا ہاتھ سا چہرہ دکھا۔

”پھپھو! بہت افسوس ہوتا ہے مجھے، کتنا خوش حال گھرانہ تھا آپ کا، ہنستا مسکراتا۔ غم و فکر سے دور، آپ کو دیکھ کر شونی اور مسکراہٹ کے معنی سمجھ میں آتے تھے۔“

”عورت کی مسکراہٹ اور شونی مرد کی دیں ہے۔ رافع! آنسو اور آپ بھی اسی کی سوغات ہیں۔“

”عورت مرد سے سب کچھ لے سکتی ہے پھپھو۔ اپنی مرضی سے جو لینا چاہے۔“ وہ آہستگی اور نرمی سے بولا۔

”ہو نہ ہو، مرد، عورت کی کو گے۔“ وہ پھنکاری۔

”مرد ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”تب ہی اس قدر وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا پھپھو کہ اس سارے معاملے میں سراسر آپ ہی تصور وار ہیں۔ لیکن کچھ نہ کچھ غلطی آپ کی بھی ہے، کیا آج اپنے بچوں کو اس طرح روتا بلکتا دیکھ کر بھی جو کچھ ہوا اس پر آپ نظر ثانی نہیں کریں گی؟“

”ہر شخص کے کچھ اصول ہوتے ہیں رافع! کوئی ایک متاع ایسی ضرور ہوتی ہے جس پر سووے بازی ممکن نہیں ہوتی۔ میری متاع میری محبت تھی۔ وہ محبت جو میں نے عائشہ سے کی اور عائشہ نے مجھ سے کی۔ بس اس محبت پر میں سووے بازی نہیں کر پاتی۔ باقی جو کچھ ہوا جو کچھ ہو رہا ہے۔ ثانوی ہے۔“

”آپ کے بچے بھی ثانوی ہیں پھپھو؟“

”بچے!“ وہ آہستگی سے بول کر رہ گئی۔ ”بچے۔“ مجھے تو آج احساس ہوا ہے رافع کہ بچے بھی اس کے ہیں۔ جتنے عرصے کا مجھی تعلق تھا۔ وہ امرتیل کا تعلق تھا۔ ایک کے لیے صرف لینا ہی لینا۔ دوسرے کے لیے بس دینا ہی دینا۔“

”ایسی بات نہیں ہے پھپھو۔ آپ کی سوچ غلط سمت میں بھٹک گئی ہے۔ اسے سیدھا راستہ دکھائیے۔ انصاف پسندی سے سوچیے۔ آپ وہ منصف ہیں جو غلطی کی سزا بھی موت دیتا ہے۔“

”میں نے کہا نا رافع تم مرد ہو۔ مرد کا ساتھ دو گے، عدا“ کو بھی سہوا“ کو گے۔ ورنہ ایک اعتماد اور محبت سے بھرے دل کے قتل کی سزا کیا ہو سکتی ہے۔ یہ ایک عورت سے پوچھو۔“

”آپ سننے بہت ٹھنڈے ہیں۔ پھپھو!“ وہ کمری سانس لے کر بولا۔ ”مومن کو اس طرح روتا دیکھ کر میرے دل پر کیا بیٹی ہے۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ آپ سمجھتی ہیں وہ آسائشات کے لیے اپنے باپ کے پاس جانا چاہتا ہے؟ نہیں پھپھو ایسا نہیں ہے اس عمر کے بچوں کو ماں اور باپ دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اگر اپنے باپ کے پاس ہوتا تو آپ کے پاس آنے کے لیے یونہی بے قرار ہوتا۔“

”تو میں کیا کروں رافع؟ کیا کروں؟ اس کے باپ کے سامنے روؤں۔ گڑ گڑاؤں؟ اپنے بچوں کے لیے شفقت پدری کی بھیک مانگوں؟ کیا کروں؟ وہ وہاں دوسری شادی رچا کر بیٹھ گیا ہے۔ اب اس کے پاس اتنا بھی وقت نہیں ہے کہ فون کر کے میرا یا بچوں کا حال پوچھ لے۔ اور تم سب مجھے مورد الزام ٹھہراتے ہو۔ کیوں؟“

وہ چیختی تھی۔ رافع سن ہو کر رہ گیا۔

”بس۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”بھیک کہہ رہی ہوں۔ اس نے خود فون کر کے یہ اطلاع دی تھی مجھے۔“ وہ سسکی۔

”پھر۔ آپ نے کیا کیا؟“ رافع کے اعصاب کو دھچکا لگا تھا۔

ایقان چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی۔
 ”میں نے اس سے طلاق مانگی ہے۔“ پھر وہ دو ٹوک انداز میں بولی۔ ”میرے پاس دو سرائیکی آپشن نہیں ہے۔“
 رافع نے سانس بھری تھی۔ اسے اسی بات کا اندیشہ تھا۔

”پھپھو۔ بچوں کے سر سے ان کے باپ کے نام کی چادر نہ کھینچیں۔ پلین۔“ وہ ہلکتی ہوا۔
 ”انہوں نے اگر یہ بے وقوفی کر لی ہے تو کم از کم آپ تو عقل کریں۔ یقیناً جانیں ایک دن انہیں ضرور اپنی غلطیوں کا احساس ہو گا۔ یہ بچے ان کے دل کو اپنی جانب ضرور موڑیں گے۔ وہ لوٹ آئیں گے۔“
 ”تب یہاں ان کے لیے کچھ بھی نہیں ہو گا۔“ وہ سختی سے بولی۔ ”میں بھکارن بنی اس کے نام کی چوکت پر کبھی نہیں بیٹھوں گی۔ ہر دروازہ بند کر لوں گی۔“
 ”آپ مجھے ان کا ٹیکٹ نمبر دیں۔“ رافع نے بالا خرہ یاس ہو کر کہا۔

”میں وہی لینے آیا تھا۔“
 ”کیوں؟ کس لیے؟“ اس نے ابرو چڑھائے۔
 ”میں۔۔۔ میں ایک بار ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“
 ”میں بہر حال ایسا نہیں چاہتی۔“ اس نے سر جھٹکا۔
 ”اور تمہیں مجھ سے نمبر مانگنے کی ضرورت پیش ہی کیوں آ رہی ہے۔ پہلے تو تم اکثر اس سے بات کیا کرتے تھے۔“

”وہ اس نمبر پر نہیں ہیں۔“ جب پھوڑ کر جا چکے ہیں۔ رہائش کا نمبر بھی تبدیل ہو چکا ہے یا شاید رہائش ہی تبدیل کر لی ہے۔ مبالغہ نمبر بھی نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی دو سرے شہر یا شاید دو سرے ملک شفٹ کر چکے ہیں۔“
 ایقان کے دل کو دکھ کا سا لگا تھا۔ اس نے رافع کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

”کہاں۔۔۔ کہاں چلا گیا وہ؟“
 رافع جو مزید کچھ کہنا چاہتا تھا رک گیا وہ ایقان کی پھیلی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ پھر وہ دکھ سے مسکرا دیا۔
 ”ان نگاہوں میں تو اب تک ان کے نام کا شہر آباد ہے پھپھو۔ آپ کہیں خود سوائے ان سب سے جھوٹ بول رہی ہیں؟“

ایقان نے یکدم نگاہیں چرائی تھیں۔
 ”شہر آباد تو نہیں ہے رافع۔“ پھر وہ بھڑکی ہوئی آواز میں بولی۔ ”برباد ہو چکا ہے۔“
 ”نہیں پھپھو۔ ایسا نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ ”میرا یقین مجھے بہت کچھ کہہ رہا ہے۔“ وہ جانے کے لیے آگے بڑھا۔

”رافع۔“ ایقان کی سرگوشی نے اس کے قدم روکے تھے۔
 ”جی۔۔۔؟“ اس نے مڑ کر دیکھا۔
 ”وہ۔۔۔ کہاں چلا گیا؟“
 رافع چند لمحوں سے دیکھتا رہا تھا۔

”ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ ڈونٹ وری۔ لیکن اتنا ہے کہ خود کو سمجھانے کی کوشش کریں۔“ پھر وہ آگے بڑھ گیا۔

”یہ لیجے اپنا۔!“ ایقان نے اسے پائن اپیل جوس کا گلاس تھا دیا۔ ”بالکل فریش فرام دی فارم ہے۔“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔
 شہلانے گلاس لبوں سے لگایا۔ ساتھ ہی اس کی نظر قدرے فاصلے پر بیٹھے ہوئے ہاشم سے ٹکرائی۔ نجانے ان

نظروں میں کیسے جذبات پوشیدہ تھے۔ شہلا جھینپ سی گئی۔
 ”انیقہ!“ ہاشم کے لیے بھی جوس لے آؤ نا۔۔۔“ وہ اپنے احساسات چھپانے کے لیے انیقہ کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ہاشم بھائی نے چائے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اس لیے ربیعہ ان کے لیے چائے بنا رہی ہے۔“ وہ محبت سے اس کے چہرے پر آنے والے ہلکے لہجے میں کہی۔ ”اور آپ نے اپنا کیا حال بنایا ہوا ہے؟ یوں لگ رہا ہے جیسے برسوں سے بیار ہوں ہاشم بھائی! آپ انہیں کچھ بھی نہیں کہتے نا؟“ انیقہ ہاشم کی جانب متوجہ ہوئی۔ ہاشم نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا۔

”بہت بری بات ہے۔ کہا کریں نا۔ بلکہ ڈانٹا کریں۔“
 ”یہ تو اسے بس کی بات نہیں۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔
 ”بہت مشکل کام ہے؟“ انیقہ شرارت سے پوچھنے لگی پھر زور سے ہنس دی۔
 ماحول قدرے شگفتہ ہو گیا تھا۔ ہاشم بھی یہی چاہتا تھا وہ ہاسپٹل سے شہلا کو یس لے آیا تھا۔ جانتا تھا کہ اس کے گھر کا ماحول شہلا کو مزید ٹینس کر سکتا تھا۔

منیذہ بیگم نماز پڑھ کر آئی تھیں۔ وہ شہلا پر دم کرنے لگیں۔ ربیعہ بھی چائے بنا کر لے آئی تھی۔

”کیا ہو گیا تھا میری بچی کو۔۔۔“ منیذہ بیگم پوچھنے لگیں۔

”کچھ نہیں امی! بس یونہی ذرا ایک نیس ہو گئی تھی۔“ شہلا نجائے کیوں اس ذکر سے شرمندہ سی ہو رہی تھی۔
 ”مت سوچا کر داتا۔۔۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”اتنا اچھا شریک سفر ملا ہے خدا کا شکر ادا کرو۔ سب کچھ تمہارے پاس ہے۔ کچھ بھی تمہاری دسترس سے دور نہیں ہے۔“

شہلا قدرے خاموش سی ہوئی تھی۔ ہاشم ایک ٹک اسی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کے ہر انداز کو، ہر رنگ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”ہاشم بھائی۔ چائے۔“ ربیعہ کی نرم آواز پر وہ چونکا۔

”آپ سی کی بیگم ہیں۔ اتنا غور پھر کبھی کر لیجئے گا۔“ ربیعہ کو بھی شرارت سوجھی۔

سب ہی ہنس پڑے تھے ہاشم قدرے شرمندہ ہوا۔ شہلا بھی جھینپ سی گئی۔

”مما۔“ خوشی سے چمکتی ہوئی آواز پر سب ہی چونک اٹھے تھے۔

سب نے ایک ساتھ دروازے کی سمت دیکھا تھا۔ وہاں عمر کھڑا تھا۔

”عمر۔ میری جان۔۔۔“ شہلا کے وجود میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ اٹھ کر اس کی جانب لپکی۔ دونوں ماں بیٹا بے

تابی سے لپٹے تھے۔ شہلا نے بار بار اسے چوما۔

”میرا بیگم۔۔۔ میری زندگی۔ کہاں چلا گیا تھا۔ ایک ہفتہ ایسے گزرا ہے جیسے روح کے بغیر جسم ہو۔“ وہ مسلسل بول رہی تھی۔

”مما۔ آپ کو پتا ہے پھانے مجھے پہلی کا پڑلے کر دیا ہے۔ وہ بہت اوپر تک فٹائی کرتا ہے۔ ریموٹ سے چلتا ہے۔ میں لے کر آیا ہوں۔ آمین آپ کو دکھاؤں۔“

شہلا کے انداز سست پڑے۔ عمر اس کا ہاتھ سمجھنے لگا تھا۔

”آمین نا ممما۔۔۔“

”بعد میں دیکھیں گے بیٹا! پہلے سب سے مل تو لو۔ نانو سے ملو۔ خالہ جانی سے۔“

عمر نے کمرے میں موجود افراد پر غور کیا پھر خوشی سے کھل اٹھا۔

”آہا۔۔۔ ہاشم انکل۔“ وہ ہانپتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔

ہاشم نے اس سے ہاتھ ملایا پھر اسے اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔

”یارا یہ ہیلی کاپٹر کیوں لے آئے؟“ وہ گفتگو سے پوچھ رہا تھا۔

”راؤے تو نیک ہیں؟“

شہلا پزل سی ہوئی۔ ہاشم نے یونی بے ارادہ کہہ دیا تھا یا اس کے دل میں کچھ تھا۔ وہ سمجھ نہ پائی۔
”آپ دیکھیں گے میرا ہیلی کاپٹر؟“

”ضرور۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں آپ کو اڑا کر دکھاتا ہوں۔“ وہ پرجوش ہو کر بھاگا تھا۔

ہاشم اس کے پیچھے چل دیا تھا۔ شہلا اپنی جگہ کھڑی رہ گئی تھی۔ منیجر، بیگم ربیعہ اور انقیہ، ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگیں۔

○ ○ ○

”یہاں سب کچھ سیٹ ہے۔ بالکل پرفیکٹ! بس اب بہت اسمو تھلی اشارٹ لینا ہے۔ بہت اچھے طریقے سے۔“

وہ ہاتھ روپ لپیٹے، بالکنی میں کھڑا بہت نیچے نظر آتی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ کان پر کارڈ لیس لگا تھا جب کہ کافی کا گرم کپ بالکنی کی دیوار پر رکھا ہوا تھا۔

”میں بہت پرامید ہوں شیری۔ یہاں کی مارکیٹ میں بہت مارجن ہے ہمارے لیے۔ پھر خدا کے فضل سے پارٹنر بھی بہت اچھا ملا ہے۔ عباد بہت عمدہ انسان ہے۔ میں بہت پسند کرنے لگا ہوں اسے۔“

دوسری جانب سے کچھ کہا گیا۔ امیر حسن نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا تھا۔

”اوہ لیس۔ نوڈاؤٹ۔ بابا بابا۔ تو تمہیں یاد ہے؟“

وہ مسکراتے ہوئے دوسری جانب سے ہونے والی گفتگو سننے لگا۔

”دشی ازناٹ اونٹی پریٹی۔ بٹ ڈفرنٹ۔ کچھ الگ سا ہے اس میں۔“ وہ اناکپ اٹھا کر اندر لاؤنج میں چلا آیا۔
”تو جانتا ہے یار میں بہت دیس گھوما ہوں۔ ہزار ہا لڑکیاں دیکھی ہیں لیکن کچھ کہتی ہوئی کچھ چھپائی ہوئی،

آنکھوں کی بات ہی اور ہے۔ یہ میں نے اب جانتا ہے۔“

وہ نرم لیدر کے گداز صوفے میں دھنس گیا اور کافی کے سبب لینے لگا۔

”ہاں یا۔ اب تو کچھ سیریس ہی لگتا ہے معاملہ صاف گوئی سے بتا رہا ہوں۔ میں کبھی کبھار بہت سنجیدگی سے سوچتا ہوں اس کے بارے میں۔“

دوسری جانب سے کچھ کہا گیا تھا۔

”اونٹن یا۔ ابھی اس سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ ابھی ملا ہی کتنی بار ہوں۔ کیا؟ بابا بابا۔ شہید ہونے کے لیے ایک ہی وار کافی ہوتا ہے۔ بالکل۔“

لاؤنج میں اس کی بے فکر بنی گونجنے لگی تھی۔

”ضرور آؤ۔ میں تو بے چین ہوں تمہیں دیکھنے کے لیے تم سے ملنے کے لیے۔ ار۔ ہاں۔ ایک بات بتانا بالکل بھول گیا۔ جانتے ہو شیری! میرے آفس میں تمہاری تصویر دیکھ کر مس ربیعہ نجائے کیوں بہت گم صم سی ہو گئی تھیں۔ جیسے وہ تمہیں جانتی ہوں۔ حالانکہ وہ کبھی پاکستان سے باہر نہیں گئیں۔ اور تم بھی پاکستان آئے

نہیں۔“ وہ کپ خالی کر کے میز پر رکھنے لگا۔

”میں خود حیران ہوا تھا۔ اب تم جلد سے جلد آؤ۔ میں تمہیں ان لوگوں سے ملوانا چاہتا ہوں ٹھیک ہے میری جان! پھر بات کرتے ہیں۔ اور سنو! بابا کیسے ہیں؟“

پھر جیسے وہ مایوس ہوا تھا۔

”چلو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ میرا سلام کہنا انہیں۔ اوکے اللہ حافظ۔“ اس نے فون آف کیا پھر کچھ سوچ کر مسکرائے لگا تھا۔

وہ بالکل خاموش بیٹھا ماں اور بہنوں کی کارروائی ملاحظہ کر رہا تھا۔ وہ سب کی سب بے حد انہماک سے سب چیزیں جھپٹتے کاغذوں میں پیک کر رہی تھیں۔

”جوڑے لے تو لیے ہیں اب اللہ کرے عریضہ کو پسند آجائیں۔ اس کی طبیعت بھی عجیب ہے۔ ڈر ہی لگتا ہے۔“ ثانیہ نے بے لاگ بصرہ کیا۔

عذرا بیگم نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں نافع کی وہاں موجودگی کی اطلاع دی تھی۔ ثانیہ کھلکھلائی۔

”اے کیا بتائیں ہے اور اگر نہیں ہے تو سب سے پہلے اسے ہی پتا چلنا ہے۔“ میم صاحبہ کا۔
 نافع ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔ ثانیہ اور سدرہ حیران سی ہو کر عذرا بیگم کو دیکھنے لگیں۔
 ”اے کیا ہوا؟“

”میں تمہیں منع بھی کر رہی ہوں لیکن تم باز نہیں آئیں۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”تم نہیں جانتیں میں جانتی ہوں، ماں ہوں اس کی۔ بہت خفا ہے وہ ہم سب سے۔ کچھ کہتا نہیں لیکن دل ہی دل میں کڑھ رہا ہے۔“
 ”کس بات پر؟“ سدرہ حیران تھی۔

”ایک تو بے چارے کے سرزردستی کا سہرا بندھ رہا ہے۔ صرف رافع کی ضد کی وجہ سے۔ اگر رافع راضی ہو جاتا تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ دوسرے عریضہ کے رویے کی سب ہی شکایت کرتے ہیں۔ وہ بھی سنتا رہتا ہے۔ نافع بہت شینس ہے۔ میں سب سمجھ رہی ہوں لیکن کچھ بولوں گی تو ایک پینڈورا بکس کھل جائے گا۔ جو میں نہیں چاہتی۔“ وہ پیکنگ چھوڑ کر افسرہ سی ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

”عریضہ کو صرف فینسی تنگ کر رہی ہیں۔ شادی کے بعد خود سیٹ ہو جائے گی۔“ ثانیہ بے فکری سے بولی۔
 رہی بات نافع کی تو ابھی اسے اس بات سے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ چھوٹا ہونے کے باوجود پہلے اسے دوہرا بنایا جا رہا ہے۔ وہ دن بعد دیکھنے گا پانچھیں کھلی جا رہی ہوں گی۔“

”چپ کر۔ بد تمیز!“ سدرہ ماں کے سامنے ایسی بات سے جھینپ گئی۔

ثانیہ پھر ہنس دی تھی۔ آج کل اسے بات بے بات ہنسی آتی تھی۔
 عذرا بیگم فلم مندی ہو گئیں۔ نافع جس طرح خفگی سے اٹھ کر گیا تھا۔ انہیں سوچ میں مبتلا کر گیا تھا۔ ثانیہ اور سدرہ عریضہ کے لیے شگون کے جوڑے اور دیگر سامان کی پیکنگ کر رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر اٹھ کر باہر چلی آئیں۔ وہ لاؤنج سے باہر کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ عذرا بیگم اس کے قریب آئیں۔

”کیا سوچ رہا ہے میرا بیٹا!“ وہ محبت سے پوچھنے لگیں۔

”میں کیا سوچ سکتا ہوں امی!“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اور مجھے کچھ سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“

”کیوں؟“ وہ حیران ہوئیں۔
 ”اس لیے کہ میرے بارے میں سوچنے والے، میرے متعلق فیصلہ کرنے والے، مجھے ہر فیصلے سے آگاہ کرنے والے بہت لوگ ہیں یہاں۔ میں۔ میں کچھ سوچ کر کیا کروں گا۔“

”نافع! تم ناراض ہو، ہم سب سے؟ مجھ سے؟“

رافع نے بے اختیار ہی اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

”نہیں امی! میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ میں آپ سے ناراض ہو بھی نہیں سکتا۔ بہت کچھ کر گزرتا میں۔ لیکن آپ کا خیال، آپ کی محبت مجھے بے اختیار رکھتی ہے۔“

”جیتا میرا چاند!“ انہوں نے جبکہ کر اس کے بالوں پر بوسہ دیا۔ ”ماں کو خوش رکھنے والے۔ ماں کو خوش دیکھنے کے متمنی ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ نافع! یاد رکھنا، میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔“
 ”لیکن اندیشے تنگ کرتے ہیں امی!“ وہ کچھ دیر بعد بولا تھا۔ ”آپ نہیں جانتیں۔“ منگنی سے نکاح اور نکاح

سے اب تک کا وقت بہت بے چینی اور بے اعتباری سے گزرا ہے، میں نے۔“
 ”میں سب جانتی ہوں نافع!“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔ ”ماں ہوں تمہاری، کیا پوشیدہ رہ سکتی ہے تمہاری
 بے چینی مجھ سے؟ لیکن میرے بیٹے! مشترکہ خاندان کو جوڑے رکھنے کے لیے بہت سے دریا پار کرنا ہوتے ہیں۔

بہت سی ان چاہی باتوں پر صبر کرنا پڑا ہے۔ ہونٹ پیسے رہنمائی عقل مندی ہے۔“
 ”عقل مندی“ زندگی ہی برباد کر دے ماں؟ پھر؟“ اس نے قدرے طنز سے کہا۔
 ”نہیں بیٹا! ایسا نہیں ہوتا۔ صبر کا پھل بیٹھائی نکلتا ہے۔ بس امید اچھی رکھو۔“
 ”وہ میرا ساتھ پا کر بہت ناخوش ہے امی۔“ وہ جیسے سرگوشی میں بولا۔ ”کیا امید رکھوں؟“

ماں کی تھوڑی سی محبت ذرا سی ہمدردی نے جیسے کسی آبلے کا منہ کھول دیا تھا۔
 ”وہ بے عقل ہے۔ ابھی زندگی کو دیکھا ہی کہاں ہے اس نے؟ دلہن بنتی ہے تو عورت، عورت بن جاتی ہے
 نافع۔ اس کی آنکھوں پر دور اندیشی کی عینک خود بخود لگ جاتی ہے۔“

”جانے دیں امی۔“ ایسا ہوتا تو دنیا میں کبھی کوئی گھر نہ بگڑتا، ابقان چھپو کی مثال آپ کے سامنے ہے۔“
 ”پھر بھی نافع۔ کوئی ایک فریق اگر اپنا گھر بسائے رکھنا چاہے تو گھر ضرور سار رہتا ہے۔ میں خود بھی اس سلسلے میں
 بہت فکر مند ہوں۔ اکثر اس بارے میں سوچتی ہوں۔ لیکن پھر تمہارے بارے میں سوچ کر بہت مطمئن۔
 اور پرسکون ہو جاتی ہوں کیونکہ میں جانتی ہوں، عریشہ کم عقل اور جذباتی سہی۔ میرا بیٹا ایسا نہیں ہے۔“
 ”آپ نے کہا امی! اگر ایک فریق اگر گھر بسائے رکھنا چاہے تو گھر ضرور رہتا ہے۔ لیکن اگر ایک فریق گھر اجاڑنے
 پر آمادہ ہو جائے، پھر کیا ہو؟“

”ایسی باتیں مت کرو۔“ وہ خفا ہوئیں۔ ”مرد ہو۔ مردن کر دکھاؤ۔ محبت کی لواحتی تیز رکھنا کہ ناخوشی موم
 بن کر پکھل جائے۔ بیٹا! میں تم سب کو ہمیشہ ہنستا ہنستا دیکھنا چاہوں گی۔ رافع کی جانب سے مجھے بہت خوف ہے۔
 اس کے انداز مجھے خوف زدہ کر رہے ہیں۔ لیکن تم میرے بہت پیارے بیٹے ہو۔ مجھے تم پر پورا یقین ہے۔“
 نافع نے ان کا ہاتھ پکڑ کر عقیدت سے چوما۔

”میں آپ کے یقین پر پورا اترنے کی اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔“
 عذرا بیگم بے فکر ہو کر مسکرا دی تھیں۔

”یہ کیلاگ ہی دیکھ کر کچھ پھوٹ دمنہ سے۔“ عریشہ کی بے نیازی پر ماہین چنجی اٹھی تھی۔
 ”میں یہاں تمہاری شادی کی شاپنگ کروانے آئی ہوں۔ تمہاری اس جلد خاموشی سے اڑنے نہیں آئی۔“
 ”آئی!۔! جو آپ کرنے آئی ہیں، کیجئے شاپنگ کرنے آئی ہیں تو شاپنگ کریں۔ ہر بات میں میری رائے اور
 میری رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بے زاری سے بولی۔
 ”لو۔ یہ بھی کوئی بات ہے؟ ابھی شادی تمہاری، پہننا اوڑھنا تمہیں۔ پسند بھی تمہاری ہو تو اچھا ہے۔ چلو
 ڈیزائن میں پسند کر لیتی ہوں۔ یہ تادو ویڈیو ڈریس کارنگ کیا ہو؟“

وہ اس کا تباہ کن موڈ دیکھ کر مصالحانہ انداز میں بولی۔
 ”سیاہ!“ عریشہ سکون سے ٹھنڈے لہجے میں بولی۔
 ”کیا؟“ اسے جھٹکا لگا۔ ”سیاہ؟ عروس لباس؟“
 ”کیا حرج ہے؟ شادی، خوشی کو کہتے ہیں۔ جب خوشی کا کوئی رنگ ہی نہ چمکے دل میں تو پھر سیاہ رنگ ہی مناسب
 ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو عریشہ!“ ماہین پریشان ہو گئی۔ ”تم اب تک اس ناراضی سے باہر نہیں نکلیں۔ اگر یہی
 معاملہ کرنا تھا تو اس وقت بولتیں، چنچیں، چلاتیں۔ اسٹینڈ لے لیتیں۔ اب ان فضول باتوں سے کیا حاصل؟“
 عریشہ نے نگاہوں کا زاویہ بدل کر اسے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی۔

”اسٹینڈ؟ اسٹینڈ تو پھر کسی وقت بھی لیا جاسکتا ہے۔“
 ”کیا... کیا مطلب؟“ ماہین ڈر گئی۔ ”دیکھو عرشہ...! خاندانی لڑکیوں کے یہ اطوار نہیں ہوتے، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اب خود کو سمجھا لو۔“

”سمجھانے کی بات کرتی ہیں۔ میں نے تو خود کو ماری لیا تھا لیکن...“
 ”لیکن کیا...؟“

”کسی نے ایسی آگ لگائی ہے اس مردہ وجود میں کہ راکھ بننے کے بجائے شعلہ بن گئی ہوں۔ جی چاہتا ہے جلا ڈالوں سب کچھ۔“

”کس نے آگ لگائی ہے کیا کہہ رہی ہو تم؟“ ماہین پریشان ہو گئی۔ ”خدا کے لیے عرشہ ایسا کوئی قدم نہ اٹھانا جس سے اس گھر کو اس گھر کے کینوں کو کوئی صدمہ ہو۔ کوئی دکھ اٹھانا پڑے۔“
 عرشہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

”میں بھی تو اس گھر کی مکیں تھی۔ کسی نے میرے بارے میں نہیں سوچا۔“ پھر وہ دکھ سے بولی۔ ”مجھے ایک اکائی، ایک ذات نہیں سمجھا کسی نے۔ کیوں آپنی؟“

”میں جانتی ہوں عرشہ! تمہیں نافع دل سے قبول نہیں تھا۔“ ماہین نے افسردگی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”ہو سکتا ہے کہ تم کسی اور کو پسند کرتی ہو ہر چند کہ تم نے کبھی اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ لیکن عرشہ! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے، ان معاملات میں وقت کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ وہ وقت نکل جائے تو پھر صبر ہی کرنا اچھا ہے۔ تمہارے ہاتھ میں اب کچھ نہیں ہے۔ جب تم منگنی کے وقت خاموش رہیں، نکال کر مہرہ لب رہیں تو اب کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ اب کچھ کوگی۔ کچھ کروگی تو سوائے ذلت کے کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ مت سوچو بری باتیں۔ اچھی باتیں سوچو۔ یہ وقت انجوائے کرو۔ خوشی خوشی اپنی شادی کی خریداری کرو۔ ثانیہ کو دیکھو، ناعمہ کو دیکھو۔ وہ دونوں انجوائے کر رہی ہیں یہ ٹائم پیریڈ اور تم! آگ، راکھ اور شعلوں کی باتیں کر رہی ہو۔“
 عرشہ نے اس کی پوری بات سنی ہی نہیں تھی۔

”ناعمہ... ناعمہ انجوائے کر رہی ہے۔ یہ ٹائم پیریڈ۔“ وہ سوچے گئی۔ ”اسے کرنا چاہیے، وہ فراز کی ہونے جا رہی ہے۔ فراز اس کا بن جائے گا۔ فراز وہ چاند جس کی چکور بن کر تمنا کی میں نے وہ فراز اس کا ہونے جا رہا ہے۔ جھوٹ سے، دھوکے سے، فریب سے ناعمہ اسے حاصل کر لے گی۔ اپنی جیت پر، فتح پر مسکرائے گی۔ اور... اور مجھے نافع کے ساتھ دیکھ دیکھ کر ہنسے گی۔“

اس کا تنفس تیز تر ہو گیا۔
 ”نہیں... نہیں ناعمہ! میں تمہیں ہنسنے نہیں دوں گی۔ میں روؤں گی تو تمہیں بھی رونا پڑے گا۔“
 ماہین اسے خاموش بالکل خاموش پیا کر بے دلی سے اٹھ گئی تھی۔

وردہ نما کربال سکھاری تھی۔ کال بیل بجی تو اس نے کھوجتی نظروں سے ناعمہ کی تلاش کی پھر اسے غائب پا کر ٹھنڈی آہ بھر کر دروازے کی سمت بڑھی تھی۔

”آپ...! دروازہ کھول کر اس نے بلند قامت کو سامنے پایا تو بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔
 ”آں... ہاں!“ رافع نے اس کے صبح چہرے پر ایک نگاہ کی پھر اس سے پرے دیکھنے لگا۔

”پچھو... پچھو ہیں اندر؟“ نہیں... بیچ دو۔“
 ”نہیں... امی تو نہیں ہیں۔“ وردہ کو حیرانی ہوئی۔ ”آپ اندر آجائیں، کوئی کام ہے تو مجھے بتائیں۔“
 ”پچھو نہیں ہیں۔؟“ رافع کو حیرانی ہوئی۔ ”کہاں گئی ہیں؟“
 ”مارکیٹ۔“

”لیکن انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ جائیں گی۔ وہ اکیلی کیوں چلی گئیں؟“

”شاید وہ روبرو ہی تھی۔ اس لیے۔“ وردہ اتنا ہی کہہ سکی۔

رافع نے سوچ کے عالم میں چند لمحے اس کے چہرے کو نظروں کی گرفت میں رکھا تھا۔ وردہ پزل سی ہوئی۔ شانوں پر تولیہ پھیلائے کیلے سیاہ بالوں کے حصار میں وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔

”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ دھیسے سے بولا۔ ”میں چلتا ہوں۔“

وہ پلٹا پھر جیسے پتھر کا ہو گیا۔ اس کے عین عقب میں ربیعہ کھڑی تھی۔ رافع نے اپنے جذبوں میں اس تیزی سے تبدیلی محسوس کی تھی کہ وہ خود ہی خوف زدہ ہو گیا۔ ربیعہ جو ابھی ابھی وہاں پہنچی تھی رافع کو دیکھ کر سٹپٹا سی گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے رافع کی آنکھوں میں اترتے رنگوں سے نظریں چرا کر کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ رافع کی آواز میں خوشی کی آمیزش تھی۔ ”کیسی ہیں آپ؟“

”شکر ہے خدا کا۔“ وہ مختصراً بولی۔

منو اور فیوڈی کا مہی نیشن کے سوٹ میں اس کی رنگت دمک رہی تھی۔ آنکھوں میں شام کے سب ہی رنگ مسکرا رہے تھے۔ نرم لبوں پر وہی اڑلی مسکان تھی جو ان لبوں کا خاصا تھی۔

ایکایک رافع کو عقب میں کھڑی وردہ کا احساس ہوا۔ وہ درمیان سے ہٹ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ ربیعہ نے بے ارادہ ہی گردن موڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر وہ چونک کر وردہ کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

”کیسی ہو وردہ؟“ وہ مسکرا کر آگے بڑھی۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وردہ نے اسے راستہ دیا۔ ”آؤ۔“

”نہیں۔۔۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“ ربیعہ مسکرائی۔ ”میں اس وقت کام سے آئی ہوں۔“

”اچھا لیکن کام کیا ہے؟“

”شہلا آپ کی کمرے سے ان کا کچھ ضروری سامان لینا ہے۔ دراصل ہاشم بھائی، شہلا آپ کی کواچانک ہی لے آئے تھے۔ بنا سامان کے پھر شہلا آپ وہیں رک گئیں ہمارے پاس اب انہوں نے مجھے بھیجا ہے ان کے وارڈ

روم سے کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ تم پلیز میرے ساتھ چلو میں ان کی ساس سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔“

”اچھا۔۔۔ میں یہ تولیہ رکھ دوں۔“ وردہ ہلٹی تھی۔ ”اور ناعمہ کو بھی بتا دوں۔“



فردوس بیگم نے خاصی خطرناک نظروں سے بھجھ کر دیکھا تھا۔

”ہاشم نے تو ہم سے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ ہم کیسے اس کا کمرہ کھول دیں۔“

”جی۔۔۔! ربیعہ سٹپٹا گئی۔ قدرے جھل بھی ہوئی۔ ”آپ۔۔۔ آپ ہاشم بھائی سے پوچھ لیجئے۔ یا شہلا آپ

۔۔۔“

”تمہاری آپ کی بیروں میں شاید مندی لگی تھی۔ جتنا رستہ تم نے طے کیا اتنا وہ بھی تو کر سکتی تھیں۔“

وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی تھیں۔ ربیعہ ایک مرتبہ پھر پانی پانی ہوئی۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو تو علم ہو گا۔“

”اے ہاں۔۔۔ ہم نے تو انہیں بیمار ہی پایا ہے۔“ انہوں نے کسی گوشے سے چابیاں برآمد کر کے ربیعہ کے ہاتھ

پر رکھیں۔ ”یہ لوفہ کمرے کی اور الماری کی سب ہی چابیاں ہیں۔ ہمارا تو خیال ہے سب ہی سامان ایک بار ہی لے

جاؤ۔ بار بار پھر لگانا پڑیں گے تمہیں۔“

”جی۔۔۔! ربیعہ کامنہ جیت سے کھل گیا۔

ان شعلہ بیانیوں کا ذکر بھی کبھی شہلا نہ کیا تھا۔ وہ ہمیشہ ان کی تعریف کیا کرتی اور ادب سے ان کا ذکر کرتی

تھی۔ ربیعہ کو شہلا سے عقیدت سی محسوس ہوئی۔

”تائی امی!“ ورورہ نے انہیں تنبیہ کرنا چاہی پھر خاموش ہی ہو رہی۔ وہ دونوں مزید گفتگو سے بچنے کے لیے تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھی تھیں۔ تب ہی کسی گوشے سے نکل کر اختر میاں چلے آئے۔

”آپ! یہاں!“ وہ ربیعہ کو دیکھ کر کھل سے اٹھے۔
ربیعہ بے طرح پریشان ہوئی۔ ایک مرتبہ پہلے بھی وہ کافی پریشان ہو چکی تھی۔
”آپ کی تعریف؟“ وہ ورورہ سے پوچھنے لگے۔

”یہ میری دوست ربیعہ ہے۔ شہلا بھالی کی بہن!“
”بہت خوب۔ ایسے لوگوں کو خدا نہ جانے کتنی محبت سے بناتا ہوگا۔ کیوں باجی؟“
”دھر آکر بیٹھو اختر میاں!“ فردوس بیگم بھنا کر بولیں۔ ”انہیں ان کا کام کرنے دو۔“
ربیعہ اور ورورہ میڑھیاں چڑھ گئیں۔ اختر میاں مسمرانز سے ہوئے بہن کے پاس آ بیٹھے۔
”جانتی ہیں باجی!“ اس لڑکی کو دیکھ کر ہمیں کیا یاد آتا ہے؟“
”کیا یاد آتا ہے؟“ انہوں نے ابرو چڑھائے۔

”ایقان کی جوانی۔۔۔“ ان کی آواز انداز میں عجب حسرت تھی۔ ”وہی سوندھا پن۔۔۔ وہی خوشبو وہی روشنی۔“
”خدا کی مارت مریب۔ آہستہ بولو۔ یہ بھی شریف لوگوں کے کرنے کی باتیں ہیں۔ پرانی لڑکیوں کے بارے میں۔۔۔ اور ایقان کیا بوڑھی ہو گئی ہے جو اس کی جوانی یاد کرتے ہو۔“ وہ خفگی سے انہیں جھڑکنے لگیں۔
”ہاں۔۔۔ اور پندرہ برس پہلے کی بات تو نہیں باجی۔“
فردوس بیگم نے انہیں غور سے دیکھا۔
”بیباہ کرو اوس تمہارا اس لڑکی سے؟“ وہ ان کے قریب جھک کر سرگوشی میں پوچھنے لگیں۔
”باجی؟“ اختر میاں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔

ہاشم نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور گہری سانس بھر کر فائل بند کی۔ آج پھر اسے آفس میں دیر ہو گئی تھی۔ ریوالونگ چیسر کی پشت سے ٹیک لگا کر اس نے کمر سیدھی کرنا چاہی۔
تب ہی اس کے موبائل پر کال آئی تھی۔ ہاشم نے اسکرین پر کالر کا نام دیکھنا چاہا لیکن وہاں اجنبی فون نمبر تھا۔
”ہیلو۔۔۔“ وہ تھکن کے احساس کے ساتھ بولا تھا۔
”ہیلو۔۔۔ مشر ہاشم۔۔۔“ دوسری جانب کسی کی بمبھیر خوبصورت آواز تھی۔
”جی۔۔۔ آپ کون؟“
”ہاشم۔۔۔ میں ابرار بات کر رہا ہوں ابرار جیلانی!“
ہاشم کی تھکن لمحہ بھر میں ہوا ہو گئی۔ وہ سیدھا ہوا تھا۔

”فرمائیے۔“ وہ بے حد محتاط انداز میں بولا تھا۔

دوسری جانب ابرار نے کھٹکھٹا کر اپنا گلا صاف کیا تھا گویا کسی اہم بات کی تمہید باندھی تھی۔
”بات قدرے لمبی بھی ہو سکتی ہے۔ آپ اگر بہت مصروف نہ ہوں تو کچھ وقت لوں گا آپ کا۔ اور اگر اس وقت آپ بات کرنے کے موڈ میں نہ ہوں تو۔۔۔ میں پھر کسی وقت۔۔۔“
”نہیں میں مصروف نہیں ہوں۔“ ہاشم نے فوراً اس کی بات کاٹی۔ ”آپ کو جو کہنا ہے کہیں۔۔۔ میں بغور سن رہا ہوں۔“

اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائل بند کی تھی۔ ابرار کے فون نے جیسے اس کے دماغ میں کسی علاقہ غیر کو ممنوعہ کی کھڑکی کھول دی تھی۔ اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی اس کی سوچ نے مختلف سمتوں میں پرواز بلند کی تھی۔

”پہلے تو میں ایک اہم سوال پوچھنا چاہوں گا ہاشم یہ ایسا سوال جس کا جواب مجھے میرے بہت سے اندازوں کے صحیح یا غلط ہونے کا پتہ دے گا۔“

”پوچھئے۔“ ہاشم نے محسوس کیا کہ وہ ٹینشن کا شکار ہونے لگا ہے۔ غیر ارادی طور پر اس نے اپنی ٹانگیں کی ناث ڈھیلی کی تھیں۔

”آپ کے اور شہلا کے درمیان کبھی میرے متعلق گفتگو ہوئی ہے؟“ ابرار نے پوچھا۔ اس کے انداز میں بے حد اعتماد تھا جیسے اسے یہ سوال پوچھنے میں کوئی عار نہ ہو۔ ہاشم نے اپنے مزاج میں تبدیلی محسوس کی اسے احساس ہوا کہ ابرار کے لبوں پر شہلا کے نام نے اس کی شائستہ روی کو بھیس پہنچائی ہے۔

”نہیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں اور میرے اور میری بیوی کے درمیان کبھی آپ کا ذکر آئے بھی کیوں؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا تھا۔

دوسری جانب لمحہ بھر کے لیے سکوت سا طاری ہوا۔ ابرار جیسے سنبھل سا گیا۔
”اس لیے کہ میں آپ دونوں کے لیے اس قدر اجنبی یا بے حوالہ نہیں ہوں۔ میرا بیٹا ہر لمحہ آپ دونوں کو میری یاد دلاتا ہو گا۔“

”جی نہیں۔۔۔ اپنے متعلق میں بے حد وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے لیے عمر آپ کا حوالہ نہیں ہے۔“
”اور۔۔۔ شہلا کے متعلق؟“ دفعۃً ابرار کے لہجے میں چھین سی اتر آئی۔ ”اس کے متعلق بھی آپ اپنا یہی وثوق استعمال کریں گے؟ آپ سمجھتے ہیں مسٹر ہاشم کہ شہلا مجھے بھول چکی ہے؟ یا۔۔۔ بھول سکتی ہے؟“
”آپ اپنا سوال کر چکے۔ جواب آپ کو مل گیا۔ اب اپنی بات کہیے۔“ ہاشم نے اس کا یہ سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مجھے آپ کے موڈ کا اندازہ ہو چکا ہے۔ اس لیے زیادہ تمہید نہیں باندھتا۔۔۔ ہاشم! میں جانتا ہوں آپ ایک بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہنڈرڈ پرسنٹ آجینٹل میں۔۔۔ آپ کی اچھائی نے ہی آپ سے یہ بات کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ ورنہ شاید میں یہ طریقہ نہ اپناتا ہاشم! عمر کے بھلے کے لیے۔ میرے بھلے کے لیے۔ اور سب سے بدھ کر شہلا کے بھلے کے لیے۔ شہلا کو ڈی ورس دے دیں۔“

ہاشم کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے پورے بدن میں ایک ظالم تناؤ ابھر اٹھا۔ اس کی ایک ایک نرس کھینچ کر رہ گئی تھی۔
”آپ کو یہ بات کہنے کی جرات کیسے ہوئی مسٹر ابرار۔۔۔“ وہ چیخ کر بولا۔ ”کیا آپ مجھے اپنے جیسا ایک مکینہ خیال کرتے ہیں؟ میرے لیے عورت رومال نہیں ہے مسٹر ابرار۔ میری بیوی میری ہم نفس ہے۔ آپ نے مجھے اتنا شریف خیال کیا کہ مجھے ہنسی آتی چاہیے جو کہ ہمیں آ رہی ہے۔ مجھے اس قدر شدید غصہ آ رہا ہے کہ اگر میں نے اس کا مکمل اظہار کیا تو میرے متعلق آپ کی رائے قطعاً تبدیل ہو جائے گی۔ میں اتنا بھی ”جینٹل مین“ نہیں ہوں جتنا آپ نے سمجھا ہے۔“

اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔ ابرار نے اس کا لفظ لفظ بغور سنا تھا۔
”آپ کو یقیناً غصہ آنا چاہیے۔“ وہ بے حد نرم لہجے میں بولا ”میں آپ کی جگہ ہوتا تو مجھے بھی آتا۔ لیکن پلیز ہاشم۔ پلیز۔۔۔ آئی بیک یو۔ اس وقت اپنے جذبات پر کنٹرول کرنے کی کوشش کیجیے۔ یہ بہت اہم گفتگو ہے۔ جس میں بہت حقیقت پسند ہونے کی ضرورت ہے۔“
”ریشٹل؟“ ہاشم طنزاً بولا۔ ”گویا ابھی جو ”مشورہ“ آپ نے مجھے دیا۔۔۔ وہ آپ کے حقیقت پسند ہو کر سوچنے کا ثبوت ہے؟“

”ہاشم۔۔۔ یہ بہت سے لوگوں کی زندگی کا۔ ان کی خوشیوں کا۔ ان کے آئندہ کا سوال ہے۔ آپ غصہ نہ کیجیے پلیز۔۔۔“ ابرار مزید نرم ہوا۔ ”یہ بات آپ کے احساسات پر ایک کوڑے کی مانند برسی ہوگی۔ میں اندازہ کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے یہ بتائیے کہ میں اور عمر جو کہ ایک مثلث کے دو کونے ہیں۔ اور اپنے تیسرے اور اہم کونے کے

متلاشی اور منتظر ہیں۔ ہم یہ بات چھپڑے بغیر کیونکر کر سکتے ہیں؟ میں شہلا کی فطرت سے واقف ہوں ہاشم۔ وہ حساس، زود رخ اور قدرے بزدل ہے۔ ساری عمر کڑھتے ہوئے گزار دے گی لیکن خود اپنے منہ سے یہ بات نہیں کہے گی۔ وہ عمر کو مس کر رہی ہے۔ انٹی ایم شیورہ کہ وہ مجھے بھی مس کر رہی ہے ایسے میں کیا یہ اچھائی کی ایک صورت نہ ہوگی کہ اتنے لوگوں کی اداسی کا بار ایک کندھا اٹھالے اور بہت سے دل کھل اٹھیں۔ غموں کے بوجھ سے آزاد ہو جائیں۔“

”کندھے کا انتخاب اچھا کیا ہے آپ نے۔“ ہاشم خشک انداز میں بولا۔ ”داؤرتا ہوں۔“

”اس لیے ہاشم! کہ یہ واحد انتخاب ہے۔ اس کے سوا چارہ نہیں۔“

”دیکھیں ابرا صاحب۔“ ہاشم نے خود کو یکا یک بے پناہ تھکا ہوا محسوس کیا تو کرسی پر بیٹھ گیا۔ بات آپ محض اس رخ سے کر رہے ہیں۔ جہاں آپ خود کھڑے ہیں۔ اس ساری چٹویشن کے بہت سے رخ ہیں۔ اچھائی اور بہتری کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ عمر کو واپس ہمارے پاس بھیج دیں۔ وہ یہاں خوش تھا۔ اس معصوم بچے کو آپ نے ڈسٹرب کیا اس کے شفاف ذہن کو آپ نے براگندہ کیا۔“

”جسٹ اے منٹ ہاشم۔ آپ نے کیا کہا؟ عمر کو واپس آپ کے پاس بھیج دوں؟ آپ کے پاس؟ وہ آپ کے پاس کب تھا؟ آپ تو صرف شہلا کو لے کر گئے ہیں ہاشم۔ عمر کو تو آپ وہیں چھوڑ گئے تھے اس کی نانی کے گھر۔“

ہاشم یکا یک جیسے لا ذواب ہوا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ فاروق حسن اور فردوس بیگم کے بھرپور دباؤ کے باعث وہ کبھی بھی عمر کو اس کے سارے ساز و سامان سمیت اپنا بیٹا بنا کر اپنے گھر نہ لے جاسکا تھا۔ اسے اس بات کی خواہش ضرور تھی کہ شادی سے قبل ہی اسے یہ بات باور کرا دی گئی تھی کہ ”حیات ولا“ میں صرف وہاں کے کینوں کی نسل ہی پروان چڑھ سکتی ہے کسی اور کی نہیں۔“

ہاشم اس بات پر رضامندی کا اظہار کر کے ہی شہلا کو حاصل کر پایا تھا۔ بعد میں کبھی بھی حالات ایسی کیسی خوشگوار گرج رہے آئے تھے کہ وہ اور شہلا عمر کو وہاں لے آئے۔ خود شہلا بھی فردوس بیگم کے رویے سے ٹالاں تھیں وہ اپنی اس خواہش سے مستبردار رہی ہو چلی تھی۔

”آپ خاموش ہو گئے؟“ ابرا کو جیسے اس کی خاموشی سے مسرت ہوئی تھی۔ ”آپ تو میں آپ کے رخ سے چٹویشن کو دیکھنے کی کوشش کر رہا ہوں مشر ہاشم۔ کیا کہتا ہے یہ رخ؟“ آل ازرائٹ؟ یا کہیں یہ کچھ غلط بھی ہے؟“

”اگر کہیں یہ کچھ غلط بھی ہے تو یہ آپ کی وجہ سے ہے ابرا!“ اب کے ہاشم کے لہجے میں بھی وہ پیلے والی سرد مری نہ تھی۔ جیسے بات کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔

”بات وہیں سے غلط ہے جہاں آپ نے غلطی کی۔“ اس نے اپنے الفاظ پر زور دیا۔ ”آپ نے ایک معصوم لڑکی کی زندگی خراب کی۔ اسے بیچ منڈھار میں لا کر تنہا چھوڑا۔ اور اب جبکہ اسے ایک کنارہ میسر ہے۔ آپ پھر الٹی سیدھی حرکتیں کر رہے ہیں۔“

”مجھے اپنے ماضی پر از حد شرمندگی ہے ہاشم! سب کچھ غلط کیا۔ سوائے ایک بات کے۔ میں نے اس سے جو محبت کی وہ سچی تھی۔ اور آپ کو برا محسوس ہو گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ شہلا نے بھی مجھے ٹوٹ کر چاہا ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ہاشم! آپ نے کبھی اس کی محبت کی ہلکی سی رمت بھی محسوس نہ کی ہوگی۔ جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ آج بھی جب وہ مجھ سے بات کرتی ہے تو اس کے لہجے میں اس پرانی محبت کی خاموش خوشبو ہوتی ہے۔ وہ خوشبو صرف میں محسوس کر سکتا ہوں۔ صرف میں۔“

ہاشم کو یوں لگا جیسے اس کا موی دل کسی تیز شعلے پر ٹھہرا ہو۔ قطرہ قطرہ۔ لہو کی بوندیں اس کے مساموں سے پھوٹ نکلیں۔

”ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا ہاشم! میرا اب بھی دعو ہے کہ میں اسے چاہتا ہوں وہ بھی یقیناً میرے لیے وہی جذبات رکھتی ہے۔ ہمارا ایک بیٹا ہے جسے ماں کی بھی ضرورت ہے اور باپ کی بھی۔ یہ ایک ایسی

تصویر ہے جو خوبصورت ہے۔ مکمل ہے لیکن ایک حادثے نے اسے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر آپ کی قربانی سے یہ تصویر پھر سے جڑ جائے۔ پھر سے ویسی ہی خوبصورت اور مکمل ہو جائے۔ تو کیا آپ یہ قربانی نہیں دیں گے ہاشم؟“

ہاشم کے لب سختی سے ہاشم پیوست تھے۔ وہ غلامی میں گھور رہا تھا۔
”میں نے شہلا سے کہا تھا کہ اگر وہ میرے پاس لوٹ کر آنا چاہتی ہے تو کسی صورت پرہگننسی نہ ہونے دے۔ وہ میری بات پر عمل کر رہی ہے۔ وہ اب تک پرہگننٹ نہیں ہوئی۔ کیا یہ بات اس کا ثبوت نہیں ہے کہ شہلا بھی اسی ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی تصویر میں زندہ ہے؟ پلینز ہاشم۔ آپ اس سے محبت کے دعوے دار ہیں۔ میں اس میں کسی قسم کا شک نہیں پاتا لیکن محبت بھی کبھی ثبوت کے طور پر بہت کچھ مانگ لیتی ہے۔ کیا آپ شہلا کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک بچہ اپنی ماں اور اپنے باپ دونوں کی محبت کے سائے میں پروان چڑھے؟ یا۔ پھر آپ صرف اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے اس خوبصورت تصویر کے ٹکڑوں کو بے رحمی سے قلعہ کر دیں گے؟“

ہاشم اتنا کچھ سن چکا تھا کہ مزید کی گنجائش ہی نہ تھی اس نے سیل آف کر کے ٹیبل پر پھینک دیا پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ ابرار کا کہا ہوا لفظ لفظ اپنی باز گشت سنا رہا تھا۔

”ربیعہ!“ منیوہ بیگم کچن میں داخل ہوئی تھیں۔

تندہی سے انڈے پھینکتے ہوئے ربیعہ چونک کر رہی۔

”جی امی؟“ اس نے پتھر آف کیا۔

”بہت مصروف ہو؟“ وہ ایک لمحہ کو اسے غور سے دیکھ کر محبت سے مسکرائیں۔

”میں عمر کے لیے ماربل کیک بنا رہی ہوں۔ بس پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔ آپ بتائیے۔ کیا کہہ رہی تھیں مجھ سے؟ کوئی کام ہے؟“

”میں سوچ رہی تھی کہ گھر کی کتنی ہی چیزیں بے کار اور فرسودہ سی ہو گئی ہیں۔ کیوں نہ ایک چکر مارکیٹ کا

لگائیں۔ انبیقہ کتنی ہے وہ مصروف ہے۔ میں اور تم مارکیٹ چلیں؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے مسکرائی۔ ”میں کیک کا بیٹر تیار کر لوں پھر اسے اوون میں رکھ کر نکالتی ہوں۔

تب تک آپ بھی تیار ہو جائیں۔“

منیوہ بیگم نے دیکھا۔ وہ بیسے سے بھیگ رہی تھی۔ انہوں نے دم پر رکھے چاولوں پر نگاہ کی، پھر وہ اس کے

قرب آئیں اور اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”میری بیٹی، میرا ہے۔ جس کی زندگی میں شامل ہوگی اس کی قسمت کو جگمگا دے گی۔“

ربیعہ شرمندہ ہوئی اسے ایسی باتوں سے جھینپ آتی تھی۔

”جیتی رہو۔ خوش رہو ہمیشہ۔“ انہوں نے محبت سے وعادی۔

پھر وہ کچن سے نکل گئی تھیں۔ ربیعہ چند لمحے ان کی بے لوث محبت پر غور کرتی رہی پھر مسکرا دی۔ ایک مرتبہ پھر

وہ جلدی جلدی کام نمٹانے لگی۔

کیک کا آمیزہ اوون میں رکھ کر ٹیپیر پچر سیٹ کر کے وہ کمرے میں چلی آئی۔ مارکیٹ جانا تھا سوالماری سے اپنا استری

شدہ جوڑا نکال کر وہ واش روم میں ٹھس گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ نہادھو کر بالکل فریش ہو کر بالوں میں برش

پھیرتے ہوئے منیوہ بیگم کے کمرے کی جانب بڑھی تھی۔

”امی جی!“ اس نے دستک دی۔

پھر کوئی جواب نہ آنے پر اس نے ہینڈل پر ذرا سادباؤ والا تودروازہ کھٹکا چلا گیا۔

”امی جی۔۔۔“ اس نے اندر جھانکا پھر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔
منیزہ بیگم اپنے کپڑوں کی الماری کے قریب گری ہوئی تھیں۔ وہ بے ہوش معلوم ہوتی تھیں ربیعہ کے لبوں سے سچ نکلی تھی۔

ہاسٹل میں سب ہی ان کے قریب موجود تھے۔
عباد شہلا انیقہ عمر ناسم اور ربیعہ۔ ”منیزہ بیگم نے دھیمے سے مسکر کر ان سب کے چہرے دیکھے۔
”یہ مجھے یہاں کیوں لے آئے ہو۔“ وہ قدرے نقاہت سے بولیں۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ عباد۔ بیٹا۔ مجھے گھر لے چلو۔“

”ضرور چلیں گے ان شاء اللہ۔“ وہ بشارت سے مسکرایا۔ ”آپ فٹ فاٹ ہو جائیں تو ابھی چلتے ہیں۔“
”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ انہوں نے اصرار کیا۔
”ہمیں بھی تو پتہ چلے۔“ وہ بھی مُصّر ہوا۔

”تمہیں میں بستر سے اتر کر چل پھر کر دکھاؤں؟“ انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔
”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں آپ کے کمرے پر نہیں ڈاکٹر کے کہنے پر اعتبار آئے گا؟“
انیقہ بولی تھی۔ کب سے ٹال رہی ہیں بیماری کو۔ کسی سے کچھ کہتی نہیں۔ درد ہوتا ہے چپ چاپ سے جاتی ہیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے امی جی! بس اب آپ بالکل صحت یاب ہو کر ہی یہاں سے اٹھیں گی۔“

منیزہ بیگم نے اس کا خفا خفا سا انداز دیکھا اور بے بسی سے مسکرائیں۔
”مجھے ان اسپتالوں سے سخت خوف آتا ہے انیقہ! اسپتال کے بستر پر لیٹنا مجھے خوفزدہ کر دیتا ہے۔ میں نہیں لیٹ سکتی۔“

انہوں نے اچانک ہی اٹھنے کی کوشش کی۔
”مجھے بس گھر لے چلو۔ میں اچھی ہو جاؤں گی۔“
”پلیز امی جی۔۔۔“ شہلا نے ان کا ہاتھ تھام کر انہیں لٹا دیا۔ ”ہم ضرور گھر چلیں گے۔ بس چند ایک ضروری ٹیسٹ ہیں جن کے لیے آپ کو ایڈمٹ کیا ہے۔ ٹیسٹ ہو جائیں تو ہم چلتے ہیں۔ تب تک صبر کر لیں۔“
وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گئیں۔

”مجھے خبر ہے۔ آپ کو مارکیٹ جانے کی جلدی ہے۔“ ربیعہ نے ماحول کو شگفتہ کرنا چاہا۔ ”بے فکر رہیں۔ وہ پروگرام بالکل سیٹ ہے۔ ہم گھر جاتے ہی مارکیٹ چلیں گے۔“
”گھر جانے کی ضرورت کیا۔“ عباد بولا۔ ”رستے میں ہی اتر جانا۔“
”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ ربیعہ نے سر ہلایا۔

سب مسکرائے لگے تھے۔
”آپ لوگ میری نانو کو تنگ نہ کریں۔ دفعتنا“ عمر بدترانہ انداز میں بولا۔ ”وہ پہلے ہی ٹھیک نہیں ہیں اور آپ لوگ انہیں ایسی باتوں سے تنگ کر رہے ہیں۔ وہ بیمار ہیں وہ نہیں جائیں گی مارکیٹ۔“
سارے ہنس دیے تھے۔ منیزہ بیگم بھی سب کچھ بھول بھال مسکرا دیں۔

”السلام علیکم۔“ وہ سنجیدہ سنجیدہ سی اندر داخل ہوئی تھی۔
شفیقہ حیات اور عذرا بیگم چونک اٹھیں۔
”وعلیکم السلام۔“ دونوں ہی قدرے پرجوش انداز میں بولی تھیں۔
عذرا بیگم نے اٹھ کر اس سے محبت سے معاملہ کیا۔ وہ ان سے مل کر ماں کی جانب آئی۔ جھکی انہوں نے اس کی پیشانی چومی۔

”شکر ہے تیری صورت نظر آئی۔“ وہ محبت سے بولیں۔ ”ایقان! تو توماں کو بھی بھول گئی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں ماں!“ وہ تھکے تھکے انداز میں ان کے قریب بیٹھ گئی۔ ”آپ تو میرے خون میں گھلی ہوئی ہیں۔“

”پھر تو یقیناً شوگر ہوگی آپ کو۔“ اندر آتا ہوا رافع شرارت سے ہنسا تھا۔ ”تی سوئیٹ سوئیٹ سی واوی جان جس کے خون میں گھل جائیں۔ کیوں واوی! دادا! بو کو شوگر بھی؟“

”کیا الٹا سیدھا بول رہے ہو؟ عذرا بیگم خفا ہوئیں۔“ ہناریوں کو مذاق میں بھی یاد نہیں کرتے۔

”آپ سنائیں پھوپھو! کیا حال چال ہیں؟“ وہ ایقان کے قریب بیٹھ گیا۔ ”خفکنوں کو کچھ افاتہ ہے یا اب بھی سارے جہاں سے نالاں ہیں۔“

”اتنے شوخ ہو رہے ہو۔“ ایقان نے اسے گھر کا۔ ”خیریت؟ بھابی بیگم۔ کہیں اس کی ڈیٹ بھی تو فیکس نہیں ہو گئی ثانیہ کے ساتھ ہی؟“

”تم اسے سمجھاؤ۔“ شفیقہ حیات بولیں۔ ”شاید تمہاری ہی سن لے۔“

”پہلے تو سب مل کر پھوپھو کو سمجھائیں۔“ رافع نے تقہر لگایا۔ ”یہ کسی کی سنیں گی؟“

ایقان قدرے جزبہ زہی ہوئی۔

”مجھے تم سے ایک کام تھا رافع!“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”میں اسی لیے آئی تھی۔“

”خیر سے کسی کام سے آئی ہو۔“ شفیقہ حیات قدرے ناراضی سے بولیں۔ ”ہم سمجھے ہماری محبت نے بالآخر خوش مارا۔؟“

”ماں۔۔۔“ ایقان نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تی بدگمان ہیں مجھ سے؟ میں نے کماتا آپ تو جیسے میرے خون میں رواں ہیں۔ ہر وقت آپ کی محبت کا احساس رہتا ہے مجھے۔ ماں سے بڑھ کر دنیا میں چاہے جانے کے لائق کون ہے؟ میں بھی ماں ہوں پورا اندازہ ہے مجھے۔“

”ثانیہ اور نافع کی تاریخ ٹھہر گئی۔ کتنے چکر کاٹے عذرا اور بیچوں نے بازاروں کے۔ تو نے نہ پوچھا اگر کسی بات کا۔ ایسی ہوتی ہیں پھوپھیاں۔“

اب نہوں نے واضح اپنی حقیقت کا اظہار کیا۔

”اب رہنے بھی دس ناں! عذرا بیگم جلدی سے بولی تھیں۔ ”وہ بے چاری آہی گئی ہے تو اسے پریشان تو نہ کریں۔ اور وہ چھوٹے بچوں کی ماں۔ اسے کہاں اتنا ٹائم کہ وہ ہمارے ساتھ پورا پورا دن بازاروں میں خوار ہو۔ تم برا محسوس نہ کرنا ایقان! ماں تو صرف تمہاری محبت میں ناراض ہیں۔ ورنہ ہمیں کوئی شکایت نہیں۔“

ایقان مدھم سا مسکرائی تھی۔ مسکراہٹ اب اس کے چہرے پہ نہ جیتی تھی۔

”مجھے اپنی کوتاہیوں کا اندازہ ہے بھابی بیگم۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”کبھی بہت شوق تھا ان سارے کاموں کا۔ بہت بے تابیوں سے سوچا کرتی تھی کہ ”حیات ولا“ میں خوشیاں اتریں گی تو ہر کام میں بھرپور حصہ لوں گی۔ ساری تیاریاں کرواؤں گی۔ بھاپ کی طرح اڑ گئیں ساری تمنا میں پتے ہوئے دل پر سے۔“

اس کا لہجہ بھر آیا تھا۔ اس نے خود پر بمشکل قابو پایا۔

”پھر بھی بھابی جان! کوئی بھی کام ہو۔ آپ مجھے خود سے کہہ دیا کریں۔ کم از کم میری کوتاہیوں کا احساس دلائی رہا کریں۔ میں تو جیسے پتھر بن گئی ہوں۔ وزنی اور لے کار۔“

”میں نے آپ کو ہلانا چاہا اور آپ مزید زور دینا چاہا۔“ رافع بولا۔ ”کیسے کیا کام تھا؟“

”مجھے نیٹ پر میرے اکاؤنٹ کی کرنٹ پیچویشن دیکھ کر بتاؤ۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شفیقہ حیات نے توتلی ہوئی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا جیسے کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کی ہو۔

”چلیں پھر میرے کمرے میں آجائیں۔“ رافع بھی کھڑا ہوا۔

”ہاں ٹھیک ہے، چلو۔“

وہ دونوں کمرے سے نکلے تھے۔

”بینک اکاؤنٹ چیک کرنے آئی ہے؟“ شفیقہ حیات نے قدرے رازدارانہ انداز میں عذرا بیگم سے پوچھا۔
 ”جی ہاں۔ اب نیٹ پر ساری تفصیل مل جاتی ہے اپنے اکاؤنٹ کی، کب کتنے جمع ہوئے۔ کب کتنے نکلائے۔“ عذرا بیگم کسی روپے کی تہہ لگا رہی تھیں۔

”عاشر بھیجتا ہے ناپیہ اسے؟“
 ”بھیجتا ہو گا پیسہ۔ تو خرچا چلا پاتی ہے۔ بچے اچھے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں باپ کے دم سے ہی ہوتا ہے یہ سب کچھ۔“

”اللہ اس بچے کو سلامت رکھے۔ اس کی بے وقوفیاں برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”آمین۔“ عذرا بیگم مسکرا دی تھیں۔

رافع نے کمرے میں آکر کمپیوٹر آن کیا تھا۔

”تمہاری جاب کیسی جارہی ہے،“ ایقان نے ایک نظر دے لے ہوئے فریج پر ڈالی۔

”زبردست۔ اندازہ نہیں ہو رہا ہے آپ کو۔“ وہ نیٹ کنکٹ کرتے ہوئے شوخی سے مسکرایا۔

”ہاں ہو رہا ہے۔“ وہ ہولے سے ہنس دی۔ ”تب ہی پوچھ رہی ہوں۔“

رافع نے اب اس کی اکاؤنٹ انفرمیشن کھولی تھی۔ ایقان بھی قدرے جھک کر دیکھنے لگی۔

پھر کرایہ ایک دونوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔

”اتنے پیسے؟“ رافع نے حیران نظروں سے ایقان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بچیس لاکھ روپیہ پچھلے ماہ جمع کروایا

گیا ہے۔“

”عاشر نے اتنے پیسے۔“ ایقان متحیر و پریشان تھی۔

”کوئی فون آیا تھا ان کا؟“ رافع نے پوچھا۔

”نہیں۔ اور میں اسی لیے اکاؤنٹ چیک کرنا چاہتی تھی میں سمجھ رہی تھی کہ عاشر نے روپے بھی نہیں

بجھوائے ہوں گے لیکن اس نے تو۔“

”کہاں چلے گئے ہیں وہ؟“ رافع متفکر سا بڑبڑایا۔ ”تار روپیہ انہوں نے آپ کے اکاؤنٹ میں اسی لیے ڈلوایا ہو گا

تاکہ بعد میں آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو۔“

”بعد میں؟“ ایقان جیسے خوف زدہ سی ہوئی تھی۔ ”کیا مطلب بعد میں؟“

رافع چونکا پھر ہلکے سے مسکرا کر اس نے کرسی گھمائی۔

”میرا مطلب ہے، جب تک وہ پاکستان نہیں آجاتے تب تک آپ کو یہاں کوئی مشکل نہ ہو۔“

”پاکستان؟“ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے رافع کا چہرہ دیکھا۔ ”وہ۔۔۔ یہاں کیوں آئے گا رافع! مجھے سچ بتاؤ“

کیا اتنے سارے روپے بھیجنے سے اس کا یہ مطلب ہے کہ اب وہ ہم لوگوں سے کوئی سلسلہ، کوئی رابطہ نہیں رکھنا

چاہتا؟ اپنے بچوں سے بھی نہیں؟“

رافع نے نظریں چرایس پھر وہ کمپیوٹر آف کرنے لگا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں پھر؟ ان سے کوئی رابطہ ممکن ہو تب ہی صحیح صورت حال کا علم ہو سکتا ہے۔ میں نے

امریکہ میں مقیم اپنے ایک دوست کو ان کا پتہ بھیجا ہے۔ وہ معلومات حاصل کر کے مجھے مطلع کرے گا۔ ان سے

ایک مرتبہ تفصیلی بات کرنا بہت ضروری ہے تب ہی صحیح صورت حال سامنے آئے گی۔“

ضروری ٹیٹوں کے بعد منیڈہ بیگم گھر آگئی تھیں۔ رپورٹس چند ایک دن میں ملنا تھیں۔ ہاشم ان کی خیریت

لے کر اٹھا تھا۔ عباد سے مصافحہ کر کے وہ باہر کی جانب بڑھا۔
 کچن کے دروازے پر کھڑی شملہ نے حیرت سے جاتے ہوئے ہاشم کی پشت دیکھی تھی۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ
 ہاشم اسے الوداع کے بنائی چلا جائے۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے گئی۔ تب تک وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر چکا
 تھا۔

”ہاشم! شملہ نے اسے پکارا۔
 وہ مڑ کر دیکھنے لگا۔ چند قدم اوپر کھڑی شملہ کو اس نے نجانے کن نظروں سے دیکھا تھا، شملہ کو عجیب سے
 احساس نے گھیرا۔

”آپ۔۔۔ جارہے ہیں۔۔۔؟“ اس نے بے معنی سوال کیا۔
 ”شاید۔۔۔“ وہ چارگی سے بولا۔

”مم۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ میں۔۔۔ میں بھی چلتی ہوں نا۔۔۔ اتنے دن ہو گئے یہاں۔۔۔“
 ”تم۔۔۔“ ہاشم نے اس کے چہرے پر کچھ کھوجا۔ ”میرے ساتھ چلو گی؟“
 ”ظاہر ہے۔ اگر آپ تھوڑا انتظار کر لیں تو۔۔۔ مجھے بیگ میں سامان رکھنے میں کچھ ٹائم لگے گا، پھر چنچ بھی کرنا
 ہے۔“ قریباً ”اُدھا گھنٹہ۔“

”میں چلتا ہوں شملہ۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”تم تیار ہو جاؤ تو مجھے فون کر دینا۔ میں آ جاؤں گا۔ میں تھوڑا
 ریسٹ کرنا چاہتا ہوں۔“

شملہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی۔
 ”ہوں۔“ پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”وسے۔۔۔ اللہ حافظ۔“ وہ گیٹ کی سمت بڑھ گیا۔
 شملہ وہیں کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ گیٹ کھول کر باہر نکل گیا پھر جب تک وہ اسے سڑک پر نظر آتا رہا،
 وہ دیکھتی رہی۔ اسی عجیب سے آزر دگی کے احساس میں وہ اب تک گھری ہوئی تھی۔
 ہاشم کے انداز کی سرحد اٹھ۔ اس کے دیکھنے کا انداز، مسکرائے کا انداز، گفتگو کا انداز۔ وہ سب جیسے کسی مردِ دل
 شخص سے مستعار مانگ لایا تھا۔ یہ ہاشم کے اپنے انداز تو نہ تھے۔ اس کے روم روم سے پھونٹی محبت کی الوہی
 خوشبو نجانے کہاں گم تھی۔ وہ جاتے ہوئے کتنی ہی بار مڑ کر دیکھا کرتا تھا۔ آج اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا
 تھا۔

شملہ بہت کچھ محسوس کر رہی تھی۔ لب کاٹتے ہوئے اس نے تادیر سوچا۔ گزشتہ کچھ دنوں میں سرزد ہونے والی
 کسی دانستہ، نادانستہ خطا کو احاطہ سوچ میں لانے کی سعی کی پھر یاپوس سی ہو کر وہ اندر آنے کے لیے مڑی تھی۔

گھر سے نکل کر کچھ رستہ طے کر کے پھر جانے کیوں اس نے مڑ کر دیکھا۔ کچھ دیر دیکھتا رہا۔ سبز یلوں سے ڈھکا وہ
 خوبصورت سنگ مرمر سے سجا ہوا گھر۔ کبھی کتنے خواب وابستہ تھے اس گھر سے۔ یہاں تک آتے آتے اس کے
 قدم آپ ہی آپ ٹھم جایا کرتے تھے۔ اس کا تصور اس گھر سے آگے جاتا تھا تو پھر اوپر کی سمت جایا کرتا تھا۔ نیلے
 آسمان کی وسعتوں میں ٹھنڈی ٹھار فضاؤں میں منڈلاتے بے فکر پرندے کی مانند وہ ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔ اب اسی
 گھر سے وہ تھکا دینے والا بوجھ کاندھوں پر لیے نکلا تھا۔

”محبت میں اتنا فرق آگیا؟“ اس نے حیران ہو کر سوچا۔

محبت۔۔۔ کل۔۔۔ آزاد پرندے کی مانند بے فکر، زندہ دل اور خوش نظر تھی۔

محبت۔۔۔ آج۔۔۔ شانوں پر دھر۔۔۔ بے بوجھ سی محسوس ہوتی تھی۔

کیوں۔۔۔ کیا ہوا تھا؟

”میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ہاشم۔۔۔ آپ نے کبھی اس محبت کی ہلکی سی رفق بھی محسوس نہ کی ہوگی۔ آج بھی

جب وہ مجھ سے بات کرتی ہے اس کے لہجے میں اس پرانی محبت کی خاموش خوشبو ہوتی ہے۔ وہ خوشبو صرف میں محسوس کر سکتا ہوں، صرف میں۔“

ایک آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔ ایک بار پھر اس کے مساموں سے پسینہ پھوٹا۔

”میں اسے چاہتا ہوں، وہ بھی یقیناً میرے لیے وہی جذبات رکھتی ہے۔“

ہاشم نے پارک کا دروازہ ادا کیا۔ وہ سوچے سمجھے بغیر اندر داخل ہو گیا۔

”میں نے اس سے کہا تھا۔ اگر وہ میرے پاس لوٹ کر آنا چاہتی ہے تو کسی صورت پر کفنیسی۔ نہ ہونے دے۔ وہ میری بات پر عمل کر رہی ہے۔“

ہاشم نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کا دل جیسے صحرا کی تپتی ریت پر ڈاڑھ رہا تھا۔

”کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ شہلا بھی اسی ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی تصویر میں زندہ ہے۔ محبت کبھی کبھی ثبوت کے طور پر بہت کچھ مانگ لیتی ہے۔ کیا آپ شہلا کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں؟“

ہاشم پوری قوت سے دوڑتا رہا۔ وہ ان آوازوں سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا جو پچھلے کچھ دنوں سے اس کے تعاقب میں بوری طاقت سے دوڑی چلی آئی تھیں۔

”آپ کی قربانی سے یہ تصویر پھر سے جڑ جائے پھر سے ویسی ہی مکمل اور خوبصورت ہو جائے تو کیا آپ یہ قربانی نہیں دیں گے ہاشم؟“

ہاشم جیسے تھک کر نڈھال ہو گیا تھا۔ وہ بیخبر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

ماہین اور اس کی ننہیں عریشہ کے کپڑے اور جیولری وغیرہ دیکھ رہی تھی۔ کئی جوڑوں پر آج ہی کام بن کر آئے تھے، کئی جوڑے درزی کے یہاں سے سل کر آئے رکھے تھے۔ ماہین نے اپنی نندوں کی فرمائش پر خاص طور پر انہیں دوسرے کھانے پر بلوایا تھا تاکہ وہ عریشہ کے لیے بنائی گئی چیزیں دیکھ سکیں۔

عریشہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے باہر سے ان لوگوں کی ہنسی کی اور باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ اس سارے قصبے سے لاطعلق بنی اپنی علیحدہ دنیا میں زندہ تھی۔ کچھ دیر بعد ماہین کمرے میں داخل ہوئی۔

”عریشہ! وہ۔۔۔ طیبہ وغیرہ ہمیں بلارہی ہیں۔۔۔ پلیز۔۔۔ کچھ دیر کے لیے باہر آجاؤ۔“

اس کے انداز میں منت تھی۔ عریشہ کے رویے نے سب کے رویے بدل کر رکھ دیے تھے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر بہن کو دیکھا۔

”تھیک ہے۔“ وہ نیم آمادگی سے بولی۔ ”آجاتی ہوں۔“

ماہین کا چہرہ کھل اٹھا۔

”میں چائے بنا رہی ہوں۔ تم تب تک ان کے پاس بیٹھو۔“

عریشہ اس کے جانے کے بعد بھی کچھ دیر اپنی جگہ پر بیٹھی رہی پھر اٹھ کر باہر چلی آئی۔

”السلام علیکم۔“ وہ قدرے روکے انداز میں بولی تھی۔

”وعلیکم السلام۔“ وہ دونوں گرم جوشی سے ملیں۔ ”ارے بھئی، تم تو ابھی سے مایوں بیٹھ گئیں۔“

عریشہ خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے؟ ڈانٹنگ وغیرہ کر رہی ہو؟“ توین نے پوچھا۔

”جی۔۔۔؟“ وہ چونکی۔ ”میں سمجھی نہیں؟“

”اس قدر دلی ہو گئی ہو کہ پچالی نہیں جا رہیں۔ رنگت بھی کھلا گئی ہے۔ ماہین کی مایوں والے دن تو تم اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں کہ آج بھی بہت سے لوگوں کو تم یاد ہو لیکن اب تو۔۔۔ بہت مختلف لگ رہی ہو۔ کیا بیمار رہی ہو؟“ طیبہ جیسے اس کے اندر اترنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ وہ خشک انداز میں بولی تھی۔
وہ دونوں اس کاموڈ دیکھ کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ اتنے میں مابین بھی چائے لے کر چلی آئی۔
”تمہاری بہن بہت بدل گئی ہے مابین!“ توین نے تبصرہ کیا۔
”اچھا۔“ مابین پھینکی سی ہنسی نہس دی۔ ”ہاں یہ کچھ سنجیدہ مزاج ہو گئی ہے۔“ وہ ان دونوں کو چائے دینے لگی۔

”وہ جو تمہاری کزن ہے، کیا نام ہے اس کا؟“ توین سوچتے ہوئے بولی۔ ”ناعمہ! وہ کیسی ہے؟ اس کی متلنی تو بہت اچھی جگہ ہوئی ہے۔“
عریشہ نے نگاہ اٹھائی اس کے لب بھنج گئے۔
”ہاں وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔“ مابین نے تائید کی۔
”ہند کی شادی ہو رہی ہے؟“ انہیں تجسس لاحق تھا۔
”شاید۔ ہمیں تفصیل نہیں پتا۔“

”کزنز میں بھی پردے ہوتے ہیں کیا؟ وہ بھی ہم عمر کزنز میں؟ عریشہ کی تو دوست ہے ناعمہ! اسے تو خبر ہوگی؟“
”تمہیں کیا دلچسپی۔ اس قصے سے؟“ مابین نے جیسے برامان کر طیبہ کو دیکھا۔
”میں جانتی ہوں تا فریحہ کو اس لیے تجسس ہے۔ برامت مانتا لیکن وہ تو بہت ہائی فائی قسم کی فیملی ہے۔ وہ لوگ یہاں رشتہ لینے آئے تو یقیناً اس کے پیچھے کوئی کہانی ہوگی۔“
”ہونے دو۔“ مابین عریشہ کی صورت دیکھ کر بیزار ہو رہی تھی۔ ”تم لوگ چائے پیو۔ یہ بتاؤ عریشہ کے کپڑے اور جیولری کیسی لگی؟“
”زبردست۔ بہت اچھی ہیں ساری چیزیں۔“ طیبہ نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”بری کیسی بنائی ہے تمہاری چچی نے؟“

”پتا نہیں۔ جب دیکھیں گے تو پتہ چلے گا۔“
”ا نہیں کہنا، بری ایسی ہو کہ فرزا والوں کی بری کے سامنے پھینکی نہ لگے۔ ویسے ان کا مقابلہ مشکل نہیں، ناممکن ہے پھر بھی۔“
”خدا کے لیے نوین۔“ مابین نے اسے جھڑک دیا۔ ”یہ مقابلہ بازی ہمارے ذہنوں میں نہیں ہے۔ ایسی باتیں نہ ہی کرو تو اچھا ہے، اور یہاں نہ نہیں، تین شادیاں ہیں۔ ثانیہ کی بری بھی آئی ہے۔ مقابلہ کس کس سے کیا جاسکتا ہے یوں بھی عریشہ، ناعمہ، ثانیہ۔ ہمیں ہی ہیں۔ ہمیں مقابلہ بازی نہیں کرتیں۔“
نوین اور طیبہ، مابین کاموڈ خراب ہو مادیکھ کر خاموش ہی ہو گئیں۔ چائے پی کر ان دونوں نے رخصت چاہی تھی۔
عریشہ دنیا وانیہ سے گم اپنی جگہ بیٹھی سوچے چلی جا رہی تھی۔

”اے بھئی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ تم لوگوں نے کیا دلیہ اور کچھڑی کھانا شروع کر دیا ہے مجھے۔“ منیوہ بیگم کچھڑی کی پلیٹ دیکھ کر بولی تھیں۔
ربیعہ ہنس دی۔
”ہم نے مانا کہ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ یوں سمجھیں کہ ہفتہ بھر کی صفائی منائی جا رہی ہے پیٹ کی۔ لہذا دلیہ اور کچھڑی ہی کھانا ہوں گے۔“
”یہ پٹیاں تمہیں شہلا اور انیقہ پڑھا رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں۔“ وہ روہانے انداز میں بولیں۔ ”خیر۔۔۔ یہ تو میں کھائی لیتی ہوں انہیں پھر اریٹ چلتے ہیں۔ اس دن بھی نہیں جاسکے تھے۔“

ربیعہ کو بہت زور ہے ہنسی آئی تھی۔

”یا اللہ۔۔۔ امی جی۔۔۔ آخر ایسی کون سی اہم شاپنگ کرنا چاہتی ہیں آپ۔ کچھ دن آرام کر لیں، مارکیٹ کون سا کہیں بھاگی جا رہی ہے۔“

”یہ کچھڑی میں اسی شرط پر کھاؤں گی۔“ وہ ضدی لہجے میں بولیں۔

ربیعہ نے دلچسپی سے انہیں دیکھا اور پھر ہنس دی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ اگر عباد بھائی پر میٹن دے دیتے ہیں تو پھر چلے چلیں گے۔“

”ہمیں عباد کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں ماں ہوں اس کی۔ وہ میری ماں نہیں ہے۔“

ربیعہ ہنس ہنس کر دھری ہو گئی۔

”آپ اسپتال میں رہ کر بہت بزدلہ سنج ہو گئی ہیں۔“

”وہ تم ہو گئی ہو۔ میں تو بہت چنچڑی ہو کر آئی ہوں۔ یہ تمہارا حوصلہ ہے کہ مجھے برداشت کر رہی ہو۔“

ربیعہ ان کے قریب بیٹھ گئی اور اپنا سر ان کے شانے سے ٹکا دیا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ ساری عمر آپ کے ساتھ گزار دوں۔ آپ نے مجھے کیا دیا ہے۔ میں لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی۔ میرے اندر ایک پیاس تھی جسے آپ کی محبت نے سیراب کیا ہے۔ اس سے زیادہ کیا کہوں امی جی۔“

منیہہ بیگم نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

”پیاس صرف تمہارے اندر نہیں تھی ربیعہ! پیاس تو میرے اندر بھی تھی۔ اسے تم نے بجھایا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے میرے ہی وجود کا گم گشتہ ٹکڑا ہو تم۔“ انہوں نے ربیعہ کا چہرہ تھام کر غور سے دیکھا۔ ”بار بار پوچھا تم سے۔ بار بار۔۔۔ لیکن۔۔۔“

اسی لمحے عباد اندر داخل ہوا۔

”امی جی۔۔۔ امیر حسن آئے ہیں۔ آپ کی طبیعت کے بارے میں سن کر عیادت کے لیے آئے ہیں۔ ویسے بائی داوے۔ یہاں کون سا جذباتی سین چل رہا ہے۔“

اس نے ربیعہ اور انہیں یوں ساتھ ساتھ بیٹھے دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔

”اس سے تمہیں کیا۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔ ”یہ ہم ماں بیٹی کا معاملہ ہے۔ امیر حسن سے ہمارا کوئی پردہ تو نہیں ہے اسے یہیں لے آؤ۔“

”میں بچن میں جانی ہوں۔“ ربیعہ فوراً ”اٹھ کھڑی ہوئی۔“ چائے وغیرہ تیار کر لوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ عباد نے سر ہلایا۔ ”میں امیر کو یہیں لے آتا ہوں۔ ڈرائنگ روم تو ذرا تکلیف ہے۔“

ربیعہ بچن میں چلی آئی پھر وہ دفعینا ”چونگی تھی۔ ڈرائنگ روم کی کرسی پر شہلا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی اور فکر کی انتہائی گہری لکیر تھی۔ ربیعہ اس کے قریب چلی آئی۔

”شہلا آئی۔۔۔“

”آں۔۔۔ شہلا جیسے نیند سے جاگی۔“ ربیعہ۔۔۔ کہو؟“

”کیا سوچ رہی ہیں؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرائی۔ ”بس یونہی۔۔۔ یہاں بیٹھ گئی تھی۔“

”آپ کچھ پریشان لگتی ہیں۔“ ربیعہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ ”خیر یہ تو ہے نا؟“

”ارے سب خیریت ہے۔“ اس نے بشارت سے مسکرانے کی کوشش کی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں دراصل ہاشم کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ کل میں نے کہا تھا کہ مجھے بھی لے جائیے گا۔ شاید بھول گئے۔ آج۔۔۔ آج پتا نہیں۔“

وہ متذنب ہی ہو کر خاموش ہو گئی۔
 ”اوہ“ ربیعہ شوخی سے مسکرائی۔ ”تویوں کہتے میاں جی یاد آرہے ہیں اور بے فکر رہیے۔ وہ زمانے کو بھول
 کتے ہیں لیکن آپ کو نہیں۔“
 ”جھا“ شہلانے جیسے ہل کر اسے دیکھا تھا۔ ”یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم؟“
 ”کتنی دقتوں سے تو آپ کو حاصل کیا ہے انہوں نے۔ بھلا بھول سکتے ہیں وہ۔“ ربیعہ کو انہی سب ہی کچھ بتا
 چکی تھی۔

شہلا جیسے اس کی کم عقلی پر تاسف سے مسکرائی۔
 ”بھولنا اسے مشکل ہو تا ہے ربیعہ! جولا حاصل ہو۔ حاصل کو بھلانا نہیں یاد رکھنا مشکل ہے۔“ ربیعہ نے چند
 لمحوں کی بات پر غور کیا پھر ہنس پڑی۔
 ”آپ ہاشم بھائی کی محبت پر بھی شک کر سکتی ہیں اپنا؟ بہت بری بات ہے۔ ہم سب تو آپ پر رشک کرتے ہیں
 کہ اتنا محبت کرنے والا جیون سا بھی ملا آپ کو۔“
 شہلانے گہری سانس بھری۔

”یاد رہے محبت بھی ایک مشکل ہے ربیعہ! پر تم نہیں سمجھو گی۔ میں تو دراصل سوچ رہی تھی کہ مابین آئی ہوئی
 ہے کیا سوچے گی وہ۔ ایک ہی بھابھی ہے وہ بھی اپنے میکے بھاگ گئی۔“
 ”تو فون کر لیں ہاشم بھائی کو وہ آفس سے انھیں گے تو آپ کو بھی لیتے جائیں گے۔“
 دفعہ ”ربیعہ کو بچن میں اپنی آمد کا مقصد یاد آیا تو وہ چائے کے لیے پانی رکھنے لگی۔
 شہلا کچھ سوچتے ہوئے بچن سے باہر نکلی تھی۔

چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ٹرائی سجا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو منیزہ بیگم کے ساتھ گفتگو میں
 مصروف امیر حسن اسے دیکھ کر بے ساختہ ہی کھڑا ہوا تھا۔
 ”السلام علیکم۔“ ربیعہ نے گفتگو سے مسکرا کر اسے سلام کیا۔ ”تشریف رکھیے نا۔“
 ”وعلیکم السلام۔“ وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”کیسی ہیں مس ربیعہ آپ۔۔۔ اور۔۔۔ یہ اتنا کچھ آپ آئی کے لیے لے
 آئی ہیں۔ انہیں پرہیز کرا میں بھی۔“

ربیعہ دھیرے سے ہنس دی۔ وہ یقیناً دل چسپ شخصیت تھا۔
 ”یہ ”اتنا کچھ“ نہیں ہے۔“ وہ منیزہ بیگم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ”اور یہ امی کے لیے نہیں،
 آپ کے لیے ہے اور آپ بالکل بھی تکلف نہیں کریں گے۔“
 ”چلیں جناب، ٹھیک ہے سزا ہے تو سزا ہی سہی۔“
 ”اس سزا میں میں بھی برابر کا شریک ہوں۔“ عباد رحمتہ بولا تو سب ہنس دیے۔ ربیعہ چائے بنانے لگی۔
 ”چینی؟“ اس نے اچانک نگاہ اٹھا کر امیر حسن سے پوچھا۔

اور تب جیسے امیر حسن کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ اسے بے حد جذب اور لگن سے دیکھ رہا تھا۔ شوق، جستجو اور
 دلچسپی سے بھر پور وہ نظر بے اختیار جھک گئی۔ وہ اپنی چوری پکڑ لیے جانے پر شرمندہ تھا۔
 ”چینی۔“ ربیعہ کو احساس ہوا کہ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔
 ”آپ کی مرضی۔“ وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے قدرے اعتماد سے بولا۔
 ”آدھا کپ ڈال دو۔“ عباد نے اسے لطف اندوز ہوتے ہوئے ٹکڑا لگا پاتا تھا۔
 ربیعہ بھی دھیرے سے ہنس دی۔ اس نے چائے بنا کر اس کے ساتھ بڑی کارنر ٹیبل پر رکھ دی۔
 ”یار امیر! یہ رس ملائی لو نا۔ یہ اپنی ربیعہ آج کل اچھی بھلی شیفت بنی ہوئی ہے۔ روز کوئی نہ کوئی نئی چیز ہم پر

آزاد تھی ہے لیکن آج کی دُش و اُفتی اچھی ہے۔ ٹرائی کرو بار۔“
امیر حسن بھی ٹرائی کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔ ربیعہ چپکے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

رات کا آخری پہر تھا۔ عریضہ نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور برابر میں سوئی ہوئی مایین کو دیکھا۔
”خوش نصیب ہو آپنی!“ اس نے دل میں اٹھتی ہوئی ہوک کو دبا کر سوچا۔ ”نیند سے لطف اندوز ہونا قسمت والوں کا کام ہے۔ ہم سے حمال نصیب تو دن کو رات اور رات کو دن کرنے کے چکر میں ہی زندگی گزار لیتے ہیں۔“
آج پھر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ آج پھر وہ کہیں سی اٹھتی تھی دل میں۔ مایین کی نیندیں پھر دل کے دھتے ہوئے تاروں کو جھیر گئی تھیں۔

فرانسہ۔ فرانسہ۔ فرانسہ۔ یہ نام اس کے لیے جیسے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا تھا۔ جب کبھی وہ اپنے حال پر صبر کرنا چاہتی تھی کسی نہ کسی کے لبوں سے اس نام کا ذکر سن کر برداشت کی حدیں ختم ہونے لگتی تھیں۔
”یا تو تم اسی وقت اسٹینڈ لے لیتیں۔“ مایین نے کبھی کہا تھا۔

”اسٹینڈ تو پھر کسی بھی وقت لیا جاسکتا ہے۔“ یہ اس کا جواب تھا۔
اسے اپنا جواب ابھی تک یاد تھا۔ وہ اپنی بات پر قائم تھی۔ سچ کہا تھا اس نے اور اب ہر گزرتا دن اسے کہتا تھا کہ ابھی وقت ہے۔ ابھی وقت ہے۔ وہ ابھی کسی کا نہیں بنا اور تو کسی کی بن کر بھی نہ بنی۔ بن بھی نہیں سکتی۔ یہ بے کار کا بُرہ روستی کا ناطہ کبھی کسی کو خوشی نہیں دے سکتا۔

”تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا۔“ دل نے سفائی سے کہا۔
وہ دھیرے سے اٹھ بیٹھی پھر اس نے مایین کو دیکھا۔

”محبت کے وعدے اس نے مجھ سے کیے تھے، ساری ساری رات، ہم ایک دو بجے کے لیے جاگتے تھے پھر۔ پھر یہ ناعمہ۔ یہ کیسے پہنچی اس تک۔۔۔ وہ میرا تھا۔۔۔ میرا ہے۔۔۔ میں اس کی تھی، میں اس کی ہوں۔۔۔“

وہ بیڈ سے اتر آئی پھر کسی رو بوٹ کی مانند چلتی ہوئی لاؤنچ میں آئی۔

”کسی کا ڈر نہیں ہے مجھے، ہر خوف سے آزاد ہو چلا ہے یہ دل۔ بس ایک ہی لگن ہے، وہ میرا نہیں بن سکتا تو ناعمہ بھی اسے نہ پاسکے۔ ناعمہ نے اسے عریضہ بن کر پھانسا ہے، میں اسے بتاؤں گی کہ میں کون ہوں۔“

وہ صوفے پر بیٹھی اور برابر میں رکھا فون سیٹ اٹھا لیا۔ فراز کا سیل نمبر اب تک یادداشت میں اسی آب و تاب سے جھگا رہا تھا۔

رات کے گہرے سنائے میں ٹیلی فون سیٹ گود میں دھرے وہ اپنے اندر اترے ہوئے سنائوں کو سننے میں محو تھی۔ ایک بڑا سا والیہ نشان تھا جو ذہن کے پردے پر یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جلنے، کڑھنے، سوچنے اور پھر کر گزرنے میں فرق تھا۔ اس کی ایک فون کال محض ایک فون کال نہ تھی۔ یہاں پہ ایک موڑ تھا جس سے آگے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اندھا کنواں گہری کھائی، خوشیوں سے بھری رہ گزری۔ جو کچھ بھی تھا اس کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہ تھا۔

وہ اندھیرے میں بیٹھی لب کا ہتی رہی۔ کیا کرے، کیا نہ کرے؟ اسے فون کر لے۔ اسے فون نہ کرے، اسے حقیقت بتا دے۔ اسے لا علم ہی رہنے دے۔ زندگی کو نیا موڑ دینے کی کوشش کرے یا پھر جو کچھ بھی ہے اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لے۔ اس نے اپنے اندر آوازوں کو ابھرتا ہوا محسوس کیا۔ آوازیں ہی آوازیں۔ شور ہی شور۔ اس کے باپ کی آواز۔ اس کے سر پر ٹھہرا وہ بھاری ہاتھ۔ اس کی ماں کی آواز۔ اس کا رونا مسکنا۔ رابعہ بیگم کی آواز۔ نافع کی آواز۔ اس کے بھائیوں کی آوازیں۔ ناعمہ کی آواز۔ ناعمہ کی ہنسی۔ ناعمہ کے قہقہے اور پھر یہ آہستہ آہستہ ساری آوازیں اس ایک آواز میں مدغم ہوتی چلی گئیں۔ ناعمہ کے بلند آہنگ قہقہوں نے اس کی ہستی کو پر خچوں میں بانٹنے کی کوشش کی۔

عریشہ نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اس کے وجود کے میب سمندر میں دل کسی بے آسرا کشتی کی مانند ڈول رہا تھا۔

”آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ براہ مہربانی کچھ دیر بعد کوشش کیجئے۔ شکریہ۔“ شائستہ آواز میں ریکارڈ شدہ پیغام سنتے ہی اس کی بہت دیر سے رکی سانس آزاد ہوئی تھی۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی، فراز کا سیل آف تھا۔ یقیناً وہ صبح تک آف ہی رہنا تھا۔ عریشہ کو احساس ہوا کہ نہ صرف وہ بلکہ خود قسمت بھی اس سے مصروف جنگ تھی۔ بے حد مایوسی کے عالم میں اس نے ریسیور بہت آہستگی سے کھینچ کر رکھ دیا۔ اس وقت جس عالم جنون میں وہ یہ حرکت کر گزری تھی، نجانے پھر کبھی اس پر طاری بھی ہونا تھا یا نہیں۔ وہ وہیں بیٹھی لب کاٹتی رہی۔

”نہیں۔“ پھر اس نے سوچا۔ ”آج نہیں تو پھر سہی۔۔۔ میں اپنی آخری سانس تک یہ کوشش کروں گی۔ یہ وقتی جنون نہیں ہے، ایک آتش فشاں ہے جو نیند سے جاگا ہے۔ اسے بہنا ہی ہوگا۔“

شیشوں سے باہر۔۔۔ بھیگی ہوئی رات۔۔۔ ہم مدھم مدھم جلنے لگی تھی۔

تیل کی آواز پر وہ کچن سے نکلی تھی۔ ایک ہاتھ پر کباب کی ٹکیہ رکھے، دوسرے ہاتھ کی پشت سے ماتھے پر آتے بال ہٹاتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو۔۔۔“ نہایت مصروفیت کے عالم میں اس نے کہا تھا۔

”تسلیمات۔“ شائستہ انداز میں کہا گیا۔

ربیعہ کو آواز پہچاننے میں لمحہ بھر لگا۔

”اوہ امیر حسن صاحب۔۔۔ کیسے ہیں آپ؟“

”خیریت ہیں جناب۔“ وہ بشارت سے انداز میں بولا۔ ”آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتے ہیں۔“

ربیعہ ہنس دی۔ ”لگتا نہیں، آپ سفید فاموں کے ملک سے آئے ہیں۔ آپ تو دہلی کے لگتے ہیں۔“

امیر حسن نے اس کی بات پر بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ ربیعہ کی بات اسے دلچسپ محسوس ہوئی تھی۔ وہ کافی دیر ہنستا رہا۔

”اوہ گاؤ۔“ پھر وہ بولا۔ ”آپ کی معصوم، کم گو شخصیت بندے کو احساس نہیں ہونے دیتی کہ آپ اتنی برجستہ اور ذہین ہیں۔ ویسے جناب سفید فاموں کو ہم نے کبھی اتنا حاوی ہی نہیں کیا خود پر کہ ہم بھول جائیں کہ ہماری جڑیں دلی میں بھی ہیں۔“

ربیعہ اس کی بات کے پہلے جملے پر کچھ محتاط سی ہوئی تھی۔

”اردو تو ہمیں خاص طور پر پڑھوائی گئی تاکہ ہم اپنی تہذیب سے دور نہ ہو جائیں۔ شہر پار سے مل کر بھی آپ کو یہی احساس ہوگا۔ انگریزی ہم بولتے ضرور ہیں لیکن اردو بولنے پر آئیں تو سننے والے سنتے ہیں اور کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے بڑی شائستہ شائستہ باتیں کریں جیسے اس وقت دل چاہ رہا ہے۔“

وہ بہت موڈ میں معلوم ہوتا تھا۔ عموماً اتنی بے تکلفی سے اتنی زیادہ باتیں وہ کرتا نہیں تھا۔

ربیعہ ہولے سے کھنکھاری۔ اس نے ہتھیلی پر رکھی کباب کی ٹکیہ کو دیکھا جسے وہ گولائی میں تراش کر بس فراٹنگ پین میں رکھنا ہی چاہتی تھی۔ جب تیل کی آواز پر اسے کچن سے نکلنا پڑا تھا۔

”کوئی۔۔۔ کام تھا۔ آپ کد۔۔۔“ اس نے امیر حسن کو یاد دلانا چاہا، ورنہ وہ تو بہت فراغت سے معلوم ہوتا تھا۔

”آل۔۔۔“ وہ چونکا۔ ”نہیں۔۔۔ آف تو ہے۔۔۔ عباد۔۔۔ عباد سے بات کروادیں۔۔۔“ وہ پھر معمول کے انداز پر آگیا۔

”عباد بھائی تو گھر پر نہیں ہیں، آپ نے ان کا سیل نمبر ڈرائی نہیں کیا؟“

”نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”تو کیجئے نا۔“ ربیعہ مسکرائی۔

”ٹھیک ہے۔ ویسے عباد سے بات کرنا ہو تو میں پہلے گھر کا نمبر ہی ٹرائی کرتا ہوں۔“ وہ جیسے شرارت سے مسکرایا۔ ربیعہ پھر مقناط ہوئی تھی۔ امیر حسن کے انداز قدرے تبدیل شدہ تھے۔

”میں ذرا بڑی تھی مگر میں۔“ اس نے جیسے معذرت و رخصت چاہی تھی۔
 ”بڑی تو میں بھی تھا جناب اپنے آس میں پھر بھی میں نے وقت نکال کر نجائے کیوں۔ مصروفیت کے لمحات سے کبھی بھی چوری کرنے کا جی چاہتا ہے۔ یہ لمحے چرا نا بہت دلچسپ کام ہے ربیعہ۔ کبھی کیا ہے آپ نے؟“
 یکدم باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ربیعہ چونک اٹھی۔

”میرا خیال ہے عباد بھائی آگے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”آپ ہولڈ کریں گے؟“
 ”نہیں۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”اس اوکے۔ خدا حافظ۔“

”آل۔“ ربیعہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ فون بند کر چکا تھا۔ ربیعہ نے قدرے حیرانی سے ریسور کو دکھا پھر فون بند کر دیا۔ اسی لمحے لاؤنج کا دروازہ کھول کر عباد اندر آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا جسے اس نے صوفے پر رکھ دیا اور خود پین میں چلا گیا۔ ربیعہ اس کے پیچھے گئی۔

”امیر حسن صاحب کا فون تھا آپ کے لیے۔“ اس نے کباب فراننگ پین میں رکھا اور آج تیزی کی عباد کو لڑ سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ لمحہ بھر کو رکا۔

”امیر حسن سے تو میری ابھی بات ہوئی ہے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ قبل۔ میں رستے میں ہی تھا۔“
 ربیعہ سٹپٹائی گئی اسے یہ توقع نہ تھی۔

”پتا نہیں۔ شاید انہیں کوئی ضروری بات یاد آگئی ہو۔ آپ پوچھ لیجئے گا۔“
 ”ہوں۔“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔

ربیعہ نے بغور اسے دیکھا وہ کچھ پریشان سا لگتا تھا۔

”آپ کے لیے کھانا لگا دوں عباد بھائی؟ ناشتہ بھی بہت لائٹ سا کیا تھا آپ نے۔“
 ”ہوں؟“ وہ چونکا۔ ”نہیں ربیعہ ابھوک نہیں ہے۔“

”میں نے منر چاول اور پکین کباب بنائے ہیں۔ آپ کا فیورٹ کمبی نیشن۔ ساتھ لوکی کارائتہ بھی ہے۔“
 ”میں۔۔۔ کچھ دیر لیٹوں گا ربیعہ۔“ اس نے جیسے معذرت کی۔

”آپ۔۔۔ ٹھیک تو ہیں؟“ ربیعہ کو وہ بہت تھکا ہوا است سامعہ معلوم ہوا۔
 ”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”امی کہاں ہیں؟“

”سو رہی ہیں۔ بس اب اٹھتی ہی ہوں گی۔ آج میں ضرور انہیں مارکیٹ لے جاؤں گی۔ کب سے ضد کر رہی ہیں ٹھیک ہے نا عباد بھائی؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ تجھے تجھے سے انداز میں بولا۔ ”لیکن رات کو ان کے چند ایک ٹیسٹ اور ہوں گے۔ میں انہیں اسپتال لے کر جاؤں گا۔ ان کی بچھل رپورٹس کچھ اتنی ٹھیک نہیں آئیں۔ چند ایک ٹیسٹ ریپیٹ ہوں گے۔“

”اللہ خیر کرے۔“ بے ساختہ ہی اس کے لبوں سے نکلا۔

”میں کچھ دیر سوؤں گا۔“ عباد نے ایک گہری سانس بھری۔ ”تم لوگ تیار ہو جاؤ تو مجھے جگا دینا۔ میں چھوڑ آؤں گا۔“

”آپ ریسٹ کریں۔ ہم تو ٹیکسی میں بھی چلے جائیں گے۔“

عباد متشکر سے انداز میں پین سے نکل گیا تھا۔ ربیعہ بھی پرسوج انداز میں کھڑی رہی۔

”آپ تیار ہیں امی؟“ سب کاموں سے فارغ ہو کر کپڑے تبدیل کر کے اس نے ان کے کمرے میں جھانکا۔
مینزہ بیگم چونک اٹھیں۔

”ہاں ربیعہ! میں تو تیار ہوں۔ ذرا یہاں آؤ۔“ ربیعہ کمرے میں چلی آئی۔
مینزہ بیگم ایک چھوٹی صندوقی کھول کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ربیعہ ان کے قریب بیٹھتی بیٹھتی اچانک چونک سی گئی۔ صندوقی میں سونے کے زیورات بھرے ہوئے تھے۔
”یہ دیکھو ربیعہ۔“ انہوں نے صندوقی اس کے آگے کی۔ ”یہ زیورات شہلا کے والد نے میرے حوالے کیے تھے۔ اس میں ان کے کئی خاندانی زیورات ہیں اور یہ۔۔۔ یہ سونا میرا حق مہر ہے۔“
انہوں نے چند چھوٹی چھوٹی نکلیاں اسے دکھائیں۔
”یہ تو۔۔۔ لاکھوں کا زیور ہے امی!“ ربیعہ حیران تھی۔

”ہاں۔۔۔ قریباً پچاس لاکھ مالیت ہوگی اس کی۔ میں اسی لیے مارکیٹ جانا چاہ رہی ہوں۔ مجھے اپنے سارے پاس جانا ہے۔ یہ تین نکلیاں میں نے تمہارے نام کی رکھی ہیں۔ میں چاہتی ہوں میں اپنی اور تمہاری مشترکہ پسند سے تمہاری شادی کا زیور بنواؤں۔ رہے یہ خاندانی زیورات۔۔۔ تو ان پر شہلا، انیقہ اور عباد کا حق ہے۔ یہ ان کی وادی، پردادی کے زیورات ہیں۔ جو سونا میرا ہے وہ میں نے سارے کا سارا تمہارے نام کر دیا ہے۔“
ربیعہ سے کچھ بھی بولنا نہ جاسکا۔ وہ ششدر سی انہیں دیکھتی رہی۔

”اتنا زیور نیکی میں لے جانا کسی طور مناسب نہیں ہے۔ تم عباد کو جگا دو۔ اس کو ہمیں صرف مارکیٹ تک چھوڑ آئے۔ رہی کپڑوں وغیرہ کی شاپنگ تو وہ ہم خود چلے جائیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“
”لیکن امی جی!“ وہ بمشکل بولی۔ ”جو۔۔۔ سونا آپ کا ہے اس پر بھی میرا نہیں، شہلا آپ کی اور انیقہ کا حق ہے۔ بخدا مجھے محنتوں سے اتنا زیور بار نہ بیچتے۔ میں کیسے اتنا بوجھ اٹھاؤں۔۔۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ مینزہ بیگم نے چند لمحے اسے غفلتی باندھ کر دیکھا۔

”ربیعہ۔۔۔ پھر وہ جسے سرگوشی میں بولی تھیں۔“ مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ تم کسی اور کو کچھ سے پیدا ہوئی ہو۔ میری ممتا کو تمہاری صورت دیکھ کر یوں قرار آتا ہے۔ میں سمجھ نہیں پاتی۔ تم مجھ سے ایسی پرانی بائیں مت کرو۔ جو جس کا حق ہے وہ اسے ہی ملنا چاہیے۔ میں شہلا اور انیقہ کا حق تمہیں نہیں دے رہی۔ اپنا حصہ دے رہی ہوں کیونکہ میرے دل نے تمہیں بی مانا ہے۔“
ربیعہ کو جانے کیا ہوا تھا وہ ان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ربیعہ۔۔۔“ وہ دیر دیر اس کے بال سہلانے لگیں۔ ”جب ہم لوٹیں گے تب مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔ میں نے بہت انتظار کیا کہ شاید تم خود سے کچھ کہو۔ اپنا بوجھ بانٹنا چاہو۔ دل ہلکا کرنا چاہو لیکن شاید تمہیں ہم پر۔۔۔“

ربیعہ نے ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا اس کی آنکھیں موتی بہا رہی تھیں۔
”عباد بھائی نے ہی مجھے منع کر دیا تھا امی! صرف ان کی زبان کا بھرم رکھنے کے لیے میں نے کبھی آپ سے کچھ کہا نہیں ورنہ کتنی راتیں صرف اس سوچ میں مبتلا رہ کر گزاریں میں نے کہ میں آپ سے جھوٹ بول کر اس چھت کے نیچے موجود ہوں۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں بیٹی! تب ہی خاموش رہی۔“ انہوں نے اس کے آنسو پونچھے۔ ”لیکن اب سوچتی ہوں کہ جانے کتنی سائیں اور مقدر میں لکھی ہیں۔ تمہارے اور انیقہ کے فرض سے جلد از جلد سکدو شہو جاؤں تو بہتر۔۔۔“

ربیعہ کو عباد کی بات یاد آئیں۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے مضطرب سی ہو کر ان کا چہرہ دیکھا۔
”میں آپ کو چھوڑ کر کبھی بھی کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔“ وہ روکنے ہوئے لمحے میں بولی۔ ”آپ انیقہ اور عباد

بھائی کی شادی کی تیاریاں کر س، مجھے شادی وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔
 منیہہ بیگم محبت سے مسکرائیں۔
 ”تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں بھی تمہیں چھوڑ کر کیس نہیں جاؤں گی۔“
 ”آپ نے کہاں جانا ہے؟“ ربیعہ ان کے سارہ سے لہجے میں کسی گئی بات کا مطلب بالکل نہ سمجھی۔
 ”جہاں ایک دن سب نے جانا ہوتا ہے، جہاں جانے سے پہلے میں اپنی اولاد کے فرض سے سبکدوش ہو جانے کی اپنی سی کوشش تو ضرور کرتی ہیں۔ آگے ان کی قسمت۔“
 ”میں یہی باتیں نہ کیا کریں امی جی!“ ربیعہ دل گرفتہ ہو گئی۔ ”آپ کو کوئی خوشی ملتی ہے مجھے یوں دکھی کر کے؟“
 منیہہ بیگم نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر چوم لیے۔ ربیعہ نے محبت سے انہیں دیکھا۔
 ”آپ اکثر میرے ہاتھ جو متی ہیں۔ میں نے بھی آپ کو شہلا آبی یا انفقہ کے ہاتھ چومتے نہیں دیکھا۔“
 ”تمہارے ہاتھ دیکھ کر مجھے کچھ یاد آتا ہے اس لیے۔“
 ”کیا۔“ ربیعہ محویت سے ان کے سلو نے چہرے کے بدلنے رنگ دیکھنے لگی۔
 ”امی جی۔“ ”عباد اندر آیا۔“ میں کچھ زیادہ ہی سولیا شاید آپ لوگوں کو دیر تو نہیں ہو گئی؟“
 وہ دونوں چونک اٹھی تھیں۔
 ”نہیں دیر نہیں ہوئی ابھی۔“ منیہہ بیگم معنی خیزی سے مسکرائیں۔ ”چلو، چلیں۔“

ربیعہ کے بہتر اصرار منع کرنے کے باوجود منیہہ بیگم نے وہی کیا جو انہوں نے کہا تھا۔ انہوں نے اپنے حصے کا سارا
 سونا ربیعہ کے زیورات تیار کرنے کے لیے جیولر کے حوالے کر دیا تھا۔
 ”تم مجھ سے بار بار مذاق میں پوچھتی تھیں کہ میں مارکیٹ آنے کے لیے اتنی بے چین کیوں تھی۔“ انہوں نے
 ربیعہ سے کہا۔ ”تو یہی وجہ تھی۔ میں یہ کام نمٹانے کے لیے از حد بے چین تھی۔ آج میں مطمئن ہوئی ہوں۔“
 وہ دونوں جیولری شاپ سے نکل رہی تھیں۔ ربیعہ خاموش ہو گئی تھی لیکن وہ دل ہی دل میں سخت شرمندہ
 تھی۔ اس کے خیال میں منیہہ بیگم کی ملکیت پر ان کی بیٹیوں کا حق تھا۔ اسے انفقہ اور شہلا سے شرمندگی محسوس
 ہو رہی تھی۔
 ”کیوں نہ کچھ گرم کپڑوں کی شاپنگ کر س، سردی بس پہنچنے ہی والی ہے۔“ منیہہ بیگم نے مسرور سے انداز میں
 کہا۔ وہ اپنا بوجھ اتار جانے سے بہت خوش لگتی تھیں۔
 ”آپ نے اپنی ضرورت پوری کر لی۔“ وہ ہار ماننے والے انداز میں بولی۔ ”اب جو چاہے سو کریں۔“
 ”اچھی بیٹیاں ماؤں کی باتیں مانتی ہیں۔“ وہ رویار انداز میں بولیں۔
 پھر وہ دونوں ایک شاپنگ پلازہ میں داخل ہو گئی تھیں۔ منیہہ بیگم ایک کپڑے کی دکان میں داخل ہوئیں تو ربیعہ
 وندو میں لگے ڈیزائن دیکھنے لگی۔ تب ہی کسی نے بے حد مسرت، جوش اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے اسے
 پکارا تھا۔

”ربیعہ۔“

ربیعہ نے مڑ کر دیکھا پھر لمحہ بھر کے لیے جیسے پتھر کی ہو گئی۔

”ترانہ۔“ اس کے لبوں سے سرگوشی کے عالم میں نکلا۔ ”ترانہ۔۔۔ تم۔۔۔ یہ تم ہو؟“

ترانہ نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا تھا۔ عالم جوش میں وہ جیسے ہولنا بھول گئی تھی۔ بس ربیعہ کو جھنجھوڑ
 رہی تھی۔

”اوہ خدا۔۔۔ آج میں کچھ اور مانگتی تو وہ بھی ملتا۔ آج وقت قبولیت تھا ربیعہ!“ پھر وہ گلو گئے لہجے میں بولی۔ ”آج گھر
 سے نکلنے وقت میں نے نجانے کیوں شدت سے تمہیں یاد کیا تھا۔“

دونوں بے اختیار ہو کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔ چند لمحوں بعد انہیں آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگوں کا احساس ہوا تو وہ علیحدہ ہو گئیں۔

”ایک منٹ ترانہ! ربیعہ بولی۔“ میں ابھی آئی۔“

ترانہ کو وہیں چھوڑ کر وہ تیزی سے دکان میں داخل ہوئی تھی۔ منیجر بیگم کاؤنٹر کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ دکاندار انہیں مختلف کپڑے دکھا رہا تھا۔

”امی جی۔“ ربیعہ نے انہیں مخاطب کیا۔ ”میں باہر ہوں، آپ اطمینان سے شاپنگ کریں۔“

”خیریت؟“ وہ چونکی۔

”میں بعد میں بتاؤں گی۔“ وہ اسی تیزی سے باہر نکلی تھی جیسے اسے پھر سے ترانہ کے کھوجانے کا خدشہ تھا۔

ترانہ وہیں کھڑی تھی۔ ربیعہ اسے لے کر قدرے کم رش والے حصے میں چلی آئی۔

”اب کو تم یہاں کراچی میں کیسے؟“

”ایک لمبی داستان ہے۔“ ترانہ کی مسکراہٹ عجیب سی تھی۔ ”سننے کے لیے کم از کم بورا دن چاہیے ہوگا۔ بس مختصراً“ یہ کہ میں نے اور عبدالباری نے کورٹ میرج کر لی اور یہاں آگئے۔ خدا کے فضل سے باری کوا چھی نوکری مل گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہیں۔“

”اور۔۔۔ اور۔۔۔ پیچھے والے لوگ۔۔۔ سب کیسے ہیں؟ منور پچھلا۔۔۔ مینا آنٹی۔۔۔ صولت۔۔۔ تصور اور تمدن بھائی۔۔۔ سب۔۔۔ سب۔۔۔ سب لوگ کیسے ہیں۔ میرے چلے آنے کے بعد کیا گزری وہاں۔۔۔“

ترانہ کچھ دیر اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر مسکرائی۔

”بہت محبت سے بنایا ہے خدا نے تمہارے اندر کتنی محبت ہے ربیعہ! بونمی تو نہیں تم اتنی خوبصورت ہو۔ وہاں شاید ہی کبھی کسی نے تمہیں اس انداز میں یاد کیا ہو اور تم۔۔۔ اس طرح ان سب کے نام لے رہی ہو جیسے۔۔۔ جیسے۔۔۔ کوئی بہت اپنوں کو یاد کرے۔“

ترانہ کا لہجہ نرم ہو گیا تھا۔

”ہاں۔۔۔ کیا شک ہے اس میں۔۔۔ روئے زمین پر شاید اسی ایک گھر سے میرا خونی رشتہ ہے ترانہ! ورنہ تو مجھے کہیں اپنی جڑیں نظر نہیں آتیں۔“

”کی زمانہ خون پانی سے کم قیمت ہے ربیعہ!“ ترانہ دھیمے سے ہنس دی۔ ”ممت معتبر جانوان خونی رشتوں کو۔“

”ایسے نہ کہو ترانہ!“ ربیعہ کو دکھ سا ہوا۔

”خیر۔۔۔ تم اپنی سٹاف۔۔۔ عباد بھائی کے ساتھ آکر کوئی مشکل تو نہیں پڑی؟ کبھی کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟ تم سوچتی ہو گی کہ ایک اودھ مرتبہ فون کے بعد میں نے بھی تم سے رابطہ نہیں کیا تو میری بن! جب ساری داستان تمہیں سناؤں گی تب تمہیں حقیقت کا علم ہوگا۔“

”میں بہت خوش ہوں ترانہ! عباد بھائی کے گھر میں مجھے سب کچھ ملا۔ عزت، محبت، خلوص، احترام، روحانی سرخوشی۔۔۔ سچے گھرے رشتے جن میں کوئی غرض نہیں، کوئی کھوٹ نہیں۔“

”شکر ہے خدا اکا۔۔۔ میرے دل سے آج ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔ میں اکثر تمہارے بارے میں سوچتی تھی کہ نجانے تم کس حال میں ہو گی۔ تم ہمارے خاندان کا حصہ تھیں ربیعہ! تمہاری حفاظت ہمارا فرض تھا لیکن جب رکھوالے ہی دشمن بن جائیں تو۔۔۔“

وہ دل گرفتہ سی خاموش ہو گئی۔ ربیعہ نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے مگر ترانہ نے جلدی سے خود پر قابو پالیا۔

”میں تمہیں اپنا ایڈریس دیتی ہوں۔“ وہ اپنا پرس کھول کر پین نکالنے لگی۔ ”تم کل ہی مجھ سے ملنے آؤ۔ مجھے احساس ہوا ہے کہ دنیا میں میرا اپنا بھی کوئی ہے، ہم دونوں جی بھر کر باتیں کریں گے۔ اف خدا۔۔۔ میں کس قدر

خوش ہوں۔ باری بھی تم سے تمہیں مل کر بہت خوش ہو گا۔“

وہ پتہ لکھنے کے دوران بھی بول رہی تھی۔ پتہ ربیعہ کو تھا کہ اس نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھوں کو دبایا۔
”اؤگی ناربیہ!“

”یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ میرا تو نجانے وقت کیسے گزرے گا کل تک۔“
”تم سے علیحدہ ہونے کو جی نہیں کرنا لیکن میں چند ضروری چیزیں لینے نکلی تھی۔ باری کے آنے سے پہلے مجھے کھانا بھی تیار کرنا ہے۔“
”کل میرے آنے سے پہلے ہی کھانا تیار کر لیتا۔“ ربیعہ شرارت سے ہنسی۔
”ضرور۔“

”اچھا۔ خدا حافظ۔“ ربیعہ نے محبت سے ہاتھ دبایا۔
ترانہ مڑ کر چل دی تھی۔ ربیعہ وہیں کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر جب وہ ہجوم میں گم ہو گئی تب وہ مڑ کر منیہ بیگم کی طرف آئی تھی۔
”کوئی مل گیا تھا؟“ انہوں نے اس کا چمکتا چہرہ دیکھا۔
”جی۔۔۔ میری پچھلی زاد بہن۔۔۔“
”پچھلی زاد بہن؟“ وہ تعجب سے بولیں۔

ربیعہ کو یاد آیا۔ عباد نے سب سے اس کے متعلق یہی کہا تھا کہ اس کا کوئی رشتہ دار یہاں نہیں ہے۔
”میں۔۔۔ میں گھر چل کر آپ کو بتاؤں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ہوں۔“ انہوں نے جیسے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔ ”اچھا۔ یہ رنگ دیکھو۔۔۔ یہ سوٹ تمہارے لیے لیا ہے۔ یہ انیفیڈ کے لیے۔۔۔ تمہیں کون سا زیادہ پسند ہے؟“
ربیعہ ان کا دل رکھنے کے لیے ان سے شاپنگ ڈسکس کرنے لگی ورنہ حقیقت یہ تھی کہ ترانہ سے ملنے کے بعد اب اس کا کسی بات میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بیچ کا عرصہ پلک جھپکتے ختم ہو اور وہ اڑ کر ترانہ کے پاس جا پہنچے۔ اس کا ذہن اندرون لاہور کی پرچنگ گلیوں میں بھٹک رہا تھا۔

شہلانے آٹھ مرتبہ بیچنے پر وال کلاک کی جانب دیکھا اور پر سوچ انداز میں کچھ دیر بیٹھی رہی پھر وہ ابھی اور جا کر ڈرائنگ ٹیبل کے سامنے رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی اور اپنا عکس دیکھنے لگی۔
آج صبح وہ خود ہی گھر چلی آئی تھی۔ نجانے کیوں ہاشم اسے لینے نہیں آیا تھا۔ شاید وہ ان دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف تھا۔ اتنا مصروف کہ اب اسے شہلا کا خیال بھی نہیں آتا تھا۔

شہلانے آئینے میں خود کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ قدرے کمزور ہو گیا تھا۔ آنکھیں بے جان سی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے میون رنگ کے لباس پر چڑی کا زرد دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ کبھی ان گہرے رنگوں میں اس کا چہرہ بہت پرکشش لگتا تھا لیکن آج شہلا کو اپنے چہرے پر ایک اداسی ایک بے رنگی کی کیفیت محسوس ہوئی۔
اس نے دروازہ کھول کر اپ اسٹک نکالی اور ہونٹوں پر لگانے لگی پھر اس نے آنکھوں میں گہرا کاجل لگایا۔ چند لمحوں کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے جولوہی باکس میں سے اپنے روپی اور زر قون کے آویزے نکالے اور کانوں میں ڈال لیے۔ اسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔ اتنے سے اہتمام سے وجود چ گیا تھا۔ اسے اپنا عکس اچھا لگا۔

نیچے گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ شہلا بے قراری ہو کر کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں کو پھر ہر کی جانب چل دی۔ حقیقت یہ تھی کہ اتنے عرصے میں اس نے کبھی دروازے پر جا کر ہاشم کا استقبال کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن آج وہ اپنی کیفیات سمجھنے سے خود قاصر تھی۔

تیزی سے بیڑھیاں اترتی وہ نیچے چلی آئی۔ ماہین اور فردوس بیگم، عذرا بیگم سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ عریشہ

اپنے کمرے میں تھی۔ حمزہ اور علی بھی گھر میں موجود نہ تھے۔ شہلا نے لاؤنج کا دروازہ کھولا۔ ہاشم عین اس کے مقابل تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ٹھہم سے گئے۔

”السلام علیکم۔“ شہلا آہستگی سے بولی۔

”وعلیکم السلام۔“ ہاشم کو اسے گھر میں دیکھ کر یقیناً چرائی ہوئی تھی۔

شہلا نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بریف کیس لینا چاہا۔ ہاشم نے چونک کر ہاتھ پیچھے کیا۔

”اس کو اسے۔“

”نہیں دے دیجئے۔“ اس نے اصرار سے کہا۔

”رہنے دو یہ کافی بڑی ہے۔“

”دے دیں نا۔ میں کمرے میں رکھ دیتی ہوں۔“

ہاشم نے از حد حیرانی سے بادل خواستہ بریف کیس اسے تمھایا۔ شہلا نے سر جھکا کر اسے اندر داخل ہونے کا رستہ دیا تھا۔ ہاشم قدم بڑھانا بھول گیا تھا۔ وہ اس کے آویزے دیکھنے لگا جو شاید اس نے پہلی بار اپنے تھے۔

شہلا مڑ کر چل دی تب اس نے بھی چونک کر قدم بڑھائے تھے۔ وہ بیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ اس کے قدم گنتا اس کے پیچھے تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر ہاشم کو خوش گوار سا احساس ہوا۔ اس کے پسندیدہ ایئر فریشر کی دھیمی مک میں باصاف ستھرا کمرہ سما ہوا تھا۔ شہلا نے بریف کیس الماری میں رکھ دیا پھر مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

”دیکھ کرے چہینج کر لیں۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔“

”ہوں۔“ اس نے غائب دماغی سے سر ہلایا۔

شہلا کو یاد آیا وہ جب بھی خوش ہوتا تھا اسے باہر کھانا کھانے کے لیے کہتا تھا۔

”قیمہ کر لیے بنے ہیں۔ آپ۔ آپ شوق سے کھالیں گے؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”جو بھی ہو۔“

شہلا الماری سے پشت نکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ہاشم کو غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے مٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی پھر آستین کے بٹن کھولنے لگا۔

”دیکھ کرے ڈیرنگ روم میں لٹکائے ہیں میں نے استری کر کے۔“

ہاشم نے اس کا سراپا دیکھا۔

”ٹھیک ہے۔“

اس نے ٹائی گردن سے نکال کر پھینکی پھر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

”آپ مجھے لینے کیوں نہیں آئے؟“

ہاشم نے چونک کر سر اٹھایا۔ شہلا نظریں جھکائے قالین کو گھور رہی تھی۔

”میں۔ میں آتا۔ آتا۔ آتا۔“ دراصل کل مجھے ٹائم نہیں مل سکا۔“ وہ ہٹکایا۔

شہلا نے اب کی بار قدرے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

”آپ مجھے فون کر کے کہہ سکتے تھے لیکن آپ نے ایک مرتبہ فون تک نہیں کیا۔“

ہاشم کے ہاتھ میں اس کے موزے تھے وہ انہیں جوتوں میں رکھنا بھول گیا۔ ایسی شکایتیں تو اس نے خواب میں بھی ان لیوں سے نہیں سنی تھیں۔

”آئی ایم سوری۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ ”میں نے شاید خیال نہیں کیا۔“

”جی ہاں اب آپ کم ہی خیال کرتے ہیں۔“ اس نے پھر نگاہیں جھکا دیں۔

ہاشم کھڑا ہوا تھا چند قدم بڑھا کر وہ اس کے قریب آگیا۔ شہلا کو اسے گالوں پر دوڑتی سرخی کا احساس ہوا اس کا دل کسی نئی رفتار سے چلا تھا۔ ہاشم نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ قدرے سمٹ سی گئی۔ ہاشم نے وارڈروب کا دروازہ کھولا۔

شہلانے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ بیگم میں ایسی سرگت لگا رہا تھا۔ شہلا خفیف سی ہو گئی۔
 ”کھانا... کھانا... اوپر لے آؤں؟“ وہ ہلکی سی آوازیں استغابی پوچھ سکی۔

”نہیں، نیچے سب کے ساتھ کھاتے ہیں۔“

”نیچے تو... ابھی کوئی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ نرم لہجے میں بولا تھا۔ ”میں نما کر فریش ہوتا ہوں، تب تک سب آجائیں گے لیکن پہلے ایک کپ چائے پلا دو تو بہتر ہو۔“

”میں ابھی لے آئی ہوں۔“ وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھی۔

باشم ایک بار پھر حیران ہونے پر مجبور ہوا تھا۔

”یہ لوس۔“ رابعہ بیگم نے ایک سفید لفافہ ور وہ کی جانب بڑھایا۔

”یہ کیا ہے امی جی؟“ اس نے اشتیاق سے لفافہ کھول کر اندر دیکھا پھر حیران ہوئی۔ ”یہ تو اچھی بھلی رقم ہے۔“
 لفافے کے اندر نیلے رنگ کے کئی نوٹ تھے، ور وہ نے رقم نکالی۔

”کتے ہیں؟“

”پتا نہیں، مگر لو۔ یہ اماں نے دیے ہیں۔ ان کی جانب سے ناعمہ کے لیے شادی کا تحفہ ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس رقم سے فرنیچر وغیرہ بنوایا جائے۔“

ور وہ رقم گننے لگی۔

”پورے پچاس ہزار ہیں لیکن ثانی امی نے اتنے زیادہ کیوں دیے؟“

”میں نے بہت منع کیا، تب عذر ابھی ناراض ہو گئیں اور اماں بھی۔“ مجبوراً ”مجھے ان کا تحفہ قبول کرنا پڑا۔ اماں کہنے لگیں کہ وہ خود بھی آرڈر کر سکتی تھیں لیکن صرف ناعمہ کی پسند شامل ہونے کے خیال سے رقم دے رہی ہیں تاکہ ناعمہ خود اپنی پسند کا فرنیچر بنوائے۔“

”چلیں خیر، وہ ابھی ہمارے اپنے ہیں۔ انہوں نے تو ایسا سوچنا ہی تھا۔ آپ کا بھی بوجھ ہلکا ہو گیا۔“

”فرازی کا والدہ جینز وغیرہ کے خلاف ہیں۔ وہ شاید یہ سب کچھ پسند نہ کریں۔“

ور وہ خاموش سی ہو کر سوچنے لگی۔

”ایک مرتبہ فریجہ بتا رہی تھی کہ فراز بہت سلیکٹو ہے۔ اسے ہر چیز پسند نہیں آتی۔ وہ بتا رہی تھی کہ اس نے اپنا کمرو بہت علیحدہ انداز سے سیٹ کیا ہوا ہے۔ پونیک ڈیزائن کا فرنیچر خاص طور پر صرف کمرے کی ہناوٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے بنوایا ہے۔ میرا خیال ہے انہیں فرنیچر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ یہ رقم ناعمہ کے اکاؤنٹ میں ڈال دیں۔“

”ایسا کیوں نہ کریں کہ تم باتوں ہی باتوں میں فراز کا عندیہ لے لو۔ ہو سکتا ہے وہ فرنیچر تبدیل کرنا چاہے۔“

”اچھا۔“ ور وہ نیم رضامندی سے بولی۔ ”چلیں یہ بھی کر لیں گے، ثانیہ کہہ رہی تھی کہ اس نے سینڈلز لینا ہیں تو ساتھ ہی ناعمہ کی سینڈلز بھی لے لی جائیں۔ آپ سے اس نے کہا نہیں؟“

”کہا ہے۔“ وہ فراغت سے بیٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ ”ابھی رافع آؤں سے آجائے تو ثانیہ اور ناعمہ کو مارکیٹ لے جائے گا۔ تم بھی ساتھ جانا۔ اس ناعمہ کو تو کوڑی کی عقل نہیں ہے۔ صرف میچنگ چلیں لے آئے گی۔ تم اسے ایسی سینڈلز دلو انکا جو ایک سے زیادہ جوڑوں پر چل جائیں۔“

ور وہ متال سی نظر آنے لگی۔ ہر چند کہ ماں کی بات رد کرنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔

”رہنے دیں امی!“ پھر وہ بولی۔ ”ثانیہ اور ناعمہ کو ہی جانے دیں۔ جو چیز بھی ہو، وہ ان کی ذاتی پسند کی ہوتا

چاہے۔ ناعمہ کو میچنگ سینڈلز کا کریز ہے تو چند سینڈلز زیادہ ہی لے گی نا۔ کیا فرق پڑتا ہے، میں نہ جاؤں تو بہتر ہے۔“

”چلو۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ لیکن تم اپنے لیے شاپنگ کر لینا۔ شادی سہ پہر ہے۔ تم نے ابھی تک اپنے لیے کچھ نہیں خریدا۔“

”میں باہر کے ساتھ جاؤں گی، کل پارسوں۔“
 رابعہ بیگم نے قدرے غور سے اس کی جانب دیکھا تھا۔ ورہہ نگاہیں چرانے لگی۔

”ورہہ۔۔۔ بیٹی۔۔۔ کیا تم رافع کے ساتھ جانے سے انکاری ہو؟“

”جی؟“ وہ چونکی۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ رابعہ بیگم ایسی بات کہیں گی۔

”جی نہیں۔“ اس کے لبوں سے بے سوچے سمجھے نکلا۔

”مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔“ اب ان کی نظروں میں گہری تشویش اثر آئی۔ ”ورہہ۔۔۔ بیٹی! یہاں آؤ۔ یہاں میرے

پاس آکر بیٹھو۔“

ورہہ آہستگی سے اٹھی تھی۔ مدھم چال چلتے وہ ان کے قریب چلی آئی۔ رابعہ بیگم نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے برابر بٹھالیا۔

”ورہہ۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسا رشتہ جڑ گیا ہے۔ وہ تم سے گریزاں ہے۔ تم اس سے خفا۔۔۔“

”نہیں میں تو کسی سے خفا نہیں ہوں۔“ اس نے غلت میں ماں کی بات کالی۔ ”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”کچھ یہ گریز کیسا؟ یہ تو محض دلوں کے میل کو ظاہر کرتا ہے۔ کیا تمہارے دل میں اس کی جانب سے کوئی بدگمانی ہے؟“

”میں امی! کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولی پھر اس نے ماں کی جانب دیکھا۔ ”میرے دل میں ان کے

لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ بات محض اتنی سی ہے۔“

رابعہ بیگم خیر سے اس کا چہرہ دیکھے لگیں۔

”بس یہ اتنی سی بات ہے؟ اس بات پر تو زندگی کی خوشیوں کا دارودار ہوا کرتا ہے ورہہ! تم اسے اتنی سی بات

کہہ رہی ہو۔“

ورہہ نے سر جھکا لیا۔ رابعہ بیگم متفکر سی ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

”اور اس کے دل کی کہو؟ کچھ خبر ہے؟ وہاں تمہارے لیے کتنی جگہ ہے؟“

”میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”غلط۔ یہ بات رافع کے علاوہ صرف تمہیں معلوم ہوگی۔ ایسے جذبے گلاب کے پھول ہوتے ہیں۔ نظرنہ

آئیں تو ان کی خوشبو ان کی موجودگی کی خبر دیتی ہے۔“

ورہہ کو لگا جیسے وہ رونے والی ہے۔ ماں نے دل کے نازک گوشے کو نشتر سے چھیڑا تھا۔

”بولو ورہہ! کیا تم دونوں ایک دوسرے سے بندھ جانے والے دو مختلف سمتوں کے نشان ہو؟“

”اس بات کی کیا اہمیت ہے امی؟“ وہ غم ناک لہجے میں بولی۔

”بہت اہمیت ہے بیٹی! میں اولاد کی خوشی کے لیے زمانے سے بغاوت کر سکتی ہوں۔ اگر تم اپنے دل کو رافع کے

لیے آمادہ نہیں بنائیں تو کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرو۔ زبردستی جانوروں کے ساتھ کی جاسکتی ہے انسانوں کے

ساتھ نہیں۔ کیا تمہیں رافع پسند نہیں؟“

ورہہ نے نظریں اٹھائیں پھر دھک سے رہ گئی وہ بے اختیار کھڑی ہو گئی تھی۔

لاؤنج کے دروازے پر رافع کھڑا تھا۔ رابعہ بیگم بھی بے ساختہ کھڑی ہوئی تھیں۔ رافع کی نظریں ورہہ کی نظروں

سے ملیں ورہہ مڑ کر کمرے میں چلی گئی۔

”اور رافع!“ رابعہ بیگم نے سنبھل کر اسے پکارا۔

وہ چند قدم اندر چلا آیا۔

”السلام علیکم۔ باہر کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا میں نے سوچا لاؤنج میں دستک دے دوں گا۔“
 ”وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں ابھی تمہاری طرف سے
 آ رہی تھی۔ دروازہ میں نے ہی کھلا چھوڑا کیونکہ ثانیہ نے کہا وہ بھی پیچھے آ رہی ہے۔ بیٹھو۔“ انہوں نے رافع کا
 چہرہ غور دیکھا لیکن کچھ اخذ کرنے سے قاصر رہیں۔

”میں ناعمہ کو لینے آیا ہوں پھپھو! ثانیہ گاڑی میں بیٹھی ہے۔“

”اچھا۔ میں ناعمہ کو کبھی جیتی ہوں۔“

”ورہ نے۔۔۔ اگر کچھ لینا ہے تو۔۔۔ وہ بھی ساتھ چلے۔“ وہ قدرے جھجک کر بولا۔

”نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”ورہ نے۔۔۔ کچھ نہیں لینا۔۔۔“

پھر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”وہ کل ماہین کے ساتھ مارکیٹ جانے کا ارادہ رکھتی ہے۔“

”بہتر، پھر آپ ناعمہ کو بھیج دیں۔ میں اور ثانیہ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔“ وہ اٹھ کر چل پڑا۔ رابعہ بیگم نے اس
 کے چوڑے شانوں اور دراز قامت کو دیکھ کر دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہا تھا پھر وہ کوئی خیال آنے پر ورہ اور ناعمہ
 کے کمرے کی جانب بڑھیں۔

”میں نے کہا نا آپ! آپ جو بھی لے آئیں گی، مجھے قبول ہوگا۔“ ناعمہ بے دلی سے کہہ رہی تھی۔

”ناہا بابا میں کیوں لے آؤں؟ تم خود جاؤ اپنا کام کرنے۔“

”آپ میرے سارے کام کر دیتی ہیں۔ اس میں کیا تامل ہے؟ ثانیہ بھی تو ساتھ ہے۔ آپ اور ثانیہ اچھی

شناخت کر گئیں گی۔“

”پلیز ناعمہ۔۔۔“ وہ رنج ہوئی۔

”پلیز آپ!۔۔۔“

”ناعمہ۔۔۔“ رابعہ بیگم قدرے سختی سے بولیں۔ ”کیا مذاق ہے یہ؟ چلو اٹھو، چادر لو اور جاؤ۔ وہ لوگ گاڑی میں

بیٹھے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“

ناعمہ نے ماں کے تیور دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اب ایک لفظ مزید کہنا محال ہے۔ وہ چپکے سے اٹھی اور الماری کھول
 کر چادر نکالنے لگی۔ ورہ ہنا کچھ کے کمرے سے نکل گئی تھی۔ رابعہ بیگم بیڈ پر بیٹھ گئیں اور کچھ سوچنے لگیں۔

”تم یونہی مجھے تنگ کر رہے ہو۔“ وہ جھلائی تھیں۔ ”جانے ہو ماں کو ستانا کتنا بڑا گناہ ہے۔“

”جی جی۔ جانتا ہوں۔ آپ مجھے یہ گناہ کر لینے دیجئے۔ چلیں انھیں شاباش۔“ عباو نے چھپیل لا کر ان کے
 قدموں کے قریب رکھ دیں۔

”دیکھو میرے زندگی کے جتنے دن ہیں، وہ یہ ٹیسٹ کروانے سے بڑھ نہیں جائیں گے۔“

”علاج لازم ہے۔ شاید آپ نے سنا نہیں اور مجھے یہ جذباتی باتیں نہ سنائیں۔ میں نے آپ کے لیے ٹائم لیا

ہے اور ہم ہسپتال جا رہے ہیں۔“

رابعہ ان کی باتیں سن کر مسکرا دی۔

”آپ ماں بیٹے کی نوک جھونک میں تو ٹائم ضرور ہی نکل جائے گا۔“ وہ بولی۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ وہ پر عزم انداز میں بولا۔ ”اب اگر انہوں نے ذرا سے پس و پیش سے کام لیا تو میں

انہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔“

وہ بازو جڑھانے لگا۔ منیجر بیگم اٹھ کر چھپیل پہننے لگیں۔

”چلو جیسے کو۔“ وہ ہار مان کر بولی تھیں۔

عباد نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور ان کے شانے پر اپنا سر رکھ دیا۔
”شک کرنے پر معذرت۔ لیکن یہ گناہ نہیں عین کارِ ثواب ہے۔“

انہوں نے مسکرا کر اس کے سر پر ایک چپت لگائی تھی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اذیت، سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ ربیعہ برتن وغیرہ سمیٹنے کے لیے پُچن میں چلی آئی تھی۔

کام کے دوران وہ ترانہ کے متعلق سوچتی رہی۔ اسے احساس ہوا کہ کاش اس نے ترانہ سے فون نمبر بھی لے لیا و تا تو اس وقت وہ اس سے فون پر ہی تھوڑی بہت بات کر لیتی۔ وقت گزارنا کافی مشکل لگ رہا تھا پھر اسے خیال آیا کہ اس کے پاس ترانہ کا صرف تحریر شدہ ایڈریس تھا جسے ڈھونڈنے میں وقت ہو سکتی تھی۔ اسے یہ بھی خیال آیا کہ اس نے عباد سے ترانہ کے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ اسے وقت ہی نہیں ملا تھا۔ وہ ابھی آیا تھا اور آتے ہی منیجرہ بیگم کو ٹیٹ کے لیے لے گیا تھا۔

ربیعہ نے ارادہ باندھا کہ وہ ان لوگوں کے آنے پر عباد کو ترانہ کے متعلق بھی بتائے گی اور اس سے کہے گی کہ کل وہ اسے ترانہ کے گھر ڈراپ بھی کر دے۔

قرباً ”دو گھنٹے کے بعد ان لوگوں کی واپسی ہوئی تھی۔ منیجرہ بیگم اس قدر تھکی ہوئی تھیں کہ وہ کوئی بھی بات کیے بغیر کمرے میں چلی گئی تھیں۔ عباد تھکا تھکا سا صوفے پر بیٹھا تھا۔

”جائے بنا دوں عباد بھائی!“ ربیعہ نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔
”اگر تکلیف نہ ہو تو۔“

”تکلیف تو بہت ہوگی لیکن میں پھر بھی بنا دیتی ہوں۔“ وہ برامان کر بولی۔
پھر وہ جائے بنا کر اس کے پاس چلی آئی۔ عباد آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اس کی آہستہ آہستہ گھبراہٹ ہوئی۔

”اسی کو کیا براہم۔ ہے عباد بھائی؟“ ربیعہ اس کی سنجیدگی سے ڈر سی گئی۔
”کچھ بھی نہیں۔“ وہ زبردستی مسکرایا۔ ”ابھی تو ٹیٹ چل رہے ہیں۔ تم دعا کرو ربیعہ!“

”یہ بھی کہنے کی بات ہے بھائی! میں ہر نماز کے بعد آپ سب کے لیے دعا کرتی ہوں۔“
”تم بہت اچھی ہو ربیعہ!“ وہ ممنونیت سے مسکرایا۔

”اپنوں کے لیے تو سب ہی دعا کرتے ہیں۔ آپ سب میرے اپنے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
”بے شک۔“ اس نے جائے کا گھونٹ بھرا۔

ربیعہ اسے ترانہ کے متعلق بتانے کا سوچنے لگی۔ تب ہی عباد بولا تھا۔
”ربیعہ۔ کل ذرا سا کام ہے۔“

”جی۔؟“ وہ چونکی۔ ”کیسے؟“

”میر حسن کے کزن ہیں شہیار احمد! وہ پوکے سے آئے ہیں۔ میں نے کل ان لوگوں کو کھانے پر انوائٹ کر دیا۔“

”میں چاہتا ہوں کہ کھانا بہت وی آئی بی قسم کا ہو۔ ویسے تو تم بہت ماہر ہو کوکنگ میں لیکن کل کمال ہی کرو۔“

”اچھا ہے۔ امیر حسن تو خیر بہت سادہ مزاج آدمی ہے لیکن یہ شہیار صاحب کیسے ہیں کچھ کما نہیں جاسکتا۔ پھر امپریشن اچھا پڑنا چاہیے۔ کیوں؟“

ربیعہ چونک اٹھی۔
”جی۔ ٹھیک ہے عباد بھائی!“ اس نے سر ہلایا۔

”کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا؟“
”کمال کرتے ہیں۔“ اس نے برامانا۔ ”آپ صبح ناشتے کے وقت ڈشیز سائیڈ کر لیجئے گا۔ ایک مرتبہ منیجرہ

سیٹ ہو جائے تو میں سامان بھی منگوالوں گی اور اشارت بھی جلدی لے لوں گی۔“ عباد نے پیار سے اسے دیکھا۔

”یہ انہی کا ایک نمبر کی کام چور اور بے ڈھنگی ہے۔ اسے تمہاری ہیلپ کے لیے کہا تو شاید تمہیں مزید پریشان ہی کرے۔“

”اس کی بڑھائی زوروں پر چل رہی ہے اسے تنگ نہ کریں۔ میں خود اپنی ہیلپ کر سکتی ہوں۔ سات آٹھ ڈشز ہی ہوں گی نا۔ کوئی اتنا بڑا پروجیکٹ نہیں ہے جو آپ میرے لیے پریشان ہوں۔“

”ٹھیک ہو سوچ۔“ وہ ہلکا ہلکا ہو گیا۔

”عماد بھائی! آج مجھے بازار میں ترانہ ملی تھی۔“

”رنیل۔“ عباد کو حیرت ہوئی۔

”جی۔۔۔ وہ باری سے شادی کر کے کراچی آچکی ہے۔ اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا ہے۔“

”تو یا زار اسے یہاں بلا لینا تھا نا۔“

”میں نے تو اسے اپنا ایڈریس نہیں دیا، غلطی ہوئی۔ خیر رسوں آپ مجھے ترانہ کے گھر چھوڑ آئیں گے نا؟“

”میں کل رات ہی چھوڑ آؤں گا۔“ وہ ہنسا۔ ”جانتا ہوں تمہارے پیٹ میں کتنے بل پڑ رہے ہوں گے۔ میں نے شاید کل دعوت کا کہہ کر غلطی کی۔“

”نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم کل نہیں تو پرسوں چلیں گے۔“ وہ بولی تھی۔

”آداب۔۔۔“ مدہم سی آواز پر فردوس بیگم نے مڑ کر دیکھا تھا پھر انہیں خاصی حیرت ہوئی۔

”جیتتی رہو یہ ہمارے نصیب کیسے کھلے؟ ایقان بیگم ہمارے گھر آئیں۔ خدا کی قدرت! اے کبھی انہیں تو کبھی گھر دیکھتے ہیں اپنا۔ بیٹھو۔“

ایقان صوفے پر ٹک گئی پھر اس نے لاؤنج کا جائزہ لیا۔ واقعی وہ کافی عرصے کے بعد آئی تھی وہاں کی سیٹنگ تک تبدیل ہو گئی تھی۔ کئی اشیاء نئی معلوم ہوئی تھیں۔

”کوئی سی ہو؟“ وہ قریب آئیں۔

”شکر ہے خدا کا۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”عاشق میاں کی کوئی خبر؟“ وہ رازداری سے آگے کو جھکیں۔

”نہیں۔“ اس نے سچ کر کہا۔

فردوس بیگم قدرے سٹپا کر پیچھے کو ہوئیں۔

”خیر چا تو بیچتا ہو گا یا وہ بھی نہیں؟“

ایقان اس قسم کے سوالوں سے ناک تک بھری ہوئی تھی۔ وہ کوفت زدہ انداز میں کھڑی ہوئی۔

”میں شہلا سے ملنے آئی ہوں بھابھی بیگم! کیا وہ اپنے کمرے میں ہے؟“

”اے ہاں۔ ہم بھی سوچیں یہ بھابھی بیگم کے لیے لڑا کیسے نکا تمہارا؟ ہاں بھئی۔۔۔ سبھی تمہاری اپنے کمرے میں ہی ہیں۔ میکے کے علاوہ وہ زیادہ تر وہیں ہوتی ہیں۔ ہم تو اس عید کے چاند کو کم کم ہی دیکھتے ہیں۔“

اچانک ہی بچن کے دروازے پر شہلا نمودار ہوئی تھی۔

”میں یہاں ہوں ایقان! روٹی پکا رہی رہوں۔ تم بیٹھو میں ابھی آئی۔“

فردوس بیگم ہری طرح سٹپائی تھیں پھر انہوں نے خود پر قابو پایا۔

”جانے کب چلی آئیں۔۔۔ بیٹی کی طرح۔“ وہ بڑبڑائیں۔ ”خبر ہی نہیں ہوئی۔“

ایقان بیٹھنے کے بجائے بچن کی جانب ہی بڑھ گئی تھی۔ دفعنا جیسے اسے کچھ خیال آیا تھا اس نے مڑ کر دیکھا۔

”بھابھی بیگم! یہ آپ کے برادر محترم کہاں ہوتے ہیں آج کل؟“

”ہاں میں۔۔۔ کون؟“ وہ قطعاً نہ سمجھیں۔

”ختر میاں کا پوچھ رہی ہوں۔“
 ”ختر؟“ ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”کک۔۔۔ کیوں۔۔۔ کچھ کہا اس نے تمہیں؟ اے ہاں۔۔۔ وہ تو ایسا ہی باؤلا ہے۔ تم تو جانتی ہو۔“

”میں تو صرف اتنا پوچھ رہی ہوں کہ وہ آج کل کہاں ہوتے ہیں؟“
 ”ہیں کہیں ہوتا ہے۔ آجاتا ہے کبھی کبھار۔“
 ”ہوں۔“ اس نے ہنکارا بھر پھر آگے بڑھ گئی۔
 شہلا اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔

”بس پک گئی ہیں۔“ وہ روٹیاں رومال میں لپیٹ کر ہاٹھاٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔
 ”تمہیں یوں کام کرنا دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے۔ اچھی لگ رہی ہو۔“ ایقان مسکرائی۔ ”ہسپتال نہیں جاتیں؟“
 ”میں نے لاگ لیو لے لی ہے۔“ وہ کھلے گل کے نیچے ہاتھ دیے ناخن اچھی طرح صاف کر رہی تھی۔
 ”کیوں؟“ ایقان کو حیرت ہوئی۔ ”پریگنٹ ہو گیا؟“
 شہلا نے جیسے تھم کر اسے دیکھا پھر ہولے سے ہنس دی۔

”ارے نہیں۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی تھی۔ ”بس یونہی دل بھر گیا تھا اس بو جھل روٹین سے۔ اپنے گھر والوں کے لیے وقت ہی نہیں نکلتا۔ ہر کسی کو شکایت تھی مجھ سے۔ سوچا سب کی شکایتیں دور کی جائیں۔“
 ”فارغ ہو گئیں تو چلو تمہارے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔“ ایقان بولی۔
 ”تھیک ہے۔“ شہلا نے اثبات میں سر ہلایا۔

”اب سناؤ۔“ شہلا نے خود بھی ٹیک لگائی اور ایقان کو بھی ایک تکیہ فراہم کیا۔ ”کیسی گزر رہی ہے؟ ہم نے تو ایک دوسرے سے دل کا حال کہنا بھی چھوڑ دیا ہے۔“
 ”دل کا حال کہنے کے لیے بھی یا تو بہت حوصلہ چاہیے یا پھر بالکل بے حوصلہ ہونا چاہیے۔ ہمارے ساتھ دونوں ہی باتیں نہیں ہیں۔ خود ہی جلتے، کھٹکتے رہتے ہیں۔ آج بے کلی حد سے سوا تھی۔ سو میں یہاں چلی آئی شاید بتا سوچے مجھے ہی۔“

شہلا نے اس کی خالی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”یہ بے کلی۔۔۔ اس کی فرقت کا دوسرا نام ہے ایقان! تم سمجھتی کیوں نہیں؟“
 ”شاید ایسا ہی ہو۔“ وہ ہنسنے لگی۔
 ”پھر اسے آواز کیوں نہیں دے لیتیں؟“
 ”وہ میری بیکار کا منظر نہیں ہے شہلا! وہ بے نیاز ہو چکا ہے۔ اب چاہے میں اسے پکاروں، خواہ اس کے اپنے بچے۔۔۔ نئی دنیا کھونچنے چلا ہے۔ دیکھو یہ سفر کب ختم ہوتا ہے۔“
 شہلا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”تو انہوں نے وہاں شادی کر لی؟“ ایقان کی باتوں سے وہ یہی سمجھی تھی۔
 ”کر لی ہوگی، یقیناً۔ مجھے اس نے کچھ عرصہ پہلے یہ اطلاع دی تھی۔ ہر چند کہ وہ جانتا ہے کہ اسے میری اجازت کی ضرورت نہیں۔“ وہ طنزاً ”ہی۔“
 شہلا کو حقیقتاً ”افسوس ہوا تھا“ خاموش بھی رہ گئی۔

”یہ تو برا ہوا ایقان۔۔۔ پھر وہ بولی۔ ”تمہاری ضد میں تمہارے بچوں کا نقصان ہوا ہے۔“
 ”بچوں کے پاس تو وہ پہلے بھی نہیں تھا۔ صرف اس کی بھیجی ہوئی آسانشات تھیں۔ سوا ب بھی ہیں۔ جانتی ہو

شہلا! پچھلے ماہ اس نے پورے پچیس لاکھ روپے بھیجے ہیں۔ شاید عقیقہ خانی کی خوشی میں پیسے کو وہ ہمیشہ سے انسانی جذلوں کا بدل سمجھتا ہے۔ میرے سامنے ہوتا تو میں اس کی رقم اس کے منہ پر مارتی۔ کمینسڈ ذلیل۔“

”ایقان! شہلا نے اس کے سرد گردن اڑا ہاتھ تھا۔ جو دھیرے دھیرے لرز رہے تھے۔

شہلا کو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ اس کا وجود ایک بھی بنا ہوا تھا جس میں اس کے سارے جذبے جل رہے تھے۔

”پنچوں سے بات تو کرتے ہوں گے؟“ اس نے ہمدردی سے پوچھا۔

”بات؟“ ایقان کی آنکھیں پھیلیں۔ ”بات کیسے ہو؟ وہ تو۔۔۔ وہ تو نجانے کہاں چھپ گیا ہے۔ وہ غائب ہو گیا ہے۔ سلیمانی ٹوپی پہن لی ہے اس نے جانتی ہوں، وہ صرف مجھے تنگ کرنے کے لیے مجھے جھکانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا ہے اور میں ٹوٹ جاؤں گی لیکن جھکوں گی نہیں۔ مر جاؤں گی لیکن اسے نہیں پکاروں گی جس نے میری جگہ اتنی آسانی سے کسی اور کو دے دی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی جگہ کسے دیتی ہوں۔“

شہلا بری طرح سے چوگی۔

”ایقان۔۔۔ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ یوں لگتا ہے جیسے بھارتیں بھجوا رہی ہو۔ صاف صاف کوہ کیا جا رہا ہے۔ عاشر بھائی کہاں چلے گئے ہیں اور۔۔۔ اور تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“

ایقان نے دفعہاً ”ہی خود پر قابو پایا تھا۔

”وہ لڑا سے شادی کر کے کسی دوسرے ملک شفٹ ہو گیا ہے شہلا!“ پھر وہ آہستگی سے بولی۔ ”اور شفٹ ہونے سے قبل اس نے مجھے یہ رقم بھیج کر شاید اگلے پچھلے حساب برابر کر دیے ہیں۔ وہ سمجھتا ہے، میں اس بھیک کے سارے پوری زندگی گزار لوں گی لیکن میں۔۔۔“

اس کی سانس ہچکچی۔ شہلا دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا کوئی دو بچوں کے ساتھ؟“

”کیوں نہیں جو وہ کر سکتا ہے، کیا میں نہیں کر سکتی۔ مجھے تو صرف اتنا بتانا کرنا ہے کہ وہ ہے کہاں پھر میں اس سے طلاق لوں گی ہر صورت ہر قیمت پر اور پھر۔۔۔ پھر اسے بتاؤں گی کہ میں اس کی جگہ کسے دیتی ہوں۔“

”ایقان۔۔۔“ شہلا نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ”خدا کے لیے۔۔۔ خدا کا واسطہ تمہیں۔۔۔ اتنی کم عقلی سے تو کام نہ لو۔ تم غم دغے سے بالکل دیوانی ہو گئی ہو۔ اپنی ذات کوئی اتنی بڑی چیز نہیں ہوتی کہ اسے رد کرنے پر انسان دنیا کو رد کرنے پر تیار ہو جائے۔ اس نے تمہاری جگہ اگر کسی کو دی تو اس میں بھی تمہارا ہی تصور ہے۔ تم مرد کو کیا سمجھتی ہو۔ وہ تم سے بے تحاشا محبت کر کے بھی یہی سنتا چاہے گا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔ محبت ایسی خطا ہے جسے مرد ہمیشہ عورت کے کھاتے میں ڈالنا چاہتا ہے۔“

”یہ اس کی غلطی ہے، اسے ضرور دکھ اٹھانا ہو گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے خود کو پٹرول چھڑک کر آگ ہی کیوں نہ لگانی پڑے۔“

شہلا آنکھیں کھولے اس دیوانی کو بکتی رہ گئی۔ وہ محبت میں شدتوں کی قائل تھی۔ شہلا ہمیشہ سے جانتی تھی لیکن اس درجہ دیوانگی کا تو اس نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

ایقان جو دل ہلکا کرنے آئی تھی۔ اب اطمینان سے تکیے سے ٹیک لگائے جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جیسے کسی اور کی آنکھیں تھیں۔ شہلا کو اس سے خوف سا محسوس ہوا۔

اس نے معصوم ارادہ کیا کہ وہ باہم کو ضرور ایقان کے ارادوں سے مطلع کرے گی۔

بھگی ہوئی رات نے پر پھڑپھڑائے عرشہ آہستگی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قسمت آ زمانے کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ اس نے ماہین کے گہری نیند میں ہونے کا اطمینان کیا اور اٹھ کر بستر سے نکل آئی۔ آہستگی سے چلتی ہوئی وہ لاؤنچ میں چلی

میلی فون سیٹ گود میں رکھ کر وہ پھر وہی پچھلی باتیں سوچنے لگی اور جب ناعمد کے قدموں سے اس کا وجود گونجنے لگا تب اس نے فراز کا سیل نمبر ڈائل کیا۔

اچانک ہی اس کے سب ہی حواس کام کرنے لگے تھے۔ دوسری جانب بیل جاری تھی۔
 ”ہیلو۔۔۔“ پھر وہ آواز سنائی دی جس سے اس کا روم روم جاگ اٹھا۔
 عریشہ کی آواز اس کے گلے میں پھنس سی گئی۔
 ”ہیلو۔۔۔“ وہ پھر بولا۔

”میں۔۔۔ میں عریشہ بات کر رہی ہوں۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولی۔
 ”عریشہ! کہیے؟“ وہ سادہ لہجے میں بولا۔

عریشہ کو اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا اپنے کانوں میں بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے فراز کی ٹھنڈی اور اجنبی آواز سن کر اپنے دل کو ایک دھچکا سا لگتا ہوا محسوس کیا تھا۔ نجانے کیوں اتنے عرصے سے ایک گمان اس کے ساتھ ساتھ جیتا تھا کہ برسوں بعد بھی وہ ایک دوسرے کو ویسے ہی پہچان لیں گے جیسے روزِ اوّل پہچانا تھا اس کی آواز سننے ہی فراز کے کانوں سے ناعمد کے جھوٹ کا برؤ اٹھ جائے گا۔

اسے احساس ہوا کہ فراز اس کی جانب سے گفتگو کا منتظر تھا۔
 ”آپ۔۔۔ اس کی آواز سننے لگی تو وہ دھیمے سے کھنکھاری“ لگتا ہے۔ آپ نے مجھے نہیں پہچانا!“
 اس کے مدھم لہجے میں دکھ بھی تھا۔ شکایت بھی تھی۔ بے یقینی بھی تھی۔
 ”ایسی بات نہیں ہے!“ وہ بولا ”میں نے آپ کو پہچان لیا ہے“
 عریشہ بے طرح چوٹکی۔

”آپ نے خود بتایا کہ آپ عریشہ ہیں۔ اور میرے جاننے والوں میں صرف ایک عریشہ ہے۔“ وہ اطمینان سے سادہ لہجے میں بول رہا تھا۔ عریشہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے سانس روکے اس کے اگلے جملوں کی منتظر تھی۔
 ”آپ یقیناً شہلا آلی کی منہ ہیں۔ ہاشم بھائی کی سسٹم۔ نافع کی منکوحہ! نافع عباد کا بہت اچھا دوست ہے۔ اس حوالے سے بھی میں آپ کو جانتا ہوں۔ ایم آئی رائٹ؟“ عریشہ کو لگا اس کے گلے میں اس کی اپنی سانس نے پھندا ڈال دیا ہے۔ جو نہ اوپر کو جاری تھی اور نہ نیچے کو صرف اس کے گلے کے گرد کسی بل دار سانپ کی مانند اپنا گلہنجہ کس رہی تھی۔

”ہیلو۔۔۔ اس کی جانب سے گہری خاموشی پا کر فراز بولا، آپ خیریت سے تو ہیں؟ یوں آدھی رات کے وقت آپ کا فون آنا۔۔۔ اور پھر کچھ نہ بولنا۔۔۔ میں کچھ سمجھ نہیں پایا۔۔۔“
 ”جی۔۔۔ کچھ نہیں۔“ وہ بمشکل بولی ”میں نے۔۔۔ میں نے شاید غلط نمبر۔۔۔“

اس سے مزید کچھ بھی نہ بولا جا سکا۔ اس نے فون بند کر دیا اور کھل کر سانس لینے کی کوشش کرنے لگی۔
 وہ چند لمحوں کے انتظار میں اس نے ایک طویل عرصہ اندھے غار میں بیٹھے ہوئے جوگی کی طرح گزارا تھا۔
 وہ چند لمحوں اتنی تیزی سے گزرے تھے کہ اب ان پر کسی خواب کا گمان ہو رہا تھا۔ یوں جیسے لمحہ بھر کے لیے آنکھ لگی تھی اور کوئی بے ربط سا خواب بنا اور ٹوٹ گیا تھا۔ وہ حیران پریشان ساکت بیٹھی تھی۔
 وہ تو اسے کئی حوالوں سے جانتا تھا اور وہ اپنی زندگی میں صرف ایک عریشہ کو جانتا تھا وہ عریشہ جو ہاشم کی بہن تھی۔ شہلا کی منہ تھی اور نافع کی منکوحہ تھی جس اس سے آگے شناخت کا کوئی حوالہ نہ تھا اور جتنے حوالے اس نے گنوائے تھے اس کے بعد کچھ بھی کہنے کا نہ حوصلہ تھا اور نہ ضرورت۔

عریشہ کو لگا جیسے اس کے وجود پر دم دھنٹے جس کا جو عالم چھایا ہوا تھا۔ وہ اب گھٹنا چاہ رہا ہے۔ اچانک ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور لبوں سے آہیں نکلنے لگیں۔ اس کے پورے جسم پر ایک شدید کیکاپاٹ طاری

ہو گئی تھی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی۔ آگے کوچھلے بھٹکتے وہ صوفے سے نیچے گر گئی تھی۔
 بیڈ روم سے ماہین گھبرائی ہوئی باہر نکلی تھی۔ اس نے لاسٹ جلائی پھر عیشہ کو نیچے گرا ہوا دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

”عیشہ“ ماہین نے اسے کاندھوں سے تھام کر سیدھا کیا۔
 اس کا ہونٹ اس کے دانت سے رگڑکھا کر پھٹ گیا تھا، خون کی بوندیں اس کی تھوڑی پر سے پھسل رہی تھیں۔
 وہ بے ہوش، بے سندھ تھی۔

اس نے بے نظر غائر ایک مرتبہ پھر ڈانٹنگ ٹیبل کی جانب دیکھا، جسے اس نے بہت محنت اور شوق سے سنوارا تھا۔ سلیقے سے رکھے گئے۔ چمکتے برتنوں صاف ستھرے سفید فیکیٹز اور درمیان میں رکھے خوبصورت گلدستے نے میز کو بہت کشش بخش دی تھی۔

”ہول۔ بہت خوب“ نے پیچھے عباد کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی۔

”آپ کب آئے عباد بھائی۔“ وہ مسکرائی تھی۔

”جب سے آپ اکیلے ہی اکیلے خود کو داؤد پیش کر رہی ہیں۔“ وہ ہنسا ”بھئی کچھ حصہ اس میں ہمارا بھی ڈال لو۔ ہمیں بھی ”بہت خوب“ تو کہنے دو۔“

”آپ کہہ چکے۔“ وہ جھینپ کر بولی ”اور لقیہ دا دکھانے کے بعد پیش کیجئے گا۔“

”کیا کیا بتا ہے اور کیا کیا انڈر پروس ہے؟“

”سب کچھ بن چکا ہے۔ انڈر پروس کچھ بھی نہیں، ماسوائے اس کے کہ پلاؤڈم پر رکھا ہے اور کباب فرمائی کرنا ہے۔“

”ڈشز؟“ وہ انکو اڑی کے موڈ میں معلوم ہوتا تھا۔

”وہی جو آپ نے ڈیسا انڈ کی تھیں۔ کوئٹے“ وہ بھی نرگسی، پلاؤ افغانی، چرند پشوری، چکن چاؤمین اور فروٹ ٹرا کٹفل۔ کباب ہماری بھی ہیں اور شامی بھی۔“ عباد اس کے پروٹیشنل انداز پر ہنسنے لگا۔

”مسم سے۔ کسی فائیو اشار ہوٹل کی ویٹرس لگ رہی ہو۔“

”جی ہاں!“ اس نے عباد کو گھورا ”بس یہی ایک داؤد باقی رہ گئی تھی۔ سو آپ نے پیش کر دی۔ بانی داوے۔ میں شیف بھی ہوں۔ صرف ویٹرس نہیں۔“

عباد نے جلدی سے کان پکڑے پھر ہاتھ جوڑ دیے۔

”تم صرف میری پیاری سی بہن ہو۔“

”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ ربیعہ اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں سے خفت زدہ ہو کر مڑی۔

”مئی کہاں ہیں؟“ عباد نے نظروں ڈالتی۔

”نماز پڑھ رہی ہیں۔ میں نے ہی انہیں کہا تھا کہ مہمانوں کے آنے سے پہلے فاونڈ ہو جائیں ورنہ انہیں یہی فکر ستاتی رہتی۔“

وہ چکن میں چلی آئی اور چاؤلوں کے نیچے آج مزید مہم کرنے لگی۔

”وہ لوگ بس پیچھے ہی ہوں گے۔“ عباد نے گھڑی دیکھی ”تم بھی شاور لے لو اور فریش ہو جاؤ۔“

”میں۔“ ربیعہ متامل سی ہوئی ”عباد بھائی۔ میں۔“

”ہوں۔ کو؟“ عباد نے جاتے جاتے اسے رک کر دیکھا۔

”مجھ سے وہاں کھانے کے لیے اصرار مت کیجئے گا۔ میں صرف سرو کر کے اپنے کمرے میں چلی جاؤں گی۔“ عباد نے ابرو اٹھا کر اسے قدرے خفگی سے دیکھا تھا۔

”وہ کیوں؟“

”وہ۔۔۔ دراصل میں تھک گئی ہوں۔“ اس نے معقول سی معذرت کرنا چاہی۔ ”میں کچھ دیر آرام کر لوں گی۔“
 ”ضرور کرتا۔ لیکن مہمانوں کے جانے کے بعد۔۔۔ جہاں اتنا کام کیا ہے وہاں تھوڑا سا صبر بھی۔“
 ”لیکن عباد بھائی۔“ وہ نچ ہوئی ”میں آخر یہ کروں گی کیا۔“
 ”سب کے ساتھ مل کر کھانا کھاؤ گی۔“ وہ حتمی انداز میں بولا۔

ربیعہ خاموش ہو گئی۔ وہ بونہی ہار مان لیا کرتی تھی۔
 ”اب جلدی سے فریش ہولہ میں بھی چھینچ کر لیتا ہوں۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔“
 وہ مصروف انداز میں بیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔

باہر گاڑی کا ہارن سنائی دیا تو عباد صوفے سے اٹھ کر تیزی سے باہر کی جانب بڑھا۔
 ”میرا خیال ہے وہی لوگ ہیں منیژہ بیگم سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے انھیں۔ ربیعہ نے بھی ان کی تقلید کی تھی۔“
 عباد کی رہنمائی میں وہ دونوں اندر آئے تھے۔ ایک امیر حسن تھا اور دوسرا وہی نوجوان تھا جس کی تصویر ربیعہ نے امیر حسن کے آفس میں دیکھی تھی۔
 ایک مرتبہ پھر وہ لمحہ بھر کے لیے ختم سی گئی تھی۔ وہ چہرہ اتنا ہی مقناطیسی اور پُرکشش تھا۔ عباد ان لوگوں کا تعارف کروا رہا تھا۔

”ہی۔۔۔ ان سے ملے۔ شہرار احمد ایہ امیر حسن کے کزن بھی ہیں اور بہت اچھے دوست بھی۔“
 ”اور بزنس پارٹنر بھی۔“ امیر حسن مسکینی سے گویا ہوا ”ہر چند کہ شہرار مجھ سے چند برس چھوٹا ہے لیکن اس کا ذہن کئی مقامات پر مجھ سے بہت تیز چلتا ہے۔“
 شہرار مسکراتا ہوا منیژہ بیگم کے سامنے ذرا سا جھکا تھا۔ منیژہ بیگم بے حس و حرکت سی کھڑی رہیں۔
 ”ہی جی۔“ عباد نے انہیں پکارا۔ تب وہ چونکیں۔

”جیتے رہو بیٹا!“ انہوں نے شہرار کے سر پر ہاتھ پھیرا ”اللہ عمر دراز عطا فرمائے۔“
 ”ہی جی۔ ہمیں بھی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ امیر حسن مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ منیژہ بیگم نے اسے بھی یاد دیا۔ پھر عباد نے شہرار کا تعارف ربیعہ سے بھی کروایا تھا۔ ربیعہ اسی کیفیت کا شکار تھی۔ وہ چہرہ ایک خاص محسوس کا حامل کیوں تھا۔؟ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

عباد ان دونوں کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ربیعہ منیژہ بیگم کی جانب متوجہ ہوئی۔
 ”ہی۔۔۔ آپ بھی چلیں اندر۔ میں نب تک کھانا لگاتی ہوں۔ کافی لیٹ ہو گیا ہے۔“ پھر اس نے رک کر منیژہ بیگم کو غور سے دیکھا وہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھیں۔
 ”ہی جی۔“ ربیعہ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”آل۔“ وہ چونکی۔
 ”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ربیعہ ان کا نہایت زور چہرہ دیکھ کر ڈر گئی۔
 ”میری طبیعت؟“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولیں۔ ”یہ۔۔۔ یہ لڑکا۔۔۔ کون ہے ربیعہ؟“
 ”یہ شہرار احمد ہیں۔ ابھی عباد بھائی آپ سے متعارف تو کروایا ہے نا۔ امیر حسن صاحب کے کزن اور بزنس پارٹنر ہیں۔ عباد بھائی سے بزنس سے متعلق معاملات ہی تو طے کرتے آئے ہیں۔۔۔“

”یہ۔۔۔ کہاں سے آیا ہے؟“ وہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھیں۔
 ربیعہ کو عجیب پریشانی نے آگیرا شہرار احمد میں آخر ایسی کون سی بات تھی جو ہر شخص کو ڈسٹرب کرتی تھی۔
 ”انگلینڈ سے آئے ہیں۔ اب آپ ڈرائنگ روم میں چلیے۔ کچھ دیر بیٹھ کر بے شک اٹھ جائے گا۔۔۔“

”میں ادھر ہی بیٹھی ہوں ربیعہ۔“ وہ لاؤنچ کے صوفے پر بیٹھ گئیں۔
 ”مجھے آپ کی طبیعت کچھ خراب لگ رہی ہے۔“ ربیعہ متفکر سی ہوئی ”انیقہ کو بلاؤں؟“
 ”نہیں۔“ وہ فوراً ”بولیں“ ”نئی سے کچھ مت کہو۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کھانا لگا دو۔ بچے بھوکے ہیں۔“

ربیعہ ان کے پاس سے اٹھنا نہ چاہتی تھی۔ لیکن ان کا دو ٹوک انداز دیکھ کر وہ کچن میں چلی آئی۔
 تمام ڈشز ڈانچنگ ٹیبل پر پہنچا کر ان لوگوں کو ٹیبل پر آنے کا کہہ کر وہ پھر منیجرہ بیگم کے پاس چلی آئی تھی۔ وہ
 آنکھیں موندے صوفے کی پشت سے سر نکالے بیٹھی تھیں۔

”جی ہئی۔“ ربیعہ نے ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا ”کھانا کھا لیجئے۔“
 ”مجھے بھوک نہیں ہے ربیعہ۔“ وہ روٹی روٹی سی آواز میں بولیں۔
 ”آپ وہاں کھانا نہیں کھا میں گی تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔“ ربیعہ بولی۔
 ”ٹھیک ہے۔ ہم دونوں بعد میں کھالیں گے۔“ پھر انہوں نے آنکھیں کھول کر ربیعہ کو دیکھا ”منور ربیعہ۔
 ان لوگوں کے جانے کے بعد عباد سے پوچھنا۔“
 وہ رک گئی تھیں۔ ربیعہ نے دیکھا ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”جی جی امی۔ کیا پوچھوں؟“
 ”شہرار احمد کے والد کا کیا نام ہے۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔
 ربیعہ حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

ماہین کے کہنے پر وہ عریشہ کا چیک اپ کر رہی تھی۔ نجانے کیوں اس کا نچلا ہونٹ زخمی تھا۔ اس کے پوٹے
 متورم تھے اور اسے ہلکا نمبر پر تھا۔
 ”کیا گر گئی تھیں؟“ اس نے ہونٹ کو انگلی سے چھوتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔
 ”جی! وہ آہستہ سے بولی۔ ”گر گئی تھی۔“
 ”کہاں سے؟“

عریشہ نے نظر اٹھا کر شہلا کی جانب دیکھا اور خاموش رہی۔ شہلا کو اپنی شادی کے روز سے اب تک کبھی اس
 لڑکی کی سمجھ نہ آ سکی تھی۔ ہر وقت چہرے پر ایک تناؤ اور انداز میں ایک سوگ کی کیفیت لیے۔ اس لڑکی کو اپنی سی
 عمر میں کون سے دکھ لاحق تھے اسے کبھی علم نہ ہو سکا۔
 ماہین زیادہ تر اپنے سرال میں ہی رہتی تھی۔ شافو نادری وہ میکے میں نظر آتی تھی۔ اس کے سرال والے ان
 معاملات میں کافی سخت تھے پھر بھی شہلا عریشہ کی نسبت ماہین سے زیادہ قریب تھی۔ عریشہ سے تو اکثر ایک نامحسوس
 سا خوف آتا تھا۔

”کچھ گولیاں لکھ رہی ہوں۔“ اس نے سانس بھر کر ماہین کو دیکھا ”ایسی تو کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوتی۔
 ہلکا سا بخار ہے۔ آنکھیں بتا رہی ہیں کہ۔“ روتی رہی ہے۔ یا پھر موسم کا اثر ہے۔ میں نے پرسکون نیند کے لیے
 ٹیبلٹ لکھ دی ہے۔ ہونٹ پر لگانے کے لیے ایک مرہم بھی لکھا ہے۔“
 اس نے نسخہ ماہین کو تھمایا۔

”میں ابھی حزمہ سے منگوا لیتی ہوں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔
 شہلا نے مسکرا کر عریشہ کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔

”میں اپنے کمرے میں ہوں۔ ہاشم آجائیں تو کھانا لگاؤں گی۔ پھر سب اسٹھے مل کر کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک
 ہے نا۔“

ماہین نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا تھا۔ عریضہ نے آنکھیں موند لی تھیں۔ شہلا باہر نکل آئی، میڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے مخصوص رنگ سنائی دینے لگی تھی۔ کمرے میں اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ شہلا نے رفتار تیز کر دی اور لپک جھپک کمرے میں چلی آئی۔
آنے والی کال کا نمبر دیکھ کر وہ ہٹکی تھی۔ پھر گہری سانس بھر کر اس نے کال ریسیو کی۔
”ہیلو۔“ وہ محتاط انداز میں بولی۔

”ہیلو۔“ دوسری جانب عمر تھا۔ ”مما۔ السلام علیکم۔“
”وعلیکم السلام۔“ وہ اسے چونے کے لیے بے تاب ہو گئی۔ ”نیک ہے میرا جانو بیٹا۔ میری زندگی!“
”آئی ایم فائن ممما۔ آپ کیسی ہیں۔؟“

”میں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بیٹا۔ آپ اس ویک اینڈ پر ممما سے ملنے نہیں آئے۔؟“ اس نے موبائل کو دونوں ہاتھوں سے کسی تیرک کی طرح تھما ہوا تھا۔ الفاظ بنے تالی سے۔ لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ پڑتے تھے۔
”بس ممما۔ اس مرتبہ میں اور بھیا گاؤں چلے گئے تھے۔ آپ نے دیکھا ہے نا بھیا کا گاؤں؟ بھیا بتا رہے تھے کہ آپ بھی ادھر جا چکی ہیں۔ بھانے مجھے وہ کمرہ بھی دکھایا۔ جس میں آپ رہتی تھیں۔ مجھے وہ کمرہ بہت اچھا لگا ممما۔ میں جب اس بستر پر سویا تو مجھے بہت اچھی نیند آئی۔ وہاں مزہ آیا ممما۔ میں نے تو فرسٹ ٹائم گاؤں دیکھا۔ بہت اچھا لگا۔“

شہلا کی لبوں پر دھیمی افسردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا بیٹا شاید بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی گفتگو میں ایک ٹھہراؤ سا محسوس ہوتا تھا۔ اس بچکانہ پن میں واضح کمی محسوس ہو رہی تھی جو کچھ ہی دن پہلے اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔
تالی اور خالوں سے کہانیاں سننے سننے سو جانے والا بچہ اب اسے اپنے سفر کے قصے سنانے لگا تھا۔
”آپ کو ممما یاد آئیں؟“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”جی ممما۔ بہت یاد آئیں۔ آپ، نانو، عباداموں، ربیعہ خالہ، انیقہ خالہ۔ میں نے سب کو مس کیا۔ پھر بھی میں نے بہت انجوائے کیا۔“

شہلا کی پلکوں پر پرمی چمکنے لگی تھی۔ اس کا بیٹا زندگی سے آشنا ہو رہا تھا۔ جینا سیکھ رہا تھا۔
”اور آپ کی پڑھائی۔ اسکولنگ۔ وہ سب؟“ اس نے خود پر قابو پایا تھا۔

”بھانے مجھے بہت اچھے ٹیوٹر رکھ دیے ہیں ممما۔ بہت جینٹلمن ہیں میرے سوا۔ انہیں سب کچھ آتا ہے۔ انیقہ خالہ بھی ان جیسا انہیں پڑھا سکتیں۔ پتہ ہے ممما اس مرتبہ شیڈول ٹیسٹ میں میرے مارکس پوری کلاس میں سب سے زیادہ ہیں۔ بھیا بھی خوش ہوئے۔ مجھے گفٹ بھی دیا ہے انہوں نے۔“
”اچھا!“ وہ اتنا ہی کسمپالی۔

”مما۔“

”جی۔“

”آپ کب تک آرہی ہیں یہاں؟“ عمر کے انداز میں قدرے تبدیلی آئی جیسے کوئی اسے کچھ کہنے پر آمادہ کر رہا تھا۔

”میں؟ میں وہاں کیوں آؤں گی عمر؟ وہ صرف آپ کا گھر ہے۔ میرا نہیں۔ میرا گھر یہ ہے جہاں میں رہتی ہوں۔ آپ کے ہاشم انکل کا گھر۔ میں یہاں بہت خوش ہوں عمر۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہو۔ زندگی جینے لگے ہو، انجوائے کرنے لگے ہو۔ آپ۔ آپ۔ اس کے گلے میں پھنسنے لگے تھے۔

”آپ ممما کو کم کم یاد کیا کرو۔ بس کبھی کبھی۔ بہت دل چاہے تو ملے آجایا کرو۔ لیکن بیٹا ایسی بات مت کہو جسے پورا کرنا آپ کی ممما کے بس میں نہ ہو۔“
”مما۔ آپ میرے بغیر بھی خوش ہیں؟“ وہ آرزو سا ہو گیا تھا۔

”میں“ آپ کے بغیر نہیں۔ آپ تو اپنی ممالی جان میں اترے ہوئے ہو۔ ہر وقت ہر مل آپ کو یاد کر کے ماما کا دل دھڑکتا ہے جیتا ہے لیکن بیٹا ہمارے درمیان یہ جتنا فاصلہ ہے اب اہل ہے اسے کم کرنا نہ آپ کے اختیار میں ہے نہ میرے۔ اب ہمیں اتنا فاصلہ رکھ کر اسے برداشت کر کے جینا ہے، سمجھنا آپ؟“

دوسری جانب سے کوئی جواب نہ دیا گیا تھا۔ شہلا کو یکایک ہی احساس ہوا کہ فون عمر کے ہاتھ سے لے لیا گیا تھا۔ اس کی باتیں کوئی اور سن رہا تھا۔

”عمر کا خیال رکھنا بہت زیادہ ہے۔ ہمیشہ۔“ وہ بولی پھر اس نے لائن ڈس کنکٹ کر دی۔

عباد نے کمرے کے اندر جھانکا۔ ربیعہ منیوہ بیگم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گردن گھما کر عباد کی جانب دیکھا پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”چائے بنا دوں عباد بھائی؟“

”تم لوگوں نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟“ وہ اندر چلا آیا۔ ”امی کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”پتا نہیں امی کو اچانک ہی کیا ہوا تھا۔“ ربیعہ متفکر سی ہو کر اسے بتانے لگی۔ ”ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا پی پی لو ہو گیا ہو۔ میں نے بہت کہا کہ میں انہی کو جگا دیتی ہوں لیکن نہیں مانیں۔ امی بہت ضدی ہو گئی ہیں عباد بھائی۔“

میری تو بالکل نہیں مانتیں۔“

عباد ماں کے قریب بیٹھ گیا اور پُر تشویش نظروں سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔ منیوہ بیگم دوائی کے زیر اثر سکون کی نیند سو رہی تھیں۔

”ربیعہ! تم امی کا اتنا خیال رکھتی ہو۔“ عباد کو اس کا خیال آیا۔ ”میں چاہوں بھی تو تمہاری خدمتوں کا۔۔۔“

”عباد بھائی پلیز۔۔۔ آپ نے ایک لفظ بھی مزید کہا تو میں۔۔۔“ وہ رو ہانسی ہو گئی۔ ”آپ۔۔۔ آپ کیوں نہیں بھول جاتے کہ میں اس گھر کا حصہ نہیں ہوں۔“

”ربیعہ۔۔۔“ وہ ملاحت سے بولا۔ ”تم میری سگی بہن بھی ہو تیں تب بھی میں ان ہی الفاظ میں اسی طرح تمہارا شکر گزار ہوتا۔ تم نے اپنی ناتواں ہستی پر اس گھر کے سب ہی بار بہت سہولت سے اٹھالیے ہیں۔ اب دیکھو انہی کا صرف بڑھائی سے تھک کر کیسی بے فکری سے سوئی پڑی ہے اور تم۔۔۔ تم صبح سے کچن میں بھی مصروف تھیں۔ امی کی دیکھ بھال بھی کر رہی تھیں اور اب بھی بے ٹکان ان کی خدمت کر رہی ہو۔ مجھے خیال آتا ہے ربیعہ کہ ہم نے تم پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈالا ہوا ہے۔ تم کچھ کتنی بھی نہیں؟“

ربیعہ سادگی سے مسکرا دی۔

”یہ سب آپ کو محسوس ہو رہا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پُر سکون پُر عافیت چھت کے نیچے ہونے کا احساس اتنا قوی ہے کہ چھوٹے موٹے کاموں کی کوئی اہمیت محسوس نہیں ہوتی۔ آپ سب کی محبتوں نے اتنی آسودگی بخشی ہے عباد بھائی کہ کسی قسم کی تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔“

”تم اتنی زیادہ اچھی ہو تب ہی۔“ وہ پُر شگفتہ سے انداز میں کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”تب ہی۔“ اس نے دلچسپی سے عباد کو دیکھا۔ ”تب ہی کیا؟“

”تب ہی سب کو اچھی لگتی ہو۔“ وہ دھیرے سے ہنسا۔ ”ربیعہ! آئی فیل کس۔۔۔“

وہ کچھ کہتے کہتے جھجک کر پھر سے رک گیا تھا۔ ربیعہ کو حیرت ہوئی۔

”کہہ بھی چکیں۔ یہ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں آپ؟“

”آئی فیل کہ مسٹر امیر حسن! تم میں انٹرنلڈ ہو رہے ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”انہوں نے اتنی بار تمہارا پوچھا کہ میں حیرت زدہ اور وہ خود شرمندہ ہو گئے۔ تمہارے بنائے ہوئے کھانے انہوں نے اس قدر ذوق و شوق سے کھائے اور اتنی زیادہ تعریف کی کہ میرا جی چاہ رہا تھا باقی ماندہ کھانا پیک کر کے ان کے ہمراہ کر دوں۔“

ربیعہ عباد کے منہ سے ایسی باتیں سن کر شرم سے سرخ پڑ گئی۔ اس سے نظریں اٹھانا محال ہو گیا۔
”کمال کرتے ہیں آپ بھی۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔

”ابھی عباد ہی از سونا کس کے میں تم سے یہ ٹایک دس کس کیے بغیر رہ نہ سکا۔“ عباد بولا۔ ”آئی ایم شیور کہ وہ چند ایک روز میں ضرور تمہارے لیے اپنا ہاتھ بڑھا میں گے“ اس لیے میں پہلے تم سے تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ بولو ربیعہ! ایسی صورت حال میں تمہارا جواب کیا ہو گا؟“

”مجھے نہیں پتا عباد بھائی!“ ربیعہ بے طرح گھبرا گئی۔ ”مجھ سے ایسی باتیں نہ کیجئے پلیز۔“
”مجھے برا بھائی سمجھتی ہو تو اچھے بچوں کی طرح بات کرو۔ ایسی باتوں میں اپنی آزاد رائے استعمال کرنے کا حق ہمیں ہمارے مذہب نے دیا ہے ربیعہ!“

اسی لمحے منیزہ بیگم نے کسمسا کر آنکھیں کھولی تھیں پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

”جی جی!“ عباد نے ان کا ہاتھ تھاما۔ ”آپ تھیک ہیں نا؟“

”وہ لوگ۔۔۔ وہ لڑکا۔۔۔“ وہ جیسے خواب میں بولی تھیں۔

”کون لوگ؟“ عباد کچھ نہ سمجھا۔ ”کون لڑکا؟“

”پی شہیار احمد کے متعلق پوچھ رہی ہیں۔“ ربیعہ نے اسے بتایا۔

”جی ہاں وہ جا چکے ہیں۔ کھانے پر آپ لوگوں کا بار بار پوچھ رہے تھے لیکن آپ کا شاید بی بی او ہو گیا تھا۔ ربیعہ نے منیزہ سے دے کر آپ کو سلا دیا تھا۔“ عباد ان کا ہاتھ سلاتے ہوئے نرمی سے بتانے لگا۔

”مجھے اس لڑکے کے باپ کا نام بتاؤ۔“ انہوں نے بچوں کی طرح عباد کا چہرہ دیکھا۔

”اس کے والد کا نام۔۔۔“ عباد سوچنے لگا۔ ”وہ یو کے میں ہوتے ہیں۔ بہت بیمار ہیں۔ پیرالائز ہیں بے چارے۔ میرا خیال ہے۔۔۔ ہاں یاد آیا۔۔۔ احمد جہاں زیب ہے ان کا نام۔“

”احمد جہاں زیب۔۔۔“ منیزہ بیگم کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکلا تھا۔ ”احمد جہاں زیب۔۔۔“

ربیعہ اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی رہ گئی تھی۔ کیسا عجیب اتفاق تھا؟ اس کے والد کا نام بھی تو احمد جہاں زیب ہی تھا۔

شہلانے از حد حیرانی سے اپنی پوری آنکھیں کھول کر فردوس بیگم کو دیکھا۔

”یہ۔۔۔ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”اے۔۔۔ کچھ بہت اٹو کھا بول دیا، ہم نے؟“ انہوں نے نظریں جراتے ہوئے مضبوط لمبے میں بولنے کی کوشش کی تھی۔ ”دستور ہے دنیا کا۔ لڑکے والے لڑکی کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ اخترمیاں کے مقابلے میں

لڑکی کچھ خوبصورت ہے۔ تو بی! چاند بھی سیاہ آسمان پر ہی چمکتا ہے۔ سامنے سورج آجائے تو ماند پڑ جاتا ہے اور پھر شکل ہی شکل ہے۔ وہ تمہاری سگی بہن تو نہیں۔ نجانے کہاں سے ٹپکی بن بادل برسات کی مانند اور پھر ایسی جی کہ پلٹنے کا نام نہیں لیا۔ برامت ماننا مگر ایسی لڑکیوں کے لیے رشتہ دینا بھی جبر و الاوں کا کام ہے۔ جو صلہ چاہیے بے نام کی بچی کو اپنانے کے لیے۔“

”تو آپ سے کس نے کہا یہ کار خیر کرنے کے لیے۔“ شہلا غم وغصے میں حفظ مراتب بھلا بیٹھی۔ ”ربیعہ جیسی ہیرا لڑکی گئے لیے وہ آپ کے گھٹنوں رسیدہ بھائی ہی رہ گئے ہیں؟ اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو آپ بہت غلط رخ پر سوچنے کی عادی ہیں۔ ربیعہ میری سگی بہن۔ لیکن سگی بہنوں سے بڑھ کر پیاری ہے۔ میرا بھائی اگر اسے بہن نہ مانتا ہوتا تو اسے کسی باہر کے رشتے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور آج تو آپ نے یہ بات کہہ دی۔ آئندہ میں ربیعہ کا نام کسی ایرے غیرے کے ساتھ لینے پر حشر مچا دوں گی۔“

شہلا کے ہاتھ پیر غصے سے بری طرح کانپ رہے تھے۔ فردوس بیگم ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھ رہی تھیں۔

انہوں نے ہمیشہ اسے بہت شائستہ اور نرم خوابایا تھا اور وہ اسے قدرے بزدل بھی جانتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بے حد اطمینان سے اپنا بدعا اس کے سامنے اس طرح پیش کیا تھا جیسے طوعاً و کرہاً ”شہلا کو یہ رشتہ منظور کرنا ہی ہوگا لیکن شہلا کی جانب سے جو رد عمل آیا تھا اس نے انہیں ششدر کر دیا تھا۔

”یہ تم کس طریق سے مخاطب ہو، ہم سے۔“ انہوں نے واویلا مچانے کے انداز میں کہا۔
 ”میں معذرت خواہ ہوں۔“ وہ روکھے انداز میں بولی۔ ”لیکن آپ کی بات اتنی ہی غلط تھی۔ اپنے بھائی کے متعلق میں کم اور آپ خود زیادہ جانتی ہیں۔ درست فرمایا آپ نے کہ وہ سیاہ رات کی مانند ہیں۔ ایسی سیاہ راتوں کے لیے کوئی چاند نہیں ہوتا۔ میں مزید کچھ کہنا نہیں چاہتی۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہت لگاؤ سے وہ ان کے قریب آکر بیٹھی تھی مگر دلوں کے فاصلے کسی طور کم ہوں لیکن انہوں نے آخر میاں کے لیے رنجہ کا ہاتھ طلب کر کے اسے ششدر اور سخت خفا کر دیا تھا۔

”ٹھیک ہے، ہم اپنے بیٹے سے بات کریں گے۔ وہ خود سسرال میں یہ معاملہ اٹھائے گا۔“ وہ پیچھے سے بولیں۔
 ”اے ہاں، جب خود ایک بیٹے کا دم چھلا لگا کر ہمارے کنوارے جوان بیٹے کے ساتھ چلی آئی تھیں تب یہ فرق انہیں نظر نہیں آئے۔ اب آنکھوں میں پیچھے رہے ہیں۔“

وہ از حد جل کر بولی تھیں۔ شہلا نے خود پر انتہا درجے کا ضبط کیا اور ایک سانس میں بقیہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔
 فردوس بیگم جلتی، برطانوی عریشہ کے کمرے کی سمت بڑھی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئیں تو عریشہ کو دو، گھنٹا کی ماہین چونکی تھی۔

”خیریت؟“ اس نے ماں کے بگڑے تیور ملاحظہ کیے۔
 ”ایک دوسری خیریت۔ ایسے گھر کو جی چاہتا ہے آگ لگا دیں، جہاں ایسے جی کو جلانے والے بستے ہیں۔“ انہوں نے ایک خوشخوار نظر عریشہ پر بھی ڈالی تھی۔

”کیا ہوا؟“ ماہین بے زار سے انداز میں بولی۔
 ”تمہاری بھتیجی بیگم کے پاس سے آرہے ہیں ابھی۔ واہ وا۔۔۔ خوب اونچے گھرانے کی ہیں۔ دوسروں کو چیونٹی جیسا حقیر جانتی ہیں۔“

”شہلا بھابھی؟“ ماہین نے بے اعتبار نظروں سے انہیں دیکھا۔
 ”ہاں وہی، ظہر خاں ولدہ رستم خاں۔ اے میں نے ایسا کیا کہہ ڈالا جو بلبلا ہی اٹھیں۔ جان بچا کے بھائے گے ہم ورنہ شاید جھنجھوڑی ڈالتیں ہاں۔“

”خدا کے لیے امی! ماہین زنج ہوئی۔“ کچھ تو سوچ سمجھ کر بولا کریں۔ شہلا بھابھی جیسی شائستہ خاتون سے کسی بڑے سلوک کی میں تو توقع نہیں کر سکتی۔“
 ”شرم کرو۔“ وہ اس پر الٹ پڑیں۔ ”ماں کو جھوٹا بتاتی ہو؟“

”معاملہ کیا ہے آخر؟“ وہ زنج ہو کر بولی۔
 پھر ساری بات سن کر اس کی بھی وہی حالت ہوئی تھی جو شہلا کی تھی۔
 ”غضب خدا کا۔ یہ بات کہتے ذرا لحاظ نہ کیا آپ نے؟“ وہ بگڑ کر بولی۔ ”کہاں آخر ماموں، کہاں وہ پھولوں سی لڑکی۔ امی جان! آپ نے تو حد ہی کر دی۔ میری بہن کے لیے کوئی ایسے شخص کا رشتہ پیش کرتا تو میں نجائے کیا حال کرتی اس کا۔ کچھ تو سوچا ہوتا آپ نے۔“

”اے بی بی! یہ دیکھو۔“ انہوں نے پھٹ سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑے۔ ”یہ دیکھو۔“ پھر انہوں نے اپنے کان پکڑ کر کھینچے۔

”اب بولو تو ناک سے سو لکیریں کھینچیں۔ ارے بہن ہوں بہن۔ اس مردار کی۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے اس کے حالت دیکھ کر۔ کیا بونہی رُلتے رُلتے مرجانے کے لیے اس دنیا میں آیا ہے وہ۔“

”تو امی جی! ان کے حساب سے بھی تو رشتہ دیکھا اور ڈھونڈا جاسکتا ہے۔“ مایین نرم پڑی۔

”وہ جو مرا جا رہا ہے اس کم سن حسینہ کے عشق میں پھر ہم کیا کریں؟“

”کون؟“ خترماملوں؟“ مایین گنگ ہو گئی۔

”اور کون۔۔ ایک بار پوچھی، ہم نے ذکر کر دیا۔ وہ تو میرے سر ہو گیا۔ روز صبح اپنا میلانہ لے کر سامنے آ بیٹھتا ہے ہاتھ پیر جوڑتا ہے پھر ذکر نہ کرتے شہلا سے تو اور کیا کرتے۔“

”خترماملوں یا گل ہو گئے ہیں۔“ مایین خفا ہوئی۔ ”ان کے دماغ کا علاج ہونا چاہیے۔“

”اے! اب تم کو اس لو اس بد بخت کو۔“ انہیں برا لگا۔ ”ماموں نہ ہوا،“ بھلے کا سودا لی ہو گیا۔ ارے بھلا چنگاے،

سلامت ہاتھ پیروں کا ہے، تو کمری نہیں کرتا تو کیا ہوا، ہم اس کے سر پرست ہیں، اسے پال رہے ہیں اس کی آل کو

بھی پال لیں گے، ہم تو اپنی محبت سے مجبور ہیں۔“

”چلیں، کسی سے تو محبت کا دعو ہے آپ کو۔“ مایین قدرے ناگواری سے بولی۔ ”خترماملوں تو بہت خوش

نصیب ہیں۔“

”ہائیں۔“ اچھی سے فردوس بیگم کا منہ کھل گیا۔ ”یعنی ہم سب سے نفرت کرتے ہیں، اے بی! کون سی برائی

کی ہم نے تم سے۔“

”اس کو دیکھیں۔“ مایین نے ترشی سے کہتے ہوئے عریشہ کی جانب اشارہ کیا تھا۔ ”دیکھیں اس کی اس حالت

خراب کو اور بتائیں کون ہے ذمہ دار اس کا۔“

”یہ خود۔“ وہ اطمینان سے گویا ہوئیں۔ ”اس کا غصہ اس کی بے جا ضد۔ ہمارے سر کس بات کا الزام لگاتی ہو

تم؟“

”امی جی! مانا کہ یہ ضدی ہے، غصہ دور ہے لیکن ماں باپ کا اور خصوصاً ماں کا فرض بنتا ہے کہ وہ ہرچے کو اس کی

طبیعت کے حساب سے ٹیٹ کرے۔ آپ نے اپنے ہرچے کو صرف اپنی طبیعت اور عادت کے حساب سے ٹیٹ

کیا۔“

”ارے کیا ٹیٹ کیا ہم نے؟ ہمیں بھی بتاؤ؟“ وہ غصے سے بولیں۔ ”یہ ٹیٹ ورٹ کے ناز خرے نہ کسی نے

ہمارے اٹھائے، نہ ہم کسی کے اٹھانے والے ہیں۔“

”امی! مایین دکھ سے بولی۔ ”کاش، آپ نے سمجھا ہوتا کہ بیٹیاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔ ان کے جذبات

آئینوں کی مانند ہوتے ہیں ان کے تصورات میں سچی دنیا اتنی اہم ہوتی ہے کہ باقی ہر معاملہ غیر اہم ہو جاتا ہے لیکن

افسوس، آپ جیسے ماں باپ اولاد کو موم کی ناک سمجھتے ہیں اور اسی طرح موڑتے ہیں اپنے فیصلوں کے مطابق۔

نتیجہ اس صورت میں بھی سامنے آتا ہے۔“ اس نے عریشہ کی جانب اشارہ کیا جس کی بند پٹوں پر موتی لرزنے لگے

تھے اور ہونٹ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔

”کون سی گولی ماری ہم نے اسے؟“ وہ ابرو چڑھا کر پوچھنے لگیں۔ ”جو اس کا نصیب تھا اسے مل گیا۔ اب جا کر

لڑے خدا سے نصیب تو وہی لکھتا ہے۔“

”درست لیکن امی جی! اولاد کو اعتماد میں لے کر فیصلے کیے جائیں تو ایسی غلط فہمیاں کبھی نہیں ہوتیں۔ یہ کیا کہ

فرد جرم پڑھ کر سنائی اور سزا دے ڈالی۔ مجھے سخت افسوس ہوتا ہے اسے یوں کڑھتا دیکھ کر۔ نفسیاتی مریض بن گئی

ہے۔“

فردوس بیگم چپ سی ہو گئیں۔ کچھ تردد سے انہوں نے عریشہ کا چہرہ دیکھا۔

”کیا بہت برا لگتا ہے اسے نافع؟“ پھر انہوں نے سرگوشی میں مایین سے دریافت کیا۔

مایین نے سانس بھر کر اپنی نا سمجھ ماموں کو دیکھا۔

”ضروری نہیں کہ اسے نافع پائند ہو۔ وہ بے چارہ تو ایک اچھا، سلجھا ہوا، سیدھا سا اور انسان ہے۔ ہاں یہ ممکن

ہے کہ اسے کوئی اور پسند ہو۔“
 ”ہائیں۔“ وہ حیرت سے بولیں۔ ”بہت خوب پھر بتا دیجیے ہمیں اپنی پسند۔“
 ”کاش اتنا اعتماد ہمارے والدین اپنی اولاد کو دے سکیں۔“
 اس نے سر دھڑکاتے ہوئے بھری تھی۔

وہ مومن اور ایمان کے دھلے ہوئے استری شدہ کپڑے رکھنے کے لیے ان کے کمرے میں آئی تھی تب ہی وہ دروازے میں ہی ٹھک کر رک گئی۔
 مومن کان سے موبائل فون لگائے کسی سے مخوج گفتگو تھا۔ دھیمی آوازیں وہ کیا باتیں کر رہا تھا، ایقان کے لیے سننا ممکن نہ تھا۔ تب ہی اس نے ذرا سی گردن موڑ کر ماں کو دیکھا اور جلدی سے فون آف کر دیا۔ ایقان چند قدم آگے بڑھ آئی۔

”کس کافون ہے تمہارا پاس؟“ وہ سخت حیرت زدہ تھی۔ ”اور۔۔ اور کس سے باتیں کر رہے ہو؟“
 ”اپنے دوست سے۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”یہ موبائل کہاں سے آیا تمہارا پاس؟“ وہ حیرت زدہ تھی۔
 ”رائف بھائی نے دیا ہے۔“ وہ متامل ہو کر بولا۔

”رائف نے؟ لیکن کیوں؟ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ وہ اس کے قریب چلی آئی۔
 ”میں نے ان سے کہا تھا، مجھے سیل فون کا شوق ہے، انہوں نے مجھے گفت کر دیا بس آپ کو بتانے والی اس میں کون سی بات ہے؟“
 ”مومن!“ اس نے تاسف سے بیٹے کو دیکھا۔ ”تم۔۔ تم روز بروز بگڑتے ہی جا رہے ہو۔ بڑے ہونے کا مطلب سرکش ہونا نہیں ہوتا۔“

وہ مڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر مزید سرکشی سے بولا۔
 ”آپ کا بیٹا ہوں نا آپ بری گیا ہوں۔“

ایقان کے قریب سے نکل کر وہ باہر چلا گیا۔ ایقان اپنی جگہ جیسے جم کر رہی رہ گئی تھی۔ حیرت، دکھ، تاسف اور غمو غصے سے اس کے اعصاب شل ہونے لگے۔
 بو جھل قدموں سے آگے بڑھ کر اس نے مومن کی الماری کھولی اور اس کے کپڑے رکھ کر ان ہی قدموں سے واپس چلی آئی۔ اچانک ہی وہ رکی۔

لاڈلج کے بیرونی دروازے پر آخر میاں کھڑے تھے۔ ایقان کا دل مزید غمگین ہوا۔
 ”تشریف لائے۔“ وہ قدرے طنز سے، آہستگی سے گویا ہوئی۔

وہ چند قدم آگے بڑھ آئے۔

”کہاں تھے آپ، پچھلے کئی روز سے نظر ہی نہیں آئے۔“ وہ آہستہ آہستہ بول کر خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”ہم۔۔ ایقان بیگم! آپ سے معذرت کرنے آئے ہیں۔“

”معذرت؟“ ایقان کو حیرت ہوئی۔ ”کس بات کی؟“

”ہم اس روز یونیورسٹی میں آپ سے وعدہ کر بیٹھے، ہم اپنا وعدہ وفا نہ کر سکیں گے۔“

وہ کان سمجھاتے ہوئے بولے۔ ایقان نے حیرت سے پوری آنکھیں پھاڑ کر انہیں سر سے پاؤں تک دیکھا۔

”دراصل بھابھی بیگم نے ہمارے لیے ایک لڑکی پسند کر لی ہے۔“ وہ دانت نکوس کر بولے۔ ”اور ہمیں وہ مندر پر جی جان سے پسند ہے۔ ہم نے سوچا، آپ ہماری اس میں نہ بیٹھیں۔“ وہ جاسیں۔ اس دن کس خیال میں جانے آپ سے کیا کہہ بیٹھے۔“

ایقان کو ایسا لگا جیسے پورے سمندر کا پانی اس کے سر پر سے بہتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ ذلت اور تحقیر کے احساس سے وہ پوری کانپنے لگی۔

”تم... تم گھٹیا... تم... ایک نظر کرم سے خود کو کوئی دیوتا خیال کر بیٹھے۔“ وہ دانت پیستے، مٹھیاں بھینچتے ہوئے آگے بڑھی۔ آخر میاں ڈر کر پیچھے ہٹے۔

”ہمیں گالی مت دس ایقان بیگم! ہم تو اپنا حق استعمال کر رہے ہیں۔ برسوں پہلے آپ نے بھی تو اپنا حق استعمال کیا تھا۔ آپ اگر بھول گئی ہوں تو ہم نہیں بھولے۔“

ایقان نے جھک کر میز پر رکھی ایش رٹے اٹھائی اور زور سے انہیں کھینچ ماری۔

”تم صرف اپنی اوقات بھلا بیٹھے ہو، زمینی کیڑے۔“

آخر میاں اچھل کر ایک طرف ہوئے تھے۔ ایش رٹے کھڑکی کا شیشہ توڑتی ہوئی گری۔

”تم مجھے میں تمہارے عشق میں دیوانی ہو رہی ہوں۔“ ایقان نے اب ایمان کا کھلونا بس اٹھایا تھا اس بار وہ آخر میاں کے سر میں جا لگا۔

”تمہارے جیسے کینے کے لیے اپنی اوقات دکھانے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا۔“

آخر میاں پورے لاؤنڈم میں ناچتے پھر رہے تھے۔ ہمیشہ طاری رہنے والی حالت نشہ ہرن ہو گئی تھی۔ آخر میاں خود بھی ہرن بنے ہوئے لمبی لمبی چھلانگیں مار رہے تھے۔

ایقان کے ہاتھ اب سبزی کاٹنے والی چھری لگ چکی تھی۔ آخر میاں یہ خطرناک نظارہ دیکھ کر زور زور سے چلانے لگے۔

”تمہارے جیسے عاشقان دل کے لیے ایک ہی سیدر پری ہے۔ موت... وہ دیوانوں کی طرح ان پر جھپٹی۔

دفعتا“ وہ پوری کی پوری کسی کے شنبے میں آگئی تھی وہ رافع تھا۔

”چھپو... چھپو کیا دیوانی ہے...“ وہ اس کا چھری والا ہاتھ قابو میں کیے ہوئے تھا۔

”چھوٹو... میں کہتی ہوں چھوٹو مجھے... اس کینے کو نہیں چھوٹوں کی میں... حساب برابر کرنے آیا ہے کتا...

میں اس کے سارے حساب برابر کیے دیتی ہوں۔“

آخر میاں جان بچا کر بڑی مشکلوں سے نکل پائے تھے۔ رافع کو پھری شیرنی کو قابو کرنا مشکل لگ رہا تھا پھر دفعتا

ہی وہ بالکل ہی بے حس و حرکت ہو کر رافع کے بازوؤں میں جھول گئی۔



”شدید مینٹل شک۔“ ڈاکٹر نے انہیں بتایا تھا۔ ”یہ خوش قسمت ہیں جو اپنے حواسوں پر قائم رہیں ورنہ ان کی باغی حالت بتا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے ذہن پر کوئی بڑا صدمہ برداشت کیا ہے۔“

”یہ صرف اپنی ضد سے لڑ رہی ہیں ڈاکٹر صاحب! اپنی شدید محبت کی نفی کرنے کی سعی کر رہی ہیں۔“

رافع کاسف سے بولا۔ اس کے ساتھ ہاشم اور عذرا بیگم بھی ہاسپٹل میں موجود تھے۔

”آج رات یہ ہاسپٹل میں ہی گزاریں گی۔ انڈر آیزرویشن۔ کل شام آپ انہیں گھر لے جاسکتے ہیں۔“

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر آگے بڑھ گیا۔ ہاشم سینے پر بازو لپیٹے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں معلوم ہوتا تھا پھر اس نے رافع کو دیکھا۔

”چھپو نہیں مانیں! رافع! ہمیں ہی کوئی حل نکالنا ہو گا۔“

”دیکھتے ہیں...! اہی تو... اہی! کی حالت ایسی نہیں کہ انہیں کچھ بتایا جائے۔ کیا خبر اور بگڑ بیٹھیں۔“

عذرا بیگم نے باری باری دونوں کی شکل دیکھی تھی۔

”ہاشم! رافع نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔“ تم پوسوں ا ملام آباد جا رہے ہو نا؟“

”ہوں! دو دن کا وزٹ ہے۔“

”پھپھو کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ آفس کے کاموں سے فرصت ملے تو انہیں مری اور بھورین لے جانا۔“

”پھپھو کو۔“ ہاشم متاثر ہوا۔ ”لیکن۔۔۔“

”سمجھا کرو انہوں نے اپنا اپنی مون وہیں گزارا ہے۔ ان کی ذہنی حالت پر اچھا اثر پڑے گا۔“

”لیکن رافع یا نہ یوں۔ میں اور پھپھو۔۔۔“ وہ گڑبڑایا۔

”تو بھابھی کو بھی ساتھ لے کر جاؤ نا۔“ رافع اس کا مدعا سمجھ کر مسکرایا۔ ”دو دن کا چھوٹا سا اپنی مون تم بھی

منالو۔“

ہاشم کے چہرے پر ایک رنگ سا گزرا تھا۔ اس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لیے ویران ہوئی تھیں پھر اس نے خود پر

قابو پایا۔

”شہلا اپنی مرضی کی مالک ہے۔ پتہ نہیں وہ جانا بھی چاہے یا نہیں اور۔۔۔ اور پھپھو۔۔۔ پھپھو کے بارے میں

تمہیں کیا گمان۔۔۔ یہ صاف انکار کریں گی۔“

”نہیں کریں گی۔“ رافع دھیرے سے بولا۔ ”ٹوٹ چکی ہیں اندر سے۔ اپنی کرجیاں سینے کے لیے انہیں بھی سفر

درکار ہے۔ تم اپنی کہو۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اگر شہلا اور ایقان پھپھو راضی ہوں تو میں ان کے ٹکٹس بھی کنفرم کروالیتا

ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم ٹکٹس کنفرم کروالو۔ شہلا بھابی نے اگر انکار کیا تو میں خود ان سے بات کرلوں گا۔ رہے

ایمان اور مومن۔ تو وہ امی کے ساتھ دو دن گزار لیں گے۔“ اس نے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں بالکل۔“ انہوں نے سر ہلایا ”میں بھی سمجھتی ہوں کہ ایقان کو تبدیلی کی ضرورت ہے۔“ ہاشم نے

دھیرے سے اثبات میں سر ہلادیا۔



منیزہ بیگم کی حالت پھر بگڑ گئی تھی۔ عباد اور انبیعا انہیں اسپتال لے گئے۔ ربیعہ پریشانی کے عالم میں گھری ان

کی صحت کے لیے دعا میں लागتی رہی۔

”اسے بار بار ترانہ کا خیال بھی آتا تھا۔ اس سے ملنے کا وعدہ کر کے وہ ایسی الجھنوں میں گرفتار ہوئی تھی کہ باوجود

کوشش کے چند گھنٹوں کے لیے بھی نہ جاسکی تھی۔

”نجانے ترانہ کیا سوچتی ہوگی۔ کاش ہم دونوں اتنی عجلت میں علیحدہ ہونے سے پہلے ایک دوسرے کے فون

نمبر زہی لے لیتے۔“

”ترانہ کے پاس عباد کا سیل نمبر تھا جس پر وہ بلاور سے ربیعہ کو چند مرتبہ فون کر چکی تھی لیکن اس روز ترانہ نے

اسے بتایا تھا کہ وہ کچھ ایسی مشکلات کا شکار رہی تھی کہ بہت سی چیزیں اس سے مٹ ہو گئی تھیں۔

فون کی نیل بجی تو ربیعہ تیزی سے جاء نماز سے اٹھ کر فون تک گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ فون ہاسپٹل سے عباد

نے لیا ہوگا۔

”ہیلو۔“

”السلام علیکم۔“ دوسری جانب سے ٹکھری ہوئی، شگفتہ آواز سنائی دی تھی۔

”وہ۔۔۔ وایکم السلام۔ امیر حسن صاحب۔ کیسے ہیں آپ۔۔۔“ ربیعہ نے ٹکھری سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی دعاؤں سے خوش باش ہیں۔۔۔“ وہ ہنسا ”ہر چند کہ آپ سے کئی شکایتیں بھی ہیں۔۔۔“

”مجھ سے۔۔۔؟“ وہ متعجب ہوئی۔ ”میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں کہ۔۔۔ کیسے۔ ایسا کیا قصور ہوا ہے مجھ

سے؟“

”آپ نے اس روز اتنے مزے دار کھانے کھائے اور اس طرح کہ ہم آپ کی میزبانی کا شکریہ بھی ادا نہ

کپائے۔ کم از کم گھر آئے مہمانوں کو گیت تک سی آف ہی کر دیتیں۔“
 ”اوہ“ ربیعہ اس کی بات سمجھ کر مسکرا دی، ”دراصل امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں ان کے پاس تھی۔“
 ”خیریت۔“ وہ چونکا۔

”عباد بھائی اور انیقہ امی کو اسپتال لے کر گئے ہیں۔ ان کی طبیعت کافی ڈاؤن ہو رہی تھی۔“
 ”اوہ آئی سی۔ میں معذرت خواہ ہوں مجھے تو بالکل علم نہیں تھا۔ عباد بھی کمال کا انسان ہے۔ کم از کم ہنر اتنی تو خیر خبر دیتا ہے اپنی۔ پھر پروفیشنل ازم سے نکل کر بھی ہمارے درمیان دوستی اور خلوص کے کئی رشتے استوار ہوئے ہیں۔ اوہ۔ اوہ شاید مزید کچھ رشتے استوار ہو سکیں۔ اگر آپ چاہیں تو۔۔۔ مس ربیعہ!“
 ”ربیعہ۔۔۔ کامطلب جان کر خاموش کھڑی رہ گئی۔

”آئی ایم سوری کہ اس وقت آپ پریشانی میں ہیں آپ سے یہ بات کہہ رہا ہوں لیکن ایسا ہے کہ میں چند ایک روز میں یو کے جا رہا ہوں۔ پاکستان میں معاملات کو فی الوقت شہر یار ہینڈل کرے گا۔ سو جانے سے پہلے معاملات خوش اسلوبی سے کسی حتمی نتیجے تک پہنچانا چاہتا ہوں۔“
 ”ربیعہ چاہتی تھی کہ اسے اس موضوع پر مزید بات کرنے سے روک دے۔ وہ ہولے کھنکھاری۔ امیر حسن اپنی جون میں تھا۔“

”مس ربیعہ! میں آپ کو اتنا بتاؤں کہ میں عباد سے پریشانی لے کر ہی آپ سے یہ گفتگو کر رہا ہوں۔ دراصل فرام داورری فرسٹ ڈسکے آپ نے۔ عجب سحر انگیزی کیفیت کا شکار کر رہا ہے مجھے۔ پتا نہیں اس کیفیت کو کہتے ہیں؟ کشش، اثر، انیسٹ! یا پھر محبت! آئی ڈونٹ نوربیعہ۔ میں خود نہیں جانتا۔ میں بیٹھے بیٹھے آپ کے خیال میں کیوں کھوجاتا ہوں۔ اس طرح کہ پھر گرد و پیش کا حساب کتاب نہیں رہتا۔۔۔ بھی بھی سخت مصروفیہ کے عالم میں کیوں میرا جی چاہتا ہے کہ مکمل فراغت کے احساس کے ساتھ آپ سے گفتگو کی جائے۔ یا۔۔۔ یا کہ اہم فائل پر کام کرتے کرتے میں نوٹ پیڈ نکال کر آپ کو اس کیج کیوں کرنے لگتا ہوں۔ مجھے آپ کے گھر کو جا۔ رستے کیوں اتنے پسند ہیں۔ آپ کے گھر کے سامنے والے پارک کی خالی جگہ دیکھ کر کیوں مجھے اپنا اور آپ کا خیال آتا ہے۔ کیوں ربیعہ کیوں؟ ازاں لو؟“

ربیعہ ریسیور تھامے بے حس و حرکت کھڑی تھی اس کے ماتھے سے پسینہ ٹپک کر اس کی گردن میں سرسراہٹ کرنے لگا۔

”ربیعہ! اس ساری صورتحال کے بعد یہ غیر ممکن ہے کہ میں آپ سے یہ نہ پوچھوں کہ کیا آپ میری زندگی میں شامل ہونا پسند کریں گی؟ آپ۔۔۔ آپ شادی کریں گی مجھ سے؟“
 ربیعہ نے بمشکل ٹھوک لگلا۔ گھر میں چھائے ہوئے کبیر سنائے اور اکیلے پن کے درمیان ریسیور سے آتی خواب ناک سی آواز اس کے دل میں کوئی ہلچل مچائے بنا اپنا دعا سنا رہی تھی۔ ربیعہ کو اپنے پتھر لیلے جذبات حیرت ہوئی اس نے اپنے دل کو ٹولا اور خوف زدہ ہو گئی۔

”ربیعہ! میں چاہتا ہوں کہ یو کے جانے سے پہلے میں اپنا نامنڈ بالکل سیٹ کر لوں ایسا ممکن ہے یا پھر ایسا ممکن نہیں ہے۔۔۔ دارو مدار آپ کی ہاں یا ناں پر ہے۔“ ربیعہ بالکل خاموش کھڑی رہی۔ وہ خود کو ایسے موڑ پر اہستہ محسوس کر رہی تھی جہاں سے کہیں کسی اور کوئی رستہ نہیں جاتا۔

ایک چپ میں جو ہے چھپی
 ہزار باتوں کی بات ہے

امیر حسن دیر سے ہنسا تھا۔

”شاید میں نے آپ کو کچھ زیادہ ہی ڈسٹرب کر دیا ہے۔ سو سوری ربیعہ! لیکن یہ حال دل ایسا ہے کہ ایک نہ ایک

دن عیاں کرنا ہی پڑتا ہے۔ ٹیک یور ٹائم ریجیہ، آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے۔ بس اتنا ہے کہ میرے یو کے جانے سے پہلے مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔ میں تب تک سُن گن کر گھر آیاں گزارتا ہوں۔“

شاید اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

”اور ہاں۔ ایک آخری بات! وہ بولا ”اگر آپ کا جواب ہاں میں ہوا تو میں آپ کو ایک خوبصورت سی قانونی دُور میں باندھ کر جاؤں گا۔ کیونکہ مصروفیت نے اگر پلٹ کر آنے کی اجازت نہیں دی تو پھر آپ کو وہاں آنا ہو گا۔“

کلیر۔“

ریجیہ ہنوز گم صم تھی۔

”اللہ حافظ!“ میر حسن نے فون بند کر دیا۔

ریجیہ نے سلسلہ منقطع ہو جانے پر خالی خالی سی نظروں سے ریسیور کو دیکھا جو ابھی کیسی انہونی داستانیں سنارہا تھا۔

وہ پلٹ کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی جاء نماز تک آئی اور اس پر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے آنکھیں بند کیں اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ دل نے نجانے کسے پکارا تھا۔ ریجیہ نے سہم کر آنکھیں کھول دیں۔



ہاشم نے ہارن دیا تھا۔ شہلا نے تیزی سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور دروازے کی سمت بڑھی۔ فلائٹ صرف ڈیڑھ گھنٹے کے فاصلے پر تھی اور ایئر پورٹ تک کے رستے میں خاصا ٹائم لگ سکتا تھا۔

گاڑی کی بچھلی سیٹ پر اجڑی اجڑی سی ایقان بیٹھی تھی۔ اگلی سیٹوں پر ہاشم اور رافع تھے۔ رافع ان لوگوں کو سی آف کرنے جا رہا تھا۔

شہلا بچھلی نشست کا دروازہ کھول کر بیٹھی۔ ہاشم نے گاڑی اشارت کی۔

”شہلا!“ دفعتا ”وہ بولا ”بیکس تمہارے ہینڈ بیگ میں ہیں نا؟“

”اوہ گاڈ!“ شہلا کو اپنے حافظے پر حیرت اور تاسف ہوا۔ ”یہ تو اور بے کمرے میں۔ میں ابھی لائی۔“

یہ گاڑی سے اتر کر تقریباً ”دوڑتی ہوئی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھتی ہوئی کمرے میں آئی۔

”کہاں۔ کہاں رکھے تھے۔“ اس نے ذہن پر زور ڈالا ”پتا نہیں ہاشم نے مجھے دیے بھی تھے یا پھر ان ہی کے بریف کیس میں ہوں۔“

شہلا نے کونے میں رکھا بریف کیس اٹھایا۔ وہ لاک تھا۔ شہلا کو ہاشم کے مخصوص نمبروں کا نظم تھا۔ دوسرے نمبر پر بریف کیس کھل گیا۔

اندر رکھا براؤن لفافہ اٹھا کر اس نے اندر رکھے کاغذات نکالے۔ پھر جیسے وہ گنگ ہو گئی تھی۔ بالکل ششدر!

وہ ذاتی درس پیر تھے بالکل تیار حالت میں ان پر صرف ہاشم کے دستخط کی ضرورت تھی۔

ہاشم نے اسے طلاق دینے کے لیے کاغذات بنوائے تھے شہلا کو درود پوار کھوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ نیچے ہاشم نے ہارن پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

یوسف نہ تھے مگر سربازار آگئے
خوش فہمیاں یہ تھیں کہ خریدار آگئے
آواز دے کے زندگی ہر بار چھپ گئی
ہم ایسے ساہ دل تھے کہ ہر بار آگئے
اب دل میں حوصلہ نہ سکت بازوؤں میں ہے
اب کے مقابلے پہ مرے یار آگئے

دانتوں سے لبوں کو کاٹتے ہوئے وہ گہری سوچ میں گم تھی۔ نرم و ملائم سفید بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے اور کبھی ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے اس کی نظروں کے سامنے سے گزرتے جاتے تھے لیکن دھیان کا بچھی ان سے نہیں دوسرے بہت دور محو پرواز تھا۔ اس کے برابر والی نشست پر ایقان کم و بیش اسی کے انداز میں دنیا و مافیہا سے بے خبر آنکھیں بند کیے گویا مراقبہ کر رہی تھی۔ اگلی کوٹنے والی نشست پر ہاشم بیٹھا اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شملہ نے ذرا کی ذرا ہاشم کو دیکھا اور ایک مرتبہ پھر اپنے لبوں کو چپکنے کی مشق شروع کر دی۔

ایک تیر تھا جو دل میں یوں پیوست ہوا تھا کہ نہ آرہا تھا نہ پار۔ جو کچھ نظروں نے دیکھا تھا اب دل کو ایک فسانہ معلوم ہوتا تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا۔ سوالیہ نشان قطار در قطار اس کے اندر اتر رہے تھے۔ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ اس تکرار کا جواب اس کے اپنے پاس نہ تھا جس کے پاس جواب تھا وہ ایک نشست کے فاصلے پر بیٹھا اخبار بنی میں مصروف تھا۔

زندگی کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اب کس جانب رواں دواں تھی؟ شملہ نے ایک نگاہ اپنے سفر پر ڈالی اسے احساس ہوا یہ محض اعتبار کا سفر تھا۔ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرنے کا سفر۔ اسے دکھ ہوا، ہر سفر کا انجام ایک سا کیوں تھا؟

وہ ابرار پر اعتبار کر کے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ ابرار کے لیے اس کے پاس محبت تھی، خلوص تھا، وفا تھی، انجام کار دکھ۔ بے اعتبار ہو جانے کا دکھ۔

ہاشم کے ساتھ سفر کی ابتدا کیا تھی؟ محض اعتبار۔ اس نے بالآخر اس کی خاموش محبت اور دل کو پھسوتے جذبوں پر اعتبار کر لیا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر ہر اندیشے کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کر کے چل پڑی تھی اور اس بار بھی سفر کا انجام مختلف نہ تھا۔

ہاشم کے بریف کیس میں رکھے ہوئے پیپرز کس جرم کی سزا تھے؟ شملہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کیا تھا اس نے؟

شملہ نے سوچنے کی کوشش کی۔ شاید۔ شاید کچھ جرم اس کے نامہ اعمال میں درج تھے۔ ہاں شاید اس کے تغافل برتنے کی ادا غلط تھی۔ شاید اظہار محبت محض سننا ہی کافی نہ تھا۔ اظہار محبت کی جرات بھی ضروری تھی۔ شاید۔ شاید لا شعوری طور پر وہ اس کی مہربانی سے بے مہری برت جاتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے نازک جذبوں کا ادراک کیے بنا سنگ دلی کا مظاہرہ بھی کر جاتی تھی لیکن یہ سب کچھ تو اس کے رویے کو زبردستی کا بخشا ہوا انعام تھا۔ یہ ادائے بے مہری و سنگدلی اس کا اپنا مزاج نہ تھی۔ یہ تو یادِ ماضی کا شاخسانہ تھی۔ ہاشم کو اس سے شکایت نہیں ہونا چاہیے تھی۔ ہاشم نے اسے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ زنگ آلود تالوں پر برہم ہونے سے کیا حاصل؟ وہ تو خود ایک ناقابلِ بیان الجھن و مشکل میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کسی مسیحا کے منتظر۔ کسی اسمِ اعظم کے تمنائی اور محبت سے بڑا اسمِ اعظم کیا ہے؟

ہاشم نے اس کی محبت پر اعتبار نہ کیا اسے کم از کم اپنے جذبوں کی چنگی پر تو یقین ہونا چاہیے تھا وہ اپنے ہی جذبوں کو رسوا کرنے کیوں چلا تھا؟

سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہونے لگا، رگیں کھینچنے لگیں، وہ نہایت بے بسی کے عالم میں ایقان کی طرح تڑھال ہو کر تھمرا زہ گئی۔

شامِ غم کی سحر میں ہوتی یا ہم ہی کو خبر نہیں ہوتی
ہم نے سب دکھ جہاں کے دیکھے ہیں بے کلی اس قدر نہیں ہوتی
دوستو! عشق ہے خطا لیکن کیا خطا درگزر نہیں ہوتی
ایک جاں سوزو نامراد خلش اس طرف ہے ادھر نہیں ہوتی

دل پیالہ نہیں گدائی کا عاشقی در بدر نہیں ہوتی
 ”دل۔۔۔“ پیالہ نہیں گدائی کا۔۔۔“
 ہاشم کے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ تہ شدہ اخبار آنکھوں پر رکھے وہ ایک ہاتھ کے فاصلے پر موجود
 نفس کے احساس کو خود پر کسی غلاف کی طرح لپٹا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

سنگ دل ہے وہ تو کیوں اس کا گلہ میں نے کیا
 جبکہ خود پتھر کو بت، بت کو خدا میں نے کیا!
 ”تصور دار اگر کوئی ہے تو وہ میرا دل ہے شہلا! تم ہر الزام سے بری ہو۔ تمہاری آمادگی کو میں محبت سمجھا۔ تو
 کیوں سمجھا؟ تمہاری رضامندی کو میں نے اپنے جذبوں کی سچائی جانا۔۔۔ کیوں جانا؟ تم سے شکایت کا کوئی حق
 میرے پاس نہیں ہے۔۔۔ تم نے مجھے اگر اپنی محبت تک پہنچنے کا راستہ بنایا تو کوئی بات نہیں۔ مجھے تم سے گلہ نہیں
 ہے۔۔۔ میرے سینے پر سر رکھ کر تم نے کسی اور کی دھڑکن کو سننا چاہا تو بھی کوئی بات نہیں۔ محبت میں نے بھی کی
 ہے۔ اس کی منہ زوری سے میری باتوں ہستی بھی واقف ہے شہلا! یہ بہت ایمان دار بھی ہوتی ہے۔ بہت
 بے ایمان بھی۔۔۔ تمہیں میری ذات کا رستہ چاہیے تو میں تمہیں یہ رستہ دوں گا۔ تم جہاں تک جانا چاہتی ہو، میں
 تمہیں پہنچاؤں گا۔ تمہارا اضطراب، تمہاری یہ پیمائش۔ کچھ کہنا چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ پانا۔ میری نظروں
 سے پوشیدہ نہیں ہے بس یہ کہ تھوڑا سا انتظار۔۔۔ تھوڑا سا صبر۔ ایک بار اور آخری بار میرے گھر کی خوشیوں میں
 شراکت داری کر لو پھر جیسا تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔ میری مٹھی میں تمہارا وجود نہیں ہے شہلا! صرف تمہاری
 آنچل کا ایک کونہ ہے۔ تمہارے آنکھوں کا اذن رخصت میری مٹھی کھول دے گا۔ میرا یقین رکھنا۔“
 اخبار کے کونے نے اس کی آنکھ کی نمی جذب کی تھی۔ جبار بازو پھیلائے چوپرواڑ تھا۔

سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی چھایا ہے
 اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے
 جو تم نے کہا ہے، فیض نے جو فرمایا ہے
 سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک نام وفا کا لیتے ہیں
 وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں
 ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے

جب دیکھ لیا ہم شخص یہاں ہر جانی ہے
 اس شہر سے دور اک کلیا ہم نے بنائی ہے
 اور اس کلیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے
 سب مایا ہے

آنکھیں موندے وہ اندر ہی اندر کہیں پکھل رہی تھی۔ کیا بچا تھا اس کے پاس؟ اک جھوٹی انا کا احساس تھا سو
 وہ بھی نہ رہا۔ کسی رزم کے شکست خوردہ سپاہی کی مانند جس نے آخری دم تک ہتھیار اٹھائے رکھے اور پھر ہر راستہ
 مسدود پا کر خود کشی کر لینا چاہی۔ بچ جانے کے باوجود جس کے پاس جینے کا کوئی اخلاقی جواز تک نہ ہو، ایقان خود کو ایسا
 بار اہوا سپاہی محسوس کر رہی تھی زندگی نے جسے خود تک پہنچنے نہ دیا اور موت جس سے کترا کر نکل گئی۔ بس سانس
 کی زنجیر پیر میں بیڑی کی مانند بڑی تھی۔

آہستہ کتنی خوش نصیب تھی اس کے بائیں جانب بیٹھی ہوئی شملہ جس پر زندگی ممتا کی مانند مہربان تھی جس کی ڈولتی ناؤ کو ہر بار محبت کا مہمان سہارا مل جاتا تھا جس کے سر پر تتی اعتماد کی چادر لمحہ بھر کو سرکھی تھی تو اگلے ہی پل یقین اور اعتبار کے رنگ پھر اسے گھیرے میں لے لیتے تھے۔

کتنا خوش قسمت تھا اس کے دائیں جانب بیٹھا ہوا ہاشم اس نے زندگی سے جو مانگا زندگی نے اس کی خاطر سنبھال رکھا اور پھر اس کی جھوٹی میں ڈال دیا۔

اور کتنی بد نصیب تھی وہ۔۔۔ سب کچھ پاکر بھی کچھ نہ پاسکی۔ رنگوں، خوشبوؤں، پھولوں کی شیدائی تھی وہ۔۔۔ اور اب سونا دل، خالی ہاتھ لیے نجانے کس رستے کی مسافر تھی۔

آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ ہار گئی تھی، وہ عاشر سے ہار گئی تھی وہ قسمت سے ہار گئی تھی، وہ خود سے ہار گئی تھی۔ اس نے اپنے سارے ہتھیار گرا دیے تھے۔ اس نے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جیسی بنائی گئی ہے اسے ویسا ہی رہنا ہے، اسے جتنی حد دی گئی ہے وہ بس وہاں تک ہی جاسکتی ہے۔ قسمت میں جو جیسا پیش آتا ہے اسے خندہ پیشانی سے قبول کرنا ہے۔

ہر کوئی شملہ جیسا نصیب لکھوا کر نہیں لاتا۔ ہر کوئی ہاشم جیسا پر خلوص اور قابل بھروسہ نہیں ہوتا۔ وہ شملہ نہیں ایقان تھی۔ عاشر ہاشم نہیں تھا۔ اس نے کیوں اس کی ذات میں ہر خوبی کو مجتمع دیکھنا چاہا تھا۔ جتنا پیار وہ ایقان کو دے سکتا تھا اس نے دیا تھا اس سے زیادہ اس کے بس میں نہیں تھا۔ ایقان نے کیوں اس سے زیادہ کی طلب کی؟ وہ تصویر دار تھی اس نے اسے انسان سمجھنے سے انکار کیا اسے فرشتہ سمجھنے اور فرشتوں کا سالوک پانے پر مصر رہی۔ رتی بھر جھٹلنے سے انکار کر کے وہ اسے اپنے سامنے گھٹنے نیک دینے پر مجبور کرتی رہی۔

نتیجہ وہی تھا جو ایسی کسی بھی سر پھری ضد کا ہوتا ہے۔ آج وہ تنہا تھی اس طور پر خود کو بیمار پر مردہ تصور کر رہی تھی۔ دوسرے اسے زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ زندگی کو خود سے بھاگتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

صلیب وقت پہ میں نے پکارا تھا محبت کو
مری آواز جس نے بھی سنی ہوگی ہنسنا ہوگا

منہ زہ بیگم اس طرح ہسپتال گئیں کہ پھر لوٹ کر گھر نہ آسکیں۔ انہیں ایڈمٹ کر لیا گیا تھا۔ عباد گھر لوٹا تو اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ وہ از حد پریشان معلوم ہوتا تھا۔ ربیعہ کادل اس کی صورت دیکھ کر دھک سے رہ گیا وہ اس کے پیچھے پیچھے گئی۔

”عباد بھائی۔“

عباد نے مڑ کر ربیعہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں گمراہ دکھ تھا۔

”ربیعہ! تیاری کرلو۔ تمہیں امی کے پاس ہاسپٹل جانا ہے۔ میں تمہیں ہی لینے آیا ہوں۔“ دکھ کے گہرے احساس سے اس کی آواز زو جھل ہو رہی تھی۔

”امی۔۔۔ امی کو کیا۔ کیا ہوا ہے عباد بھائی؟“ ربیعہ کو پوری دنیا اندھیر ہوتی محسوس ہوئی۔

عباد خاموش رہا پھر اس نے اپنی رستہ و آج اتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

ایک گلاس پانی لا دو۔ پلیز۔“ وہ اس کے سوال کا جواب دینے سے احتراز کر رہا تھا۔ ربیعہ دھڑکتے دل کے ساتھ پانی لینے چل دی۔

ایک مہمان سائبان تھا جس کے نیچے گزین تھی۔ ربیعہ کو نجانے کیوں اپنے سر سے وہ مہمان سایہ دور جاتا ہوا محسوس ہوا۔ پانی لے کر وہ واپس لوٹی تو عباد ایک ہاتھ سے سر تھامے بیٹھا تھا۔

”عباد بھائی۔ پانی۔“ وہ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد آہستگی سے بولی۔

عباد نے سر اٹھایا۔ ربیعہ بری طرح سے چونکی۔ عباد کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

”ربیعہ؟“ وہ بولا۔ ”وہی ہوا جس کا ٹھیک تھا۔ امی کو۔۔۔ بلڈ کیئر ہے۔۔۔ وہ۔۔۔ شاید۔۔۔ زیادہ عرصے تک نہ جی پائیں۔ ہماری امی ہم سے پچھڑ جائیں گی ربیعہ!“

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ ربیعہ کے ہاتھ سے گلاس پھوٹ گیا۔ وہ چند لمحے ساکت کھڑی عباد کو روٹا دیکھتی رہی پھر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا کر بیکھرتی چلی گئی۔

”کیوں فکر کرتی ہو؟“ وہ ربیعہ کو خود سے لپٹا کر اطمینان سے بولیں۔ ”میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک۔ کل ہم گھر چلیں گے۔“

ربیعہ نے بے بسی سے ان کے چہرے کی جانب دیکھا، وہ ان سے کیا کہتی؟ وہ ان سے کیا کہہ سکتی تھی؟

”اے کیا دکھ رہی ہو؟“ انہوں نے ربیعہ کے بال سمیٹ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ ”تم ایسی صورت بنا کر بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ مجھے تو تم مسکراتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ میری آنکھوں میں روشنی سی بھر جاتی ہے۔“

ربیعہ ایک ٹک انہیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک دو دنوں میں ہی بالکل ٹھیک سی گئی تھیں۔ ان کی رنگت پہلے بھی کملائی کملائی سی تھی لیکن آج ان کے چہرے پر مرونی کا تاثر اتنا واضح تھا کہ ربیعہ بالکل گم صم سی ہو گئی۔

”شہلا نہیں آئی؟“ وہ اداسی سے بولیں۔

”آئی اسلام آباد گئی ہیں، کل برسوں تک آجائیں گی۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”مٹی اداس کیوں ہو ربیعہ!“ وہ تھکے تھکے انداز میں پوچھنے لگیں۔ ”کیا میری وجہ سے پریشان ہو؟ مت ہو پریشان۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور۔۔۔ بہت خوش ہوں۔“

ربیعہ خاموش رہی، عباد بھی بالکل خاموش سا صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ انفقہ، ربیعہ کے آنے پر گھر چاچکی تھی۔ اسے بھی رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا تھا۔ کمرے میں ہلکی سی سرودی اور بو بھل پن تھا۔

”عباد!“ منیہہ بیگم بولیں۔

”جی امی۔۔۔“ وہ چونکا اور جلدی سے اٹھ کر ان کے قریب چلا آیا۔ ”کہیے۔“

”تم اب گھر جاؤ، آرام کرو۔“

”میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ کو چھوڑ کر کیس نہیں جاؤں گا۔“

”ماں کی بات نہیں مانو گے تو ماں خطہ ہو جائے گی۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔

عباد نے بے بسی سے ربیعہ کی طرف دیکھا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلا کر اسے جیسے جانے کا اذن دیا۔

”لیکن۔۔۔ یہاں خدا انخواستہ کوئی ضرورت۔۔۔“

”یہاں صرف مریض کی ضرورت ہوتی ہے، سو میں ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولیں۔ ”میرا خیال رکھنے کے لیے

ربیعہ ہے۔ تم اب جاؤ، آرام کرو۔ انفقہ کا خیال رکھنا۔“

عباد ناچار اٹھا تھا چند قدم چل کر وہ ربیعہ تک آیا۔

”ربیعہ! کوئی مسئلہ ہو تو فوراً۔۔۔“

”جی ٹھیک ہے۔ آپ کے سیل پر کال کروں گی۔“ وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بولی تھی۔

رات کا سناٹا گہرا تھا، اتنا گہرا کہ آپ ہی بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ کمرے میں خنکی کا احساس لحظہ بہ لحظہ بڑھنے لگا۔ سوتی ہوئی ربیعہ کو نجانے کس احساس نے جگایا تھا اس نے گردن گھما کر برابر کے پلنگ پر سوتی ہوئی منیہہ بیگم کو دیکھا پھر اس کی نظر کھڑکی کے بند شیشے پر پڑی۔ ان کا کمرہ دوسری منزل پر تھا اور کھڑکی کے شیشے سے پرے ہاسٹل کے لان کا سبزہ قریب کھڑے ہونے سے دکھائی پڑتا تھا۔ دور سے صرف اندھیرا ہی باہر فضا میں پھیلا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

ربیعہ نے کچھ غصہ کی گئی۔ وہ اپنے غصہ کی وجہ سے اس اندھیرے کو گھورتی رہی جیسے کوئی انجانا احساس وہاں دیکھنے پر مجبور کر رہا تھا پھر اس نے وہاں ایک ہیولہ نمودار ہوتا دیکھا اور ہولے نے آہستہ آہستہ دادی کا روپ اختیار کر لیا۔

”ربیعہ۔۔۔ ربیعہ۔۔۔“ وہ اسے پکار رہی تھیں۔

ربیعہ کو اپنی جگہ پر ان کی آواز ایسے سنائی دے رہی تھی جیسے وہ اس کے قریب ہی بول رہی ہوں۔

”دادی۔۔۔ دادی۔۔۔! آجائیں۔۔۔ اندر آجائیں۔۔۔“ ربیعہ نے انہیں پکارا۔

اتنے دنوں کے بعد وہ دادی کو دیکھ کر بہت خوش تھی۔ دادی خوش نہیں لگتی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں اداسی منجمد ہو چکی تھی۔ پریشان بالوں اور سوکھے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہ بیمار لگ رہی تھیں۔

”دادی۔۔۔! اندر آجائیں۔۔۔“ ربیعہ نے پھر انہیں پکارا۔

”وہ۔۔۔ وہ نہیں آئے دیتی۔“ انہوں نے اشارہ کیا۔

”کون؟“ ربیعہ نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا۔ ”کون؟“

”وہ۔۔۔ وہ جو بستر پر لیٹی ہے۔“

ربیعہ نے دیکھا بستر پر منیہ بیگم لیٹی تھیں۔

”یہ۔۔۔؟ یہ تو میری امی ہیں۔“ ربیعہ مسکرائی۔

”ہاں۔۔۔ وہ بولیں۔“ یہ مجھے اندر نہیں آئے دیتی۔ اس سے کہو ربیعہ! مجھے اندر آنے دے۔“ وہ لجاجت سے

بولیں۔ ”باہر سردی ہے اور مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔“

ربیعہ کو ان پر بہت ترس آیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کا جسم

پتھر کا ہو گیا ہے۔ وہ اٹھ نہ پائی۔

”ربیعہ۔۔۔! دادی اچانک ہی شیشے سے دور ہونے لگیں۔“ ربیعہ! مجھے روک لو۔ اس سے کہو مجھے اندر آنے

دے۔۔۔“ دادی۔۔۔“ ربیعہ نے ہاتھ بڑھا کر انہیں روکنا چاہا۔ ”رک جائیں۔۔۔“

”اس سے کہو ربیعہ۔۔۔! اس سے کہو۔۔۔“ وہ لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھیں۔

”امی۔۔۔ امی۔۔۔! ربیعہ نے بے ساختہ منیہ بیگم کو پکارا۔“ امی۔۔۔“

دادی اب دور ہوتے ہوئے پھر سے ایک ہیولے کا روپ اختیار کر چکی تھیں۔

”امی۔۔۔ امی۔۔۔!“

ایک نکتہ ربیعہ کی آنکھ کھل گئی وہ اپنی جگہ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا گلا خشک تھا اور تنفس بے حد تیز ہو رہا تھا۔

اس نے دیکھا، کمرے کا ماحول بالکل ویسا ہی تھا جیسا وہ چند لمحوں قبل اپنے خواب میں دیکھ رہی تھی۔ وہی اندھیرا،

وہی سناتا ویسی خشکی۔ اس نے کھڑکی کے شیشے کو دیکھا جس کے پار ہجور کے درخت ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس

نے برابر میں سوئی ہوئی منیہ بیگم کو دیکھا۔

پھر وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھی تھیں۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہ کھڑکی تک آئی اور باہر دیکھنے لگی۔ باہر

ڈراؤنا، کبیر سناتا تھا۔ ربیعہ نے آہستگی سے کھڑکی کھولی پھر لکھت ہی وہ بری طرح سے کپکپا گئی۔ باہر سے ہوا کا اتنا

سرد جھونکا اندر آیا تھا کہ ربیعہ کے ہاتھ سن ہو گئے۔ ہر چند کہ سردی نے ابھی پوری طرح سے اپنے قدم نہیں

جمائے تھے ربیعہ کو خوف محسوس ہوا۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کی اور پلٹ کر بمشکل اپنی جگہ تک آئی۔ اپنی

جگہ پر بیٹھ کر کمرے کے اوڑھ کر وہ کچھ سوچنے کی کوشش کرنے لگی۔

”وہ۔۔۔ وہ مجھے اندر نہیں آئے دیتی۔“ اسے وہ بات یاد آئی۔

ربیعہ نے حیران سوچتی ہوئی نظروں سے بستر پر لیٹی منیہ بیگم کو دیکھا جو پرسکون دواؤں کے زیر اثر بے خبر سو

رہی تھیں۔ ربیعہ اب تک کمرے میں ایک انجانا اثر محسوس کر رہی تھی۔ باقی کی رات ربیعہ نے یونہی بیٹھے بیٹھے

گزار دی تھی۔

باہر پھیلی ہوئی رات بہت خوبصورت تھی۔ اپنے کمرے کے میسر پر کھڑی شہلا نے بھورین کی ساری خوبصورتی اور دلکشی کو ایک ہی سانس میں اپنے اندر سمونا چاہا۔ نجانے زندگی میں پھر کبھی ایسی دلکش رات آتا پھر پور وقت میسر آتا بھی تھا یا نہیں۔

”تم ہوساتھ رات بھی حسین ہے۔ اب تو موت کا بھی غم نہیں ہے۔“
لٹاکی خوبصورت آواز نے پک لخت ہی جیسے ماحول کو مزید سحر انگیز کیا تھا۔ شہلا نے حیرانی سے مڑ کر دیکھا۔ شیشے کے دروازے کے پار بیٹھا ہاشم بیوی کے چھینل بدل رہا تھا۔ شہلا کافی دیر سے میسر پر کھڑی تھی۔ قریباً ”سورج کے ڈوبنے کے وقت سے۔ بھورین کی خوبصورتی سے اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ کبھی وہ طالب علمی کے زمانے میں کالج کی جانب سے آل پاکستان ٹور پر گئی تھی تب کالج کی دوستوں کے پورے ٹولے کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ تب وہ اور ایقان ہاتھوں میں ہاتھ دیے یہاں سڑکوں پر گھومتی پھری تھیں۔ مری، پٹوایہ، بھورین، تنھیا گلی۔ انہوں نے سب ہی کچھ ناپ چھوڑا تھا اور قصہ کیا تھا کہ وہ لوگ ہر سال نہ سہی تو چند ایک سال بعد ضرور یہاں آیا کریں گی اور اب کتنے سالوں بعد قسمت چند روز کے لیے یہاں لائی تھی، وہ بھی اس طرح کہ شہلا اکیلی میسر پر کھڑی بی بی کے خوبصورت لان کو ایک گہری اداسی کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور ایقان برابر کے کمرے میں لائسنس آف کیے بستر لیٹی نجانے کیا سوچے جاتی تھی۔

شہلا نے ایک بار پھر مڑ کر کمرے میں اکیلے بیٹھے ٹی وی دیکھتے ہاشم کو دیکھا، اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہاشم بھی اس کے پاس وہاں میسر پر چلا آئے۔ اسی التفات کے ساتھ جو اس نے شہلا کے لیے وابستہ کر رکھا تھا، وہ نرمی بھری محبت جو دھیرے دھیرے دل کے دروازے پر دستک دیتی تھی، آج نجانے کہاں گم تھی۔ وہ بولتی آنکھیں، وہ راز افشا کرتی مسکান، وہ سکون آمیز لمس۔ ہاشم نے اپنے سب ہی خزانے نجانے کہاں چھپا دیے تھے۔ ایک گہری خاموشی تھی جو اس نے خود پر طاری کر لی تھی۔
شہلا کو ایک مرتبہ پھر ڈائٹورس پیپر زیاد آئے۔ اس کی پٹکوں پر نمی چمکنے لگی۔ ہاشم نے ایسا کیوں سوچا؟ وہ کہہ کرنے جا رہا تھا؟ اس نے شہلا سے کچھ بھی کیوں نہیں کہا؟ اور۔ اور۔ وہ کس بات کا انتظار کر رہا تھا؟

”تم ہوساتھ رات بھی حسین ہے۔ اب تو موت کا بھی غم نہیں ہے۔“
ہاشم کی چھینل بدلتی انگلیاں ایک جگہ تھم گئیں۔ کتنا خوبصورت گیت تھا۔ محبت کا کیسا درد آشنا احساس تھا، چھینل بدلنا بھول گیا۔
کن اکھیوں سے اس نے باہر میسر پر کھڑی شہلا کو دیکھا جسے وہاں کھڑے کھڑے دو گھنٹوں سے زیادہ کا نام ہو چکا تھا۔

”کس سے بھاگ رہی ہو تم۔“ اس نے آزر دگی سے سوچا۔ ”جو خود تمہیں ہر غم، ہر فکر سے آزاد کرنے کی ٹھان چکا ہے۔ شہلا! کیوں اتنی دیر کی تم نے؟ کیوں اتنا جبر کیا خود پر۔ مجھ سے پہلے دن ہی آزادی مانگ لیتیں۔ میری زندگی کی پہلی اور آخری رات تمہارے ساتھ گزار کر بھی شیادان رمتا کہ محبت میں اتنا کام آنا فرض ہے اہل دل پر۔ اگر ابراہیم سب کچھ نہ بتاتا تو میں ساری عمر تمہارے شہر اور تمہاری بے مری کو سہا کر بھی سمجھ نہ سمجھ پاتا۔ نہ جان پاتا کہ تم نے میرا ساتھ کیوں قبول کیا۔ اپنا نام میرے نام سے وابستہ کیوں کیا۔ میں نہ جان پاتا شہلا! کبھی نہ جان پاتا لیکن اب میں تمہیں یہی راہ چلنے رہنے پر مجبور نہیں کروں گا۔ رستہ بدلنا چاہتی ہو، میں تمہیں دو سرارتیں دوں گا لیکن یہ بے مری، یہ بے گانگی، یہ اجنبیت۔ کچھ دن تو میری بن کر جو، کچھ دیر کو تو پاس آؤ۔ چند لمحے تو ساتھ گزارو۔“

”کچھ دن تو بسو میری آنکھوں میں پھر خواب اگر ہو جاؤ تو کیا۔“
اس کی آنکھوں میں سرفنی اتر آئی۔ ٹی وی پر نشر ہوتے اداس گیت دل کا درد مزید بڑھا رہے تھے۔ چند قدموں

ڈاکٹر منیرہ بیگم کا چیک اپ کر رہے تھے۔ انیقہ بھی وہاں موجود تھی۔

ربیعہ کمرے سے باہر نکل آئی اس کا دل بے طرح اداس ہو رہا تھا۔ آنے والے سرما کی شامیں ابھی سے یاسیت اور احساسِ خشکی سے بھری ہوئی تھیں۔

آہستہ آہستہ کارڈیور میں چلتے ہوئے وہ یکایک رکی۔ سامنے سے آتی، دوئی خواتین آشنا تھیں۔ ربیعہ بیگم غمگین اور پروردہ آری تھیں۔ ربیعہ نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔ اب کیسی ہیں منیذہ بہن!“ رابعہ بیگم نے پوچھا۔

ربیعہ سے اس سوال کا جواب نہ دیا جاسکا اس کی آنکھوں میں پیانی بھر گیا۔

”آئیے نا آپ لوگ۔۔۔“ وہ انہیں لے کر کمرے کی جانب بڑھی۔

ڈاکٹر زبا ہر نگل رہے تھے۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئیں تو گم صم سی منیوہ بیگم قدرے سنبھل گئیں۔ سلام دعا کے مراحل سے گزر کر وہ لوگ ان کی خدمت دریافت کرنے لگیں۔ منیوہ بیگم اپنی اصل بیماری سے آگاہ نہ تھیں۔ وہ انہیں اپنی تکالیف کے متعلق بتانے لگیں۔

ربیعہ گال پیلے ہی پشمرہ اور او اس تھا، وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آگئی۔ چند لمحوں بعد ورنہ بھی باہر نکل آئی۔
ربیعہ کمرے کے سامنے بنی بڑی سی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، جہاں سے ہسپتال کا لان نظر آتا تھا۔ ورنہ اپنی
جگہ ٹھنک کر رُک گئی۔ ایک ہاتھ دیوار پر دھرے وہ ربیعہ کو دیکھنے لگی۔ زرد رنگ لباس پر سفید دوپٹہ پہنے جس کے
کناروں پر نہایت نفیس کروشیا بنوا تھا۔ ربیعہ بے حد کم عمر اور معصوم نظر آ رہی تھی۔ سیاہ آنکھیں دور سے بھی
نم اور او اس معلوم ہوتی تھیں۔ گلابی لب ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ اس کی پشت پر بڑی سیاہ چوٹی اس کی
شخصیت کی شش میں بے پناہ اضافہ کر رہی تھی۔ ورنہ اس کے قریب پہنچ کر کھنکھاری تو وہ چونک اٹھی۔
”ارے ورنہ!“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ باہر کیوں چلی آئیں تم؟“
”بس یونہی۔“ وہ بھی دھیرے سے مسکرائی۔ ”تم کیوں چلی آئیں باہر؟“

ربیعہ نے گہری سانس بھر کر سر جھکا لیا۔

”آپنی ضرورت ٹھیک ہو جائیں گی۔“ وردہ نے اسے تسلی دی۔

”ہاں ان شاء اللہ۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

دونوں دھیرے دھیرے کاریڈور میں چلنے لگیں۔

”اور تم سناؤ۔ یونیورسٹی جا رہی ہو؟“ ربیعہ نے یوچھا۔

”ہاں لیکن تمہارے بغیر مزہ نہیں آتا۔“

”میں اب یونیورسٹی نہیں جاسکتی۔“ ربیعہ بولی۔ ”میں امی کو اس طرح چھوڑ کر ایک پل کے لیے بھی کہیں نہیں جاسکتی۔“

وردہ نے گردن موڑ کر اس کا چہرہ قدرے دھیان سے دیکھا۔

”تم بہت اچھی ہو رہے ہو۔“

”اور تم سناؤ۔۔۔“ ربیعہ نے موضوع بدلا۔ ”شادی کی تاریخاں کہاں تک پہنچیں؟“

”اگلے ہفتے ناعمہ ثانیہ اور عریشہ نیول کے ساتھ ماہوں بیٹھ رہی ہیں۔“ وہ ہنسی۔ ”بس یوں سمجھو، ہم خود کو بھول جائیں گے۔ اتنا ہنگامہ مچا ہوا ہوگا۔ تم ضرور آنا رہیجے!“

”میں۔۔۔“ رابعہ دھیرے سے بولی۔ ”میں کہاں آیاؤں گی ورنہ! تم ہاسٹڈ مت کرنا لیکن میں نہیں آسکتی۔“

”کسی ایک فنکشن میں تو پلینز“ وروہ نے اصرار کیا۔

”تمہاری شادی میں آؤں گی، ضرور۔“ ربیعہ مسکرائی۔
 ورہہ ایک نکتہ ہی خاموش ہو گئی۔ دونوں کاریڈور کے کونے پر پہنچ کر رُک گئی تھیں۔ ”میری مانو تو تم بھی ان تینوں کے ساتھ ہی مایوں بیٹھ جاؤ۔“ ربیعہ دل پر دھرا بوجھ لٹا کرنے کے لیے ہلکے ہلکے انداز میں بولی۔ ”سب لڑکیاں خیریت سے منت چاہیں گی۔“ ورہہ قدرے تلخی سے مسکرائی تھی۔
 ”میرا ہی الوقت تو ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“

”کیوں؟“ ربیعہ کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔
 ”بس۔۔۔ ربیعہ میں۔۔۔ میں شاید۔۔۔“ ورہہ نے انک انک کر کچھ کہنا چاہا۔
 ربیعہ اسے حیرانی سے دیکھتی رہی۔

”میں شاید۔۔۔ رافع سے شادی نہ کیاؤں۔“ وہ بالآخر بولی تھی۔

”ورہہ!؟“ ربیعہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”لیکن کیوں کیا برائی ہے رافع میں؟“

”بس۔۔۔ دل۔۔۔ دل آمادہ نہیں ہوتا۔“ ورہہ نے اختیار اپنی انگلیاں اضطرابی انداز میں مروڑنے لگی۔

ربیعہ نے آنکھیں پھیل کر اسے دیکھا وہ چند لمحے کچھ بھی بولنے کے قابل نہ رہی۔

”ربیعہ! میں اتنے عرصے سے دل کو یہی سمجھانے کی کوشش کرتی رہی کہ ہمارے بزرگوں نے ہمارے لیے جو فیصلہ کر دیا، ہمیں اسی کو قبول کر لینا چاہیے۔ خوش دلی سے یا بے دلی سے۔ بڑوں کی سوچ ہماری سوچ سے کہیں آگے ہوتی ہے۔ ایسی بہت سی باتیں میں سوچتی رہی ربیعہ! خود کو دہلاتی رہی لیکن آج میں اس نیچے پر پہنچی ہوں کہ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے کا اختیار انسان کے اپنے پاس ہونا چاہیے۔“

ربیعہ حیرانی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔

”لیکن ورہہ! تمہاری امی۔۔۔“

”امی نے یہ اختیار خود مجھے دیا ہے۔ اس منگنی کو رکھنے کا یا۔۔۔ نہ رکھنے کا۔۔۔“

”تمہیں۔۔۔ تمہیں رافع سے۔۔۔ کوئی شکایت۔۔۔“ ربیعہ کے الفاظ اس کے گلے میں پھنس گئے۔

”نہیں۔“ وہ فوراً ”بولی تھی۔“ میں صرف اپنی بات کر رہی ہوں۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔ ایسی بات نہیں ہے ربیعہ! کہ رافع میں کوئی برائی ہے، وہ بہت اچھا انسان ہے۔ سو ف، ویل مینرڈ، عزت کرنے والا۔ لیکن دل کبھی کبھی بہت منفرد احساس مانگتا ہے۔ میرے لیے رافع کے پاس کچھ بھی منفرد نہیں ہے۔“

ربیعہ کو احساس ہوا کہ وہ ورہہ کی باتوں سے ایک ناقابل بیان دکھ میں مبتلا ہو رہی ہے۔

”ہو سکتا ہے رافع کو میرے فیصلے سے دکھ ہو۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی لیکن اس سلسلے میں، میں خود کو بے بس یا رہی ہوں۔ میں رافع کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اسے کوئی بہت ہی اچھی پیاری، سلجھی ہوئی لڑکی مل جائے جو رافع کو محبت اور وفادارے اور رافع اسے پورا اعتماد اور خلوص دے سکے۔ ایسی لڑکی۔۔۔ ربیعہ!“

ربیعہ نے چونک کر ورہہ کو دیکھا۔

”ربیعہ تم۔۔۔ تم شادی کر لو تا رافع سے!“

”ورہہ! یا گل ہوئی ہو۔“ ربیعہ خفا ہوئی۔

”میں نے کہا تھا، وہ بہت اچھا انسان ہے، وہ تمہیں زندگی کی ہر خوشی دے سکتا ہے۔ بولو ربیعہ! کیا میں اس سلسلے میں شملہ آئی سے بات کروں؟“

ربیعہ خاموش ہوئی، کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے نظر اٹھا کر ورہہ کو دیکھا۔

”نہیں ورہہ! یہ ممکن نہیں ہے۔“

”کیوں؟“ وہ جیسے حیرت سے چیخی۔ ”کیوں ممکن نہیں ہے؟“

”کیونکہ میں کسی کو یہ اقرار دے چکی ہوں۔۔۔“ ربیعہ سر جھکا کر آہستگی سے بولی۔
 ”ورہ حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
 ”پوچھ سکتی ہوں وہ خوش نصیب کون ہے؟“ کچھ دیر بعد وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔
 ”امیر حسن۔ عباد بھائی کا بزنس پارٹنر۔“
 ”ورہ چند لمحے دانتوں سے لب کاٹتی رہی۔

”ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا ربیعہ!“ وہ مایوسی سے بولی۔
 ”ورہ!“ ربیعہ نے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”زندگی کی عمارت کبھی بھی جذبات کے ستونوں پر قائم نہیں کی جاتی۔ تدبیر، معاملہ فہمی، دوراندیشی، بنیادوں میں ان سب کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تم جو کچھ بھی سوچ رہی ہو، محض جذبات کے دھارے میں بہہ کر سوچ رہی ہو۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس فیصلے میں جذبات کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم بھی یہ فیصلہ تدبیر اور دوراندیشی کے سہارے کرو۔ تم نے ابھی بالکل ٹھیک کہا کہ رافع کسی بھی لڑکی کو زندگی کی ہر خوشی دے سکتا ہے۔ وہ لڑکی کسی اور کو نہیں، تمہیں ہونا ہے ورنہ صرف تمہیں۔“

اس نے اپنے ہاتھوں میں موجود ورنہ کے ہاتھ کو سرد تر اور بے جان سا ہوتا ہوا محسوس کیا پھر اسے تھپتھپا کر چھوڑ دیا۔

”او، کمرے میں چلیں۔ سب لوگ کہیں گے کہ ہم دونوں نجانے کہاں چلے گئے۔“ وہ دونوں کمرے کی جانب مڑ گئیں اور آہستہ آہستہ کاریڈور کے کونے سے دور ہونے لگیں۔ تب بہت آہستگی سے رافع وہاں سے آگے بڑھا تھا۔ اس نے کونے پر نمودار ہو کر دور جاتی ربیعہ اور ورنہ کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی اور دکھ تھا۔ وہ خود کو بے تحاشا تھکا ہوا اور تڑھال محسوس کر رہا تھا۔

ورہ اور ربیعہ کمرے میں داخل ہو کر اس کی نگاہوں سے او جھل ہو گئیں تو وہ بے جان ہوتے قدموں سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔



ہسپتال کے لان میں ایک دور افتادہ کونے میں بنی سنگی بیچ پر بیٹھ کر اس نے خود کو بہت تنہا، اداس اور اُدھورا محسوس کیا۔ اتنا ٹوٹا ہوا اور اس قدر پر مرمضہ۔ اس نے خود کو بھی پایا ہوا۔ اسے یاد نہ تھا۔

وہ صرف منہ زہ بیگم کی مزاج پر سی کے لیے وہاں آیا تھا، اس میں اس کی کسی اور چاہ یا تمنا کا دخل نہ تھا۔ لیکن یہاں آکر دل نے کیسا بوجھ سہا تھا، وہی جانتا تھا۔

”میں۔۔۔ میں شاید رافع سے شادی نہ کیاؤں۔“ ورنہ نے کہا تھا۔

”بس۔۔۔ دل آمادہ نہیں ہوتا۔“

”میں نہیں سمجھتی کہ میں رافع کے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں۔“

”میرے لیے رافع کے پاس کچھ بھی منفرد نہیں ہے۔“

”یہ ممکن نہیں ہے۔ میں یہ اقرار کسی اور کو دے چکی ہوں۔“ یہ ربیعہ کی آواز تھی۔

”زندگی کی عمارت کبھی بھی جذبات کے ستونوں پر قائم نہیں کی جاتی۔“

”وہ لڑکی۔۔۔ کسی اور کو نہیں۔ تمہیں ہونا چاہیے ورنہ۔“

رافع نے اپنا سر بیچ کی پشت سے ٹکرا کر آسمان کی وسعتوں کو کھوجنے لگا۔ کتنا حقیر، کتنا بے مایہ تھا اس لمحے اس کا وجود جسے کوئی بھی اپنانے کو تیار نہ تھا۔

اس نے لان میں چلتے پھرتے لوگوں کو دیکھا۔ پودوں کو۔ پھولوں کو۔ سنگی بیچوں کو۔ فوارے کو۔ سبز گھاس کو۔ اس نے ہر شے کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا جیسے وہ سب اس کا بھید جانتے تھے جیسے وہ سب اسی پر مسکرا

رہے تھے۔ اس پر طعنہ زن تھے۔ رافع کا جی چاہا کہ وہ ساری دنیا سے اپنا چہرہ چھپا لے۔

گہری سانس بھر کر وہ سیدھا ہوا۔ تب اس نے دور روش پر عباد اور امیر حسن کو اندر کی جانب جاتے ہوئے دیکھا۔ لمحہ بھر میں وہ رخ موڑ گیا تھا۔ فی الوقت کسی کا سامنا کرنے کو جی آمادہ نہ تھا۔ جیب میں اپنی گاڑی کی چابی کی موجودگی کا یقین کرتے ہوئے وہ پارکنگ کی سمت بڑھنے لگا تھا۔

پی سی بھورن کے سرسبز و شاداب لان میں بیٹھی وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ نرم دھوپ اس کے پیروں سے ذرا پرے گلاب کی کیا ریوں پر دمک رہی تھی۔ ایقان کی نظریں اس جگہ پر جم گئیں۔ کئی سال پہلے اسی جگہ بیٹھ کر اس نے کتنے شوق سے تصویریں بنوائی تھیں۔ وہ تصویریں اب تک اس نے سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔

ایقان کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے۔ دل میں ایک ہوک اٹھی تھی جس نے سوئے ہوئے ہر جذبے کو جگا دیا تھا۔ خوابیدہ جذبے کسمسائے لگے تھے۔ اس کا جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رودے۔ قدم قدم پر بھری ہوئی یادیں اپنا آپ منوانے لگی تھیں۔

اچانک ہی سیاہ اسٹریپ والی چیلوں میں قید و نہایت گورے، حسین پیر اس کے قریب آکر رکے تھے۔ ایقان نے ذرا کی ذرا سر اٹھایا۔ وہ جو کوئی بھی تھی بے حد حسین تھی۔ چہرے مہرے سے وہ فارز لگتی تھی۔ ایقان اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ بھی بے حد غور سے ایقان کا نقش نقش دیکھ رہی تھی۔

”یس؟“ چند لمحوں بعد ایقان حیرانی سے بولی۔
”میں اگر غلطی پر نہیں ہوں تو تم ایقان ہو۔“ وہ انگریزی میں بولی۔

ایقان نے نہایت حیرت سے اثبات میں سر ہلایا۔
”میں کچھ دیر یہاں تمہارے پاس بیٹھ سکتی ہوں۔“ وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔
ایقان نے پھر سر ہلایا، وہ محتاط سے انداز میں اس کے قریب بیٹھی۔

”آپ مجھے کیسے جانتی ہیں؟“ ایقان نے پوچھا۔
”یہاں کس کے ساتھ آئی ہوئی ہو؟“ اس نے ایقان کا سوال نظر انداز کر دیا۔

”میں اپنے نتیجے اور اس کی بیوی کے ساتھ۔۔۔ اس کی بیوی میری بہت اچھی دوست بھی ہے۔“
ایقان نے اپنے سوال سے اس کا احتراز واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

”یہاں تو اپنے شوہر کے ساتھ آنا چاہیے۔“ وہ مسکرائی۔
اس کی مسکراہٹ میں ایک واضح اداسی تھی جس نے اس کی پلکوں کو بھی غم کر دیا۔ ایقان لمحہ بھر کے لیے خاموش سی ہو گئی۔

”وہ پاکستان میں نہیں ہوتے۔“ پھر وہ آہستگی سے بولی۔
”پاکستان میں نہیں ہوتے؟“ اس فارز لڑکی کو حیرت ہوئی۔ ”پھر یہ پھر کہاں ہیں وہ؟“

”وہ۔۔۔ ایقان لمحہ بھر کو رکی۔“ جاپان میں۔“
”نہیں۔“ وہ بے اختیار بولی تھی۔ ”وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔“
ایقان بے طرح چوکی۔ بے یقینی سے وہ اس فارز لڑکی کو گھورنے لگی۔

”تم۔۔۔ تم جانتی ہو میرے شوہر کو؟“
”یس۔۔۔ آف کورس۔ بہت اچھی طرح سے۔۔۔ اسی لیے تو میں تمہیں جانتی ہوں۔“
”تم کون ہو؟“

”اگر تم۔۔۔“ وہ دھیرے سے مسکرائی۔

”لڑتھ؟“ ایقان نے دہرایا۔ ”لیکن عاشق سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“
 ”ایک کو لگ کا ایک اچھے دوست کا اور یکطرفہ محبت کا۔ میں اس سے محبت بھی کرتی تھی۔“
 ایقان کے وجود کو ایک جھکا لگا۔
 ”لڑا؟“ بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ ”تم۔۔۔ تم لڑا ہونا؟“
 ”ہاں میں لڑا ہوں۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

ایقان کے ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ اس کا جی چاہا تمام اخلاقیات بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ اس منحوس عورت کا گریبان پکڑ لے اور طمانچہ مار مار کر اس کا چہرہ لال کر دے۔ یہی عورت اس کی بربادی کا سبب تھی۔ اس کی زندگی کی تمام تر خوشیاں دکھ میں بدل دینے میں اس عورت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے نفرت کی شدت سے اپنے جسم میں جھٹکے لگتے محسوس کیے۔
 ”لڑا۔۔۔“ کسی مرو کی بھاری آواز بے حد قریب سے آئی تھی۔ ”لڑاؤ ار لنگ۔“
 لڑا چونک کر مڑی۔ ایقان نے بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آنے والے کو دیکھا، وہ چہرے مہرے سے پاکستانی ہی لگتا تھا۔

”مائی بسینٹل۔۔۔ منیر۔۔۔ اور منیر۔۔۔ ایقان ہیں۔ میرے بہت اچھے کو لگ عاشق کی وائف۔“
 لڑا، ایقان کے جذبات سے بے خبران دونوں کا تعارف کروا رہی تھی۔ منیر صاحب شائستگی سے سر ہلا رہے تھے۔
 ”ہائس ٹو میٹ یو مسز عاشق۔۔۔ پھر وہ اسی رسمی و شائستہ مسکراہٹ کے درمیان بولے۔ ایقان نے بمشکل ذرا سا سر ہلایا تھا۔

”ڈار لنگ۔۔۔ لنگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟“ وہ لڑا سے مخاطب تھے۔
 ”سوری منیر! میں نے ناشتہ کافی ہیوی کیا ہے۔ اب میں شام تک کچھ نہیں کھاؤں گی۔ آپ لنگ لینا چاہیں تو میں یہاں مسز عاشق سے گپ شپ لگا لوں؟“ لڑا نے مسکراتے ہوئے اجازت چاہی۔
 ”اوکے ڈیر۔۔۔ ایریووش۔۔۔ پھر ہم اپنے روم میں ملتے ہیں۔“
 ”اوکے۔“ لڑا نے جلدی سے ہاتھ ہلا دیا۔

ایقان کا ذہن ان کی گفتگو کی جانب ذرا بھی نہیں تھا۔ وہ تو مسلسل عاشق کے متعلق سوچے جا رہی تھی۔ عاشق نے اس سے کہا تھا کہ وہ چند ہی روز میں لڑا سے شادی کر رہا ہے۔ اس کے بعد اس نے کبھی ایقان سے رابطہ نہ کیا پھر اس نے ایقان کو ایک خط پر رقم بھیج دی اور اس کے بعد سے اس کا کچھ اتنا پتا نہ تھا۔ یہاں لڑا کسی اور کے ساتھ موجود تھی اور اسے اپنا شوہر بتاتی تھی۔ سب نے معاملہ کیا تھا۔ ایقان کا ذہن ایک جگہ پزل میں الجھا ہوا تھا۔
 ”یہ۔۔۔ یہ تمہارا شوہر ہے؟“ منیر کے جانے کے بعد اس نے جلدی سے پوچھا۔

”یقیناً۔۔۔ میں نے ابھی بتایا ہے تمہیں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”شاید تم یہ نہ جانتی ہو مسز عاشق! کہ میں نے عاشق کو پروپوز کیا تھا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتی تھی، میں محبت کرنے لگی تھی اس نے تم اس کی بیوی ہو، سمجھ سکتی ہو گی کہ کوئی بھی عورت جو عاشق جیسے مرو کی قوت میں رہے، وہ اسے چاہنے لگے گی۔ وہ نہ صرف ہینڈ سم بلکہ بہت پیارا انسان ہے۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟“

ایقان سے کچھ بھی نہ بولا جاسکا۔ نہ اس نے لڑا کا گریبان پکڑا، نہ اس پر تھپڑوں کی بارش کی نہ مغلظات بکس۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔ اتنا کہ تھا کہ عاشق کا ذرا روہ بھی ایسے الفاظ میں سن کر اس کا دل سینے میں یوں ترسے لگا تھا جیسے کسی نے اس پر چھری چلا دی ہو۔ عاشق کے پناہ محبت جو خون میں حل شدہ تھی جیسے ہر گرجاں سے چھن کر کاٹھن دل میں جمع ہو رہی تھی۔
 ”پھر۔۔۔ تم نے مسٹر منیر سے کیوں شادی کر لی؟“ دھواں دھواں لہجے میں وہ اتنا ہی پوچھ سکی۔

”کیونکہ عاشر کے انکار سے میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ میں اسی جیسا مڑچا ہتی تھی۔ اتنا ہی مکمل اتنا ہی پیارا اتنا ہی ناکس۔“

”عاشر کے۔۔۔ انکار۔۔۔“ ایقان بس حیرت سے بدبدا کر رہ گئی۔
 ”پھر میں نے طے کیا تھا کہ اگر کبھی شادی کی تو کسی پاکستانی مرد سے کروں گی، کسی مسلمان سے۔ میں نے محسوس کیا تھا ایقان! کہ عاشر میں جتنی بھی خوبیاں تھیں جو کہ مجھے اٹریکٹ کرتی تھیں، وہ اس کے مذہب نے عطا کی تھیں۔ تمہارا مذہب بہت عمدہ ہے ایقان! میں۔۔۔ میں پچھلے چند ماہ سے یہاں پاکستان میں ہوں۔ منیر کی جاب امریکہ میں ہے۔ وہ ایک کانٹریکٹ کے سلسلے میں جاپان آئے تھے جہاں ہماری ملاقات ہوئی اور ہم نے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ تب سے ہم چھٹیاں لے کر پاکستان آئے ہوئے ہیں۔ یہاں آکر میں نے تمہاری مشرقی روایات کو بہت قریب سے دیکھا اور جانا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ میں اگلے چند دنوں میں اسلام قبول کر لوں۔ میرا دل۔۔۔ میرا دل مسلمان ہو چکا ہے۔ بس اقرار کی دیر ہے اور میں لڑا سے۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

ایقان اس کی بات مکمل ہونے کے خیال سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔
 ”لڑا سے۔۔۔ ایقان بن جاؤں گی۔“ اس نے مسکرا کر اور قدرے جھینپ کر اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

”میں نے اپنا اسلامی نام بھی سوچا ہے۔“
 دونوں کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئیں پھر لڑا نے اسے دیکھ کر جھککتے ہوئے کہا۔
 ”عاشر کہاں ہے؟ کیا اب وہ پاکستان میں ہے؟“

ایقان نے کھوئی کھوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور خاموش رہی۔
 ”میں نے اسے پروپوز کیا تو اس نے انکار کیا جس سے میرے دل کو بہت خفیس پہنچی۔“ لڑا بتانے لگی۔ ”میں نے غصے میں اسے نجانے کیا کچھ کہہ دیا، وہ ناراض ہو گیا پھر اس کے بعد کبھی مجھ سے نہیں ملا۔ اس نے جاپان جا کر اپنی جاب تبدیل کر لی۔ ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ میں نے اسے کئی بار دوستی کا پیغام بھیجا لیکن اس نے جواب نہیں دیا پھر نجانے وقت کی دھند میں وہ کہاں گم ہو گیا۔“

لڑا کی نگاہیں بھور بن کی پھاڑیوں پر چمکتی دھوپ دیکھنے لگیں۔
 ”ایک۔۔۔ بات پوچھوں لڑا۔؟“ ایقان نے ٹوٹتے لہجے میں جھککتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں ضرور، مجھے خوشی ہوگی۔ یوں بھی میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم مجھ سے ناراض ہو۔“
 ”تمہارے اور عاشر کے مابین کس قسم کے تعلقات رہے تھے؟“
 لڑا کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ وہ کچھ دیر ایقان کو دیکھتی رہی۔

”میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا ایقان! کہ مجھے تمہارے شوہر کی جس خوبی نے اٹریکٹ کیا، وہ اسے تمہارے مذہب نے دی۔ وہ یہی خوبی تھی، یہی بات جو تم مجھ سے جانا چاہتی ہو۔ میں اس کے پاس جاتی تھی اسے اپنی قربت کی رانچ سے پھلانے کی کوشش کرتی تھی۔ اپنے جلوؤں کی بھرپور داد اس کی بے بسی اور بے پارگی سے وصول کرنا چاہتی تھی لیکن ایقان! انجانے یہ تمہاری محبت تھی یا اس کا ایمان۔۔۔ وہ پھلتے پھلتے بھی سنبھل جاتا تھا جیسے۔۔۔ جیسے اس کے اندر بیٹھا کوئی فرشتہ عین وقت پر اس کے منہ پر طماچہ پہنچ جاتا ہو۔ وہ یوں ہی چونکتا تھا یوں ہی ہڑبڑاتا تھا۔ اس کی مدھوشی اچانک ہی ہوش مندی میں بدل جایا کرتی تھی۔ وہ بے بس ہوتے ہوتے پھر سے توانائی حاصل کر لیتا تھا۔ تمہاری محبت سے یا اپنے ایمان سے۔ یہ دونوں باتیں اخلاقی ہیں اور یہ اخلاقیات تمہارا مذہب سکھاتا ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔

”اس لیے میں نے سوچا تھا کہ جب بھی شادی کی۔۔۔ کسی مسلمان مرد سے کروں گی اور اگر وہ پاکستانی بھی ہو تو کیا کہنے۔ خدانے میری دونوں آرزو میں پوری کر دیں۔“ وہ مسکرائی۔
 ایقان کو اس کی مسکراہٹ بھور بن کی چمکتی دھوپ سے زیادہ خوبصورت محسوس ہوئی۔ وہ اتنی خوبصورت تھی

کہ ایقان کو خود پر یک وقت رشک بھی آیا اور خود سے نفرت کی محسوس ہوئی۔
”تم نے مجھے کیسے پہچانا تھا؟“ اب وہ قدرے دوستانہ سے انداز میں بولی۔

”عاشق اپنے والٹ میں تمہاری اور اپنے بچوں کی تصویر رکھتا تھا۔ ست صاف گوئی سے بتا دوں کہ تمہارے بچے مجھے بالکل یاد نہیں لیکن تمہارا نقش میرے حافظے میں محفوظ رہ گیا۔ ویسے کیا اب میں پوچھ سکتی ہوں کہ عاشق کہاں ہے؟“

”عاشق؟“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”میں پاکستان میں ہیں۔“

”کیا کر رہا ہے آج کل؟“

”مجھے اور بچوں کو یاد کر رہا ہے۔“

”اسے یہاں کیوں نہیں لائیں؟“ تراخیرانی سے بولی۔

”گلملہ لے کر آؤں گی۔“ وہ مسکرائی۔

سوٹ کیس کو لاک کر کے اس نے سر اٹھایا۔ شہلا اس کے بالکل قریب کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں دکھ اور بے اعتباری تھی۔ ہاشم جبر سنا ہو کر کھڑا ہو گیا۔
”ایقان پھپھو اب تک نہیں آئیں۔“

”بس آتی ہی ہوگی۔“

”سلام آباد پینشنے میں بھی دو گھنٹے لگ جائیں گے۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”اب ہمیں نکلنا چاہیے۔ کمپنی کا ڈرائیور بھی صبح سے گاڑی لے کر آیا ہوا ہے وہ ہمارا انتظار ہے۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں۔“ وہ شاکی سے انداز میں بولی۔ ”میں اور میرا ہینڈ بیگ تیار ہے۔“
اسی وقت نبل ہوئی تھی۔ ہاشم نے بروہہ کر دروازہ کھولا۔ باہر ایقان کھڑی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔
ہاشم نے غور سے ایقان کا چہرہ دیکھا۔

”چلیں؟“ وہ شامان سی بولی۔

ہاشم کے ابو حیرت سے تن گئے۔ ایقان کے گزشتہ سارے انداز غائب ہو چکے تھے۔ وہ بالکل پہلے والی ایقان نظر آتی تھی۔

”آپ تیار ہیں۔“

”ہاں۔ بالکل۔ میرا بیگ بھی تیار ہے۔“ وہ مسکرا دی۔ ”کیوں بھی شہلا! مختصر سا ہنی مون کیسا گزرا۔ دیکھو، میں نے تم لوگوں کو بالکل بھی دسترب نہیں کیا۔ گواہ رہنا، کہیں جا کر سب سے کہو۔ پھپھو نے رنگ میا بھنگ ڈالا۔ کباب میں ہڈی بنی رہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔“

ہاشم نے بے اختیار شہلا کو اور شہلا نے بے اختیار ہی ہاشم کو دیکھا تھا۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرت کے سمندر تھے۔

”میں اپنا بیگ لے آؤں پھر نیچے چلتے ہیں۔ میرا انتظار کرنا۔“ وہ ان کی حیرانی سے قطع نظر مسکراتی ہوئی مڑ گئی۔
”یہ تو۔ بالکل تبدیل ہو گئیں؟“ ہاشم کے بنانا رہ سکا۔ ”رافع ٹھیک کہتا تھا۔“ شہلا نے جواب نہ دیا۔ اس کا ذہن ایقان کے جملے میں الجھا ہوا تھا۔ ”ہنی مون کیسا گزرا؟“ ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ اپنے مختصر ”ہنی مون“ کے متعلق سوچنے لگی تھی جس میں ہاشم راقبہ کے سوا کچھ نہ کیا تھا۔

”تم چاہتے ہو عباد کہ مرتے وقت مجھے ذہنی سکون میسر نہ ہو؟“
عباد نے چونک کر ماں کی جانب دیکھا۔ وہ گلوگیر لہجے میں اپنی بات کہہ کر اب شاکی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”ہی۔۔۔“ وہ دکھ سے بولا۔ ”یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟“
 ”تم نے مجھے یہاں اسپتال میں کیوں لا کر سوا دیا ہے عباد! میں یہاں نہیں مرنا چاہتی میرے بچے! میں اپنے گھر میں اپنے بستر پر بہت سکون سے جان دینا چاہتی ہوں۔ نہیں خدا کا واسطہ ہے عباد! مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ انہوں نے بچ بچ دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”آنسو ان کی آنکھوں سے رواں تھے عباد تیزی سے ان کے قریب گیا اور انہیں سینے سے لگا لیا۔
 دونوں ماں بیٹا رونے لگے تھے۔ ربیعہ بھی اشک بار ہو گئی۔
 ابھی ڈاکٹر زانہیں مختلف انجکشنز لگا کر گئے تھے۔ منیجر ہنگامہ کے لیے یہ سب کچھ قابل برداشت نہ تھا۔
 انہوں نے کبھی کسی بات کو اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا تھا۔ ہر تکلیف وہ خاموشی سے اندر ہی اندر اسی لیے سہتی آئی تھیں کہ انہیں ہاسپٹل ز اور ان کمروں سے بے پناہ خوف محسوس ہوتا تھا۔
 ”میں یہاں نہیں رہ سکتی عباد! تم اپنی بیمار ماں کو آخری لمحوں میں خوش اور مطمئن دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے یہاں سے لے چلو۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔“
 ”زندگی سے چند دن مزید کم ہو جائیں گے نا بیٹی۔ اچھا ہو گا۔“
 عباد جذبات پر قابو پانے کے لیے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ ربیعہ انگلی سے آنسو صاف کرنے لگی۔
 ”شہلا نہیں آئی۔“ وہ اداسی سے بولیں۔

”آپ کی فلاٹ ایک گھنٹہ بعد ایئر پورٹ پہ اترے گی۔“ ربیعہ نے گھڑی دیکھی۔
 ”اسے کس نے کچھ بتایا تو نہیں؟“

”نہیں۔۔۔ لیکن ہاشم بھائی کو عباد بھائی نے بتا دیا تھا۔ وہ شہلا آپ کو آپ سے ملوانے لے آئیں گے۔“
 ”میں شہلا سے گھر پر ملوں گی۔“ وہ ہنسد ہوئیں۔ ”عباد سے کہو بس انھی چھٹی لے کر مجھے گھر لے چلے۔“
 ربیعہ خاموش ہو رہی۔ اب ان کی ضد سے کچھ ممکن نہ رہا تھا۔



ترانا ربیعہ کو دیکھ کر تیزی سے اس کی جانب بڑھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔
 صوفے پر بیٹھا ہوا عبدالباری بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”مگر تمہیں اچھی طرح سے جانتی نہ ہوتی تو یہی سمجھتی کہ تمہاری ساتھ مجھے بھی بھلا چکی ہو اور اب تمہیں مجھ سے ملنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن۔۔۔“ ترانا گلو کیر لیجے بات ادھوری چھوڑ کر ہنس دی۔
 ”لیکن میں اپنی ربیعہ کو بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں اس لیے لمحہ بھر کے لیے بھی میرے دل میں کوئی شک کوئی وسوسہ پیدا نہ ہوا۔ مجھے علم تھا کہ تم کسی مجبوری کے تحت ہی میرے گھر نہ آسکی ہو گی اور یہاں پہنچ کر یہ خیال ٹھیک ثابت ہو گیا۔ انہی قصہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ آئی کی طبیعت اب کیسی ہے؟“
 ربیعہ نے غم آنکھوں سے ترانا کا پر خلوص چہرہ دیکھا۔

”ہم انہیں گھر لے آئے ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے وہ اب ٹھیک ہیں؟“ ترانا مطمئن ہوئی۔

”ڈاکٹر ز جواب دے چکے ہیں۔“ وہ خود پر کمال ضبط کر کے بولی۔ ”دل کی تسلی کے لیے ٹریٹ منٹ چل رہا تھا لیکن امی نے ضد کی کہ وہ ہسپتال میں مزید ایک گھنٹہ بھی نہیں رکھیں گی۔ مجبوراً۔“
 ”اوہ۔“ اس کے بازوؤں پر ترانا کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔

”بہت افسوس ہوا یہ سب کچھ جان کر۔“ عبدالباری بولا۔

”آپ کیسے ہیں باری بھائی۔“ ربیعہ اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”دکھ کی شدت سے دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔“

آپ سے سلام دعا تک نہ کی۔“
”اٹھ لو! وہ نرمی سے مسکرایا۔“ میں تمہاری کیفیت محسوس کر سکتا ہوں۔“
”آپ لوگ بیٹھیں نا۔“

”میں پہلے آئی کو دیکھنا چاہوں گی۔“ ترانا بولی۔ ”باتیں تو کبھی بھی کی جاسکتی ہیں ان کی عیادت ضروری ہے۔“
”آؤ! امی کے کمرے میں چلتے ہیں۔“ ربیعہ ان کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں منہ بیک کے پاس لے آئی۔ وہ دروازے کے زیر اثر نیم غنودگی میں تھیں۔ انہیں دیکھ کر قدرے ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کرنے لگیں۔
”کیسی ہو بیٹی!“ ربیعہ کے تعارف کروانے پر وہ خوش ہو کر بولی تھیں۔

”جی میں ٹھیک ہوں آپ۔۔۔“
”اللہ کا احسان ہے۔“ وہ مطمئن انداز میں بولیں۔
”ایسا لگتا ہے جیسے آپ کو کیس دیکھا ہو۔“ ترانا نے جیسے حافظے پر زور دیا۔
”ہو سکتا ہے۔“ وہ شفقت سے مسکرائیں۔ ”تم ربیعہ کی وہی بہن ہونا جو ایک مرتبہ بازار میں اسے ملی تھیں۔“

”جی ہاں لیکن تب میں نے آپ کو نہیں دیکھا تھا۔ آپ شاپ کے اندر تھیں۔ ربیعہ اور میں شاپ سے باہر تھے۔“
”مجھے ربیعہ نے بتایا تھا کہ اسے تم سے ملنے جانا ہے لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے بیٹی کہ ہم چاہتے ہوئے بھی اسے تمہارے پاس نہ بھیج سکے۔“

”جی میں جانتی ہوں۔ میرے یہاں تک پہنچنے میں سارا کمال باری کا ہے۔ انہوں نے بہت کوشش کے بعد کسی طرح عباد بھائی کا خلیں نمبر اور پھر ایڈریس حاصل کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ربیعہ کے ساتھ کوئی براہم ہو گئی ہوگی۔“
ترانا اور منینہ بہت کھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ ربیعہ چائے بنانے کے خیال سے کچن میں چلی آئی تب اسے حیرانی ہوئی تھی۔

انیقہ نے چائے تیار کر لی تھی اور اب ٹرائی میں چیزیں سیٹ کر رہی تھی۔
”تم کیوں چلی آئیں ربیعہ!“ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ ”میں چائے لارہی ہوں نا۔“
”حیرت انگیز۔“ ربیعہ مسکرا دی۔
”بلطہ کر رہی ہو؟“ وہ بھی مسکرائی۔

”بجڑ انہیں۔ تمہاری حرکت پر بیمار آ رہا ہے۔ میں دو دن کے لیے ہسپتال گئی اور تم نے سب کچھ یکھ لیا۔“
”تمہارے جانے سے احساس ہوا کہ تم اس گھر کے لیے اللہ کا کتنا بڑا انعام ہو۔ تم کس طرح سارے کام آسانی سے سرانجام دے لیتی ہو ربیعہ؟“

معصومیت سے پوچھتی ہوئی انیقہ ربیعہ کو بہت اچھی لگی۔
”جیسے تم نے اتنی جلدی اتنی آسانی سے یہ سب کچھ تیار کر لیا ہے۔“ اس نے ٹرائی پر نظر دوڑائی۔
”تمہاری کزن آئی ہے۔ اتنی خاطر داری تو اس کا حق ہے۔“ انیقہ ٹرائی دھکیلتے ہوئے بولی تھی۔ ربیعہ اس کے ساتھ چل دی۔

”آپ لوگوں کا بہت احسان ہے۔“ ربیعہ کو اپنے گھر کی مضبوط اور محفوظ چھاؤں دے کر آپ نے جو احسان ہم پر کیا ہے اس کا بدلہ تو صرف خدا ہی دے سکتا ہے۔“ ترانا کہہ رہی تھی۔ ربیعہ کے قدم دروازے پر لچھ بھر کے لیے رکے پھر وہ اندر داخل ہو گئی۔

ایک عرصے سے وہ اپنا ماضی ایک جرم کی طرح چھپاتی رہی تھی۔ ہر چند کہ اس میں چھپانے والی کوئی بھی بات نہ تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ اس نے اور عباد نے گھر والوں سے حقیقت چھپا کر اچھا نہ کیا تھا۔ وہ سب کے سب

اتنے کشادہ دل لوگ تھے کہ ہر بات جانتے ہوئے بھی اسے اپنے گھر میں خندہ پیشانی سے جگہ دیتے منہ زدہ بیگم نے ترانا کی بات کے جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔

انہی سب کو لوازمات کے ساتھ چائے سرو کرنے لگی تھی۔ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے موقوف ہو گیا تھا۔ چائے پی کر عبد الباری نے سب سے رخصت چاہی تھی۔ وہ کسی ضروری کام کے تحت جا رہا تھا۔ البتہ ترانا کا ارادہ رات گئے تک ان لوگوں کے پاس رکنے کا تھا۔

عبد الباری کے جانے کے بعد عباد بھی کچھ دیر آرام کرنے کے خیال سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ منہ زدہ بیگم کے پاس ترانا اور ربیعہ بی بی بیٹھی رہ گئیں۔

”اوہ۔۔۔“ اچانک ہی ترانا کو کچھ یاد آیا تھا۔ ”میرا ایک بیک ڈرائنگ روم میں رکھا ہے ربیعہ! اس میں تمہاری کچھ امانتیں ہیں، میں آج اسی خیال سے وہ ساتھ لے آئی کہ وہ سب کچھ جس پر صرف تمہارا حق ہے، تمہیں سوپ دیا جائے۔ یہ زندگی تو قدم قدم پر ہمیں جدا کر دیتی ہے۔ جانے کل ہم دونوں پھر کہاں ہوں۔“

ربیعہ نے قدرے حیرانی سے ترانا کو دیکھا۔

”بھول گئیں؟“ ترانا مسکرائی۔ ”جب تم لاہور آئی تھیں تب تم نے اپنا کچھ سامان میرے پاس امانت رکھوایا تھا پھر عباد بھائی کے ساتھ جانے کے لیے جب تم گھر سے نکلیں تو بجلت میں سب ہی کچھ میرے پاس بھول گئیں۔ اب زور ڈرائنگ روم سے وہ بیک اٹھا کر لے آؤ، میں آئی کے سامنے تمہارا سامان تمہارے حوالے کر دوں۔“

ترانا اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

ربیعہ مترددی ہو کر اٹھی۔ منہ زدہ بیگم کی طبیعت کے پیش نظر وہ انہیں کوئی ٹنشن دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اس بات کی یقینی بھی تھی کہ انہیں اپنے متعلق ہر بات سے آگاہ کر دے۔ منہ زدہ بیگم سے اس کا جو دلی رشتہ استوار ہو چکا تھا وہ متقاضی تھا کہ ربیعہ اپنے اور ان کے مابین پڑا ہر پردہ اٹھا دے۔

چھوٹا سا بیک اٹھا کر وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ منہ زدہ بیگم کے پانگ اور ترانا کی کرسی کے بیچ پر ڈی ٹیبل پر اس نے بیک رکھ دیا۔

”تم خود ہی کھولو اسے اور اپنی چیزیں چیک کر لو۔“ ترانا بے حد اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھی۔ ربیعہ نے بیک کھول کر اس میں سے سامان نکالنا شروع کیا۔ چند لمحوں کے لیے وہ خود بھی ساکت رہ گئی تھی۔

ایک سرخ جوڑا تھا، سونے کے تاروں کے کام سے مزین۔ کام اب تک کالا نہ پڑا تھا، البتہ چمک ضرور دم پر ڈ گئی تھی۔ ایک چھوٹا سا باکس تھا۔ ربیعہ اسے کھولے بنا بھی جانتی تھی کہ اس باکس میں کیا ہے پھر بھی اس نے وہ باکس کھولا۔ اس میں طلائی زینورات تھے گنبدن کے کام کا بھاری گلوبند اور جھمکے دو خوبصورت نگین۔

ربیعہ ساکت ان چیزوں کو گھور رہی تھی۔ اس کی پلکوں پر موتی چمکنے لگے تھے۔ اسے نجانے کیا کچھ یاد آیا تھا۔ اپنی داوی اماں، ان کے چھوٹے چھوٹے صندوق جن میں سے ایک پر تالا لگا رہتا تھا۔ اپنا چھوٹا سا گھر جس کے صحن میں ہار سنکھار کا درخت اپنی مہک پھلائے رکھتا تھا۔ اپنا محلہ، محلے کے پر غلوں لوگ۔ اپنی سہیلیاں اپنا کالج، اپنا بچپن، اپنی معصومیت۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے جیسے صبح کے دانے ایک کے بعد ایک گرتے ہوں۔

دفعتا! وہ بری طرح سے چوکی تھی۔ اس نے منہ زدہ بیگم کو ان چیزوں کے پاس کھڑا دیکھا، وہ دیوانوں کی طرح انہیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھیں۔ ان کا چہرہ کسی دیوانے کا چہرہ محسوس ہوا تھا، ان کے انداز میں حد درجہ وحشت تھی۔

”یہ سب کچھ۔۔۔ یہ سب کچھ۔۔۔“

”یہ سب کچھ ربیعہ کا ہے آئی!“ ترانا بھی قدرے گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

”نہیں۔۔۔“ وہ چلا میں۔ ”یہ سب کچھ میرا ہے۔ یہ سب کچھ میرا ہے۔“

پھر وہ دیوانوں کی طرح ربیعہ کی جانب بڑھیں۔

”یہ بھی میری ہے“ وہ ربیعہ کو خود سے بھیج کر چلا آئیں۔ ”یہ بھی میری ہے۔ یہ میری ہے۔ یہ میری ہے۔“
میری بیٹی۔۔۔ آم۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔
عباد اور انیقہ گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئے تھے۔
”امی۔۔۔ امی۔۔۔“ عباد ان کی جانب بڑھا۔
تب تک وہ ربیعہ کے بازوؤں میں جھول چکی تھیں۔

میرا نام مونا تھا، مونا جو زلف میں ایک کر سچن فیملی کا حصہ تھی۔ مجھے اپنا بچپن کچھ کچھ یاد ہے۔ میری ماں ایک ٹڈوا کف تھی باپ ایک شرابی۔ میری ماں جو کچھ کمائی تھی میرے باپ کے نشے کی نذر ہو جایا کرتا تھا۔ ماں بیمار رہتی تھی، میرے باپ کا دکھ اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا چلا گیا۔ اسے لیٹی ہو گئی۔ اسے اپنا مستقبل نظر آ رہا تھا، اس لیے اسے میرے مستقبل کی فکر ستانے لگی۔ اس نے مجھے نرسنگ اسکول میں داخلہ دلوا دیا، خود زندگی کی گاڑی کو اپنا پورا زور لگا کر کھینچتی رہی۔ میں نرس بن گئی اور مجھے ایک چیریٹی اسپتال میں نوکری مل گئی۔

دوسرے دن ہی میری ماں اسی اسپتال کے ایک بستر پر گہری نیند سو گئی، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ میرے اوپر اس حادثے کا گہرا اثر پڑا لیکن میرے باپ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا، اس کے لیے کمانے والے دو تازہ دم ہاتھ میدانِ عمل میں اتر چکے تھے۔ زندگی یونہی بے دلی سے گزر رہی تھی، تب ایک روز کچھ زخمیوں کو ہسپتال لایا گیا۔ وہ لوگ کسی دشوار گزار رستے سے گزر رہے تھے کہ ان کی بس گہرے کھد میں جا گری تھی۔ ان ہی بچ جانے والے زخمیوں میں سے ایک احمد جمانیب تھا۔ ایک خوبصورت جوان جو اپنے آبائی شہر سے بہت دور کسی اہم پروجیکٹ پر کام کرنے ہمارے علاقے میں آ گیا ہوا تھا، اس کی بس کے ساتھ حادثہ پیش آ گیا اور یوں وہ ہسپتال لایا گیا۔ شاید قسمت نے جنہیں جدا کرنا ہو اور جنہیں ملانا ہو ان کے لیے ہی حادثے تشکیل پاتے ہیں۔

تو میں جو کہ ہسپتال میں اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہی تھی، احمد جمانیب کو بھاگتی۔ نہ جانے اسے میری کیا بات پسند آئی۔ میرے نقش بہت خوبصورت تھے لیکن میرا رنگ سانولا تھا جبکہ وہ گورا چٹا، یونانی دیوتاؤں کا سا حسن رکھنے والا ایک خاندانی آدمی تھا۔ وہ ڈیڑھ ماہ ہسپتال بزرہا اور اس ڈیڑھ ماہ میں ہم دونوں نے نظروں ہی نظروں میں وفا کے تمام عہد و پیمان اٹھالے، جس روز اسے چھٹی ملی، اس نے مجھے شادی کی پیش کش کی۔ مجھے بھلا کیا چاہیے میں نے اپنے باپ کو محض ایک رسمی سی اطلاع دی کہ میں مسلمان ہو رہی ہوں اور ایک مسلمان نوجوان سے شادی کر رہی ہوں۔ اس دن میرا باپ بہت رویا بہت کڑکڑایا۔ مجھے میری مری ہوئی ماں کے واسطے دیے لیکن احمد جمانیب کی محبت ایک مقناطیس تھی اور میرا وجود ایک بے بس لوہے کا ٹکڑا۔

میں نے اپنے باپ کی ایک نہ سنی۔ احمد جمانیب اور میں نے شادی کر لی۔ میری ماں نے میرے لیے شادی کا جوڑا پنا کر رکھا ہوا تھا۔ سفید لیس دار فراک۔ میں نے اپنی شادی کے دن وہی جوڑا پہنا۔ ہماری شادی مسجد میں ہوئی تھی، جہاں پہلے میں مشرف بہ اسلام ہوئی پھر ہمارا نکاح ہوا۔ جوزف فرنانڈس مسجد کے باہر بٹھارہا اور مجھے اور احمد جمانیب کو بددعا میں مبتلا رہا۔ اب میں سوچتی ہوں کہ شاید اس دن میرے باپ کی کسی بددعا نے میرا تعاقب شروع کیا تھا اور۔۔۔ اور مادر میرے تعاقب میں رہی۔۔۔ تادیب۔۔۔ میرے اور میری خوشیوں کی راہ میں حائل رہی۔

خیر میں بتا رہی تھی کہ مونا جو زلف سے منیوہ احمد بن کر میں وقتی طور پر بہت خوش تھی۔ احمد جمانیب میرے چھوٹے سے شہر سے بھی دور دراز ایک چھاڑی علاقے میں ایک پروجیکٹ پر کام کرنے کے سلسلے میں آیا ہوا تھا۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بھی بتایا شادی کے بعد بتایا۔ اس نے بتایا کہ دنیا میں اس کے خونی رشتوں میں صرف اس کی ماں اور اس کی ایک بہن ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے اور ماں اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ جب سے اس کا نافر دور دراز کے علاقے میں ہوا، ماں اکیلی ہو گئی۔ اسے اکیلا پن بُرا لگنے لگا، تب اپنی بیٹی بلیس کے اصرار

پردوں والی مٹی نے مل کر احمد جہانزیب کی منگنی بلیقے بانو کی نندینا بیکم سے کر دی۔
مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی، افسوس بھی ہوا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہ ایک منگنی شدہ شخص ہے، ورنہ شاید میرا فیصلہ مختلف ہوتا۔ احمد جہانزیب نے نوکری سے چھٹی لے لی۔ وہ مجھے اپنے شہر لے آیا، جہاں اس کی ماں رہتی تھی۔ ان دنوں اس کی بہن بھی اپنی ماں کے پاس آئی ہوئی تھی۔ وہ دونوں احمد جہانزیب کے لیے سخت پریشان تھیں کیونکہ دورانِ علالت اس نے اپنے گھر والوں کو اپنے ارادوں سے آگاہ کر دیا تھا۔ مجھے اب تک وہ دن یاد ہے۔ میں احمد جہانزیب سے پیچھے کھڑی تھی۔ بلیقے بانو اور اماں۔۔۔ دونوں احمد سے لپٹ کر رو رہی تھیں اسے پیار کر رہی تھیں، اس پر سے صدے واری ہو رہی تھیں۔ تب اچانک ان دونوں کی نظر مجھ پر پڑی۔
”آہ۔۔۔ میں آج تک اپنے آپ میں ان نظروں سے خوف زدہ رہتی ہوں۔ وہ نظرس۔۔۔ وہ تلوار تھیں، وہ آری تھیں جو میرے وجود کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھیں۔ ان میں اتنی نفرت تھی کہ اب تک اس نفرت کا سوچ کر میرا دل لرز کر رہ جاتا ہے۔ ان میں اتنی پیش تھی کہ اس پیش کو آج اتنے سالوں بعد بھی میں اپنے رخساروں پر دکھتا محسوس کر سکتی ہوں۔

”یہ کون ہے؟“ اماں نے اسی پیش زدہ لمبے میں پوچھا۔
”میری سہیلی!“ وہ مسکرایا۔ ”میری بیوی۔ منیوہ! میں نے اپنے خطوط میں اسی کا ذکر کیا تھا۔“ دفعنا ”بلیقے بانو نے اپنا سر پینٹا اور بین کرنا شروع کر دیا۔
اسی طرح احمد کی اماں نے بھی میرا استقبال اسی انداز میں کیا۔ وہ دونوں اس طرح رو رہی تھیں جیسے۔۔۔ جیسے کسی کا انتقال ہو گیا ہو۔ میں ان کے انداز سے سخت خوف زدہ ہو گئی تھی۔
احمد نے بہت مشکلوں سے انہیں خاموش کرایا، ان کی منت سماجت کی، ان کے آگے ہاتھ جوڑے، ان کے پیر پکڑے۔ اماں اندر سے تو راضی نہیں تھیں لیکن احمد کی منت سماجت سے خاموش ضرور ہو گئیں۔ تاہم بلیقے بانو خاموش بھی نہ ہوئیں۔ وہ چیخ چیخ کر مجھے برا بھلا کہتی رہیں۔ میرے پچھلے مذہب کو وہ میرا ناقابلِ معافی جرم گردان رہی تھیں، ان کے لیے میں جیسے ایک نجس، ناپاک شے تھی جسے وہ کسی طور قبول نہ کر سکتی تھیں۔
”کتنا سمجھایا تھا اماں! اتنا سمجھایا تھا میں نے آپ کو لیکن آپ کو اپنے بیٹے پر بہت مان، بہت بھروسہ تھا۔“ وہ جاتے جاتے اماں سے بولیں۔ ”دیکھ لیں، میری زندگی برباد کروالی آپ کے بیٹے نے۔ آپ کیا سمجھتی ہیں۔ مینا اور منور مجھے معاف کر دیں گے؟ کبھی نہیں، منور میری زندگی عذاب بنادے گا میرے لیے۔“
وہ آنسو پونچھتی باہر کی جانب بڑھیں پھر لحد بھر کے لیے میرے قریب رکیں۔
”کلمہ ہو۔۔۔ کلمو۔۔۔ کیا پڑھ کر پھونکا تو نے میرے معصوم بھائی پر؟ جادو کرنی۔۔۔ ہمیں برباد کر کے تو بھی خوش نہ رہے گی۔“

یہ دوسرے شخص کی بددعا تھی میرے لیے۔ پہلے میرا باپ اور پھر ساس اور منند۔ میرے دل کو اندیشوں اور دوسروں کی آندھی نے گھیر لیا۔

زندگی بھر طور شروع ہوئی۔ جہانزیب کو نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ ڈپارٹمنٹ اتنی چھٹیاں برداشت نہ کر پایا۔ گھر میں مشکلات کا آغاز ہو گیا۔ ادھر بلیقے کا کہنا سچ ثابت ہوا۔ منور امین نے بلیقے بانو کو ہمارے جرم کی سزا دینا شروع کر دی۔ مینا نے زہر کھا کر زندگی ختم کرنے کی کوشش کی، تاہم اسے بچا لیا گیا۔ میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز انکشاف تھا کہ مینا احمد جہانزیب کو دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔

کچھ دن اور نکلے، میں نے احمد جہانزیب سے نوکری کی اجازت مانگی۔ اس نے قدرے رد و رد کے بعد میری بات مان لی۔ میں نے ایک مقامی اسپتال میں نوکری کر لی۔ وہاں میری ملاقات رابرٹ سے ہوئی۔ رابرٹ میری رشتے کی ایک خالہ کا بیٹا تھا۔ پوری دنیا میں وہ واحد شخص تھا جس کا میری آنجنابی ماں سے کوئی تعلق بنا تھا۔ مجھے رابرٹ سے مل کر بہت خوشی ہوئی لیکن جلد ہی یہ خوشی ایک ناقابلِ بیان الجھن میں بدل گئی۔ رابرٹ میرے گھر آنے

جانے لگا۔ میں ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن میں اسے منع بھی نہ کہی۔ شاید میری اسی خاموشی سے میری بد قسمتی کا آغاز ہوا۔ مجھے علم نہ ہوا یا کہ احمد جہانزیب کے دل میں کس وقت میری جانب سے بدگمانی نے جنم لیا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہ کہا، کچھ نہ پوچھا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں کا رنگ بھی نہ بدلا۔ وہ جیسا تھا، ویسا ہی رہا۔ رابرٹ کچھ دنوں کے لیے میرے آبائی شہر گیا، وہاں سے واپسی پر اس نے مجھے بتایا کہ میرے باپ کی حالت کتنے سے بھی بدتر ہے۔ وہ شہر سے دور ایک جھونپڑے میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں صرف اس امید پر تھامے ہوئے ہے کہ میں ایک مرتبہ اس سے مل جاؤں۔

میں یہ سب کچھ سن کر رہ نہ پائی۔ احمد سے سرسری سی اجازت لے کر میں رابرٹ کے ساتھ اپنے باپ سے ملنے چل دی۔

میں ایک نو مسلم تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میں اس طرح ایک غیر مرد کے ساتھ بلا ضرورت سفر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی کئی دن کا سفر لیکن مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا، مجھے کسی نے نہیں روکا۔ حتیٰ کہ احمد نے بھی نہیں۔ میں باپ کے پاس پہنچی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ مجھے معاف کیے بنا بہت دور جا چکا تھا۔ اسے دفنانا جا چکا تھا۔ میں اس کی قبر پر دو آٹسو بھاگرواپسی کے لیے روانہ ہو گئی۔ گھر پہنچی تو ایک حیرت انگیز دل کو دہلا دینے والا انکشاف میرا منتظر تھا۔

احمد مجھے جھوڑ کر پردیس چلا گیا تھا، ایک غیر معینہ مدت کے لیے۔ مجھے کچھ بھی بتائے بغیر، مجھ سے ملے بغیر۔ وہ ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ سوچ سوچ کر میں پاگل ہو گئی لیکن کوئی سرا میرے ہاتھ نہ آیا۔ آخر وہ اچانک تو نہیں گیا تھا۔ اس نے کوئی بلا ننگ کی ہوگی، کیس اچلائی کیا ہوگا، کوئی طے شدہ پروگرام ہوگا جس پر عمل در آمد کیا گیا تھا لیکن میری ان باتوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ بلقیس بانو تو میری صورت سے نفرت کرتی تھیں۔ اماں کی بے نیازی بھی اپنے عروج پر تھی۔ میں نہ زندوں میں رہی تھی نہ مردوں میں۔ مارے باندھے نوکری پر جاتی تھی، واپسی پر پورے گھر کا کام کرتی تھی پھر بھی کوئی مجھ سے خوش نہ تھا۔ مجھے کسی کی خوشی سے غرض نہ تھی، نموائے احمد جہانزیب کے لیکن اس ظالم نے تو مجھے اپنا کوئی فون نمبر، کوئی اتاپتا تک نہ دیا تھا جس پر میں اس سے رابطہ کہی۔

پھر میرے اندر خوشی کی ایک کوئیل پھوٹی۔ احمد جہانزیب سے جانگسمل جدائی کا کیسواں روز تھا۔ میں نے ایک شک سا ہونے پر اس کی تصدیق چاہی۔ ہسپتال میں دورانِ ڈیوٹی ہی مجھے یہ خوش خبری ملی کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ میرے قدم زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ میں خوشی سے مورچے بننا چاہتی تھی۔ میں احمد کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی تھی لیکن... لیکن کیسے؟

میں گھر پہنچی اماں کو بتایا۔ ان کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ مجھے ان کی کیفیت سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے ان سے احمد کا پتہ یا فون نمبر مانگا، ان کے قدموں میں جھک گئی لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا۔ انہیں بھی میری طرح کچھ علم نہ تھا۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ ان کا احمد سے فون پر رابطہ ہے۔ اکثر پردیس سے بچہ انہیں بلانے آتا تھا۔ احمد ہر دو سرے دن انہیں فون کرتا تھا۔

مجھے احمد کے رویے پر حیرت کم اور افسوس زیادہ ہوتا تھا۔ اس نے جیسے میری زندگی کے ساتھ ایک بے رحم کھیل کھیلا تھا۔ اس نے مجھے ایک دلدل سے نکال کر ایک صحرا میں لاکھڑا کیا تھا۔ میں نے خود کو تقدیر کے آگے سرنگوں کر دیا۔ حالات سے سمجھوتہ کر کے میں بالکل خاموش ہو گئی۔ دن گزرتے گئے۔ میں اس گھر میں تنہائی اور اماں کی بے نیازی اور بے مہری کے ساتھ جیتی رہی۔ حتیٰ کہ میری ڈیپوری کا مہینہ آپہنچا۔ تب اچانک نچانے کیا ہوا۔ اماں اور بلقیس بانو کا رویہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ وہ دونوں میرے آگے پیچھے پھرنے لگیں۔ مجھ سے اپنے سابقہ رویے کی معافی چاہنے لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مجھے دلا سے دینے لگیں کہ بچے کی پیدائش پر وہ ضرور کسی نہ کسی طرح احمد کو اطلاع بجھوائیں گی اور وہ ضرور آئے گا۔ میں نے سمجھا کہ تقدیر کی بے مہری ختم ہوئی، آزمائش ختم ہوئی۔ اچھے دن جن کی آس میں جیتی تھی، آگئے۔ کیا خبر تھی کہ یہاں سے ایک نیا امتحان، نئی آزمائش کا آغاز ہوا چاہتا ہے۔

اماں اور بلقیس بانو مجھے ہلا پھلا کر ایک دور افتادہ علاقے میں بے ہمتال میں لے آئیں جہاں ان کے بقول احمد کی پیدائش ہوئی تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ احمد کا بچہ بھی اسی ہسپتال میں جنم لے۔ نجائے کیوں مجھے ان کی بات پر یقین نہ تھا۔ میرے دل میں ایک کھٹک سا تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے اور پھر وہ انہونی ہو کر رہی۔ درودہ سے پہلے ہی مجھے انجکشن کے ذریعے بے ہوش کر دیا گیا اور جب۔۔۔ جب مجھے ہوش آیا۔۔۔ آہ۔۔۔ میری کوکھ خالی تھی میرے ہاتھ خالی تھے میرا دل خالی تھا۔

آرٹیشن کے ذریعے ڈیوڑی عمل میں لائی جا چکی تھی۔ وہاں میرے پاس کوئی نہ تھا۔ نہ اماں، نہ بلقیس بانو، نہ میرا بچہ۔۔۔ میں بہت روٹی پٹی بہت شور مچایا لیکن سب کے منہ پیسے دے کر بند کے چایچکے تھے۔ پورا عملہ بیک زبان کہہ رہا تھا کہ مردہ بچہ پیدا ہوا تھا جسے دفن کر اس کی داوی اور پھوپھی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

جانے سے قبل وہ ایک لفافہ بھی میرے لیے دے گئی تھیں۔ میں نے لفافہ چاک کیا اور مجھے علم ہوا کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں آئی۔ اس میں احمد جہانزیب کا تحریر کیا ہوا طلاق نامہ تھا۔ کیوں؟ کس لیے؟ کس جرم کی سزا؟ میرے سوالوں کا جواب دینے کے لیے وہاں کوئی نہ تھا۔ طلاق نامے پر لکھی تاریخ آٹھ ماہ پرانی تھی۔ گویا آٹھ ماہ قبل اس نے مجھے طلاق مجبوری تھی جسے مجھ سے پوشیدہ رکھا گیا۔ یہ ایک کبھی تھی جسے میرے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں دن رات روٹی اور اسے سلجھانے کی کوشش کرتی۔ ہسپتال کے کمرے میں رکھے اپنی کیس میں میرے سارے کپڑے اور میرا سب سازو سامان موجود تھا۔ گویا وہ مجھے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہنے کے لیے ہی وہاں لائی تھیں۔

آرٹیشن کے پانچویں دن مجھے فارغ کر دیا گیا۔ ہسپتال کے اخراجات کی ادائیگی کی جا چکی تھی۔ میرے مہر کی رقم بھی مجھے اپنی کیس میں مل گئی تھی لیکن مجھے اپنا بچہ چاہیے تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا بچہ زندہ ہے جسے پورے نو ماہ میں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر پھیر کر محسوس کیا تھا جس کی کوئل انگڑائیوں کو اپنے اندر سیٹھ رکھا تھا جس کے ساتھ بہروں چھوٹی چھوٹی باتیں کی تھیں۔ اس کے باپ کی جفاؤں کی ساری شکایتیں میں اسی سے کیا کرتی تھی۔

اس بچے کو میں نے ایک نظر تک نہ دیکھا۔ میں نے اس کی نرم ہتھیلیوں کو چومنا تک نہیں۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہوسہ تک نہ دیا۔ میں نے اس کے نرم وجود کی خوشبو کو اس کے لمس کی گرمی کو اپنی روح میں اترنا محسوس نہ کیا۔ مجھ سے زیادہ کسی اماں، مجھ سے زیادہ اجاڑ اور یران پوری دنیا میں کوئی نہ تھا۔

روٹی، بھلتی، سسکتی میں اپنا زخمی وجود لے کر ایک لمبا سفر طے کر کے صرف اپنا بچہ واپس لینے کے لیے گھر پہنچی تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ کلین وہ گھر بچ کر جا چکے ہیں۔ میں پوری دنیا میں اکیلی تھی۔

بہر طور سانس کی ڈور بندھی رہے تو بندہ بشر ڈھیٹ بن کر ہر مشکل بھیل جاتا ہے۔ میں ہسپتال چلی آئی۔ ایک گہری جلد خاموشی کے ساتھ میں نے زندگی کا نانا شروع کی۔ احمد جہانزیب کون تھا؟ میں بھول گئی۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول گئی لیکن ایک ننھے وجود کے بھٹکنے کی آواز مجھے نیند میں چونکا دیا کرتی تھی۔ پورا ڈیڑھ ماہ میری قمیص، میرے سینے پر بھیکتی رہی اور میرے آنسوؤں سے میرا دامن تر ہوتا رہا۔ میرا آجکل کیلا ہی رہتا تھا۔ میرے دل کا خون۔۔۔ میرے جگر کا لہو۔۔۔ دودھ بن کر چھاتی سے بہتا تھا، آنسو بن کر آنکھوں سے بہتا تھا اور۔۔۔ اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اماں اور بلقیس کو ہمیشہ پیا سار بننے کی بد دعا دیتی تھی پھر میں کراچی چلی آئی۔

میں ایک ہنگامہ خیز زندگی کا حصہ بن کر اس رونے کی آواز کو فراموش کرنا چاہتی تھی جو میری راتوں کی بے خوابی کا سبب تھی۔ کراچی میں خوش قسمتی سے ایک اچھے ہسپتال میں مجھے نوکری مل گئی۔ وہاں میری ملاقات محسن علی صاحب سے ہوئی۔ وہ ایک ازحد شریف النفس اور بے تحاشا اچھے انسان تھے۔ چند ماہ قبل ان کی بیوی ایک بچی کو جنم دے کر انتقال کر گئی تھیں۔ اس بچی سے پہلے بھی ان کے دو بچے تھے۔ ایک بیٹا ایک بیٹی۔ میری داستان غم نے محسن صاحب کے قلب پر گہرا اثر کیا۔ انہوں نے سیدھے سبھاؤ مجھ سے اپنی زندگی میں شامل ہو جانے کے لیے کہا تاکہ میری ممتا کو قرار مل سکے اور ان کی بچوں کو ماں کا پیار اور ان کے گھر کو ایک نگران۔ سو اس طرح ایک بچہ کھو کر

مجھے تین بچے مل گئے۔

چند ماہ کی انہیں۔۔۔ دو سال کا عباد اور ساڑھے تین سال کی شہلا۔ میں نے اپنے بچوں کو کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی حقیقی ماں نہیں ہوں لیکن کبھی ان سے یہ حقیقت چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی اور میرے بچوں نے کبھی مجھے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ان کی حقیقی ماں نہیں ہوں اور پیشہ مجھے یہ بات بھلانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں یہ بات بھول گئی تھی۔ بھول گئی کہ یہ میرے اپنے وجود کا حصہ نہیں ہیں۔

لیکن۔۔۔ لیکن وہ آواز۔۔۔ میں وہ آواز نہیں بھول پائی جو میں نے حالت بے ہوشی میں سنی۔ میں ان ننھے ہاتھوں کا لمس نہ بھول سکی جو میرے اندر انگڑائیاں لیتے تھے۔ میری بے خوابی میں کئی ضرور آئی لیکن اب بھی اکثر اترات کو آنکھ بے وجہ ہی کھل جاتی ہے لیکن اب۔۔۔ اب جو سکون کی نیند سوؤں گی تو شاید روز قیامت ہی جاگوں۔“

منیزہ بیگم کی کمائی مجھے میرے والد منور امین نے بستر مرگ پر سنائی۔ یوں تو مرتے دم تک انہوں نے اپنی غلطیوں کا اعتراف نہ کیا۔ انہوں نے کسی سے بھی معافی مانگنا پسند نہ کی لیکن ان کی آنکھوں میں موت کا بے تحاشا خوف چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ انہیں اپنی پچھلی پوری زندگی پر وقت ایک فلم کی مانند چلتی نظر آتی ہے۔ وہ مرنے سے سخت خوف زدہ تھے اور ان کی زندگی موت سے بھی بدتر تھی۔ ایسا صرف ان لوگوں کے ساتھ ہوا ہے جنہوں نے ساری زندگی حقوق العباد کو جی بھر کر ملیا میٹ کیا ہو، جنہوں نے دوسروں کی بددعا میں سمیٹی ہوں، دوسروں کو لہو رنگ آنسو لائے ہوں۔ میرے والد ایک ایسے ہی انسان تھے۔

نجانے کیوں مرنے سے چند گھنٹے قبل انہوں نے بنا میرے کچھ پوچھے مجھے یہ کمائی سنائی۔ شاید انہیں اور اک ہو چکا تھا کہ غلطیوں کی معافی نہ سنی غلطیوں کا اعتراف بھی ہر حال ایک اہمیت کا حامل ہے۔

میرے ماموں احمد جہانزیب ایک خوبصورت فنکارانہ مزاج کے حامل شخص تھے۔ انہیں بتائے بغیر میری امی نے میری نالی کو رضامند کر کے مینا پچھو سے جہانزیب ماموں کی مقننی طے کر دی۔

مینا پچھو نہ صرف یہ کہ واجبی شکل و صورت اور واجبی تعلیم کی حامل تھیں، انہوں نے کبھی اپنی شخصیت کو کوئی خوبصورت صفت عطا کرنے کے متعلق بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اچھی صفات سے مزین ایک سخت مزاج، اتار پرور عورت تھیں جو میرے والدین کی شادی کے موقع پر ماموں کی محبت میں جھٹلا ہو گئی تھیں اور ماموں کو بلا شرکت غیرے اپنانا انہوں نے زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔

ماموں جب منیزہ ماما کو گھر لائے تو تمام افراد پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔ کئی تو ایسے بھسم ہوئے کہ کبھی ان پر سبزہ نہ آگ سکا۔ ان میں مینا پچھو اور میرے والد شامل تھے۔ امی، نانی اور میرے والد نے ایک مشترکہ منصوبہ بنایا جس کے تحت کئی بھی صورت منیزہ ماما کو خاندان کا حصہ نہیں بنانا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ جہانزیب ماموں کی نہایت فحاش غلطی تھی جسے ہر طور درست کرنا تھا۔

ماموں کو دکھانے کے لیے نانی امی نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق بے دلی سے منیزہ ماما کو گھر میں رکھ لیا۔ انہیں وہ زیور بھی دیا جو انہوں نے اپنی بہو کے لیے رکھا ہوا تھا۔ اپنا خاندانی عروسی لباس بھی دیا۔ منیزہ ماما فطرتاً ایک سادہ اور معصوم خاتون تھیں۔ وہ اس پر ہی خوش ہو گئیں۔

اب پلاننگ پر باقاعدہ عمل درآمد شروع کیا گیا۔ امی اور نانی امی عاملوں کے پاس جانے لگیں، ان سے تعویذ لالا کر جہانزیب ماموں کو پلائے جاتے تاکہ ان سے منیزہ ماما کی جانب سے بدگمان کیا جاسکے۔ نانی امی چیکے چیکے اندر ہی اندر منیزہ ماما کے خلاف ماموں کو بھرا کرتی تھیں۔ سوئے اتفاق ان ہی دنوں ماما کے ایک رشتے کے بھائی جو ایک عیسائی نوجوان تھے ماما کو مل گئے۔ بس یہیں سے ان کی ذلت کے خلاف سب سے بڑا ایٹو کھڑا کرنے کی بنیاد فراہم ہو گئی۔

امی اور نانی امی نے ماموں کو باور کرائنا شروع کیا کہ منیزہ ماما جب مونا جوزف تھیں تب سے ان کے رابرٹ

سے خفیہ تعلقات تھے۔ انہوں نے کئی جھوٹی قسمیں اٹھائیں اور کئی غلط بیانیایں کیں جن سے حقیقتاً ماموں کا دل مامی کی جانب سے بدگمان ہونے لگا۔ شومئی قسمت سے مامی نوکری بھی کرتی تھیں، سوان کے دن کا بڑا حصہ ماموں اور گھر سے دور گزرنا تھا۔

ماموں نے اپنی بدگمانی مامی پر ظاہر نہ کی۔ انہوں نے اندر ہی اندر اپنے ملک سے باہر جانے کے انتظامات شروع کر دیے۔ وہ بڑھے لکھے قابل نوجوان تھے۔ جلد ہی ان کے باہر جانے کا بندوبست ہو گیا۔ ایک کمپنی نے انہیں ایگریمنٹ کے تحت بلوا لیا۔ ان ہی دنوں امی نے رابرٹ کے ساتھ اپنے باپ سے ملنے کی اجازت مانگی۔

ماموں نے انہیں بلا چون و چرا اجازت دے دی اور خود دوسرے ہی دن گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ وہ چاہتے تو مامی کو بیٹھ کے لیے چھوڑ بھی سکتے تھے لیکن نجانے کیوں انہوں نے ایسا نہ کیا۔ شاید ان کے دل کے کسی گوشے میں امید کی مدھم سی لوروشن تھی۔ شاید وہ سوچتے تھے کہ منہیزہ مامی بے قصور بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ منہیزہ مامی کی جانب سے کسی اعتراف، کسی شکوے، کسی پیار بھری شکایت کے منتظر تھے لیکن حالات کی چلتی میں بستی مامی نے اوھر توجہ نہ کی۔ یوں ان دونوں کے درمیان کچھ نہ ختم ہونے والی غلط حال ہو گئی۔

امی اور نانی امی کا پروگرام تھا کہ وہ مامی کو گھر سے نکال دیں گی اور ماموں سے کہیں گی کہ موتا، رابرٹ کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن مامی نے انہیں وہ خوشخبری سنا دی جس پر نانی امی دنگ رہ گئیں۔ اب وہ اپنے پروگرام پر عمل نہ کر سکتی تھیں۔ نانی امی خاندانی خاتون تھیں، وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا بچہ کسی طور کسی دوسرے کو نہ دے سکتی تھیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ بچے کی پیدائش تک منہیزہ مامی کو گھر ہی رکھا جائے۔ ہاں البتہ ایک کام انہوں نے اور کیا، وہ کہ ماموں کو پورے ایک ماہ بعد اطلاع کی کہ منہیزہ کو حمل ہو گیا ہے۔ ماموں کے جانے کے پورے ڈیڑھ ماہ بعد۔ اگلے ہفتے ہی مامی کے لیے طلاق نامہ موصول ہو گیا۔

پروگرام کے تحت یہ طلاق نامہ مامی سے چھپایا گیا۔ نانی امی اور امی نے اپنا رویہ مامی سے بالکل تبدیل کر لیا تاکہ انہیں کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔ میرے والد نے اپنے ایک دیرینہ دوست کے توسط سے ایک ایسے اسپتال کے متعلق معلومات حاصل کیں جہاں زیادہ تر ناجائز کام کیے جاتے تھے۔ وہاں کی ڈاکٹر کو ابو نے رشوت دے کر اپنی مرضی کا کام کرنے پر راضی کر لیا۔ یوں میری معصوم مامی کو ان کی زندگی کی ہر خوشی سے محروم کر دیا گیا۔

ابو جان کے پروگرام میں تو یہ بات بھی شامل تھی کہ گھرا کر ہونے والی بچی کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا جائے گا تاکہ جہانزیب ماموں ہر جھنجٹ سے آزاد ہو کر ان کی بہن کے ہو جائیں لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نانی امی نے اپنے بیٹے کی اولاد، یعنی ربیعہ کو قتل کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس بات پر میرے والد اور نانی کے درمیان ٹھن گئی۔ والد کا کہنا تھا کہ بچی کو چیتا جاگتا یا کر جہانزیب معاملے کی تہہ تک پہنچ جائیں گے کیونکہ بچی نے نقوش ماں کے اور رنگت اپنے باپ کی ملی تھی اور جبکہ نانی امی ایک ماں سے اس بے دردی سے اس کی اولاد چھین لینے سے قدرے خوف زدہ ہی ہو گئی تھیں۔

انہیں واضح سمجھ میں آ رہا تھا کہ بیٹی اور دو ماد کی باتوں میں آکر انہوں نے اپنے بیٹے کی زندگی میں ایسا زہر گھولا ہے جس کی کبھی قیامت تک اس خاندان کے حافظے سے محو نہ ہو پائے گی۔ ابو کے تیور اس درجہ خطرناک تھے کہ نانی امی اس بچی کے لیے سخت خوف زدہ ہو گئیں۔ ایک رات وہ اس بچی کو لے کر گھر سے چلی گئیں۔ ان کی بہن نواب شاہ کے قریب ایک نواحی علاقے میں رہتی تھیں۔ نانی امی ان کے پاس چلی گئیں۔ دونوں بہنوں کی مشترکہ جائیداد میں ایک مکان اور چند دکانیں تھیں جن سے وہ زندگی بسر کرنے کے قابل تھیں۔

یہاں امی کو قدرت نے سزا دینے میں دیر نہ کی۔ مجھ سے بڑی بہن تمنا جو اس وقت تین چار سال کی تھی سخت بخار میں مبتلا ہوئی اور چند راتوں میں ہی امی کو اولاد کے دکھ سے روشناس کر کے اللہ تعالیٰ کے پاس چلی گئی۔ امی کے دل پر اس حادثے کا شدید اثر ہوا۔ اس کے بعد وہ بھی زیادہ عرصہ نہ جیا میں اور اپنے گناہ و ثواب کا حساب کتاب لے کر اپنے خالق کے روبرو حاضر ہو گئیں۔ نجانے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہوگا۔

میرے والد پر کسی حادثے کا کوئی خاص اثر نہ ہوتا تھا، ان کی آنکھوں پر ہندھی غفلت کی پٹی قیامت تک کے لیے تھی۔ روز قیامت اسے فرشتے ہی کھولیں گے۔

میرے والد کے ہاتھ اس موڑ سے ایک ایسی خزانے کی چابی آگئی جس کو پا کر وہ اپنی بیوی اور مری ہوئی بچی کو ٹوکیا اپنی زندہ اولاد تک کو بھول گئے۔

نانی امی کے چلے جانے سے جہانزیب ماموں کے رابطے کا واحد ذریعہ میرے والد ہی تھے۔ انہوں نے ماموں کو جھوٹی بچی کہاںیاں سنائیں جن کے مطابق منہ ذہ مامی طلاق کے بعد رابرٹ کے ساتھ چلی گئی تھیں اور نانی امی سخت بیمار تھیں اور اب ان کا علاج کر دیا ہے۔ جہانزیب ماموں پر اپنی زندگی کے اس حادثے کا اتنا گہرا اثر ہوا تھا کہ انہوں نے کبھی ملک نہ لوٹنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ابو کے اکاؤنٹ میں نانی امی کے علاج کے لیے پیسے بھجواتے رہے، بھجواتے رہے اور ابو کے منہ کو ایک کبھی نہ ختم ہونے والی پیاس لگ گئی۔

نانی امی نے ابو کو کئی خط لکھے اور جہانزیب ماموں کا پتہ اور فون نمبر مانگتی رہیں۔ وہ ان سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنا چاہتی تھیں، انہیں سب کچھ بتا کر ہر جرم کا اعتراف کر کے وہ اپنی رسیں چر دھر ابو جہ اتار پھینکنا چاہتی تھیں۔ ابو نے نانی امی کو لائے سیدھے مغالطوں کا شکار کر دیا۔ کبھی وہ جہانزیب ماموں کے کسی حادثے میں مرنے کی اطلاع دے دیتے تو کبھی گمشدہ قرار دے ڈالتے۔ نانی امی کو مرتے دم تک شاید علم نہ ہو سکا ہو گا کہ جہانزیب ماموں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

جہانزیب ماموں کو جب ابو پر شک ہونے لگا تو انہوں نے ابو سے دو ٹوک بات کی۔ وہ فون پر اپنی والدہ کی آواز سننا چاہتے تھے تب ابو نے انہیں بتایا کہ نانی امی تو دو سال قبل انتقال کر گئی ہیں اور ماموں کے بھجوائے پیسوں سے ابو نے مکان خرید لیا ہے۔ انہوں نے اپنے کیے کے لیے ایک رسمی سی معذرت کر لی۔ جہانزیب ماموں نے کچھ بھی کہے بنا خاموشی سے فون بند کر دیا اور اس کے بعد کبھی کسی نے ان کی آواز نہیں سنی۔

برسوں گزر گئے۔ ابو ماموں کی بھیجی رقم پر کسی سانپ کی مانند بیٹھے رہے۔ تمدن بھائی چونکہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑے ہیں چنانچہ وہ اس معاملے سے کچھ کچھ آگاہ تھے۔ ابو کے بستر پر بڑ جانے کے بعد تمدن بھائی نے ابو سے وہ پیسے مانگنے شروع کیے لیکن ابو ایک نفسیاتی عارضے کا شکار ہو چکے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ جیسے ہی وہ رقم ختم ہوگی، ابو کی زندگی بھی ختم ہو جائے گی اور جب تک ان کے پاس وہ رقم باقی ہے، وہ زندگی کی گاڑی کو پھینچتے رہیں گے۔

انہیں اپنی تعفن زدہ زندگی ہر شے سے زیادہ پیاری تھی۔ انہیں پیاس کا عارضہ لاحق تھا جو شاید اسی نفسیاتی گہرے سے پیوستہ کوئی بات تھی۔ وہ ہر وقت پیاس کا شکار رہتے تھے۔ وہ خود پانی پی پی کر اور انہیں پانی پلانے والے پلا پلا کر تھک جاتے لیکن وہ پیاس بخوں کی تول رہتی۔

ربیعہ نے ابو کی بہت خدمت کی۔ اس بات سے بے خبر ہو کر کہ ابو نے اس کی زندگی کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں کیں۔ ابو مرتے وقت ربیعہ ربیعہ کہہ رہے تھے۔ نجانے ان کے دل میں کیا تھا؟ کیا وہ اس کو سب کچھ بتانا چاہتے تھے یا وہ ربیعہ سے معافی مانگنا چاہتے تھے؟ ربیعہ کے علاوہ اگر ان کی زبان کوئی اور لفظ ادا کر پاتی تو شاید سمجھ میں آتا۔ ابو مر گئے۔ تمدن بھائی کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ انہیں ابو کے سامان میں بھی کچھ نہ مل سکا۔ وہ غم وغصے سے گویا پاگل ہی ہو گئے۔ تب ایک دن مینا پھپھو خاموشی سے صولت کو لے کر چلی گئیں۔ کچھ دن بعد خبر ملی کہ مینا پھپھو نے اپنے لیے ایک گھر خرید لیا۔ اور صولت بڑے مزے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ تمدن بھائی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے خبر کی لوٹ پر مینا پھپھو سے سب کچھ اگلا لیا۔ ابو نے ماموں کو بھجوائے ہوئے پیسے فکسڈ اکاؤنٹ میں ڈلوائے تھے جو اتنے عرصے میں دو گئے تھکے ہو چکے تھے۔ ابو کی وفات سے چند روز قبل پھپھو نے ابو کی چھپائی ہوئی چیزوں میں سے بیک کانڈاٹ اور چیک بک نکال کر چھپائی تھی تاکہ پیچھے کوئی سراغ باقی نہ رہے۔ بعد میں پھپھو اس رقم کی بلا شرکت غیرے مالک بن گئی تھیں۔

تہن بھائی پھپھو سے مطالبہ کرنے لگے کہ وہ مکان تہن بھائی کے نام لکھ دیں۔ پھپھو نے صاف انکار کر دیا۔ تہن بھائی کے ہاتھوں پھپھو کا قتل ہو گیا۔ وہ خون آلود پتھر لے کر گھر آئے اور کچھ ہی دیر بعد پولیس وہاں پہنچ گئی۔ ہمارے گھر کو گھیرے میں لے لیا گیا۔ تہن بھائی کو گرفتار کر لیا گیا۔ تصور بھائی فرار ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے فون کر کے گھر نہ لوٹنے کے لیے کہا۔

میں اس وقت آفس میں تھی۔ میں نے عبد الباری کو سب کچھ بتایا۔ یہ مجھے اپنے گھر لے گئے لیکن ان کے گھر والوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے پناہ دینے سے انکار کر دیا بلکہ مجھ پر ریک الزامات بھی عائد کیے۔ عبد الباری اگلے قدموں مجھے وہاں سے لے آئے، ہم نے شام کو باری کے ایک دوست کے گھر نکاح کر لیا اور اگلے ہی دن شہر چھوڑ کر کراچی چلے آئے۔ یہاں باری کے ایک دیرینہ دوست اور رشتہ دار کے توسط سے ہمیں گھر بھی میسر آ گیا اور باری کو جلد ہی نوکری بھی مل گئی۔ یوں زندگی قدرے بہتر شکل میں رواں ہو پائی۔ وہاں تہن بھائی کو عمر قید سنائی گئی۔ تصور بھائی نے صولت سے نکاح کر لیا۔ یوں ان دونوں کا بھی گھر بس گیا۔ سو یہ تھی ہمارے گھر کی کہانی۔ ایک عمری لالچ، طمع اور حرص کا انجام۔ ساری عمر کی پیاس اور خالی ہاتھ رواں گئی میرے باپ کا مقدر۔

ریشہ خواہشات کو اپنے خون سے سیراب کر کے پیشہ کی نیند سو جانا پھپھو کی قسمت اور کھٹکتے سکون کی جھکارت سننے کے شوق میں۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے نبڑا آزمائی تہن بھائی کا نصیب ٹھہرا۔

”ماں۔۔۔ ماں۔۔۔“ اس کے لب دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے اور بند پلکوں سے آنسو رواں تھے۔ اپنا سراپنی ماں کے سینے پر دھرے وہ محض اسی لفظ کی تکرار کیے جاتی تھی۔

”میری بچی۔۔۔ میری بیٹی۔۔۔ میری زندگی۔۔۔“ وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لیے ایک عمر کی تشنگی کو قطرہ قطرہ سیراب کر رہی تھیں۔

عباد، انیقہ، ترانا اور عبد الباری ساکت بیٹھے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ زندگی اتنے رنگ بھی بدل سکتی ہے، یقین کرنا مشکل تھا لیکن جو کچھ بھی تھا، نظروں کے سامنے تھا۔ ”جب آنکھ کھلی تو میری کوکھ خالی تھی ربیعہ! میری ہاتھ خالی تھے، میرا دل خالی تھا۔“

وہ ان ہی الفاظ کی تکرار کیے جاتی تھیں۔

”آج میں آپ کے پیاس ہوں ابی! آپ کے سینے سے لگی ہوئی ہوں۔“

ربیعہ نے ان کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انہوں نے دیوا لگی سے اس کے ہاتھ کو بوسے دیے۔

”اسی لیے چوما کرتی تھی ان ہاتھوں کو میں۔ انہیں دیکھ کر تجا نے کیوں مجھے اپنے اندر پھیلتی وہ منہی انگڑائیاں یاد آیا کرتی تھیں۔“

”محبت کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔“ عباد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں اسی لیے ربیعہ سے سچی محبت محسوس ہوتی تھی۔ یہ تو واقعی ہماری تھی ہی سن نگلی۔“

”کیسے کیسے انجام دیکھے ہیں میں نے۔“ ترانا اداسی سے مسکرائی۔ ”نفرتوں کے انجام اور محبتوں کے انجام۔ کیا عظیم الشان فرق ہے۔“

گھر پہنچ کر سب سے مل کر پھر کسی کو کچھ بھی بتائے بغیر وہ چپ چاپ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی تھی۔ نیکی والے کو مطلوبہ مقام بتا کر وہ پورا رستہ خاموش بیٹھی اپنے دل کی دھڑکنوں کو گنتی رہی۔ نیکی رکی تو وہ باہر نکلے۔ اس کے سامنے واقع اس بلند و بالا عمارت کی تیسری منزل پر اس کا گھر تھا۔ سر اٹھائے وہ کچھ دیر اپنے گھر کی بالکنی کو دیکھتی رہی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پھر یکایک اسے خود پر کنٹرول نہ رہا تھا۔

وہ اندر کی جانب بھائی۔ عمارت میں لفٹ موجود تھی لیکن اس نے سیڑھیوں کا انتخاب کیا۔ تیزی سے

سیڑھیاں پھلانگتی وہ چند منٹوں میں اپنے گھر کے دروازے پر جا پہنچی تھی۔ اس نے چمک نہیں کیا کہ دروازہ لاک تھا یا نہیں۔ اس نے بیل پر انگلی رکھ دی۔ اندر بیل کی آواز گونجی اور تواتر سے بجتی چلی گئی۔ ایک منٹ کے وقفے سے دروازہ کھل گیا تھا۔

ایقان ساکت رہ گئی۔ وہ سامنے کھڑا تھا جیسے کوئی برسوں کا بیمار، بڑھی ہوئی شیو، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، زرد رنگت، تلک بچے کیڑے۔

عاشق بھی اسے دیکھ کر اسی کی طرح سکتے کی حالت میں تھا۔ کتنے ہی پل یوں گزرے تھے پھر نجانے عاشر کو کیا ہوا، اس نے زور سے دروازہ بند کرنا چاہا۔ اگلے ہی لمحے ایقان نے اپنا ہاتھ چوکھٹ پر رکھ دیا۔ اس کے لبوں سے چیخ نکلیا کہ وہ تک نہ نکلی تھی۔ عاشر نے فوری دروازہ کھول دیا اور بے اختیار ہی اس کا ہاتھ تھامتا تھا۔ اس کی انگلیاں بری طرح سے مجھوڑی ہوئی تھیں۔ شدت درد سے انگلیاں تھیلی بنی پڑ گئی تھیں۔ پوریں بالکل سفید ہو رہی تھیں۔ خود اس کا چہرہ اپنی رنگت کھو بیٹھا تھا۔

”پاکل ہو؟“ وہ غرایا۔

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لب لرز رہے تھے۔

”جانتا ہوں۔“ وہ نظریں چڑا کر بولا۔ ”اچھی طرح جان گیا ہوں۔“

”پھر ایک پاگل کو سزا دیتے رہے؟“

”خود ساخت پاگل بن قابل معافی نہیں ہوتا۔“ وہ بے رخی سے بولا۔

”پھر یہ خود ساختہ نظر بندی؟ کیوں؟ خود ساختہ ترک دنیا۔۔۔ یہ کیوں؟“

وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی آنکھوں میں دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اچانک ہی دونوں کو احساس ہوا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وہ گھر کے اندر تک آگئے تھے۔ عاشر نے احساس ہوتے ہی اس کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر اس کی جانب پشت کر لی۔

”میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں۔“ وہ اسی بے رخی سے بولا۔

ایقان دھیرے سے مسکرائی۔ وہ بے رخی سے پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔ وہ آہستگی سے آگے بڑھی اور اس کی پشت پر سر رکھ کر دونوں بازو اس کے گرد حائل کر دیے۔

”اب تم میرے سامنے نہیں ہو اب جواب دو۔“

”تم۔۔۔“ اس کے بدن میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ ”تم۔۔۔ جاؤ یہاں سے۔۔۔ میں۔۔۔ میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا۔“

”میں معافی نہیں اپنا حق مانگنے آئی ہوں۔“

”تم اپنے حقوق میرے منہ پر مار چکی ہو۔“ وہ تلخ انداز میں بولا۔

اپنے گرد حائل اس کے بازوؤں کو سختی سے جھٹک دینے کی خواہش سراٹھا کر پھر سر گرا چکی تھی۔ دم توڑ چکی تھی۔ وہ خود کو بے بس پہنچی محسوس کر رہا تھا۔ ایقان کی بے خود محبت جال کی طرح اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔

”میں آگئی ہوں عاشر! اور ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی۔ مجھے بھولا ہوا مت کہو۔ مجھے برا بھلا مت کہو۔ میں سب کچھ سنوں گی لیکن ابھی نہیں ابھی صرف۔۔۔ صرف اپنی محبت دو مجھے جو تم نے ساری دنیا سے بچا کر صرف میرے لیے رکھی ہے۔ اس محبت پر میرا ایسا ہی حق ہے جیسا میرے وجود پر تمہارا حق ہے۔ پلیز عاشر۔۔۔“

وہ اس کی پشت پر سے گھوم کر اس کے سامنے آگئی۔ عاشر کے لیے مزید مدافعت ممکن نہ رہی تھی۔ دیر یا سارے بند توڑ کا تھا۔ محبت اور آنسو ساتھ ساتھ بہہ رہے تھے۔

”یہ ہو گیا مکمل۔“ اس نے پیلا نیٹ کا خوبصورت دوپٹہ ناعمہ کے اوپر ڈال دیا۔ ہرے گونے کا نہایت نفیس اور باریک کام پورے دوپٹے پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ وردہ کی پورے ایک ماہ کی محنت کا پھل تھا۔
 ”ایسا دوپٹہ کسی دلہن کا نہ ہو گا۔ یاد رکھنا۔“ اس نے ناعمہ پر رعب جمایا۔
 ”واقعی۔۔۔ بہت حسین لگ رہا ہے۔“ اس کی نظروں میں بھی حسین ابھری پھر اگلے ہی پل معدوم ہو گئی۔
 قریب آتے لمحوں کا خیال بہت جانگمسل تھا۔

”شادی کی رات سے قبر کی رات تک تم روز روگی۔ یاد رکھنا۔“
 ایک دوا رنگ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑا دیتی تھی۔
 ”کیا بات ہے؟“ وردہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے شدت سے نفی میں سر ہلایا۔
 ”اتنی دوا اس کیوں ہو رہی ہو؟“

”آپ کو کیا پتہ؟“ گھر سے اتنا دور جانا کتنا مشکل لگتا ہے۔“ اس نے بات بنائی۔
 ”آپ تو اندازہ ہی نہیں کر سکتیں۔“

”کیوں نہیں کر سکتی۔“ وہ مسکرائی۔ ”میری شادی نہیں ہو رہی اس لیے۔“
 ”جی نہیں۔“ وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا آپ تو شادی ہو کر بھی ہمیں رہیں گی۔ یہاں بازو میں تو سسرال ہے آپ کا۔“ وردہ دفعتاً ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔
 اسی لمحے رابعہ بیگم تیزی سے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے چہرے پر خوشی اور انداز میں بے حد گرم جوشی تھی۔

”وردہ۔۔۔ وہ بے ساختگی میں کچھ کتے کتے رک گئیں جیسے انہیں کچھ یاد آیا ہو۔“
 ”جی امی۔“ وردہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”کہیے۔“

رابعہ بیگم نے قدرے تذبذب سے اس کا چہرہ دیکھا، جیسے انہیں اس کی جانب سے کسی قسم کا کوئی خدشہ ہو۔
 ”کہنے امی! کیا بات ہے؟“ وردہ کچھ حیران ہوئی۔

”بیٹا! ابھی عذرا کے پاس سے آ رہی ہوں میں۔ انہوں نے بلوایا تھا۔“
 ”جی امی! اس نے ماں کا چہرہ دیکھا جس پر چراغ سے روشن تھے۔“

”رافع نے۔۔۔ ان سے بات کی ہے۔۔۔ وہ چاہتا ہے کہ پرسوں ناعمہ اور ثانیہ کی مندی کے موقع پر۔۔۔ تمہارا اور رافع کا نکاح ہو جائے اور شادی کے دن رخصتی۔۔۔“

وردہ ساکت کھڑی رہ گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرانی کے سمندر اُبڑ آئے۔ وہ ایک ننگ ماں کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ حیران حیران اور قدرے خوش اور پر جوش سی ناعمہ بھی اس کے عقب میں آکھڑی ہوئی۔

”بولو وردہ! میں انہیں کیا کہوں؟“ انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔
 ”نہیں امی۔۔۔“ وہ سرگوشی میں بولی۔ ”پہ نہیں ہو سکتا۔“

رابعہ بیگم کا چہرہ بھگ گیا۔ ناعمہ نے حیرانی سے بہن کو دیکھا تھا۔
 ”لیکن۔۔۔ وردہ۔۔۔“ انہوں نے قدرے رک رک کر کہنا چاہا۔

”آپ بھول گئیں امی! آپ نے مجھے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار دیا تھا؟“ وہ روہانے انداز میں بولی۔
 ”نہیں۔“ رابعہ بیگم قدرے تاسف سے بولیں۔ ”مجھے اپنا کہنا یاد ہے وردہ! جیسا تم چاہو۔“

”پھر انہیں انکار کر دیں میں رافع سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ وہ دونوں کا انداز میں بولی۔

”ربیعہ..... ربیعہ! پیاس لگی ہے ربیعہ۔“
 ”دادی! دادی! کہاں ہیں آپ؟“ حدنگاہ تک پھیلے ہوئے صحرا میں چمکتی دھوپ جیسے آنکھیں ہی بے جان کیے دے رہی تھی۔

”ربیعہ..... ربیعہ!“ دکھ میں ڈوبی آواز کسی ٹیلے کے پیچھے سے آئی تھی۔ ”میں یہاں ہوں۔ یہاں۔“ ربیعہ اندھوں کی مانند آگے بڑھی۔ دھوپ کی شدت نیزوں کی صورت جسم کے آپار ہوئی جاتی تھی۔ ربیعہ ہاتھ پھیلانے آگے بڑھتی رہی۔

”یہاں گرمی ہے ربیعہ! اندھیرا ہے۔ پیاس ہے۔“ آوازیں ہلا کی حسرت اور پچھتاوے تھے۔
 ”میں..... میں آپ کے لیے پانی لاتی ہوں دادی! میں..... میں روشنی کیے دیتی ہوں۔ آپ میرا انتظار نہ کریں۔“
 ربیعہ دیوانوں کی مانند بھاگنے لگی۔

”روشنی لا دو ربیعہ۔ ذرا سی روشنی۔ ذرا سا پانی۔“
 آواز دم ہونے لگی۔ آسمان پر آگ برساتا سورج غائب ہونے لگا۔ ہر طرف خاموشی، سناٹا اور اندھیرا پھیل گیا۔

ربیعہ کی بند پلکوں میں دھیرے دھیرے جنبش ہوئی۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ماتھے پر قطروں کی صورت ابھرتے سینے اور جسم میں گھٹتے بڑھتے تنفس کے دباؤ کو محسوس کیا پھر گہری سانس لیتے ہوئے یکدم وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کا پورا جسم دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔ ٹھنڈی ہتھیلیاں چہرے پر پھیرتے ہوئے اس نے خود کو مجتمع کرنے کی کوشش کی۔

وہ خواب پوری جزئیات کے ساتھ اب جاگتے میں یاد آ رہا تھا۔ وہ لورنگ ماحول، وہ ہلا کی گرمی۔ وہ گویا حشر کا میدان تھا۔ اس کی دادی کی روح پر عذاب دینے والے فرشتے معمور تھے۔ وہ دنیا میں کی گئی کمائی سے آخرت کا عذاب خریدنے پر مجبور تھیں۔

”دادی!۔“ ربیعہ کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

اس کی پلکوں پر ستارے چمکنے لگے۔ اس کی دادی نے اس کی ماں کے ساتھ بہت برا ظلم کیا تھا۔ اس میں کسی قسم کا ابہام تھا ہی نہیں لیکن اس کی دادی نے اسے ممتا کے ہر ذائقے سے روشناس کرایا تھا۔ ربیعہ کے لیے وہ گرمی کی چھوٹی اور سردی کی دھوپ تھیں۔ وہ اس کی ابتدائی بیس سالہ زندگی کی واحد سانس، واحد غم خوار، واحد مہمان ہستی تھیں۔ انہوں نے کبھی اسے جھڑکا نہ تھا، کبھی اسے سخت نظر سے نہ دیکھا تھا اس کے لیے وہ شیرینی ہی شیرینی تھیں۔ ٹھنڈک ہی ٹھنڈک تھیں۔ محبت ہی محبت تھیں۔ انہوں نے منہزہ بیگم کے ساتھ جو بھی برائی کی مگر ربیعہ کو ہمیشہ اچھائی اور بھلائی کا درس دیا۔ ربیعہ کی ذات میں جتنے بھی ثمر پوشیدہ تھے ان کا بیج دادی نے ہی رکھا تھا۔ ربیعہ کا ان سے قلبی و روحانی رشتہ اتنا گہرا تھا کہ ان کے مرنے کے بعد بھی یہ تعلق ختم نہ ہو سکا تھا۔

اس نے گردن گھما کر برابر میں سوئی ہوئی منہزہ بیگم کو دیکھا ان کے مہر چھائے ہوئے چہرے پر بھی ہلا کا اطمینان تھا۔ زندگی کی آخری گھڑیوں میں انہیں کوئی ملال، کوئی پچھتاوا نہ تھا۔ وہ خدا کے سامنے سرخرو تھیں۔ وہ انی ذات کے سامنے سرخرو تھیں۔ عمر دادی بھی گزار کر گئی تھی۔ عمر اس کی ماں نے بھی گزار دی تھی۔ عمر گزری جاتی ہے لیکن انجام۔ انجام بھر جاتا ہے۔

عاشق نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ بجائے کس وقت گرمی نیند میں چلی گئی تھی۔ اس کی سانسیں کا زیر دم اس کی پُرسکون اور گرمی نیند کا غماز تھا۔ وہ تکیے کے سہارے تھوڑا سا نیم دراز ہو کر بیٹھا پھر اس نے بہت آہستگی سے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھینچ کر سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا اور لائٹر نکالا اور سگریٹ سلا کر ایک گہرا کش لیا۔ رگ و پے میں سکون کی لہر پھیل گئی تھی۔ ایک عرصے سے وہ جس وحشت کا شکار تھا اس سے چھٹکارا مل جانے کا احساس بہت

طاقت و اور خوبصورت تھا۔ اپنی خواہ گاہ میں 'نرم گرم بستر' اپنی محبت کی نگاہوں کی جھوٹی رفیق حیات کے ساتھ موجود ہونے کا احساس۔ سکون وطمینانیت کے اس ڈالنے کو وہ اتنا ترسا تھا کہ تقریباً "بھول ہی چلا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر سوئی ہوئی ایقان پر نظر ڈالی جو سب کچھ بھول بھال کر اس طرح سو رہی تھی۔ گویا اس کمرے سے باہر موجود دنیا سے اس کا نہ کوئی تعلق ہے نہ لینا دینا۔ اسے اپنے بچے تک یاد نہ تھے۔ عذرا بیگم کو فون پر اپنی خیریت کی اطلاع دے کر اور بچوں کی خبر گیری کرنے کی استدعا کر کے وہ مطمئن تھی۔ ادھر "حیات والا" میں تو اس خبر کو جس جس نے بھی سنا تھا اس نے فی الفور اسے مانے ہوئے فعل ادا کرنے کے لیے جائے نماز بچھائی تھی۔ وہاں کے ہر مکین کے لیے یہ ایک روح افزا پیغام تھا۔ ایک ڈھسے کر زمین پر آتا ہوا گھر پھر سے اپنی بنیادوں پر استوار ہو گیا تھا۔ جتنا سجدہ شکر بجالایا جاتا وہ کم تھا۔

عاشر نے سائڈ ٹیبل پر سے موبائل اٹھایا اور کسی کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے فوراً "فون ریسیو کیا گیا تھا۔

"نئی زندگی مبارک ہو۔" چمکتی ہوئی آواز میں کہا گیا۔

"آئی ایم ریلی تھینک فل ٹو یو۔" وہ ممنونیت سے بولا۔

"جائے دو وہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا۔ سوا سے ٹھیک کرنا بھی میری ذمہ داری تھی۔"

"آئی بی وین۔ میری دعا میں تمہارے لیے ہیں۔"

دوسری جانب چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔

"اور میری تمہارے لیے۔" اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔

عاشر کال ڈس کنکٹ کر کے چند لمحے سیل فون ہونٹوں سے لگائے کچھ سوچتا رہا تھا پھر تھوڑی دیر بعد اس نے دوبارہ ایک نمبر ملایا۔

"ہیلو بچھا جی۔" رافع کی چمکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "بھیسپی بخیر۔"

عاشر دھیرے سے ہنس دیا۔ "بالکل۔" وہ بولا تھا۔

"آئی بی رابرٹ؟"

"بالکل بھی کنیس۔"

"ٹریٹ کی؟"

"ہنڈر ڈپر سنٹ۔"

"اوکے سی یو۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔" عاشر نے کال ڈس کنکٹ کر کے سیل برابر میں ڈال دیا۔

سوئی ہوئی ایقان قدرے چونک کر جاگی تھی۔ اس نے جیسے گہرا کر رابرٹ میں عاشر کی موجودگی کا یقین کیا پھر اس کے اعصاب معمول پر آئے۔

"سو جاؤ ایقان۔" عاشر نرمی سے بولا۔

"ہوں۔" اس نے بچوں کی سی تابعداری سے سرواپس تکیے پر ڈال کر آنکھیں موندی تھیں۔

دونوں کے مابین ملاقات کو قریباً "سات آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے لیکن دونوں جانب سے کسی گلے شکوے، شکایت یا الزام تراشی کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ ایک "جیسے تھے" کی تفسیر بن گئے تھے۔ ایقان سرواپس محبت تھی لیکن خاموش تھی بالکل خاموش۔ عاشر پر سکون اور مطمئن تھا جیسے کچھ کہنا کچھ سننا نہ چاہتا ہو۔

ایقان نے اسے لڑا سے ملاقات کا احوال ذرا نہ کہا تھا۔ یوں جیسے وہ بغیر کچھ جانے بوجھ پونی ہار مان کر چلی آئی تھی۔

عاشر نے اسے جاپان سے پاکستان تک چلے آنے کے پیچھے کسی بچھتاوے، تاسف یا شکست کا اظہار نہ سنایا تھا۔

لڑاکا کردونوں میں سے کسی نے بھی نہیں کیا تھا۔ دونوں کچھ تھے کہ وہ ہار کر کسی نہ ہاریں۔ دونوں ہی چاہتے تھے کہ وہ باطرف فتح یاب ہوں۔ دونوں ہی محبت کے امتحان میں ہارے تھے اور اپنی اپنی نظر میں سرخرو رہنا چاہتے تھے۔

عاشق جانتا تھا کہ ایقان کے یوں چلے آنے میں اس کی فراخ دلی کا ہاتھ نہ تھا۔ ایقان سمجھتی تھی کہ واپس پلٹ کر فراخ دلی کا ثبوت اس نے دیا ہے۔ عاشق نے اسے آخر تک نہیں پکارا تھا۔ محبت لیوں پر کھری معنی خیز مسکراہٹ لیے بادل خواستہ کسی پار نہ دعا کی طاقت سے مجبور ہو کر لونی ضرور تھی مگر چپ چاپ تھی۔

ایقان سو رہی تھی اور عاشق چپ چاپ سگریٹ پھونک رہا تھا۔ وہاں سے بہت دور اپنے بیڈ روم میں۔ نیم دراز موبائل پر کوئی گیم کھیلتے ہوئے رافع کا ذہن گیم میں محو نہ تھا۔ وہ ایقان کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ عاشق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تقدیر اور قسمت جیسی چیزوں کے متعلق وہ پہلے کبھی اتنا سنجیدہ نہ ہوا تھا۔ آج اسے پکا یقین ہو چلا تھا۔ آپ قسمت سے منہ پھیرتے رہیں، وہ گھوم گھوم کر آپ کے سامنے آئی رہے گی۔ اس کی ذرا سی پلاننگ سے ایک گھروں سا بن گیا تھا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا لیکن یہ قسمت کو منظور تھا، سو ہوا۔ اور اس کی شنید کاوشوں کے بعد بھی دل کا گرویسے نہ بس سکا جیسے وہ بسانا چاہتا تھا کہ قسمت کو منظور تھا۔ اب وہ رو بھی تقدیر کے سامنے گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا لیکن وہ بے رخی سے منہ موڑے کھڑی تھی۔ اب کیا ہونے جا رہا تھا؟ کس کو علم تھا؟

گیلے بالوں میں بے دھیانی سے برش پھیرتے ہوئے وہ آسمان کی دستکوں کو کھوج رہی تھی۔ اس کی بے چین تلاشی نگاہیں جیسے افق کے پار کسی کو ڈھونڈنا چاہتی تھیں۔ اپنی ہستی اسے ایک جنگسار پزل کی مانند لگ رہی تھی جس کے تمام حصے مل جانے کے بعد بھی ٹھیک طرح سے جڑ نہیں پائے تھے جیسے چند حصے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ ”ربیعہ!“ شملہ نے اسے آواز دی تھی۔

کھڑکی میں کھڑی ربیعہ چونک کر بال سمیٹتے ہوئے وہ پلٹ آئی۔ ”جی آئی۔!“ ”وہاں کھڑی کیا سوچے جا رہی ہو؟“ شملہ نے محبت سے اسے دیکھا اور منہ زہ بیگم کا چہرہ نشو سے صاف کرنے لگی ”وہ انہیں سوپ پلا رہی تھی۔“ ”مجھے تو جب سے علم ہوا ہے تب سے تمہیں دیکھتے ہی پیار آنے لگتا ہے۔ عزیز تو تم پہلے بھی بہت تھیں اب تو عزیز تر ہو گئی ہو۔“

ربیعہ نے آگے بڑھ کر شملہ کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ”میرے دل سے پوچھیے آپ! میں نے کبھی بھی آپ لوگوں کو پرایا یا غیر نہیں سمجھا لیکن امی سے ملنے کے بعد۔ ان کے حوالے سے آپ میرے کتنے اپنے ہو گئے ہیں۔ میں شاید سمجھانہ سکوں۔ ایسا لگتا ہے میرے وجود کے گم شدہ حصے اچانک مل کر میری ذات کی تکمیل کر گئے ہیں۔“ بولتے بولتے اس کی آواز رندنے لگی تو وہ یوں لکھنت خاموش ہو گئی تھی۔

”ربیعہ!“ منہ زہ بیگم نے بازو پھیلائے۔ ربیعہ بے اختیار آگے بڑھ کر ان سے پلٹ گئی تھی۔ منہ زہ بیگم نے اس کے سر کو چوم لیا۔ ”ہائے ربیعہ! اب تو مجھے جیلسی ہونے لگی ہے۔“ انیقا شرارت سے بولی۔ ”جانتی ہو امی کی محبت کا یہ اظہار صرف میرے لیے ہی مخصوص تھا۔ شملہ آئی اور عباد بھائی، امی سے شکایت کرتے تھے کہ مجھے جس۔۔۔ بے اختیاری سے امی پیار کرتی ہیں وہ ان کے حصے میں کیوں نہیں آتی؟“

”تم امی کو اس عمر میں ملی تھیں جس عمر کی اس وقت ربیعہ تھی۔ امی اسی لیے تمہیں پیار کرتے وقت یوں۔ بے اختیار ہو جاتی تھیں۔“ عبادہ پرانہ انداز میں بولا۔
 وہ سب پروانوں کی مانند منیذہ بیگم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔
 ”اس کا مطلب ہے تم میں سے کسی کو بھی مجھ سے سچا پیار نہیں ملا؟“ منیذہ بیگم قدرے روٹھے ہوئے انداز میں بولیں۔

”شہلا، عباد اور انیقہ بے اختیار ان سے لپٹے تھے۔
 ”ہماری سگی ماں بھی ہمیں اس سے زیادہ محبت اور شفقت نہ دے پاتی امی جی۔ اقامت کے دن بھی ہماری یہی گواہی ہوگی۔“ شہلا جذباتی ہو کر بولی تھی۔
 ”میری میری نجات ہے بچو۔“ ان کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ”اپنے آخری وقت میں میں بہت خوش بہت مطمئن بہت محبت مانی ہوں۔ مجھ سا دولت مند کوئی نہیں۔“
 سب کی پلکیں غم ہو گئی تھیں۔

”ابھی آپ نے بہت جینا ہے امی! ہم سب کے لیے۔ ربیعہ کے لیے۔ ہم سب کے دامن آپ کی بے پناہ توجہ اور محبت سے بھرے ہوئے ہیں لیکن ربیعہ۔ یہ تو ابھی کچی مٹی کی مانند تشنہ ہے پیاسی ہے آپ کی محبت اور ممتا کی۔ ابھی آپ نے اسے بھی سیراب کرنا ہے۔“
 عباد ان کے دونوں ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ منیذہ بیگم بے بسی سے مسکرا دیں جیسے عباد کی بات رد کرنے کا حوصلہ ان میں نہ ہو لیکن اسے پورا کرنا بھی ممکن نہ دکھائی پڑتا ہو۔
 ربیعہ کی آنکھوں میں دھواں سا بھرنے لگا تھا۔

وہ رات گئے تک اسٹڈی میں مصروف تھا۔ عموماً ”ربیعہ یا انیقہ چائے کا تھرماس بھر کر اس کی اسٹڈی میں رکھ دیا کرتی تھیں۔ وہ بستر تک جانے سے پہلے دو تین کپ چائے ضرور پی لی لیا کرتا تھا لیکن آج غالباً ”ان دونوں کو ہی علم نہ تھا کہ عباد کا سونے سے قبل کچھ مطالعے کا ارادہ ہے۔ وہ بزنس قوانین سے متعلق کتابیں کھول کر بیٹھا ہوا تھا تب ہی بے اختیار اس کی نظر دروازے کی جانب اٹھ گئی، جہاں منیذہ بیگم کھڑی ہوئی تھیں۔ عباد بے اختیار اٹھ کر ان کی جانب بڑھا تھا۔

”امی جی۔ اکیوں جلی آئیں آپ؟“ وہ پریشان ہو کر ان تک پہنچا اور انہیں تھام لیا۔ ”کچھ تکلیف ہوئی؟“
 ”میں بالکل ٹھیک ہوں نیچے۔“ وہ مسکرا دیں۔ ”اتنا پریشان مت ہو۔“
 عباد انہیں سارا روئے کر اندر لے آیا۔
 ”بیٹھیں۔“ اس نے انہیں نرم کاؤچ پر بٹھایا اور خود ان کے قریب نیچے کارپٹ پر بیٹھ گیا۔ ”اور اب بتائیں اتنی رات کو آرام نہ گرم بستر سے اٹھ کر آنے کا کیا مقصد ہے؟“
 منیذہ بیگم نے محبت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”میں نے سوچا کہ ایک نظر دیکھنے کا خیال آیا تھا۔“ وہ لبوں پہ نرم مسکان سجائے بولیں۔
 ”ربیعہ سوئی؟“ عباد نے پوچھا۔

”ہاں پورا دن میری خدمت کر کے بہت تھک جاتی ہے۔ وہ بے خبر سو رہی ہے۔“
 ”آپ کی خدمت عین عبادت و سعادت ہے ہم سب کے لیے۔“ عباد نے ان کا ہاتھ تھاما۔
 ”عباد۔!“

”جی امی۔! حکم۔“
 ”بیٹا! ایک بات کہنا چاہ رہی تھی تم سے۔“ وہ قدرے ہچکچا کر بولیں۔
 ”آپ کہیں امی جی۔!“ عباد نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھا۔

”عباد! اس دن امیر حسن کے ساتھ۔۔۔ جولا کا آیا تھا۔۔۔“ وہ ذرا کی ذرا رکیں۔

”شہرارا احمد“ عباد فوراً بولا۔

”ہاں۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولیں۔ ”شہرارا احمد“ میں نے تم سے اس کے والد کا نام دریافت کیا تھا۔ جانتے تھو کس لیے؟“

عباد جواب دیے ہاں کی اداس آنکھیں دیکھتا رہا۔

”وہ لڑکا۔۔۔ ہو ہو احمد جہاں زیب کی تصویر ہے۔ ہو ہو عباد۔ ہو ہو وہی۔۔۔ ربیعہ کے والد۔ احمد جہاں زیب۔۔۔ میں نے جس لمحہ اسے دیکھا، کوئی انتخابی طاقت مجھے پوری شدت سے دھکیلتی ہوئی ماضی کی بھول بھلیوں میں لے گئی۔ میرا پورا جسم پسینہ پسینہ ہو گیا۔ مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے ایک فریم میں قید کر دیا ہو۔ آج سے پچیس برس پہلے کی تصویر کے فریم میں۔“

عباد نے ان کے نحیف جسم کو کاٹنے ہوئے دیکھا۔ اس نے ان کے منہ ہوتے ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں دباتے ہوئے انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

”پھر میں نے تم سے اس کے باپ کا نام پوچھا اور میرے شک پر تصدیق کی مہر ثبت ہو گئی۔ ہاں ہاں عباد۔! مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لڑکا۔۔۔ ربیعہ کا بھائی ہے۔ احمد جہاں زیب کا بیٹا۔۔۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان کے ہونٹ دھیرے دھیرے کپکپا رہے تھے۔

”کیسا انہونا اتفاق ہے۔“ عباد بڑبڑایا۔

”نہیں۔۔۔ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں عباد! اگر واقعی وہ ربیعہ کا بھائی ہے تو ان رشتوں کو ملنا چاہیے۔ ربیعہ کو اپنے بھائی سے اپنے باپ سے ملنا چاہیے۔“

ان کا لہجہ بھرا گیا۔

”لیکن انہوں نے آپ کے ساتھ کیا کیا تھا امی جی۔! عباد کو ان کے ساتھ ہونے والی ساری نا انصافیاں یاد آگئیں۔“ ربیعہ کیوں ملے ان سے۔“

”میں نے اپنے تمام معاملات خدا کے سپرد کر دیے ہیں میرے بیٹے! وہ رونے لگیں۔“ اس کے بعد مجھے کچھ اختیار نہیں رہا کہ میں کسی شخص کے خلاف اپنے دل میں کچھ کدورت رکھوں۔ میرا اللہ سب کا حساب کتاب انصاف سے کرے گا۔ مجھے پورا یقین ہے۔“ عباد نے بے اختیار ہو کر ان کے ہاتھوں کو چوما اور آنکھوں سے لگا لیا۔

”ٹھیک ہے امی جی۔! پھر وہ بولا تھا۔“ امیر حسن یوں بھی آپ کی عیادت کے لیے آنا چاہتا ہے۔ میں شہرارا کے لیے بھی اصرار کروں گا۔ میں۔۔۔ میں کل ہی انہیں بلواتا ہوں۔“ اس نے انہیں تسلی دی۔



شام ست رنگی چنڑا اوڑھ کر ”حیات ولا“ میں اتری تھی۔ وسیع و عریض رقبہ کے حامل بورے گھر پر تازہ رنگ و روغن کے بعد ہونے والی لافٹنگ نے ایک عرصے کے بعد کوئے کوئے کو رونق اور دلکشی کا اچھوتا احساس بخشا تھا۔ جابجا دھنک کے سب ہی رنگ بکھرے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

عمارت کے پچھلے وسیع لان کو غلط طور پر سجایا گیا تھا۔ یہاں بیک وقت تینوں دہنوں کی رسم مہندی کا انتظام کیا گیا تھا۔ رنگین قاتیں باندھ کر کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ کرسیوں کے درمیان میں اسٹیج اس طرح بنایا گیا تھا کہ ہر طرف سے مہمانان رسمیں وغیرہ دیکھ سکیں۔

شام ابھی اتری ہی تھی لیکن تمام لائٹس آن تھیں۔ جابجا رکھے گئے تازہ پھولوں کے گلدستوں نے ماحول کو لطیف و معطر بنادیا تھا۔

پورے ماحول کا یہ نظر غائر جائزہ لینے کے بعد عریضہ نے کھڑکی بند کر دی پھر رخ موڑ کر کھڑکی سے ٹیک لگا کر وہ کچھ

سوچنے لگی تھی۔ نچلے لب کا کونا اس کے دانت تلے دبایا ہوا تھا۔ آج بڑے معر کے کا وقت آیا تھا۔ اس کے برابر بیٹھی ہوئی ناعمد اور سامنے بیٹھا ہوا فرانسیسی۔ کیا کڑا وقت گزرنا تھا اس کے ناتواں دل پر آج۔
 فراز کی چیخیں بہنوں کی فرمائش تھی کہ دو لہا، دو لہن کی رسم ہندی ایک ہی موقع پر سرانجام دی جائے۔ بزرگوں نے بھی بچوں کی خوشی کا خیال کرتے ہوئے نہ صرف اجازت دے دی تھی بلکہ نافع کی رسم ہندی بھی اسی وقت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”عریضہ! ماہین کی حیرت بھری آواز پر وہ چونکی تھی۔ ”وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ میں نے تمہارا جوڑا واش روم میں لٹکایا ہے تمہارا کپڑا۔“
 عریضہ نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ماہین اس کے قریب آگئی پھر اس نے پیار سے بہن کی ٹھوڑی کو چھوا۔

”تینوں دہنوں میں میری بسن لاجواب ہوگی۔ دیکھ لیتا، آج پیلا جوڑا کیا غضب ڈھائے گا۔“
 عریضہ کے لبوں پر ایک ناسمجھ میں آنے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
 ”غضب ہی تو ڈھاتا ہے۔“ اس نے سوچا تھا۔
 پھر وہ خاموشی سے واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی۔

کھانے اور دیگر انتظامات کا جائزہ لینے کے بعد وہ نہانے کے ارادے سے تھکا ہوا سا کمرے میں داخل ہی ہوا تھا کہ یکایک ٹھنک کر رک جانے کے تمام لوازمات نگاہوں کے سامنے آئے تھے۔
 شہلا گمرے زرد رنگ کی بتاری ساڑھی زیب تن کیے، سر پاننا زین کھڑی تھی۔ وہ کلائی میں موتیے کے میکتے پھولوں کا گجرا پہننے کی کوشش کر رہی تھی۔ خود پر از حد جبر کر کے بھی ہاشم اس منظر سے آزاد ہونے میں ناکام ٹھہرا اور ٹکنکی باندھ کر اپنے کام میں منہمک شہلا کو دیکھ گیا۔

گمرا زرد رنگ اس نے شاید پہلی مرتبہ پہنا تھا اور اس رنگ میں وہ کس قدر حسین نظر آتی تھی۔ شاید اسے خود بھی احساس نہ تھا۔ کمر تک آتے سیاہ، گھنیرے، چمکیلے بال اس نے کئی دن بعد یوں سنوار کر کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔ بالوں میں لٹکائی ہوئی ڈھیروں ڈھیروں موتیے کی لڑیاں اس کے دونوں کندھوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ گلے میں سچے موتیوں کا گلہ بند اور کانوں میں آویزے تھے۔ خوبصورت آنکھوں کو مسکارے اور لافٹوں نے مزید قاتل بنا دیا تھا۔ ہونٹوں پر گہری سرخ لپ اسٹک تھی۔ اتنا چمکدار، ہمکتا روپ تو ہاشم نے شاید سہاگ رات کو بھی محسوس نہ کیا تھا۔ یکایک اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی دیوانی محبت سے شہلا کا سارا روپ بگاڑ دے۔ اس کے تکسک سے درست انداز کو بکھیر سادے۔

شہلا اچانک چونکی تھی۔

”اوے آپ۔ آپ کب آئے؟“
 ہاشم کو خود میں لوٹنے میں چند لمحے لگے۔
 ”نہیں۔ بس۔ ابھی۔“

”انتظامات مکمل ہیں؟“ وہ گجرا لیے اس کے قریب چلی آئی۔

”ہاں۔ بالکل۔ رافع نے سب ہی کچھ اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے۔“ اس نے بالوں میں انگلیاں چلائیں۔

”چھائیہ یہ ذرا گجرا تو بند کر دو۔“ شہلا نے کلائی آگے کی تھی۔

ہاشم نے کسی معمول کی مانند گجرا لیا تھا۔ شہلا کے مخصوص پر ہیوم کی دلکش مہک نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ ہاشم نے اسے گجرا پسندایا۔ شہلا نے اس کے جذلوں کی گرمی کو بالآخر محسوس کیا تھا۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے نظریں اٹھائیں پھر فوراً ہی جھکا لیں۔ راز و نیاز کرتی ان آنکھوں سے باتیں کرنا اس کے لیے کار و شوار تھا۔

موبائل کی بیسٹ نے دونوں کو کسی رُفوں لمحے کی گرفت سے آزاد کیا تھا۔ شہلا چونک کر موبائل کی جانب بڑھی۔ ہاشم اس کی پشت پر بکھرے بالوں کو دیکھتا ہوا ڈرنک روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔
”ہیلو“ شہلانے کال ریسیو کی تھی۔

الماری سے اپنا ہینک کیا ہوا کرنا شلوار نکالتے ہوئے ہاشم کے ہاتھ ہتھم گئے۔ اس نے شہلا کی بہت دلکش، مترنم ہنسی کی آواز سنی تھی۔ اس ہنسی میں اس کے روپ سے بڑھ کر نازیکی پوشیدہ تھی۔
”ہاں زندگی۔ بولو۔ میں تمہارے ہی فون کی منتظر تھی۔“

ہاشم نے لمحہ بھر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایسا لہجہ، ایسے الفاظ، کبھی اس کا بھی مقدر نہ بنے۔
”بہت تنگ کرنے لگے ہو مجھے، خفا ہو گئی تھی میں تم۔“ وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ کمرے میں چل پھر کر چیزیں بھی ان کی جگہوں پر رکھ رہی تھی۔

”میری جان۔! میں نے کبھی تم کو خود سے دور محسوس کیا ہی نہیں پھر بھی تمہیں دیکھنے کو پیار کرنے کو میرا دل تڑپتا ہے۔ تمہارا دل نہیں کرتا اپنی مہما سے ملنے کو؟“
ہاشم کے لبوں سے گہری سانس آزاد ہوئی۔

”بس کچھ وقتی مصیوبات ہیں پھر مہما ہوں گی اور مہما کا بیٹا۔!“ وہ ہنستے ہوئے تولیہ لٹکانے کے ارادے سے ڈرنک روم میں آئی تھی۔
ہاشم کو ہنوز وہیں کھڑا دیکھ کر وہ ٹھنک گئی۔ ہاشم قدرے خفیف سا ہو کر واش روم میں گھس گیا تھا۔ شہلانے تولیہ لٹکایا اور کچھ سوچتے ہوئے عمر کی معصوم باتوں پر ہوں ہاں کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

لڑکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر روایتی گیتوں کا آغاز کیا تھا جو کچھ ہی دیر بعد فلمی، علاقائی اور مختلف قسم کے گانوں سے ہوتے ہوئے شور شرابے اور پھبتیوں کا رخ اختیار کر گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح لڑکے بھی ڈفلیاں اور سیٹھیاں لیے محفل میں شریک ہو گئے تھے اور ”وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ“ کے نظریے کو الٹا ثابت کرنے کے لیے اپنی پوری پوری توانائیاں صرف کر رہے تھے۔ ایقان کا جوش اور ولولہ عروج پر تھا۔ سب کی چھیر چھاڑ، شرارتوں اور شوخیوں کا برا منائے بغیر مفصل جواب دیتے ہوئے وہ جان محفل نظر آرہی تھی۔ گہرے سبز رنگ کے لباس میں اس کی خوبصورت رنگت لودے رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک عجب چمک تھی جیسے آئینے کو بہت سی روشنیوں میں آئینے کے ہی مقابل لے آیا جائے۔ ڈھولک بجائی، بلند لے میں آواز کا جادو جگاتی وہ طلسماتی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے رافع کسی کام کا خیال آجانے پر پلٹ رہا تھا جب عاشر سے ٹکراتے ٹکراتے بھا۔

”دیکھ کر بھائی! عاشر نے اسے بازوؤں سے تھاما۔ ”کہاں کھوئے ہوئے ہو؟“

رافع نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔

”اپنی پیچھے جان“ کا بدلا بدلا خوبصورت روپ دیکھ کر خوش ہو رہا ہوں۔ روپ تو پیچھا جان آپ کا بھی دمک رہا

”آس نے کلین شیو ہوئے نک سب سے درست عاشر پر غور کرتے ہوئے کہا۔ دونوں نے ایک قہقہہ لگایا تھا۔
لڑکیوں کے درمیان بیٹھی ایقان ان کے قہقہے کی سمت متوجہ ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے لیے اس نے غور کرنے کی کوشش کی کہ وہ دونوں کس بات پر ہنس رہے تھے پھر سر جھٹک کر اپنے گیت کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”ماشاء اللہ۔“ وردہ کے لبوں سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔ زرد لباس پر اس کا بنایا ہوا نیٹ کاپیلا اور ہر دوپٹہ اوڑھے دونوں کلائیاں ہری چوڑیوں سے بھرے ناعمہ سادہ روپ میں بھی فرشتوں کی سی معصومیت اور دلکشی کا

پیکر معلوم ہوتی تھی۔

اس نے بہن کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔ دونوں کا ہی دل بھر آیا تھا۔ ناعمہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ ورہ نے خود پر کڑا ضبط کر کے آنسوؤں کو اپنے اندر ہی اتار لیا اور ناعمہ کا چہرہ صاف کرنے لگی۔ ”برہی بات ہے۔“ اس نے چھوٹی بہن پر رعب جمائے کی ناکام سی کوشش کی۔ ”امی نے اگر تمہیں یوں نیر بہاتے دیکھ لیا تو وہ اپنا ضبط کھو بیٹھیں گی۔ اگر تم چاہتی ہو کہ امی خوشی خوشی تمہیں دواغ کریں تو اپنے آنسوؤں پر قابو رکھنا۔“

”آپی!“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”امی کے لیے ہی یہ بل صراط پار کر رہی ہوں، صرف ان کی خوشی کے لیے۔“ ”برہی بات ہے۔ ایسے مت کہو۔ فرازا اچھا لڑکا ہے۔ خوش رکھے گا تمہیں۔۔۔ ذرا اسی غلط فہمیوں سے زندگی کی مضبوط بنیادوں کا کچھ نہیں بگڑتا۔ ہر طرح کو ہم اور دوسو سے دل سے نکال کر نئی زندگی کی شروعات کرنا۔“ ”مجھے اپنی پروا نہیں۔“ اس نے سوس سوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ”صرف امی کا خیال ہے، آج احساس ہو رہا ہے کہ ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے اور اس سے یوں جدا ہونا لڑکیوں کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔“ ”یہ دکھ۔۔۔ نئی خوشیوں کی اساس ہونا ہے ناعمہ۔“

”ہاں۔ اگر خوشیاں مقدر میں ہوں تو میں تو خوف اور دوسو سے بھری انجالی دنیا میں قدم رٹنے جاری ہوں۔ مجھے تو یہ جدائی اور بھی مشکل معلوم ہو رہی ہے۔“

اتنے عرصے بعد آج وہ بہن کے سامنے کھل کر بول رہی تھی کہ دل کا بوجھ آج سوا معلوم ہوتا تھا۔ ”میری بہن بہت بہادر، بہت ہمت والی ہے۔ تم نے جس صاف دلی اور ثابت قدمی سے یہ محاذ لڑا ہے، اللہ تمہیں ضرور اس کا اجر دے گا۔ جو دوسروں کے پردے رکھنا جانتا ہے، خدا اسے ہر مشکل سے بچاتا ہے۔“ ”وہ نہ اس کے دل کا بوجھ کم کرنے کی بھرپور سعی کی۔ ناعمہ گہری سانس بھر کر کچھ سوچنے لگی تھی۔

پینڈال میں سب ہی آچکے تھے اب صرف فراز کے کھوالوں کا انتظار تھا۔ نافع کے مخصوص بے تکلف دوستوں کو انتظامات دیکھنے کی ہدایت کرتا ہوا رافع، ہاشم کو ڈھونڈنے چلا ہی تھا کہ ٹھک کر رک گیا۔

شہلا کی ہمراہی میں انبیقہ اور ربیعہ آ رہی تھیں۔ رافع نے سوچا کہ وہ مڑ جائے یا وہ ان سے کترا کر گزرے یا پھر دو گھڑی ٹھہر کر اس سے کلام کر لے۔ دل ناواں نے لمحہ بھر میں کئی صورتوں پر غور کیا۔ ربیعہ کا دل اسے یوں راہ میں حائل دیکھ کر مختلف لے پر دھڑکا تھا۔ اس نے سوچا۔ وہ رکے بغیر شہلا اور انبیقہ کے ساتھ سرچھکا کر گزر جائے یا یوں ظاہر کرے جیسے اسے دیکھا ہی نہیں یا پھر اس کے پاس ٹھہر کر اس کا حال پوچھے۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم، ایک سی کیفیت کا شکار تھے۔ اچانک دونوں ہی چونکے تھے۔ شہلا اور انبیقہ اپنی دھن میں باتیں کرتی کب کی آگے نکل گئی تھیں۔ ربیعہ نجانے کب اور کیسے وہیں ٹھہر گئی تھی۔ ڈھیر ساری روشنیوں اور خوشبوؤں کے ہالے میں بس وہی دونوں وہاں کھڑے رہ گئے تھے۔

”آپ۔“ ربیعہ بے ساختہ ہی گھبرا کر بولی۔

”آپ۔“ رافع نے چونک کر بے ساختگی سے کہا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ پھر دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔

پھر دونوں کو ہی اس عجیب سی صورت حال پر ہنسی آگئی۔

”بہن اور بھائی کی شادی مبارک ہو آپ کو۔“ ربیعہ بولی۔

”شکریہ۔“ وہ مختصر ”بولا۔“

مزید رکے گا کوئی جواز نہ تھا۔ ربیعہ سر جھکا کر آگے بڑھ گئی۔ رافع کو ایک یوں محسوس ہوا جیسے ساری روشنیاں اور خوشبوئیں اس کے قدموں سے بندھ ہی گئیں۔ اس کے ساتھ پورا منظر ہی جانے لگا۔

”ربیعہ۔“ وہ بے ساختہ پکارا۔

ربیعہ کے قدم ٹھم گئے، وہ ہلٹ کر دیکھنے لگی۔ چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا وہ صحرائیں یا دل کی مانند تھا۔ وہ کسی سراب کی مانند تھا۔ اس کی نظروں کی وہ باتناکی صرف اس کے لیے تھی یا سب ہی کے لیے تھی؟ اس کے لبوں کی وہ مہمان مسکراہٹ اس کے دیدار کی عطا تھی یا ہمیشہ وہ لب یونہی مسکراتے تھے؟

* زندگی سے لگتے ہو، زندگی سے ملتے ہو
ایسی ہی خوشی سے کیا ہر کسی سے ملتے ہو؟
خوابوں سے جی دنیا اک تمہارے آنے سے
روشنی سے لگتے ہو، چاندنی سے ملتے ہو؟

اپنے درمیان ایک مقناطیسی کشش کے زیر اثر دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے عجب کیفیت کا شکار تھے۔ دفعتاً نوردار آوازوں کے ساتھ آسمان رنگ برنگ روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا اور ربیعہ اور رافع جیسے کسی طلسم سے آزاد ہوئے۔ ربیعہ نے گہرا کر آسمان کی طرف دیکھا جو بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ رافع تیزی سے باہر کی جانب پڑھا تھا۔ یہ فراز کے گھروالوں کی آمد کا اعلان تھا۔

”امی جی۔۔۔“ عباد نے انہیں پکارا۔

منیہ بیگم کی بند پلکوں میں لرزش سی ہوئی۔ نجانے وہ سوئی ہوئی تھیں یا کسی گزشتہ یاد کا عکس ان کی غم پلکوں پر لڑاں تھا۔

”جی بیٹی! کہیے۔“ ان کا لہجہ بھی بھیگاہیگا سا تھا۔

”امیر حسن اور شہیار احمد آئے ہیں۔“ عباد نے سہارا دے کر انہیں بٹھایا۔ ”آپ کو ذرا تنگ روم میں لے چلوں؟“

”نہیں۔“ وہ تھکے تھکے سے انداز میں بولی تھیں۔ ”میں نہیں یہیں لے آؤ، اپنے ہی بچے ہیں۔“

”جی بہتر۔“ عباد باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

انہوں نے امیر حسن اور شہیار احمد کو خاص طور پر اسی وقت بلوایا تھا۔ وہ یہ باتیں ربیعہ کی غیر موجودگی میں کرنا چاہتی تھیں، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اس پر کسی ایسی بات کا انکشاف ہو جو اس کے نازک دل کو مزید ٹھیس پہنچانے کا باعث بنے۔

عباد کی ہمراہی میں وہ دونوں اندر داخل ہوئے تھے۔ دونوں نے انہیں بہت احترام سے سلام کیا اور ان کی خیریت دریافت کی۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بچو! اللہ تمہیں صحت، تندرستی عطا فرمائے، خوش رکھے۔ بیٹھو امیر حسن۔۔۔“

”شہیار۔۔۔ آپ یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔“

امیر حسن اور شہیار احمد کی آنکھوں میں عجب تاثر ابھرا تھا۔ امیر حسن عباد کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا جبکہ شہیار ان کے قریب جا بیٹھا۔

منیہ بیگم نے بہت محبت سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔

”بیٹی! میں نے آپ لوگوں کو پریشان تو نہیں کیا؟“

”کیسی باتیں کرتی ہیں آئی! ہمارے لیے تو یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ ہم تو ایسے بھی آپ کی عیادت کے لیے آنا چاہتے تھے۔“ وہ بھی بہت محبت بھرے انداز میں بولا۔

”مجھے خوشی ہوگی اگر آپ مجھے“ امی“ کہو۔“ منیہ بیگم آہستہ سے بولیں۔

”ضرور۔۔۔“ شہریار نے ان کے ہاتھ تھامے۔ ”آپ کو دیکھ کر“ ماں“ کا ہی خیال آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، عباد صاحب بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ ان سے بہت پیار کرتی ہوں گی۔“

”سب ہی ماں اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں۔“ منیوہ بیگم دھیرے سے مسکرائیں۔ ”آپ کی امی بھی آپ سے پیار کرتی ہوں گی۔“

شہریار کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے اداسی بکھری تھی۔

”شہریار کی ممانہ شہریار کی پیدائش کے چند سال بعد ہی وفات پا گئی تھیں۔“ امیر حسن نے دھیرے سے بتایا۔

”میری ممانہ ہم دونوں کی دیکھ بھال کی۔ میری ممانہ شہریار کی ممانہ نہیں تھیں۔“

”اوہ۔ افسوس ہوا بیٹے آپ کی والدہ کے بارے میں جان کر۔“ منیوہ بیگم کے چہرے پر کرب کا سایہ لہرایا تھا۔

”اور آپ کے والد۔۔۔؟“

”میرے والد کا تعلق پاکستان سے ہی ہے۔ برسوں پہلے وہ ہمیشہ کے لیے وہیں سکونت پذیر ہو گئے تھے۔ میرے نانا ایک انڈین تھے۔ کاروبار کے سلسلے میں برطانیہ گئے پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کی دو بی بیٹیاں تھیں۔ میری ممانہ پیدائشی طور پر دل کی مریضہ تھیں۔ ان کے دل میں سوراخ تھا۔ ایسے میں ان کی ملاقات میرے بابا احمد جہاں زیب سے ہوئی، جنہوں نے یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی کہ ممانہ کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، ممانہ کو اپنا رفیق سفر بنالیا۔ نجانے کیوں وہ شروع سے کہتے ہیں کہ ان کے دل میں بھی سوراخ ہے، اسی لیے انہوں نے ممانہ سے شادی کی۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ ڈاکٹرز کے مطابق ان کا ہارٹ بالکل پرفیکٹ ہے پھر بھی نجانے کیوں بابا اپنی بات پر اٹل ہیں۔ انہیں وہم ہے کہ وہ دل کے مریض ہیں۔“

شہریار احمد سادگی سے کہہ جا رہا تھا۔ عباد نے اپنی ماں کی پلکوں پر ستارے سے چمکتے دیکھے۔

”پچھلے چند سالوں سے انکل پیرا انڈین ہیں۔“ امیر حسن گویا ہوا۔ ”وہ صرف اشارے سے اپنا مدعا بیان کر سکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہے جو اندر ہی اندر انہیں گھلاتا ہے لیکن انہوں نے کبھی کسی سے کچھ کہا نہیں۔ شہریار سے بھی نہیں۔“

”لیکن میں جانتا ہوں بابا کے ماضی کے متعلق۔ مجھے ان کے ایک بہت گہرے دوست نے بہت کچھ بتایا ہے۔“ شہریار نے بہت سکون سے کہا پھر اس نے منیوہ بیگم کا چہرہ دیکھا۔ حقیقت یہ تھی کہ عباد نے ان دونوں کو اعتماد میں لے کر سب ہی کچھ بتایا ہوا تھا اور شہریار نے بہت سی باتوں کی تصدیق بھی کی تھی لیکن منیوہ بیگم کے کتھار سس کے لیے وہ لوگ دھیرے دھیرے ساری باتیں کر رہے تھے۔

”گیا۔ کیا بتایا انہوں نے آپ کو؟“ منیوہ بیگم نے بے چینی سے پوچھا۔

”بابا۔۔۔ پاکستان چھوڑ کر گئے تو وہ غیر شادی شدہ نہ تھے۔ انہوں نے۔۔۔ ایک کرپشن خاتون کو مسلمان کر کے ان سے شادی کی تھی لیکن بعد میں غلط فہمی کا شکار ہو کر انہوں نے ان خاتون کو ڈائی ورس دے دی تھی۔“

ایک آنسو منیوہ بیگم کی آنکھ سے بہہ کر ان کی گردن کی جھریوں میں کھو گیا۔ بہت ضبط سے انہوں نے باقی اشکوں کو اپنے اندر ہی سمیٹ لیا۔

”آپ کے بابا۔۔۔ جانتے ہیں۔۔۔ کہ انہیں غلط فہمی ہوئی تھی؟“ بہت سی آہوں اور سسکیوں کا گلا گھونٹتے ہوئے انہوں نے دھیرے سے پوچھا۔

”جی ہاں۔۔۔“ شہریار پھر پورا اعتماد سے بولا۔ ”وہ جانتے ہیں کہ انہیں غلط باتیں بتائی گئیں۔ انہیں اصل رستے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ان سے جھوٹ در جھوٹ بولا گیا تھا اور ایسا کرنے والا کوئی اور نہیں، ان کی اپنی ماں اور بہن تھیں۔“

”الحمد للہ۔“ منیوہ بیگم نے زریب کہا اور آنکھیں بند کر کے سکون کا ایک گہرا سانس لیا۔

شہریار، امیر حسن اور عباد نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ کئی پل یوں گزرتے۔ منیوہ بیگم کی بند پلکوں میں جنبش نہ ہوئی۔

”یہی۔۔۔“ عباد گھبرا سا گیا۔

منیہ بیگم نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا اور سکون و اطمینان سے مسکرائیں۔ عباد کو یک گونہ تسلی ہوئی۔

”ادھر آؤ بیٹے۔۔۔ میں آپ کی پیشانی چومنا چاہتی ہوں۔“ انہوں نے شہیار کی جانب ہاتھ بڑھائے وہ فوراً ”ان کی طرف جھکا تھا۔ منیہ بیگم نے اس کی پیشانی پر محبت سے بوسہ دیا اور اسے سینے سے لگا لیا۔“
”میں تمہاری ماں ہوں شہیار۔۔۔ مجھے اپنی ماں سمجھو۔۔۔ میں تمہاری بہن کی ماں ہوں۔“
شہیار کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنایا۔
”انسان بہت ناشکر اور جلد باز ہوتا ہے۔“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”کبھی میں ایک بیٹی کے چھن جانے پر تڑپ تڑپ کر روتی تھی اور آج میری ممتا کو سیراب کرنے کے لیے میری اتنی بیٹیاں اور بیٹے میرے پاس ہیں۔“
امیر حسن بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب آ بیٹھا تھا۔ منیہ بیگم نے اسے بھی ہار لیا۔
”میری بیٹی بہت امتحانوں سے گزری ہے۔ خدا نے اسے سب ہی آزمائشوں میں سرخرو کیا۔ اسے سب ہی رشتہ عطا کیے۔ اے میرے رب! تیرا شکر ہے۔“

وہ اپنے بچے رب کی بے پایاں عنایتوں پر شکر گزار تھیں۔

اس نے خود کو کونکے کی طرح دکھاتا ہوا محسوس کیا تھا۔

اس کے بائیں جانب ٹائیپ بھی اسی کی طرح زرد پیراہن میں ملبوس۔ بائیں جانب ناعمدہ تھی جس کا چمکتا روپ اس کے گھونگھٹ کی آڑ سے بھی اپنی روشنیاں بکھیر رہا تھا اور اس کے عین مقابل صوفے پر بیٹوں بیچ فرازا ہستادہ تھا۔ میروں، خوبصورت شیروانی زیب تن کیے وہ بہت پر تمکنت اور پر کشش نظر آ رہا تھا۔ عریشہ کو احساس ہوا، کسی نے اسے نگاہیں جھکانے کی ہدایت کی ہے پھر اسے احساس ہوا کہ وہ کھلمکھ باندھ کر فراز کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے بدقت تمام نظریں جھکا لیں۔

فراز کے گھر والوں نے عین وقت پر نکاح کی اجازت طلب کر لی تھی تاکہ شادی کی تقریب میں وقت بچانے کا اہتمام کیا جاسکے۔ کسی کو اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ سو مختصر سے وقت میں اس ضروری کام کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے لیا گیا تھا۔ ناعمدہ فراز کی منکوحہ ہو چکی تھی۔ اس کے دل کی کیا حالت تھی عریشہ کو علم نہ تھا لیکن اس کا اپنا دل کونکے کی مانند دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس شر سے وہ ناعمدہ کے گھونگھٹ کو آگ لگا کر اسے بھی زراکھ بنا ڈالے۔ سامنے بیٹھے مطمئن و خوش خرم فراز کا گریبان تار تار کر کے اس کے چہرے پر پھیر سائے اور اپنے دل کو پیراؤ کرنے کی وجہ پوچھے۔ وہ سلگ جا رہی تھی۔ تب ہی نافع اگر فراز کے قریب بیٹھا تھا۔ چلتی، سلگتی عریشہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹھکی گئی۔ اس نے بہت دنوں کے بعد اسے دیکھا تھا۔ یوں بالمشابہت دیکھا تھا۔

سفید شلوار اور سلو شیروانی میں گورا چٹان نافع اتنا وجہ لگ رہا تھا جیسے آدھی رات کو چاند کے بجائے سورج نکل آئے۔ عریشہ کو اپنی نظموں پر اعتبار نہ آیا۔ فراز کے ساتھ بیٹھا ہوا نافع وجاہت میں فراز کو بھی مات دے رہا تھا۔ وہ چونکہ اپنوں میں ہی اگر بیٹھا تھا۔۔۔ لیے اس کے انداز میں فراز کا سا تکلف نہ تھا۔ وہ خوش باش اور بے فکر نظر آتا تھا۔

”یہ اجتماعی شادی کون کروا رہا ہے؟“ علی نے اسٹیج پر نظر ڈال کر پوچھا تو ایک قہقہہ پڑا تھا۔

”یہی کوئی راضی ہو تو آپ بھی بیٹھ جائیے۔“ کسی کونے سے آواز آئی۔ مزید قہقہہ بلند ہوا۔

”مجھے شادی کرنی ہے راضی کی قطار میں نہیں لگنا۔ قاضی صاحب نہ ہوئے تو ٹیپٹیم اسٹور والے ہونگے۔“

اس کی باتوں پر سب ہی کے ہونٹوں پر مسکان تھی۔ سوائے عریشہ کے جو اب بیٹھے ہی پھر کے بت لی ملن رسمیں کروا رہی تھی۔

”ٹھیک طرح سے کھانا۔“ وردہ نے کونے میں پلیٹ پکڑے کھڑی ربیعہ کو ہدایت کی تھی۔
 ”یہ کیا؟“ پھر وہ اس کی پلیٹ میں ذرا سے چاول اور سلاد دیکھ کر بولی۔ ”بہن! پڑیا۔ اتنا تکلف نہیں چلے گا۔“
 اور لاؤ پلیٹ۔

ربیعہ نہ نہ کہتی رہ گئی۔ وردہ نے اسے روٹ پیس اور کباب لا کر دیے۔
 ”میں اتنا نہیں کھا سکتی وردہ!“ ربیعہ منت سے بولی۔ ”میں تو تقریباً کھا چکی ہوں۔“
 ”چلو میں تمہارے ساتھ کھاتی ہوں۔“
 دونوں قریب کی میز پر آ بیٹھیں۔

”گھر جانے سے پہلے میں ناعملہ کو مبارک باد بھی دینا چاہتی ہوں۔ رش میں مجھے موقع نہ مل سکا۔ کافی گید رنگ ہے نا۔“
 ”خاندان بھر سے سب ہی کو مدعو کیا گیا ہے نا پھر دوست احباب۔ ملنے ملانے والے۔ یوں ایک بڑی تقریب بن گئی۔“

ربیعہ نے آہستگی سے سر ہلایا پھر اسے کچھ خیال آیا۔
 ”آئی رابعہ۔ ملی تھیں ابھی۔“
 وردہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔
 ”وہ کہہ رہی تھیں۔“

”کہہ میں نے رافع سے شادی سے انکار کر دیا۔ ہے نا؟“ وردہ نے اس کی ادھوری بات مکمل کی۔
 ”کیوں وردہ۔ کیوں؟“ ربیعہ کے لہجے میں احتجاج تھا۔ ”کیا برائی ہے رافع میں؟“
 ”تم بتاؤ۔“

”میں؟“ وہ حیران ہوئی۔
 ”ہاں ربیعہ۔ تم بتاؤ مجھے۔ رافع میں کیا برائی ہو سکتی ہے؟“
 ”کچھ نہیں۔ خدا کی قسم۔ کچھ بھی نہیں۔“ ربیعہ اسے یقین دلانے والے انداز میں بولی تھی۔
 ”پھر تم رافع سے شادی کر لو ربیعہ۔“ وردہ اچانک بولی۔

ربیعہ نے ذہناً پلیٹ سے ہاتھ کھینچ لیا اور نشوے ہاتھ پونچھنے لگی۔
 ”دیکھو ربیعہ! میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی وجہ کچھ بھی ہو۔ اتنا طے ہے کہ میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی لیکن رافع میں اتنی خوبیاں ہیں کہ تمہارے جیسی پیاری لڑکی اس کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔ میرا دل کہتا ہے۔“ وردہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”میں تمہیں بتا چکی ہوں وردہ۔ میں کسی سے۔“ اس نے کہنا چاہا۔

”غلط۔ بالکل غلط۔ تم کہیں بھی انکج نہیں ہو۔“ وردہ وثوق سے بولی تھی۔
 ربیعہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔

”عذر راما بہت اچھی ہیں ربیعہ! وہ تمہاری دل سے قدر کریں گی اور رافع۔ وہ تمہیں چاند تاروں سے بڑھ کر چاہے گا۔ تم ایک مرتبہ ہاں تو کہو۔ تمہارے اور رافع کے ایک ہونے میں کوئی مشکل حاصل نہ ہوگی۔“
 وردہ جذباتی ہو گئی تھی۔

”لیکن۔۔۔ تم ایسا کیوں چاہتی ہو وردہ؟“ ربیعہ نے تحیر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں۔ تمہارا ساتھ ایک اچھے انسان سے جڑے۔ میں چاہتی ہوں۔ میرے انکار سے۔ رافع کو مجھ سے بھی اچھی لڑکی کا ساتھ ملے۔ میرے انکار کا دکھ اس خاندان کے دل سے مٹ جائے۔ اس لیے۔ میں ایسا چاہتی ہوں۔ کیا تم میری دوست نہیں ہو رہی۔ کیا تم ویسی ہی محبت مجھ سے نہیں کرتیں جیسی محبت میں تم سے کرتی ہوں؟“

”میں تمہیں اس سے بھی بڑھ کر چاہتی ہوں۔“ ربیعہ دھیرے سے مسکرائی۔
”پھر انکار مت کرو۔ تمہارے انکار سے میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ پلیز۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ ربیعہ کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔ ربیعہ تذبذب اور حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔
”کیسی باتیں کر رہی ہو درود۔ اتنا برافصلہ میں اکیلے کیسے کر سکتی ہوں۔“
”رافع جیسے لڑکے کا رشتہ تو خوش نصیبی سمجھا جاتا ہے۔“ درود کی مسکان میں کیا تھا، ربیعہ سمجھ نہ سکی۔
”تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ میں خود منہ زہ آئی سے بات کروں؟“

ربیعہ کا دل اس خیال سے ہی تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔
”تمہاگل ہو گئی ہو درود۔“ وہ بمشکل اتنا ہی بولی۔
”دوست تو ہاتھ پکڑ کر کھائی میں چھلانگ لگا دیتے ہیں تم اتنے سے پاگل پن میں میرا ساتھ نہیں دے سکتیں پھر کیسی دوستی؟“

”یہ کیسی دوستی ہے کہ میں تمہارے منگیترے شادی کر لوں؟“ ربیعہ زچ ہوئی۔
”وہ میرا منگیتر نہیں ہے ربیعہ!“ وہ سکون سے بولی۔ ”یہ دیکھو۔“

اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کر دیے۔
”میری انگلیوں میں کوئی انگوٹھی نہیں ہے اور میرے دل پر کوئی نام نہیں ہے۔“
ربیعہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

آپ اپنے جلائے عروسی میں ایک فراڈ ڈھوکے باز لڑکی کو لے کر جا رہے ہیں۔
یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس سے آپ نے تاروں کی روشنی میں رات بھر باتیں کی تھیں۔
یہ وہ لڑکی نہیں ہے جو آپ کے ”دل دھڑکنے کا سبب“ تھی۔
یہ وہ لڑکی نہیں ہے جس سے آپ نے قول و قرار کیے تھے۔
یہ لڑکی اس کی آواز بنا سکتی ہے اس کے الفاظ چڑا سکتی ہے اس جیسا دل نہیں لاسکتی۔
آپ کو دھوکا دیا گیا ہے، آپ کی محبت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔
کبھی اس سے اپنی گم گشتہ محبت کا ثبوت مانگے گا۔ وہ کوئی ثبوت نہ دے پائے گی۔

ایک خون بہا۔ آپ دونوں کے سر۔

اس نے اپنے لکھے ہوئے میسج کو بار بار پڑھا پھر فراڈ کے موبائل نمبر پر سینڈ کر دیا۔
اپنا لکھا ہوا میسج ڈیلیٹ کر کے اس نے موبائل کی سم نکال کر الگ رکھ دی پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے تکیے کے نیچے سے ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر دکھا تھا۔

”ایک خون بہا۔ آپ دونوں کے سر۔“ نے زیر لب کہا۔

”عمریشہ“ ماہین کی آواز پر وہ یکدم چونک گئی تھی۔

چاقو اس نے واپس تکیے کے نیچے رکھ دیا۔

”پی نہیں بلارہی ہیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ ماہین فکر مند تھی۔
عمریشہ وال کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔

”عریشہ۔“ فردوس بیگم نے بے حد محبت سے اسے پکارا تھا۔

وہ بستر پر سیدھی لیٹ چکی تھی۔ ان کے چہرے پر حد درجہ نقاہت نظر آتی تھی۔ عریشہ کے پتھر لے جذبات میں مبتلا کی تیز آنچ سے پچھل سی ہوئی وہ ان کے قریب جا بیٹھی۔

”عریشہ! انہوں نے اس کا سرد ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹی! ہماری غلطیوں کو معاف کر دینا۔“ ان کی آواز میں لرزش تھی اور لہجے میں پچھتلاؤ کا احساس۔

”آپ نے کوئی غلطی نہیں کی امی!“ ماہین دوسری جانب سے ان کے قریب آ بیٹھی تھی۔ اس نے ماں کا دوسرا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”ماں باپ بھی جان بوجھ کر اولاد کو دکھ دینے کا نہیں سوچ سکتے۔ عریشہ یہ بات تب سمجھے گی جب ماں بنے گی۔ ماں کی بے پناہ محبت اور بے غرضی کو یہ اس وقت صحیح طور پر پرکھ پائے گی! ابھی یہ ناقص سوچ رکھتی ہے اس لیے مغالطوں کا شکار ہے۔“

عریشہ خاموشی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے کسی بھی بات کی تائید یا تردید کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

”تم نافع کے ساتھ بہت خوش رہو گی بیٹی! یہ ایک ماں کا یقین ہے اور دعا بھی۔“ فردوس بیگم اس کے اندر کے سانے سے کوئی گون گونکنے کی منتہی تھیں۔

”اتنا تو میں سمجھ چکی ہوں کہ تم اس رشتے سے سخت ناخوش ہو لیکن بیٹی! یہ تمہارے باوا کا فیصلہ تھا اور باپ بیٹیوں کے مقدر کا فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر ہی کرتے ہیں۔ اتنا تو یقین ہے نا تمہیں کہ تمہارے باپ تم سے بہت پیار کرتے ہیں؟“

”صرف بابا جان ہی نہیں آپ بھی ہم سب سے بہت محبت کرتی ہیں امی!“ ماہین پھر جلدی سے بولی تھی۔

”ہم سب کو اس بات کا یقین ہے۔ ماں اگر سخت گیر بھی ہو تو اس کی محبت میں کمی نہیں آ سکتی۔“

”ہاں۔“ وہ آہستہ سے بولیں۔ ”شاید۔ میں نے تم لوگوں سے حتیٰ ہی روار بھی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے میرے بچوں کے میں تم سب کو بہت چاہتی ہوں۔“

”عریشہ!“ ماہین اس سے مخاطب ہوئی۔ ”امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وجہ جانتی ہو؟“ عریشہ نے خاموش مگر سوالیہ نگاہوں سے اس کو دیکھا۔

”کل تمہارے اس گھر سے چلے جانے کا خیال انہیں ستا رہا ہے۔ تمہاری ناخوشی سے یہ خود کو بیمار تصور کر رہی ہیں۔ بہتر ہو گا کہ تم انہیں بتا دو کہ تم مطمئن ہو اور خوش بھی۔“

عریشہ کے لبوں پر ایک ناظم سی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ ماہین نے ایک گہری سانس بھری تھی۔

”تم یہاں امی کے پاس ہی لیٹ جاؤ عریشہ! تمہاری یہاں موجودگی سے امی کو تقویت رہے گی۔“ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں نیچے کارپٹ پر سو جاتی ہوں۔“

”میں۔۔۔ مجھے۔“ عریشہ بے چین سی ہوا تھی۔ ”مجھے شاید یہاں نیند نہ آئے۔“

ماہین نے کھڑے ہوتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے حیرت سے اسے دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ پھر وہ اطمینان سے بولی۔ ”تم تو یوں بھی راتوں کو جاگنے کی عادی ہو۔ ایک رات اپنی ماں کے لیے بھی جاگ لو گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”بیٹی! ماہین ٹھیک کہتی ہے۔ تم میرے پاس ہی لیٹ جاؤ۔ مجھے سکون رہے گا۔“ فردوس بیگم قدرے لجاجت سے بولی تھیں۔ عریشہ نے خود کو بے بس سا محسوس کیا۔

”میں تمہیں ٹرگولا نر دیتی ہوں۔“ ماہین بولی۔ ”تم پُرسکون سی نیند سو جاؤ گی اور کل فریش بھی لگو گی۔“
عزیز بادل خواستہ ماں کے ساتھ لیٹ گئی تھی۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات گردش کر رہے تھے لیکن ماں اور
بہن نے فی الوقت اسے مجبور سا کر دیا تھا۔



اس نے پھر بے چینی سے کروٹ بدلی تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس کے اعصاب جھنجھلا اٹھے تھے۔ نیند کسی
بے مروت کی مانند رو بھی ہوئی تھی جس نے رابطے کا ہر سلسلہ منقطع کر دیا ہو۔

شملہ بالآخر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سارے دن کی تھکا دینے والی مصروفیت کے باوجود اس کا ذہن ذرا سی تھکن محسوس
نہ کر رہا تھا۔ ایک ہاتھ کے فاصلے پر سوئے ہوئے ہاشم کی سانسوں کا ریویم اسے بار بار اپنی جانب متوجہ کرتا تھا۔
شملہ نے ہاتھ بڑھا کر اپنی جانب کا سائیڈ لیپ روشن کر دیا۔ کمرے میں ہلکی دودھیا روشنی نے ماحول کو عجب سحر
سا بخشا پھر اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا جو اب رات کے چکر سے نکل کر دن کی جانب محو سفر ہوا چاہتا تھا۔
”اے دل ناداں! آرزو کیا ہے؟ جستجو کیا ہے؟“ اس کے اندر خود کلاسی سی ہوئی۔ ”نیند کیوں نہیں آتی، سحر کیوں
نہیں ہوتی؟ چین کیوں نہیں ملتا؟ اس کی بے اعتنائی سے دل سے محو کیوں نہیں ہوتی ہے؟“

وہ اپنی جگہ سے ذرا سا ہلک کر ہاشم کی طرف ہو گئی۔ فاصلہ ہاتھ بھر سے سمٹ کر دو باشت کا رہ گیا۔ ہاشم
دھیرے سے سیدھا ہوا تھا۔ شملہ کا دل دھڑکا لیکن وہ ہنوز نیند میں تھا۔ ایک لمبے عرصے سے وہ دونوں میاں بیوی
کے روپ میں دو اجنبیوں کی مانند زندگی گزار رہے تھے۔ دو نہایت شائستہ اور مہمان اجنبیوں کی مانند۔ جنہیں
شکایت کرنا آتی ہو نہ کلمہ۔ مروت ہے، خلوص ہے۔ عمر گزار دینے کے حوصلے کے ساتھ۔ وہ دونوں ساتھ
ساتھ تھے۔

کم از کم شملہ کو ایسا ہی محسوس ہوتا تھا، بریف کیس میں رکھے ہوئے وہ چند پیپر ز کتنی ہی بار ذہن کے روپے پر
پھرے تھے پھر ایک موہوم سائین اسے اکتا تھا کہ ایسا ہونا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔ تذبذب اتنا بھی طویل نہیں
ہوا کرتا۔ محبت ایسی بھی کمزور نہیں ہوتی۔

”ایک بار اس سے پوچھ تو لے کہ اس اندیشے کو صداقت سے کتنا واسطہ ہے؟ پوچھ تو سنی۔“ شملہ پھر ذرا سا
سرکی تھی۔ اب کے فاصلہ محض باشت بھر کا رہ گیا تھا جسے ہاشم کی ایک کروٹ نے پاٹ دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ
جاگ اٹھا تھا۔

چند لمحے وہ از روئے یقین اور حیرانی سے ان ستارہ آنکھوں کو اپنے قریب چمکتے دیکھتا رہا پھر اپنے بازو کے نیچے اس
کے نرم گھنیرے بالوں کو محسوس کر کے وہ یوں اٹھ بیٹھا جیسے اسے گرنٹ لگا ہو۔ شملہ بھی اس کے عقب میں۔
بے حد آہستگی سے اٹھ کر بیٹھی تھی۔

”سو میں کیوں نہیں؟“ ہاشم نے گھڑی کی جانب نگاہ کر کے بوجھل آواز میں پوچھا۔

”نیند نہیں آتی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”کیوں؟“

جواب میں جو خاموشی تھی اس کی مہک سے ہاشم نے اپنے اعصاب شل ہوتے محسوس کیے۔ اس نے گردن
موڑ کر دیکھا۔ اس کا گلاب چہرہ اس کے شانے کے بالکل قریب تھا۔ ان آنکھوں کی سطح شفاف اور پر نرم تھی۔ ہاشم
کا جی چاہا وہ اس کی سے اپنی پوری ہستی کو سیراب کر لے۔

”ہاشم! شملہ! اب دھیرے سے کانپے۔“

ہاشم نے بے حد بے اختیاری کے عالم میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ شملہ نے پلکیں موند لیں۔
”میں نے اسے کہا تھا۔“ چند الفاظ بڑی تیزی سے ان دونوں کے درمیان آئے تھے۔ ”اگر وہ مجھ تک واپس

آنا چاہتی۔ میں نے۔ میں نے اسے کہا تھا۔ اسے کسی صورت۔ ماں نہیں بننا۔ اگر وہ۔ لوٹ کر آنا چاہتی۔ آپ کی ذرا سی قربانی سے۔ مسٹر ہاشم۔ کیا آپ ایک خوبصورت تصویر۔ آپ کی ذرا سی قربانی سے۔ ایک خوبصورت تصویر۔

ہاشم کا ذہن ان آوازوں کی شدت سے گونجنے لگا۔ دھمک لہجہ بہ لہجہ بڑھنے لگی تھی۔ ہاشم کا تنفس اتنا تیز ہوا کہ نرم گرم جذبوں کے دھارے میں بہتی شہلا نے گھبرا کر آنکھیں کھولی تھیں۔

”ہاشم! کیا ہو؟“ وہ گھبرا کر بولی تھی۔

”میں سونا چاہتا ہوں۔ پلیز۔“ اس کے ہاتھ پر پسینہ چمک رہا تھا۔

”ہیں۔“ ثبات میں سر ہلا کر وہ اپنی جگہ پر ہو گئی۔

ہاشم نے لیٹ کر اس کی جانب پشت کر لی تھی۔ شہلا کا دماغ بالکل سن ہو رہا تھا۔ کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورے ہوئے اس نے بقیہ رات تمام کی تھی۔



صبح بے حد خوبصورت اور معطر معطر سی تھی۔ اونچے درختوں سے چھن کر آتی صاف تھری ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوئے خزاں خزاں وہ بہت کچھ سوچتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔

”تم ایک بار“ ہاں“ تو کوربیجہ! رافع تمہیں چاند تاروں سے بڑھ کر چاہے گا۔ رافع جیسے لڑکے کا رشتہ تو خوش نصیبی سمجھا جاتا ہے۔ ربیعہ! تم ایک مرتبہ“ ہاں“ تو کہو۔“

ربیعہ۔ کے دل کو یہ احساس جان فزا کر گدائے لگا تھا۔ اس نے روش سے اٹھ کھلیاں کرتی ہوا کو محسوس کیا اور آہستہ سے ہنس دی۔

”تمہارے گھر والوں کو کوئی اعتراض نہ ہوگا“ میں خود منیجرہ آئی سے بات کروں گی۔“ ”ورہ جیسے اس کے کان میں بولی تھی۔ ربیعہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

”کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا ہی ہو جائے گا۔“

اس نے اپنے گال گرم ہوتے محسوس کیے اور انہیں ہتھیلیوں سے چھو کر دیکھا۔

”لیکن ورہہ!“ پھر وہ برگد کے پھلے ہوئے درخت کے چوڑے تنے سے پشت نکا کر حیرانی سے سوچنے پر مجبور ہوئی۔ ”ورہہ ایسا کیوں چاہتی ہے؟ اپنی قسمت کی زلفوں میں سجا خوبصورت چمکتا تارہ توڑ کر وہ میرے بالوں میں لگانا چاہتی ہے۔ کیوں؟“ ربیعہ سوچنے لگی۔

”وجہ کچھ بھی ہو، اتنا طے ہے کہ میں رافع سے شادی نہیں کر سکتی۔“ ورہہ کی آواز پھر آئی تھی۔

”وجہ کچھ بھی ہو؟ بھلا کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ کیا ورہہ کسی اور سے۔ نہیں بھلا ایسا کیسے ممکن ہے؟ ایسا ہوتا تو ورہہ مجھ سے کیوں چھپاتی؟“

”کیا تم نے ورہہ سے نہیں چھپایا کہ تم رافع سے۔“

”نہیں۔“ وہ بے چین ہوا تھی۔ ”میں نے کچھ چھپایا نہیں۔ بتانے کے لیے بھلا میرے پاس تھا ہی کیا؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ ورہہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ کیوں نہیں بتاتی کہ وہ رافع سے شادی سے کیوں گریزاں ہے؟

محصض انتہی سی بات کہ کزن ہونے کے ناتے رافع سے اس کا وہ دلی تعلق استوار نہ ہو سکا جو ان دونوں کے مابین قائم رشتے کے تحت ہونا چاہیے۔ کیا یہ تعلق خاطر شادی سے پہلے قائم ہونا ایسا ہی ضروری ہے کہ اس کے نہ ہونے سے برسوں پرانی منگنی کو توڑا جاسکتا ہے۔ کیا ورہہ سچ بول رہی ہے؟“

اپنی سوچوں سے بے چین اور مضطرب ہو کر وہ پٹی تھی پھرویں تھم کر رہ گئی۔ سامنے والے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے رافع نجانے کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”اوہ۔۔۔“ ربیعہ کے لبوں سے نکلا تھا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پر گیا تھا۔
”مزانِ بخیر؟“ وہ مسکرایا۔

”جی۔۔۔ شکریہ۔“ وہ سر جھکا کر آگے بڑھی۔

رافع اس کے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگا تھا۔ ربیعہ سے قدم اٹھانا دشوار ہونے لگا۔ ابھی چند لمحوں قبل وہ سر کی سوچوں کا شکار تھی اس کے فوراً بعد رافع کا سامنا ہو جانا اسے پرل کر گیا تھا۔
”بہت دن بعد دیکھا آپ کو یہاں۔“ رافع نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”میں۔۔۔ بہت دن بعد ہی آئی ہوں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

”ہوں تب ہی مجھے روز صبح روٹھی ہوئی ملتی تھی۔“ وہ بھی آہستہ سے بولا۔

ربیعہ کے قدم سست ہونے لگے۔ ہر چند کہ وہ انہیں تیزی سے پرہانا چاہتی تھی۔

”ربیعہ۔۔۔ ایک رافع رکا تھا۔“ آپ۔۔۔ مجھ سے شادی کریں گی؟“

ربیعہ ششدر رہ گئی۔ یوں اچانک سربراہ وہ اس قدر آسانی سے ایسا مشکل سوال پوچھ لے گا اس کے گمان میں بھی نہ تھا۔ گھنے درختوں کے سائے میں پناہ گیر وہ لمحہ بہت خوبصورت تھا۔

”رافع۔۔۔“ وہ ہکلائی۔ ”آ۔۔۔ آپ انگیڑ ہیں۔“

رافع چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا پھر دھیرے سے مسکرایا۔

”آپ نے صرف میرا نام لیا ربیعہ! آپ نے اپنا نہیں کہا کہ آپ انگیڑ ہیں۔ جانتی ہیں کیوں؟ کیونکہ بے اختیاری میں ہی انسان کے لبوں سے سچ نکلتا ہے۔ اس روز ہاسپٹل میں آپ نے وردہ سے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا۔ نجانے وہ وردہ کو سنانے کے لیے تھایا مجھے۔ بہر حال ہم دونوں ہی نے اس پر یقین نہیں کیا۔“

ربیعہ خاموش کھڑی اس کی ٹی شرٹ کے بٹن لگتی رہی۔

”نجانے اس سے آپ کا مقصد کیا تھا؟ رشتے زبردستی باندھے نہیں جاتے ربیعہ! تو زبردستی توڑے بھی نہیں جاسکتے اور رشتے محض خوبی یا قانونی ہی نہیں ہوتے۔ کچھ رشتے صرف لگا ہوں کے مابین قائم ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی غرض، کوئی کھوٹ، کوئی ریا نہیں ہوتی۔“

ربیعہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”میرے اور آپ کے درمیان۔۔۔ کیا ہے رافع؟“

رافع نے قریب سے گزرتی تنگی کے تعاقب میں دور تک دیکھا۔

”اب تک جو تھا وہ محض ایک احساس تھا ربیعہ! جس کے رنگ دل کی سطح پر ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن اب اس احساس کو یقین بنانے کا وقت ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دینے پر راضی ہو۔۔۔ تو۔۔۔“

رافع نے بات مکمل کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔

”یہ احساس میں خود تک محدود رکھنے کا پابند تھا۔ لیکن وردہ نے منگنی ختم ہونے کا اعلان کر کے مجھے اس بندھن سے آزادی بخش دی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے نہیں ہیں، ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔ اس لیے اس زبردستی کے رشتے کو نبھاتے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا!“

ربیعہ نے اس کی بات پر اپنے اندر عجیب بے چینی سی محسوس کی تھی۔

”کیا وردہ واقعی آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی؟“

”وہ تو کسی کہتی ہے۔ اور آخر وہ غلط کیوں کہے گی؟ اور۔۔۔ جب ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔ یقیناً مجھ سے بہت بہتر کوئی شخص کہیں اس کا منظر ہوگا۔ ٹھیک ہے نا!“

”پتا نہیں۔۔۔“ اس کے لبوں سے نکلا۔

”میں اپنی امی کو تمہارے گھر بھیج سکتا ہوں؟“
 ربیعہ خاموش کھڑی اپنے دل کی دھڑکنیں لگتی رہی جو کوئی انوکھا سا پیغام دینے پر آمادہ تھیں۔
 ”تمہاری خاموشی۔۔۔ تمہارا اثبات۔۔۔ تمہاری خاموشی؟“ رافع کالجہ بو جھل ہو گیا۔
 ربیعہ دھیرے سے مسکرا کر آگے بڑھ گئی تھی۔



رات نے جھلملاتا لباس پہنا۔ گھنیری زلفوں میں چمکتے ستارے ٹانگے۔ موتیا اور گلابوں کی مسک کو ہمراہ کیا اور ”حیات ولا“ کے مکینوں کے پاس چلی آئی۔

تین براتوں کی آمد کے پیش نظر شہر کاسب سے بڑا اور کشادہ ہال ارنج کیا گیا تھا۔ جہاں ”حیات ولا“ کے سب ہی مکین موجود تھے سوائے نافع اور رافع کے۔ جنہوں نے نافع کے دوست احباب کے ہمراہ ایک عدد ”بارات“ کا سا تاثر لے کر آنا تھا۔

ثانیہ کی برات کو دور جانا تھا سو اس کے سسرال والے برات لے کر پہنچ چکے تھے۔ ثانیہ کو نکاح کے بعد اسٹیج پر لے جایا گیا تھا جہاں اس کی اور اس کے گھر والوں کی تصاویر بن رہی تھیں۔

ڈرنے لنگ روم میں ناعمہ اور عریشہ رہ گئی تھیں۔ عریشہ کی خاموش کٹ دار نظریں ناعمہ کے سراپے میں جیسے سوئیاں سی چھو رہی تھیں۔ وہ بار بار پر پلو بدلتی تھی۔ اسے اس پاگل لڑکی کی کٹھیلی نظروں۔ سے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔

گہرا سرخ بیش قیمت بناری غرارہ زیب تن کیے، انٹھک لک دیتے بھاری زیورات سے مزین ناعمہ کو پہچاننا آج مشکل محسوس ہوتا تھا۔ ڈھیروں ڈھیر کلیوں کے بیچ چمکتا گلاب چروانی معصومیت بھری چھب سے پھولوں اور کلیوں کو بھی مات دے رہا تھا۔ عریشہ کا لباس میوٹن تھا جس پر میوٹن اور گولڈن کام تھا۔ گولڈن جیولری اور میوٹن میک اپ نے اس کے اداس چہرے اور خاموش نکاہوں کو عجب پراسرار سا تاثر بخشا ہوا تھا۔
 ”کچھ بات کرو نا۔“ ناعمہ گہرا کر بولی تھی۔ ”تنی خاموش کیوں ہو؟“

عریشہ غیب سے انداز میں مسکرائی تھی۔
 ”جو کچھ سنا تھا۔ کہہ چکی۔۔۔ پھر وہ بولی تھی۔“ اب۔۔۔ خاموش ہی ہونا ہے!“
 ”میں کچھ سمجھی نہیں!“ ناعمہ نے حیرانی سے اس کا اسرار سے بھرا روپ دیکھا۔
 ”سنجھ جاؤ گی! سب ہی سمجھ جائیں گے۔“

دونوں کے درمیان پھر خاموشی در آئی تھی۔ عریشہ جب چاپ اسے دیکھنے لگی۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ ناعمہ نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”دیکھ رہی ہوں۔ کہ آنے والے لمحوں کے احساس نے تمہیں خوبصورت بنا دیا ہے۔۔۔ ورنہ تم اتنی خوبصورت تو نہیں ہو۔“

”آنے والے لمحے۔“ ناعمہ کا دل بیٹھنے لگا۔

”جو جھوٹ بولے ہیں اس سے۔۔۔ نباہ پاؤ گی؟“ اس نے کٹ دار انداز میں پوچھا تھا۔ ناعمہ نے چونک کر اس کی شعلہ بار آنکھوں میں دیکھا۔

”جھوٹ بولتے وقت۔۔۔ صرف تمہارا خیال تھا۔ یا اپنے خاندان کی عزت کا۔۔۔ پھر وہ رسانییت سے بولی۔“
 ”اب بھی میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے جو کچھ کہا۔ کسی کی بھلائی کے لیے کہا۔“
 ”ہنس۔۔۔ بھلائی؟ بھلائی تو صرف تمہاری اپنی پوشیدہ تھی۔۔۔ تم کسی بھی طرح اسے یانا چاہتی تھیں۔ خواہ

جھوٹ سے ہی سہی۔ بعد میں کیا ہوتا ہے اور کیا ہو گا۔ تم نے اس بارے میں سوچا تک نہ ہو گا؟“
 ”عزیزہ! مجھے نہیں لگتا کہ میں کبھی بھی تمہارا دل صاف کر پاؤں گی۔ لیکن مجھے اپنی آنے والی زندگی کے کس
 پل سے کوئی سکھ نہ ملے اگر میں نے ایسا کچھ بھی سوچا یا چاہا ہو۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے فراز کو اپنے سے پہلے اس
 سے جھوٹ بولنا تو درکناس۔ کبھی اس سے بات تک نہ کی تھی۔ اس سے رشتہ جڑنے کے بعد اگر میں نے خود کو وہ
 لڑکی ظاہر کیا جو اس سے رات رات بھر فون پر باتیں کرتی تھی تو محض تمہاری اور نافع کی اور اپنے پورے خاندان
 کی عزت کے لیے۔ کیونکہ اس وقت تم نافع کی منکوحہ اس کی عزت تھیں۔ نافع اور فراز آپس میں دوست اور
 شناسا نہیں۔ تم ہی بتاؤ۔ حقیقت جان لینے کے بعد فراز کی نظموں میں تمہارے لیے کون سا جذبہ ہوتا؟“
 ”کم از کم وہ تم سے شادی تو نہ کرتا۔“ وہ پھٹکاری۔ ”میری نظموں کے سامنے کسی اور کا ٹونہ ہوتا میں آج بھی
 اس سے محبت کرتی ہوں۔ سنا تم نے؟ ان الفاظ کی بازگشت تم کبھی نہیں بھول پاؤ گی۔“
 ناعنہ ساکت رہ گئی۔ کھلی آنکھوں سے وہ اس دیوانی لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔



سلور مقیش سے سجا فیروزی لباس زیب تن کر کے اس نے بال سنوارے اور لیوں پر تیز گلابی لپ اسٹک لگائی۔
 کانوں میں فیروزے کے ٹاپس پن کر وہ پلٹ ہی رہی تھی جب منیہ بیگم اس کے قریب چلی آئیں۔
 ”ماشاء اللہ۔ چشم بدوست۔“ انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ دیکھا اور پیشانی پر مہر محبت ثبت کی۔
 ”آج تو میری بیٹی کا روپ ہی نرالا ہے۔“
 ربیعہ نے جھینپ کر سر جھکا لیا تھا۔
 ”یہ الوہی چمک۔ اباد و کتنا نور کا ہال۔ جیسے یہ کسی فرشتے کا چہرہ ہو۔“ انہوں نے ربیعہ کو غور سے دیکھا۔
 ”آج میری بیٹی بہت خوش نظر آتی ہے؟“
 ربیعہ نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ ماں کی نظموں میں چھپی پوشیدہ مگر شدید قوت کا اسے احساس ہوا تھا۔
 حقیقت یہی تھی کہ صبح رافع سے ہونے والی ملاقات کا اثر اب تک اس کے رویوں میں دیکھ میں رہا تھا۔ وہ خود
 کتنی ہی بار آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ چکی تھی۔ رات کو ہونے والی اس تقریب کا اسے احساس تھا۔ انتظار تھا۔
 منیہ بیگم اب تک اس کا چہرہ بغور دیکھ رہی
 ”ربیعہ!“

”جی ای۔! وہ چوکی۔“

”ایک بات پوچھوں؟“

”یہ بھی پوچھنے کی ضرورت ہے۔“ وہ ہنس دی۔

”امیر حسن کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

ربیعہ یک دم حیران ہوئی تھی۔ اس کا چمکتا چہرہ قدرے ماند پڑا۔

”میر۔ حسن۔“

”وہ۔ تم سے شادی کا خواہش مند ہے بیٹی!“

”لیکن امی جی۔! وہ بے اختیار پریشانی سے بولی۔ ”مم۔ میں ان سے شادی۔“ وہ بولتے بولتے خاموش سی
 ہو گئی۔ منیہ بیگم بے چین ہو گئیں۔

”گیا بات ہے ربیعہ! کیا تمہیں امیر حسن پسند نہیں۔ کیا کسی اور کو۔“

اسی لمحے کمرے میں انہی داخل ہوئی تھی۔ مسٹر اور گرے کبھی نیشن کے بے حد اسٹافش کرتا شلوار میں

لبوس مکاندھے پر ہلکی سی شال ڈالے۔ وہ دلکش لگ رہی تھی۔
”ربیعہ۔۔۔ عباد بھائی گاڑی میں بیٹھے ہیں۔۔۔ شہلا آپ کا دو مرتبہ فون آچکا ہے۔ سب ہی برائیں ہال میں پہنچ چکی ہیں۔۔۔ جلدی کرو۔۔۔“

”جاؤ بیٹی۔۔۔ تم لوگوں کو واقعی دیر ہو چکی ہے۔۔۔“ منیزہ بیگم نے تفکر سے گھڑی کی سمت دیکھا۔

”واپس آؤ گی تو بات کریں گے ان شاء اللہ!“

”اب اکیلی رہ جائیں گی نا۔۔۔“ ربیعہ پریشان تھی۔

”بے فکر ہو کر جاؤ۔۔۔ میری طبیعت ابھی بالکل ٹھیک ہے۔۔۔“

”ہم جلدی آجائیں گے امی جی۔۔۔! انہیقد نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ان کا گال چوما۔

”ہاں بچہ۔۔۔ جلدی آجانا۔۔۔ اکیلے گھر میں میرا دل بالکل نہیں گے گا!“ انہوں نے پیار سے کہا تھا۔

اسٹیج پر رنگ و بو اور روشنیوں کا جھوم سا اکٹھا ہو گیا تھا۔ کسی کنسرٹ کے اسٹیج کی طرح بنائے گئے وسیع و عریض اسٹیج پر تل دھرنے کی بھی جگہ نہ تھی۔ دو لہا اور دلہنیں اپنی اپنی لشتوں پر براجمان تھیں۔ مودی اور تصویروں کی شیدائی لڑکیاں تصویریں اور مودی بنوا رہی تھیں۔ اسی آفریقہ میں بڑے بڑوں کو بھی اس کا رخیر کو سرانجام دینے کے لیے بھیج لیا جاتا تھا۔

”حیات ولا“ کے سب ہی مکین چروں پر خوشگوار مسکراہٹ لیے ہوئے تھے۔ آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے دعائیہ کلمات وصول کرتے ہوئے سب ہی کے احساسات و جذبات خوشگوار تھے وسیع و عریض ہال میں اتنے ڈھیر سارے مہمانوں کو دیکھتے ہوئے ربیعہ قدرے گھبرا سی گئی تھی۔ ناعملہ کے لیے خرید آگیا گفٹ ورہ کو تھماتے ہوئے اس نے اس بات کا اظہار بھی کر ڈالا تھا۔

”اے۔۔۔“ ورہہ ہنس دی۔ ”جانتی ہوں، کم آمیز ہو۔۔۔ مگر ایسی بھی کیا کم آمیزی۔ اتنی بھر پور تقریب ہے۔۔۔ انجوائے کرو۔۔۔“

”میراجی چاہ رہا ہے۔۔۔ میں بالکل کوئے والی میز پر بیٹھوں۔۔۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔۔۔ کوئے والی میز پر ہی بیٹھ جاؤ۔۔۔“ ورہہ مسکرائی تھی۔ ”تم جہاں بھی بیٹھو گی۔ ڈھونڈ لی جاؤ گی۔“

ربیعہ نا سمجھی سے مسکرائی۔ ورہہ نے اسے غور سے دیکھا پھر قدرے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

”رافع تمہیں ڈھونڈ ہی لیں گے!“

ربیعہ کی تجیز بھری آنکھوں نے ورہہ کی بے تاثر نظروں میں کچھ کھوجنا چاہا۔ آخر اس نے ایسا کیوں کہا تھا؟

”تم بیٹھو نا ربیعہ۔۔۔! ورہہ نے اچانک اس کے دونوں ہاتھ دھیرے سے دبائے۔“ ”ابھی کھانا لگے گا تو ساتھ کھانا

کھائیں گے۔۔۔ ٹھیک؟“

ربیعہ نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ ورہہ کسی مہمان کو آتا دیکھ کر اس جانب بڑھ گئی تھی۔ انہیقد اپنی چند

شناسا لڑکیوں کے ساتھ میڈیکل کالج کے حالات پر سیر حاصل بحث کر رہی تھی۔ ربیعہ تنہا ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئی

اور ارد گرد بکھری خوشیوں اور روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ یکایک ایک مخصوص مک کا احساس ہونے پر وہ چونکی تھی۔

رافع اس کے قریب موجود تھا۔ ربیعہ کو اپنی آنکھوں میں روشنی سی بھرنے کا احساس ہوا۔ دل انجیبی سی تال پر

دھڑکا۔ رات گئے صبح صادق کے حوالے یاد آنے لگے تھے۔

”اکیلی ہی آئی ہیں؟“ رافع نے اسے تنہا پا کر پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ انہیقد اور عباد بھائی بھی ساتھ ہیں۔۔۔“ وہ مسکرائی۔

”آئی؟“

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ ربیعہ ماں کے حوالے پر قدرے اداس ہوئی تھی ”وہ گھر پر ہیں۔“ اسی لمحے رافع کو حمزہ نے آواز دی تھی۔ رافع نے پلٹ کر دیکھا، حمزہ کیمرہ تھامے ہاتھ ہلا ہلا کر اسے بلارہا تھا۔ شاید کسی گروپ فوٹو کے لیے۔

رافع نے ربیعہ کو قدرے معذرت خواہانہ برمسکرا کر دیکھا اور حمزہ کی جانب بڑھ گیا۔ ربیعہ کی نگاہوں نے کچھ دیر اسے دیکھا۔ سیاہ کوٹ پیٹنٹ میں ملبوس رافع آج ہمیشہ سے زیادہ خوبو نظر آرہا تھا۔ ربیعہ کی نظریں میں کافی دور تک اس کے ساتھ گئی تھیں۔

یہ ایک اس نے اپنے قریب کسی کی کھنکھا ر سنی تھی۔ ربیعہ چونک کر خود میں پلٹی۔ رائمہ اس کے قریب بیٹھ رہی تھی۔

”السلام علیکم۔“ ربیعہ نے گرجوٹی سے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام۔“ کیسی ہو ربیعہ! ویسے پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ ماشاء اللہ بہت خوبصورت اور پیاری ہو۔ جب اتنا تیار ہوتے ہیں تو نظر کا ٹیکہ بھی لگاتے ہیں۔“

رائمہ نے اپنی آنکھ کے گوشے سے ذرا سا کاہل لے کر اس کے کان کے پاس لگایا۔ ربیعہ بے طرح جھینپ گئی۔

”دورہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ اکثر تمہارا ذکر کرتی ہے۔ حالانکہ وہ بہت لیے دیے رہنے والی لڑکی ہے۔ لوگوں سے کم ہی گھلتی ملتی ہے۔ تم نے اندازہ لگا ہی لیا ہو گا؟“

”جی۔“ ربیعہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”یسا ہی ہے۔ پھر بھی اس کی ذات کی خوبصورتی سب ہی کو اپنا بنا لیتی ہے۔“

”نہیں۔“ رائمہ نے سانس بھر کر کہا۔ ”یسا بھی نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو رافع۔۔۔ رافع کیوں نہ بن سکا اس کا؟“

اس نے یہ سوال براہ راست ربیعہ کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا تھا۔ ربیعہ کا چہرہ قدرے بے رنگ ہوا۔

”رافع۔؟“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کہہ نہ پائی۔

”ہاں رافع۔۔۔ جسے وہ بچپن سے چاہتی ہے۔ اس وقت سے جب ان دونوں کی نسبت بھی طے نہ ہوئی تھی۔ اسی رافع سے جسے وہ ازخدا خاموشی سے اپنی پلکوں اور اپنی دعاؤں کے حصار میں رکھتی تھی۔ وہ رافع اسے چھوڑ کر۔“

گہرا سانس بھر کر اس نے ربیعہ کے سر پر کوبے حد غور سے دیکھا تھا۔

”چاندی میں۔۔۔ سونے سے زیادہ چمک ہوتی ہے۔“ پھر وہ زیر لب بولی جیسے خود اپنے آپ سے مخاطب ہو۔ ”لیکن چاندی۔۔۔ سونے سے زیادہ تو نہیں ہوتی۔۔۔ ہے نا ربیعہ؟“

پھر یہ ایک وہ ربیعہ کو دیکھ کر مسکرا دی۔

”نیو۔۔۔ تم دورہ کی دوست ہو۔ اس لیے تم سے کہہ گئی یہ سب کچھ۔ دورہ وہ نے تو اس ایڈیو رپاٹ کرنے پر بین لگایا ہوا ہے لیکن تم ہی کو ربیعہ! اتنی پرانی نسبتیں یوں بیک جنبش ابرو ختم کی جاسکتی ہیں؟ ختم کی جانی چاہئیں؟ لڑکوں کا کیا ہے۔ وہ تو ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہی رہتے ہیں۔ ایسی باتوں پر رشتے ٹوٹ جایا کرتے ہیں؟ دورہ تمہاری دوست ہے۔ اگر تم اسے سمجھا سکو تو۔۔۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور رافع بھی۔۔۔ شاید تمہارا اکامان لے۔۔۔ دراصل امی بہت پریشان ہیں۔“ وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

ربیعہ کچھ دیر بالکل بے حسن و حرکت بیٹھی رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ حرکت کرنا چاہے گی

بھی تو کر نہ پائے گی۔ پھر اس نے بروقت میز پر دھرا اپنا ہاتھ اٹھا کر اپنے گال پر رکھا۔ اس کا چہرہ تپ رہا تھا۔ پھر اسے لگا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے والی ہے۔ اسے لگا وہ ابھی اتنے ڈھیر سارے لوگوں کی موجودگی میں نور نور سے رونے لگی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اپنا دوپٹہ اس نے سر پر یوں اوڑھا کہ اس کا آدھا چہرہ ڈھک گیا۔ پھر وہ پلٹ کر تیزی سے لوگوں کے درمیان سے نکلتی چلی گئی تھی۔

عباد اور انیقہ بے حد گھبراہٹ کے عالم میں گاڑی سے اترے تھے۔ مرکزی دروازہ انہیں کھلا ہی ملا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے اندر آئے۔ لاؤنج میں بیٹھی منیزہ بیگم کو دیکھ کر دونوں ٹھٹھکے۔

”امی! وہ ربیعہ...“ عباد نے گہرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”وہ سو رہی ہے۔“ انہوں نے سکون سے کہا۔

وہ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”سو رہی ہے؟“ پھر عباد نے نہایت حیرانی سے کہا تھا ”وہ کس کے ساتھ آئی ہے؟“

”ٹیکسی لے کر آگئی تھی۔ اس کے سر میں بہت سخت درد شروع ہو گیا تھا۔ تم دونوں کی تقریب خراب نہ ہو“

اس خیال سے وہ ٹیکسی لے کر گھر چلی آئی۔ اب ٹیلٹ کھا کر سو گئی ہے۔“

”لیکن، لیکن وہ کم از کم مجھے بتا کر تو جاتی۔“ عباد کو یکایک غصہ چڑھا تھا۔ ”میں اتنا پریشان ہوا اسے کہیں نہ پا کر۔“

”میں اور انیقہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ ہم دونوں گھانا تک چھوڑ کر۔۔۔ اور گاڑی کا نٹ بلیو کر رہیہ ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت کر سکتی ہے۔“

”چھوڑیں نا بھائی۔! وہ بے چاری ہمارا خیال کر کے ہی ہمیں بناتا ہے چلی آئی اس نے سوچا ہو گا ہم لوگ شاید

گھر فون کر کے پتا کر لیں گے، ہمیں بھی تو گھبراہٹ میں اتنا دھیان نہیں رہا۔ امی سے فون پر کنفرم کر لیے تو اتنی

پریشانی اٹھانا نہ پڑی۔“

انیقہ نے ربیعہ کی طرف داری کرتے ہوئے عباد کو ٹھنڈا کیا۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔۔۔ آپ پیچ کر لیں!“

”ربیعہ؟ اس نے کھانا کھایا؟“ عباد نے بے چینی ہو کر کہاں سے پوچھا۔

”نہیں۔۔۔ اس کی حالت کافی خراب ہو رہی تھی۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہ رہے تھے جیسے رستہ بھر روتی

آئی ہو۔“ منیزہ بیگم قدرے اداسی سے بولیں۔

”لیکن کیوں؟ اسے کسی نے کچھ کہا ہے؟ کسی نے اس کے ساتھ مس بی ہو تو نہیں کیا؟“

”ایسا کچھ نہیں ہے عباد بھائی!“

ربیعہ کی آواز پر وہ سب چونک کر متوجہ ہوئے تھے۔

”کسی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میرے سر میں اچانک ہی درد اٹھا تھا۔۔۔ میں آپ لوگوں کو ڈھونڈ بھی نہ

پائی۔“

ربیعہ اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے دوپٹہ نماز پڑھنے کے انداز میں چہرے کے گرد لپیٹا ہوا

تھا۔ شاید وہ نماز پڑھ کر ہی آئی تھی۔ اس کی آنکھیں اب بھی متورم تھیں لیکن چہرہ اور انداز بالکل بر سکون تھا۔

عباد اور انیقہ اس کے قریب جا کر جیسے اپنا اطمینان کرنے لگے تھے۔ انیقہ نے اس کا سراپے کا ندھے سے لگا

لیا۔

”جج ربیعہ! نجانے کیوں ہم لوگ بہت پریشان ہو گئے تھے!“

ربیعہ کے اندر سے ایک سسکی سی نکلی مگر اس نے خود پر قابو لیا۔

”میں کھانا لگاتی ہوں۔۔۔ پھر ہم سب مل کر شادی کی دعوت کا مژہ لیتے ہیں۔“ انہیہ مسکراتے ہوئے بولی



نہایت خواب ناک اور معطر ماحول میں وہ کسی بت کی مانند ساکت بیٹھی تھی۔ پورے وجود میں ایک سپاگل جو خاموش ہونے پر راضی نہ تھا اور شور مچائے جاتا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو لمحہ بھر کے لیے پاگل دل بھی سہم کر خاموش سا ہوا پھر سوچ سوچ کر وہ آہستگی سے چلتے ہوئے قریب آ بیٹھا تھا۔

ناعمہ نے ڈرتے ڈرتے پلکوں کو اٹھایا۔ پھر فوراً ہی گرا بھی لیا۔ وہ خشک تیور لیے اس کی جانب متوجہ تھا۔

”بہت ڈھیٹ لڑکی ہو۔“ وہ سرد لہجے میں بولا۔

ناعمہ نے رونمائی میں ملاطعنہ خاموشی سے سنا۔

”خود سر۔۔۔ جھوٹی۔“ تحائف بڑھنے لگے تو اس نے بے چین ہو کر نگاہیں اٹھائیں۔ اسے لگا ’فراز نے سی مسکان کو چھپایا تھا۔

”دو نمبر فراڈ لڑکی!“ جو خنی فراز کے لبوں نے کچھ کہنا چاہا تھا ناعمہ نے بے اختیار بول کر اسے حیران کر دیا۔

”کیا۔۔۔ کیا کہا؟“ اس نے متعجب ہو کر اسے دیکھا۔

”دو نمبر فراڈ لڑکی یہی کہنا چاہتے ہیں نا آپ؟“ وہ سکون سے بولی۔ ”تمام الزامات کے ساتھ حاضر ہوں جو سلوک کیجیے شادی کی رات سے قبر کی رات تک رلانے کا وعدہ کیا ہے آپ نے۔ سو میری سزا آج سے ہے۔“

فراز نے چند لمحے اس کا چہرہ دیکھا جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ پھر ہلہول کر گویا ہوا۔

”ہوں گویا آپ سزا پانے کے لیے تیار ہیں۔ فرد جرم آپ بڑھیں گی یا میں؟“

”فرد جرم کی ضرورت نہیں۔ بنائے ہی میں ہر الزام تسلیم کرتی ہوں۔“

”پھر بھی ایک آدھ الزام دہرایا جائے تو حرج بھی کیا ہے۔“ اس نے مسکراہٹ دیائی تھی۔ ناعمہ نے نظروں سے اس کا جاذبِ نظر چہرہ دیکھا اور اس کی کشش سے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔

”پہلی نظر میں تم میرا دل چرالے گئی تھیں پاگل لڑکی۔ اتنے طویل عرصے سے تمہاری وہ معصوم ادائیں حافظے پر نقش ہے۔ بولو کیا سزا دوں اس جرم کی؟“

اس کے بوجھل معنی خیز لہجے کی تپش نے ناعمہ کے حواس جھنجھوڑے۔ وہ بری طرح چوکی۔

”تمہاری ایک سپاگل کرن کے ساتھ کچھ عرصہ باتیں کرتا رہا۔ ذہن میں تمہارا تصور باندھے۔۔۔ بخدا انا میں نے اس سے تمہارے دھوکے میں باتیں کیں۔ یہ واحد خطا ہے جو سرزد ہوئی مجھ سے۔ اس سے قطع نظر

نے کبھی تمہارے علاوہ کسی کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا۔ اسی لیے میں اس تعلق کے منقطع ہونے پر اتنی شرم سے ردِ عمل ظاہر کرنا چاہتا تھا خدا بھلا کرے فریحہ کا جس نے تم دونوں کی گفتگو سن کر مجھے سب احوال سنا دیے

ورنہ۔۔۔ ورنہ تم اسی ڈھٹائی اور خود سری سے خود کو وہی لڑکی ظاہر کرتیں اور اپنی اور میری عمر کو ضائع کر ڈالتیں تمہاری فرد جرم میں از حد قسم کی بے وقوفی کا بھی اضافہ کرتا ہوں۔“

”فریحہ نے آپ کو۔۔۔ آپ۔۔۔ آپ سب جانتے ہیں؟“ ناعمہ نے خود کو بڑی بڑی زنجیروں سے آزاد ہوئے محسوس کیا۔

”شکر ہے خدا کا جس نے پروے ہٹائے۔“ وہ مسرور سا بولا تھا۔

”آپ“ آپ سب کچھ جاننے تو جتھے بھی مجھے پریشان کرتے رہے؟“ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔
”نہیں، یہ حقیقت بیان لینے کے بعد میں نے کبھی تمہیں پریشان نہیں کیا۔“ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔

”آپ۔۔۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا۔ اتنا برا جھوٹ بولنے پر؟“ ناعمہ کی آواز بیٹھنے لگی تھی۔
”اس جھوٹ کے پیچھے تمہارے جو احساسات و جذبات پوشیدہ تھے ناعمہ! انہوں نے مجھے تمہارا بے دام غلام بنا ڈالا ہے۔ میں بہت خوش نصیب ہوں جو تمہارے جیسی بالغ نظر اور ایثار پسند لڑکی میری شریک حیات بنی ہے۔ اور معافی تو میں تم سے طلب کرتا ہوں۔ بے پروا عمر کے ایک غافل حصے میں میں نے یقیناً ایک خراب و خطرناک حرکت کی ہے چند لمحوں کی نشاط انگیزی ساری عمر چند لوگوں سے شرمسار رکھے گی۔ نظر نہیں ملا پاؤں گا میں ان سب سے۔“

”عریشہ!“ ناعمہ بے حد دکھ سے بولی تھی۔ ”اس کا پاگل پن ویسے ہی برقرار ہے۔“
”میں جانتا ہوں ناعمہ! لیکن وقت ہی ایسے پاگل پن کا درماں ہوا کرتا ہے۔ نئی زندگی کی شروعات اسے بھی بدل ڈالیں گی۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ وہ آہستہ سے بولی تھی۔
اسے عرشہ کا وہ خطرناک انداز یاد آ رہا تھا۔ اسے بے چینی سی ہونے لگی تھی۔
”کیا سوچ رہی ہو؟“ فرزانے اس کا چہرہ اپنی جانب کیا تھا۔
”عریشہ کے بارے میں سوچ رہی ہوں میں“ میں صبح اس کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتی ہوں!“
”ایسا ہی ہو گا۔“ فرزانے آہستگی مگر یقین بھرے انداز میں کہا تھا۔ ”لیکن میں۔۔۔ ابھی تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ناعمہ اس کے بدلے انداز پر چوکی، سنبھلی پھر دھیرے سے مسکرا دی۔
”میں تو سوچے بیٹھی تھی کہ آپ میرے آنسوؤں کے سوا کچھ دیکھنے کے متنبی نہ ہوں گے!“ فرزانے دھیرے سے اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔ انہیں آہستہ سے دبایا اور مضبوط لہجے میں کہا۔
”ہم اس بل سے۔۔۔ ایک بالکل نئی زندگی کا آغاز کریں گے ناعمہ! ہمارے درمیان پچھلا کوئی حوالہ کبھی نہیں آئے گا پچھلی کوئی بھی بات کوئی جگہ، کوئی شکوہ، کچھ بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں، تمہارا دامن تمہاری طرح چپاک اور صاف ہے لیکن مجھ سے کچھ غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں اسی لیے میں سب کچھ بھلا دیتا چاہتا ہوں۔ آئندہ ہمارے درمیان کسی تیسرے فرد کے حوالے سے کوئی بات نہ ہوگی میں اور تم بس یہی دنیا ہے۔ ٹھیک ہے نا!“

ناعمہ نے آہستگی سے سر ہلایا۔ وہ خود کو بے حد آزاد، ہلکا پھلکا اور مطمئن محسوس کر رہی تھی۔ نیک نیتی کے شر اس کے چہرہ پر بھرے ہوئے تھے۔ اس کا دل، دماغ اور روح آسودگی اور سیرابی کی انتہا کو محسوس کر رہے تھے۔ ایسے لمحوں میں بھی اس نے چپکے سے عرشہ اور نافع کی خوشگوار زندگی کی ابتداء کی دعا کی تھی۔



لباس تبدیل کر کے وہ چہرے کو کلیننگ ملک سے صاف کر رہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی، تھلا کو قدرے حیرت سی ہوئی۔ باختم اور رافع تو فارغ ہو کر محفل جمائے ہوئے تھے۔ گھر کے بقیہ افراد بھی تھکے ماندے اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ عرشہ کی رحمتی کا عمل ایسا ہی تھا کا دینے والا، اعصاب شکن محسوس ہوا تھا۔ اس نے رات کے دو بجائی گھڑی کو دیکھا اور بروہہ گرد دروازہ کھولا۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

”نافع!“ پوری آنکھیں کھول کر اس نے نافع کو دیکھا۔ ”تم یہاں اس وقت؟“
نافع نے یکایک اس کی کلائی پکڑی تھی پھر وہ اسے کھینچتا ہوا ”از حد عجلت میں۔ کیسے لے جانے لگا۔“
”نافع۔۔۔!“ شملانے کہنا چاہا۔

”شش۔۔۔ خدا را بھالی خاموش رہیں۔“ اس نے سرگوشی کی تھی۔
شملانے کو کسی غیر معمولی احساس نے گھیرا۔ وہ خود بھی تیزی سے قدم بڑھانے لگی۔ نافع اسے لان کے بجائے گھر کی پچھلی گلی کی جانب لے گیا تھا جہاں نکاسی آب کی لائنیں اور اکثر کمروں کے باہر کی جانب کھلنے والے دروازے تھے۔ نافع کے کمرے کا بھی ایک دروازہ اس گلی میں کھلتا تھا۔
دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے اس کے کمرے میں پہنچے تھے۔ شملانے اس دوران چشمِ تصور سے نجانے کیا کچھ دیکھ چکی تھی۔ سوچ پر بے خود پڑی عریشہ کو دیکھ کر اسے تعجب نہ ہوا۔

”کیا کیا ہے اس نے؟“ گھبراہٹ کے عالم میں پوچھ کر وہ اس کی نبض وغیرہ دیکھنے لگی۔
”شاید گولیاں کھائی ہیں۔۔۔ یہ خالی شیشی۔“ نافع نے اس کی توجہ خالی شیشی کی جانب مبذول کرائی۔
”اوہ گاڈ۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔ یہ پاگل لڑکی!“ شملانے اعصاب جواب دے رہے تھے۔
”بھالی! یہ بات اس کمرے سے باہر نکلی تو میں ساری عمر کسی سے نظر نہیں ملا پاؤں گا۔“ وہ شکستگی سے بولا تھا۔
”تم نے کچھ نہیں کیا نافع۔۔۔!“ شملانے اسے تسلی دی۔
”شاید۔۔۔ یہی میرا تصور ہے۔ میں نے امی سے کہا بھی تھا۔“ اس کی آنکھیں بے اختیار نم ہوئی تھیں۔
”افوہ۔۔۔ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے نافع! تم اسے اٹھاؤ میں گاڑی کی چابی لاتی ہوں۔“
”لیکن اس وقت کہاں جائیں گے؟“ وہ ہراساں ہوا۔ ”یہ تو پولیس کیس ہے!“
”ڈونٹ وری۔ میرے پروفیسر ہیں ڈاکٹر خالد، ان ہی کے کلینک لے کر چلتے ہیں اسے۔ جلدی کرو نافع وقت ہمارے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔“
نافع نے بے سدھ پڑی عریشہ کو کاندھے پر ڈال لیا۔ شملانے تیزی سے کمرے سے نکلی تھی۔



صبح صادق ہو چلی تھی۔ شملانے بے حد تھکے تھکے سے انداز میں نافع کے سامنے آ بیٹھی۔ چہرے پر صدیوں کی تھکن لے بیٹھا نافع چونکا پھر آنکھیں مسلنے لگا۔
”اسے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا ہے۔۔۔ تم اسے دیکھ سکتے ہو۔۔۔ دیے ابھی ہوش تو نہیں آیا۔۔۔ لیکن خطرے سے باہر ہے۔“ شملانے تنگی سے بولی تھی۔
نافع نے چند لمحوں کے لیے اٹھ کر دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ شملانے ہمراہی میں وہ بے ہوش، بے سدھ پڑی عریشہ کے پاس جا رکھا تھا۔

”کچھ دیر میں ہوش آجائے گا۔“ شملانے تسلی دی تھی۔
نافع نے کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ ایک گہری سانس ضرور اس کے لبوں سے آزاد ہوئی تھی۔ ایک نرس رُے میں چائے کے دو کپ لیے چلی آئی۔
”ڈاکٹر خالد کہہ رہے ہیں وہ کچھ دیر میں آتے ہیں۔ آپ لوگ تب تک چائے پیئیں۔“ اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ انہیں اطلاع دی تھی۔ دونوں نے گرم گرم چائے کی شدید طلب کو محسوس کرتے ہوئے کپ اٹھا لیے تھے۔ ایک گھونٹ بھر کر شملانے کھوجتی نظروں سے اسے دیکھا۔
”گھر والوں سے کیا کہنا ہے؟“

جواب میں نافع نے سوالیہ نگاہیں اس کی جانب اٹھائیں۔

”نوڈ پوائزنگ“ شملہ خود کو سہارا دینے کے لیے کھنکھماری۔ ”نوڈ پوائزنگ ہو گئی ہے عریشہ کو۔ رات گئے طبیعت خراب ہوئی تو ہم اسے یہاں لے آئے۔ ٹھیک ہے نا؟“

”ہوں!“ وہ آہستگی سے بولا۔

”تم۔ تم پریشان مت ہو نافع!“ شملہ نے اسے تسلی دینا چاہی۔ ہر چند کہ وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں ہیں جو اس وقت اس کے دکھ اور شدید غم کے تاسف کا درماں بن سکیں۔

”عریشہ عریشہ اچھی لڑکی ہے۔ اسے تھوڑی سی توجہ۔ تھوڑی سی محبت ملے گی تو۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔“

نافع نے بے تاثر سپاٹ نظروں سے شملہ کی جانب دیکھا پھر چائے پینے لگا۔

”اور پھر۔ اب تم ہی۔ اس سر پھری لڑکی کا پردہ ہو نافع۔“ وہ نافع کی خاموشی سے قدرے خوف زدہ سی تھی۔ کچھ بھی تھی۔ عریشہ اس کی نند اس کے شوہر کی بہن اس کے گھرانے کی عزت تھی۔

”بے فکر رہیں شملہ بھالی!“ نافع نے کپ خالی کر کے میز پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ہمارے گھرانے الگ الگ نہیں ہیں۔ ہم ایک خاندان کا حصہ ہیں۔ عریشہ صرف آپ کی نہیں۔ میری بھی عزت ہے۔ اور خدا گواہ ہے کہ اس کی تمام تر بے اعتنائی۔ بے توجہی اور بے نیازی کے باوجود میں اس سے محبت بھی کرتا ہوں۔ وہ محبت جو نکاح کے پاک بولوں سے دو دلوں کے درمیان خود بخود سبزے کی مانند آگ آتی ہے۔ اس کا دل اگر بجز رہا تو شاید میری ناکامی ہے۔ میں اپنا قصور تسلیم کرتا ہوں۔“

شملہ نے بہت محبت سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”بہت کم لوگ تمہارے جیسے ہوتے ہیں نافع۔ ایسے وسیع القلب۔ اتنے باظرف۔ جسے ٹھانیں مانتے۔ دریا ہو۔ تم ناکام ہو ہی نہیں سکتے۔ ایسا دریا تو صحرا میں پھول کھلا سکتا ہے۔ پورے کا پورا رنگ زار۔ گلزار بنا سکتا ہے۔ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ ایسے ہی رہو۔ اتنے کشادہ دل۔ ایسے ہی مہربان۔ باوصف۔ خدا تمہیں ہر موہ پر سرفراز کرے۔“

شملہ کے الفاظ جادو اثر تھے۔ نافع کے چہرے پر بکھری اداسی اور آنکھوں میں بسی تنہائی کی جگہ بشاشت اور سکون نے لے لی۔

”تھینک یو بھالی!“ وہ ممنونیت سے بولا۔

”یہ ڈرپ ختم ہو جائے تو ہم اسے گھر لے چلتے ہیں۔ اگلی ڈرپ میں اسے گھر پر ہی لگا دوں گی۔“

آج رات ثانیہ کاؤنڈ ہے۔ کل ناعمہ کا۔ برسوں تمہارے ویلے تک میں اسے بالکل فریض کروں گی۔“

شملہ نے لمبے میں بے فکری اور بشاشت پیدا کرتے ہوئے اسے مزید ریلیکس کرنا چاہا۔ عریشہ کی بند پلکوں کو دیکھتے ہوئے نافع نے سر ہلایا تھا۔



ازحد تھکے ہوئے انداز میں وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی ہی تھی کہ گال پر پڑنے والے زناٹے دار تھپڑ نے اسے چند لمحوں کے لیے ماؤف سا کر دیا۔ اسے دیکھنے میں دشواری سی ہوئی۔ پچھلے دنوں کی بے تحاشا مصروفیت کے بعد رات بھر کی تھکان نے اسے بہت بد حال کر ڈالا تھا۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا۔

”ہاشم!“ پھر اس کے لبوں سے نہایت حیرت اور افسوس کے ساتھ نکلا تھا۔ ”آ۔ آپ نے۔ مجھ پر ہاتھ

اٹھایا۔ آپ نے؟“

آنکھوں میں سرخی اور وحشت کا جنگل لیے وہ چہرہ ہاشم کا چہرہ نہ تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور سانسیں بے ترتیب تھیں

”رات بھر اپنے بیڈ روم سے باہر رہنے والی بیوی اپنے شوہر سے کیا توقع کرتی ہے شہلا؟“ وہ ہنسنے لگا۔ انداز میں بولا تھا۔ ”وہ کون سا مقام تھا جہاں سے تمہاری آواز کا سننا بھی محال تھا؟“ شہلا شہدہ رہ گئی۔ ہنسی پھٹی آنکھوں سے وہ اسے دیکھنے لگی۔

”کہاں گئی تھیں؟“ اس نے دانت پیسے۔ ”جواب دو مجھے۔ ابھی وہ پیپر میں نے سائن نہیں کیے ہیں شہلا احمد! جس کو لے کر تم آزاد ہو جانے کی خوشی میں سب ہی کچھ فراموش کر گئے۔“ اس کے الفاظ اس کے لبوں میں ہی دم توڑ گئے تھے۔ شہلا کسی زخمی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی تھی۔ ہاشم اس کے چھڑیوں کی بو چھاڑے گھبرا گیا۔

”یہ کیا سمجھتے ہو۔ کیا سمجھتے ہو مجھے۔ آوارہ۔ بد کردار ہوں میں؟ اتنا کمزور جانا تم نے مجھے۔ بس اتنا ہی سمجھ پائے۔ یہ تھا تمہاری کھوکھلی محبت کا دعویٰ؟“ وہ دیوانی ہونے لگی تھی۔

”شہلا۔۔۔ شہلا ہتھپاگل ہو گئی ہو۔“ ہاشم نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

شہلا اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ اپنے ہاتھ چھڑوا کر اس نے کشن اٹھا کر اسے مارنا شروع کیا۔

”تم سے محبت چاہتی رہی میں۔ تم سے۔ تمہارے جیسے کمزور ذہنیت کے انسان سے۔ جو رات بھر بیڈ روم سے باہر رہنے کو لازماً بیوی کی بد چلتی گردانتا ہے ہاشم! ہاشم اُٹلی دل کل پو۔“

ہاشم اس بھیڑی شیرنی کو سنبھالنے کی کوشش میں بیڈ روم اور اسے مار رہی ہوئی شہلا اس کے سینے پر آ گری۔

”عریضہ کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔“ شہلا گلوگیر لہجے میں بولی ”مجھے اور نافع کو اچانک ہی اسے ہسپتال لے جانا پڑا۔ میرا سبیل بھی جلد بازی میں کمرے میں ہی رہ گیا۔ ابھی میں عریضہ کو اس کے کمرے تک پہنچا کر آ رہی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہاشم۔ کہ آپ بھی اتنے بے اعتبار ہو سکتے ہیں۔“ پھر اگلے ہی بل وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر زور زور سے رونے لگی تھی۔

رات بھر اپنے اعصاب سے جنگ لڑتا ہاشم شل ہو چکا تھا۔ شہلا کے گرد اپنے بازوؤں کو لپیٹتے ہوئے وہ تھکے تھکے انداز میں سانسیں بھرنے لگا تھا۔

”شہلا، شہلا! مجھے معاف کر دو۔ زندگی نگاہوں کے سامنے روٹھ کر جا رہی ہو تو بڑے سے بڑا ذی ہوش بھی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی تمہارے جانے کے تصور سے ہی دیوانہ ہو گیا۔ مجھے تسلیم ہے شہلا! میں۔۔۔ میں تم سے دور رہ کر نہیں جی پاؤں گا۔“

شہلا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس لاوے کے بہہ نکلنے کی وہ کب سے منتظر تھی۔

”اور وہ پیپر نہ۔۔۔ وہ کس بات کا اعتراف ہیں؟“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”اسی محبت کا؟“ ہاشم کچھ دیر اس کی نظروں میں دیکھا رہا پھر اس نے انگلی کی پور سے اس کے آنسو پونچھے۔

”کہاں گئے وہ پیپر؟“ وہ تم نے ہی اٹھائے ہیں؟“

”جلا دیے تھے میں نے۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”ان کا خوف مجھے رات کو سونے نہیں دیتا تھا!“

ہاشم نے ساخنہ بنا تھا۔ اس کی شفاف ہنسی میں زندگی کی بھرپور حرارت جی اٹھنے کا مکمل احساس تھا۔

”صد شکر۔“ وہ تشکر سے بولا۔

”کیوں دینا چاہتے تھے مجھے یہ سزا؟“ شہلا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظروں میں اب تک شکایت تھی۔ بے یقینی تھی۔

”شہلا! شہلا میں گمراہ کیا گیا تھا۔ لیکن آج تمہارے اس انداز نے بدگمانی کا ذرہ ذرہ میرے دل کی تہوں سے پھونک نکالا ہے۔ یہ انداز محبت کا ہے سراسر محبت۔“

شہلا چند لمحے اس کی نظروں میں دیکھتی رہی۔ ساری بات سمجھ میں آرہی تھی۔
 ”ہاشم! وہ محض ایک پرچھائیں ہے۔ میں سمجھتی تھی تمہارے جیسا مضبوط شخص کبھی بھی ایک پرچھائیں سے خوف زدہ نہ ہو گا۔ یہ لیکن تم نے میرے خوف زدہ دل کو اپنی محبت سے اپنے اعتماد سے بخشا تھا۔“
 ہاشم شرمسار تھا۔ شہلا کی نظروں میں دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔
 ”آئی ایم سوری۔ لیکن جانو محبت جواب میں محبت اور اعتبار جواب میں اعتبار مانگتا ہے۔۔۔ صحرا میں جیتے رہنے کے لیے ایک نخلستان بھی درکار ہوتا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں ہاشم!“ شہلا اپنے آپ میں لوٹ چکی تھی۔ آہستگی سے بولی۔ ”آپ کے گریز کے دور میں جیتے ہوئے مجھے اپنی سب ہی خامیوں کا ادراک ہو چکا ہے۔۔۔ میں جانتی ہوں کہ ہمراہی کے اس عرصے میں میں نے کئی مقام پر آپ کو مایوس کیا ہے۔“
 پھر اس نے ہاشم کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

”لیکن ہاشم! آج اس بات کا یقین کر لیں کہ آپ تک آنے والی راہ میں نے کسی لاپرواہی، کسی دھوکے کی آڑ لے کر پار نہیں کی تھی۔۔۔ میرے ساتھ محض اعتبار تھا۔ آپ کے خلوص کا اعتبار۔ زندگی کو نئے سرے سے پرکھنے کا اعتبار۔ ہاشم! میں نے کبھی بھی خود کو اتنا ابرازاں اتنا بے مول نہیں سمجھا کہ ایک مرتبہ جہاں سے سر جھکا کر نگلی وہاں پھروسی جھکا ہوا سر لے کر واپس جاؤں۔۔۔ اس شخص نے جس تنفر، غرور اور بے نیازی سے مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا اس کے بعد اس کی سمت کو جاتے تمام رستے ہمیشہ کے لیے اندھے ہو گئے تھے ہمیشہ کے لیے۔ میں نے بھی پلٹ کر ان رستوں کو پہچاننے کی کوشش نہیں کی۔ حتیٰ کہ عمر کی محبت بھی مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہ کر سکی۔ مجھے وہ وقت ہمیشہ یاد رہے گا جب اس نے طلاق نامہ پہنچ کر مجھے میرے محبت کرنے والے ماں باپ اور بن بھائی کے سامنے ہمیشہ کے لیے شرمسار اور بے مول کر دیا تھا۔ اب اس کے پاس پلٹنے کے سو جواز ہوں۔۔۔ میرے پاس ایک بھی نہیں۔۔۔ مجھے آپ کی محبت، خلوص اور احترام کی جو گھنٹی چھاؤں ملی ہے۔ اس سے میں مر کر بھی دستبردار ہونا نہ چاہوں گی۔ مرنے کے بعد اگر خدا نے مجھے جنت عطا کی تو۔۔۔“

ہاشم لب بستہ حیران یک نک اسے دیکھ رہا تھا۔

”تو میں وہاں بھی آپ جیسے شخص کا ساتھ چاہوں گی ہاشم!“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”یہ سب کچھ جان لینے کے بعد بھی اگر آپ مجھے خود سے دور کرنا چاہتے ہیں تو۔۔۔“

”شہلا! ہاشم نے بے خود ہو کر اسے سینے سے لگایا تھا۔ ”کچھ مت کہو بس اب ایک لفظ بھی نہیں۔ یہ سب کچھ تم پہلے ایک بار بھی کہہ دیتیں تو میں قیامت تک تم سے بدگمان نہ ہوتا۔۔۔ محبت لفظوں کی محتاج تو نہیں ہوتی لیکن لفظ اندیشوں اور بدگمانیوں کے قائل ضرور ہوتے ہیں۔ اس لیے کم از کم ایک مرتبہ تو کسی کو اپنے لفظوں کی بارش سے سیراب کرنا ہی ہوتا ہے۔۔۔ آج تم نے میری زندگی بھر کی پیاس کو اس طرح سیراب کر دیا ہے کہ قیامت مجھے اپنی مٹی سے اس کی خوشبو آتی رہے گی۔“

شہلا نے اس کے کاندھے سے سر نکا کر سکون و طمانیت کے احساس سے سرشار ہو کر آنکھیں موندی تھیں۔

”اب شیطان کوئی سازو پ بدل کر آئے۔۔۔ میں اسے پہچان لوں گا۔“ ہاشم مزید بولا تھا۔ ”ہمیں ساتھ ساتھ رہنا ہے شہلا۔! جنت میں بھی!“

شہلا کی بد نہر ہنسی نے کمرے کا ماحول مزید خوشگوار کر دیا تھا۔

سب لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے۔ سب ہی کے چروں پر فکر مندی تھی۔

”میری بچی پوری رات ہسپتال میں گزار آئی اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ذرا چہرہ دیکھو کیسا زرد ہو رہا ہے۔ جیسے مردہ قبر سے نکلا ہو۔ ایسا بھی کیا ہو گیا تھا آخر۔“

فردوس بیگم نے عریشہ کو خوب پیار کرنے کے بعد نافع کو دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں ہی نہیں لہجے تک میں شکایت تھی۔

نافع نے نگاہیں چرائیں۔ وہ قدرے فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے، سینے پر بازو لیٹے کھڑا تھا۔

”جو اس نے کھایا، وہی کھانا سب نے کھایا۔ پھر اسی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ کیا تم نے اسے کچھ اور کھلایا تھا؟“

انہوں نے سب ہی افراد کے سامنے نافع سے مزید جرح کی۔ عریشہ نے بے چین سی ہو کر ماں کی جانب دیکھا۔

”میں نے کچھ نہیں کھلایا تھا انہیں۔“ نافع پاٹ لہجے میں بولا۔ ”آپ ان ہی سے پوچھ بیجیے!“

”کیسی باتیں کرتی ہو۔ ہوس۔“ شفیقہ حیات قدرے برا مان کر بولی تھیں ”بچہ کیا نئی دلہن کو زہر کھلا دے گا؟ کچھ کھلایا بھی ہو گا تو شوق سے اچھا ہی کھلایا ہو گا۔“

کچھ لوگ مسکرا دیے تھے۔ کچھ ہنس پڑے۔

”ایسی بات نہیں ہے۔“ شہلا اس کو ڈرپ لگا رہی تھی، مسکراتے ہوئے بولی۔ ”فوڈ پوائزننگ ضروری نہیں کہ سب ہی کو ہو۔ کسی شخص کو ایک چیز سوٹ کرتی ہے دوسرے کو نہیں کرتی۔ پوائزننگ کرویتی ہے۔ ایسا ہی عریشہ کے ساتھ ہو گیا۔“

ماہین نے ماں کا ہاتھ دبا کر انہیں مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا۔

عریشہ کی نگاہیں بے اختیار نافع کی سمت اٹھی تھیں۔ وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ عریشہ کے اعصاب میں جھنجھناہٹ سی دوڑ گئی۔ نافع کی بے تاثر سپاٹ نگاہوں میں کون سے خوابیدہ جذبات کسمسائے تھے۔ وہ سمجھ نہ پائی۔ اسے ڈرپ کی سوتلی چھینے تک کا احساس نہ ہوسکا۔

”میرا خیال ہے ہم سب لاؤنج میں چل کر بیٹھے ہیں۔“ عذرا بیگم نے ایک اہم امر کی جانب سب کو متوجہ کیا تھا۔

”عریشہ بھی آرام کر لے گی اور نافع بھی!“

”بالکل ٹھیک۔“ ماہین نے تائید کی۔

فردوس بیگم نے پھر عریشہ پر بوسوں کی بوچھاڑ کی اور بمشکل خود کو سنبھال کر کھڑی ہوئی تھیں۔

پھر سب ہی عریشہ کو پیار کر کے باہر نکلے تھے۔ آخر میں نافع بھی باہر کی سمت بڑھا تو شہلا نے اسے نظروں ہی نظروں میں کچھ سمجھانا چاہا۔ وہ گری سانس بھر کر رہ گیا۔

دونوں کے مابین گھنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ عریشہ نے چند ایک مرتبہ چور نظروں سے اس کی جانب دیکھا تھا لیکن نافع ذرا بھی متوجہ نہ تھا۔ اس کے بید کے قریب بڑی کرسی پر بیٹھا وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ عریشہ کے لیے جیسے وہ ایک اجنبی تھا۔ یہ وہ نافع نہ تھا جو اس کا رکن تھا۔ جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلی کم اور لڑی زیادہ تھی جو اس کی شکایتیں ہاشم سے کیا کرتا تھا۔ نا تجربہ کار نا پختہ کار۔ وہ نافع نجائے کہاں کھو گیا تھا۔ یہ سنجیدہ اور باشعور شخص تو کوئی اور تھا۔

”میری جان بچا لینے کے لیے شکریہ!“ وہ آہستگی سے بولی۔

نافع نے نظروں کا زاریہ موڑ کر اسے دیکھا۔ چند لمحوں کے بعد۔

”جان دینے اور لینے کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔۔۔ اس کا شکر ادا کرو۔۔۔ اس نے تمہیں حرام موت سے بچا لیا۔“

عریشہ سے چند لمحوں کے لیے بولا نہ جا سکا۔ وہ لفظ بے لفظ درست کہہ رہا تھا۔

”پھر بھی۔“ وہ بولی۔ ”جان بچانے کا نہ سہی۔۔۔ پردہ رکھ لینے کا شکر یہ!“

”یہ میرا فرض تھا۔۔۔“ وہ پھر بولا۔ ”تم میری بیوی ہو۔۔۔ تمہاری عزت سے میری عزت۔۔۔ تمہاری بے عزتی سے میری بے عزتی ہے۔“

بہت عرصے کے بعد عریشہ کی پلکیں نم ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے اندر کچھ جاگتا ہوا محسوس کیا۔ اسے لگا وہ کسی اپنے کے پاس بیٹھی ہے۔۔۔ اسے لگا وہ سب سے اپنے کے پاس بیٹھی ہے۔ ایسا اپنا اب تک کوئی نہ بنا تھا۔ دل رکھنے کی ایسی کوشش بھی کسی نے نہ کی تھی۔

”بائع۔۔۔!“ وہ آہستہ سے بولی۔

نافع نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔

”تم۔۔۔ پوچھو گے نہیں۔۔۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟“

”نہیں۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولا ”نہیں پوچھوں گا۔۔۔“

اب کے وہ چونکی تھی۔

”ایسا پوچھنے میں مجھے اپنی انسفلٹ فیل ہوتی ہے اور میں ایسا بھی نہیں چاہتا!“ پھر وہ اٹھ کر کھڑا ہوا تھا۔

”تم آرام کرو۔۔۔ اگر بہتر محسوس کرو تو شام کو ثانیہ آپنی کے کیمہ میں شرکت کے لیے تیار ہو جانا!“

”ہوں!“ اس نے گم صم سے انداز میں سر ہلایا۔

نافع کمرے سے باہر چلا گیا تھا۔ عریشہ کی نظروں نے دروازے کے بند ہونے تک اسے دیکھا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ کی پشت میں پیوست سوئی کود دیکھا۔ جس میں سے قطرہ قطرہ نکلتی زندگی ایس کی رگ جاں میں اتر رہی تھی۔

آتش فشاں کے پھٹ جانے کے بعد دھواں اگلتی چوٹی اب خاموش پڑی تھی۔ جسم و جاں میں سب کچھ ساکن تھا۔ شور و گنگمہ سر ہو چکا تھا۔ بس پچھتاوے کا ایک گہرا احساس تھا جو سوچ میں پیوست تھا پھانس کی طرح۔

”کیوں کر رہی تھی میں ایسا۔۔۔ کیوں؟“ بے سدھ ہونے سے لے کر ہوش میں آنے تک وہ بار بار خود سے پوچھ چکی تھی۔ اس وقت جب بغضیں ڈوب رہی تھیں۔ ذہن گہری نیند میں جانے لگا تھا۔ ہاتھ پیر بے جان ہوتے جا رہے تھے۔ عریشہ نے زندگی کو پورے احساس کے ساتھ جانا تھا۔ زندگی جو حرارت ہے، حرکت ہے، مسکراہٹ ہے، خوب صورتی ہے اس زندگی کو وہ یوں ٹھکرا رہی تھی تو کس لیے؟

اس کے لیے، جو اس کی نظروں کی سامنے کسی اور کا بنا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ پوری شان اور طمطراق کے ساتھ خوشیوں کے ساتھ، مسکراہٹ کے ساتھ۔ پچھتاوے یا ناسف کی ایک شکن غمے بغیر!

ناعمہ سے انتقام کے لیے؟ ناعمہ جو اپنی زندگی کی خوشیوں کی قسم کھا کر کہتی تھی، اس نے جو کچھ بھی کیا عریشہ ہی کی عزت کے لیے کیا اور حالات و واقعات اس کے کیے کی پوری تائید بھی کرتے تھے۔

اپنے ماں باپ سے انتقام کے لیے؟ جن کے کیے گئے فیصلے کی بدولت وہ ایک ایسے شخص کی پناہ میں چلی آئی تھی جو اس کی سنگین غلطی کو بھی اپنے سر لے کر پورے خاندان کے سامنے اس کی ڈھال بن کر کھڑا تھا۔

کیوں اس نے زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ کیوں اس نے اپنے لبوں کو مسکراہٹ سے دور رہنے کی سزا سنائی تھی کیوں اس نے ایک زندہ حرارت سے بھرپور وجود کو مردنی اور بے دلی کے کفن میں

لیٹ کر تمنائی اور خوشوختی کی قبر میں دفنا ڈالا تھا۔

کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟
اپنے اندر سے اٹھتی تکرار سے گھبرا کر عیشہ نے سر تکیے پر ڈال دیا۔ پھر اس نے بے تابی سے دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں خاموشی تھی۔ اب اسے صرف اس خاموشی کے ٹوٹنے کا انتظار تھا۔



”ربیعہ بیٹی! اب کیسی طبیعت ہے؟“ اس کی آنکھ کھلی تو منیہ بیگم اس کے اوپر جھکی ہوئی تھیں ربیعہ چند لمحوں کا مہربان چہرہ محبت بھری نظروں اور خوب صورت مکان کو دیکھتی رہی پھر شاشت سے مسکرا دی۔
”میں بالکل ٹھیک ہوں امی جی!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ لوسو۔ چائے پی لو۔“ انہوں نے اسے چائے کی پیالی پکڑائی۔
”آپ نے تکلیف کیوں کی امی جی!“ وہ شرمندہ ہوئی۔ ”آپ کی خدمت کرنا میرا کام ہے بجائے اس کے۔۔۔“
”بس خاموش رہو۔“ انہوں نے محبت سے اسے ڈانٹا۔ ”کبھی کبھی خدمت کرو ابھی لیا کرو۔“
ربیعہ مسکراتے ہوئے چائے پینے لگی۔

”ربیعہ۔۔۔ میری جان!“ انہوں نے اس کے بال سنوارے۔ ”تم مجھے پریشان سی لگیں۔ کیا بات ہوئی کوئی مسئلہ ہے تو اپنی ماں کو بتاؤ۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے امی جی۔۔۔“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”بلکہ میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی آپ سے۔“
اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا پھر قدرے جھینپ کر پھر سے سر جھکا لیا۔

”آپ۔۔۔ امیر حسن کے لیے پوچھ رہی تھیں؟“
”مگر تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہوگی ربیعہ!“ منیہ بیگم نے اس کی بات کاٹی۔ ”لیکن اس رشتے سے جڑی ایک حقیقت بھی ہے جو میں نہیں۔۔۔ بتانا چاہتی ہوں۔۔۔ وہ سن لو پھر جو چاہے فیصلہ کرو۔ تمہاری ماں ہر صورت تمہارے ساتھ ہے!“

”کیسی حقیقت!“ ربیعہ حیران ہوئی۔
منیہ بیگم چند لمحوں کا چہرہ دیکھتی رہیں۔ وہ تذبذب کا شکار لگتی تھیں۔
”ربیعہ۔۔۔!“ پھر وہ بولی تھیں۔ ”میں جانتی ہوں قدرت نے میرے لیے جو فیصلہ کر دیا ہے۔۔۔ میں اب چند ماہ سے زیادہ نہیں جی پاؤں گی۔“

ربیعہ نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھامے۔
”امی جی!“

”ماں میری جان۔۔۔ میں جانتی ہوں مجھے کیسے ہے۔“ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ”لیکن مجھے اپنے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں۔۔۔ جو اس کی رضا اس نے میرے دل کی سب ہی مرادوں کو یوں پورا کیا ہے کہ دل میں کسی حسرت کا پرچھاواں محسوس نہیں۔ مجھے اپنے نبی مل گئی۔ میں نے جی بھر کر اپنی مٹا کو سیراب کیا۔ مجھے اپنی بے گناہی ثابت ہونے کی نوید ملی۔۔۔ میں اپنے رب کی آزمائشوں میں سرخرو ہوئی۔۔۔ ایک گناہ گار انسان اور کیا چاہ سکتا ہے اس کے سوا؟“

ربیعہ نے اپنا سر ان کے کاندھے پر رکھ دیا۔
”میں تمہاری محبت سے سیراب ہوں ربیعہ! اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہارا باپ بھی اپنی بیٹی کی محبت اور خدمت کے ذائقے سے روشناس ہو سکے۔۔۔ اسے تمہاری ضرورت ہے!“

ربیعہ نے ایک جھٹکے سے اپنا سر اٹھایا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بے یقینی تھی۔
 ”ہاں ربیعہ! احمد جمال نسب تمہارے والد بقید حیات ہیں۔“ ”شہریار احمد تمہارا بھائی اور امیر حسن تمہارا اکڑ ہے۔“

”امی جی۔۔۔!“ ربیعہ کے لبوں سے ہشکل نکلا تھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔۔۔“
 ”یہ سچ ہے بیٹی۔!“ وہ بھگی پلکوں کو جھپکتے ہوئے بولیں۔ ”شہریار احمد تمہارا سوتلا بھائی ہے۔۔۔ تمہارے والد نے باہر جا کر اس کی ماں سے شادی کر لی تھی لیکن انہیں سکون نہ مل سکا۔۔۔ وہ ساری عمر اپنے غلط فیصلے پر پشیمانہ اندر رہی اندر گھلتے رہے ہیں۔۔۔“

حیرانی کے سمندر میں ڈوبی ربیعہ یک ٹک انہیں دیکھ رہی تھی۔
 ”تمہارے والد پیر الازہر ہیں بیٹی۔! ان کی دیکھ بھال کے لیے محض زرسوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ وہ ساری اپنے حقیقی رشتوں سے دور کس طرح ترپے ہوں گے۔ کتنا ترسے ہوں گے۔۔۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔ اس میں چاہتی ہوں ان کی سزا میں کچھ تخفیف ہو ان کی اپنی بیٹی ان سے مل پائے ان کی خدمت کر سکے۔ ان کے ساتھ کچھ عرصہ بتا پائے۔ اگر نیم امیر حسن کا ہاتھ تھامنے پر راضی ہو سکو تو ایسا ممکن ہے۔“
 ان کی نگاہوں میں التجا تھی۔ ربیعہ حیران رہ گئی۔

”میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ ایک ان سے لپٹ گئی ”کبھی نہیں۔“
 ”میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گی بیٹی!“ انہوں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ ایک ہے۔ تمہارے والد کو تمہاری ضرورت ہے۔“

”میرے والد۔۔۔ جنہیں یہ تک علم نہیں کہ میں ہوں۔“ وہ دکھ سے بولی۔ ”وہ ایک اچھے انسان ہیں بیٹی ان کی طرف سے بدگمان نہ ہو!“ منہ زہ بیگم کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے ”تمہیں ان سے ضرور ہی ملنا چاہیے میں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ تمہیں دیکھیں۔۔۔ اپنے سینے سے لگائیں۔۔۔ تمہیں ایک باپ کی طرح پیار کریں جانے کیوں مگر میں ایسا چاہتی ہوں۔“

”امی جی! امی جی۔“ ربیعہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی میں آپ کو۔۔۔“
 منہ زہ بیگم دھیرے دھیرے اس کا سر تھپک رہی تھیں۔



آج رات خوشبوؤں میں ایک جاوولی اثر تھا! رافع نے مشام جاں کو معطر ہوتا محسوس کیا۔ پھر اس نے دس بجائی گھڑی کی سوئیوں کو دیکھا۔

رنگ و بو سے سچی اس محفل میں بہت سے چہرے تھے۔ لیکن نظریں جس چہرے کو دیکھنے کی متمنی تھیں وہ اب تک دکھائی نہ دیا تھا۔

آج فراز اور ناعمہ کی تقریب ولیمہ تھی۔ اسٹیج پر بیٹھے دولہا، دولہن کے چہرے حقیقی خوشی کی روشنی سے جگمگ رہے تھے۔ ان کے انداز میں ایک دوسرے کے لیے چاہت اور الفت تھی۔ ان دونوں کو خوش و خرم دیکھ کر کئی دلوں کو تشکر اور طمانیت کا بھرپور احساس ہوا تھا۔

راجہ بیگم رائے اور وردہ ناعمہ کو ہنستا مسکراتا اور مطمئن بنا کر اذ حد خوش تھیں۔
 رحمانہ بیگم بیٹا اور سو کو آپس میں ملنفت پا کر شاداں و فرحاں تھیں۔

تقریب میں جگمگاتے چہروں کے درمیان ایک مسکراتا چہرہ اسٹیج کی جانب رواں دواں تھا۔ گولڈن ہناری ساڑھی زیب تن کیے، بھاری زیورات پہنے عریضہ نے جب دولہا، دولہن کو مبارک باد دی تو وہ دونوں ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھنے بنارہے تھے۔

”عریضہ!“ ناعمہ نے بے ساختہ مسرت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ”کیسی ہو تم؟“

”میں ٹھیک ہوں۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائی۔

ایک عرصے بعد ناعمہ نے اس کی آنکھ کے کاجل کو مسکراتے دیکھا تھا۔ اسے اپنی دعا کی مقبولیت کا احساس ہوا تو اس کا رواں دواں خدائے پاک کا شکر بجالانے لگا۔

”خوش ہونا تم؟“ ناعمہ نے عجلت بھرے انداز میں تصدیق چاہی۔

”الحمد للہ۔۔۔۔۔ میں بہت مطمئن اور خوش ہوں ناعمہ!“

اس نے ذرا کی ذرا فرازی کی جانب دیکھا جو اس کی سمت دیکھنے سے گریزاں، قدرے شرمندہ سا نظر آتا تھا۔ ”اس دنیا میں زیادہ تر لوگ ایک مرتبہ جیتے اور ایک مرتبہ مرتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر ان کا خدا کچھ زیادہ ہی مہربان ہوتا ہے۔۔۔۔۔ انہیں سیدھی راہ چلانا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ انہیں بھٹکنے نہیں دیتا۔۔۔۔۔ پھر بھی وہ اگر بھٹکیں تو انہیں ہدایت دے کر پھر سے سیدھی راہ پہ لے آتا ہے۔۔۔۔۔ میں ان ہی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک ہوں۔“

ناعمہ حیرانی سے آنکھیں کھولے ایک ٹک اس کا جگمگا تا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”نافع؟“ پھر اس نے استفسار کیا ”نافع کہاں ہے؟“

عریضہ کا چہرہ نافع کے نام پر جس طرح کھلا تھا اس نے ناعمہ کو مزید ہجر حیرت میں غرق کیا۔

”آئے تو ہیں۔۔۔۔۔“ وہ قدرے شراب کر بولی۔ ”شاید دوستوں وغیرہ کو کہنی دے رہے ہیں۔“

ناعمہ ہنس پڑی۔ تو عریضہ نے چونک کر دیکھا۔ نافع اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔ نافع اور فراز آپس میں ملنے لگے۔ عریضہ شفق رنگ چہرہ لے کر واپس مڑ گئی تھی۔



تقریب اب اختتام پذیر تھی۔ انتظار کرتا رافع اب قدرے باپوس ہو چلا تھا۔ اس کے انداز کی تمام گفتگلی اور دلکشی ماند پڑ گئی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ غلطی پر تھا۔ عبادت تو تقریب میں موجود تھا، بیعہ کو اگر آتا ہوتا تو وہ عباد کے ساتھ ہی آتی نہ کہ بعد میں۔ اس نے اپنی حماقت پر خود کو سرزنش کی۔

”ہم بھی آدمی تھے کام کے۔۔۔۔۔“ بڑبڑاتے ہوئے وہ مڑا ہی تھا کہ ہاشم کے مقابل آگیا۔

ہاشم کے لبوں پر ناقابل فہم سی مسکراہٹ تھی۔ سنجیدہ، نرم، قدرے افسردگی کو ظاہر کرتی مسکراہٹ۔ رافع کو محسوس ہوا جیسے وہ جھکراہٹ رافع کے لیے ہی تھی۔

”کسے ڈھونڈ رہے ہو؟“ ہاشم نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

”قسمت کو!“ اس نے جیسے آہ بھری۔

”وہ کھڑی ہے!“ ہاشم نے اشارہ کیا۔

رافع نے عجلت اور حیرانی سے اس سمت دیکھا پھر فوراً ہی اس کے تاثرات تبدیل ہوئے تھے۔ ہاشم نے جہاں اشارہ کیا تھا؟ وہاں ورورہ کھڑی تھی۔

رافع نے جیسے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے اس کا ہاتھ کاندھے سے ہٹایا تھا۔

”تیرا دوست ہوں یا نہ۔“ ہاشم نے یقین دلانے والے انداز میں کہا۔
 ”نہیں۔۔۔ تم طرف ہو!“ وہ ایک سمت کو بڑھ گیا۔
 ہاشم اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ پھر سے اس کے کاندھے پر رکھ لیا تھا۔
 ”راغ۔۔۔! میری جان قسمت سے منہ نہیں پھیرتے۔ برا مان جاتی ہے اور جو ستارہ قسمت کے ستارے سے
 دور کہیں چمکا ہو۔۔۔ اس سے روشنی نہیں مانگتے۔ اس کی روشنی کسی اور کے لیے ہوتی ہے۔“
 راغ اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ پھر اس نے ہاشم کی جانب رخ کیا اور چند لمحوں کی مہمان اور پر غلوں میں نظر میں دیکھتا
 رہا۔
 ”ہاشم۔۔۔! وہ یوں بولا جیسے خود سے بھی خوفزدہ ہو۔“
 ”ہاں۔۔۔ بولو!“
 ”کیا وہ۔۔۔ کسی اور کے لیے ہے؟“ اس کے لہجے میں انتہائی بے یقینی تھی۔
 ”ہاں!“ ہاشم سپاٹ سے انداز میں بولا۔
 راغ کا چہرہ تیزی سے تاریک پڑا تو ہاشم کی آنکھوں میں ترم در آیا۔
 ”میں نہیں مانتا۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”کل شام ریجہ کا نکاح ہے۔ اس کے کزن امیر حسن کے ساتھ! میں اور شہلا ابھی وہیں سے آرہے ہیں
 جہاں ساری تفصیلات طے کی جا رہی تھیں۔ وہ کسی اور کا ستارہ ہے راغ۔۔۔ اسی کے نام ہونے جا رہا ہے۔“
 راغ کو یوں لگا جیسے وہ اس دنیا سے بہت دور۔ سورج سے ہزاروں گلاکھوں میل دور۔ کسی اندھیرے ’سرد‘ نا
 معلوم سیارے پر تنہا کھڑا ہے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، کچھ بھائی نہ پڑتا تھا۔ وہ خلا میں تھا یا اس کے قدموں تلے
 زمین بھی تھی اسے علم نہ تھا۔ بے وزنی اور بے بسی کی اس کیفیت میں وہ کتنی دیر جٹکا رہا، اسے علم نہ تھا۔ ہاشم
 مزید کیا کہہ رہا تھا اسے علم نہ تھا۔

ہاشم جو اسے مزید تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا، خاموش ہو گیا۔ احساس ہوا کہ وہ محض ایک بت سے
 مخاطب ہے۔ اس کا سب سے پیارا دوست اور کزن اس کے سامنے نہیں ہے اس کے سامنے صرف اس کی
 صورت کا ایک بت ہے۔

ہاشم نے خود کو ایک بے رحم سرجن محسوس کیا جو مریض کو نئی زندگی دینے کے لیے سفاکی سے اس کا سینہ چاک
 کرتا ہے اور دل نکال کر باہر رکھ دیتا ہے جو خود پر ایک مٹتی بے جسی صرف اس لیے طاری کرتا ہے کہ اس کے
 سارے نرم احساسات اور جذبات دور بیٹھے اس دل کی صحت یابی کا وظیفہ بڑھ رہے ہوتے ہیں۔
 ساری دنیا نجانے کیا کر رہی تھی؟ وہ دونوں آنے کے سامنے کھڑے تھے! پھر کیا ایک بے جان بت میں جان لوٹی۔۔۔
 راغ اچانک مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس سے دور جانے لگا۔
 ہاشم نے اسے پکارا نہیں۔ اس کے لب آپس میں پیوست تھے۔ اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ نیا دل کتنی دیر بعد
 دھڑکنے شروع کرتا ہے۔ اسے اس کا انتظار تھا۔



کارپورج میں کھڑی کر کے وہ تیزی سے چلتا ہوا اندر آیا تھا۔ اپنے پورشن کی سمت بڑھتے ہوئے یکایک اس کے
 قدم ٹھٹھے تھے۔
 ”حیات ولا“ کے درودیوار ہنوز رنگ برنگ روشنیوں سے سجے ہوئے تھے۔ رات کے اس پہر، خالی عمارت

روشنیوں میں گھر کر بھی ایک اداسی کا شکار لگتی تھی۔ تقریبات ختم ہو جانے کے احساس کے ساتھ تھکی تھکی سی عمارت۔ رافع کو یاد آیا۔ چند دن قبل مندی کی تقریب میں وہ اور ربیعہ اسی جگہ ٹھہر گئے تھے! ربیعہ نے آگے بڑھنا چاہا تھا مگر اس کے قدم اس کے دل کے تابع ہو گئے تھے۔ انہوں نے دماغ کا کمانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ دل جو اس کے قدموں سے ضدی بچے کی مانند لپٹ گیا تھا۔ وہ دل جو اس کی آنکھوں کی روشنی میں کسی ہیرے کی مانند آشکار ہوا تھا۔ وہ دل جو اس کی نرم، شرمیلیں مسکراہٹ کے گوشوں میں چھپا بیٹھا تھا وہ دل۔ کیسے بدل گیا؟ اس دل نے کسی اور نام پر سر تسلیم خم کیسے کیا؟ رافع تو یہ کوشش کر کر کے بری طرح ہار تھا۔ کچھ دیر اس نظروں سے سارا منظر دیکھ کر وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتا اندر چلا آیا جہاں صرف ایک ملازمہ سب گھر والوں کا انتظار کر رہی تھی۔ رافع کو دیکھ کر وہ بچن میں چلی گئی۔ رافع اپنے کمرے میں آکر ٹیلی فون پر ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔ دوسری جانب سے غالباً ”انیقہ نے فون اٹھایا تھا۔“

”ہیلو۔۔۔“
 رافع چند لمحے تذبذب کا شکار ہوا پھر بولا۔
 ”میں۔۔۔ ربیعہ سے بات کر سکتا ہوں؟“

”ربیعہ سے؟“ ”انیقہ کے انداز میں قدرے حیرت در آئی۔ ”جسٹ ہولڈ آن پلیز!“ پھر وہ بولی تھی۔
 رافع خاموشی سے کھڑا سامنے دیوار پر لگی تصویر کو دیکھتا رہا جہاں سورج غروب ہونے کا منظر اداسی پھیلا رہا تھا۔
 اپنے کمرے کی دیوار پر لگی یہ تصویر اسے پہلے کبھی اپنی اداسی نہ لگی تھی۔
 ”ہیلو۔۔۔“ چند ہی لمحوں میں اس کی مترنم آواز سنائی دی تھی۔
 ”رافع!“ وہ آہستگی سے بولا۔

دوسری جانب چند ہی لمحوں کی خاموشی چھائی تھی۔ اگلے ہی بل وہ قدرے شگفتگی سے بولی۔
 ”کیسے ہیں رافع آپ؟“

”آپ۔۔۔ آج تقریب میں نہیں آئیں؟“ وہ آہستگی سے بولا۔

”جی۔۔۔ امی کی وجہ سے میں اور انیقہ گھر پہ ٹھہر گئے۔“

”سنا ہے۔۔۔ کل آپ کے گھر بھی ایک تقریب ہے۔۔۔“ رافع نے خود پر از حد جبر کیا تھا۔

ربیعہ کافی دیر کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

”جی!“ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔ ”اور میں چاہتی ہوں۔۔۔ آپ اور وردہ بھی۔ شریک ہوں اس تقریب میں۔“

رافع نے اپنی آنکھوں میں تیزی سے ابھرتی نمی کو محسوس کیا۔ پھر وہی نمی اس کے حلق میں اترنے لگی۔

”وردہ تو آپ کی دوست ہے۔۔۔ میں کس ناتے؟“

”آپ۔۔۔ وردہ کے منگیتر ہیں!“

”اوس۔۔۔ آئی سی۔۔۔ آپ مجھے وردہ کے منگیتر کی حیثیت سے انوائٹ کر رہی ہیں۔“ رافع نے اپنی ذات کے صحرا میں جیسے دکھ اور تاسف کے بگولے اٹھتے دیکھے۔

”ربیعہ۔۔۔ آپ کو دیکھ کر بالکل احساس نہیں ہوتا۔ کہ آپ اس قدر ظالم ہیں۔“ وہ ٹوٹ کر بولا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی۔ رافع نے اپنے کان کے اس قدر قریب اس کی مدھر ہنسی کو پہلی بار سنا اور شاید آخری باب۔! باوجود شدید ضبط کے اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

”رافع۔۔۔ آپ حقیقت پسندی کو ظلم کے نام دیں تو میں ظالم ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں افسانے اور

حقیقت دونوں کو برتا رہے رافع۔ حقیقت کی جانب آپ پیٹھ کر لیں گے تو وہ گھوم کر پھر سے آپ کے سامنے چلی آئے گی۔ سو آگے بڑھ کر اس کا مقابلہ کرنا ہی عقل مندی ہے۔ آپ نے اپنی زندگی میں صرف چھتیس ہی دیکھی ہیں۔ ابھی آپ کو نفرت سے واسطہ نہیں پڑا اور میں چاہتی ہوں کہ زندگی میں کبھی آپ کو نفرت سے واسطہ نہ پڑے جو آپ سے محبت کرتے ہیں وہ ہمیشہ آپ کی محبت میں مبتلا رہیں۔ تاہم۔۔۔ میں نے اپنی زندگی میں چھتیس بھی دیکھی ہیں اور نفرتیں بھی۔ نفرتیں وہ سوئیاں ہوتی ہیں رافع۔! جو ایک جیتے جاگتے جسم کو برسوں کے لیے سلا دیتی ہیں اور یہ سوئیاں نکلنے کا انتظار بہت طویل اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں۔۔۔ میں جینا چاہتی ہوں مسکراتا چاہتی ہوں۔ مسکراتی میں نے بہت مشکلوں سے حاصل کی ہیں رافع! میں کسی قیمت پر ان کا سودا نہیں کر سکتی۔

وہ بول بول کر تھک سی گئی۔ اتنا بولنا اس کی سرشت نہ تھی۔ وہ بہت کم گو تھی! رافع گم صم سی کیفیت کا شکار تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔
 ”ورہ میری دوست ہے۔“ پھر وہ آہستگی سے بولی تھی۔ ”اس لیے میرے بلانے پر وہ کل ضرور آئے گی۔۔۔ آپ! آپ نجانے آئیں گے یا نہیں؟“ پھر اس نے ریسیور رکھ دیا۔
 رافع چند لمحے اسی طرح ریسیور کان سے لگائے کھڑا رہا پھر ریسیور کان سے ہٹا کر اس نے لبوں پہ عجیب سی مسکراہٹ لیے اسے دیکھا تھا۔
 ”اؤں گا۔“ وہ بیڑیا۔ ”تم پکارو گی۔ تو دنیا کے آخری کونے پر بھی چلا آؤں گا۔۔۔ بے شک۔۔۔ تم نے محض الوداع کہنے کو ہی پکارا ہوا!“



وہ جلدی جلدی ہاتھوں میں چوٹیاں ڈال رہی تھی۔ ماہین نے کمرے میں جھانکا تو حیران رہ گئی۔
 ”بھائی!۔“ وہ اندر چلی آئی ”ابھی تو صرف پانچ بجے ہیں۔“
 اس نے شہلا کی تیاری پر اپنی حیرانی ظاہر کی تھی۔ شہلا چونکی پھر ہنس دی۔
 ”جانتی ہوں ابھی صرف پانچ بجے ہیں اور تقریب ولیمہ رات کے نو بجے ہے۔۔۔ لیکن میں ابھی تقریب نکاح کے لیے تیار ہوئی ہوں۔“
 ”کس کا نکاح؟“
 ”میری بہن۔! ربیعہ کا نکاح ہے آج۔۔۔ سادگی کے ساتھ۔ صرف گھر کے چند افراد کی موجودگی میں یہ فریضہ ادا کیا جا رہا ہے۔“
 ”اچھا۔“ ماہین حیرت سے مسکرائی ”ربیعہ کو میری طرف سے مبارک باد دیجئے گا۔۔۔ اور نوبت تک ضرور لوٹ آئیے گا۔“ میں عربشہ کے ساتھ پارکر جا رہی ہوں۔۔۔ اسے لے کر سیدھی ہال چلی جاؤں گی!“
 ”تم بے فکر رہو۔۔۔ مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی میں اور ہاشم ہال میں پہنچ جائیں گے!“
 ماہین نے ایک محبت بھری نگاہ اپنی خوش ادا، دلکش بھانج پر ڈالی اور دل ہی دل میں اس کے حسن اور شخصیت کو سراہتی ہوئی کمرے سے نکل گئی تھی۔
 اچانک ہی شہلا کو احساس ہوا تھا کہ سائیڈ نیبل پر رکھا ہوا ہاشم کا موبائل مسلسل واہیرٹ کر رہا تھا۔ وہ ذرا سا آگے بڑھی اور اسکرین پر آیا نمبر دیکھنے لگی۔ دوسرے ہی لمحے وہ چونکی تھی۔ اس نے پلٹ کر ڈرائیونگ روم کے بند دروازے کی جانب دیکھا لمحہ بھر کے لیے سوچا پھر موبائل اٹھا کر آن کیا تھا۔

”ہیلو۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔
 دوسری جانب حیرت بھری خاموشی چھائی پھر آواز آئی تھی۔
 ”ہیلو۔ شہلا!“
 ”آپ کو اس نمبر پر فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی ابرا صاحب؟“ وہ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ابرا قد رے
 محتاط ہو کر کھٹکھار اٹھا۔
 ”شہلا۔! میں ہاشم سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 ”نہیں ابرا۔۔۔“ وہ دفعہ ”بہت سہولت سے بولی۔“ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں!“
 ”اوپس۔ یہ تو میرے لیے بہت مبارک خبر ہے۔“ اس کے لہجے میں چکار آئی۔ ”کب کہاں کیونکر۔۔۔“
 شہلا نے لمحہ بھر کے لیے سوچا۔
 ”پرسوں۔۔۔“ پھر بولی۔ ”شام پانچ بجے۔۔۔ جگہ میں تمہیں گھر سے نکلنے سے قبل بتا دوں گی۔“
 ”سونا کس آف ہو میم۔۔۔“ وہ ہنسا۔ ”مجھے نہیں آتا بیچ کا وقت کیسے گزرے گا!“
 شہلا نے رابطہ منقطع کر دیا۔ پھر وہ پلٹی اور تھم گئی۔ ہاشم اس کے عین پیچھے کھڑا تھا۔
 ”یہ میری کاڑ تم کب سے اینڈ کرنے لگیں؟“ وہ مسکرایا۔
 ”تمہیں اعتراض ہے؟“ شہلا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”تم من دو تو کا فاصلہ مٹاؤ اور میں معترض ہوں ایسا ممکن ہے؟“
 وہ اس کے قریب ہوا۔ شہلا نے جینٹ کر اسے دھکیلا تھا۔
 ”دیر ہو رہی ہے۔۔۔“



پنک اور سی گرین کنٹراسٹ کا بیش قیمت اور خوب صورت سوٹ زیب تن کیے ’سی گرین‘ موتیوں سے مرصع
 نازک سائیٹ پین گریج سنور کر جب اس نے آئینہ دیکھا تو حیران ہی رہ گئی۔ اس ’ربیعہ‘ سے تو اس کی آج تک
 ملاقات نہ ہوئی تھی۔ یہ ربیعہ جو آئینے میں نظر آئی تھی بے تحاشا حسین۔۔۔ نازک اندام۔۔۔ خوش انداز یہ لڑکی
 نجانے کون تھی۔
 ”تمہاری تصویریں کسی میگزین میں لگ جائیں تو میں پاکستان کی نمبرون یو ٹیشن مشہور ہو جاؤں۔۔۔“ انہی نے
 اسے تیار کیا تھا اور اب اپنی مہارت پر خود بے حد حیران تھی۔
 ربیعہ نے مسکراتا چاہا۔ پھر اسے محسوس ہوا اس کے لب مسکرانے پر آمادہ نہ تھے۔ اس کا دل ایک جامد سی
 کیفیت کا شکار تھا۔

انہی نے اب کیمرہ اٹھا کر دھڑا دھڑا اس کی تصویریں بنارہی تھی۔
 ”میں بہت اکیسا اینڈ ہو رہی ہوں ربیعہ! کہ میں نے تمہیں تیار کیا ہے اور تم اتنی حسین لگ رہی ہو۔ وہ رزلٹ
 دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ مشیر حسن پرسوں کی فلاٹ سے جا سکیں گے۔ آج تمہارا یہ
 روپ دیکھتے ہی وہ اپنی فلاٹ کی سنسل کروالیں گے۔“
 اس نے شرارت سے اسے چھیڑا تھا۔ ربیعہ محض اس کا دل رکھنے کے خیال سے مسکرا دی۔
 اسی لمحے کمرے میں منہ زدہ یکدم داخل ہوئی تھیں۔۔۔ وہ بہت تھکی تھکی، زخمیہ اور بیمار نظر آتی تھیں۔ ربیعہ
 کے قریب آکر وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہیں۔ ربیعہ سے نظریں اٹھانا محال ہو گیا۔ اسے لگا ان کا چہرہ دیکھتے ہی وہ ان

سے لپٹ جائے گی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گی۔
منہ ذہن بیگم نے اسے بازوؤں سے تھاما اور کچھ دیر دیکھتی رہیں۔
”سدا رکھی۔۔۔ آباد ہو۔“ پھر وہ جیسے سرگوشی میں بولی تھیں۔۔۔ ”ہمیشہ خوشیوں اور پھولوں سے بھرا رہے
دامن۔ اس پیشانی پر کبھی غم و فکر کی ہلکی سی شکن نہ پڑے۔ یونہی نور کے ہالے میں چمکتی رہے۔“
پھر انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ رعبہ کے لب کپکپائے پلکیں لرزیں لیکن اسے اپنے اندر اٹھتے جوار
بھائے کو صدفوں میں رکھنے کا سلیقہ آتا تھا۔



وہ گوگلی سی کیفیت کا شکار ہوئی بیٹھی تھی۔ حالات نے یکایک جس طرح پلٹا کھایا تھا۔ اس کے لیے ایک
ناقابل فہم سی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔
”وہ کس طرح سے ایسا کر سکتی ہے۔۔۔ کیونکر۔“ وہ بار بار الجھتی تھی۔
ورڈ نے نظروں کا زاویہ بدل کر کھڑی کو دیکھا جو ساڑھے پانچ بج رہی تھی۔
”رات عریضہ اور نافع کاؤ لیمہ ہے۔۔۔ تمہیں جلدی واپس آنا ہے۔ فائٹ تیار ہو جاؤ۔“ وہ کتنی بھولی آگے
بڑھ گئی تھی سورہہ اسی شمس کیفیت کا شکار ہوئی بیٹھی رہی۔
اچانک دروازے پر مدھم سی دستک نے اسے چونکایا تھا۔ پھر دروازے کی سمت دیکھ کر وہ بے اختیار کھڑی ہو
گئی۔ وہاں رافع کھڑا تھا۔

”آپ۔۔۔“ وہ بے ساختہ بولی۔ ”آئیے۔“
وہ چند قدم بڑھا تھا۔ ہلکی ہلکی لائٹنگ والی آف وہائٹ شرٹ اور بلیک پینٹ میں ملبوس رافع کا چہرہ بیمار اور اترا
ہوا محسوس ہوتا تھا۔ حالانکہ پچھلے دنوں تو اترا سے ہونے والی تمام تقریبات میں وہ بے حد فریٹش اور زندہ دل محسوس
ہوا تھا۔

”تم تیار نہیں ہو تم؟“ وہ سپاٹ لمحے میں بولا۔
”آپ۔۔۔ وہاں جا رہے ہیں؟“ اس کے نیچے میں ہلکی سی حیرانی تھی۔
”ہاں۔۔۔ میں اور تم دونوں جا رہے ہیں۔ تیار ہو جاؤ۔“
نجانے کیوں سورہہ نے کسی ردیوٹ کی مانند اثبات میں سر ہلایا تھا۔
رافع باہر نکل گیا۔ سورہہ نے لباس تبدیل کرنے اور بال بنانے میں صرف دس منٹ لگائے تھے۔ پھر وہ دونوں
ساتھ ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھ گئے تھے۔



عباد کے ساتھ نکاح کے کانڈاٹ کے ساتھ الجھا ہوا ہاشم بری طرح سے چونکا تھا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے
پر رافع کو دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
”ارے رافع بھائی۔۔۔“ عباد بھرپور خوشی سے بولا ”زبردست۔۔۔ آپ نے تو ہماری سادہ سی تقریب کو چار چاند
لگا دیے۔۔۔ آئیے ٹاپلیز!“
رافع سے مصافحہ اور معانقہ کر کے اس نے رافع کو ہاشم کے برابر بٹھایا۔ رافع نے ہاشم کو دیکھا وہ گردن موڑے
اسی کی جانب متوجہ تھا۔ رافع کے لبوں پر مدھمی آفسر سی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔ ہاشم نے اپنا بائو اس
کے کانڈھے کے گرد لپیٹا۔ باہر گاڑی کا ہارن بجاتا تو عباد چونکا تھا۔

”میرا خیال ہے وہ لوگ آگئے۔ آئیے ان کا استقبال کرتے ہیں۔“ عباد کے انداز میں بے حد خوشی اور گرم جوشی تھی۔ ہاشم اور رافع بھی اٹھ کر اس کی پیروی میں باہر کی جانب بڑھے تھے۔

امیر حسن کے ساتھ شہیار احمد اور چند قریبی دوست تھے۔ خوب صورت کڑھائی والے بلیک کرتا شلوار میں لمبوس امیر حسن بے حد خوش تھا۔ شہیار احمد ایک وجیرہ مگر نو عمر جوان لگتا تھا۔ عباد کے علاوہ ہاشم اور رافع نے بھی ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔

کچھ ہی دیر میں نکاح کی رسم کا آغاز ہوا۔

”میں ربیعہ کی جانب سے گواہ ہوں۔“ شہیار احمد نے کہا تھا۔

”میں۔۔۔ امیر حسن کی جانب سے۔۔۔“ عباد نے مسکرا کر کہا پھر اس نے رافع کو دیکھا۔ ”ربیعہ کی جانب سے دوسرا گواہ رافع بھائی ہوں گے۔ اور امیر حسن کی جانب سے ہاشم بھائی۔ ٹھیک ہے نا۔“ رافع اور ہاشم نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ رافع آہستگی سے بولا۔

پھر اس نے نظر اٹھا کر امیر حسن کو دیکھا۔

”میں گواہ ہوں گا۔ اور میں گواہی دوں گا امیر حسن۔ کہ میں نے اس کی ہر تمنا۔ ہر خیال سارے تصور۔۔۔ ساری چاہتیں سارے جذبات تمہیں سونپے۔ وہ تمہاری بیٹی۔ اس سے محبت کرنے کا حق صرف تمہارا ہوا۔۔۔ اسے دیکھنے۔۔۔ سوچنے بچھونے کا حق صرف تمہارا۔ یہ دل اس کے تصور سے بھی دستبردار ہوتا ہے کہ اس میں اس پار ساقی تو بہن ہوئی ہے۔“

ہاشم کا ہاتھ رافع کے زانو پر دھرا ہوا تھا۔ دفعنا ”ہاشم نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ایک قطرہ گرنا محسوس کیا۔ اس نے رافع کے زانو پر دباؤ ڈالا۔ رافع نے دھیرے سے سر ہلایا تھا۔



بہت اطمینان اور آسانی سے اس نے تین مرتبہ دھیرے سے۔۔۔ مگر مضبوطی سے ”ہاں“ کہا تھا اور وہ کسی کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ ربیعہ امیر حسن بن گئی تھی۔

منہجہ بیگم، شہلا، انقیہ، ترانہ اور وردہ اس کو گلے لگا کر مبارکباد دے رہی تھیں۔ ربیعہ چہرے پر سکون اور خاموشی لے لے ان سے دعائیہ کلمات وصول کر رہی تھی۔

”ربیعہ۔۔۔“ ترانہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامے کہہ رہی تھی۔ ”تم سے متعلق میری جتنی دعائیں تھیں۔۔۔ خدا نپاک نے وہ سب کی سب قبول کر لیں۔ میں آج بہت خوش ہوں ربیعہ۔“

ربیعہ دھیرے سے مسکراتی تھی۔ وردہ یک ٹک اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ربیعہ کی نگاہ بار بار اس سے ٹکراتی تھی۔ اسے وردہ کی نظروں میں پوشیدہ بے چینی، بے قراری اور سوالیہ نشان صاف نظر آرہے تھے۔ جواب میں صرف ایک مبہم سی مسکان تھی جو لبوں کے گوشوں میں چھپی ہوئی تھی۔

کھانے کے انتظامات کے سلسلے میں شہلا، انقیہ اور ترانہ ادھر ادھر ہوئی تھیں تب وردہ نے لب کھولے۔

”یہ سب کیا ہے ربیعہ؟“

”وہی۔۔۔ جو میں نے تم سے کہا اور تم نے اس کا یقین نہ کیا۔ میں نے کہا تھا نا۔۔۔ میں انکی جگہ ہوں تم نہیں

مانیں۔۔۔ دیکھ لو میں نے بچ کہا تھا۔“

”لیکن رافع۔۔۔“ وردہ کے لب کانپے۔

”رافع بہت اچھے انسان ہیں ورہ۔“ ربیعہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”ان کی جوڑی تمہارے ساتھ بنی ہے۔۔۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہو۔۔۔ میری دعا ہے کہ تم دونوں کا ساتھ بہت مضبوط بہت محبت بھرا بہت طویل اور خوب صورت ہو۔“

ورہ اداسی سے مسکرائی۔

”ایسی دعا میں مت کہو ربیعہ! جن کا پورا ہونا ممکن ہی نہ ہو۔“

”میری دعا کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ورہ۔۔۔“ ربیعہ مضبوط لہجے میں بولی ”میری دوست ہو تم۔۔۔ دوست تو۔۔۔ دوستی کی خاطر۔۔۔ آنکھ بند کر کے کھائی میں بھی چھلانگ لگا دیتے ہیں۔۔۔ تمہارے ہی الفاظ ہیں نا۔۔۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم اپنے الفاظ کو ثابت کر سکو۔۔۔ اگر میں تم سے ایسا چاہتی ہوں تو تمہیں ایسا ہی کرنا ہو گا۔“

ورہ نے بے حد بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔



”ربیعہ! امیر حسن تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“ عباؤ اس کی پاس آیا تھا۔

ربیعہ نے سر اٹھا کر حیرانی سے عباؤ کو دیکھا پھر سر جھکا لیا۔

عباؤ خاموشی سے باہر چلا گیا تھا۔ چند لمحوں بعد امیر حسن اور شہیار احمد اندر داخل ہوئے تھے۔ ربیعہ بے اختیار کھڑی ہوئی۔ امیر حسن اپنی جگہ ٹھہر گیا جبکہ شہیار احمد آگے بڑھا تھا۔

اس نے ربیعہ کے ہاتھ تھامے اور مسکرایا۔

”آپلی۔۔۔ آپ میری آپلی ہیں نا؟“ وہ شفاف نظریں اس کے چہرے پر جمائے پوچھ رہا تھا۔ ربیعہ اب تک نہ روئی تھی۔ اچانک ہی اس کے کانڈھے سے سر ٹکا کر رو پڑی۔

شہیار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کا چہرہ اٹھا کر اس کے آنسو صاف کیے۔

”مت روئیں آپلی۔۔۔ رونے کے موسم گزر گئے ہیں۔ اب تو صرف ہنسنے اور مسکرانے کے دن ہیں۔ آپ اپنی مای سے جدا ہو کر اپنے باپ اور بھائی کے قریب رہیں گی۔ ہر طرح کی فکر اور اندیشے سے خود کو آزاد کر لیں۔“

”قربت داری میں خانگسار کا نام بھی شامل کر لیں تو کوئی حرج نہیں۔۔۔“ امیر حسن مسکراتا ہوا آگے بڑھا تھا۔

شہیار ہنس دیا۔ ربیعہ بھی دھیمے سے مسکرا دی تھی۔

”چلیں آپ لوگ باتیں کیجئے۔۔۔ میں امی کے پاس بیٹھتا ہوں۔“ شہیار مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر وہ باہر کی جانب بڑھ گیا۔

امیر حسن ہولے سے کھنکار کر اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔ ربیعہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا۔

”ربیعہ!“

ربیعہ نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں میٹھیں اور مہمان تھیں۔

”نئے ساتھ کی ابتدا مبارک ہو۔“ وہ اس کے سر پرے کو نظروں میں جذب کرتا ہوا بولا تھا۔

”میرے جذلوں کو پذیرائی عطا کرنے کا شکریہ۔۔۔ آپ کی یہ نوازش عمر بھر اس دل پر جلی حروف میں لکھی رہے گی۔“

ربیعہ نے بے ساختہ حیران نگاہیں اٹھائی تھیں۔۔۔ بے حد کوئل اور اچھوتے پن سے وہ اپنے جذلوں کا اظہار کر رہا تھا امیر حسن نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”میں پرسوں یو کے جا رہا ہوں، ہاں کام تو خیر کیا خاک کروں گا۔ ساری توجہ سارا ارتکا تو یہاں چھوڑ جاؤں گا۔ آپ کے پاس۔ آپ کے کاغذات تیار ہونے میں جتنا وقت لگے گا میں ایک ایک سیکنڈ بھی گن کر گزاروں گا۔“ اس کے ہاتھ میں ربیعہ کا ہاتھ لرزنے لگا تھا۔ اس کی ہتھیلی بھگ گئی۔ امیر حسن ہولے سے ہنس دیا۔ ”آپ۔۔۔ کچھ نہیں کہیں گی؟“ وہ فوراً شوق سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ ”نہیں!“ اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

امیر حسن مسکرا دیا۔ ”آپ کی تین مرتبہ والی ”ہاں“ کے بعد اب ہر ناں منظور ہے۔“ ربیعہ نے لب بھینچ کر مسکراہٹ روکی تھی۔ ”لیکن آپ سے ”ہاں“ کہلوانے کے کئی طریقے مجھے بھی آتے ہیں۔ مثلاً۔۔۔“ ربیعہ نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔

”میں اب جاؤں؟“ ربیعہ نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دیکھا آپ نے۔۔۔“ وہ زور سے ہنس دیا تھا۔ ربیعہ بری طرح سے جھینپ گئی۔ امیر حسن نے اس کا ہاتھ چھوڑنے سے قبل آہستگی سے لبوں سے لگایا۔ ”آپ کی یہ حیا۔۔۔ اور کم آمیزی۔۔۔ فی الوقت یہیں تک آنے کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن خدا را۔۔۔ میرے حال پر ترس کھائیے گا۔ کاغذات بننے کے بعد ایک دن کی دوری کی اجازت نہیں ہوگی۔ ٹھیک ہے نا؟“ ربیعہ نے سر جھکا لیا۔ ”جلدی آجانا ربیعہ ایلینز۔“ وہ اس کے کان کے قریب گنگنایا تھا۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ ”خدا حافظ۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے پلٹ گیا۔ ”خدا حافظ۔!“ ربیعہ نے اس کی پشت کو دیکھ کر آہستگی سے کہا تھا۔



بست سے چمکتے چہروں کے درمیان وہ تنہا اور اداس تھا۔۔۔ ہنستے مسکراتے نفوس اس کے ارد گرد سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان اس طرح چل رہا تھا جیسے اس کی کوئی پہچان، کوئی شناخت نہ ہو، کوئی اسے جانتا ہو نہ وہ کسی کو جانتا ہو۔

”رائف۔۔۔“ ایقان نے دفعاً ”اے بکا را تھا۔

رائف کسی معمول کی مانند اس آواز پر ٹھہرا۔ چمکتی مہکتی ایقان کی نظروں میں بے اختیار سی جیرانی تھی۔ ”ایسے خاموشی سے، یوں سنجیدہ سی شکل بنا کر کہاں سے آرہے ہو۔۔۔ کچھ دیر پہلے سب تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

رائف کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔

”پھپھو۔۔۔ آپ خوش ہیں نا؟“ اس کے سوال نے ایقان کو حیران کر دیا۔

”ہاں۔۔۔ بہت!“ اس کا اعتراف بھرپور تھا۔

”خوش رہیں۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔“ اس نے محبت سے اس کا گال تھپتھا کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔

ایقان نے نہایت چرائی سے اس کی پشت دیکھی تھی۔
پاس سے گزرتے ہاشم نے دفعتاً ”راغب کا بازو تھام لیا تھا۔ راغب رک کر اسے دیکھنے لگا۔
”ہاشم۔“

اس کی نظروں میں عجب سی وحشت اور ویرانی تھی۔ ہاشم رہ نہ پایا اس نے راغب کو گلے سے لگا لیا۔
”ہاشم۔ تم خوش ہونا؟“
ہاشم خاموشی سے اس کی پشت تھپکتا رہا۔

”سب لوگ خوش رہیں ہاشم! اور میں بھی بہت خوش ہوں۔ مجھ پر ترس مت کھاؤ۔ کمزور مت سمجھو مجھے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ حقیقتوں کا سامنا کیسے کیا جاتا ہے۔ مسکرا کر خندہ پیشانی سے مردانہ وار۔ وہ بہت بہادر ہے ہاشم! اتنی بہادر جتنی وہ نازک ہے اس نے مجھے بہادر بننا سکھایا ہے جینا سکھایا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مسکراتا سکھایا ہے۔ میں اس کا احسان مند ہوں۔ ہمیشہ رہوں گا۔“
ہاشم نے الگ ہو کر اس کا چہرہ دیکھا۔

”ابھی بھی بہت فرق ہے راغب۔“ پھر وہ بولا ”میں ابھی اس سے مل کر آ رہا ہوں۔ اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان ہے۔ آنکھوں میں نہ حتم ہونے والا یقین اور اعتبار۔ اور گفتگو میں ربط اور ٹھہراؤ۔ تمہاری آنکھوں میں وحشت ہے۔ چہرے پر بایوسی اور گفتگو میں بے ربطی کیا سیکھا تم نے اس سے؟“
راغب ٹھٹک سا گیا۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتا رہا۔

”ٹھیک کہتے ہو تم ہاشم۔“ پھر وہ آہستگی سے بولا ”محبت وحشت کا جنگل نہیں ہے۔ یہ وہ دیوانگی ہے جو زندگی گزارنے کا سلیقہ بخشتی ہے۔ وہ گداز بخشی ہے دل کو۔ کہ دو سروں کے دکھوں پر رونو اور دو سروں کی خوشیوں پر مسکراتا آ جاتا ہے۔“
ہاشم یک لخت کھل کر مسکرایا۔

”میرا دوست تو بچ میں بدل گیا۔ واہ رے محبت۔ تجھے سلام!“
راغب دھیمے سے مسکرایا تھا۔

رنگ دیو کی محفل میں خوشیوں کی پریاں ہنستی مسکراتی پھر رہی تھیں۔ ہر چہرے پر اطمینان اور مسکراہٹ تھی۔ وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے اسبج کی طرف بڑھ گئے۔



کمرے میں داخل ہو کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا پھر خاموشی سے ڈرنک روم کی جانب بڑھا تھا۔
بیچ پر بیٹھی عریشہ نے اس کی پشت کو دھیمے سے مسکا کر دیکھا تھا۔ چند دن پہلے ایسی ہی ایک مسکرتی رات اس کی بے وقوفی کی نذر ہو چکی تھی۔ ایسی بڑی حماقت کی۔ کہ نافع جیسا حوصلہ مند ہی اس کا تحمل ہو پایا تھا۔ ایسی بے وقوفیاں جو زندگی بھر کے تاسف اور پچھتاؤں کا سبب بن جایا کرتی ہیں عریشہ بحفاظت اس شرری بلند ہوتی لیٹوں سے باہر نکل آئی تھی تو نافع کے طرف کی بدولت۔ وہ اس کا سناٹا بن گیا تھا۔ اس کا محافظ۔ ہاں اس سے کچھ ناراض ضرور تھا لیکن آج وہ اس کی ہر ناراضی دور کر دینے کا تہیہ کیے بیٹھی تھی۔

نافع لباس تبدیل کر کے باہر آیا۔ نظروں میں الجھن بھر کر اس نے بیڈ کے پیچوں بیٹھی ”دلن“ کو دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر وہ گلی کی جانب مڑنے دروازے کی جانب بڑھا۔ شاید عریشہ کے سونے کا انتظار وہ کمرے سے باہر جا کر کرنا چاہتا تھا۔

”نافع!“ یکایک اس کی مترنم آواز پر وہ پلٹا تھا۔ ”مجھے کچھ کہنا ہے۔“

”ہاں۔۔۔ بولو۔“

”یہاں آؤ۔“ وہ مسکرائی۔

نافع کو اس کی وہ دلکش مسکراہٹ اپنی کسی گم گشتہ قیمتی متاع کی مانند لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تھا۔ عریشہ بیڈ سے اتری پھر اچانک جھک کر اس نے نافع کے پیر تھام لیے۔

”نافع۔۔۔ مجھے معاف کرو۔۔۔ پلیز۔“

نافع نے کھلی کی سی تیزی سے جھک کر اسے اٹھایا۔ عریشہ تڑپ کر اس کے سینے سے لگی تھی۔

”نافع۔۔۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے کہنے کے لیے۔۔۔ بس اتنا کہ مجھے معاف کرو۔“ وہ گلو کی رلجے میں بولی تھی۔ ”نئی زندگی کی شروعات اس طرح سے کرو کہ ہمارے درمیان یقین، محبت اور اعتبار کے سوا کچھ نہ ہو۔۔۔ کوئی جگہ، شکوہ، شکایت بے یقینی۔۔۔ خفگی ناراضی کچھ بھی نہیں۔“

نافع نے اسے الگ کر کے اس کا چہرہ دیکھا۔

”مجھے کوئی بے یقینی۔۔۔ خفگی ناراضی نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔ ”ہاں کچھ شکوے ضرور ہیں مجھے میرے

اس حق سے کیوں محروم کر رہی ہو؟“

”جس سے تمہیں گلے شکوے تھے نافع۔۔۔ وہ عریشہ شادی کی رات اس سچ پر مر چکی ہے۔۔۔ جو تمہارے سامنے ہے۔۔۔ اس عریشہ سے گلے شکوے کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔۔۔ کیونکہ یہ سر سے پاؤں تک صرف تمہاری ہے ہمیشہ سے ہمیشہ کے لیے۔“

نافع اس کی خوب صورت وضاحت پر مسکرائے بنانہ رہا۔

”تم کتابی بچو۔۔۔ میں نے وہ سارے گلے شکوے ضرور کرنے ہیں۔ جو نجانے کب سے دل کے اندریوں براجمان ہیں کہ محبت کو جگہ تھوڑی بڑتی ہے۔“

وہ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر بولا۔ عریشہ کھلی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”ان بے چاروں کے کہنے سننے سے اس رات کی خوب صورتی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ وہ مزید بولا۔ ”کیونکہ

محبت جس چیز میں مل جائے اسے خوب صورت بنادیتی ہے۔۔۔ ہے نا؟“

عریشہ مسکرا دی۔۔۔ نافع بھی مسکرا دیا۔ سچ پر بکھرے پھول بھی مسکرا دیے تھے۔



دونوں ہاتھ کر پر رکھے، وہ شوریدہ سر لہروں کو اپنے قدموں تک آکر دم توڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آج بھی اس کے انداز میں وہی غرور اور طظن تھا۔۔۔ نہ بھٹکنے والی کیفیت تھی۔

”ابرا صاحب!“ شملانے اسے قدرے فاصلے سے پکارا۔ وہ اچانک ہی مڑا۔

”اوہ۔۔۔ تم آگئیں!“ وہ پھر پورا انداز میں مسکرایا۔

پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ اس کے قریب چلا آیا۔

”کتنی مرتبہ کہا تمہیں۔۔۔ یہ گلاسز مت پہنا کرو۔“ وہ اس کے سیاہ گلاسز دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

”اپنے اور تمہارے درمیان مجھے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔“

”میرے اور آپ کے درمیان صدیوں کا نواری فاصلہ حائل ہے ابرا صاحب۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

”اسے پاشانا ممکن امر ہے۔“

”ایسے مت کہو شہلا! یلیز۔۔۔“ وہ تڑپ سا گیا۔ ”میں تو سمجھا تھا تم مجھے ہر فاصلہ ختم کر دینے کی نوید سناؤ گی۔۔۔ وہ الفاظ جو سننے کے لیے میں۔۔۔ نجانے کب سے۔۔۔ تنہائی کے صحرا میں بھٹک رہا ہوں۔“ شہلا گلاسز کے پیچھے سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کے لب آپس میں سختی سے پوسٹ تھے۔۔۔

”مسٹر ابرار۔۔۔“ پھر وہ بولی ”آج میں بیس سال کی کم فہم اور جذباتی دو شیرہ نہیں ہوں۔۔۔ میں ایک باشعور عورت ہوں۔۔۔ جو الفاظ اور عمل میں فرق بخوبی محسوس کر سکتی ہے۔ تم نے مجھے طلاق دی۔ جذباتی ہو کر، بجلت میں، غصہ میں۔ چلو! میں مان لیتی ہوں پھر تم نے پلٹنے میں اتنا عرصہ لگایا اتنا کہ تمہارا بیٹا اپنے قدموں پر چل کر بولنا سیکھ گیا۔ تمہارے بارے میں استفسار کرنا سیکھ گیا۔ اتنا عرصہ کہاں تھے تم؟ جو گی بن کر تمہارا پائے رہے؟ وحشی بنے جنگلوں کی خاک چھانٹتے رہے؟ نہیں ابرار۔۔۔ تم اپنے ماں باپ کے اس دنیا سے نزر جانے کا انتظار کرتے رہے۔“

”شہلا۔۔۔“

”میری بات سنو ابرار۔۔۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ آج میں کچی عمر کی لڑکی نہیں ایک سمجھ دار عورت ہوں۔ ہر قسم کے حالات کا تجزیہ کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم نے اپنے باپ کی زندگی میں بغاوت کیوں نہ کی کیونکہ شادی کے ابتدائی چند مہینوں کا عرصہ ان کی کفالت کے بغیر گزار کر تمہیں ان کی اہمیت کا پوری طرح اندازہ ہو چکا تھا۔ سو میرے ساتھ رکھے گئے ناروا سلوک پر بھی تمہاری زبان خاموش رہی اور مجھے طلاق بھیجتے وقت بھی تم نے ان کے پلڑے میں رکھے ہوئے زمین و جانیدار کے وزن سے میری محبت کے وزن کو ہلکا اور بے مول تصور کیا۔۔۔ جب تک وہ زندہ رہے تم نے کبھی مجھے توٹیا اپنے اس بیٹے کو بھی یاد نہیں کیا جس کی محبت کو آج تم اپنی زندگی کے لیے لازمی جز قرار دیتے ہو۔ اب تم آزاد ہو ابرار! تو ایک بار پھر میرے وجود کو محبت کے نام پر اپنی سچی میں قید کر لینا چاہتے ہو۔“

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لیے رکی۔ ابرار حیرت سے پھیلی آنکھیں لیے اسے یک ٹک دیکھ رہا تھا۔

”لیکن اب میں محبت کو پہچانتی ہوں۔۔۔ اس کی خوشبو اس کی دلکشی۔۔۔ اس کے تقاضوں کو بخوبی سمجھ لیتی ہوں۔۔۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میرے شوہر نے مجھ سے سچی محبت کی ہے۔ ایسی اصلی اور سچی محبت جس کے چہرے پر غرض اور کھوٹ کا کوئی نقاب نہیں۔ جس کی روشنی سے زندگی کی نظائیں خیر ہو جاتی ہیں۔ جس کا ذائقہ چکھ لینے کے بعد میں قیامت تک کے لیے آسودہ اور مطمئن ہوں۔۔۔ سو اب تم مجھے پکارو یا بوس ہو کر پلٹ جاؤ۔۔۔ میرے لیے برابر ہے۔ میرے پاس وہ ساعت ہی نہیں جو تمہیں سن سکے اور وہ گویائی ہی نہیں جو تمہاری کسی پکار کا جواب دے پاتی۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہمارے درمیان یہ آخری وضاحت ہے۔۔۔ میں تمہارے اندر کے کھوٹ کو پہچانتی ہوں ابرار۔۔۔ اس یقین دہانی کے بعد آئندہ مجھ سے نظرت ملانا ہاں ہمارے درمیان رابطے کی ایک کڑی ضرور موجود ہے۔ لیکن اس کڑی کے سروں کو آپس میں کچھ نسبت نہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا۔۔۔ عمر کے حوالے سے جب بھی ہماری ملاقات ہوگی اس میں ہمارے درمیان پہچان کا کوئی حوالہ نہ ہوگا۔“

ابرار خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک دم پلٹا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا دور جانے لگا۔ بالآخر وہ دور ہوتے ہوئے ایک نقطے کی سی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ شہلا کافی دیر وہاں کھڑی اپنے پیروں سے لپٹی لہروں کو محسوس کرتی رہی۔

”چلیں؟“ چانک کوئی بے حد قریب سے بولا تھا۔

وہ بے اختیار پلٹی۔

”ہاشم آپ! یہاں؟“ وہ نجانے کب سے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

”ہاں۔۔۔ میں یہاں۔۔۔ تم جہاں کہیں بھی ہوتی ہو۔ محبت مجھے آواز دے لیتی ہے۔۔۔ میں مجبور ہوں۔“ وہ دکاشی سے مسکرایا تھا۔ شہلانے گلا سزا کر ہاتھ میں تھام لیے اور اسے دیکھ کر مسکرائی۔
اس کے اور ہاتھم کے درمیان کچھ حائل ہوتا۔۔۔ اسے گوارا نہ تھا۔



وہ پورے ایک ہفتے کے بعد لوٹا تھا لیکن اس کے چہرے پر بے بسی اور تازگی تھی۔
”سب کام نمٹا کر آ رہا ہوں۔۔۔“ عباد نے ربیعہ کو فائل تھما لی۔ وہ نواب شاہ سے ربیعہ کی ملکیت کا دعوا دائر کر کے اور اس کے مکان اور دکانوں کے کاغذات حاصل کر کے آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا ربیعہ کے نام جو کچھ ہے اسے مل سکے۔ ربیعہ نے فائل کھول کر دیکھی۔۔۔ کاغذات پر ایک نظر ڈالی اور اداسی سے مسکرائی۔
”میں نے تو آپ کو منع کیا تھا عباد بھائی۔“ وہ بولی ”مجھے ان چیزوں کی تمنا نہیں اور ضرورت بھی نہیں۔“
”یہ تمہارا حق ہے ربیعہ بیٹی۔“ منیزہ بیگم نقاہت سے بولیں۔ ”اپنا حق حاصل ضرور کرو۔ پھر خواہ اسے رکھو یا کسی غریب کو بخش دو۔“

”عباد بھائی۔۔۔“ ربیعہ نے اچانک فائل اسے واپس تھما دی۔ ”مجھے اس گھریا ان چند دکانوں کی قطعاً حاجت نہیں۔ یہ دادی کی ملکیت تھیں دادی ہی کو ان کی ضرورت ہے۔“
”تمہاری۔۔۔ دادی کو؟“ عباد نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔
”جی ہاں!“ ربیعہ نے اپنی پلگوں پر چمکتے ستارے محسوس کیے۔ ”میری دادی کو۔۔۔ میں چاہتی ہوں عباد بھائی کہ پیہ سب کچھ کسی ٹرسٹ کو دے دیں تاکہ یہ صدقہ جاریہ بن کر ان کے عذاب میں تخفیف کا باعث بنے۔“
”ربیعہ!“ منیزہ بیگم کے لب کانپنے لگے۔

”جی امی۔۔۔“ ربیعہ بے اختیار ان سے لپٹ گئی۔ ”میری دادی اس جہان میں خوش نہیں ہیں۔ میں جانتی ہوں۔ آپ کی ممتا کی پیاس نے ان کی روح کو پتے صحرا میں بھٹکتے رہنے کی سزا سنائی ہے۔ لیکن امی جی! دادی نے مجھے ہمیشہ محبت کے دریا سے سیراب رکھا۔ اس طرح کہ میں نے عمر کے اس حصے میں ممتا کی طلب کو بھی محسوس نہ کیا۔“

منیزہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو چلے۔

”امی جی۔۔۔ امی جی۔۔۔ ہو سکے ہو سکے تو میری دادی کو معاف کر دیں امی جی۔“ ربیعہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ منیزہ بیگم کی بند پلگوں سے موتی کی سیخ کے دانوں کی مانند گر رہے تھے۔
”امی جی۔۔۔ میری دادی۔۔۔ بہت عذاب سہہ چلیں۔۔۔ اب میری خاطر آپ انہیں معاف کر دیں۔“ ربیعہ تواتر سے کہے جا رہی تھی۔
منیزہ بیگم کا کپکپا ہا ہاتھ اس کی پشت تھپکنے لگا۔



ایک ماہ کے اندر اندر اس کے کاغذات تیار ہو گئے تھے۔ وقت روانگی آپہنچا تھا۔ عباد اس کے اور شہر مار کے تھکنس کنفرم کروا کر لوٹا تو ماحول سو گوار سا ہو گیا۔ منیزہ بیگم بے حد کمزور ہو چکی تھیں۔ اب بستر سے اٹھنا بھی ان کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ ربیعہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ بتانا چاہتی تھی سو ہر وقت ان کے قریب ہی موجود رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ان کے قریب بیٹھی ان کا سر آہستہ آہستہ دبا رہی تھی۔ ان کی آنکھوں سے بار بار قطرے پھسلتے۔ ربیعہ خاموشی سے انہیں صاف کر دیا کرتی تھی۔



ایئر پورٹ پر معمول کی گھبراہٹ تھی۔ ربیعہ کو الوداع کہنے کے لیے کئی چہرے موجود تھے۔ شہلا، ہاشم، انیقہ، عباس، دہیل، پیسیر منہذہ بیگم۔۔۔ زانا، عبدالباری، فراز، ناعمہ اور سب سے مل کر اس نے وردہ کو دیکھا تو اسے خوشی آمیز حیرت نے گھیر لیا۔

”ورودہ۔۔۔“ وہ اس سے لپٹ گئی۔ ”تم نے تو مجھے حیران ہی کر دیا۔“
 ”کیوں۔۔۔“ وہ پُر غم آنکھوں سے مسکرائی۔ ”مجھے دوست نہیں سمجھتیں؟“
 ربیعہ نے ناقابل فہم سی مسکان کے ساتھ اس کا چہرہ دکھا۔
 ”تم جانتی ہو ورودہ! میں تمہیں کیا سمجھتی ہوں! بہت چاہتی ہوں میں تمہیں۔۔۔“
 ایسے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ورودہ کے ہاتھوں کو اس نے دھیرے سے دبا یا۔

”اور میں چاہتی ہوں کہ تم زندگی سے اپنے حصے کی ساری خوشیاں حاصل کرو۔“ دونوں بے اختیار لپٹ گئیں۔ پھر سب سے باری باری مل کر۔ باری باری خدا حافظ کہہ کر وہ اور شہرہ ارشد لاؤنج میں داخل ہو گئے تھے۔ ان کے اندر چلے جانے کے بعد ہر نظر اٹکبار ہو گئی۔ سب ہی اپنے آپ کو صاف کر رہے تھے۔ انہی نے منہ زہ بیگم کا چہرہ صاف کر کے انہیں خود سے لپٹا لیا۔

”میں ہوں نا ہی۔۔۔ آپ کی دوسری بیگم۔۔۔“ وہ بولی تھی۔



ایئر پورٹ سے باہر آتے ہی وہ ٹھک گئی۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر رافع کھڑا تھا۔ روہ نے نگرہ کو مود کر فراز اور ناعمہ کو دیکھا۔ وہ ان کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ رافع نے گلاسز اتارے اور آگے بڑھ آیا۔

وہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ان سپاٹ نظروں میں عجب سی خاموشی تھی۔
”چلیں؟“

”لیکن میں۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گئی۔
پھر اس نے ناعمد اور فراز کو دیکھا تھا۔

”آپ لوگ چلیں۔ میں رافع کے ساتھ آجاتی ہوں۔“ کہتے ہوئے اس کے انداز میں ہلکی سی حیاور آئی اور کمال سے رخ پڑ گئے۔ فرزا اور ناعمہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ شہلا اور ہاشم بھی دوسرے انہیں دیکھ رہے تھے۔

وردہ نے رافع کا پھیلا ہوا ہاتھ تھاما اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے ساتھ ہوئی۔



انکھیں موندے لٹی ہوئی تھیں۔

”ای جی۔۔۔ عباد کی پکار پر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان کے لب آہستہ آہستہ بل رہے تھے۔“
”ربیعہ اور شہیار احمد ساتھ خیریت کے پہنچ گئے ہیں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

انہوں نے آہستہ سے الحمد للہ کہہ کر لرزتے ہاتھ منہ پر پھیرے۔

”میں ان سے آپ کی بات کروا تا ہوں۔“ عباد کے انداز میں عجیب سی ٹینشن تھی۔

پھر اس نے دونوں بازوؤں میں انہیں اٹھا کر وہیل چیئر پر بٹھایا اور وہیل چیئر دھکیلتا ہوا اپنی اسٹڈی میں لے آیا
ماں انقہاس کے لیے ٹاپ پر ٹیٹ کنکٹ کے نیچے تھی۔

اسکرین پر ربیعہ نظر آرہی تھی۔ منہ زہ بیگم کی آنکھوں میں روشنی دور آئی۔ عباد نے انہیں ربیعہ کے دورو کر

یا۔

ربیعہ کی آنکھوں میں غمی گس مونیوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ دفعتا ”اسکرین پر
ایک کمزور مدقوق چہرہ نمودار ہوا۔ منہ زہ بیگم ساکت رہ گئیں۔ یہ چہرہ یہ شناسا چہرہ۔ یہ اپنا اپنا سا لگتا چہرہ۔

لوں تھا یہ شخص۔ ان کا ماضی۔ ان کی روشنی تقدیر۔ ان کا مہراں۔ بھران کا ستم گرس۔

احمد جہاں زیب نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھے۔ ان کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں منہ زہ بیگم

ماکت بیٹھی رہ گئیں۔ وہ ان ہاتھوں کو دیکھے جاتی تھیں۔

اچانک ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔ اسکرین خاموش ہو گئی۔

عباد نے چونک کر ماں کی سمت دیکھا۔ وہاں بھی ایک جامد خاموشی تھی۔

”اس کے لبوں سے سرگوشی کی صورت برآمد ہوا۔

۔“ انقہاس نے چیخ ماری تھی۔

سارے رابطے منقطع ہو چکے تھے۔ عباد نے آہستگی سے ماں کی کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”بابا۔ بابا۔“ ربیعہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شہیار احمد نے اسے گلے سے لگا لیا۔ امیر حسن نے ان کی

کھلی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں بند کیا تھا۔

دور و حسیں بدگمانی کے ہر بندھن سے آزاد آسمانوں کی جانب محو سفر تھیں۔

(ختم شد)

